

جلد ۳۵ | نمبر ۱

اپریل ۱۹۸۰ء

...: امیر احمد صدیقی

... ایڈیٹر: شاہنواز قریشی



ہمیندر کمار

... اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش

...: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ واسٹیشنری یوپی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

... کردہ محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ۔ اتر پردیش

: پچاس پیسے
: پانچ روپے

پرکاشن پبلک انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

...: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

... نیا دور انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

عنوانات

اے۔ ایم علوی
"ہومیو ہوم" نالہ فتح گنج۔ لکھنؤ

(افسانہ)

انگاروں کا سوال

شام کا دھندلکا رات کے گہرے اندھیرے میں گم ہو گیا نیلگوں فلک پر ننھے ننھے ستارے مسکرا اٹھے۔ مغرب میں افق پر بادلوں کے بے ترتیب ٹکڑے پھیلتے گئے۔ صوفیہ ماحول کی معتوب اور حالات کی ستائی ہوئی بے سہارا لڑکی اپنے کمزور شانوں پر بوڑھے باپ کی خدمت کا بوجھ اٹھائے اداس بیٹھی ہے۔ بوڑھا باپ کھانسی کی شدت سے بیقرار لڑکھڑاتی سانسوں میں کھوں...... کھوں کر رہا ہے۔ ہوا ٹھنڈی اور تیز ہے۔ دونوں باپ بیٹی رات بسر کرنے کے لیے روزانہ اس درخت کے نیچے آکر ٹھہرتے تھے۔ ان کی زندگی اسی طرح گزرتی ہے۔ صبح سے پیٹ بھرنے کے لیے گلی گلی بھیک مانگنا اور رات کو اس درخت کے نیچے سو رہنا۔ دونوں زمانے کی بے اعتنائی اور ستم گری پر خاموشی سے آنسو بہا رہے ہیں۔

صوفیہ۔ بابا! سڑک تو ابھی سے سنسان ہو گئی ہے...

بوڑھا۔ ہاں بیٹا! آج سردی کچھ زیادہ ہے۔ اور ویسے بھی تو رات ہو گئی ہے۔ دن بھر کی رونق سمٹ گئی ہے۔ ہماری زندگی کی طرح!

صوفیہ۔ کیا۔ بابا ہم ساری زندگی اسی طرح سڑک پر پڑے پڑے گزار دیں گے۔ ہمیں کوئی جھونپڑی سر چھپانے کو نہیں ملے گی؟ دیکھو نا بابا! کتنی سردی ہے جسم پر کپکپی چھا گئی ہے۔ ایسی کالی ڈراونی رات اور برفیلی فضا میں کوئی اور تو ہماری طرح ان سڑکوں پر نہیں سوتا۔

بوڑھا:۔ نہیں بیٹا ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ اس قسم کی باتیں تقدیر کا شکوہ ہیں۔ خدا جس حال میں رکھے۔ اس پر شاکر رہنا ہی انسان کے لیے بہت بڑی عبادت ہے۔

صوفیہ:۔ بابا! بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ اس وقت دنیا آرام سے ہیٹر، انگیٹھیاں جلائے سو رہی ہے۔ کیا قدرت کو صرف ہمارا ہی امتحان لینا تھا۔ کل صبح ٹوپ والا بابو کیسے ٹھک ٹھک کر بچوں کے ساتھ جا رہا تھا۔ اس کی بیوی کیسے خوبصورت کپڑے پہنے ہوئی تھی۔ لیکن ہمیں تو ایسے کپڑے نہیں ملتے بابا۔ "آپ کہتے ہیں خدا غریبوں کا ہے۔ مگر ہمیں تو ایسی چیزیں دیکھنے کو بھی نہیں دیتا......

یہ سنتے ہی بوڑھے کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہہ نکلیں اور اس کی سانسوں میں دبی دبی ہچکیاں گھل گئیں۔۔ کھانسی تیز ہو گئی اور وہ ماضی کے بحر بیکراں میں ڈوب گیا۔

صوفیہ:۔ بابا تم رو رہے ہو۔ لیکن ہمیں رونے سے منع کیا کرتے ہو....

بوڑھا:۔ ہاں بچی! رونا اچھا نہیں ہوتا۔ میری آنکھوں میں تو آنسو بے اختیاری کے عالم میں آگئے.... "بیٹا! دنیا میں کون ایسا ہے جو دکھی نہ ہو...... ہماری زندگی تو دنیا بھر سے مختلف ہے۔ یہ تو آنسوؤں میں پیدا ہوئی۔ آہوں میں پلی، اور حسرتوں کی موت سو جائے گی... ماحول کی تلخ ہوا نے وہاں لاکر کھڑا کیا ہے۔ جہاں انسان کا کوئی مونس نہیں.....

صوفیہ:۔ ہم کہاں تک بھیک مانگ کر پیٹ پالتے رہیں گے۔۔۔ بابا! ایسی زندگی سے موت آجائے تو بہتر ہے۔ نہ جانے موت بھی کہاں مر گئی ہے۔۔ وہ بھی غریبوں کے پاس آتے ہوئے ڈرتی ہے۔ کوئی بھی غریب سے محبت نہیں کرتا....

بوڑھا۔۔ ہاں بچی! میں بھی یہی سوچتا ہوں۔ مگر کیا کروں کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ امیدیں پیدا ہوتی ہیں...... اور بلبلوں کی مانند ٹوٹ جاتی ہیں۔۔ میری زندگی تو اب ختم

اے۔ ایم علوی
"ہومیو ہوم" نادر فتح گنج۔ لکھنؤ

(افسانہ)

ان گداؤں کا سوال

شام کا دھندلکا رات کے گہرے اندھیرے میں گم ہو گیا نیلگوں فلک پر ننھے ننھے ستارے مسکرا اٹھے۔ مغرب میں افق پر بادلوں کے بے ترتیب ٹکڑے پھیلتے گئے۔ صوفیہ ماحول کی معتوب اور حالات کی ستائی ہوئی بے سہارا لڑکی اپنے کمزور شانوں پر بوڑھے باپ کی خدمت کا بوجھ اٹھائے اداس بیٹھی ہے۔ بوڑھا باپ کھانسی کی شدت سے بیقرار لڑکھڑاتی سانسوں میں کھوں..... کھوں کر رہا ہے۔ ہوا ٹھنڈی اور تیز ہے۔ دونوں باپ بیٹی رات بسر کرنے کے لیے روزانہ اس درخت کے نیچے آ کر ٹھہرتے تھے۔ ان کی زندگی اسی طرح گزرتی ہے۔ صبح سے پیٹ بھرنے کے لیے گلی گلی بھیک مانگنا اور رات کو اس درخت کے نیچے سو رہنا۔ دونوں زمانے کی بے اعتنائی اور ستم گری پر خاموشی سے آنسو بہا رہے ہیں۔

صوفیہ۔ بابا! سڑک تو ابھی سے سنسان ہو گئی ہے...

بوڑھا۔ ہاں بیٹیا! آج سردی کچھ زیادہ ہے۔ اور ویسے بھی تو رات ہو گئی ہے۔ دن بھر کی رونق سمٹ گئی ہے۔ ہماری زندگی کی طرح!

صوفیہ۔ کیا۔ بابا ہم ساری زندگی اسی طرح سڑک پر پڑے پڑے گزار دیں گے۔ ہمیں کوئی جھونپڑی سر چھپانے کو نہیں ملے گی؟ دیکھو نا بابا! کتنی سردی ہے جسم پر تو کپکپی چھا گئی ہے۔ ایسی کالی ڈراونی رات اور برفیلی فضائیں کوئی اور تو ہماری طرح ان سڑکوں پر نہیں سوتا۔

بوڑھا:۔ نہیں بیٹیا ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ اس قسم کی باتیں تقدیر کا شکوہ ہیں۔ خدا جس حال میں رکھے۔ اس پر شاکر رہنا ہی انسان کے لیے بہت بڑی عبادت ہے۔

صوفیہ:۔ بابا! بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ اس وقت دنیا آرام سے ہیٹر، انگیٹھیاں جلائے سو رہی ہے۔ کیا قدرت کو صرف ہمارا ہی امتحان لینا تھا۔ کل صبح ٹوپ والا بابو کیسے ٹھمک ٹھمک کر بچوں کے ساتھ جا رہا تھا۔ اس کی بیوی کیسے خوبصورت کپڑے پہنے ہوئی تھی۔ لیکن ہمیں تو ایسے کپڑے نہیں ملتے بابا۔ "آپ کہتے ہیں خدا غریبوں کا ہے۔ مگر ہمیں تو ایسی چیزیں دیکھنے کو بھی نہیں دیتا.....

یہ سنتے ہی بوڑھے کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہہ نکلیں اور اس کی سانسوں میں دبی دبی ہچکیاں گھل گئیں۔۔۔ کھانسی تیز ہو گئی اور وہ ماضی کے بحر بیکراں میں ڈوب گیا۔

صوفیہ:۔ بابا تم رو رہے ہو۔ لیکن ہمیں رونے سے منع کیا کرتے ہو....

بوڑھا:۔ ہاں بچی! رونا اچھا نہیں ہوتا۔ میری آنکھوں میں تو آنسو بے اختیاری کے عالم میں آ گئے.... "بیٹیا! دنیا میں کون ایسا ہے جو دکھی نہ ہو......۔ ہماری زندگی تو دنیا بھر سے مختلف ہے۔ یہ تو آنسوؤں میں پیدا ہوئی۔ آہوں میں پلی، اور حسرتوں کی موت سو جائے گی... ماحول کی تلخ ہوا نے وہاں لا کر کھڑا کیا ہے۔ جہاں انسان کا کوئی مونس نہیں.....

صوفیہ:۔ ہم کہاں تک بھیک مانگ کر پیٹ پالتے رہیں گے۔۔۔ بابا! ایسی زندگی سے موت آ جائے تو بہتر ہے۔ نہ جانے موت بھی کہاں مر گئی ہے۔۔ وہ بھی غریبوں کے پاس آتے ہوئے ڈرتی ہے۔ کوئی بھی غریب سے محبت نہیں کرتا....

بوڑھا۔۔ ہاں بچی! میں بھی یہی سوچتا ہوں۔ مگر کیا کروں کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ امیدیں پیدا ہوتی ہیں..... اور بلبلوں کی مانند ٹوٹ جاتی ہیں۔۔ میری زندگی تو اب ختم

دہاب رشیدی
۷۵ تارین ٹیکلی۔ شاہجہانپور

گنیش شنکر ودیارتھی

آزادی کی نعمت سے بہرہ ور ہم اہل بھارت اس احساس سے دور ہوتے جا رہے ہیں کہ جد وجہد آزادی میں کیسے کیسے سپوت کام آئے۔ دور غلامی کی کڑی دھوپ میں کیسے کیسے باحوصلہ مجاہد جور و ظلم کے طویل و خطرناک مرحلوں سے گزرے جس کے نتیجے میں یہ باوقار لمحے ہمیں میسر آئے۔ وہ قافلۂ عزم و عمل جس کے رہرووں نے ملک کے لیے اپنا سب کچھ تج دیا، ہماری تاریخ کا جلی عنوان ہے۔ وہ ایک منارۂ روشنی ہے جو ہمیشہ آنے والی نسلوں کو راستہ دکھاتا رہے گا۔ اوراق الٹتے جائیے کہیں کسی سرفروش کی داستانِ حریت ہے تو کہیں کسی شہید کے لہو کی سرخی، غرض سارے صفحات اسی نورِ سحر و رنگِ شفق سے جگمگا رہے ہیں ٹیپو سے لے کر باپو تک ایک تابناک سلسلہ ہے، جس نے اندھیروں میں سفر کیا اور آخر کار روشنی کے اُس ہالے تک لایا جہاں سے آفتابِ آزادی کی حدیں شروع ہوتی ہیں۔ آج ہم جس بے خوف صحافی، مجاہدِ آزادی، قومی یکجہتی کے علمبردار کا ذکر کر رہے ہیں اُس امر شہید کا نام تھا گنیش شنکر ودیارتھی مادرِ وطن کا یہ لاڈلا اتر پردیش کے فتح پور ضلع میں ۱۸۹۰ء کو پیدا ہوا۔ اُس عظیم فرزند کے والد محترم ایک معلم تھے۔ ہائی اسکول کے بعد ہی مروجہ تعلیم کو خیر آباد کہہ دیا اور جنگ آزادی کے مقدس اسکول میں اپنا نام درج کرا لیا، جہاں اُس جیسے بے شمار جیالے اپنی جانیں گنگ و جمن کی حرمت کے لیے قربان کرنے کا عزم کیے ہوئے تھے۔ گنیش شنکر نے اس نکتہ کو بخوبی سمجھ لیا تھا کہ طالب علم ساری عمر طالب علم رہتا ہے اسی لیے انھوں نے اپنے نام کے ساتھ، ودیارتھی کے لفظ کو مستقل طور پر وابستہ کر لیا تھا۔

بڑا پر آشوب دور تھا۔ انگریزوں کی ریشہ دوانیوں نے قوم کے اندر جگہ جگہ دراڑیں پیدا کر دی تھیں۔ فرقہ وارانہ فضا، کسانوں کا استحصال، ہریجنوں کے مسائل، غرض کہ پورا بھارت درد میں انھیں زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا غلامی کا طوق الگ سے گردنوں میں پڑا تھا۔ اس صورت حال سے دردمندوں کے دل بے قرار تھے، اہلِ قلم کے ہاتھوں میں قلم لرز رہے تھے۔ گنیش شنکر دردمند دل بھی رکھتے تھے اور خدا کے فضل سے قلم بھی ہاتھ میں تھا وہ کیسے دیکھ سکتے تھے کہ پورا ملک اس طرح تباہ و برباد ہو جائے اسی احساس سے وہ بے خطر میدانِ کارزار میں کود پڑے۔ جد وجہد کا آغاز سرسوتی سے کیا جو اُس دور کا عظیم اخبار تھا، ساتھ ہی ساتھ وہ کرم یوگی اور اُردو کے 'سوراجیہ' میں بھی بے باکی سے اپنے انقلابانہ خیالات کا اظہار کرنے لگے۔ موخر الذکر دونوں اخبار انگریزی حکومت کی نظروں میں روزِ اول سے ہی کھٹکتے تھے اُس پر ودیارتھی جی کے مضامین اُن پر اور بھی قیامت توڑتے تھے۔ ودیارتھی جی بچپن سے ہی گاندھی جی اور نہرو جی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے تھے ویسے ملک کے سارے ہی عظیم قائدین سے ان کا تعلق تھا۔ اس زمانے میں چلنے والی ہر تحریک میں چاہے وہ سیاسی ہو یا سماجی ہو، وہ پیش پیش رہے۔ اس سلسلے میں وہ تجزیاتی ردِ عمل بھی ظاہر کرتے تھے۔ آخرکار انھوں نے ایک آزاد پالیسی رکھنے والے اخبار کی ضرورت محسوس کی اور 'پرتاپ' نام کے اخبار کو جاری کیا۔ یہ اخبار صحافت کے آسمان کا سورج بنا۔ ہر انقلابی نظریے کو اس کے صحافت میں جگہ دی گئی۔ زندگی کی ہر سطح پر ہونے والے ظلم و جور پر بے خوفی و جرأت سے قلم اٹھایا گیا، اس سلسلہ میں نہ سماج کے طبقۂ اُمرا کی پروا کی گئی نہ حکومت

غزلیں

صلاح الدین نیّر
۳۲-۹-۲۰ بازار روپ لال حیدر آباد - ۲

حسن کی کب تک پردہ داری، عشق ہی اپنا رسوا کیوں
تم کو جس نے دل سے چاہا اس سے رشتہ ٹوٹا کیوں

پروانہ تو پروانہ ہے، جانے کیا انجام ہو نا
عشق کی لَو پہ جلنے والا اپنی آگ میں جلتا کیوں

پاؤں تو میرے زخمی ہی تھے تم کو کیا معلوم نہیں
جانا اگر تھا چھوڑ کے مجھ کو تم نے مڑ کے دیکھا کیوں

اب کے برس ان قزاقوں نے پھولوں کی توہین بہت کی
پھر بھی کسی نے یہ نہیں پوچھا زخم ہیں دل کے تازہ کیوں

مجھ کو اور بھٹکنے دیتے منزل پر تو رکنا تھا
راہِ وفا دشوار اگر تھی تم نے رستہ روکا کیوں

لوگوں نے جب آپ کو پوچھا میں نے بتایا اپنا نام
بات تھی اتنی معمولی سی اس پہ اتنا غصّہ کیوں

چرچے تھے بے لوث وفا کے پھولوں سے بھی رشتہ تھا
راہِ وفا پُر خار اگر تھی آپ کا دامن الجھا کیوں

جو کچھ بھی حالات تھے نیّر تم نے کبھی یہ غور کیا
رشتۂ دل نازک تو بہت تھا اتنی جلدی ٹوٹا کیوں

خورشید افسر بسوانی
بسواں
سیتاپور - یوپی

رنگ، کرنیں، برف، جھرنے، پھول، پتھر پھینک دے
اپنی آنکھوں سے کھُرچ کر سارے منظر پھینک دے

ساری لہریں سو گئی ہیں ذہن کے آغوش میں
کوئی اس ٹھہرے ہوئے پانی میں کنکر پھینک دے

زندہ جب تک ہوں، بتا دے اپنے گھر کے راز تک
اور اگر مر جاؤں، مجھ کو بھی سمندر پھینک دے

لکھ گیا ہے میرے چہرے پر مرے قاتل کا نام
بستیوں سے دور لے جا کر مرا سر پھینک دے

جل گیا جب گھر ہی تو کیسی نشانی کیا ثبوت
جانے کب جھونکا کوئی یہ راکھ اٹھا کر پھینک دے

اس کے گل دانوں میں مرجھائے نہیں چہرے کے پھول
تو بھی تنہائی کا موسم گھر کے باہر پھینک دے

خوش ہے کیوں ساحل پہ خالی سیپ مٹھی میں لیے
کوئی ہوتا پھینک دیتا، تو بھی افسر پھینک دے

کے قہر و جبر کی ۔ یہ حقیقت ہے کہ قومی بیداری کے سلسلے میں جو اہم رول 'پرتاپ' نے ادا کیا وہ اپنی مثال آپ ہے ۔ ۹ر جون ۱۹۱۹ء کے شمارے میں دیش کی آتما کے عنوان سے وہ تحریر کرتے ہیں کہ "دیش کی روح آفاقی ، لامحدود اور ناقابلِ تسخیر ہے ، دن بیتے ہیں ، برس ٹل جاتے ہیں ، زمانوں کا اختتام ہو جاتا ہے ، بڑے بڑے نادر شاہ خاک میں مل جاتے ہیں مگر روحِ وطن زندہ جاوید ہے ، جور و استبداد کے طوفان اس کو فنا کرنے کے ناپاک ارادے لے کر آگے بڑھیں ، چاہے افکار و خیالات کے فاسد دھارے اس کو مٹانے پر کمربستہ ہو جائیں مگر اس کی ابدیت پر حرف نہیں آسکتا ۔ اس کی تشنگی صرف آزاد و خود مختار فضائیں بجھا سکتی ہے ۔ غلامانہ ماحول میں آبِ حیات بھی اِس کی پیاس نہیں بُجھا سکتا ۔"

'پرتاپ' کے ذریعہ وہ لگ بھگ ۱۰ برس تک سامراجی حکومت کے ظلم و جور نیز سماجی بے انصافیوں پر لکھتے رہے ۔ ۴ر مارچ ۱۹۱۸ء کو انھوں نے لکھا کہ "آج سے سال بھر پہلے ۵ر مارچ ۱۹۱۷ء کو ملک کے نمائندہ صحافیوں کا ایک وفد لارڈ چیمس فورڈ سے دہلی میں ملا تھا اور اُن کو عرض داشت پیش کی تھی "پریس ایکٹ" "آزادیٔ فکر کا گلا گھوٹ رہا ہے ، لہٰذا اُس کو فوراً واپس لیا جائے ۔ اگر ایسا ہو جائے تو ملک ایک بڑی بے چینی سے نجات پا سکتا ہے اور اراکینِ حکومت اپنی جابرانہ پالیسیوں پر نظرِ ثانی کر سکتے ہیں ، دیش ترقی کی راہ پر بھی لگ سکتا ہے حالانکہ ہمیں اُمید نہیں کہ یہ ہوگا ہمارے حاکم ایک جگہ پر گڑے رہ سکتے ہیں مگر یہ خیالِ خام دل سے نکال دیں کہ وقت بھی اُن کے لیے ایک جگہ گڑا رہے گا ۔"

وہ ملک کی آزادی کو پریس کی آزادی کے ساتھ جوڑتے تھے وہ نہ صرف کالے قانونوں کے کٹر دشمن تھے ۔ بلکہ بڑھتی ہوئی غریبی پر بھی مضطرب رہتے تھے ۔ وہ اپنے مضامین میں مسلسل قارئین کو متوجہ کرتے تھے کہ آزادیِ رائے پر پابندی اور مفلوک الحالی دونوں خطرناک ہیں ۔ انگریزوں کے ساتھ وہ مقامی سرمایہ داروں کو بھی ایک خطرہ سمجھتے تھے ۔ ۱۶ر ستمبر ۱۹۱۸ء کو انھوں نے لکھا تھا کہ "غریبی نے اور بھی بھیانک روپ اختیار کر لیا ۔ اب پیمانۂ صبر چھلکنے والا ہے ۔

ہم پوچھتے ہیں ۔ پاپی کون ہے ؟ غریب یا امیر ؟ غریب بے چارہ ایک مٹھی بھر اناج کے لیے آپ کو سامانِ عیش فراہم کرتا ہے ۔ آپ امیر باپ کے بیٹے ہونے کے ناطے کُشن کے گدے پر خوابِ استراحت کے مزے لوٹتے ہیں اور غریب باپ کا لڑکا کھُری چارپائی کو ترستا ہے ۔ یہ بے شرمی نہیں تو اور کیا ہے ؟"

ان کی اسی جرأت و بے خوفی نے انھیں بار بار قید و بند کی مصیبت میں ڈالا مگر نہ کبھی ان کے پائے استقامت ڈگمگائے نہ اپنے راستے سے منھ موڑا ۔ ۱۹۱۳ سے ۱۹۳۰ء تک چلنے والی تمام تحریکوں میں قدم سے قدم ملائے وہ پرتاپ کے ذریعہ ان کی افادیت سے قوم کو آگاہ کرتے رہے اور بے تکان لکھتے رہے ۔ چمپارن میں گوروں کے ظلم ، دیسی ریاستوں میں ہونے والے استبداد سبھی پر وہ آگ برساتے رہے ۔ کافی عرصے تک مہاتما گاندھی ، پرتاپ کو خصوصی طور پر اپنائے رہے ۔

کانپور کو انقلابی مرکز بنانے میں ودیارتھی جی کا بہت بڑا ہاتھ تھا ۔ چندر شیکھر آزاد ، راجکمار سنہا ، بٹکیشور دت ، بھگت سنگھ جیسے انقلابیوں سے ان کا ذاتی تعلق تھا ، یہ سارے عظیم انقلابی گنیش شنکر ودیارتھی کو ایک بے غرض ، مخلص اور دردمند اور آزادی کی سچی تڑپ رکھنے والی شخصیت کے روپ میں عقیدت کی نظر سے دیکھتے تھے ۔

'پرتاپ' میں انھوں نے انقلابیوں پر زبردست مضامین بھی لکھے ۔ دوسری طرف جو دانشمندی ان کی عظمت کو ظاہر کرتی ہے ۔ وہ نگاہ دور بیں ہے ۔ جو مغربی ثقافت اور زبان کو سرخ نشان سمجھتی ہے ۔ اس مرحلے پر ان کا قلم درد و غم میں ڈوبا نظر آتا ہے ۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر مغربی کلچر پوری طرح اس سرزمین میں سرایت کر گیا اور بدیسی زبان کو مکمل دسترس حاصل ہو گئی تو پھر آزادی کا مفہوم ہی بے معنی ہو جائے گا اور انگریز کا

(بقیہ صفحہ ۴۸ پر)

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی
۱۷ - اشفاق اللہ مارگ ۔ لکھنؤ

میر امّن : آسان زبان و اسلوب کے بانی

اردو کی مقبول ترین کتاب باغ و بہار کے مصنف میر امّن کا نام میر امان اللہ تھا۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے ، وہیں پلے بڑھے اور تعلیم و تربیت پائی۔ ان کے اسلاف شہنشاہ ہمایوں کے عہد میں دلی آئے تھے اور دربار سے وابستہ ہو گئے۔ یہ تعلق میر امّن کے زمانے تک باقی رہا لیکن جب دلی تباہ ہوئی اور سلطنت مغلیہ اندرونی اور بیرونی سازشوں اور حملوں کی وجہ سے صرف نام کی رہ گئی۔ "سلطنت شاہ عالم از دلی تا پالم" کے مقولے سے بھی کم رہ گئی اور

"وہ گھر کہ سارے گھر، اس گھر کے سبب آباد تھے، تباہ و برباد ہوگیا"

تو میر امّن بھی چار و ناچار، بحسرت و یاس دلی چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ [illegible] اتے ہوئے عظیم آباد (پٹنہ) پہنچے وہاں ایک عرصے تک رہے لیکن کوئی قابل اطمینان اور مستقل صورت پیدا نہ ہو سکی اس لیے عیال و اطفال کو چھوڑ کر تن تنہا کلکتے چلے گئے۔ کچھ عرصہ تک بیکار رہنے کے بعد، نواب دلاور جنگ کے چھوٹے بھائی میر کاظم علی خاں کی اتالیقی پر مقرر ہو گئے۔ تقریباً دو سال تک اتالیقی کی خدمت انجام دیتے رہے۔ مگر نباہ نہ ہو سکنے کی وجہ سے علیحدہ ہو گئے۔ خوش قسمتی سے میر بہادر علی حسینی سے ان کی ملاقات ہو گئی۔ میر صاحب فورٹ ولیم کالج کے ہندستانی شعبہ میں میر منشی تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر جان گلکرسٹ صدر شعبہ سے میر امّن کا تذکرہ کیا اور ان کی سفارش کی۔ گلکرسٹ تو ایسے قابل لوگوں کی تلاش ہی میں رہتا تھا وہ میر امّن کی لیاقت اور صلاحیت سے متاثر ہوا اور ۴ مئی ۱۸۰۱ء کو انھیں ہندستانی شعبہ میں "ماتحت منشی" کی جگہ دیدی اور چالیس روپے ماہوار تنخواہ مقرر کی۔ ڈاکٹر گلکرسٹ نے چار درویش کا آسان اردو زبان میں ترجمہ کرنے کا کام میر امّن کے سپرد کیا۔ میر امّن کے الفاظ میں :

"جان گلکرسٹ صاحب نے (کہ ہمیشہ اقبال ان کا زیادہ رہے جب تک گنگا جمنا بہے) لطف سے فرمایا کہ قصّے کو ٹھیٹ ہندستانی گفتگو میں جو اردو کے لوگ، ہندو، مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں، ترجمہ کرو موافق حکم حضور کے میں نے بھی اسی محاورے سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔"

میر امّن نے دن رات ایک کر کے ۱۸۰۲ء میں چار درویش کا ترجمہ ختم کر دیا اور کتاب کا نام باغ و بہار رکھا جس سے اس کی تاریخ بھی نکلتی ہے، اس کے بعد فورٹ ولیم کالج کے ذمہ داروں کو حسب ذیل عرضی دی۔

(نقل عرضی کی جو مدرسہ کے مختار کار صاحبوں کے حضور میں دی گئی)

"صاحبان والاشان، نجیبوں کے قدر دانوں کو خدا سلامت رکھے۔ اس بے وطن نے حکم اشتہار کا سن کر چار درویش کے قصّے کو ہزار جد و کد سے اردوے معلّیٰ کی زبان میں باغ و بہار بنایا۔ فضل الٰہی سے سب صاحبوں کے سیر کرنے کے باعث سرسبز ہوا۔ اب امیدوار ہوں کہ اس کا پھل مجھے بھی ملے تو میرا غنچۂ دل مانند گل کھلے۔ بقول حکیم

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: آپ تھے (تذکرہ شعرائے قصبات اودھ)
مصنف: عرفان عباسی - صفحات: ۳۲۰
قیمت: ۲۵ روپے - ملنے کا پتہ: نصرت پبلشرز حیدری مارکیٹ امین الدولہ پارک، لکھنؤ۔

"آپ تھے" قصبات اودھ کے ۴۸ مرحوم شعراء کے خاکوں پر مشتمل ہے۔ ان خاکوں میں اختصار کے ساتھ شاعر کے حالات زندگی، شخصی و شعری خصوصیات اور اشعار کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ یہ خاکے تعارفی نوعیت کے ہیں اور FIRST INFORMATION کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس طرح ان خاکوں کی اپنی جگہ ایک افادیت ہے۔

"آپ تھے" میں ریاض خیر آبادی، جاں نثار اختر اور سلام مچھلی شہری جیسے اہم شعرا کے خاکے بھی شامل ہیں۔ اس میں عباس علی خاں بیخود صاحب کا خاکہ بھی شامل ہے۔ جو کلکتہ یونیورسٹی میں اردو کے لیکچرر تھے اور ۶ اگست ۱۹۶۹ء کو وہیں ان کا انتقال ہوا۔ کلکتہ میں عام طور سے انھیں بیخود کلکتوی ہی کہا جاتا ہے۔ لیکن ان کے خاکے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ فیض آباد کے تھے۔ اس طرح ان خاکوں سے بعض شعرا کے سلسلے میں جو غلط فہمیاں ہیں وہ بھی دور ہو جاتی ہیں۔

لکھنؤ میں اگر کسی شخص کو کسی شاعر کے حالات زندگی اور نمونہ کلام نہ دستیاب ہو پا رہا ہو تو وہ اگر عرفان عباسی صاحب سے رابطہ قائم کرے تو اسے یہ چیزیں ان سے یقیناً بڑی آسانی سے حاصل ہو جائیں گی۔ ان خاکوں اور تذکروں کی شکل میں عباسی صاحب جو کام کر رہے ہیں، اس کی افادیت کے پیش نظر وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ لیکن ان سے ایک گذارش بھی ہے وہ یہ کہ انھیں افسانہ نگاروں، ناول نگاروں اور ناقدین پر بھی توجہ دینی چاہیئے اور ان کے خاکے اور تذکرے بھی لکھنا چاہیئے تاکہ اردو میں اس سلسلے میں جو کمی ہے اس کے دور ہونے کا سلسلہ شروع ہو سکے۔

— شاہ نواز قریشی



مشتاق سلونوی — (صفحہ ۲۸ کا بقیہ)

نعت کے چند اشعار

لب پہ ہے نام محمدؐ دل میں ارمان رسولؐ
یوں پہنچتے ہیں مدینہ مبتلایان رسولؐ

قوت بازوئے احمدؐ تھے علی مرتضےٰؑ
پارۂ دل فاطمہؑ حسنین تھے جان رسولؐ

طالب بخشش جو ہو دنیا کے جھگڑے چھوڑ کر
کیوں نہیں بنتے ہوائے مشتاق دربان رسولؐ

نعلین دوست حق سے بڑھا افتخار عرش
دونا ہوا نبیؐ کے قدم سے وقار عرش

محبوب حق، امین خدا، رحمت جہاں
ختم رسل، شفیع امم، شہسوار عرش

سلام کے چند اشعار

حیف جو مالک کوثر ہے وہ پیاسا رہ جائے
مجرئی سب بچیں احمد کا نواسہ رہ جائے

پانی جو دے نہ سکے آل نبیؐ کو اپنا
یا خدا بہنے سے اس طرح کا دریا رہ جائے

اے فلک کیسا ستم ہے کہ دم ظہر حسینؑ
سر کٹانے کے لئے تشنہ و تنہا رہ جائے

فردوسی کے کہ شاہنامہ میں کہا ہے۔

بسے رنج بردم دریں سال سی
عجم زندہ کردم بدایں پارسی
سو اُردو کی آراستہ کر زباں
کیا میں نے بنگالہ ہندوستاں

خاوندا آپ قدردان ہیں۔ حاجت عرض کرنے کی نہیں۔ الٰہی! تارا اقبال کا چمکتا رہے۔ عرضی
میر امّن دلّی والے کی

میر امّن نے یہ عرضی اس فیصلہ کو مدنظر رکھتے ہوئے دی تھی کالج کونسل نے ایک تجویز ۲ر نومبر ۱۸۰۱ء کو کیا تھا جس میں طے کیا گیا تھا کہ:

"دیسی زبانوں میں ادبی کتابوں کی تصنیف و تالیف کی ہمت افزائی کے خیال سے منتخب دیسی لوگوں کو انعامات دیے جائیں گے"[11]

میر امّن کی عرضی، صاحبان والاشان، اور نجیبوں کے قدردانوں" کی خدمت میں پیش ہو کر منظور ہوئی اور میر امّن کو پانچ سو روپیہ کا انعام دیا گیا۔ کالج کونسل نے ۳۱ر اگست ۱۸۰۲ء کی میٹنگ میں یہ فیصلہ کیا کہ:

"فاضل دیسی میر امّن، جو کالج سے وابستہ ہیں اُن کو چہار درویش کے ہندوستانی ترجمے کے لیے جسے ہندوستانی پروفیسر نے آج ہی پیش کیا ہے۔ پانچ سو روپیہ بطور انعام دیئے جائیں گے"[12]

باغ و بہار ۱۸۰۳ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی اس سے قبل میر عطا حسین خاں تحسین نے ۱۷۷۵ء میں چہار درویش کا فارسی سے اردو میں ترجمہ "نوطرز مرصع" کے نام سے کیا تھا۔ اس زمانے کے ادبی معیار، دستور اور رواج کے مطابق نوطرز مرصع کی زبان فارسی آمیز، عبارت رنگین اور اسلوب مسجع و مقفیٰ ہے۔ عربی و فارسی الفاظ و تراکیب، تشبیہات و استعارات کی بہتات ہے۔ میر امّن کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے عام فہم زبان اور سیدھے سادے اسلوب میں "باغ و بہار" لکھی۔ بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق کے الفاظ میں:

"میر امّن نے نوطرز مرصع کی زبان کو سامنے رکھ کر، باغ و بہار لکھی۔ اس کی زبان اس قدر صاف، سادہ، آسان، سلیس اور بامحاورہ ہے کہ آج تک اس کا جواب نہیں ہو سکا"[13]

خواجہ احمد فاروقی "میر امّن کو ضرورت سے زیادہ اہمیت نہ دیے اور ان کے متعلق "معاصرین کی رائے کچھ بہت ہمت افزا" نہ ہونے کی صراحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"بلاشبہ میر امّن نے وہ نئی نثر ایجاد کی جس کے جملے آج مصری کی ڈلیاں اور شربت کے گھونٹ ہیں"[14]

باغ و بہار نے میر امّن کو زندہ جاوید بنا دیا اُردو نثر میں ان کو وہی شہرت و مقبولیت اور مرتبہ حاصل ہے جو نظم میں میرؔ، غالبؔ، اور اقبالؔ کو ہے۔

باغ و بہار کے ختم کرنے کے بعد ڈاکٹر گلکرسٹ نے فرمائش کی کہ ملا حسین واعظ کاشفی کی کتاب اخلاق محسنی کا آزاد ترجمہ کرو۔ میر امّن نے یہ ترجمہ ۱۸۰۳ء میں مکمل کیا اور "گنج خوبی" نام رکھا۔ اس کتاب کے ترجمہ کے متعلق میر امّن لکھتے

"خداوند نعمت، صاحب خلق و مروت، جان گلکرسٹ صاحب نے کہ زبان اُردو کے قدردان اور فلک زدوں کے فیض رساں ہیں، اس بعید الوطن، میر امّن دلّی والے کو لطف و عنایت سے فرمایا کہ اخلاق محسنی جو فارسی کتاب ہے، اس کو اپنی زبان میں ترجمہ کرو تو صاحبان عالی شان کے درس کی خاطر مدرسے میں کام آوے"[15]

میر امّن نے ترجمے میں اس فرمائش کا خاص طور سے خیال رکھا اور اس کو اپنی زبان اور اپنے محاورے میں لکھا۔ ترجمے کے متعلق لکھتے ہیں:

"فقط فارسی کے ہو بہو معنی کہنے میں کچھ لطف اور مزہ نہ دیکھا۔ اس لیے اس کا مطلب لے کر اپنے محاورے میں سارا احوال بیان کیا.... میں نے اُردوئے معلّٰی کی زبان کو بے

022084
7.4.82

رباعی :-

تکلیف بھی دیکھی ہے، عیش بھی دیکھا ہے
یاد اس کی نہ ہم کو رنج اس کا ہے
تسلیم و رضا یہ کہہ رہے ہیں مشتاق
یارب ہر حال میں شکر تیرا ہے

غزل کے چند اشعار :-

خیال یار میں تو ہی تسلی مجھکو دیتا ہے — خیال یار ہمدم کوئی تجھ سا ہو نہیں سکتا
مجھ کو دیوانہ انھیں رسوا کیا — اک دل بیتاب نے کیا کیا کیا
تیرے ساتھ وہ نظر آئے — گل کے پہلو میں خار کو دیکھا
پہلے دعویٰ ان کو یکتائی کا تھا — آئینہ دیکھا تو حیرت ہو گئی
ہر بشر کے لیے ہے راہ عدم کی در پیش — آج جاتا ہے کوئی اور کوئی کل جائے گا
جفا آپ مشتاق پر کر رہے ہیں — ذرا سوچئے تو یہ کیا ہو رہا ہے

مرے کھلتے ... جفا کا ہو نہیں سکتا — زبان شکر ہے یا اس سے شکوہ ہو
یہ کیا خبر تھی کہ تم دل میں مرے بیٹھے ہو — میں جستجو میں تمھاری کہاں کہاں
کبھو تم بھی مشتاق حال جدائی — سناتا ہے ناصح قیامت کا

نظم "قلم" کے ۲ بند :-

اے قلم تو جسم ہے اور جان تری تحریر ہے — علم اور تعلیم کی تو بولتی تصویر
پھیلی کیا دنیائے دانش میں تری تنویر ہے — طالب و خواہاں ترا ہر اک جوان و پیر
عرش پر سنتے ہیں اے خامہ تری خلقت ہوئی
یہ بھی انساں پر خدائے پاک کی رحمت ہوئی

قید میں تحریر کی لاتا ہے تو ہی واقعات — بالیقیں ہے تو ہی وجہ باقیات اللہ
تو نہ ہوتا تو ہمیں سب بھول جاتی اپنی بات — تیری تحریرات سے ہیں لطف اللہ
اس تمدن کی ترقی پر ترا احسان ہے
تو ہر اک علم و ترقی کی یقیناً جان ہے



گنیش شنکر ودیارتھی — (صفحہ ۴۶ کا بقیہ)

(صفحہ ۴۶ کا بقیہ)

جانا نہ جانا برابر ہو گا۔

ان کی شہادت کانپور کے دنگے میں ہوئی۔ باپو یہ خبر سنکر چیخ اٹھے۔ اور اپنے جذبات کا اظہار یوں کیا۔ "ہمیں تو گنیش شنکر ودیارتھی بننا چاہیئے۔ اس نے اہنسا کی سیوا کا بہ آدرش ہمارے سامنے رکھ دیا۔ اس کی قربانی رائیگاں نہ ... ہم ان کی عظمت کو سلام کرتے ہیں۔"

پریس جسٹریشن آف بکس ایکٹ ۱۸۶۷ء (دسمبر ۱۹۵۶ء میں ترمیم شدہ) کی دفعہ ۱۹ ڈی کے قاعدہ ۸ کے مطابق ماہنامہ نیا دور کی ملکیت وغیرہ کے بارے میں مندرجہ ذیل تفصیلات شائع کیے جاتے ہیں :-

(۱) مقام اشاعت	لکھنؤ
(۲) وقفۂ اشاعت	ماہوار
(۳) پرنٹر کا نام، قومیت اور پتہ	شری اشوک کمار۔ ہندستانی۔ سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری۔ اتر پردیش، الہ آباد۔
(۴) پبلشر کا نام، قومیت اور پتہ	ٹھاکر پرشاد سنگھ۔ ہندستانی۔ ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش لکھنؤ
(۵) اڈیٹر کا نام، قومیت اور پتہ	شری ابرار احمد صدیقی۔ ہندستانی۔ ایڈیٹر نیا دور محکمۂ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش لکھنؤ
(۶) ان اصحاب کے نام جو اس رسالے کے مالک یا حصہ دار ہیں یا اس کے تمام سرمایے کے ایک فی صدی سے زیادہ کے حصہ دار ہیں۔	نیا دور سرکاری جریدہ ہے اس لیے اس کے بارے میں ان اصحاب کے نام اور پتے کا جو اس جریدے کے مالک یا حصہ دار ہیں یا ساری پونجی کے ایک فیصدی سے زیادہ کے حصہ دار ہیں سوال نہیں۔

میں ٹھاکر پرشاد سنگھ اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔
(دستخط) ٹھاکر پرشاد سنگھ (پبلشر)

بیچ و کاؤ جیسے بادشاہ سے لے کر امرا اور ان کے ملازم بولتے ہیں، بولا۔۔۔ اب یہ مبتدی کے واسطے فائدے مند اور منتہی صاحب دریافت کو پسند آوے گی کہ کیا بے لگاؤ دریا کے مانند اس کی عبارت رواں اور مثال گھوڑے بادپا کے کہ میدان ہموار اور صاف پاتا ہے۔ رواں ہے"۔ [۶]

اس کے باوجود، یہ کتاب باغ و بہار کے مقابلے میں مقبول و مشہور نہ ہو سکی۔

اردو نثر میں، میر امن کی یہی دونوں کتابیں یادگار ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے دوسرے نثری کارناموں کا پتہ نہیں چلتا۔ یہ دونوں کتابیں بھی گلکرسٹ کی فرمائش سے لکھی گئیں۔

فورٹ ولیم کالج سے پہلے دلی اور عظیم آباد میں، انھیں تصنیف تالیف سے کوئی سروکار نہیں رہا۔ ملازمت کی مجبوری نہ ہوتی تو شاید ان کتابوں کا بھی وجود نہ ہوتا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کا شمار ممتاز اہل قلم میں نہیں کیا جاتا تھا۔ اس دور میں یوں بھی نثر نگاری کی طرف توجہ نہیں تھی۔ زیادہ تر رجحان شاعری کی طرف تھا جہان آباد کا ماحول شاعرانہ تھا۔ میر امن اسی ماحول میں پروان چڑھے تھے۔ موزوں طبع بھی تھے۔ گاہے گاہے شعر گوئی سے دل چسپی بھی لیتے تھے۔ کسی کی شاگردی نہیں کی۔ لطف تخلص رکھا۔ اپنی شاعری کے متعلق گنج خوبی کے دیباچے میں لکھا ہے:

"اگرچہ فکر سخن کہنے کی ساری عمر نہیں کی۔ ہاں مگر خود بخود جو کوئی مضمون دل میں آیا تو اسے باندھ ڈالا۔ نہ کسو کا استاد، نہ کسی کا شاگرد۔ بیت ؎

نہ شاعر ہوں میں اور نہ شاعر کا بھائی
فقط میں نے کی اپنی طبع آزمائی

اور انھوں نے طبع آزمائی" باغ و بہار اور "گنج خوبی"۔۔۔ دونوں میں موقع موقع سے ۔۔۔ ہے۔

باغ و بہار میں چار درویشوں اور بادشاہ آزادبخت کے قصے کا آغاز حسب حال اشعار سے کیا ہے اور کتاب کے خاتمہ پر بارہ اشعار کا قطعہ تاریخ بھی کہا ہے ان کے علاوہ کہیں کہیں اور بھی انھوں نے شعر موزوں کیے ہیں جس سے ان کے موزوں طبع ہونے میں شک نہیں رہتا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ نہ شاعر تھے اور نہ شاعر کے بھائی۔ اس لیے یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ شعر و شاعری سے بھی انھیں نہ ہونے کے برابر لگاؤ تھا۔

میر امن فورٹ ولیم کالج سے ۱۸۰۶ء تک وابستہ رہے۔ ان سے پہلے، ان کے مربی و محسن ڈاکٹر جان گلکرسٹ ۲۴ر فروری ۱۸۰۴ء کو کالج سے مستعفی ہو چکے تھے۔ ان کے الگ ہو جانے سے میر امن بہت متاثر تھے، شعبہ کے ذمہ داروں نے بھی کوئی کتاب لکھنے یا ترجمہ کرنے کے لیے ان کے سپرد نہیں کی۔ درس و تدریس کے فرائض وہ ضرور انجام دیتے رہے لیکن پیرانہ سالی اور جسمانی معذوری کی وجہ سے وہ پڑھانے کا کام بھی بخوبی انجام نہیں دے سکتے تھے اسی لیے انھوں نے جب ایک طالب علم کو پڑھانے سے معذوری ظاہر کی تو انھیں کالج کی ملازمت سے علٰحدہ کر دیا گیا۔ فورٹ ولیم کالج کی کارروائیاں جلد دوم صفحہ ۱۰۶ پر اس کے متعلق حسب ذیل عبارت ملتی ہے۔:

"۴ر جون ۱۸۰۶ء کو فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی کے پروفیسر کی شکایت پر کہ میر امن نے ایک طالب علم کو پڑھانے سے انکار کیا ہے۔ میر امن، کالج کونسل کے سامنے پیش کیے گئے۔ انھوں نے الزام کو تسلیم کرتے ہوئے پیرانہ سالی اور جسمانی معذوری کا انھوں نے عذر پیش کیا۔ ان کا بیان سننے کے بعد کالج کونسل اس نتیجے پر پہنچی کہ میر امن کالج کی خدمات سے سبکدوش ہونے کے خواہش مند معلوم ہوتے ہیں۔ طے پایا کہ اس مہینے کی تنخواہ کے علاوہ اور دو مہینوں کی تنخواہ دے کر کالج کی خدمات سے ان کو سبکدوش کر دیا جائے"۔

اس کے بعد کالج کی کسی کارروائی میں ان کا نام نہیں ملتا۔ اس طرح میر امن نے کالج میں صرف پانچ سال ایک ماہ تک کام کیا۔ کالج سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ کلکتے ہی میں رہے یا کہیں اور چلے گئے اور کب تک زندہ رہے؟ ابھی تک پردۂ راز میں ہے۔ قرین قیاس یہ ہے کہ جب انھیں پیرانہ سالی اور جسمانی

ذوری کی وجہ سے علٰحدہ کیا گیا، اور چار مہینے کی مزید تنخواہ
رسبر کے لیے دی گئی، تو وہ کلکتے ہی میں رہے ہوں گے
وری اور ضعیفی کی وجہ سے سفر کے لائق ہی نہیں رہے
ہوں گے۔ کلکتے ہی میں ان کے آخری ایام گزرے ہوں
گے اور وہیں ان کا انتقال ہوا ہوگا۔

میر امنؔ کو دلّی اس وقت چھوڑنا پڑی تھی جب "سورج
مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کرلیا، اور "احمد شاہ درانی نے گھر بار
تاراج کیا" تھا، یہ حملہ ۱۷۶۱ء میں ہوا تھا۔ اس وقت تک دلّی
کی ٹکسالی زبان اور عوام و خواص کے محاورے، پر دسترس
حاصل کر چکے تھے۔ ہندستانی معاشرہ، مختلف و متضاد طبقوں
اور فرقوں کے حالات، رسم و رواج، تفریحات و تقریبات سے
ان کو بخوبی واقفیت ہو چکی تھی۔ یہ اسی وقت ممکن ہے، جب
عمر کا بڑا حصّہ اسی ماحول میں گزرا ہو۔ میر امنؔ کے بیان سے
یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی عمر کا کافی حصّہ دلّی میں گزرا۔
وہ خود لکھتے ہیں:

"جو شخص سب آفتیں سہہ کر دلّی کا روڑہ ہو کر رہا اور دس
پانچ پشتیں اسی شہر میں گزریں اور اس نے دربار امراؤں کے اور
میلے ٹھیلے، عرس، چھڑیاں، سیر تماشا، اور کوچہ گردی اس
شہر کی مدت تلک کی ہوگی اور وہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان
کو لحاظ میں رکھا ہوگا، اس کا بولنا البتہ ٹھیک ہے یہ عاجز
بھی ہر ایک شہر کی سیر کرتا اور تماشا دیکھتا یہاں تلک
پہنچا ہے۔"

اس بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ میر امنؔ "مدت
تلک" دلّی میں رہے اور "دلّی سے نکلنے کے بعد" اپنی زبان کو
لحاظ میں رکھا۔"

دلّی سے وہ تنہا نہیں گئے۔ بلکہ عیال و اطفال کو بھی اپنے
ساتھ لیتے گئے۔ اس لیے گمانِ غالب ہے کہ دلّی چھوڑتے وقت
ان کی عمر کم از کم پینتیس یا چالیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔
دلّی چھوڑنے کے بعد وہ، ہر ایک شہر کی سیر کرتے، اور تماشا
دیکھتے، ٹھوکریں کھاتے اور تکلیفیں اٹھاتے ہوئے کسی نہ کسی
طرح عظیم آباد پہونچے اور "کتنے برس بلدہ عظیم آباد میں دم لیا۔
کچھ بنی، کچھ بگڑی، آخر وہاں سے بھی پاؤں اکھڑے" عیال اور
اطفال کو وہیں چھوڑ کر تن تنہا کشتی پر سوار ہو کر کلکتے پہنچے
کچھ عرصے تک بے کار رہنے کے بعد قریب دو سال تک
اتالیق رہے لیکن نباہ نہ ہو سکا۔ تب منشی میر بہادر علی حسینی کے
وسیلے سے "ڈاکٹر جان گلکرسٹ تک رسائی ہوئی" اور ۴ مئی
۱۸۰۱ء کو کالج کے ہندستانی شعبے میں ملازم ہو گئے۔ اس طرح
میر امنؔ عظیم آباد سے ۱۷۹۷ء کے آخر یا ۱۷۹۸ء کے آغاز
میں کلکتے گئے ہوں گے۔ عظیم آباد میں وہ کتنے برس تک رہے؟
اور روانہ ہونے سے پہلے، عیال و اطفال، کو کس پر چھوڑا؟
ملازمت مل جانے کے بعد انھیں کلکتے بلایا یا نہیں؟ ان سب
باتوں کا ابھی تک علم نہیں ہو سکا۔

۱۸۰۶ء میں، میر امنؔ فورٹ ولیم کالج سے علٰحدہ ہو گئے۔
اب اگر یہ مان لیا جائے کہ ۱۷۶۱ء میں ان کی عمر ۳۵ سال تھی
تو ۱۸۰۶ء میں وہ اسّی سال کے ہوں گے۔ اس لیے ان کا سنِ
پیدائش ۱۷۲۶ء کے قریب ہوگا اور سنِ وفات ۱۸۰۶ء یا اس
کے دو ایک سال بعد۔ حیرت یہ ہے کہ میر امنؔ کی سیرت و شخصیت
اور ان کے مختصر حالات بھی لکھنے کی طرف کسی نے نہ تو ان کے
زمانے میں توجہ کی اور نہ ان کے انتقال کے بعد، آج تک کوئی
متوجہ ہوا۔ اس کا سبب بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ میر امنؔ کی علمی
ادبی حیثیت اس زمانے کے کسی اہلِ علم نے تسلیم نہیں کی تھی۔
اور مشاہیر ادب کی نظر میں ان کی نثر نظیر اکبر آبادی کی نظم
سے بھی زیادہ "ہیچ و پوچ" سمجھی جاتی تھی یوں بھی:

"نثر گوشۂ گمنامی میں پڑی تھی اور نثر لکھنے والوں کو
ابھی تک ادبی تاریخ میں کوئی بڑی جگہ نہیں مل سکی تھی"

زوال پذیر معاشرہ کے ادیب و شاعر، مسجع و مقفٰی عبارت لکھنا اور
اور محمد شاہی روش پر چلنا، فضل و کمال کے لیے ضروری سمجھتے تھے
مرزا رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب میں میر امنؔ کی نثر نگاری

اور زبان دانی کا جو مذاق اُڑایا ہے وہ اسی کی غمازی کرتا ہے۔ موجودہ زمانے کی طرح اس دور میں بھی ادبی سرمایہ داروں نے میر امّن جیسے مفلوک الحال، غریب الدیار اور کمپنی بہادر کے ملازم، پر کچھ لکھنا اپنے ادبی و علمی وقار کے منافی سمجھا ہوگا۔ بے مہریٔ زمانہ کا وہ خود شکار ہوگئے لیکن ان کے فن نے انھیں زندۂ جاوید بنا دیا۔ وہ دلّی والے تھے، ان کی زبان دلّی کی ٹکسالی زبان تھی، انھوں نے ہر حال میں اپنی زبان، کا لحاظ رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اُردوئے معلّٰی کو۔

"بے پیچ درکاؤ، جسے بادشاہ سے لے کر امراؤ اور ان کے ملازم بولتے ہیں۔" لکھنے میں کامیاب ہوئے یہ کام آسان نہ تھا؛ اردو نثر خاص و عام میں بولے جانے والے محاوروں سے خالی تھی۔ میر امّن کے سامنے عام فہم اور آسان اردو نثر کا کوئی نمونہ بھی نہیں تھا۔ یہ ان کی خداداد صلاحیت اور زبان پر قدرت تھی کہ وہ مروّجہ رنگین، دقیق زبان و اسلوب کے بجائے سادہ، سلیس زبان اور اسلوب لکھنے میں کامیاب ہوئے اور اپنی زبان دانی کی وجہ سے وہ یہ اوّلیت بھی حاصل کر سکے کہ "ہندیوں میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو زبان کے بننے اور اس کے نشو و نما کا حال لکھا ہے"۔[9]

لیکن یہ حال انھوں نے بزرگوں کے منھ سے سن کر لکھا، اور ابتدا سے لے کر اپنے زمانے تک، اردو کی تشکیل و ترقی، کو سیدھے سادے انداز اور عام بول چال میں بیان کیا۔ میر امّن کے الفاظ میں:

"حقیقت اردو زبان کی، بزرگوں کے منھ سے یوں سنی ہے کہ دلّی شہر ہندوؤں کے نزدیک چوجگی ہے۔ ان ہی کے راجا پرجا، قدیم سے وہاں رہتے تھے اور اپنی بھاکھا بولتے تھے۔ ہزار برس سے مسلمانوں کا یہ عمل ہوا۔۔۔ اس آمد و رفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی۔ جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدردانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سن کر، حضور میں آکر جمع ہوئے لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جُدی جُدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال و جواب کرتے۔ ایک زبان اُردو کی مقرر ہوئی۔۔۔ بارے: زبان اردو کی منجتے منجتے ایسی منجی کہ کسو شہر کی بولی اس سے ٹکر نہیں کھاتی"۔

میر امّن نے دلّی کی زبان اُردو، کو ہندستان کی زبان قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کا ملکوں میں رواج، کیسے ہوا؟

"سو اب خدا نے بعد مدّت کے جان گلکرسٹ صاحب سا دانا، نکتہ رس پیدا کیا کہ جنھوں نے اپنے گمان اور لگت سے اور تلاش و محنت سے قاعدوں کی کتابیں تصنیف کیں۔ اس سبب سے ہندستان کی زبان کا ملکوں میں رواج ہوا اور نئے سر سے رونق زیادہ ہوئی"۔[10]

اس بیان سے اگر ایک طرف میر امّن کی زبان دانی اور روزمرّہ دہلی میں آسان نثر لکھنے پر قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ تو دوسری طرف یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ سنہ ۱۸۰۰ء ہی میں، اُردو زبان، کا ملکوں میں رواج ہو گیا تھا۔

میر امّن کی زبان اُردوئے معلّٰی تھی، جس میں سادگی و سلاست کے ساتھ ساتھ روزمرّہ اور محاورہ کی چاشنی موجود ہے۔ تشبیہات و استعارات کا حسن استعمال ہے، حسبِ موقع مروّجہ ہندی کے الفاظ، فقروں اور کہاوتوں کے استعمال سے، عبارت کی دلکشی میں اضافہ ہوا ہے۔ عربی اور فارسی کے الفاظ بھی موقع و محل کے لحاظ سے استعمال کیے ہیں اس سے ان کے لسانی نظریہ کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اردو زبان میں دوسری زبانوں کے ایسے الفاظ جو عام فہم اور روزمرہ کی گفتگو میں داخل ہو چکے ہیں استعمال کرنا جائز سمجھتے تھے اور عربی یا فارسی یا کسی بھی زبان کے مشکل اور نامانوس الفاظ سے اُردو کو گراں بار بنانے کے خلاف تھے۔ ترجمے کے متعلق بھی ان کا نظریہ یہ تھا کہ لفظی ترجمہ سے عبارت کی روانی قائم نہیں رہ سکتی ہے۔ اسی لیے انھوں نے باغ و بہار اور گنج خوبی دونوں میں:

لفظی ترجمے کے بجائے معانی اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ عوام و خواص کی بول چال کی زبان کو استعمال کیا۔ اور اس کو معیاری قرار دیا۔ اُردو کو مفرس اور معرب بنانے سے پرہیز کیا اور آسان سے آسان زبان اور سیدھا سادا اسلوب اختیار کیا۔"

ان کی زبان اور ان کے اسلوب کے متعلق حامد حسن قادری لکھتے ہیں:

"دلّی کی زبان، اُردوئے معلّیٰ کے روزمرّہ اور محاورے، بیان کی دلکشی، فقروں کی شگفتگی، مکالموں کی دلفریبی، حسبِ موقع اختصار و تطویل، مناظر کی تصویر، یہ سب خوبیاں اس زمانے کے کسی مصنف میں ایسے کمال کے ساتھ یکجا نہیں ہیں۔"

میر امّن نے بڑی عمر پائی۔ دنیا کے نشیب و فراز دیکھے۔ دلّی کی چہل پہل اور رنگینی بھی دیکھی اور اس کی تباہی اور ویرانی بھی۔ وہ اپنے وسیع تجربے اور گہرے مشاہدے کی بدولت، معاشرے اور ماحول سے بخوبی واقف ہو گئے تھے۔ جزئیات پر ان کی نظر تھی، انسانی جذبات، احساسات اور خیالات کو بیان کرنے کی قدرت اور صلاحیت رکھتے تھے، چھوٹے سے چھوٹے اور معمولی سے معمولی واقعہ کی لفظوں میں ہو بہو تصویر کھینچنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ اور یہ ملکہ اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے، جب مصنف اظہارِ خیال پر قدرت، اور الفاظ کے حسنِ استعمال کا فن جانتا ہوں۔ میر امّن کی زبان صاف ستھری، نکھری اور رچی ہوئی ہے، انھوں نے ہر بات موقع محل کے اعتبار سے نپے تلے، سلیس اور سادہ الفاظ میں بیان کی ہے، جو عبارت کو سادگی، روانی، سلاست، آہنگ، ترنم، توازن اور تناسب عطا کرتی ہے اور دلوں کو متاثر و مبہوت کر دیتی ہے ان کا اسلوب دھیرے دھیرے بہنے والے دریا کی طرح رواں ہے کہیں کہیں انھوں نے عبارت کی سادگی اور روانی کی خاطر قواعد کے اصول بھی نظر انداز کر دیے ہیں لیکن اس سے عبارت کے حسن میں کمی ہونے کے بجائے اضافہ ہوا ہے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد میر امّن کی عبارت کے متعلق لکھتے ہیں:

"میر امّن کی عبارت میں ایک خلوص آہنگ ہے جسے موسیقیت یا وزن سے کوئی سروکار نہیں۔ جملوں کی ساخت ترتیب، اور حرکت میں باریکی، تناسب اور جاذبیت ہے گویا یہ ہلکی ہلکی چھوٹی بڑی موجوں کی طرح رواں ہیں ان میں ایک قسم کا بہاؤ ہے۔ میر امّن کی انشا اپنے حدود میں لاجواب ہے۔ ان کی انشا، اوسط انشا کا بہترین نمونہ ہے"

...میر امّن کی انشا میں ہمواری ہے لیکن یکسانی نہیں۔ وہ قصداً نئی نئی روشوں کا استعمال نہیں کرتے لیکن جو قصے وہ کہتے ہیں ان میں نت نئے نئے قسم کے واقعات ہوتے رہتے ہیں اس لیے غیر ارادی طور پر ان کی عبارت میں بھی ہلکا ہلکا تغیر ہوتا رہتا ہے ہلکے ہلکے رنگ کی آمیزش رہتی ہے۔ اس لیے یکسانی یا یک رنگی جاتی رہتی ہے لیکن اس کا عام رنگ قائم رہتا ہے"

میر امّن کی اہمیت اسی لیے ہے کہ انھوں نے ایک نئی زبان بنائی، اس کو استعمال کر کے ایسی نئی نثر ایجاد کی جس کے جملے مصری کی ڈلیاں ہیں۔ اور ایسا اسلوب اختیار بلکہ ایجاد کیا جو ابتدا میں عام فہم اور آسان ہوتے ہوئے بھی، اتنا مرغوب و پسندیدہ اور دلکش و دلآویز نہیں تھا۔ لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا، اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ میر امّن کی نثر آگے چل کر اتنی مقبول ہوئی کہ مرزا غالب کے خطوں کی اساس بنی۔

مرزا غالب کے بعد، سرسید تحریک نے اردو نثر کو بہت ترقی عطا کی۔ آسان اور عام فہم زبان و اسلوب نے مقبولیت حاصل کی۔ اب وہ شکوہ سخن وری کے منافی نہیں سمجھی جاتی تھی بلکہ عام و خاص سب اسی زبان و اسلوب کے دلدادہ ہو گئے تھے۔ مرزا غالب، ماسٹر رام چندر، سرسید احمد خاں، مولانا محمد حسین آزاد، ڈاکٹر نذیر احمد، مولانا ذکاء اللہ، حالی، شبلی، محسن الملک

وقار الملک، مولوی چراغ علی جیسے مشاہیر و محسنین ادب نے میر امن کی نثر کو زندہ جاوید بنا دیا۔

میر امن نے بہت سے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو اس زمانے میں تو رائج تھے لیکن اب متروک ہو چکے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، ہر ترقی پذیر، عوام سے رابطہ رکھنے والی اور ان کے خیالات کی ترجمانی کرنے والی زبان میں اس عہد کے الفاظ داخل ہوتے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ متروک ہوتے رہتے ہیں۔ میر امن کا یہ کمال ہے کہ ان کی نثر میں بیشتر الفاظ ایسے استعمال ہوئے ہیں جو متروک ہونے کے باوجود آج بھی سمجھے جاتے ہیں۔ اگر ان کی جگہ مروجہ الفاظ رکھ دیے جائیں تو عبارت کا حسن باقی نہیں رہے گا۔ میر امن کی زبان دانی اور قدرت بیان کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔؟

"مختصر یہ کہ میر امن، سادہ، عام فہم، زبان و اسلوب کے بانی ہیں۔"

۱-۲؎ گل کرسٹ اور اس کا عہد، صفحہ ۱۵۴-۱۵۳۔
۳-۴-۵؎ ذوق و جستجو صفحہ ۴۸۔
۶؎ مخطوطہ گنج خوبی بحوالہ ذوق و جستجو صفحہ ۵۸ خواجہ احمد فاروقی۔
۷؎ ذوق و جستجو۔ خواجہ احمد فاروقی صفحہ ۴۶
۸؎ مقدمات عبدالحق صفحہ ۲۳۶۔
۹؎ باغ و بہار۔ صفحہ ۱۴-۱۳۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔
۱۰؎ داستان تاریخ اردو۔ صفحہ ۸۴
۱۱؎ اردو زبان اور فن داستان گوئی۔ صفحہ ۱۵۶-۱۵۵،
۱۲؎ ذوق و جستجو۔ خواجہ احمد فاروقی۔ صفحہ ۴۹



حیات لکھنوی
امامیہ ہال، پنچکوئیاں روڈ
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

غزل

ایسا تو وقت مجھ پہ کبھی بھی پڑا نہ تھا
جیسے تمام شہر میں اک آشنا نہ تھا

یہ جانتا ہوں میں، مری آغوش کے سوا
ویرانیوں کے پاس کوئی راستہ نہ تھا

مل جل کے بیٹھنا بھی گوارا نہ تھا اسے
ترکِ تعلقات بھی وہ چاہتا نہ تھا

طوفاں کے تند جھونکوں نے شاخیں اجاڑ دیں
لیکن مرے شجر کا پرندہ اڑا نہ تھا

رقصاں رہی دلوں میں لبِ بام کی ہوس
کوئی بلندیوں سے ابھی تک گرا نہ تھا

ویران ایک شہر کا گوشہ ہوا فقط
تنہائیوں سے کوئی مگر گھر بچا نہ تھا

اب اس کے دل میں کچھ بھی رہا ہو مگر حیات
وہ شخص دیکھنے میں تو کوئی برا نہ تھا

ٹر عبدالاحد خان خلیل
ت اللہ روڈ - امین آباد
ھنؤ

ڈاکٹر وحید مرزا: کچھ یادیں کچھ باتیں

بیسویں صدی عیسوی کے ربع دوم وسوم میں جن طلبہ نیز ان کے والدین اور اساتذہ کا واسطہ لکھنؤ یونیورسٹی سے رہا ہے، اور جن کو عربی، فارسی نیز دیگر علوم میں تحقیق وتدوین اور ادبی کاوشوں سے دلچسپی رہی ہے، وہ ڈاکٹر وحید مرزا کی ذات سے بخوبی واقفیت رکھتے ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف ان کی عزت کرتے تھے اور عقیدت رکھتے تھے بلکہ ان کی شخصیت، شرافت، دقتِ نظر اور تبحر علمی سے مستفیض بھی ہوتے رہتے تھے۔ وہ طلبہ میں ہر دل عزیز تھے اور احباب میں باتوقیر، عمائدین یونیورسٹی میں محترم تھے اور اہالیانِ شہر میں معتمد۔ وہ بڑے خلیق وملنسار، سلیم الطبع وکثیر المشاغل، خوش اوقات ووسیع المطالعہ، نیک سیرت ومتین صورت، کم گو وگوشہ نشین، انیس الغربا وکفیل الطلبا، ہمدرد وغم گسار انسان تھے۔ وہ اپنے طلبہ کا بے حد خیال رکھتے تھے اور بعض اوقات اپنے حدود واختیارات سے باہر جاکر بھی ان کی مدد کے لیے آمادہ رہتے تھے۔ ان کا یہ طرز عمل صرف اپنے شاگردوں ہی کے لیے مخصوص نہیں تھا۔ بلکہ ہر اس شخص کے لیے جو کسی وسیلہ یا واسطہ سے ان سے متعارف ہوجاتا تھا، وہ ہمہ تن اعانت بن جاتے تھے۔ وہ چھوٹے بڑے، اچھے برے ہر نمونہ کے انسان کی پذیرائی نہایت وسیع القلبی اور کشادہ پیشانی سے کرتے تھے اور ہمیشہ ان کی دل جوئی اور ہمت افزائی کو اپنے فرائض منصبی میں شامل سمجھتے تھے بالخصوص وہ علم وادب سے دلچسپی رکھنے والوں سے بڑے اخلاص اور محبت سے پیش آتے تھے اور دامے، درمے، قدمے، سخنے ایسی مدد کرتے تھے کہ جس کو کبھی کوئی باشعور اور غیرت مند انسان فراموش نہیں کرسکتا تھا۔

بعض اوقات ایسے غیر متعلق لوگ بھی ان سے ملنے آجاتے تھے کہ جن کو محض مالی امداد کی ضرورت ہوتی تھی۔ وہ خاموشی سے ان کے دکھ درد کی روداد سنتے رہتے اور بالآخر کچھ نہ کچھ امداد کرکے ان کو رخصت کرتے۔ ضرورت مند طلبہ اور ان کے شعبہ کے ممبران بھی اکثر ان سے مالی امداد کے طالب ہوجاتے تھے اور وہ بڑی خندہ پیشانی سے قرض حسنہ کی صورت میں ان کی مدد کرتے تھے۔

جب کبھی کوئی ڈاکٹر صاحب سے ملنے ان کی کوٹھی پر جاتا، وہ فوراً موسم کے لحاظ سے پتلون اور قمیض یا کوٹ پتلون میں ملبوس اپنے مطالعہ کے کمرے سے ڈرائنگ روم یا کوٹھی کے برآمدے میں نکل آتے تھے اور آنے والے کی خاطر مدارات نیز اپنے مشغلہ کے لیے سگریٹ کا ڈبہ مع دیا سلائی یا لائٹر ساتھ لیتے آتے تھے۔ پوری توجہ سے آنے والے کی باتیں سنتے تھے اور امکانی امداد سے کبھی گریز نہیں کرتے تھے۔

دنیا سرائے فانی ہے اور ہر چیز یہاں کی آنی جانی۔ مشیت ایزدی میں کس کو دخل ہوسکتا ہے۔ چنانچہ ۱۱ر ستمبر ۱۹۷۶ء کو یہ اطلاع لکھنؤ پہنچی کہ بتاریخ ۵ر ستمبر بروز اتوار (۹ر رمضان المبارک ۱۳۹۶ھ) ڈاکٹر وحید مرزا کا لاہور میں انتقال ہوگیا۔ ڈاکٹر وحید مرزا یکم جنوری ۱۸۹۸ء کو پیدا ہوئے تھے اور انتقال کے وقت ان کی عمر ۸۰ سال تھی۔ ان کے بڑے بھائی مرزا محمد سعید صاحب نیز دیگر اعزا زیادہ تر دہلی میں رہتے تھے۔ لیکن ان کی طالب علمی کا زمانہ بیشتر لاہور میں گزرا۔ ان کو لاہور سے خاص مناسبت تھی اور وہیں کی خاک نے ۱۹۷۶ء میں ان کو آغوش تمنا

میں لیے لاہور ہی میں ان کی ذہنی تربیت ایسے علمی و ادبی ماحول میں ہوئی تھی کہ جس میں سید اولاد حسین شاداں بلگرامی، ظفر علی خاں، ڈاکٹر اقبال، حافظ محمود شیرانی اور پروفیسر محمد شفیع جیسی ممتاز ادبی شخصیتیں اپنے کارناموں کی بدولت شہرۂ آفاق تھیں۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد ۱۹۲۵ء میں ڈاکٹر وحید مرزا لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں تشریف لے آئے۔ یہیں سے ۱۹۲۶ء میں دو سال کے لیے وہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے اسکالر شپ پر پی ایچ۔ ڈی کے لیے "امیر خسرو ۔ حیات و تصانیف" کے موضوع پر انگریزی میں تحقیقی مقالہ لکھنے لندن گئے۔ وہاں انھوں نے عربی و فارسی کے مشہور محقق سر ڈینی سن راس (SIR E. DENISON ROSS) کی نگرانی میں اپنا کام مکمل کیا اور ۱۹۲۹ء میں لکھنؤ واپس آگئے۔ یہ مقالہ حضرت امیر خسرو پر پہلا تحقیقی و معیاری مقالہ ہونے کے لحاظ سے بے حد مقبول ہوا۔ اور آج بھی اپنی کاوش اور دقت نظر، نکتہ رسی اور تحقیقی حواشی کے اعتبار سے مثالی اور خزینۂ معلومات ہے۔ لندن یونیورسٹی سے جب ڈاکٹر وحید مرزا پی ایچ ڈی کرکے واپس آئے تو اس زمانہ میں لکھنؤ یونیورسٹی میں ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی عربی کے پروفیسر تھے۔ لیکن ان کو کلکتہ یونیورسٹی میں جگہ مل گئی اور وہ کلکتہ چلے گئے۔ چنانچہ ڈاکٹر وحید مرزا لکھنؤ یونیورسٹی میں صدر شعبۂ عربی ہو گئے اور ۱۹۵۳ء میں ڈاکٹر آئیر وائس چانسلر کے زمانہ میں پروفیسر بنا دیے گئے۔ وہ یکم مئی ۱۹۵۷ء تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ آخر زمانہ میں لکھنؤ یونیورسٹی کی فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین بھی ہو گئے تھے اور بڑی خوش اسلوبی سے اس منصب کے فرائض کو انجام دیتے رہے تھے۔

ڈاکٹر وحید مرزا نے علوم مشرقیہ میں تحقیق و تدوین کا ذوق لاہور کے علمی و ادبی ماحول میں حاصل کیا تھا اور اس سلسلہ میں مزید تجربہ و بصیرت لندن یونیورسٹی میں تحقیقی کام کرکے حاصل کی تھی۔ لندن میں قیام کے زمانہ میں ان کے دانتوں میں کچھ تکلیف ہو گئی تھی جس کی وجہ سے ڈاکٹروں کے مشورہ پر انھوں نے اپنے سب دانت نکلوا دیے تھے۔ لیکن مصنوعی دانت کبھی نہیں لگوائے، نہ لندن میں اور نہ ہندوستان آکر۔ لیکن ان کا کہنا تھا کہ کھانے پینے میں ان کو کسی قسم کی تکلیف محسوس نہیں ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ مسوڑھوں سے چنے چبا لیتے ہیں اور گنا چوس کر کھا لیتے ہیں۔ وہ بہت کم سخن اور منکسر المزاج انسان تھے اور بے تکلف صحبتوں میں بھی کبھی اپنے کمالات کا اظہار کرنا یا اپنی قابلیت کا رعب جمانا پسند نہیں کرتے تھے۔ بالعموم ان کا طریق کار یہ ہوتا تھا کہ ادبی صحبتوں یا دیگر محفلوں میں لوگ باتیں کرتے رہتے تھے اور وہ صرف سننے پر اکتفا کرتے تھے۔ بے ضرورت لب کشائی ان کی عادت ہی نہ تھی اور کسی کی دل آزاری کرنا وہ جانتے ہی نہ تھے۔

علمی و ادبی نیز تحقیقی موضوعات پر ڈاکٹر وحید مرزا کے نقد و نظر کی اہمیت کا معترف ہر اہل علم کو ہونا پڑتا تھا۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن رسالہ 'معارف' اعظم گڑھ (نومبر ۱۹۷۶ء) میں لکھتے ہیں کہ "مئی ۱۹۳۵ء کے اورینٹل کالج میگزین میں مظہر کڑہ مانک پوری پر ایک بحث چھڑ گئی۔ اس میں محمود شیرانی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے ساتھ ڈاکٹر وحید مرزا نے بھی حصہ لیا تھا۔ ان کا مضمون بڑے شوق سے علمی حلقہ میں پڑھا گیا۔ ۱۹۶۰ء میں دارالمصنفین سے "ہندوستان عربوں کی نظر میں" نکلی تھی تو اس کی پہلی جلد پر ڈاکٹر صاحب نے حیدرآباد کے 'اسلامک کلچر' میں ایک طویل ریویو لکھا تھا۔ اس میں ترجموں کے تسامحات کی نشان دہی فاضلانہ انداز میں کی تھی۔ جن کو دارالمصنفین میں تسلیم کیا گیا۔" ڈاکٹر وحید مرزا کی تنقید نہایت متوازن اور ان کے تبصرے نہایت منصفانہ اور بے لاگ ہوتے تھے اور لکھنؤ کے ادبی حلقے ان کو نہایت احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ۱۹۳۵ء کا واقعہ ہے کہ جب پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب اور سید محمد احمد بیخود موہانی میں کچھ ادبی بحثیں چلیں، ڈاکٹر وحید مرزا نے بھی ان میں دلچسپی لی اور بیخود موہانی کی تصنیف 'جوہر آئینہ'، پر انگریزی میں نہایت فاضلانہ تبصرہ

ـ اور کوشش اس بات کی پیش نظر رہی کہ دونوں ادیبوں کے ملق غلط فہمیاں دور ہو جائیں اور اہل ذوق ان ادبی موشگافیو ہ بینیوں، نکتہ چینیوں اور معنی آفرینیوں سے پوری طرح مستفیض ہکیں اور صحیح نتائج نکال سکیں کہ جو ان ہر دو حضرات کی عالمانہ ں میں زیر تبصرہ آئی ہیں۔ ڈاکٹر وحید مرزا کی رائے ہمیشہ بہت لم اور مستند ہوتی تھی اور مسلک ہمیشہ صلح کل اور مرنجان مرنج رہتا تھا۔

لکھنؤ یونیورسٹی کا شعبہ علوم مشرقیہ جو ہمیشہ سے غیر معمولی یت کا حامل رہا ہے اور جس کے زیر اہتمام عربی و فارسی علوم کی م اور متعدد ادبی و مذہبی امتحانات ہوتے ہیں ڈاکٹر وحید مرزا ہی زیر سرپرستی ترقی و توسیع کے مدارج طے کرتا رہا۔ یونیورسٹی ـ سالانہ جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر اس فیکلٹی کے امتحانات ی اسناد کے اعلان اور تقسیم کا کام ڈاکٹر صاحب موصوف ہی انجام یتے تھے۔ لکھنؤ کے تمام عربی و فارسی بالخصوص دینی مدارس سے اکٹر وحید مرزا کا بہت قریبی تعلق رہتا تھا۔ اور سب اساتذہ رام ان کے نظم و ضبط اور تبحر علمی کے معترف تھے۔ جولائی ۱۹۳۳ء ں کالون تعلقدار انٹر کالج لکھنؤ میں میرا تقرر بحیثیت لکچرر معبہ فارسی و اردو ہوا اور میں لکھنؤ آیا۔ اسی زمانہ میں میری ملاقات ڈاکٹر وحید مرزا سے ہوئی۔ ان کے صاحبزادے طاہر مرزا اور ان کے بھتیجے محمد وسیم وہاں زیر تعلیم تھے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کو اپنے بچوں کی تعلیم سے خاص دلچسپی تھی اور اکثر میری ملاقات ان سے ہوتی رہتی تھی۔ کبھی کالون کالج کی سالانہ تقاریب میں اور کبھی ان کی کوٹھی پر جو کالون کالج کے قریب ہی نیو حیدرآباد میں واقع تھی۔ اس کوٹھی کو ڈاکٹر صاحب نے بڑے شوق اور اہتمام سے تعمیر کرایا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے بقول ڈاکٹر صمدی رڑکی انجینیرنگ کالج میں بھی کچھ دن تعلیم پائی تھی اور فن تعمیر سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ ڈاکٹر وحید مرزا کی پہلی شادی مولوی رضا اللہ خاں مرحوم کی صاحبزادی سے ہوئی تھی جو شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ کے صاحبزادے تھے اور اردو کے مشہور مترجم مولوی عنایت اللہ کے چھوٹے بھائی تھے۔ مولوی رضا اللہ ایک کامل فن انجینیر تھے اور محکمۂ انجینیرنگ سے ریٹائر ہو کر مستقل طور پر دہرہ دون میں مقیم تھے۔ ڈاکٹر وحید مرزا نے نیو حیدرآباد لکھنؤ میں یہ کوٹھی ان ہی کے مشورہ سے بنائی تھی جو فن تعمیر کا ایک دلکش نمونہ تھی۔

ڈاکٹر وحید مرزا کی پہلی بیوی یعنی رضا اللہ خاں کی صاحبزادی کا انتقال ۱۹۴۱ء میں ہو گیا تھا جس کا صدمہ ایک عرصہ تک ان کو نہایت سخت رہا اور انھوں نے دوسری شادی نہیں کی۔ اس وقت ان کے صاحبزادے طاہر مرزا کی عمر تین چار سال تھی۔ سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب سے ڈاکٹر وحید مرزا کی پہلی ملاقات دہرہ دون میں ۱۹۴۱ء میں ہوئی تھی۔ دونوں بھائیوں یعنی رضا اللہ خاں اور عنایت اللہ خاں کے بنگلے دہرہ دون میں قریب ہی قریب تھے اور سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب، بڑے بھائی یعنی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے دارالترجمہ کے ناظم عنایت اللہ صاحب کے مہمان تھے۔ ڈاکٹر وحید مرزا صاحب بیوی کے انتقال کے بعد گرمیوں کی یونیورسٹی تعطیلات کے زمانہ میں مع طاہر مرزا کے رضا اللہ خاں کے یہاں قیام پذیر تھے۔ صباح الدین عبدالرحمن صاحب لکھتے ہیں (معارف۔ اعظم گڈھ۔ نومبر ۱۹۷۵ء):-

"ان کا لڑکا طاہر مرزا شاید تین چار برس کا رہا ہوگا۔ اس سے دل بہلاتے رہتے اور اس کی ہر طرح کی ناز برداری کرنے ہی میں ان کو لذت ملتی۔ وہ ان کو چھیڑتا، تنگ کرتا، ان کا ہاتھ پکڑ کر برآمدہ سے کمرہ اور کمرہ سے باہر لیجاتا۔ وہ اس کے حکم کی تعمیل کرتے رہتے۔ جتنے دنوں ان کا ساتھ رہا یہی تماشہ دیکھنے میں آیا۔ اس سے ان کی شرافت نفس کا گہرا نقش دل میں برابر قائم رہا۔" دوران قیام دہرہ دون صباح الدین عبدالرحمن صاحب نے انگریزی میں ترجمہ کئے ہوئے اپنے کچھ مضامین ڈاکٹر وحید مرزا کو دیکھنے کے لیے دیے۔ ڈاکٹر صاحب نے جو اصلاح و ترمیم ان ترجموں میں کی اس سے وہ ان کی قابلیت سے بیحد متاثر ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ ڈاکٹر وحید مرزا کو عربی، فارسی، انگریزی اور اردو پر بڑی قدرت حاصل تھی اور عنایت اللہ صاحب ناظم دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد بھی ان کی قابلیت کے معترف تھے۔

ڈاکٹر وحید مرزا کی دوسری شادی سہارن پور کے نواب عادل خاں کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ ان سے ڈاکٹر صاحب کے چار فرزند اور ایک دختر تھی۔ یہ چاروں فرزند خالد، شاہد، عابد اور زاہد کالون تعلقدارس کالج میں پڑھتے تھے اور اس سلسلہ میں میری ملاقات اکثر ڈاکٹر صاحب سے ہو جایا کرتی تھی۔ ۱۹۵۲ء میں کالون کالج سے میں لکھنو یونیورسٹی کے شعبہ فارسی و اردو میں لکچرر ہو کر آ گیا اور ڈاکٹر صاحب سے مزید تقرب کا موقع حاصل ہو گیا۔ شعبہ فارسی و اردو جس کے صدر پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب تھے، شعبہ عربی سے بالکل قریب ہی واقع تھا اور تقریباً روزانہ ہی ان سے ملاقات کی صورت ہو جایا کرتی تھی۔

ڈاکٹر وحید مرزا کی تصانیف اور تحقیقی کاموں کے سلسلہ میں۔ "لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو" یعنی "امیر خسرو: حیات اور تصانیف" کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ انگریزی مقالہ ۱۹۲۹ء میں تیار ہو گیا تھا اور وحید مرزا کو اس پر لندن یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری بھی مل گئی تھی۔ لیکن مختلف دشواریوں بالخصوص مالی مشکلات کی وجہ سے ایک عرصہ تک شائع نہیں ہو سکا (مقدمہ مقالہ۔ ڈاکٹر وحید مرزا) بالآخر پنجاب یونیورسٹی کے پروفیسر محمد شفیع کی کوشش سے اور ممبران کمیٹی کی توجہ اس کی اہمیت کی طرف مبذول کرانے پر پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل پبلی کیشنز فنڈ کمیٹی نے اس کی طباعت و اشاعت کے اخراجات اپنے ذمہ لینا منظور کر لیا اور ۱۹۳۵ء میں کلکتہ کے بیپٹسٹ مشن پریس سے ۲۶۲ صفحات پر مشتمل شایع کر دیا گیا۔ اس زمانہ میں ڈاکٹر وحید مرزا شعبہ عربی، لکھنو یونیورسٹی میں صدر شعبہ اور ریڈر تھے۔

اس مقالہ کے بغور پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر وحید مرزا نے امیر خسرو کی زندگی اور تصانیف کا مطالعہ بڑی عقیدت، لگن، دقت نظر اور سائنٹفک انداز میں کیا تھا۔ بہت سے تاریخی واقعات خود امیر خسرو کی تصانیف سے اخذ کر کے داخلی شہادتوں کے ساتھ پوری احتیاط اور سیاق و سباق کے حوالوں کی مدد سے پیش کیے تھے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ۱۲۲ انگریزی اور فارسی مطبوعہ و قلمی کتابوں کا بالتفصیل مطالعہ کر کے مواد فراہم کیا تھا۔ ان کتابوں اور مخطوطات کی فہرست مقالہ کے آخر میں 'کتابیات' کے زیر عنوان دے دی گئی ہے اور مقالہ کے متن میں فٹ نوٹس کی صورت میں جا بجا اقتباسات اور ان کے حوالے دے دیے گئے ہیں۔ تحقیق و تنقید اور اخذ نتائج کا جو معیار ڈاکٹر صاحب نے اس مقالہ میں قائم کیا ہے اور از اول تا آخر برقرار رکھا ہے وہ نہایت بلند، قابل رشک اور مثالی ہے۔ اور تحقیق و تدوین کا کام کرنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ بہت مفید، مشعل راہ اور بصیرت افروز ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ مقالہ خسرو شناسی کی لازوال یادگار ہے اور ادبی کاوش اور چھان بین کا بہترین نمونہ۔ وہ کوئی بات بغیر ناقابل تردید ثبوت اور وثوق کے قلم بند نہیں کرتے اور معتبر حوالے دے کر تحقیق کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ امیر خسرو پر ڈاکٹر وحید مرزا کے اس تحقیقی مقالہ کے متعلق سید صباح الدین عبدالرحمٰن ۱۹۶۶ء میں فرماتے ہیں کہ ۱۹۴۲ء میں وحید مرزا کی یہ کتاب پڑھ کر جو لذت ملی وہی ۱۹۶۶ء میں بھی پاتا ہوں۔ گویا اس موضوع پر اب تک اس سے بہتر کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔ سید صاحب کے الفاظ ہیں کہ "اپنی علمی اور ادبی زندگی میں مجھ کو امیر خسرو سے لگاؤ نہیں بلکہ عشق ہو گیا ہے جس کو سب سے پہلے علامہ شبلی کے ذریعہ سمجھا، مگر اس ذوق کی شراب کو دو آتشہ ڈاکٹر وحید مرزا کی کتاب نے بنایا۔ علامہ شبلی نے امیر خسرو سے متعلق اپنی شعر العجم میں جو لکھا ہے اس کے ایجاز کا اطناب ڈاکٹر صاحب کی تصنیف ہے۔ اگر علامہ شبلی بقید حیات ہوتے تو اس اطناب کی داد دل کھول کر دیتے۔ اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ امیر خسرو پر جو کچھ لکھا گیا تھا وہ اس میں ہے۔ جو کچھ نہیں لکھا گیا ہے وہ بھی اس میں ہے۔ اور جو کچھ آگے چل کر لکھا جائے گا وہ بھی اس میں ہے" (معارف۔ نومبر ۱۹۶۶ء) ڈاکٹر

بدمرزا کی خسرو شناسی سے متاثر ہو کر ہندوستانی اکیڈیمی
پی۔ الہ آباد نے ۱۹۴۴ء میں فرمائش کی کہ وہ "امیر خسرو" پر
ومیں ایک کتاب لکھ دیں۔ ڈاکٹر صاحب کو پہلے تو اسی موضوع
وبارہ قلم اٹھانے میں تکلف ہوا، لیکن پھر اس خیال سے کہ
اکیں ہندوستانی اکیڈمی کا پاس خاطر منظور تھا، نیز یہ کہ
ی انگریزی تصنیف تک بعض اہل ذوق کی رسائی نہیں
سکتی تھی، علاوہ ازیں اب تک جو تصانیف اردو میں اس
نوع پر موجود تھیں ان کے قابل قدر ہونے کے باوجود ان میں
ن واقعات کے بیان کرنے میں نادانستہ طور پر سہو ہو گیا تھا،
کٹر صاحب نے امیر خسرو پر حسب فرمائش کتاب لکھنا
روع کر دی اور ۱۹۴۵ء میں مکمل کر کے ہندوستانی اکیڈمی
آباد کے حوالے کر دی جو ۱۹۴۹ء میں اردو ٹائپ میں طبع
اکے شایع کر دی گئی اور بے حد مقبول ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب کے اس اردو 'امیر خسرو' اور ۱۹۳۵ء کے مطبوعہ
نگریزی مقالہ کی ترتیب و تدوین اور انداز فکر و طرز استدلال
میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ انگریزی مقالہ اصول و روایات
تحقیق و تقدیر نیز تفصیلات و حواشی کے لحاظ سے فن تحقیق
بے مثال ہے۔ اور اردو تصنیف جس میں "طوطی ہند حضرت
امیر خسرو دہلوی کے حالات زندگی اور ان کی تصانیف پر
ایک تنقیدی نظر" ڈالی گئی ہے، تفصیلات کو نظر انداز کرتے
ہوئے ڈاکٹر صاحب کی تحقیق و ماحصل کا ایک دلکش و دل پذیر
نتیجہ اور خلاصہ ہے۔ انھوں نے عہد امیر خسرو سے تعلق رکھنے
والے سب واقعات اس اردو ایڈیشن میں شامل رکھے ہیں
اور غلط فہمیوں کی مدلل انداز میں تردید و تصحیح کر دی ہے۔
امیر خسرو جیسے ہزار شیوہ، انسان کے سوانح اور تخلیقات
کی تفصیلات نہایت اختصار و جامعیت کے ساتھ بیان کر دی
ہیں اور اس کا التزام رکھا ہے کہ ان کی زندگی کا کوئی پہلو
بے التفاتی کا شکار نہ ہو جائے۔ امیر خسرو کی درباری اور عوامی
شاعری، امیری، یعنی فوجی خدمات اور تصوف و ولایت، حضرت
نظام الدین اولیا سے روابط و عقیدت سب کا کافی تفصیل سے
ذکر کیا ہے اور ان اسباب و علل نیز عناصر پر بھی روشنی ڈالی
ہے کہ جو امیر خسرو کو مقبول خاص و عام اور مقرب شاہ و گدا
بنانے میں کارفرما اور اہمیت کے حامل تھے۔ امیر خسرو کی ظرافت
طبع، حاضر جوابی غیر معمولی ذہانت اور قوت مطابقت و پذیرائی
کی نشان دہی کرتے ہوئے انھوں نے بتایا ہے کہ یہی وہ خصوصیات
و عناصر ہیں کہ جن کی بدولت وہ جس محفل میں جاتے تھے جان
محفل کہلاتے تھے اور جس دربار یا مجلس میں بیٹھتے تھے مرکز نگر
و نظر بن جاتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا کہ "سوائے شیخ
سعدی کے اور کوئی فارسی شاعر ایسا نہیں گزرا جس نے
خسرو کی طرح عوام کے دلوں میں گھر کر لیا ہو اور جس کا نام بچے
بچے کی زبان پر ہو" ایک حقیقت اور آفاقی صداقت ہے۔ اردو
'امیر خسرو' مطبوعہ الہ آباد ۱۹۴۹ء کے متعلق اس کے دیباچہ
میں خود ڈاکٹر وحید مرزا لکھتے ہیں:

"یہ ظاہر ہے کہ اس کتاب کی تالیف میں میں نے اپنی انگریزی
تصنیف سے بہت کچھ مدد لی ہے۔ لیکن اسے انگریزی تصنیف کا
ایک روکھا پھیکا ترجمہ نہ سمجھنا چاہیے۔ واقعات و حقائق زیادہ تر
وہی ہیں، لیکن ترتیب اور اسلوب یہاں جداگانہ ہے۔ تاریخی
واقعات کے بیان کرنے میں زیادہ اختصار سے کام لیا گیا ہے۔
اور خسرو کے منثور و منظوم کلام کے نمونے زیادہ دیے گئے ہیں۔
انگریزی تصنیف کے متن اور حاشیے میں جو باتیں براہ راست
خسرو سے متعلق نہ تھیں انھیں زیادہ تر کتاب میں حذف کر دیا
گیا ہے۔ لیکن یہ التزام رکھا ہے کہ کوئی ضروری بات نہ رہ جائے۔
غرض یہ کہ اختصار کے ساتھ جامعیت کو نباہنے کی کوشش
کی گئی ہے۔"

ڈاکٹر وحید مرزا کا انداز بیان اور اسلوب نثر نگاری نہایت سادہ
سلیس اور رواں ہے۔ کہیں کہیں شگفتہ مرصع اور دلکش بھی
ہو گیا ہے۔ دیباچہ 'امیر خسرو' سے اقتباس ملاحظہ ہو:-

"انگریزی کی ایک مثل کے مطابق یہ صحیح ہے کہ تنوع کمال کا

ڈاکٹر وحید مرزا کی دوسری شادی سہارن پور کے نواب عادل خاں کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ ان سے ڈاکٹر صاحب کے چار فرزند اور ایک دختر تھی۔ یہ چاروں فرزند خالد، شاہد، عابد اور زاہد کالون تعلقدارس کالج میں پڑھتے تھے اور اسی سلسلہ میں میری ملاقات اکثر ڈاکٹر صاحب سے ہو جایا کرتی تھی۔ ۱۹۵۲ء میں کالون کالج سے میں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ فارسی و اردو میں لکچرر ہو کر آ گیا اور ڈاکٹر صاحب سے مزید تقرب کا موقع حاصل ہو گیا۔ شعبہ فارسی و اردو جس کے صدر پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب تھے، شعبہ عربی سے بالکل قریب ہی واقع تھا اور تقریباً روزانہ ہی ان سے ملاقات کی صورت ہو جایا کرتی تھی۔

ڈاکٹر وحید مرزا کی تصانیف اور تحقیقی کاموں کے سلسلہ میں۔ "لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو"، یعنی "امیر خسرو: حیات اور تصانیف" کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ انگریزی مقالہ ۱۹۲۹ء میں تیار ہو گیا تھا اور وحید مرزا کو اس پر لندن یونیورسٹی سے پی ایچ، ڈی کی ڈگری بھی مل گئی تھی۔ لیکن مختلف دشواریوں بالخصوص مالی مشکلات کی وجہ سے ایک عرصہ تک شائع نہیں ہو سکا (مقدمہ مقالہ۔ ڈاکٹر وحید مرزا) بالآخر پنجاب یونیورسٹی کے پروفیسر محمد شفیع کی کوشش سے اور ممبران کمیٹی کی توجہ اس کی اہمیت کی طرف مبذول کرانے پر پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل پبلی کیشنز فنڈ کمیٹی نے اس کی طباعت و اشاعت کے اخراجات اپنے ذمہ لینا منظور کر لیا اور ۱۹۳۵ء میں کلکتہ کے بیپٹسٹ مشن پریس سے ۲۶۲ صفحات پر مشتمل شائع کر دیا گیا۔ اس زمانہ میں ڈاکٹر وحید مرزا شعبۂ عربی، لکھنؤ یونیورسٹی میں صدر شعبہ اور ریڈر تھے۔

اس مقالہ کے بغور پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر وحید مرزا نے امیر خسرو کی زندگی اور تصانیف کا مطالعہ بڑی عقیدت، لگن، دقت نظر اور سائنٹفک انداز میں کیا تھا۔ بہت سے تاریخی واقعات خود امیر خسرو کی تصانیف سے اخذ کر کے داخلی شہادتوں کے ساتھ پوری احتیاط اور سیاق و سباق کے حوالوں کی مدد سے پیش کیے تھے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ۱۲۲ انگریزی اور فارسی مطبوعہ و قلمی کتابوں کا بالتفصیل مطالعہ کر کے مواد فراہم کیا تھا۔ ان کتابوں اور مخطوطات کی فہرست مقالہ کے آخر میں 'کتابیات' کے زیر عنوان دے دی گئی ہے اور مقالہ کے متن میں فٹ نوٹس کی صورت میں جا بجا اقتباسات اور ان کے حوالے دے دیے گئے ہیں۔ تحقیق و تنقید اور اخذ نتائج کا جو معیار ڈاکٹر صاحب نے اس مقالہ میں قائم کیا ہے اور از اول تا آخر برقرار رکھا ہے وہ نہایت بلند، قابل رشک اور مثالی ہے۔ اور تحقیق و تدوین کا کام کرنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ بہت مفید، مشعل راہ اور بصیرت افروز ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ مقالہ خسرو شناسی کی لازوال یادگار ہے اور ادبی کاوش اور چھان بین کا بہترین نمونہ۔ وہ کوئی بات بغیر ناقابل تردید ثبوت اور وثوق کے قلم بند نہیں کرتے اور معتبر حوالے دے کر تحقیق کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ امیر خسرو پر ڈاکٹر وحید مرزا کے اس تحقیقی مقالہ کے متعلق سید صباح الدین عبدالرحمن ۱۹۶۶ء میں فرماتے ہیں کہ ۱۹۴۲ء میں وحید مرزا کی یہ کتاب پڑھ کر جو لذت ملی وہی ۱۹۶۶ء میں بھی پاتا ہوں۔ گویا اس موضوع پر اب تک اس سے بہتر کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔ سید صاحب کے الفاظ ہیں کہ "اپنی علمی اور ادبی زندگی میں مجھ کو امیر خسرو سے لگاؤ نہیں بلکہ عشق ہو گیا ہے جن کو سب سے پہلے علامہ شبلی کے ذریعہ سمجھا، مگر اس ذوق کی شراب کو دو آتشہ ڈاکٹر وحید مرزا کی کتاب نے بنایا۔ علامہ شبلی نے امیر خسرو سے متعلق اپنی شعر العجم میں جو لکھا ہے اس کے ایجاز کا اطناب ڈاکٹر صاحب کی تصنیف ہے۔ اگر علامہ شبلی بقید حیات ہوتے تو اس اطناب کی داد دل کھول کر دیتے۔ اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ امیر خسرو پر جو کچھ لکھا گیا تھا وہ اس میں ہے۔ جو کچھ نہیں لکھا گیا ہے وہ بھی اس میں ہے۔ اور جو کچھ آگے چل کر لکھا جائے گا وہ بھی اس میں ہے" (معارف۔ نومبر ۱۹۶۶ء) ڈاکٹر

رزا کی خسرو شناسی سے متاثر ہو کر ہندوستانی اکیڈیمی
) - الہ آباد نے ۱۹۴۴ء میں فرمائش کی کہ وہ "امیر خسرو" پر
یں ایک کتاب لکھ دیں۔ ڈاکٹر صاحب کو پہلے تو اسی موضوع
بارہ قلم اٹھانے میں تکلف ہوا، لیکن پھر اس خیال سے کہ
ین ہندوستانی اکیڈمی کا پاس خاطر منظور تھا، نیز یہ کہ
) انگریزی تصنیف تک بعض اہل ذوق کی رسائی نہیں
لتی تھی، علاوہ ازیں اب تک جو تصانیف اردو میں اس
ع پر موجود تھیں ان کے قابل قدر ہونے کے باوجود ان میں
، واقعات کے بیان کرنے میں نادانستہ طور پر سہو ہو گیا تھا،
ڑ صاحب نے امیر خسرو پر حسب فرمائش کتاب لکھنا
وع کر دی اور ۱۹۴۵ء میں مکمل کر کے ہندوستانی اکیڈمی
آباد کے حوالے کر دی جو ۱۹۴۹ء میں اردو ٹائپ میں طبع
اکے شایع کر دی گئی اور بے حد مقبول ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب کے اس اردو 'امیر خسرو' اور ۱۹۳۵ء کے مطبوعہ
نگریزی مقالہ کی ترتیب و تدوین اور انداز فکر و طرز استدلال
ں زمین آسمان کا فرق ہے۔ انگریزی مقالہ اصول و روایات
تحقیق و تقدیر نیز تفصیلات و حواشی کے لحاظ سے فی الحقیقت
بے مثال ہے۔ اور اردو تصنیف جس میں "طوطی ہند حضرت
امیر خسرو دہلوی کے حالات زندگی اور ان کی تصانیف پر
ایک تنقیدی نظر" ڈالی گئی ہے، تفصیلات کو نظر انداز کرتے
ہوئے ڈاکٹر صاحب کی تحقیق و ماحصل کا ایک دلکش و دل پذیر
نتیجہ اور خلاصہ ہے۔ انھوں نے عہد امیر خسرو سے تعلق رکھنے
والے سب واقعات اس اردو ایڈیشن میں شامل رکھے ہیں
اور غلط فہمیوں کی مدلل انداز میں تردید و تصحیح کر دی ہے۔
امیر خسرو جیسے ہزار شیوہ، انسان کے سوانح اور تخلیقات
کی تفصیلات نہایت اختصار و جامعیت کے ساتھ بیان کر دی
ہیں اور اس کا التزام رکھا ہے کہ ان کی زندگی کا کوئی پہلو
بے التفاتی کا شکار نہ ہو جائے۔ امیر خسرو کی درباری اور عوامی
شاعری، امیری، یعنی فوجی خدمات اور تصوف و ولایت، حضرت
نظام الدین اولیا سے روابط و عقیدت سب کا کافی تفصیل سے
ذکر کیا ہے اور ان اسباب و علل نیز عناصر پر بھی روشنی ڈالی
ہے کہ جو امیر خسرو کو مقبول خاص و عام اور مقرب شاہ و گدا
بنانے میں کارفرما اور اہمیت کے حامل تھے۔ امیر خسرو کی ظرافت
طبع، حاضر جوابی غیر معمولی ذہانت اور قوت مطابقت و پذیرائی
کی نشان دہی کرتے ہوئے انھوں نے بتایا ہے کہ یہی وہ خصوصیات
و عناصر ہیں کہ جن کی بدولت وہ جس محفل میں جاتے تھے جان
محفل کہلاتے تھے اور جس دربار یا مجلس میں بیٹھتے تھے مرکز فکر
و نظر بن جاتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا کہ "سوائے شیخ
سعدی کے اور کوئی فارسی شاعر ایسا نہیں گزرا جس نے
خسرو کی طرح عوام کے دلوں میں گھر کر لیا ہو اور جس کا نام بچے
بچے کی زبان پر ہو" ایک حقیقت اور آفاقی صداقت ہے۔ اردو
'امیر خسرو' مطبوعہ الہ آباد ۱۹۴۹ء کے متعلق اس کے دیباچہ
میں خود ڈاکٹر وحید مرزا لکھتے ہیں:

"یہ ظاہر ہے کہ اس کتاب کی تالیف میں میں نے اپنی انگریزی
تصنیف سے بہت کچھ مدد لی ہے۔ لیکن اسے انگریزی تصنیف کا
ایک روکھا پھیکا ترجمہ نہ سمجھنا چاہیے۔ واقعات و حقائق زیادہ تر
وہی ہیں، لیکن ترتیب اور اسلوب بیان جداگانہ ہے۔ تاریخی
واقعات کے بیان کرنے میں زیادہ اختصار سے کام لیا گیا ہے۔
اور خسرو کے منثور و منظوم کلام کے نمونے زیادہ دیے گئے ہیں۔
انگریزی تصنیف کے متن اور حاشیے میں جو باتیں براہ راست
خسرو سے متعلق نہ تھیں انھیں زیادہ تر کتاب میں حذف کر دیا
گیا ہے۔ لیکن یہ التزام رکھا ہے کہ کوئی ضروری بات نہ رہ جائے۔
غرض یہ کہ اختصار کے ساتھ جامعیت کو نباہنے کی کوشش
کی گئی ہے۔"

ڈاکٹر وحید مرزا کا انداز بیان اور اسلوب نثر نگاری نہایت سادہ
سلیس اور رواں ہے۔ کہیں کہیں شگفتہ مرصع اور دلکش بھی
ہو گیا ہے۔ دیباچۂ امیر خسرو سے اقتباس ملاحظہ ہو:-
"انگریزی کی ایک مثل کے مطابق یہ صحیح ہے کہ تنوع کمال کا

منافی ہے۔ لیکن یہ مثل عام قابلیت اور اوسط درجہ کی استعداد رکھنے والے انسانوں پر ہی صادق آتی ہے۔ صدیوں میں افلاک کی گردش دوام سے کوئی نہ کوئی ایسی جامع شخصیت پیدا ہو ہی جاتی ہے جو اس عام قاعدے سے بالاتر ہوتی ہے۔ اور یہی امتیاز اس صاحب کمال کے لیے عالم گیر شہرت اور ابدی ناموری کا باعث بن جاتا ہے۔ ایسے ہی خوش قسمت لوگوں میں سے ایک امیر خسرو بھی تھے۔" (دیباچہ)

امیر خسرو اور حضرت نظام الدین اولیا کے روابط و بیعت کے سلسلہ میں ساتویں باب (صفحہ ۱۶۲) سے چند سطور ملاحظہ ہوں:

"خسرو بھی ان خوش قسمت لوگوں میں سے تھے جو حضرت نظام الدین کی بزرگی کے معترف اور ان کے فیض صحبت سے بہرہ مند تھے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے تو لکھا ہے کہ وہ آٹھ سال کی عمر میں ہی حضرت نظام الدین کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے تھے۔ لیکن یہ بات قرین قیاس نہیں۔ بلکہ خسرو کے اپنے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ۶۷۱ھ میں باقاعدہ مرید ہوئے، اگرچہ غالباً اس سے پہلے بھی انھیں شیخ الاسلام سے ملنے کا شرف ضرور حاصل ہو چکا ہوگا۔ اُدھر حضرت نظام الدین بھی طوطئ ہند خسرو سے ناواقف نہ تھے اور ان کے کلام کی شیرینی سے اکثر حاشنی گیر ہوتے رہے تھے۔ اس لیے جب خسرو مرید ہونے کے ارادے سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے اپنے ملازم سے کہا کہ ایک ترک ہم سے ملنے آیا ہے اسے اندر بلا لو۔ جب خسرو آئے تو آپ نے انھیں بہت لطف و کرم سے اپنے پاس بٹھایا اور ان سے باتیں کیں۔ اس کے بعد ان سے بیعت لی اور انھیں ایک بارانی اور کلاہ چہار ترکی عنایت کیا۔"

متذکرہ بالا دو تصانیف کے علاوہ ڈاکٹر وحید مرزا نے امیر خسرو کی "مثنوی نہ سپہر" کی ترتیب و تدوین کا کام بھی نہایت محنت اور لگن سے انجام دیا اور بطور 'مقدمہ' انگریزی میں ایک فاضلانہ تبصرہ لکھ کر اس کی افادیت میں اضافہ کر دیا امیر خسرو کی دوسری تصنیف "خزائن الفتوح" کو جو عہد سلطان علاؤ الدین خلجی کی معتبر تاریخ کی حیثیت رکھتی ہے، ڈاکٹر صاحب نے تصحیح و تحشیہ و تمہید کے ساتھ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے زیر اہتمام شائع کرایا۔ ۱۹۷۵ء میں جب امیر خسرو کی ہفت صد سالہ تقریبات ہندستان و پاکستان میں منائی جا رہی ہے، لاہور کے اہل دانش کے اصرار پر ڈاکٹر صاحب نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ لیکن 'خزائن الفتوح' کا جو نسخہ پاکستان میں ان کو دستیاب ہوا وہ طباعت و کتابت کی کچھ غلطیوں کی وجہ سے ناقابل اعتماد تھا۔ ان کو شدت کے ساتھ اس نسخہ کی تلاش تھی کہ جو انھوں نے خود تدوین و تحشیہ کے ساتھ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے شائع کرایا تھا۔ پاکستان و ہندستان میں اس نسخہ کی تلاش کی گئی۔ میں نے اور ڈاکٹر صمدی نے اس نسخہ کو ہندستان میں بہت تلاش کیا۔ لیکن دستیاب نہ ہو سکا۔ بالآخر بڑی کوشش کے بعد پاکستان میں یہ نسخہ ڈاکٹر وحید مرزا کو مل گیا اور انھوں نے اس کے مطابق اپنے ترجمہ اور اصل نسخہ کی تصحیح کر دی۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ 'خزائن الفتوح' کا ایک مخطوطہ برٹش میوزیم لندن میں ہے، اور دوسرا کنگز کالج کیمبرج کی لائبریری میں ان ہی دونوں نسخوں کی مدد سے انھوں نے ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے شائع ہونے والے نسخہ کی تدوین و ترتیب کی تھی اور وہ ہر لحاظ سے قابل اعتماد تھا۔

لکھنؤ یونیورسٹی سے ۱۹۵۸ء میں ریٹائر ہونے کے بعد ڈاکٹر وحید مرزا کئی سال ہندستان میں رہے اور مختلف ادبی و تحقیقی اداروں کے کاموں میں مدد کرتے رہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے تحقیقی کاموں سے بھی ان کو وابستگی رہی اور وہ برابر ان میں دلچسپی لیتے رہے۔ لاہور میں پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے اردو ترجمہ اور جدید ترتیب و اضافہ کا جو کام ہو رہا تھا، اس کے ڈائرکٹر، سابق پرنسپل اورینٹل کالج لاہور، پروفیسر محمد شفیع تھے۔ وہ ڈاکٹر وحید مرزا کے قدیم مربی اور استاد تھے اور ایک عرصہ سے ڈاکٹر صاحب ان کے معین و مددگار تھے۔ انسائیکلوپیڈیا کے مختلف انگریزی مقالے وہ لاہور سے ڈاکٹر صاحب کو بھیج دیتے تھے اور وہ خود اردو میں ترجمہ کر کے نیز دوسروں سے ترجمہ کرا کے اور اس پر نظر ثانی کر کے پروفیسر محمد شفیع کو لاہور بھیج دیتے تھے ۱۹۶۰ء میں

و یونیورسٹی سے ریٹائر ہونے کے بعد اسی کام کے سلسلہ میں پروفیسر شیخ کے اصرار پر عارضی طور پر وہ لاہور چلے گئے، اور ان کے سسٹنٹ ڈائرکٹر کی صورت میں کئی سال تک کام کرتے رہے نہ وہ ہندوستانی نیشنل تھے اس وجہ سے ۱۹۶۵ء کی ہندوستان ستان جنگ کے بعد ہندوستان واپس آگئے۔ اسی دوران پروفیسر محمد شفیع کا انتقال ہوگیا۔ اور اسسٹنٹ ڈائرکٹر ۔بجائے ان کو ادارہ تعلیمات اسلام و ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، اب یونیورسٹی کا ڈائرکٹر مقرر کیا جانا تجویز ہوا۔ لیکن ڈاکٹر وحید مرزا پنی ذاتی مجبوریوں کی وجہ سے جلد لاہور واپس نہ جا سکے۔ بالآخر ریشنل کالج لاہور کے ریٹائرڈ پرنسپل اور سابق صدر شعبہ اردو۔ اب یونیورسٹی ڈاکٹر سید عبد اللہ اس کے ڈائرکٹر بنا دیے گئے۔ ڈاکٹر وحید مرزا کو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کی ترتیب تکمیل سے کافی دلچسپی تھی اور وہ اس کام کو جاری رکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ پاکستانی ادیبوں اور اپنے اعزا کے اصرار پر ۱۹۶۶ء میں وہ مستقل طور پر پاکستان منتقل ہونے پر آمادہ ہو گئے۔

جب ڈاکٹر وحید مرزا نے لکھنؤ کو خیر باد کہنے کا فیصلہ کیا تو ان کے طلبہ اور احباب نہایت افسردہ، آزردہ اور متاثر ہوئے۔ میں اس شام کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا جب ڈاکٹر صاحب نے لکھنؤ سے سہارنپور اور وہاں سے لاہور جانے کا ارادہ کیا، اور چارباغ ریلوے اسٹیشن سے عازم سفر ہوئے۔ ہر شخص با دیدۂ پرنم ان کو رخصت کر رہا تھا اور وہ خود بھی فرداً فرداً ہر شخص سے گلے مل مل کر اور مصافحہ کر کر کے آبدیدہ و حزن مجسم تھے۔ سہارنپور پہنچ کر چند ماہ ان کا وہاں قیام رہا، پھر اپنے ایک صاحبزادے شاہد مرزا کو وہاں ننہال میں چھوڑ کر لاہور چلے گئے۔ اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی ترتیب و تدوین، تصحیح و ترجمہ میں مصروف ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب کو چونکہ انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے میں خاص مہارت تھی اور دونوں زبانوں پر پوری قدرت رکھنے کی وجہ سے وہ بہت صحیح اور بامحاورہ کرتے تھے، اس وجہ سے ان کا کیا ہوا ترجمہ نہایت قدر و تحسین کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔

۱۹۷۵ء میں ہندوستان و پاکستان میں امیر خسرو کا ہفت صد سالہ جشن بہت دھوم دھام سے منایا گیا۔ ان تقریبات میں بہت سے مقالے پڑھے گئے، اور مختلف اخبارات و رسائل نے بڑے آب و تاب سے "امیر خسرو نمبر" نکالے۔ ڈاکٹر وحید مرزا نے بھی کئی مضمون مختلف عنوانات پر امیر خسرو سے متعلق پاکستانی اخبارات و رسائل میں لکھے۔ لیکن اپنی طبعی بے نیازی اور گوشہ نشینی کے تقاضوں کے تحت ہفت صد سالہ جشن کے اجتماعات میں شرکت نہیں کی اور کوٹھی نمبر ۱۳۱ / سی ماڈل ٹاؤن۔ لاہور میں، جس کا نصف حصہ انھوں نے خرید لیا تھا، قیام پذیر رہے۔

اسی زمانہ میں سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب "امیر خسرو انٹرنیشنل سیمینار" میں شرکت کرنے ہندوستان سے لاہور گئے ہوئے تھے اور میں بھی اپنے اعزا سے ملنے وہاں گیا ہوا تھا۔ امیر خسرو پر ہر محفل و مجلس مذاکرات میں مقالے پڑھے جا رہے تھے اور ریڈیو نیز ٹیلی ویژن پر روزانہ پروگرام ہوتے تھے۔ ان کی علمی و ادبی خدمات، تاریخی منظومات، بذلہ سنجی، حاضر جوابی، زبان دانی، نکتہ رسی، امیری و عوام دوستی، مہارت موسیقی و زمانہ شناسی، حب الوطنی و درویش منشی، وغیرہ وغیرہ کے تذکرے ہوتے تھے۔ لیکن ڈاکٹر وحید مرزا ذاتی طور پر کہیں نظر نہیں آتے تھے۔ یہ ضرور تھا کہ ہر مقرر کی زبان پر ڈاکٹر وحید مرزا کا نام اور ہر مقالے کے اوراق میں ان کی تصانیف و نگارشات کے حوالے موجود رہتے۔ سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب امیر خسرو کی ان ہفت صد سالہ تقریبات و مذاکرات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"ظروف بدلے مگر مظروف وہی تھا جو ڈاکٹر وحید مرزا اپنے ظرف میں پیش کر چکے تھے۔ انھوں نے مثنوی 'نہ سپہر' کو جس طرح سمجھایا ہے اس سے بہتر شاید کوئی اور نہ سمجھا سکے گا۔ آئندہ جو بھی اس مثنوی پر لکھے گا اس سے استفادہ کیے بغیر نہ رہ سکے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں اسی لیے بھیجے گئے تھے کہ امیر خسرو کو سمجھیں اور دوسروں کو سمجھائیں۔"

ڈاکٹر وحید مرزا نے امیر خسرو کی تصانیف اور خود ان پر جو کچھ لکھ دیا وہ تقریباً حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور ہر تحقیقی و تنقیدی کام کرنے والے کو فی الحقیقت اس سے استفادہ کیے بغیر چارہ نہیں ہے۔

اکتوبر - نومبر ۱۹۷۸ء میں کئی مرتبہ میری ملاقات ڈاکٹر وحید مرزا سے ماڈل ٹاؤن، لاہور میں ہوئی۔ اس زمانہ میں ان کے صاحبزادے طاہر مرزا پاکستان ٹائمز کی ملازمت ترک کر کے ایک نئے جاری شدہ انگریزی ہفتہ وار اخبار کے ایڈیٹر ہو گئے تھے اور بیگم طاہر مرزا ٹیلی ویژن، لاہور، پر خبریں سناتی تھیں۔ ڈاکٹر وحید مرزا بیحد کمزور ہو گئے تھے۔ ان کو چلنے پھرنے میں کافی تکلف ہوتا تھا۔ اور غذا بھی بہت قلیل رہ گئی تھی۔ ایک عرصہ سے ان کو پلورسی یعنی سینہ کے درد کی شکایت تھی۔ اور جو انجکشن اس مرض کے دفعیہ کے لیے دیئے جاتے تھے ان کا اثر یہ ہوتا تھا کہ سر میں بھاری پن رہتا تھا۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ اٹھ کر جانے میں سر چکرا جاتا تھا اور قدم لڑکھڑانے لگتے تھے۔ لہذا زیادہ وقت وہ اپنے مطالعہ کے کمرے میں ہی صرف کرتے تھے اور نوشت و خواند میں مصروف رہتے تھے۔ صبح و شام کوٹھی کے لان میں جا کر بیٹھ جاتے تھے۔ معالجین ان کی مزاجی کیفیت کی مناسبت سے انجکشن کی دواؤں کی مقدار میں کمی بیشی یا انجکشن دینے کے دفعہ کو کم یا زیادہ کرتے رہتے تھے۔ میں نومبر ۱۹۷۸ء میں لکھنؤ واپس چلا آیا اور بعد کے خطوط اور وہاں کی خبروں سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی صحت برابر گرتی چلی گئی۔ بالآخر ایک سال بعد وہ وقت آ گیا کہ جس کا ان کے اعزا و احباب کو خطرہ تھا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

ڈاکٹر وحید مرزا کے پس ماندگان میں ان کی بیگم صاحبہ مع اپنے تین لڑکوں اور ایک لڑکی کے لاہور میں مقیم ہیں۔ ان کے لڑکے شاہد مرزا کا سہارنپور میں اپنے والدین کے لاہور چلے جانے کے چند سال بعد انتقال ہو گیا تھا۔ طاہر مرزا مع اپنی بیوی کے ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد لاہور کی صحافی زندگی چھوڑ کر لندن چلے گئے ہیں اور بی۔ بی۔ سی لندن کے نشریاتی پروگرام سے متعلق ہیں۔

ڈاکٹر وحید مرزا اور ان کے خصائل حسنہ کی یاد اب بھی جب کبھی آ جاتی ہے دل کو بے چین کر جاتی ہے۔

"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"

★

ابھی اور

اظہار شادانی
چ راجندر مارگ
دھار۔ ایم۔ پی

مل جل کے ترقی کی ہو تدبیر ابھی اور
معمارِ وطن! کوشش تعمیر ابھی اور

ذہنوں سے مٹانا ہے جہالت کا اندھیرا
اے شمع وطن! علم کی تنویر ابھی اور

محنت کش و زردار میں تفریق ہے باقی
قانونِ مساوات ہمہ گیر ابھی اور

ہے سارے زمانے کو ابھی تیری ضرورت
لکھنا ہے تجھے وقت کی تحریر ابھی اور

دیکھی تھی زمانے نے تری قوتِ ادراک
دیکھے گا جہاں، عدلِ جہانگیر ابھی اور

الفت کے شہیدوں کی چتاؤں پہ چڑھیں پھول
نفرت کے جنازے کی ہو تحقیر ابھی اور

محنت کا پسینہ ہے شہیدوں کا لہو بھی
ابھرے گی مرے دیش کی تصویر ابھی اور

ہر روح تڑپ اٹھے، ہر سنگ پگھل جائے
نغمات میں ہو درد کی تاثیر ابھی اور

اظہار کبھی سرد نہ ہو گرمیِ جذبات
اے شعلہ نوا! آتشیں تقریر ابھی اور

نوٹے مہاری تنور
۔غوث نگر۔ رکاب گنج۔ لکھنؤ ۱

چلیے چل کر گاؤں میں دیکھیں

ؤں میں کیا ہے شہر سے بڑھ کر چلیے چل کر گاؤں میں دیکھیں
بمٹ اور چوپال کا منظر چلیے چل کر گاؤں میں دیکھیں
وری گھٹائیں، گھونگھٹ، گاگر چلیے چل کر گاؤں میں دیکھیں
شرط ہے لیکن خوب سنبھل کر چلیے چل کر گاؤں میں دیکھیں
سادہ جیون سچے دکھ سکھ، گرم آنسو ٹھنڈی مسکانیں
اُمڈا ہوا اک پیار کا ساگر چلیے چل کر گاؤں میں دیکھیں
بھروں میں تو چڑھ جاتا ہے پیتل پر سونے کا پانی
کنگن، جھمکے، پائل، جھومر چلیے چل کر گاؤں میں دیکھیں
سورج روز سویرے اُٹھ کر کرتا ہے تیار جسے خود
تاروں جڑی وہ چاند کی چونر چلیے چل کر گاؤں میں دیکھیں
ہندو مسلم مل کے منائیں ہولی ہو یا عید ملن
تہواروں کا روپ اُجاگر چلیے چل کر گاؤں میں دیکھیں
بھید بھاؤ سے ناطہ توڑے لیکن پکے شیخ و برہمن
دونوں ملیں گے ایک ڈگر پر چلیے چل کر گاؤں میں دیکھیں
اونچے مکانوں میں نہ ملیں گے پیپل برگد نیم کے سائے
چوکھٹ چوکھٹ دھوپ کے تیور چلیے چل کر گاؤں میں دیکھیں
بچے بوڑھے نر اور ناری سب ہی ملیں آلاس بھرے
دھرتی کی پوجا کے اوسر چلیے چل کر گاؤں میں دیکھیں
بچے ہمیں دیکھیں جو اچانک مارے خوشی کے تالی بجائیں
پھینک کے ساکت جھیل میں کنکر چلیے چل کر گاؤں میں دیکھیں
دنیا بھر کی ساری جھیلیں تنور نچھاور ہوں جس پر
ممتا کی وہ مان سروور چلیے چل کر گاؤں میں دیکھیں

نفیس احمد سراج
نفیس الکٹرک ڈرائی کلینرس
ڈبائی ضلع بلند شہر ۔ ۲۰۲۳۹۳

خاندانی بہبود

اولاد کی کثرت سے ہر موڑ پہ غم ہوں گے
تقدیر کے شکووں سے احساس نہ کم ہوں گے
ساحل پہ پہنچنے کے آثار بھی کم ہوں گے
تعداد سے گر زیادہ کشتی پہ قدم ہوں گے
ڈوبے گا سفینہ جب منجدھار میں ہم ہوں گے

قلت پہ قناعت کر ہر طور نرالا کر
سانچے میں پھر الفت کے ہر شخص کو ڈھالا کر
چھوٹے سے نشیمن میں کلیوں کو سجایا کر
دو تین چراغوں سے بھرپور اُجالا کر
پھر زیست میں جینے کے سامان بہم ہوں گے

رو رو کے ترے بچے روٹی کو پکاریں گے
کثرت ہے تو غم دل میں کس کس کے اتاریں گے
معصوم ہی چہرے ہر سمت نہاریں گے
ہر روز کے ہنگامے غربت کو نکھاریں گے
پھر حوصلے جینے کے کچھ اور بھی کم ہوں گے





حکیم ناطق لکھنوی — شخصیت اور فن

عرفان عباسی
۵۔ موتی لال بوس روڈ
نیا گاؤں۔ لکھنؤ

ناطق مری غزل کا تغزل تو دیکھنا
جو شعر ہے وہ عشق کا دفتر لیے ہوئے

دبستان لکھنؤ کے ممتاز، قادر الکلام کہنہ مشق شاعر اور نامور ادیب حکیم ابو العلا سید سعید احمد ناطق لکھنوی کی پہلی زیارت غالباً امین آباد لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ وہ مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی کے ساتھ تھے۔ گداز جسم، ورزشی اعضا، سڈول بازو، میانہ قد، کندمی رنگت، چوڑا چکتا پر رعب چہرہ اس پر سنہرے فریم والا چشمہ، بھرے بھرے گلے، پتلے ہونٹ، چوڑا دہانہ، ستواں ناک، پھیلے نتھنے، بڑے کان، بیضاوی ابرو، ذہانت سے ضیا بار متوسط آنکھیں، فراخ ماتھا، ریشمی بالوں والی تراشی ہوئی خوبصورت داڑھی سفید بال، چہرے پر متانت و سنجیدگی کی گہری تہیں، چست ریشمی شیروانی، چھوٹی موری کا شفاف پائجامہ اور پناس وضع کی ٹوپی زیب تن کیے۔ پیر میں خوبصورت سبز پوری جوتا اور بائیں ہاتھ کی انگلی میں بڑے زمرد کے نگینے والی انگوٹھی — اس کے بعد بھی ان کی زیارت کے مواقع نصیب ہوتے رہے۔ ان کی وضع میں کبھی فرق نہ آیا۔ جب دیکھا چہرے پر وہی تازگی، چمک دمک، رعب داب، نہ عمر رسیدگی کا کوئی اثر نہ اعضا میں اضمحلال — چال ڈھال میں وہی دلکشی و میانہ روی — کبھی کبھی شیروانی کے نیچے سے سفید و شفاف قمیض میں لگے مخصوص ڈیزائن والے طلائی بٹن بھی جھانکتے نظر آتے تھے۔

ناطق صاحب مولوی سید عبدالبصیر صاحب حضور بلگرامی کے گھر ۱۸۷۸ء میں لکھنؤ کے محلہ فراش خانہ میں پیدا ہوئے۔ حضور صاحب اردو و فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کا آبائی وطن بلگرام ضلع ہردوئی تھا۔ حضور صاحب

ولادت: ۱۸۷۸ء لکھنؤ
وفات: ۱۹۵۰ء
چاٹگام (بنگلادیش)

بسلسلۂ معاش، بلگرام سے لکھنؤ آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ وہ آتش اسکول سے تعلق رکھتے تھے اور اساتذہ میں شمار کیے جاتے تھے قدیم تذکروں میں ان کے کلام کی مثالیں اکثر ملتی ہیں۔

ناطق صاحب علم و ادب کا فطری ذوق لے کر پیدا ہوئے۔ شعر و ادب کی فضاؤں سے معمور گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ذی علم و استاد فن باپ کی تعلیم و تربیت میں پروان چڑھے۔ اردو و فارسی و عربی زبانوں میں مہارت حاصل کرنے کے بعد صرف ۱۸ سال کی عمر میں نوادر الانوار کانپور کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔ کئی سال کانپور میں قیام رہا جہاں متعدد ناولیں اور تاریخی کتابیں لکھ کر شہرت حاصل کی۔ پھر حیدرآباد (دکن) کا سفر کیا اور وہاں کے سرکاری اخبار ملک و ملت کے شعبۂ ادارت سے وابستہ رہے۔ اسی زمانے میں حکیم مصباح الدین خاں صاحب سے علم طب حاصل کیا جس کی تکمیل دہلی و شملہ جا کر حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں صاحب سے کی۔ کئی سال کانپور، سہسرام اور لکھنؤ میں مطب کرتے رہے پھر ۱۹۲۲ء میں عزیز الدین صاحب کے علاج کے سلسلے میں کلکتہ والے بہ اصرار انھیں لے گئے۔ ناطق صاحب سے لکھنؤ

کی ادبی محفل چھوٹ گئی وہ کلکتہ میں کئی سال باقاعدہ مطب کرتے رہے۔
۱۹۳۹ء میں لکھنؤ واپس آئے پہلے ہیوٹ روڈ (ٹھکو میاں کے احاطے) پر قیام اور مطب کیا۔ کچھ دن کنٹونمنٹ روڈ (گھسیاری منڈی) اس کے بعد احاطہ خام (امین آباد) میں قیام رہا۔ اسی مکان میں ان کی صاحبزادی محترمہ سلمیٰ قدوائی اپنے شوہر معروف شاعر و ادیب شایاں قدوائی صاحب کے ساتھ اب بھی مقیم ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد پھر کلکتہ چلے گئے لیکن لکھنؤ اور اس کی ادبی محفلوں کی یاد تڑپاتی رہی اور وہ کبھی کبھی لکھنؤ آتے رہے۔ آخری بار شاید ۱۹۴۸ء میں اپنے صاحبزادے سید رشید احمد صہبا کی شادی کے سلسلے میں آئے تھے۔

ناطق صاحب شاعری کی گود میں پلے تھے۔ والد ماجد حضور بلگرامی کا شمار اپنے وقت کے قادر الکلام شعراء میں ہوتا تھا۔ شہر کا سارا ماحول علم و ادب میں سرشار تھا۔ گھر گھر علم و ادب کی شمعیں فروزاں تھیں اور انھیں دعوت شعر و سخن دے رہی تھیں۔ ماحول سے متاثر ہو کر شاعری شروع کی جس کی ابتداء عربی سے ہوئی۔ ناطق صاحب کی ممانی جو امیرؔ مینائی صاحب کی بہن ہوتی تھیں۔ ناطق صاحب کے ساتھ ہی رہتی تھیں اور انھوں نے ناطق صاحب کو بیٹا بنا لیا تھا۔ ان کے پاس امیرؔ مینائی صاحب آتے رہتے تھے۔ ایک دن ممانی کے اصرار پر ناطق صاحب نے اپنا عربی کلام امیرؔ مینائی صاحب کو سنایا تو انھوں نے اظہار پسندیدگی کرتے ہوئے اردو میں شعر کہنے کا مشورہ دیا اور وہی ان کی اردو شاعری کا نقطۂ آغاز ہوا۔ وہ شاعری کا ساز لے کر بیٹھے اور دیکھتے ہی دیکھتے ممتاز شعرا کی صف میں نظر آنے لگے۔ کہا جاتا ہے انھوں نے چند غزلیں امیرؔ مینائی صاحب کو دکھائی تھیں لیکن اس کی تصدیق نہیں ہو سکی۔ اس کے علاوہ شاید انھوں نے کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب تہہ نہیں کیا، فطری استعداد اور عقل سلیم کی رہنمائی میں ہی اپنی راہیں متعین کیں — ناطق صاحب زود گو و قادر الکلام شاعر تھے نام و نمود، کلام کی اشاعت اور ادبی محفلوں میں شرکت سے گریز کرتے تھے اپنے دیوان کے مقدمے میں خود لکھتے ہیں:—

"سادہ مزاج شعراء کی طرح زیادہ تحسین طلب اور شہرت پسند نہیں ہوں۔ اس دعوے کی دلیل ضروری ہو تو یہ واقعہ ہے کہ شعر کہنے کے لیے کبھی مجھ کو یہ عذر نہیں ہوا کہ طبیعت حاضر نہیں ہے مگر پڑھنے کے لیے صدہا مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ طبیعت حاضر نہیں ہوئی اور نہیں پڑھ سکا۔ اگر لوگوں نے بہت مجبور کیا تو طوعاً و کرہاً نہایت بددلی سے تین چار شعر پڑھ دیئے۔ اب رہی شہرت طلبی تو اس کی بابت صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ ہندوستان بھر کے شعراء میں جن حضرات نے اپنے کلام کو رسالوں میں شائع کرنے سے پرہیز کیا ہے ان میں ایک میں بھی ہوں۔"

ناطق صاحب نے زبان کے بنانے سنوارنے میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ ۱۸۹۵ء میں لکھنؤ کے جن سات نوجوان شعراء نے مہذب شاعری کی بنا ڈالی ان میں ناطق صاحب بھی شامل تھے یہ سات نوجوان شعراء تھے۔ صفیؔ لکھنوی، نظرؔ، ابرؔ، عزیزؔ، محشرؔ، شررؔ اور حکیم ناطقؔ لکھنوی۔ ان کا مقصد تھا کہ شعر کا معیار ایسا ہو کہ باپ بیٹی کے سامنے اور بھائی بہن کے سامنے غزل کے اشعار پڑھ سکے۔ غیر فصیح و غیر مہذب الفاظ و محاورات کا استعمال ترک کیا جائے عریانی، فحش نگاری، مرگ و گریہ، نوحہ و ماتم کے مضامین اور نسوانی اجزائے جسم کی تعریف پر پابندی لگائی جائے۔ اس تحریک میں شعرائے لکھنؤ کے علاوہ ملک کے دوسرے ممتاز شعراء ریاضؔ خیرآبادی، وحشتؔ کلکتوی، شفقؔ عماد پوری، سائلؔ دہلوی اور دلؔ شاہجہانپوری وغیرہ بھی شامل ہو گئے تھے۔ اس سلسلے میں ناطق صاحب "خدنگ نظر"، "معیار"، "زندہ دل" اخبار وغیرہ میں مضامین و مختصر افسانے لکھتے، جلسوں میں تقریریں کرتے اور لوگوں کو اپنا ہم خیال بناتے رہے۔ آخر کار اس تحریک سے اردو کی غزلیہ شاعری میں تبدیلی کا آغاز ہوا اور مہذب شاعری کی راہیں ہموار ہوئیں۔
حضرت اثرؔ لکھنوی فرماتے ہیں:

"بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ جدید اردو شاعری کا سنگ بنیاد سب سے پہلے ناطق صاحب نے رکھا۔"

ناطق صاحب شاعری برائے زندگی کے قائل تھے۔ انھوں نے کبھی اپنا کلام جمع کرنے کی فکر نہیں کی۔ شروع میں غزلیں بلکہ پورے پورے دیوان بیچ دیا کرتے تھے اپنے دیوان کے مقدمے میں ایک جگہ خود لکھا ہے:—

"کانپور میں چار پانچ سال کے عرصے میں اتنی غزلیں کہہ لی تھیں کہ ایک دیوان تیار ہو گیا وہ میں نے بیچ ڈالا کیونکہ مجھے پسند نہ تھا مگر خریدار کو پسند آیا —"

ناطق صاحب مزاجاً سیدھے۔ پابند وضع، کم سخن، ایجاز و اختصار

سے گفتگو کرنے والے، علم کلام کے ماہر اور زبردست قوت استدلال کے مالک تھے۔ کلام سنانے پر مشکل سے آمادہ ہوتے تھے اور دوسروں سے بھی شعر سنانے کی فرمائش کم کرتے تھے۔ مشاعروں میں جب کبھی شریک ہوتے ٹھہری آواز پرسکون لہجے اور لطیف ترنم سے پڑھتے تھے۔ اردو، فارسی اور عربی ادب، فقہ، طب، علم نجوم، خوشنویسی، فلسفہ و منطق وغیرہ پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ ہندی ادب کے مفاہیم میں حیرت انگیز قابلیت اور ہندی شاعری کے رموز و کنایات میں نکتہ رس ذہن کے مالک تھے۔ ہندی کے اشعار پر ان کا عمیق نقد و تبصرہ مشہور ادبی مجلوں میں شائع ہوا تھا۔ علم موسیقی، رمل و جفر، فلسفہ و منطق، کیمیا گری وغیرہ میں بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ شطرنج کے کھیل اور حقہ نوشی کو ان کی نجی صحبتوں میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔

بحیثیت نثر نگار امتیازی حیثیت و مقبولیت کے مالک تھے۔ لاتعداد ناول، علمی و ادبی موضوعات اور تصوف پر تصنیفات کثیر تعداد میں ہیں جن میں چند مقبول ترین تخلیقات "شجرہ مشاہیر از زمانہ حضرت آدم"۔ "اسرار حقیقت"۔ "بستان معرفت"۔ "تاریخ جنگ ہفت روزہ"۔ "افسانہ شہر آشوب" وغیرہ ہیں۔ انھوں نے تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل اپنے دیوان جس میں ۱۶۲ غزلیں، ۲ قصائد، ایک مرثیہ، ۴۶ رباعیات اور ایک مثنوی شامل ہے (دیوان ناطق مطبوعہ ۱۹۵۰ء) جسے انجمن تعمیر ادب چاٹگام نے شائع اور سید رشید احمد و سید اقبال عظیم نے ترتیب دیا تھا، کے مقدمہ میں بطرز حقیقت شاعری، اغراض و مقاصد اور اپنا نظریہ شاعری پیش کیا ہے وہ بھی خاصے کی چیز ہے۔ دوسری شعری تخلیقات میں "منظوم تاریخ اردو معہ حواشی" (سنہ ۱۹۴۰ء) "مصحف ناطق" وغیرہ کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ غیر مطبوعہ تخلیقات "وید اور ویدانت"، "فارسی شاعری کی ابتدا اور انتہا"، "تذکرہ شعرائے اردو" وغیرہ بھی انفرادیت کی حامل ہیں۔ لاتعداد تنقیدی مضامین و مقالہ جات ان کے علاوہ ہیں۔

ناطق صاحب کی علمی و ادبی زندگی بیسویں صدی کے ابتدائی نصف پر چھائی ہوئی ہے۔ مزاج کی سخت گیری اور دیر شناسی کے باوجود وہ ملک گیر شہرت و مقبولیت کے مالک تھے۔ ان کے مداحوں، قدردانوں اور احباب کی طویل فہرست میں سر تیج بہادر سپرو، سر جے۔ پی سریواستو، مولانا سید سلیمان ندوی، سر عبدالقادر، حسن شہید سہروردی، مولانا عبدالماجد دریابادی۔ سر کشن پرشاد، منشی نوبت رائے نظر، کاظم حسین محشر، مولانا صفی، عسکری مرزا بلیغ، وحشت کلکتوی، مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی وغیرہ مشاہیر کے نام شامل ہیں۔ ان کا حلقۂ تلامذہ بھی کافی وسیع تھا۔

ناطق صاحب نے عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں شاعری کی ہے وہ حمد، نعت، غزل، نظم، قصیدہ۔ رباعی، مرثیہ، مثنوی وغیرہ اصناف پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ زبان و بیان کی پاکیزگی، فکر و نظر کی بلندی، لب و لہجہ کی شائستگی، فلسفہ و تصوف کے مضامین، سادگی و دل آویزی، ان کے کلام کی اہم خصوصیات ہیں۔

۹ اکتوبر سنہ ۱۹۵۰ء کو دبستان لکھنؤ کا یہ ممتاز شاعر، معروف ادیب، مشہور صحافی۔ محسن زبان و ادب لکھنؤ سے دور چاٹگام (بنگلا دیش) میں فالج کے شدید حملے کی تاب نہ لاکر، اسلوب غزل کو وسعتیں عطا کر کے اور اردو شاعری کو آب حیات پلاکر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا ؎

ابتدا سے آج تک ناطق کی ہے یہ سرگذشت
پہلے چپ تھا پھر ہوا دیوانہ اب خاموش ہے

نمونۂ کلام

غزل کے چند اشعار ؎

وقت رخصت چلتے چلتے کہہ گئے — اب جو ارماں رہ گئے سو رہ گئے
وہ جب یار کی پرسش کو آئیں — طبیعت کو پھر اس کی پوچھنا کیا
مجھ سے افسردہ نہ ہو اے جوش بہاراں مجھ کو تو نا — کیف میں بھول گیا چاک گریباں ہونا
کس کے دل میں درد تیرے عشق کا رہتا نہیں — فرق اتنا ہو کہ سب کہتے ہیں میں کہتا نہیں
ذکر و فکر ثواب کیا کم ہے — شیخ پر یہ عذاب کیا کم ہے
نظر مل گئی ان کی دل لے گئے وہ — برابر رہا میں نہ جیتا نہ ہارا
کہہ رہا ہے شور دریا سے سمندر کا سکوت — جس میں جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے
دراز اتنا مری قید کا زمانہ تھا — کہ وہ چمن نہ رہا جس میں آشیانہ تھا

حرم سے نکلے تلاش بت میں بتوں سے یاد خدا پہ بگڑی
غرض ہم آوارۂ وفا ہیں کہیں ہمارا گزر نہیں ہے

حمد کے چند اشعار ؎

ہر ایک مرکز وحدت ہو ذات کا ۔ ہر دائرہ ہو عالم کثرت صفات کا
شعاع مہر مبین جیسے تپیدہ ہوں ۔ منظر ہے جہاں میں تری التفات کا
بن کے نور آتا ہو شمع وجود سے ۔ ہر لمحہ جو پیچ میں ہو باری حیات کا
ناز کو جو حقیقت پہ ناز ہے ۔ ادنیٰ ساجز و ہے یہ ترے کلیات کا

تجھ سے تو حمد و نعت بھی ناطق نہ بن پڑی
اب کون ساوسیلہ ہے تیری نجات کا

نعت کے چند اشعار

دل میں محبت ہے سرکار دو عالم کی ۔ عزت اسے حاصل ہے دربار دو عالم کی
حق مجسم نے کی آکے مسیحائی ۔ مشکل تھی شفا ورنہ آزار دو عالم کی
وقت نظر کھولی اس نور ہدایت نے ۔ اک شمع ہوئی روشن انوار دو عالم کی
کی غلامی سے دشوار ہے آزادی ۔ تقلید نہ ہو جب تک مختار دو عالم کی

عاجز ہے زباں ناطق الفاظ ہیں ناکافی
تعریف ادا کیا ہو سرکار دو عالم کی

ایک مرثیہ کے دو بند

م پہ سایہ فگن جب شب عاشور ہوئی ۔ کربلا تیرگیٔ ظلم میں محصور ہوئی
شب ماہ تھی لیکن شب دیجور ہوئی ۔ چاند بے نور ہوا چاندنی کافور ہوئی
پنجۂ جبر سے دامان ستم چھوٹ گیا
عہد یاروں نے باہم جو کیا تھا وہ ٹوٹ گیا

نظر آنے لگی تو برسنے لگے تیر ۔ دست کش آپ ہوئے کھینچ لی سب کی شمشیر
نصیب اور سیہ بختوں کی پلٹی تقدیر ۔ خوں سے رنگین ہوئی صبر و رضا کی تصویر
ہو کے بے ہوش سر خاک پہ جب آئے حسینؑ
رو کے کہتا تھا سر چرخ کوئی ہائے حسینؑ

رباعی

دل میں یہ خیال بھی ہے سب کچھ ہوں میں
لب پر یہ سوال بھی ہے کب کچھ ہوں میں
سب کچھ ہوں اسی سے کچھ نہیں ہوں ناطق
کچھ بھی نہ رہوں اگر تو سب کچھ ہوں میں

نعتیہ قصیدے کے چند متفرق اشعار

اکتا گیا فردوس میں رہتے رہتے ۔ سنتا کب تک کوئی حوروں کی چنال ادا چنیں

سب کو معلوم ہو بدلا ہوا میرا پتہ ۔ آج کل ہوں در میخانہ پہ میں خاک نشیں
میری آوارہ روی کی کوئی منزل نہ راہ ۔ میں ہوں اک ذرہ فضا میں جو مکاں ہے نہ مکیں
تھا اسی غم میں کہ آیا نظر اک جلوۂ خاص ۔ نار میں نور ملا کر ہوئی جس کی تکوین
دفعتہً دل نے لیا نام رسول عربی ۔ جن کی خاطر ہوئے پیدا افلاک و زمیں



اظہر لکھنوی
تکیہ پیر غائب جھوائی ٹولہ
لکھنؤ ۳

غزل

جلووں کی نمائش تو سر شام بہت ہے
میرے لیے اس شام کا انجام بہت ہے

الزام محبت تو ہے اک رسم زمانہ
جرأت ہو تو اک لغزش ناکام بہت ہے

طوفاں میں رہا کرتی تھی ساحل کی تمنا
ساحل پہ بھی طوفان کا ہنگام بہت ہے

طوفان حوادث کے میں کیا ناز اٹھاؤں
میرے لیے یہ گردش ایام بہت ہے

اے مالک تقدیر یہ کیا بات ہے کیا راز
تدبیر وفا مورد الزام بہت ہے

میرے لیے میخانہ کا میخانہ ہے لیکن
ساقی سے جو مل جائے وہ اک جام بہت ہے

اب مجھ کو لبھائیں نہ جنوں خیز بہاریں
سائے میں غم دوست کے آرام بہت ہے

اظہر کبھی جگہ پائے گا ارباب نظر میں
ہر چند ابھی شاعر گم نام بہت ہے

ھمنیدسکار
مینجنگ ڈائرکٹر، اترپردیش فلم کارپوریشن

اترپردیش فلم کارپوریشن

اترپردیش فلم کارپوریشن کا اصل مقصد تحصیل کے صدر مقامات اور اس سے بھی چھوٹے مقامات پر عوام الناس کو سستی شرح پر تفریح مہیا کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے کارپوریشن کی اسکیم کم لاگت سے سینما ہال تعمیر کرا کے اس کے ذریعہ ایسے لوگوں کو تفریح مہیا کرنا ہے جن کے لیے گاؤں، قصبے یا تحصیل کے آس پاس سستی شرح پر تفریح کے ذرائع دستیاب نہیں ہیں۔ چھوٹے مقامات پر فلم دکھانے کی سہولت کی فراہمی کے نتیجے میں تجارتی فلموں کے ساتھ ساتھ دستاویزی فلمیں بھی دکھائی جا سکیں گی۔

فلمیں نہ صرف اس ملک بلکہ ساری دنیا میں اظہار کا سب سے موثر ذریعہ بنتی جا رہی ہیں۔ نہ صرف فنی اور ثقافتی اظہار کے لیے بلکہ اجتماعی تعلیم، اخلاقی تربیت اور ترقیاتی پروگراموں کی تشہیر اور سماجی ترقی کی رفتار تیز تر کرنے کے لیے بھی یورپ اور دنیا کے متعدد مقامات پر فلم کا استعمال کیا جا رہا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی سماجی افکار اور عصری تبدیلیوں پر فلموں کے اثرات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ باشعور افراد اور دانشور وقتاً فوقتاً فلم کے ارتقا اور اس کے سماجی اثرات کا جائزہ لیا کریں۔ فلم کارپوریشن اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہے اور اپنی طویل مدتی اسکیم میں اچھی فلموں کے ذریعہ سماجی تبدیلی کے سلسلے میں اپنی ذمے داری نباہنے کے لیے مستعد اور کوشاں ہے۔ اس ضمن میں کارپوریشن اپنے تیسرے مرحلے میں ہی اپنے وسائل سے فلم سازی کا کام خود شروع کرنے پر غور کر رہا ہے۔

مذکورہ اسکیم کی تکمیل میں ابھی وقت لگے گا۔ فی الحال کارپوریشن چھوٹے مقامات پر فلموں کے ذریعہ تفریح کے ذرائع مہیا کرنے کی غرض سے اپنے وسائل کو مرکوز کر رہا ہے۔

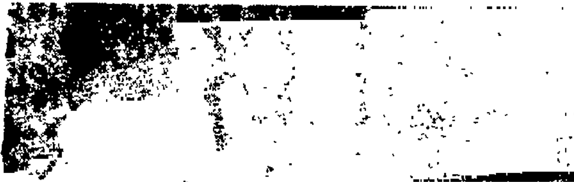
کارپوریشن پہلے مرحلہ میں چھوٹے مقامات پر پچاس سینما ہال تعمیر کرا رہا ہے۔ اب تک آٹھ سینما ہال تعمیر ہو چکے ہیں۔ توقع ہے کہ بقیہ سینما گھروں کی تعمیر آئندہ ستمبر تک مکمل ہو جائیگی۔ فلم کارپوریشن ستمبر ۱۹۷۵ء میں قائم کیا گیا تھا۔ اس وقت سے اب تک اپنے محدود وسائل کے باوجود کارپوریشن نے اپنے نشانہ کی تکمیل کی سمت کافی پیش رفت کی ہے۔

فلم کارپوریشن اترپردیش کی سرزمین پر فلموں کی شوٹنگ کو ترجیح دیتا ہے۔ اس مقصد کے تحت کارپوریشن کی ایسے پروڈیوسروں کو مالی امداد دینے کی بھی تجویز ہے جو اترپردیش میں فلم تیار کریں۔ اس کام میں مزید سہولت فراہم کرنے کی غرض سے فلم پروڈیوسروں کو کرائے کے آلات بھی فراہم کئے جائیں گے۔ اس کے علاوہ ریاست میں بننے والی فلموں میں بہترین فلم اور بہترین اداکار کو پچاس پچاس ہزار روپیہ کا انعام دینے کا بھی فیصلہ کیا گیا ہے۔

اترپردیش فلم کارپوریشن کو مالی اعتبار سے مستحکم کرنے کی ضرورت ہے اور خود کفیل ہونے کی اس کی کوششوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اس لیے کارپوریشن کے سینما ہالوں میں دکھائی جانے والی فلموں کے سلسلہ میں یہ بھی پیش نظر رکھا جائے گا کہ ان سے کارپوریشن کو مالی فائدہ ہو۔ فی الحال ہم ایسی فلموں کی نمائش کو ترجیح دیں گے جو صاف ستھری سماجی مقصدیت کی حامل اور مالی اعتبار سے کامیاب ہوں۔ جن عوام الناس کو ہم تفریح کے ذرائع فراہم کرنا چاہتے ہیں انھیں فن کے نام پر اظہار کی پیچیدگی والی فلمیں دکھانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

سوشلسٹ جمہوریہ ویت نام کے وزیر اعظم شری پھام وان ڈونگ گذشتہ ۱۰ اپریل کو چھ روزہ سرکاری دورے پر ہندستان تشریف لائے۔ دہلی ہوائی اڈے پر وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی اور وزیر خارجہ شری پی وی نرسمہا راؤ ان کا خیر مقدم کر رہے ہیں۔

گورنر اترپردیش شری سی۔ پی۔ این سنگھ ۹ مارچ کو راج بھون لکھنؤ میں مرکزی وزیر مملکت برائے شہری رسد و تجارت شری ضیاء الرحمٰن انصاری سے محو گفتگو ہیں۔





گورنر شری سی. پی. این سنگھ ۴ مارچ کو دوھان بھون لکھنؤ میں محکمہ جاتی سکریٹریوں کے جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے تصویر میں گورنر کے مشیر شری اسلام احمد بھی نظر آرہے ہیں۔



گورنر شری سی پی این سنگھ ۱۳ مارچ کو راج بھون لکھنؤ میں عوام کے مسائل سنتے ہوئے۔ تصویر میں گورنر کے سکریٹری شری اے پی سنگھ جو محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ کے موجودہ سکریٹری ہیں نظر آرہے ہیں۔



سابق وزیر اعلا اتر پردیش شری چندر بھان گپتا کے جسد خاکی پر لکھنؤ کے شہری پھول مالائیں
چڑھاتے ہوئے۔ تصویر میں گورنر کے مشیر شری اسلام بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔



نر کے مشیر شری
ردلی دت شکلا
ام تقسیم کو بہتر
نے کی غرض سے
ھنؤ میں سستے
ے کی ایک دکان
معائنہ کرتے ہوئے
ویر میں ضلع مجسٹریٹ
ھنؤ شری یوگیندر
زائن بھی نظر آ رہے
ہیں



شری ستیشی بھوشن سرن (سابق سکریٹری اطلاعات دموجودہ سکریٹری علاج وصحت) ۱۴ر مارچ کو
ملیح آباد میں فلم کارپوریشن کے سینماگھر کا افتتاح کرتے ہوئے۔ تصویر میں فلم کارپوریشن یوپی کے مینیجنگ
ڈائرکٹر شری مہیندر کمار بھی نظر آرہے ہیں جو محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ اترپردیش کے ڈائرکٹر
بھی ہیں۔

مدر ٹریسا ۱۶ر مارچ کو الہ آباد میں بے سہارا افراد کے ایک آشرم کا افتتاح کرتے ہوئے۔



کارپوریشن دوسرے مرحلہ میں ریاست میں بڑی تعداد میں سنیما ہال تعمیر کراکے اور بعض شہروں میں کبھی پرانے چھوٹے سینما ہال لے کر اس پوزیشن میں آنا چاہتا ہے کہ فلم سازی کی جہت فلموں کے انداز فکر اور مقصد پر اثر انداز ہوسکے۔ جب ہم بڑی تعداد میں بامقصد فلموں کی نمائش کرسکیں گے تو فلمیں کیسی ہوں، اس سلسلے میں بھی پروڈیوسروں پر نظر اثر انداز ہونے کی پوزیشن میں آجائیں گے۔ یہ خیال صحیح ہے کہ سماجی مسائل حل کرنے کے لیے سماجی سطح پر ہی ان مسائل سے لڑنے کی ضرورت ہے۔ سماج جس سماجی دباؤ اور تضادات سے گذرتا ہے ان پر نظر رکھ کر ہی سماجی تبدیلی کی لہر کی شناخت ممکن ہے۔ اس لیے کارپوریشن کے دوررس مقاصد میں فلم سازی کے سلسلے میں سماجی مقصدیت کی حامل فلمیں بنانے کو یقینی ترجیح دی جائے گی۔

★

راشدہ افر

پسِ عمر

وہ زخم کیا ہے جو منھ بند ہو، کبھی نہ رسے
وہ درد کیا جو کسی یاد کو جگا نہ سکے
وہ یاد کیا جو رہے دل میں اور کسک نہ بنے
وہ قرب کیا جو مٹائے نہ جسم و جاں کا وجود
نہ امتحانِ وفا ہو تو فاصلہ کیا ہے
نہ ماورائے زماں ہو تو عشق ہی کیسا
گماں نہ ہو تو یقیں کا بھی اعتبار نہ ہو
شبِ فراق نہ ہو، صبح انتظار نہ ہو
گزاری عمر تو جانا کہ زندگی کیا ہے

نظیر صفی پوری
۱۶۲/۳۳ گل گردین، محمود نگر
لکھنؤ ۳

غزل

ٹکرا کے ٹوٹ جائے گا خود کو سنبھالیے
شیشہ ہے دل کا اس کو ادب سے اچھالیے

تحریک سے ہمیشہ نکھرتی ہے زندگی
کچھ کیجیے تو گھر سے قدم تو نکالیے

اُس ایک خط سے جو کبھی بھیجا تھا آپ کو
یاروں نے رنجشوں کے فسانے بنا لیے

الزام تھا چراغ بجھانے کا جن کے سر
اکثر اُن آندھیوں نے سفینے بچا لیے

اِن سے تو زہر ہی کی توقع ہے ہر طرح
کیوں اپنی آستین میں سانپوں کو پالیے

پھولوں کی سلطنت پہ لٹیروں کو دیکھ کر
ہم نے بھی اپنے تاج میں کانٹے سجا لیے

کچھ زندگی کے گرم تقاضے ہیں اے نظیرؔ
اب اور آج کل پہ نہ سانسوں کو ٹالیے

لائق لکھنوی

شخصیت اور شاعری

[illegible]

[illegible] ایران سے ترک وطن کر کے ہندوستان آئے [illegible] ہوا سکتا ہے۔ [illegible] وقت تعلق ہو جانے کے سبب شعر گوئی اور ادبی مذاق کو [illegible] ان میں [illegible] موجود تھیں۔ [illegible] ملک کے [illegible]

[illegible] کو مکمل [illegible]

[illegible] کے بعد انیس بذات خود عالمی شعرا کی صف میں آچکے ہیں۔ [illegible] محققین نے ان کو مرثیہ گوئی کی صنف سے ماورا اخلاقیات، [illegible] بجز ل شاعری کا اعلیٰ وارفع شاعر تسلیم کر لیا ہے۔

میر انیس کے تین بھائی انس، مخلوق اور محسن بھی صاحب دیوان شاعر [illegible] ان کے بعد دو حقیقی بھائی انس اور مونس اعلیٰ پیمانہ کے مرثیہ گو اور [illegible] کو شاعرانہ حیثیت سے جانے پہچانے گئے۔ ان کے بعد انیس کے تین بیٹے نفیس [illegible] اور آخر میں پوتے میر ہاشم حسین جزین (متوفی ۲۳ ستمبر ۱۹۶۶ء) [illegible] جن کی تعداد دس تک پہنچ جاتی ہے۔ اولاد ذکور کے [illegible] انیس کے بھانجے، داماد، نواسے، پرنواسے ان کی اولاد در اولاد حتیٰ کہ یہ سلسلہ میر محمد [illegible] لائق پر منتہی ہوا۔ گویا کہ ڈیڑھ سو سال کی مسلسل تاریخ میں اس خانوادے کے تیس پینتیس شعراء، ادباء، مرثیہ گو، غزل گو، مرثیہ خواں اور ادیب گزرے جن

کے اذکار مختلف تذکروں میں پائے جاتے ہیں۔ ایسے ناقابل فراموش خانوادے کے مکمل حالات اور اس کے باقیات الصالحات کی امانتوں اور روایات کا تحفظ کسی ایک شخصیت کے لیے کتنا دشوار امر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ جناب لائق نے جب آنکھ کھولی تو میر خورشید علی نفیس کی سی جلیل القدر ہستی اور میر علی محمد عارف کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔ خصوصاً دادی کی گود میں پلے بڑھے، دادی نے انیس و نفیس اور خاندان کے عہد عروج کا بیشتر حصہ دیکھا تھا اور جو نہ دیکھ سکی تھیں وہ تازہ بتازہ روایات کے طور پر سن چکی تھیں۔ چنانچہ وہی کہانیاں دادی کی زبان سے پوتے کے لیے لوریاں بن گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کر جناب لائق کی گھٹی میں وہ تمام داستانیں ایک ایک کر کے سما گئیں بلکہ ان کا ذوق و شوق ان کی عادت ثانیہ بنتا گیا حتیٰ کہ بغیر خاندانی کہانیاں سنے سنائے نیند آنا مشکل ہو جاتی۔ خاندان کی آنکھوں دیکھی بہیں بہن، باہمی تعلقات رہن سہن، اخلاق و آداب معاشرہ اور ماحول اسی کے اپنے جیتے ہوئے [illegible] ذہن و دماغ میں اس طرح بسا دیے کہ [illegible] ہو گئی۔ لیکن اب کی عمر تو [illegible] بائیس سال کی ہوئی تھی کہ دادی [illegible] ہمیشہ کے لیے چھوٹ گئی مگر لائق اپنی خداداد ذہانت کی وجہ سے اپنے [illegible] عارف کی توجہ خاص کا مرکز بن گئے۔ یہی وہ اسباب تھے جن کے [illegible] نظر لائق ہمارے عہد کی ایک زندہ کتاب، لکھنؤ کے ادبا و شعرا کے حالات کے امین، خاندان انیس کی ایک متحرک تاریخ، بولتا ہوا تذکرہ، روایات کا مخزن، خاندانی امور کی یادداشت کا خزینہ دار بن گئے تھے۔ اور خاندان انیس ہی پر موقوف نہیں مرحوم "لکھنؤ کے عہد دیرینہ سے عصر حاضر تک کے بیشتر شعرا و ادبا کے حالات و سوانح حیات کے عالم تھے۔ لکھنؤ کی ادبی نشستوں، معرکوں، معاصر شعرا کی باہمی ذکر۔ نوک جھونک، ان کے دلائل و براہین، بحث و مباحثے، علما، ادبا اور شعرا کے سنین ولادت و تاریخہائے رحلت، جائے سکونت، مدفن نیز دوسری اہم معلومات کے حامل تھے، روایات ماسبق کا مخزن تھے۔ سلطنت اودھ کے سقوط کے بعد ہی یہاں کے دیوان خانوں، مجلسی محلوں اور ڈیوڑھیوں کی ادبی محافل و مجالس اور شعری نشستیں، بزم کی تھیں،

ولادت: ۲۵ جون ۱۸۹۳ء
وفات: ۸ مئی ۱۹۰۰ء

اب مختلف محلوں کے چھوٹے چھوٹے ہوٹل شرفا روا با کی آماجگاہ بن رہے تھے، شعرا اپنے مختصر سے دوستوں اور حواریوں کو لے کر ہوٹلوں میں بیٹھنے لگے گویا کہ ادبی محافل کا مرکز اب لکھنؤ کے ہوٹل اور قہوہ خانے بن گئے تھے۔ یہ وہ عہد تھا کہ اشراف لکھنؤ ہوٹلوں میں مختصر سی نشستوں کا انعقاد کر لیتے تھے۔ اساتذہ اپنے تلامذہ کو اصلاح دیا کرتے، ادبا و شعرا اپنے نظمی و نثری تخلیقات اپنے ہمنواؤں کے جھرمٹ میں سنا سنا کر تحسین و آفرین کے نذرانے قبول کرتے۔ اور اسی دوران چائے کے دور پہ دور چلتے رہے۔ چنانچہ جناب لائق کی زندگی کا آخری دور بھی اسی طرح گزرا، شاہی کالے امام باڑے کے منتظم اعلا اور نگراں کے عہدے پر فائز تھے، آزوقہ کی چنداں فکر نہ تھی۔ مجالس پڑھ کر بھی کچھ نہ کچھ بازیافت ہو جاتی تھی۔ اسی سلسلے میں آپ اکثر و بیشتر بیرون لکھنؤ بھی جایا کرتے تھے۔ ہر سال ریڈیو پر تحت اللفظ مرثیے پڑھتے، ریاست محمود آباد سے بھی قدیمانہ تعلقات تھے حتیٰ کہ بہار انگیار امیر حیدر خاں صاحب کے صاحبزادگان کے اتالیق ہوئے، لیکن آزادی کے بعد کے بدلے ہوئے حالات نے اس سلسلہ کو ختم کر دیا اور صبح و شام کی بیشتر زندگی ملازمت کے علاوہ بزازے کے ایک دیرینہ ہوٹل میں نشست کے طور پر گزرنے لگی۔ شہر کے عام لوگوں کو اس نشست کا علم تھا چنانچہ باہر کے لوگ جب کسی تحقیق کو آتے تو ان کو بھی اس مرکز کا علم ہو جاتا اور ان کی تحقیق کا مرکز بھی گویا وہی ہوٹل ہوتا۔ محلّے اور شہر کے باذوق حضرات جناب لائق کو اپنے حلقے میں لیے رہتے۔ اس طرح لکھنؤ کے عہد پارینہ کی یادیں تازہ ہوتی رہتیں۔ مرحوم خانوادہ انیس کی گزشتہ یادگاروں کے محافظ تھے اور وہ تمام رموز و اسرار ان کے سینے میں محفوظ تھے جنھیں حوادث زمانہ نے بے نام و نشان بنا دیا تھا گویا مرحوم موجودہ صدی کے واقعات و حالات کی ایک جیتی جاگتی انسائیکلوپیڈیا تھے۔ آپ خاندان کی پروان چڑھتی ہوئی شاعری اور مرثیہ خوانی سے وابستہ رہے۔ عہد شباب کے بعد ان کی زندگی کا دھارا یکسر بدل گیا اور وہ شعر و شاعری سے زیادہ ادبی امانتوں کی حفاظت، اور روایات گوئی کا محور بن گئے۔ عوامی زندگی ان کا سرمایہ ہو گئی اور ایک داستان گو کے روپ میں اپنے آبا کے باقیات الصالحات کی حفاظت میں منہمک رہنے لگے۔

فردوسیٔ ہند انیس پر سینکڑوں کی تعداد میں مضامین، مقالات اور کتب تالیف ہو چکی ہیں۔ لیکن ان تمام امور کے باوجود ہنوز کوئی مصدقہ سوانحعمری عالم وجود میں نہ آسکی، اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ خاندان کا ہر فرد اپنی دھن میں مشغول ہو جاتا، اس کے ارد گرد کا ماحول، اس کے مشاغل اور صبح و شام کی صحبتوں نے اس کو اس عظیم کام کی مہلت نہ دی۔ آج تاریخ ادب اردو میں انیس کی مکمل و محقق سوانحعمری کا خلا باقی ہے اور باقی رہے گا جس کے تکملے کی ذمہ داری سب پر باقی ہے اور باقی رہے گی۔

انیس کی تیسری پشت سے ہی جب اولاد ذکور کا فقدان ہو گیا تو شعر و سخن کی جاگیر ان کی اولاد اناث کے حصے میں آئی۔ لیکن نواسوں کی باہمی نوک جھونک اور تلاش معاش کے سبب باقیات الصالحات عام نظروں سے اوجھل ہو گئے اور وہ سب ان کے پوشیدہ صندوقوں تک ہی محدود ہو کر رہ گئے۔ ان تمام حالات کے باوجود خاندان کے بعض افراد نے انیس اور ان کے علاوہ تمام افراد کی مصروفیات اور مشاغل کو اپنی ذاتی وراثت کی کتابوں میں کہیں کہیں لکھا ہے جو بطناً بعد بطناً اور نسلاً بعد نسلاً منتقل ہوتی ہوئی جناب لائق تک پہنچیں۔ خصوصیت سے میر سید علی مانوس اور میر علی محمد عارف نے یہ فرائض بہت بڑی حد تک انجام دیے۔

انیس کی اولاد اناث ادھر ادھر منتشر ہو گئی لیکن جناب لائق انیس کی محلسرا اور دیوان خانے کو سینے سے لگائے رہے کیونکہ اول تو یہ تمام جائداد ان کے والد میر عارف کی ملکیت تھی دوسرے اس کا سب سے بڑا سبب ان کی وہ تربیت، پرورش تھی اور ذوق و احساس کی فراوانی تھیں جو تنگدستی کے باوجود اسپنے اسلاف کی میراث اور ترکہ کو خاک میں ملانے کے لیے تیار نہ ہونے دیتیں۔ دیوان خانہ اور محلسرائے انیس جناب لائق کو ترکہ میں ملے تھے۔ چنانچہ آخر میں جناب لائق کا تنہا دم ان تاریخی آثار و روایات کا رہ گیا تھا۔ باقی تمام اعزا اور حصہ داران ترک وطن کر کے چلے گئے یا راہی عدم ہو چکے تھے۔ اس وقت سب سے بڑا مسئلہ ان یادگاروں کی بقا و تحفظ کا تھا۔ انیس کی محلسرا جناب لائق کی نگاہوں کے سامنے بعض جگہ سے گر چکی تھی۔ دیوان خانے کے آثار محض دیکھنے کے لیے کھڑے نظر آتے تھے۔ ان کی بنیادیں ہل چکی تھیں۔ جناب لائق ان سب کی حفاظت و نگہبانی میں تن من دھن سے لگے رہے اور صبح و شام دیکھ بھال میں مصروف رہتے تھے۔ آپ کو اس محلسرا سے بے پناہ الفت اور روحانی لگاؤ تھا۔ آبا و اجداد کے بعض باقیات الصالحات خصوصاً مصنف سحرالبیان میر حسن کا ایک

تاریخی دیوان، خلیق کے بعض مراثی، انیس کے چند غیر مطبوعہ مرثیے، مونس، انس اور نفیس کا کلام، عارف و عروج کے مراثی ترکے میں ملے، دیوان خانہ اب بھی قطعی غیر محفوظ حالت میں موجود ہے بلکہ حقیقتِ امر یہ ہے کہ ابتدا میں اس یادگار کی بقا کے سلسلے میں لائق ہی نے پہل کی تھی اور محکمۂ آثار قدیمہ نیز مرکزی گورنمنٹ کو خطوط لکھے تھے۔ اسی زمانے میں دیوان خانے کی تصویر بھی کھنچوائی تھی، اگر نہ کھنچوائی ہوتی تو اب اس کا ذکر ہی ہوتا مگر اصل خد و خال کوئی نہ دیکھ سکتا۔ یہ تصویر ابھی حال ہی میں پروفیسر اکبر حیدری کاشمیری کی مرتب کردہ کتاب باقیاتِ انیس میں راقم السطور نے شائع کی ہے۔ مقبرہ میر انیس کے تحفظ کے لیے ہندوستان کے مختلف روساء کو متوجہ کیا اور ۱۹۳۲ء میں نواب یوسف علی خاں سالار جنگ مزار انیس پر تشریف لائے اور مزار کی حالت دیکھ کر اپنے انجینیر زین یار جنگ کو عمارت کے لیے نقشہ بنانے کا حکم صادر کیا لیکن ان کا تعمیری مقصد شروع بھی نہ ہوا تھا کہ راجہ صاحب محمود آباد کے ایک بیان سے جو نیشنل ہیرالڈ میں شائع ہوا تھا حیدرآباد کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

مکانِ انیس کی بقا و تحفظ کے سلسلے میں ملک کے بیشتر روساء و عمائدین کو اس کی طرف توجہ دلائی اور شعراء اور ادباء کو بھی اس اہم کام کی طرف متوجہ کیا جن میں سید علی عباس حسینی اور سید مسعود حسن رضوی ادیب سے بھی مختلف اوقات میں تبادلۂ خیال ہوئے، اسی سلسلے میں جناب ادیب کا ایک مکتوب جو انھوں نے اپنے ملازم جانی مرزا کے ہاتھ روانہ کیا تھا، درج ذیل ہے :

" مکرمی۔ تسلیم

ایک تدبیر ذہن میں آتی ہے جو اگر کارگر ہو گئی تو مکانات میر انیس بھی محفوظ ہو جائیں گے اور آپ کو معاوضہ بھی کافی مل جائے گا۔ لیکن اس کے لیے ضرورت ہو کہ کسٹوڈین اور کامپیٹنٹ آفیسر اور محکمہ تحفظ آثار قدیمہ کی طرف سے آپ کے پاس جو تحریریں وقتاً فوقتاً آتی رہی ہیں ان سب پر نظر کر لی جائے جو خطوط اس سلسلے میں آپ نے بھیجے ان کی نقلیں اگر موجود ہوں تو ان کو اور ان کے جواب جو آئے ہوں ان کو بھی دیکھ لینا ضروری ہو۔ مہربانی فرما کر جلد سے جلد یہ سب کاغذات مجھ کو دکھا دیجیے تاکہ ان کے ضروری اقتباسات مع تاریخ وغیرہ کے لکھ کر زیرِ تجویز عرضداشت میں شامل کر دیے جائیں۔ مکانوں کی پیمایش جو آپ کے پاس موجود ہو وہ بھی ضرور لیتے

آئیے گا۔

والسلام

خیر اندیش

سید مسعود حسن رضوی "

جناب لائق سے برصغیر ہند و پاک کے وہ افراد جو انیس کے سلسلے میں تحقیقی کام کر رہے ہیں خط و کتابت کیا کرتے تھے اور وہ ان کو حتی الامکان جوابات تحریر فرما کے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے ان حضرات میں خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر سید صفدر حسین زیدی مرحوم، سید یوسف حسین شائق مرحوم، سید ضمیر اختر نقوی، ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری، سید مسعود حسن رضوی ادیب، سید محمد آقا حیدر حسن عابدی، پروفیسر سید حسن سرمد، پروفیسر زکی الحق، قیام الدین احمد صاحبان کے نام قابل ذکر ہیں۔ ذیل میں ایک مکتوب جو نواب مرزا محمد تقی خاں ہوس کے بارے میں چند سوالات پر مبنی ہے درج ذیل ہے :

" امراوتی کیمپ ۷۸۶/۹۲ حوالہ نمبر 30/7/11 786

بزرگ محترم تسلیمات عرض ہے۔

میں یکم نومبر کو امراوتی پہنچ گیا۔ لکھنؤ کے چند روزہ قیام میں کئی صاحبان سے ملنے کا اتفاق ہوا لیکن آپ کی بزرگانہ شخصیت نے اپنا ایک دیرپا نقش چھوڑا ہے۔ اس ناچیز کو آپ نے جو عزت بخشی اس کے لیے بندہ بے حد ممنون ہے۔ یقین ہے کہ آپ اس خاکسار کو یاد رکھیں گے۔ کچھ باتیں آپ سے دریافت کرنی ہیں براہ کرم بواپسی ڈاک ان کا جواب ارسال فرمائیں۔ لفافہ ملفوف ہے (INLAND LETTER) کو میں نے لفافہ کارڈ کا نام دیا ہے کہ لفافہ اور کارڈ کے بین بین ہے۔

نواب مرزا محمد تقی خاں ہوس کے خاندان سے آپ کے خاندان کے دیرینہ مراسم ہیں لہٰذا کچھ سوالات کا آپ ہی تشفی بخش جواب دے سکتے ہیں۔ کالا امام باڑہ کس کا بنوایا ہوا ہے۔ اس امام باڑے کے پاس جن کا مقبرہ ہے وہ چھوٹے مرزا علی خاں کا ہے یا بڑے مرزا علی خاں کا (مجھ سے بتایا گیا ہے کہ ہوس کے والد اور بیٹے دونوں کا نام علی خاں تھا اور وہ بڑے اور چھوٹے مرزا کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں)۔ مجالس ماہانہ جو بقول آپ کے ۱۲ تاریخ بحساب قمری ہوا کرتی ہے یہ کب سے شروع ہوئی اور اس کی خصوصیت کیا ہے۔ امام باڑے میں ایک مقام بتایا جاتا ہے جہاں رونے کی آواز آتی ہے۔ اس کے بارے میں آپ کیا بتا سکتے ہیں۔ امام باڑے کے اندر دو قبریں بنی ہیں یہ کس کی ہیں۔ اس امام باڑے اور مقبرے کی نگہداشت کس کے ذمے ہے اور اس کے لئے کون کون سے صاحبان عہدیدار ہیں۔ نواب قاسم علی خاں کا باغ کدھر ہے جہاں حسن دہلوی کی قبر بتائی جاتی

ہے اور یہ نواب قاسم علی خاں کون ہیں۔
زحمت دہی کے لئے معذرت طلب ہوں لیکن آپ کی شفقت و عنایت نے میری ہمت بندھائی ہے اور یقین دلایا ہے کہ اس ضمن میں آپ سے ضرور مدد ملے گی۔

فقط خاکسار

پروفیسر سید محمد آقا حیدر حسن عابدی"

جناب ادیب کے خطوط میں ایک اور خط دستیاب ہوا جو انھوں نے چند سال قبل جناب لائق کو بطور سوالنامہ روانہ کیا تھا:

" مکرمی۔ تسلیم
سوالات ذیل کے جوابات انھیں سوالوں کے سامنے لکھ دیجیے۔
شکر گزار ہوں گا:۔

۱۔ حزیں مرحوم کا نام کیا تھا۔
۲۔ ان کی عمر کیا تھی۔
۳۔ کس کے شاگرد تھے۔
۴۔ کے مرثیے کہے اور کے مجلس میں پڑھے۔
۵۔ ان کے والد کا نام کیا تھا۔

سید مسعود حسن رضوی
۶ نومبر ۶۶ء "

جیسا کہ متذکرہ بالا سطور میں میں نے لکھا ہے کہ جناب لائق تاریخ ادب سے دلچسپی رکھنے والے مشاہیر سے تعاون فرماتے تھے۔ ذیل میں جناب سید مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم کے ایک مکتوب کا جواب تحریر کرتا ہوں جس میں انھوں نے ناسخ کی جائے دفن اور ان سے متعلق کچھ اور ضروری حالات دریافت کیے تھے:

۷۸۶

" محترمی تسلیم ۲۰ مارچ ۶۱ء
امید ہے کہ آپ بعافیت ہوں گے۔
آپ کا ایک دستی خط مرزا صاحب سے ملا۔ اس میں تحریر چند سوالات کا جواب درج ذیل ہے:
...... ناسخ کی قبر محلہ ٹکسال اندرون چوک ایک مکان میں ہے جس میں اس وقت (ورنا کولر اسکول ہے) میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ مکان حکیم محمد باقر صاحب نے بیع کیا ہے اور ناسخ مرحوم کی جائداد اور بھی حکیم محمد باقر صاحب نے بیع کی جو ان کے قبضہ میں تھی۔ ناسخ کے والد کی قبر گاؤ گھاٹ کے تکیہ پر ہے جس کو آج کل لوگ روشن کا تکیہ کہتے ہیں۔

جناب سید محمد ہادی صاحب لائق

مکرمی۔ تسلیم
سوالات ذیل کے جوابات انہیں سوالوں کے سامنے لکھ دیجیے۔
شکر گزار ہوں گا:۔
۱۔ حزیں مرحوم کا نام کیا تھا۔
۲۔ ان کی عمر کیا تھی۔
۳۔ کس کے شاگرد تھے۔
۴۔ کے مرثیے کہے اور کے مجلس میں پڑھے۔
۵۔ ان کے والد کا نام کیا تھا۔

سید مسعود حسن رضوی
۶ نومبر ۶۶ء

ادیب کا خط لائق کے نام

عشرت مرحوم نے بھی آب بقا میں یہ صحیح نہیں درج کیا۔ روشن الدولہ کی نہ وہاں کبھی کوئی قبر تھی نہ آج ہے۔ آتش مرحوم کا مکان مادھو لال کی چڑھائی پر تھا جس کا مجھ کو علم ہے۔ چونے کی بھٹی اس پر نہیں تھی چنانچہ میں کل شیخ تصدق حسین صاحب کو ہمراہ لیکر گیا اور موجودہ حالت دیکھی۔ یہ مکان آتش کے ورثا نے محلہ کے ایک لالہ صاحب سے خرید لیا تھا۔ لالہ صاحب کے وارث اچھے اچھے عہدوں پر فائز رہے جگنا تھ صاحب آنریری مجسٹریٹ ہوئے۔ ہری کشن صاحب کے فرزند بشن ناتھ صاحب ہردوئی میں وکیل ہیں ان کے قبضہ میں اس وقت یہ مکان بصورت اراضی ہے۔ چونے کی بھٹی دریر واقع ہے۔ آتش اور ان کے فرزند کی قبر اسی اراضی پر ہے۔
لالہ نانک پرشاد، لالہ جگنا تھ، لالہ ہری کرشن، لالہ بشن ناتھ، ایک وکیل صاحب ... یہ لوگ ہردوئی میں ہیں اور صاحب حیثیت ہیں اگر کوشش کی جائے تو اور تعمیری مقصد کے تحت ان حضرات سے خواہش کی جائے تو کیا عجب ہے کہ وہ اراضی دیدیں خدا نے ان کو بہت کچھ دیا ہے۔

والسلام
آل انیس
سید محمد ہادی لائق "

طول مضمون واقع نہ ہو اس لیے خطوط کو ترک کرتے ہوئے اصل مدعا کی جانب رجوع ہوتا ہوں کہ جناب لائق کو انیس کے تمام تبرکات سے عشق حقیقی تھا اور دوسری طرف ان کے سامنے یہ وقت آیا کہ یہ تمام املاک نیلام پر چڑھ گئیں۔ بولیاں بولی جانے لگیں۔ جناب لائق اس انبوہ کے سامنے کھڑے ہر فرد کی شکل دیکھتے اور خاموش تماشائی بنے رہتے۔ ان کی معاشی حالت اس قابل نہ تھی کہ نیلام کی آخری بولی لگا کر مکان انیس کو خود خرید لیتے لیکن

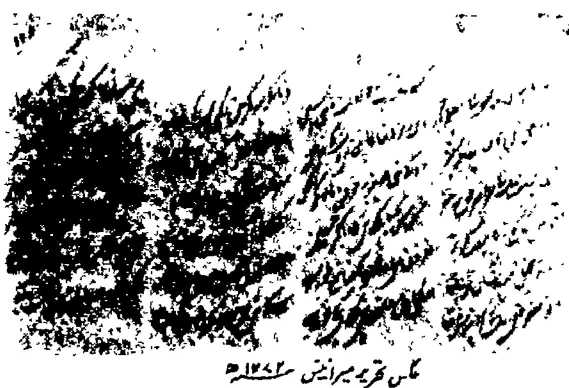
مالک ہونے کے سبب حکومت کو قانوناً ان کا نشا لینا ضروری تھا۔ چنانچہ بربار رقم بیع کی کمی کے بہانے انکار کرتے رہے۔ حکومت کو براہ راست بھی لکھتے رہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے کہ اس زمانے میں مرحوم بہت غمزدہ رہتے تھے اور اس یادگار کو بچانے کی فکر میں تھے۔ ہمیں یہ بھی یاد ہے کہ جناب ہمایوں کبیر مرحوم کے زمانہ سے یہ خط و کتابت جاری تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بالکل آخر میں یادگار انیس کمیٹی لکھنؤ کی تشکیل کی گئی اور کمیٹی نے یہ محلسرا انیس خریدلی۔ انیس کی یادگار کے سلسلے میں جناب لائق نے یہ قربانی خود بھی پیش کی کہ مکان کے نیلام سے جو رقم ان کو حصے کے بقدر ملنا تھی وہ یادگار انیس کے حق میں چھوڑ دی۔ اس کے بعد انھیں قدرے اطمینان ہوا اور اسی مکان کے ایک حصہ میں جو ان کے والد میر عارف کی نشست گاہ تھی سکونت اختیار کرلی۔ وقتاً فوقتاً برصغیر کے جو شائقین انیس کی یادگار دیکھنے آتے ان کی راہبری میں مصروف رہتے اور حتی الامکان تواضع بھی فرماتے تھے۔ عہد انیس کی متعدد کمیاب اور بیش قیمت چیزیں بھی ایک الماری میں اور کچھ پیٹیوں میں مقفل رہتیں اور تاکید رہتی کہ کوئی اس میں ہاتھ نہ لگائے، اگر کبھی کھولتے تو اپنے سامنے صاف کرکے اور دھوپ دکھا کر بند کر دیتے تھے۔ مثلاً انیس کی چوگوشیہ ٹوپی، زرد عقیق کی انگوٹھی اور ایک قلمی تصویر جو غالباً اس وقت کے مشہور مصور محمد علی مرتعش نے بنائی ہے۔ پانی بنانے کا "آہن تاب" وغیرہ۔ ان چیزوں کے علاوہ ایک بے بہا اور نادر شے وہ چند مخطوطے ہیں۔ مثلاً ایک مخطوطہ جس میں اول کسی مرثیے کے چند بند، اس کے بعد ایک تاریخی مرثیے کے سترہ اٹھارہ بند خط شکست میں ہیں۔ آخر میں مکمل مرثیہ "بخدا فارس میدانِ تہوّر تھا حُر" شامل ہے۔ یہ مکمل جلد خود میر انیس کے قلم کی لکھی ہوئی ہے۔ جناب لائق کو سب سے بڑا سرمایہ جو انھیں اپنے والد میر عارف اور میر نفیس سے ملا۔ وہ ان کے کشکول تھے۔

جن میں تاریخ وار انیس کے نجی حالات، مجالس مرثیہ خوانی، سفر، بعض خطوط کی نشاندہی، بعض مراثی کی تاریخی یادداشتیں اور انیس کی صبح و شام کی مصروفیات و مشغولیات لکھی گئی ہیں۔ خصوصاً میر نفیس اور میر عارف کے کشکول وغیرہ ہیں جو انیس کی نفسیات اور مزاج کی عکاسی کرتی ہیں۔ دوستوں اور شاگردوں کے نام، مرثیہ خوانی کے مقامات تک کی نشاندہی موجود ہے۔ انہی یادداشتوں اور اپنی دادی اور والد سے سنی ہوئی باتوں کی مدد سے وہ لوگوں کا تعاون کیا کرتے تھے۔

بہ اعتبار شعر گوئی اور مرثیہ خوانی وہ اپنے اسلاف کے مقابلے میں اپنے کو کمتر سمجھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ وہ انیس، مونس، نفیس و عارف کے کلام کو ترجیح دیتے اور مجالس میں ان ہی کا کلام سامعین کو سنایا کرتے تھے۔ شاعری کی ابتدا غزل سے کی، اس زمانے میں لکھنؤ کی ادبی محفلوں میں غالب کی طرحوں میں غزل کہنے کا رواج عام تھا اگرچہ یگانہ چنگیزی جیسے غالب شکن موجود تھے۔ توصفی، عزیز، آرزو، ثاقب، رشید و عارف جیسے زباں داں غزل گو بھی موجود تھے۔ جناب لائق نے ان کی شاعرانہ چشمکیں بھی دیکھیں اور فنی طور پر شاعرانہ صلاحیتوں سے متاثر بھی ہوئے، اس زمانہ میں 'معیار ادب' کا سالانہ مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ مشاعرے میں شہر کے نامی شعراء کے علاوہ بیرون جات کے شعرا بھی مدعو کیے جاتے تھے۔ جناب داغ کے خویش نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی بھی تشریف لائے تھے مصرعہ طرح تھا "یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا" جناب لائق نے بھی اس مشاعرے میں شرکت کی اور جب اپنی غزل پڑھی تو سائل دہلوی ان کی طرف متوجہ ہوئے اور انھوں نے جب یہ شعر پڑھا ۔

کوئی ہنس رہا ہے مجھ پر کوئی تو بہ کر رہا ہو ۔ کوئی کہہ رہا ہے دل پہ نہیں اختیار ہوتا

سائل صاحب نے تعریف کی اور بار بار مذکورہ شعر پڑھوایا گیا۔ دو شعر اور



عکس تحریر میر انیس ۱۲۷۲ھ

ـسن ہیں :-

ہاتھا بوسہ دے کر تیرے دستِ نازنیں کو   وہی تیر کاش ظالم مرے دل کے پار ہوتا
ے تیر کو شکایت مرے جذبے نہ کیوں ہو   جو وہ دل سے چھوٹ جاتا تو جگر کے پار ہوتا

ل اپنی وضع کے مطابق عارف سے ملنے آئے تو لائق بھی موجود تھے۔ سائل
حب نے کہا "ماشاءاللہ مشاعرے میں میں نے آپ کے صاحبزادے کی غزل سنی
ے کی زبان اردو مخصوص ہے اس وجہ سے میں متوجہ ہو کر سن رہا تھا۔ شاعر
ے ان کے ایک شعر نے کافی رنگ کیا۔ ہر اک نے بیساختہ تعریف کی۔ عارف
حب نے کہا" میں نے تو مشق کے واسطے اور اس واسطے کہ شعرائے شہر میں
متاد پیدا ہو جائے انجمن کا ممبر بنوا دیا ہے تاکہ یہ مشاعروں میں شریک
تے رہیں اور ان کے کلام کی ترقی سب دیکھتے رہیں۔" بطور نمونہ کلام غزل
ے چند منتخب شعر پیش کیے جاتے ہیں ؎

ری الفت نے شاید کچھ خبر کی   کہ اب ہے اور ہی حالت نظر کی
وہ ہوں غم دوست اے ظالم کہ تجھ کو   دعا دے کر شبِ فرقت بسر کی
مریضِ غم کہیں اچھے ہوئے ہیں   ہوئی بیکار کوشش چارہ گر کی
وہ نقدِ دل جسے ہاتھوں سے کھویا   کمائی تھی ہماری عمر بھر کی
نشانہ بن گیا اور بے خبر ہوں   صفائی دیکھنا تیرِ نظر کی
نہ رو شیدہ ہوا سبزہ لحد پر   یہ حدت ہے کسے سوزِ جگر کی
قرار آ جائے جو موت آئے ہم کو   دوا ہے آپ ہی دردِ جگر کی
دعائے وصل وہ مانگے شبِ ہجر   جسے امید لائق ہو سحر کی

ہوا ہوں عشق کا بیمار دیکھیے کیا ہو   بہت برا ہے یہ آزار دیکھیے کیا ہو
فراق میں دلِ ہمدم نے ساتھ چھوڑ دیا   نہیں ہے اب کوئی غمخوار دیکھیے کیا ہو
خدا کرے کہ ابھی رہ گزر سے وہ گزریں   کھڑے ہیں ہم پئے دیدار دیکھیے کیا ہو
خدا ہی جانے شبِ وعدہ آئیں وہ کہ نہ آئیں   عجب طرح کا ہوں بیمار دیکھیے کیا ہو
چلا ہوں عشق کرنے میں پر اب بھی   بہت یہ راہ ہے دشوار دیکھیے کیا ہو
زبان سے مری سن سن کے قصۂ الفت   وہ مجھ سے ہو گئے ہشیار دیکھیے کیا ہو
کسی کے دام میں آیا نہ جو کبھی لائق   ہوا ہوں اس کا گرفتار دیکھیے کیا ہو

صنف شاعری میں رباعی، سلام، نوحہ وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ ذیل کی رباعی میں اپنے بھائیوں کے تخلص کس خوبصورت پیرائے میں نظم کیے ہیں ؎

کب میں نے کہا کسی سے فائق ہوں میں   ہاں مدحتِ شبیر کا شائق ہوں میں
مداحِ امام سب ہیں بہتر مجھ سے   دراصل برائے نام لائق ہوں میں

اشکِ غمِ شہ سے چشم تر ہو میری   قدر اہلِ ہنر کو بیشتر ہو میری
درگاہ خدا میں یہ دعا ہے لائق   مداحیِ آل میں بسر ہو میری

ہادی کوئی کوئی مقتدا کہتا ہے   کوئی عالم کا رہنما کہتا ہے
اللہ رے مراتبِ علیِؑ اعلیٰ   بندہ کوئی، کوئی خدا کہتا ہے

کیوں حزن عیاں بجائے خوشحالی ہے   کس گل کا دلوں کو رنج پامالی ہے
کرتی ہے کسے تلاش چشمِ حقدار   اس بزم میں کس گل کی جگہ خالی ہے

اسلاف سے بڑھ کے شان و شوکت بخشے   علم و عمل و عزت و حرمت بخشے
لائق یہ رہیں دونوں جہاں میں ممتاز   خالق انھیں کونین کی دولت بخشے

جناب لائق نے سلام کثرت سے نظم کیے اور انھیں حدود میں طبع آزمائی کی جو ان کے اسلاف نے قائم کیے تھے۔ کہیں انیس کے رنگ کو اپنایا کہیں عارف کی شوخیِ مضامین سے متاثر ہوئے۔ فرماتے ہیں ؎

آرام پا یا کس نے دارِ غم و محن میں   رو رو دیے ہیں مرسل ہستی کی انجمن میں
چشمِ فلک نے دیکھا کب ظلم اس طرح کا   اولادِ فاطمہؑ کے بازو تھے اک رسن میں
ہے راہ دل سے دل کو یہ بات ہے مسلّم   گریاں وطن میں صغریٰ اصغر تپاں ہیں رن میں
وقتِ وداع آخر اکبر یہ شہ سے بولے   سوکھی زبان کے کانٹے چبھتے ہیں اب دہن میں
اے دورِ چرخ تو نے کیسا یہ دن دکھایا   بے پردہ آلِ احمد ظالم کی انجمن میں
سن کر اذانِ اکبر بولے ملک فلک پر   بلبل چہک رہا ہے گلزارِ پنجتن میں
ارشادِ ظفر سے کچھ شعر کہہ لیے ہیں   لائق ضرور پڑھ دو اس غم کی انجمن میں

بعض ناقدین کا خیال ہے کہ "ساقی نامہ عروج و عارف اور پیارے صاحب رشید کی ایجاد ہے اس سے قبل شعراء نے اس موضوع کو شعری پیکر میں نہیں ڈھالا تھا۔" راقم السطور کے خیال میں ساقی نامہ کی ابتدا میر انیس نے کر دی تھی۔ ان کی وفات کے بعد سب سے پہلے نفیس نے اس موضوع کو وسعت دی اور ساقی نامے کو مسلسل مراثی و سلام میں نظم کرتے رہے۔ رشید و عروج نے اس میں اور مضامین کا اضافہ کیا۔ عارف و فائق نے بھی اپنی جودتِ طبع کی بدولت خوب خوب ساقی نامہ سے متعلق شعر کہے۔ جناب لائق نے بھی اسی ڈگر پر چلتے ہوئے چند سلام نظم کیے۔ فرماتے ہیں ؎

بڑا میخوار ہوں ہاں ساقیا مجھ کو چھکا دینا   شرابِ حُبِ حیدر بھر کے ساغر میں پلا دینا

یہی ہر دم دعا ہو شاہ بیکس کے غلاموں کی   لحد کے واسطے یارب زمین کربلا دینا
لحد میں وقت پرسش ہو سند حب و ثنا دیں کی   فرشتوں کو ہمارا جرعۂ خاک شفا دینا
نیتجہ جز فنا کچھ بھی نہ نکلا کوشش دہر سے   جلانا تھا چراغ عمر کا گویا بجھا دینا
مقام غور ہے کیا قلب کو تسکین دیتا ہے   سر اشک خوں غم شبیر میں آنکھوں سے بہا دینا
شہ بیکس نے کیا احساں کیا ہے ہم غلاموں پر   نہیں آساں کسی کے واسطے یوں گھر لٹا دینا
بپا تھا حشر گھر میں کون عابد کی خبر لیتا   جہاں پانی نہ ممکن ہو وہاں کیا دوا دینا
اٹھے بیمار کے بستر سے یہ کہتے ہوئے حضرت   مرے اللہ تو ہی میرے عابد کو شفا دینا
کہا حضرت نے رو کر اب علی اصغر نہ ہوئے گا   گلے سے تیر کھنچتے ہی تمہارا مسکرا دینا
تردد کچھ نہ کر لائق ملے گا سب اسی در سے   ہے تیرا وصف ذاتی چشم گریاں کو بہا دینا
خدا کے دین کی حیدر نے یوں حمایت کی   شریک کار رسالت رہے رسالت کی
گواہ ہے شب ہجرت کہ اے علی تو نے   نبی کے بستر راحت پہ استراحت کی
فضائل آل محمد کے کس طرح ہوں بیاں   کہ جن کی ذات بنائی گئی سیادت کی
مدیں گزار دیں عباس نے رفاقت کی   سمجھ سمجھ کے کچھ اس طرح شہ کی نصرت کی
جہاں میں دو نوں جہاں کی کیسے ملی شاہی   علی نے فقر کی حالت میں جو امارت کی
نبی و آل کا دامن نہ چھوٹنے پائے   انھیں کی ذات سے امید ہے شفاعت کی
برائے آب سوئے نہر جب چلے عباس   علی کا رعب وہی شان تھی جلالت کی
وہی علی ولی ہے وہی مرا ساقی   ملے گی ہاتھ سے جس کے شراب جنت کی
جگہ پہ اپنی تھا مرحب مگر سمجھتا تھا   علی کے سامنے آیا بڑی جہالت کی
صغیر بچے کو دفنا کے کہتے تھے حضرت   یہ مرحلہ بھی تھا دشوار جس سے فرصت کی
حسین عصر کے ہنگام یوں ہوئے زخمی   جگہ نہ جسم پہ باقی رہی جراحت کی
وہی عطا کیا قاتل کو خود جو نوش کیا   وصی نبی کا تھا وہ جس نے یہ عدالت کی
غلام پنجتن پاک سے ہے تردد کیا   لحد میں آئے گی لائق شمیم جنت کی

عیاں کیا کیا ہوئی ہیں قوتیں بازوئے حیدر سے   یہ جبریل سے پوچھے کوئی یا باب خیبر سے
ہوا ہے تہلکہ برپا وغائے ابن حیدر سے   زمیں ہلتی ہے رن کی نعرہ اللہ اکبر سے
ازل سے میں ہوں سرمست ولائے ساقی کوثر   پتا ساقی بھلا کیا ہوگا تیرا ایک ساغر سے
غم شبیر میں ہر دم جو میں آنسو بہاتا ہوں   نہیں رہتے ہیں کم آنکھیں مری تسنیم و کوثر سے
سروں پر ہوگا سایہ دامن پاک پیمبر کا   ہمیں پھر خوف کیوں ہو آفتاب روز محشر سے
کہا عون و محمد نے ہمیں کیا خوف مرنے کا   وہ بچے ہم ہیں جو کھیلا کیے شمشیر و خنجر سے
کہا زینب نے اکبر سے نہ نکلیں حسرتیں میری   شکایت تم سے کیا جو کچھ شکایت ہے مقدر سے
کہا شہ نے نہ خاطر کر سکے کچھ اپنے مہماں کی   بڑی ہم کو ندامت ہے بہن خرد سال دلاور سے
کبھی زخم گلو پر کی نظر دیکھی کبھی صورت   بہ مجبوری نکالا تیر شہ نے حلق اصغر سے
ذر اشک عزا کو دیکھ کر حوریں یہ کہتی ہیں   ضیا ان کی تو کچھ دھیمی ہے الماس و گوہر سے
لٹا کر قبر میں اصغر کو کہتے تھے شہ والا   نہ کیونکر اس الم میں خون آنکھوں سے مری برسے
مرے نور نظر کو اے لحد آرام سے رکھنا   چھٹا ہے آج یہ پہلے پہل آغوش مادر سے
تردد کچھ نہ کر حامی ترے مولا ہیں اے لائق   تمسک رکھ ہمیشہ دامن سبط پیمبر سے

جناب لائق مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں اپنے کو بہت ہیچ سمجھتے تھے اور اکثر دوران گفتگو کہتے "میں اور میرا پڑھنا کیا" خاندان کے بزرگ شعرا کے کلام کو سناتے اور بعض نجی گوشوں کی طرف توجہ مبذول کیا کرتے تھے۔ خوانندگی کے سلسلے میں اپنے اسلاف کے ڈھنگ کو الگ الگ طریقوں سے پڑھ کر بتاتے تھے۔ ذیل میں ہم جناب لائق کے مرثیے سے چند بند نذر ناظرین کرتے ہیں ؎

فزوں ہو دفتر شرح و بیان شان علی   حبیب ایزد اکبر ہے مدح خوان علی
خدا رسول ہیں واللہ قدر دان علی   رسول حق کی ہو گویا زبان زبان علی
کلام حق ہو خدا کی قسم کلام ان کا   عصائے پیر ہو تیغ جواں ہے نام انکا
علی کے نام میں نام خدا یہ ہے تاثیر   کہ گرتے گرتے سنبھل جاتے ہیں صغیر و کبیر
علی کو رکھتا ہو محبوب آپ رب قدیر   خدا کے عاشق بے مثل ہیں جناب امیر
خدا کے نام پہ یہ جان و دل سے قرباں ہیں   تمام خلق خدا پر علی کے احساں ہیں
علی نے کی ہو مصائب میں انبیاء کی مدد   کہ دے رہا ہے کلام اللہ اس کی سند
نزول ناد علی ہے بروز جنگ احد   علی کا نام ادھر لو ادھر ہو دشمن رد
ملائکہ کے لیے رہبر قدیم یہ ہیں   برائے جن و بشر ہادی و کریم یہ ہیں
قسم خدا کی یہ بیت خدا کے ہیں مولود   علی ہیں قبلہ ایمان و کعبۂ مقصود
انھیں نے روز تولد کیے خدا کو سجود   جھکایا سر نہیں آگے کسی کے جز معبود
علی نے جلوۂ توحید جب دکھایا تھا   بتوں نے سجدۂ خالق میں سر جھکایا تھا
بلند دست نہ کس طرح ہو امیر عرب   کہ ہے علی کا ید اللہ دو جہاں میں لقب
علی کشندۂ عنتر ہیں قاتل مرحب   پکارتے ہیں دم بیکسی علی کو سب
خدا کے فضل سے معجز نمائی کرتے ہیں   ہر اک کی آن کے مشکل کشائی کرتے ہیں
کروں سخا و عطا کا میں ان کے کیا مذکور   ہر ان کا جود و سخا دو جہان میں مشہور
کہ راہ حق میں دیا مال و جان حد مقدور   حسن حسین سے فرزند تھے یہ آنکھوں کے نور
خدا کی راہ میں دونوں کو جب نثار کیا   گنہگاروں کو دوزخ سے رستگار کیا

میں جو کچھ تھا کر دیا وہ نثار ملاحظہ کیا اپنی جان کا زنہار
رش پہ سوئے جو حیدرِ کرّار تھا آپ کرتا مباہات ایزدِ غفار
تک ان کے مناقب بیان کرتے تھے گُل مرادسے دامن کو اپنے بھرتے تھے
ل سے ہے نامِ علی منصور خدا کے حکم سے ہے دشمنِ علی مقہور
و لی مومنوں کا ہے وہ ضرور نبیؐ کا نفس علی ہے بہ حکمِ ربِ غفور
دا کے فضل سے معصوم پاک اطہر ہے نبی کے بعد علی باعث مودّت ہے
باب علوم نبی ایزدِ پاک نبی کے واسطے حق نے کہا ہے خود لولاک
مدح میں عاجز بشر کا ہو ادراک علی ہے نور خدا اور ہم ہیں مشتِ خاک
بہ روزِ حشر وہ ساقیِ حوضِ کوثر ہے علی کا مرتبہ وہم و گماں سے برتر ہے
نہ کو محشر میں جب اٹھائے گا پھر اس کے سائے میں ... کو وہ بٹھلائے گا
ل میں قریب نبیؐ وہ پائے گا جو دوست ہیں انھیں وہ ساتھ لیکے جائے گا
مجو قاضی دینِ رسول ہے حیدر خدا کے دین کی اصل اصول ہے حیدرؑ
ئے والا رعیت میں عدل ہے بہ خدا وہ کرنے والا ہے تقسیم بالسویت کا
حق نے ہے خیر البشر یہ فرمایا ہیں شامل اس میں مقلد علی کے سرتاپا
وہ صالحین کا آقا ہے اور صادق ہے علی ہے مصحفِ ناطق حدیثِ ناطق ہے
عاشق صادق ہیں حق کے ہیں محبوب ہیں ان کے شیعوں میں موسیٰؑ و یوسفؑ و یعقوبؑ
شیعہ ہیں الیاسؑ و خضرؑ اور ایوبؑ ہر اک نبی کو ولائے علی رہی مرغوب
شرف رسولوں نے پایا ہے حبِ حیدر سے نبی علی سے ہیں اور ہیں علی پیمبرؐ سے
ب ان کا یداللہ ہے بہ قول نبیؐ بہ حقِ حق اسد اللہ ہیں علی ولی
ے پاک نے بھیجا ہے ان کو نادِ علی یہ حق کے حافظ و ناصر ہیں بس خفی و جلی
بہ ربِ کعبہ ہیں اصلِ اصولِ ایمان کے علی کے ساتھ ہے قرآں یہ ساتھ قرآں کے
سراج ہدیٰ نور اولیاء اللہ علی کے در کے گدا ہیں جہاں کے شاہنشاہ
بس نبی و علی ایک نور سے واللہ جو کچھ طریق نبی ہے وہی علی کی ہے راہ
خدا گواہ یہ دو ٹکڑے ایک نور کے ہیں یہ پیشوا ملک و انس و جن و حور کے ہیں
....
ت جب یہ ہوا از روئے معقول و منقول کہ ہیں نبی کے طریقہ پہ خاص آلِ رسولؐ
ن کی پیروی کرنا کہ ہو نجات حصول تلاش غیر اماموں کی اب ہے امر فضول
نہ چھوڑنا دل ناداں نبی کے دامن کو بجز رسول کا دامن علی کے دامن کو
ی نسل سے پیدا ہوئے امامِ زماں امام مہدیِ ہادی خلیفۃ الرحمان
رجب وہ بہ حکم خدا کریں گے بیاں سب اختلاف کے پردے اٹھیں گے ایک ایک بیاں

ذرا نہ فرق جہاں اپنی آن کا ہوگا بس ایک دینِ خدا دو جہاں کا ہوگا
....

۱۹۷۶ء میں اتر پردیش اردو اکاڈمی نے مرحوم کی ادبی خدمات کے صلے میں ایک معقول وظیفہ مقرر کیا تھا جو انھیں تا حیات ملتا رہا۔ ہم محترم بزرگ جناب صباح الدین عمر صاحب کے مشکور ہیں جو اس وقت اتر پردیش اردو اکاڈمی کے سکریٹری تھے۔

آج جناب لائقؔ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔ خدا نے وہ نعمت ہم سے چھین لی جو ہمارے عہد کی امانت تھی اس سے ہم ہی محروم نہیں بلکہ وہ سارا معاشرہ محروم ہو گیا جسے یہاں کا کلچر محبوب ہے۔ مرحوم حسب دستور علی الصباح اٹھے اور نماز سے فارغ ہو کر دعائیں وغیرہ پڑھتے رہے۔ پھر ناشتہ کیا اور کچھ نعتیہ رباعیاں پڑھیں۔ تقریباً دس بجے ان کے بچپن کے دوست اقبال بہادر ترکمان آئے اور آواز دی 'جناب ہادی صاحب' جواب میں انھوں نے کہا 'حاضر ہوا' ترکمان صاحب کو باہری کمرے میں بٹھایا گیا۔ کھانا تناول فرما کر باہر چلے گئے اور مختلف موضوع زیر بحث رہے۔ بارہ بجے اندر آئے اور سو گئے۔ ڈیڑھ بجے دن میں گھبرائے ہوئے اٹھے اور پانی مانگا۔ پانی فوراً دیا گیا ذرا ٹھہر کر کہنے لگے، میرے سینے میں درد ہے۔ وہ علم طب سے واقف تھے اس لیے انھوں نے کہا "بازوؤں کو کس کے دباؤ" ایسا ہی کیا گیا مگر طبیعت بگڑتی رہی جسم ٹھنڈا ہوتا گیا اور وہ پسینے میں شرابور ہو گئے۔ میں گھبرایا ہوا ڈاکٹر کے یہاں گیا اور دس منٹ میں واپس ہوا تو راستے میں مرحوم کی سناونی سن لی۔ ڈاکٹر صاحب ساتھ تھے۔ وہ تمام جسم کا بار بار معائنہ کرتے رہے کسی طرح مطمئن نہ ہوتے ان کی پریشانی سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی خواہش تھی کہ ایک مُردے میں جان ڈال دوں۔ لیکن مشیتِ الٰہی کے آگے انھیں بھی سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ چنانچہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے انھوں نے آخری حکم سنا دیا۔

لائقؔ کی وفات سے متاثر ہو کر لکھنؤ کے دیگر شعراء نے اپنا منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اور قطعات تاریخ نظم کیں۔ ذیل میں محترم سید یوسف حسین شائقؔ کے تاثرات بصورت مادۂ تاریخ پیش ہیں ؎

سہہ سہہ کے زمانے کے ستم مر گئے لائقؔ ماتم میں ہمیں خاک بسر کر گئے لائقؔ
ہستی کے گلستاں سے نگہ اپنی پھرا لی اس باغ سے بوئے گل تر لے گئے لائقؔ
بہ تا عمر جو اترے نہ اتارے سے کسی کے دل پر وہ گراں کوہِ الم دھر گئے لائقؔ
اس جا ہیں جہاں سے کوئی پھر کر نہیں آیا دیدار سے محروم ہمیں کر گئے لائقؔ

رونے کے لیے چھوڑ دیا ہم کو جہاں میں ۔۔۔ اور خود سوئے دربار پیمبر گئے لائق
دعویٰ تھا غلامی کا انھیں آلِ عبا کی ۔۔۔ رحمت سے خدا کی سوئے کوثر گئے لائق
جنت میں مکاں مل گیا شاہ دوسرا سے ۔۔۔ جب مرثیہ لے کر سرِ منبر گئے لائق
پہنچا دیا رضواں نے انھیں قصر میں ان کے ۔۔۔ جس وقت در باغ جناں پر گئے لائق
فائق کی جدائی کا الم تھا بہت ان کو ۔۔۔ اب خوش ہیں کہ نزدیک برادر گئے لائق
تاریخ وفات ان کی لکھو سوچ کے شائق ۔۔۔ اب تو اسد اللہ کے در پر گئے لائق
تاریخ کے مصرعۂ ثانی عدد "کو" کے ملادو ۔۔۔ آخر سوئے فردوس سفر کر گئے لائق

صاحبِ 'مہذب اللغات' جناب محمد میرزا مہذب لکھنوی نے وفات سے متاثر ہو کر کہا ؎

اے مہذب مرثیہ گوئی کا ہے دور زوال ۔۔۔ اٹھ گیا دنیا سے اپنے وقت کا گویا نفیس
مصرع تاریخ نکلا سیوی سنہ میں صاف ۔۔۔ جانِ ذکرِ لائق شہ بیکر روح انیس
۱۳۹۷ھ

حسینی شاعر جناب فضل نقوی نے متعدد تاریخیں نظم کیں جن میں سے صرف ایک مادۂ تاریخ پیش ہے ؎

لے گیا آخر انھیں بھی دہر سے دستِ اجل ۔۔۔ جن سے باقی رہ گئی تھی کچھ نہ کچھ شانِ انیس
زیر تربت بھی ہو مجلس پڑھ رہے ہیں مرثیہ ۔۔۔ ہادیِ فن عارفِ روحِ گلستانِ انیس
۱۳۹۷ھ

قدیم لکھنؤ کے کم سخن اور گوشہ نشین شاعر جناب عبدالمجید تخلص بہ مجید لکھنوی نے مادۂ تاریخ نکالی۔ فرماتے ہیں ؎

سیدو ناصرِ دیں لائقِ انساں ہادی ۔۔۔ محسنِ قوم طریقت کے نگہباں ہادی
تھے نفیس بانی یادگار و آلِ انیس ۔۔۔ واہ جنت کے مکیں آیتِ قرآں ہادی
۱۳۹۷ھ

میر انیس کے ہمعصر مفتی میر عباس شوستری کے نواسے سید ظفر حسین ظفر لکھنوی نے طویل تاریخ کہی جس کے چند منتخب اشعار درج کیے جاتے ہیں ؎

دے گئی غم حیف ہے بعد زوال ۔۔۔ نوزدہ ماہ جمادی الاولیں
اٹھ گئے ہادی ادیب باکمال ۔۔۔ گفتگو جن کی تھی سنجیدہ دل نشیں
لکھنوی اہلِ ہنر حضرات کے ۔۔۔ تذکرے از بر تھے سینہ تھا امیں
لکھنؤ میں بلبلِ شیراز تھے ۔۔۔ ناز کرتی تھی وطن کی سرزمیں
غمزدہ احباب گریاں ہیں عزیز ۔۔۔ ہے میسر ان کو قربِ طاہریں
دور تاریکی لحد کی ہوگئی ۔۔۔ داغِ سجدہ سے چمک اٹھی جبیں
کوچۂ لکھنؤ سے کیا غرض ۔۔۔ جب ہے حاصل سیرِ فردوسِ بریں
یاد آتے ہیں ظفر ہجری میں یہ ۔۔۔ ابنِ عارف قصرِ جنت کے مکیں
۱۳۹۷ھ



حواشی

[1] آپ کا نام کاظمی بیگم اور تخلص تو تھا پیارے صاحب رشید سے کافی بڑی تھیں۔ انھیں پیارے کہہ کر مخاطب کرتی تھیں۔ جناب لائق سے بے پناہ محبت کرتی تھیں۔ مرحوم کا بیان ہے مجھے دادی کی محبت ماں سے زیادہ ملی اور ہم انھی کو "اماں" کہتے رہے۔ آپ کی وفات ۱۳۳۲ھ میں عارف کی رحلت سے چند ماہ قبل ہوئی۔ [2] مولوی محمد حسین آزاد نے جب تذکرۂ آبِ حیات لکھنے کا ارادہ کیا تو انیس کی سوانحِ عمری کے سلسلے میں میر نفیس کو متعدد خطوط بھیجے۔ میر نفیس نے کوئی توجہ نہیں کی۔ ایک دن نواسے نفیس عارف نے ان سے کہا "نانا ابا مولوی محمد حسین صاحب کے کئی خط آچکے ہیں ان کو کیا جواب دیا جائے۔ کچھ دیر سکوت کے بعد خورشید علی نفیس نے جواب دیا "مولوی محمد حسین کی چند سطریں لکھ دینے سے میرے باپ (مراد میر انیس) کا نام زندہ رہے گا اور نہ مجھی میرے باپ کی شہرت وعظمت کے سید الشہدا ذمہ دار ہیں اور خاموش ہو گئے۔" اگر یہ صورت پیش نہ آتی تو یقینی طور پر انیس کی مستند سوانحِ عمری محفوظ ہو گئی ہوتی مگر نفیس کے انتقال کے بعد عارف نے میر انیس کے سلسلے میں ایک مضمون لکھ کر سر عبدالقادر کے پرچے "مخزن" لاہور میں بھجوایا تھا۔ (دیکھئے مخزن ۱۹۰۲ء کے مسلسل شمارے) [3] انیس کی بڑی بیٹی عباسی بیگم کے بیٹے میر نفیس کے مجھلے داماد ــــــ آپ نے تقریباً تیس سال مسلسل تراثِ انیس کی لیتہ برادری کی خدمات انجام دیں۔ آپ کے نقل کردہ مراثی انیس قطعی مستند کہے جا سکتے ہیں۔ [4] عارف نے برایماے میر نفیس ۱۸۹۰ء میں مکان انیس خرید لیا تھا اور ورثائے شرعی کو ان کا حصہ دے دیا تھا۔ ان کاغذات پر خاندان کے دیگر بزرگوں کے علاوہ جناب انیس کی دختر ان کے دستخط بھی موجود ہیں۔ قدیم طرز کے مطابق رشید کے دستخط اس طرح ہیں "پیارے بقلم خود" [5] مذکورہ انگوٹھی ہمشیرزادۂ میر انیس میر کاظم حسین یونس کے پاس تھی۔ خود انھیں وہ انگوٹھی میر نواب مونس سے ملی تھی کیونکہ کاظم حسین یونس انھی کے ساتھ رہتے تھے۔ اور مونس کے شاگرد بھی تھے۔ کاظم حسین کے فرزند اور میرے حقیقی پھوپھا سید فدا حسین زائر (متوفی ۱۹۶۱ء) نے یہ انگوٹھی کربلا جانے سے قبل لکھنؤ کے مشہور طبیب حکیم صاحب عالم کے ہاتھ فروخت کر دی تھی۔ صاحب عالم صاحب عرصہ ہوا پاکستان چلے گئے تھے اور وہیں انتقال ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ انگوٹھی ان کے ورثا کے پاس موجود ہو؟ [6] اس تصویر سے یادگار انیس کمیٹی لکھنؤ اور مرکزی انیس کمیٹی دلی نے دوسرے فوٹو بنوائے اور اسی تصویر کا عکس مرکزی حکومت کے جاری کردہ ٹکٹ پر لیا گیا۔ [7] اس تاریخی مرثیہ کا مطلع 'یا رب چمنِ نظم کو گلزارِ ارم کر' ہے اور اب تک مختلف جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ اب یہ قلمی مرثیہ فروخت ہو کر مولانا آزاد لائبریری (مخطوطات سیکشن) علی گڑھ میں موجود ہے۔ (دانش)

غزلیں

احترام اسلام
۵۴۲، اترسوئیا۔ الہ آباد۔ ۲۱۱۰۰۳

خوش گمانی کی اُبھاری ہوئی تصویر نہ دیکھ
حسن کو سرکشِ چشمِ وفا گیر نہ دیکھ

ایسے ہی تجربوں نے چھین لیں آنکھیں میری
روزنِ خواب سے گل ریزیِ تعبیر نہ دیکھ

اثرِ تلخئ زہراب سے باہر تو نکل
کون کہتا ہے کہ تو ذائقۂ شیر نہ دیکھ

دے توجہ کہ ہے یہ خونِ رگِ جاں کا لکھا
یوں تغافل سے خطِ تشنۂ تفسیر نہ دیکھ

واقعیت کے نظر سوز شرر ہیں ہر سو
کسی جانب بھی گرفتارِ اساطیر نہ دیکھ

منتظر کون سی منزل ہو تری کیا جانے
بے تعلق سا کھڑا جادۂ تدبیر نہ دیکھ

احترام اس جگہ آزاد ہے تو ہی تنہا
تیرے بھی پاؤں جکڑلے کوئی زنجیر نہ دیکھ

نوشاد حسین ھمراز
۵۱۔ سبزی منڈی شتاق ہوٹل الہ آباد ۳

نالوں میں اثر ہے نہ تو آہوں میں اثر ہے
لیکن یہ یقیں ہے کہ انھیں میری خبر ہے

ہر سمت زمانے میں اندھیروں کا نگر ہے
اے وقت کے سورج یہ تری کیسی سحر ہے

وہ گردشِ دوراں کا اثر لے نہیں سکتا
جس دل پہ ابھی ان کی نگاہوں کا اثر ہے

اے وحشتِ دل مجھ کو کہاں لے کے چلی ہے
ویرانوں سے بہتر مرا اجڑا ہوا گھر ہے

پھر آنے لگے ہیں میری توبہ کو پسینے
ساقی تری آنکھوں میں قیامت کا اثر ہے

نقشِ قدمِ یار میسر نہیں ان کو
بھٹکے ہوئے راہی ہیں تو انجان سفر ہے

ھمراز کسی ایک کو ہمراز بنا لے
اسکول تیرا شوخ غزالوں کا نگر ہے

احمد سعید
حاجی بلڈنگ ۔ چکمنڈی، مولوی گنج لکھنو،

نیوراسس: علامات اسباب اور علاج

غیر طبی نفسیات کی اصطلاح میں (NEUROSIS) نیوراسس شدید قسم کی دماغی الجھن اور جذباتی بے چینی کو کہتے ہیں ۔ اردو میں اس کے لیے اعصابیت یا اعصابی کشیدگی جیسے الفاظ کا استعمال عام ہے ۔ ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک میں مبتلائے اعصابیت افراد کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے ۔ بلکہ جدید ترین ترقی یافتہ ممالک میں اس کا تناسب ترقی پذیر ممالک سے کہیں زیادہ ہے ۔ مقام حیرت ہے کہ ماضی کے مقابلے میں آج اسکول و کالج اور صحت عامہ کے تحفظ کے لیے طبی مراکز تمام ملکوں میں کہیں زیادہ موجود ہیں ۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ آج کا انسان پہلے کے انسان کے مقابلے میں زیادہ ذہنی الجھن اور جذباتی بے چینی کا شکار ہے ۔

ماہر نفسیات نیوراسس کو پھوڑے پھنسی، ہیضے اور دوسری بیماریوں کی طرح کوئی مستقل جسمانی بیماری تو قرار نہیں دیتے ۔ تاہم کسی فرد میں نیوراسس کی علامات کا پایا جانا ایک فرد کی زندگی کو خطرناک بیماریوں کی طرح اذیت ناک اور تکلیف دہ ضرور بنا دیتا ہے ۔ بلکہ بعض اوقات عدم تدارک کی صورت میں جسمانی بیماریوں اور دوسری قلبی شکایات کا بھی سبب ہو جاتا ہے ۔ یہ ایک قسم کے ذہنی عدم توازن کا نام ہے ۔ جو بہت سے جسمانی عارضوں کی وجہ تو بن سکتا ہے ۔ لیکن خود اس کا سبب کوئی جسمانی عارضہ نہیں ہوتا، مزاج کی فطری شگفتگی رخصت ہو جاتی ہے ۔ طبیعت میں الجھن اور بے چینی مبتلائے اعصابیت کی زندگی کا جزو لاینفک بن جاتی ہے ۔ ایسا شخص اپنے معمول کے حالات کو بھی غیر معمولی اہمیت دیتا ہے ۔ ہمارے آپ کے لیے روانہ کے واقعات و حالات کسی خاص اہمیت کے حامل نہیں ہوتے دوسرے الفاظ میں ایک نارمل آدمی کو جہاں کچھ نظر نہیں آتا وہاں نیوراٹک کو بھوت اور عفریت نظر آتے ہیں ۔ ایسے شخص کو زندگی اپنی تمام حلاوتوں اور سحر طرازیوں کے باوجود بے مزہ اور بے کیف معلوم ہوتی ہے بسا اوقات زبان حال سے وہ یوں کہتا نظر آتا ہے ۔

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بے زار بیٹھے ہیں

نیوراٹک کا تعلق زندگی اور لوازمات زندگی سے محض شکست خوردہ رقیب کا ہو کر رہ جاتا ہے ۔ صرف کھوکھلے اور کمزور پہلوؤں پر اس کی نظر رہتی ہے ۔ جس سے وہ متوحش اور دل برداشتہ نظر آتا ہے ۔ محرومی و حرماں نصیبی کا احساس اس میں روز بروز قوی تر بنتا جاتا ہے نیوراٹک بظاہر نارمل نظر آتا ہے ، لیکن اس کے ساتھ لین دین اور نشست و برخاست اس کے قریب ترین ساتھیوں کے لیے بھی وبال جان بن جاتی ہے ۔

نیوراٹک میں قوت مدافعت کا مکمل طور پر فقدان ہوتا ہے ۔ ہر آنے والے کل سے وہ لرزہ براندام نظر آتا ہے ۔ اس کے لیے ہر آنے والا کل غربت افلاس اور مایوسیوں کے نئے عنوانات اپنے ساتھ لاتا ہے ۔ نارمل آدمی تعطیلات کے منتظر رہتے ہیں لیکن نیوراٹک کے نزدیک یہ ایک فضول چیز ہے، کیونکہ بقول اس کے کل پھر ورکنگ ڈے ہوگا ۔ اس احساس سے بھی ہر کا دل سرد پڑ جاتا ہے ۔ اور سیر و تفریح سے طبیعت اچاٹ ہو جاتی ہے ۔ نیوراٹک بظاہر باشعور اور ذی ہوش نظر

تا ہے، تاہم حقائق سے فرار کے لیے مزاجی کشیدگی، الجھن اور
سیوں کا سہارا لینا اس کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہے الجھن پریشانی
شت سیمابیت نیوراٹک کی وہ علامات ہیں۔ جو اس کو نارمل افراد
علیحدہ کرتی ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ عام آدمی نیو
سس یا اعصابی کشیدگی میں کیسے مبتلا ہو جاتا ہے، مشہور ماہر نفسیات
ائڈ کے نزدیک ہر طفل شیر خوار نارمل ہوتا ہے، لیکن عمر کے
اتھ ساتھ لاشعوری طور پر ایسی راہوں سے گزرتا ہے، یا ایسے
ربوں سے دوچار ہوتا ہے، جس کی وجہ سے وہ نیوراسس
عصابی کشیدگی) کا شکار ہو جاتا ہے، اس سے یہ ثابت ہوا
کسی شخص میں نیوراسس کی علامات دراصل اس کے بچپن کے
لط ماحول اور ناقص سرپرستی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ بچپن کا صرف
یک واقعہ یا ایک تجربہ آئندہ چل کر آدمی کو نیوراسس میں
بتلا کر دیتا ہے، فرائڈ کی رائے ہے کہ اعصابی کشیدگی یا نیوراسس
ماجی و اخلاقی ماحول اور فرد کی فطری خواہشات کے درمیان
یدا ہونے والے تصادم یا ذہنی دباؤ کے نقطۂ عروج کا نام
ہے۔ نفرت و محبت، بغض و عداوت، خوف، لالچ، دشمنی
ور بغاوت یہ وہ فطری تقاضے (NATURAL URGES)
ہیں۔ جو تقریباً ہر فرد میں کم و بیش پائے جاتے ہیں۔ تاہم ایک نارمل
آدمی ان تقاضوں کے تئیں صبر و ضبط سے کام لیتا ہے، یا دوسرے
الفاظ میں ان کو لگام دیے رہتا ہے۔ جبکہ نیوراٹک (مبتلائے
اعصابیت) کی لغت میں صبر و ضبط جیسے الفاظ کا مکمل طور پر
فقدان ہوتا ہے۔ سیمابیت، تشکیک، معمولی معمولی باتوں پر
آپے سے باہر ہو جانا یا مایوسیوں کے سمندر میں ہچکولے لینا
نیوراٹک (مبتلائے اعصابیت) کے روزانہ کے معمولات ہیں۔
نیوراٹک تعلیم بھی حاصل کرتا ہے۔ معمولی نوکری اور تجارت
سے لے کر بڑے بڑے عہدوں پر بھی فائز ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کی خصوصیات
یا مزاجی عدم توازن خود اس کے لیے بھی اور اس کے دوستوں
اور ماتحتوں کے لیے بھی درد سر بن جاتا ہے۔ نیوراٹک جب
عملی زندگی میں قدم رکھتا ہے تو اس کی مزاجی الجھن ایک بچے کی سی

معذوری و مجبوری کا احساس پیدا کر دیتی ہے۔ حقائق سے فرار کے
لیے کمزور تاویلوں کا سہارا لینا اس کی عادت بن جاتا ہے۔
احساس کمتری بھی نیوراٹک کے مزاج کا ایک حصہ بن
جاتا ہے۔ دوسروں کے عیوب اور عادتوں پر نظر رکھنا
اور دوسروں کی کمزوریوں کی نشان دہی کرنا اور ان کی حسب منشا
تاویل کرنا تاکہ خود اس کی کمزوریوں کی پردہ پوشی ہو سکے۔ نیوراٹک کا
مزاج بن جاتا ہے۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔ کہ نیوراسس کی تخم ریزی دراصل
بچپن کی ناقص تربیت کے سبب ہوتی ہے۔ جس کے برگ و بار آئندہ
زندگی میں نظر آتے ہیں۔

مجھے یہ کہنے میں پس و پیش نہیں ہے۔ کہ آج کے والدین
دراصل بچوں کو بہتر تربیت دینے میں قطعی طور پر ناکام ہو چکے ہیں۔ بہتر
تربیت کی بات تو دور رہی وہ اپنے بچوں میں غیر طبعی افکار
(ABNORMAL FEELINGS) پیدا کرنے میں ایک اہم کردار ادا
کر رہے ہیں۔ نتیجے کے طور پر آج کل کے نوعمر لڑکے لڑکیاں مختلف قسم کی ذہنی الجھنوں
میں گرفتار ہیں۔ ہمارے ملک میں والدین بچوں کو اسکولوں میں داخل کر کے
خود کو اپنے تربیتی فرض سے سبکدوش سمجھ لیتے ہیں۔ میری
رائے میں والدین کا یہ رویہ فرض منصبی سے فرار پر مبنی ہے۔
اسکول اور کالج تعلیم کے مرکز ہوتے ہیں۔ تربیت وہاں ایک
ذیلی چیز ہے۔ جبکہ بچوں کی سب سے بڑی تربیت گاہ ماں کی آغوش
اور سرپرستوں کی نگاہ، توجہ ہوتی ہے۔ یعنی گھر۔ چنانچہ کوئی وجہ
نہیں کہ ہم اسکول اور گھروں کی مربوط تعلیم و تربیت سے ایک ایسی نسل نہ
تیار کر سکیں۔ جو ہر لحاظ سے قابل تقلید اور تمام سماجی اور مزاجی
آلودگیوں سے پاک ہو۔ اتنا ضرور ہے کہ تربیت کے دوران
والدین کو اپنی عادتوں پر کنٹرول کے ساتھ ساتھ صبر و ضبط
اور مربیانہ شعور سے بھی کام لینا پڑے گا۔ تاکہ بچے کا لاشعور
مکمل طور پر ان جراثیم سے پاک رہے۔ جو آگے چل کر زندگی میں
مختلف ذہنی و جسمانی بیماریوں کا باعث ہوتے ہیں۔ جنکی ذمہ داری
بعد میں کوئی بھی اپنے سر نہیں لیتا۔ اس اصول کو وہ ممالک زیادہ بہتر

طور پر اپنا سکتے ہیں۔ جن کی آبادی محدود ہے۔ اسی طرح سے والدین بھی جو تحلیل الاولاد ہیں جو ان اصولوں کے مطابق اپنے بچوں کی تربیت موثر انداز میں کر سکتے ہیں۔ کیونکہ تعلیم کے دوران تربیت کا فقدان تعلیم پر بھی بری طرح اثر انداز ہوتا ہے۔ اور اگر تعلیم محفوظ بھی رہی۔ تو لڑکپن اور جوانی کی منزلیں گزار کر آدمی عملی زندگی میں قدم رکھتا ہے تو اس فقدان کا تلخ نتیجہ سامنے آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے سامنے بلا تفریق جنس ایسے بہت سے افراد کی مثالیں موجود ہیں۔ جو باوجود تعلیم یافتہ ہونے کے نہایت بدمزاج اور بدکردار ہوتے ہیں جھوٹ فریب دیگر اخلاقی برائیاں اور ذہنی الجھنیں ان کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہیں۔

ہر شعبۂ زندگی میں ایسے افراد پائے جاتے ہیں اور آئندہ چل کر وہ اپنے بچوں کو بھی بہترین تربیت دینے سے معذور رہتے ہیں۔ بچوں کی تربیت کے لیے کوئی قاعدہ کلیہ متعین کر لینا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ یہ تربیت حالات والدین یا سرپرستوں کے فہم و شعور اور ان کی حکمت عملی پر منحصر ہوتی ہے۔

آج کل بچوں اور نوعمر لڑکوں میں بڑھتے ہوئے مجرمانہ رجحانات پر کافی تبصرے ہو رہے ہیں۔ تجربوں اور مشاہدوں نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ نئی نسل میں اس قسم کے رجحانات کا پایا جانا دراصل نیوراسس (اعصابیت) ہی کا نتیجہ ہے۔ اسی لیے جدید نفسیات میں مجرموں کو بھی نیوراٹک (مبتلائے اعصابیت) افراد کے زمرے میں شامل کیا جاتا ہے اور ان کے علاج کے لیے بھی وہی طریقے اپنائے جاتے ہیں جو ایک نیوراٹک کے علاج کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ ان رجحانات کی وجہ بھی والدین یا سرپرستوں کا اپنے بچوں کی تربیت کے تئیں عدم دلچسپی یا منفی طور طریقے یا منفی انداز فکر ہے۔ غلط ماحول اور ناقص تربیت کی وجہ سے بچوں اور نوعمر لڑکے اور لڑکیوں میں مجرمانہ اور باغیانہ رجحانات پختہ سے پختہ تر ہوتے جا رہے ہیں ساتھ علاوہ بچوں کے اندر نیوراٹک یا اعصابی کشیدگی کی علامات کے فروغ پانے کا ایک بڑا اور عام سبب ماں باپ کی باہمی رنجش اور تکرار بھی ہے۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ ماں باپ یا سرپرست اپنے باہمی جھگڑوں کے سلسلے میں اپنے معصوم بچوں کو آلۂ کار بناتے ہیں اور ایک دوسرے کو اخلاقی طور پر شکست دینے کے لیے وہ اپنے بچوں کو شطرنج کے مہروں کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ اس کردار کی وجہ سے بچوں میں خوف اور غصے کے احساسات پیدا ہونے لگتے ہیں جو ان کے ذہنی ارتقاء کو بری طرح متاثر کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معصوم بچہ کسی ایک فریق کا حلیف بن کر رہ جاتا ہے رفتہ رفتہ عمر کے ساتھ ساتھ اس کے دل و دماغ میں ایسے خیالات پروان چڑھنے لگتے ہیں جو ماں باپ کے کردار کو اس کی نگاہ میں مشکوک بنا دیتے ہیں۔

نیوراسس (اعصابیت) میں مبتلا شخص کے علاج کے لیے سب سے پہلے ضروری ہے کہ اسے اس کے وجود کی اہمیت کا احساس دلایا جائے۔ اس کے لاشعور کو تمام آلودگیوں سے پاک کیا جائے اور اس میں از سر نو صحت مند احساسات کی تخم ریزی کی جائے۔ اور مزید برآں اس کو یہ احساس دلایا جائے کہ وہ دوسروں کی طرح ایک کارآمد اور باصلاحیت انسان ہے اور اپنے ساتھیوں خاندان اور ملک و قوم کے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ بعض اوقات نیوراسس مختلف جسمانی بیماریوں مثلاً کمزوری فالج دورے، ضعف بصارت اور بے خوابی کا بھی سبب بن جاتی ہے۔ ایسی صورت میں نیوراسس کے مریض کو کسی ماہر نفسیات کے پاس لے جانا چاہیئے۔ آج کل ملک میں بھی نفسیات کے مرکز تقریباً ہر شہر میں موجود ہیں۔



غزلیں

عتیق افریدی
عالمگیر طولہ خاں
رام پور ۲۴۴۹۰۱
یوپی

دو دلوں میں کون آخر کس کا آئینہ نہ تھا
اس حقیقت کو مگر اب تک کوئی سمجھا نہ تھا

چہرے چہرے پر بظاہر دوستی کے خول تھے
دشمنوں کی صف میں تھا وہ کون جو اپنا نہ تھا

ہوگئیں ہیں کس قدر حساس میری انگلیاں
آج گل چبھتے ہیں کل تک خار بھی چبھتا نہ تھا

کس کی نظریں تھیں نہیں تھی جن کو مری جستجو
کس کا دل تھا جو کبھی میرے لیے دھڑکا نہ تھا

اُن دلوں پر آج صدیوں کے دکھوں کا بوجھ ہے
جن سے اک پل کے لیے بھی بارِ غم اٹھتا نہ تھا

جو حقیقت میں بدل ہوتا میرے محبوب کا
حلقۂ احباب میں میرے کوئی ایسا نہ تھا

دست بستہ ہے سماعت میرے لفظوں پر عتیق
داستانِ دردِ دل پہلے کوئی سنتا نہ تھا

ظہیر غازی پوری
ریلوے آؤٹ ہٹمینٹس
ہزاری باغ بہار

ادائے واجبات آگئی
متاعِ غم جو ہات آگئی

درِ خیال جب بھی کھل گیا
سمٹ کے کائنات آگئی

چلا تھا چند گام ہی ابھی
کہ حدِ ممکنات آگئی

خلاؤں میں اسے اچھال دے
زبان پر جو بات آگئی

لہو لہان ہوگئی خوشی
کبھی جو میرے سات آگئی

کھلی تھی جب تک آنکھ دن رہا
میں سو گیا تو رات آگئی

حیات غائبانہ جہان میں
بطور واردات آگئی

حدِ تعینات سے پرے
کہاں غزل کی بات آگئی

عارف نجمی
۲۴۔اے۔ کٹرہ ابوتراب خاں
لکھنؤ

... اب رسّیاں کھول دو
... ہے کشتیاں کھول دو

... یں جاگ اٹھیں دستِ احساس کی
اس سے بہتر ہے خود مٹھیاں کھول دو

بوند تم پر کوئی بادلوں کی پڑے
اس سے پہلے ہی تم چھتریاں کھول دو

تم کو چلنے میں دشواریاں ہوں اگر
خود سے پہنی ہوئی بیڑیاں کھول دو

چاہتے ہو اگر دھوپ کی روشنی
اب بھی باقی ہے دن کھڑکیاں کھول دو

اختر علوی
بہار شریف، بہار
۸۰۳۱۰۱

ہجرت کرنے والے پرندے

آپ نے بارہا چاندنی راتوں میں سفید اور سیاہ پرندوں کے غول کے غول قطار در قطار پرواز کرتے ہوئے دیکھے ہوں گے اور ان کے منظم سفر کو دیکھ کر حیرت بھی ہوئی ہوگی۔ ہم ان پرندوں کا ذکر نہیں کر رہے ہیں جو دن بھر دانہ چگ کر شام کو اپنے آشیانوں یا رَین بسیروں کو لوٹتے ہیں بلکہ ہم ان جاں باز اور طاقتور پرندوں کا ذکر کر رہے ہیں جو اپنے وطن سے ہزاروں میل دور دراز مقامات تک عارضی طور پر ہجرت کرتے ہیں، اگر ان کی مستقل سکونت تو اپنے وطن ہی میں رہتی ہے۔ دکن میں جب آموں کا موسم شروع ہوتا ہے، آم کے درخت ہرے بھرے پتوں سے لد جاتے ہیں، نئی نئی کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں اور نازک ٹہنیوں پر پھولوں کے خوشے جھومنے لگتے ہیں۔ آموں کی بہار کی جلوہ آرائیوں کے ساتھ ساتھ نئے نئے پرند بھی درختوں پر نمودار ہونے لگتے ہیں۔ جو پرند صرف اس موسم میں ہی نظر آتے ہیں ان میں قابل ذکر کوئل، بلبل، ہریل اور شاما [illegible] ہیں یہ پھولوں کا منھ چومتے ہوئے نغمہ ریز ہوتے ہیں ان کی میٹھی اور سریلی تانیں دل و جگر میں سرور اور سرمستی کی کیفیات پیدا کرتی ہیں لیکن بہار کے اختتام پر یہ پرندے اپنے مقامات کو واپس چلے جاتے ہیں۔

شمالی اور جنوبی علاقوں میں اکثر جانور مثلاً جل تھیلے AMPHIBIA رینگنے والے اور سمن ولے جانور تو موسم سرما کی ناخوشگوار مدت سرمائی نیند میں گذار دیتے ہیں اس موسم میں ان کا درجۂ حرارت گھٹ جاتا ہے اور یہ بغیر کسی حرکت کے خاموش پڑے رہتے ہیں صرف سانسوں کی ڈور باقی رہتی ہے اور جسم میں جمع شدہ چربی غذا کا کام دیتی ہے۔ برخلاف ان کے جسمانی درجۂ حرارت بہت زیادہ ہوتا ہے اس لیے یہ سرما نہیں گذار سکتے۔ اس کے علاوہ غذائی قلت اور دراز دراجی درپیش ہوتی ہیں۔ اس لیے ان مشکلات کے پیش نظر بعض باہمت اپنے وطن سے ہزاروں میل دور معتدل مقامات کی طرف پرواز کرتے ہیں جہاں انھیں رہائشی آرام اور غذائی سہولت کے بہتر سے بہتر آسانی فراہم ہو سکتی ہیں ان کا سفر ہجرت ہمیشہ مخالف اور طویل مسافت پر مشتمل ہوتا ہے اور وہ اکثر شمال سے ہزاروں میل جنوب کی طرف پرواز کرتے ہیں۔

موسم سرما کے آغاز سے ہی ایسے پرندے ہجرت کی تیاری میں لگ جاتے ہیں سب سے پہلے یہ اپنے بچوں کی حفاظت، آرام اور غذا کا سامان مہیا کر دیتے ہیں حتیٰ کہ ان کو سردی سے محفوظ رکھنے کے لیے وہ آشیانوں میں اپنے بال و پر تک نوچ کر ایک گرم بستر تیار کر دیتے ہیں اس کے بعد وہ ٹکڑیوں کی شکل میں ایک جگہ جمع ہونے لگتے ہیں جہاں کئی دن تک ان کی مشقی پرواز ہوتی رہتی ہیں۔ ہجرت کے کئی دن قبل ہی سے بعض پرندے کافی غذا فراہم کر کے اپنے جسم کے اندر چربی کی شکل میں جمع کرنے لگتے ہیں اور وہ آغاز سفر تک کافی فربہ اور توانا ہو جاتے ہیں یہی چربی دورانِ سفر ان کی خوراک کا کام دیتی ہے اور ان کو منزلِ مقصود تک پہنچانے میں سودمند ثابت ہوتی ہے۔ ان اقسام میں قامت کے پرندے ہوتے ہیں جو اکثر دریاؤں اور تالابوں کے کنارے رہتے ہیں مثلاً مرغابیاں، بگلے، سارس اور بکالیاں

لیکن چند چھوٹے پرندے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی جسمانی حالت اس قابل نہیں ہوتی کہ وہ کافی مقدار میں خوراک حاصل کر کے چربی کی شکل میں جمع کر لیں۔ ایسے پرندے دوران سفر مختلف مقامات یعنی کھیتوں، وادیوں اور جنگلوں میں ٹھہر کر پھل پھلاری کھاتے اور دانہ دنکا چگتے چگاتے اطمینان سے اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔ ان میں چھوٹی چھوٹی اور خوبصورت گانے والی چڑیاں بھی ہوتی ہیں جو دوران سفر نغمے بکھیرتی اور مختلف غذائی مقامات پر قیام کرتی ہوئی اپنی منزل مقصود کی طرف پرواز کرتی رہتی ہیں۔ دورانِ سفر اکثر پرندوں کی ہلاکت بھی واقع ہوتی ہے وہ راتوں میں بجلی کے تاروں سے ٹکرا کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں بعض سمندروں میں لائٹ ہاؤس پر بڑی بڑی جالیاں لگا دی گئی ہیں تاکہ سمندر پر سے اڑنے والے پرندے رات میں ان جالیوں کے جھولوں میں رات گذار سکیں۔ جیسا کہ اوپر بتلایا گیا پرندے اپنے وطن ہی میں رہتے بستے ہیں لیکن موسم سرما کی ناخوشگواری، درجہ حرارت میں قابل لحاظ کمی، اور غذائی مشکلات درپیش ہونے پر وہ ترک وطن پر مجبور ہو جاتے ہیں لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنی سمت کا تعین، سفر کا وقت، فاصلہ کا اندازہ اور دورانِ پرواز پیش آنے والے مراحل اور مشکلات کو کس طرح حل کرتے ہیں؟ آخر ان پرندوں کو ان سب باتوں کا کس طرح علم یا اندازہ ہوتا ہوگا؟ ہمیشہ سے ہی ایسے سوالات انسانی ذہن میں ابھرتے رہے ہیں چنانچہ اس بارے میں مختلف نظریات بھی پیش کیے جاتے رہے۔ ۱۹۰۰ سے ۱۹۴۰ تک کے عرصہ میں سائنس دانوں کے انہماک اور انتھک تحقیقاتی نتائج کے بعد مختلف اقسام کے پرندوں کی گرمائی و سرمائی ہجرت کے فاصلوں اور ان کے اختیار کردہ راستوں، طے شدہ فاصلوں اور ان کے سفر سے متعلق کثیر معلومات جمع کی گئیں جو نہایت دلچسپ اور پُر لطف ہیں لیکن ۱۹۴۰ تک کے تمام نظریات کو قیاسات پر محمول کیا گیا کیونکہ سائنسی تجربہ کے بعد یہ تسلی بخش ثابت نہیں ہوئے۔

برطانیہ کے ڈاکٹر میتھوز اور ڈاکٹر کریمر نیز جرمنی کے سائنس دانوں کی انتھک مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے کہ ہم پرندوں سے متعلق ان کی سمت کا یقین اور اسی سمت میں ان کے سفر کی حرکتوں میں کامل یقین اور بھروسہ کے ساتھ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ میتھوز اور کریمر دونوں الگ الگ تجربہ کرتے ہوئے ایک مشترکہ نتیجے پر پہنچے انھوں نے اندازہ لگایا کہ سورج ان کی سمت کے تعین میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے چنانچہ تجربے کے لیے جب پرندوں کو کھلے آسمان کے نیچے آزاد کیا گیا تو ان کے پنجرے پر اسی سمت کی طرف اپنا رخ کیے بیٹھا دیکھا گیا جس سمت میں ان کو پرواز کرنا مقصود تھا۔ کچھ دیر کے لیے وہ اپنے پروں کو پھڑ پھڑا کر اپنے عزم سفر کا اظہار کرتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے چند لمحوں میں وہاں سے پرواز کر جاتے ہیں۔ ڈاکٹر کریمر نے عملی طور پر اس امر کی بھی وضاحت کر دی چنانچہ اس نے تجربے کے لیے ایک چھ گوشے والا پنجرہ بنایا جس کا نچلا حصہ شیشے کا بنا ہوا تھا جہاں سے پرندوں کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ بآسانی کیا جا سکتا تھا۔ اس پنجرے میں بہت سے ہجرتی پرندوں کو اسی سمت رُخ کرتے ہوئے دیکھا گیا جس سمت میں اس نوع کے جنگل کے آزاد پرندے پرواز کر رہے تھے۔ جب آئینوں کے ذریعہ مختلف پہلوؤں سے روشنی منعکس کی گئی تو پرندوں نے شعاع کے مطابق اپنی سمت کو تبدیل کر لیا اور اکثر یہ بھی دیکھا گیا کہ دوران سفر جب سورج گھنے بادلوں میں چھپ جاتا ہے تو پرندے اپنا سفر ملتوی کر دیتے ہیں اور جب اس کی روشنی نظر آنے لگتی ہے تو پھر اپنا سفر جاری کر دیتے ہیں۔ یہاں یہ بات صاف طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ سورج کی روشنی یا شفاف آسمان پرندوں کی پرواز میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جب پرندے ایک مرتبہ سورج کی روشنی کی مدد سے اپنے سفر کی سمت کا یقین کر لیتے ہیں تو اسی سمت میں اپنی پرواز جاری رکھتے ہیں دوران سفر جب ان کے جسم پر سورج کی ہلکی سی کرن یا روشنی پڑتی ہے تو وہ سورج کی حرکت اور اس سے مغرب اور شمال و جنوب کی سمتوں کا یقین کر لیتے ہیں نیز یہ بھی اندازہ لگاتے ہیں کہ انھوں نے اب تک کتنی مسافت طے کی ہے اور ابھی ان کی منزلِ مقصود کتنی دور ہے، یہ تمام باتیں دن میں سفر کرنے والے پرندوں سے متعلق ہیں مگر بعض



پرندے ایسے بھی ہوتے ہیں جو صرف رات کے وقت ہی اپنا سفر جاری رکھتے ہیں اور جونہی صبح صادق کی روشنی نمودار ہوتی ہے یہ پرندے پُر بہار گھنے جنگلات میں اتر جاتے ہیں جہاں گھنیری چھاؤں میں آرام کرتے اور پھل پھلاری سے اپنا پیٹ بھرتے ہیں گویا تمام دن پکنک سی دھوم مچی رہتی ہے ایک عجیب سماں بندھا رہتا ہے۔ کوئی پرندہ اپنے ملائم پروں کو پھیلا کے کسی ننھی سی ڈالی پر جھومنے لگتا ہے۔ بعض پرندے ننھی ننھی ڈالیوں پر نغمہ سرا ہوتے ہیں گویا ان نغموں سے جنگل وادیٔ طیور خوش الحان بن جاتا ہے۔ جیسے ہی سورج کی کرنیں پربت کے اس پار نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں تو یہ عیش و طرب کی محفل بھی ختم ہو جاتی ہے۔ جیسے جیسے آسمان پر چاند کائنات میں ہر سو اپنی روشنی بکھیرتا ہوا نمودار ہوتا ہے اس کی ٹھنڈی چاندنی میں یہ پرندے اپنی منزلِ مقصود کی طرف پرواز کرنے لگتے ہیں یہ طائرانِ شب اپنی سمت کا تعین چند مخصوص ستاروں کی مدد سے کرتے ہیں۔

سائنس دانوں کے صبر آزما اور دیدہ ریز تجربات سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ نباتات اور حیوانات بھی وقت جانتے اور بتلاتے ہیں چنانچہ اب یہ تسلیم کر لیا گیا کہ ہر جاندار کے جسم کے اندر مخفی گھڑی پائی جاتی ہے جس کو حیاتیاتی گھڑی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جو روزمرّہ کے افعال میں توازن اور ہم آہنگی کو برقرار رکھنے میں معاون ثابت ہوتی ہے یہ جاندار چاہے حقیر خلائی مخلوق ہو یا عصرِ حاضر کا ترقی یافتہ انسان۔

سائنس کی زبان میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسانی قلب یا سینے میں حیاتیاتی گھڑی کا وجود پایا جاتا ہے چنانچہ تجربات سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ اسی کی بدولت پابند تہجد گزار اشخاص شب میں بالکل ٹھیک وقت پر خود بخود بیدار ہو جاتے ہیں اس کا تعین بھی کیا جا سکتا ہے۔ آپ رات میں ۲ بجے بیدار ہونے کے لیے گھڑی سرہانے رکھ کر سو جائیے، چند دن تک الارم ہی کے ذریعہ اٹھیے کچھ عرصہ میں آپ بغیر الارم ہی کے ٹھیک وقت مقررہ پر بیدار ہو جایا کریں گے۔ ماہرین طیور یہ جانتے ہیں کہ پرندوں میں بھی وقت کا صحیح شعور اور حافظہ کی شاندار قوتیں پائی جاتی ہیں جو آسمانی سفر کے لیے نہایت ہی ضروری ہیں۔ پرندے ٹھیک وقت پر جاگتے بھی ہیں اور اپنے آشیانوں میں بسیرا بھی لیتے ہیں اور وہ منظم طریقہ پر فضائی اور خلائی راہوں پر پرواز کرتے ہیں، نہایت عمدگی اور باقاعدگی کے ساتھ وقت پر سارے امور انجام دیتے ہیں چنانچہ مرغانِ سحر اس کی بہترین مثال ہیں جو فجر کے وقت کی صحیح اطلاع دیتے ہیں۔ آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ سورج کی روشنی جیسے جیسے زوال پذیر ہوتی ہے نرم و نازک بیلوں اور پودوں کے پتے بھی مرجھانے لگتے ہیں اور شبِ تاریک کی آغوش میں آرام گزیں ہو جاتے ہیں اور نسیمِ سحر کی آمد آمد پر غسلِ شبنم سے حیات نو پانے لگتے ہیں۔ سائنسی تجربات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پرندے فضائے آسمان کی بلندیوں اور نیلگوں پہنائیوں میں شب و روز ملکوتی سیر میں مصروف پائے جاتے ہیں۔ طائرانِ فلک کا سید قدرتاً باطنی علم و آگہی یا عرفانِ روحانی کی نعمتوں اور اسرار و رموزِ فطرت سے معمور نظر آتا ہے۔ مگر انسان ان طائرانِ فلک کی سیر و سیاحت کے اسرار و رموز اور ان کے وسیع علم و آگہی سے ابھی بے خبر ہے۔

★

نیا دور کا منشی نولکشور نمبر

اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لیے منشی نولکشور کی بیش بہا اور بے مثال خدمات پر انھیں خراجِ تحسین پیش کرنے کی غرض سے نیا دور جلد میں ایک خصوصی نولکشور نمبر شائع کرنے جا رہا ہے۔ جس میں منشی نولکشور کی حیات اور کارناموں پر ملک کے ممتاز اور مقتدر ادیبوں کے مضامین کے علاوہ ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر اہم شعراء کی نظمیں بھی شائع ہوں گی۔

ادارہ

(افسانہ)

اخلاق حسین عارفؔ
۱۵ - بارود خانہ لکھنؤ - ۲۲۶۰۰۱

نوبت

بنیا کی ماں تیل کے گرم گرم لڈو مٹھی میں رونلتے ہوئے بولیں۔

"تھوڑے لڈو اپنے ساتھ کے لیے رکھ لو۔۔۔! لوٹا بھی ساتھ لے لینا دس بارہ منٹیل کا سفر ہے راہ میں پیاس لگی تو۔۔۔!

"ہاں۔ رکھ دو اس میں تھوڑے لڈو" گیان پرکاش نے ان کی طرف تھیلا بڑھاتے ہوئے کہا۔

بنیا کی ماں نے جھولا ان کے ہاتھ سے لے لیا اور تھوڑے لڈو اس میں رکھ دیے اور چار پانچ انھیں دیتے ہوئے بولیں۔

"لو۔۔۔ انھیں کھا لو۔ مٹھاس ہے شگن بھی ہو جائے گا ایشور کرے تمھارا جانا سپھل ہو"

ان کی ورک شاپ میں کارتک پورنیما کی تعطیل تھی ویسے بھی احتیاطاً انھوں نے ایک دن کی رخصت اور لے لی تھی۔ کیوں کہ انھیں بنیا کی بات چیت پکی کرنی تھی اور وہ اسی سلسلہ میں وہاں جا رہے تھے جہاں لڑکی کی بات چیت چل رہی تھی۔

لڈو کھا کر انھوں نے پانی پیا۔ پان کلے میں دبا کر اوپر سے تبا کو پھانکی انگوچھا کاندھے پر ڈال۔ جھولا ہاتھ میں لٹکا کر گھر سے نکل پڑے۔ بس اسٹینڈ تک جاتے ہوئے راستہ میں انھیں اپنے ہونے والے سمدھی کا خیال آیا اور ان کے مقابلے میں اپنی غریبی کا احساس کھٹکا مگر وہ اپنی لاڈلی بیٹی کے رشتہ کے سلسلے میں آشا اور نراشا کے بھنور میں ڈوبتے ابھرتے ہر طرح آزمائش کے لیے اپنے کو تیار کرنے لگے۔ انھوں نے سوچا آدمی کوشش کرتا ہے بھگوان اسے سپھل کرتا ہے سب کام اسی کے ہاتھ میں ہے اس خیال نے انھیں کچھ ڈھارس بندھائی اور اپنے مشن پر ان کے قدم تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔

بس سے اتر کر بری داس پور پہنچتے پہنچتے ایک گھڑی دن چڑھ گیا۔ کسان اپنے کھیتوں میں نرائی کر رہے تھے۔ کچھ نہر سے پانی لے کر کھیتوں کو سینچ رہے تھے۔ کھیتوں کے درمیان پگڈنڈی پر چل کر آموں کے باغ کو پار کرتے ہوئے جب وہ گاؤں کے اس پہنچے تو ایک آدمی سے جو ادھر سے آ رہا تھا پوچھا۔

"بھیا۔۔۔! شری گرجا شنکر جی کا مکان کون سا ہے؟"

"وہ سامنے سفیدی سے پتا ہوا اونچا مکان انہی کا ہے"

اس نے ہاتھ سے کھمبے کی طرف اشارہ کرکے بتایا۔

گیان پرکاش نے گرجا شنکر کے مکان پر پہنچ کر آواز دی تو وہ خود باہر آ کر ان سے بڑے تپاک سے ملے۔ انھیں بیٹھکے میں بٹھا کر مزاج پرسی کے بعد ملے۔

"سب ٹھیک ٹھاک ہے نا۔۔۔! گھر میں سب کشل منگل ہے۔۔۔!!"

"ایشور کی کرپا ہے" انھوں نے جواب دیا۔ چاہا کہ وقت بتائے بنا بات اسی وقت شروع کر دیں مگر موقع محل نہ پا کر چپ رہے۔

مہمان کا ہاتھ منھ دھلا کر چل پان کے بعد حقہ کا کش لگا کر دھواں بکھیرتے ہوئے گرجا شنکر بولے۔

"ہاں ... کیا حکم ہے!"

گیان پرکاش نے الفاظ تول تول کر جملہ مرتب کیا۔

"آپ نے پچھلے دنوں جس سلسلے میں کملیش کی ماں اور اس کی بہن کو بھیجا تھا...

... سوچا کہ خود ہی چل کر مل آؤں۔"

"ہاں۔ ہاں ... میں سمجھا ... اچھا ہوا آپ خود ہی آ گئے ... آپ کے یہاں کملیش کی بات چیت چل ہی رہی تھی کہ ادھر پرسوں ترالانگر سے ایک اور رشتہ آ گیا" انھوں نے جملہ نا تمام چھوڑ کر حقہ کا کش لیا اور اس کے دھوئیں کے ساتھ اپنی ادھوری بات بھی بکھیر دی" وہ بیس ہزار نقد دینے کو کہہ گئے ہیں"

گیان پرکاش کے کانوں کے پردوں سے ٹکراتی ہوئی ان کی یہ بات دماغ میں تیر کی طرح لگی۔

اپنی بے بسی پر یا شاید حقہ سے نکلے ہوئے مٹیالے دھوئیں سے ان کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ انھیں اپنی تنگ دستی کا وہ احساس دوبارہ ستانے لگا جو گھر سے بس اڈے تک آتے وقت راستہ میں ان کے دماغ میں ابھرا تھا۔

"ہوں —" انھوں نے ڈوبی ہوئی بھاری آواز میں ہنکاری بھری۔

"پر میں نے ابھی انھیں زبان نہیں دی ہے .. میں نے سوچا اس بارے میں آپ سے دو ٹوک باتیں کر لوں" گرجا شنکر اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے جیسے وہ اپنے مقابل سے طاقت آزمائی پر تلے ہوئے تھے۔

گیان پرکاش کو یہ رشتہ ہر طرح پسند تھا مگر اس گتھی کو وہ کس طرح سلجھائیں یہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اتنے میں گرجا شنکر پھر بولے۔

"اس کے علاوہ شہر سے پڑھ لکھ کر آئے ہوئے چھوکروں کو تو آپ جانتے ہی ہیں ...

ان کی بھی رائے لینی ضروری ہے نا —!"

"ہاں ہاں۔ یہ تو بڑی عمدہ بات ہے"

دن ڈھلے مہمان کو رخصت کر کے کملیش کے پتا گھر میں آ کر اس کی ماں سے بولے" لڑکی تو تمھاری دیکھی بھالی ہے!"

"ہاں۔ بڑی سندر، پڑھی لکھی اور سگھڑ ہے"

"پر بہو کے سوا تمھارے ہاتھ شاید ہی کچھ لگے — یہ میرا اپنا خیال ہے"

"ابھی بات تو پکی ہوئی نہیں... ہماری نگاہ میں دو گھر ہیں ... دونوں کو پرکھ کر ٹھنڈے دل سے سوچ بچار کر لو ... میری رائے میں تو کملیش اور بینا کی جوڑی اچھی رہے گی ویسے جیسی تمہاری مرضی" وہ سوپ سے چاول پھٹکتے ہوئے بولیں۔

"میرے خیال میں ترالانگر والی بات زیادہ اچھی رہے گی کیوں کہ وہاں سے بیس ہزار مل رہے ہیں"

"بینا کے یہاں سے بھی تو دس ہزار مل رہے ہیں ... اور پھر ایسی دیکھی بھالی لڑکی۔ گن ونتی پڑھی لکھی، سمجھ دار، چندر جیسی سندر ... یہ سب کچھ کیا کم ہے"

گیان پرکاش گھر لوٹے تو آنگن میں بچھی ہوئی کھاٹ پر اپنی پتنی کے پاس ہی بیٹھ گئے۔ جوتے اتار کر ایک طرف سرکا دیے ہاتھ منھ دھو کر انگوچھے سے پونچھنے لگے تو بینا کی ماں بولی

"کیا خبر لائے!"

"بات پکی ہوتی مشکل نظر آتی ہے" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولے

"کیوں ... !کیا بات ہوئی .... !!" وہ ہراساں ہو کر بولیں۔

"بڑے آدمی ہیں ... اپنی ٹکر کا ناطہ ڈھونڈھتے ہیں"

"پھر بھی کیا بات چیت ہوئی؟"

"سوچ بچار کر جواب دیں گے — ایک اور جگہ سے بات آئی ہے وہ بیس ہزار دے رہے ہیں"

"تم نے دس ہزار دینے والی بات کان میں ڈال دی ہے نا —!"

"ہاں ڈال تو دی۔ مگر کہاں دس کہاں بیس ہزار... دگنے کا فرق ہے"
انھوں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا اور سوچ میں ڈوب گئے۔
ادھر گرجا شنکر کے مکان سے باہر جانے کے بعد کملیش ماں کے پاس آکر بولا۔
"ماں — ! جب بینا سگھڑ، پڑھی لکھی اور سندر ہے تو باپو کیسے پہلے دوسری لڑکی کیوں باندھ رہے ہیں — ؟
"تمھارے باپو چاہتے ہیں کہ تمھارا جیون سکھ اور شانتی سے بیتے اس لیے اچھے گھر میں رشتہ کی تلاش میں ہیں" ماں نے بیٹے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔
"پر ماں۔ سکھ اور شانتی روپیوں سے نہیں... ہردے کے ملاپ سے ملتی ہے"
ماں اپنے بیٹے کا مطلب سمجھ گئی مگر منھ سے کچھ نہ بولی۔
کملیش نے جیسے تیسے وہ رات کاٹی۔ صبح اٹھ کر ضروریات سے فراغت پاکر وہ شہر چل پڑا۔ آکاش پر چاروں طرف مٹیالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ کھیتوں میں ہر طرف ہریالی پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا کے ٹھنڈے جھونکے آتے اور اسے چھوتے ہوئے گزر جاتے۔ وہ اپنے مشن پر جاتے ہوئے بڑی مسرت محسوس کر رہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بہت بڑی مہم سر کرنے جا رہا ہے۔
بہت دن کی بات ہے جب اس نے بینا کو دیکھا تھا مگر جب اس نے اپنی بہن سے جو ماں کے ساتھ اسے دیکھنے گئی تھی اس کی تعریف سنی تھی تو اسے اپنانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ لتا نے اس سے کہا تھا۔
"ارے بھیا — ! بینا اتنی سندر ہے کہ بیان نہیں کرسکتی... بڑی سندر....
ہاں، اتنی سندر جیسے چندرما... بھیا میں تو اسی کو اپنی بھابی بناؤں گی...
سنا تم نے... !!"
اور لتا نے سچ ہی تو کہا تھا۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ اسی چندرما کے درشن کے لیے آکاش کی اونچائیوں کو چیرتا ہوا اپسراؤں کے دیش کی طرف اڑتا چلا جا رہا ہو۔
شہر کے بس اڈہ پر اتر کر وہ رکشہ پر بیٹھا اور راجیندر نگر کی طرف چل پڑا۔ محلہ میں گھستے ہی پہلے موڑ پر اس نے ایک لڑکی سے پوچھا۔
"میں نے کہا — میرا مطلب ہے گیان پرکاش جی کا مکان کدھر ہے — !"
لڑکی کی بڑی بڑی نشیلی آنکھیں، کالے گھونگھریالے بال گٹھا ہوا بدن، گورا رنگ، چال مستانہ، گویا بجلی کوندر ہی تھی۔
"کہاں سے آئے ہیں آپ — !" گویا جل ترنگ بج اٹھا۔
"جی... جی، میں ہری داس پور سے آ رہا..."
ہری داس پور۔ ایک نوجوان صاف کرتا دھوتی جواہر بنڈی پہنے ہوئے شریف صورت لڑکی جھجکی — ساری کا پلو گھسیٹ کر گھونگھٹ نکالتے ہوئے اس نے سوچا۔
جانے کون ہے.... کہیں.... کہیں وہی تو...
پھر آہستہ سے بولی۔
"آیے میرے ساتھ"
کملیش کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ رکشا والے کو کرایہ دے کر پیچھے پیچھے ہولیا۔ ابھی پندرہ بیس قدم ہی چلا ہوگا کہ ایک مکان آگیا وہاں پل بھر رک کر دوسری طرف منھ پھیرے پھیرے وہ بولی۔
میں باپو جی کو بھیجتی ہوں — آپ یہیں رکیے"۔
"اچھا... تو آپ..." کملیش کا من خوشی سے ناچنے لگا۔ اسے ایسا لگا جیسے چندرما بادلوں میں چھپ گیا اور ساری دھرتی پر اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا۔ ابھی وہ درشن کی خوشی اور نظروں سے اوجھل ہونے کی کسک سے دوچار ہو ہی رہا

(بقیہ صفحہ ۴۴ پر)

اطفال نمبر

قارئین کے تاثرات

ڈاکٹر محمود الٰہی صدر شعبہ اردو گورکھپور یونیورسٹی

یہ بڑی مسرت اور علامت ہے کہ بچوں کے بین الاقوامی سال کا احترام اردو والوں نے بھی کیا اور انھوں نے اس کی تقریبات میں شرکت کی تصنیفات و تالیفات کے ساتھ کی۔

میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ اردو میں بچوں کا ادب بس برائے نام ہے ور میں یہ بھی نہیں کہوں گا کہ ہمارے اچھے فنکاروں نے اس کی تشکیل و تزئین میں اپنا خون جگر صرف نہیں کیا۔ لیکن میں اس حقیقت کا ضرور اعتراف کروں گا کہ بچوں کے ادب کی طرف تمام تر متوجہ نہیں ہوئے۔ ۱۹۷۹ء میں بچوں کا جو ادب اردو میں سامنے آیا ہے۔ اس کی حیثیت تلافی مافات کی ہے۔

بعض رسالوں نے بچوں کا ادب نمبر شائع کیا ہے اور بلا شبہ نیا دور ان سب میں ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔

نیا دور کے اس ضخیم نمبر میں ہر عمر کے بچوں کے لیے مواد موجود ہے، یہی نہیں ان میں ایسے مضامین بھی ہیں جو بچوں کے ادب کے بارے میں ایک سب لائق تنقید کا درجہ رکھتے ہیں۔

میں نیا دور کے ارباب حل و عقد کو ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں مجھے یقین ہے کہ اس سے ادیبوں کو نیا حوصلہ ملے گا اور وہ بچوں کے ادب کی طرف پہلے سے زیادہ انہماک کے ساتھ متوجہ ہوں گے۔

حکم چند نیّر صدر شعبہ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی

نیا دور کا اطفال نمبر ملا۔ بہت وقیع اور مفید مضامین جمع کرکے شائع کرنے پر مبارکباد قبول فرمائیے۔ آپ نے یہ اچھا کیا کہ بچوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر مواد فراہم کیا ہے۔ نیا دور کی خصوصی نمبروں کی روایت کو آگے بڑھائیے اور کافی پہلے سے اعلان شائع کرکے ادیبوں اور شاعروں کو کافی وقت دیجیے کہ وہ خصوصی نمبر کے لیے خصوصی تخلیقات پیش کر سکیں۔

کاظم علی خاں لکھنؤ۔ نیا دور کا اطفال نمبر دیکھا۔ آپ کی محنت پر داد اور کامیابی پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ طلبہ کے خصوصی شمارے میں بہت کچھ ہے۔ اردو رسائل کے لیے یہ نمبر مشعل راہ ہے۔ افسوس کہ آپ کے حکم کے باوجود وقت کمی کے باعث میں بیت بازی پر کچھ نہ لکھ سکا۔ اس کے معذرت خواہ ہوں۔

ڈاکٹر ذکی کاکوروی (لکھنؤ) نیا دور کا اطفال نمبر نظر نواز ہوا۔ طبیعت خوش ہوگئی۔ صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے نیا دور کا یہ خصوصی نمبر ہمارے بچوں کے ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ بین الاقوامی سال کے موقع پر ملک کے متعدد رسائل نے خصوصی نمبر شائع کیے لیکن نیا دور کے "اطفال نمبر" کو سب پر فوقیت ہے۔ آپ کی حسن ترتیب اور نامور ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات نے نیا دور کے اطفال نمبر میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ اتنا دلکش معیاری اور جاندار نمبر نکالنے پر آپ اور آپ کے جوائنٹ ایڈیٹر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

سیفی سرونجی (بجنور یوپی)

نیا دور کا اطفال نمبر باصرہ نواز ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے اس خصوصی نمبر کو جس محنت و کاوش سے سجا کر دلکش اور معیاری بنایا ہے وہ آپ کی بے مثال لگن اور بے پناہ خلوص کا نتیجہ ہے۔ اس سلسلے میں آپ کی انتھک کوششوں کو جس قدر سراہا جائے کم ہے۔ اس کامیاب نمبر نکالنے پر میں ادارے کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

عبد النافع قدوائی لکھنؤ

نیا دور کا اطفال نمبر موصول ہوا۔ بچوں کے عالمی سال کے موقع پر یوں تو اردو کے متعدد رسائل نے نمبر نکالے لیکن نیا دور کا معیار ان سے بلند ہے۔ مضامین کا اکٹھا کرنا اور پھر ان کی حسن ترتیب آسان کام نہیں لیکن آپ کی ہمت، محنت و حسن انتخاب کی داد دینا ہوگی۔

احقر کی جانب سے اتنا شاندار اور معیاری نمبر نکالنے پر دلی مبارکباد قبول کیجیے۔



نقد و تبصرہ

تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: **سنگ لرزاں** شاعر: شہنشاہ مرزا قیمت: ۱۲ روپے
ملنے کا پتہ: ۸۲، وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ

"سنگ لرزاں کے شاعر کے سامنے زندگی کا کوئی آدرش یا نصب العین نہیں۔ تمام خواب شکستہ اور پامال ہو چکے ہیں تمام آدرش کھوکھلے ثابت ہو چکے ہیں۔ اس لئے زبان میں کہیں تلخی اور بیزاری آگئی ہے تو کہیں محرومی اور تنہائی کا احساس۔ ۔ ۔ جہاں تک ان نظموں کے اسلوب کا سوال ہے میں اسے کوئی نام نہیں دینا چاہتا۔۔۔۔"

یہ ہیں وہ الفاظ جو شاعر نے خود اپنی شاعری کے حوالے سے پیش لفظ کے طور پر تحریر کیے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ یہ شاعری ہے یا نثری شاعری۔ بقول شاعر یہ ایک قسم کی نئی اور تجی شاعری ہے جس میں تخلیقی سطح پر باطن کی تہوں میں خفتہ جذبات کو جگانے کی کوشش کی گئی ہے۔

سنگ لرزاں کا شاعر نئی نسل کے شعراء کی جس صف سے تعلق رکھتا ہے میرے خیال میں شاید چند شعراء ایسے ہوں گے جن کا رشتہ روایت تہذیب، زبان و ادب سے اتنا گہرا اور مضبوط ہو۔ اس کے باوجود شاعر نے اپنے گرد و پیش کی تمام روایتوں، تہذیبوں، قدروں اور علامتوں کو توڑ کر اپنے لیے ایک نئی زبان اور اظہار کا ایک بالکل الگ رنگ ڈھنگ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ اس سخت اور کھردری زمین سے کہیں کہیں غزل کے انکھوے پھوٹتے نظر آتے ہیں اور ان پر جذبوں کی شبنم بھی قطرہ قطرہ گرتی ہے۔ مثلاً ؎

ہم اپنا درد ہنسی میں چھپائے بیٹھے ہیں
تمہارے بعد وہ سوتا تو خشک کیا ہوگا
ابھی تو عمر کے بہت سے مقام آئیں گے

ہجر اور وصل میں ہے فرق کیا
ہجر بھی وصال ہے یا وصال ہجر ہے

میں تم کو دیکھ کے خوشبو کا اہتمام کروں

اب ان کے اسپ سبک گام بھی پشیماں ہیں
عجب بساط ہے ہر شے پہ مات لکھی ہے

سنگ لرزاں کی نظموں میں یہ اور اس طرح کے پچاسوں مصرعے شاعر کی غزل زندگی کی مثال کے طور پر تلاش کیے جا سکتے ہیں جو شاعر کے اس دعوے کی تردید اور نفی کرتے ہیں کہ نئے تجربوں، نئے موضوعات اور عصری حسیت کے لیے تنگنائے غزل کے پیمانے میں مشکل ہی سے گنجائش نکل سکتی ہے" بیشتر نظموں میں شاعر کو نیند نہ آنے کی شکایت ہے جو یقیناً اس عہد کی برق رو اور مشینی زندگی کا انتہائی کرب انگیز المیہ ہے۔ دیکھئے رات بھر نیند نہ آنے کی شکایت مرزا غالب کو بھی رہی ہے۔

مجموعی طور پر یہ مجموعہ کلام۔ شہنشاہ مرزا کے ذہنی رویوں، سیاسی عقائد اور فکری بے گانگی، ذاتی بے رشتگی کے اظہار کا بھرپور عکاس ہے۔ امید ہے کہ بے مقصد شاعری کے اس ہنگامے میں سنگ لرزاں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ اور شعر و ادب پر گہری نگاہ رکھنے والوں کو جلد اپنی طرف متوجہ کر لے گا۔

اترپردیش اردو اکادمی کی امداد سے شائع کردہ اس مجموعہ کا سرورق صادق نے بنایا ہے اور انتخاب و ترتیب کے ذمہ دار ڈاکٹر نیر مسعود ہیں۔ کاغذ عمدہ ہے اور قیمت بھی کچھ زیادہ نہیں ہے

——— ساغر مہدی

نام کتاب: **رنگ سیاہ** شاعر: ذکاء الدین شایاں ناشر: ندرت پبلشرز وکٹوریہ اسٹریٹ۔ لکھنؤ۔ قیمت: ۵ روپے

یہ ذکاء الدین شایاں کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ شایاں جدید طرز فکر کے شاعر ہیں اور اپنے حلقے میں اپنی سنجیدگی طبع اور خلوص فکر کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ زیر نظر مجموعہ ان کا پہلا مجموعہ کلام ہے جس میں نئی غزل کے شائقین کے لیے کافی سرمایہ نشاط موجود ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیں:۔

ہے رنگ رنگ فضا سرخ رو ہیں سب منظر
لے گی آنکھ تو دیکھیں گے ہم بھی اب منظر
نڈھال سرخیاں بے خواب کروٹوں کا دھواں
بچھڑ کے ہم سے چلے ہیں تمام شب منظر

ہر نقش نرم و شیریں رنگ خیال سا ہے
وہ شیشۂ بدن بھی اب پائمال سا ہے

—— ڈاکٹر ذکیہ کاکوروی

نام کتاب: **کالے حرف** (افسانوی مجموعہ) مصنف: ظفر اقبال
قیمت: چھ روپے۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ دین و ادب۔ امین آباد لکھنؤ

"کالے حرف" — مایوسی و حرماں نصیبی، ناکامی و نامرادی، شب بیداری اور اشک سوزی کا دوسرا نام ہے۔ عصر حاضر کی زندگی میں یہ عناصر جس قدر کثیر تعداد میں ملتے ہیں۔ ان کا بھرپور مشاہدہ ایک حساس ادیب ہی کر سکتا ہے۔ اور ظفر اقبال نے ان کی موثر عکاسی اپنے افسانوں میں کی ہے۔ وہ حسن و عشق کی دلکش وادیوں میں نہیں بھٹکتے وہ تو بس اسٹینڈ پر، گلی کے نکڑ پر، سگریٹ والے کی دکان پر، ڈاکٹر کی ڈسپنسری پر، سڑکوں پر اور پلیٹ فارم پر دیکھے جاتے ہیں۔

کالے حرف ان کا ایک اچھا فن پارہ ہے۔ عصری زندگی کے تمام مسائل انھوں نے اس مختصر سے افسانے میں سمو دیے ہیں۔

ظفر اقبال نے جگہ جگہ خوبصورت تشبیہات و استعارات کا استعمال کیا ہے۔ ان کی جدت پسند طبیعت میدانِ تشبیہات و استعارات میں بھی کسی شہسوار سے پیچھے نہیں۔ بعض جگہ بڑی جدید تشبیہات سے کام لیا ہے۔ مثلاً کلثوم کے گورے چٹے رنگ کو "صابن کے سفید جھاگ" سے تشبیہ دی ہے۔ کلثوم کی خوبصورتی اور اس کے شوہر کی بدصورتی اور موٹے بھدے جسم کی تصویر کشی یوں کرتے ہیں جیسے سیاہ پہاڑ کے اوپر کوئی سفید بدلی آکر ٹھہر گئی ہو یا کسی پرانی کائی لگی دیوار پر سفید بیلے کی کلیاں کھِل کر مسکرا پڑی ہوں۔"

کالے حرف کے تمام افسانوں میں جو علامتیں (SYMBOLS) پیش کی گئی ہیں وہ خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ ابلاغ و ترسیل کے مقصد کو بھی پورا کرتی ہیں۔

—— سید طلعت رضا حسینی



(صفحہ ۴۵ کا بقیہ)

تھا کہ گیان پرکاش مسکراتے ہوئے باہر آئے اور بولے۔

"اچھے ہو بیٹا —! کہو کیسے آنا ہوا —!!"

آپ کے درشنوں کو' پرنام کرتے ہوئے کملیش نے ان کے چرن چھوئے۔ انھوں نے جھک کر اسے اٹھا لیا اور اپنی چھاتی سے اس طرح لپٹا لیا جیسے وہ ان کی اپنی اولاد ہو۔

کملیش تھوڑی دیر شہر میں رہ کر گاؤں لوٹا تو سیدھا اپنی ماں کے پاس جا کر بولا۔

"ماں —! میں اس لڑکی کو خود دیکھ کر آرہا ہوں۔ میں شادی اسی کے ساتھ کروں گا۔ میں جیسی پتنی چاہتا ہوں بینا میں وہ تمام باتیں پائی جاتی ہیں۔ خود تم نے اور لتا نے بھی تو اسے دیکھ کر پسند کیا ہے۔ مجھے جہیز اور روپیہ نہیں چاہیے۔ جہیز لینا اور دینا جرم ہے۔ میں اس کو ختم کر کے نئی روایت قائم کروں گا۔ آپ باپو سے اپنے طور پر یہ بات جتا دیجیے"

کملیش کی ماں بینا کو خود بھی بہو بنانا چاہتی تھیں اس لیے موقع نکال کر انھوں نے اپنے پتی سے سب کچھ کہہ ڈالا۔ گرجا شنکر سن کر خاموش رہے کچھ بولے نہیں۔

ڈیزل ٹریننگ کے لیے کملیش کے بھوپال جانے میں ایک مہینہ باقی رہ گیا تھا کہ گرجا شنکر نے بیٹے کو بلا کر کہا۔

"میں چاہتا ہوں جانے سے پہلے تمھاری سگائی کر دوں۔ مجھے فخر ہے کہ بھگوان نے مجھے تمھارے جیسا اچھے آدرشوں والا بیٹا دیا۔ تمھارے جیسے نوجوان پیدا ہوں تو سماج کی بہت سی برائیاں دور ہو جائیں — میں نے بینا سے تمھاری بات پکی کر دی ہے"

کملیش کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ گرجا شنکر کچھ اور کہنے والے تھے کہ وہ ان کے چرنوں میں جھک گیا۔



Urdu Monthly
NAYA DAUR
POST BOX No. 148 LUCKNOW-226001

Vol. 35 No. 1
APRIL-1980.
50 PAISE

REGD No. LW/NP.17
Annual Subs.
Rs. 5/-





وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی ۲۱ مارچ ۱۹۸۰ء کو سہارنپور میں دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ جشن کی تقریبات کا افتتاح کرتے ہوئے

جون سنہ ۱۹۸۰ء

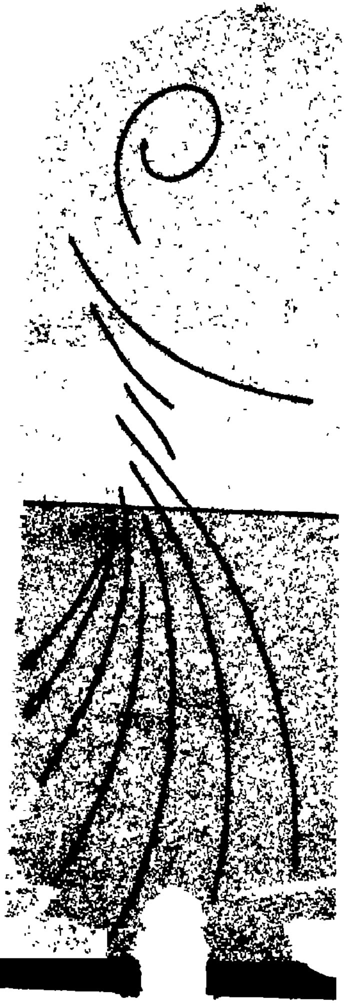
"مولانا محمد علی جوہر کے تعلیمی نظریات"
از نظر برنی دیکھئے صفحہ ۲۸
۳۰۶

6/6/80





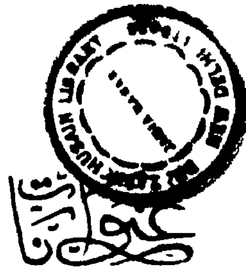


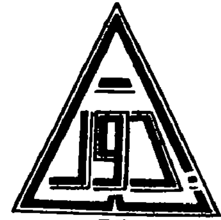






قیمت ۱ پچاس پیسے





جلد ۳۵ نمبر ۳

جون ۱۹۸۰ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: شاہنواز قریشی



پبلشر: مہیندر کمار

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یوپی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شایع کردہ محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ۔ اترپردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پبلی کیشن برانچ انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

اپنی بات

اتر پردیش کے نئے وزیر اعلیٰ شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ اس ریاست کے سب سے کم عمر وزیر اعلیٰ ہیں۔ آپ کی پیدائش ۲۵ جون ۱۹۳۱ء کو الہ آباد میں ہوئی تھی۔ آپ کی تعلیم الہ آباد اور پونا یونیورسٹی میں ہوئی جہاں سے آپ نے بی۔ ایس سی۔ بی۔ اے اور ایل۔ ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ سماجی اور سیاسی سرگرمیوں میں زمانہ طالب علمی سے ہی حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ سیاسی تحریکوں میں بھی آپ نے سرگرم حصہ لیا۔ اس کے علاوہ تعلیمی سرگرمیوں میں بھی آپ ہمیشہ دلچسپی لیتے رہے۔ کوراوں ضلع الہ آباد میں آپ نے گوپال ودیالیہ انٹرمیڈیٹ کالج قائم کیا۔ اودے پرتاپ کالج وارانسی میں طلبا کی یونین کے صدر اور الہ آباد یونیورسٹی میں یونین کے نائب صدر بھی رہے۔ اس کے علاوہ ۱۹۵۷ء میں آپ نے بھودان تحریک میں بھی حصہ لیا اور موضع پسانا ضلع الہ آباد میں واقع اپنا فارم عطیہ کے طور پر اس میں دے دیا۔

آپ ۷۱-۱۹۶۹ء کی مدت میں اتر پردیش اسمبلی کے ممبر رہے۔ ۱۹۷۱-۱۹۷۰ء میں اتر پردیش کانگریس لیجسلیچر پارٹی کے وہپ رہے۔ ۷۱-۱۹۶۹ء میں کل ہند کانگریس کمیٹی کے ممبر بھی رہے۔ ۱۹۸۰ء سے قبل آپ مرکزی حکومت میں وزیر رہ چکے ہیں۔ آپ نے پولینڈ، روس، چین اور ہانگ کانگ کا دورہ بھی کیا ہے۔

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے آپ نے ۹ جون ۱۹۸۰ء کو حلف لیا۔ وزیر اعلیٰ شری سنگھ ایک عملی انسان ہیں اور سوشلسٹ ذہن رکھتے ہیں۔ اتر پردیش اس وقت جن مسائل سے دوچار ہے، انھیں تیز رفتاری سے حل کرنے کی صلاحیت شری سنگھ میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ چنانچہ وزیر اعلیٰ اتر پردیش کے عہدۂ جلیلہ پر ان کا انتخاب نہ صرف یہ کہ ایک مستحسن اقدام ہے بلکہ ریاست کی ترقی کے لیے فال نیک بھی ہے۔

ریاستی اسمبلی کے وسط مدتی انتخابات میں عوام نے جن آرزوؤں اور امنگوں کا اظہار کیا ہے انھیں پایۂ تکمیل تک پہنچانا بلاشبہ ایک بڑی ذمہ داری ہے جس سے عہدہ برآ ہونے کی پوری صلاحیت ہمارے نئے وزیر اعلیٰ میں ہے۔ چنانچہ اپنے عہدے کا حلف لینے کے بعد ہی اپنی پہلی پریس کانفرنس میں شری سنگھ نے نئی ریاستی حکومت کی ترجیحات کا اعلان بھی کر دیا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ امن و امان کی صورت حال میں سدھار لانا میری حکومت کا سب سے پہلا کام ہوگا۔ اسی کے ساتھ ساتھ میری حکومت قیمتوں کو قابو میں لانے کے لیے بھی فوری اقدامات کرے گی۔ انھوں نے مزید کہا کہ نظم و نسق کو کارگزار اور چاق و چوبند بنایا جائے گا۔ مہنگائی دور کرنے اور قیمتوں پر قابو پانے کے لیے نئی حکومت جو اقدامات کرے گی، ان کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ بجلی کی فراہمی میں درپیش رکاوٹوں کو دور کیا جائے گا، آبپاشی کی سہولتوں میں اضافہ کیا جائے گا اور پیداوار بڑھانے کی غرض سے صنعتی تعلقات کو بہتر بنایا جائے گا۔ انھوں نے ذخیرہ بازوں، چور بازاری کرنے والوں اور تجارت کے درمیانی لوگوں کو آگاہی دی کہ اگر قلت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تو حکومت ان کے خلاف سخت کارروائی کرے گی۔

● گزشتہ ماہ ضلع لکھنؤ کے قصبہ ملیح آباد کو جو اپنے دسہری آموں کے لیے تمام دنیا میں ایک خصوصی شہرت رکھتا ہے، ہریجنوں اور دیگر کمزور طبقوں کی مربوط و منصوبہ بند معاشی ترقی کے لیے خصوصی پلان کے تحت ملک کا پہلا پائلٹ پراجکٹ شروع کرنے کی غرض سے منتخب کیا گیا ہے۔ ملیح آباد ملک کے ان ۳۶ ترقیاتی بلاکوں میں سے ایک ہے جہاں اقوام مندرجہ فہرست لوگوں کی آبادی ۵۰ فیصد یا اس سے زائد ہے۔ تجرباتی بنیاد پر اس پائلٹ پراجکٹ کی عمل آوری ملیح آباد کے تین مواضعات سہلامئو، سنیاسی باغ اور مجاسہ سے شروع ہوگی۔ اس خصوصی پائلٹ پراجکٹ کے تحت مجوزہ مربوط دیہی ترقی کا مقصد مستفید ہونے والوں کی تعداد میں اضافہ کرنا ہے تاکہ اس میں اقوام مندرجہ فہرست کے علاوہ چھوٹے کاشتکاروں، بے زمین مزدوروں، دیہاتی غریبوں، دستکاروں، معاشی طور پر دیگر پسماندہ طبقوں نیز اقلیت کے لوگوں کو شامل کیا جا سکے۔ ریاست کی راجدھانی لکھنؤ سے تقریباً ۲۳ کیلو میٹر دور لکھنؤ ہردوئی روڈ پر واقع ملیح آباد ریاست کے ان ۲۱ ترقیاتی بلاکوں میں ہے جہاں اقوام مندرجہ فہرست کی آبادی ۵۰ فی صد یا اس سے زائد ہے۔ ضلع لکھنؤ میں ایسے دو ترقیاتی بلاک ملیح آباد اور کاکوری ہیں۔ اس پائلٹ پراجکٹ کی عمل آوری کے لیے ملیح آباد کو اس لیے منتخب کیا گیا ہے کہ اس میں اقوام مندرجہ فہرست کی آبادی کا فیصد بہت زیادہ ہے اور یہاں کا سماجی۔ معاشی ڈھانچہ اتر پردیش کے دیہی علاقوں میں ایک خاص نوعیت کا حامل ہے۔ اس کے علاوہ ریاست کی راجدھانی لکھنؤ سے قربت اس انتخاب کا دوسرا سبب ہے کیونکہ اس سے اسکیم کی عمل آوری میں لگے ہوئے تمام ملازمین اور افسروں کے کام کی رفتار ترقی پر نظر رکھنے اور اس پراجکٹ کے مختلف پروگراموں کے سلسلے میں مزید ہدایات دینے میں سہولت ہوگی۔ اس طرح اسکیم کی عمل آوری میں درپیش دشواریوں اور خامیوں کو جلد دور کرنے میں بھی بڑی مدد ملے گی۔ اسکیم کے تحت ملیح آباد کے مواضعات سہلامئو، سنیاسی باغ اور مجاسہ میں پمپنگ سیٹ، زرعی آلات اور زیادہ پیداوار دینے والے بیج اور کیمیاوی کھاد کے لیے گرانٹ کا بندوبست ہے تاکہ اقوام مندرجہ فہرست کے چھوٹے کسان اپنے معاشی حالات بہتر بنانے کی غرض سے زرعی پیداوار میں اضافہ کر سکیں، اس کے علاوہ ان مواضعات میں اقوام مندرجہ فہرست کے ضرورت مند افراد کو گھریلو صنعتوں اور صنعتی پیشوں کے لیے بھی گرانٹ دی جائے گی۔ اسی کے ساتھ ہی مکانات کی تعمیر اور موجودہ مکانات کو بہتر بنانے کے لیے بھی اس پراجکٹ کے تحت گرانٹ دینے کا بندوبست ہے۔ اس کے علاوہ پینے کے پانی کی فراہمی کی صورت حال کو بہتر بنانے کا پروگرام بھی ہے تاکہ پینے کے پانی کا مسئلہ حل ہو سکے۔ دور رس فوائد کے حامل اس پراجکٹ کی عمل آوری سے ملیح آباد کے مذکورہ بالا مواضعات کا سماجی معاشی نقشہ یقینی طور پر بدل جائے گا اور نہ صرف اقوام مندرجہ فہرست بلکہ دیگر کمزور اور غریب طبقوں کا معیار زندگی بھی بلند ہوگا۔

ایڈیٹر

فضا ابن فیضی
مئو ناتھ بھنجن - ۲۷۵۱۰۱
یو۔پی

غزل

بسکہ اوراق صحیفوں کے ہیں سارے پتھر
اس نے لفظوں کی جگہ مجھ پہ اتارے پتھر

ہنر و حرف و نوا کے ہیں تراشے لوگو!
پھینک دو چن کے مری سمت وہ سارے پتھر

میں سزاوارِ عقوبت سہی، لیکن تم میں
ہو جو معصوم، وہ پہلا مجھے مارے پتھر

اُن سے پوچھو، کہ جو شیشے کے مکاں رکھتے ہیں
کیسے سمجھیں گے اب اوروں کے خسارے پتھر

اس طرح کیا کوئی پھولوں کی جبیں چومے گا
میں نے آنکھوں سے لگائے ہیں تمھارے پتھر

ان میں حصّہ ہے بہ اندازۂ ہمت سب کا
تہہ دریا ہیں گہر، اور کنارے پتھر

رات اک جھیل ہے، یاد اس کی کنول کی صورت
اور ایسے میں ہوے خواب ہمارے پتھر

کوئی طوفان ہی اب مجھ کو بہالے جائے
تیر جائے کسی پتھر کے سہارے پتھر

چلو، موضوعِ گل و لالہ یہ سوچا جائے
لوگ کہتے ہیں کہ ہیں چاند ستارے پتھر

ضربِ تیشہ تو بہر حال ہے اک تیری چیز
نہ یہ پتھر ہیں شرارے، نہ شرارے پتھر

کچھ نہیں، تو انھیں رستوں کی مسافت ناپیں
نصب کر دو ہمیں، ہم بھی ہیں تمھارے پتھر

تھی وہی خود شکنی، خودنگری کی بنیاد
عمر بھر بیٹھ کے آزر نے سنوارے پتھر

کج ہیں زخموں کی کلاہیں مرے سر پر اب بھی
دیکھتے ہیں مجھے کیا سر کو ابھارے پتھر

مصلحت تیری، انا میری ہیں دونوں چپ چاپ
اب سنے کون، جو پتھر کو پکارے پتھر

سادہ لوحوں نے فضاؔ کیسی نکالی یہ ردیف
استعارے نہ کنائے نہ اشارے پتھر

سید عبدالباری
شعبۂ اردو ۔ جی ۔ ایس ۔ پی ۔ جی
کالج ۔ سلطان پور

اردو شاعری میں ہماری تہذیب کے نقوش

اس عنوان کے تحت آپ مجھ سے یہ توقع کریں گے کہ میں ہندستان کی تہذیب کی روداد بیان کردوں اور وہ بھی شعر و ادب کی زبان میں ۔ اور میں اس فکر میں غلطاں ہوں کہ اس مختصر سے مقالہ میں اپنے قافلۂ تمدن کے سفر کی کن کن منزلوں کے نقوش آپ کے سامنے اجاگر کردوں ، اور اس کے قدموں کی کن کن آہٹوں کو قلمبند کروں ۔ خاک حجاز سے وادیٔ گنگ و جمن تک فکر و عمل کے نہ جانے کتنے نشیب و فراز ہیں جن میں میرے تہذیبی قافلے کے حدی خوانوں کی صدائیں گونجی ہیں ۔ اور میری زبان کے حساس شعر و ادب نے ان کی نوا کے زیر و بم کو اور ان کے سبک گام اونٹوں کی ہر چاپ کو اپنے اندر جذب کر رکھا ہے ۔ آپ ذرا کان لگا کر غور سے سنیے تو میری تہذیب کے قلب کی ایک ایک دھڑکن میرے شعر و ادب کی رگ رگ سے سنائی پڑے گی اس لیے کہ ان رگوں میں ان زندہ و پائندہ اقدار و روایات کا صحتمند و توانا خون رواں دواں ہے ، جن سے میری تہذیب کا خمیر تیار ہوا ہے۔ میرے عرب نے آج سے صدیوں پیشتر جب اس ظلمت کدۂ دہر میں تہذیب و شرافت کی قندیلیں اور انسانیت کی مشعلیں روشن کی تھیں اور اس کے نور سے جب وحشت و حیوانیت کے اندھیرے چھٹنے لگے تھے تو اس اجالے کی کچھ کرنوں نے میرے وطن کے دروازوں پر بھی آکر دستک دی تھی ۔ اس نئی شعاع تہذیب کی دستک میں زندگی کا پیام پنہاں تھا ۔ میرے وطن نے اس کو خوش آمدید کہا اور ان مردان حق آگاہ کی راہ میں آنکھیں بچھائیں جن کے دامن میں فقر و استغنا کی دولت اور حق گوئی دنیا کی متاع بے بہا تھی ۔ اقبال نے سچ کہا ہے ۔

آہ وہ مردانِ حق ، وہ عربی شہسوار
حامل خلق عظیم ، صاحب صدق و یقیں
جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمز غریب
سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے ، شاہی نہیں

حجازی تہذیب کی اس سرزمین پر پذیرائی کوئی تعجب خیز بات نہ تھی ۔ آخر میرے وطن میں بھی اخلاق اور روحانیت کی فضیلت کا ایک تصور پہلے ہی سے موجود تھا ۔ وید اور گیتا کے مقدس آہنگ میں اخلاقی عظمت کے یہی نغمے پوشیدہ تھے۔ صداقت ، حسن اور خیر یہاں پہلے ہی انسان کا منتہائے نظر اور منزل مقصود قرار دی جا چکی تھی ۔ الغرض عرب کے بادیہ نشینوں کے کردار و عمل اور دلسوزی و دردمندی سے یہاں ایک نئی زندگی اور تازگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی ۔ ہمالیہ کے دامن سے راس کماری تک ایک نیا ولولہ اور ذوق تعمیر کروٹیں لینے لگا ۔ انسانوں اور انسانوں کے درمیان کھڑی ہوئی رنگ و نسل کی دیواریں ٹوٹنے لگیں ۔ جب وسط ایشیا اور حجاز کے ان نئے مہمانوں نے یہاں کے صحت مند تہذیبی عناصر کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے "خذ ما صفا ودع ما کدر" کا متوازن طرز عمل اختیار کیا اور یہاں کے ہر رنگ و نسل اور ہر طبقہ و پیشہ کے انسانوں کو اخوت انسانی کے جذبہ کے تحت گلے لگایا تو ایک نئی زبان کی بنیاد پڑی ۔ یہ زبان ایک تہذیبی تقاضہ اور ایک تمدنی ضرورت تھی ۔ یہ اس لیے معرض وجود میں آئی تھی کہ اچھائیاں جہاں جہاں بھی ہوں ان کو اپنے دامن میں سمیٹ کر سمیٹتا کے ایک نئے تاج محل کی تعمیر کرے ۔

ہوں اور صوفیوں کے مقدس ہاتھوں نے اس کی بنیاد رکھی تھی
دشاہوں نے اپنے عوام کی امنگوں کو سمجھنے اور پنے خوابوں کو
ت کا جامہ پہنانے کے لیے اسے اپنی سرپرستی سے نوازا تھا۔
ر۔ بہمنی اور مغلیہ سلطنتوں کے پرشکوہ دربار ہوں یا لکھنؤ
م آباد، مرشد آباد، رامپور وغیرہ کے فرمانرواؤں کی محفلیں
، فورٹ ولیم کالج کی ادب نواز فضا ہو یا ۱۸۵۷ء کے غدر کا
مرٔ دار و گیر، انیسویں صدی کے اختتام سے بیسویں صدی
سط تک آزادی کی جنگ کے مختلف نشیب و فراز ہوں یا
ادی کے بعد نئے ہندستان کی تعمیر اور آزادی و جمہوریت
نغمہ طرازی ہو، ہماری تاریخ کے ہر ہر موڑ پر اس زبان کے
تا ادب نے ہمارے سماج اور تہذیب کے کرب و نشاط، زندگی
ملوں اور حسرتوں کی موثر پیرایہ میں عکاسی کی ہے۔ آیئے اردو کے
نہ میں ہم ان تمام تہذیبی ادوار کے چند نمایاں مشترک اور
یادی پہلوؤں کا جائزہ لیں۔

اردو شاعری میں سب سے زیادہ غالب اور ہمہ گیر تصور
یا کی بے ثباتی اور کائنات کے گوشے گوشے میں حسن مطلق کی
لوہ گری کے احساس پر مبنی رہا ہے۔ ہمارے شعراء نے اس
ئنات کے خالق کے جمال کی جھلک جملہ مظاہر فطرت میں دیکھی
ہے۔ اسی قوت مشاہدہ کی بدولت ان کی نگاہ میں آفاقیت پیدا
ہوئی ہے۔ اسی نے انھیں حدود زمان و مکاں اور امتیاز رنگ
نسل سے اوپر اٹھ کر ساری انسانیت سے محبت کرنے کا
شعور عطا کیا ہے۔ اور اسی شعور کی بدولت انہوں نے دل
کی عظمت اور انسانیت کے احترام کے نغمے فضا میں بکھیرے
ہیں۔ اور قطرہ میں قلزم اور کوزہ میں دریا کو بند کرنے کی صلاحیت
حاصل کی ہے۔ بے ریائی، پاکیزگی قلب، خلوص نیت اور
حسن عمل کو دنیا کی سب سے بڑی دولت قرار دیا ہے۔ یہ کائنات
اپنی تمام عشوہ طرازیوں اور جلوہ سامانیوں کے باوجود انھیں
ایک فریب نظر محسوس ہوئی ہے اور انہوں نے بڑے اعتماد
و یقین کے لہجہ میں اسی خیابان نیرنگی دوراں کو طاق نسیاں

پر رکھنے اور صرف حُسن مطلق کی تابش جمال کو منتہائے نظر
بنانے کا درس دیا ہے چنانچہ میر حسن فرماتے ہیں۔

نہ بھول اے دل تو اس نیرنگیٔ خیابان دوراں پر
یہ شیشہ ہے اسی قابل رہے جو طاق نسیاں پر

دیکھیے اس حسن مطلق کی جھلک ہمارے شعراء کو کائنات میں
کس کس انداز سے نظر آتی ہے۔ وزیر لکھنوی فرماتے ہیں۔

میں وہ بلبل ہوں تصور میں ہمیشہ — آنکھ کی بند گلستاں دیکھا

رشک لکھنوی کہتے ہیں :-

محفل میں شمع، چاند فلک پہ چمن میں پھول — تصویر روئے انور جاناں کہاں نہیں

آتش لکھنوی کہتے ہیں۔

پروانے جلتے ہیں تری برق جمال سے — شمعوں کے سر سے آتش سودا الجھتی ہے

اقبال فرماتے ہیں۔

چمک تیری عیاں بجلی میں آتش میں شرارے میں
جھلک تیری ہویدا چاند میں سورج میں تارے میں
بلندی آسمانوں میں زمینوں میں تری پستی
روانی بحر میں افتادگی تیری کنارے میں

نظیر اکبر آبادی اپنے مخصوص رنگ میں کہتے ہیں۔

تنہا نہ اسے اپنے دلِ تنگ میں پہچان
ہر باغ میں ہر دشت میں ہر سنگ میں پہچان
ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

الغرض ہمارے اساتذہ کے کلام کا ایک بڑا حصہ دنیا کی
بے ثباتی اور اس حیات مختصر کی اصل غرض و غایت کے مضمون
پر مشتمل ہے۔ انھیں یہ نقطہ نظر اپنی تہذیب کے اس واضح
رجحان سے ملا ہے جو انسان کو اس دنیا میں مسافر یا راہرو
قرار دیتا ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے۔

كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ

(اس دنیا میں مسافر یا راہ گیر کی مانند سیر کرو)
اس مضمون کی جھلک اردو شاعری میں اس طرح ملتی ہے

وزیر فرماتے ہیں ؎

بادشاہی کی تمنا نہ رہی — جب سوئے گورِ غریباں دیکھا
اہل دولت سے کوئی نزع میں آ تا پوچھے — ساتھ کیا کیا لیا اس وقت میں کیا کیا چھوڑا

صبا کہتے ہیں ؎

دو دن کی حیات پر فلک سے — کیا کیا شکوے شکایتیں ہیں
نقش و نگار خانۂ دنیا ہے بے ثبات — سونے کے بعد ایک ہے شاہ و گدا کا رنگ

میر تقی میر بڑی افسردگی کے ساتھ کہتے ہیں:۔

قبائے لالہ و گل سے جھلک رہی تھی خزاں — بھری بہار میں رو دیا کیے بہار کو ہم
کہا میں نے گل سے ہے کتنا ثبات — کلی نے یہ سنکر تبسم کیا
زندگی اپنی خواب کی سی ہے — یہ حقیقت سراب کی سی ہے

میر انیس اپنی رباعیات میں اس دنیا اور انسان کی چند روزہ زندگی پر بڑی حسرت کے ساتھ اور بڑے درد انگیز لہجے میں تبصرہ فرماتے ہیں۔

گر لاکھ برس جیے تو پھر مرنا ہے — پیمانۂ عمر ایک دن بھرنا ہے
ہاں توشۂ آخرت مہیا کر لے — غافل تجھے دنیا سے سفر کرنا ہے

حالی نے مناجات بیوہ میں اس دنیا پر کیسا چبھتا ہوا تبصرہ کیا ہے۔

ریت کی سی دیوار ہے دنیا — اوچھے کا سا پیار ہے دنیا
ساتھ سہاگ اور سوگ ہے یاں کا — ناؤ کا سا سنجوگ ہے اس کا

ہماری تہذیب کا یہ جوہر بھی رہا ہے کہ اس نے انسانی اخوت اور ہمدردی کا ایک بلند تصور ہمیں عطا کیا ہے۔ صوفیائے کرام نے اسی تصور کی روشنی میں سارے انسانوں کو سینے سے لگانے اور دل کے آبگینہ کو ٹھیس نہ پہنچانے کا سبق دیا۔ تصوف کی ساری عمارت اسی احترامِ آدمیت اور دردِ انسانیت کے وسیع تصور پر کھڑی ہے۔ اردو شاعری میں دل کی عظمت اور انسان سے محبت کا ایک سیل رواں ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے اودھ کے نواب وزیر آصف الدولہ کی رفیقۂ حیات دلہن بیگم کا شعر سنیے ؎

مت کرو فکر عمارت کی کوئی زیرِ فلک — خانۂ دل جو گرا ہو اسے تعمیر کرو

پھر انھیں کا دوسرا شعر بھی ملاحظہ ہو جس میں وہ غم جہاں یا غم انسانیت کے داغوں کو اپنے دل کی متاعِ گراں قرار دیتی ہیں ؎

جہاں کے باغ میں ہم بھی بہار رکھتے ہیں — مثالِ لالہ دل داغدار رکھتے ہیں

میر جنھوں نے زندگی بھر دلی اور دل کے مرثیے لکھے کہتے ہیں ؎

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے — پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کے
کعبہ پہنچا تو کیا ہوا اے شیخ — سعی کر ٹک پہنچ کسی دل کو
ہمیشہ چشم ہے نمناک ہاتھ ہے دل پر — خدا کسو کو نہ ہم سا بھی دردمند کرے

انیس مشورہ دیتے ہیں۔

خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم — انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا تصور بھی ہماری تہذیب کا بنیادی عنصر رہا ہے اور اس تصور کو ہمارے شعراء نے خوب نمایاں کیا ہے۔ میر کہتے ہیں ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں — تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

جگر مرادآبادی نے اس تصور کو اس مقام تک پہنچا دیا ؎

کبھی کبھی تو اسی ایک مشت خاک کے گرد — طواف کرتے ہوئے ہفت آسماں گزرے

لیکن عظمت آدم کے اس تصور میں انسانی زندگی کی بے ثباتی اور فنا کے تصور سے ایک توازن پیدا کیا گیا ہے۔ تاکہ انسان میں خود سری اور تکبر کے عناصر نہ آنے پائیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں میر یہ دعوا کرتے ہیں کہ ؎

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے

وہیں انھیں یہ احساس بھی ہے۔

تو ہے بیچارہ گدا میر ترا کیا مذکور — مل گئے خاک میں یاں صاحب افسر کتنے
نمود کر کے وہیں بحر غم میں ڈوب گیا — کہے تو میر بھی اک بلبلہ تھا پانی کا
شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی — انھیں کی آنکھ میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے کہ وفاداری بشرط استواری یعنی کسی اصول و نظریہ پر اپنے کو قربان کرنا اور ناموافق حالات

میں بھی اس پر قائم رہنا ہماری تہذیب کے نزدیک انسان کی ایک بڑی صفت قرار پاتا ہے۔ چنانچہ اس مضمون کو ہمارے شعراء نے مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے۔ آصف الدولہ کا شعر ہے ؎

تیرے کوچہ میں نقش پا کی طرح   ایسے بیٹھے کے پھر نہ واں سے گئے

مرزا محمد رضا برقؔ فرماتے ہیں :-

برقؔ جو کہتے تھے آخر وہی کرکے اٹھے   جان دی آپ کے دروازہ سے مر کے اٹھے

مرزا غالبؔ نے اسے کئی پہلوؤں سے بیان کیا ہے :-

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے   مرے بتخانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو
نہیں کچھ سبحہ وزنار کے پھندے میں گیرائی   وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے
رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل   جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکے تو پھر لہو کیا ہے

میری تہذیب جمود و تعطل کے مقابلہ میں حرکت و عمل کی ہمیشہ علمبردار رہی ہے۔ اس نے ہمت دشوار پسند کو ہمیشہ قدرو منزلت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ چنانچہ رندؔ لکھنوی کہتے ہیں :-

رکھ لیا میں نے کوہِ غم سر پر   چل دیے غیر حوصلہ کر کے

روشؔن صدیقی کا تیور ملاحظہ ہو :-

تنگ ہے گردش دوراں تیرے دیوانوں سے   کبھی ملتی ہے تو کترا کے نکل جاتی ہے

اصغرؔ گونڈوی اپنے رجائیہ اور نشاط افروز لہجہ کے لیے مشہور رہیں :-

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے   اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے
آلام روزگار کو آساں بنا دیا   جو غم ہوا اسے غم جاناں بنا دیا
یہاں کوتاہی ذوق عمل ہے خود گرفتاری   جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

داغؔ کو ملاحظہ فرمائیے۔

دل دے تو اس مزاج کا پروردگار دے
جو رنج کی گھڑی کو خوشی سے گزار دے

آرزوؔ نغمہ سرا ہیں :-

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

نشورؔ کہتے ہیں۔

تاریخ جنوں یہ ہے کہ ہر دور خرد میں
اک سلسلۂ دار و رسن ہم نے بنایا

اقبالؔ نے اردو شاعری کے اس تیور کو پورے بانکپن کے ساتھ نمایاں کیا اور اس حوصلۂ تسخیر اور مزاج سخت کوشی کے بیان کو نقطۂ عروج تک پہنچا دیا۔ ملاحظہ ہو ؎

جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

الغرض ہماری دل نواز متحرک آفاقی اور انسانیت نواز تہذیب کے صدہا جلوے اردو شاعری کے آئینہ میں اپنا عکس جمال پیش کرتے رہے ہیں۔ اس کی مزید تفصیل و تشریح کا یہ موقع نہیں۔ چند اشعار پر میں اس بحث کو ختم کرتا ہوں۔ جو میرے دعوے کی مزید تائید کرتے ہیں۔

امیرؔ- خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

داغؔ- ان بے ریا کی ہے صحبت کسے نصیب
زاہد بھی ہم میں بیٹھ کے انسان ہو گیا

وزیرؔ- رات دن سجدۂ شکرانہ ہے واجب مجھ پر
کہ خدا دیتا ہے اور نام تیرا ہوتا ہے

غالبؔ- بک جاتے ہیں ہم آپ متاع سخن کے ساتھ
لیکن عیار طبع خریدار دیکھ کر

جگن ناتھ آزاد-

ذرا سا بھی یقیں دنیائے فانی میں بڑی شئے ہے
گماں کتنا ہی بڑھ جائے گماں سے کچھ نہیں ہوتا



حرمت الاکرام
رام باغ مرزا پور
۲۳۱۰۰۱

ریت کی گہرائی

میں گزروں ریت سے
تم گزرو، کوئی اور گزرے
خواہ وہ تنہا ہو
یا ہمراہ کوئی قافلہ ہو
پاؤں کی آواز ابھرتی ہے
نہ آتی ہے کوئی آہٹ،
عزیزو!
کون سمجھے
ریت کے سینے کی گہرائی!

منزل بہ منزل

روشنی بصارت ہے
روشنی صداقت ہے
روشنی حقیقت ہے
اور راہ عرفاں میں
روشنی قیامت ہے

شکاری کا تیر

حیا کے سنگ پوش
زینوں پہ چڑھتے چڑھتے
تھکن تو ہے ناگزیر لیکن
تھکن سے بڑھ کر
لہو کی حدت
کسی شکاری کے تیر جیسی
ہدف بناتی ہے آدمی کو

فانی: لافانی

شباب ایک تبسم ہے
یہ لبوں کے اُفق پر
طلوع ہوتا ہے
تو جاگ اٹھتا ہے دل ہی نہیں، بدن سارا
شباب ایک تبسم ہے کائنات فروز
یہ ماہ و سال کا صید زبوں سہی لیکن
ابد کی روح لیے جگمگاتا رہتا ہے

ی لکھنوی
ٹ فارسی
روڈ
۳

جلووں میں یوں اسیرِ نظر ہو کے رہ گئی
اُٹھی جدھر نگاہ اُدھر ہو کے رہ گئی

ہرگز نہیں بہار وہ ننگِ بہار ہے
محدود کچھ گھروں میں اگر ہو کے رہ گئی

اس انقلابِ وقت کی رفتار الاماں
منزل خود آج گردِ سفر ہو کے رہ گئی

ان واعظوں کے فیض سے جنت ہے جس کا نام
رنگینیٔ خیالِ بشر ہو کے رہ گئی

چہروں سے دوستوں کے نقابیں جب اُٹھ گئیں
شرمندہ دشمنوں سے نظر ہو کے رہ گئی

میرے خیال میں تو اندھیرا ہے اس کا نام
وہ روشنی جو حدِ نظر ہو کے رہ گئی

ہم جس کے منتظر تھے وہ آئی نہیں سحر
ہاں زندگی چراغِ سحر ہو کے رہ گئی

شاربؔ مرے حریفوں کی کوئی خطا نہیں
جیسا تھا ذہن ویسی نظر ہو کے رہ گئی

غزل

محمد عثمان عارفؔ
مرکزی نائب وزیر
برائے مواصلات و تعمیرات
نئی دہلی

ہر روز نئی وقت کی یہ روپ متی ہے
ہر غمزہ میں انداز میں شوخی میں نئی ہے

کیا فکرِ حوادث کی اگر دھوپ کڑی ہے
معلوم ہے زلفوں کی تری چھاؤں گھنی ہے

ہر لمحہ ترے آنے کا دیتی ہے دلاسا
زینے پہ شبِ غم کے تری یاد کھڑی ہے

جینے سے پریشان بھی ہوتا ہے یہ جلدی
انسان کو جینے کی تمنا بھی بڑی ہے

فرصت نہیں اپنی ہی مصیبت سے ہر اک کو
پوچھے کوئی کیا حال ہے؟ یہ کس کو پڑی ہے

ہو اپنی دکانوں کے سجانے کا سلیقہ
بازار میں گر جنس ہے کھوٹی بھی کھری ہے

تکمیلِ تمنا کے لیے چاہیے صدیاں
دنیا ابھی احساس کی منزل میں کھڑی ہے

بے لطف ہے محروم ہے کانٹوں کی خلش سے
جو زندگی پھولوں سے ہم آغوش رہی ہے

شامل غمِ دوراں غمِ انساں ہے اسی میں
مل جائے ترا درد تو دولت یہ بڑی ہے

تو عیش کے نغموں میں اسے سن نہ سکا ہے
ہنگامۂ دنیا میں صدا دل نے تو دی ہے

ماضی کے اندھیروں میں کہاں ڈھونڈو گے عارفؔ
وہ خواب سنہرے نہ وہ شیشہ کی پری ہے

اصغر مرزا پوری
۲۴۔ علی بلڈنگ ۲۱۲/۲۰۸
مولانا آزاد روڈ بمبئی۔ ۴۰۰۰۰۸

سید ابراہیم خلیل
معرفت صحیفہ ۱۶-۴-۲۳۵ (۲۴)
چنچل گوڑہ حیدرآباد (A.P)

غزلیں

جان کر، پہچان کر کعبے کی، بت خانے کی روح
بے تعلق سب سے، خود میں گم ہر دیوانے کی روح

کوئی تو ہو، جان لیوا بھی ہے اور جاں بخش بھی
شمع کی لو ہی تو ہے دراصل پروانے کی روح

دیکھ کر میری جبیں تڑپی ہے کیا روحِ حرم
جب سمٹ کر آئی سجدے میں صنم خانے کی روح

ہے نگاہِ مستِ ساقی کی توجہ کا اثر
مرے ساغر میں جو کھنچ کر آئی میخانے کی روح

اُف یہ آوارہ بگولے کی تڑپ، یہ اضطراب
ہے تلاشِ دوست میں شاید کہ دیوانے کی روح

سنتے سنتے آپ کو جس موڑ پر نیند آ گئی
بس وہی اک موڑ تو ہے سارے افسانے کی روح

ہتھکڑی، بیڑی، سلاسل، طوق تکتے رہ گئے
مسکرا کر طنز سے نکلی جو دیوانے کی روح

اس کے ہر ذرّہ میں رقصندہ ہیں سو آبادیاں
کاش دیوانے سے سمجھے کوئی ویرانے کی روح

ہو گیا ہے خلق کی ہر ایک شے سے بے نیاز
پا گیا اصغرؔ جنوں میں جذب ہو جانے کی روح

وہ مجھ پر نہ بار بھی نہیں اگر ہوتے ہیں برہم بھی
توجہ مجھ پہ ہے ان کی اگر کم بھی، تو بہم بھی

ہوئے ہیں زخم ہائے دل تری پرسش سے بہتر
ترے لہجے کی شیرینی ہے ان زخموں کا مرہم بھی

بنائیں گے ہم اپنا آشیانہ اک نیا کوئی
ہوئے ہیں چار تنکے دیکھنا ہم کو فراہم بھی

اگر آنا ہو آؤ، آ بھی جاؤ دیر کاہے کی
رہے گا چار دن کے واسطے پھر لطف باہم بھی

غنیمت ہے خوشی تو پھر خوشی ہے تم کو حاصل ہے
بہت ہی خوب تھا ہوتا اگر اندازۂ غم بھی

تبسم کی ترے ہم دلکشی میں کھو گئے لیکن
ترے دیدار میں تھا محو اپنا دیدۂ نم بھی

مری ناکامیوں کا ہر جگہ پھر تذکرہ ہوگا
کہ ہوگا مدتوں تک موت پہ میری وہ ماتم بھی

لرز جاتا ہے دل گو کاوشِ تخریب سے میرا
تصور میں ہے میرے عظمتِ تقدیرِ آدم بھی

تغافل اور توجہ دونوں شامل ہیں نگاہوں میں
کہ وہ کم آشنا بیگانہ بھی ہے اور محرم بھی

خلیلؔ ہم کو نشاط و لطف حاصل ہے بہر صورت
خوشی حاصل ہوئی ہم کو اگر پہونچا کوئی غم بھی

عبدالرشید
۶۰/۸۸ - پریم نگر - کانپور

میر کی شاعری میں مزاح و ظرافت

میر محمد تقی میر اردو غزل کے مسلم الثبوت استاد ہیں۔ غزل گوئی میں کوئی دوسرا شاعر آج تک ان کا جواب نہیں ہوا اپنے زمانے میں بھی وہ ایک باکمال شاعر تسلیم کیے جاتے تھے۔ میر حسن دہلوی نے اپنے تذکرہ میں ان کو "سرآمد شعرائے ہند" لکھا ہے۔ سودا نے ان کو استاد مانا ہے۔ اردو ادب کے ہر دور کے باکمال شعرا جو ان کے بعد ہوئے ان کی استادی اور بہ کمال شاعری کے معترف ہیں۔ ذوق دہلوی کہتے ہیں ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب ..
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

مرزا غالب میر کے کمال شاعری کو تسلیم کرنے میں ناسخ کے ہم خیال ہیں ؎

غالب اپنا بھی عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

لیکن میر کے کمال شاعری کی اس عہد بہ عہد شہرت و ستائش کے باوجود ان کے کلام کی مقبولیت طبقہ خواص تک محدود ہے۔ عام طبائع کا ذوق شعر فہمی میر کی شاعری سے پوری طرح لطف اندوز ہونے سے قاصر ہے۔ میر کو خود بھی اس کا احساس تھا۔ چنانچہ ایک شعر میں انھوں نے اپنا خیال ظاہر کیا ہے۔ ؎

شعر میرے ہیں سب خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

میر کے اس مقولے سے ان کے کلام کی یہ خصوصیت واضح ہو جاتی ہے کہ صداقت جذبات کے لحاظ سے ان کی شاعری عوام کی شاعری ہے جس میں عام جذبات انسانی کی تفسیر اور واردات قلبی کی سچی ترجمانی کی گئی ہے لیکن ان کا انداز بیان طبقہ خواص کے ساتھ مخصوص ہے جس سے وہی لوگ لطف اندوز ہو سکتے ہیں جو اسالیب بیان کے سمجھنے کی استعداد رکھتے ہیں۔ عوام کے طبقہ میں میر کی شاعری کے زیادہ مقبول نہ ہونے کا خاص سبب ان کا وہ مخصوص انداز بیان ہے جو عام ادائے مطلب کے طریقے سے مختلف ہے اور جس کی بنیاد طنز و مزاح پر قائم ہے۔

علمائے ادب نے طنز کی تعریف اس طرح کی ہے کہ یہ قوت تخیل کے محاسبانہ عمل کا نام ہے جو ابہام و کنایہ اور رمز و اشارہ کے پیرایہ میں اپنا کام کرتی ہے۔ اس میں الفاظ اور فقروں کا استعمال ان کے ظاہری معنی و مفہوم کے برخلاف کیا جاتا ہے۔ طنز و مزاح کے پیرایۂ بیان میں ایسا لطیف اشارہ اور ابہام ہوتا ہے کہ سرسری نظر میں طنز نگار کے قول کا مفہوم اکثر اس کے اصلی خیال کے برعکس نظر آتا ہے۔ جن لوگوں کو طنز و مزاح کا صحیح ذوق نہیں ہوتا وہ اس اسلوب بیان کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ طنز میں قائل کا کلام بہ ظاہر خوشگوار اور ہمدردانہ معلوم ہوتا ہے لیکن در پردہ اس میں فطرت انسانی کی کسی مخفی کمزوری کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے۔ اس میں خوش طبعی اور ظرافت کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے اور اسلوب بیان کو ادبی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

میر تقی میر کے اشعار کی دلکشی اور تاثیر کا راز ان کے اسلوب بیان اور طرزِ ادا میں پوشیدہ ہے۔ ایک اچھے طنز نگار کے لیے ذکی الحس، نازک مزاج، آشفتہ بیان اور منہ پھٹ ہونا ضروری ہے۔ میر تقی میر میں فطرتاً یہ تمام صفتیں موجود تھیں۔ مولوی محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں ان کا جو مرقع کھینچا ہے وہ بہت کچھ اصل کے مطابق ہے۔ میر نے اپنی بدمزاجی کا ذکر خود بھی کیا ہے۔ سہ

اتنی بھی بدمزاجی ہر لحظہ میر تم کو
الجھاؤ ہے زمیں سے جھگڑا ہے آسماں سے

ایک اور شعر میں اپنی اس کمزوری کا اظہار اس طرح کرتے ہیں ؂

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر
تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا

ایک حقیقی شاعر کی زندگی اور افتادِ طبیعت و سیرت کے اصل نقوش ہم کو اس کی شاعری میں ملتے ہیں۔ میر صاحب قدرتاً محزون و غمگیں مزاج تھے۔ ان کی ساری زندگی حزن و یاس اور مصائب و ادبار کا نمونہ تھی اس کے ساتھ ہی خودداری اور وقار کا ان کو بے حد احساس تھا۔ مجبوراً ان کو عزلت گزینی کی زندگی بسر کرنا پڑی۔ مصائب کی شدت انسان کو مایوسی کی حد تک پہنچا دیتی ہے۔ عالم یاس میں انسان بیباک اور منھ پھٹ ہو جاتا ہے اس کی گفتگو کا انداز بدل جاتا ہے۔ الفاظ بظاہر سیدھے سادے ہوتے ہیں لیکن ان کی تہہ میں غضب کا جوش و خروش چھپا ہوتا ہے۔

میر کے کلام میں یاس و حسرت کے مضامین کے ساتھ جب ایک لطیف طنز کی چاشنی مل جاتی ہے تو عجیب لطف پیدا کر دیتی ہے اور ان کے اشعار تیر و نشتر بن کر دلوں میں چبھتے ہیں۔ یہ فطرت انسانی ہے کہ پے در پے مصیبتیں انسان کو بلند ہمت اور اذیت کوش بنا دیتی ہیں جب زندگی کی تلخ کامیاں حد کو پہنچ جاتی ہیں تو انسان مصائب و آلام کو لوازمِ حیات سمجھ کر ان کو ہیچ سمجھنے لگتا ہے۔ شاعر آلام و مصائب پر نوحہ و بکا کرنے کے بجائے کبھی تبسم زیرِ لب اور کبھی زہر خند سے کام لیتا ہے یہی تبسم زیرِ لب اور زہر خند جب الفاظ کے پیرائے میں ظاہر ہوتا ہے تو طنز و مزاح کہلاتا ہے۔ میر کے کلام میں طنزیات کی روح اسی شدت کے ساتھ کارفرما ہے جس کے ساتھ وہ انگلستان کے مشہور طنز نگار سوئفٹ (Swift) کی تحریروں میں نمایاں ہے۔

میر کے اکثر تذکرہ نویسوں اور نقادوں نے ان کو یاسیات یعنی حزنیہ شاعری کا امام کہا ہے۔ سودا سے میر کا موازنہ کرتے ہوئے دونوں کے کلام میں "آہ" اور "واہ" کا فرق بتایا ہے۔ میر کی شاعری کو نوحۂ زندگی اور مرثیۂ عاشقی سمجھنے والوں کے لیے یہ انکشاف تعجب خیز ہوگا کہ جس چیز نے ان کے کلام کو سحر کا مرتبہ دیا ہے اور ان کو تمام اردو شعرا میں ممتاز کیا ہے وہ ان کا شعورِ طنز اور ذوقِ مزاح ہے۔ میر کے وہ اشعار جو نشتر بن کر دل میں چبھتے ہیں اکثر وہی ہیں جن میں ایک لطیف مزاح اور لطیف طنز کی آمیزش ہوتی ہے۔ قدرت نے جہاں میر کو ایک دردمند دل بخشا تھا وہاں احساسِ ظرافت اور ذوقِ مزاح رکھنے والا دماغ بھی عطا کیا تھا۔ جس طرح آلامِ حیات اور مصائبِ عشق کو ایک موثر و دلگداز انداز میں بیان کرنے کا ملکہ انھیں حاصل تھا اسی طرح تلخیوں کو طنز و مزاح کی چاشنی سے شیریں و خوشگوار بنا لینے کی صلاحیت بھی ان کو قدرت سے عطا ہوئی تھی۔

میر کو بجائے یاسیات کے امام کے اگر طنزیات کا امام کہا جائے تو خلافِ حقیقت نہ ہوگا۔ لطفِ بیان اور حسنِ ادا میں میر اپنے حریف و معاصر سودا پر سبقت لے گئے ہیں۔ دونوں کے کلام کا خاص فرق یہ ہے کہ سودا کے بیان کی رنگینی زیادہ تر الفاظ و عبارت سے وابستہ ہے جبکہ میر کے کلام کی لطافت، معنی اور حسنِ ادا کے ساتھ مربوط ہے۔ زندگی کی ناکامیوں اور مصیبتوں پر ان کا زیرِ لب تبسم اور لطیف زہر خند اُن کے کلام کو "آہ" اور "واہ" کا مجموعہ بنا دیتے ہیں۔

طنز و مزاح میں اپنے بیان کو زیادہ موثر بنانے کے

بعض اوقات شاعر اپنے مدعا کا اظہار ایسے الفاظ کے ذریعہ کرتا ہے کہ سرسری نظر میں ان الفاظ کا مفہوم قائل کی مراد کے برعکس معلوم ہوتا ہے۔ اس طریقۂ بیان کو طنز کہتے ہیں۔ طنز و مزاح کے اسالیب میں کنایہ، تعریض، ایہام وغیرہ سبھی داخل ہیں۔ میرؔ کے کلام میں ان کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں ؎

ہوگا کسی دیوار کے سائے میں پڑا میرؔ
کیا کام محبت سے اُس آرام طلب کو

اس شعر میں عاشق کو آرام طلب بطور طنز و طعن کہا گیا ہے۔ شعر کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر عاشق کو اس کی آرام طلبی اور محبت سے بیگانگی پر ملامت کر رہا ہے لیکن شاعر کی اصل مراد یہ ہے کہ عاشق اپنی وفا شعاری میں ہر حال میں ثابت قدم ہے۔ "کسی دیوار" میں لفظ "کسی" سے بجائے تعمیم کے تخصیص کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ شاعر کی مراد یہ ہے کہ محبت کے باعث اپنا گھر بار چھوڑ کر عیش و آرام پر لات مار کے بے یار و بے خانماں عاشق صادق محبوب کی دیوار کے نیچے پڑا ہے۔ اس سے زیادہ وفا شعاری اور کیا ہوگی کہ جب گھر میں جگہ نہ ملی تو دیوار ہی کے سایہ کو غنیمت سمجھا۔ ؎

اب حالت دل ہے ان کے دلخواہ
کیا پوچھتے ہو الحمد للّٰہ

پرسانِ حال کے استفسار پر خدا کا شکر ادا کرنے کا مطلب بظاہر یہی ہوتا ہے کہ سب خیریت ہے لیکن دل کا حال محبوب کی منشاء کے مطابق ہونا اشارہ ہے۔ عاشق کی تباہ حالی کی تعریض۔ الحمد للّٰہ کا لفظ یہاں طنزاً استعمال ہوا ہے جس سے انتہائی مصیبت پر بھی صبر و شکر کا اظہار ہوتا ہے۔ شاعر کا مقصد یہ ہے کہ دل کی تباہ حالی کی تفصیل سے بہتر صبر و خاموشی ہے۔ ؎

تم نہیں فتنہ ساز سچ صاحب
شہر پرشور اس غلام سے ہے

محبوب کے حسن کی فتنہ سازی کی شکایت کرنے کے بجائے عاشق کا اپنے آپ کو حسن و عشق کے ہنگاموں کا باعث قرار دینا طنزیہ بیان ہے خود محبوب کی فتنہ پردازی کا۔ ؎

گو طاقت و آرام و خور و خواب گئے سب
بارے یہ غنیمت ہے کہ جیتا تو رہا ہوں

جن چیزوں پر زندگی کا انحصار ہے ان کے چلے جانے کے بعد زندگی کو غنیمت سمجھنا طنزیہ اظہار ہے اپنی بدحالی کا۔ ؎

تا دمِ مرگ غم خوشی کا نہیں
دل آزردہ گر سلامت ہے

بظاہر شعر کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر دلِ آزردہ کی سلامتی پر خوش ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے خوشی کی فکر نہیں۔ مگر شاعر کا اصل مقصد اس کے برعکس ہے یعنی آزردگی پسند دل کے ہوتے ہوئے خوشی کبھی نصیب نہیں ہو سکتی۔

مزاح و طنز کا ایک بلیغ اسلوب یہ ہے کہ شاعر ادائے مطلب کے لیے وہ سارے الفاظ جو اس کے لیے ضروری ہیں استعمال نہیں کرتا بلکہ چند خاص الفاظ پر اکتفا کرتا ہے۔ لیکن پیرایۂ بیان ایسا ہوتا ہے کہ شعر کا مضمون محذوف الفاظ کے بغیر بھی سمجھ میں آجاتا ہے۔ میرؔ اکثر ایک لفظ سے وہ کام لیتے ہیں جو ایک توضیحی جملے سے پورا ہو سکتا ہے ان کا یہ لفظی اشارہ بہت کثیر المعنی ہوتا ہے۔ ؎

کہا میں نے گل سے ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

کلی کے مسکرانے (کھلنے) میں پھول کی زندگی کی بے ثباتی کا راز پوشیدہ ہے۔ شاعر کے سوال کے جواب میں کلی کا صرف مسکرا دینا ایک عملی جواب ہے جس کا تعلق مشاہدے سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جتنی دیر کلی کے کھلنے میں لگتی ہے وہی پھول کی مدتِ حیات ہے۔ یہ سارا مضمون ایک لفظ تبسم میں پوشیدہ ہے۔

پہنچا تو ہوگا سمعِ مبارک میں حال میرؔ
اس پر بھی جی میں آئے تو دل کو لگائیے

اس شعر میں شاعر عشق بازی کے انجام بد سے عاشق مزاج لوگوں کو آگاہ کرنا چاہتا ہے۔ مگر اس کی تفصیل کرنے کے بجائے

اپنے انجام کار کی طرف اشارہ کر کے خاموش ہو جاتا ہے"۔ اس پر بھی کے الفاظ اس حقیقت پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ ناگفتہ بہ نتائج عشق جو مجھے پیش آئے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے کسی تنبیہ و نصیحت کی ضرورت نہیں ہے۔ اب جس کا جو جی چاہے کرے۔

لطف پر اس کے ہم نک نہ جا ہمدم
کبھی ہم سے بھی آشنائی تھی

ابتدائے عشق میں معشوق کے التفاتِ ناز پر مغرور نہ ہونے کی صلاح ایک نوگرفتار محبت کو شاعر دے رہا ہے۔ مگر محبت کے انجام بد کی تفصیل کرنے کے بجائے "کبھی ہم سے بھی آشنائی تھی" کہنے پر اکتفا کرتا ہے جس سے اس بات کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ عاشق کو آغاز محبت کی فریب کاریوں میں نہ آنا چاہیئے بلکہ انجام عشق کی تباہ کاریوں سے بھی باخبر رہنا چاہیئے۔

فارسی شاعروں کی پیروی میں ظاہر پرست واعظوں اور زاہدوں کی پردہ دری اردو غزل کا ایک خاص موضوع بن گیا ہے۔ میر تقی میر کی سرشت میں طنز و تعریض کا ملکہ شدت کے ساتھ موجود تھا۔ انھوں نے نئے نئے اسالیب کے ساتھ زہد ریائی پر کھلی چوٹیں کی ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں سے

شریف مکہ رہا ہے تمام عمر اے شیخ
یہ میر اب جو گدا ہے شراب خانہ کا

تمام عمر شریف مکہ رہنے کے بعد آخر عمر میں شراب خانہ کی گدائی اختیار کرنا اس حقیقت کا اظہار ہے کہ شاعر میخانہ کی بے ریا زندگی کو اپنی اگلی ریاکاری کی زندگی پر ترجیح دیتا ہے۔ سے

واعظ شہر تنک آب ہے مانند حباب
ٹک ہوا لگتی ہے اس کو تو ابھر جاتا ہے

ہوا لگنے سے مراد جھوٹی تعریف ہے اور یہ احمق کی خصوصیت ہے کہ وہ جھوٹی تعریف سے پھولا نہیں سماتا۔

نہ کیونکر شیخ توکل کو اختیار کریں
زمانہ ہو جو مساعد تو روزگار کریں

شیخ کے توکل اختیار کرنے کی وجہ شاعر نے زمانہ کی ناسازگاری قرار دی ہے، زمانہ ساتھ دے تو یہ پھر اپنا کاروبار دنیا طلبی شروع کردیں زمانہ کی مساعدت کے ساتھ "روزگار کریں" کا محاورہ کس قدر پر لطف ہے۔

نگاہ مست نے اس کی لٹائی خانقہ ساری
پڑا ابتر ہے اب تک کارخانہ زہد و طاعت کا

یاران دیر و کعبہ دونوں بلا رہے ہیں
اب دیکھیں میر اپنا جانا کدھر بنے ہے

مزاح و ظرافت کے لیے رمز و کنایہ ایک موثر آلہ کار ہے۔ وہ طریقہ بیان جو رمز و کنایہ میں ہوتا ہے بہ اعتبار صراحت کے کہیں زیادہ بلیغ ہوتا ہے کنایہ کے معنی لغوی در پردہ گفتگو کرنے کے ہیں اس کی عمدہ مثالیں میر کے کلام میں پائی جاتی ہیں کنایہ کی بہترین مثالوں میں میر کا یہ مشہور شعر پیش کیا جا سکتا ہے سے

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

گریبان کے چاک کا بڑھ کر دامن کے چاک سے مل جانا کنایہ ہے، اس کے افراطِ دریدگی سے "فاصلہ شاید نہ کچھ رہے" میں لفظ شاید کے استعمال میں جو لطف ہے وہ قابل غور ہے"۔

خردمندی ہوئی زنجیر ورنہ
گزرتی خوب تھی دیوانے پن میں

عقل و خردمندی ہی کی بنا پر انسان کو رسوم و قیود کا پابند ہونا ضروری ہے۔ خردمندی کا زنجیر بن جانا کنایہ ہے۔ عقل و ہوش کے ساتھ انسان کو پابند قیود ہونے سے مطلب یہ ہے کہ ایسی خردمندی کس کام کی جس سے انسان کی آزادی سلب ہو جائے۔

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی فیصلہ
آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر

مزاج کا امتحان پر آنا کنایہ ہے بے لاگ فیصلے سے۔ مطلب یہ ہے کہ عاشق کے عشق صادق اور رقیب کی جھوٹی محبت کے درمیان صحیح فیصلہ محبوب کی آزمائش پر منحصر ہے۔

جس کا وقت آگیا ہے۔ اس جانچ میں عاشق صادق کی کامیابی یقینی ہے۔

پھر بھی کرتے ہیں میرؔ صاحب عشق
ہیں جوان اختیار رکھتے ہیں

اس شعر میں "پھر بھی" کے دو لفظ اس مضمون پر دلالت کرتے ہیں کہ باوجود ان ناکامیوں کے جو راہ عشق میں شاعر کو پیش آئی ہیں وہ اپنی ناعاقبت اندیشی سے اب بھی عشق بازی سے باز نہیں آتا اور اس کو لوازم شباب سمجھتا ہے یہ اس کی بڑی نادانی ہے۔

میرؔ کی ظرافت بعض اوقات مضحک الفاظ و محاورات پر منحصر ہوتی ہے۔ یہ سطحی قسم کی ظرافت ہوتی ہے۔ جس میں کسی شخص یا حالت کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے۔ اس میں الفاظ اور طرز بیان دونوں سے مزاحیہ کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔ چند مثالیں حسب ذیل ہیں:۔

پھرا میں گرد سر اس کے تو بولا
تمہارا میرؔ صاحب سر پھرا ہے

گرد سر پھرنا اور سر پھرنا (بد دماغی ظاہر کرنا) میں جو فرق و تقابل ہے وہ لطف مزاح سے خالی نہیں۔

چشم بد دور چشم تر اے میرؔ
آنکھیں طوفان کو دکھاتی ہیں

چشم تر کے لیے آنکھیں دکھانے (مقابلہ کرنے) کے محاورے نے حسن بیان کو دوبالا کر دیا ہے۔

کہتے ہیں ترے کوچہ سے میرؔ آنے کہے ہے
جب جانیے وہ خانہ خراب اپنے گھر آوے

اس شعر میں خانہ خراب کی صنعت خاص مزاحیہ رنگ کی ہے اور یہی شعر کی جان ہے۔

اے ہم صفیر بے گل کس کو دماغ نالہ
مدت ہوئی ہماری منقار زیر پر ہے

منقار زیر پر ہونے سے مراد خاموش رہنا ہے۔ یہ لفظی مزاح کی نہایت پر لطف مثال ہے۔

غزل کے بعد میرؔ کی سب سے بڑی جولانگاہ مثنوی ہے۔ ایک مثنوی میں موسم بارش میں اپنے مکان کی خستہ حالی اور تباہی کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں۔

یہ جو بارش ہوئی تو آخر کار
اس میں سی سالہ وہ گری دیوار
آہ کھینچی خرابی کیا کیا نہ
کہتے ہو ہمسایہ ہیں وہ ہم خانہ

اپنے ہمسایہ کے مکان کے درمیان مشترک دیوار کے گر جانے سے ہمسایہ کے ہم خانہ بن جانے کا حادثہ کس قدر عجیب اور مضحکہ خیز ہے۔

مذکورہ بالا بیان اور مثالوں سے اس حقیقت کا ثبوت ملتا ہے کہ میر تقی میرؔ کے کلام میں غم و حزن کے غالب عنصر کے ساتھ ساتھ مزاح و ظرافت کے نمونے بھی پائے جاتے ہیں۔ حسرتؔ یاس کے مضامین کے پہلو بہ پہلو طنز و مزاح کا استعمال، لطف زبان، محاورہ بندی، مضامین کی جدت اور تاثیر، زبان کی سلاست اور سادگی، اور سچی واردات قلبی کی مصوری۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جو میرؔ کی شاعری کی عظمت کی ضامن ہیں۔"



نیا دور کا منشی نولکشور نمبر

اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لیے منشی نولکشور کا بیش بہا اور بے مثال خدمات پر انھیں خراج عقیدت پیش کرنے کی غرض سے نیا دور جلد ہی ایک خصوصی نمبر شائع کرنے جا رہا ہے۔ جس میں منشی نولکشور کی حیات اور کارناموں پر ملک کے ممتاز اور مقتدر ادیبوں کے مضامین کے علاوہ ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر اہم شعرا کی نظمیں بھی شائع ہوں گی۔

ادارہ

ڈاکٹر سلمان عباسی
۴۵ - ڈاکٹر موتی لعل
بوس روڈ -
لکھنؤ - ۲۲۶۰۰۱

نذرِ اقبال

ہمارا تذکرہ ہے عہدِ حاضر کے فسانوں میں
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

خدا جانے کہاں منصور کی حق آزمائی ہے
انا الحق کی صدا پھر آرہی ہے میرے کانوں میں

خدا کس کا، صنم کس کے، جبیں کس کی، صلا کس کو
یہی جھگڑا ہے اس دیر و حرم کے پاسبانوں میں

یہ بجلی بن کے گلشن کو جلا کر خاک کر دے گی
جو چنگاری سلگتی ہے ہمارے آشیانوں میں

انھیں لازم ہے اوروں پر بھی پتھر پھینکنا چھوڑیں
جو اک عرصے سے خود رہتے ہیں شیشے کے مکانوں میں

نہ ہم اقبال کو سمجھے نہ ان کا فلسفہ سمجھے
مگر اقبال اب رائج ہیں دنیا کی زبانوں میں

احسن نشاط
معرفت: پروفیسر عتیق احمد صدیقی
اردو ڈپارٹمنٹ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

مسافر

میں مسافر ہوں مسافر کا بھروسا کیا ہے
میری منزل ہے کہاں اور مرا رستا کیا ہے
کس کو معلوم بھلا میرا ارادا کیا ہے
تم تو معصوم ہو تم نے ابھی دیکھا کیا ہے
اور دل والوں کی تقدیر کا نقشا کیا ہے
بہ خدا با دلِ رنجور مجھے جانا ہے
کیوں نہ جاؤں گا بہت دور مجھے جانا ہے

مجھ کو معلوم ہے کچھ دن میں جو حالت ہوگی
حالِ دل سننے میں بھی تم کو قباحت ہوگی
لطف تو یہ ہے تمھیں مجھ سے شکایت ہوگی
مجھ سے ملنے میں یقیناً تمھیں زحمت ہوگی
اور رسوائی اگر میری بدولت ہوگی
زندگی میرے لیے ایک قیامت ہوگی
ہو کے حالات سے مجبور مجھے جانا ہے
کیوں نہ جاؤں گا بہت دور مجھے جانا ہے

بس خیال آتا ہے رہ رہ کے ہر اک بار مجھے
یاد آئیں گے یہاں کے در و دیوار مجھے
یاد آئیں گے تمھارے لب و رخسار مجھے
اور تڑپائے گی یہ چشمِ فسوں کار مجھے
کیسے مل پائیں گے یہ گیسوئے خم دار مجھے
تم سا ملنے کو نہیں یار طرح دار مجھے
لے کے اک درد کا ناسور مجھے جانا ہے
کیوں نہ جاؤں گا بہت دور مجھے جانا ہے

جوہر نظامی
درگاہ۔ پٹنہ ۶

اسلوبِ گفتگو

سفر میں ہوں یا حضر میں، ہوٹل میں ہوں یا کلب میں خلوت میں ہوں یا جلوت میں۔ دو صاحب مذاق، صاحب علم و دانش جب ملتے ہیں تو ذہنی اتصال گفتگو ہی سے ہوتا ہے۔ وہ گفتگو ہی سے ایک دوسرے کے خیالات کو جذبات و احساسات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گفتگو ہی سے انسانی سیرت و اخلاق کی عکاسی ہوتی ہے، اسی لیے گفتگو کو آرٹ کہا گیا ہے یہ آرٹ یا ہنر یا فن ایسے اشخاص کی صحبت میں سیکھا جاتا ہے جو قدرتی طور پر اس کے ماہر ہوں۔ گفتگو کی نوعیت اور محاسن ہی سے گفتگو کرنے والے کے کلچر کی خوبی، حسن مذاق، ذہنی رجحانات، صلاحیت اور دوسرے اوصاف کا اندازہ ہوتا ہے۔ اعلیٰ قسم کی گفتگو کا انحصار صرف ذہن کی ذکاوت اور دماغ کی تیزی پر نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق موروثی تعلیم و تربیت اور کلچر سے ہوتا ہے۔

عام طور پر اہل مشرق فرصت کے اوقات میں زیادہ تر لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر بات چیت کرتے ہیں۔ اس کو اُن کی بیکاری اور کاہلی پر محمول نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس طرح کی انفرادی گفتگو اور تبادلۂ خیالات سے دماغ کو ایسی غذا ملتی رہتی ہے جو کتابوں کے مطالعہ سے میسر نہیں ہوتی۔ ان کے لیے گفتگو تعلیم خصوصاً نفسیاتی تعلیم کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ گو وہ عام طور سے اس کی تعبیر اس طرح نہیں کرتے ہیں۔

اصحاب فکر و دانش، ارباب فلسفہ و حکمت اور ترجمان علم و ادب کی گفتگو میں ایک خاص قسم کی شگفتگی اور کشش ہوتی ہے جو ذہنی تربیت کا ذریعہ بنتی ہے۔ عہد قدیم کے علم و فنون پر گہری نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ گفتگو میں سلیقہ اور تربیت پر کلچر کا ارتقا منحصر رہا ہے۔ لیکن موجودہ دور میں یہ آرٹ بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اگر واقعی نظر انداز کر دیا گیا ہے تو اس کی وجہ کیا ہے۔ اساسی طور پر موجودہ نسل گذشتہ نسلوں سے مختلف نہیں۔ گو بظاہر دونوں میں ایک وسیع خلیج حائل نظر آتی ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ موجودہ عہد کے لوگوں کا طرز زندگی بالکل بدل گیا ہے اور اُن کے ذہنی و اخلاقی چوکھٹے میں جو تصویر نظر آتی ہے وہ کچھ خوش گوار نہیں ہے

کیا جانے کیا ہو گیا ارباب جنوں کو جینے کی ادا یاد نہ مرنے کی ادا یاد

اُن کی علمی و ادبی زندگی خود پسندانہ خیالات و جذبات کا مرکز بنتی جا رہی ہے۔ ان کی زندگی ذاتی مفاد اور انفرادی جد و جہد کی وجہ سے طوفان خیز ہو گئی ہے۔ ان کو اپنی مشغولیت کے سبب اتنی فرصت نہیں ملتی کہ وہ گفتگو کو آرٹ یا فن کے طور پر سیکھنے کی کوشش کریں۔ جبکہ عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ گفتگو بے کار اور خالی وقتوں میں کی جاتی ہے۔ لیکن یہ کوئی معقول وجہ نہیں۔ اس کے حقیقی اسباب موجودہ تمدن کے معاشرتی اجزا کا تجزیہ کرنے کے بعد معلوم ہوں گے۔ درحقیقت اس کے دو سبب بتائے جا سکتے ہیں ایک تو تجارت اور سیاست کا وسیع پیمانہ پر فروغ دوسرے انسان کے جذبہ خود پسندی کی بے راہ روی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خود پسندی موجودہ دور کی پیداوار نہیں بلکہ اُس وقت سے قائم ہے جب سے انسانی آبادی شروع ہوئی لیکن پہلے خود پسند کچھ افراد ہوا کرتے تھے۔ اب ہر جگہ، ہر شہر میں خود پسندوں کی اکثریت ہے۔

اب یہ حضرات اُن تمام چیزوں سے برسرپیکار ہیں جن سے اُن کو مادی فوائد حاصل نہیں ہوتے ہیں جس کے سبب حسنِ سیرت

حسنِ اخلاق بازارِ حیات میں ایک جنس کمیاب و نایاب بن کر رہ گئی ہے۔

تنقید یا اختلاف کوئی بری چیز نہیں مگر تعمیری جذبہ اور دامن میں ذاتی مفاد کی جھلک تک نہ ہو۔ لیکن نامساعد حالات میں آرٹ اور حسنِ کلام کی ترقی کی کیا امید ہو سکتی ہے؟

بہت سے شعر، فکر، ادیب اور باکمال شعرا محض اس لیے گمنامی اور غربت کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں کہ اس تجارتی دنیا میں ادب و شاعری کو حسنِ گفتگو کی طرح محض ایک ذہنی عیاشی سمجھا جاتا ہے۔ یہ دونوں حسین آرٹ تجارت کے دائرے سے باہر ہیں اس لیے ان کی طرف توجہ کم ہے لیکن جو ملک یا خطے ابھی کاروباری اور صرف صنعتی بننے سے محفوظ ہیں وہاں یہ دونوں آرٹ اب بھی بہت مقبول ہیں۔ شہروں کے شور اور ہنگاموں سے دور اب بھی یہ منظر دیکھنے میں آتا ہے کہ کچھ لوگ چوپال میں بیٹھ کر یا تو منظوم قصے جیسے ہیر رانجھا، سوہنی مہیوال یا پھر الف لیلیٰ، چہار درویش، فسانۂ آزاد اور داستان وغیرہ پڑھتے اور سنتے ہیں یا آپس میں مختلف علوم و فنون پر باتیں کرتے ہیں۔ ایسی مجلسیں شکوہ و شکایت یا دل آزاری سے یکسر پاک رہتی ہیں۔ کچھ کاتبِ فکر ایسے بھی ہیں جو ان باتوں کو ایسے تذکروں کو فضول سمجھتے ہیں۔

گفتگو کے دو پہلو ہیں۔ کرنا اور سننا۔ اچھی گفتگو کرنے والے کی طرح اچھے سننے والوں کی بھی بہت کمی ہوتی جا رہی ہے۔ اچھی اور دلکش گفتگو کرنے والوں میں اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر بعض عظیم ہستیوں کا ذکر بھی کرنا چاہوں گا۔ جس کے بغیر آج کی یہ گفتگو نامکمل رہے گی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی سحر آفرینی مشہور ہے ان کی تقریر و تحریر سے لوگ واقف ہیں۔ وہ علم و دانش اور بصیرت کے مینار تھے۔ اردو زبان میں ان کی جیسی خطابت کی مثال ملنا مشکل ہے۔

غالب کی اچھوتی اور منفرد نثر کے بعد مولانا آزاد کی نثر کا جواب نہیں۔ لیکن یہی نہیں مولانا آزاد گفتگو بھی نہایت شگفتہ، دلکش، پُراثر اور عالمانہ انداز میں کرتے تھے۔

شاعرِ مشرق ڈاکٹر سر محمد اقبال کی شاعری سے ایک دنیا واقف ہے۔ لیکن ان کی گفتگو بھی بڑی دلکش ہوتی تھی۔

علامہ سید سلیمان ندوی سے کون ہے جو واقف نہ ہو۔ اُن کے تاریخی کارناموں سے صاحبِ علم حضرات روشناس ہیں۔ ان کی گفتگو میں دلکشی کے ساتھ معلومات کا سمندر لہریں مارتا تھا اس میں طنز و مزاح کی آمیزش بھی ہوتی تھی۔ آواز دھیمی تھی اور باتیں بہت ٹھہر ٹھہر کر کرتے تھے۔

مولانا سید سلیمان اشرف (علی گڑھ) (ڈاکٹر ذاکر حسین پروفیسر رشید احمد صدیقی کے استاد) علامہ عبداللہ عمادی مرحوم دکن تاریخ طبری کے مترجم۔ سر تیج بہادر سپرو الہ آباد، نواب نصیر حسین خیال عظیم آبادی۔ مولانا مناظر احسن گیلانی صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ دکن۔ مولانا عبدالماجد دریابادی مدیر صدق جدید۔ ان حضرات کی گفتگو میں وہ جذب و اثر تھا کہ ان کے پاس سے اُٹھنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔

ڈاکٹر عظیم الدین احمد مرحوم سابق صدر شعبۂ اردو و عربی پٹنہ یونیورسٹی۔ بہت ہی شگفتہ، دلچسپ پُرمغز اور عالمانہ گفتگو فرماتے تھے۔ اس سلسلے کے دیگر حضرات میں مولانا عبدالمجید سالک مرحوم ایڈیٹر انقلاب لاہور۔ مولانا عبدالرزاق ملیح نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی حضرت خواجہ حسن نظامی مولانا محمد علی ایڈیٹر کامریڈ۔ ڈاکٹر سچدانند سنہا بیرسٹر پٹنہ۔ قاضی عبدالودود بیرسٹر، پروفیسر سید حسن عسکری اور ڈاکٹر عابد رضا بیدار وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

انگریزی زبان میں مقناطیسی جذب و اثر کے ساتھ گفتگو کرنے والوں میں ڈاکٹر رادھا کرشنن پنڈت جواہر لال نہرو مسز سروجنی نائیڈو۔ رابندر ناتھ ٹیگور۔ نواب [illegible] جنگ بہادر۔ نواب سر نظامت جنگ مولانا محمد علی ایڈیٹر کا شری ستیا مورتی مسٹر آصف علی دہلی۔ اور مؤید الملک

ایام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات کا اسلوب بڑا عالمانہ اور پرکشش تھا۔

اردو زبان میں نہایت عمدہ، شستہ اور دل کش انداز میں گفتگو کرنے والوں میں ڈاکٹر ذاکر حسین پروفیسر رشید احمد صدیقی اور پروفیسر خواجہ غلام السیدین مرحوم اپنا جواب آپ تھے۔ ان حضرات کے پاس بیٹھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز ہم پر برابر برس رہی ہے۔ درگزر کرنے کا یہ عالم تھا کہ کوئی کتنی ہی گستاخی کیوں نہ کرے ان حضرات سے اس کے تعلقات میں کبھی فرق نہ آتا۔ مخالفین بھی ان کے حسن سلوک کا اعتراف کرتے تھے۔

دیگر حضرات میں جنھیں قدرت نے تحریر کے ساتھ تقریر کی غیر معمولی صلاحیت بھی عطا فرمائی ہے حضرت مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ پرکشش اور عالمانہ گفتگو کرنے والوں اور گفتگو سننے والوں دونوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ حساس صاحب علم باخبر اور بیدار مغز ہوں اور گھنٹوں خاموش رہ سکتے ہوں تاکہ صبر و سکون کے ساتھ گفتگو کی تہہ تک پہنچ سکیں۔ اگرچہ گفتگو کرنے والے کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

سنجیدہ اور مہذب اشخاص کی گفتگو ایک دلچسپ تجربہ کا باعث ہوتی ہے۔ ان کی گفتگو میں ایسا توازن ہوتا ہے کہ ان میں خواہ کتنا ہی اختلاف ہو لیکن گفتگو میں تلخی اور ناگواری نہیں پیدا ہونے پاتی۔ نفیس گفتگو کرنے والا کبھی اپنی گفتگو کو مذہبی عقیدہ کی حیثیت سے نہیں شروع کرتا کہ اس میں ترمیم اور تبدیلی کی گنجائش ہی نہ ہو۔ کیونکہ گفتگو میں مخاطب کے خیالات کا احترام ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ گفتگو کرنے والے کو پورا حق ہے کہ وہ دوسرے کی رائے کی مخالفت کرے اور اپنے نقطۂ نظر کو واضح کرے۔ لیکن اس سے یہ بھی توقع کی جاتی ہے کہ معقول دلائل و براہین کے بغیر کسی پس و پیش کے قائل ہونے میں تامل نہ کرے۔

ظاہری اقتدار اور بڑائی نیز محض احساس کمتری کی بنا پر معقول بات کو تسلیم کرنے سے منکر نہ ہو۔ اس سے گفتگو کا سارا لطف اور افادیت جاتی رہتی ہے اور گفتگو محض مناظرانہ بحث میں تبدیل ہو کر رہ جاتی ہے۔

نفیس اور پرمغز گفتگو کرنے کے لیے وقت اور جگہ کا لحاظ ضروری ہے۔ مناسب وقت اور مناسب جگہ پر دماغ گفتگو کرنے اور سننے کے لیے حاضر رہتا ہے لیکن آج کل کی زندگی میں مناسب وقت اور مناسب جگہ کا تعین کرنا مشکل ہے۔ فرصت کے اوقات زیادہ تر سینما اور کلب میں گزرتے ہیں۔ سینما اور نائٹ کلبوں کی چہل پہل سے کچھ دیر کے لیے تفریح تو ضرور ہو جاتی ہے لیکن اس قسم کے مشاغل سے دماغ کی تربیت اور نشو و نما نہیں ہوتی۔ بعض ہوٹلوں میں ایسے اشخاص بھی ملتے ہیں جو گفتگو کرنے میں ایسے منہمک ہو جاتے ہیں کہ ہوٹل کی موسیقی اور سڑکوں کا شور و غل بھی ان کے انہماک میں مخل نہیں ہوتا۔ لیکن ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔

بہر حال گفتگو کو آرٹ یا ہنر کی طرح سیکھنے والے اشخاص کو تھوڑے ہنگامہ خیز ماحول میں بھی مناسب جگہ مل سکتی ہے بشرطیکہ وہ اس کے خواہاں ہوں۔ عام طور سے چاندنی رات اور گرمی کے موسم کی ٹھنڈی ہوائیں۔ دریا کا کنارہ یا گوشۂ خانقاہ اور خوشگوار ماحول پرکشش علمی گفتگو کرنے کے لیے بہت موزوں ہوتا ہے۔

ہمارے جاہ و ثروت کے زمانے میں اچھی گفتگو کرنا ایک بڑا معاشرتی وصف سمجھا جاتا تھا۔ وہ میزبان بڑا مقبول ہوتا تھا جو اپنے مہمانوں کی ضیافت اعلا قسم کی گفتگو سے کرتا تھا۔

عہد حاضر کی تہذیب میں بھی کھانے کی میز پر اچھے کھانوں سے زیادہ اہمیت اچھی گفتگو کو دی جاتی ہے۔

اس طرح کی گفتگو کے ذریعہ اہم سیاسی، تجارتی، علمی اور اقتصادی مسائل کھانے کی میز پر ہی طے کیے جاتے ہیں۔ گو ایسی گفتگو کو فن کے نقطۂ نظر سے پرفریب کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس طرح گفتگو کرنے والوں کے اصل خیالات و جذبات کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ وہ اپنے مقاصد سامنے رکھ کر اپنی گفتگو میں مدبرانہ پہلو اختیار کرتے

حنیف کیفی
شعبۂ اردو
جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

ساحل سلطانپوری
ہاشم منزل سول لائنز
سلطان پور - یو پی

غزلیں

مری سکوں طلبی کا کرو علاج کوئی
تمہیں تلاش کرو میرا ہم مزاج کوئی

تمام جسم میں گھل جائے زہر تشنہ لبی
نہ لب کشا ہو مگر زخم احتیاج کوئی

کرو نہ مجھ کو مکدر میں صاف پانی ہوں
نہیں پسند مجھے رنگ امتزاج کوئی

یہ کس کہانی کا عنوان ہو خدا جانے
سُنا رہا ہے مجھے کل کی بات آج کوئی

بہا سکے گی اسے لہر کیا زمانے کی
اسیر کر نہ سکا ہو جسے رواج کوئی

اُتر گیا ہے رگ جاں میں زہر بادِ حیات
سوائے موت اگر ہو کرو علاج کوئی

میں اپنی مردہ دلی پر ہوں نوحہ خواں کیفی
نہ انقلاب کی خواہش نہ احتجاج کوئی

دلوں میں گرمیٔ سوز و گداز رہنے دے
یہ سلسلے ہیں جنوں کے دراز رہنے دے

سفر کا لطف انھیں راستوں پہ ملتا ہے
قدم قدم پہ نشیب و فراز رہنے دے

میں جل رہا ہوں کسی پیاس کے جہنم میں
لبوں پہ یہ لبِ شبنم نواز رہنے دے

ہر آئینے کو نہ دے داغ نامرادی کے
ہمارے بیچ کوئی امتیاز رہنے دے

مرے لہو کے تقدس کو یوں نہ ارزاں کر
کہاں سے لائے گا کوئی جواز رہنے دے

ہجوم چشم تماشا میں یوں نہ عریاں کر
مرے وجود کو تو حرفِ راز رہنے دے

بہار ہو کہ خزاں کا زمانہ ہو ساحل
چمن چمن مجھے نغمہ طراز رہنے دے

اوم پرکاش بجاج
۲۰۰۔ ای گورنمنٹ کوارٹرز
قرول باغ، نئی دلی ۱۱۰۰۰۵

قطعات

(۱)

زندگی کے بھرے خزانوں سے
میں نے تھوڑے خلوص چھانٹے ہیں
ماسوا ان کے میرے دامن میں
نہ کوئی پھول ہے نہ کانٹے ہیں

(۲)

ولولے جب تک نہ ہوں نغمہ سرا
دل میں پیدا نور ہو سکتا نہیں
چوم کر دار و رسن کو ہم نفس
ہر کوئی منصور ہو سکتا نہیں

(۳)

غم کے احساس سے جو عاری ہے
دل وہ دل ہی نہیں ہے پتھر ہے
سچ تو ہے عزم و حوصلے کے بغیر
زندگی موت کے برابر ہے

(۴)

جو بھی قلب و نظر نے دیکھا ہے
وہی رنگ سخن میں ڈھالا ہے
زندگی کے گھنے اندھیروں سے
میں نے ڈھونڈا یہی اجالا ہے

وصی سیتاپوری
آزاد نگر۔ سیتاپور

چھوٹی بچت اسکیم

وہ وقت گیا وہ دور گیا جب لوگ پریشاں رہتے تھے
چہروں سے ٹپکتی تھی غربت اور چاک گریباں رہتے تھے
ہر رات یہاں پر سوتی تھی ناداری کی چادر تانے
اور اچھے اچھوں کے گھر میں بھی فاقے مہماں رہتے تھے
ہر عزم جواں تھا اپنا مگر فیضان اسیری کیا کہیے
ہر حوصلہ مردہ جیسا تھا دم توڑ گئے ارماں رہتے تھے
ماحول کی زنجیریں جکڑے تعمیر و ترقی کی راہیں
مایوس دلوں اور ذہنوں میں بس خواب پریشاں رہتے تھے
تحریر دمکتے چہروں پہ صدیوں کے پریشاں افسانے
دھندلے دھندلے مرجھائے مٹے افسانوں کے عنواں رہتے تھے
برہم تھا سکون قلب و نظر مستقبل کے اندیشوں سے
ہم ایسے جزیرے تھے جن کو گھیرے ہوئے طوفاں رہتے تھے
ہر مشکل خود آسان ہوئی ان چھوٹی بچت اسکیموں سے
پھر اس دنیا میں باعزت جینے کا ہمیں انداز آیا
دانہ دانہ انبار بنا اور قطرہ قطرہ سے ساگر
اس طرح ہمارا سرمایہ خود آج ہمارے کام آیا
خود سامنے آ کر بننے لگیں تعمیر و ترقی کی راہیں
رفتہ رفتہ کافور ہوا صدیوں کی غلامی کا سایا
سڑکوں نہروں کا جال بچھایا دیش کے کونے کونے میں
کھیتوں کھیتوں اس پیسے نے دھرتی پہ سونا برسایا
یہ سارا پیسہ لگتا ہے تعمیر وکاس کے کاموں میں
اس آپ کے پیسے نے آخر نادیدہ نشانہ اپنایا
ہیں جتنے ادھورے منصوبے ان سب کو رہبر ہم دیں گے
یہ عہد وصی اب کرتے ہیں منزل پہ آ کر دم لیں گے

ماہر قریشی
۸/۲۴۲ اندرون گلی مقابل جگت سینما
بڑا بازار۔ بریلی۔ یو۔ پی۔

ڈاکٹر ماتا پرشاد زیب بریلوی

نام ماتا پرشاد، تخلص زیب، ۱۱ر نومبر ۱۹۰۹ء کو بمقام بریلی پیدا ہوئے۔ زیب صاحب کے والد کا نام بابو لکھن لال تھا جو بریلی کے کائستھ استھانہ خاندان کے متمول زمیندار تھے۔

زیب صاحب نے اردو اور فارسی کی تعلیم مولوی قاسم علی صاحب خواہاں اور ان کے بعد مفتی حبیب الحسن صاحب احسن سے حاصل کی۔ انگریزی میں میٹرک پاس کرنے کے بعد رجسٹرڈ میڈیکل پریکٹیشنر R.M.P کی سند حاصل کی اور اپنے مکان واقع محلہ ذکاتی میں پریکٹس کرنے لگے۔ بعد کو پریکٹس چھوڑ دی اور ایچ۔ آر شوگر فیکٹری بریلی اور شوگر فیکٹری کچھا میں ملازم رہے۔ پھر آر۔ آر۔ انجینئرنگ ورکس کلکٹر بک گنج میں کام کرتے رہے۔ دیہی اور شہری جائیداد سے معقول آمدنی تھی۔

مولوی قاسم علی خواہاں اور مفتی حبیب الحسن احسن کی تعلیم و تدریس نے زیب صاحب میں فطری ذوق شعری کو جلا دی۔

۱۹۲۶ء میں زیب صاحب نے پہلی غزل ایک مقامی مشاعرے میں پڑھی جس پر احسن صاحب کی اصلاح تھی۔ زیب صاحب فرصت کا وقت معجز، علیش اور تحو جیسے ممتاز اساتذہ بریلی کی صحبت میں گزارتے تھے۔ اس فیض صحبت سے زیب صاحب کی شاعرانہ صلاحیتیں تیزی سے ابھریں اور وہ تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کرنے لگے۔ ۱۹۲۷ء میں زیب صاحب نے ایک آل انڈیا مشاعرے کا اہتمام کیا جس میں ہندستان کے نامور شعرا نے شرکت کی تھی۔ یہ مشاعرہ ساہو گوپی ناتھ کے مکان پر منعقد ہوا تھا۔ اور ۲۶ گھنٹے مسلسل جاری رہا۔ اس مشاعرہ کا گلدستہ نہال سخن کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس مشاعرہ کی یاد اب تک لوگوں کے دلوں میں تازہ ہے۔

زیب صاحب نے قدیم و جدید شعرا کا گہری نظر سے مطالعہ کیا، اس وقت کتابوں کا حصول اور ان کا مطالعہ زیب صاحب کا محبوب مشغلہ تھا۔ زیب صاحب مومن خاں مومن دہلوی سے بے حد متاثر تھے۔ بعد کے شعرا میں سب سے زیادہ سیماب اکبرآبادی سے متاثر ہوئے۔ اس تاثر نے اس قدر کشش پیدا کی کہ ۱۹۲۱ء میں سیماب صاحب کے شاگرد ہو گئے۔ سیماب صاحب بھی اس لائق شاگرد کی قدر کرتے تھے۔

سیماب صاحب نے زیب صاحب کے ذہن و فکر پر فن شاعری کے گہرے نقوش مرتسم کیے۔ زیب صاحب فرماتے ہیں :-

میں لفیض حضرت سیماب اے اہل نظر
شاعر امروز بھی ہوں شاعر فردا بھی ہوں

یہ سیماب صاحب کا ہی اثر ہے کہ زیب صاحب نے کوزہ گری کو وصف شاعری کبھی نہیں سمجھا ان کی شاعری عالمی ماحول کی ترجمان ہے، یہی وجہ ہے کہ ہندستان و پاکستان کے موقر رسالوں اور اخباروں میں زیب صاحب کا کلام شائع

ہوتا تھا۔

زیبؔ صاحب سے میری واقفیت ۱۹۴۱ء سے ہے اور میرا یقین ہے کہ زیبؔ صاحب بریلی کے ان چند گنے چنے شاعروں میں سے تھے جنھوں نے بریلی کا وقار بلند کرنے میں حصہ لیا ہے۔ اس وقت زیبؔ صاحب کی عمر شاعری لگ بھگ ۵۲ سال تھی۔ اس مدت شاعری میں وہ بزم و گرم ماحول سے بھی گزرے لیکن ان کے پائے استقامت کو کبھی جنبش نہیں ہوئی۔ سراپا پیار خلوص ان کا مسلک تھا وہ حلیف و حریف دونوں کو یکساں طور پر نوازتے تھے۔ ان کے خلوص، وسعتِ نظر اور وضعداری نے بھی ان کے فن کی ترقی میں حصہ لیا۔ وہ خود فرماتے ہیں۔ سہ

خلوص کا زیبؔ فیض یہ ہے، مآلِ کسبِ ادب کا یہ ہے
نظر کو آسودگی ملی ہے، شعورِ اہلِ نظر سے پہلے

زیب صاحب کی شاعری کا سراغ ان کی بے چین طبیعت میں بھی ملتا ہے، جب زیب صاحب نے آنکھ کھولی تو بریلی میں غزل کا دور دورہ تھا مگر زیبؔ صاحب کی بے چین طبیعت اور ان کے کثرتِ مطالعہ کا تقاضہ شدید تھا وہ "تنگنائے غزل" میں مقید محصور ہونا نہیں چاہتے تھے، ان کی نظر اس ابھرتے ہوئے سورج پر تھی جس کی شعاعیں نمودار ہونے لگی تھیں۔ انھوں نے نئے سورج کو سلامی دی ۔ غزل کے ماحول میں نظم، گیت اور نئے رس بھرے ہوئے قطعے لکھے۔

دراصل زیب صاحب بریلی کے "فراق" تھے۔ فراقؔ کی طرح فن کے "مفتی" زیب صاحب سے بھی ناراض تھے۔ . . . . . .
. . . . مگر زیبؔ صاحب اپنے نادر خیالات اور تصورات کو نظم کرتے رہے، وہ عام طور پر "مفتیاتِ ادب" کی کرم فرمائیوں سے متاثر نہیں ہوئے۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۳۱ء میں میرے ہم جماعت دوست سلامؔ مچھلی شہری نے قدیم ڈگر سے ہٹ کر نیا رنگ اپنایا تو فیض آباد کے شعراء نے ان کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ اس وقت غور طلب ہے کہ سلام مرحوم شاعرانہ اعتبار سے کس مقام پر فائز ہیں؟ ہمیں یقین ہے کہ زیبؔ صاحب مرحوم کا مقام بھی وضاحت کے ساتھ متعین ہو جائے گا۔

منتا سمجھ کے میں نے مزاجِ بہار کا
دامن جھٹک دیا ہے غمِ روزگار کا

آوارۂ بہار ہوں میری خطا معاف
احسان کیوں اٹھاؤں نسیمِ بہار کا

حریفِ آئینہ خانہ تھی عزمِ دید کی صورت
ہنسی جلووں کی حیرانی پہ یوں بھی آ گئی مجھ کو

برسوں رگِ حیات سے ٹپکا کیا لہو
ایسا چبھا تھا قلب میں پیکاں حجاب کا

تشنہ لبوں کو دیکھ کے ساقی کے ہاتھ سے
ساغر چھلک گیا ہے خوشی میں شراب کا

اہلِ جہاں کو زیب شعور و نظر سے ہم
پیغام دے رہے ہیں نئے انقلاب کا

زیبؔ صاحب اپنی غزل میں ندرتِ بیان اور خیال آفرینی سے بھی کام لیتے تھے۔ بقول اقبال احمد سہیل :۔

"فرسودہ اور پامال خیالات کو بغیر کسی ندرتِ بیان کے پیش کرنا شاعر کو نقد و نظر کے محکمۂ احتساب میں ایک قابلِ تعزیر مجرم قرار دیتا ہے۔"

زیبؔ صاحب اس اندازِ بیان میں بہت کامیاب ہیں۔ انتخابِ الفاظ اور تراکیبِ الفاظ کے لحاظ سے زیب صاحب کے مندرجہ ذیل اشعار متنوع ہیں۔ خود اعتمادِ شاعر کا یہ بھی ایک حسن ہے"!

وفا کی راہوں میں روشنا تھی، نمودِ شام و سحر سے پہلے
مرے شبستاں میں جاوداں تھی جمالِ شمس و قمر سے پہلے
کبھی محبت کی خلوتوں میں کبھی محبت کی انجمن میں
ہوا تصادم نہ دل کا، دل سے تصادم ہر نظر سے پہلے
اب نہ تسکین دے سکیں گے جام و مینا نہ مجھے
بھول جائیں شوق سے یارانِ میخانہ مجھے

تیری رحمت کے سہارے پر یقیناً ذوق ہے
زندگی بھر احترامِ جام و پیمانہ مجھے

حسن کی مجبوریاں نازک تقاضے عشق کے
کر نہ پائیں گے کبھی وحشت سے بیگانہ مجھے

اب بھی پیمانے چھلک جاتے ہیں میرے نام پر
دعوتیں دیتی ہیں اب بھی چشمِ مستانہ مجھے

تشنۂ جلوہ ابھی معراجِ ذوقِ دید ہے
اور کر حیرانِ فروغِ آئینہ خانہ مجھے

افسانۂ حیات کا عنواں کسے ہے یاد انجام یاد ہے دلِ خانہ خراب کا
امیدِ التفات نے برباد کر دیا دل اعتراف کر نہ سکا اعتبار کا

دلِ غم آشنا کو مسکرا کر دیکھنے والے
جو دل کی چوٹ سینے پر ابھر آئی تو کیا ہوگا

شمع و پروانہ کے مضمون کو عموماً شعرا نامرادی، نوحۂ غم اور کسمپرسی سے تعبیر کرتے ہیں لیکن زیب صاحب کے اشعار میں یہ مضمون امید و رجائیت سے عبارت ہے :۔

سوز و سازِ دل سے روشن بزمِ احساسات ہے
رقصِ محفل ہے مذاقِ شمع و پروانہ مجھے

ظلمتوں میں جب فروزاں ہوگی شمعِ آرزو
روشنی دے گا خلوصِ سوزِ پروانہ مجھے

دراصل زیب صاحب کے اشعار میں سوز و گداز کا آہنگ بھی دل نواز ہے اور یہ ندرت ادا ان کی وسعتِ نظر کی عکاس ہے :۔

ندیم دفنا دیا کہاں پر اسے محبت کی دھڑکنوں میں
لطیف سی جو خلش تھی دل میں نمودِ سوزِ جگر سے پہلے

ہر نقشِ آرزو کو تماشا بنا دیا
گلشن کھلا ہوا ہے مرے اضطراب کا

خودی و بے خودی اور عرفان و آگہی کے مضامین کو زیب صاحب نے اس پیرایۂ بیان میں ادا کیا ہے : ؎

رہِ وفا ایسے بھی آتے ہیں مقام اکثر
جہاں آنکھیں کھلی رہتی ہیں بک جاتے ہیں جام اکثر

کچھ آدابِ محبت کے سلیقے اور ہوتے ہیں
نگاہوں سے بھی ہو جاتے ہیں محفل میں سلام اکثر

وحشت نے بھرم کھلوا ہی لیا عرفانِ عقیدت مندی کا
کس سمت کو سجدہ کرنا تھا کس سمت کو سجدہ کر بیٹھے

خرد کی راہوں میں جانے والے گذر گئی رہگذر سے پہلے
میں اپنی منزل پہ آ گیا ہوں جنوں میں اہلِ نظر سے پہلے

حوادثِ حیات کو کس صفائی اور برجستگی سے پیش کیا ہے ۔ ؎

اب نہ کر مجبورِ حسنِ چمن خانہ مجھے
یاد ویرانے کو میں کرتا ہوں ویرانہ مجھے

موجوں پہ چھوڑ دیتے سفینہ حیات کا
احسان ناخدا نہ اٹھاتے تو خوب تھا

زیب طوفاں کی وسعت تو بہت ہے لیکن
رخ سفینے کا ہر اک موج بدل سکتی ہے

بربادیوں نے زورِ حوادث کی آڑ میں
عنوان بدل دیا ہے رخِ انقلاب کا

حسن و عشق غزل کی روح ہے اور ہر دور کے شاعر نے حسن و عشق کے نقش و نگار سے اپنی غزل کو سجایا ہے۔ فلسفۂ حسن و عشق کے متعلق اقبال احمد سہیل نے لکھا ہے ؎

"حسن و عشق کے ربطِ باہمی کی نسبت مختلف نظریئے ہیں۔

۱۔ عشق خالقِ حسن ہے۔
۲۔ توفیق یعنی حسن تقاضائے عشق کا محرک اور خالق ہے۔
۳۔ حسن اور عشق اپنی اپنی جگہ پر مستقل ہستیاں ہیں۔
۴۔ حسن اور عشق کی حقیقت ایک ہی ہے مثالیں دو ہیں۔

زیب صاحب نے اپنی غزل میں ان چاروں نظریوں کو اعتماد اور وثوق کے ساتھ اپنایا ہے۔

پہلا نظریہ

میرے چمن کی بہار بھی یہ مری نظر کا جمال تھا
اسے رنگ و بو کے نکھار نے سرِ لالہ زار بنا دیا

اے جذبِ عشق یہ بھی کرامات کیا کہوں
یوسف کو تو نے خوابِ زلیخا بنا دیا

اس لئے منت کش احساں ہوں تپ عشق میں
دل کے شعلے حسن کی تنویر بن کر رہ گئے

دوسرا نظریہ

دل بے نیاز ہو کے محبت میں کھو گیا
اب جنوں نواز ہے عالم شباب کا
کہاں [illegible] محبت میں سکوں [illegible]
حسن ہی کو [illegible] مقام [illegible] سمجھا گیا

تیسرا نظریہ

مری محبت کے آئینہ میں مری نگاہوں کا معجزہ ہے
کہاں تھا ورنہ یہ حسن جلوہ نگاہ جلوہ نگر سے پہلے

چوتھا نظریہ

تعبیر کائنات ذرا سامنے تو آ
آنکھوں نے خواب دیکھ لیا ہے بہار کا
اشکوں میں دیکھتا ہوں [illegible] آرزو
آئینہ سامنے ہے مرے شاہکار کا

کچھ تبسم زیرِ لب آنکھوں میں کچھ رنگِ حیا
اس طرح ہوتی ہے دیوانوں کی دیوانوں سے بات

اچھے غزل گو ہونے کے ساتھ ساتھ زیب صاحب کی نظمیں بھی حقیقت پسندی اور واردات قلبی کی آئینہ دار ہیں اردو اخبارات میں شائع ہوتی تھیں۔ عوام کا احساس، ہمارا مشرب، آئینہ وفا، خلوص نظر، انسانیت "۲۶ جنوری" ان کی مشہور نظمیں ہیں جو عوام و خواص دونوں سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں۔

زیب صاحب غزل اور نظم کے علاوہ "قطعہ" کے بھی کامیاب شاعر تھے۔ چند قطعے بطور نمونہ پیش ہیں۔

[illegible]
نظر انداز کر دو اہل دل [illegible]
محبت نے [illegible] دامن [illegible]
محبت [illegible]

[illegible]
[illegible] گزری ہیں [illegible]
اب [illegible] زمانے [illegible]
خواب [illegible]

محبت کے دوراہے [illegible]
[illegible]
[illegible] جادہ [illegible]
جہاں پہ [illegible] باقی [illegible]

[illegible]
جیسے میرے غریب خانے پر [illegible]

وقت نے آواز دی منہ موڑ کر [illegible]
مری وحشت آئینہ وحشت کا ہے [illegible] دامن چھوڑ کر

رخ سے پردہ اٹھا کے دیکھیں گے [illegible] دیکھیں گے
[illegible] ہے دیکھنے کی انھیں شمع [illegible] دیکھیں گے
[illegible] کلیاں تیری ہنسی نے [illegible]
مرے ہاتھوں میں ہے اپنا ہی دامن [illegible]

زیب ماتم ہو کیا اس دل کا [illegible]
کتنا نازک ہے شیشۂ ہستی دل [illegible] ٹوٹ جاتا ہے
ہندستان کے مختلف مقامات پر [illegible] مشاعرہ کیا ہے

کہ عموماً شعراء کو تحصیل علم کی طرف رغبت نہیں ہے اور وہ شعر سیدھا کر لینے کا نام شاعری جانتے ہیں ہمیں اس بات پر بڑی مسرت ہے کہ زیب صاحب نہ صرف مطالعہ کے شائق تھے بلکہ مبتدی اور منتہی دونوں سے کسب علم میں نہیں شرماتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ۵۲ سال تک شعر کہنے کے باوجود استادی کے خبط میں گرفتار نہیں ہوئے انھوں نے نہ کوئی شاگرد بنایا اور نہ ہی ایسا کوئی ارادہ مستقبل کے لیے رکھتے تھے۔ زیب صاحب اس کسر نفسی پر قابل فخر ہیں۔

زیب صاحب کا سرمایہ شاعری بہت کافی ہے اگر ان کا تمام کلام منظر عام پر آجائے تو ایک ضخیم کلیات تیار ہو جائے ایک مختصر مجموعہ انتخاب۔

"نگار خانے" اگست ۱۹۶۲ء میں پہلی بار منظر عام آچکا ہے جو عبدالباری آسی اکاڈمی، لاٹوش روڈ لکھنؤ۔ شائع کیا۔

افسوس کہ یہ فانوس ادب اردو ۲۲ فروری ۱۹۷۹ء کو ۵ سوا چھ بجے ڈسٹرکٹ اسپتال بریلی میں ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا ہے



اسلوبِ گفتگو : — صفحہ ۱۹ کا بقیہ

ہیں جو کبھی منفی ہوتا ہے اور کبھی مثبت۔ اس لیے ایسی گفتگو کلچرل اور ذہنی نشو و نما کے لیے مفید نہیں ہوتی۔

گفتگو کا سلیقہ پیش نظر ہو تو گفتگو کے ذریعہ آپس میں اتحاد، اخوت ہم آہنگی اور رواداری پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ گفتگو کی بنیاد خلوص پر ہو۔

موجودہ دور کے طرز زندگی نے گفتگو کے حسین فن پر کاری ضرب لگائی ہے۔ قدیم طرز کے گھروں کی قدیم فضا میں یہ فن آسانی سے ترقی کرتا تھا۔ لیکن جدید زندگی کا نیا مذاق اس سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ مثلاً اب گھروں میں ریڈیو ہوتا ہے اس سے تفریح اور معلومات میں اضافہ تو ضرور ہوتا ہے لیکن دماغ ورزش مطلق نہیں ہوتی۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ عہد نے سائنس اور ٹیکنالوجی کو فروغ دینے میں نمایاں کارنامہ انجام دیے ہیں۔ لیکن آرٹ اور کلچر کی ترقی کے سلسلے میں اس کامیابی نسبتاً کم ہے۔

بہر حال جب کبھی معاشرتی زندگی کو اعلا معیار پر لانے کی کوشش کی جائے گی تو فرصت کے اوقات کا بہترین مصرف زیر غور آئے گا اس وقت گفتگو اور اسلوب گفتگو کی اہمیت صحیح اندازہ ہوگا۔



معاونینِ نیا دور سے

غزلوں کی ایک کثیر تعداد یہاں منتظر اشاعت ہے۔ اس لیے شعرائے کرام سے گزارش ہے کہ کم از کم تین ماہ تک اپنی غزلیں بھیجنے کی زحمت نہ فرمائیں۔ اس سلسلے میں ادارہ خط و کتابت سے بھی معذور ہے۔



عروج زیدی
نلکٹ کوٹھیاں
رامپور
۲۴۴۹۰

دل جو اُن کا راز داں ہے آج کل
داستانِ درد داستاں ہے آج کل

پھول افسردہ ہیں تارے مضمحل
کس پہ قسمت مہرباں ہے آج کل

ان کے جلووں میں ہے دل کھویا ہوا
کافر ہر ایک و آں ہے آج کل

آ چکے ہیں ہم حقیقت کے قریب
ایک پردہ درمیاں ہے آج کل

کس قدر جینا گراں ہے آج کل
یہ زمیں کیا آسماں ہے آج کل

خونِ دل کم ہے مگر آنکھوں کا حال
ایک دریا سا رواں ہے آج کل

یہ مآلِ گرمیٔ حالات ہے
آدمی آتش بجاں ہے آج کل

اک سکوتِ خاص، عرضِ شوق یہ
حاصلِ شرح و بیاں ہے آج کل

ہائے ڈھلتی عمر کا یہ مرحلہ
اختلافِ جسم و جاں ہے آج کل

خود نگر ہونا ضروری ہے عروجؔ
کون کس کا پاسباں ہے آج کل

اُنس مسرور
ٹانڈہ ۔ فیض آباد

رنگ اپنا اب کے رنگوں سے جدا لیتے چلو
جنگلوں سے سبز پتوں کی قبا لیتے چلو

یا اُنھیں تاریک غاروں کی طرف پھر لوٹ جاؤ
یا مذاقِ زیست کوئی دوسرا لیتے چلو

طاقِ دل میں روشنی خنجر کی رکھ لو دوستو
جرأتِ قاتل سے اپنا خوںبہا لیتے چلو

لذتِ خانہ بدوشی کا اُٹھاؤ کیوں دماغ
انجمادِ بے حسی کا کچھ پتا لیتے چلو

پھر نواحِ جسم و جاں میں خامشی ہے خیمہ زن
شورش و ہنگامۂ حرف و نوا لیتے چلو

وہ تو خوشبو ہے نہیں آئے گا زیرِ دستِ شوق
صد گرفتِ حلقۂ موجِ صبا لیتے چلو

حفیظ سلمانی
نیا گاؤں
لکھنؤ

کچھ بھی ہو، یہ سحر، سحر تو نہیں
چشمِ عالم، مری نظر تو نہیں

میرے چہرے کو دیکھنے والے
میرے دل کی تجھے خبر تو نہیں

ہر نظر ہے پھری ہوئی مجھ سے
یہ بھی موسم کا کچھ اثر تو نہیں

یوں تو میں بھی وفا شعاروں میں
تم نہیں مانتے اگر تو نہیں

اُٹھ رہے ہیں جہاں سے یہ شعلے
دیکھنا وہ مرا ہی گھر تو نہیں

کچھ کہوں، دل مری نہیں سنتا
یہ بھی ناداں کہیں اُدھر تو نہیں

لازمی شے ہے ہمتِ پرواز
کچھ ضروری یہ بال و پر تو نہیں

لاکھ دل میں حفیظؔ ہوں طوفاں
ہاں مگر آنکھ میری تر تو نہیں

نظر برنی
[illegible]
[illegible]
[illegible]

مولانا محمد تقی امینی کے تعلیمی تصورات

[illegible] بات [illegible] معلوم ہوتا ہے [illegible] بات [illegible] [illegible] اوراق کو پلٹ کر [illegible] [illegible] تعلیم [illegible] [illegible] ہندوستانی سے [illegible] سبب ہوا جب اور ہندوستانی قوم [illegible] دولت [illegible] اور ملک [illegible] ایک [illegible] تعلیمی [illegible] قومی [illegible] تعلیمی میدان [illegible] اثر ہونے [illegible] تعلیم عوام کی [illegible] طرح [illegible] [illegible] نظام تعلیم [illegible] اور [illegible] نہیں ہے۔

آج [illegible] تعلیم سخت [illegible] [illegible] کی بات کہتے ہیں۔

تعلیم [illegible] دی [illegible]
[illegible] سرکاری تھی
[illegible] انگریزوں نے اس بات کی

[illegible] کہ ہندوستانی باشندے علم و دانش سے [illegible] نہ ہونے پائیں [illegible] [illegible] نے ایک موقع پر کہا تھا:

"[illegible] ہندوستانیوں کو تعلیم دینا چاہتے ہو؟ تعلیم دے کر انھیں اپنے [illegible] سے آگاہ کرو گے۔ کیونکہ ان کا ملک لوٹ لیا ہے [illegible] اور ذخائر کیا ہم نے ان [illegible] ہندوستانیوں کو [illegible] لہٰذا ہماری [illegible] ہے کہ ان کو اسی طرح فریب خوردہ، خود فراموش اور جاہل رہنے دو۔"

[illegible] تعلیمی سازش کا [illegible] کے بیان سے بھی [illegible] واضح ہو جاتا ہے۔

[illegible] انگریزوں کو ہندوستان اسی طرح چھوڑنا پڑا جس [illegible] انگلستان چھوڑا تھا تو وہ ایک ایسا ملک چھوڑ جائیں گے جس میں نہ تعلیم ہوگی نہ حفظانِ صحت کا سامان [illegible]"

[illegible] میکالے نے نظامِ تعلیم کا ایک ایسا تصور ہندوستان کے لیے پیش کیا جو انگریزوں کے مقاصد کو تو پورا کرتا ہی تھا بلکہ اس سے مستزاد یہ تھا کہ ہندوستانیوں کے ذہن و مزاج کی صحیح نشو و نما نہیں ہو سکی۔ مسلمانانِ ہند محض سرکاری ملازمتوں کے حصول اور یورپ کی کورانہ تقلید کو ہی تعلیم سمجھ بیٹھے۔ خلیل احمد [illegible] رقم طراز ہیں:

[illegible] کے دو پہلو ہیں۔ ایک نوعیت تعلیم دوسر

نظام تعلیم، نوعیت تعلیم میں تبدیلی کرنا اس لیے زیادہ اہم اور ضروری ہے کہ اس نے موجودہ نسل کے دماغوں کو فرقہ پرستی اور تنگ نظری سے محدود و مضمحل کر دیا ہے اور جب تک تعلیم کو ہندستانیوں کی ضروریات کے صحیح سانچے میں نہ ڈھالا جائے گا نوجوانوں کے دماغوں میں وسعت اور شگفتگی پیدا نہ ہوگی۔"

(ماخوذ از مسلمانوں کا روشن مستقبل)

انگریزی نظام تعلیم کے خلاف قومی نفرت کا یہ رجحان اتنا شدید ہوتا گیا کہ ملک کے گوشہ گوشہ میں قومی تعلیمی ادارے قائم ہو گئے۔ آریا سماج نے ڈی اے وی کالجوں اور گورکل کی بنیاد ڈالی تو دوسری طرف محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (جو بعد میں یونی ورسٹی میں تبدیل ہوا) کے قوم پرست طلبا بھی اس تحریک میں سرگرمی اور جوش کے ساتھ شامل ہو گئے۔ قوم پرست طلبا کی رہنمائی کی ذمہ داری مولانا محمد علی نے اپنے اوپر لے لی۔ ان اداروں کے مقاصد، نصاب اور انتظامی ڈھانچہ میں باہمی اشتراک نہیں تھا تاہم ایک بات ضرور مشترک تھی اور وہ تھی قومی تعلیم کا فروغ۔ قومی تعلیم کے ان پیشواؤں نے جو عوام کو انگریزی حکومت کے نظام تعلیم سے بیزار کرنا چاہتے تھے، ان اداروں میں تعلیم کا رخ موڑنے کے لیے اہم اقدامات شروع کر دیے۔

علی گڑھ میں سرسید احمد خاں کے کالج کے طلبا نے ترک موالات اور خلافت کی تحریکوں کا اتنا اثر قبول کیا کہ انھوں نے اکتوبر ۱۹۲۰ء میں کالج کا سارا انتظام ہی درہم برہم کر دیا اور اس بات کا پرزور مطالبہ کیا کہ یہ کالج انگریزوں کی سرکاری امداد و دولت سے مطلقاً آزاد کر دیا جائے لیکن کالج کے ارباب حل و عقد نے اس مطالبہ کو مسترد کر دیا۔ جس کا شدید ردعمل دیکھتے ہوئے قوم پرست عناصر نے جن میں اساتذہ کارکنان اور طلبا شامل تھے، کالج کے انتظامیہ کے ساتھ عدم تعاون اختیار کیا اور اس کالج کی تطہیر اور اس کو

سچے اسلامی و قومی خطوط پر چلانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ قومی اشتراک کے اسی سیکولر انداز فکر کی پیداوار ہے جو ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو معرض وجود میں آئی۔ مولانا محمد علی جوہر نہ صرف ایک عظیم قومی رہنما ہی تھے بلکہ ان کی نبض تعلیم پر بھی گہری نظر تھی۔ انھوں نے اپنی ہمہ جہت شخصیت کے پرتو سے ایوان تعلیم کو بھی منور کر دیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جشن سیمیں (۱۹۴۶) کے جلسہ میں مولانا محمد علی جوہر کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا:

"مولانا محمد علی اس عہد کے ان غیر معمولی شخصیتوں میں تھے جنھیں قدرت نے ذہنی قوتوں کے ساتھ قلب و روح کی بیتابی بھی ودیعت فرمائی ہے۔ ان کا ذہن انھیں فرزانوں کا فرزانہ اور ان کا دل انھیں دیوانوں کا دیوانہ بنا دیتا ہے۔ جامعہ کے ابتدائی کام کرنے والوں کو اس دیوانہ فرزانہ کی شاگردی اور ہمرکابی کا شرف بھی حاصل ہوا جس نے ہماری قومی زندگی کے بہت سے اجارے توڑے اور بہت سے شیشہ گروں کی دکانیں درہم برہم کر دیں۔ جامعہ والوں کو ان سے وہ گرمی قلب ملی جو مایوسیوں میں امید وار اور تہی دستی میں غنی رکھ سکتی ہے اور اگرچہ بے وسیلگی میں ہمارے منصوبوں کی آہٹ پا کر بسا اوقات نیک دل ہمدردوں نے ہم پر ترس کھایا اور زبان حال سے فرمایا:"

بہ سادگی تو رحم آمدم دریں بازار
کہ تنگ دستی و امیدواری گذری

لیکن محمد علی کی تربیت نے ہمیں دل شکستہ و ویران کی قدر کرنا سکھا دیا تھا اور ہم بھی عرفی کے الفاظ میں اپنے نیک دل ہمدردوں سے کہہ دیتے تھے کہ:

عرفی دل آباد بہ یک جو نخرد عشق
من ہم دل ویراں بہ دو عالم نفروشم"

۱۹۲۰ء کا زمانہ ہندستان کے جذبۂ حریت کی آزمائش کا زمانہ تھا۔ ملک میں ہر طرف انگریزو بھارت چھوڑو اور خلافت کا شور پیہم بلند ہو چکا تھا۔ علی برادران اور

مہاتما گاندھی کے جو کہ ہندستانی کے عوام کے دلوں پر حکومت کر رہے تھے، دور دوں پر شباب آگیا۔ وہ جہاں جاتے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ انڈین نیشنل کانگریس کے اس ریزولیوشن کا ہر جگہ خیر مقدم ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ تعلیم کا ایسا ادبی، [illegible] فنی اور ٹکنیکل نظام منظم و مرتب کیا جائے جو قومی خطوط پر مبنی ہو اور قومی نگرانی میں ملک کی ضروریات کے لیے موزوں ترین قرار پائے۔

مولانا محمد علی نے کانگریس کے اس ریزولیوشن کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے علی گڑھ کا انتخاب کیا۔ انھوں نے اپنے ہم خیال اور پرجوش طلباء کی ایک خاصی بڑی تعداد اپنے گرد جمع کر لی اور کالج کے حدود میں ایک عظیم الشان جلسہ کا انعقاد کیا۔ جس وقت مولانا محمد علی مہاتما گاندھی کو اپنے ساتھ لے کر یونین ہال میں داخل ہوئے۔ تو وہاں طلباء کی ایک کثیر تعداد موجود تھی جس نے ان عظیم رہنماؤں کا استقبال بڑے پرجوش طریقہ پر کیا۔ اس جلسہ میں ان قومی رہنماؤں نے ایک ایسے ادارہ کی داغ بیل ڈالنے کی اہمیت پر زور دیا جو سرکاری معاونت سے مطلقاً آزاد ہو اور جس کے فرزندوں میں حب الوطنی ثقافت شناسی اور اجتماعی نقطۂ نگاہ کی خصوصیات پیدا ہو جائیں۔

کالج کے اس جلسہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا محمد علی اور ان کے رفقاء کو کالج سے نکال دیا گیا۔ لیکن مولانا محمد علی شیر دل محب وطن تھے۔ وہ بھلا اس تشدد آمیز رد عمل کا کیا اثر لیتے۔ انھوں نے کالج کے حکم نامہ اخراج سے قبل ہی ۲۹ر اکتوبر سنہ۲۰ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کا اعلان کر دیا۔ سرسید ہال کی مسجد کے صحن میں بہت سے طلباء اور اساتذہ جمع ہو گئے تھے اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے ہاتھوں اس قومی تعلیمی ادارہ کی رسم تاسیس عمل میں آئی۔ مولانا محمود الحسن کمزوری اور ضعیفی کے باوجود محض حب قومی میں دیوبند کی طویل مسافت طے کر کے علی گڑھ پہنچے تھے۔

علالت کے باعث ان کی تحریری تقریر مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھ کر سنائی۔ مولانا محمود الحسن کی تقریر میں مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی، جذبۂ حریت کے فقدان اور دینی تعلیم کی افادیت پر ولولہ انگیز ڈھنگ سے روشنی ڈالی گئی تھی۔ انھوں نے فرمایا:

"اے نونہالانِ وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے درد کے غمخوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندستان کے دو تاریخی مقاموں (دیوبند اور علی گڑھ) کا رشتہ جوڑا۔"

انھوں نے قومی تعلیم کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے یہ بھی کہا:

"مسلمانوں کی تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور اغیار کے اثر سے مطلقاً آزاد کیا باعتبار عقائد و خیالات اور کیا باعتبار اخلاق و اعمال ہم غیروں کے اثرات سے پاک ہوں اور ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے غلام پیدا کرتے رہیں بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہئیں بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے اور ان عظیم الشان مدارس کے جنھوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا اس سے پیشتر کہ ہم اس کو اپنا استاد بناتے۔"

مولانا محمد علی نے علی گڑھ میں کالج کے متوازی ایک تعلیمی ادارہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کا تصور پیش کرنے سے پیشتر ایک تعلیمی نصاب تیار کیا تھا جس میں ابتدائی جماعتوں سے لے کر اعلیٰ جماعتوں کے لیے درسیات موجود تھے۔ اس نصاب میں آنرز کلاسوں کا بندوبست بھی شامل تھا اور ابتدائی و ثانوی نیز اس کی تمام منزلوں میں صنعت و حرفت و دینی تعلیم کو اہمیت دی گئی تھی جس کا مقصد طلباء کے ذہن و دماغ کی صحیح نشو و نما کے علاوہ دستکاری کے کاموں میں دلچسپی

پیدا کرنا تھا تاکہ وہ تعلیم سے فارغ ہو کر زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں ترقی حاصل کر سکیں مثلاً قفل سازی، الیکٹرو پلیٹنگ، صحافت، کپڑا بُننا، جلد سازی، لیتھو اور ٹائپ کی طباعت، نقشہ نویسی، لائن اور ہاف ٹون بنانا، کاپی رائٹنگ، شارٹ ہینڈ اور ٹائپ رائٹنگ وغیرہ کی تعلیم۔

حکومت نے مسلمانوں کے اس نوزائیدہ ادارہ کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا لیکن ارباب جامعہ اس رد عمل سے دل برداشتہ نہ ہوئے۔ انھوں نے جامعہ کو سرکاری اعانت کے بغیر کامیابی کے ساتھ چلانا شروع کر دیا اور ملک میں بہت جلد اس کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہو گئی چونکہ سودیشی تحریک زوروں پر تھی اور عدم تعاون کا سلسلہ جاری تھا اس لیے تھوڑے عرصہ میں اس ادارہ کے ساتھ ملک کے کئی مدارس نے اپنا الحاق مکمل کرا لیا اور ایک ناظر المعارف (انسپکٹر آف اسکولز) کا عہدہ مقرر کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ ۲۳ء کے اواخر تک جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ۱۱ اسکولوں نے اپنا الحاق مکمل کرا لیا تھا۔

یہ تو تھا وہ تاریخی و سیاسی پس منظر جس کے تعارف کے بغیر مولانا محمد علی جوہر کے تعلیمی نظریات و معتقدات کی شناخت کرنا بعید از قیاس ہے۔ مولانا محمد علی کی شخصیت کے اتنے پہلو ہیں کہ ان کا ایک مقالہ میں احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے تاہم یہاں میں صرف ان کے تعلیمی مشاغل اور تعلیمی خدمات و نظریات پر اظہار خیال کرنے پر اکتفا کروں گا۔

عہد حاضر میں تعلیم کے تین مختلف نظریات ہیں اور تینوں کے حاملین موجود ہیں۔ ان میں پہلی جماعت کا خیال ہے کہ تعلیم کا مقصد صرف ترقی کے مواقع بہم پہنچانا اور رخنوں کو دور کرنا ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ افراد کو ثقافت سے بہرہ ور کرنا اور ان کی تمام تر صلاحیتوں کو نقطۂ عروج تک تربیت دینا ہی تعلیم کی غایت ہے لیکن تیسرے گروہ کا موقف یہ ہے کہ تعلیم انفرادی زاویہ نگاہ سے غور کرنے کے بجائے اجتماعی زاویہ نگاہ کی قائل ہے اور اس کا فرض یہ ہونا چاہیے کہ وہ مفید شہریوں کی تربیت کا کام انجام دے۔ مولانا محمد علی موخر الذکر نظریۂ تعلیم کے قائل تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان سے انگریزی تسلط کو پسپا کرنے کے لیے ایسے نظام تعلیم کی سخت ضرورت ہے جس میں دینی دنیوی تعلیم کی یکجائی ہو اور وطن سے الفت کا جذبہ استوار ہو اور فطری نشو و نما کے ساتھ ساتھ پیشہ کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے نظام تعلیم کو اجتماعیت کے آئینے میں ہی دیکھا اور برتا جا سکتا ہے۔

یوں تو مولانا محمد علی کی اعلیٰ تعلیم یورپ میں ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود انھوں نے مغربی معاشرہ کا کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ ان کو اسلامی تہذیب و تمدن سے جو فطری لگاؤ تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہر چند وہ مزاجاً جذباتی واقع ہوئے تھے مگر انھوں نے اپنے عقلی غور و فکر اور گہرے مشاہدہ کے بعد یہ رائے قائم کی تھی کہ اسلام نوع انسانی کی نشو و نما کے لیے سب سے بہتر نسخہ ہے۔ اگر اس پر عمل کیا جائے تو صرف مسلمانان عالم ہی نہیں بلکہ عالم دنیا ہی مادی و روحانی نجات حاصل کر سکتی ہے۔ مولانا نے اپنے شوق سے قرآن، تفسیر، فقہ، حدیث، تاریخ اسلام اور علم الکلام وغیرہ ایسے اسلامی علوم کا مطالعہ کیا تھا اور انھوں نے بہت جلد ان پر عبور حاصل کر لیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس کے وقت بھی مولانا نے اس بات پر زور دیا تھا کہ جامعہ میں تعلیم کا ڈھانچہ اس طرح کا ہو جس میں دینی تعلیم قدیم اور جدید طرز کے ساتھ موجود رہے۔ ان کی یہ دلی خواہش تھی کہ ہر سطح پر قرآن پاک کی تعلیم دی جائے۔ اسی لیے انھوں نے اپنے نصاب میں اسلامیات کے ساتھ ساتھ عربی زبان کی تعلیم کو لازمی قرار دیا۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے دوسری طرف غیر مسلم طلبہ کے لیے اسلامی تعلیمات کو اختیاری مضمون قرار دیتے ہوئے جامعہ میں ہندو اخلاقیات کا بندوبست بھی کیا جو آج تک جامعہ ملیہ اسلامیہ میں

جاری ہے۔ وہ اپنے اخبار "ھمدرد" (۳۰ر اکتوبر ۱۹۲۵ء) میں ایک قاری کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

"جامعہ ملیہ اسلامیہ پہلے تو "جامعہ" اور "ملیہ" ہے یعنی اس میں علوم دین و دنیا دونوں پڑھائے جاتے ہیں اور نہ تو وہ دیوبند اور مدرسہ نظامیہ وغیرہ کے طرز پر صرف علوم دین کی تعلیم دیتی ہے نہ انگریزی کالجوں کی طرح صرف علوم دنیوی پر اکتفا کرتی ہے پھر یہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے یعنی اس کی تعلیم اسلام کی تعلیم ہے گو دیگر مذاہب کے پیروؤں کے لیے اس کا دروازہ بند نہیں ہے۔"

دینی تعلیم کو لازمی مضمون قرار دینے کی توجیہہ پیش کرتے ہوئے اور قرآن پاک کے مطالعہ کی اہمیت بیان کرتے ہوئے مولانا محمد علی نے ایک تقریر میں کہا:

"یہ مقصد پیش نظر رہا ہے کہ اس ادارہ سے جدید معیار کے مطابق نہ صرف مہذب نوجوانوں کی تربیت کی جائے بلکہ ایسے سچے مسلمان تیار کیے جائیں جن کے دلوں میں اسلام کی سچی لگن ہو اور جو اپنے مذہب کی خاطر خواہ معلومات بھی رکھتے ہوں اور جو اسلام کی تبلیغی فوج کے آزاد دستوں میں کھڑے ہونے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ اس مقصد کے لیے مقصد قرآن کی گہری معلومات کو ناگزیر بنیاد تصور کیا گیا ہے۔"

قرآنی تعلیم کو اسلام کی روح اور تعلیم کا سنگ بنیاد قرار دیتے ہوئے وہ اپنے معرکۃ الآرا نصاب تعلیم میں لکھتے ہیں:

"ہمارا مطمح نظر ہمیشہ یہ رہا ہے کہ ہم اپنے درسگاہوں سے ایسے نوجوان پیدا کریں جو نہ صرف حسب معیار زمانۂ حال تعلیم و تربیت یافتہ شمار کیے جانے کے مستحق ہوں بلکہ سچے معنوں میں مسلمان بھی ہوں جن میں اسلام کی روح ہو اور جو اپنے مذہب کی تعلیمات سے اس قدر بہرہ اندوز ہو چکے ہوں کہ مبلغین اسلام کی فوج میں دوسروں کی امداد سے مستغنی و بے نیاز ہو کر خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔ اس مقصد کے لیے قرآن مجید سے پوری واقفیت حاصل کرنے کو ہم نے اپنی تعلیم کا سنگ بنیاد قرار دیا ہے۔ چنانچہ ہر منزل میں ہم نے اس امر کا انتظام کیا ہے کہ کلام اللہ کی تعلیم سمجھا کر دی جائے تاکہ مسلمانوں کی وہ جماعت جو اقتصادی یا دیگر وجوہ کی بنا پر منزل ابتدائی سے آگے بڑھنے کی استطاعت نہ رکھتی ہو قرآن مقدس صرف ناظرہ ہی نہ پڑھے بلکہ اردو یا دوسری مادری زبان میں اس کے بین السطور ترجمہ سے بھی واقف ہو جائے۔"

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ مولانا محمد علی نے جس دور میں ملک قومی ادارہ کی اہمیت کو سمجھا تھا، وہ دور ہندوستانیوں کے لیے ابتلا و آزمائش کا دور تھا۔ ہر طرف ترک موالات اور خلافت تحریک کا غلغلہ تھا اور عوام غیر ملکی تسلط کے خلاف نبرد آزما ہو چکے تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کے بعد ملک میں رفتہ رفتہ بہت سے قومی ادارے تشکیل پانے لگے جو اپنی مالی دشواریوں اور بے سروسامانیوں کے باوجود سرکاری امداد کے بغیر فروغ پاتے رہے۔ ڈاکٹر بٹا بھی سیتا رمیہ لکھتے ہیں:

"ملک کے مختلف حصوں میں قومی یونیورسٹیاں، قومی کالج اور قومی اسکول قائم ہونے شروع ہو گئے۔ یو پی، پنجاب اور بمبئی یونیورسٹی میں طالب علموں کی تحریک اپنے شباب پر تھی۔ بنگال بھی ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا نہ رہ سکا۔ کلکتہ نے بھی پرجوش مناظر دیکھے جن کی تعداد ان اٹھارہ مہینوں کی یاد کار مدت میں کچھ کم نہیں تھی۔ تقریباً وسط جنوری میں دیش بندھو اور سی آر داس کی اپیل پر ہزاروں طالب علموں نے کالجوں اور امتحانوں کو خیرباد کہا۔ مہاتما گاندھی کلکتے گئے اور ۴ر فروری کو نیشنل کالج کا سنگ بنیاد رکھا۔ وہ دوسری مرتبہ پٹنہ گئے اور نیشنل کالج کھولا اور بہار ودیا پیٹھ کا افتتاح کیا۔ قومی تعلیم کو زبردست بڑھاوا ملنے کی وجہ سے اس طرح چار ماہ سے بھی کم مدت میں علی گڑھ کی نیشنل مسلم یونیورسٹی، گجرات ودیا پیٹھ، بہار ودیا پیٹھ، کاشی ودیا پیٹھ، بنگال نیشنل یونیورسٹی، تلک مہاراشٹر ودیا پیٹھ اور ایک بہت بڑی تعداد میں مختلف گریڈ کے نیشنل اسکول ملک کے تمام حصوں میں قائم ہو گئے ہیں جن میں ہزاروں طالب علم تعلیم پانے لگے۔"

قومی تحریکوں کے نتیجہ میں قائم ہونے والے ان تعلیمی اداروں میں مناسب عمارتوں اور ضروری سامان کی قلت، سرمایہ کا فقدان اور تربیت یافتہ کارکنوں اور اساتذہ کی کمیابی کا مسئلہ سامنے تھا۔ ان طالب علموں اور اساتذہ کو تعطیلات کے دوران اور کبھی کبھی کام کے دنوں میں بھی عوام میں اور خصوصاً دیہی علاقوں کے لوگوں میں سیاسی پروپگنڈہ کرنے کی ذمہ داری

جس سو نہیں جاتی تھی مگر ان تمام دشواریوں کے باوجود قومی تعلیم صوبوں کی ترتیب، قومی ضرورتوں کے مطابق متوازی نصاب تعلیم کی تیاری اور جدید ہندوستانی زبانوں کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے استعمال کرنے کا کام مسلسل جاری رہا ۔

مولانا محمد علی نے ہمدرد کے ۳۰ اکتوبر ۱۹۲۵ء کے شمارہ میں قومی تعلیم کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے تحریر فرمایا:

"جامعہ نے ابتدا ہی سے پیش نظر جو مقصد رکھا ہے وہ یہ ہے کہ یہاں سے سچے خدا پرست مسلمان اور وطن پرور ہندوستانی پیدا ہوں ۔"

انھوں نے اس مسئلہ پر مزید اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے انگریزی اخبار کامریڈ میں لکھا :

"یہ کہنا بجا نہ ہوگا کہ ملت اسلامیہ کے لیے سب سے اہم ضرورت قومی تعلیم کی ہے ۔ کامریڈ اسکو زیادہ دنوں تک نظر انداز نہیں کرسکتا ۔ اس کی طرف ہندوستان کی تمام قوموں نے افسوس ناک تغافل برتا ہے اور بیلگام میں ہونے والے جلسہ میں اس پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی ۔ پچاس سال قبل جب مسلمان سر سید احمد خاں کے زیر اثر تھے تو تعلیم پر سرکاری تسلط کی سخت نکتہ چینی کی گئی تھی اور پہلی بار تعلیم میں ترک موالات کا جھنڈا بلند کیا گیا ۔ اب ان کا فرض ہے کہ قومی تعلیم کی موجودہ صورت حال پر نظر ثانی کریں ۔"

"ایک بات بالکل واضح ہو چکی ہے ۔ ہر چند کہ ہندوستان کی تمام قوموں کو اپنے نوجوانوں کی تعلیم کو وہ سمت رکھانی چاہیے جو کہ ان کے لیے از بس ضروری ہے اور جس کو قومی تعلیم کہا جا سکتا ہے ۔ یہ بالکل انفرادی قسم کی ہونا چاہیے جو کہ حکومت یا اس کے امدادی اداروں کے اثر سے بالکل پاک ہو ۔ ہر قوم کو اپنے نوجوانوں کے لیے علیحدہ سے تعلیم کا بندوبست کرنا چاہیے ۔"

بلکہ مذہبی رواداری اور اخوت سے مختلف فرقوں میں باہمی یگانگت کا جذبہ استوار ہو سکتا ہے تعلیم کا مقصد دلوں کو جوڑنا ہو تو ملت ہے مغائرت پیدا کرنا نہیں ۔" مولانا محمد علی اس خصوصیت کو ملت اسلامیہ کا طرۂ امتیاز سمجھتے تھے ۔ وہ لکھتے ہیں :

"اسلام نے دنیا کو مسلم و کافر دو ملتوں میں ضرور تسلیم کیا ہے لیکن اسلام نے اس کی اجازت نہیں دی ہے کہ اپنی ملت کی محبت میں کوئی مسلمان اتنا سرشار ہو جائے کہ بنی آدم کے ساتھ انصاف کو یک قلم ترک کر دے ۔"

وہ سلسلۂ تحریر جاری رکھتے ہوئے اخوت و مساوات کے مسئلہ پر مزید روشنی ڈالتے ہیں اور رقم طراز ہیں :

"ایک مسلمان قوم پرور اور محب وطن اسی لیے کہ اسلام نے نہایت کشادہ دلی سے حقوق جار کو تسلیم کیا ہے اور جس مذہب کے قانون نے غیر مسلموں کو بھی حق شفعہ دے کر پڑوسی کے بعض حقوق کو سگے بھائی اور مسلمانوں کے حقوق پر بھی ترجیح دی ہے وہ قومیت مشترکہ کے خلاف نہیں ہو سکتا ۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی غلامی اسلام نے جائز نہیں رکھی خواہ وہ دنیوی امور میں غیر قوم کی غلامی ہو یا بادشاہوں کی غلامی یا لیڈروں کی یا مذہب میں ارباب من دون اللہ کی تقلید جامد ہو پھر ہندوستان یا مصر یا شام یا فلسطین میں ایک مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ مل کر غیر ملکیوں کی غلامی کے خلاف کیوں جنگ نہ کرے ۔ بہر حالت میں غیر مسلموں کے ساتھ ناانصافی اسلام اور ایمان کے منافی ہے ۔ حقیقتاً ایک مسلمان کے لیے حب الوطن من الایمان ہے ورنہ خاک پاک وطن مسلمان کے لیے استنجا کے ڈھیلے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ۔"

فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی جو مثال محمد علی کے عصری حالات میں نظر آتی وہ حصول آزادی کے بعد تقریباً ناپید ہے ۔ وہ اس اتحاد و یگانگت کے لیے قومی تعلیم کو ہی ذمہ دار ٹھہراتے ہیں :

"موجودہ اختلافات رنگ و نسل و وطن کی طرح عقائد کے اختلافات نہ مٹنے والے نہیں بلکہ صحیح طریقہ پر تبلیغ و نشر اور تعلیم و تربیت سے مٹ سکتے ہیں اور سب انسان پھر بھائی بھائی ہو سکتے ہیں ۔"

تعلیم کے پیشہ پر کسی فرد یا کسی قوم کا اجارہ نہیں ہوتا۔ یہ وہ شعبۂ حیات ہے جس میں فرد کو گفتار و کردار کی پوری آزادی ہونا چاہیے۔ اگر تعلیم کو محض بعض افراد اپنی خواہشات کا وسیلہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ اصل میں جمہور کے قاتل ہیں اور جمہور کا قتل انسانیت کے قتل کے مترادف ہوتا ہے۔ بقول اینی بسنیٹ:

"تعلیم پر ہندوستانی کنٹرول سے مراد وہ تعلیم ہے جس پر کنٹرول ہندوستانیوں کا ہو، جس کی تشکیل ہندوستانیوں نے کی ہو اور جس کا انتظام بھی ہندوستانی کرتے ہوں۔ اس تعلیم کو اپنے سامنے خدمت، حکمت اور اخلاق کے ہندوستانی آدرش رکھنے چاہئیں۔ اس میں ہندوستانی روح سرایت ہونی چاہیے نہ کہ مخصوص مذاہب کی لفظی توجیہ۔ اس کی روح کشادہ، متحمل، روادار اور ہمہ گیر ہے اور تسلیم کرتی ہے کہ انسان خدا کے پاس مختلف راستوں سے پہنچے۔"

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد کے پیچھے بھی مولانا محمد علی کا یہی نظریہ کارفرما تھا۔ انھوں نے اس ادارہ کے قیام اور بقا کے لیے خلافت کمیٹی کی طرف سے دس ہزار روپے کی گرانقدر گرانٹ ماہانہ کی منظوری دی۔ اور مختلف جگہوں پر جا جا کر اس کے لیے شبانہ روز چندہ اکٹھا کیا۔ مدراس میں ۴ اپریل ۱۹۲۱ء کو اپنی تقریر میں انھوں نے کہا:

"تم تعلیم چاہتے ہو، تم اعلیٰ تربیت کے خواستگار ہو، میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ سوراج کے ماتحت ہندوستان میں جاہل و ناتربیت یافتہ کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوگا۔ ہمیں تو اس سے بھی زیادہ تعلیم کی ضرورت ہے جتنی کہ موجودہ گورنمنٹ کو اور مجھے اور تمہیں خوب معلوم ہے کہ گورنمنٹ کو تعلیم کا ذوق کب سے پیدا ہو گیا ہے اور اس بات کو مسز بسنیٹ بھی اس وقت سے جانتی ہیں جب سے انھوں نے قومی کالجوں کی بنیاد ڈالی۔"

مولانا محمد علی اور اینی بسنیٹ نے ہندوستانی عوام کو غیر ملکی نظام تعلیم کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لیے سعی پیہم کی اور ملک کے ہر گوشہ میں جا جا کر قومی تعلیم کی اہمیت پر زور دیا۔ علی گڑھ انگریزی حکومت کی مٹھی میں تھا، یہاں مولانا محمد علی کو جدوجہد کرنا پڑی اس کا اندازہ ان کی ایک تقریر کے مندرجہ ذیل سے بخوبی ہو سکتا ہے:

"میں نے علی گڑھ میں مہاتما گاندھی سے کہا تھا کہ ہمارے نوجوان جس وقت اسلام اور ملک کی آواز سنیں گے تو فوراً کہتے ہوئے اپنے اپنے کالجوں کو خیرباد کہہ دیں گے۔ علی گڑھ گیا اور تقریریں کیں۔ مہاتما گاندھی اور شوکت نے بھی لڑکوں سے خطاب کیا۔ اس وقت ان کے چہروں کی درخشانی صاف اس بات کا پتہ دیتی تھی کہ ہمارے نوجوانوں پر اعتماد فرد آج رنگ لانے والا ہے۔ ہر لڑکا دعوت حق پر لبیک کہنے پر مستعد و آمادہ نظر آتا تھا مگر انہیں زندگی میں ایک نیا سبق حاصل کرنا باقی تھا۔ مایوسی کا وہ تھا جبکہ قول و فعل میں امتیاز کرنے کا وقت آ پہنچا لڑکوں کا تمام جوش سرد ہونے لگا۔ یہی وہ سبق ہے جو تعلیم سکھاتی ہے کہ قول کچھ ہو اور فعل کچھ۔ اگر تعلیم یافتہ طبقہ موجودہ طرز تعلیم پر قانع ہے تو ہمیں اس کی پرواہ نہیں۔ تعلیم کے دلدادہ ملک کی ترقی کو روک نہیں سکتے اور اس لیے ہم اپنی تمام تر توجہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے عوام پر مبذول کیے ہوئے ہیں۔"

مادری زبان میں تعلیم دینے کا مسئلہ عہد حاضر کا مسئلہ ہے۔ سودیشی تحریک کے بانیوں نے ہندوستان کے وسیع و عریض حدود اور رنگ و نسل کی بوقلمونی کے پیش نظر بہت پہلے ہی اس کو بھانپ لیا تھا کہ ہندوستان میں ذریعہ تعلیم کے لیے مادری زبان کو اختیار کرنا ضروری ہے ۔۔۔ جو ثابت کرتے ہیں کہ مذہبی پہلو کے بعد سب سے اہم پہلو ذریعہ تعلیم کا ہوتا ہے کتنا مضحکہ خیز اور غلامانہ ذہنیت کا مظہر ہے کہ علم کی تحصیل میں ذریعہ تعلیم کے لیے ایک غیر ملکی زبان کو اختیار کیا گیا۔" محمد علی نے ۲ اپریل ۱۹۲۱ء کو مدراس میں ایک تقریر کے فرمایا تھا۔

"ہمارے قومی تنزل کا یہ حال ہے کہ جس زبان کو ہم نے مشترکہ قرار دے رکھا ہے وہ ہماری آزادی کا طرۂ امتیاز نہیں (بلکہ) غلامی کا نشان نیز ثبت ہے ... یہ اسکول ہیں جہاں تمہارے بچوں اور نوجوانوں کی ہمت و مردانگی میں زہر ملایا جاتا ہے۔ جہاں وہ ظالموں کے پنجہ میں ہوتے ہیں اور "لیکوں" کی گرفت میں پوری طرح آجاتے ہیں نہ صرف تمہارا جسم بلکہ یہ تعلیم تمہاری روح فنا کر رہی ہے۔"

ذریعۂ تعلیم کے طور پر انگریزی زبان کو اختیار کرنے پر مولانا محمد علی جتنی اذیت اور روحانی کرب محسوس ہوتا تھا اس کا اظہار انہوں نے جابجا اپنی تحریروں اور تقریروں میں مسلسل طور پر کیا ہے۔ ہمدرد کے ۹ جنوری ۱۹۲۶ء کے شمارہ میں انھوں نے تحریر کیا۔

"ہماری غلامانہ ذہنیت کسی چیز سے اس قدر ثابت نہیں ہوتی جس قدر کہ ایک غیر زبان میں تحصیل علوم کی مشقت رائیگاں سے ثابت ہوتی ہے۔ ہم مشرقی تو ذہنی لوگ ہیں اور بربریت میں مبتلا ہیں لیکن خود تہذیب یافتہ مغربیوں کا کیا شمار ہے؟ کیا کوئی انگریز اپنے بچے کو تاریخ یا سائنس فرانسیسی یا جرمن زبان میں پڑھواتا ہے؟ کیا کوئی فرانسیسی یا اطالوی اپنے بچے کو جغرافیہ یا ریاضی انگریزی یا روسی زبان میں سکھواتا ہے؟ لیکن ہماری غلامی اور اب ہماری غلامانہ ذہنیت کو دیکھو کہ ہمارے اسکولوں اور کالجوں کے ہندستانی اساتذہ بھی جو اکثر انگریزی زبان کو خود بھی اس طرح نہیں جانتے جس طرح کہ انگریز جانتے ہیں، ہندستانی بچوں کو تاریخ اور سائنس جغرافیہ اور ریاضی انگریزی میں سکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

مولانا محمد علی نے اپنے مرتبہ نصاب میں بھی دینی تعلیم کے علاوہ زبان پر خاص توجہ دی ہے وہ یہی ذریعہ تعلیم ہے۔ تو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں انھوں نے اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بناتے ہوئے زور اور فرمایا کہ ہماری خواہش ہے کہ ایک غیر زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کا نامعقول اور غلامانہ طریقہ جس میں مغائرت زبان کی وجہ سے طلبہ کے دماغ پر مسائل کا صحیح اور روشن نقش کبھی قائم نہیں ہوتا، قطعاً ترک کر دیا جائے۔ البتہ انھوں نے منزل ثانی میں طلبہ کو اس امر کا اختیار دے دیا کہ وہ کوئی ایک مغربی زبان حاصل کریں اور امید ظاہر کی کہ مدارس ثانوی میں تھوڑے عرصے کے بعد انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ دوسری مغربی زبانوں مثلاً فرانسیسی اور جرمن کی تعلیم کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔

مغربی زبانوں کو منزل ثانی میں اختیاری مضمون کی شکل میں حاصل کرنے کا مشورہ دیتے وقت مولانا محمد علی نے ایشیائی مشرقی زبانوں کے مطالعہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ وہ کامریڈ کے ۲۴ جنوری ۱۹۲۶ء کے شمارہ میں لکھتے ہیں۔

"پہلے تو علاقائی زبانوں کا علم اور پھر جہاں اردو بولی جاتی ہے وہاں ہندی کا اور جہاں اردو نہیں بولی جاتی ہے وہاں اردو کا مطالعہ ہونا چاہیے۔ یونیورسٹی سطح پر عربی و فارسی (زبان وادب) کا ڈگری کی سطح تک بندوبست ہونا چاہیے" اردو زبان کے ذریعہ تعلیم دینے کی تجویز پیش کرتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں:-

"ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ وجہ زیادہ دن باقی نہیں رہ سکے گی اور یہ کہ قوم جامعہ کو زیادہ سے زیادہ فنڈ فراہم کرے گی تاکہ جامعہ ہندوستان میں اور دوسری جگہ پر ایسے اساتذہ اور پروفیسروں کے دستے تیار کر سکے جو ان مضامین کو اردو کے ذریعہ پڑھانے کے اہل ہوں۔"

سائنس انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں اہم رول ادا کرتی ہے کیونکہ اس کی بدولت انسان کو کائناتی نظام کی جزئیات کو سمجھنے اور تسخیر فطرت میں مدد ملتی ہے۔ یوں بھی تعلیم کا مقصد زندگی کے ہر شعبہ میں حصہ لینے کے لائق بنانا ہے۔ ہندستان کے مشہور سائنسداں پی سی رائے نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پہلے جلسۂ تقسیم اسناد منعقدہ جون ۱۹۳۲ء میں سائنس کی اہمیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا:

"میرا تو خیال ہے کہ تہذیب و تمدن کی خاطر سائنس کی

سب سے بڑی سب سے بہتر اور سب سے مستقل خدمت تحکم و جبروت سے بغاوت، صداقت کی جستجو اور معقولیت کی حمایت رہی ہے اور آج یہاں ایک سائنس داں کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے میں آپ سے اس علم صداقت اور نشان حریت کو ہمیشہ بلند رکھنے کی درخواست کرتا ہوں۔"

مولانا نے اپنے نصاب میں ادب اور تاریخ اور فلسفہ کے ساتھ سائنس اور ٹکنیک کو بھی اہم مضامین کے طور پر رائج کرنے کی تجویز کی اور کہا :-

"طلبا نے مذہبی تعلیم حاصل کرلی، ذہنی و دماغی نشو و نما بھی ہوگیا۔ ساتھ ساتھ یہ خیال بھی پیش نظر رکھا گیا تھا کہ وہ اپنی روزی خالص دماغی کام کے ذریعہ ہی کمانے پر مجبور نہ ہوں۔ کوئی پیشہ ایسا بھی اختیار کرسکیں جس میں جسمانی محنت سے روزی کمائی جاسکے اور جس میں بڑے سرمایہ کی حاجت نہ ہو مثلاً نجاری، قفل سازی، پارچہ بافی وغیرہ۔"

مولانا محمد علی نے قوم کے فرزندوں کی معاشی حالت بہتر بنانے کی غرض سے اپنے تعلیمی نصاب میں دست کاری کو لازمی مضمون کی حیثیت سے رائج کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر مسلمان سائنس اور ٹکنالوجی کے معاملات میں زیادہ دلچسپی لیں تو ان کی مجموعی اقتصادی حالت میں اصلاح ہوسکتی ہے، ورنہ پھر کوئی زندگی کے کسی بھی مقابلے میں دقت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ انھوں نے علم ریاضی کی تعلیم کو بھی ریڑھ کی ہڈی سے تعبیر کیا اور اس کے مروجہ معیار کو ناکافی قرار دیا۔ ریاضی کے بارے میں ان کی رائے یہ تھی کہ اکثر بچوں کے دماغ پر ایسے پیچیدہ اور طولانی سوالات کے حل کرنے کا بار ڈال دیا جاتا ہے جن سے خود رسیدہ لوگوں کو بھی عملی زندگی میں شاذ و نادر ہی سابقہ پڑتا ہے۔ اس دستور تعلیم کو خیرباد کہہ کر یہ ممکن ہوسکے گا کہ ترقی کی رفتار حسب منشا تیز ہوجائے گی اور ایک بارہ برس کے بچے کو اتنا حساب سکھا دیا جائے کہ وہ اربعہ متناسبہ، سود اور رقبہ وغیرہ کے ان آسان سوالات کو حل کرسکے، جن سے ایک دیہاتی لڑکے اور ایک قصباتی لڑکے کو روزانہ عملی زندگی میں سابقہ پڑتا ہے۔

نقاشی کی ابتدائی تعلیم کو مدارس کے منزل اول میں شامل کیا گیا تاکہ بچے کے ہاتھ اور آنکھ کی تربیت ہو اور ان میں خوبصورتی و تناسب کا احساس ترقی پائے لیکن ثانوی سطح پر اس مضمون کو ایک اختیاری مضمون بنا دیا گیا۔

اسی طرح مولانا محمد علی نے اپنے تعلیمی نصاب میں صنعت کی مجوزہ تعلیم کو لازمی قرار دیا۔ اس سے بچے کی تفریح اور تفنن طبع سامان پیدا ہوتا ہے لیکن منزل اول میں چونکہ طلبہ کی ایک بڑی تعداد زراعت کی جانب مائل ہوگی اس لیے تجویز پیش کی گئی کہ انھیں اس پیشہ میں علمی و عملی دونوں طرح کی تعلیم دی جائے اور ساتھ ہی حفظ صحت کے ابتدائی اصولوں اور باغبانی وغیرہ کی واجبی تعلیم پر بھی زور دیا گیا۔ "چرخہ کتائی" کو ملک کے سیاسی حالات اور تقاضوں کے پیش نظر لازمی قرار دیا۔

نجاری، طباخی، معماری، رنگ سازی، پارچہ شوبی، سیاق نخہ نویسی، آہن گری، خیاطی، دباغی، جلدسازی، چرم سازی وغیرہ ایسے فنون کو بھی داخل نصاب کیا گیا۔ طالب علمی کو ہر دو مضامین کے گروہ میں سے کسی نہ کسی ایک حرفہ کو سیکھنا ضروری خیال کیا گیا تاکہ چند سال میں اقتصادی بے بضاعتی اور تحریجی معاش سے نجات حاصل ہو۔ اس قسم کی دیگر چھوٹی چھوٹی ملازمتوں کی محتاجی سے طلبہ کی گلوخلاصی ہوجائے نیز تعلیم یافتہ لڑکا اپنی غلامانہ دست نگری کو سرکاری ملازمت کے دستور عام پر محمول نہ کرسکے۔

یہ ہیں مولانا محمد علی کے وہ تعلیمی نظریات و رجحانات جنھوں نے ملک کے تعلیمی ڈھانچہ کو پوری قوت کے ساتھ متاثر کیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تشکیل کے ذریعہ انھوں نے سرسید کے بعد ایک ایسا تعلیمی انقلاب کردیا جس کے نتیجہ میں قومی اتحاد و یگانگت کی لہریں ہندستانی نسلوں کی شریانوں میں دوڑنے لگیں اور انگریزوں کے ایوان حکومت میں پہلی بار یہ محسوس کیا گیا کہ اب ہندوستانی عوام بیدار ہوگئے ہیں جن کو تعلیمی میدان میں زیادہ عرصہ تک مغلوب نہیں رکھا جاسکتا۔



غزلیں

سیف بجنوری
اسکول روڈ۔ بجنور

رفتہ رفتہ مٹ گئی سب یادگارِ آرزو
جیب بے چاکِ جنوں، دل بے شرارِ آرزو

آنکھ پر روشن ہو کیسے مطلعِ آفاقِ جاں
بے طلب دل کشتۂ گرد و غبارِ آرزو

تن یہ اب کیا ہے بجز اک صد شکن بوسیدہ پوش
اے نگارِ آرزو، اے نوبہارِ آرزو

کھا گئے اس کو بھی شاید ناخنِ لمحاتِ یاس
رہ گیا تھا وہ جو اک تلووں میں خارِ آرزو

قلبِ مردہ کو عطا کر پھر تمنا کی تپش
اے خدائے درد، اے پروردگارِ آرزو

اک عذابِ جاں ہے اب ہر آرزو مندیِ دل
زندگی آندھی ہے، دل شمعِ مزارِ آرزو

سیفؔ طے ہو کس طرح راہِ درازِ زندگی
پاؤں میں زنجیرِ دنیا، سر پہ بارِ آرزو

طلحہ تابش
بیگم وارڈ۔ پرتاپ گڑھ

بے سبب ان سے روٹھ جاتا ہوں
"جذبۂ دل کو آزماتا ہوں"

آپ اپنے سے خوف کھاتا ہوں
میں کبھی جب بھی مسکراتا ہوں

بھول کر بھی اسے نہ بھول سکا
سب سے یہ بات میں چھپاتا ہوں

مجھ سے واقف ہیں یہ جہاں والے
میں انھیں سے فریب کھاتا ہوں

زندہ رہنے کے واسطے اکثر
زندگی سے فریب کھاتا ہوں

تیرے ہی واسطے سے اے غمِ دوست
میں زمانے میں جانا جاتا ہوں

جانے کیا ہو گیا مجھے تابشؔ
آپ اپنے کو بھول جاتا ہوں

ہما پروین
۱۹/۹۸ اولڈ بھوسہ منڈی لکھنؤ

بچھا ہوا کوئی تنہائیوں کا جال نہ تھا
ترے فراق سے پہلے یہ گھر کا حال نہ تھا

تھکے تو یوں کہ ہمیں آرزو تھی سائے کی
صعوبتوں سے سفر کی بدن نڈھال نہ تھا

کچھ ایسے موڑ پہ بچھڑے تھے ہم محبت میں
مجھے بھی رنج اسے بھی کوئی ملال نہ تھا

نگاہ تو نے کسی اور ہی پہ کی ہوتی
جو تم شکستہ دلوں کا کوئی خیال نہ تھا

کبھی کبھی کوئی بادل برس بھی جاتا تھا
زمینِ شہر کا اتنا برا تو حال نہ تھا

چھپا ہوا مرا دشمن تھا خود مرے اندر
سوا اپنے آپ سے بچنے کا کچھ سوال نہ تھا

گئے دنوں کا تجھے دھیان تک نہیں تھا
ترا دورِ عشق یہی ہے جسے زوال نہ تھا

فضل حسنین
۱۱۴۔ گلاب باڑی الٰہ آباد

(مزاحیہ)

قصہ ادیب بننے کا

جب ہم نے کسی طرح رو دھو کر ایم۔ اے پاس کر ہی لیا تو لوگ ہم سے ہمارا مصرف دریافت کرنے لگے۔ چھوٹی موٹی ملازمتیں ہمیں پسند نہ آئیں اور کسی بڑی ملازمت نے ہمیں منھ نہ لگایا ہم عجیب سی کشمکش میں گرفتار تھے کہ اچانک ایک دن ہمیں خیال آیا کہ کیوں نہ ادیب ہی بنا جائے۔ اس طرح ہر جگہ ہمارا نام بھی آجائے گا اور لوگ دنیا میں ہماری تشریف آوری کا مقصد دریافت کرنا بھی بند کر دیں گے۔

اس خیال کا آنا تھا کہ ہم دل و جان سے ادیب بننے میں مصروف ہو گئے۔ پہلا کام ہم نے یہ کیا کہ اپنی زلفِ مبارک کو لاوارث چھوڑ دیا کہ تم آزاد ہو جدھر چاہو جاؤ۔ اس کا ہمیں یہ فائدہ نظر آیا کہ ہم ادیب نما تو لگنے ہی لگیں گے ساتھ ہی لوگ ہمیں فلسفی بھی سمجھنے لگیں گے۔ آنکھوں پر زیرو نمبر کا چشمہ یوں ہی خواہ مخواہ چڑھا لیا کہ انٹلیکچولس (INTELLECTUALS) کی صف میں بھی ہم پیچھے نہ رہیں اور لوگ سمجھ لیں کہ دن رات لکھنے پڑھنے کے چکر میں ہم رفتہ رفتہ اپنی بینائی سے محروم ہونے کے درپے ہیں۔

اب ہم تقریباً ہر قسم کے رسائل و اخبارات پابندی سے خریدنے لگے۔ ایک چمڑے کا بیگ بھی خرید لیا اور ان رسائل و اخبارات کو بیگ میں اس طرح رکھتے کہ ان کے نام بیگ سے جھانکتے رہیں۔ چلتے وقت ہم بیگ کو آگے رکھتے اور خود اس کی تقلید میں رہتے تاکہ کسی ملنے والے کی نظر ہم سے پہلے ہمارے بیگ پر پڑے۔

ہم نے اپنا لکھنے پڑھنے کا کمرہ بالکل علاحدہ کر لیا کہ پرندہ بھی اس میں پر نہ مار سکے۔ ایک عمدہ قسم کا رائٹنگ پیڈ بھی خرید لائے۔ کافی ہاؤس بھی بڑی پابندی سے جانے لگے۔ غرض کہ ہم میں ایک ادیب کی اب تقریباً تمام خصوصیات جمع ہو چکی تھیں سوائے ایک عدد تخلیقی ذہن کے۔ اب دن رات ہمیں افسانے کے پلاٹ کی تلاش رہتی لیکن کمبخت پلاٹ تھے کہ کسی طرح گرفت میں ہی نہ آتے تھے۔ لیکن سچ ہے جہاں چاہ وہاں راہ۔ آخر ایک دن پلاٹ سے ہماری مڈبھیڑ ہو ہی گئی۔ بس پھر کیا تھا۔ دن رات ایک کر کے ہم ایک افسانہ لکھنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔

ہم نے اپنا افسانہ ایک رسالے کو ارسال کیا۔ مدیر کا خط آیا جس میں بڑے خلوص کے ساتھ ہمیں مشورہ دیا گیا تھا کہ آپ افسانے کو اس کے حال پر چھوڑ دیں، افسانوی ادب پر یہی آپ کا احسانِ عظیم ہوگا۔ البتہ اگر آپ آزاد نظمیں لکھنے میں قسمت آزمائی کریں تو ممکن ہے کامیابی مل جائے۔ ہم نے سوچا چلو شاعر ہی بن جاتے ہیں۔ شاعروں کو بھی تو اکثر بڑے بڑے انعامات سے نوازا جاتا ہے اور پھر مدیر نے ہم میں کچھ نہ کچھ دیکھ کر ہی ہمیں یہ مشورہ دیا ہوگا۔

چنانچہ ہم نے اپنی تمام تر توجہ شاعری کی طرف مبذول کر دی اور کسی نہ کسی طرح ایک نظم لکھ کر ہی دم لیا۔ نظم فوراً اسی مدیر کو ارسال کر دی۔ جواب آیا۔ آپ نے جو تخلیق ارسال کی ہے وہ نظم ہے یا افسانہ؟ خط پڑھ کر خون ہی تو کھول اٹھا۔ آپ ہی سوچیے جب ہم نے افسانہ بھیجا تو اس نے ہمیں شاعری کا مشورہ دیا اور اب جب ہم نے خون پسینہ ایک کر کے نظم بھیجی تو کمبخت پوچھتا ہے کہ یہ نظم ہے یا افسانہ؟ ہم نے اپنی تخلیق واپس منگا لی اور اسے ایک دوسرے رسالے کو ارسال کر دی۔ مدیر کا خط آیا۔ ہم آپ کی تخلیق (نظم یا افسانہ جو بھی ہو) آئندہ شمارے میں شائع کر سکتے ہیں بشرطیکہ آپ اپنے شہر سے کچھ بڑے اشتہا

بجوادیں۔ ورنہ اگلا شمارہ نکالنا شاید ہمارے لیے ممکن نہ ہو سکے اور یہ طرح دنیا ایک عظیم تخلیق سے محروم رہ جائے گی۔ یہ خط پڑھ کر ہمارے دل پر جو گزری ہوگی اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ اگر اشتہارات فراہم کرلینا اتنا آسان ہوتا تو اب تک ہم خود ایک رسالہ نہ نکال چکے ہوتے۔

اس حادثے سے ہمارے دل کو ایسا شدید صدمہ پہنچا کہ ہم نے شاعر یا ادیب بننے کا خیال ہی دل سے نکال پھینکنا چاہا۔ لیکن اب ایسا ممکن کہاں تھا۔ ہمارے یار دوست جو ہماری اس ادبی بھاگ دوڑ میں کافی دلچسپی لے رہے تھے۔ اتنی جلد ہتھیار ڈال دینے پر ہمیں لعنت ملامت کرنے لگے اور ہم نے پھر ایک افسانہ لکھ کر ہی دم لیا۔

ہمارے ایک خیر خواہ وہ افسانہ ایک ایڈیٹر کے حوالے کر آئے۔ ایڈیٹر کا خط بھی آگیا کہ ہمارا افسانہ عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ بس اب کیا تھا۔ ہمیں تو منہ مانگی مراد مل گئی۔ ادھر کافی دنوں سے ہم لوگوں سے ملنے جلنے میں کافی پریشانی محسوس کر رہے تھے کیونکہ جب بھی کوئی شناسا ملتا۔ پہلا سوال یہی کرتا۔ "کہیے ادیب صاحب! کہاں کہاں چھپ رہے ہیں؟" اب تو ہمارے ہاتھ ایک ثبوت لگ چکا تھا۔ اس لیے اب ہم ڈھونڈ ڈھونڈ کر لوگوں سے ملاقات کرتے اور بات گھما پھرا کر اسی موضوع پر لے آتے۔ مخاطب کا پیچھا اس وقت تک نہ چھوڑتے جب تک کہ ایڈیٹر کا وہ خط اس کے سامنے آئینے کی طرح نہ کر دیتے۔ اس خط کو ہم ہر وقت سینے سے لگائے رہتے تھے۔

اب ہمیں ایک نئے مسئلے سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا یعنی اس حادثے کا سلبریشن (CELEBRATION)۔ یار لوگوں نے خوب ہاتھ صاف کیے۔ ہم بھی سوچتے چلو کوئی بات نہیں۔ یہی "مصاحبین" ہمیں ایک بڑا ادیب بنانے میں مددگار ثابت ہوں گے ہم نے انھیں ایک ایک عدد پوسٹ کارڈ بھی سونپ دیا کہ ہمارا افسانہ شائع ہوتے ہی وہ لوگ ایڈیٹر کے نام خط لکھیں اور افسانے کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ایک کر دیں۔

اب ہم نے بڑے ادیبوں سے ربط ضبط پیدا کرنا بھی شروع کردیا۔ یہاں تک کہ اس سلسلے میں ہم دوسرے شہروں کا چکر لگانے لگے۔ ہم ہمیشہ اس ٹوہ میں رہتے کہ کون بڑا ادیب ہمارے شہر میں آنے والا ہے۔ پہلے تو ہم پوری کوشش کرتے کہ اسے اپنا ہی مہمان بنائیں لیکن اگر وہ ہمیں بالکل ہی گھاس نہ ڈالتا تو ہم خود اس کے پیچھے لگ لیتے کہ اس میں بھی خود نمائی کے امکانات تھے۔ غرض کہ ہم نے اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور ادیب بننے کے لیے ہر حربے کو استعمال کر ڈالا۔ اپنے کچھ خصوصی "چمچوں" کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے کہ راہ چلتے لوگوں سے ہمارا تعارف ادیب کی حیثیت سے کراتے چلیں۔

اب ہمیں اس رسالے کا انتظار بڑا گراں گزر رہا تھا جس میں ہمارا افسانہ شائع ہونے والا تھا۔ خدا خدا کر کے افسانہ شائع ہوا اور اس رسالے کی دس کاپیاں ہمارے نام بذریعہ وی۔ پی آئیں۔ یعنی ہمارے افسانے کا معاوضہ ہمیں یہ ملا کہ ہم رسالے کی دس کاپیاں فروخت کریں یا پھر ان کی قیمت خود اپنی جیب سے بھریں۔ لمحے بھر کو ہمارے قدم لڑکھڑا سے گئے اور ہم میدان چھوڑ کر بھاگنے کی سوچنے لگے لیکن پھر فوراً ہی سنبھل گئے کہ بغیر کچھ کھوئے کوئی چیز حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے ہم نے خوشی خوشی سارے رسالے اپنے مصاحبوں میں مفت تقسیم کر دیے۔

اب ہمیں افسانہ نگاری کے سوا اور کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ دن رات نظریں نئے نئے پلاٹ کے تعاقب میں رہتیں یہاں تک کہ اکثر بات کرتے کرتے ہماری آنکھیں خلا میں یوں معلق ہو جاتیں کہ مخاطب گھبرا کر ہماری نبض ٹٹولنے لگتا۔ ادیبوں سے ملنے ملانے کے چکر میں دن بھر غائب رہتے۔ رات گئے گھر آتے اور افسانے کی دنیا میں گم ہو جاتے۔ گھر والے ہم سے عاجز آ چکے تھے۔ یہاں تک کہ ایک دن والد بزرگوار نے اخبار میں ہمیں عاق کرنے کی خبر چھپوا دی۔ وجہ انھوں نے صرف یہ دی تھی کہ "چونکہ میرا لڑکا ادیب ہو گیا ہے اس لیے اب اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں رہا"۔ لوگ یہ خبر پڑھ پڑھ کر ہم پر ترس کھاتے رہے اور ہم دل ہی دل میں خوش تھے کہ ہمیں افسانے کے لیے ایک نیا پلاٹ گھر بیٹھے ہاتھ آ گیا تھا۔



باقیہ بنارسی
ڈی ۲۹/۵۰ ویلو گلی۔
قاضی پورہ کلاں۔
دال منڈی۔ بنارس

اعتراف

نہ تبسم نہ تکلم نہ کوئی سوز نہ ساز
بدلا بدلا نظر آتا ہے جنوں کا عالم
مجھ سے کچھ اور رہی کہتی ہے میری تنہائی
لوگ کہتے ہیں کہ ہے مجھ پہ فسوں کا عالم
میرے اس حال پہ اس درجہ تعجب نہ کرو
اس سے بڑھ کر بھی کئی زہر پیے ہیں میں نے
نہ یقیں ہو تو کبھی پوچھ لو ماضی سے مرے
اپنے سر کتنے ہی الزام لیے ہیں میں نے
اور یہ بھی ہے کہ ہر ظلم گوارا کر کے
میں ہر اک راز کو سینے میں چھپا لیتی ہوں
کچھ یہی سوچ کے جل جائے نہ دامن کوئی
کتنے انگاروں کو ہاتھوں میں اٹھا لیتی ہوں
آج کیوں چپ سی لگی ہے مجھے تم کیا جانو
یہ اگر کچھ بھی نہیں ہے تو میری بات تو ہے
میرے بے کیف تبسم پہ ذرا غور کرو
اس کے پردے میں کوئی درد بھری بات تو ہے
مدتیں گذریں کہ میں بھول چکی تھی لیکن
آج کیا جانیے کیوں یاد کوئی آیا ہے
اور یوں ٹھیس لگی ہے مرے دل پر جیسے
کوئی شیشہ کسی دیوار سے ٹکرایا ہے
اب یہ میں سوچ رہی ہوں کہ یہی ہونا تھا
میں نے یہ وعدہ خلافی کی سزا پائی ہے

حضور سہسوانی
راز منزل سہسوان
بدایوں - ۲۴۳۶۳۸

رین

چنچل کومل پیروں میں جب باندھ کے آئے چھاگل رین
برہا کے مارے منوا کو اور بھی کر دے گھایل، رین

خنجر کتنے سناٹوں کے تن میں اترتے جائیں گے
بھور بھئے تک سر کو اپنے پٹکے گی جب پاگل، رین

مجھ کو پہلے سے بھی بڑھ کر سندر لگنے لگتی ہے
کالے کالے نینوں میں جب بھر کر آئے کاجل، رین

خوشبو سی بکھری ہے میرے آشاؤں کے مندر میں
ہوتا ہے محسوس کہ جیسے صندل کا ہو جنگل، رین

مجھ پر کیا احسان یہ میرے ایک نشہ سا چھانے لگا
ہاتھ میں جب لے کر آئی ہے کالی سی اک بوتل، رین

ہر اک دکھ کو چھین کے میرے من کو اکثر چین دیا
اور کبھی پہلے سے بڑھ کر، کر جاتی ہے بے کل، رین

دن کا اجالا دل کو میرے جب بھی دے گا زخم کوئی
اس پہ حضور آ کر رکھے گی دیکھنا مرہم پل پل، رین

(افسانہ)

بلقیس شبیہ
معرفت ایم جی رحمان ایڈوکیٹ
ڈھنڈہ میس ۱۰ اکولہ ۱-۴۴۴
مہاراشٹر

کوئلہ بھئی نہ راکھ

اکشاف نے بڑی آہستگی سے عروسانہ کے کمرے کی زنجیر ہلائی۔

"مجھے معلوم تھا آپ ہی ہوں گے" عروسانہ نے دروازہ کھول کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"فوراً کہیے کیا ہے" وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے خوف زدہ لہجے میں بولی۔

"اتنی سنگ دل کیوں بن گئی ہو کوئی ضرورت ہی ہو گی جو اتنی رات گئے تمھارے دروازے پر آیا ہوں" اکشاف بولا۔

"دادی اماں اور خالہ امی جاگ رہی ہیں" عروسانہ نے آہستہ سے کہا۔

"ارے! ان سے کیا ڈرتی ہو" اکشاف نڈر پن سے بولا "ہمیں کمرے میں چل کر بیٹھنے کو نہیں کہو گی"؟

"خدا کے لیے اکشاف بھائی یہاں سے چلے جایئے"۔ عروسانہ نیم وا دروازے سے سر نکال کر بولی۔

"ہماری عروس بڑی ہی بزدل ہے"

"آپ محض اپنی دل لگی اور ظرافت سے مجھے رسوا اور بدنام کر دیں گے۔ آپ کا کیا ہے آپ اس گھر کے لاڈلے ہیں آپ کی ہر خطا معاف کر دی جائے گی لیکن میرا تو جینا دوبھر ہو جائے گا"

فکر نہ کرو عروس ایک دن تمھیں اپنی دلہن بنا کر تمھارے نام سے اس خاندان کا چراغ روشن کر دوں گا"

اکشاف مجھے مستقبل کے خوبصورت خواب دکھا رہا ہے عروسانہ سوچنے لگی۔ خواب تو صرف دیکھنے کے لیے ہوتے ہیں۔ اور کیا وہ خود اس گھر کا چراغ نہیں؟ چراغ بن کر جل رہی ہے۔ جلے جا رہی ہے سورج اپنی آگ میں خود جل کر چاند کو روشنی دیتا ہے۔ چاند کی اجلی خنک چاندنی سب پسند کرتے ہیں۔ سورج کی دھوپ اور تمازت کسی کو نہیں بھاتی۔ عالیہ اور اکشاف اس گھر کے چراغ سمجھے جاتے ہیں حالانکہ روشنی اسی کے دم سے ہے۔

وہ رات بھر کروٹیں بدلتی رہی۔ اکشاف کے لیے وہ اپنے دل کے سارے دروازے بند کر دینا چاہتی تھی۔ مگر پھر بھی جانے کیسے اس کے رگ و پے میں اکشاف کی محبت سرایت کرتی جا رہی تھی اک پل کو بھی اسے نیند نہ آئی۔ صبح اکشاف جا رہا تھا۔ اس کی تعلیم کے آخری سال کے صرف چند مہینے ہی باقی تھے۔ سب کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ لیکن دادی اماں کا دل تھا یا پتھر... اندر اکشاف اللہ اکیلا ہے یہ لڑکا۔ سسرال جانے والی لڑکی کی طرح رات سے آزردہ ہے۔ خالہ امی کو بھی اپنے دل پر کس قدر اختیار ہے۔ مگر جاتے جاتے اکشاف ماں کے سینے سے لگا تو ان کی آنکھیں بھی بھرے ہوئے گاگر کی طرح چھلک پڑیں۔ عروسانہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھتی رہی۔ وہ اکشاف کے سامنے نہ گئی۔ وہ اپنی ان آنکھوں کو کیسے چھپاتی جو رات سے برس رہی تھیں۔ ....

اکشاف کیا گیا، گھر کا گھر اداس ہو گیا۔ عروسانہ کی اداسی کا تو کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ گھر میں بس اک وہی تو تھا جو اس کے دکھ سکھ خوشی و غم کا خیال رکھتا تھا۔ ورنہ سب تو اسے محض اک مشین سمجھتے

تھے صبح سے شام تک کام کرنے والی بے جان، کبھی نہ تھکنے والی مشین کبھی کسی کو خیال نہ آتا کہ وہ بھی گوشت پوست کی بنی انسان ہے جسے خوشی، آرام اور محبت و دلجوئی کی ضرورت ہے۔

آپا آئیں۔ گھر میں پھر رونق آگئی۔ ان کے گھر آنگن کو ایک کرنے والے چھوٹے بڑے چار بچے۔ خود آپا کی سروتے کی طرح چلتی زبان مگر انہیں بھی اکشاف کی کمی محسوس ہوئی۔ دادی اماں سے بغیر پوچھے اُسے آنے کا تار بھیج دیا۔ وہ تو گویا آنے کے لیے تیار ہی بیٹھا تھا۔

اور اک دن ٹپک ٹپک کرتا تانگا بڑے دروازے پر آ رکا۔

آپا نے کھڑکی سے سر نکال کر جھانکا

"میرا بھیا!" وہ خوشی سے گرتی پڑتی بھاگیں

"ماموں جان آگئے! ماموں جان آگئے" بچوں کا شور سن کر دادی اماں تسبیح ہلاتی کمرے میں آئیں۔

"کیا اکشاف آیا ہے؟"

"آداب عرض دادی اماں" اکشاف سعادت مندی سے جھکتا ہوا بولا۔

دادی اماں کے اک دم تیور بدل گئے۔

"میں نے بلایا ہے اسے تار بھیج کر" آپا نے جھٹ کہا۔

اکشاف وہاں سے فوراً کھسک گیا۔ امی نماز پڑھ رہی تھیں اس نے باورچی خانے کا رخ کیا۔

"بختو! کمبخت مصالحہ بھی نہیں پیسا۔ شیرو تم وہاں کھڑے کھڑے کیا کر رہے ہو بورے سے کوئلے نکالو۔ اری او کلثوم! ذرا جلدی سے چاول تو دھولاؤ۔۔۔" چولھے کے پاس عروسانہ بڑبڑا رہی تھی۔ "کمبخت لکڑیاں" وہ چولھے میں جھک کر پھونکیں مارنے لگی۔

"تمھیں بہت جلد اس دھوئیں کی گھٹن سے چھٹکارا مل جائے گا"

اکشاف اس کے بہت قریب جا کر جھکتا ہوا بولا۔

"ہائے اللہ۔۔۔ آپ" عروسانہ نے چونک کر دیکھا اور خوشی سے کھل اٹھی۔۔۔ اور دھواں بھری آنکھوں کو آنچل سے رگڑنے لگی جن میں خوشی کے آنسو جھلک رہے تھے۔

"لکڑیاں گیلی ہیں شاید؟" اکشاف نے سوال کیا۔

"گیلی ہوں یا سوکھی۔ بہرحال انھیں جلنا ہی ہوگا" عروسا پھر چولھا پھونکنے لگی۔

"میاں!" دھلے ہوئے چاول کا تسلہ عروسانہ کو تھماتے ہوئے کلثوم بوا نے اکشاف سے کہا "آپ گئے تھے نا تو آپ کی عروس بہت اداس ہو گئی تھیں"

"اے بوڑھی چوہیا!" عروسانہ غرائی "کیا آج خوشی سے پاگل ہو گئی ہے"

"ٹھیک ہی تو کہا کلثوم بوا نے" اکشاف خوش ہو کر بولا "کیا تم میرے جانے کے بعد اداس نہیں ہو گئی تھیں؟ اور کیا تم اک دن میری دلہن نہیں بنو گی؟۔۔۔"

وہ جانتی تھی اس گھر میں اس کی کیا حقیقت ہے۔ بن ماں باپ کی لاوارث لڑکی۔ اس کا یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا اکشاف اتنا پڑھ لکھ کر بیوقوف ہے اندھیروں سے اجالوں کی توقع کر رہا ہے۔

آپا کے بچے تو خود قیامت تھے۔ یہ اکشاف ان بچوں سے بچہ گیا گھر رابن گیا۔ تمام دن کی دھما چوکڑی، شور پکار، ڈرائنگ روم برآمدہ، ڈائننگ ہال صرف دادی اماں اور امی کے کمرے کو چھوڑ کر مکان کا کوئی حصہ ان کی دوڑ بھاگ سے نہیں بچا۔ قالین پر جھوٹا کھانا پڑا ہے، دالان میں کرسیاں آتش دان پر گلدان صوفہ سیٹ پر ایش ٹرے۔ میز پر جوتے بکھرے ہوئے۔ اللہ! آپا کے بچے ہیں یا شیطان۔ عروسانہ تمام دن سامان کو درست کر کے ترتیب سے ان کی جگہ جاتی رہتی وہ کام سے کبھی بیزار نہ ہوتی۔ نل کا پانی بہہ کر آنگن میں جمع ہو رہا ہے بچے اور اکشاف تالاب بنا کر کھیل رہے ہیں۔ اک دوسرے پر چھینٹے اچھال رہے ہیں۔

"میں تو سمجھی تھی تم ڈاکٹر بن کر کچھ سنجیدہ ہو جاؤ گے۔ مگر توبہ کرو، تم تو بچوں سے بھی گئے گزرے ہو" آپا غیرت دلاتیں تو وہ قہقہہ مار کر ہنس دیتا۔

عروسانہ دور سے اس کی شرارتیں دیکھ کر مسکراتی رہتی۔

"خدایا! تو میرے اکشاف کو اسی طرح ہنستا مسکراتا رکھیو۔" وہ
اکرتی۔

اک دن اس نے سنا آپا اماں سے کہہ رہی تھیں: "امی! آپ
لیے ایسی چاند سی بہو لاؤں گی کہ آپ کا گھر روشن ہو جائے گا۔"
چولھے کے پاس بیٹھی عروسانہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"لیکن آپا آسمان کا چاند زمین پر کیسے آئے گا؟" اکشاف بدستور
س رہا تھا۔

"گھونگھٹ اٹھا کر دیکھ لینا" آپا برجستہ بولیں۔

"چاند تو صرف، رات ہی کو چمکتا ہے ایسی روشنی ہو جو دن اور
ت جگمگاتے رہیں۔" اکشاف عروسانہ کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔
"پھر آپا! جب گھر ہی میں روشنی موجود ہو تو باہر سے اجالے مانگنے
کیا ضرورت ہے۔"

عروسانہ نے پلٹ کر دیکھا اکشاف کی محبت پاش نظریں اسی
جمی ہوئی تھیں۔ سلگتی ہوئی آگ کے گرم گرم کوئلے۔ جیسے اس کے
ے پھول بن گئے اس نے خوشی سے بوکھلا کر سلگتی ہوئی آگ کو انگلیوں
ں اٹھا لیا۔ لیکن جب اس نے آپا کی زبان سے فرحانہ کا نام سنا تو اس
ے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ اکشاف نے سنا تو وہ بھی برس پڑا۔ صبر
ی بھی حد ہوتی ہے۔ وہ چھبیس سال کا نوجوان ہے کیا اسے اپنے بارے
یں فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا وہ عروسانہ
پسند کرتا ہے اور اسی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔

"ہائے غضب!" آپا نے چھاتی ٹھونکتے ہوئے کہا "دادی
اماں سنیں گی تو قیامت آجائے گی تم ان کی پوتی فرحانہ پر عروسانہ کو
ترجیح دے رہے ہو۔"

"امی! آپ کچھ تو بولیے۔" اکشاف ماں سے بولا۔ "آخر وہ آپ
کا اپنا ہی تو خون ہے۔"

"جو نیچے کا چراغ! مٹی کا دیا" امی نے حقارت سے کہا "بھلا
وہ حویلی میں فانوس کی جگہ لے سکتا ہے۔"

"چلے ہو خاندان کا نام روشن کرنے" آپا بڑبڑائیں "موئی دو کوڑی
کی باورچن۔"

"اسے باورچن کا ذلیل درجہ آپ لوگوں نے دیا ہے" اکشاف
غصہ سے بولا۔ "کان کھول کر سن لیجیے میں اگر شادی کروں گا تو صرف عروسانہ
کے ساتھ۔ جائیے میرا یہ فیصلہ دادی اماں کو سنا دیجیے۔"

گھر میں جیسے مخالفت کا اک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ جس میں عروسانہ
کا وجود اک تنکے کی طرح حقیر تھا۔ وہ آپا اور خالہ امی کی حقارت بھری
نظروں کی تاب نہ لاسکی۔ دو روز تک وہ اپنے کمرے میں روتی دھوتی
پڑی رہی۔ تیسرے دن کلثوم بوا نے اسے آکر بتایا کہ اسے ہمیشہ ہمیشہ
کے لیے اس گھر سے نکالنے کی سازش کی جارہی ہے اور اسے چھ بچوں کے
باپ بوڑھے فضلو سے بیاہ دینے کے چرچے ہو رہے ہیں۔ حال ہی میں
جن کی بیوی کا تپ دق سے انتقال ہوا ہے۔ یہ سب سن کر وہ تڑپ
ہی تو گئی۔ اس نے سوچا کہ وہ اس سلسلے میں صرف اکشاف سے احتجاج
کر سکتی ہے صرف اسی سے مدد لے سکتی ہے لیکن اسے معلوم ہوا کہ دو دن سے
وہ بھی گھر سے غائب ہے۔ وہ آپا کے آگے خالہ امی کے آگے بہت روئی
گڑگڑائی دادی اماں کا دامن پکڑ لیا لیکن کسی کو اس پر رحم نہ آیا۔
اکشاف کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر فوراً اسے اس گھر سے دفعان کر
دیا گیا۔

چار پانچ روز بعد اکشاف لوٹا۔ گم صم۔ اداس اداس ....
روٹھا ہوا.... اس نے گھر میں کسی سے بات نہ کی شیرو کو غسل خانے میں
گرم پانی ڈالنے کو کہہ کر کندھے پر تولیہ اور ہاتھ میں صابن دانی لیے وہ
باورچی خانے کے پاس سے غسل خانے کی طرف روانہ ہوا۔ باورچی خانے
میں کوئی نہ تھا۔ خالی چولھے میں جلتی ہوئی لکڑیاں دھواں چھوڑ
رہی تھیں۔ اسے عجیب سے سونے پن کا احساس ہوا۔

"چھوٹے سرکار!" گرم پانی غسل خانے میں ڈالتے ہوئے شیرو
نے سرگوشی کی "آپ کی عروس وہ بوڑھا فضلو اٹھا کر لے گیا۔"

"کیا!!" صابن دانی اکشاف کے ہاتھ سے گر پڑی۔

"جی سرکار!" شیرو آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا "آپ نہیں تھے
تو عروسانہ بی بی کا نکاح زبردستی اس بوڑھے کے ہاتھ پڑھا دیا گیا۔"

"نہیں...." وہ بری طرح چیخا تولیہ وہیں پھینک کر وہ امی
کے کمرے کی طرف دوڑا آپا بھی وہیں تھیں۔

"عروسانہ کہاں ہے امی؟" اس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو رہی تھیں۔

"جس گھر کا چراغ تھی اسے اسی دہلیز پر جلا دیا گیا" آپا نے بڑی نفرت سے کہا۔

"آپ چپ رہیے۔ میں امی سے سوال کر رہا ہوں۔ بتلایئے! کہاں ہے میری عروس؟" وہ امی کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔

"پاگل ہو گئے ہو کیا؟" آپا نے دھکا دے کر اسے پرے کر دیا۔ "امی کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔"

"آ.. آ... ہا!" اکشاف دانت پیستا ہوا بولا "آپ بہت فتنہ انگیز ہیں۔ یہ سب کیا دھرا آپ ہی کا تو ہے۔ آپ نے عروسانہ کے ساتھ ہی نہیں بلکہ میرے ساتھ بھی دھوکا کیا۔ آپ بہت ظالم ہیں بے رحم ہیں...... دھوکے باز ہیں..." وہ چیختا ہوا عروسانہ کے کمرے کی طرف بڑھا۔ اس کے کمرے میں اس کی کوئی چیز نہ تھی۔ صرف خالی پلنگ پڑا تھا وہ اس پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

گاؤں میں کالرے کی وبا نے خوب زور پکڑا۔ صبح سے شام تک اکشاف دوائیوں کا بکس لیے گاؤں میں گھومتا رہتا۔ عروسانہ بھی اس وبا میں مبتلا ہو گئی۔ اکشاف کے قدم خود بخود اس کے گھر کی طرف اٹھ گئے۔ شادی کے بعد پہلی بار وہ اس کے گھر جا رہا تھا۔ "ڈاکٹر صاحب آئے ہیں" یہ خبر اس کو ملی تو اس نے آنکھیں کھول کر اکشاف کی طرف نیم بیہوشی کی حالت میں دیکھا۔ لیکن وہ اسے پہچان گئی۔

"ہماری عروس کو ہم پر بھروسہ نہیں۔ دیکھ لینا اک دن تمہیں دولہن بنا کر تمہارے نام سے اپنے خاندان کا چراغ روشن کر دوں گا"

"میری عروس! تمہیں بہت جلد اس دھوئیں کی گھٹن سے نجات مل جائے گی...... وہ دن دور نہیں جب تم صحیح معنوں میں اس گھر کی چراغ کہلاؤ گی....."

پرانی باتیں اس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا اور اپنے قریب بیٹھے ہوئے بڑے میاں سے بولی۔

"ان سے کہیے یہ چلے جائیں۔ مجھے نہیں چاہیے ان کی دوا۔ یہ میرے پاس کیوں آئے چارہ گری کو...... یہ مجھے کیوں بچانا چاہتے ہیں... میری انا کو زخمی نہ کریں..... مٹی کا حقیر سا دیا۔ اسے اپنے غرور و نخوت کی پھونکوں سے بجھا دیجیے...... اب مجھ سے جلا نہیں جاتا..... اب مجھ سے جیا نہیں جاتا..... مجھے مر جانے دیجیے، مجھے مر جانے دیجیے..." وہ پھپھک پھپھک کر رونے لگی۔

"ہاں عروس!" اکشاف گھٹی گھٹی آواز میں بولا "میں بھی چاہتا ہوں اب تم مر جاؤ۔ تمہاری یہ زندہ درگور زندگی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی خدا کرے تمہیں جلد موت آ جائے۔" لیکن بدنصیبوں کو موت کہاں وہ بغیر دوا کے اچھی ہو گئی اور بوڑھا افضل بیمار پڑا اور ختم ہو گیا۔

"امی جان سوائے آپ کے عروس کا اس دنیا میں کون ہے۔ سوتیلے بچے کسی دن ہاتھ پکڑ کر اسے گھر سے باہر کر دیں گے۔ اس بے عزتی سے پہلے ہی اسے اپنے گھر لے آیئے"۔ اکشاف نے ماں کے سامنے یہ تجویز رکھی تو انھوں نے اپنا نادر شاہی حکم سنایا۔

"جب تک تمہاری شادی نہ ہو جائے اس وقت تک عروسانہ اس گھر میں نہیں آ سکتی۔"

"آپ مجھے خوبصورت باغ دکھاتے رہے اور میں اس دوزخ میں ڈھکیل دی گئی۔" اکشاف عروسانہ کے پاس تعزیت کے لیے گیا تو اس نے کہا۔

"میں نے آپ سے کوئی شکایت نہ کی..... لیکن اب.... اب تو میرے پر کٹ چکے ہیں.... سوتیلے بچوں نے مارے طعنوں کے میرا جینا اجیرن کر دیا ہے۔ خدا کے لیے مجھے اس ذلت سے بچایئے۔" وہ رو پڑی۔

عروسانہ کو دوبارہ اس گھر میں واپس بلانے کے لیے مجبور اکشاف کو شادی کے لیے راضی ہونا پڑا لیکن اس کا دل رو رہا تھا۔ افوہ! اس گھر کے لوگ کس قدر سفاک ہیں۔

"اللہ! اب منہ سے کچھ بولو گے بھی..... دولہے ایسے زبان تو نہیں سی لیتے۔" ابٹن ملتے وقت آپا نے اسے چھیڑا۔

ادھر بڑے دروازے سے سجی ہوئی موٹر سے دولہن اتری اور ادھر گلی کے چھوٹے دروازے سے لٹی ہوئی عروسانہ کی زندہ لاش۔ مکان کے آخری سرے پر اس کے لیے ایک کمرہ پہلے ہی خالی کر دیا گیا۔

۔ وہ سمجھ گئی کہ اکشات کی نظروں سے اوجھل رہنا ہے۔ اس نے خود
شہ نشینی اختیار کر لی۔

وہی گھر .... وہی گھر کے افراد .... بلکہ دولہا بھائی اور
، دولہن کا اضافہ ہو گیا تھا مگر گھر میں اب وہ پہلے کی سی رونق نہ تھی۔
ہیل پہل۔

" ماموں جان چلیے باغ میں آنکھ مچولی کھیلیں !
چلیے آنگن میں نل کا پانی جمع کر کے تالاب بنائیں "

بچے اس کی منت سماجت کرتے وہ انھیں جھڑک دیتا۔

وہ کھڑکی کے پاس کھڑا شام کے اس اکیلے تارے کو دیکھ رہا تھا جو جنوبی
ربی افق کے درمیان چاند کا انتظار کیا کرتا، ہر روز وہ کتنا اکیلا، کتنا
اسس اور کتنا تنہا نظر آ رہا تھا۔

آسمان کے سارے تاروں سے الگ تھلگ یہ ستارہ!

"یہاں کھڑے کھڑے کیا کر رہے ہو؟" آپا نے اسے ٹوکا۔

"وہ دیکھو آپا!" اس نے انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کیا "آسمان
اکیلا ستارہ کیسا اداس نظر آ رہا ہے "

" لیکن تم تو اکیلے نہیں ہو " آپا نے ترشی سے کہا " کمرے میں جاؤ
نام ڈھلے پیڑ تلے یوں ننگے سر نہیں کھڑے رہتے "

"کمرے میں میرا دل گھبراتا ہے" وہ بے رخی سے بولا۔

"اب تم سے ایسی باتیں بھی کہنا پڑیں گی کیا؟"
دلہن تمہارے بارے میں کیا سوچتی ہو گی۔ آج صبح ہی دبی دبی زبان
میں مجھ سے تمہاری لاپرواہی کی شکایت کر رہی تھی۔"

اکشات اک دم زور سے ہنسا۔ "شاید اسے یہ بات معلوم نہیں کہ وہ اس
گھر میں میری دلہن نہیں بلکہ صرف "بہو" اور "بھابی" بن کر آئی ہے۔ آپ
بتا دیجیے گا اسے یہ بات۔

آپا ہکا بکا اس کا منھ تکنے لگیں۔ اب نہ وہ دادی اماں سے ڈرتا تھا
نہ اسے امی کا لحاظ تھا۔ وہ آپا کو بھی بات بے بات پر جھڑک دیتا تھا۔

وہ دالان میں ستون کے سہارے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ کلثوم
بو نل پر چاول دھو رہی تھیں۔

" نجتو! کہاں مر گیا " آپا چولھے کے پاس چیخ رہی تھیں۔

" شیرو! بورے سے کوئلے نکال۔ مصالحہ بھی تیار نہیں ہوا ابھی
تک کلثوم
کلثوم! چاول دھو رہی ہے یا سو گئیں نل پر جا کر ....."
آپا غصے سے برتن پٹک رہی تھیں۔

یادیں تو اشارہ پاتے ہی جاگ اٹھتی ہیں۔ اکشات نے عروسانہ
کے کمرے کی طرف دیکھا۔ اس پر اب آپا کا قبضہ تھا۔ عروسانہ کا تو جیسے
وجود ہی ختم ہو گیا تھا۔

سلگتی یادوں نے اس کے ذہن میں ماضی کا دھواں بھر دیا۔

" دھواں ...... سب دھواں ....." وہ اپنی آنکھیں
رگڑنے لگا۔

باورچی خانے سے دھواں نکل کر اس کی طرف لپک رہا
تھا۔ چمنی سے بھک بھک دھواں نکل کر آسمان کی طرف اڑ
رہا تھا جس میں عروسانہ کی ابھرتی ڈوبتی تصویر تھی، بادلوں
کے سیاہ بھورے ٹکڑے آسمان پر تیر رہے تھے ..... کسی
آوارہ بدروح کی طرح ....

" آ..... پا..... !" وہ زور سے چیخا! "سب دھواں
کر دیا بند کرو کچن کی کھڑکی اور دروازہ ..... میرا دم
گھٹ رہا ہے ...."

لیکن آپا کو حیرت ہوئی کچن میں بالکل ہی دھواں نہ
تھا۔ وہ تو اسٹوو پر پکا رہی تھیں۔ کوئلے کی انگیٹھی ابھی انھوں
نے سلگنے بھی نہیں رکھی تھی۔

یہ دھواں ...... دھواں کیا بڑبڑا رہے ہو"
آپا اس کے پاس آ کر بولیں۔

" جب لکڑی پوری جلنے نہیں پاتی اور اسے کوئلہ بننے
سے پہلے بجھا دیا جاتا ہے تو وہ اسی طرح دھواں دیتی ہے
یہ محبت کی اس آگ کا دھواں ہے جسے آپ لوگوں نے قبل
از وقت بجھا دیا تھا "

" شیرو!" ایک دن نوکر اس کے کمرے میں پانی
کی صراحی رکھنے کو آیا تو اکشات اس سے پوچھنے لگا۔

"عروس کیسی ہے؟"

"معلوم نہیں سرکار...... کمرے کے باہر بہت کم نکلتی ہیں کسی سے بات نہیں کرتیں۔ کلثوم بوا ان کے کمرہ میں ناشتہ، کھانا دے آتی ہیں........"

آتشِ گل کو ابکے ہوا کیا ہے
گلستاں میں دھواں ہی دھواں ہے

وہ زور زور سے گانے لگا۔ امی پریشان ہو کر اس کے پاس آئیں۔

"طبیعت گھبرا رہی ہے بیٹے؟" وہ ممتا بھرے لہجہ میں بولیں۔

"تمھاری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔"

"ہاں مجھے نیند آ رہی ہے۔" اس نے ماں کی گود میں سر رکھ کر آنکھیں موند لیں لیکن یادوں کے دھوئیں نے اس کی روح کو گھیر لیا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

"امی! عروسانہ کہاں ہے؟"

"اپنے کمرے میں" امی نے مختصر جواب دیا۔

"وہ تمام دن اپنے کمرے میں رہتی ہے۔ اس کا دل نہیں گھبراتا؟"

امی! عروس کہتی تھی لکڑی چاہے گیلی ہو یا سوکھی اُسے جلنا ہی ہوتا ہے۔ ٹھیک کہتی تھی نا امی وہ؟....... وہ ہم سب کے لئے کتنا کام کرتی تھی۔ صبح سے اٹھ کر رات گئے تک ہم سب کو اس نے کتنا آرام اور سکھ پہنچایا۔ امی! میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں اسے اپنی عروس بناؤں گا۔ کیا وہ اس گھر کا چراغ نہیں بن سکتی تھی؟ بچپن سے لے کر جوانی تک اس گھر کی دہلیز پر اس کی زندگی کے سینکڑوں شب و روز گزرے ہیں، وہ جلتی ہی رہی ہے...... ہم نے اسے آج تک کیا دیا ہے۔ سوائے ان تکلیف دہ یادوں کے۔ اس نے اپنے دل کے نہاں خانوں میں میرے نام سے امید کا دیا جلایا تھا۔ ہمارے سینوں میں آج بھی محبت کے چراغ جل رہے ہیں۔ آپ لوگوں نے اسے بجھانے کی کوشش کی مگر یہ چراغ بجھا نہیں بلکہ اس کی لو اور تیز ہوگئی ہے۔

امی سسکیوں کو روکے خاموش آنسو بہا رہی تھیں۔

اچانک وہ اٹھا اور عروسانہ کے کمرے کی طرف دوڑا امی بھی اس کے پیچھے لپکیں۔ وہ آہستگی سے اس کے کمرے کی زنجیر ہلانے لگا۔

"مجھے معلوم تھا آپ ہی ہوں گے"...... اس آواز کے ساتھ اکشاف کے ذہن پر عروسانہ کے ماضی کی تصویر ابھری۔

اس نے دروازے کی دراز میں سے جھانکا، اندر گھپ اندھیرا تھا۔

اس نے دوبارہ زنجیر ہلائی۔ مگر کمرے میں کوئی آہٹ نہ ہوئی۔

"اتنی سنگدل کیوں بن گئی ہو۔ کوئی ضرورت ہی ہوگی جو اتنی رات گئے تمہارے دروازے پر آیا ہوں۔" ذہن کے پردے پر ماضی کی یادیں رقص کر رہی تھیں اور وہ مسکرا رہا تھا۔ اس نے اور زور سے زنجیر ہلائی۔

دو تین روز سے عروسانہ کی طبیعت زیادہ خراب تھی۔ وہ جنگلہ کود کر کمرے میں داخل ہوا۔ چراغ جلایا، اندر سے بند دروازہ کھولا۔ کمرہ میں دو تین روز کا باسی کھانا پڑا تھا۔ اور وہ خود فنا کی تاریکیوں میں ڈوب گئی تھی۔ جانے کب......"

"کمبختو! تم نے آخر اس چراغ کو بجھا دیا نا...." اکشاف بری طرح چیخا......

"اب مجھے بھی اپنے چاروں طرف اندھیرا نظر آ رہا ہے تاریکی اور دھواں...... دھواں......"

وہ دھواں دھواں کہتا ہوا کمرے سے باہر بھاگا۔



نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

م کتاب: نگارِ سحر (غزلوں کا مجموعہ) شاعر: جوہر ہاشمی
فحات: ایک سو اٹھائیس۔ کتابت و طباعت۔ عمدہ۔ قیمت:
۲۰ روپے۔ ملنے کا پتہ: آندھرا پردیش اردو اکیڈمی بک ڈپو
ے۔سی گارڈز، حیدر آباد ۲۷

جوہر ہاشمی حیدر آباد کے......... ایک مشہور شاعر ہیں، ادبی
ریدوں، اور روزناموں کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے بھی
ن کا کلام نشر ہوتا رہا ہے۔ "نگارِ سحر" ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔
قول عابد علی خاں:

"جوہر ہاشمی کے کلام کو جدید و قدیم رجحانات کے امتزاج کا نام
یا جا سکتا ہے، وہ اپنی فکر کی ترسیل میں کامیاب ہیں۔ نگارِ سحر، ان کی
شاعری کے پورے کینوس کی نمایندگی کرتا ہے۔"

ممکن ہے نگارِ سحر جوہر ہاشمی کی شاعری کے پورے کینوس کی
نمائندگی کرتا ہو لیکن مجھے صرف چند مرحلوں میں ہی ان کے یہاں جدید
رجحانات ملے ہیں ورنہ وہ بحیثیت مجموعی غزل کی انھیں روایات کے پابند
نظر آتے ہیں جن کی اصلاح کا بیڑا حالی نے اٹھایا تھا۔ فکر کی ترسیل
میں مکمل کامیابی کی بات کو بھی تسلیم کرنے میں تردد ہوتا ہے۔ اس کا
سبب یہ ہے کہ جوہر ہاشمی لفظوں کے استعمال میں محتاط نہیں رہتے۔

اگر جوہر ہاشمی کے کلام میں کہیں کہیں جدید خیالات ملتے
ہیں تو اس میں شعروں کی سی کیفیت نہیں ہوتی، ان کے لفظوں میں
داخلی حرارت تو ہوتی ہے لیکن وہ تیزی نہیں ہوتی جو وجود کو جھلسا دے
وہ بیشتر جگہوں پہ بیانیہ اسلوب اختیار کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ
وہ غزل کی روایتوں کے شاعر ہیں۔ اس کے باوجود جدید لب و لہجہ کے
اشعار میں خاصی توانائی ہے ؎

دیکھ کر چاند کو لہروں پہ ندی کی جوہر
چند خوش فہم اٹھا لائے ہیں بوسیدہ جال

فرقت کی آگ مجھ کو جلاتی ہے رات دن
تیرا خیال میرے لیے دیپ راگ ہے

جوہر ہاشمی اگر غزل کے روایتی مضامین اور استعاروں سے
گریز کرتے ہوئے اپنے اظہار کے لیے ایک نئی زبان کی تشکیل کی طرف
توجہ کریں تو ان کے فن کے لیے کافی امکانات ہیں۔

وسیم احمد اعظمی

نام کتاب: **سمن زار** مجلد اور دیدہ زیب
مصنف: خواجہ عبدالغفور آئی۔ اے۔ ایس: قیمت: آٹھ روپے

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ محمد علی روڈ۔ بمبئی نمبر ۳۔

خوبصورت جلد میں یہ کتاب "سمن زار" ہندو پاک کے مشہور
طنز نگار خواجہ عبدالغفور کی تخلیق پر مشتمل ہے۔ یوں تو علوم
مختلفہ پر لکھی ہوئی متعدد کتابیں کئی زبانوں میں خواجہ عبدالغفور کی
موجود ہیں۔ پچھلے آٹھ دس برس میں طنز و ظرافت پر ان کی یہ چھٹی
کتاب ہے۔ موصوف کا یہ کارنامہ اردو ادب کے لیے قابلِ قدر ہے۔
ایک بات جو سمن زار کے خالق کو دوسرے طنز نگاروں سے جدا
کرتی ہے۔ وہ ہے ان کی علوم انگریزی پر دسترس، انھوں نے انگریزی
کے طنز کی آمیزش سے اردو ادب کے پیمانے کو ایک نئی سطح بخشی
ہے۔ بلکہ ایک اعتبار سے دورِ حاضر کی ضروریات کے طفیل انھوں نے
اردو تہذیب کو ایک جدید فیشن عطا کیا ہے۔ ان کی دیگر کتابیں
لائبریریوں کے شیش محلوں میں محفوظ ہیں۔ اس کتاب کو بھی کچھ ان
سے زیادہ ہی مرتبہ حاصل ہے۔

تسنیم فاروقی

نام کتاب: **الفاف** (شعری مجموعہ) شاعر: محسن جلگانوی
قیمت: بارہ روپے۔ ملنے کا پتہ: اردو اکیڈمی اے۔سی گارڈز
حیدر آباد۔ ۴

محسن جلگانوی حیدر آباد کے ایک نوجوان شاعر ہیں۔ الفاف ان کی
غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ہے۔ محسن کے یہاں روایت کے سنجیدہ شعور کے
ساتھ ساتھ عصری حسیت اور زبان و بیان کی ندرت ملتی ہے۔ انھوں نے اپنے

شعور کی عمارت اقدار کی شکست وریخت کے تصور پر نہیں قائم کی ہے بلکہ روایت سے سلیقہ اور عصری آگہی سے لب ولہجہ کی وارفتگی پائی ہے۔ عام جدید شاعروں کی طرح ان کے یہاں عزم وغصہ کے عناصر یا خود کلامی کی مجہولیت بھی نہیں ملتی۔ وہ تنہائی کی کیفیت میں غم زمانہ کی لذتیت سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ اکثر اوقات اس سے لطف اندوز بھی ہوتے ہیں ؎

بھیڑ ہے آئینہ خانے میں بہت اندھوں کے
خود کو محسن یہاں پہچان بھی لو تو بس ہے

سینوں میں تھا محفوظ جو صدیوں کا اجالا
وہ قتل ہوا بن گیا اخبار کی سرخی

نظموں میں الفاف، منگل سوتر، پینڈولم، قفقیہ شہر، نجات وغیرہ خوبصورت تخلیقیں ہیں۔

——— بلند اعتماد

نام کتاب: 'عرش' شاعر: کشفی لکھنوی۔ قیمت: ایک روپیہ
ناشر: عرفان بک ڈپو۔ پاٹانالہ۔ لکھنؤ

کشفی لکھنوی کی آنکھیں پرنور نہ سہی دل تو روشن ہے۔ جذبات اور ایمان کے اجالے کے باوصف لکھی گئی یہ کتاب نعت مواد کے اعتبار سے منفرد اور لائق توجہ ہے انھوں نے اپنی نعتوں میں منقبت کے اشعار بھی بڑی خوبصورتی سے پیش کیے ہیں۔ امید ہے کہ یہ کتاب مذہبی حلقوں میں بیحد پسندیدہ ثابت ہوگی۔

نام کتاب: 'فصیل شب' شاعر: خاطر حافظی۔ قیمت: چھ روپیے
ملنے کا پتہ: محلہ شاہ معروف گورکھپور۔

یہ کتاب طباعت اور گٹ اپ کے اعتبار سے خوب ہے۔ ۲۶ نظموں ایک نعت اور چالیس غزلوں پر مشتمل ہے۔ حصۂ نظم میں حدیث آدم اور سپر دگہذر وغیرہ اچھی تخالیق ہیں۔ خاطر حافظی جن لوگوں سے متاثر ہیں اور جن کا ذکر انھوں نے کیا ہے وہ سب جدید گروہ سے متعلق ہیں گویا خاطر کو جدید شاعر کی حیثیت سے تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک شعر نمونتاً ملاحظہ ہو ؎

گرمی بدن کی اس کے شرابور کر گئی
تھی ایسی تیز آنچ مرا ہاتھ جل گیا

واقعی یہ کتاب لائبریری کے لائق ہے۔ (تسنیم فاروقی)

نام کتاب: شعرائے اردو کے اولین تذکرے۔
مصنف: ڈاکٹر محمد انصاراللہ قیمت: بارہ روپیے،
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ

اردو تحقیق میں ڈاکٹر انصار اللہ کا نام اب معروف ہو چلا ہے انھوں نے بڑی محنت اور عرق ریزی کے ساتھ کئی کلاسیکی کتابیں تحقیق کے بعد مرتب کی ہیں۔ اور لغت ولسانیات پر کتابیں لکھی ہیں۔ زیر نظر کتاب اردو کے آٹھ اولین تذکروں کے تعارف اور ان کے اولیت کے دعوے سے بحث کرتی ہے۔ مرتب نے ان تذکروں کے بیانات کا مختصر جائزہ لیا ہے اور بعض غلط مندرجات کی تصحیح اور اردو تذکروں کے بعض مختلف فیہ باتوں کی اوہان کا باہمی موازنہ کیا ہے اس کے ساتھ ہی تذکرہ نگاروں کے مختصر حالات بھی دے دیتے ہیں۔

لائق مصنف نے تذکروں کے تعارف کی اچھی کوشش کی ہے مگر موضوع ذرا اور تفصیل وتحقیق کا طالب ہے، اسی طرح انھیں ان اردو تذکروں کی درجہ بندی CLASSIFICATION بھی کرنا اور آخر میں اپنا قول فیصل بھی کہنا چاہیے تھا تاکہ تحقیق کرنے والوں کو مکمل رہنمائی حاصل ہوتی۔

نام کتاب: بزم ورزم فطرت (مجموعہ کلام) شاعر: ڈاکٹر عبدالمجید شمس عظیم آبادی۔ قیمت: ۱۲ روپیے۔ ملنے کا پتہ: سائنٹفک پبلشرز، مجید ولا، پٹنہ، بہار۔

ڈاکٹر شمس عظیم آبادی ان چند اردو شعرا میں ہیں جو اعلا تعلیمی لیاقت وصلاحیت کے حامل ہیں اور ان کی شاعری کی بنیاد فکر وخیال کے ساتھ حقائق پر بھی ہے، وہ فضل حق آزاد عظیم آبادی کے لائق شاگرد اور اردو کے کہنہ مشق شاعر ہیں۔ مگر گوشہ نشینی کے سبب اردو حلقہ ان سے پوری طرح متعارف نہیں، مگر ان کا کلام ماضی قریب کی اردو شاعری کے تمام طاقتور عناصر سے فیض یاب ہونے کے ساتھ جدت وندرت کا حامل ہونے کے سبب تحسین وستائش کا مستحق ہے۔ اسی لیے کتاب کے شروع میں علامہ جمیل مظہری ماہر مرحوم اور جناب عابد رضا بیدار جیسے اہل نظر نے اس مجموعے کی داد دی ہے۔ غزلوں میں روایتی انداز کے بجائے ان کے عزم محکم اور یقین پیہم کی جھلکیاں موجود ہیں اور تعمیری افکار وخیالات اپنی آب وتاب سے متاثر کرتے اور قاری کو روشنی وگرمی بخشتے ہیں، اس مجموعے کی دیگر تخلیقات میں نظمیں مثنویاں اور رباعیاں بھی ہیں۔ انھوں نے اردو مثنوی کو سائنسی حقیقت پسندی کی بڑی مستحکم بنیاد فراہم کی ہے۔ 'حیات وکائنات' ان کی ایک بڑی فکر انگیز مثنوی ہے، نظم نگاری کی بھی ان میں خاص صلاحیت ہے۔ مجموعی طور پر انسان دوستی ان کے اشعار میں روح بن کر سمائی ہوئی ہے جس سے ان کے افکار واشعار کی قدر وقیمت بڑھ جاتی ہے۔

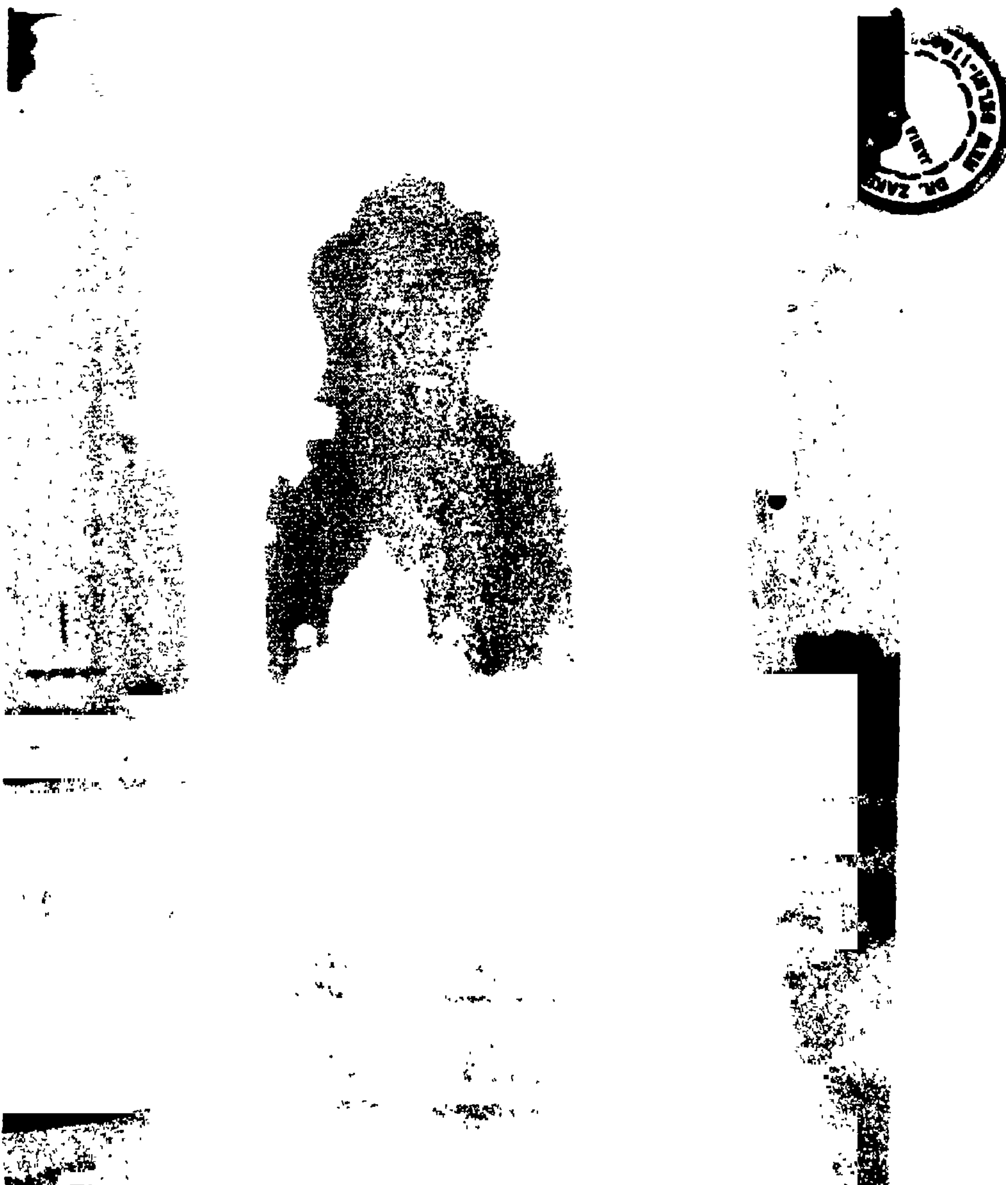
——— شمس تبریز خاں



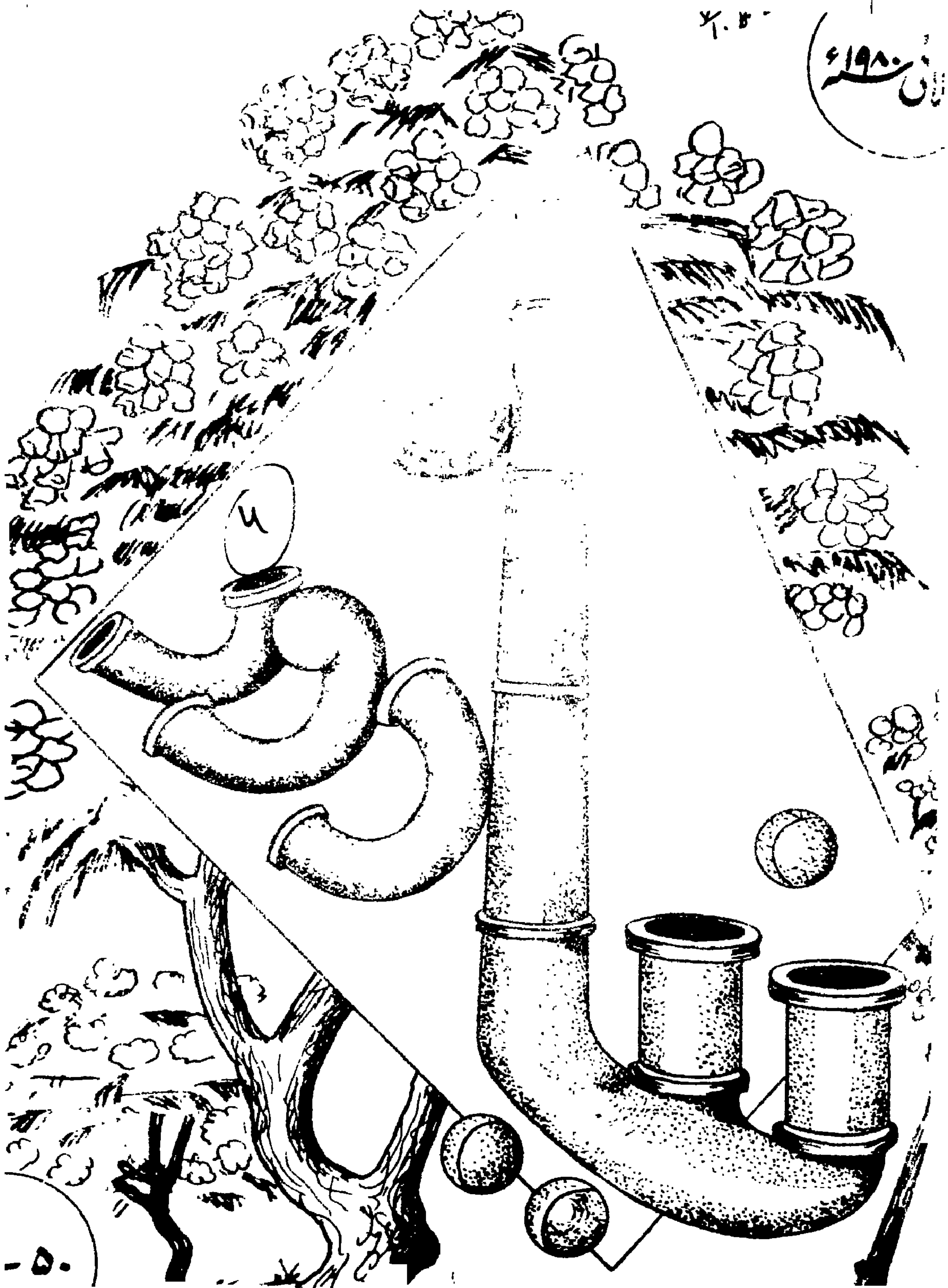
Vol. No – 3
JUNE 1980.
50 PAISE

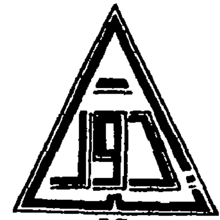
POST BOX No. 146 LUCKNOW-2260..

REGD No. LW/NP. 11
Annual Subs.
Rs. 5/-



مقبرۂ نواب سعادت علی خاں لکھنؤ


-٥٠



جلد ۳۵ نمبر ۴

جولائی سنہ ۱۹۸۰ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی



پبلشر: ہمیندر کمار

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یو پی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ۔ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پبلیکیشن بیورو انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

شری سنجے گاندھی کا ۲۳ جون کو ایک ہوائی حادثہ میں اچانک انتقال ہندوستان کے لیے ایک زبردست المیہ ہے۔ وہ نہ صرف نوجوانوں بلکہ تمام ملک کے لیے عزم وعمل اور حوصلوں کا سرچشمۂ تحریک بن گئے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ "بات کم عمل زیادہ" کی تلقین کی۔ ان کے قول و فعل میں کبھی کوئی تضاد نہیں رہا۔ خطرات اور ناموافق حالات میں بھی ان کے قدم کبھی نہیں ڈگمگائے۔ اپنے حوصلے، زبردست خود اعتمادی، سوجھ بوجھ، عزم مصمم اور جہد پیہم کے ذریعہ انھوں نے ناموافق حالات کو بھی موافق بنالیا۔ وہ فوری فیصلہ کرنے کی زبردست صلاحیت رکھتے تھے اور فیصلہ کرنے میں کسی طرح کے پس و پیش سے کام نہیں لیتے تھے۔ خطرات سے کھیلنا بھی ان کے مزاج میں داخل تھا۔

ملک کی سیاست میں انھوں نے ایک نمایاں اور ممتاز مقام حاصل کرلیا تھا اور بقول خوشونت سنگھ "وہ ایک ایسے سیاست داں تھے۔ جسے غیر معمولی کہنا مناسب ہوگا۔ کیونکہ وہ جو کچھ کہتے تھے وہی کرتے بھی تھے۔ وہ جھوٹے وعدے نہیں کرتے تھے اور ٹالنے والی خاموشی سے کام نہیں لیتے تھے۔ وہ ایک صاف گو ایماندار اور کھرے سیاست داں تھے۔ ان کی نہیں کا مطلب نہیں تھا۔ وہ نہیں کرنے کے لیے "ہوسکتا ہے" یا اسی طرح کی دوسری بات نہیں کہتے تھے۔ اسی طرح ان کی ہاں کا مطلب ہاں تھا۔ وہ صاف کہہ دیتے تھے کہ "یہ ہوگا" اور اس سلسلے میں وہ "شاید" یا "میں دیکھوں گا کہ میں کیا کرسکتا ہوں" جیسے جملے نہیں استعمال کرتے تھے۔" افسوس صد افسوس کہ ۲۳ جون کے المناک حادثہ نے ایک ایسی پرجوش سیاسی زندگی کا خاتمہ کردیا۔ جس سے ملک کو بڑی امیدیں تھیں۔

ان کی پیدائش ۱۴ دسمبر ۱۹۴۶ء کو ہوئی تھی۔ اس طرح انھوں نے کل ۳۳ برس ۶ ماہ کی عمر پائی۔ لیکن ان کی زبردست صلاحیتوں کی بنا پر انھیں کم عمری ہی میں سیاسی حکمت عملی کے ماہر کی حیثیت سے تسلیم کیا جانے لگا تھا۔ انھوں نے بڑے ڈسپلن کے ماحول میں تربیت پائی تھی۔ چنانچہ اسی ماحول کا اثر تھا جس کے سبب انھوں نے نظم وضبط کی پابندی پر ہمیشہ زور دیا اور خود بھی نظم وضبط کے اصول پر کاربند رہے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے وقت کی پابندی کا بھی ہمیشہ خیال رکھا اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے رہے۔ انھیں ملک کی ترقی سے گہری دلچسپی تھی اور وہ ترقیاتی اسکیموں میں بھی گہری دلچسپی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ انھوں نے ۱۹۷۵ء میں جو پانچ نکاتی پروگرام شروع کیا تھا، اس میں شجرکاری، گندی بستیوں کی صفائی اور جہیز کی لعنت ختم کرنے سے متعلق اہم نکات بھی شامل تھے۔ ان کا یہ پروگرام ملک کی ترقی سے ان کی گہری عملی دلچسپی کا بین ثبوت تھا۔

اپنی منفرد صلاحیتوں کی بنا پر انھیں ملک گیر مقبولیت حاصل ہوگئی تھی۔ ۲۴ جون کو دہلی میں ان کی آخری رسوم میں لوگوں نے ملک کے گوشے گوشے سے آکر شرکت کی۔ شرکت کرنے والوں کی تعداد تین لاکھ سے زائد تھی۔ جو ان کی عوامی مقبولیت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

وزیر اعلیٰ اتر پردیش شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے ۲۴ جون کو لکھنؤ میں ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ حکومت اتر پردیش شری سنجے گاندھی کی یاد تازہ رکھنے کے لیے عوامی بہبود کی کئی اسکیمیں شروع کرے گی۔ اس کے علاوہ ریاستی حکومت ان کے پانچ نکاتی پروگرام کی جانب بھی خصوصی توجہ دے گی۔ شری سنجے گاندھی کو حقیقی خراج عقیدت یہی ہوگا کہ جو کام وہ ادھورا چھوڑ گئے ہیں اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے۔ شری سنجے گاندھی کے انتقال کے المیہ پر ادارہ نیا دور زبردست رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے اپنی محبوب وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی شریمتی مینکا گاندھی اور ان کے دیگر اعزا کو دلی تعزیت پیش کرتا ہے۔

● سابق صدر جمہوریہ ہند شری وی۔ وی گری بھی ۲۴ جون کو تقریباً ۸۶ سال کی عمر میں اس دار فانی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئے۔ ان کا انتقال مدراس میں ہوا۔ وہ ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۴ء تک صدر جمہوریہ ہند کے عہدے پر فائز رہے تھے۔ صدر جمہوریہ کی حیثیت سے بھی انھوں نے عام آدمی خاص طور سے مزدوروں کی فلاح و بہبود میں ہمیشہ عملی دلچسپی لی اور اس سلسلے میں ٹھوس کام بھی کیے۔

شری وی۔ وی گری کی پیدائش ۱۰ اگست ۱۸۹۴ء کو برہام پور اڑیسہ میں ہوئی تھی۔ انھیں مہاتما گاندھی سے بڑی عقیدت تھی۔ انہی کے حکم پر شری گری نے سول نافرمانی تحریک میں حصہ لیا جس کے نتیجے میں انھیں ۵ ماہ کے لیے جیل بھیج دیا گیا تھا۔ شری گری بنیادی طور پر ابتدا ہی سے ایک مزدور لیڈر رہے۔ انھوں نے ۱۹۳۸ء میں کانگریس کی زیر اقتدار ریاستوں کے وزرائے صنعت کی کانفرنس میں آل انڈیا پلاننگ کمیشن کی بنیاد ڈالی۔ ان کا یہ اقدام ان کی دور اندیشی کا مظہر ہے۔ اس طرح ہندوستان میں منصوبہ بندی کا معمار حقیقتاً انھیں کو کہا جاسکتا ہے۔

وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے شری گری کو وزیر محنت کی حیثیت سے مرکزی کابینہ میں شامل کیا۔ لیکن ۱۹۵۴ء میں انھوں نے کابینہ سے اس لیے استعفیٰ دے دیا کہ وہ ٹریبونل سے مزدوروں کو بعض حقوق دلانے میں ناکام ہوگئے تھے۔ ۱۹۶۷ء میں وہ نائب صدر جمہوریہ ہند منتخب ہوئے۔ صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے انتقال کے بعد وہ ملک کے صدر جمہوریہ ہوئے۔ اس کے علاوہ شری گری لنکا میں ہندوستان کے ہائی کمشنر اور کیرالا، کرناٹک اور اتر پردیش کے گورنر بھی رہ چکے تھے۔ وہ جس عہدے پر بھی رہے، انھوں نے بے مثل کارکردگی اور منفرد طریقہ کار کا مظاہرہ کیا۔ ان کا ہر قول اور ہر اقدام عوام کی فلاح و ترقی کے تئیں ان کی گہری دلچسپی کا مظہر ہے۔ وہ عام آدمی کا دکھ درد سمجھتے تھے۔ عام آدمی کے مسائل سے بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ وہ تمام عمر ان مسائل کو حل کرنے، عام آدمی کی حالت بہتر بنانے، ملک سے غریبی اور بے روزگاری دور کرنے نیز استحصال کی لعنت ختم کرنے کی جدوجہد کرتے رہے۔ انھوں نے غریبوں اور محنت کش طبقوں کے لیے جو کام کیے ہیں وہ ہمیشہ ان کی یاد دلاتے رہیں گے۔ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ان کے انتقال پر اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ "انھوں نے ۶۰ سال تک مسلسل ملک کی خدمت کی۔ وہ ایک ممتاز مجاہد آزادی اور ایک عظیم مزدور لیڈر تھے۔ اپنی وزارتی ذمہ داریوں کے دوران انھوں نے غریبوں اور پسماندہ لوگوں کی زبردست خدمت کی۔ ان کی موت سے ایک عظیم شخصیت ختم ہوگئی۔" ادارہ نیا دور اس عظیم قومی نقصان پر سوگوار ہے اور شری گری کے پسماندگان سے گہری ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

—— ایڈیٹر

نازش پرتاپ گڑھی
بیگم وارڈ، پرتاپ گڑھ
یو۔پی۔

شعر ۔ شاعر

زیست کے قافلۂ گرمِ سفر کی خاطر — نغمہ و شعر و سخن ایک حدی خوانی ہے
محفلِ شعر میں کھلتے ہیں پیامات کے پھول — محفلِ شعر میں الہام کی تابانی ہے
محفلِ شعر میں پاتا ہے سکون و راحت — دل، جو آماجگہ درد و پریشانی ہے
شعر ہوتا ہے مداوائے ہر اک زخمِ جگر — نغمہ و شعر علاجِ غمِ پنہانی ہے
زندگی حسنِ حقیقی کے لیے گرداں ہے — شعر اسی جستجوئے عشق کی جولانی ہے
قلبِ انساں کو جو تفویض کرے ذوقِ حیات — شعر اسی آرزو و شوق کی ارزانی ہے
شعر ادراکِ حقیقت کا ہے اعلانِ جلی — شعر تخئیل کا اظہارِ پرافشانی ہے
شعر ہے فکر و نظر کا متشکل ہونا — شعر جذبات کی الفاظ بدامانی ہے
شعر ہے تجربۂ عمرِ گریزاں کا نچوڑ — شعر صد جلوہ گہِ عالمِ عرفانی ہے
شعر مجموعۂ آیاتِ کتابِ ہستی — شعر ہی ماحصلِ حکمتِ انسانی ہے
جس کو اک مرحمتِ خاصِ مشیت کہیے — شعر اسی شمعِ بصیرت کی درخشانی ہے
شعر پیغام ہے وقت اور زمانہ سے بلند — شعر اک درس، جو آفاقی و لافانی ہے
نہ کسی قوم کا پابند نہ محدودِ وطن — شعر اک مشترکہ دولتِ انسانی ہے
منسلک کفر سے ہوتا ہے نہ ایمان کے ساتھ — شعر خود اپنی جگہ پرتوِ ایمانی ہے
شاعر اک شمعِ فروزاں پئے محرابِ حیات — شاعری آئینۂ قوتِ روحانی ہے

ملہمِ غیب ہوا کرتا ہے نطقِ شاعر
شاعری عرش سے اک سلسلہ جنبانی ہے

ڈاکٹر محمد رضوان اللہ علوی
شعبۂ عربی، لکھنؤ یونیورسٹی
لکھنؤ

عباسی خلافت اور نوروز و مہرجان

عباسیوں نے کوئی سوا پانچ سو برس خلافت کی ہے۔ سنہ ۱۳۲ھ (۷۵۰ء) میں سب سے پہلا عباسی خلیفہ ابو العباس سفاح تخت پر متمکن ہوا اور سنہ ۶۵۶ھ (۱۲۵۸ء) میں تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد میں عباسیوں کا تخت خلافت الٹا گیا۔ مورخ فخری کا قول ہے کہ عباسیوں کی خلافت دنیا کی عظیم الشان سلطنتوں میں سے تھی۔ عام لوگ ان کے طمطراق یا اپنی اغراض کی وجہ سے ان کی اطاعت پر مجبور تھے۔ انتہائے عروج اور اپنے دور زریں میں خلافت عباسیہ کی شان و شوکت، جاہ و جلال اور تہذیبی ترقی کا اندازہ ان کی معاشرتی زندگی کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ پانچ سو سال سے زیادہ عرصہ پر محیط یہ سلطنت مختلف النوع محاسن و مکارم کی حامل تھی۔ اس دور میں علوم و فنون کی ترویج و اشاعت کے جو کام ہوئے وہ اسلامی تاریخ کے زریں ابواب ہیں۔ دین کا شغف و شعور بکمال و تمام پورے معاشرہ میں تھا۔ خوش حالی اور فارغ البالی عام تھی۔ سماجی ڈھانچے میں کوئی بے اعتدالی نہ تھی۔ بغداد کی خلافت جسے سفاح اور منصور نے قائم کیا تھا تیسرے خلیفہ مہدی سے لے کر نویں خلیفہ واثق کے دور تک پورے شباب پر رہی۔ ہارون الرشید اور اس کے بیٹے مامون کے عہد خلافت میں عروج کمال پر تھی۔ یہی وہ دو نامی گرامی خلیفہ ہیں جن کی بدولت عباسی حکومت آج عہد سیمیں کہلاتی ہے اور اپنے وقت میں منارۂ نور کی حیثیت رکھتی تھی۔ لیکن آخری دور میں پورے قلمروئے خلافت میں جبر و استبداد پھیل گیا تھا اور اس کی مرکزیت اور اس کے نظم و نسق کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ خاندان کے سینتیسویں جانشین مستعصم کے وقت سنہ ۶۵۶ھ میں وہ فنا کے گھاٹ اتر گئی۔ اس ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ عباسیوں نے اپنی خلافت عجمیوں خاص کر ایرانیوں کے تعاون سے قائم کی تھی چنانچہ ساسانی کسرویت کے قالب میں ڈھل جانے پر وہ مجبور تھی۔ آہستہ آہستہ ایرانی القاب، ایرانی بیویاں، ایرانی شاہد و شراب، ایرانی فنون لطیفہ، ایرانی تہوار جیسے نوروز، مہرجان اور رام روز حتی کہ ایرانی افکار و اسلوب نگارش جب خلافت پر چھا گئے تو عوام بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ غرضیکہ ایرانی اثرات عباسیوں کے دور زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی تھے۔ بغداد میں ایرانی جشنوں سے دلچسپی بہت بڑھ گئی تھی اور اس سلسلہ میں عظیم الشان اجتماعات منعقد کیے جاتے تھے۔

اس کے ساتھ ہی اسلامی خوشی کے دن یعنی عیدین کا اہتمام بھی مذہبی سے زیادہ ظاہری نمود و نمائش پر مبنی تھا۔ دستور کے مطابق خلفاء امامت کے فرائض انجام دیتے اور مسائل حاضرہ کو قرآن و حدیث کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ محی الدین مراکشی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب حضارۃ الاسلام فی دارالسلام میں عیدین کے جشن اور اس کے پر شکوہ مظاہر کا تذکرہ بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ

"بغداد، بیت المقدس، دمشق، خراسان اور کوفہ و بصرہ میں مظاہر سے زیادہ نمایاں تھے۔ دنیا کے گوشے گوشے سے پیروان اسلام مکہ معظمہ میں حج کے لیے جمع ہوتے تھے۔ مسجد حرام میں سات ذی الحجہ کو ظہر کی نماز کے بعد امام مسجد ان کے سامنے ایک بلند پایہ خطبہ دیتا تھا جس میں حج کی اہمیت

اور حج کے مناسک کی صراحت ہوتی تھی۔ بلادِ اسلامیہ کے جن شہروں میں اسلامی حمیت اور دینی بیداری تھی ان میں عید الفطر اور عید الضحیٰ کے اجتماعات اپنی چمک دمک اور رونق کے اعتبار سے قابلِ دید ہوتے تھے جیسے طرطوس میں جہاں مسلمان مجاہدین اسلام کے نام پر مرمٹنے کے لیے اسلامی ممالک کے گوشہ گوشہ سے اکٹھا ہوتے تھے۔ ان کے لیے فیاض مسلمان جو خود جہاد فی سبیل اللہ استطاعت نہیں رکھتے تھے بے شمار تحفے اور انعامات بھیجتے تھے۔ دسویں صدی عیسوی کا مشہور جہاں گشت ابن حوقل اپنی تصنیف المسالک والممالک میں بیان کرتا ہے کہ

"سجستان اور کرمان کی سرحد سے لے کر مصر اور مغرب تک صرف طرطوس کے مسلمان باشندوں کو یہ فخر و امتیاز حاصل تھا کہ انھوں نے ایک وسیع مکان بلادِ اسلامیہ کے چپہ چپہ سے آنے والے مجاہدوں کے لیے بنوایا تھا اور ان کے کھانے پینے کا انتظام بھی اپنے ذمہ لیا تھا اور جو تحائف موصول ہوتے وہ ان مجاہدین کو بطور عطیہ حوالے کیے جاتے۔ طرطوس میں اسلامی شعائر کی نمائش پورے تزک و احتشام سے ہوتی تھی۔

بڑے بڑے شہر خاص کر بغداد عید کی شب میں روشنی سے جگمگا اٹھتے تھے اور تکبیر و تہلیل کی آوازیں گونجا کرتی تھیں۔ نہروں میں رنگ برنگ کی کشتیاں تیرتی رہتی تھیں اور ان پر شمعیں اور قندیلیں روشن ہوتی تھیں۔ خلیفہ کا محل زیبائش کے اعلیٰ معیار کو چھو رہا ہوتا تھا جو ناظرین کو دعوتِ نظارہ دیتا تھا۔ عامۃ الناس سیاہ رنگ کی عبا پہنتے تھے جو عباسیوں کا قومی نشان تھا۔ مرا کشی نے لکھا ہے کہ کچھ لوگ عمامہ کے بجائے نرکل اور کاغذ کی بنی ہوئی سیاہ اونچی دیوار کی ٹوپیاں اور لمبی لمبی صدریاں بھی پہنتے تھے جن پر یہ آیت نوشتہ ہوتی تھی

"فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ"

(اللہ تمہارے لیے ان کے مقابلہ میں کافی ہے اور وہ سننے اور جاننے والا ہے)

نوروز

مراکشی کا بیان ہے کہ نوروز ایرانیوں کا قدیم تہوار تھا جو نئے سال کے موقعہ پر بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ یہ ان کے سال کا پہلا دن ہوتا اور موسمِ ربیع کے آغاز میں پڑتا تھا جب سورج برجِ حمل میں داخل ہوتا تھا۔ خراسان کے حکمرانوں نے نوروز سے ایک نئے رواج کی طرح ڈالی کہ اس دن سے ان کی فوج موسمِ گرما کا لباس پہنتی تھی اور سپاہی اسی لباس میں نوروز کے جشن میں شرکت کرتے تھے۔ تاریخ کے اوراق نشان دہی کرتے ہیں کہ جس شخص کو سب سے پہلے اسے موسمی دن قرار دینے کا خیال پیدا ہوا وہ جمشید تھا اور جمشید نامور اہلِ قلم ایڈورڈ براؤن کی علمی تحقیق کی روشنی میں حضرت سلیمان بن داؤد تھے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے جب ایران کو فتح کیا تو خلیفہ کے حکم سے نوروز کے جشن کو فارس کے طول و عرض میں بند کرا دیا۔ جس کا سبب بظاہر اس کے سوا اور کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ اس طرح کے جشنوں سے جاہلی رسم و رواج اور عادات کو مزید پھلنے پھولنے کا موقع ملے گا لیکن عہدِ عباسی میں یہ تہوار پھر سے منایا جانے لگا۔

بیان کیا گیا ہے کہ نوروز کی روایات نے کسانوں کو بڑی الجھن میں گرفتار کر رکھا تھا کیونکہ نوروز سے نیا مالی سال شروع ہوتا تھا اور اس وقت تک کھیتیاں کھڑی ہوتی تھیں اور کٹائی شروع نہ ہوتی تھی۔ لیکن کسانوں کو اس تاریخ پر مال گزاری ادا نہ کرنے کی صورت میں طرح طرح کے مصائب کا شکار ہونا پڑتا تھا۔ عدمِ ادائیگی کی صورت میں مال گزاری کی رقم اکثر دوگنی کر دی جاتی تھی جو کسی کاشتکار کے لیے بلائے بے درماں سے کم نہ تھا۔

ابن خلدون نے نوروز کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ہشام بن عبد الملک کے دور ۱۰۵ھ سے ۱۲۶ھ (۷۲۴ـ۷۴۳ء) میں کاشتکار ایک وفد لے کر اموی عامل خالد بن عبد اللہ قسری کے حضور میں حاضر ہوئے اور اس سے اپنے مصائب بیان کیے جو نوروز کے موقعہ پر مال گزاری ادا کرنے میں پیش آتے تھے۔ اس وفد نے خالد سے پرزور مطالبہ کیا تھا کہ نوروز کو ایک مہینہ آگے بڑھا دیا جائے لیکن اس نے ایسا کرنے سے اپنی معذوری ظاہر کر دی۔ ابو ریحان بیرونی نے الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ

میں لکھا ہے کہ ہارون الرشید کے عہد تک حالات جوں کے توں تھے اور مال گذاری نوروز ہی کے موقعہ پر وصول کی جاتی رہی ۔ کسان پھر ایک بار وفد کی صورت میں یحییٰ بن خالد برمکی کی خدمت میں پیش ہوئے اور اپنی دشواریاں بیان کیں اور نوروز کو تقریباً دو ماہ آگے بڑھانے کا مطالبہ کیا۔ یحییٰ نے ان کی مجبوریوں کے پیش نظر ان کی درخواست مان لینے پر آمادگی ظاہر کی ہی تھی کہ اس کے مخالفوں نے سن گن پالی۔ اسے متعصب مجوسی کہنے لگے اور اس پر الزام لگایا کہ اب تک جو ہوتا آیا ہے اسے یکسر بدلنا چاہتا ہے ۔ چنانچہ اس مخالفت کے باعث وہ باز رہا اور وہی دستور بجنسہ باقی رہا ۔

نوروز کی وجہ تسمیہ کے بارے میں بھی کئی متضاد بیانات تاریخ نویسوں نے دیے ہیں۔ بیرونی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ حضرت سلیمان بن داؤد کی انگوٹھی کہیں گم ہو گئی جس کی وجہ سے سلطنت ان کے ہاتھ سے جاتی رہی ۔ چالیس روز کی جدوجہد اور صبر آزمائی کے بعد انگوٹھی ملی اور حکومت بھی ہاتھ آئی۔ اس موقعہ پر والیانِ ریاست انھیں مبارکباد دینے آئے، پرندوں نے اپنے پر پھیلا کر ان پر سایہ کیا۔ اسی دن ایرانیوں نے جھوم جھوم کر رقص کیا اور موسمی گیت گا کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ "نوروز آمد" کہہ کر انھوں نے جشن منائے، بس اسی دن سے اس کا نام نوروز پڑ گیا۔ اسی دن حضرت سلیمان نے ہوا کو حکم دیا کہ وہ اپنے دوش پر انھیں اٹھا کر چلے۔ راستہ میں ایک ابابیل نے ان کی سواری دیکھ کر درخواست کی کہ "اے ظل سبحانی! ذرا بچ کر نکلئے آشیانے میں میرے انڈے ہیں کہیں ٹوٹ نہ جائیں"۔ یہ سن کر حضرت سلیمان گھونسلے سے بچ کر نکل گئے۔ جب وہ زمین پر اترے تو وہی ابابیل ازراہِ تشکر اپنی چونچ میں پانی کے چند قطرے بھر کر لائی اور ان کے سامنے چھڑک دیا اور ٹڈی کی ایک ٹانگ تحفۃً نذر کی۔ یہی وجہ ہے کہ نوروز میں گھروں پر پانی کا چھڑکاؤ ہوتا ہے اور دوست احباب اور اعزا واقربا ایک دوسرے کو ہدیے پیش کرتے ہیں ۔

برہان قاطع نے نوروز کو ماہ فروردین اکیس مارچ کا دن بتایا ہے اور لکھا ہے کہ جس دن آفتاب برج حمل کے نقطہ اول میں داخل ہوتا ہے اور فصل بہار کا آغاز ہوتا ہے وہی یوم نوروز ہے۔ صاحب تاریخ عجم کا بیان ہے کہ اہل فارس کے عقائد کے مطابق نوروز نہایت مقدس اور محترم دن ہے کیونکہ خداوند کریم نے حضرت آدم اور دنیا کی اسی دن تخلیق کی اور سبعہ سیارہ کو گردش کرنے کا حکم دیا۔ برہان قاطع اور تاریخ عجم میں نوروز کی وجہ تسمیہ بھی بیان کی گئی ہے۔ لیکن فرہنگ انجمن آرا نے ان سب سے اختلاف کیا ہے۔ اس میں مذکور ہے کہ جب جمشید نے مقام اصطخر میں تخت جمشید بنایا اور دن نکلنے سے ذرا پہلے تخت پر جلوہ افروز ہو کر مشرق کا نظارہ کیا تو سورج کی کرن جب تخت و تاج پر پڑی اور جواہرات کی جگمگاہٹ سے لوگوں کی آنکھیں چکا چوند ہونے لگیں تو انھوں نے خوشی و انبساط سے سرشار ہو کر نعرہ بلند کیا اور اس رنگین صبح کا نام نوروز رکھا۔ اسی دن جشن منایا گیا۔ دربار شاہی میں ہر شخص کو حاضر ہونے کی دعوت دی گئی۔ قیدیوں کی رہائی اور حاجت مندوں کی حاجت روائی کے احکام صادر کیے گئے۔ پروفیسر فلو دل نے ہسٹری آف دی ایسٹ میں چند اہل نجوم کے اقوال بڑی کدوکاوش کے بعد نقل کیے ہیں۔ ان کی رائے میں نوروز کی دو قسمیں تھیں ایک کا نام نوروز عامہ اور دوسرے کا نوروز خاصہ بتایا ہے۔ چنانچہ جو دن تحویل آفتاب کا برج حمل میں ہے اس کا نام نوروز عامہ رکھا کہ اس سے زیادہ نیک ساعت کوئی دوسری نہیں اور ماہ فروری کی چھٹی تاریخ تاریخ کا نام نوروز خاصہ پڑ گیا کیونکہ اسی دن جمشید پیشدادی نے تخت پر دوبارہ اپنا تسلط قائم کیا اور ایک جشن عام منعقد کیا۔ نہا دھو کر عبادت کی اور خاص رسم و رواج کا اجرا کیا ۔

ایران کا کسریٰ خاندان جب سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے اہل فارس کے سبھی رسم و رواج خاص کر نوروز کو بڑی اہمیت دی۔ صاحب تاریخ عجم کا بیان ہے کہ خاندان کسریٰ کے شہنشاہوں کا یہ معمول تھا کہ وہ نوروز کے پانچ دنوں میں پہلے

دن نو ر بار عام کرتے جس میں رعایا کو انعام و اکرام سے نوازتے تھے۔ دوسرے دن عالی مرتب ہستیوں کو اپنے حضور میں آنے کا موقع دیتے جو بقول البیرونی اس زمانہ میں دہقانی زمیندار تھے۔ تیسرے دن ملک کے سورماؤں اور مجوسی پیشواؤں کو شرف ملاقات بخشتے تھے۔ چوتھے دن اپنے اعزہ و اقربا اور خاص خاص لوگوں کو باریابی کا موقع دیتے تھے اور پانچواں دن اپنے گھر والوں کنیزوں اور غلاموں کے ساتھ بتاتے تھے اور ان میں سے ہر ایک کو اس کے مرتبے کے پیش نظر تحفے عطا کرتے تھے اور چھٹا دن فرائض سے سبکدوشی کا دن ہوتا، محل میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ گزارتے۔ اس دن وہ صرف انھیں لوگوں کو شرف حضوری بخشتے جن سے وہ بے حد بے تکلف ہوتے اور تنہائی میں ان کے ساتھ ہنسنا بولنا پسند کرتے تھے۔ اس دن وہ تحائف وغیرہ پیش کرنے کا حکم دیتے تھے جو نوروز کے موقع پر اعیان ریاست اور اعزہ ان کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔ وہ ان کا جائزہ لیتے، کچھ لوگوں میں بانٹ دیتے اور کچھ ہدیے خزانے میں بھیج دیتے تھے۔ چھ روز کا مسلسل جشن اسی طرح ختم ہوتا تھا اور اسی کے ساتھ تمام عیش و عشرت کا بھی خاتمہ ہو جاتا تھا۔ ہر قسم کی حاجت روائی انھیں ایام پر موقوف ہوا کرتی تھی۔

نوروز صرف انھیں خصوصیات کا حامل نہ تھا بلکہ اس دن اہل فارس اپنے احباب کو تحفے میں شکر اور پہننے کے جوڑے بھی پیش کیا کرتے تھے۔ بیرونی کی اطلاع کے مطابق گنے کی دریافت اور اس کا استعمال جمشید ہی کے عہد سے ہوا۔ واقعہ یوں ہے کہ جمشید نے ایک روز ایک پودا دیکھا اس میں سے تھوڑا سا رس نکال کر چکھا جو اسے بہت مزیدار معلوم ہوا اور اس سے شکر بنوائی۔ اسی لیے ایرانی نوروز کے پانچویں دن شکر تبرک کے طور پر ایک دوسرے کے یہاں بھیجتے ہیں۔ تاریخ عجم کے بیان کے مطابق شاہ خراسان نوروز کے موقع پر اپنے وزرا اور سلطنت کے دوسرے اراکین کو نوروز کی تقریب کے موقع پر موسم گرما کی خلعت مرحمت کرتے اور ایک دوسرے پر پانی کے چھینٹے ڈالتے۔ یہ عمل ان کے نزدیک متبرک سمجھا جاتا تھا اور وہ اسے دافع امراض بھی خیال کرتے تھے۔ عجب نہیں کہ رنگ پھینکنے کی رسم یہیں سے چلی ہو۔

مہرجان

قاضی احمد بن محمد دہستانی نے نگارستان میں اور شاہزادہ فرہاد مرزا نے تاریخ جام جم میں مہرجان کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی ہے کہ مہرجان (مہرگان) اکتوبر کی سولھویں تاریخ کا نام ہے۔ یہی وہ تاریخ ہے جب آفتاب برج میزان میں قدم رکھتا ہے اور خزاں کی جگہ موسم بہار آجاتا ہے۔ اس کی بھی نوروز کی طرح دو قسمیں ہیں۔ ابتدائی تاریخ سولہ اور آخری اکیس ہے۔ ایرانی اس دن کو اپنی سب سے بڑی عید اس لیے خیال کرتے ہیں اور اسے دوسرے دنوں پر فضیلت دیتے ہیں کہ خداوند نے اسی دن زمین کی تخلیق کی تھی جس کے نتیجے میں تمام ارواح اپنے اپنے قالب میں آئیں۔ تاریخ الاسلامی السیاسی کے مصنف کا کہنا ہے کہ شاہان کسریٰ اور خلفائے بنی عباس جس اہتمام سے نوروز مناتے تھے اسی شان و شوکت سے سال کے آخر میں مہرجان کی تقریب بھی منایا کرتے تھے۔ مہرجان کو ماہ مہر اور روز مہر بھی کہتے ہیں جس کے معنی ہیں روح کی محبت۔ قاضی احمد دہستانی نے نگارستان میں حضرت سلمان فارسیؓ کا ایک بیان نقل کیا ہے کہ ایرانیوں کی حکومت میں ہم یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ خدا نے اپنے بندوں کو یاقوت کا سرخ نوروز کے دن اور زبرجد کا مہرجان کے دن دیا تھا۔ اسی لیے اہل ایران نے ان دونوں دنوں کو سال کے باقی ایام پر فوقیت دی تھی جس طرح یاقوت اور زبرجد کو تمام ہیرے جواہرات پر فوقیت حاصل ہے۔

ایرانی اپنے اس اعتقاد کا بڑا پرچار کرتے تھے کہ مہرجان کائنات کے خاتمہ کی دلیل ہے اور نوروز دنیا کی ابتدا کی نشانی ہے۔ تاریخ جام جم میں لکھا ہے کہ اہل فارس مہرجان کی تقدیس اس لیے بھی کرتے تھے کہ اسی دن یزداں نے اپنے فرشتوں کے ذریعہ کاوہ آہنگر کی اعانت کی تھی جس نے ضحاک پر فتح پائی۔ اور

بقول صاحب تاریخ عجم جو تقریب اس یاد میں منائی گئی وہ "قومی مہر و محبت کا دیباچہ" تھی۔ بیرونی نے تاریخ جام جم سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کاوہ آہنگر نہیں بلکہ فریدوں نے اس دن ضحاک پر نصرت پائی تھی۔ ایرانیوں کا اعتقاد تھا کہ اس دن فرشتوں نے آسمان سے اتر کر فریدوں کی مدد کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان تقریبات میں شہنشاہ ایران ہیرے جواہرات سے مرصع تاج پہنتے تھے جس کے اوپر سورج کا چتر بنا ہوتا تھا۔ شاہان عجم نے مہرجان کے دن ایک بہت بڑا بازار لگانے کا دستور قائم کیا تھا اور منادی کرا دی تھی کہ اگر کوئی شخص کسی فریادی کے لیے حاضری دربار کے امر میں حائل ہوا تو اس کی سزا قتل ہوگی۔ بیرونی کے بیان کے مطابق اس زمانہ میں یہ رسم تھی کہ صبح تڑکے ایک نامی گرامی سورما گھر کے آنگن میں تلوار سے مسلح ہو کر گونجتی ہوئی آواز میں کہتا تھا "اے فرشتو! اس دنیائے آب و گل میں اترو اور شیطانوں اور شر پسندوں کا قلع قمع کرو اور دنیا کو ان کے منحوس وجود سے پاک کرو"

مہرجان کے تہوار پر بھی نوروز کی طرح تحفے تحائف دیئے جاتے جس میں شکر جزو خاص ہوتی تھی۔ اسی موقعہ پر بادشاہ شجاعان مملکت کو ان کی مردانگی اور جرأت پر موسم سرما کا لباس عطا کرتے تھے اور اس معمول میں آخر تک کوئی فرق نہ آیا۔ ان دونوں تہواروں پر جاحظ کا بیان ہے کہ شہنشاہ دربار عام میں چھوٹے بڑے، عالم و جاہل اور شریف و رذیل ہر شخص کو شرف باریابی بخشتے تھے۔

رام روز

سرکاری سطح پر منایا جانے والا ایک تہوار رام روز بھی تھا جو مہرجان کے پانچویں دن پڑتا تھا اور اسے بھی مقدس سمجھا جاتا تھا۔ اسے مہرجان عظیم بھی کہتے تھے۔ جس دن فریدوں نے ضحاک کو شکست فاش دی یہ اسی روز کی یادگار تھی۔ ضحاک کی شکست سے لوگوں میں مسرت و شادمانی کے بے پایاں جذبات ابھر آئے تھے اس لیے یہ ایک قومی عید قرار دی گئی۔ مہرجان اکتوبر کی سولہ کو اور رام روز اکیس تاریخ کو پڑتا تھا۔ تاریخ عجم میں ہے کہ زردشت نے حکم دیا تھا کہ مہرجان و رام روز لائق تعظیم و تکریم ہیں اس لیے ان کے اہتمام میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جائے۔ ہرمزبن شاپور جب تخت سلطنت پر متمکن ہوا تو اس نے سولہ اور اکیس کے درمیانی دن بھی رام روز کے دن قرار دیے۔ پھر آگے چل کر دوسرے جانشینوں نے اکیس سے لے کر تیس تاریخ تک سب کو عوام کے لیے یوم عید قرار دیا۔

عباسی خلفاء کا ایرانیوں کی طرف رجحان خاندان بنی امیہ کی بیرونی سیاست کے ردعمل کے طور پر تھا۔ عباسیوں نے اپنی پوری حکومت کا ڈھانچہ ایرانی طرز پر کھڑا کیا تھا۔ لباس، کھانے پینے اور نشست و برخاست کے آداب تک میں ان کی نقل کی جانے لگی تھی۔ شعر و ادب میں تصنع اور پر تکلف عبارت آرائی عجم ہی کا فیض ہے۔ معاشرتی اور سیاسی ہر میدان میں عباسی حکومت ایران سے اس درجہ متاثر تھی کہ اس نے اپنی اصلیت اور اس جوہر کو کھو دیا تھا جو اسے صحرا و بیابان سے ورثہ میں ملا تھا۔



ساغر اعظمی
بارہ بنکی - ۲۲۵۰۰۱

جاوید دانش
شعبۂ اردو ذاکر حسین کالج
اجمیری گیٹ - دہلی
۱۱۰۰۰۶

غزلیں

کر گیا ہے مجھے پھر میرے حوالے کوئی
میں امانت تری کیوں مجھکو سنبھالے کوئی

اپنے دامن میں لیے تیرگی گھر لوٹ آیا
آج پھر بانٹنے نکلا تھا اجالے کوئی

روشنی پاکے سبھی دیکھ رہے ہیں خود کو
دیکھتا کیسے مرے پاؤں کے چھالے کوئی

میں نے آئینے بنائے ہیں تری یادوں کے
ڈر رہا ہوں کہ کہیں توڑ نہ ڈالے کوئی

یوں تو مجھ پر نہ کسی کو کبھی ترس آئے گا
ڈوبنے جاؤں تو ممکن ہے بچالے کوئی

جانے کیا بات کہ جب شعر ہمارے سن لے
آنسوؤں کی طرح پلکوں پہ سجالے کوئی

اک نہ اک روز صداؤں کے دیے بجھنا ہیں
اور کچھ دن کے لیے شور مچالے کوئی

ٹھوکروں میں ابھی پتھر کی طرح ہوں ساغر
کبھی شاید مجھے رستے سے ہٹالے کوئی

تم جو حسن کی بات کرتے ہو! وہ بھی اک پردہ ہے میاں
زلف و لب و رخسار سے آگے، اور بھی اک دنیا ہے میاں
کعبے میں کیا ڈھونڈ رہے ہو؟ کاشی میں کیا کھوجو ہو
سب کچھ اپنے ہی اندر ہے، باہر کیا رکھا ہے میاں!
کون ہو تم؟ یہ تو پہچانو! سمجھو کچھ! میری مانو!
اپنی انا کا راز بھی جانو! آگے نام خدا ہے میاں!
شہر ڈھنڈورا، بغل میں چھورا، خوب تماشا کرتے ہو
تل کی اوٹ پہاڑ چھپا ہے، تم نے کبھی دیکھا ہے میاں
یہ میرا، یہ تیرا کیا؟ کیسی تو تو میں میں ہے
ریت سے کس کی پیاس بجھی ہے، دریا تک پیاسا ہی میاں
یہ دنیا سپنے کی مایا، آنکھ کھلے تو کچھ بھی نہیں
سائے کے پیچھے مت بھاگو! سایہ پھر سایہ ہے میاں
رمتا جوگی، بہتا پانی، آج یہاں، کل جانے کہاں؟
بستی بستی، نگری نگری، جوگی کا پھیرا ہے میاں!

کاظم علی خاں
۲۰۱۔ وکٹوریہ اسٹریٹ
لکھنؤ

غالب کے بعض غیر معروف ادبی آثار

زیر نظر مضمون جن نصف درجن سے زائد متفرق ادب پاروں پر مشتمل ہے وہ مرزا غالب کے غیر معروف ادبی آثار کی حیثیت رکھتے ہیں اور سطور ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱)

شاگردِ غالب، شاہ باقر آروی[1] کے متعلق یہ روایت ہے کہ ایک بار کسی نے باقر کے سامنے مندرجہ ذیل شعر کو غالب سے منسوب کر کے پڑھا ؎

مجلسِ واعظ تو تا دیر رہے گی غالب
یاں سے میخانہ ہے پی کر کے ابھی آتے ہیں[2]

باقر کو شک ہوا کہ یہ شعر غالب کا کلام نہیں ہے چنانچہ انھوں نے استاد کو خط لکھ کر حقیقت دریافت کی۔ اس کے جواب میں غالب نے باقر کو جو خط لکھا اب اس کا محض ایک اقتباس ہی باقی بچا ہے جسے باقیاتِ غالب کی حیثیت حاصل ہے۔ مکتوبِ غالب بنام باقر کا یہ تراشہ ذیل میں ملاحظہ ہو:

"اگر یہ شعر میرا ہو تو مجھ پر ایک ہزار لعنت، ورنہ
جس نے اس کو بہ غلط میری جانب منسوب کیا ہے اس
پر دس ہزار لعنت! مجھے کیا شامت آئی تھی کہ پاس
ہی میخانہ ہوتے ہوئے مجلسِ وعظ میں جا کر بیٹھتا۔"[3]

مکتوبِ غالب بنام باقر کا منقولہ بالا اقتباس قاضی عبدالودود نے بھی اپنے ایک مضمون میں پیش کیا ہے [معاصر پٹنہ حصہ ۲ صفحہ ۲]۔ مجھے تلاش کے باوجود غالب کے کسی مجموعۂ مکاتیب میں یہ خط شامل نہیں مل سکا ہے۔

(۲)

حکیم ظہیر الدین احمد خاں کی جانب سے ان کے چچا نجم الدین حیدر کے نام عودِ ہندی[4] اور اردوئے معلی[5] میں غالب کا ایک اردو خط شامل ہے۔ اس خط کا مسودہ غالب نے ظہیر الدین کو ایک مختصر سے رقعے کے ہمراہ ارسال کیا تھا۔ حکیم ظہیر الدین کے نام غالب کا وہ مختصر اردو رقعہ یہ ہے:

"لو میاں ظہیر الدین! ہم نے مسودہ کر کر بھیج دیا ہے
تم اس کو اپنے ابا سے پڑھ لو اور اس کی نقل کر کر
اپنے چچا جان کو بھیج دو۔ غالب ۱۲"[6]

حکیم ظہیر الدین کے نام غالب کا یہ مختصر مکتوب ابھی تک غالب کے کسی مجموعۂ خطوط میں شامل نہیں ہوا ہے۔ اسے بھی غالب کے غیر معروف ادبی آثار میں جگہ دی جائے گی۔

(۳)

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے اپنے مضمون مطبوعہ نیا دور لکھنؤ شمارہ بابت ۲۶ جنوری ۱۹۷۴ء (ص ص ۵/۱۲) میں سید احمد حسین میکش کے نام غالب کے ایک فارسی خط کو غیر مطبوعہ قرار دیا ہے اور اس خط کا محض ایک اقتباس شائع فرمایا ہے۔ میری اطلاع کے مطابق میکش کے نام غالب کا متذکرۂ بالا فارسی خط نیا دور لکھنؤ بابت ۱۵ جنوری ۱۹۷۴ء سے قبل باغِ دو در، لاہور طبع ۱۹۰۰ء (متن ص ص ۱۸۲ تا ۱۸۴) میں شائع ہو چکا ہے۔ اور

کتاب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ میکش کے نام غالب کے اس فارسی خط کا اُردو مفہوم سطورِ ذیل میں ملاحظہ ہو:

"میری جانِ سعادت نشان، خط لکھنے کے لیے الفاظ و معنی ابھی دیدہ و دل میں تھے کہ دوسرا خط ملا اس سے پہلے کے خط میں تم نے جو یہ لکھا تھا کہ جب تک میں دوسرا خط نہ لکھوں جواب نہ لکھا جائے تو اب جواب لکھنے کی اجازت ملنے پر [خط] لکھ رہا ہوں۔

مخفی نہ رہے کہ 'حرون' لفظ عربی ہے اور اِس کا اِملا حائے حطی سے ہے۔ اگر قصیدے میں ہائے ہوز سے لکھا گیا ہے تو قصور کاتب کا ہے، نہ کہ میرا۔ یہ لفظ ضرور صحیح کر دیں۔ لعب عین کے کسرہ کے ساتھ بھی جائز ہے اور عین کے سکون سے بھی (روا ہے)......

تمہارا مشفق قطب الدولہ بہادر کے زیرِ سایہ فرکش ہونا تم کو بھی مبارک ہو اور مجھ کو بھی۔ اِس جواں مرد صاحبِ دل سے ہرگز دور نہ رہیں! دولت کی تلاش اِسی دروازے پر کریں۔ جو اتنی غم خواری کر رہا ہے وہ تم کو ناکامی کے حوالے نہ کرے گا۔

میر مہدی [مجروح] کے نام کا خط میر مہدی کو اور میر امام الدین کے نام کا خط میر امام الدین کو پہنچا دیا گیا۔ میں آج یہ خط تمہارے نام لکھ کر رکھ چھوڑتا ہوں اگر ان دونوں کے خط بھی آ گئے تو اِس خط کے ساتھ رکھ کر تم کو بھیج دوں گا، ورنہ کل صرف اپنا خط ڈاک سے روانہ کر دوں گا۔

شاہِ اودھ [واجد علی شاہ] کے بارے میں ناخوشگوار خبریں آ رہی تھیں۔ خدا تم کو ہمیشہ سلامت رکھے تم نے [خط لکھ کر] میرے دل کو سکون بخشا۔ تم نے بیماری کا دفع ہونا اور غسلِ صحت کا اِن شاء اللہ بروزِ پنج شنبہ انجام پانا لکھا، لیکن وہ بات نہ لکھی جس سے دل کو تقویت ہوتی اور امید بندھتی۔ جشنِ غسلِ صحت قصیدۂ مدحیہ گزرانے کے لیے پاکیزہ تقریب ہے۔ کتنا اچھا ہو کہ یہ خط جو میں آج لکھ رہا ہوں اور کل بھیجا جائے گا ابھی تم کو نہ ملا ہو کہ میرا قصیدہ بادشاہ تک اور بادشاہ کا عطیہ مجھ تک پہنچ جائے...... [قطب الدولہ کے ذکر پر مشتمل چند سطریں حذف کر دی گئی ہیں]

تم نے [اپنے خط میں] اپنی نسبت منشی یحییٰ علی خاں کے لطف و محبت کا جو ذکر کیا ہے اس سے میرے دل میں اس فرخندہ گہر کی محبت گھر کر گئی ہے۔ جو تم کو میری طرح عزیز رکھتا ہو میں اُس کو عزیز کیوں کر نہ جانوں۔ وہ جو شفقت تم پر فرماتے ہیں احسان ہے جو مجھ پر کرتے ہیں۔ تمہاری تحریر سے معلوم ہوا کہ یحییٰ تخلص فرماتے ہیں اور شعر کہتے ہیں۔ اُن کو میرا سلام پہنچانا اور مجھ کو ان کا کلام لکھ کر بھیجنا۔ از اسد اللہ نوشتہ سہ شنبہ ۱۰ ربیع الاول ۱۲۶۵ھ [۱۳ مارچ ۱۸۴۹ء] جواب طلب۔

چونکہ کل شام تک بلکہ آج چہار شنبے کی صبح تک [نہ میر مہدی نہ میر امام الدین] کسی کا خط نہیں ملا اِس لیے میں یہ خط روانہ کر رہا ہوں اور تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ اب میں غمِ روزگار کے ہاتھوں عاجز آ گیا ہوں، دیر ہرگز نہ کرنا اور قطب الدولہ کو اس پر آمادہ کرنا کہ جشنِ غسلِ صحت کے موقع پر ہی میرے کام.... (کو) سرانجام فرمائیں اور تم یہ کرنا کہ اِس خط کا جواب جلد لکھنا۔ بروز چہار شنبہ ربیع الثانی کی گیارھویں اور مارچ کی ساتویں تاریخ [یہ خط] روانہ کیا گیا۔ ۹ے

(۴)

جناب اکبر علی خاں عرشی زادہ نے اپنی تحریر میں مجھے میرے قیامِ رام پور کے دوران ۸ جون ۱۹۷۹ء کو ازراہِ کرم غالب کا ایک اردو خط مرحمت فرمایا جو بہ شکریۂ جناب عرشی زادہ سطورِ ذیل میں تحیاتی حصہ حذف کرکے درج کیا جاتا ہے:

"صاحب میں کل تمہارا مسہل لیے ہوئے تھا۔ اِس

وقت میر غالب علی سے معلوم ہوا کہ تم سہل پے بیٹھے ہو

....

.... ہفت پیکر دشت

بہشت اگر دونوں ہوں تو دونوں اور اگر دونوں نہ
ہوں تو جو ہو وہ نیاز علی عالی رقعہ کو [؟ کے] حوالے
کرد غالب ۱۲"

نظر بظاہر یہ خط نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کے نام ہو سکتا ہے جن کے کتب خانے واقع دہلی سے غالب کتابیں مستعار لے کر پڑھا کرتے تھے [ذکر اردوئے معلی (حصہ اول): غالب، طبع ۱۸۶۹ء، ص ۱۰۰]۔ یہ اُردو خط ابھی تک مجھے غالب کے کسی مجموعہ مکاتیب میں شامل نہیں ملا ہے۔ جناب عرشی زادہ اب غالب کے اس [شاید غیر مطبوعہ] خط کو شائع فرما رہے ہیں۔ میں نے غالب کے اس غیر معروف خط کے ابتدائی اور اختتامی فقرے عزائم لکھنؤ مورخہ ۱۲ر جون ۱۹۷۹ء (ص ص ۳/۴) میں اپنے ایک مراسلے کے ذریعے شائع کرائے تھے تاکہ خط کے غیر مطبوعہ ہونے کی تصدیق یا تردید ہو سکے لیکن ابھی تک کسی نے خط کے غیر مطبوعہ ہونے کی تردید نہیں کی ہے

⑤

سلطان العلماء مولانا سید محمد کے نام پنج آہنگ میں غالب کے دو فارسی خطوط موجود ہیں۔ مجھے سلطان العلماء سید محمد کے نام غالب کا ایک ایسا فارسی مکتوب دستیاب ہوا ہے جو نہ صرف پنج آہنگ بلکہ متفرقاتِ غالب، آثارِ غالب اور باغِ دو در پر بھی اضافہ ہے۔ سلطان العلماء مولانا سید محمد کے نام غالب کا یہ غیر معروف فارسی مکتوب سطورِ ذیل میں منقول ہے:

"خداوند نعمت آیۂ رحمت سلامت۔ تسلیم و کورنش
و ذریعہ نیازی کہ پیش ازیں بپاسخ ہمایوں توقیع
رواں داشتہ ام بعز قبول قرین باد دریں ہنگام دو شعر
دو دانش مند باہم در آویختہ اند یکے می سراید کہ آفریدگار
ہمتائے حضرت خاتم الانبیاء علیہ و آلہ السلام می تواند
آفرید و این یکے میفرماید کہ ممتنع ذاتی و محال ذاتی است
بندہ چون ہمیں عقیدت دارد نظمے در گیرندہ بنیاد
سرانجام دادہ است ہر آئینہ چشم دارد کہ سواد بہ نور نظر
اصلاح روشن شود۔

زیادہ حدِ ادب۔ از غالب نگاشتہ بست و یکم
جمادی الاول سنہ ۱۲۷۳ھ "۱۵

تجلیات میں اس خط کے بعد مثنوی کے جو اشعار درج ہیں وہ کلیاتِ غالب میں موجود ہیں۔ اس خط کی تاریخ تحریر ۲۱ر جمادی الاول ۱۲۷۳ھ ہے جو از روئے تقویم یک شنبہ ۱۸ر جنوری ۱۸۵۷ء کے مطابق ہے۔ تجلیات (باب السیرۃ ص ص ۱۹۹ تا ۲۰۰) میں غالب کے اس خط کا جواب بھی موجود ہے۔ غالب کے محولۂ بالا خط کے مکتوب الیہ سلطان العلماء مولانا سید محمد دربار اودھ میں غالب کے مربی تھے۔

⑥

مجھے غالب کا ایک ایسا فارسی قطعۂ تاریخ ملا ہے جو ابھی تک غالب کے کسی مجموعۂ کلام فارسی میں شامل نہیں ہوا ہے۔ غالب کا یہ غیر معروف فارسی قطعۂ تاریخ مندرجہ ذیل کتب پر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے

(۱) کلیاتِ غالب۔ مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ طبع ۱۸۶۳ء [مملوکہ کاظم علی خاں]

(۲) کلیاتِ غالب۔ مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ طبع جنوری ۱۸۷۲ء [کاظم علی خاں]

(۳) کلیاتِ غالب فارسی (جلد اول): مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی۔ مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع جون ۱۹۶۷ء [اس کتاب کے لیے جناب ڈاکٹر نیر مسعود کا شکر گزار ہوں]

(۴) کلیاتِ غالب: مرتبہ امیر حسن نورانی۔ راجا رام کمار بک ڈپو لکھنؤ طبع فروری ۱۹۶۸ء

(۵) انتخابِ غالب: مرتبہ مولانا امتیاز علی عرشی مطبع قیمہ، بمبئی طبع ۱۹۴۲ء

(۶) آثارِ غالب: مرتبہ قاضی عبدالودود مشمولہ علی گڑھ میگزین غالب نمبر بابت ۴۹-۱۹۴۸ء

(۷) متفرقاتِ غالب: مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب، کتاب نگر لکھنؤ طبع ۱۹۶۹ء

(۸) گلِ رعنا: مرتبہ مالک رام، علمی مجلس، دلی طبع مئی ۱۹۷۰ء

(۹) باغِ دودر: مرتبہ وزیر الحسن عابدی، پنجابی اکیڈمی پریس، لاہور طبع ۱۹۷۰ء [عنایت کردہ پروفیسر آغا سہیل لاہور]

سات اشعار پر مشتمل غالب کا یہ غیر معروف فارسی قطعۂ تاریخ میر مہدی مجروح کے مرتبہ تذکرے طلسمِ راز پر غالب کے تحریر کردہ دیباچے میں شامل ہے اور سطورِ ذیل میں پیش ہے: ؎

اندریں سالِ ہمایوں کہ سپہر از رہ مہر
کردہ ایثار بر آفاق ہمایوں اثری
ایں شرف نامۂ معنی کہ طلسمی ست شگرف
یافت پیرایۂ اتمام بہ والا نظری
سالِ اتمام خود آنست بہ آئین حساب
کہ بر آئینہ بروبج فلکی داستری
اول احاد کہ چو باعشرات آمیزی
کند اندر ہی ورق نقش دو شش جلوہ گری
چوں بہ آرائشِ عنوان مآت آوری روئے
جز دہ و دو بنود آنچہ درآں جا نگری
آں دو شش دیں دہ و دو دانست شماری عجیب
روزگاریست کہ عالم شدہ اثنا عشری
دانم ایں تذکرۂ باغ دو دراں باغ بود
جنبشِ خامۂ غالب بہم بادِ سحری

اس قطعے سے تذکرۂ طلسمِ راز کا سنہ تکمیل ۱۲۶۶ھ مستخرج ہوتا ہے۔ بعد کو ۱۲۷۷ھ میں تذکرۂ سراپا سخن کے سنہ انطباع کے سلسلے میں غالب نے اسی روش پر ایک اردو قطعۂ تاریخ بھی کہا تھا جو سراپا سخن سے منقول ہے: ؎

اِس کتاب طرب نصاب نے جب
آب و تاب انطباع کی پائی
فکرِ تاریخِ سال میں مجھ کو
ایک صورت نئی نظر آئی
ہندسے پہلے سات سات کے دو
دیے ناگاہ مجھ کو دکھلائی
اور پھر ہندسہ تھا بارہ کا
باہزاراں ہزار زیبائی
سالِ ہجری تو ہو گیا معلوم
بے شمولِ عبارت آرائی!
مگر اب ذوقِ بذلہ سنجی کو
ہے جداگانہ کارفرمائی
سات اور سات ہوتے ہیں چودہ
بہ امیدِ سعادت افزائی
غرض اس سے ہے چار دہ معصوم
جس سے ہے چشمِ جاں [؟] کو بینائی
اور بارہ امام ہیں بارہ
جن سے ایمان کو ہے توانائی
اُن کو غالب یہ سال اچھا ہے
جو اٹھارہ کے ہیں تولائی

غالب کے اس اردو قطعۂ تاریخ سے سراپا سخن کے پہلے ایڈیشن کا سنہ انطباع ۱۲۷۷ھ برآمد ہوتا ہے۔

(۷)

غالب کی فارسی کتاب قاطع برہان (طبع اول، ۲۰ رمضان ۱۲۷۸ھ [مطابق شنبہ ۲۲ مارچ ۱۸۶۲ء] کو لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ اس میں غلط نامہ ہونے کے باوجود صفحہ ۵۱ پر بعض غلطیاں باقی رہ گئیں جن کی تصحیح کے لیے غالب نے کئی ماہ بعد ۲ رگست ۱۸۶۲ء کو مطبع احمدی دہلی سے تتمۂ غلط نامۂ قاطع برہان چھپوایا۔ تتمۂ غلط نامۂ قاطع برہان میں اغلاط کی نشان دہی کے بعد غالب کی مندرجہ ذیل اردو عبارت بھی شامل تھی:

" درویش دلریش اسد اللہ المتخلص بہ غالب، جن صاحبوں کے پاس قاطع برہان بہ طریق ارمغان پہنچی

ہو، یا انھوں نے خود ازراہِ تمرد نافرمانی کی ہو،
اُن کی خدمتِ عالی میں عرض کرتا ہے کہ اِس بقیہ
غلط نامے کو دیکھ کر صفحہ ۸۵ میں ۶ جگہ موافق اِس غلط نامے
(کے) تکلیف فرما کر بنا دیں اور اگر اتنی تکلیف
گوارا نہ ہو تو اِس ورق غلط نامۂ شاملہ کو آگے
لگا دیں کہ البتہ اس صورت میں مجھ پر بڑا احسان

ہوگا..... [عربی عبارت حذف کر دی گئی ہے]....

مرقوم پنجم اگست ۱۸۶۲ء"[۲۳]

غالب کی یہ غیرمعروف[۲۴] اُردو تحریر مجموعۂ نثرِ غالب اردو پر اضافہ ہے۔ مجموعۂ نثرِ غالب اردو میں غالب کی متعدد متفرق اُردو تحریریں یک جا کی گئی ہیں۔

حواشی

[۱] سید شاہ باقر علی باقر آروی شاہ وارث علی اشکی کے فرزند تھے۔ شاہ باقر علی ۸ محرم ۱۲۴۷ھ مطابق یک شنبہ ۱۹ جون ۱۸۳۱ء کو پیدا ہوئے۔ صوبہ بہار میں گیا کے قریب واقع مقام پیر بگہ اُن کا مولد ہے۔ اُن کی تاریخ وفات ۲۴ جمادی الآخر ۱۳۲۶ھ مطابق جمعہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۸ء ہے۔ شاہ باقر علی شاعر تھے، اُن کا تخلص باقر تھا اور غالب سے تلمذ رکھتے تھے۔ غالب کی کتاب قاطعِ برہان کے سلسلے میں غالب کے موافقین و مخالفین کے درمیان جو ادبی معرکہ آرائی ہوئی اُس میں باقر نے بھی اپنے اُستاد کی جانب سے حصہ لیا تھا۔ اس ادبی معرکے کے نتیجے میں ایک کتاب ہنگامۂ دل آشوب بھی وجود میں آئی تھی جس کا ایک نیا ایڈیشن ۱۹۶۹ء میں بھی شائع ہوا ہے۔ ہنگامۂ دل آشوب: مرتبۂ سید قدرت نقوی۔ انجمنِ ترقی اُردو، کراچی طبع ۱۹۶۹ء (ص ص ۵۳ تا ۵۶، ص ص ۸۶ تا ۹۴ نیز ص ص ۱۱۹ تا ۱۲۹) میں باقر کی نظم و نثر کے نمونے شامل ہیں۔ باقر کے حالات مندرجہ ذیل ماخذوں میں موجود ہیں:

(۱) تلامذۂ غالب: مالک رام۔ مرکزِ تصنیف و تالیف نکودر (طبع اوّل) ص ص ۴۴ تا ۴۸

(۲) دودِ چراغِ محفل: سید حسام الدین راشدی۔ ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی طبع مارچ ۱۹۶۹ء ص ص ۱۴۱ تا ۱۹۴ [بہ شکریۂ دانش محل لکھنؤ]

(۳) ہنگامۂ دل آشوب: مرتبۂ سید قدرت نقوی۔ انجمنِ ترقی اردو، کراچی طبع ۱۹۶۹ء ص ص ۱۳۶ تا ۱۳۷

(۴) فیضانِ غالب: عرش ملسیانی۔ غالب اکیڈمی، نئی دہلی طبع مارچ ۱۹۷۷ء ص ۳۴

[۲] جناب قاضی عبدالودود قدرے فرق کے ساتھ اسے قائم کا شعر قرار دیتے ہیں [معاصر، پٹنہ حصہ ۲۔ ص ۲۔ حاشیہ ۱]۔

[۳] مقدمۂ دیوانِ باقر۔ شمس الاسلام پریس، حیدرآباد ص ۱۴۸ [بہ حوالہ دودِ چراغِ محفل ص ۱۵۴ نیز ص ۲۶۹]

[۴] عودِ ہندی: غالب۔ مطبع مجتبائی، میرٹھ (طبع اول) مطبوعہ ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ [اکتوبر ۱۸۶۸ء] ص ص ۱۲۶ تا ۱۲۷ [مملوکۂ کاظم علی خاں]

[۵] اُردوئے معلی (حصہ اول): غالب۔ اکمل المطابع، دہلی (طبع اوّل) مطبوعہ مارچ ۱۸۶۹ء ص ص ۲۳۴ تا ۲۳۵ [مملوکۂ کاظم علی خاں]

[۶] مضمون اکبر علی خاں عرشی زادہ: "بسلسلۂ غالب" مشمولہ صحیفہ، لاہور (غالب نمبر ۱) جنوری ۱۹۶۹ء ص ص ۷۷ تا ۸۷

[۷] کلیاتِ غالب۔ مطبع منشی نول کشور۔ لکھنؤ طبع ۱۸۶۳ء [مملوکۂ کاظم علی خاں] ص ۳۱۶ میں قصیدہ نمبر ۱۵ کے پندرھویں شعر کے دوسرے مصرعے میں لفظ "چیون" کو غلطی سے "ہرون" ہی لکھا گیا ہے جو یا تو سہوِ کاتب ہے یا غالب کی ناکافی عربی دانی کا کرشمہ معلوم ہوتا ہے۔ فرہنگِ آصفیہ (جلد دوم): مولوی سید احمد دہلوی۔ ترقی اردو بورڈ، دہلی طبع ۱۹۷۴ء میں لفظ

"حزون" موجود نہیں۔ لغاتِ سعیدی کان پور۔ طبع ۱۹۲۹ء میں لفظ "حَرُون" کو عربی لکھا گیا ہے اور اس کے معنی سرکش بچھڑا۔ سرکش گھوڑا۔ مطلق سرکش بتائے گئے ہیں۔ لغاتِ سعیدی میں "حَرُون" حائے حطّی سے ہی مرقوم ہے۔ نیز ملاحظہ ہوں (۱) غیاث اللغات۔ نول کشور پریس، کان پور طبع نومبر ۱۸۷۴ء ص ۱۴۱ [مملوکہ کاظم علی خاں]۔ (۲) منتخب اللغات۔ مطبع احمدی، کان پور۔ طبع ۱۸۸۷ء ص ۲۱۰ [مملوکہ راقم الحروف)۔

۸؎ غالب نے اپنے ۶ مارچ ۱۸۴۹ء کے اس خط میں فرماں روائے اودھ واجد علی شاہ کی علالت کا ذکر کیا ہے۔ متعدد ماخذ بتاتے ہیں کہ جنوری، فروری اور مارچ ۱۸۴۹ء کے دوران واجد علی شاہ کافی علیل رہے لیکن ۲۳ مارچ ۱۸۴۹ء کو اُن کی حالت کچھ بہتر تھی۔ ۱۸۴۹ء کا پورا سال بادشاہ نے بیماری میں گزارا تھا۔ [بہ حوالہ: (۱) تواریخِ اودھ (جلد دوم): کمال الدین حیدر (ناقص الطرفین مطبع و سنہ اشاعت نامعلوم) ص ۴۶ (۲) سلطانِ عالم واجد علی شاہ: سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ آل انڈیا میر اکاڈمی، لکھنؤ طبع ۱۹۷۰ء ص ص ۴۰ تا ۴۴]

۹؎ باغِ دودر: مرتبہ سید وزیر الحسن عابدی لاہور طبع ۱۹۷۰ء (تحقیق نامہ) ص ۱۰۱ تا ص ۱۰۴

۱۰؎ پنج آہنگ مشمولہ کلیاتِ نثرِ غالب۔ مطبع منشی نول کشور، کان پور طبع اپریل ۱۸۸۸ء ص ۲۱۲ نیز ص ۲۲۸ [مملوکہ کاظم علی خاں]

۱۱؎ پنج آہنگ: غالب مرتبہ سید وزیر الحسن عابدی۔ مطبع عالیہ، لاہور طبع ۱۹۶۹ء [بہ شکریہ ڈاکٹر نیر مسعود]

۱۲؎ متفرقاتِ غالب: مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ کتاب نگر، لکھنؤ طبع ۱۹۶۹ء

۱۳؎ آثارِ غالب: مرتبہ قاضی عبدالودود مشمولہ علی گڑھ میگزین غالب نمبر ۴۹ - ۱۹۴۸ء

۱۴؎ باغِ دودر: مرتبہ وزیر الحسن عابدی۔ لاہور طبع ۱۹۷۰ء

۱۵؎ تجلیات: مؤلفہ مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی۔ نظامی پریس، لکھنؤ طبع ۱۳۴۴ھ (باب السیرۃ) ص ص ۱۹۷ تا ۱۹۸

۱۶؎ کلیاتِ غالب طبع ۱۸۶۳ء ص ص ۱۰۰ تا ۱۰۸ [مثنوی ششم]

۱۷؎ تقویم یک صد و دہ سالہ مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ طبع ۱۸۶۵ء [رضا لائبریری رام پور]

۱۸؎ سلطان العلماء مجتہد العصر مولانا سید محمد غفران مآب مولانا دلدار علی کے بڑے فرزند تھے۔ مولانا سید محمد کی تاریخِ ولادت ۱۷ صفر ۱۱۹۹ھ [مطابق اواخر ۱۷۸۴ء] ہے۔ سید سبط محمد نقوی نے مولانا سید محمد کا سنہ ولادت "اوائل ۱۷۸۴ء" درج کیا ہے جو خلافِ تقویم ہے۔ عبدالرؤف عروج نے مولانا سید محمد کا سنہ ولادت خلافِ واقعہ ۱۱۹۱ھ لکھا ہے۔ مولانا سید محمد صفِ اوّل کے شیعہ عالم تھے۔ اُن کے والد مولانا دلدار علی نے اپنی وفات سے چند روز قبل ۱۲ جمادی الاوّل ۱۲۳۵ھ کو ایک وصیت نامے کے ذریعے انھیں اپنا جانشین مقرر کیا۔ مولانا سید محمد نے اودھ کے حکمراں محمد علی شاہ اور اُن کے فرزند امجد علی شاہ کے زمانے میں کافی عروج حاصل کیا۔ سلطان العلماء مولانا سید محمد نے ۲۲ ربیع الاوّل ۱۲۸۴ھ [مطابق پنج شنبہ ۲۵ جولائی ۱۸۶۷ء] کو دس بجے شب میں وفات پائی اور اپنے والد کے تعمیر کردہ عزا خانہ غفران مآب لکھنؤ میں دفن ہوئے۔ بعد وفات رضوان مآب کا لقب پایا [رک: (۱) امجد علی شاہ: سبطِ محمد نقوی۔ سرفراز قومی پریس، لکھنؤ طبع ۱۹۷۶ء ص ص ۲۱۴، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۴ (۲) بزمِ غالب: عبدالرؤف عروج۔ ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی طبع مارچ ۱۹۶۹ء ص ص ۲۰۶ تا ۲۰۹]

۱۹؎ کلیاتِ نثرِ غالب۔ مطبع منشی نول کشور، کان پور طبع اپریل ۱۸۸۸ء ص ۹۰ (بقیہ صفحہ ۴۸ پر)

نہالؔ رضوی
کشمیری محلہ۔ لکھنؤ

غزل

ہے روئے حسیں زلفِ خم دار کے سائے میں
چاند آیا ہے بادل کی دیوار کے سائے میں

اربابِ خرد ذوقِ پیکار کے سائے میں
ملتے ہیں تباہی کی دیوار کے سائے میں

رہتے ہیں جو نفرت کی دیوار کے سائے میں
اک دن انھیں لائیں گے ہم پیار کے سائے میں

کانٹوں میں بسر کرکے پھولوں نے بتایا ہے
دشوار نہیں جینا، تلوار کے سائے میں

تہنیتِ وحشت کے پیغام بھی آئے ہیں
ہم تک تری پائل کی جھنکار کے سائے میں

سایہ نہیں ہوتا ہے، دیوار میں شیشے کی
ڈھونڈو نہ سکونِ دل زردار کے سائے میں

مستقبلِ ہستی کی زلفوں کو سنوارا ہے
سرشارِ محبت نے کردار کے سائے میں

جس کو غمِ انساں کا احساس کہا جائے
وہ دھوپ بھی رہتی ہے فنکار کے سائے میں

منزل کی تمنا کو پروان چڑھائیں گے
دن کاٹ کے سورج کی دیوار کے سائے میں

نفرت ہے جنھیں مجھ سے، بیزار ہیں جو مجھ سے
جاتا ہوں نہالؔ ان تک اشعار کے سائے میں

مختار احمد مکی۔
ایم - ای - ٹی ٹیچرس کالج
سوپور، کشمیر ۱۹۳۲۰۱

خواجہ غلام السیدین

ایک تعارف

علامہ اقبال کا ایک مشہور مصرعہ۔ ع
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
خواجہ غلام السیدین کی شخصیت پر بہت حد تک صادق آتا ہے خواجہ غلام السیدین آزاد ہندستان کی وہ جلیل القدر شخصیت ہیں جن کے فکر کی روشنی جدید ہندستان کی تعلیمی جد وجہد کی تاریخ میں پھیلی ہوئی ہے۔ ان کی شخصیت اور مفکرانہ میلانات کا مطالعہ آزادیٔ فکر، توازن نظر اور تہذیبی بصیرت کا درس دیتا ہے۔ وہ اپنی نجی اور گھریلو زندگی میں بھی ایک سچے معلم تھے۔ لوگوں کی کمزوریوں کو نظر انداز کرکے ان کی صلاحیتوں کو ابھارنے میں ان کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ صف اوّل کے معلم ہونے کے ساتھ ہی وہ اعلا درجہ کے انسان بھی تھے۔ تمام عمر وہ اعلا علمی سرگرمیوں سے وابستہ رہے جو خاندانی روایات ممتاز علمی و تہذیبی شخصیتوں کی رفاقت اور پاکیزہ و صحت مند ماحول کا نتیجہ تھا۔

خواجہ غلام السیدین نے پانی پت کے ایسے گھرانہ میں ۱۹۰۴ء میں آنکھ کھولی جو نور ایمانی سے منور تھا۔ ان کے مورث اعلا خواجہ ملک علی نے تیرھویں عیسوی میں بعہد سلطان غیاث الدین بلبن ہرات سے ہجرت کرکے پانی پت میں سکونت اختیار کی تھی۔ ان کے نانا الطاف حسین حالی سرسید احمد خاں کے دست راست تھے اور ان کے شانہ بشانہ ہندستانی مسلمانوں کی تعلیمی، معاشرتی، مذہبی اور ذہنی اصلاح میں نمایاں کردار ادا کیا اور اردو زبان میں مقدمہ شعر و شاعری اور مدوجزر اسلام لکھ کر اپنا نام زندہ جاوید کر گئے۔

ان کے چچا خواجہ غلام الحسنین فلسفہ تعلیم کے ایک بڑے ماہر اور فن تعلیم کے ایک مایہ ناز معلم تھے۔ خود سیدین کے والد خواجہ غلام الثقلین نہایت فصیح البیان مقرر اور بلند پایہ مصنف تھے جن کے بارے میں بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کا کہنا ہے کہ "علی گڈھ کالج میں ان سے پہلے اور غالباً ان کے بعد بھی کوئی ایسا طالب علم نہیں ہوا جس کا مطالعہ ایسا گہرا معلومات اتنی وسیع اور کام کرنے میں ایسا انتھک ہو وہ انتہا درجہ کے ذہین اور ذکی تھے۔"

خواجہ غلام السیدین اپنے والد کا پرتو تھے ابتدائی تعلیم انھوں نے حالی مسلم اسکول پانی پت میں حاصل کی۔ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" کے مانند ابتدائے عمر سے ہی ان کے اساتذہ ان کی بے نظیر لیاقت اور فصیح البیانی دیکھ کر انگشت بدنداں تھے۔ میٹریکولیشن کا امتحان اعزاز و امتیاز کے ساتھ پاس کرنے کے بعد انھوں نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (موجودہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) میں داخلہ لیا اور یہاں سے بی۔ اے۔ کا امتحان فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن حاصل کرکے پاس کیا اسی دوران انھوں نے یونیورسٹی و بیرون یونیورسٹی کے مباحثہ میں بہتیرے انعامات بھی حاصل کیے۔ حتیٰ کہ یونیورسٹی کے بہترین مقرر کا کیمبرج میڈل بھی انھیں کو حاصل ہوا۔ اس انتہائی درجہ کی ذہانت اور قابلیت سے متاثر ہوکر یو۔ پی پبلک انسٹرکشن کے ڈائرکٹر مسٹر میکنزی حکومت ہند کے وظیفہ پر لیڈز یونیورسٹی جو ان دنوں برطانیہ میں فن تعلیم کا اعلا ادارہ تھا بھیجنے پر راضی ہو گئے۔ ۱۹۲۴ء میں انھوں نے وہاں سے ڈپلوما ان

ایجوکیشن کا امتحان دوہرے امتیاز کے ساتھ پاس کیا جو یونیورسٹی
کی تاریخ میں اس سے قبل صرف ایک لڑکے نے اس امتیاز کے
ساتھ پاس کیا تھا۔ ۱۹۲۵ء میں ایم ایڈ کی ڈگری حاصل کرنے
کے بعد وطن کو واپس ہوئے۔

لیڈز کے دوران قیام مختلف مباحثہ کے علاوہ لیگ آف
نیشنز کے ایک اجلاس کو خطاب کرنے کا موقع بھی ملا۔ اس کے
ساتھ ہی انھوں نے یونیورسٹی یونین پارلیمنٹ کے وزیر اعظم
اور انٹرنیشنل سوسائٹی کی صدارت کے فرائض بھی انجام
دیئے۔

برطانیہ سے واپسی پر علی گڑھ کی مشہور جوبلی ڈیبیٹ (مباحثہ)
میں بطور محرک آپ نے حصّہ لیا اور زیر بحث موضوع "ہندستانی
مسلمان کو قومی تحریک میں حصّہ لینا چاہیئے نہ کہ علیحدہ ایک سیاسی
جماعت کی تشکیل کرنا چاہیئے" باوجود سر علی امام اور مسٹر محمد علی
جناح اور دوسرے سیاسی لیڈران کی مخالفت کے پاس
ہوگیا۔

۱۹۲۶ء میں آپ کی تقرری مادر درسگاہ (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)
کے ٹریننگ کالج میں ریڈر کی حیثیت سے ہوئی اور جلد ہی ترقی دے کے
آپ کو ٹریننگ کالج میں پروفیسر و پرنسپل مقرر کیا گیا۔ اس طرح
وہ ملک کے اس وقت سب سے کم عمر پرنسپل تھے۔

اسی زمانے میں مہاتما گاندھی نے بنیادی تعلیم یا تعلیم بالعمل کا
تصور پیش کیا جس کو نظریاتی و عملی شکل دینے کے لیے ڈاکٹر
ذاکر حسین کی سرکردگی میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے
روح رواں سیدین تھے۔ خود سیدین گاندھی جی سے اپنی ایک
ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "جب واردھا کمیٹی کی
رپورٹ گاندھی جی کی خدمت میں پیش کی گئی تو وہ بہت خوش
ہوئے اور کمیٹی کے کام کو سراہا۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ سب
ذاکر صاحب کے طفیل میں ہے تو گاندھی جی مسکرائے اور کہنے لگے
"جاکر (ذاکر) صاحب تو کہتے ہیں کہ رپورٹ کے پیچھے اصل شکتی
تمھاری ہے۔"

واردھا اسکیم کے نصاب تعلیم کا پتہ چلتے ہی گوپال سوامی
آئنگر (جموں و کشمیر کے وزیر اعظم) کو چلا انھوں نے بنیادی تعلیم کو
کشمیر میں نافذ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا اور خواجہ غلام السیدین
جموں و کشمیر کے ڈائرکٹر آف ایجوکیشن مقرر ہوگئے۔ اس طرح وہ
۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۵ء تک ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے
بعد ازاں دو برس ریاست رام پور اور تین برس ریاست بمبئی
کے مشیر تعلیم کی خدمات انجام دیں۔ اس کے علاوہ گیارہ سال
تک حکومت ہند کی وزارت تعلیمات سے منسلک رہے۔ دریں
اثنا کولمبیا، وسکونسن اور اسٹینفورڈ یونیورسٹیز میں مہمان
پروفیسر کی حیثیت سے بھی بلائے گئے اور ۱۹۶۴ء میں ہوائی میں
سینیر اسکالر کے طور پر مرکز مشرق و مغرب میں بھی مدعو کیا گیا۔

اس کے علاوہ بنیادی اور ثانوی تعلیم کی ترقی کے سلسلہ
میں ذاکر حسین کمیٹی، مودالیر کمیٹی، کوٹھاری کمیشن، کمیشن
آف انگلو انڈین ویلیر بین ایجوکیشن، بنیادی تعلیم کے قومی
بورڈ کے ممبر کے طور پر اور بہار تعلیم تشکیل نو کمیٹی کے چیرمین
کی حیثیت سے نمایاں خدمات انجام دیں۔ مزید برآں انھوں نے
ایم۔ یو بیگ کمیٹی، مرکزی تعلیمی مشاورتی بورڈ کے ممبر اور
کل ہند ثانوی تعلیمی بورڈ برائے امداد اقوام متحدہ
تعلیمی، سماجی، ثقافتی انجمن (UNESCO) کے ممبر کے طور پر
کارہائے نمایاں انجام دیے۔

خواجہ غلام السیدین نے مختلف بین الاقوامی تعلیمی
کانفرنسوں مثلاً برطانیہ، فرانس، آسٹریلیا اور جین میں ہندستان
کی نمائندگی کی ساتھ ہی عالمی بینک کی طرف سے سوڈان میں
مشیر تعلیم بھی رہے اور سوڈان و عراق میں چیرمین برائے
بین الاقوامی تعلیمی تشکیل نو کمیشن کے فرائض بھی انجام دیے
آپ عالمی تعلیمی فیلو شپ کے صدر بھی رہے اور ایک خصوصیت
یہ لندن اور دوسری امریکن یونیورسٹیوں میں لکچر بھی دیے۔
اندرون ملک بھی مختلف کل ہند تعلیمی کانفرنسوں کی صدارت
کی۔ آخری وقت میں آپ رشین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈمنسٹریشن

اینڈ پلاننگ کے ڈائرکٹر تھے۔ اس طرح بہترین تعلیمی خدمات کے ساتھ ہی ایک بہترین منتظم کے طور پر بھی آپ نے اپنے کو پیش کیا۔ ان تمام تعلیمی خدمات کے اعتراف میں حکومت ہند نے پدم بھوشن کا خطاب عطا کیا۔ ساتھ ہی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری دی اور کولمبیا یونیورسٹی نے ان کو دنیا کے سات ممتاز ماہرین تعلیم میں شمار کرتے ہوئے تمغۂ ستارہ عطا کیا۔

ڈاکٹر سیدین مختلف کتابوں کے مصنف ہیں ان کی مشہور کتابوں میں تعلیم، تہذیب اور سماجی نظام (انگریزی) اقبال کا نظریہ تعلیم (انگریزی) تعلیم برائے بین الاقوامی مفاہمت (انگریزی) مستقبل کا اسکول (انگریزی) ہندوستانی تعلیم کی انسانی روایا (انگریزی) تعلیمی تشکیل نو کے مسائل (انگریزی) ایک تعلیم یافتہ کے عقائد (انگریزی) اور اردو میں آندھی میں چراغ، زندگی اور تعلیم، اصول تعلیم، سوانح حیات (مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں) مرد درویش اور فکر انسانی کا سفر ارتقا وغیرہ نمائندہ کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے تعلیمی مضامین ہند بیرون ہند کے مختلف جریدوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے سر راس مسعود نے بڑے فخر کے ساتھ اصول تعلیم کے مقدمہ میں تحریر کیا ہے کہ "اس کتاب کو ہم ان مستند کتابوں کے مقابلہ میں پیش کر سکتے ہیں جو دوسرے ممالک کی زبان میں اس مضمون پر لکھی جا رہی ہیں۔" (مقدمہ اصول تعلیم)

بقول مالک رام، خواجہ غلام السیدین کا موضوع سخن تعلیم تھا اور وہ ساری عمر معلم رہے، سقراط کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے روزمرہ کی گفتگو کے ذریعہ اپنے عہد کے نوجوانوں کو، جو آگے چل کر یونانی قوم کے کرتا دھرتا بننے والے تھے، سکھایا کہ اچھا آدمی اور اچھا شہری کون ہے اور کسی بھی شخص کو اس کا مصداق بننے کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ سیدین صاحب کا مطمع نظر بھی ساری عمر یہی رہا .... ان کی ذات میں وہ سب صفات جمع تھیں جنھیں دانایان ہند نے ستیم (حق) شیوم (قوت تخلیق) اور سندرم (حسن) سے تعبیر کیا ہے۔

سیدین صاحب کی ہر تصنیف میں اسی طرح کے افکار و خیالات بکھرے ہوئے ہیں جس کے متعلق فرانس کے ایک مشہور فلسفی روسو نے اپنی کتاب (EMILE) ایمائل میں لکھا ہے کہ "میرے الفاظ میں تناقص ہو سکتے ہیں لیکن میرے خیالات میں کوئی تناقص نہیں ہے۔" یہی حال سیدین کا ہے شروع سے آخر تک ان کا مقصد اور مطمع نظر ایک رہا ہے۔ وہ تعلیم سے فرد اور جماعت کی بہبود کا کام لینا چاہتے تھے۔ انھوں نے قومی میراث اور قومی وحدت کے مسئلہ پر سنجیدگی سے غور و فکر کیا، مشرقی روح کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔ تہذیبی علامات کو پہچانا، مغربی فکر کی روشنی میں ہندی کی صالح بنیادی قدروں کا تجزیہ کیا، تعلیم کے سماجی پہلو افراد کی تخلیقی صلاحیت، ہندوستان میں اسلامی تمدن کی برکت، جمہوریت و سائنس کے چیلنج اور ملک کے لسانیاتی اور دوسرے مسائل پر گہری نظر رکھتے ہوئے اعلا تعلیم اور ذہنی آزادی پر بڑے ہی ناقدانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

ان کا خیال تھا کہ تعلیمی نظریہ کے دو اہم پہلو ہیں۔ ایک تعلیم اور معاشرتی زندگی کا گہرا ربط اور دوسرے تعلیم کے ذریعہ انسانی قدروں کی حفاظت اور ان کی بقا۔ تعلیم کے ذریعہ ہر فرد کی ذہنی و اخلاقی صلاحیت کو اس طرح ابھارنا چاہتے تھے کہ وہ خود اپنی زندگی کو تابندہ بنائے اور ساتھ ہی ملک و ملت کی خدمت کے لئے بھی مفید ثابت ہو سکے۔ اپنے ایک مضمون "تعلیم و اخلاق" میں لکھتے ہیں کہ "تعلیم نہ صرف اصلاح اخلاق بلکہ کسب معاش اور دولت کا صحیح استعمال کا طریقہ بھی سکھا سکتی ہے ...... اخلاق کی تربیت کے لئے ہمیں موجودہ اور آئندہ نسلوں کی ذہنیت تبدیل کرنے کی ضرورت ہے اور اس بات کو ذہن نشین کرانا ہے کہ زندگی میں کون سی باتیں اور چیزیں اور نصب العین برتر اور مقدم ہیں اور کون سے کمتر اور موخر ہیں لوگوں کا معیار قدر (VALUES)

بھی بدلنا ہے تاکہ وہ خود بخود یہ محسوس کرلیں کہ ہمارا موجودہ معیار اخلاق کس قدر پست اور انسانی مرتبے سے گرا ہوا ہے۔ تاکہ وہ ازخود ہر جائز وسیلہ معاش کو عزت کی نگاہ سے دیکھیں اور بیکاری و مفت خوری کو ذلیل ترین حالت سمجھیں۔۔۔۔۔ غرض مختصراً یہ کہ ہمارے سامنے اصلاح تمدن کی جو مہم درپیش ہے اس کا تعلیمی نقطۂ نظر سے یہی مطلب ہے کہ ہم لوگوں کے نقطۂ نظر اور نظام قدروں کی از سر نو تشکیل کریں یہی وہ امر ہے جس کی بابت جرمنی کے مشہور فلسفی نے کہا تھا کہ WE REQUI REA TRANS VALUATION OF ALL VALUES.)

یعنی ہمیں اپنے نظام قدور میں ایک انقلاب پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔"

اس طرح انھوں نے سمجھایا کہ صحت مند ترقی پسند اور دلفریب قومی زندگی کے لئے تعلیمی قدروں کی ضرورت قدم قدم پر ہے۔ نئے سماجی نظام کو ان ہی اقدار سے روشنی ملے گی اور اگر یہ روشنی گل ہوگئی تو ضمیر مردہ ہو جائے گا اور اس کے ساتھ ہی وہ تعلیم کے میکانکی پہلو کے بھی مخالف تھے "تعلیم اسی حد تک مفید ہے جہاں تک وہ مقصد برآری میں معاون ثابت ہو اور جو تعلیم کے جوہر زندگی کے نمایاں کرنے کا وسیلہ ہو۔ دوسری صورت میں یہ تعلیم کی زندگی نہیں بلکہ موت ہے" خود ان کے الفاظ میں:

"تعلیم پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ بچوں کے ذہن کی تازگی، جولانی اور قوت کی بڑی عمر تک حفاظت کرے اور ان کے آئینۂ طبیعت پر حتی الامکان جامد خیالات کی گرد جمنے نہ دے۔" (فکر انسانی کا سفر ارتقا)

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"بچوں کے والدین اور معلموں کا فرض ہے کہ تعلیم میں آزادی اور جدت پسندی کا رنگ بھریں اور سب کے لئے یکساں مواقع فراہم کریں جو۔۔۔۔۔۔۔ میکانیکی بے جان اور رسمی درس و تدریس کا طریقہ اختیار کرتے ہیں وہ بچوں کے دماغ پر محض معلومات کا بے انداز بوجھ ڈال دیتے ہیں۔

اس سے ان کی تخلیقی اپج اور ذہنی جودت کی جڑیں کٹ جاتی ہیں" برخلاف اس کے آزادی وہ محرک ہے جس سے ذہن کے سوتے کھل جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔ ہر وہ شخص جو تخلیق کی کچھ بھی صلاحیت و استعداد رکھتا ہو اُسے اس کا پورا موقع ملنا چاہیے کہ وہ اپنے ذہن اور اپنی صلاحیتوں کو نشوونما دے سکے۔"

(فکر انسانی کا سفر ارتقا)

خواجہ غلام السیدین نے اپنی تصانیف میں جس نظریہ تعلیم پر روشنی ڈالی ہے وہ فلسفۂ انسانیت ہے جو ان کے نزدیک ایمان، یقین، فلسفۂ عمل، اور انسانی زندگی کے دوسرے مسائل کو سلجھانے کے لئے واضح راستہ ہے۔ ان کے نزدیک انسان کی سب سے بڑی صفت انسانیت ہے یعنی تمام انسانوں کی بحیثیت انسان عزت کرنا، ان کی فلاح و بہبود میں اپنی بہتری کو تلاش کرنا اور اس بات کا پر خلوص یقین کہ تقریباً ہر شخص کے اندر نور الہیٰ کی چنگاری پوشیدہ ہے۔ اپنے فلسفۂ انسانیت کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"میں اس اصطلاح (انسانیت) کو اس کے فنی یا محدود فلسفیانہ مفہوم میں استعمال نہیں کرتا ہوں بلکہ اس کے آزاد اور عوامی معنی میں جس کا مطلب انسان پر اس کی لاانتہا قدر و قیمت اس کے لامحدود ممکنات پر اس کے احترام اور اس کے ساتھ الفت کے تعلق پر اس کا خود اپنا مقصد ہونے پر اعتماد ہے۔ برعکس اس کے وہ دوسروں کے مقاصد کے لئے بطور وسیلہ استعمال ہو۔"

(ایک تعلیم یافتہ کے عقائد)

اسی طرح ان کا یہ فلسفہ انسانیت موجودہ صدی کی انسانی امنگوں کی ایک آواز بازگشت اور ایک جدید فلسفۂ انسانی بن کر طلوع ہو رہا ہے جو پوری انسانیت پر محیط ہے۔ اس سلسلہ میں سائنس کی دین کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ:

"اہل سائنس نے اپنا فرض زمان و مکان کے فرق کو مٹا کر اور دوسرے سائنسی ایجادات کے بدولت پورا کر دیا

ہے۔ اب یہ تعلیمی کارکن کا فرض ہے کہ وہ ایک ایسے عالمی نظریہ کی تبلیغ کرے جو جغرافیائی یا نسلی یا قومی یا دوسرے ایسے ہی قسم کے گروہی تعصب سے بالکل بالاتر ہو۔"

(ایک تعلیم یافتہ کے عقائد۔ ص ۱۰۸)

وہ سائنس و مذہب میں بھی کوئی تضاد یا فرق تسلیم نہیں کرتے۔ بلکہ ان کے خیال میں دونوں بجائے خود ایک ہی سرچشمہ سے موجزن ہوئے ہیں اور دونوں ایک ہی مقصد کو پورا کرتے ہیں۔ سائنس سے انسان فطرت کی تسخیر کر سکتا ہے تو مذہب سے اپنے نفس کی، دونوں لازم و ملزوم ہیں ہاں اگر ضرورت ہے تو دونوں کو اپنے اپنے مقام پر رکھنے کی۔ اگر تعلیم دونوں کو اس کا مقام دلا سکے تو یہ وقت اور تعلیم کا سب سے بڑا کارنامہ ہوگا۔

لیکن جہاں سیدین برٹرنڈرسل (Bertrand Russell) کے اس خیال سے متفق ہیں کہ دورِ حاضر کے مہذب انسانوں کو "اپنے زمان و مکان کے کسی ایک ٹکڑے کا ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کا شہری ہونا چاہیئے"۔ وہیں وہ اندرونِ ملک کی اعلیٰ قدروں کی خوبیوں کے بھی نہیے پرستار رہتے۔ جہاں وہ وسعت نظری کی دعوت دیتے ہیں وہیں وہ اپنی دولت سے شناسائی کی بھی تلقین کرتے ہیں۔

"مجھے استادوں کی تربیت میں یہ فکر ہمیشہ رہی کہ ان کی نظر کو وسیع کیا جائے اور انھیں نہ صرف اپنے ملک کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی مسائل میں دلچسپی پیدا کرائی جائے۔ بلکہ جو تحریکیں اور قوتیں بین الاقوامی پیمانہ پر کام کر رہی ہیں وہ ان کو اور تعلیم پر ان کے اثر کو سمجھیں، علاوہ اس کے میں نے غالباً پہلی مرتبہ ان کے نصاب میں نامور اور تخلیقی، ہندستانی مفکروں کے تعلیمی خیالات کا مطالعہ بھی شامل کیا ورنہ اس وقت تو مغربی ماہرین تعلیم کے خیالات کا مطالعہ بالکل کافی سمجھا جاتا تھا اور اپنی دولت سے شناسائی ہی نہ تھی"۔ (مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں۔ ص ۱۹۱)



غزل

بشیر فاروقی
۵، ۵ نئی بستی
مراد علی لین۔ لکھنؤ

جانے کب کون کہاں کس سے جدا ہو جائے
اور یہ رشتوں کی مہک خواب نما ہو جائے

پھر اسی موڑ پہ مل جائیں جہاں بچھڑے تھے
آؤ پھر کوئی نیا عہد وفا ہو جائے

جس کو مل جائیں پرستار ہمارے جیسے
پھر وہ پتھر کا صنم کیوں نہ خدا ہو جائے

میں وہ راہی ہوں جو خوشبو کے تعاقب میں چلے
اور کچھ دور پہ خوشبو سے جدا ہو جائے

ہو کے بیتاب اٹھی تھی وہ محبت کی نظر
میں ڈرا تھا کہ نشانہ نہ خطا ہو جائے

مجھ کو چاہو مگر اتنی بھی محبت نہ کرو
زندگی تم سے بچھڑنے پہ سزا ہو جائے

آج میں گھر سے جو نکلا تو یہ احساس ہوا
جیسے قیدی کوئی زنداں سے رہا ہو جائے

چاند آ کر مری باہوں سے لپٹ جائے بشیر
اور اٹھا جو مرا دستِ دعا ہو جائے

اسلام عشرت
محلہ قاضی اورنگ آباد ۔
۸۲۴۱۰۱ بہار

پنڈت بالمکند عرش ملسیانی کی شاعری

عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ ہر شخص کسی ایک ہی صنف میں نمایاں کامیابی حاصل کرتا ہے اور دوسرے اصناف پر قدرت حاصل کرنے کے باوجود وہ عوام سے خراج عقیدت اور مقبولیت نہیں حاصل کر پاتا۔ مثلاً جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی، علامہ جمیل مظہری اور منشی تلوک چند محروم نے شاعری کی دنیا میں بے شک اپنا ایک علاحدہ مقام بنا لیا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ دنیا انھیں ایک مسلم الثبوت شاعر کی حیثیت سے ضرور جانتی ہے۔ لیکن کسی دوسری حیثیت سے انھیں کوئی نہیں جانتا۔ اس سے یہ مطلب اخذ ہرگز نہیں کرنا چاہیے کہ یہ نثر کی دنیا سے بالکل نابلد رہے ہیں۔ یا ان کے نثر پارے قابل اعتنا نہیں۔ بلکہ ہوتا یہ ہے کہ ان کی نظم و غزل کی پرواز اتنی اونچی ہوتی ہے کہ ان کی نثر وہاں پہنچنے سے قاصر رہ جاتی ہے اور نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ عوام الناس ان کے اشعار کی بلندیوں اور رنگینیوں میں کھو کر ان کی نثری کاوشوں پر توجہ ہی نہیں دیتے اور آہستہ آہستہ اسے بالکل فراموش کر دیتے ہیں۔ مگر کچھ لوگ اس سے مستثنیٰ بھی ہیں، جو بیک وقت نظم و نثر دونوں صنفوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔

عرش ملسیانی کا شمار ایسے ہی لوگوں میں کیا جا سکتا ہے وہ ایک باکمال شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب مزاح نگار بھی تھے، ان کے مضامین (مزاحیہ) کا مجموعہ "پوسٹ مارٹم" کے مطالعہ کے بعد ہم یہ کہنے میں یقیناً حق بجانب ہیں کہ عرش ملسیانی نے مزاح نگاری کو فرش زمین سے اٹھا کر عرش بریں تک پہنچا دیا ہے۔ بہرکیف سردست میرا مقصد عرش ملسیانی کی مزاح نویسی کا جائزہ لینا نہیں، بلکہ عرش ملسیانی کا بحیثیت شاعر مرتبہ و مقام متعین کرنا ہے۔

عرش ملسیانی صاحب کا اصل نام پنڈت بالمکند تھا اور عرش تخلص کرتے تھے۔ وہ ۲۰ ستمبر ۱۹۰۸ء کو عالم وجود میں آئے تھے، ان کی جائے پیدائش ملسیان ہے، ان کے والد محترم کا نام ابو الفصاحت پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی تھا جو اردو شاعری کی دنیا میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں عرش صاحب کو ابتدا ہی سے شعر و ادب سے گہری دلچسپی تھی، گویا ان کا ذوق ادب فطری تھا، جو ان کے ماحول، میراث و پدر بزرگوار کے فیضان کا نتیجہ ہے۔ عرش ملسیانی نے نہ تو کسی کی شاگردی اختیار کی اور نہ کسی کا چربہ اتارا۔ وہ عہد طفلی ہی میں شعر کہتے تھے اور اسی زمانے سے مشاعروں میں شریک ہونے لگے تخیل کی بلند پروازی اور جدت بیان و ندرت ادا کے سبب بے حد مقبول ہوئے۔ پھر تو یہ حال ہو گیا کہ شعر و سخن کی ہر محفل انھیں تلاش کرنے لگی اور ان کی عدم موجودگی میں بزم شعر و سخن سونی سونی معلوم ہوتی تھی۔ یوں تو عرش ملسیانی کو نظم و غزل دونوں اصناف پر قدرت کاملہ تھی لیکن فطری رجحان غزل کی جانب تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ زیادہ تر غزل ہی کہتے تھے، ان کے کلام میں جوش و خلوص اور حسن کے عناصر کے ساتھ ساتھ سوز و ساز واردات قلب، درد و کیف اور خوشی و غم کے واقعات

اتنے حسین و دلکش پیرایۂ بیان میں ظاہر ہوئے ہیں کہ کوئی بھی شخص ان کی انفرادیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ عرش ملسیانی ۱۹۴۸ء میں ماہنامہ "آجکل" (دہلی) سے وابستہ ہوئے اور ان کا یہ تعلق ۱۹۶۷ء تک قائم رہا۔ ان کی ادارت میں "آجکل" کے بڑے اچھے اور ضخیم یادگار نمبر شائع ہوئے ہیں، عرش ملسیانی کی بہت ساری تصنیفات شائع ہو کر شرف قبولیت حاصل کر چکی ہیں، مثلاً "ہفت رنگ"، "چنگ و آہنگ" اور "شرارِ سنگ" شعری مجموعے ہیں۔ علاوہ ازیں "آہنگ حجاز"۔ اردو کی مزاحیہ شاعری کا انتخاب، ہمارا ملک ہے، مضامین کاہت وبود، فیضانِ غالب مولانا ابوالکلام آزاد کی سوانح عمری اور ہندی میں غالب کی حیات اور شاعری اور خطوط کے ترجمے بھی شائع ہو چکے ہیں، عرش ملسیانی ۲۵ ستمبر ۱۹۷۹ء کو طویل علالت کے بعد اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے، جو بلاشبہ اردو زبان و ادب کے لیے ایک عظیم سانحہ ہے۔

کسی بھی ادیب، شاعر اور فن کار کے فن کو بخوبی سمجھنے کے لیے فن کار کے نقطۂ نظر کو سمجھنا لازم ہوتا ہے۔ کیوں کہ فنکار کے انداز نظر کو پیشِ نظر رکھنے سے اس کے فن تک براہ راست رسائی ہو جاتی ہے، اور اس طرح فن کار کے فن پارے کا تجزیہ صحیح طور پر ہو پاتا ہے۔ لہٰذا اس اعتبار سے عرش ملسیانی کے نقطۂ نظر کو مد نظر رکھنا بے حد ضروری ہے دیکھیے وہ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت ذیل کے سطور میں یوں کرتے ہیں:-

"ادب برائے فن یا فن برائے ادب یا رشید احمد صدیقی کے قول کے مطابق دونوں برائے تفنن کی بحث ایک ذہنی عیاشی سہی لیکن ہر فن کار کو ایک لائحۂ فکر متعین کرنا ضروری ہے۔ اضطراری اور فراری طرزِ عمل سے وہ خود کو اس بحث سے مامون نہیں کر سکتا۔ میں نے خود اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کیا ہے، اور ایک ایسے اہم نقطۂ نظر پر پہنچا ہوں جہاں یہ دونوں نظریے نفرو ضات سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ اور وہ مقام ہے ادب برائے زندگی کا مقام۔ ادب برائے زندگی اور ادب برائے ادب کی بحث میں میں الجھنا اس لیے لاحاصل سمجھتا ہوں کہ یہ بحث ہی بے بنیاد ہے ادب برائے ادب کی کوئی حیثیت نہیں۔ اظہار مطالب میں شاعر لاکھ مختار و آزاد سہی لیکن ماحول و وراثت سے متاثر ہونا اس کے لیے ضروری ہے۔ زندگی سے کسی ادب یا ادیب کو مفر ہی نہیں —"

پھر دوسری جگہ وہ کہتے ہیں:

"مجھے وہ شاعری پسند نہیں، جس میں مار دھاڑ اور پکڑ دھکڑ کی تلقین یا لوٹ کھسوٹ اور غارت گری کے نعرے ہوں، اظہار مطالب کے باب میں عجز طبیعت کو غلط زبان اور غلط ترکیبوں کی "جدت آفرینیوں" سے چھپانا میرے نزدیک مستحسن نہیں۔ وہ شاعری جو شعریت سے خالی ہے، جس میں رس اور لوچ نہیں جو موسیقی اور مصوری سے مبرا ہے، تضیع اوقات کے سوا کچھ نہیں —"

مذکورہ بالا دونوں اقتباسات کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ "ادب برائے ادب" یا "ادب برائے زندگی" کی بحث میں الجھنا نہیں چاہتے بلکہ ان کی نگاہ میں اس شاعری کی قدر و منزلت ہے جس میں رس ہو، موسیقیت ہو اور فصیح زبان کا استعمال ہو اور بلاشبہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے ان باتوں کا نازک سے نازک موقعوں پر بھی پورا پورا لحاظ رکھا ہے، اور اپنی شاعری کے ذریعے اس کا بیّن ثبوت فراہم کیا ہے۔ ورنہ اردو کے مشہور و معروف شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی ہرگز یہ کہنے پر مجبور نہ ہوتے کہ:

"عرش صاحب سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں، فن کی

پابندی کا سختی کے ساتھ لحاظ کرتے ہیں اور معائبِ شعری سے دور رہتے ہیں۔ ان کی شاعری میں روح اور بیان میں حرارت پائی جاتی ہے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ ان کی اکثر نظموں میں مغز اور تفکر کے نمایاں آثار ملتے ہیں۔"

علامہ دتاتریہ کیفی ان کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

—— "عرش ملسیانی صاحب کی تعلیم میں مشرقی اور مغربی دونوں ادب داخل تھے۔ مذاق سلیم اور طبیعت ہمہ گیر تھی، انھوں نے دونوں کے محاسن کو اپنے کلام میں سمو لیا، جیسا اثر اور لوچ ان کی غزل میں ہے، ویسا ہی زور اور دقت نظر ان کی نظموں میں ہے۔ گیت بھی خوب لکھتے ہیں۔ ان میں تاثر اور روانی قابل تعریف ہے۔ پاکیزہ جذبات کے ساتھ موسیقیت بھی خوب ہے۔ یہ جو کچھ بھی لکھتے ہیں صحیح فصیح ہوتا ہے۔ زبان اور محاورے کی دل آویزی، اسلوب کی چستی، تخیل کی بلندی اور جذبات کی پاکیزگی اور حسن ادا ان کے کلام کے خاص اوصاف ہیں اور ان کے خیالات کا پس منظر خواہ کچھ ہی ہو۔ وہ بیان کی کلاسیکی خوبی اور دلکشی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور یہی امتیاز انھیں اپنے ہم عصر شاعروں سے الگ کرتا ہے۔"

بلاشبہ عرش ملسیانی نے غزلوں کے علاوہ بعض بے حد کامیاب اور قابل قدر نظمیں لکھی ہیں مثلاً "اشرف المخلوق" "درویش کی دنیا" "رشوت کا بازار" اور "خدا اور انسان" وغیرہ نظموں کو ہم بہترین اور اہم نظموں میں شمار کر سکتے ہیں، انھوں نے اپنی نظم "اشرف المخلوق" میں عہد حاضر کے انسانوں کا ذکر کیا ہے اور یہ دکھلایا ہے کہ آج کا انسان اپنے قول و فعل اور عمل کے لحاظ سے اس قدر پست ہو گیا ہے کہ اس کو "اشرف المخلوقات" کا لقب عطا کرنا نامناسب اور بے کار بھی ہے۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:-

خونخواری انساں کی یہ گھاتیں ہیں قیامت
اس اشرف المخلوق کی باتیں ہیں قیامت

تہذیب کے ضامن بھی ہیں تہذیب کے دشمن
اپنے بھی پرائے ہیں تو رہبر بھی ہیں رہزن

اٹھو کہ اب ایسے میں تو سونا نہیں اچھا
طوفان میں یوں جی کو ڈبونا نہیں اچھا

آپس کی لڑائی کا گماں تک بھی نہ چھوڑو
اب بغض و عداوت کا نشاں تک بھی نہ چھوڑو

"درویش کی دنیا" اگرچہ ایک مختصر سی نظم ہے لیکن اثر و تاثیر کے لحاظ سے نمائندہ اور کامیاب نظم کہی جانے کی مستحق ہے، اس نظم میں انھوں نے درویشوں اور فقیروں کی زندگی کا بہترین مرقع بڑے حسین و دلکش پیرائے میں کھینچا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ درویشوں کی زندگی کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے، اس نظم کے بعض اشعار ڈاکٹر محمد اقبال کے رنگ میں اتنی کامیابی سے کہے گئے ہیں کہ ان پر اقبال کے اشعار کا گمان ہوتا ہے، مثلاً دو اشعار دیکھیے:

دل جس کا پُر انوار ہے انوارِ خودی سے
ہے اس کے لیے ہیچ مقدر کی سیاہی
درویش کی دنیا ہے مساوات کی دنیا
عشرت بھی امارت بھی فقیری بھی ہے شاہی

"خدا اور انسان" جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے کہ اس میں خدا اور انسان کے مابین آپس میں گفتگو کرتے ہوئے دکھلایا گیا ہے۔ گویا یہ ایک مکالماتی نظم ہے۔ یہ نظم بے حد مختصر سہی، لیکن شوخی طرز ادا اور خطابیہ لب و لہجے کی ایک اچھی مثال قائم کرتی ہے۔ اس نظم پر اردو کے مشہور

و ممتاز شاعر علامہ اقبال کی بعض نظموں مثلاً شکوہ، جوابِ شکوہ یعنی خدا کے حضور میں اور روحِ ارضی سے آدم کا خطاب وغیرہ کی گہری چھاپ نمایاں ہے۔ دو اشعار ملاحظہ ہوں:

خدا:- وقف تیرے لیے آسائشِ دنیا کر دی
گل مقصود سے میں نے تری جھولی بھر دی

انسان:- میں وہ انساں ہوں تری رحمت محکم سے
نسل انساں کو مٹا سکتا ہوں ایٹم بم سے

عرش ملسیانی نے اردو شاعری کو ایجادات و اختراع سے مالا مال نہیں کیا ہے، یہ بات بالکل صحیح ہے لیکن یہ کیا کم ہے کہ انھوں نے دامانِ اردو شاعری کو قدیم روایات سے مستحکم بنایا اور کلاسیکیت کو کافی بلند و بالا مقام پر پہنچانے کی کوشش کی۔ میرے خیال میں یہی ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ ان کے ابتدائی دور کے کلام میں عاشقانہ رنگ و آہنگ، شوخی اور بے باکی کے عناصر غالب ہیں۔ مثال کے لیے دو شعر درج ہیں:

محبت سوز بھی ہے ساز بھی ہے
خموشی بھی ہے یہ آواز بھی ہے

ان سے ملنے کی گو نہیں صورت
ان سے ملنے کی آس رہتی ہے

عرش ملسیانی نے صرف روایتی طور پر عشق و عاشقی اور شوخی رندانہ ہی کو اپنی شاعری کا موضوع نہیں بنایا بلکہ ان کا قابلِ ذکر کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے شاعرانہ مصوری کا بھی ارفع و اعلا نمونہ پیش کیا ہے۔ وہ اپنے الفاظ کے حسنِ انتخاب سے کام لے کر اپنے حسین تصورات کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ سننے والوں کے سامنے اس کا جیتا جاگتا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے، چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

اخلاص و وفا کے سجدوں کی جس در پر داد نہیں ملتی
اے غیرتِ دل، اے عزمِ خودی اس در پر سجدہ کیا معنی

دل کا منزل پہ جا کے رک جانا
اعتراف شکست ہے شاید

ہم کو قفس سے حکمِ رہائی تو مل گیا
اڑنے کے واسطے ہیں مگر بال و پر کہاں؟

شاعری کی تعریف کی جاتی ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں سوز و گداز ہوتا ہے۔ بندش میں چستی اور لطافت ہوتی ہے، حسنِ بیان میں رنگینی اور طرزِ اظہار میں رعنائی پائی جاتی ہے، اور ان باتوں کے علاوہ شاعری میں موسیقیت کا اہتمام بھی بہت ضروری ہے۔ اس تعریف کے پیش نظر عرش ملسیانی کے کلام کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ تمام خصوصیات ان کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ علاوہ ازیں شوکتِ الفاظ، ترنم اور توازن کا بھی ہر لمحہ وہ خیال رکھتے ہیں اور تخیل کی بلند پروازی نے تو ان کی شاعری کو اور چار چاند لگا دیے ہیں، انھوں نے حیات و کائنات کے تمام اسرار و رموز کو اپنی شاعری میں پیش کیا اور دنیائے اردو شاعری کو وسعت بخشی مثلاً ذیل کے اشعار دیکھیے:

اگر تقدیر تیری باعثِ آزار ہو جائے
تجھے لازم ہے اس سے بر سرِ پیکار ہو جائے

جو دھرم پہ بیتی دیکھ چکے، ایماں پہ جو گذری دیکھ چکے
اس رام و رحیم کی دنیا میں انسان کا جینا مشکل ہے

میں اپنے حالِ ماضی پر بھی کچھ اے عرشؔ رو لیتا
مگر پیشِ نظر اس وقت مستقبل کی باتیں ہیں

عصرِ حاضر کے شعرا کا ایک قابلِ ذکر رویہ یہ ہے کہ ان کے اندر جوش، ولولہ، ہمت اور جرأت رندانہ پائی جاتی ہے۔ گویا عہدِ موجودہ کے شعرا حوصلہ افزا اشعار کہنے پر آمادہ نظر آتے ہیں، چنانچہ اس اعتبار سے اگر ہم عرشؔ ملسیانی کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ وہ بھی اس قسم کے اشعار کہنے میں موجودہ دور کے شعرا سے پیچھے نہیں ہیں، درج ذیل اشعار مثال کے لئے کافی ہیں:

اگر ساحل نہیں ملتا تو یہ کم ہمتی کیسی
بھنور میں کیا سفینے کو ڈبو یا بھی نہیں جاتا

جنھیں خود اعتمادی مائلِ تدبیر رکھتی ہے
وہ ناکامی میں بھی تقدیر کو رویا نہیں کرتے

وہ مرد نہیں جو ڈر جائے ماحول کے خونیں منظر سے
اس حال میں جینا لازم ہے جس حال میں جینا مشکل ہے

ہندستانی ادب کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ہی ڈالنے سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ گیت ہندستانی تہذیب آرٹ اور کلچر کی دین ہے۔ ویسے اردو میں گیتوں کی جانب توجہ بہت قلیل تعداد میں لوگوں نے دی ہے۔ پھر بھی اردو میں چند ایسے شعرا کے اسمائے گرامی ضرور قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے اردو ادب کو اچھے گیتوں سے مالا مال کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے اور بہت حد تک اس باب میں نئے نئے اضافے بھی کیے ہیں۔ اس ضمن میں راجہ مہدی علی خاں الطاف مشہدی، جاں نثار اختر، ساحر لدھیانوی، بسمل الہ آبادی اور زبیر رضوی وغیرہم کے نام لیے جا سکتے ہیں اور اسی زمرے میں ہم عرشؔ ملسیانی کو بھی رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے دو خوب صورت گیتوں کے بند ذیل میں درج ہیں۔

"اندھا نیاسے"

اندھا جگ کا نیاسے رے منوا اندھا جگ کا نیاسے
سونے چاندی کی پوجا میں اندھے ہیں دھنوان
ان کی نگری میں ہوتا ہے نردھن کا اپمان
ہم سے سہانہ جائے رے منوا اندھا جگ کا نیاسے

"من کی بات"

پگڈنڈی کی بھول بھلیاں بھیانک کالی رات
بادل گرجے، بجلی کڑکے اور بھری برسات
ایسے میں اپنے ساجن کو ڈھونڈت ڈھونڈت ہار
من کی بات سناؤں کس کو کون سنے گا من کی بات

عہدِ حاضر کے ان معدودے چند کلاسیکل شعرا پر جب میں نگاہ ڈالتا ہوں، جن کی شہرت کا سورج بامِ عروج پر پہنچ چکا ہے تو ان میں مجھے عرشؔ ملسیانی بھی نظر آتے ہیں جو اپنی ذاتی کوششوں اور فطری ذکاوت کی بنا پر ایک ارفع و اعلیٰ مقام پر فائز ہو چکے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا غالباً مبالغہ نہ ہو گا کہ عرشؔ ملسیانی شہرتِ بقائے دوام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں ان کی نظموں، غزلوں اور ان کے گیتوں سے ہندستانی فضا معمور ہے اور یقین ہے کہ ہمیشہ ان کے نغموں کی گونج سنائی دیتی رہے گی۔

قطعہ

راجیو موہن شاداب
رنگ محل۔ سبھاش بازار
میرٹھ

ہے یہی ایک پیغام سب کے لیے
کیجیے کچھ فروغ ادب کے لیے
ہاں غلط ہے یہ تقسیم فکر و عمل
ہم عجم کے لیے تم عرب کے لیے

غزلیں

جعفر عسکری
۱۰ نور اللہ روڈ الہ آباد

یارب سرابِ شوق میں پانی نظر تو آئے
اس بحرِ بے نشاں میں روانی نظر تو آئے

مانا دلوں میں سرد پڑا شعلۂ نفس
پھر بھی نمودِ شعلہ فشانی نظر تو آئے

یرقاں زدہ رگوں میں لہو کچھ تو ہو رواں
بے نور صورتوں پہ جوانی نظر تو آئے

کر دوں خوشی سے نذر اُسے جان و دل مگر
مجھ کو کہیں وہ دشمنِ جانی نظر تو آئے

جس پر کیا تھا ساتھ ترے شوق کا سفر
اس رہگذر کی کوئی نشانی نظر تو آئے

میں خود ہوا ہوں شہر کے آزار سے خجل
لیکن فضائے دشت سہانی نظر تو آئے

جعفر انا پسند طبیعت نہیں مگر
میرے سوا کوئی مرا ثانی نظر تو آئے

چندر پرکاش جوہر بجنوری
۶۔ دیوان بلڈنگ لیڈر روڈ
الہ آباد

زندگی خواب بھی ہے، فتنۂ بیدار بھی ہے
نغمۂ امن بھی ہے، نعرۂ پیکار بھی ہے
شوقِ نظارہ بھی ہے، جلوہ گہِ یار بھی ہے
دیکھنا ہے کہ ہمیں جرأتِ دیدار بھی ہے
کون ہے جس کو نہیں دعوئ عرفانِ خودی
اس حقیقت سے مگر کوئی خبردار بھی ہے
انقلابات کا کیا غم کہ انہی کے دم سے
رونقِ بزم بھی ہے گرمئ بازار بھی ہے
کچھ تو خود حُسن کو ہے جلوہ نمائی سے گریز
اور کچھ مصلحتِ طالبِ دیدار بھی ہے
گرمئ عشق میں دونوں ہیں برابر کے شریک
شمع کے سوز میں پروانے کا کردار بھی ہے
اپنے ماحول کی ناقدرئ پیہم کا شکار
آج کا فن ہی نہیں آج کا فن کار بھی ہے
زندگی عشرتِ پیہم ہی نہیں ہے جوہر
زندگی جہدِ مسلسل کی طلبگار بھی ہے

غزلیں

خاطر حافظی
محلہ شاہ معروف
گورکھپور۔

یونہی گر گر کے ہر گام سنبھلتے رہیے
عشق کا نام نہ بدنام ہو چلتے رہیے

کوئی موسم ہو کسی پیڑ کا سایہ ہی سہی
اسی امید پہ صحرا میں بھی چلتے رہیے

ایک مرکز پہ نہیں آج کی دنیا کا نظام
اپنے ہر خواب کے سانچے کو بدلتے رہیے

دیکھیے صبح کو رنگین ہواؤں کا خرام
یا کہ کمرے کی خموشی سے بہلتے رہیے

منتظر ہوگا کوئی گھر پہ ہمارا خاطر
سونی سڑکوں پہ بہت یوں نہ ٹہلتے رہیے

سید اولاد اصغر رضوی
۳۰۔ جوہری محلہ لکھنؤ ۳

کبھی خوشی نے کبھی بے بسی نے پی ڈالے
ہزاروں درد مری زندگی نے پی ڈالے

جنھیں سنبھال نہ پایا سمندروں کا جگر
کچھ ایسے غم بھی مری آگہی نے پی ڈالے

مرے قلم کو مرے لاشعور نے سونپے
وہ مسئلے جو مری خامشی نے پی ڈالے

نہ جانے کتنے مسرت کے جانفزا لمحے
کبھی کبھی مری آزردگی نے پی ڈالے

بڑے سکون سے تلخابۂ حیات کے گھونٹ
سمجھ کے آبِ بقا بے حسی نے پی ڈالے

عجیب بات ہے پیالے رموزِ قدرت کے
کوئی بھی پی نہ سکا آدمی نے پی ڈالے

* نہ پی سکا جنھیں کوئی بنامِ شوق اصغر
وہ جام زہر بھی سادہ دلی نے پی ڈالے

سلطان احمد نادم
میڈیکل ڈپارٹمنٹ مک وکاس بھون۔
حضرت گنج۔ لکھنؤ

ہے یہ انداز جلوہ آرائی
جھانکتی ہے فضا میں رعنائی
دل میں ہوتی ہیں لرزشیں پیدا
دور بجتی ہے کوئی شہنائی
دل کے انداز کس نے دیکھے ہیں
صرف لالہ نہیں ہے صحرائی
ٹوٹ جاتا ہے ہر تعلق بھی
زندگی ہے خیالِ تنہائی
آج ٹوٹا جمود ہستی کا
فیضِ وحشت ہے دشت پیمائی
چشم بینے نور تھی محبت کی
جس نے بخشی جہاں کو رعنائی
ان کا جلوہ ہر اک نگاہ میں ہے
حسن ہوتا ہے کتنا ہرجائی
خود سمندر بھی جس سے شرمائے
ان کی آنکھوں میں ہے وہ گہرائی
سر سے پا تک ہے رقص کا عالم
ہنس کے لی ہے جو اس نے انگڑائی
کیا محبت کی بات ہو نادم
کوئی وحشی ہے کوئی سودائی

ضیا حسنیؔ
پانڈو نگر۔ کان پور

(افسانہ)

ایک بوند آنسو

پروفیسر نجمی کی زندگی کا دھندلکا تھا۔ اس دھندلے ماحول میں وہ اپنے مستقبل کا بھیانک عکس دیکھ رہا تھا۔ بظاہر اس کی زندگی کسی گہرے سمندر کی سطح کی طرح پرسکون دکھائی دیتی، اسے دیکھ کر ایسا لگتا جیسے اس کے ذہن میں کوئی فکر نہیں کوئی وسوسہ نہ ہو۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ وہ اپنی تیس سالہ ملازمت میں سبکدوش ہو کر اپنے پرفضا بنگلے "فردوس" میں حیات مستعار کے باقی دن گزار رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے رہ رہ کر غم کی پرچھائیاں ابھرتیں اور تنہائی کا کرب اس کے دل میں ایسے کچوکے لگاتا کہ وہ بے چین ہو جاتا اسے اپنی عملی کامرانیوں اور مادی آسائشوں کے درمیان عجیب سی گھٹن محسوس ہوتی کہ وہ سوچنے لگتا کہ اس نے کاہے کو اتنا شاندار بنگلہ تعمیر کرایا، دو کمروں کا مکان زندگی گزارنے کے لیے کافی نہ ہوتا؟ اس مکان کی زمین حاصل کرنے، اس کا نقشہ بنوانے اور اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں اس نے اپنی زندگی کے کتنے بیش قیمت لمحات گنوا دیے۔ لال قلعہ اور تاج محل، مغلوں کی عظمت پارینہ کی داستان سنا رہے ہیں لیکن شاہان مغلیہ کی نسل کا شاید ایک بھی فرد باقی نہیں۔ اس نے انسانی زندگی کا غائر مطالعہ کیا تھا۔ پھر بھی اس سے ایسی چوک ہو گئی کہ جس کی تلافی ممکن نہیں۔ وہ برابر خیالوں کی دنیا میں بھٹکتا رہتا۔ کبھی اسے اپنا بھرا پرا کنبہ یاد آتا۔ کتنے خوش خوش تھے وہ لوگ، پہلے سے اپنی ازدواجی زندگی اچانک یاد آجاتی۔ زہرہ آتنے دھیرے سے اس کے دل میں آ کر بس گئی کہ اسے آہٹ بھی نہیں ہوئی پھر وہ اسے ٹوٹ کر چاہنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ پیار کا بندھن ایسا مضبوط ہو گیا کہ دونوں ایک جان دو قالب ہو گئے! لیکن قدرت کچھ اور ہی فیصلہ کر چکی تھی۔ زہرہ اچانک معیادی بخار میں مبتلا ہوئی۔ بخار کی دھیمی آنچ میں اس کا خون جلتا رہا، چہرہ ہلدی کی طرح پیلا پڑ گیا، بڑی بڑی روشن آنکھیں اب ٹمٹماتی ہوئی لگتیں، رنگ روپ کی دلکشی جاتی رہی، نجمی نے ہزار جتن کیے، لیکن دوا نے کوئی کام نہیں کیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے زہرہ نے اس کی باہوں میں دم توڑ دیا۔ اس سانحہ نے نجمی کی زندگی کو یکسر بدل ڈالا۔ وہ اسے دیوانہ وار یاد کرتا۔ دن میں دو بار اس کی قبر پر جاتا اس کے سرہانے بیٹھا ہوا زار و قطار رویا کرتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی وہ کیفیت تو نہیں رہی لیکن اس نے عزم مصمم کر لیا کہ وہ اب کسی دوسری عورت کا منھ نہ دیکھے گا۔ عہد شباب میں وہ اپنے اس فیصلہ پر مضبوطی سے قائم رہا لیکن جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی اسے کسی ساتھی کی ضرورت بے اختیار محسوس ہوتی رہی۔ جب وہ کسی حسین و جمیل عورت سے باتیں کرتا یا کسی مغنیہ کا دلکش نغمہ سنتا تو اس کا یہی جی چاہتا کہ وقت ٹھہر جائے اور وہ جی بھر کے اس لطف اور مسرت کو حاصل کر لے جس کا اس کی زندگی سے بہت کم تعلق رہا ہے۔ ادھر وہ کسی مہکتے ہوئے دلکش پھول کو دیکھتا تو کشاں کشاں اس کے قریب پہنچتا۔ اس کی مہک سے لطف اندوز ہو کر آگے بڑھ جاتا۔ اس نے کبھی کسی پھول کو گلے کا ہار نہیں بنایا۔

وہ سوچتا کہ عورت اندر کی تپش اور جلن کا مداوا بن کر ابھرتی ہے لیکن وہ کسی کو کیسے اپنا لے؟ اس نے جب کوئی بات کہی ہے تو اس کی پابندی اس نے ننگی تلوار کے سائے میں بھی کی ہے۔ لہٰذا اب وہ کسی عورت کے ساتھ زندگی گزارنے کا معاہدہ نہیں کر سکتا۔ غرض اکثر تنہائی کا کرب اسے مضطرب کرتا اور وہ سوچتا کہ ایسا بھی کوئی نہیں جس سے وہ دو گھڑی باتیں کر کے دل کا بوجھ ہلکا کر لے۔

پندرہ سال پہلے اس نے اپنے بھتیجے نامی اور بھتیجی رعنا کی ساری ذمہ داریاں اوڑھ لی تھیں۔ ان دونوں کی پرورش و پرداخت کے لئے اس نے ایک یوریشین نرس مقرر کی، اپنے بچوں کی طرح انھیں پالا پوسا اور پروان چڑھایا۔ جب نامی بی۔ ایس۔ سی (انجینئرنگ) سے لیس ہو گیا تو وہ اپنی بہن رعنا کے ساتھ جدّہ چلا گیا، وہاں اس نے ایک فلسطینی لڑکی دیمہ سے شادی کر لی۔ نامی نے نجمی کو عمرہ کرانے کے لیے جدّہ بلایا تھا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو رعنا اسے نہیں ملی۔ معلوم ہوا کہ کسی عربی سے مہر کی کثیر رقم لے کر اس نے شادی کر لی ہے۔ وہ رعنا سے بھی ملا، اس کا شوہر زیورات کا تاجر تھا۔ بظاہر وہ خوش خوش دکھائی دی لیکن جلد ہی یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ اس کی حیثیت اس گھر میں کسی لونڈی سے زیادہ نہیں۔ نجمی نے رعنا اور نامی دونوں کو وطن واپس چلنے کا مشورہ دیا۔ لیکن دونوں راضی نہیں ہوئے اور وہ مایوس و ہراساں وطن واپس آ گیا۔

ایک دن وہ بیڈ ٹی لے کر اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا کہ نتھو ایک ٹرے میں توسٹ، مکھن، بوائلڈ انڈا، کیلے اور چائے لے کر آ گیا۔ وہ ناشتہ کر ہی رہا تھا کہ ایک جواں سال حسین و جمیل لڑکی، بیش قیمت بنارسی ساری زیب تن کیے ہوئے آ گئی۔ وہ سمٹی سمٹائی آداب کر کے اس کے سامنے صوفے پر بیٹھنے لگی۔ تو نجمی نے کہا۔

"ناشتہ کر لو حمیرہ!"

اس نے کچھ پس و پیش کیا لیکن نجمی نے اصرار کیا تو وہ اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئی اور ناشتہ کرنے لگی۔ نجمی بولا۔

"حمیرہ! میں سوچتا تھا کہ اب تم میرے یہاں کاہے کو آؤ گی جس دن میں کالج سے رخصت ہو رہا تھا، طلبا کے مجمع پر کئی بار متجسس نگاہ ڈالی کہ شاید تم نظر آ جاؤ لیکن تم کہیں دکھائی نہیں دیں اور میں مایوس اپنے گھر آ گیا۔ اس کے بعد میں بھی تمھیں بے اختیار اور بار بار یاد کرتا رہوں۔"

ایسی بات سنتے ہی حمیرہ کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ اس نے شرماتے لجاتے ہوئے کہا۔

"سر! جس دن آپ کی الوداعی پارٹی تھی اس دن بخار میرے جوڑ جوڑ کو ہلا رہا تھا۔ اسی لیے میں حاضر نہ ہو سکی۔ آپ جس انداز سے شفقت فرماتے ہیں اسے میں محسوس کرتی ہوں جیسے ہی آپ نے کالج کو خیرباد کہا مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ایک شفیق بزرگ کی سرپرستی سے محروم ہو گئی ہوں یقین جانیے! میں نے آپ کی عدم موجودگی کو جس شدت سے محسوس کیا اسے بیان نہیں کر سکتی۔ میں آپ کو فراموش بھی کیسے کر سکتی ہوں۔ آپ کے لیکچر کا دل نشین انداز اور انگریزی ادب پر عبور۔ یہ ساری باتیں مجھے رہ رہ کر یاد آتی ہیں اور میں سوچتی ہوں کہ آپ نے کالج کو چھوڑ کر جو خلا پیدا کر دیا ہے۔ وہ شاید ہی پُر ہو۔"

"کوئی جگہ خالی نہیں رہتی، کوئی دوسرا اس خلا کو پُر کر دیتا ہے یہ بات الگ ہے کہ افراد مختلف صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں اور ان کے کام کرنے کا انداز بھی کچھ بدلا ہوتا ہے۔ اچھا ہوا تم آ گئیں ایک منصوبہ میرے زیر غور ہے جو تمھارے تعاون ہی سے عمل میں آ سکتا ہے۔"

"آپ جو خدمت میرے سپرد کریں گے اسے انجام دینے میں مجھے فخر ہو گا۔ میں ایم۔ اے کر لوں تو کسب معاش اس مقصد سے کروں گی کہ اپنی زندگی تو بہتر طور پر گزاروں اور اپنی بوڑھی والدہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کے ساتھ ساتھ خدمت خلق بھی کروں کاش! میری زندگی کا یہ مقصد پورا ہو جائے۔"

"اگر تمھارا یہ جذبہ ہے تو میں اسے سراہتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تم میرے منصوبے کو ضرور کامیاب بناؤ گی۔ مجھے ہمیشہ سے کمسن بچوں کو بھیک مانگتے دیکھ کر ان کی زندگی کو سدھارنے کا

ل میں جذبہ ابھرتا رہا ہے۔ لیکن زندگی کے ہنگاموں میں مجھے اس کا وقع نہیں مل سکا۔ اب میں نے سوچا ہے کہ پانچ لاوارث بچوں کو اصل کرکے ان کی پرورش و پرداخت اس طرح کروں جیسے ایک مہردار باپ اپنے بچوں کی کرتا ہے۔ ان کی تعلیم و تربیت اور ان کی ضروریات کی مد میں جس قدر رقم صرف ہوگی اسے میں بے دریغ خرچ کروں گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ یتیم خانوں میں ان لاوارث بچوں کو سہارا ملتا ہے اور وہاں انھیں پیٹ بھر کھانا بھی ملتا ہے لیکن جو منصوبہ میرے زیر غور ہے وہ ذرا مختلف ہے۔ یتیم خانوں میں انھیں جو سہولتیں نہیں ملتیں انھیں تمھیں دینا ہوگا۔ ان کی پرورش و پرداخت تمھیں ماں کی طرح کرنا ہوگی۔ ان کے رجحان، ان کے ذوق و شوق، ان کی حرکات و سکنات کو مد نظر رکھنا ہوگا اور اسی روشنی میں ان کی رہنمائی کرنی ہوگی۔ میں تمھاری صلاحیتوں کا بھرپور معاوضہ ادا کروں گا۔ جب بچوں کی تعداد بڑھے گی تو تمھاری مدد کے لئے دو نرسیں بھی متعین کردوں گا۔

ایک بات یہ بھی ہے حمیرہ! جب سے میں نے تمھیں دیکھا ہے دل کا یہی تقاضا ہے کہ تم سدا میری نگاہوں کے سامنے رہا کرو۔ میں تمھیں نہیں دیکھتا تو بے چینی سی محسوس کرتا ہوں۔ دیکھ لیتا ہوں تو دل کو قرار آجاتا ہے۔"

ایسی بات سنتے ہی حمیرہ کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ فوراً ہی وہاں سے چل پڑے لیکن اس نے کسی قدر سوچ کر جواب دیا ــــــ

"میں ماں تو نہیں بن سکی کیونکہ میرا ہاتھ انیس نامی ایک ظالم مرد کے ہاتھ میں دیدیا گیا تھا جو ذہنی بیمار تھا۔ اس نے میرے ذہن پر کاری ضربیں لگائی ہیں وہ اکثر و بیشتر نت نئے ڈھنگ سے مجھے جسمانی اذیتیں دیتا رہا تھا۔ اس کی اُن ذلیل حرکتوں کی وجہ سے مجھے اب کسی مرد پر بھروسا نہیں رہ گیا ہے انیس نے مجھے اس حالت میں بھی زدوکوب کیا کہ جب میں ماں بننے والی تھی۔ اس آڑے وقت میں ایک تجربہ کار ڈاکٹر کام آیا اور اس نے میری جان بچالی۔ اس کے بعد میں اپنے میکے آگئی تو اس وقت سے بدبخت کا منہ کبھی نہیں دیکھا۔ سر! جس طرح ایک سعادت مند شاگرد اپنے شفیق استاد کی خدمت کرتا ہے بالکل وہی جذبہ آپ کے لیے میرے دل میں بھی ہے مجھے کوئی دوسری خدمت سونپ کر سرفراز نہ فرمائیں میں نکاح ثانی کا ارادہ نہیں رکھتی۔"

یہ سنتے ہی نجمی ہنسنے لگا اور اتنی دیر ہنستا رہا کہ نوکر کو تعجب ہوا اس لیے کہ کافی دنوں سے اسے اس طرح ہنستے ہوئے نہیں دیکھا گیا تھا۔

"تمھیں یہ غلط فہمی کیسے ہوئی"۔ اس کے آگے کچھ کہے بغیر وہ سائیڈ روم سے ایک فریم کی ہوئی تصویر لے آیا اور اسے حمیرہ کو دکھاتے ہوئے بولا۔

"زہرہ، حمیرہ کے روپ میں پھر جی اٹھی ہے۔ وہ مجھ سے الگ کیسے رہ سکتی ہے۔ ؛ قبر میں میرا انتظار کر رہی ہے۔ جلد ہی میں سپرد خاک کردیا جاؤں گا لیکن جب تک زندہ ہوں تم میری نگاہوں کے سامنے رہو۔ میری نیت میں ذرا سا بھی کھوٹ نہیں۔"

"حمیرہ! یقین جانو! تمھارا لہجہ، تمھاری گفتگو، مسکرانے کا انداز سبھی کچھ زہرہ سے ملتا ہے ایسی مشابہت تو میں نے کہیں دیکھی نہیں۔"

پھر اس نے اپنی روداد محبت حمیرہ کو سنادی اور وہ مطمئن بھی ہوگئی

پوسٹ گریجویشن کے بعد حمیرہ "فردوس" منتقل ہوکر آگئی۔ نجمی نے پانچ بچوں کو اس کے حوالے کردیا اور یہ حکم بھی دیا کہ وہ ان کی پرورش و پرداخت ایسی فراخ دلی سے کرے کہ یہ بچے اپنی بیتی زندگی کو بالکل بھول جائیں اور یہ بھی کہا کہ ان کو پروان چڑھاتے ہوئے انھیں ایسی تعلیم دو کہ بتدریج ان کے ذہن میں زندگی کی اہمیت بڑھتی جائے علم کی طرف رغبت ہو اور برائی سے نفرت ہو۔

نجمی کی ہدایت کے بموجب حمیرہ ان بچوں کی نگرانی کرنے

لگی۔ صبح سے شام تک وہ ان کی دیکھ ریکھ کرتی، کبھی تھوڑی دیر کے لیے ماں کے پاس بھی آجاتی۔ اس کی ضروریات کی تکمیل کرتی اور پھر اپنے کام میں لگ جاتی۔ دو برس گزر گئے اس عرصہ میں یحییٰ نے کئی بار اس کی کارکردگی پر گہری نگاہ ڈالی اور حسابات کو سختی سے جانچا۔ لیکن اس کے سامنے کوئی ایسی بات نہیں آئی جس سے حمیرہ کی غفلت ظاہر ہوتی۔ یحییٰ اکثر لڑکوں کو اپنے پاس بلا لیتا۔ ان سے باتیں کرتا اور پھر ٹہلتا ہوا ان کے کمرے میں آکر ان کی پوشاکوں، بستروں اور کھانے کا معائنہ کرتا۔ اس معاملہ میں بھی حمیرہ کی نیک نیتی ہمیشہ ابھر کر سامنے آئی۔ پھر بھی وہ ان بچوں کی بہتری کے لیے کوئی مفید مشورہ ضرور دیتا اور حمیرہ اس پر عمل بھی کرتی تھی۔

دن گزرتے رہے۔ اسی طرح دس برس بیت گئے، اب یحییٰ کی عمر ستر برس سے زیادہ ہوگئی تھی۔ ایک دن اس نے حمیرہ کو ناشتہ کے موقع پر بلایا اور کہنے لگا۔

"مجھے ایسی امید نہ تھی کہ میری عمر اتنی طویل ہوجائے گی۔ شاید خدا مجھے اس باغ کو پھولتا پھلتا ہوا دکھانا چاہتا ہے۔ ہاں میں نے اپنے دونوں بنگلے اور دس بیگھے کے قلمی آم کے باغات کو اس نیک کام کے لیے وقف کر دیا ہے۔ میرے انتقال کے بعد تم اس وقف کی متولیہ ہوگی۔ ایک بچہ میڈیکل کالج میں ہے۔ دوسرا انجینیرنگ کالج میں ہے، تیسرا کامرس کی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ باقی دو لڑکیاں بھی ذہین ہیں یہ گریجویشن کر لیں تو انھیں ٹیچرس ٹریننگ کالج میں داخلہ دلا دینا۔ امید ہے کہ اب تم اس کام کو برابر جاری رکھو گی۔ کل سے ایک معمر خاتون تمھاری مدد کے لیے آئیں گی، وہ تمھاری ہدایات کے بموجب کام کریں گی۔ ان کو تین سو روپے ماہوار تنخواہ دی جائے گی۔ تین نو عمر بچے اور آجائیں گے، ان کی نگرانی وہ کریں گی تم ان کی کارکردگی پر نگاہ رکھنا۔"

ایک دن یحییٰ نے حمیرہ کو حسابات کے رجسٹروں کے ساتھ طلب کیا وہ کئی کمروں میں گئی لیکن وہ وہاں نہیں ملا۔ وہ رجسٹر لیے ہوئے صحن میں آگئی تو اس نے دیکھا کہ یحییٰ حوض میں جھکا ہوا ہے وہ اور قریب آئی تو اس نے دیکھا کہ یحییٰ کبوتر کی چونچ کو حوض میں ڈبو رہا ہے اور اس کے ہاتھ میں کبوتر کا خون لگا ہوا ہے۔ اس نے حمیرہ کو دیکھا تو کہنے لگا۔

"حمیرہ! اب مجھے ان کبوتروں سے کافی دلچسپی ہوگئی ہے۔ مطالعہ کتب میں ڈوبا رہتا ہوں یا ان کبوتروں کی نگرانی کرتا ہوں۔ میں نے پچیس روپے کا یہ نیا جوڑا خریدا تھا۔ دیکھو! کتنا خوبصورت ہے یہ، اچانک بلی نے اسے دبوچ لیا۔ میں نے ایرگن سے اس پر فائر کیا لیکن بچ نکلی اور اسے ایسا زخم دے گئی ہے جس سے خون رِس رہا ہے۔"

اسی اثنا میں کبوتر نے آخری ہچکی لی اور دم توڑ دیا۔ یحییٰ نے کرب اندوہ میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

"افسوس حمیرہ! یہ تو مر گیا۔"

"سر! میں تو زندہ ہوں، خدا کے لیے آپ اتنے مایوس اور دیگر نہ ہوں۔ میں اب آپ کو مایوس اور فکرمند دیکھنا نہیں چاہتی۔"

یہ کہتے ہوئے حمیرہ اس کے بالکل قریب آگئی۔ یحییٰ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس کی آنکھیں چھلک پڑیں اور آنسو کی ایک بوند اس کے دوسرے ہاتھ پر گری تو وہ بولا۔

"تم رونے کیوں لگیں حمیرہ؟"

"سر! میں اس لیے رونے لگی کہ یہ کبوتر زخم کی تاب نہ لاکر مر گیا لیکن زخموں سے چور ایک وجود آج بھی مضطرب ہے۔ انیس نے اپنی کڑوی کسیلی باتوں سے ایسے نشتر لگائے کہ وہ زخم بن گئے ہیں۔ کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ مندمل ہوگئے لیکن وہ اکثر اس طرح ہرے ہوجاتے ہیں کہ مجھے کسی کل چین نہیں آتا۔"



بالکرشن گوپال مغموم
۳۱۱ - سکٹر ۱۲ - ڈی چنڈی گڑھ یو.ٹی

منشی پریم چند

میکشو! گردش میں ہے جامِ دوامِ پریم چند
سب سے پہلے مختصر افسانے جس نے لکھے تھے
ناولوں میں بھی تھی جس کے سچی تصویرِ حیات
ہندی و اردو میں یکساں تھا رواں جس کا قلم
وہ حقیقت بیں، حقیقت کیش، حق گو، حق نگار
موت سے بھی آنہ پایا جس کی شہرت کو زوال
وہ بہت سادہ طبیعت، وہ بہت سادہ لباس
وہ بہت خوددار، عالی طبع، نقشِ انکسار
نفسیاتِ مرد و زن سے تھا جو یکسر آشنا
اہلِ زر کے ہتھکنڈوں سے تھا سراسر باخبر
کارخانہ داروں کے، جاگیرداروں کے ستم
قرض داروں پر وہ ساہوکار کے دندانِ آز
وہ پولس کی سختیاں، بیگار کا جبرِ عظیم
غیر ملکی حکمرانوں کا سلوکِ ناروا
وہ کسانوں کے مصائب، مسئلے مزدور کے
ملک بھر میں وہ "زباں بندی" کا قانونِ سیاہ
تاکہ پھر دہقاں نہ ہو جائیں بغاوت کے شرر
اس قدر صبر آزما ماحول میں وہ پریم چند
اس کی تحریروں میں تھا اس وقت کا پورا نشاں
اس کے افسانوں میں وہ دیہات کی منظر کشی
اس کی تحریروں میں تھی مظلوم انساں کی پکار
اس کا نصب العین تھا بیداریِ ہندوستاں.

آؤ! پھر ساغر کو چھلکائیں بنامِ پریم چند
بے تکلف، معتبر افسانے جس نے لکھے تھے
یاس کی کالی گھٹاؤں میں تھی تنویرِ حیات
عہدِ پیری میں بھی تھا کیا کیا جواں جس کا قلم
وہ محبِ ملک و ملت، آدمیت کا وقار
ملکوں ملکوں ہے مسلّم جس کا فن، جس کا کمال
پیکرِ صدق و صداقت، وہ غیور و حق شناس
ماہ طینت، نجم فطرت، گُل مزاج و گُل نگار
وہ جو تھا مزدور و دہقاں سے برابر آشنا
دیکھتا تھا مفلسوں کی آہِ سوزاں کے شرر
طبقۂ بے چارگاں پر فتنہ کاروں کے ستم
جور کے قصے، حکایاتِ ستم ہائے دراز
زندہ انسانوں کی خاطر شعلۂ نارِ جحیم!
ہر محبِ قوم کی گردن پہ شمشیرِ جفا
وہ ستم پیش ماندگاں پر طبقۂ مغرور کے
خامۂ بے باک پر وہ قہر آلودہ نگاہ
حاکمانِ وقت کی تھی ہر صحافی پر نظر
خامہ فرسا تھا بصدقِ دل، بصد عزمِ بلند
سب کے سب اوہامِ کہنہ اور فرسودہ رواج
بے غرض، بے لوث، وہ معصوم سادہ زندگی
اس کا موضوعِ سخن، سرمایہ داری کا شکار
اس کا اک اک لفظ تھا تنویرِ دل، تنویرِ جاں

آؤ اس کی یاد مل جل کر منائیں شوق سے
اس کی عظمت، اس کے فن کے گیت گائیں شوق سے

ڈاکٹر فضل امام
شعبۂ اردو فارسی، راجستھان یونیورسٹی، جے پور

پریم چند کے ورثہ کی موزونیت

ادب اور فن کے ذریعہ ماضی کی روایات کا تجربہ اور تجزیہ کیا جاتا رہا ہے اور حال و مستقبل کے مطالبات و موضوعات، ادب اور فن میں امید کی کرن پیدا کر کے انھیں ترقی یافتہ بناتے رہے ہیں۔ اس لیے ادب اور فن کے تخلیقی عمل میں یہ بھی محسوس کیا جاتا رہا ہے کہ ادیب اور فن کار اپنے ماضی اور عہد کا رہین منت ہوتا ہے لیکن تاریخی مشاہدہ اور تجربہ یہ بھی بتاتا ہے کہ بڑا اور سچا فنکار صرف فضا، ماحول، پس منظر اور پیش منظر کا ہی رہین منت نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے لیے خود ماحول ڈھالتا ہے ــــ لیکن اس سے بھی بڑے اور عظیم فن کار اور ادیب وہ ہوتے ہیں جن کی فن کارانہ گرفت میں صرف ان کا ماحول، تاریخی عہد اور جغرافیائی سرحدیں ہی نہیں ہوتیں۔ بلکہ ان کی دسترس میں مستقبل قریب اور مستقبل بعید کے تمام تر وسیع امکانات ہوتے ہیں۔

بقول اقبال ؎

کھول کر آنکھیں مرے آئینہ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

جن کا فن ہر دور کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ اس اعتبار سے منشی پریم چند کے وارث اور میراث کی اہمیت اور موزونیت جتنی کل تھی اتنی ہی آج بھی ہے۔

واضح رہے کہ میں پریم چند کو اوتار یا پیغمبر کا درجہ نہیں دیتا۔ اور نہ ہی انھیں فرشتہ یا فرشتہ خصلت قرار دیتا ہوں۔ پریم چند اول و آخر انسان تھے اور ایک باشعور فن کار۔ اس کے علاوہ انھیں اور جو کچھ کہا جائے گا وہ عدم واقفیت کی دلیل اور نادان دوستی کے ذیل میں آئے گا۔ پریم چند کے سلسلے میں کسی موازنہ بمعنیٰ مقابلہ کا بھی قائل نہیں ہوں۔ کیونکہ کسی بڑے فن کار کی اس سے بڑھ کر کوئی توہین نہیں ہو سکتی کہ اس کا کسی سے مقابلہ کر کے اسے "عظیم" تسلیم کیا جائے یہ اور بات ہے کہ عظمتوں کی سرحدیں اکثر و بیشتر مل جاتی ہیں ــــ

پریم چند اپنے عقیدت مندوں اور مخالفوں کے ذریعہ بھی تختۂ مشق بنائے گئے اور اسی افراط و تفریط کے نتیجہ میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ انھیں "فرقہ پرست" بھی قرار دیدیا گیا۔ اگرچہ ان ذہنی قلابازیوں سے پریم چند کی بلندیوں پر کوئی حرف نہیں آسکا ہے بلکہ ان سب اختلافات سے پریم چند کی شخصیت و فن اور نکھر کر سامنے آیا ہے۔ ناعاقبت اندیشان فن و ادب، اختلافات سے دور رہ کر فن و ادب کو دیکھنے کے عادی ہیں۔ جبکہ وہی شخص وہی ذات اختلافی ہوتی ہے یا اختلافی بنائی جاتی ہے جس میں علم و فن کا وجود ہوتا ہے۔ جب علم نہیں ہوگا تو اختلاف کس چیز کا ــــ جب فن ہی نہ رہے گا تو تردید و مخالفت کس لیے۔ لہٰذا شخصیت، علم اور فن کے لیے اختلافات کو لازمی ٹھہرایا جا سکتا ہے، اور پھر ذہن انسانی کا کیا کہنا ــــ جب چاہتا ہے اور جہاں چاہتا ہے۔ اختلافات پیدا کر ہی ڈالتا ہے۔ یہاں تک کہ وجود باری تعالیٰ کے باب میں بھی

خلاف پایا جاتا ہے۔

پریم چند کو بھی "اختلافی" طبقہ کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ انھیں تخلیقی فن کار تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا گیا۔

اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک ایسا مصوّر ہے، ایک ایسا پیکر تراش ہے جو زندگیوں سے کہانی لیتا ہے، زندگیوں کی کہانیوں کو دیکھتا ہے، اور جو دیکھتا ہے، محسوس کرتا ہے وہی لکھتا ہے اس لیے پریم چند حقیقی "تخلیقی" فن کار ہے۔ بنارس کی گھاس منڈی میں وہ پہروں گھاس والوں سے بیٹھ کر باتیں کرتا تھا۔ بیڑی پلاتا تھا اور پیتا تھا اور جب گھاس والے دریافت کرتے کہ آپ ہم لوگوں کے پاس پہروں بیٹھ کر کیوں وقت گنواتے ہیں؟ تو وہ جواب دیتے "تم اپنا کما رہے ہو اور میں اپنا کما رہا ہوں۔"

کیا آج گھاس والوں کا طبقہ ختم ہو گیا ہے؟ کیا آج گھسیاری منڈی بند ہو گئی ہے؟ نہیں۔ اس لیے پریم چند کا ورثہ آج بھی زندہ ہے اور ان کے فن کی افادیت آج بھی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ پریم چند کا ناول "گئودان" قدیم زندگی کا رجحان ہے۔ چنانچہ اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس ناول میں پریم چند نے دیہی زندگی کو مرکز بنایا ہے اور اپنی تمام تر توجہ کسانوں کی زندگی پر مرکوز کی ہے۔ لیکن حقیقتاً "گئودان" کا کینوس بڑا وسیع ہے۔ اس میں دیہی زندگی کے ساتھ ساتھ شہری زندگی کے مسائل کا احاطہ بھی کیا گیا ہے۔

گئودان کا مخصوص مسئلہ کسانوں کی زندگی کا مسئلہ ہے اگرچہ کسانوں کی زندگیوں کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے پھر بھی کسانوں کا قرض کے بوجھ سے دبے رہنا بہت اہم ہے۔ قرضے کے باعث کسان کس طرح پیسا جاتا ہے۔ ھوری ایسے ہی کسان کی مثال ہے۔ لیکن کسانوں کی زندگی کے ساتھ پروفیسر مہتہ کا کردار اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ شہری زندگی سے بھی یہ ناول جڑا ہوا ہے۔

میدانِ عمل ہو یا غبن، کایا کلپ ہو یا رنگ بھومی، نرملا ہو یا بازارِ حسن، ان سبھی ناولوں میں کسی نہ کسی خصوصی سماجی مسئلے کو پیش کیا گیا ہے۔

اسی طرح ہندو مسلم اتحاد کے سلسلے میں پریم چند نے جس طرح کے پیکر تراشے ہیں ان کی ضرورت آج ۱۹۸۰ء میں بھی ہے اور بعد کو بھی اس کی ضرورت رہے گی۔

پریم چند کا قلم دراصل ایک ایسے مزدور کا قلم ہے جو سعیِ مسلسل اور جہدِ پیہم میں یقین رکھتا ہے۔ جب انھوں نے حالات کے بدلے ہوئے تقاضے دیکھے تو قلم کو تلوار بنا لیا۔ پریم چند نے قلم کو حرکت دی تو پہلی جنگِ عظیم کے بادل تمام دنیا پر چھائے ہوئے تھے اور جب حرکتِ قلم بند ہونے لگی تو دوسری جنگِ عظیم کا انقلاب پرورش پا رہا تھا۔ اس طرح دو عظیم جنگوں کی درمیانی مدت میں پریم چند نے اپنے فکر و فن کو تحفظِ ناموسِ انسانیت کے لیے وقف کر دیا۔

سماجی فلاح و بہبود اور امن و آشتی کا معاملہ ہو یا ملکی نظام کی بہتری اور امن و سکون کی بات ہو، بلندی و پستی، ذات، پات، چھوا چھوت اور توہم پرستی وغیرہ سماجی زندگی کے جتنے پہلو ہیں پریم چند نے ان سب کو آئینہ دکھایا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ پریم چند نے جاگیردارانہ نظام اور زمینداروں کے استحصال کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے، لیکن اب تو جاگیرداری اور زمینداری ختم ہو گئی ہے، اس لیے اب ان کے افسانوں اور ناولوں کی کیا افادیت اور موزونیت رہ جاتی ہے۔؟

اس سلسلے میں میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جاگیرداری اور زمینداری ختم تو ضرور ہو گئی ہے لیکن ان کے پس پشت کارفرما ذہنیت کا ابھی مکمل طور پر سدباب نہیں ہوا ہے۔ یعنی اقبال کے الفاظ میں ؎

گرچہ اسکندر رہا محرومِ آبِ زندگی
فطرتِ اسکندری اب تک ہے گرمِ نائے و نوش

میرا ایک سوال ہے۔؟

کیا ملک میں جہالت، افلاس، توہم پرستی کورانہ تقلید جیسی لعنتوں اور چور بازاری، رشوت ستانی، ناانصافی، چھوا چھوت فرقہ پرستی، تعصب اور سماجی نابرابری، کا بالکل خاتمہ ہو گیا ہے؟ کیا سبھی باشندگانِ ملک اپنے حقوق و فرائض سے آشنا ہو گئے ہیں۔؟ ظاہر ہے کہ یہ سب لعنتیں آج بھی موجود ہیں۔ اس لیے پریم چند

(بقیہ صفحہ ۴۸ پر)

ڈاکٹر سعید عارفی
شعبۂ اردو کے۔ جی۔ کے۔ پوسٹ گریجویٹ کالج
مراد آباد۔ یو۔ پی

پریم چند کا ایک ابتدائی ناول

ہم خرما و ہم ثواب

"ہم خرما و ہم ثواب" پریم چند کا دوسرا ناول ہے اس کے دو ایڈیشن شائع ہوئے۔ پہلا ایڈیشن بابو مہا دیو پرشاد ورما نے شائع کیا اور دوسرا ایڈیشن نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوا مگر کسی ایڈیشن پر سن اشاعت درج نہیں ہے۔ امرت رائے نے "زمانہ" میں شائع شدہ اشتہارات اور تبصرے کی بنیاد پر "ہم خرما و ہم ثواب" کا سن اشاعت ۱۹۰۶ء متعین کیا ہے اور یہی سن اشاعت صحیح معلوم ہوتا ہے۔ پریم چند نے امتیاز علی تاج کے نام ۲۹ جنوری ۱۹۲۱ء کو خط تحریر کرتے ہوئے "ہم خرما و ہم ثواب" کو اپنی ۱۹۰۰ء کی تصانیف میں شامل کیا ہے مگر یہ قرین قیاس نہیں ہے۔ کیونکہ "زمانہ" میں ستمبر ۱۹۰۶ء سے "ہم خرما و ہم ثواب" کے اشتہارات برابر ملتے ہیں اگر "ہم خرما و ہم ثواب" کی اشاعت پہلے ہوئی ہوتی تو منشی دیا نرائن نگم سے پریم چند کے تعلقات کے پیش نظر کسی تاخیر سے اشتہار کی اشاعت کا سوال ہی نہیں ہے اس لیے ہم شائع شدہ اشتہارات کی بنیاد پر "ہم خرما و ہم ثواب" کو پریم چند کا دوسرا ناول کہہ سکتے ہیں۔

"ہم خرما و ہم ثواب" کا ہندی ترجمہ ۱۹۰۷ء میں "پریما" کے نام سے شائع ہوا۔ "پریما" کی اشاعت انڈین پریس الہ آباد سے ہوئی۔ اس طرح پریما الگ سے پریم چند کا کوئی طبع زاد ناول نہیں ہے بلکہ ان کے اردو ناول "ہم خرما و ہم ثواب" کا ہندی ترجمہ ہے۔ "پریما" کے کرداروں کے نام پلاٹ اور مسائل سب "ہم خرما و ہم ثواب" کے مماثل ہیں۔ "ہم خرما و ہم ثواب" کا اردو ایڈیشن عام طور پر نایاب ہے اس کا ایک نسخہ ڈاکٹر قمر رئیس کے پاس موجود ہے۔ امرت رائے نے پریم چند کے ابتدائی ناولوں کو "منگلا چرن" کے نام سے مرتب کرتے وقت "ہم خرما و ہم ثواب" کو شامل کر لیا ہے۔ اردو ایڈیشن دستیاب نہ ہونے کی بنا پر زیر نظر مطالعہ میں ہندی ایڈیشن کو بنیاد بنایا گیا ہے۔

پریم چند نے اپنے پہلے ناول "اسرار معابد" میں بھی عورتوں کے مسائل کو موضوع بنایا تھا مگر اسرار معابد میں وہ عورتوں کے مذہبی مقامات پر جانے اور لوگوں کے مذہب کے پردے میں محفل عیش و نشاط آراستہ کرنے کے رویے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر کے رہ گئے تھے "اسرار معابد" میں مسائل پر ان کی گرفت ڈھیلی ہے اور ان کی اس کمزوری کا احساس اس ناول میں قاری کو قدم قدم پر ہوتا ہے "ہم خرما و ہم ثواب" میں بیوگی کے مسئلے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ پریم چند کی فکر پر اس دور کی آریہ سماجی تحریکات کے اثرات نے اس ناول میں بیوگی کے مسائل کے حل کو ایک انقلابی کیفیت عطا کر دی ہے۔ اس طرح واضح ہو جاتا ہے کہ عورت اور بیوگی کے مسائل ابتدا سے پریم چند کے فکر و فن کا جز رہے ہیں۔

چونکہ پریم چند کے فکر و فن کی اساس بیوگی کے مسائل اور اصلاح معاشرت پر ہے اس لیے وہ "ہم خرما و ہم ثواب" کی ابتدا بھی اصلاح معاشرت سے کرتے ہیں۔ انھوں نے ناول کی ابتدا میں آگرہ کے خادم قوم لالہ دھنک دھاری لال سے ایک

جوش تقریر اصلاح معاشرت کے موضوع پر کرا دی ہے، جس سے امرت رائے جو ناول میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے، متاثر ہوتا ہے اور اپنی زندگی کو یکسر بدلنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

امرت رائے ایک نوجوان وکیل ہے۔ شہر کے امیر کبیر اور عزت دار لوگوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ اس کے باپ شہر کے نامی گرامی وکیلوں میں تھے۔ انھوں نے خاصی دولت کمائی تھی مگر انگریزی تہذیب و تمدن کو ناپسند کرتے تھے اس کے برعکس امرت رائے کے مزاج پر انگریزی تہذیب و تمدن کا گہرا اثر تھا۔ اس نے ابتدائی درجات سے انگریزی تعلیم پائی تھی۔ باپ کی موت کے بعد اس نے ایک خوبصورت مکان دریا کے کنارے بنوایا تھا اس مکان کی تعمیر کے وقت اس کو اپنے کئی آبائی مکانات فروخت کرنے پڑے تھے جو بہت معمولی قیمتوں پر فروخت ہوئے۔ ان باتوں کے علاوہ اس کو بچپن سے ہی مطالعہ کا شوق تھا اور اس کے پاس ایک اچھی لائبریری تھی جس میں مختلف علوم کی کتابیں موجود تھیں اسے فنون لطیفہ سے بھی گہری دلچسپی تھی وہ مجرد زندگی گزار رہا تھا اس کا خیال تھا کہ جب تک اس کی وکالت شباب پر نہ آ جائے شادی کرنا مناسب نہیں۔

چونکہ امرت رائے مکمل طور پر انگریزی تہذیب میں گرفتار تھا اس لیے لوگ اس کی طرز معاشرت کی تبدیلی کو ناپسند کرتے تھے۔ لالہ بدری پرشاد ملک کی قدیم روایتوں کے دلدادہ تھے روزانہ بھاگوت کی کتھا کرنا فرض سمجھتے تھے وہ سادھوؤں فقیروں کو کھانا کھلاتے ہر صبح گنگا میں اشنان کرتے تھے چنانچہ ان کا طرز زندگی لوگوں کے لیے پسندیدہ بن گیا تھا اس مزاج اور کردار کے انسان کو امرت رائے کیونکر پسند آسکتا تھا، وہ اسے بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے انھوں نے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی مگر اپنی باتوں کو بے اثر دیکھ کر خاموش ہو رہے منشی بدری پرشاد اور امرت رائے کے مزاج و کردار کے تضاد کی تصویر کشی میں پریم چند نے اس تہذیبی زندگی کی تبدیلی کی طرف بعض اہم اشارے کیے ہیں، جو نئی تعلیم کی بدولت ملک گیر مقبولیت حاصل کر رہی تھی۔ انھوں نے چابکدستی سے سماجی قدروں کی شکست و ریخت کے عمل پر تبصرہ کیا ہے جس میں ایک طرف بدری پرشاد امرت رائے کو ناپسند کرتا ہے لیکن بظاہر دنیا سے نفرت کے باوجود ایک ایسے نوجوان کی تلاش کرتا ہے جو نئی روشنی سے سنوارا گیا ہو اور معنوی دولت کے ساتھ ظاہری دولت بھی رکھتا ہو، اس لیے تمام باتوں کے باوجود وہ اپنی بیٹی پریما کی شادی امرت رائے سے کرنا چاہتا ہے کیونکہ سارے شہر میں انھیں امرت رائے جیسا کوئی دوسرا لڑکا نظر نہیں آتا جس کے پاس علم بھی ہو، دولت بھی ہو اور خاندانی وقار بھی ہو۔ لالہ بدری پرشاد امرت رائے کے خیالات و معیار کے مطابق پریما کو انگریزی فارسی اور ہندی کی تعلیم دلواتے ہیں، پریما حسن صورت میں لاجواب تھی مگر تعلیم نے اس کے حسن میں مزید اضافہ کر دیا منشی بدری پرشاد بظاہر امرت رائے کی انگریزیت کا مخالف نظر آتا ہے لیکن جب اسے یہ خبر ملتی ہے کہ امرت رائے سماجی و مذہبی اصلاحات کی تحریکات سے وابستہ ہو گیا ہے تو اس کی خفگی بڑھ جاتی ہے اسے اصلاحی تحریکات میں عیسائیت کا شائبہ نظر آتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ امرت رائے نے اپنا خاندانی مذہب و مسلک ترک کر دیا ہے چنانچہ اس نے خفا ہو کر امرت رائے سے پریما کا رشتہ ختم کر دیا۔ پریما سے رشتہ ٹوٹنے کے واقعہ نے امرت رائے کو شدت سے متاثر کیا مگر اس نے اپنی اصلاحی سرگرمیوں میں کمی نہ کی بلکہ اپنا زیادہ تر وقت تحریک کی نذر کرنے لگا۔

امرت رائے کا قریبی اور عزیز ترین دوست دان ناتھ، جو پریما کے حسن و جمال پر فدا اور اس سے شادی کا خواہش مند ہے مگر امرت رائے کو اس کا منگیتر دیکھ کر زبان نہیں کھولتا وہ امرت رائے کی مذہبی و معاشرتی اصلاحی تحریکات سے وابستہ ہو کر تکمیل آرزو کی تمنا کرتا ہے۔ وہ بدری پرشاد کی امرت رائے کے درمیان خلیج کو وسیع سے وسیع تر بنانے کے لیے افواہیں پھیلاتا ہے اور بدری پرشاد کی نظر میں امرت رائے کے مقابلہ میں اپنی حیثیت کو ترجیحی بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

پریما کے مکان کے قریب رہنے والے ایک پنڈت بسنت کمار کسی دفتر میں کلرک تھے جن کی بیوی پورنا اور پریما کے گہرے مراسم تھے۔ بسنت کمار کے دفتر جانے کے بعد پورنا اپنا زیادہ تر وقت پریما کے گھر پر گزارا کرتی تھی اور دونوں آپس میں راز و نیاز کی باتیں کیا کرتی تھیں۔ بابو امرت رائے بسنت کمار سے واقف تھے اور انھیں کی سفارش سے بسنت کمار کو ملازمت ملی تھی۔ بسنت کمار ایک دن گنگا میں نہانے گئے تھے کہ ڈوب گئے۔ لوگ اظہار ہمدردی کے لیے پورنا کے پاس آئے جن میں پریما، پریما کا بھائی کملا پرشاد اور ڈپٹی منشی بدری پرشاد بھی تھے۔ امرت رائے کچہری سے آتے ہوئے پورنا کے پاس تعزیت کے لیے آئے اور ہر طرح سے اس کی امداد کا وعدہ کیا۔ پریم چند کے لفظوں میں:

"امرت رائے نے مہری کو دلاسہ دیا اس کو پورنا کی خبر گیری کی تاکید کی۔ دہلیز میں کھڑے ہو کر پورنا کو سمجھایا اور اس کو ہر طرح سے مدد دینے کا وعدہ کر کے چراغ جلتے جلتے اپنے بنگلے کی طرف روانہ ہوئے۔"

رفتہ رفتہ اس کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا۔ شروع میں تکلف کے پردے حائل رہے۔ پھر پورنا سامنے آنے لگی۔ امرت رائے اس کے گھر جاتا اور اس کی خبر گیری کرتا۔ بسنت کمار کی موت کے بعد کئی ماہ مختلف مذہبی رسومات کے ادا کرنے اور برہمنوں وغیرہ کو کھانا کھلانے میں صرف ہو گئے۔ ان ہنگاموں سے فرصت ملی تو ایک نیا ہنگامہ ہوا، ہندو معاشرے میں بیوگی کی علامت کے طور پر اس کا بال منڈوانا ضروری تھا لیکن پورنا نے اپنے سر کے بال نہیں منڈوائے جس پر محلہ اور پاس پڑوس کی عورتوں نے طرح طرح کی چہ می گوئیاں شروع کر دیں۔ پریم چند نے پورنا کے ذریعہ دقیانوسیت، فرسودگی اور تقلید پسندی کی بنیادوں پر حملہ کرنے کی کوشش کی ہے پورنا بیوگی میں سر منڈوانے اور دوسری رسموں کی ادائیگی سے گریز کر کے اس نظام کے کھوکھلے پن پر کاری ضرب لگاتی ہے، اسی سے بغاوت اور انقلاب کے رجحان کو تقویت مل سکتی تھی لیکن چونکہ پریم چند کی بغاوت پسندی اور انقلاب آفرینی رسومات کی اصلاح تک محدود تھی، اس لیے پورنا کو ان عوامل سے گزارتے ہیں جن کی آخری تان سماجی اصلاح پر ٹوٹتی ہے۔ پورنا کے رویے پر معاشرہ نے اعتراض کیا مگر بے سود۔ امرت رائے کے پورنا کے یہاں آنے کو ناپسند کیا گیا لیکن امرت رائے کی شخصیت اور وقار کے پیش نظر کسی کو کچھ کہنے کی جرأت نہ تھی پورنا اپنے دور کی تعلیم یافتہ وسیع النظر اور روشن خیال خاتون ہے۔ اس میں حالات کے خلاف نبرد آزمائی کا عزم و حوصلہ ہے، لیکن وہ جس ماحول کی پروردہ ہے اس میں عورت اظہار کا ہنر نہیں سیکھ پاتی، اسے امرت رائے پسند ہے لیکن اپنی پسند کسی پر ظاہر نہیں کرتی۔

امرت رائے کے اظہار شوق نے پورنا کے جذبات متلاطم کر دیے۔ اسے امید نہیں تھی کہ امرت رائے اس سے شادی کے لیے تیار ہو جائیں گے کیونکہ اس میں کئی طرح کی پیچیدگیاں تھیں اولاً اس کی بیوگی ہی کیا کم ستم تھی، دوم ذات برادری کا فرق۔ اسے اس بات کا خوف دامن گیر رہتا ہے کہ اگر اس نے امرت رائے سے شادی کی تو سماج میں انگشت نمائی ہوگی لیکن امرت رائے کے خط کا آخری فقرہ اسے انکار کرنے سے روک دیتا ہے۔ پریم چند نے اس کی ذہنی کش مکش کی خوبصورت تصویر کشی کی ہے کہ اس ادھیڑ بن میں کسی طرح اس کا سارا دن گزر گیا اور وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔ اسی دوران امرت رائے اس کے گھر آجاتا ہے اس نے دیکھا کہ پورنا کے ہاتھ کنگنوں سے خالی ہیں:

"اس نے امرت رائے کی طرف دیکھا آنکھیں لال تھیں انھوں نے اس کی طرف دیکھا۔ چہرے سے حسرت برس رہی تھی دونوں کی نگاہیں ملیں۔ امرت رائے بے اختیار جوش سے اس کی طرف بڑھے اور اس کا ہاتھ لے کر کہا

.... پورنا، ایشور کے لیے مجھ پر رحم کرو۔"

ان فقروں کا اس پر خاطر خواہ اثر ہوتا ہے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے اور اسی عالم میں اپنا سر امرت رائے کے کاندھے پر رکھ دیتی ہے اس کے آنسوؤں کے تاروں میں

امرت رائے کو رشتہ امید نظر آتا ہے اور وہ اسے اپنے قریب بٹھا کر اس کی سونی کلائیوں میں کنگن پہنا دیتا ہے۔ وہ امرت رائے کے کنگن پہنانے پر کسی قسم کی مزاحمت نہیں کرتی اس طرح پورنا خاموش اظہار رضامندی کر دیتی ہے۔

اس شادی کا علم لوگوں کو ہوتا ہے، تو مخالفت کرتے ہیں شہر کے بدمعاش آوارہ لوگ، پنڈت ٹھاکر، ہزاروں غریب امیر برہمن، سیٹھ ساہوکار منشی بدری پرشاد کے مکان پر جمع ہو کر شادی کو روکنے کا منصوبہ بناتے ہیں۔ بیوہ کی شادی کے بارے میں اس وقت کی مروجہ دلیلوں کا پریم چند نے چابکدستی سے تجزیہ کیا ہے، جس میں ایک طرف پنڈتوں کی برادری بیوہ کی شادی کو ناجائز قرار دیے اور امرت رائے سے مناظرہ کرنے کے لیے تیار ہے اور دوسری جانب شہر کے وکیل مل کر کسی ایسی نظیر کی تلاش میں سرگرداں ہیں جس کی رو سے اس شادی کو غیر قانونی اور ناجائز قرار دیا جا سکے۔ ہر فرد کو اس بات کا غم ہے کہ امرت رائے چھتری ہو کر برہمنی سے شادی کر رہے ہیں۔ امرت رائے کا ردعمل پریم چند کی زبان سے سنیے:

"رات تو کسی طرح کٹی، صبح ہوتے ہی منشی بدری پرشاد صاحب کے دولت خانے پر شہر کے شرفا وعلما، امرا و غربا مع کئی ہزار برہمنوں اور شہریوں کے جمع ہوئے اور تجویز ہونے لگی کہ یہ شادی کیونکر روکی جائے"۔

پریم چند نے مسائل کے تجزیے کے سلسلے میں سماجی مراسم میں شدت کے عناصر کو نمایاں کرنے کے لیے کئی طرح کے تصادم کا بیان کیا ہے۔

پریم چند نے مسائل کے تجزیہ کے سلسلے میں سماجی مراسم میں شدت کے عناصر کو نمایاں کرنے کے لیے کئی طرح کے تصادم کا بیان کیا ہے، جس میں امرت رائے اپنے مخالفوں کے تیور دیکھ کر گھبراتا ہے، ہمت کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنے کی جرأت پیدا کرتا ہے لیکن چونکہ انقلابی ذہن قانونی مصالح کا پابند ہے اس لیے سب سے پہلے مجسٹریٹ کی خدمت میں حاضر ہو کر شر پسندی کی شکایت کرتا ہے اور اپنی حفاظت کے لیے پولیس کا انتظام کراتا ہے۔ مخالفین پر اس کا شدید ردعمل ہوتا ہے۔

پورنا اور امرت رائے کی شادی کی جدوجہد کو پریم چند نے آدرش کے زیور سے آراستہ کر دیا ہے، جس کے زیر اثر بیوہ کی شادی کی مخالفت میں کمی آجاتی ہے اور رام کلی اور لچھمی کی شادیاں امرت رائے کی تحریک سے وابستہ افراد سے ہو جاتی ہیں۔ رام کلی اور لچھمی پورنا کی سہیلیاں ہیں اور اسی کے گھر پر رہنے لگتی ہیں، جس سے ان کی تربیت ہونے لگتی ہے اور ان میں اصلاحی کاموں سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔

زیر نظر ناول کا ان کے گزشتہ ناول "اسرار معابد" سے موازنہ کیا جائے تو ایک مسئلہ خاص طور پر مرکز توجہ بنتا ہے۔ دونوں ناولوں میں مندروں میں ہونے والی برائیوں پر سے پردے ہٹائے ہیں اور رام کلی دونوں جگہوں پر دو مختلف کردار رکھنے کے باوجود مندروں کی اصلاح کا ذریعہ بنتی ہے، زیر نظر ناول میں اس کے وسیلے سے مندروں کی زندگی اور تعیش پسندی پر ضرب کاری لگتی ہے "اسرار معابد" کی رام کلی سے یہ رام کلی اس حد تک مختلف ہے کہ یہ رام کلی شادی کے فوراً بعد ہی بیوہ ہو گئی تھی اور روز ہی گنگا اشنان اور پوجا کے لیے جایا کرتی تھی، چونکہ گھر میں اس کی دنیا بہت محدود تھی اس لیے اس نے گھر سے باہر گھاٹ پر مندروں میں اور پنڈوں کے درمیان اپنی زندگی اور دنیا کو وسعت دے رکھی تھی۔ رام کلی کی ہر ایک سے آشنائی تھی مگر گھر میں جب وہ رہتی تو بیوگی کے لبادہ کو اپنے وجود پر اوڑھے رہتی جب کہ وہ باہری دنیا میں گھر کی زندگی سے مختلف زندگی گزارتی۔ پورنا بھی بیوہ ہونے کے بعد گنگا اشنان کے لیے ہر صبح جایا کرتی تھی، ایک دن رام کلی اسے ضد کر کے مندر بھی لے گئی۔ رام کلی اپنا زیادہ سے زیادہ وقت گھر سے الگ مندروں وغیرہ کی نذر کرتی تھی۔

زیر نظر مطالعہ میں اس حقیقت پر نظر رکھنے کی ضرورت

(بقیہ صفحہ ۴۸ پر)

ایس۔ ایم۔ عصیم
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی دہلی

زادِ راہ کے افسانوں کا تجزیہ

زادِ راہ کے افسانے پریم چند کی افسانہ نگاری کے ایسے دور کی تخلیق ہیں جب انھوں نے فنی اعتبار سے ترقی کی بہت سی منزلیں طے کر لی تھیں۔ اس مجموعہ میں ان کا فن اپنی بلندیوں پر نظر آتا ہے۔ وہ مثالیت پسندی اور رومانیت جو ان کے ابتدائی افسانوں پر حاوی تھی اس کے اثرات اس مجموعہ میں کم سے کم ہیں، اب انھیں اس بات کا گہرا احساس ہو گیا تھا کہ افسانوں کا مواد ماضی کے رنگین دور یا مستقبل کی خیالی دنیا میں نہیں بلکہ اپنی قریبی زندگی اور اس کے مسائل میں مضمر ہے۔ ان مسائل کا تعلق معاشرت سے بھی ہے اور سیاست سے بھی۔ چنانچہ اس مجموعہ کے افسانوں کو سیاسی، سماجی یا معاشی نوعیت کا کہا جا سکتا ہے تاہم ان کا موضوع ہماری روزمرہ کی جانی پہچانی زندگی ہے۔ دو ایک افسانے ایسے ہیں جن کا حقیقت نگاری سے کم تعلق ہے اور جن میں پریم چند کے لاشعور میں موجود عقائد کام کر رہے ہیں مثلاً "ڈامل کا قیدی"۔ اس کے علاوہ تمام افسانوں میں پیش کردہ زندگی ایسی ہے جس کی تصدیق ہر شخص اپنی زندگی کے تجربات سے کر سکتا ہے۔ بلاشبہ فکر، فن اور اسلوب کے اعتبار سے ان افسانوں میں پختگی کا احساس ہوتا ہے۔ پریم چند بنیادی طور پر زندگی آمیز ادب کے قائل تھے۔ اس لیے جس طرح زندگی کا دھارا بدلتا رہا ان کے فن میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں۔ ان کے عہد میں گاندھیائی نظریات تیزی سے پھیل رہے تھے گاندھی جی کے فلسفہ میں سچائی، عدم تشدد اور اخلاقیات کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ اس لحاظ سے پریم چند کے یہاں جو حقیقت پسندی ملتی ہے وہ محدود اور CONDITIONAL ہے جس کی نشان دہی زادِ راہ کے بیشتر افسانوں سے بھی ہوتی ہے۔

"زادِ راہ" کے افسانوں میں ادب اور سماج کے رشتہ کو بہت واضح طور پر سمجھنے کی کوشش ملتی ہے۔ انھوں نے جس طبقہ کے مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے اس میں وہ بذاتِ خود ایک فرد کی حیثیت سے شریک رہے ہیں وہ ذاتی طور پر ان مسائل سے دوچار ہوئے اور ان کو حل کرنے کے لیے انھوں نے ادب کو وسیلہ بنایا۔ پریم چند کی نظر میں ادب زندگی کو بہتر بنانے کا ذریعہ ہو سکتا ہے اس لیے انھوں نے تنوطیت کی ترجمانی سے دامن بچایا اور زندگی کی رجائی قوتوں کو ابھارنے کی کوشش کی۔ پریم چند نے سماج پر ادب کے اثرات کو خصوصی اہمیت دی۔ زادِ راہ کے افسانوں کا مطالعہ کرتے وقت قاری کے ذہن میں اس دور کی سماجی رسومات اور خصوصیات ابھر کر سامنے آ جاتی ہیں۔ گاؤں والوں کی زندگی کی بنیاد ذات پات پر تھی۔ پیشہ ورانہ اور طبقاتی تقسیم کی سخت گیری اور اعلیٰ طبقہ کی مطلب پرستی کی وجہ سے اچھوت عام انسانوں کی طرح زندگی گزارنے سے محروم تھے، ان کی محنت و جفاکشی کا استحصال ہو رہا تھا اور ان کی خدمتوں سے فیضیابی کو اعلیٰ طبقہ اپنا مذہبی اور سماجی حق تصور کرتا تھا۔ اس حیوانی رویہ کو صدیوں تک مذہبی قیادت حاصل رہی ہے۔ پریم چند

انسان دوست فنکار تھے اس لیے انھیں ہمیشہ سے اس غیر انسانی رویہ سے نفرت تھی۔ گاندھی جی نے جب اچھوتوں کی بھلائی کے لیے کام شروع کیا تو پریم چند نے، جو بچپن سے ہی اس پسماندہ طبقہ سے ہمدردی رکھتے تھے اور اس طبقہ کو سماج میں انسانوں کی طرح زندگی گزارنے کا حق دلانے چاہتے تھے، اپنے افسانوں اور ناولوں میں اچھوتوں کے مسائل اور اعلیٰ طبقہ کی سخت گیریوں کو بڑے ہی موثر انداز میں پیش کیا۔ اس کو پیش کرتے ہوئے ان کی دلی ہمدردیاں فطری طور پر اس پسماندہ طبقہ کے ساتھ رہیں جو صدیوں سے مذہبی پاکھنڈیوں اور با اقتدار لوگوں کے استحصال کا شکار رہیں۔ ان کی نظر میں صرف چمار بھنگی ہی نہیں بلکہ کنجڑے بھی ہیں۔ "زادراہ" کے افسانوں میں پریم چند نے اچھوتوں کو فریادی، کاہل یا بزدل کے روپ میں پیش نہیں کیا بلکہ ان کے کردار میں شرافت، خودداری اور محنت و جفاکشی کے جذبہ کو ابھارا ہے۔

اس مجموعہ کا پہلا افسانہ "دنیا کی دیوی" ہے جس میں انھوں نے ایک عورت کی زندگی کو بنیاد بنایا ہے۔ اس سے عورت کے متعلق ان کا نظریہ تو واضح ہو جاتا ہے لیکن انھوں نے یہاں جس عورت کا کردار پیش کیا ہے وہ پسماندہ طبقہ سے تعلق رکھتی ہے گویا وہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ ایک پسماندہ و غریب طبقہ کی عورت کی اصل قدر اس کی شرافت ہے اس افسانہ میں تلیا ایک ضعیف اور کمزور عورت ہے جس کا شوہر آخر عمر تک اس سے نہیں ملا۔ بچپن میں شادی کے دن ملاقات ہوئی اور پھر ایک مستقل جدائی۔ اسی گاؤں کے ٹھاکر مختلف قسم کا لالچ دے کر اس کے حسن و شباب سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ ایک دن ٹھاکر اس کے گھر پر آ کو ہے تو تلیا اس کی طرف قہر کی نگاہوں سے دیکھ کر کہتی ہے،

"اچھا ٹھاکر اب یہاں سے چلے جاؤ نہیں تو یا تم نہ رہو گے یا میں نہ رہوں گی ..... میرا آدمی کالے کوسوں میرے نام پر بیٹھا ہوا ہے اسی لیے کہ میں یہاں اس کے نام کو کلنک لگاؤں .... جب تک وہ ایسی پریم بھری چٹھیاں بھیجتا رہے گا .... تلیا اسی کی ہے۔ تم دل میں بھی دکھانے میں کبھی ۔۔۔"

اس طرح وہ شوہر کے انتظار میں اپنی ساری جوانی گزار دیتی ہے مگر کسی دوسرے مرد سے آشنائی نہیں کرتی تلیا کے کردار کے حوالے سے پریم چند یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں پسماندہ اچھوت عورتوں میں بھی پاکیزگی، وفاداری اور عصمت کی وہی اہمیت ہے جو اعلیٰ طبقوں میں پائی جاتی ہے۔

پریم چند نے تلیا کے کردار میں پاکیزگی کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں انسانیت سے دھڑکتا ہوا دل بھی دکھایا ہے۔ اس کی نظر میں تمام انسان برابر ہیں اعلیٰ طبقہ کے ظلم و جبر سہنے کے باوجود اس کے دل میں اس طبقہ کے لوگوں کے لیے ہمدردی اور محبت موجود ہے اسی افسانہ میں بنسی ٹھاکر اپنے بھائی کے انتقال کے بعد اس کی بیوی اور بچوں کو بے یار و مددگار گھر سے نکال دیتا ہے۔ مگر تلیا اسے اپنے گھر میں پناہ دیتی ہے اور یہ اپنی عصمت کو خطرہ میں ڈال کر اس کا حق بنسی ٹھاکر سے دلاتی ہے۔

زادراہ افسانہ میں بھی ہم ایک پسماندہ اور کچلے ہوئے طبقہ کی کنجڑی عورت سے متعارف ہوتے ہیں۔ سیٹھ رام ناتھ کے انتقال کے بعد انھیں کی برادری کا ایک باعزت فرد (سیٹھ جھابرمل) سوشیلا کو ذلیل کر کے اپنے گھر سے نکال دیتا ہے۔ برابر میں ہی کنجڑن رہتی تھی سوشیلا کی بے بسی اور جھابرمل کی حیوانیت دیکھ کر اس پر غم و غصہ کی جو کیفیت طاری ہوتی ہے، مصنف نے اس کا بیان اس طرح کیا ہے:

"—— جھابرمل کو خوب صلواتیں سنائیں اور سوشیلا کی ٹوٹی پھوٹی بکھری ہوئی کام کی چیزوں کو سمیٹ اپنے گھر میں لے گئی اور پیار سے بولی، تم چل کر میرے گھر میں رہو بھولا خطہ میں آ گئی نہیں کوڑے کی موچھیں اکھاڑ لیتی ...... تم آرام سے میرے گھر میں رہو میرے ہاں کسی بات کا کھٹکا نہیں ——"

تو سوشیلا کنجڑوں کی اس ہمدردی کے باوجود اس کے گھر جاتے ہوئے ڈر رہی تھی کیونکہ مکان کا کرایہ ادا نہ کرنے کی وجہ سے جھابرمل نے بے عزت کر کے اسے گھر سے نکالا تھا اور سوشیلا اس وقت بھی کرایہ ادا کرنے کی حالت میں نہیں تھی اسی لیے وہ کنجڑن سے کہتی ہے:" کرایہ کہاں سے دوں گی۔" سوشیلا کے یہ الفاظ سن کر کنجڑن مادرانہ شفقت سے بولی:

"—— میں جھابرمل نہیں ہوں بیٹی نہ کبیر داس ہوں میں تو سمجھتی ہوں اچھے برے دن سب کے آتے ہیں۔ میرے دھنیہ بھاگ کہ تم میرے گھر میں آؤ، میری آنکھیں کیا پھوٹ گئی ہیں کہ میں تم سے کرایہ مانگنے جاؤں گی ——"

اس طرح پریم چند نے واضح کر دیا ہے کہ انسانی ہمدردی اور بے لوث محبت صرف غریبوں اور پسماندہ طبقہ کے لوگوں ہی میں ملتی ہے۔ سوشیلا اس کنجڑن کی مادرانہ شفقت اور انسانیت سے متاثر ہو کر اپنا دکھ درد بھول جاتی ہے۔ کنجڑن سوشیلا اور اس کے بچوں کی پرورش اپنی محنت کی کمائی سے کرتی ہے اور اس کی جوان لڑکی کی عصمت کا بھی خیال رکھتی ہے۔ سیٹھ جھابرمل سوشیلا کی زبوں حالی سے فائدہ اٹھا کر اس کی جوان لڑکی سے اپنی ہوس کی آگ بجھانا چاہتا ہے تو یہی کنجڑن عورت اپنی اعلیٰ ہمتی سے اس کی حفاظت کرتی ہے۔ تلیا اور کنجڑن کے کردار کے ذریعہ پریم چند نے ثابت کر دیا ہے کہ شرافت، انسانی محبت اور خودداری اچھوتوں میں بھی ہوتی ہے اس لیے سماج میں انھیں بھی انسانوں کی طرح زندہ رہنے کا حق ملنا چاہیے۔

"زادِ راہ" کے افسانوں میں پریم چند نے جن حقائق کا ذکر کیا ہے وہ زندگی سے اتنے قریب ہیں کہ ان کے دور کے علاوہ آج بھی ہمیں معمولی سی تبدیلی کے ساتھ دیہاتوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ پریم چند کے زمانہ میں دیہی سماج میں پنچایت اور برادری کی بہت اہمیت تھی۔ ہر برادری کا جو دھری اس کا سرپنچ ہوتا تھا باقی تمام برادری کو اس کے احکام اور فیصلوں پر عمل کرنا ضروری تھا۔ اگر برادری کا کوئی فرد حکم عدولی کرے تو اس پر جرمانہ کیا جاتا تھا اور بعض سنگین حالات میں اس سے معاشرتی و سماجی تعلقات ترک کر دیے جاتے تھے۔ برادری کے سرپنچ کو حکومت کی طرف سے خاص مراعات حاصل ہوتی تھیں اور گاؤں کے متعلق تمام فیصلوں میں سرپنچ کی رائے کا احترام کیا جاتا تھا۔ سرپنچوں کی مطلب پرستی، سخت دلی اور حیوانیت کو پریم چند نے "زادِ راہ" میں بڑی خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔ اس افسانہ میں برادری کے مظالم کے ساتھ ساتھ ضرر رساں مذہبی روایات سے بھی نفرت کا اظہار کیا ہے خصوصاً ہندوؤں کے معاشرے میں جن غلط رسومات نے مذہبی حیثیت اختیار کر لی تھی اور جو ہندو طبقہ کو خیر و برکت کے بجائے تباہی کی راہ پر گامزن کرتی ہیں ان پر سختی سے نکتہ چینی کی ہے پریم چند گاؤں کے اس گھناونے سماج سے نفرت کرتے تھے، تاہم ان میں اتنی قوت نہیں تھی کہ وہ اسے جڑ سے اکھاڑ سکیں پھر بھی اپنی بساط بھر انھوں نے جو کچھ کر دکھایا وہ ان کی ترقی پسندی اور اعلیٰ ہمتی کی دلیل ہے۔

"زادِ راہ" کی مکمل کہانی پر ہندو سماج کے غلط رسوم اور برادری کے ٹھیکیداروں کی سنگ دلی کا دباؤ حاوی رہتا ہے سیٹھ رام ناتھ کے انتقال کے بعد ان کے پس ماندگان کو جن مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے اس کا سبب

دیہی فرسودہ سماج اور برادری ہیں جو مذہبی فرض کی ادائیگی کے بہانے غریبوں کا استحصال کرتے ہیں۔ برادری کے تمام ٹھیکیدار برہم بھوج اور عالیشان دعوت کے لیے زبردستی اس کا مکان اور زیورات فروخت کر دیتے ہیں۔ برادری کے سامنے سوشیلا اور اس کا بھائی ہر طرح سے مجبور ہو جاتا ہے تو پریم چند سیٹھ رام ناتھ کی بیوہ کی زبانی اس رویہ کی سخت مذمت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ :

"۔۔۔ آپ لوگ کیا اتنے بے رحم ہیں، آپ لوگوں کو یتیم بچوں پر بھی رحم نہیں آتا کیا انھیں بھکاری بنا کر چھوڑو گے ۔۔۔"

پریم چند نے بڑی فن کارانہ قدرت کے ساتھ ان مذہبی روایتوں اور برادری کے ظلم و ستم کے ذمہ داروں کا نفسیاتی تجزیہ پیش کیا ہے خواہ وہ دھنی رام ہوں کبیرداس یا بھیم چند سبھی کو مرنے والے کی رسوم کی ادائیگی کی فکر ہے مگر کسی کو نہیں کہ سوشیلا اور اس کے بچوں کی زندگی کس طرح گزرے گی۔ اس سے قبل کہا جا چکا ہے کہ اس وقت کا قانون بھی سرپنچوں کی مدد کرتا تھا اس لیے یہ تمام لوگ جائز و ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے قانون کی بھی مدد حاصل کر لیتے تھے۔ سوشیلا کی جوان لڑکی جب جبار سے شادی کرنے سے انکار کر دیتی ہے تو یہ برادری کی مدد سے اسے قانونی طور پر حاصل کر لیتا ہے۔ پریم چند برادری کی سخت گیری رسوم کی ادائیگی اور سیٹھ رام ناتھ کے خاندان کی تباہی کے ذریعہ قاری کے دل و دماغ میں اس معاشرہ سے نفرت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس نفرت کا اظہار وہ سوشیلا کی لڑکی ریوتی کی زبانی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

"ایسی برادری کی مجھے پرواہ نہیں ۔"

پریم چند کی پرورش غربت اور مفلسی کے ماحول میں ہوئی تھی معاشی پریشانیوں سے وہ عملی طور پر دوچار ہوئے تھے۔ دولت مند سیٹھوں کی ریاکاری اور ان کی سیاہ قلبی سے بھی وہ بخوبی واقف تھے۔ ان کے خیال میں دولت کی کثرت، انسان کو عیاشی، بے شرمی اور غیر اخلاقی راہ پر ہی نہیں لے جاتی بلکہ سنگدل بھی بنا دیتی ہے اور اس کا اثر اکثر ازدواجی زندگی پر بھی منفی پڑتا ہے۔ "لعنت" افسانہ میں پریم چند نے دولت مند سیٹھ شاہ پورجی اور غریب کاؤس جی کی گھریلو زندگی کے ذریعہ دولت کی لعنت کو بڑی خوب صورتی اور کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ شاہ پورجی دولت مند ہونے کی وجہ سے عیاشی شراب نوشی اور رقص کی محفلوں میں شرکت کرنا اعلیٰ طبقہ کے لئے ضروری سمجھتے ہیں، ان کے پاس دولت کی فراوانی ہے اور گھر میں ہر طرح کا سامان عیش موجود ہے مگر شاہ پورجی کی بیوی کو کبھی محبت نہیں ملتی جو عورت کی زندگی کے لیے بہت ضروری ہے۔ اس کے برعکس کاؤس جی غریب ہیں اور ہر طرح کے سامان عیش کے فقدان کے باوجود ان کی ازدواجی زندگی میں سکون ہے، ایک دوسرے پر قربان ہونے کا جذبہ موجود ہے۔ شاہ پورجی کی بیوی ان کی عیاشی اور غیر اخلاقی حرکتوں سے مجبور ہو کر کبھی محبت حاصل کرنے کے لیے غیر سماجی اور غیر اخلاقی فعل کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے، اس طرح پریم چند نے واضح کر دیا ہے کہ دولت کی زیادتی بھی گھریلو زندگی کو تباہ و برباد کر دیتی ہے پریم چند دولت کی لعنت پر گلشن کی زبانی طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"۔۔۔ یہی تو زندگی کی لعنت ہے ہم اس چیز پر لپکتے ہیں جو جہنم اور بربادی کی طرف لے جاتی ہے۔"

پریم چند کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ موجودہ سماجی نظام کا ڈھانچہ دولت کی بنیاد پر قائم ہے۔ معاشی ناہمواری کے باعث معاشرہ میں پھیلتی ہوئی خرابیوں کو انھوں نے "زادِ راہ" میں کئی افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ "زیور کا ڈبہ" میں چندر پرکاش مفلسی اور معاشی بدحالی کے سبب اپنی بیوی کے لیے ٹھاکر صاحب کے گھر سے زیور کا ڈبہ چرا لاتا ہے۔۔

دراصل پریم چند نے اس مقام پر جاگیردارانہ سماج کے طبقاتی تضاد اور معاشی ناہمواری کی پیدا کردہ گندگی کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ دکھانا چاہتے ہیں کہ موجودہ سماج میں ایک طبقہ ایسا ہے جو اپنی زندگی ہر طرح کی آسائش و زیبائش میں گزارتا ہے اور اسی کے ساتھ سماج میں دوسرا طبقہ بھی موجود ہے جو مسلسل محنت و مشقت کے باوجود مایوسیوں اور محرومیوں میں زندگی بسر کرتا ہے۔ چندر پرکاش کو اس تضاد کا شدید احساس تھا اور وہ اپنی بیوی کو زیور سے آراستہ کرنا چاہتا ہے۔

پریم چند کے عہد میں بڑی بڑی صنعتوں کے فروغ کی وجہ سے سرمایہ داروں کا ایک نیا گروہ تیار ہو گیا تھا۔ یہ سرمایہ دار اپنے مزدوروں کو کم سے کم اجرت دے کر زیادہ سے زیادہ محنت لیتے تھے جس کی وجہ سے ان کی زندگی ہمیشہ پریشانی اور مفلسی میں گزرتی تھی مگر ملک کی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے مزدوروں میں اتحاد اور اعتماد بڑھتا جا رہا تھا اور یہ لوگ اپنے حقوق کو حاصل کرنے کے لیے منظم طور پر احتجاج کرتے تھے۔ پریم چند نے "ڈامل کا قیدی" میں اپنے عہد کے غریبوں کا خون چوسنے والے مالکوں اور مزدوروں کے رویّے کو بڑے فنکارانہ طور پر پیش کیا ہے۔ اسے پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس افسانہ میں موجودہ عہد کے سرمایہ داروں اور مزدوروں کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

چونکہ پریم چند آدرش وادی ادیب تھے اس لیے انھوں نے گاندھی جی کے فلسفۂ اخلاقیات اور قلب ماہیت کے تصور کو اپنے ادب میں بڑی خوبی سے برتا اور پیش کیا ہے۔ دیگر افسانوں اور ناولوں کی طرح زادِ راہ کے کرداروں کو غیر اخلاقی فعل سے بچانے کی شعوری طور پر کوشش کی ہے۔ اگر کسی کردار سے ایسا عمل سرزد ہو جاتا جو سماج کے لیے مضر ہو تو پریم چند کرداروں کی قلب ماہیت کر دیتے تھے۔ قلب ماہیت کا مطلب ہے کسی اخلاقی یا روحانی دباؤ کے تحت انسان اپنے دل و دماغ سے حیوانی اور غیر اخلاقی خیال کو دور کر دے۔ "دنیا کی دیوی" کے اختتام پر گردھر کے ذریعہ قلب ماہیت کا تصور پیش کیا ہے۔ زادِ راہ کے بیشتر افسانوں میں اخلاقی کشمکش اور قلب ماہیت کا یہی تصور دکھائی دیتا ہے۔ لیکن جب انھیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ چوری کرنا ایک اخلاقی و مذہبی گناہ ہے تو وہ ٹھاکر صاحب سے چندر پرکاش کی سفارش کروا کر اسے منیجر کا عہدہ دلوا دیتے ہیں ٹھاکر صاحب کی سفارش سے اس عہدہ کو حاصل کرنے کے بعد چندر پرکاش اخلاقی کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے اور خاموشی سے زیورات کا صندوق ٹھاکر صاحب کے گھر رکھ آتا ہے۔ 'قہر خدا کا'، 'نیتور'، 'ڈامل کا قیدی' وغیرہ افسانوں میں بھی اخلاقی کشمکش اور قلب ماہیت کا یہی تصور کار فرما ہے۔

دراصل سماجی نابرابری، رسم و رواج کی خرابیاں، اعلیٰ طبقہ کی برائیاں، طبقاتی تضاد، دولت کی غیر مساوی تقسیم، معاشرہ کی گندگی، اخلاقی کشمکش، قلب ماہیت کا تصور، جنگ آزادی اور دیہی زندگی کی حقیقی مصوری وغیرہ وہ بنیادیں ہیں جن پر "زادِ راہ" کے افسانوں کی عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ انھیں مسائل کی وجہ سے ہمیں اس مجموعہ میں ہندستان کے ایک خاص عہد کی روح کی جھلک دکھائی دیتی ہے اور یہی اس مجموعہ کی اہمیت ہے۔



ادارہ

اُتّرپردیش شاہراہِ ترقی پر

● اردو کی ترقی پر توجہ دی جائے گی ● اردو مسودات کی اشاعت کے لیے مالی امداد ● دفتروں میں وقت کی پابندی کو یقینی بنایا جائے ● افسران فیصلوں کے نفاذ کے ذمے دار ● ۳۰۰ قالین سازی تربیتی مرکزوں کا قیام ۔۔۔ ۱۵۰۰۰ افراد کو روزگار کے مواقع

● اتر پردیش کے وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے اردو زبان کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اردو ترقی مورچہ، اتر پردیش کے ایک وفد کو لکھنؤ میں ۱۱ر جون کو یہ یقین دلایا کہ وہ اردو کی ترقی سے متعلق مسئلہ پر پوری توجہ دیں گے۔ انھوں نے کہا کہ "مجھے یقین ہے کہ اس کا حل نکل آئے گا۔"

شری سنگھ نے کہا کہ اردو ایک مالا مال زبان ہے اور موثر اظہار کی زبردست صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ اتر پردیش میں ہی پھلی پھولی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان کی توسیع و ترقی کے لیے ٹھوس اقدامات کیے جائیں گے۔

اراکین وفد کا اصل مطالبہ یہ تھا کہ اردو زبان کو ریاست میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔ اس قسم کی یقین دہانی کانگریس (آئی) کے منشور میں بھی کی گئی ہے۔

شری ہاشم رضا عابدی (الہ آبادی) کی قیادت میں اراکین وفد نے وزیر اعلا سے ملاقات کی۔ انھوں نے واضح کیا کہ اردو زبان ہندی کی مخالف نہیں ہے۔ ہندی ہماری قومی زبان ہے تاہم اردو کو اس کا جائز مقام حاصل ہونا چاہیے۔

اردو ترقی مورچہ کے اس وفد میں شری سید علی اشرفی، شری راشد انعام، شری سید اشفاق حسین، شری سلیم عمر، شری شاہ فاروق عطا، شری احمد عباس ردولوی، شری سعادت علی صدیقی اور شری امتیاز حسین شامل تھے۔

● ریاستی حکومت نے اردو زبان کے اعلا پایہ کے مسودات کی اشاعت کے لیے مالی امداد دینے کی غرض سے ہندستان کے مختلف حصوں کے خواہشمند اشخاص سے درخواستیں طلب کی ہیں۔

یہ مالی امداد فخرالدین علی احمد میموریل فنڈ سے دی جائے گی جسے ۱۹۷۶ء میں اردو مسودات کی اشاعت کے لیے مالی امداد دینے کے مقصد سے قائم کیا گیا تھا۔

مالی امداد کے خواہشمند افراد کو مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ مقررہ فارم سکریٹری فخرالدین علی احمد میموریل فنڈ، محکمہ قومی یکجہتی، اتر پردیش سکریٹریٹ، لکھنؤ سے مفت حاصل کرکے مکمل تفصیلات کے ساتھ اس فارم کو مذکورہ پتہ پر روانہ کریں۔

☆ ☆ ☆

● سرکاری دفتروں میں وقت کی پابندی کا یقینی بندوبست کیا جائے تاکہ انتظامیہ کے طریقۂ کار اور عام نظم وضبط میں سدھار ہو۔

وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے یہ ہدایات لکھنؤ میں ۱۳ر جون کو سکریٹریوں اور اسپیشل سکریٹریوں کے ایک جلسہ میں دیں۔

انھوں نے کہا کہ وقت کی پابندی نہ کرنے سے ملازمین کے ذہنی رجحان کا پتہ چلتا ہے جس کا خراب اثر پڑتا ہے۔

شری سنگھ نے کہا کہ کام کو جلد سے جلد نبٹانا چاہیے۔ انھوں نے

یہ بھی کہا کہ محض اپنی میز سے فائل کھسکا دینے سے افسروں کی ذمہ داریاں ختم نہیں ہو جاتیں بلکہ ان سے مسئلہ کے حل کی توقع کی جاتی ہے۔

وزیر اعلا نے یہ ہدایت بھی کی کہ افسروں کو عوام کی حقیقی شکایتوں اور پریشانیوں کو بغور سُننا چاہیے اور انھیں جلد سے جلد دور کرنا چاہیے۔

✣ ✣ ✣

● وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے ۱۲ جون کو لکھنؤ میں ریاستی حکومت کے اعلا افسروں سے واضح طور پر کہا کہ ان کی ذمہ داری صرف فیصلہ کرنے پر ہی ختم نہیں ہو جاتی بلکہ وہ ان فیصلوں پر مناسب عملدرآمد کے لیے بھی ذمہ دار ہوں گے۔

وزیر اعلا نے کہا کہ اعلا افسروں کو یہ دیکھنا ہوگا کہ سرکاری فیصلوں پر عملدرآمد کیوں نہیں ہوا اور اس کے بارے میں انھوں نے معلومات حاصل کیوں نہیں کیں۔ اگر عملدرآمد سے متعلق کوئی دشواری ان کے علم میں تھی تو انھوں نے اس سلسلہ میں کیا کارروائی کی۔

سکریٹریٹ کے سکریٹریوں اور اسپیشل سکریٹریوں سے خطاب کرتے ہوئے وزیر اعلا نے کہا کہ سرکاری فیصلوں کے نفاذ کے سلسلہ میں مسلسل جائزہ اور نگرانی کا بندوبست ہونا چاہیے تاکہ عمل آوری میں پیش آنے والی دشواریاں بلا تاخیر دور کی جاسکیں۔

وزیر اعلا نے افسروں سے کہا کہ نظم و نسق کو عوامی احساسات سے ہم آہنگ ہونا چاہیے اور ان کی کامیابی کا پیمانہ یہی ہے کہ وہ ان احساسات کے تئیں کتنے حساس ہیں۔

شری سنگھ نے اس سلسلہ میں کہا کہ اس وقت عام آدمی کی ایسی خواہش ہے کہ انتظامیہ کو امن و قانون برقرار رکھنے کے لیے سختی سے نپٹنا ہے اور اس میں کسی قسم کی تساہلی نہیں برتنے دی جائے گی۔ عام جرائم کے علاوہ معاشی جرائم پر بھی نظر رکھنا ہوگی کیونکہ اگر اس صورتِ حال میں سدھار نہیں ہوتا ہے تو یہ نظم و نسق کی کمزوری کی علامت ہوگی۔

شری سنگھ نے اس بات پر تشویش ظاہر کی کہ جو اسکیمیں اور پیسہ غریب طبقے کے لیے مخصوص ہوتا ہے اس کا فائدہ سماج کے دوسرے طبقے اٹھاتے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ سرکاری افسروں کو اس بات کو یقینی بنانا ہوگا کہ جو سہولتیں اور امداد کمزور طبقہ کو مہیا کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے وہ ان سے مستفید ہوں۔ محض منصوبہ کی رقم میں اضافہ کر دینے سے کوئی خاص فائدہ نہ ہوگا بلکہ وسائل کو ان غریب لوگوں تک پہنچانا ہوگا۔

چیف سکریٹری شری رام بہادر سکسینہ نے وزیر اعلا کا خیر مقدم کرتے ہوئے یقین دلایا کہ پورا نظم و نسق سرکار کی پالیسیوں پر پورے خلوص کے ساتھ عمل کرے گا اور عوام کی خواہشات پوری کرنے کے عزم کو عملی جامہ پہنانے میں اپنا مکمل تعاون دے گا۔

✣ ✣ ✣

● وزیر صنعت شری عبدالرحمان نشتر نے اعلان کیا کہ اس سال ریاست کے دیہی علاقوں میں ۲۰۰ قالین سازی تربیتی مرکز قائم کیے جائیں گے جن میں تقریباً ۱۵،۰۰۰ افراد کو روزگار کے مواقع حاصل ہوں گے۔ اس کے علاوہ مربوط دیہی ترقی اسکیم کے تحت نئے صنعت کاروں کو تربیت اور مالی امداد دے کر صنعتیں قائم کرنے کے لیے ان کی حوصلہ افزائی کی جائے گی جس سے تقریباً ۵،۰۰۰ افراد کو روزگار کے مزید مواقع دستیاب ہوں گے۔

وزیر موصوف ۱۳ جون کو نظامت صنعت، کانپور میں صنعتی کارپوریشنوں کے منیجنگ ڈائرکٹروں کے ایک جلسہ سے خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ خورجہ اور فیروز آباد کی کانچ اور پاٹری صنعت کے لیے ایک تجربہ گاہ اور جھانسی میں ایک پاٹری مرکز قائم کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ دستکاری اور چھوٹی صنعتوں کی امداد کے لیے کانپور میں ایک ایئر کارگو کامپلیکس قائم کیا جائے گا اور قالین کی صنعت کے لیے بھدوہی میں اُون دھونے کی ایک مشین لگائی جائے گی۔



نقد و تبصرہ

تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں۔

نام کتاب:- **نوائے آوارہ** شاعر: غلام ربانی تاباں

ناشر:- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر - دلی

قیمت:- ۸ روپے ۵۰ پیسے :: کتابت و طباعت: عمدہ

نوائے آوارہ غلام ربانی تاباں صاحب کا تازہ ترین شعری مجموعہ ہے اس سے قبل ان کے کئی مجموعے شائع ہو کر مقبول عام ہو چکے ہیں جن کے نام ہیں غزال و دل، حدیث دل اور ذوق سفر ہیں۔ تاباں کا شمار زمانہ حال کے بزرگ غزل گو شعراء میں ہوتا ہے۔ وہ ادبی حلقوں اور شاعروں دونوں میں برابر مقبول اور مشہور ہیں۔

تاباں کے کلام میں جدت فکر اور غزل کے روایتی اسلوب سے شعوری انحراف خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ روایتی اسلوب سے انحراف کا مطلب یہ نہیں کہ وہ جدید یا نام نہاد ترقی پسندی کے شوق میں آوارگی کیف کے شکار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ غزل اور اردو شاعری کی روایتی قدروں کا احترام بھی تاباں کی شاعری میں نمایاں ہے زیر نظر مجموعہ کلام نوائے آوارہ کو اگر اسم بامسمیٰ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

نوائے آوارہ کے رنگ و آہنگ کا اندازہ ان اشعار سے لگایا جا سکتا ہے

نہ جانے کب مرے تخیل کو جسم مل جائے — کوئی گماں مذاق جنوں سے دور نہیں

لپٹ کے گرد کی چادر میں چین سے سو جائے — کوئی بھی تو کسی رہگذر سے دور نہیں

گئے بیلوہ جلوہ گری نظر گئے بام و در میں الجھ گئی

اسے کون باد صبا کہے جو شجر شجر میں الجھ گئی

کبھی نا تمام سی قربتیں کبھی نا تمام سی دوریاں

مری رہگذر تھی کہ بے طرح تری رہگذر میں الجھ گئی

کسی داستاں سے عجیب تر مری زندگی کی حقیقتیں

وہ فروغ درد کی رات تھی جو کسی سحر میں الجھ گئی

تمہارے شہر میں کچھ تلخ تجربے بھی ہوئے — وفا کا قتل ہی کیا اور سانحے بھی ہوئے

نہ جانے پیار کی بولی میں کیا کہیں گے لوگ — جفا کے دور میں طے چند مرحلے بھی ہوئے

نام کتاب: **اثر لکھنوی حیات اور کارنامے**

مؤلف: محمود خاور

ناشر: شالیمار پبلیکیشنز بازار گھاٹ - حیدرآباد

قیمت: پندرہ روپے

زیر نظر کتاب اثر لکھنوی - حیات اور کارنامے محمود خاور کا تحقیقی مقالہ ہے۔ اس میں انھوں نے اثر لکھنوی کی حیات شخصیت اور کارناموں پر روشنی ڈالی ہے

اثر لکھنوی کا شمار بیسویں صدی کے ممتاز ادبا و شعرا میں ہوتا ہے وہ نہ صرف ترسے شاعر تھے بلکہ اچھے نقاد اور بڑے ادیب بھی تھے زبان و لغت پر بھی ان کو بڑی قدرت حاصل تھی۔

محمود خاور کتاب کے ابتدائیہ میں لکھتے ہیں

یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اردو شاعری اور تنقید کی اس اہم اور ناقابل فراموش شخصیت کے بارے میں اردو نقادوں نے تساہل سے کام لیا اور کبھی کسی نے ان کی تحریروں کی قدر و قیمت کے تعین کی کوشش نہیں کی۔ اس بات نے میرے اس کام کو بے حد دشوار بنا دیا اس لیے کہ مجھے اپنے کام کے لیے کسی بیشرو سے کوئی مدد نہیں ملی۔ میں نے جو کچھ بھی کیا ہے اس کے لیے مجھے خود مواد تلاش کرنا اور ترتیب دینا پڑا ہے اثر صاحب کے ہمعصروں میں کوئی ایسا شخص نہیں جو ان کے خاندان یا خود ان کے بارے میں مصدقہ طور پر کوئی بات بتا سکے اردو دنیا کی یہ حالت کس قدر افسوسناک ہے۔

محمود خاور کی پریشانیاں بظاہر ان کی سادگی پر محمول معلوم ہوتی ہیں۔ ورنہ دلچسپی کوئی بات اثر صاحب پر تحقیق و تنقید کے سلسلے میں نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان پر اب تک خاطر خواہ کام نہیں ہو سکا مگر ان کو فراموش کرنے کی بات درست نہیں معلوم ہوتی۔ ان کے معاصرین اور ان کے بعد کی نسلوں کے معلوم نہیں کتنے افراد ایسے ہیں جو مختلف حیثیتوں سے اثر صاحب کے بارے میں بیشتر ضروری معلومات فراہم کر سکتے ہیں۔ اثر صاحب سے متعلق مواد آسانی سے مل سکتا ہے زیر نظر کتاب میں ماخذات کی اہمیت پر فاضل مقالہ نگار نے کم توجہ فرمائی ہے بہرحال ان کی یہ کاوش اختصار کے باوجود قابل مطالعہ ہے اور اس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

—— (ڈاکٹر) ذکی کاکوروی



غالب کے بعض غیر معروف ادبی آثار — (بقیہ صفحہ ۱۵)

٢٠۔ ماخذ میں یہاں غلطی سے لفظ "نطاب" درج ہوا ہے۔
٢١۔ تذکرۂ سراپا سخن: محسن علی محسن۔ مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ طبع اپریل ۵، ۱۸۰ء ص ص ۲۹۲ تا ۲۹۳ [مملوکہ صفی لائبریری، لکھنؤ]
٢٢۔ قاطع برہان: غالب۔ مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ (طبع اول) مطبوعہ ۱۸۶۲ء ص ۹۲ (خاتمۃ الطبع) — [مملوکہ کاظم علی خاں]
٢٣۔ بہ شکریہ جناب مولانا امتیاز علی خاں عرشی
٢٤۔ مجموعۂ نثر غالب اردو: مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی۔ مجلس ترقی ادب، لاہور طبع نومبر ۱۹۶۰ء [عطیہ استاد محترم جناب مولانا سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی مقیم لاہور]

پریم چند کے ورثہ کی موزونیت — (بقیہ صفحہ ۲۵)

کی تخلیقات کی آج بھی اتنی ہی اہمیت و افادیت ہے اور ان کے افسانوی کردار بھی آج کی زندگی میں مل جاتے ہیں۔

پریم چند کی وراثت میں سماج کے بعد ایک دوسری اہم چیز زبان ہے۔ انھوں نے جس طرح کی زبان استعمال کی ہے وہ ایک جیتی جاگتی صورت حال کا نام ہے۔ وہ اردو میں لکھتے تھے اور لکھتے رہے۔ دھنپت رائے سے نواب رائے تک کا حال تو لوگوں کو معلوم ہوگا لیکن یہ حقیقت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ "پریم چند" کا نام انھیں اردو کے مشہور و ممتاز صحافی اور مصنف جناب منشی دیا نرائن نگم مدیر "زمانہ" نے دیا تھا۔ ان کی سبھی نگارشات اردو میں تخلیق ہوئی ہیں۔ ہندی میں ان کا ترجمہ ہوا ہے۔ بعض تخلیقات اگر ہندی میں ہی لکھی گئی ہوں تو اس امر سے اختلاف کی قطعی گنجائش نہیں کہ انھوں نے اردو میں ہی سوچا تھا۔ وہ اپنے افسانوں اور ناولوں میں جو زبان استعمال کرتے ہیں۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انھیں ہر طبقہ کی زبان پر عبور حاصل تھا۔ انھوں نے اپنی زبان میں دھرتی کی آواز کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنی زبان میں شعور زیست اور عوام کی محنتوں کو ڈھالا ہے۔ انھوں نے زبان درباروں اور محلوں سے نہیں بلکہ چوپالوں، پنچایتوں اور گلی کوچوں سے لی ہے۔ وہ اس رمز سے آشنا ہیں کہ سادہ اور بے تکلف گفتگو کے لیے سادہ اور بے تکلف زبان بھی ضروری ہوتی ہے۔

پریم چند کا فن اور ان کا ورثہ آج بھی یہی کہہ رہا ہے کہ دنیا امید و عمل ہے اور یہاں ایسا کوئی مقام نہیں ہے جسے آخری منزل قرار دیا جائے۔ آگے بڑھتے رہو اور بڑھتے چلو جب تک کہ "رنگ بھومی" میں فتح نہ حاصل ہو، جب تک کہ ملک کی "کایا کلپ" نہ ہو، جب تک کہ اس "میدان عمل" میں "غبن" اور "گئودان" سے ہوری اور رام ناتھ کا استحصال ہونا بند نہ ہوجائے اور ہمارا ملک ایک جدید طرز کا "سیوا سدن" اور "پریم آشرم" نہ بن جائے۔ اس وقت تک پریم چند کے ورثہ کی ضرورت اور افادیت ہے اور رہے گی۔

پریم چند کا ایک ابتدائی ناول — (بقیہ صفحہ ۳۹)

ہے کہ اس دور میں پریم چند آریہ سماجی تحریک سے عملی طور پر وابستہ تھے جو معاشرے کی اصلاح اور فرسودہ روایات سے نجات کے لیے کوشاں تھی اور اس دور میں بیوگی کے مسئلہ کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ اس طرح پریم چند نے زیر نظر ناول میں بیواؤں کی شادی اور عورتوں کے مذہبی مقامات اور عبادت گاہوں میں داخلے پر پابندی کے ساتھ ساتھ مختلف فرقوں کے درمیان شادی اور مذہب کے نام پر ہونے والے استحصال اور بدعنوانیوں کے خلاف آواز بلند کی ہے مگر ناول میں بیواؤں کی زندگی کے مختلف مسائل، ان کے سماجی مقام اور ان کی دوسری شادی کے مسئلہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔



REGD No. LW/NP. 17

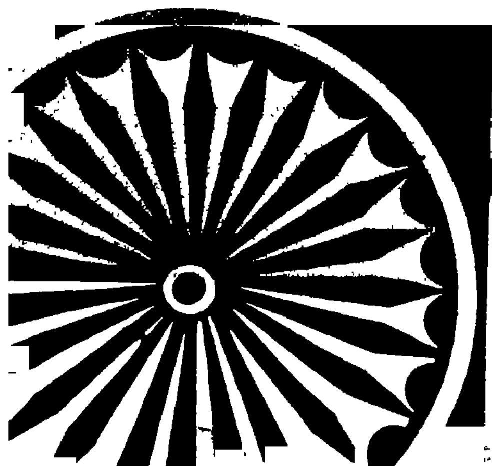
JULY 1960.

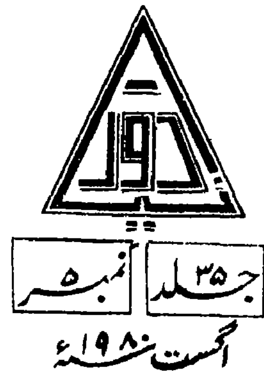
50 PAISE — POST BOX No. 146 LUCKNOW 226001 — Annual Subs Rs 5/



اُترپردیش کے وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ کو گورنر اتر پردیش شری سی۔ پی۔ این سنگھ
۹ر جون ۱۹۸۰ء کو راج بھون لکھنؤ میں ان کے عہدے کا حلف دلاتے ہوئے۔

یوم آزادی نمبر





جلد ۳۵ نمبر ۵

اگست ۱۹۸۰ء

ایڈیٹر : امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر : شاہ نواز قریشی

★

پبلشر : ہمیندر کمار

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

پرنٹر : اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یو پی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ ۔ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ : پچاس پیسے
زر سالانہ : پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ : سپرنٹنڈنٹ پبلیکیشنز انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ : ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶ ۔ لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری : ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

اپنی بات

آزادی انسان کی ایک فطری اور پاکیزہ خواہش ہے۔ غلامی کی زندگی نہ تو انفرادی حیثیت سے گوارہ ہوتی ہے اور نہ اجتماعی حیثیت سے۔ غلامی کی زندگی انسانی فکر و احساس اور جذبہ پر ایک کرب ناک بوجھ ہوتی ہے لیکن یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ آزادی محض جشن منانے کی چیز نہیں ہوتی۔ آزادی کا مطلب تن آسانی قطعی نہیں ہوتا۔ آزادی اپنے ساتھ بڑی ذمے داری بھی لاتی ہے۔ ایک آزاد ملک کے باشندوں کے فرائض کچھ کم اہم نہیں ہوتے۔ یہ صحیح ہے کہ آزادی حقوق دلاتی ہے۔ لیکن کچھ فرائض بھی عائد کرتی ہے۔ یہ فرائض انجام نہ دیئے جائیں تو آزادی تاراج اور انتشار کی حدوں کو چھونے لگتی ہے چنانچہ حقوق کی بازیابی کے ساتھ ساتھ فرض کا احساس یقینی طور پر ہونا چاہیے۔ لیکن حصول آزادی کے بعد ذمے داریوں کا احساس اور فرض شناسی کا جذبہ جس حد تک ہم میں ہونا چاہیے تھا اس حد تک نہیں پیدا ہو سکا۔ جس امنگ جوش و خروش اور جس اسپرٹ کے ساتھ جنگ آزادی لڑی گئی۔ اسی امنگ جوش و خروش اور اسپرٹ کا مظاہرہ ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے بھی ہونا چاہیے تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو ہمارا ملک ترقی کی راہ پر بہت آگے ہوتا لیکن اس کا مطلب یہ قطعی نہیں ہے کہ ہمارے ملک نے ترقی کی ہی نہیں۔ آزادی کے بعد وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی قیادت میں ملک نے خاصی پیش رفت کی۔ بڑے بڑے کل کارخانے قائم ہوئے۔ ملک مشینی اور صنعت کاری کے دور میں داخل ہوا۔ بھاری صنعتوں کے قیام کے نتیجے میں ہم بہت سی ضروری اور صنعتی اشیا کے سلسلے میں نہ صرف یہ کہ خود کفیل ہو گئے بلکہ برآمد بھی کرنے لگے۔ انجینیرنگ، ٹیکنالوجی اور صنعت کاری کے میدان میں ہندستان دنیا کے بہت سے ملکوں کے لیے ایک قابل تقلید مثال بن گیا۔ تکنیکی اور اعلا تعلیم کے میدان میں بھی ہم آگے بڑھے۔ نہرو جی کی قیادت میں ہی ہم نے منصوبہ بند ترقی کا راستہ اختیار کیا۔ آزاد ہندستان کے پہلے وزیر اعظم کی حیثیت سے نہرو جی نے اس ملک میں سائنسی انداز فکر اور وسیع النظری کو فروغ دینے کی موثر کوششیں کیں۔ بعد میں وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی سرگرم اور فعال قیادت میں ملک اور آگے بڑھا۔ انھوں نے بعض بہت ہی انقلابی نوعیت کے اقدامات کیے۔ مثال کے طور پر بینکوں کا نیشنلائزیشن، راجا مہاراجاؤں کے صرف خاص کا خاتمہ، اقلیتوں اور اردو زبان کے تحفظ اور ترقی پر خصوصی توجہ، یہ تمام اقدامات وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے دور حکومت میں کیے گئے۔ اس کے علاوہ زمین کا مشاہدہ کرنے والے دو مصنوعی ذیلی سیارے "آریہ بھٹ" اور "بھاسکر" خلا میں بھیجے گئے۔ اس طرح ہندستان خلائی سائنس کے عہد میں داخل ہو گیا۔ لیکن ہندستان میں مصنوعی سیاروں کو خلا میں بھیجنے کی ٹکنالوجی کی تکمیل ۱۸ جولائی ۱۹۸۰ء کو ہوئی۔ جب آندھرا پردیش کے ساحل کے نزدیک واقع جزیرے سری ہری کوٹہ سے خلائی گاڑی ایس۔ ایل۔ وی۔ ۳ داغی گئی۔ جس میں مصنوعی ذیلی سیارہ روہنی آر۔ ایس۔ ون تھا۔ خلائی سائنس کے میدان میں ہندستان کی یہ شاندار کامیابیاں جلد ہی اس کو دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑا کر دیں گی۔

آیئے آزادی کی ۳۳ ویں سالگرہ کے اس مبارک موقع پر عہد کریں کہ ہم اپنی آزادی کو مزید مستحکم اور پائیدار بنانے کے لیے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھیں گے اور اپنے ملک کو ترقی کے راستے پر اور آگے بڑھائیں گے۔

● شری علی جواد زیدی کو اتر پردیش اردو اکاڈمی کا صدر مقرر کیا گیا ہے۔ شری زیدی کی جانی پہچانی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ وہ ایک ممتاز ادیب شاعر اور نقاد ہی نہیں بلکہ مجاہد آزادی بھی ہیں۔ ملک کی آزادی کے لیے انھوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی اٹھائیں چنانچہ جنگ آزادی کے جشن سیمیں کے موقع پر انھیں تامر پتر سے بھی نوازا گیا۔ اس کے علاوہ زیدی صاحب انتظامی امور کا بھی ایک طویل تجربہ رکھتے ہیں۔ وہ تیس سال تک مرکزی حکومت اور اتر پردیش نیز جموں و کشمیر کے محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ میں اعلا عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں۔ وہ نیا دور کے نہ صرف مدیر رہے بلکہ انھیں کے زمانے میں جب وہ بحیثیت اسسٹنٹ ڈائرکٹر محکمے کے مطبوعات دیکھ رہے تھے اطلاعات کی جگہ نیا دور نے ادبی حیثیت حاصل کی اور نیا دور کے نام سے موسوم ہوا۔

اردو اکاڈمی کے صدر کی حیثیت سے شری زیدی کی تقرری اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے فال نیک ہے۔ ادارہ نیا دور شری زیدی کو اس نئے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہونے پر مبارک باد پیش کرتا ہے۔

● وزیر اعلا اتر پردیش شری وشو ناتھ پرتاپ سنگھ نے ۱۶ جولائی کو ریاستی اسمبلی میں ۸۱-۱۹۸۰ء کا ریاستی بجٹ پیش کر دیا۔ اس بجٹ میں عوام کی خدمت اور مفاد عامہ کے کاموں کے تئیں موجودہ حکومت کی وابستگی کا واضح اعلان موجود ہے۔ یہ بجٹ عوام کی خواہشات نیز امیدوں کو پورا کرنے کے عزم کا مظہر ہے۔ اس بجٹ میں جن امور پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے وہ ہیں: دیہی علاقوں کی ہمہ گیر ترقی، ہریجنوں اور دیگر کمزور طبقوں کی فلاح نیز ان کے لیے سماجی انصاف کا یقینی بندوبست، اقلیتوں کے مفادات کا تحفظ، قومی یک جہتی اور امن و قانون کا استحکام۔ اس کے علاوہ علاقائی عدم توازن کم کرنے، روزگار کے مواقع میں اضافہ کرنے، عوامی نظام تقسیم کو چست بنانے، عوام کو صاف ستھرا اور چاق و چوبند نظم و نسق فراہم کرنے نیز ریاست کی معاشی اور سماجی ترقی کو یقینی بنانے کے پروگراموں پر بھی خاص زور دیا گیا ہے۔ موجودہ حکومت نے بجٹ میں اپنی سیاسی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے اور جمہوریت کو ہر سطح پر مستحکم بنانے کا عزم بھی ظاہر کیا ہے۔ مقامی اداروں مثلاً پنچایتوں، علاقائی کمیٹیوں، ضلع پریشدوں، نگر پالیکاؤں اور نگر مہا پالیکاؤں وغیرہ میں انتخابات کرا کے انھیں عوامی نمائندوں کی قیادت عطا کی جائے گی۔

اس بجٹ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کوئی نیا ٹیکس نہیں لگایا گیا ہے۔ وزیر اعلا نے اس سلسلے میں اعلان کیا کہ ایک ارب، ۱ کروڑ ۹۹ لاکھ روپے کا خسارہ بقایا جات کی وصولیابی، منصوبہ کے باہر کے اخراجات میں بچت اور مرکزی امداد سے پورا کیا جائے گا۔ سالانہ منصوبہ کا کل بجٹ میں ۸۵۰ کروڑ روپیہ رکھا گیا ہے۔

(ا۔ آ۔ صف ،۳ ،،

فراق گورکھپوری
۴ بینک روڈ۔ الہ آباد ۲

غزل

مری نوا سے جلا اٹھتے تھے بحر و بر یہ چراغ
کہاں سے لاؤں عزیزو، مگر وہ دل وہ دماغ

بدن بہارِ تبسم ہے سر سے تا بہ قدم
یہاں سے دیکھیں اسے مسکرا رہے ہیں چراغ

ترے جمال سے دنیائے عشق رنگا رنگ
ترے خیال سے سینوں میں لہلہاتے ہیں داغ

سرے سے بزم میں انگڑائیوں کا یہ عالم
یہ بادِ صبح کی موجیں یہ جھلملاتے چراغ

پھری جن اہلِ نظر سے تری نگاہِ کرم
اب ان سے آنکھ چراتے ہیں بام و در کے چراغ

مری نظر میں ہیں سب جلوہ ہائے ظلمت و نور
نہ ہر اندھیرا، اندھیرا، نہ ہر چراغ چراغ

مجھے بہار و خزاں کیا ہے کچھ نہیں معلوم
میں کہہ رہا ہوں غزل اور کھلتے جاتے ہیں باغ

لگاؤ کان کہ عیسیٰ نفس ہے سازِ غزل
ہر ایک شعر سے جلتا ہے زندگی کا چراغ

وہ سر سے تا بہ قدم ہے بہار کی تصویر
وہ عضو عضو گلستاں بغل میں سیکڑوں باغ

دیوالی آج غریبوں کے گھر میں ہے لیکن
قریب ہو کے بھی ہیں ان سے کتنی دور چراغ

جلا گیا تھا انھیں کب تبسمِ پنہاں
کہ زخم زخم ہیں اب تک یہ تھرتھراتے چراغ

تلاشِ دوست میں، میں ہوں ازل سے سرگرداں
اسی تلاش میں پانے لگا ہوں اپنا سراغ

یہاں کسی کو بھی ملتا نہیں پتہ اپنا
میں ہوں وہاں کہ خود اپنے کو ڈھونڈتے ہیں چراغ

گناہِ عشق کی معصومیاں جزاک اللہ
سیاہ نامۂ اعمالِ عشق ہے بے داغ

شراب خانہ کی مٹی سے ہے سرشت میری
کہ ذرّے ذرّے سے میرے چھلک رہے ہیں ایاغ

ملا لو شاعرِ آوازِ درد سے آواز
اس اک چراغ سے تم بھی جلا لو اپنے چراغ

وطن میں رہ کے بھی غربت کا ہے وہی عالم
دھواں دھواں سی ہیں شامیں اداس اداس چراغ

شبِ سیاہ میں بن بیٹھے ہیں جو مشعلِ راہ
بہت اندھیرے وہ دل ہیں بہت اندھیرے دماغ

دیارِ ہند ہے یا کوئی مرکزِ دریافت
کہ پا سکی ہے یہیں زیست زندگی کا سُراغ

تمام دہر میں بادِ فنا کے جھونکے ہیں
کوئی بتاؤ کہاں جا کے میں جلاؤں چراغ

تمام جسم میں عالم ہے جگمگاہٹ کا
کہ عضو عضو میں پیہم لہک رہے ہیں چراغ

رہے گی یاد دلوں کو یہ نرمیٔ گفتار
بجھائے سے نہ بجھیں گے یہ جھلملاتے چراغ

میرا کلام سراسر ہے صبحِ نو کی نوید
کہ اب تو لینے لگے ہچکیاں فسردہ چراغ

محمد عثمان غنی
رفت قومی آواز لکھنؤ

اے اسیرانِ خانۂ زنجیر

۲۵ جنوری ۱۸۵۸ء کو بہادر شاہ ظفر بادشاہ ہندستان کے جرائم کی تفتیش کے لیے ایک تحقیقاتی کمیشن سر جان لارنس صاحب کے حکم سے قائم ہوا۔ دیوانِ خاص میں اس کمیشن کا اجلاس ہوتا تھا جس میں بادشاہ قیدیوں کی طرح لایا جاتا۔ اسی دیوانِ خاص میں وہ کبھی شاہانہ جلوس کرتا تھا۔ اب چپراسی اور چوب دار تک اس کو "قیدی" کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

۲ اپریل ۱۸۵۸ء کو کمیشن نے اپنا فیصلہ سنا دیا "جو شہادت عدالت کے روبرو پیش کی گئی ہے اس کے بموجب عدالت کی رائے ہے کہ قیدی محمد بہادر شاہ معزول شدہ بادشاہ ان کل اور جزو الزامات کا جو اس پر لگائے گئے ہیں مجرم ہے۔"

۱۵۲۶ء سے ۱۸۵۷ء تک ہندستان پر جاہ و جلال کے ساتھ حکومت کرنے کے بعد دودمانِ تیموریہ کا زوال ہو گیا۔ ابوالمظفر بہادر شاہ ظفر جلا وطن کر کے رنگون بھیج دیے گئے۔ دہلی لوٹ لی گئی۔ ملک میں خون کے دریا بہہ گئے اور بادشاہ کے مقربِ خاص سید ظہیر الدین ظہیر دہلوی نے رو رو کر لکھا ؎

ہر ایک رونقِ بزمِ جہاں قتل ہوا
ہر ایک قبیلہ و ہر خاندان قتل ہوا
ہر ایک طوطیِ شیریں زباں قتل ہوا
ہر ایک بلبلِ نوشیں بیاں قتل ہوا
گھروں سے کھینچ کے کشتوں پہ پشتے ڈالے ہیں
نہ گور ہے نہ کفن ہے نہ رونے والے ہیں

تقریباً ایک صدی بعد اسی شہر دہلی میں انگریز وائسرائے کے بنوائے ہوئے عالی شان محل میں ہی کھڑے ہو کر ۱۴ اور ۱۵ اگست کی درمیانی رات میں جواہر لال نہرو وزیر اعظم ہندستان نے اعلان کیا "اس آدھی رات کو جب ساری دنیا سوتی ہے ہندستان اپنی گہری نیند سے بیدار ہوتا ہے۔ مدت گزری جب ہم نے اپنی تقدیر سے ایک عہد کیا تھا وقت آگیا ہے کہ اس وعدہ کو وفا کیا جائے۔"

ایک بار پھر ہندستان میں خون کی ندیاں بہہ گئیں ملک دو ٹکڑے ہو گیا۔ اور اتنے بڑے پیمانے پر انتقال آبادی ہوا کہ تاریخ انسانی نے اس سے قبل کبھی ایسا سفر در وطن نہیں دیکھا تھا۔

خون کی یہ قربانی دے کر بھی ۱۸۵۷ء میں ہم ہار گئے تھے۔ خون کی یہ قربانی دے کر ہم ۱۹۴۷ء میں کامیاب ہوئے اور آزاد ہو گئے۔ دونوں قربانیوں کی کہانی ایک طویل تاریخ ہے جو ابھی شاید پوری طرح سے لکھی نہیں گئی ہے اور شاید اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ کبھی نہ لکھی جا سکے۔ لیکن یہ قصہ ہے جاننے اور سمجھنے کے لائق کہ اس میں عبرت کا بھی سامان ہے اور عزیمت کا بھی۔

مولانا فضل الحق خیرآبادی مرحوم ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ایک جلیل القدر "ہیرو" اور ایک بڑے عالم تھے۔ غدر کے جرائم میں کالے پانی کی سزا پائی اور وہیں وفات پائی۔ انھوں نے بہ عبور دریائے شور رہ کر "قصائد غدریہ" عربی میں تصنیف کیے کہ اس زمانے میں عالموں کی یہی زبان تھی۔ فرماتے ہیں

"مجھے ایک عورت کے (ملکہ وکٹوریا) مکر نے مبتلائے مصائب

کردیا، عورتوں کا مکر بڑا ہی زبردست مکر ہے
وہ عہد و پیمان کرکے مخلوق کو فریفتہ بنالیتی ہیں اگرچہ ان کے
عہد و میثاق میں نہ وفا ہے نہ قرار
اس نے یہ اعلان کیا کہ جو لوگ گھر سے مجبور پڑے ہیں انھیں
امن دیا گیا
ایسے لوگ اس کے امان نامے سے دھوکے میں آکر اپنے
گھروں کو خوش خوش واپس ہوگئے
میں بھی کافرہ متسلطہ کے اعلان سے فریب کھاکر مکان پہنچ
گیا
پھر حکامِ سلطنت نے اس کے عہد و میثاق کی پروا نہ کرتے
ہوئے سختی شروع کی اور میری بھی طلبی ہوئی "
آگے چل کر فرماتے ہیں:
" فضل حق کے لیے رفعت و بلندی کا فضل تھا اس کی وجہ
سے مجھے برابر والوں پر سربلندی حاصل تھی
شرفاء میں قدر و منزلت وجاہت میسر تھی جس کے سامنے
روسار، والیان ملک جھکتے تھے
کمال رفعت، وسعت، تندرستی، بزرگی، برتری
تونگری خوش بختی نصیبہ وری یہ سب نعمتیں حاصل تھیں
جنھیں آزمائش و مصیبت بھی بوسیدہ نہ کرسکی ہے
بہت سی عیش کی زندگی متغیر اور کتنی نعمتیں زائل ہوگئیں،
سختی اور بدحالی نازل ہوگئی
اللہ نے مجھے وہ علوم عطا کیے کہ ان میں سے بہت سے علماء
نے حاصل کیے میرے اور میرے احباب کے درمیان جدائی حائل
ہوگئی نعمت متغیر ہوگئی شرارتیں گھر آئیں اور فتنے اچانک چھاگئے،
مسرت جاتی رہی، شادمانی و راحت پھر گئی۔ نصرانی ہمارے شہروں
پر مسلط کر دیے گئے کج فہم ہندستانی ان کے مددگار بن گئے
وہ اسے نہ سمجھ سکے کہ نہ ان کے پاس وفاداری ہے نہ وسعت
حمایت
اس سے قبل ان پر ایسا شخص حکمراں تھا جسے غنا، سرود

اور مال و دولت نے خدمت اہل دیار سے روک دیا تھا۔
اب جب کہ نصاریٰ کی پوری طرح مدد کی گئی تو ظلم و ستم میں فراط
سے کام لینے لگے
اور کمزوروں کو تو جور و جفا سے اکھاڑ پھینکا
وہ دیار جو آباد تھا ویران ہوگیا، جس طرح کہ امرا و روسا و
برباد ہوگئے
وہ قوم سبا کی طرح متفرق و منتشر ہوگئے ان کے بہت سے
گروہوں کو قید و بند نے آدبایا "

مولانا فضل الحق خیرآبادی مرحوم کہ آخری عہد تیموریہ کے صف اول کے دانشوروں میں شمار ہوتے تھے اور مرزا اسد اللہ غالب، مومن خاں مومن، امام بخش صہبائی، مفتی صدر الدین آزردہ، کے ہم عصر تھے قید و بند کی صعوبتوں کو جھیلتے ہیں تو کس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ کج فہم ہندستانی نصرانیوں کے مددگار ہوگئے اور ان سے قبل ان پر ایسا شخص حکمراں تھا جسے غنا و سرود اور مال و دولت نے خدمت اہل دیار سے روک دیا تھا۔ مولانا آزادی کے خواہاں تھے لیکن آزادی ملے تو کیوں کر۔ انگریز کو شکست ہو تو کیوں کر۔ بات مولانا فضل حق اور ان کے ساتھیوں کے سمجھنے کی نہ تھی کہ وہ زمانہ ہی اور تھا اور ان بزرگوں کے رویا ہی اور تھے۔

وقت کا کارواں گزرتا رہتا ہے، ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں لیکن اسی ۱۸۵۷ء کے آس پاس ایک نئی نسل تیار ہو رہی تھی جو آزادی ہندستان کے لیے ایک نیا ذہنی رویہ بنانے کا ذریعہ بننے والی تھی۔ آزادی کی سیاسی تحریکات ابھی دھندلے مستقبل میں گم تھیں لیکن آج جب وہ دھندلا مستقبل ماضی کی میراث بن چکا ہے تو یہ نظر آتا ہے کہ انگریزوں کو شکست دینے کے لیے بہت کچھ ترک کرنا اور بہت کچھ حاصل کرنا ضروری تھا۔ کیوں کہ زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہوتی جارہی تھی اور پرانی سیاست گری خوار ہوتی جارہی تھی۔

مسلمانوں میں سب سے پہلے جس نے اس حقیقت کا شعوری ادراک کیا وہ پچھلی صدی کے آخری ربع کا "نیچری" سر سید احمد خاں

دہلوی" تھا۔ لیکن فضا سرسید کے مطلع ہند پر طلوع ہونے سے قبل ہی بدلنا شروع ہو گئی تھی اور خود خاندان تیموریہ کے آخری اور ٹمٹماتے ہوئے چراغ کے آخری دور میں ایک نئی روشنی پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ اس زمانے میں اگرچہ جید علماء [اور جنگ آزادی میں ان کے اثرات کی بھی ایک طویل داستان ہے] مثلاً شاہ عبدالعزیز دہلوی کے خاندان کے علماء، مشائخ مثلاً شاہ غلام علی، خواجہ محمد نصیر، شاہ محمد اسحاق اور حضرت کالے صاحب، شعراء مثلاً شیخ محمد ابراہیم ذوق مرزا غالب، شیفتہ، بے خبر، مومن خاں مومن وغیرہ زندہ اور موجود تھے لیکن ایک نئی نسل بھی پروان چڑھ رہی تھی جس کو آگے چل کر بڑے کام انجام دینا تھے اور ایک نئی فضا بنانا تھی۔ اخبارات نکلنا شروع ہو گئے تھے۔ جدید علوم پر کام شروع ہو گیا تھا اور نہ صرف سیاسی بلکہ ذہنی دنیا بھی آئندہ چند برسوں میں تہہ و بالا ہونے والی تھی۔

فورٹ ولیم کالج نے کلکتہ میں بہت پہلے کام شروع کر دیا تھا لیکن دہلی کی اردو سوسائٹی اور دہلی کالج نے بہادر شاہ کے عہد ہی میں نئے علوم تک ہندستانیوں کی رسائی کا انتظام کرنا شروع کر دیا تھا۔

دہلی کی اردو سوسائٹی نے بڑے پیمانے پر تراجم کا کام کیا خصوصاً سائنسی علوم مثلاً نباتات، کیمسٹری، ریاضیات وغیرہ کے ترجمے کے اصول مرتب کیے [آج اردو ترقی بورڈ ایک مرتبہ پھر اسی اصولی ادھیڑ بُن میں مبتلا و مصروف ہے] مولوی عبدالحق نے ان تصانیف کی ایک فہرست مرتب کر دی تھی کہ جو دہلی کی اردو سوسائٹی نے اردو میں منتقل کروائیں۔ ان میں تجزیہ اقلیدس، اصول قانون، تاریخ ہند، الجبرا، تاریخ انگلستان، علم مثلث، ترشہائے مخروطی، تاریخ روما الغرض ایک طویل فہرست سیکڑوں کتابوں کی ہے جس میں سائنس، ریاضیات، قانون، تاریخ، سوانح، میڈیسن اور مذہبیات سب کچھ شامل ہیں۔

یہ پہلا قدم تھا ہندستانیوں اور مسلمانوں کو خصوصاً جدید علوم سے روشناس کرانے کا۔ اور یہی روشنی آئندہ چل کر وہ سلیقہ بخشنے والی تھی کہ جس کی بدولت ہندستان کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہونا تھا۔

دہلی سوسائٹی کے علاوہ بھی ترجمہ کا کام زور و شور سے ہوا۔ ہندو مسلمان سب اس کام میں حصہ لے رہے تھے۔ اعتراضات بھی ہو رہے تھے لیکن لکھے جا رہے تھے لکھے جا رہے تھے اور اُدھر وقت کی موونگ فنگر بھی لکھے جا رہی تھی لکھے جا رہی تھی۔

اور پھر دہلی کالج تھا۔ سرسید کے مدرسۃ العلوم سے بہت پہلے اس نے بھی بڑا کام کیا۔ جو اب یکسر فراموش کر دیا گیا ہے۔ کوئی نام بھی اس کا نہیں لیتا۔

دہلی کالج اپنی ابتدائی شکل تبدیل کر کے دہلی کالج کے نام سے ۱۸۲۵ء میں قائم ہوا۔ اور ۱۸۷۷ء میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ احتجاج کے باوجود اس کو بند کر دیا گیا [یاد رکھیے کہ اسی ۱۸۷۷ء کے آس پاس سرسید نے مدرسۃ العلوم کی بنا ڈالی جو آگے چل کر مسلم اینگلو اورینٹل کالج اور پھر مسلم یونیورسٹی بنا]

دہلی کالج کے قیام کے لیے نواب اعتماد الدولہ سید فضل علی خان بہادر نے ایک لاکھ ستر ہزار روپیہ کا عطیہ دے کر اسے وقف کر دیا۔ اس کالج نے ایک طرف تو اردو زبان کو مالا مال کرنے کا عدیم المثال کارنامہ انجام دیا اور دوسری طرف ایک نئی نسل کو پروان چڑھایا۔ اس کالج میں ایک طرف تو مشرقی علوم کا شعبہ تھا اور دوسری طرف مغربی علوم کا بھی ایک شعبہ تھا۔ ۱۸۵۲ء میں اس میں ۱۰ عیسائی، ۹۲ مسلمان اور ۱۷۲ ہندو طالب علم تھے۔ مولانا امام بخش صہبائی یہاں مدرس تھے۔ جو غدر میں مع اہل خاندان کے قتل ہوئے۔ شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ یہاں کے تعلیم یافتہ تھے۔ مسٹر رام چندر ریاضی کے استاد تھے اور انھوں نے ریاضی کی متعدد کتابیں اردو میں منتقل کیں۔ اور مولانا الطاف حسین حالی کو رنج رہا کہ وہ دہلی میں رہتے ہوئے اس کالج میں نہ پڑھ سکے۔ شمس العلماء نذیر احمد بھی اس کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ فرماتے ہیں:

"معلومات کی وسعت، رائے کی آزادی، ٹالریشن (درگزر) گورنمنٹ کی سچی خیر خواہی [یہ قابل غور ہے] اجتہاد علی البصیرہ

یہ چیزیں جو تعلیم کے عمدہ نتائج میں اور حقیقت میں شرطِ زندگی ہیں ان کو میں نے کالج ہی میں سیکھا اور اگر میں کالج میں نہ پڑھتا تو بتاؤں کہ کیا ہوتا مولوی ہوتا تنگ خیال، متعصب اکھل کھرا اپنے نقص کے احتساب سے فارغ دوسروں کے عیوب کا محتسب "

قابلِ غور ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد گورنمنٹ کی سچی خیر خواہی پر زور دیتے ہیں اور پھر ان کے بعد سرسید علیہ الرحمۃ بھی انگریز پرستی کے لیے بدنام ہوتے ہیں لیکن قابلِ غور یہ بات بھی ہے کہ اگر جدید علوم کی روشنی ہندستان میں نہ پھیلتی تو کیا انگریز کو ہندستان سے نکالا جاسکتا تھا۔

اگر ماسٹر رام چندر، سدا سکھ لال، پنڈت موتی لال تسبل دہلوی، پنڈت من پھول، ماسٹر پیارے لال، ڈپٹی نذیر احمد، شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ وغیرہ گورنمنٹ کی خیر خواہی میں سہی۔ وہ کار ہائے نمایاں انجام نہ دیتے تو کیا آئندہ چل کر نہرو، گاندھی، حسرت موہانی، رفیع احمد قدوائی وغیرہ کے پیدا ہونے کے امکانات تھے۔

دہلی کالج مرحوم ہوا۔ ایک نئے بزرگ نے مسندِ ارشاد سنبھالی، سرسید احمد خاں کو بجنور اور میرٹھ میں انگریزوں کی جان بچانے اور اپنا گھر لٹانے اور اسی وفاداری کے صلے تعلقداری سے انکار کرنے کے بعد جب سانس لینے کی مہلت ملی تو انھوں نے گردوپیش پر نظر ڈالی، سنیے کیا کہتے ہیں۔

" غدر کے بعد مجھے اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا۔ جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا "

چنانچہ ایک طویل جد و جہد سرسید نے اپنی قوم کو بربادی سے نکالنے کی شروع کی۔ رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند پہلا قدم اور مدرستہ العلوم کا قیام اس جد و جہد کا نقطۂ عروج تھا۔ سرسید اور ان کے رفقا نے ملک اور قوم پر جو احسان کیا اس کی داستان الحمد للہ اب لوگوں کو از بر ہے۔ لیکن نیچری تھے کہ متعصب، کہ انگریز پرست کہ فرقہ پرور یہ بحث ابھی زیرِ لب چلے ہی جاتی ہے۔ کارنامہ سرسید کا بہرحال یہ یاد رکھنے کا ہے کہ انھوں نے ہندستان میں جدید تعلیم کا در باز کیا۔

سرسید، مولوی سمیع اللہ، حالی، شبلی، عبدالحق خیرآبادی، نذیر احمد، ذکاء اللہ، محمد حسین آزاد، اور پھر انھی دشت و کہسار سے فوج کی فوج۔ برہمو سماج، مدرستہ العلوم، دارالعلوم دیوبند، فرنگی محل، محمد علی شوکت علی، تحریکِ خلافت، تلک، گوکھلے، ٹیگور، گاندھی، ترکِ موالات، نہرو، سبھاش چندر بوس، ہندستان چھوڑ دو، پٹیل، راج گوپال آچاری، راجندر پرشاد سیاسی آزادی، معاشی آزادی کا خواب اور اندرا گاندھی۔

زمانہ کر رسیمان خیال بھی ہے اور دموں کے الٹ پھیر کا نام بھی بہرحال چلتا رہتا ہے، آزادیِ ہند اب تینتیس برس پرانی حقیقت ہے لیکن یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ آزادی کے لیے جس نئے ذہن کی ضرورت تھی وہ ۱۸۵۷ء میں موجود ہی نہ تھا۔ لیکن اس ذہن کی تعمیر کرنے والوں کی پہلی نسل اسی زمانے میں پیدا ہوئی، اس وقت بھی مطعون رہی اور اب بھی اس کو کسی غلط فہمی میں انگریز پرست قرار دے دیا جاتا ہے۔ ہوتی آئی ہے کہ ......

آج ۱۹۸۰ء میں جب ہم آزادیِ ہند کی تینتیسویں سالگرہ منا رہے ہیں تو ہم ۱۸۵۷ء اور ۱۸۳۵ء کی اس "یوتھ پاور" کو بھول چکے ہیں جس نے خود کو جلا کر خاک کیا اور اپنے خاکستر سے ایک نیا جہاں پیدا کیا۔ آزادی کے معمار اور معمارِ اول وہ بھی تھے۔

بہادر شاہ ظفر نے سوال کیا تھا ؎

اے اسیرانِ خانہ زنجیر ‏ ‏ ‏ تم نے یاں غل مچا کے کیا پایا
نہ بجھا سوزِ دل جب آنکھوں سے ‏ ‏ ‏ ہم نے دریا بہا کے کیا پایا

یہ ایک ختم ہوتی ہوئی تہذیب کے فرماں روا کا مرثیہ ہے۔ رام پرشاد بسمل یہ پڑھتے ہوئے دار پر چڑھ گئے کہ ؎

لذتِ صحرا نوردی دوریِ منزل میں ہے

یہ ایک ابھرتی ہوئی تہذیب کے جواں مرد کی عزیمت ہے۔ عبرت سے عزیمت تک کا یہ سفر خوب ہے لیکن اس سفر میں جو خاموش مددگار تھے بارے ان کا بھی کچھ بیان ہوتا رہے تو بہتر۔

★

ڈاکٹر اقبال ماہر
۲۳۷ نخاس کہنہ ۔ الٰہ آباد

اُتر پردیش

(علم و ادب کی روشنی میں)

دیارِ شادمانی ہے بہارِ رنگ و نکہت ہے
یہاں رضواں ہے محوِ باغبانی یہ وہ جنت ہے

ہمالہ کو شرف حاصل ہے اس کی پاسبانی کا
یہ دیوارِ کہستاں ضامنِ امن و حفاظت ہے

فضائے وادیٔ گنگ و جمن میں آگئی رونق
صدائے مطربِ نوخیز فردوسِ سماعت ہے

لطافت سبزہ زاروں میں صباحت کشت زاروں میں
گلستاں میں ترنم فرمائیِ صناعِ فطرت ہے

زلیخائے وطن اس وقت ہے مصروفِ آرائش
جبیں پُرنور ہے لب پر محبت کی شکایت ہے

مجھے ہے اعتراف اس کا کہ میں ہوں تیرا دیوانہ
مجھے اقرار ہے اب تک مجھے تجھ سے محبت ہے

ترا دیدار آنکھوں کے لیے ہے خلدِ رعنائی
تصور تیرا تجھ سے بھی زیادہ خوبصورت ہے

سراپا تو کسی شاعر کا رنگیں خواب ہے گویا
اگر سوچیں تو افسانہ جو دیکھیں تو حقیقت ہے

ابھی بھولا نہیں میں داستانِ عظمتِ ماضی
مرے دل میں اسی تہذیبِ رفتہ کی امانت ہے

طلوعِ آفتابِ تازہ کے آثار ہیں پیدا
وطن کے آسماں کو مطلعِ نو کی ضرورت ہے

یہاں بیداریٔ تہذیب ہے یہ وہ ریاست ہے
مرے صوبہ کو حاصل علم و فن کی مرکزیت ہے

سخن دانوں سے ہے آرائشِ کاشانۂ معنی
قلم کاروں کی ہے بہتات فن کاروں کی کثرت ہے

کبیر و جائسی و تلسی و رس خان کے دم سے
ابھی محفوظ دنیا میں تمدن کی امانت ہے

نظیر و میر و غالب ہیں اسی دھرتی کے پروردہ
یہی سیماب اور اعجاز کی جائے ولادت ہے

منیر و قائم و رشک و امیر و ناسخ و آصف
یہ بزمِ مصحفی و آتش و انشا و جرأت ہے

سرور و مہدی و سرشار و اسمٰعیل و سر سید
نذیر و راشد الخیری میں تہذیب و فراست ہے

شرر سے محفلِ ناول نگاری کی ہے آرائش!
یہاں رسوا ہے اختر ہے کہیں ذکرِ امانت ہے

نسیم و محسن و شوق و حسن سے مثنوی زندہ
ریاضِ پاک باطن میں بھی رندانہ جسارت ہے

زباں دانوں کے ہونٹوں پر ہے توصیفِ انیس اب تک
وہ موجِ آبِ کوثر ہے کہ دریائے فصاحت ہے

دبیرِ مرثیہ خواں کی صدا گونجی ہے مجلس میں
زبان و فن میں معنی آفرینی ہے بلاغت ہے

اٹھا ارضِ الٰہ آباد سے اکبر حسین اکبر
تبسم میں یہاں سنجیدگی کی نشتریت ہے

سلیمان و سلام و شبلی و ستار صدیقی
محقق ہے مورخ ہے ہر اک اہلِ فراست ہے

صفی و ثاقب و یاس و عزیز و افسر و آسی
جلال و برق و چکبست و اثر سے فن کی عظمت ہے

جلیل و ماجد و نوح و وفا و بسمل و وحدی
جگت موہن رواں کے سر پہ بھی تاجِ فضیلت ہے

وہ تارا چند و سندر لال و نوبت رائے و سپرو
ثنا خوانِ ادب ہیں ان کو اردو سے محبت ہے

نیا اک موڑ دھنپت رائے نے بخشا کہانی کو
زمانے میں نگم بھی مایۂ نازِ اکملیت ہے

جواہر لال نہرو وہ "تلاشِ ہند" کا خالق
ادب بھی جس کے ذکر و فکر کا مرہونِ منت ہے

نیاز اہل ادب میں ایک قاموس ہمہ دانی
نگارستان معنی ہے جمالستان حکمت ہے

مہا دیوی و پنت و اشک و امرت رائے و بچے شنکر
سدھاکر، مارکنڈے اور اوستھی میں بھی ندرت ہے

شرر و کیفی سے معمور ہے بچن کا مدھوشالہ
نرالا کا جنوں بھی آئینہ دار فراست ہے

امرت پرکاش، چندر گپت، امرت رائے، تریپاٹھی
شرر، گوپش اور کملیشور میں قابلیت ہے

وطن کا مرد آہن، جاں نثار حریت جوہر
دم گفتار اک شیر نیستان خطابت ہے

امیر کاروان آگہی، فضل الحسن حسرت
اسیری میں غزل گوئی ہے بیخی کی شفقت ہے

وہاں شانی بدایونی نے بھی نغمہ سرائی کی
جہاں ہر زخم مرہم ہے جراحت میں بھی لذت ہے

سرود زندگی سے وجد میں ہے عالم امکاں
نشاط روح اصغر گونڈوی میں سرمدیت ہے

جگر ساغر بکف مینا بدوش آیا ہے محفل میں
سبوئے میکشی میں اس کے صہبائے محبت ہے

ادب میں جوش سا اک شاعر آتش نوا اٹھا
رجز خوانی میں سطوت ہے غزل خوانی میں شوکت ہے

مسیحائے ادب وہ ڈاکٹر اعجاز کی ہستی
زبان و علم و نقد و فن پہ حاصل جس کو قدرت ہے

فراق اک آزر علم و ادب ہے معبد فن میں
دیار حکمت و ادراک میں مینار عظمت ہے

مقدم انتقاد احتشام حکمت و دانش
مسلم کاروان فکر میں اس کی قیادت ہے

علیم و ذاکر و عبدالحق و فاروقی و عابد
یہاں یوسف یہاں مسعود رضوی سے عبادت ہے

یہاں عفان و ستار و علی عباس و صدیقہ
یہاں ابن صفی و شوکت و عادل کی شہرت ہے

ظریف و احمق و احمد جمال و شوکت و فرقت
رشید احمد کی تحریروں میں سنجیدہ ظرافت ہے

روش صدیقی و شاد و قضا و ساغر و تاباں
خلیل و اثر و خورشید میں بھی معنویت ہے

مسیح و عرشی و عابد سہیل و اختر انصاری
رضیہ بیگم و سجاد و شارب میں فراست ہے

علی جواد و جعفر عسکری و جذبی و اجمل
نشور و مصطفیٰ زیدی میں عہد نو کی جدت ہے

عقیل نکتہ فہم و نکتہ داں کا ذہن معروضی
دبستان معانی میں ترقی کی علامت ہے

امیر و عشرت و عرفان و شہباز و حیات اللہ
بشر مختار خاصان ایوان صحافت ہے

شمیم و نازش و بدر و جمال و حرمت و بیکل
فضیل و شہریار و شمس کے بھی فن میں جدت ہے

مجاز و کیفی و مجروح و سردار و وحید اختر
مظفر میں اثر سبط حسن میں مقصدیت ہے

سلام و جعفر عباس و ط۔ انصاری و باقر
حسن اور آل احمد میں بھی تنقیدی بصیرت ہے

شہیر و قرۃ العین و مجیب و راہی و مجنوں
وقار و عسکری و مجتبیٰ کے فن میں وسعت ہے

رئیس و عندلیب و سالک و احسان بن دانش
اسی در سے طفیل احمد جمالی کو بھی نسبت ہے

وہ بزم شاعر و فنکار ہو یا محفل حکمت
یہاں مصروف تعمیر وطن ہر اک جماعت ہے

وہی یوپی جہاں کھلتے ہیں غنچے علم و دانش کے
اسی فردوس سے اقبال ماہر کو عقیدت ہے



ڈاکٹر حنیف نقوی
شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی
وارانسی۔ ۲۲۱۰۰۵

مرزا حاتم علی بیگ مہرؔ

مرزا غالبؔ بلا شک وشبہ اپنے عہد کی سب سے زیادہ متنوع پرکشش اور اہم شخصیت ہیں۔ ان کی اسی انفرادیت کی بنا پر ان کا حلقۂ تعارف اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ وسیع تھا۔ ملک کے گوشے گوشے میں ان کے احباب، تلامذہ اور قدرشناس موجود تھے۔ ان میں سے بعض حضرات کو آج بھی ادبی دنیا میں ذاتی حیثیت سے اعتبار و امتیاز حاصل ہے اور بعض محض غالبؔ سے نسبت کی بنا پر مشہور و متعارف ہیں۔ آخر الذکر لوگوں کے زمرے میں ایک نام مرزا حاتم علی بیگ مہرؔ کا بھی آتا ہے۔ غالبؔ سے ان کے تعلقات ۱۸۵۸ء میں قائم ہوئے اور آخر وقت تک ان کی استواری میں کوئی فرق نہیں آیا۔ تقریباً گیارہ سال کی اس مدت میں دونوں کو کبھی ایک دوسرے سے ملاقات کا موقع نہیں ملا لیکن باہمی مراسلت کے ذریعے برابر رشتۂ اخلاص و ارتباط کی تجدید ہوتی رہی۔ مہرؔ نے "دستنبو" کی کتابت و طباعت اور تہذیب و آرائش میں غیر معمولی دلچسپی لے کر غالبؔ شناسوں کی صف میں جگہ حاصل کی اور غالبؔ نے ان کی مثنوی "شعاع مہر" پر تقریظ لکھ کر دوستی کا حق ادا کیا۔ ادب کے عام طالب علم مہرؔ کو یا تو غالبؔ سے اسی رشتۂ نیازمندی کی نسبت سے پہچانتے ہیں یا پھر ناسخ کے ایک نمودار شاگرد کی حیثیت سے کبھی کبھی ان کا نام زبان و قلم پر آجاتا ہے۔ انفرادی طور پر ان کے سوانح حیات اور کارناموں کے متعلق بہت کم لکھا گیا ہے اور جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ انتہائی ناقص اور نامعتبر ہے۔ حال ہی میں جناب کاظم علی خاں نے ماہنامہ "نیا دور" کے جنوری ۱۹۸۰ء کے شمارے میں ان کے "سوانح اور ادبی آثار" کے بارے میں ایک بسیط مضمون لکھ کر نسبتاً زیادہ مفصل اور باوثوق معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ بھی بعض اہم مآخذ تک رسائی سے محرومی کے باعث کئی امور کے سلسلے میں صحیح نتائج تک پہنچنے میں ناکام رہے ہیں۔ پیش نظر سطور کا مقصد انہی خامیوں اور کوتاہیوں کا ازالہ ہے۔

اسلاف وخاندان:۔ مہرؔ کے تمام سوانح نگار اس پر متفق ہیں کہ ان کے مورث اعلیٰ اصفہان سے ترک وطن کر کے ہندوستان آئے تھے۔ خود مہرؔ نے بھی اپنی خودنوشت میں جو اس مضمون کے آخر میں بطور ضمیمہ شامل ہے، یہی لکھا ہے کہ "پردادا میرے نادر شاہ کے ساتھ ہندوستان میں اصفہان سے آئے"۔ کاظم صاحب نے خواجہ عبدالرؤف عشرتؔ کے حوالے سے اس معلومات پر یہ اضافہ فرمایا ہے کہ وہ نادر شاہ کے توپخانے کے کمانڈر تھے۔ یہ بات کسی معتبر ذریعے سے ثابت نہیں ہوتی۔ مہرؔ نے اس کی جانب کوئی اشارہ نہیں کیا حالانکہ یہ ایسا اعزاز ہے کہ انھیں اس کا ذکر کرنا چاہیے تھا۔ وہ اپنے پردادا کا نام بھی نہیں بتلاتے کہ دوسرے ذرائع سے ہی عشرتؔ کے اس بیان کی تصدیق کی جا سکے۔ مہرؔ کے دادا کا نام بیشتر تذکرہ نگاروں نے مرزا امراد علی خاں لکھا ہے۔ کاظم صاحب کے بقول مولانا غلام رسول مہرؔ نے اس متفق علیہ روایت کے علی الرغم ان کا نام "امداد علی خاں" درج فرمایا ہے۔ لیکن اس معاملے میں مولانا مہرؔ تنہا نہیں، جناب مرتضیٰ حسین فاضلؔ زیدی نے بھی "ریاض الفردوس" کے تکملے میں "امداد علی خان" ہی لکھا ہے۔ (ص ۱۳۹) فاضل مضمون نگار معاصر تذکرہ نگاروں کی شہادتوں اور مہرؔ کے پوتے مرزا قاسم حسین کے بیان کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ روایت ناقابل قبول

ہے اور صحیح نام "مرزا مراد علی خاں" ہی ہے۔ مہر کی خود نوشت ان کے اس قول کی تائید نہیں کرتی۔ انھوں نے دو بار اپنے دادا کا ذکر کیا ہے اور دونوں جگہ ان کا نام "مرزا امراؤ علی خاں بہادر" لکھا ہے۔ چونکہ اس نام میں یکے بعد دیگرے دو الف جمع ہو گئے ہیں، اس لیے کتابت کے دوران ان میں کسی ایک کا حذف ہو جانا اور اس طرح "مرزا امراؤ" کا "مرزا مراد" بن جانا بعید از امکان نہیں۔ مہر کی تحریر سے اس امر کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ مرزا امراد علی خاں بہادر نواب شجاع الدولہ کے "مصاحب خاص و ندیم با اختصاص" اور علاقۂ دلمؤ کے ناظم تھے۔ غالباً شجاع الدولہ ہی نے انھیں رکن الدولہ کا خطاب بھی عطا کیا تھا۔

مہر کی تحریر کے مطابق ان کے والد مرزا فیض علی بیگ قزلباش تا عمر "عملداری سرکار انگریز بہادر" میں تحصیلدار رہے۔ مرزا قاسم حسین کے بقول انھیں صرف کھیر (ضلع علی گڑھ) کا یاد اکسٹر رام بابو سکسینہ (تاریخ ادب اردو، حصہ اول ص ۲۳۹) اور جناب فاضل زیدی (ریاض الفردوس ص ۱۳۹) کے حسب تحریر علی گڑھ یا کول کا تحصیلدار قرار دینا درست نہیں۔ اس سلسلے میں خواجہ عبد الرؤف عشرت کا یہ بیان زیادہ قرین صحت معلوم ہوتا ہے کہ مہر کی ولادت کے زمانے میں مرزا فیض علی بیگ ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے علی گڑھ کے تحصیلدار تھے۔ (آب بقا ص ۱۱۸)

مولد اور سنہ ولادت :۔ بیشتر تذکرہ نگار مہر کو لکھنوی الاصل بتاتے ہیں لیکن خواجہ عبد الرؤف عشرت کے علاوہ ان میں سے کسی نے وضاحت کے ساتھ یہ نہیں لکھا کہ وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ اس کے برخلاف مرزا محمد عسکری نے "ادبی خطوط غالب" میں آگرے کو ان کا مولد قرار دیا ہے۔ جناب کاظم علی خاں جنھوں نے ایسے تمام تذکروں سے جن میں مہر کا ذکر ہے، استفادہ کیا ہے، عشرت کے بیان سے متفق ہیں۔ مرزا محمد عسکری کی روایت یقیناً ناقابل توجہ ہے لیکن حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ انھوں نے مہر کے ایک اہم ترین تذکرہ نگار حکیم قطب الدین باطن اکبر آبادی کے بیان کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ باطن جو مہر سے قریبی تعلق اور ذاتی واقفیت رکھتے تھے، ان کا "مولد و منشا" فرخ آباد بتاتے ہیں (گلستان بے خزاں ص ۲۲۸) مہر کے چھوٹے بھائی مرزا عنایت علی ماہ کے ذکر میں بھی انھوں نے فرخ آباد سے ان کی اس نسبت کا اعادہ کیا ہے (ص ۲۴۱) اس تذکرے کے علاوہ نواب علی حسن خاں نے بھی اپنے تذکرے "بزم سخن" کی فہرست شعرا (ص ۱۲) میں ماہ کا پورا نام "مرزا عنایت علی بیگ فرخ آبادی" درج کیا ہے۔ خود مہر نے اپنی خود نوشت میں لکھنؤ کو اپنا مولد لکھنے کی بجائے "مسکنِ قدیم" لکھا ہے۔ البتہ ایک مثنوی میں جو "حکایت منظوم" کے عنوان سے شامل دیوان ہے، ان کا یہ واضح بیان موجود ہے کہ ع

مولد مرا شہر لکھنؤ ہے

چونکہ یہ بات دعویٰ زباندانی کے اثبات میں کہی گئی ہے، اس لیے ممکن ہے کہ اس میں حقیقت بیانی سے زیادہ سخن سازی دخیل ہو۔ فرخ آباد سے ان کا تعلق بہرحال ثابت ہے، اس لیے باطن کے بیان کو سرسری طور پر غلط بیانی سے تعبیر کر کے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مرزا غالب نے ۱ جون ۱۸۵۹ء کو مہر کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ "مجھ کو آپ کا فرخ آباد جانا معلوم ہو گیا تھا، اس واسطے آپ کو خط نہیں لکھا۔" (خطوط غالب مرتبہ مولانا غلام رسول مہر طبع سوم ص ۲۱۹) مہر کی منظور نظر مغنیہ مغل جان بھی فرخ آباد ہی کی رہنے والی تھیں۔ ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳ء) میں جب انھوں نے فرخ آباد میں اپنا مکان تعمیر کرایا تو مہر وہاں موجود تھے اور انھوں نے اس کی تاریخ کہی تھی۔ اس کے بعد اسی سال مغل جان کے انتقال پر انھوں نے قطعۂ تاریخ کہا تھا۔ مہر کے قریبی اعزا میں ان کے ایک ماموں مرزا حبیب علی کا نام ہمارے علم میں ہے۔ "باغ فرنگستان" کے مطابق وہ ایام غدر میں فرخ آباد میں قیام پذیر تھے۔ دیوان مہر میں ایک دوسرے عزیز مرزا راحت علی بیگ کی شادی کی تاریخ کا ایک قطعہ موجود ہے۔ اس کے مصرع اول میں مہر نے انھیں "عزیزی میرزا راحت علی بیگ" لکھا ہے۔ "سخن شعرا" میں راحت تخلص کے تحت ایک شاعر مرزا راحت علی خلف مرزا حبیب علی بیگ کا ذکر ملتا ہے جنھیں "مقیم فرخ آباد" بتایا گیا ہے (ص ۱۷۵) یہ یقیناً مہر کے ماموں زاد بھائی تھے۔ نواب فدا حسین خاں فدا

رئیس فتح گڑھ (فرخ آباد) نے مہر کی وفات پر ایک قطعۂ تاریخ کہا ہے جو دیوان مہر کے آخر میں منقول ہے۔ اس کے ایک مصرعے ع داشتم الفت بہ آں مغفورِ من از بد و عمر، سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کا بچپن ایک ساتھ گزرا تھا۔ ان شواہد کی روشنی میں یہ قیاس کرنا غلط نہ ہوگا کہ مہر کی والدہ فرخ آباد کی رہنے والی تھیں اور ان کی ولادت بہ گمان غالب اپنے ننہیال میں ہوئی تھی۔

لکھنؤ میں ولادت سے متعلق مہر کے بیان کی صحت مشکوک ہونے کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے دادا نے لکھنؤ کو اپنا وطن بنا لیا تھا اور ان کے والد بھی شاید وہیں پیدا ہوئے تھے۔ اس لحاظ سے لکھنؤ ان کا مولد ہو یا نہ ہو، وطن ضرور تھا اور انھیں اس سرزمین سے اتنا ہی تعلق خاطر تھا جتنا کہ کسی شخص کو اپنے وطن سے ہونا چاہیے۔ چنانچہ ان کے اشعار میں کثرت سے لکھنؤ کا ذکر ملتا ہے۔ ان اشعار سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ برابر لکھنؤ جاتے رہتے تھے۔ ان میں سے چند شعر یہ ہیں ؎

لکھنؤ میں روضۂ عباس مدفن ہو مرا — آگرہ میں کوئی جا جز بیر گیلانی نہیں
اس چرخ روسیاہ نے مٹی خراب کی — مجھ کو چھڑا کے لکھنؤ کی خاک پاک سے
لکھنؤ میں جا کے پڑھنا مہر اب تو یہ غزل — تیری باتوں کے سمجھنے کو سخنداں چاہیے
سینہ میں دل کو رکھتی ہے یاد دیار یار — حب کا عمل ہوئی مری حب وطن مجھے

محمد مستجاب خاں مشتاق شاگرد مہر کے ایک خط سے جو مہر کے زمانۂ قیام لکھنؤ میں ان کے نام لکھا گیا تھا، یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کبھی کبھی عشرۂ محرم لکھنؤ میں گزارا کرتے تھے اور وہاں ان کا قیام عموماً اپنے سمدھی میر وزیر علی صبا کے مکان پر رہتا تھا۔ اس خط کے یہ جملے ملاحظہ طلب ہیں :۔

"جناب مرزا صاحب اللہ آپ کب تک لکھنؤ میں تشریف رکھتے ہیں۔ اب یہ فرمایئے یہاں بھی آیئے گا یا محرم وہاں کیجیے گا۔ مگر آپ سمدھیانے میں رہتے ہیں اور ضرور بلا تکلف پلاؤ علیہ السلام نوش فرماتے ہوں گے اور قورمہ علیہ الرحمہ کھاتے ہوں گے۔ (حدیقۃ النشوص ۶۳)

مہر کی تاریخ ولادت کے سلسلے میں تمام تذکرہ نگار خاموش ہیں، البتہ خواجہ عبدالرؤف عشرت کا بیان ہے کہ وہ بروز شنبہ ۲ر جمادی الاول سنہ ۱۲۳۰ھ (۵ر اپریل ۱۸۱۵ء) کو قریب شام پیدا ہوئے تھے اور ان کا تاریخی نام خورشید علی تھا۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ خواجہ صاحب کو افسانہ طرازی میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ اس لیے ان کے کسی بیان کو جس کی پشت پر کوئی مضبوط دلیل نہ ہو، قبول کر لینا تحقیقی بے احتیاطی کے مترادف ہے۔ مہر کی جو خود نوشت ہمارے پیش نظر ہے، وہ ۳ جمادی الاول سنہ ۱۲۸۶ھ کو جاری شدہ ایک اشتہار کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ اس میں انھوں نے اپنی عمر ستاون برس بتائی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب سے سنہ ۱۲۸۶ھ میں سے ۵۶ سال کم کرنے میں کچھ بھول چوک ہو گئی ہے اور انھوں نے اس اشتہار کی تاریخ اجرا کو بنیاد بنا کر ان کی تاریخ پیدائش متعین کر دی۔ تحقیق مزید کے طور پر اس کے ساتھ تاریخی نام کا بھی اضافہ فرما دیا۔ اگر واقعی مہر کا تاریخی نام خورشید علی ہوتا تو وہ خود نوشت میں اس کا تذکرہ ضرور کرتے۔ جہاں تک راقم السطور کو علم ہے۔ مہر کا کوئی معاصر تذکرہ نگار بھی ان کے اس نام سے واقف نہیں حتیٰ کہ ان کے فرزند مرزا سخاوت علی بیگ نے ان کے انتقال کے بعد تو ارتخ وفات پر مشتمل جو رسالہ ترتیب دیا تھا اس میں بھی ان کے اس نام یا تاریخ پیدائش کا ذکر نہیں ملتا۔ اس لیے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ خواجہ عبدالرؤف عشرت کو جو نہ مہر کے ہم عصر تھے اور نہ ہم خاندان، یہ تاریخ کس طرح معلوم ہوئی ــــ جناب کاظم علی خاں نے خواجہ عشرت کے بیان کو صحیح تسلیم کرتے ہوئے اس سلسلے میں یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ "ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے میں مہر کا سنہ ولادت ۱۸۱۴ء درج ہے موصوف کے نزدیک یہ ایسی تحقیقی غلطی ہے جس سے "اردو تحقیق کی سمت و رفتار کا اندازہ ہوتا ہے"۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے ڈاکٹر صدیقی کے بیان کو غلط طور پر پیش کر کے خود تحقیقی بددیانتی کا ثبوت دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے تحقیقی مقالے "لکھنؤ کا دبستان شاعری" میں مہر کا سال ولادت سنہ ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۴ء تحریر فرمایا ہے۔ اگر عشرت کی بیان کردہ تاریخ ولادت کو صحیح مان لیا جائے تب بھی ان کے اس بیان میں سنہ ہجری کی سنہ عیسوی کے ساتھ عدم مطابقت کے علاوہ کوئی غلطی نظر نہیں آتی اور اس غلطی کو غلط بیانی تصور کرنا صریح ناانصافی

خواجہ عشرت نے یہ بھی لکھا ہے کہ والد کے انتقال کے وقت قہر کی عمر صرف چار سال تھی۔ دوسرے سوانح نگار سنین عمر کے تعین کے بغیر اسے ان کی کم سنی کا واقعہ بتاتے ہیں۔ جناب کاظم علی خان نے "ریاض الفردوس" (مرتبہ ۱۲۸۱ھ) کے حوالے سے لکھا ہے کہ "باپ کی رحلت کے بعد قہر کی تعلیم ان کی والدہ نے بڑے اہتمام سے دلائی" (کذا) یہ بیان "ریاض الفردوس" کے مولف کا نہیں، اس کے مرتب جناب مرتضیٰ حسین فاضل زیدی کا ہے اور محض قیاس پر مبنی ہے، اس لیے اس میں صحت اور عدم صحت دونوں کے امکانات مضمر ہیں۔ خود قہر نے اپنے والد کے انتقال کے متعلق کچھ نہیں بتایا ہے لیکن والدہ کی وفات سے متعلق چار قطعات تاریخ ان کے دیوان میں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک قطعے کا آخری مصرعہ ع شود جنتی مادر پاک قہر، کاظم صاحب نے بھی "آب بقا" کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ ایک دوسرے قطعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بروز شنبہ ۱۴ ربیع الاول ۱۲۸۶ھ (۲۶ جون ۱۸۶۹ء) کو فوت ہوئی تھیں۔

آغاز شاعری اور تلمذ:۔ کاظم صاحب نے بعض قرائن کی بنیاد پر یہ رائے قائم کی ہے کہ "قہر نے شاید تیرہ سال کے سن میں (۱۲۴۲ کے آس پاس) شاعری شروع کی ہوگی" قہر نے خود ۱۲۸۱ھ میں جہاں اپنی عمر ستاون سال بتائی ہے وہیں مدت شاعری چالیس سال قرار دی ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شعر گوئی سے ان کے شغف کا آغاز سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں (۱۲۴۶ھ کے آس پاس) ہوا ہوگا۔ کاظم صاحب نے خواجہ عشرت کے اس بیان کی روشنی میں کہ "قہر نے ناسخ سے شاید دس برس اصلاح لی تھی کہ ناسخ کا انتقال ہوگیا" یہ نتیجہ بھی اخذ کیا ہے کہ وہ رجب یا شعبان ۱۲۴۳ھ میں ناسخ کی لکھنؤ سے جلا وطنی سے قبل ہی ان کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو چکے تھے۔ ہماری پیش کردہ معلومات کی بنیاد پر یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ قہر رجب ۱۲۴۸ھ میں ناسخ کی لکھنؤ واپسی کے بعد ان کے شاگرد ہوئے ہوں گے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ رشتہ اس سے قبل ہی ناسخ کے کان پور یا الہ آباد میں قیام کے دوران قائم ہو چکا ہو۔ ناسخ سے ان کا تلمذ بہرحال تمام شبہات سے بالاتر ہے۔ خود نوشت کے علاوہ اپنے اس شعر میں بھی انھوں نے اس نسبت کا اعتراف کیا ہے ؎

نہ کیوں ہر طرز میں بڑھتا غزل اس ماہ کے آگے
مرا استاد کامل قہر ناسخ سا ہمہ داں ہے

لیکن ناسخ کی شاگردی کے اس اعلان کے پہلو بہ پہلو انھوں نے اپنے ایک مقطعے میں بیک وقت ناسخ اور آتش دونوں سے استفادے کا اقرار کیا ہے اور ایک دوسرے مقطعے میں ان دونوں اساتذہ کو اپنے کمال فن کا معترف بتایا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

آگ پانی میں لگا دیتے ہیں آتش، ناسخ
ہم بھی اے قہر ہیں شاگرد انھیں استادوں کے

قہر کو سب جانتے تھے صاحب فکر بلند
خواجہ آتش کیا، جناب ناسخ مغفور کیا

قہر کے چھوٹے بھائی مرزا عنایت علی ماہ آتش کے شاگرد تھے۔ بہت ممکن ہے کہ قہر نے بھی ابتدائے مشق میں یا ناسخ کی وفات کے بعد ان سے کچھ دنوں تک مشورہ سخن کیا ہو۔

تلامذہ: کاظم صاحب کو "مختلف ماخذ کی ورق گردانی کے نتیجے میں" قہر کے جن تلامذہ کے نام معلوم ہو سکے، وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) راجا بلوان سنگھ راجا (۲) منشی کفایت علی تنہا (۳) سید علی نقی، نقی جلالوی (۴) مغل خاں تمنا اکبرآبادی (۵) کنور جگل کرتی سنگھ کنور (۶) عبدالرحمٰن خاں انصاف اکبرآبادی (۷) رن بہادر سنگھ بہادر (۸) منشی رام سہائے تسلیم۔

راجا بلوان سنگھ راجا کا قہر سے اصلاح لینا مشکوک ہے۔ قہر راجا صاحب موصوف کے مصاحبین میں شامل تھے۔ باطن اکبرآبادی نے انھیں نظیر اکبرآبادی کے صاحبزادے خلیفہ گلزار علی اسیر کا شاگرد بتایا ہے (گلستان بے خزاں ص ۹۲) قہر نے خود بھی کئی جگہ ان کا ذکر کیا ہے۔ لیکن کہیں انھیں اپنا شاگرد نہیں لکھا۔

منشی کفایت علی تنہا کا نام "خوش معرکہ زیبا" کے حوالے سے اس فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔ ان کا ذکر "گلستان بے خزاں"، "سخن شعرا"، "ارمغان گوکل پرشاد" اور "یادگار ضیغم" میں بھی موجود ہے لیکن "گلستان بے خزاں" میں قہر سے تلمذ کا حوالہ موجود نہیں۔

نقی جلالوی کا ذکر "سراپا سخن" کے حوالے سے کیا گیا ہے، اُن کا ترجمہ "سخن شعرا" میں بھی موجود ہے۔

تمنؔا کا ذکر بھی "سراپا سخن" ہی کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ کاظم صاحب نے ان کا نام مغل خاں لکھا ہے "گلستان سخن"، "گلستانِ بے خزاں"، "سخن شعرا" اور "یادگار ضیغم" کے مطابق صحیح نام "مغل جان" ہے۔

کنور جگر درشن سنگھ کنورؔ کے تلمذ کا ثبوت "شعاع مہر" کے قطعۂ تاریخ سے فراہم کیا گیا ہے لیکن انصاف اکبرآبادی اور رن بہادر سنگھ بہادرؔ کی شاگردی علی الترتیب "تذکرہ نادر" اور "سخن شعرا" کے حوالے سے ثابت کی گئی ہے۔ ان دونوں شاعروں کے قطعات تاریخ بھی "شعاع مہر" کے آخر میں موجود ہیں اور ان کے عنوانات میں ان کو "مشیر مہر" قرار دے کر رشتۂ شاگردی کی وضاحت کی گئی ہے۔ انصاف کا ترجمہ "تذکرہ نادر" کے علاوہ "گلستان سخن"، "سخن شعرا" اور "ارمغانِ گوکل پرشاد" میں بھی موجود ہے۔

منشی رام سہائے تسلیم بدایوں کے رہنے والے تھے۔ ان کا ذکر "ہندو شعرا" مولفہ خواجہ عبدالرؤف عشرت کے علاوہ شیام سندر برق سیتاپوری کے تذکرے "بہارِ سخن" میں بھی موجود ہے۔

کاظم صاحب نے آخر میں استدراک کے تحت اپنی پیش کردہ اس فہرستِ تلامذہ میں تسلیم سہوانی (منشی انوار حسین) کے نام کا اضافہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "تاریخ لطیف (از مہدی علی خاں ممتاز دارآم رام پوری) میں مرزا حاتم علی مہر کو استاد تسلیم سہوانی لکھا گیا ہے گویا تسلیم سہوانی بھی مہر کے شاگرد تھے۔" یہ اطلاع بالکل بے بنیاد ہے۔ تسلیم سہوانی نے شیخ علی بخش بیمار کے علاوہ کسی سے اصلاح نہیں لی۔[1]

راقم السطور کو متذکرہ بالا شاعروں کے علاوہ مہر کے جن تلامذہ کے نام اور حالات معلوم ہوئے ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے:-

(۱) آغا حسین آغا:- آغا کے قطعات تاریخ اور ایک طرحی غزل "شعاع مہر" میں شامل ہے اور کنور، انصاف اور بہادر کی طرح ان کے نام کے ساتھ بھی "مشیر مہر" کا اضافہ کرکے مہر سے اُن کے رشتۂ تلمذ کی توثیق کی گئی ہے۔ مشاعرۂ آگرہ (منعقدہ ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء) کے گلدستے "شعر و سخن" میں بھی انھیں تلامذۂ مہر میں شمار کیا گیا ہے۔ اس گلدستے کے مطابق وہ آگرے میں کٹرہ حاجی محمد حسن میں رہتے تھے اور اس کی ترتیب کے وقت ان کی عمر چالیس سال اور مدتِ مشق "تخمیناً بیس سال" تھی۔ (ص ۱۴)

(۲) سید حیدر حسین آفتاب:- قصبۂ جلالی ضلع علی گڑھ کے رئیس اور "آگرے میں بعہدۂ نظارت محکمۂ طالبہ و خفیفہ مامور تھے۔ مذکورہ صدر مشاعرے کے لیے" استادِ مکرم مرزا مہر صاحب کے حکم کے بموجب پہلی بار غزل کہی تھی۔ (شعر و سخن ص ۱۷)

(۳) منشی مہربان علی ابر:- انھوں نے مہر کے انتقال کی تاریخ کہی تھی جو دیوان مہر کے آخر میں منقول ہے۔ اس تاریخ کے عنوان میں انھیں "شاگردِ حضرت مغفور" لکھا گیا ہے۔

(۴) نظام علی خاں افضل:- آگرے کے رہنے والے تھے لیکن مشاعرۂ مذکور کے انعقاد کے زمانے میں سہسوان ضلع بدایوں میں بعہدۂ منصفی مامور تھے۔ اس وقت ان کی عمر پچاس برس اور مدت مشق بیس سال تھی۔ (شعر و سخن "ص ۱۲ و ۱۳)

(۵) منشی کنج بہاری لال برق اکبرآبادی:- "بمقام ٹونڈلہ سررشتۂ ریل میں نوکر تھے۔ ۱۲۸۶ھ میں عمر ۲۹ سال اور مدت شاعری دو سال تھی۔" (شعر و سخن ص ۲۳)

(۶) محمد نیاز علی پریشان:- مشاعرہ آگرہ کے بانی اور "شعر و سخن" کے مرتب تھے۔ اس وقت ان کی عمر ۳۸ سال اور مدتِ مشق دو سال تھی۔ (شعر و سخن ص ۲۵)

(۷) مرزا امراؤ علی بیگ تمنا اکبرآبادی:- ۱۲۸۶ھ میں ان کی عمر پچپن سال اور مدت شاعری بیس سال تھی۔ (شعر و سخن ص ۳۰)

(۸) شیخ دیدار حسن حسن قادری:- ان کا وطن بانگرمئو تھا لیکن ۱۲۸۶ھ میں صدر گودام آبکاری ضلع آگرہ میں محرر تھے۔ اس وقت ان کی عمر اٹھائیس سال تھی اور شعر کہتے ہوئے ایک سال ڈیڑھ ماہ کی مدت ہوئی تھی۔ (شعر و سخن۔ ص ۳۸)

(۹) شیخ محمد حسن حسن:- مشتاق اکبرآبادی کے ایک خط موسومہ

مہر سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۸۷ھ کے آس پاس یہ ہمیرپور میں مقیم تھے اور وہاں سے اپنا کلام بغرضِ اصلاح مہر کے پاس بھیجتے رہتے تھے۔ (حدیقۃ النشر ص ۶۱)

(۱۰) شیخ عبدالمجید رسوا غازی پوری :۔ ۱۲۸۶ھ میں بسلسلۂ ملازمت آگرے میں مقیم تھے۔ اس زمانے میں ان کی عمر بیس سال اور مدتِ مشق دو برس تھی۔ کچھ دنوں تک فارسی میں مرزا غالب سے بھی مشورۂ سخن کیا تھا۔ (شعر و سخن ص ۴۶)

(۱۱) شیخ عوض علی رسا مارہروی :۔ ان کا تعلق قاضیانِ مارہرہ کے خاندان سے تھا۔ ۱۲۸۶ھ میں ان کی عمر بائیس سال اور مدتِ مشق دو برس تھی۔ مہر کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہونے سے پہلے کچھ دنوں تک صاحب عالم متخلص بہ صاحب (مارہروی) سے بھی اصلاح لی تھی۔ (شعر و سخن ص ۴۲) مشتاق اکبرآبادی کے ایک بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عموماً پچیس پچیس تیس تیس شعر کی غزلیں کہا کرتے تھے۔ (حدیقۃ النشر ص ۶۳)

(۱۲) امیر اللہ خان رضا اکبرآبادی :۔ اورئی ضلع جالون کی جیل میں عہدۂ محرری پر مامور تھے۔ ۱۲۸۶ھ میں اس ملازمت کو سات برس ہو چکے تھے۔ اس وقت ان کی عمر ۳۴ سال اور شعر گوئی سے شغف کی مدت پانچ سال تھی۔ (شعر و سخن ص ۵۱)

(۱۳) شیخ بلاقی ولد شیخ سعد اللہ متخلص بہ زر :۔ ان کے اجداد کا وطن لاہور تھا لیکن تقریباً سو برس سے بزرگوں نے بسلسلۂ ملازمت آگرے میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ انھوں نے اپنے والد کے انتقال کے بعد دلی جا کر سادہ کاری سیکھی اور آگرے میں اسی کو ذریعہ معاش بنایا۔ ۱۲۸۶ھ میں پچپن سال کے ہو چکے تھے اور تقریباً ۳۰ سال کی عمر سے شعر کہہ رہے تھے۔ مہر کے علاوہ ان کے چھوٹے بھائی مرزا عنایت علی ماہ سے بھی مشورۂ سخن تھا۔ (شعر و سخن ص ۵۶) "گلستانِ سخن"، "سخن شعرا" اور "یادگارِ ضیغم" میں بھی ان کا ذکر موجود ہے۔

(۱۴) منشی دیبی پرشاد سحر :۔ ان کا اصل وطن بانگرمئو تھا لیکن عرصۂ دراز تک بدایوں میں عہدۂ سب ڈپٹی انسپکٹری مدارس پر مامور رہنے کی وجہ سے وہیں سکونت اختیار کر لی تھی، اسی بنا پر بالعموم بدایونی کی نسبت سے ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔ نواب علی حسن خان نے لکھا ہے کہ یہ مرزا حاتم علی مہر سے اصلاح لیتے تھے۔ (بزم سخن ص ۵۷)

(۱۵) سید سعادت علی سعید اکبرآبادی :۔ ۱۲۸۶ھ میں "مدرسہ منڈی آہن" میں مدرس تھے۔ اس وقت ان کی عمر بیالیس سال تھی اور پچیس سال سے طبع آزمائی کر رہے تھے۔ (شعر و سخن ص ۶۰)

(۱۶) گنگا پرشاد شاد اکبرآبادی :۔ عدالت العالیہ ہائی کورٹ (آگرہ) میں بعہدۂ وکالت فائز تھے۔ ۱۲۸۶ھ میں ۴۳ سال کی عمر تھی۔ اس وقت تک شعر کہتے ہوئے اکیس سال ہو چکے تھے۔ (شعر و سخن ص ۶۸)

(۱۷) شیخ احمد علی شیون اکبرآبادی :۔ ان کے آبا و اجداد "اضلاع اودھ" کے متوطن تھے۔ ۱۲۸۶ھ میں ان کی عمر پچیس سال اور مدتِ مشق چار سال تھی۔ (شعر و سخن ص ۶۶)

(۱۸) شیخ صادق علی صادق ساکن ملانواں (ضلع ہردوئی) مقیم آگرہ :۔ ۱۲۸۶ھ میں ان کی عمر بائیس سال اور مدتِ مشق پانچ سال تھی۔ اس زمانے میں بے روزگار اور کچہری کلکٹری میں ملازمت کے امیدوار تھے۔ (شعر و سخن ص ۴۷)

(۱۹) منشی گنگا سہائے صغیر :۔ ان کا وطن بانگرمئو علاقہ اودھ تھا۔ ۱۲۸۲ھ سے ہائی کورٹ میں ملازم تھے۔ مشاعرۂ آگرہ کے انعقاد کے وقت ان کی عمر اکتیس سال تھی اور شعر کہتے ہوئے بارہ برس ہو چکے تھے۔ (شعر و سخن ص ۶۷)

(۲۰) مرزا سخاوت علی بیگ ضیا :۔ مہر کے صاحبزادے تھے "یادگارِ ضیغم" کے مولف نے تلامذۂ مہر کی فہرست میں ان کا نام غلطی سے مرزا شجاعت علی بیگ لکھ دیا ہے۔ (نسخۂ قلمی مخزونہ ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد، ص ۶۰۹)

(۲۱) حکیم سید فخرالدین فخر :۔ حکیم قطب الدین باطن اکبرآبادی، مولف "گلستانِ بے خزاں" کے صاحبزادے تھے۔ ۱۲۸۶ھ میں ان کی عمر ستائیس سال اور مدتِ مشق آٹھ سال تھی۔ (شعر و سخن ص ۵۸)

(۲۲) مرزا علی حسین قیصر اکبرآبادی :۔ ۱۲۸۶ھ میں "بزمرۂ وکلائے سررشتہ دیوانی" مامور تھے۔ اس وقت ان کی عمر پینتالیس سال اور مشقِ

سخن کی مدت بیس سال ہو چکی تھی۔ وکالت کے پیشے میں داخل ہونے سے پہلے "چند سے نوکری گورنمنٹ بہادر کی اختیار کی تھی" اور بعد ازاں بارہ برس تک مطبع حیدری کے نام سے ایک چھاپاخانہ چلاتے رہے تھے۔ شاعری کا شوق منیر شکوہ آبادی کی "برکت صحبت سے" پیدا ہوا۔ محکمۂ صدر دیوانی آگرہ کی ملازمت کے زمانے میں مرزا اعظم علی اعظم کا تلمذ اختیار کیا۔ ان کے الہ آباد چلے جانے کے بعد مرزا حاتم علی مہر اور مرزا عنایت علی ماہ سے اصلاح لی۔ (شعر و سخن ص ۸۸)

(۲۳) محمد مستجاب خاں مشتاق :۔ ان کا وطن بانس بریلی تھا لیکن "سررشتہ کنٹونمنٹ مجسٹریٹ چھاؤنی آگرہ" میں ملازمت کے باعث آگرے میں مقیم تھے۔ مشاعرۂ آگرہ کے انعقاد کے وقت ان کی عمر ۲۹ سال تھی اور شعر گوئی سے شغف کے آغاز کو صرف ایک مہینا ہوا تھا۔ (شعر و سخن ص ۱۰۷) اردو نثر میں ان کی نگارشات کا ایک مجموعہ "حدیقۃ النثر" کے نام سے ۱۳۰۳ھ میں مطبع الٰہی آگرہ میں چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔

(۲۴) شیخ محمد حنیف مضطر امروہوی :۔ ۱۲۸۶ھ میں ان کی عمر ۲۰ سال تھی اور شعر گوئی سے دلچسپی کو صرف "چند ماہ" ہوئے تھے۔ اس زمانے میں یہ فوجداری چھاؤنی آگرہ میں سررشتہ دار کی حیثیت سے مامور تھے۔ (شعر و سخن ص ۱۰۶)

(۲۵) داروغہ قیوم بخش مضطر :۔ سہوان ضلع بدایوں کے رہنے والے تھے۔ تا عمر "سرکار انگریز" کے ملازم اور محکمۂ پولیس سے وابستہ رہے۔ نواب علی حسن خاں کی تحریر کے مطابق تسلیم سہوانی اور مرزا مہر سے "استفادۂ سخن" کرتے تھے۔ (بزم سخن ص ۱۰۵)

(۲۶) محمد ولایت علی مطمئن :۔ نیاز علی پریشاں کے صاحبزادے تھے۔ وطن قدیم سندیلہ اور مولد متھرا تھا۔ مشاعرۂ آگرہ کے انعقاد کے وقت عمر صرف پندرہ سال اور مدتِ مشق دو ماہ تھی۔ (شعر و سخن ص ۱۱۲)

(۲۷) شیخ مصلح الدین منصور :۔ ان کے والد کا وطن کلکتہ تھا لیکن ہائی کورٹ میں "بعہدۂ انگریزی ڈگری نویسی" مامور ہونے کی وجہ سے انھوں نے آگرے میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ۱۲۸۶ھ میں منصور کی عمر چھبیس سال تھی اور وہ بارہ سال سے مشق سخن کر رہے تھے۔ (شعر و سخن ص ۱۱۶)

(۲۸) محمد وزیر خاں وزیر صابری :۔ ان کا اصل وطن میرٹھ تھا۔ ۱۲۸۶ھ میں ضلع آگرہ میں داروغہ آبکاری تھے۔ عمر چونتیس سال تھی۔ مشاعرے کی تاریخ سے ماہ ڈیڑھ ماہ قبل شعر کہنا شروع کیا تھا۔

محمد مستجاب خاں مشتاق کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ مہر کے شاگرد ہر ماہ طرحی مشاعرے منعقد کرتے رہتے تھے اور ان میں ہر شخص ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتا تھا۔ ان مشاعروں کے لیے کبھی ایک اور کبھی دو مصرعے تجویز کیے جاتے تھے۔ مہر کے نام ایک خط کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو :۔

"آخر ماہ ذی الحجہ کے شنبہ یا یکشنبہ کو مشاعرہ ہوگا۔ اگر آپ مصرعہ تجویز کر دیں اور اس پر غزل لکھ لائیں تو سبحان اللہ اور آپ کے کمرہ میں مشاعرہ کیا جائے ... میں نے دو مصرعے طرح کے لئے تجویز کئے ہیں۔ مصرع "اس مسیحا نے نہ پوچھا کسی بیمار کا حال" "دیگر" "دل نہ رکھتے ہیں نہ جانباز جگر رکھتے ہیں" کوئی زمین اچھی پاک صاف آپ تجویز کریں گے اور بہت جلد بھیج دیں گے تو شاعروں کے پاس بھجوا دیا جائے گا" (حدیقۃ النثر ص ۶۱)

مہر ہی کے نام مشتاق کے ایک دوسرے خط سے ان کے بعض تلامذہ کی شاعرانہ سرگرمیوں کے بارے میں مزید دلچسپ معلومات حاصل ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں :۔

"شیخ دیدار حسن صاحب چار مشاعروں سے مشاعرہ میں شریک نہیں ہوئے۔ آج ان کی زبانی سنا کہ انھوں نے مشاعرہ آئندہ کی طرح کی غزل آپ کے پاس اصلاح کے لیے بھیجی تھی۔ میں نے ان چار مشاعروں کی غزلیں اس وجہ سے نہیں بھیجیں کہ اول تو دس دس بارہ بارہ شعر لکھے دوسرے دیدار حسن تو آتے ہی نہ تھے۔ رسا نے بھی غزل کہنا چھوڑ دیا ان کے چھوڑ دینے کا باعث یہ ہوا کہ کبھی صادق علی نے ان کی غیر طرحی غزل پر غزل کہی تھی۔ کوئی برابر کا کچھ سننے والا نہ تھا۔

کچھ لطف نہ آیا۔ اب یقین ہے کہ دیدار تن نے غزل کہی
ہے تو شریک بھی ہوں گے اور سنا ہے کہ غزل بھی اچھی کہی
ہے۔ میں نے بھی کل اتوار کو فکر کر کے یہ چند شعر لکھے ہیں،
آج واسطے اصلاح کے بھیجتا ہوں۔" (حدیقۃ النثر ص۶۲)

اولاد :۔ مہر کے ایک قطعۂ تاریخ کی رو سے ان کی شادی ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲-۳۳ء) میں ہوئی تھی۔ شادی کے تقریباً دو برس بعد ان کے یہاں بیٹے کی ولادت ہوئی۔ اس موقع پر انھوں نے جو قطعاتِ تاریخ کہے تھے، ان میں سے ایک میں اس کی تاریخ پیدائش دوشنبہ ۱۱ شوال ۱۲۵۰ھ (۹ فروری ۱۸۳۵ء) بتائی گئی ہے اور تاریخی نام "آغا بہرام" تجویز کیا گیا ہے۔ یہ قطعہ نقل کرنے کے بعد کاظم صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ "آغا بہرام کا اصل نام مرزا سخاوت علی رکھا گیا تھا۔" اس بیان کے برخلاف ایک دوسرے قطعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ اصل نام تاریخی نام کے بعد کا تجویز کردہ نہیں اور "آغا بہرام" کے علاوہ ان کا ایک اور تاریخی نام "آغا مرزا" بھی تھا۔ یہ قطعہ درج ذیل ہے ؎

حاتم بھی سخاوت سے ہے غنی (کذا) فرزند سخاوت علی ہے جو ترا
لے مہر تو اس کے نام تاریخی رکھ آغا بہرام اور آغا مرزا

سخاوت علی کی ولادت کے تین برس بعد مہر کے یہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی جو دو برس کی عمر میں فوت ہو گئی۔ جناب کاظم علی خاں نے سرسری اندازے کے مطابق اس کا سالِ ولادت ۱۲۵۳ھ اور سالِ وفات ۱۲۵۵ھ متعین کیا ہے۔ دیوان مہر میں موجود قطعات ان قیاسات کی تصدیق کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک قطعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس بچی کا نام "جانی خانم" تھا۔

مرزا سخاوت علی کے سلسلے میں کاظم صاحب نے مختلف "بکھری ہوئی شہادتوں کو جمع کر کے" یہ نشاندہی فرمائی ہے کہ وہ میر وزیر علی صبا کے داماد تھے۔ ان معلومات کا معتبر ترین ماخذ مہر کی وفات کا ایک قطعۂ تاریخ ہے جو ان کے دیوان کے آخر میں نقل ہوا ہے۔ اس قطعے کے عنوان میں اس کے مصنف حکیم سید رضا حسین سجاد کذا یتھام کو صبا کا خویش کلاں اور مرزا سخاوت علی کا ہم زلف بتایا گیا ہے۔ ان اندراجات سے ضمناً یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ مرزا سخاوت علی کی اہلیہ کم از کم اپنی ایک بہن سے عمر میں چھوٹی تھیں۔

۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۳ء میں مرزا سخاوت علی کے یہاں بیٹا پیدا ہوا۔ مہر نے پوتے کا نام مرزا قاسم حسین رکھا اور اس خوشی میں تیرہ تاریخیں کہیں جن میں یہ سجع بھی شامل ہے ؏ دولت کونین رااے ہمہ قاسم حسین

سخاوت علی کے بارے میں کاظم صاحب نے مزید تحریر فرمایا ہے کہ مہر کے ایک قطعے کے مطابق وہ "۱۸۶۶ء میں ایٹہ میں بہ عہدہ سررشتہ داری مال منتقل ہوئے تھے۔" بعد کے ماخذ میں سے "کلام اختر"، "منشی موتی لعل، آب بقا اور ریاض الفردوس میں انھیں تحصیلدار ایٹہ بنایا گیا ہے۔" ہماری اطلاع کے مطابق مرزا سخاوت علی نے ملازمت کی ابتدا عدالتِ صدر (آگرہ) میں مسل خواں کی حیثیت سے کی تھی۔ اس کے بعد وہ ایٹہ میں سررشتہ دار مقرر ہوئے۔ چنانچہ مہر نے "تاریخ داگزاشت جامع مسجد اکبر آباد" کے عنوان میں انھیں "سابق مسل خواں صدر حال سررشتہ دار کلکٹری ایٹہ" لکھا ہے۔ "ایاغ فرنگستاں" کی تصنیف کے زمانے (۱۸۷۳ء مطابق ۱۲۹۰ھ) تک وہ اسی عہدے (سپرنٹنڈنٹ محکمہ مال) پر برقرار تھے لیکن مہر کی وفات (۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء) کے دو قطعات تاریخ کے عنوانات میں انھیں "سب کلکٹر ایٹہ" لکھا گیا ہے۔ ان میں سے ایک قطعہ خود مرزا سخاوت علی کا اور دوسرا ان کے ہم زلف تنہا لکھنوی کا کہا ہوا ہے۔ چونکہ مہر کی وفات کے صرف ڈیڑھ ماہ بعد ۱۲ شوال ۱۲۹۶ھ کو سخاوت علی کا بھی انتقال ہو گیا، اس لیے ان کے عہدے میں کسی مزید تبدیلی کا امکان نظر نہیں آتا۔ یہاں ضمناً اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ کاظم صاحب نے جس بیان کو "ریاض الفردوس" کا حوالہ دے کر اس کے مولف سے منسوب کیا ہے وہ درحقیقت اس کے مرتب جناب فاضل زیدی کا قول ہے نیز سخاوت علی کو تحصیلدار ایٹہ لکھنے والوں میں مرزا قاسم حسین اختر، خواجہ عبدالرؤف عشرت اور مولانا فاضل زیدی کے علاوہ رام بابو سکسینہ (تاریخ ادب اردو) اور مولانا غلام رسول مہر (خطوطِ غالب) بھی شامل ہیں۔

ملازمت، اعزاز، جاگیر وغیرہ :۔ کاظم صاحب نے لکھا ہے کہ "مہر ابتدا میں تحصیلدار تھے لیکن ۱۸۴۰ء میں منصفی کا امتحان پاس

کر کے جہاناآباد (ضلع مرزاپور) میں منصف ہوئے، پھر منصفی کا عہدہ چھوڑ کر وکالت کا پیشہ اختیار کیا...." مہر کی تحصیلداری کے بارے میں کوئی موثر شہادت موجود نہیں لیکن یہ بات کہ وہ ۱۸۴۸ء میں منصفی کا امتحان پاس کر کے جہاناآباد کے منصف مقرر ہوئے، بالاتفاق خواجہ عبدالرؤف عشرت، ڈاکٹر رام بابو سکسینہ، مرزا محمد عسکری (ادبی خطوط غالب) مولانا غلام رسول مہر اور مولانا فاضل زیدی (ریاض الفردوس دعود ہندی) سبھی لوگوں نے لکھی ہے۔ اس غلط روایت کے اولین راوی غالباً خواجہ عبدالرؤف عشرت ہیں اور باقی تمام حضرات نے آنکھیں بند کر کے ان کا اتباع کیا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ مہر نے منصفی کا امتحان ۱۲۶۴ھ مطابق ۱۸۴۸ء میں پاس کیا تھا۔ ان کا مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ جو "تاریخ یافتن سند لیاقت عہدہ منصفی" کے عنوان سے درج دیوان ہے، اس کا ثبوت فراہم کرتا ہے ؎

یافتم ڈپلومہ از فضل خدا   دوستانم شاد و دشمن پائمال
مہر این فیض شہید کربلاست   "بخشش حق" بخوان تاریخ سال

ایک دوسرے قطعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس امتحان میں شرکت یا منصفی کی امیدواری کے لیے انھیں کسی جج نے ترغیب دی تھی۔ بعض بدخواہوں کو ان کی یہ ترقی ناگوار تھی۔ اس لیے کسی شخص نے ان کے خلاف اعتراض داخل کر کے ان کی کامیابی کی راہ میں رکاوٹ ڈالنا چاہی لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ یہ قطعہ درج ذیل ہے ؎

امیدوار کیا جج نے منصفی کا مجھے   تو مجھ سے ہوگئی ناحق کو حاسدوں کو کد
دیا سوال مری ضد میں صدر میں لے مہر   ہوا وہاں سے بھی آخر سوال ان کا رد
ملا ذریعہ کامل خدا کا فضل مجھے   اثر پذیر عدو کا ہوا نہ بغض و حسد
نکالوں سائل موذی کو اب کہو تاریخ   عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

آخری مصرعے کے مجموعی اعداد ۲۰۰۵ ہوتے ہیں، ان میں سے "سائل موذی" کے ۱۵۷ اعداد کے تخرجہ کے بعد ۱۸۴۸ء حاصل ہوتا ہے۔ اس سے بھی ہمارے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے کہ مہر نے منصفی کے لیے مقابلے کا امتحان ۱۸۴۸ء میں پاس کیا تھا۔ ہفت روزہ "اسعد الاخبار" آگرہ کے ایک شمارے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ امتحان ۱۸۴۸ء میں منعقد ہوا تھا اور اس شمارے کی اشاعت

کے وقت تک مہر عہدہ منصفی پر مقرر نہیں ہوئے تھے۔ اخبار مذکور "خبر اکبرآباد" کے عنوان سے لارڈ ڈلہوزی کے خیر مقدم کے سلسلے میں مہر کا قطعہ تاریخ نقل کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ :-

"نواب گورنر جنرل بہادر نومبر کی ۱۰ تاریخ یا دولت اقبال شہر اکبرآباد میں تشریف لائے، اور خبر ہے چار روز (بعد) مہضت فرمائیں گے۔ افصح الشعرا سخنور یکتا، میرزا حاتم علی مہر نے سال گزشتہ کے امتحان میں سند منصفی پائی ہے، مگر اغلب ہے کہ حکام والا مقام ان کی لیاقت اور عالی خاندانی اور جوہر ذاتی و صفاتی ملحوظ و منظور فرما کر عنقریب کسی ضلع (میں) عہدہ موصوفہ پر انھیں منصوب کریں۔ نواب محتشم الیہ کے ہندوستان تشریف لانے کی انھوں نے کیا خوب برجستہ تاریخ موزوں فرمائی۔

قطعۂ تاریخ

لارڈ ڈلہوزی ست رونق بخش ہند
(اے) صبا در شش جہت این مژدہ گو
مصرع تاریخ مقدم گفت مہر
افتخار ہند ما دام بجسم تو"

۱۸۴۸ء

(بحوالہ سہ ماہی "اردو ادب" علی گڑھ، شمارہ نمبر ۲، ۱۹۶۲ء)

"اسعد الاخبار" ہی کے نومبر ۱۸۴۹ء کے ایک شمارے میں "تاریخ تقرر جناب مرزا حاتم علی مہر بر عہدہ منصفی" کے زیر عنوان ایک قطعہ تاریخ "از نتائج طبع سخنور پر جوہر حافظ بلاقی صاحب اکبرآبادی متخلص بہ زر" شائع ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ منصفی کے عہدے پر مہر کا تقرر ۱۲۶۵ھ مطابق ۱۸۴۹ء میں عمل میں آیا تھا۔ یہ قطعہ درج ذیل ہے ؎

انگریز نے حکومت جب مہر کو عطا کی
جو تھے فلک پہ عیسیٰ بولے خوشی مبارک
تاریخ زر نے لکھی یہ آب زر سے اس دم
اے مہر تجھ کو ہووے یہ منصفی مبارک ۱۲۶۵ھ

ایضاً بحوالہ سہ ماہی "اردو ادب" علی گڑھ، شمارہ ۲، ۱۹۶۲ء

چنار (ضلع مرزاپور) میں بحیثیت منصف قہر کے تقرر کے سلسلے میں ان کا یہ شعر اکثر نقل کیا جاتا ہے ؎

از بسکہ سوزِ ہجر کے خوگر ہوئے ہیں ہم
منصف چنار گڑھ کے مقرر ہوئے ہیں ہم

اس مطلع کے علاوہ انھوں نے ایک مقطع میں بھی چنار سے اس منصبی تعلق کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

منصفی کیجیے ہے اپنی حکومت میں چنار
قہر پہلو میں نہ کیوں کر دلِ سوزاں ہوتا

دیوان کی ایک اور غزل میں انھوں نے چنار کا نام لیے بغیر وہاں کے جنگلوں، پہاڑوں اور دشوار گزار راستوں کی بڑی مکمل تصویر کشی کی ہے۔ اس غزل کے بعض اشعار سے ان مشکلات کا اندازہ ہوتا ہے، جن سے وہ اس ملازمت کے دوران دوچار رہے۔ بطور مثال مطلع اور مقطع کے دو شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں ؎

پہاڑوں میں بیابانوں میں دیوانی عدالت ہے
وہ دیوانہ ہوں جس کی کوہ و صحرا پر حکومت ہے

یہ ہے جنگل محال اے قہر تحقیقات کرنا ہے
غزل اک اور بھی کہہ لیجیے ایسے میں فرصت ہے

چنار کے قریب بنارس مشرقی یو۔ پی کا سب سے اہم شہر ہے جس کی تاریخی، تہذیبی، ادبی اور صنعتی اہمیت ہر دور میں مسلم رہی ہے۔ قہر کے بعض اشعار اس شہر کے اربابِ فضل و کمال سے ان کے قریبی روابط کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مثلاً ایک غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں ؎

احباب بنارس کے لیے قہر کا تحفہ
ایک اور بھی ساتھ اس کے غزل جائے تو اچھا

اس قسم کے اشعار کے علاوہ قہر کے دیوان میں بنارس اور پری رخانِ بنارس کی تعریف میں دو مکمل غزلیں موجود ہیں جو ان کے سوانح اور شخصیت کے مطالعے میں کافی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان غزلوں کے یہ منتخب اشعار بطورِ خاص ملاحظہ طلب ہیں ؎

تیلی کے عوض ہوں بتِ رعنائے بنارس
اللہ رے ان آنکھوں کو دکھلائے بنارس

روتا ہوں بنارس کے تصور میں شب و روز
اے ہندوو! دیکھو، یہ ہے دریائے بنارس

ہے کعبۂ مقصود فقط کوچۂ دلدار
کافر ہوں جو مجھ کو ہو تمنائے بنارس

ناظم ہوں محمدی کا اگر لکھنؤ جاؤں
اس ملک میں ہوں معدلت آرائے بنارس

جب سے مجھے قسمت نے بنارس سے چھڑایا
رہتا ہے زباں پر مری بس ہائے بنارس

اک گیسوؤں والے کی محبت کا پڑا پیچ
پہلے تو نہ تھا مجھ کو یہ سودائے بنارس

اے قہر توارد ہوں جو مضموں تو بجا ہے
میں اور حزیں دونوں ہیں شیدائے بنارس

نہیں واقف ہے اے ہمدم گلوں سے تو بنارس کے
گلے کا ہار ہوتے ہیں مرے گلرو بنارس کے

نہ دیکھا ہم نے کوئی شہر ہم پہلو بنارس کے
ہمیں جنت میں یاد آئیں گے یہ گلرو بنارس کے

کہاں رونے سے فرصت ہجر میں پائی کہ میں ہنستا
بھلا کیا لکھنؤ میں پونچھتا آنسو بنارس کے

جدائی اس صنم سے اور مجھ سے ہو نہ یا اللہ
رہیں معشوق اپنے زینتِ پہلو بنارس کے

حزیں تعریف اس کی کرتے آئے قہر اب تک
فقط ہم نے ہی لکھے شعر کیا اردو بنارس کے

ان غزلوں کے بعض اشعار واضح طور پر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ قہر بنارس میں بھی کافی دنوں تک مقیم رہے تھے اور وہاں ان کی دلبستگی کا اچھا خاصا سامان فراہم ہو گیا تھا۔ پہلی غزل کا چوتھا شعر جس میں انھوں نے خود کو "معدلت آرائے بنارس" کے نام سے پکارے جانے کی تمنا کی ہے، اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہاں بھی ان کی آمد ملازمت ہی کے سلسلے میں

ہوئی تھی۔ ممکن ہے کہ ابتدا میں بحیثیت منصف ان کا تقرر بنارس ہی میں ہوا ہو اور یہاں سے تبادلے کے بعد وہ چنار پہنچے ہوں۔ پہلی غزل کا محولہ بالا شعر یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ بنارس چھوڑنے کے بعد وہ لکھنؤ بہر حال نہیں پہنچے تھے جب کہ دوسری غزل کا تیسرا شعر لکھنؤ میں بنارس کی یاد میں ان کی بے قراری پر دلالت کرتا ہے۔ اول الذکر شعر سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ وہ اس زمانے میں بحیثیت ناظم محمدی جانے کے خواہش مند تھے۔ سلطنتِ اودھ کے تحت محمدی قسمت خیرآباد و محمدی میں انتظامیہ اور عدلیہ کے نقطۂ نظر سے کافی اہمیت رکھتا ہے۔ فروری ۱۸۵۶ء میں وہاں میر حسن علی عدلیہ کے ناظم اعلیٰ (جج) کی حیثیت سے متعین تھے۔ ان کی ماہانہ تنخواہ صرف ساٹھ روپیہ ماہوار تھی جب کہ ان کے دوسرے گیارہ ہم منصبوں میں سے پانچ ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار اور دو سو روپیہ ماہانہ پاتے تھے[2] جو بظاہر اس امر کا ثبوت ہے کہ ان کی ملازمت زیادہ پرانی نہ تھی۔ ممکن ہے کہ عہدِ واجد علی شاہ میں اس منصب کے خالی ہونے کے وقت قہر نے اس کے حصول کی کوشش کی ہو۔ انھوں نے ایک شعر میں "مملکتِ انگریز" سے نکل کر لکھنؤ جانے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ چنار صرف مملکت انگریزی میں شامل نہیں تھا، وہاں کی آبادی میں بھی انگریز اور عیسائیوں کا اچھا خاصا تناسب تھا۔ اس لیے بعید از امکان نہیں کہ اس شعر میں چنار ہی سے لکھنؤ جانے کی خواہش کا اظہار ہو۔ شعر یہ ہے ؎

چل لکھنؤ کو مملکتِ انگریز سے
کعبے میں بیٹھ قہر نکل کر گریز سے

چنار کی ملازمت سے قہر کی بددلی کا ایک سبب تو وہ دشوار[یاں] ہو سکتی ہیں جو یہاں کے ماحول اور جغرافیائی حالات کا نتیجہ تھیں اور ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں کی زبان ان کے لیے تکدرِ طبع کا باعث تھی۔ اس کیفیت کا اظہار انھوں نے ایک شعر میں اس طرح کیا ہے ؎

یہ ہے پورب کی زبان دانی قہر
کہتے ہیں بات کو ہم سنتا ہوں

وجوہات کچھ بھی رہی ہوں، بہر حال نظامتِ محمدی کے حصول کے لیے ان کی یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی اور انھیں مجبوراً ملازمت سے استعفا دینا پڑا یا بحکمِ سرکار برطرف کر دیے گئے۔ ملازمت سے اس قطع تعلق کی طرف انھوں نے ایک غزل کے مقطع میں اس طرح اشارہ کیا ہے ؎

ساری عزت نوکری سے اس زمانے میں ہے قہر
جب ہوئے بیکار تو توقیر آدھی رہ گئی

۱۲ رفروری ۱۸۵۶ء کے ایک سرکاری مراسلے میں جس کا حوالہ کاظم صاحب نے اپنے مضمون میں دیا ہے، مہر کو "سابق منصف چنار" لکھا گیا ہے۔ اس سے ایک طرف تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس تاریخ سے پہلے اس ملازمت سے سبک دوش یا برطرف ہو چکے تھے اور دوسری طرف یہ پتہ چلتا ہے کہ ملازمت سے علیحدگی کے وقت وہ چنار ہی میں متعین تھے۔ غدر کے ہنگامے کے دوران لکھنؤ میں ان کی موجودگی کے شواہد خود ان کے دیوان "الماس درخشاں" اور ایک دوسری تصنیف "ایاغ فرنگستان" میں موجود ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ منصفی کی ملازمت سے ان کا تعلق اس سے پہلے ہی اور بہ گمان غالب واجد علی شاہ کے دورِ حکومت (قبل از فروری ۱۸۵۶ء) میں ختم ہو چکا تھا۔ غدر کے زمانے میں جب کہ ہر طرف انگریزوں کے خلاف نفرت و حقارت کا بازار گرم تھا اور وہ لوگ بھی جو ان کی مدد و حمایت کے مرتکب ہوتے تھے، عوامی غیظ و غضب سے بمشکل ہی بچ پاتے تھے، قہر نے سات انگریزوں کو اپنے گھر میں پناہ دے کر ان کی جان بچائی۔ اس جرأت مندانہ اقدام میں قہر کے ساتھ ان کے بیٹے مرزا سخاوت علی بیگ اور ماموں مرزا حبیب علی بھی شریک تھے۔ ہنگاموں کے فرو ہونے اور امن و امان قائم ہونے کے بعد قہر اور ان کے متذکرہ بالا اعزا کو ان کی اس خیر خواہی کے صلے میں جن انعامات و اعزازات سے نوازا گیا، "ایاغ فرنگستان" میں انھوں نے لارڈ کیننگ کے زمانۂ گورنری (۱۸۵۶ء تا ۱۸۶۲ء) کے واقعات کے تحت ان کی تفصیلات اس طرح بیان کی ہیں:

"ان گورنر کے زمانہ میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مورخ اس رسالہ کا اور اس کا بیٹا آغا سخاوت علی بجلدوے خیر خواہی کو ساتھ شخص انگریز مع بچوں اور میموں کے غدر پر آشوب لکھنؤ میں باغیوں جفا کار کے ہاتھ سے دونوں نے بچائے تھے، مخلع بخلعت ایک ہزار چھ سو اس تفصیل سے ہوے۔ الخ (ایک ہزار) کا خلعت مولف کو اور چھ سو کا آغا سخاوت علی کو مع ایک بڑی نوکری کے اور سو گاؤں یعنی موضع مسلم" کاندا دبا ماؤ" پرگنہ فتح پور سیکری ضلع آگرہ و پانچ بوہ حصۂ اوّل سیکری بمعافی نصف جمع مال گزاری دونوں کو سرکار سے مرحمت ہوا اور باریابی دربار گورنر کا شرف بخشا گیا اور ہوا اس خلعت کے جو ایک ہزار چھ سو کا ہوا تھا۔ ایک دوشالہ دور و دار اور ایک گوشوارۂ زریں خلعت دربار گورنر کا مقرر ہوا۔ البتہ اس خیر اندیش دولت انگلشیہ ۔ ۔ ۔ کے تمام خاندان کی بدل وجاں کبھی خیر خواہی ہنگام ہونے غدر کے جو زقیام مقامات مختلف یعنی مولف اور میرا بیٹا لکھنؤ میں تھا اور مولف کا چھوٹا بھائی مرزا عنایت علی سررشتہ دار کنٹونمنٹ چھاؤنی اکبرآباد میں ۔ ۔ ۔ اور اسی طرح میرے ماموں مرزا رجب علی وقت در و د مولف لکھنؤ سے فرخ آباد میں میرے رازدار رہے' اور چار سو روپیہ کا خلعت بھی پایا' بخوبی ثابت ہے"۔ (ص ۱۵ تا ۱۷)

کاظم صاحب نے مرزا قاسم حسین اختر کی تصنیف "میسٹی ٹریلز" کے حوالے سے ان عطیات کی تفصیلی فہرست بھی پیش کی ہے جو اس سلسلے میں گورنر جنرل نے ۴ اپریل ۱۸۵۹ء کو آگرہ کے دربار عام کے موقع پر قہر کو پیش کیے تھے۔ قہر نے اس اعزاز کے شکریے کے طور پر ایک قطعۂ تاریخ کہا تھا جو "تاریخ عطائے خلعت بست و دو پارچہ مع مالائے مروارید و اسپ اسلحہ قیمتی دو ہزار روپیہ بمصنف و مرزا سخاوت علی بیگ خلف الصدق مصنف ایک موضع بہ فتح پور از سرکار" کے عنوان سے ان کے مطبوعہ دیوان میں بھی موجود ہے اور "ایاغ فرنگستان" میں بھی نقل ہوا ہے۔ اس قطعے کے چند اشعار یہ ہیں :

یہ میں نے میرے بیٹے نے عجب کام | کیا ہے قابل تحریر اے قہر
وفور غدر میں جرات سے اپنی | ہوئی رستم کی بھی تحقیر اے قہر
بچائے لکھنؤ میں سات انگریز | نہ چھوٹی ایک کی نکسیر اے قہر
بچایا بھائی نے سررشتہ اپنا | وہ تھا منشی ذی توقیر اے قہر
مرے ہم راز تھے ماموں بھی میرے | بسانِ خواب اور تعبیر اے قہر
جہاں ہو اور کوئن وکٹوریہ ہو | جہاں میں شاہ کشور گیر اے قہر
کہ مجھ کو اور بیٹے کو بھی میرے | مخلع کرکے دی توقیر اے قہر

پڑھوں مصرعِ تاریخ مسیحی
مبارک خلعت و جاگیر اے قہر
۱۸۵۹

لکھنؤ سے ترک سکونت اور قیام آگرہ :-

تذکرہ "یادگار ضیغم" کے مولف کا بیان ہے کہ "قہر پہلے چار گڑھ میں منصف تھے پھر بوجہ رفاقت مہاراجہ بلوان سنگھ اکبرآباد میں سکونت اختیار کی"۔ (مخطوطہ ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد دکن ص ۶۰۹)

اس کے برخلاف خواجہ عبدالرؤف عشرت، ڈاکٹر رام بابو سکسینہ، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (لکھنؤ کا دبستانِ شاعری)، مرزا محمد عسکری (ادبی خطوط غالب)، مولانا غلام رسول مہر (خطوط غالب) اور مولانا فاضل زیدی (تعلیقات عود ہندی و تکملۂ ریاض الفردوس) کے بیانات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قہر نے جن سات انگریزوں کو اپنے گھر میں پناہ دی تھی، ان کو لے کر وہ آگرہ چلے گئے تھے اور اس کے بعد انھوں نے آگرے ہی کو اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ جناب نادم سیتاپوری نے ایک جگہ اس سے زیادہ واضح الفاظ میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ "۱۸۵۷ء سے پہلے مرزا حاتم علی بیگ قہر کا کوئی تعلق کبھی آگرے سے نہیں رہا ۔ ۔ ۔ غدر کے بعد جب انگریزوں نے فتح پور سیکری کے پاس دو گاؤں جاگیر میں دیے تو پہلی بار آگرے سے ان کا تعلق قائم ہوا"۔ (سہ ماہی اردو کراچی، غالب نمبر صفحہ ۱۵۲)۔

کاظم صاحب نے بھی اسی روایت کا اتباع کرتے ہوے قہر کی لکھنؤ سے ہجرت اور آگرے میں مستقل قیام کو غدر کے بعد کا واقعہ قرار دیا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آگرے سے ان کا تعلق اس سے برسوں پہلے قائم ہو چکا تھا اس روایت کے اولین ناقل خواجہ عبدالرؤف عشرت یا ان کے متبعین نے اگر معاصر تذکرہ نگاروں کے بیانات کا بغور مطالعہ کیا ہوتا تو شاید ان سے

یہ غلطی سرزد نہ ہوئی ہوتی۔ آگرے میں قہر کے قیام یا موجودگی کا ذکر سب سے پہلے ہمیں تذکرہ "بہارِ بے خزاں" میں ملتا ہے جو ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۸۴۵ء کی تالیف ہے۔ اس کے مولف احمد حسین سحر کاکوروی نے قہر کا حال دو جگہ لکھا ہے، ایک جگہ ان کا نام بے تخلص قہر شاگردِ ناسخ کی حیثیت سے اور دوسری جگہ نام اور تخلص کے ساتھ۔ اول الذکر قہر ہے جن کے نمونۂ کلام کے تحت پیش کردہ اشعار "الماس درخشاں" میں موجود ہیں۔ آگرے میں ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ قطب الدین باطن اکبرآبادی کا تذکرہ "گلستانِ بے خزاں" اس کے تقریباً چار سال بعد ربیع الاول ۱۲۶۵ھ مطابق جنوری ۱۸۴۹ء میں مکمل ہوا۔ اس میں بھی قہر کو "عرصۂ دراز سے رونق افروزِ اکبرآباد" بتایا گیا ہے۔ دیوانِ قہر سے بھی اس سلسلے میں کم از کم دو ثبوت فراہم کیے جا سکتے ہیں۔ ان میں سب سے اہم ایک مسجد کی تعمیر کا قطعۂ تاریخ ہے۔ یہ مسجد مولوی احمد علی ڈپٹی کلکٹر آگرہ نے بنوائی تھی اور اس قطعہ کے بموجب ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۸ء) میں مکمل ہوئی تھی۔ ایک دوسرے قطعے سے جس میں ۱۸۵۲ء میں لارڈ ڈلہوزی کے ورودِ آگرہ کے موقع پر تاج گنج میں ایک شاندار جشن کے انعقاد کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے کہ قہر اس زمانے میں آگرے میں موجود اور اس جشن میں شریک تھے۔ ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۲ء) میں ان کے فرخ آباد میں قیام اور مغل جان کی صحبتوں میں موجودگی کا ذکر اس سے قبل کیا جا چکا ہے۔ ان تمام شواہد کی روشنی میں یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ قہر ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳ء) تک فرخ آباد میں مقیم رہے اور ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۸ء) میں مولوی احمد علی کی تعمیر کردہ مسجد کی تکمیل کے وقت آگرے میں موجود تھے۔

د "تہنیت خلعتِ وزارتِ بیت السلطنتِ لکھنؤ بہ منور الدولہ اکرم الملک مرزا احمد علی خاں بہادر" سے متعلق ایک شعر بھی اس گتھی کو سلجھانے میں ہماری مدد کرتا ہے۔ شعر یہ ہے ؎

آپ ہوئے نواب وزیر اودھ چھانیے کیوں خاکِ در عمر فذید

منور الدولہ واجد علی شاہ کے ابتدائی دورِ حکومت میں ۱۸۴۷ء کے اوائل میں اودھ کے وزیر اعظم مقرر ہوئے تھے اور صرف پانچ ماہ بعد ۱۷ر جون ۱۸۴۷ء کو برطرف کر دیے گئے تھے۔ اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ قہر اس زمانے میں تلاشِ معاش میں سرگرداں تھے اور منور الدولہ کی وساطت سے کوئی معقول و مناسب ملازمت حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن قبل اس کے کہ ان کی توقعات پوری ہوں، خود منور الدولہ اقتدار سے محروم ہو گئے۔ اس ناکامی کے بعد ان کا آگرے چلا جانا قرینِ قیاس ہے۔ آگرہ اس زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت صوبۂ شمال مغربی کا صدر مقام تھا۔ ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) میں ان کی آگرے میں موجودگی بہرحال یقینی ہے، اس لیے یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں کہ غدر سے پہلے قہر کا آگرے سے کوئی تعلق نہیں تھا یا غدر کے بعد انھوں نے آگرے کا رخ کیا اور پھر وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ خود یہ واقعہ بھی کہ انھوں نے انتہائی ناموافق حالات میں چند انگریزوں کو اپنے گھر میں پناہ دی اور پھر انھیں آگرہ پہنچا دیا،[۶] ان کے آگرہ میں پہلے سے قیام کے سلسلے کی ہی ایک کڑی معلوم ہوتا ہے۔ قہر نے جن سات افراد کی جان بچائی تھی، ان میں مسٹر ڈی، اے، براؤن ڈپٹی کلکٹر آگرہ کے ایک بھائی بھی شامل تھے۔ یہ بات بعید از امکان نہیں کہ مسٹر ڈی۔ اے۔ براؤن سے ان کے ذاتی تعلقات ہی ان لوگوں کی مدد کے محرک ہوئے ہوں۔

غدر کا بعد کا یہی وہ زمانہ تھا جب کہ قہر اور مرزا غالب کے درمیان دوستانہ روابط قائم ہوئے۔ ان کے پہلے خط کے جواب میں غالب نے جو خط لکھا تھا، اس پر کوئی تاریخ درج نہیں لیکن قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ۸ر جولائی ۱۸۵۸ء سے پہلے لکھا گیا تھا۔ اس خط میں غالب لکھتے ہیں:-

"میں نے سنا تھا آپ کہیں کے صدر امین ہیں، پھر
اکبرآباد میں کیوں خانہ نشین ہیں؟"

اس استفسار سے بھی ضمناً یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قہر ملازمت سے علیحدگی کے بعد آگرے میں ایک غریب الدیار کی حیثیت سے مقیم نہیں تھے بلکہ اپنے گھر پر بے روزگاری کے دن گزار رہے تھے۔ اس خط کی تحریر سے تقریباً پانچ ماہ بعد ۸ر دسمبر ۱۸۵۸ء کو گورنر جنرل کا وہ حکم جاری ہوا جس میں قہر اور ان کے بیٹے اور ماموں کے لیے ان کی خیر خواہی سرکار کے صلے میں انعامات کا اعلان کیا گیا تھا۔ غالب نے قہر کے خط سے یہ خوش خبری پانے کے بعد انھیں مبارکباد دیتے ہوئے لکھا تھا کہ :-

..... "بعد اس رپورٹ کے تم کو تہنیت

دیتا ہوں۔ پروردگار بہ تصدقِ ائمہ اطہار پیش آمد اقبال تم کو مبارک کرے اور منصب ہائے خطیر اور مدارج عظیم کو پہنچا دے۔ واقعی یہ کہ تم نے بڑی جرأت کی۔ فی الحقیقت اپنی جان پر کھیلے تھے۔ بات پیدا کی مگر اپنی مردمی و مردانگی سے۔ دولت کا ہاتھ آنا مع نیک نامی، اس سے بہتر دنیا میں کوئی بات نہیں۔ اب یقین ہے کہ خدمت منصبی ملے اور جلد ترقی کرو، ایسا کہ سالِ آئندہ تک صدر الصدور ہو جاؤ۔"

اس خط سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ غالب اور قہر دونوں کے نزدیک اصل کامیابی خدمت منصبی کے دوبارہ حصول میں مضمر تھی اور قہر غالباً اس کے لیے کوشاں بھی تھے۔ ان کی یہ کوشش اس صورت میں کامیاب ہوئی کہ کچھ ہی دنوں کے بعد انھیں عدالت صدر میں وکالت کا پروانہ مل گیا۔ مرزا غالب کے ایک خط میں جو مثنوی "شعاع مہر" کی رسید اور تعریف پر مشتمل ہے، قہر کو اس "عہدۂ وکالت" کی مبارکباد دی ہے۔ یہ مثنوی ۵ دسمبر ۱۸۶۱ء کو چھپ کر شائع ہوئی تھی یقین ہے کہ یہ خط اس کے آس پاس ہی لکھا گیا ہوگا۔ اس بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ دسمبر ۱۸۶۱ء کے قریب قہر کو "وکالت کا عہدہ" مل چکا تھا "شعر و سخن" کے ایک اندراج (ص ۳۰) سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۸۶ھ / ۱۸۶۹ء میں وہ وکیل ہائی کورٹ کی حیثیت سے آگرے کی ایک جانی پہچانی شخصیت تھے۔

رنگین مزاجی:

قہر جس دور سے تعلق رکھتے ہیں اس میں طوائفوں سے دلچسپی لازمۂ امارت و ریاست سمجھی جاتی تھی۔ یہ رجحان صرف تعیش پسندی اور لذت پرستی ہی کی علامت نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے کچھ تمدنی و معاشرتی تصورات بھی کارفرما تھے۔ چنانچہ ہر شہر میں نامی گرامی طوائفوں کی مجلسیں تہذیب و شائستگی کی تربیت گاہ تصور کی جاتی تھیں۔ ان حالات میں ارباب نشاط سے قہر کے تعلقِ خاطر کے خلاف لب کشائی کی گنجائش نہیں لیکن وہ اس سلسلے میں کسی حد کے پابند نظر نہیں آتے، اس لیے ان کا معاملہ دوسروں سے قدرے مختلف ہے۔ قطب الدین باطن اکبرآبادی کے بقول وہ مزاجاً انتہائی "عاشق منش اور آزادہ روش" واقع ہوئے تھے۔ اپنے کلام میں وہ شاہدانِ جلوہ بدست کی پرستش میں جس سرگرمیِ شوق کا مظاہرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس سے ان کی افتادِ طبع اور ذوقِ نظر کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بنارس سے متعلق ان کی وہ دونوں غزلیں جن کے چیدہ چیدہ اشعار گزشتہ سطور میں پیش کیے جا چکے ہیں، اسی رجحان کے آئینہ دار ہیں۔ ایک غزل سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ دنوں تک متھرا میں بھی ان کا قیام رہا تھا اور وہاں بھی انھوں نے "پری رویان ماہ سیما" کے دیدار سے اپنی پریشان نظری کے ارادہ میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ یہ غزل اس مطلع سے شروع ہوتی ہے ؎

پری رویانِ مہ سیمائے متھرا   چھٹی اے قہر ہم سے ہائے متھرا

چنار میں بھی جہاں وہ اپنے فرائضِ منصبی کی ادائیگی میں حائل بعض دشواریوں کی وجہ سے کسی قدر پریشان رہتے تھے، ان کے لیے دل بستگی کا کافی سامان موجود تھا۔ وہاں اس زمانے میں انگریزوں اور اینگلو انڈینس کی بھی خاصی آبادی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کچھ منظورِ نظر خواتین اس طبقے میں بھی موجود تھیں۔ مندرجہ ذیل اشعار اسی تعلقِ خاطر کی غمازی کرتے ہیں ؎

دہ فرنگن سر پہ جب رکھے گی انگریزی کلاہ   زینتِ محرابِ ابرو سائبان ہو جائے گا

⁂

خیال آٹھوں پہر رہتا ہے مجھ کو اک فرنگن کا   گماں ہر اک کو میرے کشورِ دل پر ہے لندن کا
ہوا ہے عشق جب سے ہم کو اک کافر فرنگن کا   بجا ہے نازِ موزوں پر تنک ہوتا ہے دامن کا
یقیں ہے قبر میں آئیں فرشتوں کے عوض عیسیٰ   شہیدِ خنجرِ ابرو ہوں اس قاتل فرنگن کا
کہاں لندن، کہاں اے قہر ہم آ ہیں بتاتے ہیں   بیاں ہیں شاہدِ مضموں پہ ہے عالم فرنگن کا

⁂

نکلوائے گا کبھو یہ ہمیں اک ماہِ میتا   ارادہ اب کے سال ہے قہر ہے سوئے دکن کا

⁂

دہ بردار آفتابِ حسن کے تمسا گیا   ورنہ ہر یک شوخ میتا کا تھا کندن کا رنگ

⁂

ہر ایک کو گمانِ مسیحا ہے جہتر ہو   دیکھیں جو ان کے ساتھ سوا رنش مجھے

لکھنؤ کے ساتھ قہر کی قلبی وابستگی میں بھی "حبِ وطن" سے زیادہ حسینانِ لکھنؤ کی چاہت دخیل معلوم ہوتی ہے۔ اس بھرے پرے شہر میں ان کی دلچسپیاں

کا مرکز صرف فرنگی محل کی گلیاں تھیں جہاں طوائفوں کی خاصی آبادی تھی چنانچہ آگرے کے زمانۂ قیام میں بھی وہ عالم تصور میں انہی گلیوں کی سیر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں :-

بھولی نہ دل کو ایک گھڑی لکھنؤ کی یاد میں آگرے میں تھا یہ فرنگی محل میں تھا
کیا کیا حسین چھوٹ گئے لکھنؤ کے ہائے لندن میں جو نہ تھا وہ فرنگی محل میں تھا
لندن تک بھی ہوگی فرنگی محل کی سیر لاکھوں میں ہاں بھی ایک فقط لکھنؤ تو ہے
بے چین دل کو کرتی ہے یادِ دیارِ یار جب کا محل ہوئی مری حب وطن مجھے

ارباب نشاط سے قہر کی یہ دلچسپیاں اگرچہ بظاہر کسی حد کی پابند نظر نہیں آتیں تاہم ان میں سے بعض ان کے مزاج میں اس حد تک دخیل تھیں کو انھوں نے ان کی شخصیت اور کلام پر اپنے مستقل نقوش چھوڑے ہیں۔ اس زمرے میں چنا جان، مغل جان اور درگا جان صنم کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ چنا جان سے ان کے تعلقات ۱۲۴۸ھ (۳۳-۱۸۳۲ء) کے آس پاس استوار ہو چکے تھے۔ کربلا میں ان کی بنوائی ہوئی مسجد کی تاسیس و تکمیل کے دو قطعاتِ تاریخ اس طرف رہبری کرتے ہیں۔ فی الوقت یہ بتانا دشوار ہے کہ وہ آگرے کی رہنے والی تھیں یا لکھنؤ کی۔ اگر ان کا وطن آگرہ تھا تو اس تعلق کی بنیاد پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آگرے سے قہر کا رشتۂ موانست ۱۲۴۸ھ ہی میں قائم ہو چکا تھا۔ مختلف شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ قہر نے چنا جان سے غالباً باقاعدہ نکاح کر لیا تھا لیکن نیرنگیٔ قسمت سے یہ رفاقت بھی دیرپا ثابت نہ ہو سکی اور پنجشنبہ نہم ذی قعدہ ۱۲۷۶ھ (۳۱ مئی ۱۸۶۰ء) کو جب کہ قہر ابھی جوانی سے بڑھاپے کے دور میں داخل نہیں ہوئے تھے، وہ انھیں ہمیشہ کے لئے داغِ مفارقت دے گئیں۔ قہر کو ان سے کتنی محبت تھی اور یہ سانحہ ان کے لیے کس قدر روح فرسا ثابت ہوا، اس کا اندازہ غالب کے اس تعزیتی مکتوب سے کیا جا سکتا ہے جو انھوں نے خود قہر کے خط سے اس واقعے کی اطلاع پانے کے بعد انھیں تحریر کیا تھا۔ لکھتے ہیں :-

"آپ کا غم فزا نامہ پہنچا۔ میں نے پڑھا، یوسف علی خاں عزیز کو پڑھوا دیا۔ انھوں نے جو میرے سامنے اس مرحومہ کا اور آپ کا معاملہ بیان کیا یعنی اس کی اطاعت اور تمہاری اس سے محبت، سخت ملال ہوا اور رنج کمال ہوا۔

سنو صاحب! ...... شاعر کا کمال یہ ہے کہ قیس و فرہاد ہو جائے۔ فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بھری سے ٹکر کھائے۔ عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو۔ لیلیٰ اس کے سامنے مری تھی۔ تمہاری محبوبہ تمہارے سامنے مری بلکہ تم اس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمہاری معشوقہ تمہارے گھر میں مری۔ . . . "

قہر نے اس موقع پر گیارہ قطعاتِ تاریخ کہے تھے جو مجموعی طور پر ۳۲ اشعار پر مشتمل ہیں۔ یہ قطعات ان کی خانہ ویرانی کے مرثیے ہی نہیں چنا جان کی محبت، وفاداری اور پارسائی و پرہیزگاری کے قصیدے بھی ہیں۔ اس حادثے سے متاثر ہو کر قہر کے بعض احباب نے بھی تاریخیں کہی تھیں۔ یہ تمام قطعات "بیانِ بخشایش" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔

غالب کے ایک دوسرے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ چنا جان کی موت کا غم قہر کے دل سے بھلائے نہ بھولتا تھا۔ اس خط میں وہ انھیں ایک بار پھر اس حادثے کو بھول جانے کی تلقین کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک فشانی، کہاں (کی) مرثیہ خوانی، آزادی کا شکر بجا لاؤ، غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی، منا جان سہی۔"

چنا جان کی تعمیر کردہ مسجد کے قطعۂ تاریخ میں ان منا جان کا ذکر بھی موجود ہے۔ یہ غالباً چنا جان کی چھوٹی بہن تھیں۔ ان سے قہر کے تعلقات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

مغل جان فرخ آباد کی رہنے والی تھیں۔ زمانۂ قیام فرخ آباد میں ان کی صحبتوں میں قہر کی حاضری کا ذکر اس سے پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔ ان صحبتوں میں اکثر ادبی بحثیں بھی چھڑ جاتی تھیں اور متنازعہ فیہ مسائل پر طرفین سے خوب خوب نوک جھونک ہوتی تھیں۔ قہر نے ایسے ہی ایک مباحثے کا حال ایک مختصر مثنوی میں نظم کیا ہے جو "حکایتِ منظوم" کے عنوان سے شاملِ دیوان ہے۔ اس مباحثے میں قہر کے حریف کسی رئیس کے ایک مصاحب تھے۔ اس مثنوی سے اس معارضے کی نوعیت کے علاوہ قہر اور مغل جا

نہ تھا افسانہ گوئی سے سروکار
غرض یہ ہے کہ بہلے خاطرِ یار

یہ "یارِجانی" درگاجان صنم کے علاوہ کوئی اور نہیں۔ مہرؔ نے ان کی تفریحِ طبع کے لیے یہ مثنوی ہی نہیں لکھی، اس کے اوراق پہ ایک محفلِ مشاعرہ بھی سجائی ہے جس کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ ؎

ہوئی وحشت اسے اک دن زیادہ — کیا پھر شعر کہنے کا ارادہ
کہ بہلے خاطرِ محزوں کسی طرح — پے بزمِ سخن اس نے یہ کی طرح
جیے گا آپ کا بیمار کیوں کر — ملے گا شربتِ دیدار کیوں کر

اس مشاعرے میں درگاجان بھی بحیثیت شاعرہ شریک ہیں۔ مہرؔ نے ان کی غزل کے عنوان میں ان کا نام "بتِ کافر کیش و سنگ راہ حرم بی درگاجان متخلص بہ صنم" لکھا ہے۔

چناجان، مغل جان اور درگاجان کے علاوہ مہرؔ کے کلام میں حسینی اور حیدری سے ان کے خصوصی تعلقِ خاطر کے شواہد بھی موجود ہیں۔ حسینی کی تعریف میں انھوں نے اننچاس اشعار کی ایک مختصر مثنوی کہی تھی جو "سراپائے حسینی" کے نام سے دیوان میں شامل ہے۔ حیدری چناجان اور بناجان کی ہم وطن تھیں۔ انھوں نے بھی کربلا میں واقع اس مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا تھا جس کے سالِ تاسیس (۱۲۵۳ھ) اور تکمیل (۱۲۵۹ھ) کے قطعات مہرؔ نے کہے ہیں۔ ان کا انتقال یوم جمعہ ۹ر شوال ۱۲۶۴ھ (۸ر ستمبر ۱۸۴۸ء) کو ہوا۔ مہرؔ نے اس موقع پر گیارہ قطعاتِ تاریخ کہہ کر انھیں آخری ہدیۂ محبت پیش کیا ہے۔

مہرؔ کے انتقال پر ان کے احباب اور معاصرین نے جو تاریخیں کہی تھیں ان میں سے غلام محی الدین شیدا اکبرآبادی کا یہ قطعہ ان کی شخصیت کے اس پہلو کو مزید واضح کرتا ہے ؎

رفت چوں حاتم علی سوے جناں — رنگِ عیش از گلشنِ امکاں ببرد
بر حسینانِ جہاں آمد بلا — ہر یک اسباب طرب با غم سپرد

تصانیف: جناب کاظم علی خاں نے مہرؔ کی انیس تصانیف نظم و نثر کا ذکر کیا ہے۔ یہ فہرست اگرچہ مہرؔ کے تمام علوم آثارِ ادبیہ کو محیط ہے، تاہم اس کے بعض اندراجات نامکمل ہیں اور بعض ترمیم و تصحیح کے طالب ہیں۔ اس کے علاوہ اس فہرست میں زمانۂ تصنیف و ترتیب کے اعتبار سے تقدیم و تاخیر کا بھی لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ بطورِ ذیل میں اس رعایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان تمام کتابوں کے متعلق زیادہ جامع اور مفصل معلومات پیش کی جا رہی ہیں:-

(۱) **پنجۂ مہر:-** کاظم صاحب نے تنہا لکھنوی کے قطعۂ تاریخ کی رو سے اس کا سالِ طباعت ۱۲۵۵ھ متعین کیا ہے۔ موجودہ معلومات کی بنیاد پہ یہ مہرؔ کی اولین تصنیف ہے۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اسے متفرقاتِ نظم میں شمار کرتے ہیں جو صحیح نہیں۔ مہرؔ کی خود نوشت کے مطابق یہ نثری تصنیف ہے۔

(۲) **خارِ عشق:** کاظم صاحب نے اس کا تعارف "غدر میں تلف شدہ کلام" کہہ کر کرایا ہے۔ یہ مہرؔ کا پہلا دیوان تھا جو ۱۲۶۱ھ میں مرتب ہوا تھا۔ یہ سنہ اس کے نام سے برآمد ہوتا ہے۔

(۳) **بخارِ عشق:-** یہ دوسرا دیوانِ غزلیات تھا جو اپنے تاریخی نام کے بموجب ۱۲۷۰ھ میں ترتیب دیا گیا تھا اور مہرؔ کے بقول "ایامِ غدر میں لٹ گیا"۔ کاظم صاحب نے اس کا نام "انجامِ عشق" تحریر فرمایا ہے۔

(۴) **دیوانِ سوم:-** مہرؔ کی تحریر کے مطابق یہ تیسرا دیوان "بطورِ کشکول" مخمسات و مسدسات و رباعیات و قطعات پر مشتمل تھا۔ ان کے بقول یہ بھی ایامِ غدر میں تلف ہو گیا۔

(۵) **قاعدۂ نغمہ:-** مہرؔ نے اسے "رسالہ موسوم بہ قاعدۂ نغمہ" لکھا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کوئی مختصر نثری تصنیف تھی۔ نام غالباً تاریخی ہے جس سے ۱۲۶۰ھ برآمد ہوتا ہے۔ مولانا غلام رسول مہرؔ اور کاظم صاحب دونوں نے اس کا نام "قاعدۂ نظم" تحریر کیا ہے جو صحیح نہیں۔

(۶) **شعاعِ مہر:-** یہ مثنوی مہرؔ کی تصانیف میں سب سے زیادہ مشہور ہے۔ مولوی عبدالوہاب کے قطعۂ تاریخ کے بموجب یہ ۱۲۷۵ھ میں تمام ہوئی تھی اور اس وقت سالِ عیسوی ۱۸۵۸ء اور سالِ سنبت بکرمی ۱۹۱۶ تھا۔ از روے تقویم ۱۸۵۹ء، ۱ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۵ھ کو شروع ہوا تھا اور ۱۲۷۵ھ کی آخری تاریخ ۳۰ر جولائی ۱۸۵۹ء کے مطابق تھی چونکہ تیسرے سنہ یعنی

سنبت بکرمی ۱۹۱۶ کی ابتدا ۱۴ جون ۱۸۵۹ء کو ہوئی تھی، اس لیے اس مثنوی کا زمانۂ تکمیل ۱۴ جون اور ۳۰ جولائی ۱۸۵۹ء کے مابین قرار پاتا ہے۔ تصنیف سے تقریباً ڈیڑھ برس بعد یہ مثنوی ۵ ماہ دسمبر ۱۸۶۰ء کو مطبع حیدری واقع آگرہ، محلہ کڑہ حاجی محمد حسن میں مرزا علی حسین کے اہتمام سے چھپ کر منظر عام پر آئی۔ "شعاعِ مہر" مہر کے بقول اس کا "بے تاریخ" نام ہے (۱۲۷۴)۔ سرورق کے اندراج کے مطابق ان کے عزیز شاگرد مرزا آغا حسین آغا نے تجویز کیا تھا خاتمے کے اشعار میں خود مہر نے اس کے تین تاریخی نام "طغرائے امید"، "زنگ داغ" اور "اخبار عشاق" بتائے ہیں جن میں سے ہر ایک سے ۱۲۷۵ھ برآمد ہوتا ہے۔

"شعاعِ مہر" کی شہرت کا اصل سبب مرزا غالب کی تقریظ ہے جس کی وساطت سے اہل علم اس کا ذکر کرتے اور اس کی جانب توجہ دیتے رہے ہیں۔ تقریظ نگاری کے آداب و تقاضوں کے عین مطابق غالب نے اس تقریظ میں دل کھول کر مہر کی سحر بیانی اور حسن گفتار کی تعریف کی ہے اور اس مثنوی کو "مجموعۂ دانش و آگہی" قرار دیا ہے۔ ایک خط میں انھوں نے اس کے متعلق اپنے تاثرات ان الفاظ میں ظاہر کیے ہیں :۔

"جھوٹ بولنا میرا شعار نہیں۔ کیا خوب بول چال ہے، انداز اچھا، بیان اچھا، روزمرہ صاف.......
اس مثنوی نے اگلی مثنویوں کو تقویم پارینہ کر دیا۔"

اس میں شک نہیں کہ غالب نے اس مثنوی کے مقابلے میں اگلی مثنویوں کو "تقویم پارینہ" قرار دے کر ناانصافی یا مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے لیکن اس آخری رائے سے قبل انھوں نے اس کے جو اوصاف گنائے ہیں، ان سے اختلاف کی گنجائش بہت کم ہے۔ علاوہ بریں اس مثنوی کے سلسلے میں ان کے بیانات کی مبالغہ آمیزی جسے وہ خود "صدقِ اظہار" سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کی اس مصلحت شناسی اور احتیاط پسندی کی تابع معلوم ہوتی ہے جو انھیں اپنے دوستوں اور بالخصوص باحیثیت اور بارسوخ دوستوں کی خاطر شکنی اور ناخوشی سے روکتی رہتی تھی اور جس کا لحاظ نہ کرکے وہ "آئینِ اکبری" کی تقریظ کے معاملے میں سر سید کو ناراض کر چکے تھے۔

ایک اور بات جسے اس مثنوی کے مطالعہ کے سلسلے میں نظر انداز کیا جاتا رہا ہے، یہ ہے کہ اس کا قصہ مہر کا طبع زاد نہیں۔ ان سے پہلے محمد قاسم نامی کسی شخص نے اسے نثر میں لکھا تھا۔ مہر نے ایک یار عزیز (بی درگاجان صنم) کی تحریک اور اپنے شاگرد رشید کنور جگر در تی سنگھ کنور کے اصرار سے اسے نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ اس صورت حال کی وضاحت انھوں نے ان اشعار میں کی ہے ؎

کنور صاحب سخنور معنی آگاہ | جناب کیدر رتی سنگھ ذی جاہ
انھیں ہے مشورہ ہر تگ سے سخن کا | ہمیشہ مشغلہ ہے علم و فن کا
مجھے خاطر عزیز ان کی ہے از بس | انھوں نے مجھ سے کی اس نظم میں کد
یوں ہی اک اور بھی جانِ صنم تھی | کہ ہم کو ذوق تازہ مثنوی ہے
غرض ہونا پڑا مجبور و ناچار | کہ تھا احباب کا ارشاد و اصرار

بیان واقعات میں مہر جا بجا شوخ بیانی سے تجاوز کر کے عریاں نگاری کے حدود میں داخل ہو گئے ہیں۔ کاظم صاحب نے "شعاعِ مہر اور جہانِ غالب" کے عنوان سے اپنے ایک مضمون میں "شعاعِ مہر" کے اس پہلو پر سخت تنقید کی ہے۔ علمی و اخلاقی نقطۂ نظر سے ان کا یہ موقف بالکل درست ہے لیکن مہر نے جن لوگوں کے "ارشاد و اصرار" پر یہ قصہ نظم کیا تھا، ان کی طبقاتی حیثیت اور اس کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا جائے تو ان کی اس انتہاپسندی پر حیرت و تعصب کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس کے علاوہ ان کی اس وضاحت کو نظر انداز کر دینا بھی مناسب نہیں کہ انھوں نے یہ مثنوی ثقہ حضرات کے لیے نہیں، رنگین مزاج لوگوں کے لیے لکھی تھی اور اس میں "شوخ نگاری" کے جو نمونے نظر آتے ہیں، ان کی ذمہ داری بڑی حد تک اصل قصہ نگار پر عاید ہوتی ہے۔ اس ضمن میں یہ اشعار ملاحظہ طلب ہیں ؎



ماسکو میں ہونے والے اولمپک میں شرکت کرنے والے ہندستانی کھلاڑی نئی دہلی میں ۹ جولائی ۱۹۸۰ء کو
وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے ساتھ

وزیر اعلیٰ اتر پردیش شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ، جولائی ۱۹۸۰ء کو ودھان بھون لکھنؤ میں کناڈا کے ہائی کمشنر
شری جان ہیلڈون سے محو گفتگو ہیں





وزیر اطلاعات اتر پردیش شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ



وزیر منصوبہ بندی و امداد باہمی شری برہم دت



وزیر آبپاشی

اتر پردیش

وزیر صنعت شری عبد الرحمٰن نشتر



وزیر انصاف شری جگدیش پرشاد



وزیر بلدیات شری لام سنگھ کھنہ







درسنگھ

وزیر صحت وخاندانی بہبود شری لوک پتی ترپاٹھی

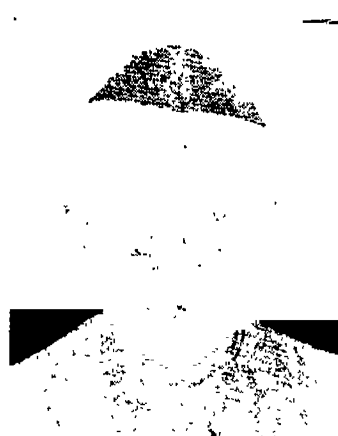
وزیر زراعت شری بلرام سنگھ یادو

ن کابینہ

وزیر مال شری یشپال سنگھ

وزیر پنچائت راج و قومی یک جہتی شری عمار رضوی

وزیر جنگلات وسیاحت شری ودیا بھوشن





وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے ۱۱ جون ۱۹۸۰ء کو لکھنؤ میں اردو ترقی مورچہ اتر پردیش کے ایک وفد کو یقین دلایا کہ وہ اردو کی ترقی سے تعلق [illegible] پر توجہ دیں گے۔ وفد شری ہاشم رضا عابدی ایم۔ایل۔سی [illegible] "قومی جنگ" کی قیادت میں [illegible] میں وزیر اعلا اور شری [illegible] کے علاوہ وفد کے دیگر اراکین شری شاہ محمد فاروق عطا، سعادت علی صدیقی، احمد عباس ردولوی، عبدالسلام صدیقی اور سلیم عمر بھی نظر آرہے ہیں۔

وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ ۶ جولائی ۱۹۸۰ء کو لکھنؤ میں ریاستی حفاظتی ہوم کی سات لڑکیوں کی شادی پر
انھیں تحفے پیش کرتے ہوئے

اسے کیوں مولوی قدردس دیکھیں | اگر دیکھیں تو وہ قاموس دیکھیں
جو اس میں جابجا کچھ شوخیاں ہیں | نشان زود طبع نکتہ داں ہیں
ہوئی ہیں نثر میں اس سے بھی بڑھ کر | بہت خوش ہوں گے احباب اس کو پڑھ کر
تقیہ ناشر کے کہاں ہوں | وہ بوڑھے ہیں تو ہیں ان سے جواں ہوں

تمام نقائص اور خامیوں کے باوجود "شعاعِ مہر" کا یہ امتیاز کچھ کم نہیں کہ اس کی بدولت مہر کا نام زندہ ہے اور اردو مثنویات کی تحقیق و تنقید کے ضمن میں برابر اس کا نام آتا اور اس کی بعض خوبیوں کا اعتراف کیا جاتا رہا ہے۔

(۷) داغ نگار:۔ یہ دو سو دس اشعار کی ایک مختصر مثنوی ہے جو مطبع نور الابصار میں چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔ مرزا عنایت علی ماہ کے قطعہ تاریخ کے ایک مصرع کے مطابق مہر نے اسے "دن بھر میں" نظم کیا تھا۔ اسی قطع کے آخری مصرع "شگوفہ نیا، تازہ کار قلم" سے اس کا سال تصنیف ۱۲۷۶ھ (۱۸۶۰ء) برآمد ہوتا ہے۔ "تمہید سخن" کے عنوان سے کہے گئے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ مہر نے آگرہ کے عبداللہ نامی اک آزردہ جاں" کی یہ "سرگذشت" اپنے ایک دوست وجاہت علی خاں کے اصرار پر نظم کی تھی۔ اس کی تصنیف کے زمانے میں وہ اپنی چہیتی شریک حیات چنا جان متوفیہ ۹ ذی قعدہ ۱۲۷۶ھ مطابق ۳۱ مئی ۱۸۶۰ء) کی موت کے غم سے نڈھال تھے۔ ان کے اپنے قول کے مطابق ہر چند یہ موقع مثنوی کہنے کے بجائے اپنا مرثیہ آپ کہنے اور دن رات اپنے غم و رنج میں آپ ڈوبے رہنے کا تھا، تاہم دوستوں کی "خواہش و فرمائش" کی تعمیل میں "طبیعت بہلانے" کے لیے یہ "مختصر قصہ" نظم کر دیا۔ اس وضاحت سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ مثنوی ۹ ذی قعدہ اور ۳۰ ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ کے درمیان کسی تاریخ کو نظم کی گئی ہے۔

(۸) بیان بخشائش:۔ یہ رسالہ چنا جان کی وفات سے متعلق منظومات پر مشتمل ہے۔ ان منظومات میں سے گیارہ قطعات تاریخ، ایک مسدس اور دو غزلیں خود مہر کی کہی ہوئی ہیں ان کے علاوہ ایک قطعہ ان کے چھوٹے بھائی مرزا عنایت علی ماہ کا اور پانچ قطعات ان کے دوست مولوی عبد الوہاب کی تصنیف ہیں۔ مہر کی کہی ہوئی دونوں غزلوں کے آخری مصرعوں سے بھی تاریخ نکلتی ہے۔ خود "بیان بخشائش" بھی تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۷۶ھ برآمد ہوتا ہے۔ یہ مجموعہ ۱۲۷۷ھ میں مطبع حیدری آگرہ میں چھپا تھا۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم نے ایک مضمون میں اس مجموعے کے ایک خاص نسخے کا جو ان کی ذاتی ملکیت میں تھا، ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اس کے آخر میں مہر نے چند سطریں اور ایک قطعہ تاریخ اپنے ہاتھ سے لکھ کر دستخط کر دیے ہیں۔ اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی طباعت کے اخراجات نواب مرزا محمد علی خاں بہادر (حزیں) نے عطا کیے تھے۔" نگارشات ادیب ص ۳۲)۔ متذکرہ قطعہ تاریخ درج ذیل ہے۔

عجب روکش مہر انور ہے یہ | ہزاروں دفاتر سے بہتر ہے یہ
حزیں سے کہا جب کہ تاریخ کو | وہ بولا "مصیبت کا دفتر ہے یہ"

۱۲۷۷ھ

(۹) پارۂ عروض:۔ یہ رسالہ علم عروض و قافیہ سے متعلق تھا۔ نام تاریخی ہے جس سے ۱۲۷۳ھ برآمد ہوتا ہے۔ کاظم علی صاحب نے "خطوطِ غالب" مرتبہ مولانا غلام رسول مہر اور "ادبی خطوطِ غالب" مرتبہ مرزا محمد عسکری کے حوالے سے اس کا نام "پیرایۂ عروض" تحریر کیا ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ "بزم غالب" اور "آب بقا" میں اس کا نام "پارۂ عروض" بتایا گیا ہے۔ "تاریخ ادب اردو" ترجمہ مرزا محمد عسکری میں بھی اسے "پیرایۂ عروض" ہی سے موسوم کیا گیا ہے لیکن ڈاکٹر سکسینہ کی اصل انگریزی کتاب میں صحیح نام "پارۂ عروض" ہی درج ہے، یہ رسالہ غالباً شایع نہیں ہوا ہے۔

یہ کتاب مرزا قاسم حسین قزلباش کے "اجازت نامہ برائے طبع و اشاعت" مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۸۹۲ء کے تحت باہتمام نثار حسین مطبع دبدبۂ حیدری آگرہ سے ۱۳۱۱ھ (۹۴-۱۸۹۳ء) میں شائع ہو چکی ہے۔ صفحات کی تعداد ۶۸ ہے جن میں سے آخری دو صفحات قطعات تاریخ وغیرہ پر مشتمل ہیں۔

(۱۰) محیط آشنا:- یہ ان شعرا کا تذکرہ تھا جن سے مہر کی ملاقات ہو چکی تھی۔ خود نوشت میں اس کا ذکر موجود ہے، اس بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ جمادی الاولی ۱۲۸۶ھ مطابق اگست ۱۸۶۹ء سے قبل مرتب ہو چکا تھا۔ یہ تذکرہ بھی طبع نہ ہو سکا اور اب بظاہر اس کا قلمی نسخہ بھی کسی کتب خانے میں محفوظ نہیں ہے۔

(۱۱) داغِ دلِ مہر:- خواجہ عبد الرؤف عشرت، ڈاکٹر رام بابو سکسینہ، مرزا محمد عسکری، مولانا غلام رسول مہر اور ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے اسے داسوخت بتایا ہے۔ اس کے برخلاف پروفیسر عبد القادر سروری (اردو مثنوی کا ارتقا) اور علی جواد زیدی (قصیدہ نگاران اتر پردیش) اسے "شعاعِ مہر" اور "داغِ نگار" کے ساتھ مثنویاتِ مہر میں شمار کرتے ہیں۔ فی الوقت یہ بتانا دشوار ہے کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ نام بظاہر تاریخی ہے جس سے اس کا سالِ تصنیف ۱۲۸۴ھ برآمد ہوتا ہے

(۱۲) دیوانِ چہارم:- مہر نے اپنی خود نوشت میں فہرست تصانیف کے تحت مذکورہ تلف شدہ تین دیوانوں کے علاوہ ایک اور دیوان کی موجودگی کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہی دیوان ان کے انتقال کے بعد ان کے پوتے مرزا قاسم حسین کے زیر اہتمام "الماس درخشاں" یا "خیالاتِ مہر" کے تاریخی ناموں سے ۲۸ نومبر ۱۸۹۵ء کو مطبع الٰہی آگرہ میں چھپ کر شائع ہوا۔ مہر نے اس کے لیے ان دو ناموں کے علاوہ ایک اور تاریخی نام "مہر حسن" بھی تجویز کیا تھا۔ ان تینوں ناموں سے ۱۲۸…ھ برآمد ہوتا ہے لیکن خود نوشت کے حوالے کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۲۸۶ھ ہی میں مرتب یا مکمل ہو چکا تھا۔

"الماس درخشاں" انیس سطری مسطر کے پانچ سو آٹھ صفحات پر مشتمل ہے سب سے پہلے صفحہ ۲ سے صفحہ ۳۵۱ تک ردیف وار غزلیں شامل کی گئی ہیں۔ بعض غزلیں نامکمل ہیں۔ ان میں مقطع کی جگہ عموماً یہ عبارت لکھ دی گئی ہے کہ" بوجہ ناتمام ہونے غزل کے مہر صاحب مرحوم نے مقطع نہیں لکھا ہے"۔ بعض ردیفوں میں ایک ایک دو دو فارسی غزلیں بھی موجود ہیں۔ صفحہ ۳۵۱ پر "اشعار متفرق اور جستہ جستہ دواوین تلف شدہ کے جو کچھ یاد آئے یا کچھ ردیوں میں مل گئے"، کا عنوان قائم کیا گیا ہے۔ ان متفرق اشعار کا سلسلہ صفحہ ۳۶۶ پر ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد اسی صفحے سے خمسے شروع ہو جاتے ہیں جن شاعروں کی غزلیں تضمین کے لیے انتخاب کی گئی ہیں، ان میں شعرائے فارسی میں سے نظیری، قدسی اور حافظ اور شعرائے اردو میں سے میر، ناسخ، آتش، سودا، مرزا جان طپش، سید محمد خاں رند، ہزاری لعل اشکی، حیدر علی واثق، زین العابدین خاں شورش، میر علی اوسط رشک، میر شجاعت علی جوشش، میر وزیر علی صبا، میر قاسم علی خاں قاسم، مرزا رجب علی سرور، الٰہی بخش معروف، آغا علی خاں مہر، بلوان سنگھ راجہ، احمد علی شیون، عالم پناہ واجد علی شاہ، درگا جان صنم اور دو نامعلوم الاسم شاعر شامل ہیں۔ ان میں سے راجہ کی تین غزلوں پر، میر، ناسخ، رند، شیون اور صنم کی دو دو غزلوں پر اور باقی تمام شعرا کی ایک ایک غزل پر تخمیس کی گئی ہے۔

صفحہ ۴۱۹ سے صفحہ ۴۳۲ تک مسدس، صفحہ ۴۳۳ سے صفحہ ۴۳۸ تک مثلث، "مخمس بر اشعار متفرق" "مسبع تلف شدہ" اور "مسدس بر دو شعر" کے زیر عنوان متفرق کلام کے نمونے منقول ہیں۔ صفحہ ۴۳۹ اور ۴۴۰ پر سات رباعیاں اور سات قطعات درج کیے گئے ہیں۔ صفحہ ۴۴۱ سے ۴۴۸ تک "سراپا حسینی" اور "حکایت منظوم (نمبر۱)" "حکایت منظوم (نمبر۲)" کے عنوان سے علی الترتیب ۵۹، ۲۳ اور ۱۲۵ اشعار کی تین مثنویاں، صفحہ ۴۴۸ کے وسط سے صفحہ ۴۵۱ تک "زائچہ منظوم واجد علی شاہ (۶۱ اشعار) اور صفحہ ۴۵۱ کی آخری سطر سے صفحہ ۴۵۲ تک "قصیدہ بمدح زن حاکم" نقل ہوا ہے۔ صفحہ ۴۵۳ سے قطعات تاریخ شروع ہوتے ہیں جن کا سلسلہ صفحہ ۴۹۹ کی پہلی سطر پر ختم ہوا ہے۔ بعد ازاں صفحہ ۴۹۹ سے صفحہ ۵۰۳ تک ترتیب دیوان سے متعلق اور صفحہ ۵۰۳ سے ۵۰۸ تک

وفاتِ مہرؔ کے سلسلے میں مختلف شعرا کے قطعات تاریخ کو جگہ دی گئی ہے۔ ان میں سب سے آخر میں مرزا سخاوت علی بیگ ضیاؔ کے قطعات منقول ہیں۔ اس آخری صفحے پر ایک اشتہار بھی شائع ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا قاسم حسین نے اس دیوان کا "حق تالیف" محمد مچھو خاں مالک و مہتمم مطبع الٰہی آگرہ کے نام ہبہ کر دیا تھا۔

(۱۳) شبنمِ عشرت :۔ خواجہ عبد الرؤف عشرت کا بیان ہے کہ مہرؔ نے اس میں "اپنے فرزند آغا سخاوت علی بیگ کی شادی کے سہرے اور تاریخیں جو احباب نے لکھی ہیں جمع کر کے چھپائی ہیں۔" (آبِ بقا) اس کے برخلاف جناب کاظم علی خاں نے "کلامِ اختر" کے حوالے سے لکھا ہے کہ "اس میں مہرؔ نے اپنے پوتے مرزا قاسم حسین کی ولادت و بسم اللہ وغیرہ کی تقریبوں کا ذکر کیا ہے۔" مولانا فاضل زیدی لکھتے ہیں کہ یہ کتاب ان کے پاس موجود ہے لیکن وہ اس کی تفصیلات نہیں بتاتے۔ کتاب کا نام بظاہر تاریخی ہے جس سے اس کا سالِ ترتیب ۱۲۸۰ھ نکلتا ہے۔ مرزا قاسم حسین بھی اسی سال پیدا ہوئے تھے۔

(۱۴) ایاغِ فرنگستان :۔ مولانا غلام رسول مہرؔ نے اسے ہندوستان میں انگریزی عملداری کے ابتدائی عہد کی تاریخ قرار دیا ہے لیکن درحقیقت یہ ان گورنروں اور لفٹیننٹ گورنروں کا مختصر تذکرہ ہے جنھوں نے انگریزی حکومت کی ابتدا سے ۱۸۶۲ء تک حسبِ عہدہ ہندوستان کے برطانوی مقبوضات اور صوبہ شمال مغربی پر حکومت کی۔ یہ کتاب "بحضور جناب سر ولیم میور صاحب بہادر لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی بطور یادگار" پیشکش کے لیے ۱۸۶۳ء میں مطبع مفید عام آگرہ میں بڑی تقطیع کے ۵۲ صفحات پر نہایت خوش خط جلی قلم میں چھپ کر شائع ہوئی تھی۔ "ایاغِ فرنگستان" اس کا "اسم تاریخی" ہے۔ اس سے بھی ۱۸۶۳ء ہی برآمد ہوتا ہے۔ "خطوطِ غالب" مرتبہ مولانا غلام رسول مہرؔ میں غالباً بنائے سہو سالِ طباعت ۱۸۶۲ء درج ہو گیا ہے۔

(۱۵) ہمدمِ آخرت :۔ ڈاکٹر گیان چند (اردو مثنوی، شمالی ہند میں) اور ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی (اردو مثنوی کا ارتقا) کے بیان کے مطابق یہ تقریباً چھ سو اشعار کی مثنوی ہے جو ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء میں لکھی گئی ہے اور چند حدیثوں کے تراجم پر مشتمل ہے۔ "ہمدمِ آخرت" سے بھی اس کا سنہ تصنیف ۱۲۹۰ھ ہی معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر جین کی تحریر کے مطابق اس کے آخر میں مصنف نے اپنے حالات بھی بیان کیے ہیں۔

(۱۶) رسالۂ زبر و بینات :۔ کاظم صاحب کی اطلاع کے مطابق مہرؔ نے یہ رسالہ میر انیس کی وفات سے متعلق مرزا دبیرؔ کی مشہور تاریخ "ع طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس" پر بعض حضرات کے اعتراضات کے رد میں تحریر کیا تھا۔ جناب فاضل زیدی نے اس کا ذکر "مرزا دبیرؔ کی تائید میں ایک کتاب" کے عنوان سے کیا ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ یہ کتاب ان کے پاس موجود ہے۔ (تعلیقات عود ہندی)۔ موجودہ نام بظاہر کاظم صاحب کا تجویز کردہ معلوم ہوتا ہے۔ مہرؔ نے جو اپنی تصانیف کے تاریخی نام رکھنے کے عادی ہیں، یقیناً اس کے لیے کوئی اور نام تجویز کیا ہوگا۔

(۱۷) ذابِ انتقام :۔ کاظم صاحب رقمطراز ہیں کہ "بزمِ غالب" اور "ادبی خطوطِ غالب" میں اس کا نام بالترتیب "فریبِ انتقام" اور "ضبطِ انتقام" لکھا گیا ہے حالانکہ صحیح نام "ذابِ انتقام" ہے۔ یہ حضرت مختار کے حال میں ایک منظوم مذہبی کتاب ہے۔ نام کی صحت کے بارے میں یہ اطلاع مولانا فاضل زیدی کے بیان پر مبنی معلوم ہوتی ہے جنھوں نے لکھا ہے کہ یہ کتاب میرے پاس موجود ہے۔ (ریاض الفردوس) مرزا محمد عسکری نے "ادبی خطوطِ غالب" کے علاوہ "تاریخ ادبِ اردو" میں بھی اس کتاب کا نام "ضبطِ انتقام" ہی لکھا ہے لیکن ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی اصل انگریزی کتاب میں "ذابِ انتقام" ہی درج ہے۔ (ص ۱-۹) کاظم صاحب نے اسے "ایک منظوم مذہبی کتاب" قرار دیا ہے حالانکہ یہ ایک فارسی رسالے کا سلیس نثری ترجمہ ہے۔ مہرؔ نے اس کے مختصر دیباچے میں اس امر کی وضاحت اس طرح کی ہے :۔

"یہ رسالہ مختصر اور عجالۂ محقر ترجمہ کتاب نور الابصار

فی اخذ الثار اعنی طلب خون وانتقام امام حسین علیہ السلام حال مختار بن عبیدہ ... جو تالیف جناب ... سید ابراہیم صاحب مدظلہ العالی فارسی عالمانہ میں تھا اور کم استعداد اس کے سمجھنے سے بخوبی بہرہ یاب نہوتے تھے، بندۂ فانی، زرد چہر، حاتم علی مہر قرن لباس اصفہانی نے اردو سے سریع الفہم میں امتحاناً ترجمہ کر کے ہدیۂ ناظرین باتمکین کیا۔"

کتاب کے آخر میں خود مہر کا کہا ہوا مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ درج ہے۔ نسخۂ مطبوعہ میں اس قطعے کی پیشانی پر مصنف [redacted] مرزا حاتم علی مہر کی بجائے "مولوی حاتم علی صاحب متخلص بہ مہر" لکھا گیا ہے۔ قطعہ ؎

خوب اعدا سے لیا مختار نے ‌‌ انتقام خون شاہ تشنہ کام
یہ رسالہ مہر ہے اس حال کا ‌‌ نام تاریخی ہے "ذات انتقام"

اس تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مہر نے یہ ترجمہ ۱۲۹۵ھ میں مکمل کیا تھا۔ اس کا پہلا ایڈیشن ان کی وفات کے بعد سید عابد علی زیدی کے زیر اہتمام ان کے اپنے مطبع اثنا عشری واقع محلہ فراش خانہ متصل دریرگنج لکھنؤ میں اواخر ماہ ربیع الاول ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸۹۶ء میں چھپ کر منظر عام پر آیا۔ دوسرا ایڈیشن جو راقم السطور کے پیش نظر ہے اور جس کے سرورق کے تمام اندراجات طبع اول کے مطابق ہیں اسی مطبع سے "بتاریخ چہارم ماہ ذی الحجہ روز شنبہ ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۵ اپریل ۱۸۹۹ء" شائع ہوا ہے۔

(۱۸) عید قیصریہ :- کاظم صاحب نے "ادبی خطوط غالب" کے حوالے سے اس کا نام "عہد قیصر" قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "آپ تھا" اور "بزم غالب" میں اسے "عید قیصریہ" لکھا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہی نام صحیح ہے۔ "عہد قیصر" بظاہر "عید قیصریہ" کی تصحیف معلوم ہوتی ہے کیونکہ مرزا محمد عسکری "ادبی خطوط غالب" کی ترتیب سے کچھ ہی دنوں پہلے "تاریخ ادب اردو" کے ترجمے میں جو مہر سے متعلق ان کی معلومات کا بنیادی ماخذ ہے اس کا نام "عید قیصریہ" ہی لکھ چکے تھے۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی اصل انگریزی کتاب میں بھی یہی نام ملتا ہے۔ انھوں نے اسے متفرقات نظم میں شمار کیا

(۱۹) توقیر شرف :- کاظم صاحب نے اس کا نام "ت... لکھا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ ان کا اپنا یا کاتب مضمون کا سہو قلم ہو "تاریخ ادب اردو"، "ادبی خطوط غالب" اور "خطوط... میں جو موصوف کے ماخذ ہیں اسے بالاتفاق "توقیر شرف" ہی لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر سکسینہ نے اسے منظومات کے زمرے میں شامل کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان ماخذ سے اس کے بارے میں مزید کوئی معلومات حاصل نہیں ہوتی۔ ہمارے خیال میں آخری تصنیف ہے کیونکہ اس کے نام سے ۱۲۹۶ھ برآمد جو مہر کا سال وفات بھی ہے۔ مرزا آقا حسین کی کتاب پر مبنی کاظم صاحب کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مہر ۱۸۷۹ء (۱۷ صفر ۱۲۹۶ھ) کو قلعۂ آگرہ میں لفٹیننٹ گو... میں شرکت کی تھی۔ ممکن ہے کہ یہ اس موقع پر پیش کی گئی یا نظم کا تاریخی نام ہو۔

تصانیف مہر کی یہ فہرست بظاہر مکمل ہے لیکن اس مرثیوں کا کوئی مجموعہ شامل نہیں۔ ممکن ہے کہ یہ مرثیے کے تحت کسی مجموعۂ منظومات میں شامل ہوں یا انھوں نے علیحدہ مجموعہ مرتب کیا ہو جو ان کے سوانح نگاروں کی... آ سکا۔ یہ بات بہرحال طے ہے کہ وہ ہر سال ماہ محرم میں... کرتے تھے۔ اس طرف انھوں نے اپنی ایک غزل میں اس طرح اشارہ کیا ہے ؎

آ گیا ماہ محرم تو کہیں مرثیۂ مہر ‌‌ اب تو کرنی ہی پڑے گی...

مہر کے آثار ادبیہ پر اس بحث کے ضمن میں ضروری ہے کہ غدر کے ہنگامے میں کلام کے ایک بڑے حصے کے اتلاف... متعلق ان کے بیان کا بھی جائزہ لیا جائے۔ خود نوشت... نقصان کا ذکر کرنے کے بعد انھوں نے لکھا ہے کہ "دوا... کے غم میں ایک غزل جس کا مطلع تھا "دیوان حال میں...

اس عہد میں ہر ایک تہِ چرخ کہن لٹا
اوروں کا زر لٹا مرا نقد سخن لٹا

مہرؔ کے سوانح نگاروں میں مولانا غلام رسول مہرؔ نے بھی اس واقعے کی تائید کی ہے اور بطور ثبوت یہ مطلع نقل فرمایا ہے۔ کاظم صاحب بھی بظاہر موصوف ہی کے ہم خیال ہیں لیکن فی الحقیقت مہرؔ کے اس بیان میں صداقت کم اور مبالغہ زیادہ ہے جسے کہ ہم اسے صرف شاعری بھی کہہ سکتے ہیں۔ "الماس درخشاں" میں ان غزلوں کے علاوہ جن کا تعلق چار، بنارس اور منفرا سے ہے اور جو یقیناً غدر سے پہلے کے زمانے سے تعلق رکھتی ہیں، متعدد ایسے قطعاتِ تاریخ موجود ہیں، جو مہرؔ کے اس دعوے کی نفی کرتے ہیں۔ تاریخ گوئی سے غیر معمولی دلچسپی کی بنا پر انھوں نے بعض غزلوں کے آخری مصرعوں میں بھی "تاریخِ فکر" کا التزام کیا ہے۔ ان غزلوں میں سے ایک غزل کا مقطع یہ ہے ؎

تاریخِ فکر "ہائے غمِ ہجر" کہیے مہرؔ مضمون ہیں غزل میں غمِ ہجرِ یار کے

"ہائے غمِ ہجر" سے ۱۲۶۲ھ برآمد ہوتا ہے جو ۱۸۴۶ء کے مطابق ہے۔ یہ غزل بھی "ذوداوینِ تلف شدہ کے متفرق اور جستہ جستہ اشعار" پر مشتمل ضمیمے کے بجائے اصل متن میں شامل ہے اور غدر سے پہلے اور بعد کے کلام کی موجودہ تفریق کو باطل قرار دینے کے لیے ایک اہم شہادت کی حیثیت رکھتی ہے۔

غدر سے پہلے مرتب ہونے والے جن تذکروں میں مہرؔ کا ذکر آیا ہے، ان میں سے فی الوقت "بہارِ بے خزاں"، "خوش معرکۂ زیبا" اور "گلستانِ بے خزاں" ہماری دسترس میں ہیں۔ "بہارِ بے خزاں" ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۸۴۵ء کی تالیف ہے، "خوش معرکۂ زیبا" ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) میں شروع ہو کر ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶ء) میں تمام ہوا، اور "گلستانِ بے خزاں" ربیع الاول ۱۲۶۵ھ مطابق جنوری ۱۸۴۹ء میں مکمل ہوا ہے۔ اول الذکر میں دو غزلوں کے آٹھ اشعار، ثانی الذکر میں ایک غزل کے پانچ شعر اور آخر الذکر میں نو غزلوں کے اسی اشعار مہرؔ کے نمونۂ کلام کے طور پر نقل کیے گئے ہیں۔ ان میں سے "گلستانِ بے خزاں" کے انتخاب میں شامل پانچ شعروں کے علاوہ باقی تمام اشعار "دیوانِ مطبوعہ" میں موجود ہیں۔ جو اشعار دیوان میں نہیں ملتے وہ یہ ہیں ؎

(۱) داغِ عشقِ شمع رویاں دل پہ گر جاتا رہا گل مرا مانندِ چراغِ دودماں ہو جائے گا

(مقطع) پیدا ہی کروں گا کوئی تدبیرِ رہائی تو ڑوں گا در خانۂ زنجیر سے زنجیر

(مقطع) منتظر ہے نبات بڑھ شطرِ دلِ بیتاب اب دیکھیے کیا لائے گا چیرہ دلِ بیتاب
دریائے رنگ کی آنکھوں سے جاری ہے بدل یہ گنبدِ گرداں ہے حباب پر ملبل

گریباں ہاتھ میں ہے دھجیاں میں صحرا کا داماں ہے بس اب پاؤں ہیں تیرا در سر خارِ مغیلاں ہے

پہلے، دوسرے اور پانچویں شعر کی زمینوں میں مہرؔ نے طویل غزلیں کہی ہیں۔ باطن نے ان میں سے پہلی غزل کے تین شعر، دوسری غزل کا صرف یہی مطلع اور آخری غزل کے تیرہ اشعار نقل کیے ہیں۔ ایسی صورت میں ان تین شعروں کا متعلقہ غزلوں میں نہ پایا جانا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ نظرِ ثانی کے وقت قلم زد کر دیے گئے ہوں گے۔ ان اشعار میں جو لسانی و بیانی اسقام ہیں وہ بھی اس قیاس کو تقویت بخشتے ہیں۔ تیسرے اور چوتھے شعر کی زمینوں میں دیوان میں کوئی غزل موجود نہیں۔ ممکن ہے کہ ان طرحوں میں مزید اشعار کہے نہ گئے ہوں یا انھیں شعروں کی طرح بے کیف و بے رنگ ہونے کی بنا پر انھیں دیوان سے خارج کر دیا گیا ہو، بہر صورت غدر سے پہلے کی بارہ محولہ بالا غزلوں میں سے دس کی دیوانِ مطبوعہ میں موجودگی اُن کلام کے بارے میں مہرؔ کے بیان کے خلاف ایک اور اہم ثبوت فراہم کرتی ہے۔

"الماس درخشاں" اور مذکورہ بالا تذکروں میں مشترک کلام کے تقابلی مطالعے سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ مہرؔ نے ترتیبِ دیوان کے وقت اپنے کلام پر خاص توجہ کے ساتھ نظرِ ثانی کی تھی۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل اشعار کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ؎

کوئی مضموں نہ بند ھے زلف اگر واہو جائے   سوجھے کیا خاک جب آنکھوں میں اندھیرا ہو جائے

—————— بہار بے خزاں

کوئی مضمون نہ بندھے زلف اگر وا ہو جائے   شعر کیا سوجھے جب آنکھوں میں اندھیرا ہو جائے

—————— الماس درخشاں

بوسۂ لب سے جو منہ نزع میں میٹھا ہو جائے
خواب مرگ اپنا سبک سیر دں سے اچھا ہو جائے

—————— بہار بے خزاں

منہ دم نزع لب یار سے میٹھا ہو جائے
خواب مرگ اپنا شکر خواب سے اچھا ہو جائے

—————— الماس درخشاں

پانوں کی انگلی یہ تیری ید بیضا صدقے
ہونٹ ہل جائے تو اعجاز مسیحا ہو جائے

—————— بہار بے خزاں

ہو ترے ناخن پا پر ید بیضا صدقے
ہونٹ ہل جائے تو اعجاز مسیحا ہو جائے

—————— الماس درخشاں

تن بے روح میں روح آتی ہے دیکھے سے اسے
منہ پہ عیسیٰ کے میں کہتا ہوں مسیحا ہے وہ رخ

—————— خوش معرکہ زیبا

تن بے روح میں روح آتی ہے دیکھے سے اسے
منہ پہ عیسیٰ کے میں کہہ دوں کہ مسیحا ہے وہ رخ

—————— الماس درخشاں

مہر معشوق ہے اور صبح امید عاشق
حیرت یوسف و تسکین زلیخا ہے وہ رخ

—————— خوش معرکہ زیبا

مہر معشوق ہے اور صبح امید عاشق
غیرت یوسف و ہم شکل زلیخا ہے وہ رخ

—————— الماس درخشاں

خیال عشق جوانی ہے خواب پیری میں
سحر ہے چونکیے غفلت سے اب سدھاری رات

—————— گلستان بے خزاں

خیال عیش جوانی عبث ہے پیری میں
سحر ہے خواب سے بس چونکیے اب سدھاری رات

—————— الماس درخشاں

میں سمجھا دیکھ کے اس کے لب مسی آلود
ہوا ہے آتش یاقوت سے دھواں پیدا —— گلستان بے خزاں

گماں ہے دیکھ کے اس کے لب مسی آلود
ہوا ہے آتش یاقوت سے دھواں پیدا

—————— الماس درخشاں

کہاں یہ ابروے خم دار کب یہ چشم فتاں ہے
بیاض چشم آہویاں کتاب طاق نسیاں ہے

—————— گلستان بے خزاں

غضب یہ ابروے پرخم بلا یہ چشم فتاں ہے
بیاض چشم آہو اب کتاب طاق نسیاں ہے

—————— الماس درخشاں

جسے اہل ریاضی برج آبی کہتے ہیں شاید
وہ سانچا تیرے آنسو ڈھالنے کا ختم گریاں ہے

—————— گلستان بے خزاں

جسے ارباب ہیئت برج آبی فرض کرتے ہیں
وہ سانچا تیرے آنسو ڈھالنے کا چشم گریاں ہے

—————— الماس درخشاں

وفات :۔ مہرؔ کے سوانح نگاران کے سال ولادت کی طرح سال وفات کے سلسلے میں بھی متفق اللسان نہیں۔ کاظم صاحب نے ان اختلافات کی نشاندہی میں بھی وہی طریقہ کار اپنایا ہے جس کی طرف سنہ ولادت سے متعلق بحث میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ چنانچہ ان کا یہ بیان کہ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی اور ڈاکٹر گیان چند نے مہرؔ کا سال رحلت ۱۲۹۰ھ بتایا

ہے، درست نہیں۔ ان دونوں حضرات نے ان کے انتقال کا سال ۱۲۹۷ھ لکھا ہے۔ اس میں سنہ ہجری غلط اور سنہ عیسوی صحیح ۱۸۷۹ء ہے۔ یہاں بھی درحقیقت حساب کی اس غلطی کا اعادہ ہوا ہے جس کی وجہ سے سنینِ ولادت کی تطبیق میں ایک سال کا فرق واقع ہوگیا ہے۔ کاظم صاحب نے اس بحث کے آخر میں "وفاتِ مہر کے عینی شاہد" مرزا قاسم حسین اور ایک معاصر تذکرہ نگار مظفر حسین صبا گوپاموی (مولف روشن) کے حوالے سے صحیح تاریخ رحلت ۲۸ شعبان ۱۲۹۶ھ متعین کی ہے۔ اس تاریخ کا اصل ماخذ وہ رسالہ ہے جو مرزا سخاوت علی بیگ نے اپنے والد کے انتقال کی تاریخوں سے مرتب کرکے شائع کرنا چاہا تھا اور جو ان کی بے وقت موت (واقع ۱۲ شوال ۱۲۹۶ھ) کی وجہ سے نامکمل رہا۔ اس رسالے کے لیے جمع کردہ مواد "الماس درخشاں" کے آخر میں بطور ضمیمہ شامل ہے۔ قطعات تاریخ سے قبل مرتب رسالہ مرزا سخاوت علی بیگ نے اس حادثے کی تفصیلات ان الفاظ میں بیان کی ہیں:

"تاریخ ۲۸ شعبان ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸ اگست ۱۸۷۹ء روز دوشنبہ عین نماز مغرب کے وقت مجھ کو داغ پدری المعہ[۴۶] سال کی عمر میں نصیب ہوا، جناب فلک رکاب عالی منزلت ہم اوج سپہر جناب مرزا حاتم علی بیگ صاحب مہر نے انتقال فرمایا۔" (ص ۵۰۳)

وفات کے وقت مہر اٹیہ میں مرتب رسالہ کے پاس قیام پذیر تھے وہیں تکیہ اسد علی میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ ان کے انتقال کی تاریخیں کہنے والوں میں اٹیہ اور اس کے قرب و جوار کے کئی لوگ شامل ہیں۔ خود مرزا سخاوت علی بیگ ضیا نے پانچ قطعات کہے ہیں جن میں سے تین میں وفات کے دن، تاریخ اور ماہ وغیرہ کی صراحت موجود ہے۔

آخر میں اس مضمون کے ضمیمے کے طور پر مہر کے وہ خود نوشت حالات نقل کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے جو انھوں نے آگرے کے ایک مشاعرے کے گلدستے کے لیے لکھے تھے۔ یہ مشاعرہ راجہ صاحب بہادر والی کاشی (راجہ بلوان سنگھ) کے دولت کدہ پر منعقد ہوا تھا۔ بانیٔ مشاعرہ منشی نیاز علی تپاں نے یکم اگست ۱۸۶۹ء مطابق ۳ رجمادی الاول ۱۲۸۶ھ کو بصورت اشتہار ایک دعوت نامۂ عام جاری کرکے اس مشاعرے کے اغراض و مقاصد اور دیگر تفصیلات ان الفاظ میں بیان کی تھیں۔

"یہ مشاعرہ بتاریخ ۱۶ ماہ اکتوبر ۱۸۶۹ء مطابق ۱۰ رجب ۱۲۸۶ھ روز شنبہ سات بجے رات سے شروع ہوگا جس میں شعرائے موجودین شہر مجتمع ہوں گے، غرض اس جلسے کی یہ ہے کہ اکثر بڑے بڑے شہروں یا قصبوں کے شاعروں کا حال مفصل ایک خاص تذکرے میں واسطے یادگاری کے لکھا جاوے تاکہ طرح واحد کے ذریعے سے ان کی فکر کا نتیجہ ظاہر ہو۔"

طرح کے لیے ایک مصرع غزل اردو کا اور ایک فارسی کا تجویز کیا گیا تھا اور شاعروں سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ ان میں سے کسی ایک یا دونوں طرحوں پر غزلیں کہہ کر جدول مندرجہ اشتہار کے مطابق اپنے حالات کے ساتھ ۱۰ اکتوبر تک بانیٔ مشاعرہ کے پاس بھیج دیں۔ شاعروں نے اس جدول کے ذریعہ طلب کردہ تفصیلات کو بالعموم زیادہ اہمیت نہیں دی اور نام اور پتے کے علاوہ دوسرے حالات بہت کم لکھ کر بھیجے اس لیے تذکرے کی تالیف کا خیال پورا نہ ہوسکا۔ تاہم اس مشاعرے کی یادگار کے طور پر ایک گلدستہ "شعر و سخن" کے تاریخی نام سے مرتب کرکے شائع کردیا گیا۔ اس گلدستے کا ایک ناقص الاول والآخر نسخہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ میں محفوظ ہے جس سے مہر کے حالات کا اقتباس سطور ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

"مرزا حاتم علی بیگ، مغل قزلباش، اصفہانی الاصل خلف مرزا فیض علی بیگ قزلباش تحصیلدار ابن رکن الدولہ مرزا امراد علی خاں بہادر اصفہانی، تخلص مہر شاگرد شیخ امام بخش ناسخ لکھنوی، عمر ۵۷ سال۔ مدت شاعری

بہ سال بسکونت قدیم لکھنؤ بسکونت حال اکبرآباد۔"

تصنیفات:- تین دیوان غزلیات، ایک موسوم بہ خار عشق، دوسرا انجار عشق، تیسرا بطور کشکول مخمس و مسدس و رباعیات و قطعات وغیرہ ایام غدر میں لٹ گئے۔ اب ایک دیوان اور ایک کتاب نثر موسوم بہ پنجۂ مہر اور ایک رسالہ علم عروض و قافیہ میں موسوم بہ پارۂ عروض اور دو مثنویاں ایک موسوم بہ شارع مہر اور دوسری داغ نگار اور ایک رسالہ موسوم بہ قاعدۂ نغمہ اور ایک تذکرہ ان شعرا کا جن سے ملاقات ہوئی موسوم بہ محیط آشنا بعض چھپے ہوئے بعض قلمی ہیں اور دو وادین ملکۂ کے غم میں ایک غزل جس کا مطلع یہ ہے، دیوان حال میں موجود ہے ۔

اس عہد میں ہر اک تہ چرخ کہن لٹا
اور دن کا زر لٹا، مرا نقد سخن لٹا

حال:- پردادا میرے نادر شاہ کے ساتھ ہندستان میں اصفہان سے آئے۔ دادا میرے مرزا امراؤ علی خاں بہادر مصاحب خاص، ندیم با اختصاص نواب شجاع الدولہ بہادر اور ناظم علاقۂ لکھنؤ و بریلی رہے۔ والد ہمیشہ علی داری سرکار انگریز بہادر میں تحصیلدار رہے۔ راقم اکثر دفتر منصفی چنار گڑھ میں برابر رہا تا بعد منصفی وکیل محکمۂ محتشمہ صدر دیوانی اور محکمۂ عالیہ ہائی کورٹ ممالک مغربی و شمالی اب تک ہے۔ ایام غدر میں ساتھ انگریز اور میم اور بچے بحکمت عملی دست تسلط باغیان ناہنجار سے اپنے محفوظ رکھے۔ اس کے جلدو میں بعطائے خلعت فاخرہ اور نصف معافی اور نصف مال گزاری مواضعات کاندا و باندا (؟) معہ مونع ایک حصہ فتح پور سیکری اور باریابی دربار ڈربار نواب گورنر جنرل بہادر اور نواب لفٹننٹ گورنر بہادر سے معزز و ممتاز ہوا۔"

★

حواشی

[illegible] صاحب [illegible] کے تحت تحریر فرمایا ہے کہ تاریخ لطیف [illegible] میں مرزا حاتم علی مہر [illegible] کھا گیا ہے گویا تسلیم سہسوانی بھی مہر کے شاگرد تھے " یہ بیان [illegible] واقعہ ہے۔ تسلیم سہسوانی نے شیخ علی بخش بیمار شاگرد مصحفی کے علاوہ کسی سے اصلاح نہیں لی۔ "تاریخ لطیف" راقم السطور کے پیش نظر رہی ہے۔ اس کی ترتیب کی تاریخ اختتام ۱۰ ذی الحجہ ۱۳۲۹ھ (۱۵ دسمبر ۱۹۱۱ء) ہے اس اعتبار سے اسے معاصر ماخذ کی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ اس کتاب میں مہر اور تسلیم کے درمیان رشتہ استادی و شاگردی کا ذکر مہر کی تاریخ وفات کے سلسلے میں آیا ہے جو اس طرح نقل کی گئی ہے ۔

"تاریخ وفات مرزا حاتم علی صاحب مہر تخلص استاد تسلیم سہسوانی از تسلیم سہسوانی"

حضرت مہر نے جو رحلت کی ۔۔ [illegible] ہو گیا [illegible]
بجھ گئی شمع بزم حسن سخن ۔۔ [illegible] کالی رات
فکر تاریخ میں تھے تسلیم ۔۔ تھی بجز آہ کے نہ لب پہ بات
کہہ دیا یک بیک [illegible] ۔۔ "غم مہر" تو ہے سال وفات (ص ۲۲۱)

مادہ تاریخ کی نوعیت، اشعار کی زبان اور [illegible] ہے۔ [illegible] پیش نظر راقم السطور کا خیال ہے کہ یہ قطعہ منشی رام سہائے تمنا بدایونی شاگرد مہر کا نتیجۂ فکر ہے۔ "تاریخ لطیف" کے مولف نے غالباً اپنے کسی [illegible] اس کے سرعنوان "از تسلیم شاگرد مہر" لکھا ہوا دیکھ کر بربنائے غلط فہمی اسے منشی امیر اللہ تسلیم سہسوانی سے منسوب کر دیا چونکہ منشی رام سہائے ایک غیر معروف شاعر ہیں اور تسلیم سہسوانی تاریخ گو کی حیثیت سے مشہور و معروف ہیں اس لیے اس قسم کی غلط فہمی قرین قیاس ہے ۔ [illegible] میر حسن علی ناظر محمدی اور [illegible] کے بارے میں یہ معلومات ڈاکٹر جی۔ ڈی بھٹنا گر کی انگریزی تصنیف "اودھ انڈر واجد علی شاہ" (ص ۸۳ اور ص ۲۱) پر مبنی ہیں انتظامی نقطۂ نظر سے محمدی کی اہمیت کے سلسلے میں کمال الدین حیدر کی "تواریخ اودھ" کی طرف بھی رجوع کیا جا سکتا ہے۔ [illegible] ساتھ انگریزوں کے ساتھ میم

ہمدردانہ سلوک کے سلسلے میں یہ وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے ان لوگوں کو لکھنؤ میں نہیں فرخ آباد میں اپنے ماموں کے گھر میں پناہ دی تھی "ایاغ فرنگستان" سے نقل کردہ اقتباس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ ان افراد کو لکھنؤ سے اپنے ساتھ لے کر سیدھے فرخ آباد پہنچے تھے جہاں ان کے ماموں مرزا حبیب علی نے انھیں حالات کے سازگار ہونے تک اپنے گھر میں چھپائے رکھا اور اس معاملے میں پوری راز داری برتی، اس کے بعد ان لوگوں کو بخیر و عافیت آگرہ پہنچا دیا گیا۔ مرزا حبیب علی کو چار سو روپے کا خلعت اسی راز داری کے سلسلے میں ملا تھا۔ شہ اس مصرع میں "شہر آشوب" کی بہ نسبت "شعر آشوب" زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ کتابت کی غلطی ہو۔ لفظ "بُنا" جرأت کی اس ہجو کے پہلے بند کے مصرع ثانی میں استعمال ہوا ہے۔ پورا بند حسب ذیل ہے ؎

اب ان کو دے شفق جو رخ شال تارنجی | بنا جو کرتے تھے لیل و نہار شطرنجی
یہ دیکھ کیوں کہ نہ الجھے بخار زتن جی | ظہور حشر نہ ہو کیوں کہ کلچڑ ماہی گنجی

حضور بلبل بستاں کرے نوا سنجی



اپنی بات ——— (صفحہ ۲ کا بقیہ)

زبردست خشک سالی کے پیش نظر کسانوں کی معاشی حالت سدھارنے کی غرض سے ۸۱-۱۹۸۰ء میں اناج کی پیداوار کا نشانہ ۳۳۰ لاکھ میٹرک ٹن رکھا گیا ہے۔ اس سال ۲٫۹۰ لاکھ ہیکٹیر فاضل رقبہ میں آبپاشی کی سہولت مہیا کرنے کی تجویز ہے۔ سیلاب کی روک تھام سے متعلق کاموں کے لیے اس سال ۲۲٫۵۰ کروڑ روپیہ کا بندوبست کیا گیا ہے۔ بجلی کی پیداوار کے لیے ۲۹۰ کروڑ روپیہ کے مصارف اور ۳۴۴ میگا واٹ مزید بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ ضروری اشیا کی قیمتوں میں اضافہ کی روک تھام کے لیے گیہوں، چاول، شکر، خوردنی تیل وغیرہ کی تقسیم کے لیے مزید دکانیں قائم کی جائیں گی۔ ان اشیا کی فراہمی کے لیے نئے گودام بھی قائم کیے جائیں گے۔ تمام لیڈ بنکوں نے اپنے اپنے ضلع کے لیے سال ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۲ء تک کی مدت کے لیے تین سالہ قرض اسکیمیں تیار کی ہیں —— ان اسکیموں کے تحت تقریباً ۱۲۰۰ کروڑ روپیہ کا قرض تقسیم کرنے کا نشانہ ہے جس کا ۸۰ فیصد زراعت اور دیہی صنعتوں سے متعلق پروگراموں میں لگایا جائے گا۔ قدرتی آفات کے سلسلے میں تقاوی تقسیم کرنے کے لیے سال ۸۱-۱۹۸۰ء میں ۵٫۳۵ کروڑ روپیہ کا بندوبست کیا گیا ہے۔ ——— ایڈیٹر

جاوید اکرم
۱/۱۲۰ سول لائنس۔ فتح گڑھ۔ یوپی

غزل

سچائی کی تلخی ہے ہم سادہ بیانوں میں
پتھر کی ہیں بنیادیں شیشے کے مکانوں میں

جو چاہو وہ لے جاؤ احساس کی نگری سے
خوشیاں بھی ہیں آنسو بھی آنکھوں کی دکانوں میں

تم دیپ محبت کے پلکوں پہ سجا لینا
بٹ جائے نہ یہ دنیا تفریق کے خانوں میں

یہ بے سر و سامانی تحریر بھی سنتے ہیں
کچھ تیر نئے جوڑو بوسیدہ کمانوں میں

ہم اہل سخن دورِ حاضر کی نمائش میں
ہر عیب چھپا جائیں سنگیت کی تانوں میں

اس راہ محبت سے جاوید گریز اچھا
ٹکراؤ گے بھٹکو گے سنسان چٹانوں میں

غزلیں

ابو محمد سحرؔ
۳۹ مالویہ نگر ۔ بھوپال ۳

مرے دل سے کتنے قریب تھے تری رہ گزار کے فاصلے
تجھے دور مجھ سے نہ رکھ سکے یہ ترے دیار کے فاصلے

تو غزالِ ملکِ ختن سہی میں تری تلاش میں جب چلا
مرے ہر قدم پہ سمٹ گئے ترے مرغزار کے فاصلے

جو خوشی رہی تو یہی خوشی جو الم رہا تو یہی الم
کبھی وصلِ یار کی قربتیں کبھی ہجرِ یار کے فاصلے

تری ایک وعدہ خلافی نے دیئے داغِ دل مجھے اس قدر
غمِ بے شمار میں کھو گئے غمِ انتظار کے فاصلے

کہیں سرنگوں ہے کوئی کلی کہیں پھول نقشِ فسردگی
یہ خزاں رسیدہ مرا چمن یہ بھری بہار کے فاصلے

نہ خیالِ غنچۂ آرزو نہ دماغِ جلوۂ رنگ و بو
یہ ہے زندگی مرے چار سو کہ ہیں ریگ زار کے فاصلے

غمِ عشق ہو کہ غمِ جہاں نہیں کوئی اپنا مزاج داں
کسی ہم سخن کی یہ دوریاں کسی غم گسار کے فاصلے

میں اسیرِ جذبِ دروں سحرؔ میں بتاؤں گر ہو مجھے خبر
کہ جنوں نے طے کیے کس طرح غمِ روزگار کے فاصلے

کمالؔ جائسی
کرنیل گنج ۔ کانپور

کبھی رُت جو تیرے خیال کی چمنِ سخن سے چلی گئی
تو بہارِ حسنِ کلام بھی مرے شہرِ فن سے چلی گئی

کروں طنز اہلِ حرم پہ کیا یہ وہ فتنہ کار زمانہ ہے
کہ بتوں کی یاد بھی روٹھ کر دلِ برہمن سے چلی گئی

تو ستم کو رنگِ کرم نہ دے نہ بہل سکے گا جنوں مرا
وہ ادائے بوئے وفا جو تھی ترے پیرہن سے چلی گئی

اسے قید کر نہ سکی نظر [illegible] آرزو کے حصار میں
ترے رُخ کی آئی نئی سحر بڑے بانکپن سے چلی گئی

جو چھپی تھی دامنِ ماہ سے جو اڑی تھی رُخِ بہار سے
وہ ترے خیال کی چاندنی روشِ چمن سے چلی گئی

چلو زلف و رُخ کی بہار کو رہِ آرزو سے پکار لوں
کہ پلٹ کے پھر نہ یہ آئے گی جو مرے وطن سے چلی گئی

بڑھیں دردِ عشق کی مستیاں جو شکستِ دل کی فضا لیے
وہ غرورِ ناز کی تازگی رخِ گلبدن سے چلی گئی

کہوں کیا کمالؔ کہ آرزو مرے دل کا ساتھ نہ دے سکی
یہ جس انجمن میں جواں ہوئی اسی انجمن سے چلی گئی

اطہار شامانی

آزادی کی دیوی

ادرِ ہند کی منھ بولتی تصویر ہے تو
ماگتا خواب ہے، بیداری تعبیر ہے تو
پھول سی نرم ہے، نازک ہے محبت کے لیے
اور نفرت کے لیے برہنہ شمشیر ہے تو
وستوں کے لیے مرہم ہے تری میٹھی نظر
شمنوں کے لیے اک زہر بجھا تیر ہے تو
حامیٔ امن و اماں کے لیے پیغامِ حیات
شر پسندوں کے لیے آہنی زنجیر ہے تو
ندگی بخش اک نغمہ ہے غریبوں کے لیے
ل زر کے لیے اک نالۂ دلگیر ہے تو
غیر کے واسطے سرحد پہ ہے چمن دیکھا
شانۂ دوست پہ اک زلفِ گرہ گیر ہے تو
عقل و ہمت پہ تری نور جہاں ناز کرے
عدل و انصاف میں اک ثانیٔ جہانگیر ہے تو
گتھیاں سلجھی ہیں، سلجھیں گی ترے ہی نام سے
جس پہ تقدیر کا سایہ ہے وہ تدبیر ہے تو
سازشیں لاکھ ہوں تخریبِ وطن کی لیکن
ل کو تجھ پہ ہے یقیں جذبۂ تعمیر ہے تو
تیری ہستی سے ہیں وابستہ امیدیں کتنی
دل کی دھڑکن ہے غمِ قوم کی تاثیر ہے تو
جہل، بیکاری، غریبی کو مٹانا ہے تجھے
ناظمِ نظمِ وطن! ہند کی تقدیر ہے تو
جانِ "گاندھی" کی ہے دراصل تو "نہرو" کا دل
ناز ہے جس پہ مصور کو وہ تصویر ہے تو
خود ہی مٹ جائیں گے اظہار مٹانے والے
مٹ نہیں سکتی، مقدر کی وہ تحریر ہے تو

سعید تابش
اسلامیہ کالج۔ لال باغ۔ لکھنؤ

آزادی

رات تاریک تھی زنداں میں وہ سناٹا تھا
ایک زنجیر کھڑکنے کی بھی آواز نہ تھی
دم بخود، مہر بہ لب بیٹھے تھے قیدی سارے
عزم زندہ تھا مگر طاقتِ پرواز نہ تھی

چند دیوانے اٹھے پرچمِ جرأت لے کر
جن کی للکار سے زنداں کی فضا جاگ اٹھی
جب شہیدوں کا لہو خاکِ چمن نے پایا
کھل اٹھے پھول، گلستاں کی ہوا جاگ اٹھی

دیکھ کر قافلۂ نورِ سحر کے تیور
رات پھر رات تھی گھبرا گئی، جی چھوڑ دیا
مشعلیں عزم و یقیں کی جو ضیا بار ہوئیں
خوف سے ظلمتِ حالات نے دم توڑ دیا

دیکھتے دیکھتے زنجیرِ غلامی ٹوٹی
صبحِ آزادیٔ جمہور ہوئی جلوہ فگن
بامِ مشرق پہ نئی شان سے چمکا سورج
اک نئے طرز پہ ہونے لگی تعمیرِ وطن

سید نجم الدین نقوی
۱۲۔ اے۔ قلعۂ معلیٰ۔ رام پور
(یو۔ پی)

سجاد ظہیر — کچھ یادیں

سید سجاد ظہیر، سر سید وزیر حسن مرحوم کے چوتھے نامور فرزند تھے۔ ان کی عرفیت بنّے تھی۔ اس لیے اُن کے قریبی دوست اور ساتھی اور اُن کے چھوٹے بھی اُنھیں اسی نام سے یاد کرتے۔ کوئی صرف بنّے کہتا تھا اور کوئی بنّے بھائی۔ میں نے مرحوم کو پہلے پہل الٰہ آباد میں دیکھا۔ یہ غالباً ۳۶۔۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ یہ دور سارے ہندستان میں بالعموم اور الٰہ آباد میں بالخصوص سیاسی بیداری کا دور تھا۔ آنند بھون اور سوراج بھون وہ مرکز تھے جہاں ہندستان کا دل دھڑکتا تھا۔

آنند بھون نہرو خاندان کی جائے قیام تھی اور سوراج بھون میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا دفتر تھا۔ اُن دنوں الٰہ آباد میں آئے دن سیاسی جلسے، جلوس اور ہنگامے ہوتے رہتے تھے۔ آنند بھون اور سوراج بھون الٰہ آباد یونی ورسٹی سے بالکل متصل تھے۔ یہ دونوں جگہیں، دانشوروں کا مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ کالج اور یونی ورسٹی کے طلبا کی آماجگاہ بھی تھیں۔ انھیں مقامات پر سجاد ظہیر صاحب مجھے نظر آئے۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ، متوازن قد، دلکش پیشانی انھیں، کے ساتھ میں نے کئی اور لوگوں کو بھی دیکھا۔ ان میں ڈاکٹر رام منوہر لوہیا، ڈاکٹر کنور محمد اشرف اور ڈاکٹر زیڈ۔ اے۔ احمد تھے۔ بنّے بھائی، ڈاکٹر احمد اور ڈاکٹر اشرف اپنے سیاسی عقائد میں کمیونسٹ تھے، لوہیا صاحب سوشلسٹ۔ لیکن اُس وقت یہ لوگ کانگریس سے علاحدہ نہیں ہوئے تھے، اور کانگریس سوشلسٹ کے نام سے جانے جاتے تھے۔

بنّے بھائی کو شروع شروع میں دور سے دیکھتا رہا۔ قریب تو کبھی نہ آسکا مگر قریب ہونے کی خواہش ضرور دل میں رہی۔ مرحوم، مقرر تھے اور بہت اچھے مقرر مگر خطیب نہ تھے۔ تقریر کا انداز دانشوری لیے ہوتا تھا۔ اس میں جذباتیت نہیں ہوتی تھی۔ اُن کی باتیں خواص پسند تھیں، اگرچہ انھیں گفتگو عوام سے تھی۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ' ۱۹۳۵ء کے تحت ہندستان کو برٹش گورنمنٹ نے صوبائی خود مختاری دی۔ کانگریس نے انتخابات لڑے۔ پنڈت نہرو کے طوفانی دوروں نے کانگریس کے سر فتح کا سہرا باندھ دیا۔ سوراج بھون میں کئی دن تک اس پر بحث ہوتی رہی کہ کانگریس پارٹی کو اسمبلیوں میں داخل ہو کر حکومت بنانا چاہیے یا نہیں۔ ان بحثوں میں بنّے بھائی نے بھی حصہ لیا۔ وہ پنڈت نہرو کے ہم خیال تھے اور حکومت بنانے کے مخالف۔ اُن کا کہنا تھا کہ انتخابات سے یہ ثابت ہو گیا کہ ہندستان کے عوام کانگریس کے ساتھ ہیں، لیکن وزارت سازی اور حکومت کے کاموں میں اُلجھنے سے آزادی کی جنگ سرد پڑ جائے گی۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم بھی اسی نقطۂ نظر کے حامل تھے۔ مجھے مولانا آزاد کی وہ تقریر دل پذیر آج بھی یاد آتی ہے جو اُنھوں نے اسی موضوع پر پرشوتم داس پارک میں کی تھی اور ارشاد عظیم آبادی کے اِس شعر کو عنوانِ کلام بنایا تھا:

تمناؤں میں اُلجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

مولانا آزاد نے صوبائی خود مختاری کو شیشے کا کھلونا بتایا اور فرمایا کہ اگر ہم اس کھلونے سے کھیلنے لگے تو ہمارے ہاتھ زخمی ہو سکتے ہیں۔ آزادی کے لیے جنگ کرتے رہنے کا جذبہ کمزور پڑ سکتا ہے۔ اس جلسے میں بھی میں نے سجاد ظہیر صاحب کو اپنے نوجوان ساتھیوں کے

ساتھ دیکھا۔ وہ انگلستان سے بیرسٹری پاس کرکے نئے نئے آئے تھے۔ اُن کے سب سے بڑے بھائی سید علی ظہیر صاحب اودھ چیف کورٹ کے نامور بیرسٹر تھے اور اُن کے والد چیف جج سے سبک دوش ہونے کے بعد الہ آباد ہائی کورٹ میں وکالت کر رہے تھے، اور سول لائنس کے ایک وسیع و عریض بنگلے میں مقیم تھے۔ سجاد ظہیر صاحب انھیں کے ساتھ فروکش تھے۔ کبھی کبھی الہ آباد یونی ورسٹی میں بھی آتے تھے۔ یہی زمانہ تھا جب اُن کی قیادت میں کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد پڑی اور آئے دن الہ آباد میں اِس انجمن کے جلسے ہونے لگے۔ انجمن کی جانب سے اُس کے اغراض و مقاصد پر مشتمل جو اعلان نامہ شائع ہوا تھا اُس پر منشی پریم چند، ڈاکٹر عبدالحق، جوش ملیح آبادی، ڈاکٹر عابد حسین اور نیاز فتح پوری جیسے بزرگ اور مستند عالموں کے بھی دستخط تھے اور یہ کارنامہ بنّے بھائی کا تھا۔ ۱۹۳۶ میں لکھنؤ کے رفاہ عام کلب میں انجمنِ ترقی پسند مصنفین کی جو کانفرنس منعقد ہوئی اُس کی صدارت منشی پریم چند جیسے عظیم ادیب نے کی اور اپنے خطبۂ صدارت میں ان ادیبوں سے پوری پوری ہمدردی ظاہر کی غالباً اسی کانفرنس کے بعد اُن کا وہ لافانی شاہکار سامنے آیا جو کفن کے نام سے لکھا گیا تھا۔ اس افسانے کے مطالعہ سے اندازہ ہو جاتا تھا کہ منشی پریم چند سماجی اور اقتصادی تصورات میں ترقی پسندوں سے کتنے قریب ہو گئے تھے۔

ایک صبح الہ آباد کے ایک روزنامے میں ایک خبر پڑھی کہ سجاد ظہیر گرفتار کر لیے گئے۔ یہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ پھر یہ خبر بھی پڑھنے کو ملی کہ وزیر حسن صاحب نے کلکٹر سے کہہ کر انھیں رہا کرا دیا، اور پھر اُس کے بعد سجاد ظہیر صاحب کا ایک بیان شائع ہوا کہ وہ اپنے سیاسی عقائد میں عملاً راسخ رہیں گے۔ صرف یہی ایک واقعہ مرحوم کے ارادے کی پختگی اور اُن کے خلوص کا آئینہ دار ہے۔ چنانچہ وہ جیل سے باہر آنے کے بعد اُسی طرح برٹش گورنمنٹ کے خلاف برسرِ پیکار رہے جس طرح اس سے پہلے تھے۔ اُن کا دماغ ایک دانش ور کا دماغ اور دل ایک باغی کا دل تھا۔ دل و دماغ کی آویزش سے نہیں بلکہ اُن کی متوازن آمیزش سے سجاد ظہیر کی شخصیت کی تشکیل ہوئی تھی اور اسی سے اُنھوں نے اپنا لائحۂ عمل بنایا تھا۔

وہ پھولوں کی سیج پر پلے تھے مگر ہوش سنبھالتے ہی کانٹوں کی راہ اختیار کی۔ ایسی راہ جس میں دور دور آرام، اطمینان اور سکون کا سراب بھی نہیں دکھائی دیتا تھا۔ ساری عمر مشکلات کا سامنا کرتے رہے۔ چاہتے تو باپ کی سرپرستی میں الہ آباد ہائی کورٹ میں بیرسٹری کرتے یا شہر نگاراں میں رہ کر بڑے بھائی کی رہبری میں وکالت کرتے۔ اپنی خداداد ذہانت اور بزرگوں کی رہبری میں اپنے پیشے کو زینت بخشتے۔ بنگلے بنواتے، کاریں خریدتے، عمدہ کپڑے پہنتے اور لذیذ کھانے کھاتے۔ مگر یہ سب اُسی وقت تو ممکن تھا جب اُن کے اندر کا باغی دولت و ثروت اور ذوقِ تن آسانی سے سمجھوتہ کرنے دیتا۔ مگر بقول جوشؔ،

جب بلاتے ہیں فرائض دردناک آواز سے
سو رما منہ پھیر لیتے ہیں حریم ناز سے

میں نے مرحوم کو کسی قدر قریب سے اس وقت دیکھا جب اُن کی شادی رضیہ آپا سے ہوئی۔ مرحومہ اجمیر کے خان بہادر سید رضا حسین کی بڑی بیٹی تھیں۔ اور سر سید فضلِ علی مرحوم اُن کے خالو تھے۔ رضا حسین مرحوم میرے عمِّ محترم پروفیسر سید ضامن علی صاحب مرحوم بانی و صدر شعبۂ اردو، الہ آباد یونی ورسٹی کے دوستوں میں تھے۔ شادی کے بعد رضیہ آپا نے الہ آباد یونی ورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کرنے کے لیے داخلہ لیا۔ یہ بات ۴۱-۱۹۳۹ء کی ہے۔ میں بھی اُسی کلاس میں پڑھتا تھا۔ سجاد ظہیر صاحب اور رضیہ آپا کئی بار ضامن صاحب کے یہاں آئے، کبھی کھانے پر، کبھی یوں ہی ملنے کے لیے۔ ایک بار نہایت دلچسپ لطیفہ رہا۔ خان بہادر رضا حسین کو بڑی فکر تھی کہ کسی طرح اُن کے داماد کے سیاسی اور مذہبی خیالات بدل جائیں۔ چنانچہ ضامن عباس صاحب کے یہاں ایک ڈنر میں سجاد ظہیر صاحب مدعو کیے گئے، اور اس عہد کے مشہور خطیب حکیم سید مرتضیٰ حسین صاحب کو بھی دعوت دی گئی۔ حکیم صاحب ضامن صاحب کے ہم زلف تھے اور بہت اعلا پایہ کے ذاکر۔ وہ اپنی مجلسوں میں توحید اور نبوت پر چار چار گھنٹے مدلل تقریر کرتے تھے۔ توحید اور رسالت اُن کے مخصوص موضوعات تھے۔ اُس دن حکیم صاحب اور بھی

تیاری کے ساتھ آئے۔ رضیہ آپا تو عورتوں کے ساتھ شریکِ طعام رہیں۔ بنّے بھائی نے ہمارے ساتھ کھانا کھایا۔ کھانے پر اور کھانے کے بعد بہت دیر تک حکیم صاحب تبلیغ فرماتے رہے اور سجاد ظہیر کو مخاطب کرتے رہے۔ ہر ہر نکتے پر بنّے بھائی گردن ہلاتے رہے، مسکراتے رہے، "جی ہاں" اور "بے شک" کہتے رہے۔ ضامن صاحب، حکیم صاحب اور رضا حسین صاحب کی مسرتوں کی تو کوئی حد نہ تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اُن کا مشن کامیاب رہا۔ جب بنّے بھائی اور رضیہ آپا موٹر میں بیٹھ کر جانے لگے تو میں نے کہا کہ "بنّے بھائی، اب تو آپ بھی صراطِ مستقیم پر آگئے۔" ہنسنے لگے اور بس اتنا کہا کہ میں اپنے بزرگوں کے سامنے کیا زبان کھولتا۔

یہ واقعہ ایک اعتبار سے سبق آموز ہے۔ ہم اپنے خیالات و نظریات میں چاہے کتنے انقلابی ہوں مگر اپنے مخالفوں سے گفتگو کرتے وقت نہ تو شدت اختیار کرنا چاہیے نہ جارحیت، اور جب بات بزرگوں اور خوردوں کے درمیان آن پڑے تو خاموشی ہی بہتر ہوتی ہے۔

زمانہ طالب علمی میں میں اردو ایسوسی ایشن کا سکریٹری بھی رہا۔ اُسی زمانے میں الٰہ آباد میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہو رہا تھا۔ مجھے سوجھی کہ مولانا آزاد کو تقریر کے لیے مدعو کیا جائے۔ آنند بھون وہاں سے چند قدم پر تھا۔ مگر سوال تھا کہ رسائی کیسے ہو۔ رضیہ آپا نے کہا: چلو، میں چلتی ہوں۔ پنڈت جی سے سفارش کرا دوں گی۔ ہم لوگ اُن کی کار میں بیٹھ کر آنند بھون پہنچے کار برساتی میں رُکی اور ہم لوگ چق اُٹھا کر ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے۔ پوری کوٹھی لذیذ غذاؤں کی خوشبو سے معطر ہو رہی تھی۔ دل چاہا کہ ایک پلیٹ لے کر پینٹری میں پہنچ جاؤں مگر حدِ ادب مانع ہوئی۔ اتنے میں ایک گوشے سے پنڈت جی برآمد ہوئے۔ ہم، تعظیم کے لیے کھڑے ہوگئے۔ پنڈت جی نے رضیہ آپا سے آنے کا سبب دریافت کیا تو اُنھوں نے مجھے بلوایا اور (حاضری) کا سبب بتایا۔ وہ مسکرائے اور فرمایا کہ میں مولانا تک آپ کی درخواست پہنچائے دیتا ہوں اور پھر ایک کتاب اُٹھا کر مجھے دیتے ہوئے ہنسے اور کہا کہ جب تک تم اسے پڑھو۔ یہ کتاب للی پُٹ مینس کی کہانی تھی۔ میرا قد اس وقت بھی لگ بھگ چھ فٹ رہا ہوگا۔ پنڈت جی کا یہ شستہ مذاق آج بھی یاد آتا ہے۔ چند لمحوں بعد پنڈت جی نے آکر مطلع کیا کہ مصروفیت مانع ہے۔ مولانا آزاد ہماری استدعا نہیں قبول کر سکتے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ملک تقسیم ہوا۔ کچھ دنوں بعد معلوم ہوا کہ سجاد ظہیر کو اُن کی پارٹی نے سرحد پار روانہ کر دیا تاکہ وہ وہاں پارٹی کی تنظیم کریں۔ بیوی بچے یہیں رہے۔ وہاں وہ اور یہاں یہ غمِ جاناں اور غمِ دوراں کا مقابلہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک مبینہ سازش کے الزام میں سجاد ظہیر کو پاکستان میں گرفتار کر لیا گیا۔ اُن کے ساتھ فیض بھی اسیر ہوئے۔ کچھ دنوں بعد رہائی نصیب ہوئی تو اپنا مولد اور وطن یاد آیا۔ ہندستان آئے اور پنڈت نہرو کی دریا دلی کے باعث ایک بار پھر یہاں کے شہری ہوگئے۔ سُننے میں آیا کہ ہندستان کا محکمۂ داخلہ سجاد ظہیر کو شہریت دینے پر تیار نہ تھا۔ مگر پنڈت جی کی ذاتِ گرامی آڑے وقت میں کام آئی۔

بنّے بھائی سے آخری ملاقات ۱۳ اگست ۱۹۷۲ء کو لکھنؤ کاؤنسل ہاؤس میں ہوئی جہاں گجرال اردو کمیٹی کی ایک نشست میں بیان دینے کے لیے مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا۔ بنّے بھائی مرحوم بھی اِس کمیٹی کے ممبر تھے۔ بڑے بڑے لوگ جمع تھے۔ جب جلسہ ختم ہوا تو وہ خود میری طرف بڑھے۔ میں نے ادب سے جھک کر سلام کیا۔ وہ بغل گیر ہوئے اور میری پیشانی چومی اور نہایت التفات سے خیریت پوچھی۔ اس منظر کو بعض لوگوں نے تعجب سے دیکھا۔ یہ ملاقات تقریباً تیس سال بعد ہوئی تھی۔ ہم دونوں اپنے خدوخال کے لحاظ سے بہت بدل چکے تھے۔ وہ بہت مصروف تھے۔ دوستوں اور قدردانوں میں گھرے ہوئے۔ پھر بھی میں اُنھیں یاد رہا۔ وہ بے حد محبت سے ملے۔ سپاس سے دل آج تک لبریز ہے۔

کچھ برس پہلے ایک صبح اخبار اُٹھایا تو دیارِ غیر میں اچانک رحلت کی خبر پڑھ کر دل دھک سے ہوگیا۔ کسی ادبی کانفرنس میں گئے تھے۔ وہیں دل کا دورہ پڑا۔ گئے تھے ہنستے بولتے اور واپس آئے خاموش۔ اور ایسے خاموش کہ پھر کبھی نہ بولے۔ عاشق کا جنازہ تھا، شان سے آیا اور شان سے اُٹھا، شان سے اُٹھنا بھی چاہیے تھا۔ زندگی بھر یک رنگ رہے۔ وطنِ عزیز کے وفادار اور اپنے سیاسی عقائد میں

مخلص۔ بقول انیس ع

جس کے ہیں بس اُنھیں کے ہیں جدھر ہیں بس اُدھر ہیں

ہجر مجر، کو دیھاند ان کا شعار نہ تھا۔ راہ پُر خار تھی۔ مگر مخمل اور لالہ زار سمجھتے ہوئے گزر گئے۔

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

مرحوم کی ادبی زندگی کا آغاز غالباً ۱۹۳۱ء سے ہوا جب وہ دورانِ تعلیم لندن سے کچھ دنوں کے لیے وطن آئے تھے۔ اُسی زمانے میں افسانوں کا ایک مجموعہ "انگارے" کے نام سے شائع کیا جس میں پروفیسر احمد علی، سجاد ظہیر، محمود الظفر، ڈاکٹر رشید جہاں وغیرہ کے افسانے شامل تھے۔ ان افسانوں میں ایسی روایات اور اقدار پر سخت چوٹیں تھیں جو سماج کے بزرگ طبقے کو بے حد عزیز تھیں۔ نتیجے میں سخت احتجاج ہوا اور کتاب ضبط ہو گئی۔ ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین قائم کی، خود اُس کے جنرل سکریٹری اور روحِ رواں رہے۔ اور ملک کے طول و عرض میں دورے کیے، زعمائے ادب سے ملے، اُن کی ہمدردیاں حاصل کیں۔ لکھنؤ سے نیا ادب نکالا۔ جس میں علی سردار جعفری، مجاز، سبطِ حسن، ڈاکٹر علیم، ڈاکٹر رشید جہاں، احتشام حسین وغیرہ اور خود اُن کے مضامین شائع ہوتے رہے۔

مرحوم نے نوجوان ادیبوں، خوش فکر شاعروں اور دقیقہ رس ناقدوں کی ایک فوج سی تیار کر دی جن میں سے ہر ایک نے آگے چل کر امتیازی مقام حاصل کیا۔ حالی کی طرح سجاد ظہیر نے بھی اردو تنقید کو ایک نیا موڑ دیا۔ اگر مرحوم کو اردو تنقید میں جدلیاتی نقطۂ نظر کا بانی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اِس نقطۂ نظر کے سب سے بڑے حامی عظیم ناقد پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم تھے جن کے متعلق مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کی رائے تھی کہ تنقید کا یہ دور، دورِ احتشامی کے نام سے یادگار رہے گا۔

بنّے بھائی کی تصنیفات میں "لندن کی ایک رات" "حافظ" "روشنائی" "نقوشِ زنداں" اور "پگھلا نیلم" وغیرہ ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے موضوع، اُسلوب اور طرزِ فکر کے اعتبار سے نہایت اہم ہے۔ لندن کی ایک رات ناول ہے، روشنائی ترقی پسند ادب کی تاریخ۔ "نقوشِ زنداں" مرحوم کے خطوط کا مجموعہ ہے جو اُنھوں نے جیل سے اپنی شریکِ حیات کو لکھے تھے۔ حافظ خواجہ حافظ پر ایک عمدہ تصنیف ہے اور پگھلا نیلم آزاد نظموں کا مجموعہ ہے جو جدت اور اظہارِ خیال کی ندرت کا نمونہ ہے۔ اِن کتابوں کے علاوہ بہت سے مضامین ہیں جو "نیا ادب" اور دوسرے رسائل میں بکھرے ہوئے ہیں۔ انگریزی کتابوں کے ترجمے اور صدارتی خطبے بھی ہیں۔

اگر اردو کا کوئی ریسرچ اسکالر مرحوم پر تحقیق کرنے بیٹھ جائے تو نہایت عمدہ اور کارآمد تحقیقی دستاویز تیار ہو سکتی ہے۔ کاش ایسا ہو سکے!

مومن غازیپوری

جشنِ عید

روزہ داروں کے لیے بخشش و انعام ہے عید
لمحہ لمحہ ہے مسرت سحر و شام ہے عید
آج ہر سانس میں خوشبو سی بسی جاتی ہے
ہر روش جشن کا ساماں ہے ہر اک گام ہے عید
رکھ کے روزے جو رہے حکمِ خدا پر پیاسے
ان کی خاطر مے عرفاں سے بھرا جام ہے عید
خیر و برکت کا ہے آغاز تو اے ماہِ صیام
ساعتیں تیری سعادت ترا انجام ہے عید
حق کا انعام رسولِ عربی کا مژدہ
اہلِ ایماں کے لیے تحفۂ اسلام ہے عید
دل میں کینہ نہ رہے آؤ گلے سے لگ جاؤ
اتحاد اور مساوات کا پیغام ہے عید
عید مومن کے لیے فضلِ خداوندی ہے
دل کے اظہارِ مسرت کا حسیں نام ہے عید

کیفؔ احمد صدیقی
نمبر ۹۰ شیخ سرائے ۔ سیتاپور

میرا ہندوستان

اکتا کا چمن میرا ہندوستاں
میرا پیارا وطن میرا ہندوستاں
اس میں ہندو ہیں مسلم ہیں عیسائی ہیں
لیکن اک دوسرے کے سبھی بھائی ہیں
پیار کی انجمن میرا ہندوستاں
میرا پیارا وطن، میرا ہندوستاں
متحد ہیں سب اہلِ وطن اس طرح
مختلف رنگ کی اک دھنک جس طرح
امن کا بانکپن میرا ہندوستاں
میرا پیارا وطن، میرا ہندوستاں
اس میں ایسے بھی انسان پیدا ہوئے
لوگ سمجھے کہ بھگوان پیدا ہوئے
رام و لچھمن کا بن میرا ہندوستاں
میرا پیارا وطن میرا ہندوستاں
ہر تمدن کا ہے جنم داتا یہی
راہِ تہذیب سب کو دکھاتا یہی
مرکزِ علم و فن میرا ہندوستاں
میرا پیارا وطن میرا ہندوستاں
سور و تلسی و ٹیگور کی سرزمیں
کیفؔ! اقبالؔ و غالبؔ بھی سنتے نہیں
بزمِ شعر و سخن میرا ہندوستاں
میرا پیارا وطن میرا ہندوستاں
اکتا کا چمن میرا ہندوستاں

مہدی پرتاپ گڑھی

اعتراف

(جہیز کی لعنت سے متاثر ہوکر)

اے مرے آنگن کی مینا
گیت تیرے گونجتے ہیں آج بھی میرے چمن میں
اے مرے گھر کی چمبیلی
تیری خوشبو سے معطر ہیں در و دیوار اب تک
میں نے چاہا تھا شفق کی سب گلابی
ماہِ تاباں کے رخِ انور کی چاندنی
آبشاروں کا ترنم
کھلتی کلیوں کا تبسم
زیست میں تیری رچا دوں
میں نے چاہا تھا کہ پھولوں، تتلیوں اور جگنوؤں سے
تیرے آنچل کی کروں تزئین ہر دم
میں نے چاہا تیری صبحِ زندگی میں
لاکے سب قوسِ قزح کے رنگ بھر دوں
میں نے چاہا تھا کہ تیری زیست ہو اتنی مثالی
تاکہ تجھ کو دیکھ کر یاد آئیں
رضیہ، چاند بی بی اور سیتا
یہ مگر کس کو خبر تھی
میری ان اونچی اڑانوں کا تصور
جاگتی آنکھوں کے سپنے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے
کوئی بھی اعلیٰ شے تیرے مقدر میں نہیں ہے
آئی ہے تیرے مقدر میں شبِ سخت وگراں کی اک سیا
کیوں کہ میں علم و ہنر تہذیب و دانش
کے گراں مایہ خزانے دے کے تجھ کو
کار، بنگلہ، ریفریجریٹر، چیک بکیں، سونے کے زیا
دے نہ پایا
کیونکہ میں تھا صرف اک نادار شاعر

سید محمد ہاشم
شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

محمد علی جوہر کی شاعری

محمد علی جوہر کا شمار صف اول کے شعرا میں نہیں ہوتا ۔ خود انھوں نے اپنے بارے میں لکھا ہے " یہ (میرے اشعار) صرف اپنی دست افشانی اور پاکوبی کے لیے ہیں، انھیں لٹریچر سے کیا تعلق "۔ کچھ اسی طرح کی بات تو اقبال نے بھی کہی تھی۔

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ — کہ میں ہوں محرم راز درون میخانہ

اس کے باوجود اقبال صف اول کے شاعر ہیں ۔ اقبال نے تو شاعری کی طرف واقعی سنجیدگی سے توجہ کی تھی جبکہ جوہر صاحب فرماتے ہیں :

" لکھنے کے لیے بیٹھتا ہوں نہ کوشش کرتا ہوں، مگر جب طبیعت پر خود ہی کسی بیرونی تحریک کا غلبہ ہوتا ہے تو بغایت مجبوری کہہ لیتا ہوں اور دل کو تسکین دے لیتا ہوں "

یہ بیرونی تحریک کیا ہے ؟ یہ وہی چیز ہے جس سے محمد علی کی شخصیت عبارت ہے ۔ یعنی مذہب سے عشق اور انگریز سے نفرت ان ہر دو قسم کے جذبات کے ساز کے تاروں کو جب کسی بیرونی مضراب سے چوٹ پہنچتی ہے تو " بغایت مجبوری " محمد علی کی شاعری وجود میں آتی ہے ۔

جوہر کی شاعری خالص صحافتی ہے، خالص سیاسی بھی خالص مذہبی بھی اور خالص روایتی بھی ۔ مذہبی اور سیاسی رنگ جب روایتی شاعری کو تقویت پہنچاتے ہیں تو ان کے یہاں اچھی شاعری وجود میں آتی ہے ۔ لیکن یہ حصہ بہت کم ہے ۔ اس کے علاوہ یہ میر، غالب، اقبال، انیس، اور آتش کی طرح ادب میں کسی بڑے انقلاب کا سبب یا پیش خیمہ ثابت نہیں ہوئے ۔ اس لیے جوہر دوسرے درجہ کے شاعر ہیں ۔ اگرچہ حیرت انگیز حد تک کبھی کبھی وہ کلاسکی حدود کو بھی پار کر لیتے ہیں ۔ وہ میر و فانی، درد و شاد، امیر و داغ، آتش و سودا، اقبال و یگانہ اور مومن و حسرت کی جھلک دکھانے کی بھی صلاحیت رکھتے ہیں، غالب کی ناکام تقلید بھی ان کے حصہ میں آئی ہے، فارسی کلاسکس میں خاقانی اور جدیدیوں میں بہار کا مزاج بھی ان کے یہاں جلوہ افروز ہے، کیٹس اور شلی، پنت، گیت، نرالا، بہاری اور پرساد، ملیالم کے جی شنکر کروپ اور ولتول نارائن مینون جیسے شعرا سے بھی جوہر کو مناسبت ہے ساتھ ہی ظفر علی خاں مرحوم کی شاعری کا رنگ بھی ان کے کلام میں جھلکتا ہے اس لیے ان کی شاعری کو خانوں میں تقسیم کر کے سمجھنا نامناسب نہیں ۔

ایک قسم کی شاعری خالص صحافتی رنگ میں ہے جس میں وقتی ہیجان کی منظوم لفظی تصویر کھینچ دینا ہی مقصود اول قرار پایا ہے ۔ اس میں ہمیشگی کی تلاش بے سود ہے ۔ عمر سے اس کا کوئی تعلق نہیں ۔ یہ ۱۸۹۸ء، ۱۹۱۷ء کی بھی ہو سکتی ہے اور ۱۹۲۹ء و ۱۹۳۰ء کی بھی ۔ یہاں قافیے اور ردیفیں بھی مل جائیں گی، تلمیحیں بھی اور جور و ستم کا گلہ بھی ۔ وفا اور جفا جیسے الفاظ بھی مل جائیں گے اور بعض پرانی باتیں بھی ۔ لیکن ان کی حیثیت محض تاریخی ہے اور تاریخی سیاق و سباق میں یہ ایک خاص اثر و کیفیت پیدا کر سکتی ہے اور بس ۔ جس طرح ایک دن کا اخبار دوسرے دن ردی کے انبار میں اضافہ کے کام آتا ہے، جوہر کی تاریخی شاعری بھی یہی حیثیت رکھتی ہے ۔

عالم میں آج دھوم ہے فتح مبین کی — سن لی خدا نے قیدی گوشہ نشین کی
کھادی کے بعد جیل کا خلعت جنھیں ملا — کرتے نہیں تمیز وہ موٹے مہین کی
چند روزہ عیش ہے یہ جنتِ شداد کا — اس طرح ہر گز نہ ہو گا فیصلہ بغداد کا
ہو گئے جوہر یہ کیسے بندۂ دام فریب — شور سنتے تھے بہت ہم حسرت آزاد کا
ممکن نہ ہو دوگانہ، سوئے یاں ہوں نصیب — زنداں میں ہو دو چند خوشی پھر بھی عید کی
عہد اول کو بھی اچھا ہے جو پورا کر دو — تم وفادار رہو تھوڑی سی وفا اور سہی

سیاسی شاعری کا معیار بلند ہے ۔ کہیں کہیں لہجہ روایتی نہیں رہتا اور مضامین بھی چغلی کھاتے ہیں ۔ مثلاً اگر واردات عشق کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں محبوب کے جور و ستم اور بے دردی کی مثالیں فارسی غزل میں ہر جگہ مل جائیں گی اور اردو میں ولی کے یہاں بھی خواہ بعض جگہ

ہندستانی رنگ بیں ہی سہی، میرؔ اور ان کے معاصرین کے کلام میں بھی اسی فارسی رنگ میں محبوب کی بالادستی اور دبدبہ کا اثر بکثرت ملے گا، لیکن اس جفا کیش ستم گر ظالم وجابر محبوب کی صفات کا اظہار اس کی قوت بازو سے نہیں بلکہ محض اس کی نگہ وابرو، زلف ورخسار اور اس کی بزم غیر میں موجودگی وغیرہ سے ہوتا ہے، یہی اس کی روایت ہے۔ جوہرؔ کے یہاں ایسی مثالیں بھی مل جائیں گی جو محبوب کی زور آزمائی اور قوت بازو کے استعمال کی نشاندہی کرتی ہیں:

تجھے ہے قوت بازو پہ غرہ جس پر ہم کو
لگا دے زور تو سارا تری قدرت کہاں تک ہے

بلاشبہ یہ محبوب اور اس کا یہ تناظر انگریز کی انسان نادوستی ہے۔ لیکن غزل کی روایت سے بہرحال احتراز ہے۔ بہ ایں ہمہ سیاسی شاعری کا کچھ حصہ یقیناً اچھا ہے۔ سیاسی استعاروں کی مدد سے جوہرؔ نے اس حصہ میں جان ڈال دی ہے۔ یہ شاعری "بہ صورت مجبوری" شروع ہوئی تھی۔ محمد علی ایک تیز و طرار آدمی تھے۔ ہندستان کی غلامی انھیں لمحہ بھر کے لیے بھی برداشت نہیں ہو رہی تھی، اسی کی خاطر انھوں نے "کامریڈ" اور "ہمدرد" اخبارات جاری کیے۔ انتہائی زود قلم شخص تھے، جو چاہتے منٹوں میں لکھ لیا کرتے تھے، مصلحت، خوف اور رعایت جیسے الفاظ ان کے دشمن تھے، خلوص ان میں بدرجۂ اتم تھا۔ لہٰذا ہر کام جو قوم سے تعلق رکھتا تھا، اس کے لیے سربکف ہو جاتے —— ایسے جری شخص کو ان حالات میں ۱۹۱۵ء میں جیل بھیج دیا گیا۔ وہاں وہ چار سال تک اس طرح قید رہے کہ لکھنے اور بولنے تک کی پابندی لگی ہوئی تھی۔ جذبات بے قابو ہو جاتے تھے، کہ طبیعت کی موزونی اور ایچ، شاعری سے دلچسپی اور غزل کی رمزیت نے ایام اسیری میں ان سے اچھی خاصی شاعری کرا دی۔ چنانچہ یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اگر وہ التزامی طور پر ہی سہی اسی طرح کی شاعری کرتے تو ان کا مقام کچھ اور ہی ہوتا۔

کہہ دو رضواں سے نہیں سایۂ طوبیٰ درکار
اپنی جنت ہے یہیں چھاؤں میں تلواروں کی

قید تنہائی کا لذت آشنا　　کیسے کہہ دوں تارک لذات ہے

جو رگلچیں یاد رکھ قید قفس کا غم نہ کر　　چین کب اے بلبل نالاں تجھے گلشن میں تھے
جبہ سائی کی بھی کچھ ہوگی تمھیں کو امید　　گالیاں کھاتے ہو جا جا کے جو دربان سے
رات تلچھٹ تک نہ چھوڑی تب کہیں　　راز ہائے بادہ و ساغر سے
تجھ سے سیکھے کوئی ستم ایجاد　　طرز عشاق کے ستانے کے
قاتل جوہرؔ کے ہاتھوں سے نہ چھوٹا حشر تک
کس بلا کا خون ظالم کی رگ گردن میں ہے
قید ہے قید غلامی دو برس کی قید کیا　　دیکھو کب ہو خاتمہ اس قید بے میعاد کا
تجھ سے مقابلے کی کسے تاب ہے و لے　　میرا لہو بھی خوب ہے تری حنا کے بعد
صیاد! کیا ہوئی وہ تری حد سے احتیاط　　مرغ خیال کے نہ مرے پر کترے

اشعار کی تعداد کچھ زیادہ ہو گئی لیکن ان سے جوہرؔ کے سیاسی شاعرانہ رجحان کی عکاسی اتنے خوبصورت طریقے پر ہوتی ہے کہ روایتی انداز کو ذرا بھی ٹھیس نہیں پہنچتی۔ ان میں وہی شدت اور کیف موجود ہے جو شاعر کا نصب العین ہے۔ یہاں متعدد تاثرات کے وجود کے امکانات پوشیدہ ہیں۔ تاریخی اشعار کے مقابلے میں یہ بہت زیادہ دنوں تک زندہ رہیں گے، ان سے علامتیں بھی گڑھی جا سکتی ہیں، لیکن سیاسی استعاروں اور کنایوں کو علامت کا روپ دینے کی کوشش جوہرؔ کی شاعری کے ساتھ ناانصافی پر مبنی ہوگی۔ تنقید خلا میں وجود میں نہیں آتی۔ شاعر کو اس کے اصل چوکھٹے میں رکھ کر اس کی شاعری کا تجزیہ کرنے سے نتائج زیادہ بہتر اور صالح و صحتمند طریقے سے اخذ کیے جاتے ہیں۔ جوہرؔ کا میدان نسبتاً محدود ہے۔ ان کی انفرادیت یہی ہے کہ اتنے اچھے خالص سیاسی اشعار کم لوگوں نے کہے ہیں، سیاسی شاعری کی بھی گئی ان میں سے بیشتر میں سبجکٹیویٹی کا فقدان ہے۔ جوہرؔ سیاست کی بھٹی میں تپ کر شعر کہتے ہیں، اس کی لذت سے وہ آشنا ہیں، اس لیے بھی یہ اشعار اپنا پورا اثر چھوڑتے ہیں۔ اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ حسرتؔ کی سیاسی شاعری بھی عمدہ ہے، لیکن وہ اتنی واضح نہیں، یہ ان کی خامی نہیں خوبی ہے، لیکن جوہرؔ کا امتیاز مسلّم ہے۔

میں نے شروع میں جو بات کہی تھی، اسے یہاں پھر دوہراتا ہوں، جوہرؔ کی شاعری مذہب اور سیاست سے ہم آہنگ ہونے کے بعد بہتر شاعری بنتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ سیاسی اور مذہبی استعاروں

علاوہ علامتوں اور تلمیحوں نیز قرآنی تاثرات کو ذہن میں رکھتے ہوئے "مضراب کی گرز ند" کے بعد جو شاعری کی گئی ہے، وہ ہمیشہ بصد شوق پڑھی جائے گی۔ اسی شاعری سے وہ یاد کیے جائیں گے وہی ضرب المثل بنتی ہے، وہی علامتی پیکروں سے لبریز ہے، وہی شدید سے شدید تاثر دینے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے، خواہ وہ دعائے اسیری ہو یا ان کی غزلیں۔

مذہبی تلمیحات و اشارات خصوصاً حسین۔ علی۔ شبیر۔ کربلا۔ یزید۔ شمر۔ فرات۔ آب حیات۔ تشنہ لبی۔ پیغام قضا۔ قتل۔ شہر۔ حشر۔ لہو۔ عشق۔ بت پرستی۔ غلامی۔ امتحان۔ کوثر۔ طوبیٰ۔ توحید۔ لاتحزن۔ ہل من مزید۔ خریداری یوسف وغیرہ۔ اثر آفرینی کے لحاظ سے انتہائی گراں مایہ جواہر ہیں اور یہاں احساس ہوتا ہے کہ غزل پر جوہر کا خاصا احسان بھی ہے۔

اک شہر آرزو یہ بھی ہونا پڑا خجل　　ہل من مزید کہتی ہو رحمت دعا کے بعد

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے　　اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

بت پرستی کا نشاں طوق غلامی کم ہے　　کیا ضروری ہے کہ قشقہ بھی ہو زنار بھی ہو

مطلب فرات سے ہے نہ آب حیات سے　　ہوں تشنۂ شہادت و شیدائے کربلا

فرصت کسے خوشامد شمر و یزید سے　　اب ادعائے پیروی پنجتن کہاں

غزل کے بہترین اشعار وہی کہلاتے ہیں جو کثرت تاثر سے عبارت ہوں۔ ایک با محدود تاثر دینے والی غزل اچھی غزل کے زمرے میں نہیں رکھی جا سکتی۔ معرکۂ کربلا سے ناواقف شخص کے اندر بھی ان اشعار سے تجسس کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور ان اشعار میں وہ اپنی ہی آواز سن سکتا ہے۔ ایرانی تلمیحات و اشارات اور ہندستانی اساطیر جن کا مرکب اردو ہے، ان اشعار میں فرقہ واریت کے امتیازی احساس کے بغیر ملتے ہیں۔

واقعۂ کربلا جوہر کے لیے سب سے بڑا سرچشمۂ تحریک ہے۔ چنانچہ مذہب ہو، ذاتی پریشانی ہو، یا ملک کی آزادی کا مسئلہ، اس واقعہ میں تمام مشکلات و مسائل کا حل اور ہر قسم کی رہنمائی مضمر ہے۔ یہ واقعہ حق و باطل اور خیر و شر کے درمیان جنگ کا آئینہ دار ہے۔ وہ شاید خود بھی نہ جانتے ہوں گے کہ اس جذبے کے تحت وہ کس پایہ کے اشعار کہہ رہے ہیں۔ مثلاً ایک شعر دیکھیے ؎

خود خضر کو شبیر کی تشنہ لبی سے　　معلوم ہوا آب بقا اور ہی کچھ ہے

روایت شکن جوہر حضرت شبیر کو خضر کا رہنما بنا دیتے ہیں۔ شبیر کی تشنہ لبی سن کر قاری کے ہونٹوں پر بھی پپڑی جمنا شروع ہو جاتی ہے۔

تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ استبداد، استحصال، آمریت، استعماریت اور غلامی جیسی لعنتوں کے خلاف آواز بلند کرنے والے ہمیشہ نظر بندی اور دار و رسن جیسے انعامات سے نوازے جاتے رہے ہیں۔ لیکن دار پر بھی انا الحق کے نعرے کہنا ان لوگوں کے لیے باعث ننگ ہوتا ہے بلکہ ایسے موقعوں پر تو ان لوگوں کو اپنی منزل قریب تر نظر آنے لگتی ہے:

یہ نظر بندی تو نکلی ردِّ سحر　　دیدہ ہائے ہوش ابینا ہو چلے

مستحق دار کو حکم نظر بندی ملا　　کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

جاں فروشی کے لیے ہم تو تیار ہیں مگر　　کوئی اس جنس گراں کا خریدار بھی ہو

جوہر کے یہاں روایتی دائروں میں عصری حسیت سے لبریز اشعار کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ لیکن ان کی شخصیت میں مقصدیت کے غلبہ نے ان کی شاعری کو بے طرح متاثر کیا ہے۔ ان کی شاعری بقول خود "لٹریچر کے لیے نہیں" لیکن بہرحال یہ شاعری ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے تمام خیالات و جذبات پر قاری کی مہر تصدیق ثبت کرانا چاہتے ہیں جبکہ یہ بات طے ہے کہ قاری ان کا ساتھ اسی لمحہ تک دے سکتا ہے جب تک وہ اسے اپنے دل کی آواز تصور کرے۔ قاری کے مزاج سے ہم آہنگی اور مقصدیت کے غلبہ میں تضاد اور پھر تصادم تو ہوتا ہی ہے اور ایسے موقع پر باذوق قاری جوہر کے بیسیوں اشعار اخباری بیان کی طرح پڑھتا چلا جاتا ہے اور بس۔ دراصل بایوگرافی کی طرح شاعری میں بھی ATTACHMENT کے ساتھ ساتھ DETACHMENT انتہائی ضروری بلکہ ناگزیر ہے ——

بہرحال یہ صورت حال بیشتر مقامات پر نہیں۔ اور جہاں کہیں مناسب حدود میں موجود ہے وہاں جوہر اردو کے پسندیدہ شاعر تسلیم کیے ہی جائیں گے۔



غزلیں

مسلم سلیم
۳۲ کارپوریشن فلیٹس
خلد آباد، الہ آباد

جب جب بھی زندگی کی گئیں راحتیں تمام
لمحات میں سمٹ سی گئیں مدتیں تمام

میں! اور احتجاج کی ہمت! نہیں نہیں
بے اختیار تھیں پڑی ہیں رگیں تمام

ہر بار یوں لگا کہ کوئی آئے گا مگر
کچھ دور ہی سے لوٹ گئیں آہٹیں تمام

وہ دیکھنے میں اب بھی تناور درخت ہے
حالانکہ وقت کھو چکا ہے جڑیں تمام

آثارِ کرب سب سے چھپاتا پھرا مگر
بستر پہ نقش ہو ہی گئیں کروٹیں تمام

وہ خود یہ چاہتا تھا یہ احساس تب ہوا
ہم بے خودی میں توڑ گئے جب حدیں تمام

مختار ٹونکی
کالی پلٹن روڈ۔ پل محمد خاں
ٹونک۔ راجستھان

ہوا ہوں جان سے جس پر فریفتہ لکھو
گزر گیا ہے جو مجھ پر وہ واقعہ لکھو

کسی طرح سے بھی قاتل کو تم نہ دو الزام
جو میری موت کو لکھو تو حادثہ لکھو

ہزار قربتیں دل کی ہوں ان کا لکھنا کیا
جو بیچ ان کے ہے مابین فاصلہ لکھو

یہ زندگی تو ہماری سمجھ سے باہر ہے
گزرتے ٹوٹتے لمحوں کا سلسلہ لکھو

کسی کے ہونٹوں کی تعریف سے ہے کیا حاصل
لبوں سے چوم کے ان کا بھی ذائقہ لکھو

خلوص و مہر و وفا اور پیار دنیا سے
تمام ختم ہوئے ان کا مرثیہ لکھو

جدھر بھی دیکھیے اب تو جدید قدریں ہیں
روایتوں کا ہوا ہے جو خاتمہ لکھو

تمہاری ذات بھی مشکوک ہو کے رہ جائے
مری کتاب پہ ایسا نہ حاشیہ لکھو

تمام ماضی کے افسانے چھوڑ کر مختار
نئے زمانے کا تازہ سا واقعہ لکھو

ناوک حمزہ پوری
سی سی ال سوندا ۔ ہزاری باغ
بہار

جشن آزادی

مبارک اے ہم وطن مبارک پھر آج پندرہ اگست آیا

نسیم صحن چمن میں ہر سو یہ آج جا کے پکار آئی
خوشی منا ڈالے اہل گلشن نوید فصل بہار آئی
وہ آئی سوتنترتا کی کنیا وہ سر کے دل کا قرار آئی
عروس بھارت بڑی ادا سے پھر آج کر کے سنگار آئی
خوشی کے احساس جذبۂ انبساط کو پھر ابھار آئی
صدا یہ کانوں میں میرے رہ رہ کے آئی اور بار بار آئی
مبارک اے ہم وطن مبارک پھر آج پندرہ اگست آیا
ہے جشن آزادی آج بزم طرب میں ہر شخص مست آیا

خوشی سے ہے سربلند کتنا ہمالہ کا دیکھیے نظارا
گلے گلے مل رہے ہیں سر ور ہو کے گنگ جمن کا دھارا
بنا ہے مثل عروس نو بن سنور کے ہندوستاں ہمارا
چمک اٹھا آسماں پہ سوتنترتا کا اک تابناک تارا
فضا میں گونج اٹھا ہر سو جے ہند کا عجب پرجلال نعرہ
عروج پر ہے ہماری جمہوریت کی تقدیر کا ستارا
مبارک اے ہم وطن مبارک پھر آج پندرہ اگست آیا
ہے جشن آزادی آج بزم طرب میں ہر شخص مست آیا

پھر آتش جذبۂ مسرت کو آج کے یوم نے ہوا دی
وہ سب نے اپنے مکاں سجائے ہو جس طرح ان کے گھر میں شادی
بڑے ہی ذوق اور شوق سے سب نے زیب تن کی ہے آج کھادی
پرندے ہر سو چہک رہے ہیں چمن چمن اور وادی وادی
ہے نکلی سولہ سنگار کر کے وطن کی نوخیز شاہزادی
کسی نے ایسے حسین لمحے میں آ کے ناوک مجھے صدا دی
مبارک اے ہم وطن مبارک پھر آج پندرہ اگست آیا
ہے جشن آزادی آج بزم طرب میں ہر شخص مست آیا

انجم عرفانی
شعبۂ اردو ایم ایل کے پی جی
کالج بلرام پور، گونڈہ

۱۵ پندرہ اگست

آیا ہے رقص کرتا ہوا پندرہ اگست
کلیوں کو گدگداتا ہواؤں کو کرتا مست
وہ دن کہ دور حیرت ہم کو ملی پناہ
وہ دن کہ ہم نے قصر غلامی کیا تباہ
وہ دن کہ اپنے حال پہ کی ہم نے خود نگاہ
اس ایسی علم سنبھالا جو تھا زیر سنگ دست
آیا ہے رقص کرتا ہوا پندرہ اگست

بخشیہ فلک میں ٹھہرا یہی روز انتخاب
اک سرفروش قوم سے ہے اس کو انتساب
اس دن لیا دیا گیا صدیوں کا کل حساب
ہر شخص کر کے آیا تھا پہلے سے بندوبست
آیا ہے رقص کرتا ہوا پندرہ اگست

پائی تھی ہم نے ظلم کی راتوں سے جب نجات
دیکھی تھی جب کہ ہم نے بھی رعنائی حیات
کھل کر کہی تھی ہم نے بھی جب اپنے دل کی بات
جام خودی سے پیر و جواں سب ہوئے تھے مست
آیا ہے رقص کرتا ہوا پندرہ اگست

کرنا ہے اب خیال ہمیں بھول بھول کا
اس کو گلے لگانا ہے جو گل ہے بھول کا
تاکہ نہ پھر اعادہ ہو مانی کی بھول کا
کوئی نہ ہے بلند نہ کوئی ہے آج پست
آیا ہے رقص کرتا ہوا پندرہ اگست

جنت نظیر اپنے وطن کو بنانا ہے
راہوں میں اس کی کابلشاں کو بچھانا ہے
تفریق اونچ نیچ کی یکسر مٹانا ہے
ہوں سب وطن پرست، ہو کوئی نہ خود پرست
آیا ہے رقص کرتا ہوا پندرہ اگست

انجم حضور حق میں اب آؤ دعا کریں
دے حوصلہ ہمیں کہ ہم آگے بڑھا کریں
الفت سے مثل شیر و شکر ہم رہا کریں
آتا رہے ہمیشہ یونہی پندرہ اگست
آیا ہے رقص کرتا ہوا پندرہ اگست

غزلیں

ڈاکٹر متین نیازی
۱۲۴/۱۷، رام نرائن بازار
کان پور

پیار کا جذبہ دلوں سے کیوں فنا ہونے لگا
اے محبت تیری دُنیا میں یہ کیا ہونے لگا

منہ چھپانے کے لیے ہاتھ آیا ہے اچھا نقاب
بھولے بھٹکے جب ملے ذکرِ جفا ہونے لگا

یہ رقیبانہ فضائیں الاماں والحفیظ
اب ذرا سی بات پر محشر بپا ہونے لگا

تا کجا ذہنوں کی دنیا میں رہے گا انتشار
دردِ دل اے چارہ گر اب تو سوا ہونے لگا

کاش رہتے صبح تک روشن محبت کے چراغ
تم بجھاتے ہو چراغوں کو یہ کیا ہونے لگا

ہائے کیسی بدنصیبی ہے محبت کی متین
ناوکِ الفت نشانے سے خطا ہونے لگا

عطیہ بانو
معرفت محمد صابر
۳۰۸/۵ گلی پارچہ۔ لکھنؤ

ہر برگ میں رنگ گلِ تر دیکھ رہے ہیں
کلیوں کے تبسم کا ہنر دیکھ رہے ہیں

گو تم کی نگاہوں سے جو گھر دیکھ رہے ہیں
راہوں میں تجلی کا سفر دیکھ رہے ہیں

شاید کوئی ترشا ہوا پیکر نظر آئے
پتھر کا جگر آئینہ گر دیکھ رہے ہیں

ہر روشنیِ نو ہے اندھیروں کی امانت
ہم شب میں چراغوں کی سحر دیکھ رہے ہیں

یہ دل ہی نہیں مجرمِ تحریکِ تمنا
کچھ ان کی بھی تائیدِ نظر دیکھ رہے ہیں

پھینکی ہیں ارادوں نے ستاروں پہ کمندیں
شائستگیِ حسنِ سفر دیکھ رہے ہیں

آئینۂ ماضی بھی عطیہ سے منور
اُلٹے ہوئے اوراقِ نظر دیکھ رہے ہیں

محسن ملیح آبادی
۲۶/۲ ، کینٹ روڈ ، لکھنؤ

(افسانہ)

بَھرَم

یوں تو اُس کی پوری شخصیت قابلِ رشک تھی۔ لیکن اس کا چھ فٹ سات انچ کا قد اس کی شخصیت میں سب سے نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ ہاں اس کا رنگ ضرور مدھم تھا مگر ناک نقشہ بڑا اُجلا اور جاذبِ نظر تھا۔ اس کی اس سانولی رنگت سے کبھی اس کے اندر کسی طرح کا کوئی احساس کمتری نہیں پیدا ہوا تھا۔ کیونکہ اُس نے کئی بار اپنی ماں کی زبانی سُنا تھا۔ مرد سانولے ہی اچھے لگتے ہیں بس ناک نقشہ اچھا ہونا چاہیے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے کبھی خود کو گورے چٹے لوگوں سے کمتر نہیں سمجھا۔ اس کا بھرا بھرا کلین شیو چہرہ، اور اس پر جب وہ ایک ادا کے ساتھ اپنے ہونٹوں میں سگریٹ دبا کر آئینے کے سامنے کھڑا ہوتا اور چہرے کو اور زیادہ سنجیدہ اور رعب دار بنا کر چہرے پر ایک نظر ڈالتا تو خود بخود اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی اور پھر اُسے محسوس ہوتا اُس کے سامنے کمپنی کے سارے ملازم کھڑے ہیں اور وہ ان سب کے سامنے مسکرا دیا ہے اس سے پیشتر کہ اس کی مسکراہٹ ہنسی میں بدل جائے اور اس کے چہرے کے بزرگانہ رعب کا خول گر جائے۔ وہ جلدی سے آئینے کے سامنے سے ہٹ جاتا۔ ہونٹوں میں دبے ہوئے سگریٹ کو پھر سگریٹ کیس میں رکھ لیتا اور اپنے کمرے سے نکل کر بڑی شان سے آواز دیتا۔ فرزانہ، ذرا چائے بنا دو سر میں کچھ درد محسوس ہو رہا ہے۔ بہن کو آواز دیتے وقت بھی وہ یہ نہ بھولتا کہ آواز میں رعب دارانہ کھنک برقرار رہنی چاہیے۔

سگریٹ وہ محض شوقیہ یا چہرے کو اور زیادہ سنجیدہ بنانے کے لیے پیتا تھا اس کا خیال تھا کہ سگریٹ کے دُھنویں کے پیچھے چہرہ اور زیادہ رعب دار لگتا ہے۔ جب تک گھر میں رہتا ایک سگریٹ بھی نہ پیتا۔ پینے کی خواہش ہی نہ ہوتی مگر جب دوستوں میں ہوتا تو ہر دس منٹ پر جیب سے سگریٹ کیس اور لائٹر جو خود اس کے کہنے کے مطابق اس نے ہانگ کانگ سے منگائے تھے، نکالتا اور نمائشی طور سے بڑے اسٹائل سے۔ ہاتھ لائٹر کا بٹن دبا کر سگریٹ سلگاتا اور بڑے شاہانہ طریقے سے ہلکے ہلکے کش پینے لگتا۔ جب دوستوں کے ساتھ ہوتا تو آدھی سگریٹ پی کر پھینک دیا کرتا کہ دوستوں کی نظروں میں اس کی فیاضی برقرار رہے۔ جب سے اُسے نوکری مل گئی تھی تب سے وہ پائپ پینے لگا تھا جو وقت بے وقت اس کے دانتوں میں دبا رہتا۔ اس کا خیال تھا کہ اس پائپ نے اس کے چہرے کو مزید رعب دار بنا دیا ہے۔ ایک بار اس نے اپنے دوستوں سے کمپنی میں اپنی دھاک کا ذکر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ جب وہ پائپ منہ سے لگا لیتا ہے تو کمپنی کے ملازم اُسے چور نظروں سے دیکھتے ہیں اور اس کے پائپ کے دُھنویں نے اس کے باس کے دل میں بھی کمتری کا احساس بڑھا دیا ہے۔ جو باس کے چہرے سے عیاں رہتا ہے۔ کمپنی کے ایک ملازم نے ایک روز بڑے ہی رازدارانہ انداز میں اپنے پچھلے آفیسر کا ذکر کرتے ہوئے اُسے بتایا تھا کہ اس سے پہلے والا آفیسر باس کے سامنے بھیگی بلی بنا رہتا تھا۔ اور پھر وہ بولا تھا۔ لیکن آپ کے سامنے تو باس بھیگی بلی بنا رہتا ہے۔ اور دونوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا تھا اور دوسرے سارے ملازم ان لوگوں کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ تبھی اُسے اپنی بے خیالی کا احساس ہوا تھا کہ ایک ملازم جو اس کا ماتحت ہے، اس کے ساتھ دوسرے ملازمین کے سامنے قہقہہ لگا کر اس نے اچھا نہیں کیا اس طرح اس کی رعب دارانہ شخصیت میں جھول پیدا ہوگا۔ اس نے جلدی سے اپنے چہرے پر سنجیدگی کا خول چڑھاتے ہوئے اس ملازم سے کہا تھا۔ اچھا اس وقت تم کیا کرنے جا رہے ہو۔ اور اس نے محسوس کیا تھا کہ ملازم کو بھی اپنی بے خیالی کا احساس ہو گیا ہے۔ وہ گھبرا سا گیا تھا اور جلدی سے وہاں سے کھسک لیا تھا۔

یہی نہیں کمپنی کے باہر بھی اس کی شخصیت بہت نمایاں تھی۔ وہ جدھر سے گزر جاتا لوگ مبہوت رہ جاتے لوگوں کی حیرت بھری نظریں اس کے پیروں سے سر تک پھیل جاتیں اور لوگ آپس میں چہ میگوئیاں

رنے لگتے۔ عورتیں اسے دیکھ کر حیرت زدہ ہو جاتیں اور مرد احساس
تری میں مبتلا ہو جاتے۔ اُس وقت وہ بڑی شان محسوس کرتا۔ بظاہر
نیاز لیکن چور نظروں سے لوگوں کی طرف دیکھ لیا کرتا۔ اس وقت اس کا
ڑا چکلا سینہ اور تن جاتا، گردن کچھ اور لمبی ہو جاتی اور وہ اپنے
نوں ہاتھوں کو پتلون کی جیبوں میں ڈال کر اور اکڑ جاتا اتنا کہ اس کا
فٹ سات انچ کا قد اور بڑھ جاتا۔ اس وقت اُسے محسوس ہوتا کہ
مان اب اس کے سر سے بہت دور نہیں۔ اس وقت اُسے اپنے وہ دوست
اس کے ساتھ ہوتے کیڑے مکوڑے یا اس سے بھی حقیر تر معلوم
تے اور پھر ایک دم اُسے اپنے باس کا خیال آجاتا ــــ باس ــــ
کسی طرح بھی اس کا باس نہیں لگتا تھا۔ اس کا باس جو عام آدمیوں میں
ٹھنگنا تھا اس کے سامنے تو بالکل بالشتیہ لگتا تھا۔ ایک بالشت
بس تو زیادہ سے زیادہ دو بالشت۔ بس اس سے زیادہ نہیں جب
اس کے قریب آتا تو وہ بخوبی اندازہ لگا لیتا کہ باس اس کی
لیم اور اس کے قد سے مرعوب ہے۔ تعلیم میں بھی وہ باس سے ایک
گری زیادہ تھا۔ جب باس اُسے کسی طرح کی ہدایتیں دینے کے
لیے اس کی میز کے قریب آتا تو دور ہی سے بیٹھے رہنے کا اشارہ
کرتا اور جلدی جلدی ہدایتیں دے کر بھاگ کھڑا ہوتا۔ جب
اُسے ہدایتیں دے رہا ہوتا تو وہ محسوس کرتا کہ باس کی
آنکھوں میں یاسیت اور بے بسی چھپی ہوئی ہے اس وقت اُسے
س کی اس بے بسی پر ترس آجاتا اور کچھ کچھ ہنسی بھی۔ ہنسی اس کے
ہونٹوں تک تو نہ آتی مگر اندر ہی اندر ..... وہ خوب ہنستا اور
س کی ہدایتیں سُننا بھول جاتا اور اس کے قد کے متعلق سوچنے
لگتا اور جب باس اُسے ہدایتیں دے چکتا تو وہ چونک پڑتا اور
ہڑبڑا سا جاتا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ باس جو بمشکل اُس کے سامنے رک پاتا
تھا بے چارے کو دوبارہ ہدایتیں دینی پڑتیں۔

ایک روز جب باس اُس کے پاس آیا تو خلاف معمول اس کا
چہرہ تمام تاثرات سے عاری تھا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کی کوئی
حرکت تھی نہ بے بسی۔ اس کی میز کے قریب بیٹھے ہوئے باس نے اس کے
چہرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور بوجھل سی آواز میں بولا۔

مسٹر احمد آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ میں ریٹائر ہو چکا ہوں قاعدے
کے مطابق مجھے ایک ہفتہ پہلے ہی کرسی چھوڑ دینی چاہیے تھی۔ لیکن
کمار صاحب کی علالت کی وجہ سے ایک ہفتہ رکنا پڑا۔ اور آج
ابھی ابھی کمار صاحب کا فون آیا تھا۔ انھوں نے مجھے گھر پر بلایا ہے۔
اس روز باس کمپنی کا چارج اُسے سونپ کر دو دن کی چھٹی لے کر چلا گیا۔
اور وہ دو دن تک باس کی میز پر کام کرتا رہا۔ باس کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے
اُسے بڑی خوشی ہوتی اور وہ سوچتا۔ وہ باس سے زیادہ اس کرسی کا مستحق
تھا دراصل اُسے باس کی جگہ اور باس کو اس کی جگہ ہونا چاہیے تھا۔
اور پھر کسی خوش آئند خیال سے اس کا چہرہ کھِل اُٹھتا۔

تیسرے روز جب وہ باس کی میز پر جھکا فائل میں نوٹنگ کر رہا
تھا کہ اُسے باس کے قدموں کی آواز کے ساتھ جو بہت مانوس تھی بھاری
بھر کم قدموں کی آواز بھی سُنائی دی۔ اس نے نگاہ اُٹھا کر دیکھا اور
مبہوت رہ گیا اُسے محسوس ہوا باس اور اس کے ساتھ آئے ہوئے آدمی
کے قدم زمین پر نہیں بلکہ اس کے دل و دماغ پر پڑ رہے ہیں۔ وہ نڈھال
سا ہو گیا۔ بمشکل وہ کھڑا ہو سکا تبھی باس کی مسرت بھری آواز اس کی
سماعت سے ٹکرائی۔ آپ ہیں مسٹر احمد اس کمپنی کے -ADMINISTR
ATIVE OFFICER اور آپ ہیں مسٹر سلیم انٹرویو میں کامیاب
ہوئے ہیں اور کل سے میری کرسی سنبھالیں گے۔ اُسے لگا باس کی
زبان سے الفاظ نہیں تیر نکل رہے ہیں۔ اس وقت باس کی آنکھوں
میں مسرت آمیز چمک تھی۔

اچھا اب ذرا میں انھیں ڈپٹی صاحب سے ملوا دوں۔ اس کے ڈھیلے ڈھالے
ہاتھوں میں ایک جھٹکا لگا اور اس کا بے جان سا ہاتھ میز پر گر گیا۔

اس کے ساتھ ساتھ کمپنی کے ملازم بھی اپنے نئے باس کی طرف حیرت
بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے جو ان کے -ADMINISTRATIVE OF
FICER سے بھی لمبا، خوبصورت اور جاذب نظر تھا۔

اُلجھن میں اس کا ہاتھ پتلون کی جیب میں چلا گیا۔ اس نے جیب
سے سگریٹ کیس اور لائٹر نکالا۔ سگریٹ سُلگایا۔ لیکن پھر کسی خیال
سے سگریٹ میز پر مسل دیا اور کنپٹیوں کی اُبھری ہوئی نسیں آہستہ آہستہ
سہلانے لگا۔

★

اُتّر پردیش شاہراہِ ترقی پر

• ریاست کی ترقی کے لیے ملازمین لگن اور محنت سے کام کریں • دوسرے سپر تھرمل بجلی گھر کے لیے اتر پردیش کا مطالبہ • جنگلاتی مواصلات کی توسیع کے لیے تین لاکھ روپئے کی منظوری • پہاڑی علاقے میں پینے کے پانی کی اسکیموں کے لیے ڈیڑھ کروڑ روپیہ • بے زمین افراد کو قبضے دلانے کی ہدایت • خشک سالی سے متاثر کسانوں کو کیمیاوی کھاد اور بیج • ۲۵ کروڑ روپئے کے امداد باہمی قرضوں کی تقسیم کی اسکیم • ریاست کے لیے ۱۲ نئے بجلی پراجکٹ

• وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے سکریٹریٹ کے افسروں اور ملازمین سے اپیل کی ہے کہ وہ ریاست کے ۹ کروڑ عوام کی توقعات کو پورا کرنے کے لیے لگن اور محنت سے کام کریں تاکہ ریاست ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکے۔

وزیر اعلا نے سکریٹریٹ میں اتر پردیش سکریٹریٹ کے افسروں اور ملازمین کی مختلف ایسوسی ایشنوں کے زیر اہتمام منعقدہ ایک خیر مقدمی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ان کے مسائل پر پوری سنجیدگی اور ہمدردی کے ساتھ غور کیا جائے گا۔

⁂

• اتر پردیش کے وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے نئی دہلی میں وزرائے برقیات کی کانفرنس میں ریاست کے لیے ۲۰۰۰ میگا واٹ کے ایک مزید سپر تھرمل بجلی گھر کی منظوری دینے کی پر زور وکالت کی تاکہ ریاست میں بجلی کی پیداوار اور مانگ کے درمیان پیدا ہونے والے ممکنہ تفاوت کو دور کیا جا سکے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ماہرین کے ایک ورکنگ گروپ کے تجزیہ کے مطابق ۸۵-۱۹۸۴ء کے دوران اتر پردیش میں ۱۵۰۰ میگا واٹ بجلی کی قلت ہو سکتی ہے۔

وزیر اعلا نے کانفرنس میں اتر پردیش کا معاملہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس صدی کی بدترین خشک سالی کے باعث اتر پردیش کو بجلی کے زبردست بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ مستقبل میں اس طرح کی مصیبتوں سے بچنے کی غرض سے بجلی کی پیداوار میں زبردست اضافہ کرنے کے لیے اسے بھرپور مدد کی ضرورت ہے۔

شری سنگھ نے زور دیا کہ نرورا میں قائم ہونے والے ایٹمی بجلی گھر میں ۲۳۵ میگا واٹ صلاحیت کے دو مزید یونٹوں کا اضافہ کیا جائے جس میں اس وقت صرف ۴۷۰ میگا واٹ بجلی کی پیداوار کا بندوبست ہے۔

⁂

• حکومت اتر پردیش نے ریاست کے پہاڑی علاقوں میں جنگلاتی مواصلات کی توسیع کی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے موجودہ مالی سال میں تین لاکھ روپے کی رقم منظور کی ہے۔

اسکیم کے تحت پہاڑی اضلاع کے جنگلاتی علاقوں میں سڑکوں اور پلوں کی تعمیر نیز ٹیلیفون لائنیں پھیلانے کا کام انجام دیا جائے گا۔

⁂

• پہاڑی علاقہ کے خشک سالی اور پانی کی قلت سے متاثرہ مواضعات کو پینے کے پانی کی سہولت مہیا کرنے اور متاثرہ پراجکٹوں کو سرگرم عمل کرنے کی غرض سے ۸۱-۱۹۸۰ء میں حکومت ہند سے موصولہ ۱.۵۰ کروڑ روپیہ کی رقم اتر پردیش جل نگم کی تحویل میں دے دی گئی ہے۔

⁂

• وزیر مال شری چودھری نیپال سنگھ نے محکمۂ مال کے افسروں اور ضلع حکام کو ہدایت کی ہے کہ ۱۹۷۶ء میں حکومت نے غریب بے زمین افراد کو جو زمین الاٹ کی تھی، انھیں مقررہ مدت کے اندر الاٹ شدہ زمینوں پر

(بقیہ صفحہ ۵۶ پر)

نقد و تبصرہ

تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: رقصِ لہو (مجموعہ کلام)

شاعر: خضر برنی

ناشر: ادبی سنگم، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

قیمت: دس روپے

رقصِ لہو اردو کے کہنہ مشق شاعر حضرت علامہ خضر برنی کا نوواں مجموعہ کلام ہے۔ اس پر اتر پردیش اردو اکاڈمی ایک ہزار روپے کا انعام دے چکی ہے۔ اس سے پیشتر بھی خضر صاحب اکاڈمی کا انعام حاصل کر چکے ہیں۔

خضر برنی گذشتہ چالیس برس سے غزل گوئی میں مصروف ہیں۔ بقول پروفیسر گوپی چند نارنگ: "وہ کہنہ مشق شاعر ہیں۔ کلاسکی روایات اور رچا ہوا شعور رکھتے ہیں"۔

خضر برنی نے جملہ اصناف سخن پر طبع آزمائی کی۔ بقول مولانا ماہر القادری "خضر برنی نے غزل، نظم اور قطعات بھی کہے ہیں۔ وہ کسی صنف سخن میں معذور نہیں۔ ان کی شاعری میں حساس دل کی آواز ہے اور چوٹ کھائے ہوئے دل کی آواز میں بڑا سوز و درد ہوتا ہے۔"

خضر برنی کی شاعری میں محبت بڑی معصوم اور مقدس نظر آتی ہے وہ اور تماش بینوں کی طرح آنکھیں سینکنے کے قائل نہیں۔ جوش ملیح آبادی نے درست فرمایا ہے: "خضر صاحب کے کلام میں یکسوئی، ہم آہنگی اور سلاست کے ساتھ قدیم و جدید کی آمیزش کا حسن درخشاں ہے۔"

چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

ان سے ملنے کا جب آسرا ہو گیا
درد پہلے سے بھی کچھ سوا ہو گیا

وہ آئیں یا نہ آئیں انہیں اس کا اختیار
دل نے تو حسرتوں کے دیے جگمگا دیے

مجھ سا نہ ہو جہان میں تنہا کوئی بشر
صحرا میں ایک پیڑ کی صورت کھڑا ہوں میں

—— ظفر حسین

نام کتاب: نقوشِ حسن (مجموعۂ کلام)۔

شاعر: بلو اکرشن گوپال مغموم۔ صفحات: ۳۴۷۔

قیمت: بیس روپے۔

پتہ: ماہنامہ بیسویں صدی، دریا گنج، نئی دہلی۔

جناب مغموم کہنہ مشق، پختہ کار اور خوش گو شاعر ہیں اور ایک طویل عرصے سے اردو کے مشہور رسائل میں ان کا کلام شائع ہوتا رہا ہے انھیں تمام اصنافِ سخن پر تقریباً یکساں قدرت حاصل ہے اس طرح وہ پنجاب کے معروف شعرا کی صف میں جگہ پانے کے ہر طرح مستحق ہیں۔ مغموم ایک حساس دل اور ذوقِ جمال رکھتے ہیں جو کسی فن کار کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ وہ صرف کائنات کے خارجی مظاہر ہی میں حسن کے جویا نہیں بلکہ وہ افکار و معانی میں بھی حسن کے طالب ہیں اس لیے شریفانہ جذبات، تعمیر خیالات اور انسانی حیات کے نقوشِ حسن، ان کے کلام میں جا بجا بکھرے ہوئے ہیں اور ان کے تخیل میں ایک ایسی دنیا بسی ہوئی ہے جس میں ہر طرف حسنِ خیال و عمل کی حکمرانی ہے۔

وہ حسنِ فطرت سے بہت متاثر ہیں اور نظموں میں اپنے مشاہدات و تاثرات کا کامیاب اظہار اس خوبصورتی سے کرتے ہیں جس سے دوسرے بھی متاثر ہو جاتے ہیں اور کچھ دیر ان کے مشاہدے میں اپنے کو شریک محسوس کرنے لگتے ہیں، اسی طرح حسنِ فکر و عمل کی حامل شخصیتوں سے بھی وہ متاثر ہوئے ہیں اور انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

حسنِ مجاز کی تحسین کے باوجود وہ اس کی کثافتوں اور آلودگیوں سے دامن کش رہے ہیں اور اسے بھی حسنِ حقیقت تک رسائی کا زینہ سمجھتے ہیں۔ غزل گوئی کی پاکیزہ خصوصیات ان کے حصے میں آئی ہیں اسے نہ وہ معاملہ بندی سمجھتے ہیں نہ درسِ عرفان بلکہ ایک درمیانی اور متوسط راہ کے قائل ہیں اس لیے ان کی غزلیں جیتی جاگتی، رواں دواں اور زندگی سے قریب معلوم ہوتی ہیں، زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں کا انھیں دکھ ہے جو انھیں پرامید ہونے کے باوجود مغموم بنا دیتا ہے اور یہی 'نشاطِ غم'، کلام مغموم کا حقیقی جوہر ہے۔

ان کے کلام میں حب الوطنی، اردو نوازی، اور انسان دوستی کے جو جذبات کروٹیں لے رہے ہیں وہ ان کے کلام کی مقبولیت میں اضافہ کرتے رہیں گے۔

—— شمس تبریز خاں

نامِ کتاب : بدایوں کے چند ادبا و شعراء ۔
نامِ مصنف : مبشر علی صدیقی ۔
صفحات : ۱۴۴ ۔
قیمت : دس روپیہ ۔
ملنے کا پتہ : مبشر علی صدیقی، گلی وحید بخش۔ محلہ سوتھ۔ بدایوں (یو۔ پی)

مبشر علی صدیقی بدایوں کے بزرگ و نامور ادیبوں میں سے ہیں محکمۂ تعلیمات سے وابستہ رہ کر انھوں نے اردو ادب کی کافی خدمت کی ہے اور گورنمنٹ کالج کے پرنسپل کے عہدہ سے ریٹائر ہو جانے کے بعد بھی مستقل طور سے ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ انھیں صحیفۂ بشارت، اردو اور تاریخ کیسے پڑھائیں، آئینہ کے سامنے، ایک معلم کی سرگزشت اور نگارشات نو جیسی تصانیف کی بنا پر فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ "بدایوں کے چند ادبا و شعراء" صدیقی صاحب کی نثری کاوش کا بہترین نمونہ ہے جو تین حصوں پر مشتمل ہے (۱) اشخاص سے متعلق (۲) تصانیف سے متعلق (۳) رسائل پر تبصرہ۔ کتاب میں چھوٹے چھوٹے مضامین قرینے سے شامل کیے گئے ہیں۔ پہلے حصہ میں فانی بدایونی سے ملاقات، علی حاتم اور میر محفوظ علی قرالحسن قمر۔ عیش، ضیا۔ برق وغیرہ۔ لکشمی نرائن جوہر۔ ابراحسنی گنوری۔ آل احمد سرور کی شاعری میں کشمیر کا ذکر اور دلاور فگار کی مزاحیہ شاعری سے متعلق مضامین شامل ہیں۔ ان کا انداز بیانیہ ہے لیکن شعرا کے بارے میں لکھتے ہوئے چیدہ اشعار کا سہارا لیتے ہیں۔ معیاری رسائل کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔ اس طرح قاری کو دلچسپی پیدا کرا دیتے ہیں۔ دوسرے حصے میں دیوان غالب کے بدایوں ایڈیشن۔ ڈاکٹر سید محمود کا مقدمۂ دیوانِ غالب۔ ثاقب بدایونی کا قصیدہ۔ طنزیات و مقالات (سید محفوظ علی) وغیرہ سے متعلق مضامین شامل ہیں۔ تیسرے حصہ میں بدایوں کے مشہور رسائل "چمن"، "المنظور" پر معیاری تبصرہ کیا گیا ہے اور ان کے شمارو سے منتخب اشعار بھی نقل کیے گئے ہیں۔

محترم صدیقی صاحب نے اپنی ادبی صلاحیت کا مظاہرہ اس تصنیف میں بخوبی کیا ہے۔ وہ اچھے نثر نگار کے علاوہ اچھے ناقد بھی نظر آتے ہیں انھیں زبان و بیان پر بھی مکمل عبور حاصل ہے۔

— خلیل اللہ خان

نامِ کتاب : نذرِ اقبال
مرتب : عقیل الرحمٰن عقیل — قیمت : چار روپئے
ملنے کا پتہ : سب رس کتاب گھر۔ ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ۔
حیدر آباد۔ ۵۰۰۰۰۴

اقبال، اردو کے وہ عظیم شاعر ہیں، جنھوں نے "آبِ رودِ گنگا" کو مخاطب کیا، جنھوں نے ہمالیہ کو "فصیلِ کشورِ ہندوستاں" کہا۔ جنھوں نے رام اور کرشن کو اور سوامی ویویکانند کو خراجِ عقیدت پیش کیا ایسے عظیم دانشور کی ولادت صدی تقاریب ہند و پاک ہی میں نہیں مشرق و مغرب کے گوشے گوشے میں احترام اور اہتمام سے منعقد ہوئیں۔

اقبال صدی تقاریب کے موقع پر ملک میں سمینار منعقد ہوئے۔ مختلف زاویوں سے فکرِ اقبال کا جائزہ لیا گیا اور متعدد اہم مطبوعات شائع ہوئیں۔ حیدر آباد، صدیوں سے شعر و ادب اور گنگا جمنی کلچر کا شہر آرزو رہا ہے۔ چنانچہ اقبال کو حیدر آباد سے بڑی محبت اور عقیدت تھی۔ آصفی حکمراں میر عثمان علی خاں اور ان کے وزیر اعظم مہاراجہ صوفی کرشن پرشاد شاد نے اقبال بیحد متاثر تھے۔ دکن کی تہذیب جامعہ عثمانیہ اور دکن کی شاعرہ سرو جنی نائیڈو سے بھی اقبال کو گہرا لگاؤ تھا۔ دو بار دکن والوں نے ان کا دل کی گہرائیوں سے خیر مقدم کیا تھا اور آج بھی دکن میں اقبال شناسی کی شمع اقبال اکیڈیمی اور سہ ماہی اقبال ریویو نے روشن کر رکھی ہے۔

اس مختصر مگر مفید کتاب نذرِ اقبال کے حصۂ اوّل میں اس کے مرتب عقیل الرحمٰن عقیل نے ایک مبسوط مقالہ میں جس کا عنوان "اقبال شناسی میں حیدر آباد کا حصہ" ہے۔ دکن اور اقبالیات پر مفید مواد یکجا کیا ہے۔ اس کتاب کے دوسرے حصے میں دکن کے ۲۸ شعراء کی ۳۰ نظمیں شائع ہوئی ہیں۔ سخنوروں کا یہ نذرانۂ اقبال سے ان کی بے پناہ عقیدت کا مظہر کلدستہ ہے۔ ان نظموں سے یہ تاثر واضح ہوتا ہے کہ دکن میں اقبال سے والہانہ وابستگی، نظم کی صنف کے لیے فال نیک ہے۔

— وقار خلیل

نام کتاب: **شاناتہ غالب** ۔ نام مصنف: مالک رام

قیمت: سولہ روپے ۵۰ پچاس پیسے ۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر دہلی ۱۱۰۰۲۵

اردو ادب میں محقق اور ناقد کی حیثیت سے مالک رام کا اپنا ایک مقام ہے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن ادبی دنیا میں "ماہر غالبیات" کی حیثیت سے زیادہ متعارف ہیں۔ ۱۹۲۶ء میں غالب سے متعلق ان کا پہلا مضمون "نگار" لکھنؤ میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت سے اب تک غالب سے متعلق ان کے پچاس سے زیادہ مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب بیشتر مضامین ملک کے معیاری رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں جنھیں کتابی شکل میں جمع کر دیا گیا ہے۔ لیکن بقول مالک رام۔

"نظر ثانی کے دوران میں ان میں بہت کچھ رد و بدل ہوا ہے اور بعض مضمون تقریباً از سر نو لکھے گئے ہیں۔"

اس کتاب میں زیادہ تر مضامین مرزا غالب کی شخصی زندگی سے متعلق ہیں۔ اور چند ایک مضامین میں غالب کی نفسیات سے بھی بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب سے مالک رام کی دوسری کتاب "ذکر غالب" کے بعض مجمل اور پیچیدہ بیانات کی توضیح و تشریح بھی ہو جاتی ہے حاصل یہ کہ یہ کتاب غالب سے متعلق بہت سی اہم معلومات فراہم کرتی ہے ــــ کتابت و طباعت معیاری اور کاغذ نفیس ہے جو "مکتبہ جامعہ نئی دہلی" کی امتیازی خصوصیت ہے!! ــــ وسیم احمد اعظمی

نام کتاب: **گلدستہ**۔ شاعر: ناوک حمزہ پوری

قیمت: سات روپیہ کتابت و طباعت: عمدہ

ملنے کا پتہ: جاوید بک ڈپو، کالج روڈ ہزاری باغ، نسیم بک ڈپو ۲۵۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ

گلدستہ جناب ناوک حمزہ پوری کا چھٹا شعری مجموعہ ہے اس سے قبل ان کے پانچ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ بچوں کے ادیب کی حیثیت سے ناوک حمزہ پوری کا نام محتاج تعارف نہیں۔ انھوں نے ادب اطفال میں نمایاں اضافے کیے ہیں اور اپنا ایک مقام بھی بنا لیا ہے۔ گلدستہ بچوں کے لیے ہلکی پھلکی اور شاداب نظموں اور نصیحت آمیز خیالوں کا خوبصورت مجموعہ ہے۔

اردو میں بچوں کے ادب کی بڑی کمی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ زیادہ تر اردو ادیبوں نے ادب اطفال کو زیادہ اہمیت نہیں دی اور اسے لائق توجہ نہیں سمجھا۔ ناوک حمزہ پوری ان چند اردو ادیبوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے بچوں کے ادب کی ضرورت کو محسوس کیا اور اس پر مستقل طور سے توجہ دی۔

میں اردو اکیڈمی بہار کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اس نے بچوں کے لیے ایسا گرانقدر مجموعہ شائع کیا۔ امید ہے کہ ناوک حمزہ پوری بچوں کے ادب میں اور بھی اضافہ کریں گے۔ ــــ ملند اعتماد



اترپردیش شاہراہ ترقی پر ــــ (باقی صفحہ ۵۲)

قبضہ دلایا جائے۔

شری سنگھ نے یہ بھی کہا ہے کہ ان غریب بے زمین افراد کو اگر مقررہ مدت کے اندر زمین پر قبضہ نہیں دلایا جاتا ہے تو اس کے لیے متعلقہ افسر کو ذمہ دار قرار دیا جائے گا۔ حکومت اس سلسلہ میں کسی قسم کی کوئی تساہلی برداشت نہیں کرے گی۔

● حکومت اترپردیش نے خشک سالی سے متاثر کسانوں کی خریف کی مہم کامیاب بنانے میں سرگرم اور موثر رول ادا کرنے میں مدد دینے کی غرض سے انھیں بیج اور کیمیاوی کھادوں کی خریداری پر مالی امداد دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

● اترپردیش میں زرعی پیداوار کو بڑھانے کے لیے آئندہ امدا باہمی سال کے دوران ۲۵۰ کروڑ روپیہ کے قلیل مدتی امداد باہمی قرضے تقسیم کرنے کی اسکیم بنائی گئی ہے جو آج تک کسی ایک سال میں تقسیم کی جانے والی قرضہ کی سب سے بڑی رقم ہوگی۔ یہ رقم موجودہ امداد باہمی سال میں تقسیم شدہ قرضہ کی رقم سے ۸۰ کروڑ روپیہ زیادہ ہے۔

اس قرض تقسیم اسکیم سے پردیش کے تقریباً ۸ لاکھ کسانوں کو فائدہ پہنچنے کی توقع ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

● ریاستی حکومت سات تھرمل اور ریچھ پن بجلی پراجکٹ مرکزی حکومت کی منظوری کے لیے پیش کر چکی ہے جن کی تکمیل پر ریاست کی بجلی کی صلاحیت میں ۶۶۵۰ میگاواٹ کا اضافہ ہوگا۔

⁂ ⁂ ⁂

Vol. 35 No-5 REGD No. LW/NP.17
AUGUST 1980.
50 PAISE POST BOX No. 146 LUCKNOW 226001 Annual Subs. Rs. 5/-



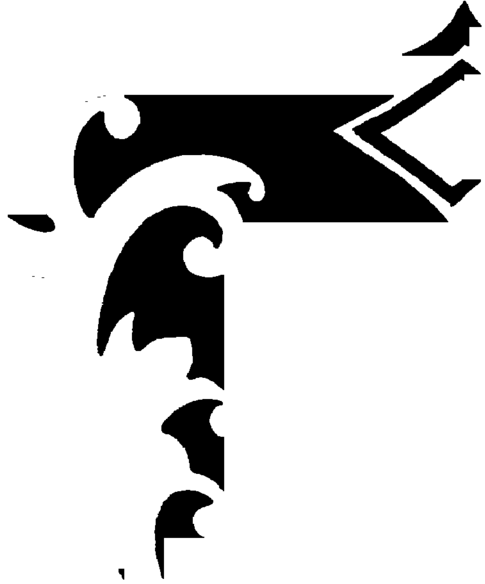


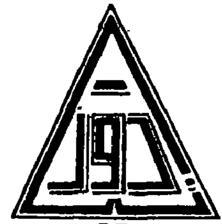
وزیر اعلا اتر پردیش شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ ۶ جولائی ۱۹۸۰ء کو لکھنؤ میں منعقدہ اتر پردیش اسٹیٹ مومن کانفرنس کی مجلس عاملہ
کے جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے











جلد ۳۵ نمبر ۶

ستمبر ۱۹۸۰ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی



ناشر: ہمیندر کمار

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یو پی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ۔ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زرِ سالانہ: پانچ روپے

سیل کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پبلی کیشن پبلک انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی لکھنؤ



اپنی بات

گذشتہ سال اتر پردیش زبردست خشک سالی سے دوچار ہوا تھا جس سے فصل کا بھی نقصان ہوا تھا اور بجلی کی پیداوار بھی بری طرح متاثر ہوئی تھی لیکن اس سال ریاست کو زبردست سیلاب کے مصائب کا سامنا ہے۔ ریاست کے ۴۵ اضلاع سیلاب کی زد میں ہیں۔ ان اضلاع میں ۲۰،۴۳۱ گاؤں، ۲ر۳۱ کروڑ کی آبادی اور ۲۰ر۶۰ لاکھ ہیکٹر زمین سیلاب سے متاثر ہوئی ہے۔ جس میں ۱۲ر۲۶ لاکھ ہیکٹر رقبہ زیر کاشت ہے۔ ایک بڑی تعداد میں مکانات کو بھی سیلاب سے نقصان پہنچا ہے۔ اس طرح کے مکانات کی تعداد ۲ر۴۱ لاکھ ہے۔ ایک تخمینے کے مطابق سیلاب سے مجموعی طور پر ۶۲ر۶۱ کروڑ روپے سے بھی زیادہ کا نقصان ہوا ہے۔ سیلاب سے ہونے والے نقصانات کی تلافی کے لیے حکومت ہند سے ۱۸۵ کروڑ روپے، ۲۵ ہزار میٹرک ٹن سیمنٹ اور ۹۵۰۰ میٹرک ٹن گیہوں اور ۵۰۰۰ میٹرک ٹن چاول کی مانگ کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ریاستی حکومت اپنے تمام وسائل سے سیلاب زدہ علاقوں میں راحت اور امداد پہنچانے کا کام جنگی پیمانہ پر کر رہی ہے۔ سیلاب سے متاثر ہونے والے ۴۵ اضلاع میں تقریباً ۱۰ر۸۸ لاکھ افراد اور ۲ر۱۱ لاکھ مویشیوں کو محفوظ مقامات پر پہنچایا جا چکا ہے۔

ان اضلاع میں ۱۳۶۲ سیلاب چوکیاں اور ۲۲۴ امدادی مرکز راحت اور بچاؤ کا کام انجام دے رہے ہیں۔ ۲۸۸۴ کشتیاں اور ۳۵ موٹر بوٹیں راحت اور امدادی کاموں کے سلسلے میں استعمال کی جا رہی ہیں۔ بچاؤ کے کاموں کے سلسلے میں خاص طور سے تربیت یافتہ پی۔ اے۔ سی کی ۱۲ کمپنیوں سے رائے بریلی، مرزا پور، دیوریا، سلطان پور، گونڈہ جونپور اور اٹاوہ وغیرہ میں کام لیا گیا ہے۔ راحت کے کاموں میں تیزی لانے کے لیے ضلع مجسٹریٹوں کو یکم جون تک ۵ر۵۵ کروڑ روپیہ کی رقم دی جا چکی ہے اس کے علاوہ ۲ر۹۱ کروڑ روپیہ کی رقم تقاوی کے طور پر تقسیم کے لیے ضلع مجسٹریٹوں کو دی گئی ہے۔ ضلع مجسٹریٹوں سے کہا گیا ہے کہ زیر آب دیہاتوں کے تمام لوگوں کو عارضی طور پر معذور تسلیم کیا جائے اور انھیں راحت پہنچانے والی تمام ضروری اشیاء فراہم کی جائیں۔ اس کے علاوہ سیلاب زدہ علاقوں میں بیماریوں کی روک تھام کے لیے زیادہ سے زیادہ ٹیکے بھی لگائے جا رہے ہیں اور کنووں وغیرہ کی صفائی کی جا رہی ہے۔ ان علاقوں میں بیمار لوگوں کے مفت علاج کا بھی بندوبست ہے۔ مویشیوں کو بیماریوں سے بچانے کے لیے ۲۱ر۱۲ سے زیادہ ٹیکے لگائے جا چکے ہیں اور ۵ر۴۲ لاکھ مویشیوں کا علاج کیا گیا ہے۔

سیلاب سے متاثرہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ سہولت بہم پہنچانے کے لیے حکومت نے متعدد اہم فیصلے بھی کیے ہیں۔ جن کے تحت سیلاب سے متاثرہ لوگوں کے لیے مفت مالی امداد کی زیادہ سے زیادہ رقم ۱۰۰ روپے سے بڑھا کر ۱۵۰ روپے کر دی گئی ہے۔ مرنے والے افراد کے خاندانوں کو فی خاندان ۱۰۰۰ روپے تک کی مالی امداد دینے کا بندوبست بھی کیا گیا ہے۔ ان مکانات کے سلسلے میں جنھیں سیلاب سے نقصان پہنچا ہے، امداد کی رقم کچے مکانوں کے لیے ۳۰۰ روپے سے بڑھا کر ۵۰۰ روپے اور پختہ مکانوں کے لیے ۴۰۰ روپے سے بڑھا کر ۸۰۰ روپے کر دی گئی ہے۔ پہاڑی علاقوں میں پختہ مکانوں کے لیے یہ رقم ۱۰۰۰ روپے ہو گی۔ اس امداد کے استحقاق کی شرائط بھی نرم کر دی گئی ہیں۔ ان لوگوں کے لیے جو مکانات سے متعلق امداد کے استحقاق کے دائرہ میں نہیں آتے، قدرتی آفات تقاوی کا بندوبست کیا گیا ہے۔ مکان کے لیے اس کی شرح زراعت پیشہ افراد کے سلسلے میں ۵۰۰ روپے اور غیر زراعت پیشہ افراد کے لیے دیہی علاقوں میں ۲۵۰ روپیہ اور شہری علاقوں میں ۲۰۰۰ روپے سے ۳۰۰۰ روپے تک ہے۔ خشک سالی سے متاثرہ لوگوں میں بالکل بے سہارا افراد کو فی کس ۱۵ کیلو ماہانہ گیہوں مفت دینے کا جو بندوبست کیا گیا تھا وہ سیلاب سے متاثرہ افراد کے لیے بھی ہو گا۔ زرعی بقایا جات کی وصولی اس سال بھی ملتوی کر دی گئی ہے۔ جن مواضعات میں سیلاب سے فصل کو ۵۰ فیصد سے زیادہ نقصان پہنچا ہے وہاں کے طلبا کی فیس بھی معاف کر دی گئی ہے۔

اس طرح اتر پردیش کی موجودہ حکومت اپنے تمام تر وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے سیلاب سے متاثرہ لوگوں کو ہر ممکن راحت، امداد اور سہولت پہنچانے کے لیے پوری طرح کوشاں اور سرگرم ہے۔ سیلاب کا پانی جمع ہو جانے کے سبب پھیلنے والے متعدی امراض کی روک تھام کے لیے ریاستی نظامت صحت نے اتر پردیش کے تمام چیف میڈیکل افسروں کو وسیع پیمانہ پر اقدامات کرنے کی ہدایت کی ہے۔ ابتدائی صحت مرکزوں پر تعینات صحت افسران اور دیگر ملازمین سے کہا گیا ہے کہ وہ اس سلسلے میں خصوصی اقدام کریں۔ اس کے علاوہ حکومت نے سیلاب کے سلسلے میں راحت رسانی کے کام میں لگے افسروں اور ملازمین کو یہ آگاہی بھی دی ہے کہ راحت رسانی اور بچاؤ کے کاموں کے سلسلے میں کسی طرح کی غفلت اور تساہلی برداشت نہیں کی جائے گی۔

وفیات

اردو کے بزرگ ادیب اور شاعر یکے بعد دیگرے اٹھتے جا رہے ہیں۔ اس سے اردو ادب میں جو خلا پیدا ہو رہا ہے وہ شاید ہی پُر ہو سکے۔
گذشتہ دنوں ل۔ احمد اکبرآبادی اور علامہ جمیل مظہری بھی داغ مفارقت دے گئے:

(باقی صـ ۲۳ پر)

فضا ابن فیضی
مئوناتھ بھنجن - ۲۷۵۱۰۱ (یو-پی)



غزل

اس نے سمجھا تھا مجھے بھی کوئی پتا سوکھا
مجھ کو توڑا تھا کہ بس ہاتھ ہوا کا سوکھا

اب کے ساون میں ہے یہ زہر کی خوشبو کیسی
پہلی بارش میں جو بھیگا وہی پودا سوکھا

یوں بھی آؤ کہ نئے دور کا منظر دیکھیں
رکھ لیں پلکوں پہ کوئی برگِ تماشا سوکھا

خود کو تخلیق کے شعلوں میں ڈبوئے رکھو
جل بجھوگے، جو یہ احساس کا سوتا سوکھا

زندگی بھی ہے کسی ریت کے دریا کا سفر
موج در موج رہا، پھر بھی ہوں سوکھا سوکھا

جلتے موسم کا تو بوسہ تھا طرب ناک بہت
یہ الگ بات، رہا ہونٹ ہمارا سوکھا

لب کھلے تھے کہ لہو پھیل گیا چار طرف
وقت کیوں مجھ سے کرے کوئی تقاضا سوکھا

وہ تو عادی تھا سرابوں کے سفر کا، لیکن
اب سمندر میں کہاں ڈھونڈھتا رستا سوکھا

ہم بھی زندہ ہیں، جو زندہ ہے کمی کا احساس
خوش ہے دریا کہ ملا اس کو کنارا سوکھا

ہوسِ جسم کا دونوں ہی پہ یکساں ہے دباؤ
تو سلگتا ہوا جنگل ہے، میں صحرا سوکھا

آج لفظوں میں ہے مفہوم کی وہ صورتِ حال
جس طرح بیچ سمندر میں جزیرا سوکھا

ہوں گھنا سایہ، مگر یہ بھی تو پوچھو مجھ سے
میں یہاں فن کی کڑی دھوپ میں کتنا سوکھا

ہے فضا اپنی جگہ ایک توازن کی مثال
جتنا تازہ ہے دماغ، اتنا ہی چہرا سوکھا

ڈاکٹر ثمینہ شوکت
بیت ثمین، ۲-۲-۲۰۸/۲، [illegible] نگر
حیدر آباد

غالب ایک کلچر

ہندایرانی تہذیب اور مغل کلچر کے جلال و جمال کی یادگاریں لال قلعہ دہلی یا آگرہ کا تاج محل ہی نہیں، تیموری افرایسابی خاندان کے چشم و چراغ غالب کی شخصیت بھی ہے جو اپنی ذات سے ہندایرانی تہذیب کا ستون اور ہندستان کے تہذیب باشان کلچر کا روشن منارہ ہے۔ ہندایرانی کلچر جو غالب کی شخصیت میں مجسم ہوگیا ہے۔ تاج محل ہی کی طرح عجیب و غریب ہے جو وہاں رگِ سنگ میں منجمد ہے تو یہاں رگِ جاں میں جاری و ساری ہے اور لال قلعہ کی طرح رفیع اور عظیم ہے۔

کلچر، اپنی بنیاد میں ایک ذہنی کیفیت ہے۔ یہ ذہنی کیفیت انسانی زندگی میں مسرت و شادمانی اور خیر کی تلاش ہے خوشی، حسن اور خیر مادی، ماورائی دونوں نوعیت کے حامل ہوتے ہیں۔ مادی خوشی عموماً مادی فراغتوں پر مبنی ہوتی ہے اور مادی حسن مادی تعمیر کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ جیسے تاج محل یا لال قلعہ، جو کہیں جمال محبت کا اظہار ہے اور کہیں جلال خسروانہ کا آئینہ دار ہے لیکن ماورائی مسرت ایک برتر نوعیت کی حامل ہوتی ہے جس کا تعلق قلب و ذہن کی زندگی سے ہوتا ہے۔ قلب و ذہن کی زندگی، جذب و شوق اور سوز و آرزومندی سے عبارت ہوتی ہے۔ اس طرح کلچر مادی اور ماورائی دونوں حیات میں نور اور حلاوتِ حیات کے ان تھک تعاقب کا نام ہے۔ یہی تلاش اور تعاقب، میرے خیال میں غالب کی تمام زندگی اور زندگی کی تمامتر سرگزشت کا حاصل ہے۔

ماضی کے موروثی ورثے کے طور پر غالب کو خاندانی اور نسلی برتری کی مسرت نصیب تھی۔ ان کی شخصی اور انفرادی زندگی کی بھی کچھ تمنائیں تھیں۔ مادی اور ماورائی دونوں طرح کی اور یہ تمنائیں ان کے فطری ذوقِ جمال کی پیدا کردہ تھیں۔ انھیں اپنی داخلی اور مجلسی و خارجی زندگی میں ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو رہی۔ یہی جستجو میرے خیال میں ان کے قصرِ شاعرانہ کی تعمیر کا سبب تو ہوئی لیکن اس کے ساتھ ہی ان کے قصرِ زندگی میں یہی خرابی کا باعث بھی بنی۔

غالب کا عہد مغلیہ سلطنت کا آخری زمانہ تھا جب شمع شوکت و سطوت جھلملا رہی تھی۔ وہ دہلی جو عظمت، شوکت اور دل آویزی کے اعتبار سے "سوادِ رومۃ الکبریٰ" سے کم نہیں تھی اپنی عظمت رفتہ کی نوحہ خواں بن چکی تھی۔ ۱۸۵۷ء کا قیامت خیز ہنگامہ ہندستان کی سیاسی تاریخ میں مغل اقتدار کے مکمل خاتمہ اور انگریزوں کے مستحکم تسلط اور قانونی اقتدار کی بیّن فتح تھی۔ مغل نظامِ سیاست کے تحلیل ہونے کے ساتھ زندگی کی تمام ہندستانی روایات بھی تحلیل ہوتی معلوم ہوتی تھیں، ایک بساطِ سیاست کے الٹنے سے بساطِ زندگی درہم برہم ہوگئی، معیشت، معاشرت سب ہی کے طور بدلے شکست خوردہ ہندستانیوں کے لیے یہ سخت تشویش اور تشکیک کا زمانہ تھا۔ جس کے نقوش اس دور کی شاعری، صناعی اور ادب میں بھی نظر آتے ہیں۔

غدر سے تقریباً ساٹھ سال پہلے سن ۱۷۹۷ء میں آگرہ میں غالب

کی ولادت ہوئی۔ خاندانی سلسلہ سلجوقی، افراسیابی ایک ترکمانوں سے ملتا ہے۔ جن کے زیرنگیں کبھی پورا برصغیر تھا۔ غالبؔ کے دادا شاہ عالم ثانی کے زمانے میں سمرقند سے ہندستان آئے اور دربار سے منسلک ہو گئے۔ والد عبداللہ بیگ دربار اودھ اور بعد دربار نظام علیخاں آصف جاہ ثانی سے وابستہ رہے۔ آخری زمانے میں راجہ بختاور سنگھ کے ملازم ہوئے اور ایک لڑائی میں مارے گئے۔ والد کے انتقال کے بعد چچا نصر اللہ بیگ نے جو انگریزی فوج میں چار سو سوار کے بریگیڈیر یا رسالدار تھے کفالت اور تعلیم و تربیت کی ابھی نو برس کی عمر تھی کہ چچا کا بھی انتقال ہو گیا۔ چچا کی جاگیر کے عوض انگریزی سرکار سے پنشن مقرر ہوئی۔ پرورش ننھیال میں ہوئی۔ سنہ ۱۲۲۵ھ میں یعنی تیرہ برس کی عمر میں دہلی کے نواب الٰہی بخش خاں معروف کی لڑکی امراؤ بیگم سے شادی ہوئی۔ شادی کے بعد آگرہ چھوڑ کر دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ کچھ دنوں بعد وہ پنشن بند ہو گئی جو چچا کی جاگیر کے عوض ملتی تھی لیکن دربار دہلی، اودھ، رامپور سے کچھ روپے ملتے رہے جو غالبؔ کی فراخدلی اور شاہ خرچی کے پیش نظر ناکافی ثابت ہوئے لیکن غالبؔ کے کلچر کی یہ بھی چند قدریں تھیں جن سے ان کی زندگی کو ایک نشاطیہ کیفیت نصیب ہوئی تھی چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیے ہیں بہ قدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بنوں اگر تمام میں نہ ہو سکے نہ سہی جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو کوئی بھوکا اور ننگا نظر نہ آئے ـــ خدا کا مقہور ...... وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیک مانگے وہ میں ہوں۔"

عدم تشدد کے پجاری مہاتما گوتم بدھ نے کہا تھا: "زندگی میں آرزو، زندگی کی لعنت ہے۔" آرزو لعنت ہی سہی لیکن آرزو انسان کی سرشت ہے۔ انسانی طبائع کے اعتبار سے اس کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ یہ وہ امرت ہے جو انسان کو بوند بوند عزیز ہوتا ہے۔ اس کی محرومی زندگی میں ایسا زہرِ غم گھول دیتی ہے جس سے دل تا جگر ساحلِ دریائے خوں بن جاتے ہیں۔ کبھی پاسِ تمنا سے دین و دنیا دونوں لٹ جاتے ہیں۔ دونوں کی غارت گری ہوتی ہے۔ تاہم یہ بھی یقین تھا۔

اسدؔ شکوہ کفر و دعا ناسپاسی
ہجومِ تمنا سے لاچار ہیں ہم

غالبؔ نے بھی آرزو کی تھی۔ دولت اور حکومت ان کے اجداد کی میراث تھی جو ان کے نصیب میں نہ آئی۔ دنیا میں عزت و شہرت اور دل کو دولتِ محبت کی آرزو تھی۔ یہ وہ حرفِ تمنا تھے جو سب کے روبرو کہے بھی نہیں جا سکتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ غالبؔ وہ انداز بیان اختیار کرتے ہیں جو ان کے شخصی وقار اور ان کے نفسیاتی نزاعوں کی پردہ داری کرتا ہے۔ حقائقِ حیات سے ناآسودہ ہو کر شاعری میں پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ کچھ اس سے مدعا عرض ہنر نہیں تھا۔ شاعری ان کے ذہن کا ایک مخصوص ردِ عمل تھی۔ ایسا ردِ عمل جو تشنہ کامیِ تمنا یا شکست خوردہ آرزوؤں کا پیدا کردہ تھا۔ شجاعت علی سندیلوی نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"غالبؔ زندگی سے بہت کچھ چاہتے تھے۔ شہرت، محبت دولت۔"

میں کہتی ہوں کہ اعمال اور ارادوں کی آزاد قوتیں سب کی طرح غالبؔ کو بھی نصیب ہوئی تھیں وہ کیوں نہ "بہت کچھ چاہتے"! لیکن زندگی کی بے درد حقیقت یہ تھی کہ ان کے اسلاف کی عزت و جاہ اور ان کے شخصی وقار میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ غالبؔ کو اس فرق کا احساس تھا اور جانگسل احساس تھا۔ تاہم یہ احساس معاشرتی زندگی میں انتشار کا موجب نہ بن سکا یہی غالبؔ کا کلچر ہے۔ ارادے بے رحم حالات کی زد میں آکر ٹوٹتے رہے ارادے اور آرزو کی شکست غالبؔ کو واماندہ و افسردہ نہ بنا سکی۔ آرزو اور آرزو کی ناتمامی کا احساس قلب و ذہن کے لیے ایک قیامت ہے لیکن غالبؔ کا ضبط و تحمل اور اخلاقی اقدار کا پاس و لحاظ انھیں فروتر، مہمل یا رکیک رویے تک آنے

نہیں دیتا ۔ ناگوار کو گوارا ناپسندیدہ کو پسندیدہ بنا لینا، ضبط کے وہ انداز ہیں جو غالبؔ کو مجسّم تہذیب و شائستگی بنا دیتے ہیں ۔

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دل کشا کہیے

اے آرزو شہیدِ وفا خوں بہا نہ مانگ
جز بہرِ دست و بازوئے قاتل دعا نہ مانگ
کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

اور اس شعر کے تیور اور حوصلہ بھی دیکھیے :

جاں مطربِ ترانۂ ہل من مزید ہے
لب پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں

آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفرؔ کے دربار سے غالبؔ کی وابستگی شاہانِ تیموریہ کی تاریخ لکھنے کی بدولت ایک مورخ کی حیثیت سے تھی ۔ گویا ان کی شاعر کی حیثیت اُن کے معاصر ذوقؔ کے آگے مسلّم نہیں تھی ۔ ذوقؔ " استادِ شہ " تھے اور غالبؔ مورخ شہزادہ جواں بخت کی شادی کی تہنیت میں دونوں نے سہرے کہے ۔ مقطع میں غالبؔ نے ایک سخن گسترانہ بات کہہ دی :

ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے بڑھ کر کوئی کہدے سہرا

ذوقؔ اور ان کے حواری بھلا یہ کیوں کر گوارا کرتے ۔ اس پر مستزاد ہرزہ سرایانِ دہلی نے سخن گسترانہ بات کو " استادِ شہ " سے پرخاش کا نام دیا ۔ غالبؔ کو سخن سنجی اور سخن فہمی کا خمیازہ بھگتنا پڑا اور معذرت کرنا پڑی ۔

مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے
روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں، جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے

تصادمِ اغراض کا نتیجہ شخصی دشمنی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے ۔ لیکن غالبؔ اپنے مخصوص کلچر کی بدولت اپنے کسی رویے میں بھی سودائی، جنونی بھونڈے یا بے راہ اور بے قرینہ نہیں ہونے پاتے ۔ ایسے موقعوں پر وہ کچھ کہتے ہیں تو بس اتنا کہتے ہیں ؎

حسرت اے ذوقِ کمالِ سخن ہے کیا کیجے
ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کیجے

مخالفتوں کی مزاحمت میں غالبؔ نے کبھی غیر سماجی رویّہ اختیار نہیں کیا ۔ اپنے عزیزوں، دوستوں اور شاگردوں کو بھی وہ شخصی دشمنی سے باز رہنے کی تلقین کرتے تھے ۔ ایک عزیز کے نام لکھتے ہیں :

" تم نے اپنے ساتھیوں سے کہہ دیا ہے کہ مدبّر کو بازار میں بے حرمت کریں ۔ یہ بات خلافِ شیوۂ مومنین ہے ۔ یہ قصد نہ کرنا ۔ تم یوں تصوّر کرو کہ اس نام کا آدمی اس محلے میں بلکہ اس شہر میں کوئی نہیں ہے ۔"

غالبؔ کا یہ بیان بھی ملاحظہ ہو :

" میں جو اپنے عزیز کو نصیحت کرتا ہوں تو اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہتا ہوں کہ اے دل تو اپنے کو اس عزیز کی جگہ سمجھ ۔"

تعلیم و تلقین غالبؔ کے عقیدے کی رو سے دوستوں اور عزیزوں کے لیے ہوتی ہے ۔ خود غلطی پر نہ رہو اور غیر کی غلطی سے کام نہ رکھو یہ غالبؔ کا اخلاقی نظریہ تھا ۔ ہرگوپال تفتہ کو ایک خط میں انھوں نے اسی کی تلقین کی تھی ۔ دوسروں کی خوشی کو اپنی خوشی اور دوسروں کی خامیوں کو اپنی خامیاں بنا لینا چاہیے ۔ ذاتی اغراض سے بے نیاز اور فریضہ کی خاطر انجام دیا ہوا عمل غالبؔ حسنِ عمل

جانتے تھے۔ طاعت برائے طاعت اور بندگی برائے بندگی کے قائل تھے اجرت کے طالب نہ تھے۔ عمل نیک یا خیر اور نیکی کو نجات کی راہ سمجھتے تھے ورنہ دنیا تو "حلقۂ دامِ خیال" سے زیادہ نہیں:

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی   حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ   عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

خطا کاروں سے درگزر کرنا، اپنے اور پرائے کا غم کھانا، عزیزوں، محتاجوں کی مدد کرنا، مصیبت میں کام آنا، عیوب کی پردہ داری کرنا، دشمنی کا جواب خلوص اور محبت سے دینا، انسانی نفسیات کی وہ بلندیاں ہیں جن کی جانب رہنمائی بھی غالبؔ کے کلچر کا بڑا کارنامہ ہے:

جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنیے
جو ناسزا کہے اس کو نہ ناسزا کہیے
رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجیے
کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے۔

نہ سنو گر برا کہے کوئی   نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی   بخش دو گر خطا کرے کوئی

غالبؔ کو دراصل انسان عزیز تھے اور اس خصوص میں ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی، نصرانی کا کوئی امتیاز نہیں تھا۔ اپنے زمانے کے ہندوؤں سے ان کے مراسم عزیزوں جیسے تھے۔ منشی شیو نرائن انھیں اپنے بچوں کی طرح عزیز تھے۔ مرزا تفتہ کے نام خط میں لکھتے ہیں:

"بندہ پرور، میں تو بنی آدم کو مسلمان یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں۔ دوسرا مانے یا نہ مانے۔"

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

غالبؔ کے خطوط بھی ان کی رواداری، ایثار و کرم، مہر و محبت اور غم خواری و یگانگت، حسنِ معاملہ اور پاسِ وضع کے بہترین درس ہیں۔ وسعتِ سعی کرم کا حال یہ تھا کہ ان کے در پر محتاجوں، معذوروں، اندھوں اور لنگڑوں، لولوں کی ایک بھیڑ لگی رہتی تھی، جو غالبؔ خستہ کی داد و دہش اور بخشش و کرم سے فیض یاب ہوتے تھے، غالبؔ کے کلچر میں دل آزاری بڑا گناہ تھا کہیں یہ بات بھی ان کے ذہن میں بیٹھ گئی تھی کہ انسانوں کی آزمائش کے لیے فقیروں کے بھیس میں کبھی کوئی پراسرار وجود بھی ہوتا ہے۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

غدر کے بعد ایسا بھی اتفاق ہوا کہ جب لفٹننٹ گورنر کے دربار سے غالبؔ کو خلعت مع جواہرات کے ملے۔ غالبؔ کے پاس چپراسی اور جمعداروں کو قاعدے کے مطابق انعام دینے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ انھوں نے دربار سے آتے ہی خلعت اور جواہرات بازار میں فروخت کے لیے بھجوا دیے اور فروخت ہونے کے بعد جب رقم آئی تو چپراسیوں کو انعام دیا۔

قلعۂ معلیٰ سے جو تعلق تھا غدر ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد وہ بھی ٹوٹ گیا۔ بہادر شاہ ظفر قید کر کے رنگون بھیج دیے گئے۔ دہلی کے مکان و مکین، آسمان و زمین، اور آثارِ ہستی سب لٹ گئے۔ ان حالات میں ہر ہندستانی قلزمِ خون کا شناور تھا اور انگریزی نظر میں بغیر جرم کے مجرم بھی تھا اور خاص ملازمانِ قلعہ پر سختیوں میں شدت تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر بازپرس ہوتی اور معتوب ہوتے۔ غالبؔ انگریزوں سے سستے سمجھوتوں کے مقابلے میں راست کرداری اور راست گوئی پر قائم رہے۔ اس فتنۂ آشوب میں کہ کسی کو لب

کھولنے کی بھی مجال نہ تھی۔ انھوں نے کسی مصلحت کو دخل نہ دیا۔ وہ خطوط جو غالب نے غدر کے دوران یا بعد میں لکھے ہیں ایک طرح سے غدر کی قیامت خیزیوں کی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انگریزوں نے حکومت چونکہ مسلمانوں سے چھینی تھی اسی لیے مسلمان ہی سب سے زیادہ مظالم کی زد میں تھے۔

ایک شعر ہے سہ

شہرِ دہلی کا ذرہ ذرہ خاک
تشنۂ خوں ہے ہر مسلمان کا

غالب اس زمانے میں دہلی میں رہے۔ وطن اور یارانِ وطن کی پائمالی دیکھی۔ بہاروں کے کارواں ان کی نظر کے سامنے لٹ گئے۔ فتحِ شہر کے بعد مکانات ڈھائے گئے۔ نعشوں سے کنوئیں پٹ گئے۔ پانی کھاری ہو گیا۔ کوئی مسلمان شہر میں بغیر پروانۂ راہداری کے پھر نہیں سکتا تھا لیکن غالب اس کلیے سے مستثنیٰ تھے۔ کیونکہ کچھ انگریز ان کے دوست اور کچھ شاگرد بھی تھے۔ مہدی مجروح کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرائے لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو ہو کا مقام ہو جائے۔

یاد کرو مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا۔ اب وہ باغیچے کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں۔ باقی سب اٹ گیا ــــ پنجابی کٹرہ، دھوبی واڑہ، رام جی گنج، سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب کا باغ ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا ــــ"

اور علاء الدین علائی کے نام لکھتے ہیں:

"وہ دلی نہیں ہے جس میں تم پیدا ہوئے ہو۔ وہ دلی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا رہا ہوں۔ ایک کیمپ ہے۔"

وہ اپنے خطوط میں دل کے غم سے خوں ریز ہونے کا ذکر کرتے ہیں اور اس کی بھی صراحت کرتے ہیں کہ یہ نہ سمجھو کہ میں اپنے غم میں مرتا ہوں۔ اگرچہ غالب کی خارجی دنیا میں کچھ ان کے اپنے غم بھی تھے۔ ـ جیسے زمانے کی ناقدردانی، سرپرستوں کی بے التفاتی، پنشن کی موقوفی اور قرض خواہوں کے مطالبات، اور تقاضے جو غالب جیسے نسلی نخوت رکھنے والے حساس کے لیے مستقل ایذا سے کم نہیں تھے۔ تاہم اس دعوے کے باوجود کے شکوے کے فن کو سوائے میرے کوئی نہیں جانتا۔ اس طرح شکوہ سنج ہوتے ہیں کہ صدف کی قید گوارا کر لینے والے قطرۂ نیساں کو تو دنیا موتی کہتی اور ہاتھوں ہاتھ لیتی ہے۔ لیکن اپنی آزادی نہ بیچنے والے قطرے کو اشک سمجھ کر خاک میں ملا دیتی ہے:

بسکہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے
جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

حوصلوں کی ناکامی اور آرزؤں کی نامرادی و ناآسودگی یہ سماجی زندگی کی وہ بے درد حقیقتیں تھیں جنھوں نے غالب کے نشیمنِ حیات میں چنگاریاں سی بھر دی تھیں۔ امراؤ بیگم جیسی سیدھی سادی متقی خاتون کے ساتھ شادی بھی غالب آشفتہ سر رنگیں مزاج و رنگیں نوا کے حق میں مشیت کا ایک مذاق تھا۔ تاہم غالب نے جس طرح امراؤ بیگم کے آرام و آسائش کا خیال رکھا، ان کی دلجوئی ملحوظ رکھی اور احترام روا رکھا اسے ایک نہایت مہذب اور شائستہ انسان کا رویہ کہا جا سکتا ہے۔ پندرہ برس کی عمر سے پچھتر برس کی عمر تک شعر کہتے رہے۔ نظم و نثر کی داد نہیں پائی۔ عرضِ ہنر کا صلہ ہی نہیں ملا۔ کمال سخنے

(بقیہ صفحہ ۴۲ پر)

خضرؔ برنی
معرفت "لہریں" جامعہ نگر،
نئی دہلی ۲۵

غزلیں

ہستی میں اپنی حرف و حکایت ہوں دوستو
میں کیسی نامراد عبارت ہوں دوستو

جینے کی آرزو ہے نہ مرنے کا حوصلہ
روزِ ازل سے غم کی امانت ہوں دوستو

کیسے ہو ناگوار مجھے تلخیٔ حیات
پیمانِ زندگی کی علامت ہوں دوستو

چھیڑے نہ مجھ کو گردشِ دوراں سے یہ کہو
طوفاں ہوں، حشر ہوں، میں قیامت ہوں دوستو

محوِ نیاز و نازِ محبت ہوں مستقل
دیکھو مجھے کہ نقشِ زیارت ہوں دوستو

ہر گام زندگی نے دیئے ہیں بہت فریب
پھر بھی تو آج تک میں سلامت ہوں دوستو

مجھ کو خضرؔ کے نام سے پہچانتے ہیں لوگ
بدنام ہو کے رشکِ خطابت ہوں دوستو

خورشید افسر بسوانی
بسواں - سیتاپور

اک ایسی جنگ تھی میرا ہی سر خالی گیا
تیر میں نے بھی چلایا تھا مگر خالی گیا

تو بھی پچھتائے گا مجھ کو زد کے باہر دیکھ
دکھ مجھے بھی ہوگا تیرا وار اگر خالی گ

میں ہمیشہ چند یادیں لے کے لوٹا ہوں مگر
اک دل تھا کچھ اداس، اک سفر خالی گیا

کچھ پتہ ہے تجھ کو کیا کیا پا گئے اربابِ ہوش
اٹھ کے اس محفل سے تو ہی بے خبر خالی گ

چند سکے تھے مگر سکوں کی اب قیمت ہی کیا
آج بھی بازار سے میں اپنے گھر خالی گیا

کوئی چوٹ ابھری، نہ افسردہ ہی جاگا کوئی
اب کے پُروائی کا موسم کس قدر خالی گیا

ساغر مہدی
سیدواڑہ، بہرائچ

ریاضؔ جرولی ـــــ ایک طنز نگار

وہ حضرات جنہوں نے اودھ پنچ، لکھنؤ اور ظرایف دھلی کی پرانی فائلیں دیکھی ہیں ریاضؔ جرولی کے نام اور کام سے یقیناً واقف ہوں گے۔ اودھ پنچ کے مستقل قلمی معاونین کی فہرست میں شامل ہونے کے علاوہ ریاض جرولی، اودھ پنچ کے نامہ نگار خصوصی بھی تھے۔ اپنی طنزیہ اور مزاحیہ نظموں میں کہیں کہیں ریاضؔ کے بجائے فریسؔ تخلص بھی فرمایا۔

اودھ کے قصبات میں جرول اپنے دور کا ایک بڑا علمی اور تہذیبی مرکز رہا ہے جو آج بھی دریائے گھاگھرا کے کنارے بہرائچ ضلع کا ممتاز قصبہ ہے۔ مگر گردش ماہ و سال نے علم و ادب کے اس آئینہ خانہ کو دھندلا کر دیا جو کبھی شعر و ادب کا گہوارہ تھا۔

ایسے ہی علمی و ادبی اور شاعرانہ ماحول میں سید ریاض علی ریاضؔ جرولی پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید حسینؓ علی تھا۔ ابتدائی تعلیم اردو، فارسی اور عربی کی مدرسہ یا کالج میں نہیں بلکہ گھر ہی پر حاصل کی اور بغیر کسی سند کے فارغ التحصیل ہوئے۔ حضرت ریاضؔ خاندانی طور پر رئیس تو نہ تھے مگر ان کے دادا کے زمانہ سے ایک رئیس خاندان سے ایسا رابطہ چلا آ رہا تھا کہ دونوں خاندان ایک جان دو قالب ہو گئے۔ چنانچہ ریاض صاحب نے ریاست کی فضا میں آنکھیں کھولیں اور جوانی کے عالم تک رئیسانہ ٹھاٹھ باٹ کے ساتھ بسر کی۔ تقریباً ستاون برس کی عمر میں جب زمینداری کا خیمہ اکھڑا اور افلاس کے سایہ نے خاندان پر شامیانہ کیا تو گھبرا کر لکھنؤ سدھارے، وہاں صاحبان علم و ذوق سے ربط ضبط پیدا ہوا۔ خاص طور سے حکیم صاحب عالم صاحب مالک معدن الادویہ وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ سے بہت گہرے تعلقات ہو گئے۔ حکیم صاحب عالم صاحب اپنے دور کے بڑے باکمال شخص اور اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ ان کا مطب مشاہیر شعراء اور ادباء کا مرکز تھا۔

ریاضؔ صاحب نے ان صحبتوں سے بہت کچھ حاصل کیا مگر جب حکیم صاحب عالم صاحب تقسیم ملک کے بعد پاکستان ہجرت کر گئے تو گویا ریاضؔ جرولی کی دنیا اجڑ گئی۔ بالآخر ۱۹۶۴ء میں انتقال کر گئے اور کربلائے ملکہ جہاں میں سپرد خاک ہوئے۔

شاعری کی ابتدا سنجیدہ غزلوں سے کی اور سید فضل مہدی صاحب نسیمؔ جرولی جو مرزا دبیرؔ کے شاگرد تھے سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ حضرت نسیمؔ جرولی قصبہ جرول کے صاحب طرز شعرا میں تھے۔

محض علمی مشاغل کی بنا پر جناب ریاضؔ جرولی اور ٹھاکر اصغر علی صاحب تعلقدار پٹرہا بہرائچ سے گہرے مراسم تھے۔ پس ان کی فرمائش پر ریاض صاحب نے سید سالار مسعود غازی کی منظوم تاریخ لکھی۔ اور ٹھاکر صاحب نے ازراہ عقیدت اس نظم کو مزار شریف کی نذر کر دیا جو عرصہ تک کتب خانۂ مسعودیہ کی زینت رہی پھر کوئی عقیدت مند اس کو تبرک سمجھ کر اڑا لے گیا۔

علمی و ادبی مشاغل کے علاوہ طبیعت میں صناعی اور فنکاری بدرجہ اتم موجود تھی۔ خصوصاً علم خطاطی اور طغرا نویسی ان کے خاص مشاغل تھے۔ اپنی زندگی میں بقول یحییٰ علی جعفری صاحب سیکڑوں

بے مثل طغرے تیار کیے۔

روضۂ شاہ نجف لکھنؤ میں آویزاں چند طغرے آج بھی موجود ہیں حقوق کے بچوں پر طرح طرح کے ڈیزائن کاغذ پر رنگا رنگ گلدستے، نمونوں کے جاذب نظر خاکے اور خوش نویسی کے جدید نمونے تیار کرنا ان کے خاص مشاغل تھے۔ مگر اپنی عسرت اور تنگدستی کے زمانے میں بھی اپنی اس ہنرمندی اور فنکاری سے کوئی فائدہ اقتصادی اور معاشی نہ اٹھایا۔

"اودھ پنچ لکھنؤ" جس زمانہ میں عروج پر تھا۔ حضرت ریاض اس کے نامہ نگار خصوصی تھے۔ مگر اپنی شاعرانہ اور طنزیہ تحریروں کی بنا پر منشی سجاد حسین صاحب مدیر اودھ پنچ سے بہت قریبی مراسم ہو گئے اور ان کی طنزیہ اور مزاحیہ نظمیں اودھ پنچ کی زینت بننے لگیں۔ اس کے علاوہ اس دور کے ایک اور مزاحیہ جریدے ظریف دہلی میں بھی وہ پابندی سے لکھتے تھے۔

"اودھ پنچ اور ظریف" کی مکمل فائلیں ان کے پاس محفوظ تھیں مگر عسرت کے زمانے میں ریاض صاحب نے وہ تمام جلدیں لکھنؤ یونیورسٹی کی لائبریری کے سپرد کر دیں جو اب بھی وہاں موجود ہیں۔

حضرت ریاض خیر آبادی نظم و نثر دونوں ہی میدانوں میں صاحب طرز طنز نگار تھے۔ اگرچہ نظموں اور غزلوں کا ایک بڑا حصہ سنجیدہ غزلیات قصائد اور رباعیات پر مشتمل ہے۔ اپنے استاد حضرت تسلیم خیرآبادی کی موت پر ان کا ایک قطعۂ تاریخ ملاحظہ کیجیے۔

قطعہ تاریخ

مقیم خلد بریں فضل ہدیٰ مغفور
خدا پرست جگر گوشۂ جناب اثیم

بہار باغ سخن خوشہ چین خرمن ادب
گل نہال ادب فخر خاندان شمیم

فرشتہ خصلت دہر دعزیز نیک مآل
بزرگ سایۂ رحمت پئے قسیم و حکیم

سراج بیت جناب بلیغ طاب ثراہ
برادر برادر ذی رتبہ سلیم و فہیم

ریاض مصرع تاریخ گفت ہاتف غیب
نسیم خلد علا میزبان روح نسیم

۱۳۷۹ ہجری

دوسرا حصہ مزاحیہ شاعری کا ہے۔ سنجیدہ شاعری کا مجموعہ جس کو انھوں نے بہت خوبصورت اور خوشخط طور پر تیار کیا تھا۔ ان کے بھانجے یحییٰ علی صاحب جعفری کے پاس محفوظ ہے۔ مزاحیہ غزلوں کا ایک مجموعہ "دیوان فرہاد" کے نام سے ترتیب دیا تھا جو تلف ہو گیا۔ یعنی حضرت ریاض کے ورثا یا پرستاروں کی تحویل میں نہیں بلکہ کہاں ہے۔ اس کا کسی کو علم نہیں۔

مزاحیہ و طنزیہ کلام کے دو مجموعے مسکدہ اور تفریحات ریاض محفوظ ہیں۔ آئیے ان کی نثر کا ایک نمونہ ملاحظہ کیجیے۔ جو قصبہ کے ایک رئیس خسیس کے گھوڑے کی موت پر مرثیہ کا پیش لفظ ہے۔

"شہسوار توسن خیال ران پڑی سے درست پاس باگ سے چست، لجام تخیل ہاتھ تھامے میدان فکر میں پڑا کا عزم ہے کہ دنیا میں موت و زندگی کا ساتھ ہے۔ شادی کے ہاتھ میں ماتم کا ہاتھ ہے۔ یہی رفتار ابلق ایام دہر ہے۔ کہیں خزاں ہے تو کہیں بہار ہے۔ چنانچہ ہمارے ایک عجیب الفطرت نادر خصلت دوست نے حاتم کی گور پر دولتی جھاڑی ہیچ دستی سے سخاوت کی بیخ نوں کھاڑی۔ اسباب جاہ و حشم میں گھوڑے کی زیادتی فرمائی کہ ڈگڈا رئیس کا ٹھکا کری کہ ہنہنانگ بڑے موٹھڑوں سے بے تنگ۔ کم خواب شب کو، منھ زور طبع پنج رہوار سستے داموں مول لیا۔

مرزا محمد رفیع سودا نے اپنے قصیدہ میں مبالغہ سے کام لیا تھا مگر بندۂ درگاہ نے وہی حال اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ سہ

فاقوں سے ہنہنانے کی طاقت نہیں رہی
گھوڑی کو دیکھ دیکھ کے ....

(مرزا رفیع سودا)

ظاہر ہے کہ ایسے رہوار کو موت کا ہم عناں ہو کر رمنا کی راہ لگنا چاہیے تھا۔ آخر کار قابض ارواح اجل کی باگ ڈور بے لیے

کرم کرم ہی کا تو سہارا دکھاتا آ پہونچا اور صحرائے خموشاں کی کالی بادیوں
میں بھٹک گیا چونکہ یہ سانحہ اپنی نوعیت میں کوئی "معمولی سانحہ"
نہ تھا۔ لہٰذا ایک سوار اسپ تفنن نے اشہبِ خیال کو تفکر کا
کوڑا رسید کیا اور فریس شاعر نے لگے ہاتھوں سرپٹ رفتار
سے ایک مرثیہ لکھ ڈالا۔"

"کہیں کہیں سے چند بند ملاحظہ کیجئے۔" سہ

فرس نامہ

دنیا سے ایک دوست کا گھوڑا گزر گیا
بوسٹے عیال رو کے کہ رہوار مر گیا
افسوس آج دھقان کو ویران کر گیا
داغ فراق دے کے نہ جانے وہ کدھر گیا
کس سے کہوں میں جا کے سنا اپنے درد کو
لوگوں کہاں سے پاؤں میں اب غازی مرد کو

ہوگا نہ ایسا اسپ کوئی اس جہان میں
جب تک کہ جان باقی رہی اس کی جان میں
کچھ کھایا دھوکے سے کبھی نہ اپنے مکان میں
مالک سے مرتے دم کہا اپنی زبان میں
جو سانپ بیچا مراسن تو یہ غور سے
بعد فنا بچانا ...... کے چور سے

روکو فریس توسن خامہ کی اب لگام
بے چین ہو رہے ہیں بہت سامعین تمام
وہ اسپ خوش خرام و فلک سیر خوش خرام
کیا نام کر گیا ہے بڑھاپے میں لاکلام
لیڈر وہ سارے لاغروں کا خوشحال تھا
اپنے گروہ میں وہ عدیم المثال تھا

آئیے اب ایک پیرہن سال کے عقد آخر کی تقریب میں
شرکت کیجئے۔ جن کا سہرا حضرت ریاض نے یوں لکھا ہے۔

سہرا

پرشکن چہرہ پہ زیبا ہو یہ نادر سہرا
باندھیں گر آ کے حبیب ابن مظاہر سہرا
دل میں نوشاہ کے مدفون ہیں صدہا ارمان
بن گیا زینت محراب مقابر سہرا
ہر ورق گل کا مسل آیا ہے ارمانوں کی
دم بخود دیکھ کے ہیں اہل دفاتر سہرا
کیوں نہ ہر غنچے سے کافور کی خوشبو آئے
ہے رفیق سفر منزل آخر سہرا
پوپلے منہ پہ دولہن کو نہ ہو ظن باطل
درِ دندانِ مجازی کا ہے ساتر سہرا
در فردوس پہ کہتی ہیں یہ حوریں ہنس کر
باندھے آتا ہے وہ جنت کا مسافر سہرا
رات کو عقد ہوا اور تیغ طلاق پائی
یوں ہی بندھتا رہے یا رب متواتر سہرا
حوریں ہوں گائیں ساز بجائیں غلماں بھی ریاض
لطف کیا بڑھ دے اگر بندۂ قاصر سہرا

حضرت ریاض جودلی اپنے دور کے تمام سماجی اور معاشرتی
پہلوؤں کا گہرا شعور رکھتے تھے وہ اپنے دور کے چھوٹے چھوٹے واقعات
رسم و رواج اور سماجی ناہمواری کے پرانے ڈھانچوں کو یکسر توڑ دینا
چاہتے تھے مگر صالح اور خوبصورت روایات کے دلدادہ بھی تھے۔
ان کا تعلق اگرچہ جاگیردارانہ نظام سے تھا لیکن روایت شکنی
ان کے مزاج کا خاص پہلو تھا۔ مرثیہ خوانی و ذاکری جو صرف مذہبی عقائد
کی بنا پر کار ثواب باعث نجات اور حب اہلبیت کے اظہار کا وسیلہ
تھی جب کاروباری اور تاجرانہ رنگ اختیار کرنے لگی تو ریاض نے
یوں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

نامراد ذاکر

جب چاند محرم کا نظر آیا ستمظارا
اور مرثیہ خواں کا نہ رہا کوئی سہارا

جب کوچہ و بازار میں رو رو کے پکارا
اے صاحبو حصّوں پہ بھی پڑھوا لو خدارا
مجبور کا ہوں ٹی وی کا میں تشنہ دہاں ہوں
دو روٹیاں کھلوا دو کہ میں مرثیہ خواں ہوں

جو گوشیہ ٹوپی ہے مرے فرق پہ زرتار
رومال بھی شامی ہے مرے دوش پہ پُرکار
انگرکھا ہے تنزیب کا پاجامہ بھی بردار
جُراب بھی ہے پاؤں میں گرگابی ہے بیزار
اس ٹھاٹ پہ بھی کوئی تو پرساں نہیں ہوتا
پڑھنے کا ہمارے کوئی ساماں نہیں ہوتا

خدا عالموں سے میں نے سفارش کے بھی لکھوائے
خود کاغذی گھوڑے بھی ہر اک سمت کو دوڑائے
امکان میں جس قدر وسیلے تھے وہ پہنچائے
مقصد یہ تھا پڑھنے کا بلاوا کہیں سے آئے
قسمت کی مگر گتھیاں سلجھیں نہ کسی سے
عشرہ میرا خالی گیا مضطر ہوں اسی سے

لے دے کے سہارا ہے عطائے علماء کا
اب سوم کی اُجرت کا کروں جا کے تقاضا
مل جائے جو قسمت سے رقم خمس کی یکجا
دکان کروں پان کی کچھ تو ہو سہارا
ورنہ بسر اوقات کی صورت نہیں کوئی
دنیا میں بلا پیسے کے عزت نہیں کوئی

دولت کی عظمت اور ضرورت کا اعتراف حافظ و سعدی سے لے کر نظیر اکبر آبادی تک نے اپنے اپنے انداز میں کیا ہے۔ ریاض حسن جرولی نے بھی صحیفۂ زرّین کے عنوان سے ایک طنزیہ قصیدہ تحریر فرمایا اس کے چند بند پیش کیے جاتے ہیں ؎

صحیفۂ زرّیں

دل لبھا لیتی ہیں زاہد کا ادائیں اس کی
سارے نغموں سے بھی خوشتر ہیں صدائیں اس کی
سیم تن لیتے ہیں بڑھ بڑھ کے بلائیں اس کی
ہیں وفاؤں سے بھی پُرلطف جفائیں اس کی
دافع رنج و الم قاضی حاجات ہے زر
دافعِ فکر ہے حلالِ مہمات ہے زر

جس سے ناراض ہو یہ خلق خدا بھی ناخوش
باپ بھی، بھائی بھی دادا بھی چچا بھی ناخوش
اپنے بیگانے احبا رفقا رہتے ہیں ناخوش
عقل و دانش بھی خفا بخت رسا بھی ناخوش
زر سے محروم جو ہے قابلِ نفرت وہ ہے
اہلِ ثروت میں نہیں لائق عزت وہ ہے

مندرجہ بالا صاف ستھری اور پاکیزہ طنزیہ اور مزاحیہ تخلیقات کے علاوہ اودھ کے دیہاتوں کی خالص زبان میں بھی ریاض حسن صاحب نے اپنے جوہر دکھائے ہیں۔
شبرات کے متعلق ان کا ایک آلھا ملاحظہ کیجیے۔

آلھا

جگ مگ جگمگ لاگیں دیے دہن جلوا سے
دھڑ پڑ دھڑ پڑ آتش باجی بالک لوگ چھڑائے
سبرات آئی دھوم مچی تو سب کا سو جھا اونا سے
مردے آئے مو ہار اگھیرن حلوا دیو کھلا سے
پرچے لے لے ڈلیا پہونچے لاگے سب چلائے
گھر کی ملکن حلوا روٹی دے کے دہن سمجھائے
بڑکی بہنی حصہ کارن گیئل پر دس رسائے
دکھو منواں کی ہتیاری ان کا لاڈ منائے
کہیں ریاض اب سن لو بھیا بہت بڑی لو آئے
پیکرن ماں اب آپن دیہی بارٹھے لو رنہ مو ٹائے



۱؎ مطبوعہ طنز و مزاح نمبر نمکدان۔ لاہور۔

لاح الدین نیّر
۳۱ - ۶ - ۲۰ بازار روپ لال
بدرآباد -

غزل

س فصلِ گل کا ایسا ہی اک حادثہ ہوں میں
ہولوں کی پتیوں سے بھی کٹنے لگا ہوں میں

سند نشیں ہوں آج تو حیرت ہے کس لیے
فرشِ نگاہ دوست بھی برسوں رہا ہوں میں

دِ صبا کی طرح جو چھو کر گزر گئی
ب بھی اسی نگاہ کا اک سلسلہ ہوں میں

خوشبو تمہارے ہاتھوں کی دل میں اتر گئی
جتنے خطوط پاس تھے لوٹا رہا ہوں میں

ے وجہ وضع داری پہ الزام آگیا
الانکہ تیرے ساتھ ہی چلتا رہا ہوں میں

صدیوں تلک جو آئینہ خانوں میں بند تھی
اس ایک روشنی سے بھی اکثر ملا ہوں میں

ب تک رکھو گے مجھ کو اندھیروں میں دوستو!
برسوں تمہارے شہر میں جلتا رہا ہوں میں.

جب تاج ہی نہیں ہے تو بن باس کس لیے
نیّر خود اپنے گھر سے نکالا گیا ہوں میں

مناظر حسن شاہین ڈمراوی
پرائمری اسکول علاول پور
ڈاک خانہ نگواں - گیا
(بہار) ۸۰۵۱۲۸

شامِ تنہائی

افق میں آج کا یہ آفتاب ڈوب چلا
سنہری ہونے لگیں چوٹیاں پہاڑوں کی
دھواں سا پھیل گیا دور کہساروں میں
ہوائیں تھک سی گئیں ہو گئی فضا خاموش
سکوت چھانے لگا موج کی امنگوں پر
خموش سر کو جھکائے ہیں دیودار کے برگ
تصورات کے پردے پہ دھند چھانے لگی
کسی کو یاد بھی کرنے لگوں تو یاد نہ آئے
یہ وقت آیا ہے تنہائیوں کی شام لیے
غمِ حیات، غمِ دل، غموں کا جام لیے
کوئی رفیق کوئی ہم نفس نہ کوئی یار
دل و دماغ کو ڈسنے لگی ہے تنہائی
رگوں میں دوڑ رہا ہے یہ زہرِ تنہائی
مرے ندیم! نہ جانے یہ کیسی شام آئی

محمد اسحاق صدیقی
۵۔ اے گوئن تالاب لکھنؤ

پرندوں کے مشہور عالم | ڈاکٹر سالم علی



ڈاکٹر سالم علی کا پورا نام معیز الدین عبد العلی ہے۔ وہ ۱۲ نومبر ۱۸۹۶ء کو بمبئی میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق گجرات کے ایک تجارت پیشہ خاندان سے ہے، جو تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے کھمبات سے آکر بمبئی میں آباد ہوگیا تھا۔ اُن کے والد کا نام مُعیز الدین تھا اور والدہ کا نام زینت النسا تھا۔

معیز الدین صاحب بمبئی کی ایک فرم طیب جی اینڈ کمپنی میں ملازم تھے۔ افسوس کہ وہ ۴۲ سال کی عمر میں معیادی بخار میں مبتلا ہو کر چل بسے۔ اُس وقت سالم علی چار یا پانچ مہینے کے تھے۔ جب وہ تین یا چار سال کے ہوئے تو والدہ بھی داغِ مفارقت دے گئیں۔ فالج اور کینسر نے ۴۵ سال کی عمر میں اُن کی زندگی کا بھی چراغ گل کر دیا۔ پانچ لڑکے اور چار لڑکیاں اُن کی یادگار تھے۔ اِس بُرے وقت میں سالم علی کے نانا کے چھوٹے بھائی امیر الدین طیّب جی نے بڑی فراخ دلی کا ثبوت دیا اور ان بچوں کو مثل اپنی اولاد کے تعلیم و تربیت دی۔ وہ ایک صاحب حیثیت، اعلیٰ تعلیم یافتہ وسیع النظر اور دریا دل انسان تھے۔ انھیں انسانوں ہی میں نہیں جانوروں تک میں دلچسپی تھی چنانچہ ۱۵ ستمبر ۱۸۸۳ء کو جب بامبے نیچرل ہسٹری سوسائٹی (BOMBAY NATURAL HISTORY SOCIETY) کی بنیاد پڑی تو اِس کے چند سال بعد وہ اُس کے ممبر بن گئے۔ اِس علمی ادارے کے قیام کا مقصد ہندستان کی حیوانی زندگی کے نمونے جمع کرنا، حیوانات کے رہن سہن اور ان کی امتیازی خصوصیات کا مشاہدہ کرنا تھا۔ جب بچے سن تمیز کو پہنچ گئے تو طیب جی انھیں اکثر سوسائٹی کے جلسوں میں ساتھ لے جاتے تھے تاکہ اُن میں بھی ماہرین حیوانات کی تقریریں سُن کر اور جانوروں اور پرندوں کے نمونے دیکھ کر مشاہدۂ قدرت کا شوق پیدا ہو۔

اس سلسلے میں اس خاندان کے ایک دوسرے فرد بدر الدین طیب جی کا ذکر بھی ضروری ہے۔ جو امیر الدین طیب جی کے بڑے بھائی تھے۔ وہ مشہور بیرسٹر تھے اور بعد میں بمبئی ہائی کورٹ کے پہلے مُسلم جج ہوئے۔

سالم علی کے بھائیوں میں تین کافی مشہور ہوئے (۱) ہاشم علی جو حیدر آباد (دکن) میں ہائی کورٹ کے جج تھے اور جنھیں نظام نے نواب ہاشم یار جنگ کا خطاب دیا تھا (۲) حامد علی، جو آئی، سی، ایس تھے اور اتنے ہر دلعزیز کہ جہاں جہاں، وہ تعینات رہے، وہاں کے لوگ اب بھی انھیں یاد کرتے ہیں۔ سالم علی میں نیچر اور پرندوں میں دلچسپی انھیں کے ذریعہ پیدا ہوئی۔

(۳) جابر علی، جو کیمبرج یونیورسٹی سے ایگری کلچر (زراعت) کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے ملک کے محکمۂ زراعت میں کوئی اعلیٰ عہدہ حاصل کرنے کے لیے جد و جہد کرتے رہے۔ لیکن جب یہ دیکھا کہ ایسے تمام عہدے انگریزوں کے لیے مخصوص ہیں (یاد رہے یہ انگریزی حکومت کا دور تھا) اور جو نوکریاں ملتی ہیں وہ اُن کے شایانِ شان نہیں، اُنھوں نے ملازمت کا خیال ترک کر دیا اور کاشتکاری شروع کر دی۔ وہ گاندھی جی سے بہت متاثر تھے اور ان کے عقیدت مندوں میں شامل تھے۔

سالم علی اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے اور سب کے پیارے۔ انھیں پرندوں کا شوق کیسے پیدا ہوا، یہ ایک دلچسپ

کہانی ہے۔ غالباً ۱۹۰۷ء کی بات ہے کہ جب وہ گیارہ سال کے تھے، اُنھوں نے اپنی ہوائی بندوق سے ایک گوریا ماری۔ گھر کے آس پاس گوریا کا شکار کرنا ان کے لیے عام بات تھی (اُس زمانے میں اُن کا گھر کھیت باری گرگام میں تھا) لیکن یہ چڑیا عام چڑیوں سے کچھ مختلف تھی۔ اُس کے گلے پر ایک پیلا دھبہ تھا، جو اس سے پہلے سالم علی نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس نئی چڑیا کو لے کر وہ اپنے ناتا امیر الدین طیب جی کے پاس گئے، اور پوچھا کہ یہ کون سی چڑیا ہے۔ وہ ایک مانے ہوئے جنگلی جانوروں کے شکاری تھے، اُنھیں پرندوں میں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔

اُنھوں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا اور کہا "تم اسے بامبے نیچرل ہسٹری سوسائٹی لے کر جاؤ، وہاں تمھیں اس کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔"

اُس زمانے میں سوسائٹی کا دفتر اپالو اسٹریٹ پر ولایتی شراب کی ایک فرم فپ سن اینڈ کمپنی[1] (PHIPSON & CO) کی عمارت کے ایک حصے میں واقع تھا۔ اِس کمپنی کے ڈائرکٹر کا نام تھا والٹر سیموئیل ملارڈ (WALTER SAMUEL MILLARD)۔ وہ ایک رحم دل انگریز تھا، جسے مشاہدہ قدرت کا شوق تھا۔ وہ سوسائٹی کا آنریری سکریٹری بھی تھا۔ جب ایک خوش پوشاک ہندستانی لڑکا ایک مری ہوئی چڑیا لے کر اُس کے پاس پہنچا اور اُس کی شناخت کی درخواست کی تو اُسے تعجب ہوا کہ ایک ہندستانی لڑکا پرندوں میں اتنی دلچسپی کیسے لے سکتا ہے۔ اُسے خود اِس لڑکے میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔ وہ اُسے ساتھ لے کر سوسائٹی کے دفتر گیا اور اُس کے حیوانی ذخیرے میں اُس قسم کی چڑیا کی تلاش شروع کی جو لڑکا لے کر آیا تھا۔ اُس نے نہ جانے کتنی الماریاں کھولیں اور ہر ایک کے خانے کھول کر دیکھے، جن میں سے ہر خانہ روئی بھری ہوئی چڑیوں کی لاشوں سے بھرا تھا۔ یہاں تک کہ وہ خانہ نظر آیا، جس میں وہ چڑیا تھی۔ جس کے گلے پر پیلا دھبہ تھا۔ اُس نے وہ چڑیا باہر نکالی اور لڑکے کی لائی ہوئی چڑیا سے مقابلہ کر کے بتایا کہ جو چڑیا تم لائے ہو وہ اِسی قسم کی ہے۔ اِسے عام طور پر جنگلی چڑیا یلو تھرو ٹیڈ اسپیرو (YELLOW THROATED SPARROW) کہتے ہیں۔ گوریا کی اس قسم کے بارے میں اُس نے اور بھی کئی دلچسپ باتیں بتائیں۔ مثلاً پیلا دھبہ صرف نر کے پایا جاتا ہے۔ اُس وقت سالم علی کو احساس ہوا کہ "میں تو چڑیوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ نہ جانے چڑیوں کی کتنی قسمیں ہیں، میں اُن سب کو پہچاننا سیکھوں گا۔"

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ اُس انگریز نے کہا: "تم خود چڑیاں مار کر کیوں نہیں جمع کرتے۔ اگر تمھارا اپنا ذخیرہ ہو تو تم آہستہ آہستہ ہر چڑیا کو پہچاننا سیکھ جاؤ گے اور ہر ایک کے بارے میں تمھیں بڑی دلچسپ باتیں معلوم ہوں گی۔" یہی نہیں اس نے سالم علی کو سوسائٹی میں آتے رہنے کی ترغیب دی اور فرصت میں اُنھیں چڑیوں کی کھال اتار کر محفوظ کرنے کا طریقہ سکھلایا۔ سالم علی نے یہ گُر سیکھ لیا اور بڑی لگن سے چڑیاں مار مار کر اپنے گھر کے ایک حصے کو مُردہ عجائب گھر میں بدلنے لگے۔ اُس نیک نفس انگریز نے سالم علی کو پرندوں کے بارے میں کتابیں بھی پڑھنے کو دیں۔

سالم علی کو پرندوں کا شوق دن پر دن بڑھتا گیا اور گھر کے لوگ پریشان تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ لڑکا چڑیوں کے چکر میں اپنا قیمتی وقت برباد کر رہا ہے۔ تعلیم پر پوری توجہ نہیں کرتا۔ وہ اس وقت سینٹ زیویرس کالج (ST. XAVIER'S COLLEGE) کے طالب علم تھے۔ اُنھیں الجبرا اور ریاضی میں ذرا بھی دلچسپی نہ تھی۔ زولوجی (ZOOLOGY) اُن کا دل پسند موضوع تھا، جس میں وہ مہارت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ جیسے تیسے اُنھوں نے پندرہ سال کی عمر میں ہائی اسکول پاس کیا اس کے بعد حالات نے ایسا موڑ لیا کہ اُن کی زندگی کا رُخ ہی بدل گیا۔

سالم علی کے ایک چچا زاد بھائی تھے صلاح الدین (عبّاس طیّب جی کے بیٹے)، جن کا رنگون میں کاروبار تھا۔ اُن کی فرم کا نام تھا "ایس، ایس طیّب جی اینڈ کمپنی"۔ وہ وولف ریم (WOLFRAM) کی کھدائی کراتے تھے۔ اپنے کام میں ہاتھ بٹانے کے لیے ۱۹۱۱ء میں اُنھوں نے اپنے چچا زاد بھائی جابر علی کو برما بلوا لیا۔ چند سال کے بعد جابر علی صاحب نے اپنے چھوٹے بھائی سالم علی کو لکھا کہ "اگر تمھیں پڑھنے لکھنے میں کوئی خاص دلچسپی نہ ہو تو چلے آؤ۔" بات کچھ

ایسی ہی تھی۔ اس طرح بھائی کی فرمائش پر سالم علی ۱۹۱۴ء میں ۱۸ سال کی عمر میں برما پہنچ گئے۔ وہاں انھوں نے اپنے بھائی جابر علی اور بمبئی کے ایک پارسی تاجر جے۔ ایم ہانگسا جی کی شرکت میں تو ائے ٹمبرس (TAVOY TIMBERS) کے نام سے ایک فرم قائم کی جو ہندستانی ریلوے کو سلیپر مہیا کرتی تھی۔

سالم علی صاحب برما میں سات سال رہے۔ اس عرصے میں وہ ایک بار ہندستان آئے اور اکتوبر ۱۹۱۷ء سے دسمبر ۱۹۱۸ء تک بمبئی میں رہے۔ بمبئی کے قیام کے دوران انھوں نے داورس کالج آف کامرس (DAVAR'S COLLEGE OF COMMERCE) میں داخلہ لے کر بائر اکاؤنٹنسی اور کامرشیل لا کا نصاب پورا کیا اور زولوجی میں مہارت حاصل کرنے کے لیے دوبارہ اپنے قدیم کالج میں داخل ہوئے جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے وہ سینٹ زیویرس کالج کے طالب علم تھے جس کے بایولوجی ڈپارٹمنٹ کے ڈائرکٹر فادر ای بلیٹر (FR. E. BLATTER) اُن پر بہت مہربان تھے۔ وہ اُن کا شوق پہلے سے جانتے تھے۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ "اگر واقعی تم پرندوں کی زندگی کا مطالعہ سائنسی طریقے پر کرنا چاہتے ہو تو تمھیں زولوجی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کرنا چاہیے اور میں تمھیں اس کا موقع دے سکتا ہوں۔" سالم علی صاحب نے اس موقع کا فائدہ اٹھایا اور کالج میں داخلہ لے کر ایک سال میں بی۔ اے (آنرس) کا نصاب پورا کر لیا لیکن امتحان نہیں دیا۔ اگرچہ اُن کے پاس کوئی ڈگری نہ تھی لیکن زولوجی میں اُن کی عملی مہارت اور نظری معلومات عام طالب علموں سے کہیں زیادہ تھیں کیونکہ اُنھیں اس سے فطری لگاؤ تھا۔ آگے چل کر اُنھیں اپنے تحقیقی کام میں زولوجی سے بڑی مدد ملی۔

اس سلسلے میں اُن کی ازدواجی زندگی کا جائزہ لینا ضروری ہے کیونکہ سالم علی صاحب کی زندگی بنانے اور سنوارنے میں اُن کی شریک حیات کا بڑا ہاتھ تھا۔

سالم علی صاحب کی شادی دسمبر ۱۹۱۸ء میں ہوئی تھی۔ اس وقت اُن کی عمر ۲۲ سال تھی۔ بیوی اُن سے دو یا تین سال چھوٹی تھیں۔ اُن کا نام تہمینہ تھا۔ اُن کے والد عبداللطیف صاحب نے لندن کو [illegible]

ثانی بنایا تھا۔ اس سے اُن کی تعلیم و تربیت انگلینڈ میں ہوئی تھی۔ انگلینڈ میں وہ دس یا بارہ سال گزار چکی تھیں۔ سالم علی ان کے دور کے رشتے دار تھے اور بچپن [illegible] ایک ہی سکول میں پڑھتے تھے۔ شادی کے بعد جنوری ۱۹۱۹ء میں وہ اپنی بیوی کو لے کر برما چلے گئے۔ اُس وقت تک انھیں یہ بالکل معلوم نہ تھا کہ اُن کی بیوی کی دلچسپیاں کیا ہیں لیکن اتفاق سے [illegible] تھیں۔ جب اُن کو پتہ چلا کہ اُن کے شوہر کو جنگل اور پرندوں سے بے حد دلچسپی ہے تو [illegible] اس کے کہ وہ اُن کی راہ میں حائل ہوتیں وہ اُن کے شوق میں برابر کی شریک ہوگئیں [illegible] پرندوں کا ماہر بننے [illegible]

برما میں سالم علی صاحب کا قیام [illegible] دراصل اُن کا پرندوں کا شوق [illegible] کے سلسلے میں [illegible] جنگلوں میں گھومنے [illegible] کا نشانہ [illegible] یہ شوق مہنگا پڑا۔ اگر [illegible] لیتے تو ممکن ہے کہ وہ تجارت میں [illegible] شوق کو [illegible]

جب [illegible] ختم ہوئی [illegible] اُن کے بھائی کو [illegible] کبھی کافی نقصانات ہوئے۔ ۱۹۲۴ء [illegible] سالم علی صاحب اپنے بھائی [illegible] بمبئی لوٹ آئے۔

برما سے واپس آنے کے بعد [illegible] وہ چاہتے تھے کہ زولاجیکل سروے آف انڈیا (ZOOLOGICAL SURVEY OF INDIA) [illegible] کسی ایسے محکمے میں [illegible] اُن کی زولوجی کی لیاقت [illegible] ڈگری نہ ہونے کی وجہ سے اُنھیں نوکری نہ مل سکی [illegible] وہ اور اُن کے بھائی [illegible]

ذمہ داریوں کا [illegible] خوش رکھنے کے لیے [illegible]

اُن کے شوق میں رکاوٹ بن جاتی ۔ اس حقیقت کو اُن کی بیوی نے محسوس کیا اور کہا "ہماری زندگی ایک ہی ہے ۔ ایسا تو ہے نہیں کہ ہم ایک زندگی میں نوکری کریں گے اور دوسری میں اپنی دلچسپی کا کام کریں گے ۔ اس لیے آپ ایسی نوکری نہ کریں جس میں آپ کو اپنا شوق پورا کرنے اور اپنی قابلیت دکھانے کا موقع نہ ملے ۔ آپ وہی کام کریں جس میں آپ کو دلچسپی ہے ۔" اس بات سے ہی اُن کی شریکِ حیات کے ایثار اور روشن خیالی کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔ یہی نہیں بلکہ جب اُنھوں نے یہ دیکھا کہ بمبئی میں گزر بسر مشکل سے ہو رہی ہے تو وہ اپنے شوہر کو لے کر کہم چلی گئیں، جہاں اُن کے میکے والوں کی تھوڑی سی جائداد تھی ۔ یہ مقام بمبئی بار کے دوسری طرف ساحل کے کنارے علی باغ کے پاس ہے ۔ یہاں سالم علی صاحب کا قیام تقریباً چھ مہینے رہا ۔ یہ مقام اُن کی زندگی میں خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہ ایک بڑی پُرسکون جگہ تھی، جہاں مشاہدۂ قدرت کا پورا موقع تھا ۔ یہیں اُنھوں نے بیا کی زندگی کا گہرا مشاہدہ کیا ۔ اُس کے بارے میں مضامین لکھے، جنھیں پرندوں کے ماہروں نے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا کیونکہ اس سے پہلے کسی نے بیا کی زندگی، خصوصاً ازدواجی زندگی کا اتنا گہرا مطالعہ نہ کیا تھا ۔

اس دوران اُن کا تعلق بامبے نیچرل ہسٹری سوسائٹی سے بھی قایم رہا، جہاں وہ چند سال معمولی مشاہرے پر کام کرتے رہے ۔ اُن کی خدمات اور قابلیت کا سوسائٹی کے عہدے داروں کو احساس تھا اور وہ چاہتے تھے کہ اُن کے لیے بھی کسی مناسب عہدہ کا بندوبست ہو جائے ۔ چنانچہ سوسائٹی نے محکمۂ تعلیم کے اشتراک و تعاون سے حکومتِ بمبئی کے سامنے ایک تجویز پیش کی، جس کا مقصد اسکولوں میں نیچر اسٹڈی کو مقبول بنانا تھا ۔ اُس نے حکومت پر زور ڈالا کہ وہ بمبئی کے پرنس آف ویلز میوزیم میں ایک گائیڈ لیکچرر اِن نیچرل ہسٹری مقرر کرے جو آنے والوں خاص کر بچوں کو اُن جانوروں کی زندگی کے بارے میں بتائے، جن کے نمونے وہاں موجود ہیں کیونکہ جب تک بتانے والا نہ ہو، کسی کو جانوروں میں کیا دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے ۔ بات معقول تھی، اسی لیے یہ تجویز منظور ہوئی اور اس طرح سالم علی صاحب ۱۹۲۶ء میں میوزیم میں گائیڈ لیکچرر اور بامبے نیچرل ہسٹری سوسائٹی میں اسسٹنٹ کیوریٹر مقرر ہوئے جہاں وہ تین سال تک کام کرتے رہے ۔

۱۹۲۹ء میں سالم علی صاحب مزید مطالعہ کے لیے چھٹی لے کر جرمن چلے گئے، کیونکہ اُس زمانے میں ہندستان کی کسی یونیورسٹی میں پرندوں کے بارے میں تعلیم حاصل کرنے کا انتظام نہ تھا ۔ اُنھوں نے برلن یونیورسٹی کے زولاجیکل میوزیم میں پرندوں کے مشہور عالم پروفیسر اروِن اسٹریسے من (ERWIN STRESE MANN) سے علمِ طیور (ORNITHOLOGY) کی نظری و عملی تعلیم حاصل کی ۔ جرمنی میں اُن کا قیام نو مہینے رہا لیکن پروفیسر اسٹریسے من زندگی بھر اپنے شاگرد پر مہربان رہے اور خط و کتابت کے ذریعہ اُن کی رہنمائی کرتے رہے ۔

جرمنی سے سالم علی صاحب انگلستان چلے گئے، جہاں وہ تین مہینے رہے ۔ وہاں جانے کا سبب یہ تھا کہ لندن کے برٹش میوزیم میں ہندستانی پرندوں کا بہترین ذخیرہ ہے ۔ وہ ہندستان سے اپنا ذخیرہ لے گئے تھے اور دونوں کا مقابلہ کر کے پرندوں کی خاندان کے لحاظ سے شناخت یا تقسیم کرنا چاہتے تھے ۔ اس کام میں انھیں پرندوں کے شعبے کے نگراں نارمن، بی کینئر (NORMAN B. KINNEAR) سے بڑی مدد ملی، کیونکہ وہ خود بامبے نیچرل ہسٹری سوسائٹی میں برسوں کیوریٹر رہ چکا تھا ۔

سال بھر کی تعلیم و تربیت کے بعد جب سالم علی صاحب ۱۹۳۰ء میں بمبئی واپس آئے تو اُنھیں پہلی خبر یہ ملی کہ مالی مشکلات کی وجہ سے پرنس آف ویلز میوزیم میں گائیڈ لیکچرر کا عہدہ ختم کر دیا گیا ہے ۔ اب اُن کے سامنے دو ہی راستے تھے یا تو کسی دوسری جگہ ملازمت کر لیں اور پرندوں کے بارے میں جو مہارت حاصل کی ہے اُسے اکارت ہونے دیں اور یا پھر ملازمت کا خیال چھوڑ کر ہندستانی علمِ طیور کو آگے بڑھائیں اور اپنے تحقیقی کام میں لگے رہیں ۔ اُنھوں نے علم کو پیٹ پر ترجیح دی اور جیسے تیسے میاں بیوی زندہ رہے ۔ اُنھوں نے بمبئی کی سکونت بھی ترک کر دی اور ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء تک دہرہ دُون میں مقیم رہے ۔

اس وقت تک ہندستان کے مختلف حصوں میں پائے جانے والے پرندوں کے بارے میں کسی کو پورا علم نہ تھا، کیونکہ اس لحاظ سے

ملک کا جائزہ نہیں لیا گیا تھا۔ مختلف پرندوں کے نمونے جو بغیر کسی نظم و ترتیب کے ہاتھ لگ گئے تھے، عجائب گھروں کی زینت تھے۔ اُن کی بیشتر قسمیں موجود نہ تھیں۔ پرندوں کے نمونے جمع کرنے کا طریقہ بھی باقاعدہ نہ تھا۔ جب کسی انگریز کا کسی علاقے میں تقرر ہوتا اور اُسے پرندوں میں دلچسپی ہوتی تو وہ اُسے مار کر اس کی کھال اُتار لیتا اور اُسے محفوظ کرنے کے بعد بامبے نیچرل ہسٹری سوسائٹی کو بھیج دیتا۔ سالم علی صاحب نے شدت کے ساتھ اس ضرورت کو محسوس کیا کہ ہندستان کے ہر حصے کا باقاعدہ جائزہ لے کر یہ بات معلوم کی جائے کہ کہاں کون کون سے پرندے پائے جاتے ہیں اور اُن کا وہاں کی آب و ہوا سے کیا تعلق ہے۔ ہر پرند کی نمایاں خصوصیات کیا ہیں اور اُس کا طرزِ زندگی کیا ہے۔ اُنھوں نے سوسائٹی کے سامنے اپنی تجویز رکھی اور کہا کہ اگر وہ اس تحقیقی کام کے لیے فنڈ فراہم کرے تو وہ بلا معاوضہ اپنی خدمات پیش کرنے کے لیے تیار ہیں۔ سوسائٹی نے اُن کی تجویز کو پسند کیا اور جلد ہی اس کا انتظام بھی ہو گیا

اُس زمانے میں ملک میں ریاستیں ہوا کرتی تھیں جن کے راجہ شکار اور جنگلی جانوروں میں دلچسپی لیتے تھے۔ اُن سے توقع تھی کہ اس کام کے لیے وہ ضرور کچھ نہ کچھ روپیہ فراہم کر دیں گے، بشرطیکہ برٹش ریذیڈنٹ اُن پر دباؤ ڈالیں۔ یہ تدبیر کارگر ہوئی۔ اس طرح سالم علی صاحب نے حیدرآباد، دکن (۱۹۳۱-۳۲ء)، ٹراونکور، کوچین (۱۹۳۳ء) بھوپال، گوالیار، اندور، دھار (۱۹۳۸ء)، بھاول پور (۱۹۳۹ء)، میسور (۱۹۳۹-۴۰ء)، گجرات - ۱۹۴۲ء (۱۹۴۴ء، تبت (۱۹۴۵ء) اور اڑیسہ (۱۹۴۸ء) کے پرندوں کا نہایت جانفشانی سے جائزہ لیا۔ ایک ایک ریاست کا جائزہ لینے میں دو مہینے سے چھ مہینے تک لگتے تھے۔ پوری کوشش اس بات کی تھی کہ مقامی پرندوں کی کوئی بھی قسم نظرانداز نہ ہونے پائے۔ اس تحقیقی کام میں سالم علی صاحب کی بیوی اُن کے سکریٹری کا کام کرتی تھیں۔ جہاں وہ جاتے تھے، وہ ساتھ جاتی تھیں۔ سفر کبھی بیل گاڑی پر کرنا ہوتا، کبھی اونٹ پر اور کبھی پیدل۔ بامبے نیچرل ہسٹری سوسائٹی نے انھیں دو ٹیکسی ڈرمسٹ (TAXIDERMIST) فراہم کیے تھے، جن کے ذمے پرندوں کی کھالیں اُتار کر اُنھیں محفوظ کرنے کا کام تھا۔ ہر سروے میں سیکڑوں پرند بندوق سے مارے جاتے یا جال کی مدد سے پکڑے جاتے تھے، جن کی کھالیں محفوظ کرنے کے بعد بمبئی کو بھیج دی جاتی تھیں اور وہ اُنھیں انگلینڈ، پرندوں کے ایک دوسرے ماہر ہیو وسلر (HUGH WHISLER) کو روانہ کر دیتی تھی تاکہ اُن کا برٹش میوزیم (لندن) ہندستان میں پرندوں کے نمونوں سے مقابلہ کر کے اُن کی شناخت اور تقسیم (CLASSIFY) کریں۔ وہ لوگ تحقیقی نتائج سوسائٹی کو بھیج دیتے تھے، جو سالم علی صاحب کی رپورٹ کے ساتھ جرنل آف بامبے نیچرل ہسٹری سوسائٹی میں شایع ہوتے۔

افسوس کہ ۱۹۳۹ء میں سالم علی صاحب کی رفیقۂ حیات کا انتقال ہو گیا۔ اُنھیں ٹیومر کی شکایت تھی۔ آپریشن ناکام ثابت ہوا۔ خون میں زہر سرایت کرنے کی وجہ سے اُن کی موت واقع ہو گئی۔ اُس وقت اُن کی عمر چالیس سال تھی۔ اُس زمانے میں یہ میاں بیوی دہرہ دون میں رہتے تھے۔ مرحومہ نے آخری سروے اپنے شوہر کے ساتھ ۱۹۳۸ء میں وسطی ہندستان کی ریاستوں کا کیا تھا۔

سالم علی صاحب کے مُلک گیر سروے اور دوسرے عالموں کے اشتراک و تعاون سے دس بارہ سال کے عرصے میں ہندستانی پرندوں کے بارے میں جو نئی معلومات حاصل ہوئی تھیں اُن کی بنیاد پر ایک ایسی کتاب لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جس سے عام پڑھنے والے ہندستانی پرندوں کا بخوبی علم ہو۔ چنانچہ بامبے نیچرل ہسٹری سوسائٹی کی فرمائش پر سالم علی صاحب نے ایک کتاب تیار کی جو "بک آف انڈین برڈس" (BOOK OF INDIAN BIRDS) کے نام سے ۱۹۴۱ء میں شایع ہوئی۔ اس کتاب میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں ہر اُس پرند کی رنگین تصویر ہے جس کا ذکر ہے۔ اس طرح پرندوں کی شناخت میں بڑی آسانی ہو گئی اور شاید ہی پرندوں کے مشاہدے اور مطالعہ کا کوئی ایسا شوقین ہو، جس کے پاس یہ کتاب نہ ہو۔ اب تک اس کتاب کے گیارہ اڈیشن نکل چکے ہیں۔ چالیس پچاس ہزار کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں۔ ہندی اور پنجابی

زبانوں میں بھی اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

"بک آف انڈین برڈس" نے مصنف کو ساری دنیا میں مشہور کر دیا اور اُن کو اس سے معقول آمدنی بھی ہوئی لیکن مصنف کو اس بات کا بے حد افسوس ہے کہ جب یہ کتاب ۱۹۴۱ء میں پہلی بار منظرِ عام پر آئی تو اُن کی بیوی اُسے دیکھنے کے لیے موجود نہ تھیں جبکہ اُنھوں نے اس کتاب کے لکھنے میں بڑی مدد کی تھی۔

سالم علی صاحب نے اپنی بیوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی نہیں کی کیونکہ وہ یہ محسوس کرتے تھے: "مجھے خوش نصیبی سے ایسی بیوی ملی جو بالکل میرے ہم مذاق تھی۔ اب یہ اُمید کرنا کہ دوسری بیوی بھی ویسی ہی ہو گی ضرورت سے زیادہ توقع کرنا ہے۔" اُن کے کوئی اولاد نہیں ہے۔ اُن کی تصانیف ہی اُن کی اولادیں ہیں جو اُن کا نام زندہ رکھیں گی۔

بیوی کے انتقال کے بعد وہ اپنا سارا وقت پرندوں کے مشاہدہ اور مطالعہ میں گزارنے لگے۔ اُن کی زندگی کے ۱۰ سال جنگل اور شہر میں بٹے ہوئے تھے۔ وہ جنگلوں میں پرندوں کی زندگی کا مشاہدہ کرتے اور شہر میں آکر اپنے نوٹس (NOTES) اور دوسروں کی تحقیقات سے مقابلہ کر کے مضامین اور کتابیں لکھتے۔ اپنی پہلی کتاب کی کامیابی اور مقبولیت نے اُنھیں دوسری کتابیں لکھنے پر آمادہ کیا۔ اُن کی پہلی کتاب بامبے نیچرل ہسٹری سوسائٹی نے شائع کی تھی۔ بعد کی مندرجہ ذیل پانچ کتابیں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کیں:

1 THE BIRDS OF KUTCH (1945)

2 INDIAN HILL BIRDS (1949)

3 THE BIRDS OF TRAVANCORE AND COCHIN (1953) 2ND EDITION AS BIRDS OF KERALA (1969)

4 THE BIRDS OF SIKKIM (1962)

5 A FIELDGUIDE TO THE BIRDS OF EASTERN HIMALAYAS (1977)

یہ کتابیں ان لوگوں کے لیے بے حد مفید ہیں جو پرندوں میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ مبتدیوں، خاص کر اسکولی بچوں کے لیے اُنھوں نے لیئق فتح علی کے ساتھ ایک مختصر کتاب "اباؤٹ انڈین برڈس" (ABOUT INDIAN BIRDS) لکھی، جسے بلیکی اینڈ سن (انڈیا) بمبئی نے ۱۹۵۹ء میں شائع کیا۔ اس کے بعد دونوں نے "کامن برڈس" (COMMON BIRDS) کے نام سے ایک بڑی کتاب لکھی، جسے نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا (نیو دہلی) نے ۱۹۶۷ء میں شائع کیا۔ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۵ء میں یہ مقبولِ عام کتاب دوبارہ اور سہ بارہ شائع ہوئی۔ اس میں جانے پہچانے ۱۰۱ پرندوں کا باتصویر دلچسپ حال ہے۔ اس کا مختلف ہندستانی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے لیکن افسوس اُردو زبان میں اب تک اس کا ترجمہ نہیں ہوا ہے۔

ڈاکٹر سالم علی صاحب کی سب سے عظیم اور ضخیم تصنیف کا نام ہے: "ہینڈ بک آف دی برڈس آف انڈیا اینڈ پاکستان" (HAND BOOK OF THE BIRDS OF INDIA AND PAKISTAN) جسے اُنھوں نے امریکی ماہرِ علمِ طیور۔ ڈاکٹر سڈنی ڈِلن ریلی (DR. SIDNEY DILLON RIPLEY) کے ساتھ مل کر لکھا ہے۔ یہ (... ½16 × ½24 سینٹی میٹر) کی دس جلدوں میں ہے۔ اسے آکسفورڈ یونیورسٹی ... نے بمبئی نیچرل ہسٹری سوسائٹی کے اشتراک و تعاون سے بمبئی میں چھپوا کر ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۴ء تک شائع کیا۔

اس کتاب میں نہ صرف ہندستان، پاکستان بلکہ نیپال، سکم، بھوٹان اور لنکا میں پائے جانے والے اور باہر سے نقلِ مکان کر کے آنے والے پرندوں کا بھی حال ہے۔ پرندوں کی کل اقسام جن کا مفصل ذکر ہے ۲۰۶۰ ہیں۔ دس جلدوں میں کل ۳۱۸۲ صفحات اور ۱۱۳ رنگین تصاویر والے اوراق (PLATES) ہیں، جن میں سے ہر ورق پر چھ سے لے کر بارہ تک پرندوں کی تصویریں ہیں۔ یہ تصویریں چوٹی کے سات مصوروں کی بنائی ہوئی ہیں، جو پرندوں کی تصویریں بنانے کے لیے شہرۂ آفاق ہیں۔ ہر تصویر ہو بہو اصل کے مطابق ہے اور بعض چڑیوں کی تصویریں تو اتنی خوبصورت ہیں کہ بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بولنا یا اڑنا چاہتی ہیں۔

اس امر کی وضاحت کے لیے کہ کون سا پرند ملک کے کس حصے میں کہاں سے کہاں تک پایا جاتا ہے جابجا ہندستان اور قرب و جوار کے ممالک کے نقشے شہر حلیوں میں دے ہیں اگر وہ ملک کے باہر بھی پایا جاتا ہے تو اس کی بھی وضاحت ہے کہ کہاں کہاں ملتا ہے۔ ناظرین کی آسانی کے لیے بیشتر پرندوں کے سروں کی تصاویر بھی دی ہیں۔ اس کتاب کو بجا طور پر ہندستانی پرندوں کی مستند ترین اور مکمل ترین انسائیکلوپیڈیا کہا جا سکتا ہے اس کا ہر بڑے کتب خانے میں ہونا ضروری ہے۔

ڈاکٹر سالم علی صاحب ایک خود ساختہ انسان ہیں۔ وہ تقریباً پچاس سال تک پرندوں کی زندگی کا باریک بینی سے مشاہدہ کرتے رہے ہیں۔ بندوق، کیمرہ، دُوربین اور نوٹ بک لیے انھوں نے نہ صرف ہندستان کا چپہ چپہ چھانا ہے بلکہ تبت، اروناچل پردیش، افغانستان، برما اور بنگلہ دیش جاکر وہاں کے پرندوں کی زندگی کا بھی مطالعہ کیا ہے۔

سالم علی صاحب کی مادری زبان گجراتی ہے۔ وہ اردو اور جرمن زبانیں بخوبی جانتے ہیں اور کسی قدر فارسی بھی۔ وہ نہایت شستہ انگریزی لکھتے اور بڑی روانی سے بولتے ہیں۔ اُن کا انداز بیان واضح، دلکش اور پُراثر ہے۔ اُن کے تحقیقی مضامین دنیا کے مشہور علمی جریدوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

وہ بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ اُن کا تعلق دنیا کے تمام اُن علمی اداروں سے ہے جن کا تعلق حیوانی زندگی خصوصاً پرندوں کی زندگی سے ہے۔ جرمنی، برطانیہ، فرانس، اسپین اور امریکا کی علم طیور سے متعلق انجمنوں نے انھیں اپنا اعزازی ممبر بنایا ہے۔ وہ بامبے نیچرل ہسٹری سوسائٹی کے صدر ہیں۔ انڈین بورڈ فار وائلڈ لائف کے نائب چیرمین اور انٹرنیشنل کاؤنسل فار برڈ پریزرویشن کے ہندستانی شعبے کے چیرمین ہیں، علاوہ ازیں وہ انڈین نیشنل سائنس اکاڈمی کے فیلو ہیں۔

انھیں اُن کی علمی خدمات کے اعتراف کے طور پر ڈی، ایس سی (D.SC) کی اعزازی ڈگریاں علی گڑھ یونیورسٹی (۱۹۵۸ء) دہلی یونیورسٹی (۱۹۷۳ء) اور آندھرا یونیورسٹی (۱۹۷۸ء) نے دی ہیں۔

صدر جمہوریہ ہند نے انھیں ۱۹۵۸ء میں پدم بھوشن اور ۱۹۷۶ء میں پدم وبھوشن کے اعزازات سے نوازکر اُن کی اُن نمایاں خدمات" کا اعتراف کیا ہے، جو انھوں نے ہندستانی علم طیور (INDIAN ORNITHOLOGY) کو آگے بڑھانے میں انجام دی ہیں۔ اُن کی غیر معمولی قابلیت اور بیش بہا علمی خدمات کا دوسرا ثبوت وہ تمغے (میڈل) ہیں جو وقتاً فوقتاً اُن کو علمی انجمنوں کی طرف سے دیے جاتے رہے ہیں۔

گزشتہ دس پندرہ سال سے بامبے نیچرل ہسٹری سوسائٹی کے توسط سے اُن کا ورلڈ وائلڈ لائف فنڈ (WORLD WILDLIFE FUND) سے گہرا تعلق ہے۔ یہ ایک بین الاقوامی ادارہ ہے۔ جس کا کام دُنیا کے مختلف مُلکوں سے چندہ جمع کرکے ایسے اداروں کی مدد کرنا ہے۔ جو جانوروں کے تحفظ و نگہداشت میں حصہ لیتے ہیں۔ اس کی شاخیں دنیا کے ہر ملک میں موجود ہیں۔

ہندستان کے حیوانات خصوصاً پرندوں کی اُن قسموں کو بچانے کے لیے، جن کی تعداد بہت کم ہو گئی ہے، سالم علی صاحب نے بڑی لگن اور محنت سے کام کیا ہے۔ اُن کی غیر معمولی خدمات کی بنا پر ورلڈ وائلڈ لائف فنڈ (WORLD) نے فروری ۱۹۷۶ء میں انھیں پال گیٹی (PAUL GETTY) وائلڈ لائف کنزرویشن ایوارڈ دیا اور موصوف نے نہایت فراخ دلی سے پچاس ہزار ڈالر کی پوری رقم بامبے نیچرل ہسٹری سوسائٹی کی نذر کر دی۔ وہ بجا طور پر اس اعزاز کے مستحق تھے۔ دراصل انھیں اس سے پہلے ہی اتنے اعزاز مل چکے تھے کہ اُن میں سے کسی ایک کا حاصل کر لینا ہی عمر فخر کے لیے کافی ہے۔ لیکن ان باتوں کا اُن پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ شہرت، عزت اور دولت سے بے نیاز اپنے کام میں لگے رہے اور اب بھی لگے ہیں۔ اگرچہ اُن کی عمر ۸۳ سال سے اوپر ہے لیکن وہ اب بھی جوانوں کی طرح چاق و چوبند ہیں اور اُن کے جوش و خروش میں کوئی کمی نہیں معلوم ہوتی۔

حواشی

لے ان میں بے بھائیوں کے نام ترتیب وار لکھے ہیں۔ چوتھے بھائی امیر علی تھے، پانچویں وہ خود تے مسٹر ایچ ایم فیپسن سوسائٹی کے بانیوں میں سے تھے اور اُس کے آنریری سکریٹری تھا۔ اُن کی دلچسپی کا خاص موضوع مچھلیاں اور پیٹ کے بل رینگنے والے جانور تھے۔ فیپسن صاحب کا دفتر پہلے فوربس اسٹریٹ (FORBES STREET) پر تھا، جہاں سوسائٹی کا آغاز ہوا۔ بعد میں انھوں نے اپالو اسٹریٹ پر ایک دوسری عمارت کرائے پر لے لی اور سوسائٹی کو کئی کمرے کرایے پر دے دیے۔ (SALIM ALI · BOOK OF INDIAN BIRDS P. 35 No 69) سے ٹوائے تو اسے جنوبی برما کا ایک شہر ہے، جہاں اس فرم کا کاروبار تھا۔ سے یہ جرنل ۱۸۸۶ء سے نکلنا شروع ہوا اور تب سے اب تک بڑی پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ شہ بیوی کے انتقال کے بعد ۱۹۴۰ء میں بمبئی لوٹ آئے اور اپنے بہنوئی کے ساتھ ان کے بنگلے میں رہنے لگے۔ تب سے یہ اُن کی مستقل رہائش گاہ ہے۔ اُن کا پورا پتہ ہے، ڈاکٹر سالم علی، ۴۶ پالی ہل، باندرہ بمبئی۔ ۴۰۰۰۵۰ شہ ہندی ترجمہ "بھارت کے پکشی" کے نام سے ہریانہ ساہتیہ اکاڈمی (چنڈی گڑھ) نے شایع کیا ہے۔ قیمت ۱۹ روپے ۵۰ پیسے۔ شہ سالم علی صاحب کی بھانجی ظفر فتح علی صاحب کی بیوی ہیں۔ ظفر فتح علی سالم علی صاحب کی پھوپھی کے پوتے ہیں۔ یہ دونوں میاں بیوی سالم علی صاحب کے نہ صرف قریبی رشتے دار ہیں بلکہ نامور اور عزیز ترین شاگرد بھی ہیں۔ ایک تیسرا قابل ذکر نام ہمایوں عبدالعلی صاحب کا ہے جو سالم علی صاحب کی پھوپھی زاد بہن کے بیٹے ہیں۔ اُن کا بمبئی میں بڑا کاروبار ہے لیکن اُنھیں نہ صرف پرندوں میں بلکہ تمام حیوانات میں گہری دلچسپی ہے۔ وہ بھی سالم علی صاحب کے نامور شاگرد ہیں۔



اپنی بات ــــ (صفحہ ۲ کا بقیہ)

ل۔ احمد اکبرآبادی ان ادیبوں میں تھے جو اردو ادب کی رومانی تحریک سے وابستہ رہے اور انھوں نے اردو نثر کو زبان و بیان کی ندرت اور جدت سے روشناس کیا۔ ل۔ احمد اکبرآبادی اور ان کے ہم عصر ساتھی نیاز فتح پوری، سلطان حیدر جوش اور مرزا ادیب جیسے ادیبوں نے رسائل و جرائد (شاہکار، نیرنگ خیال، ہمایوں، ساقی اور ادبی دنیا) کے ذریعہ اردو شعر و ادب کا مزاج بدل دیا۔ ادیبوں کی اس نسل نے اردو نثر کو رنگینی اور لطافت سے ہمکنار کیا۔

ل۔ احمد صاحب نے ناول کے علاوہ بے شمار افسانے بھی لکھے۔ جو ہمیشہ ان کی یاد دلاتے رہیں گے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۹۶ برس تھی۔

علامہ جمیل مظہری ایک نامور اور بلند پایہ بزرگ شاعر تھے۔ وہ ان شعراء میں تھے جو ادبی سیاستوں سے دور رہتے ہیں۔ ان پر ترقی پسندی یا جدیدیت کا کوئی لیبل نہیں چسپاں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب قطعی نہیں ہے کہ وہ عصری تقاضوں اور نئے رجحانات سے بے خبر تھے۔ عصری تقاضوں اور نئے رجحانات کو انھوں نے اپنی شاعری میں ملحوظ رکھا ہے۔ لیکن اپنے اسلوب اور لہجے پر آنچ نہیں آنے دی۔ اپنے اسلوب اور لہجے کو برقرار رکھا۔ چنانچہ ان کی ہیئت اور ان کے فنی رچاؤ کے تمام ادبی حلقے معترف ہیں اور ان کی شاعری سے بھی محظوظ ہوتے ہیں۔

اردو ادب کی ان بزرگ شخصیتوں کا انتقال بلاشبہ ناقابل تلافی نقصان ہے جس پر ادارہ نیا دور گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ ــــ ایڈیٹر

اکمل اجملی
دائرہ شاہ اجمل - الہ آباد ۳

شیخ محمد افضل الٰہ آبادی کی ادبی خدمات

عہد اورنگ زیب میں ہندوستان میں جو نامور شخصیتیں موجود تھیں ان میں حضرت شیخ محمد افضل الٰہ آبادی کا نام سرِ فہرست ہے۔ دنیائے معرفت کا یہ مشہور مرشد علم و ادب کے میدان کا بھی وہ شہسوار ہے جس نے اپنے تبحرِ علمی سے ادبی دنیا کو بہت کچھ دیا۔ شیخ محمد افضل الٰہ آبادی ۱۰ ربیع الاول ۱۰۲۸ ہجری مطابق ۱۶۲۸ عیسوی میں سیدپور بھتری ضلع غازی پور کا مشہور و معروف قصبہ اور تاریخی مقام ہے میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شاہ عبد الرحمٰن اور جد بزرگوار کا نام شاہ عبد النبی تھا جو تابی تخلص فرماتے تھے اور اپنے عہد کے جید عالم اور صاحب طرز ادیب و شاعر تھے۔ تابی کے قصیدہ اور اشعار تذکرہ میں موجود ہیں۔ ایک شعر سے ان کی استعداد کا پتہ چلتا ہے جس سے خود شیخ نے بھی استفادہ کیا ہے۔

این یک نفس کہ در تنِ مجروح ما بی است
کز در خیال دوست رود بس غنیمت است

آپ کا خاندان عہد تغلق میں بغداد سے وارد ہندوستان ہوا اور تقریب شاہی سے سرفراز ہوا۔ ریاست ملدنی، جو غازی پور کے نام سے مشہور ہوئی معافی میں ملی۔ آپ کے جد بزرگ سب سے پہلے وارد ہند ہوئے شاہ تاج الدین ہیں۔ ان کے متعلق صاحب تمتوات یوں رقم طراز ہیں "شیخ تاج الدین و شیخ سراج الدین ہر دو برادر از نواحی بغداد برآمدہ بدیار خراسان و ماوراء النہر عبور کردہ دراں وقت کہ تغلق بادشاہ فتح ٹھٹھہ کردہ بخدمت بادشاہ رسیدہ بحسن معاملات مرتبہ میا یافتند۔" ان کی اولاد میں شیخ ابو البرکات اپنے وقت کے جید عالم اور فن قرأت کے ماہر تھے۔ ان کی مہارت و چابک دستی سے متاثر ہو کر سلاطین شرقیہ میں سے کسی سلطان نے موضع بھتولی پرگنہ بھتری ان کو نذر کیا آپ نے وہاں عمارات عالیہ تعمیر کیں اور وہیں اقامت اختیار فرمائی۔ آثار عمارات و مساجد و مقابر پر عرفی کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

سہ از نقش و نگار در و دیوار شکستہ
آثار پدید است صنادید عجم را

شیخ ابو البرکات کی اولاد میں بڑے بڑے علماء و فضلاء پیدا ہوئے۔ شیخ افضل الٰہ آبادی کا سلسلہ نسب ساتویں پشت میں شیخ ابو البرکات سے جا کر مل جاتا ہے۔ شیخ محمد افضل الٰہ آبادی نے قرآن شریف و گلستاں کسی ایسے باخبر سے پڑھیں کہ دیباچہ کے بعد پھر فارسی پڑھنے کی ضرورت نہ رہی۔ تمام کتابیں خود مطالعہ فرماتے اور جہاں نا شنیدہ الفاظ آجاتے واقف کاروں سے معلوم کر لیتے۔ علوم عربیہ میں قریب قریب تمام کتابیں ملا نور الدین مداری جونپوری سے پڑھیں۔ جو باقی رہیں وہ علامۂ عصر محمد آصف الٰہ آبادی سے پڑھیں جو رشتہ میں آپ کے ماموں ہوتے تھے۔ علم حدیث میں حضرت میر سید محمد کالپوی سے اکتساب فیض کیا۔ حصول علم کے سلسلہ میں متعدد بار سفر کیے اور جب تکمیل کر لی تب تشنگی دور ہوئی۔ اکتساب علم حدیث کے بعد ، جمادی الثانی ۱۰۶۰ھ مطابق ۱۶۴۰ء میں سلسلہ چشتیہ میں میر سید محمد کالپوی کے دستِ حق پرست پر بیعت کی اور سلسلہ نقشبندیہ پر کاربند رہے۔ پیر و مرشد کے حکم سے الٰہ آباد کو وطن ثانی بنایا اور ۱۰۸۰ھ مطابق ۱۶۶۹ء میں مسجد اور ۱۰۹۲ھ مطابق ۱۶۸۲ء میں خانقاہ تعمیر کی جو مقام افضل اور بقعۂ افضل کے نام سے مشہور ہے۔ رشد و ہدایت کے علاوہ شیخ نے تقریباً پچاس کتابیں اپنی یادگار

چھوڑیں جن میں شرح گلستاں، شرح بوستاں، شرح یوسف وزلیخا، تذکیر دلپذیر، رسالہ عربیہ وفارسیہ در بحث ایمان فرعون، شرح قصائد خاقانی، سیر منظوم، شرح مثنوی معنوی مسمیٰ بہ بین الجمہور، نوز النجات عن الخذلان، نمونہ تحقیقات اہل الفرقان، شرح القصوص علیٰ دقیق النصوص، فتح الاغلاق، کشف الاستار، شرح ابیات حافظ شیرازی، تفریح الطالبین فی ارادۃ مولانا شمس الدین، دستور الکشافی فی معرفۃ احباب الاحاتم والخطاعربی، تائید العمم شرح فصوص الحکم، مجمع الفوائد العجیبہ حل العبارات العربیہ، میزان الاشعار، صحیفۃ الاسرار، شرح چہار رباعی خواجہ ناصر الدین بستی، رسالہ شش نصاب، تذکرہ البدائع، القول الراسخ فی منتخبات المشائخ، غایۃ المرام فی شرح تیر الاحکام در علم فقہ، اثبات الاحوطیہ من اربع رکعات الظہر بعد الجمعہ، محاکمہ میاں قدسی شید او منیر، شرح پند نامہ عطار، شرح نام حق، شرح قرآن السعدین، شرح مخزن الاسرار، شرح تحفۃ العراقین، شرح قصائد عرفی، شرح قصائد حدیقہ حکیم ثنائی، شرح الوری، شرح ابیات متفرقہ برابر گلستاں، انشائے فارسی، شرح رسالہ تصویہ، نظم السیر النبی، مرثیہ مرشد کے علاوہ مکتوبات اور کلیات فارسی مشہور آثار ہیں۔ ان تصانیف میں چند حضرت مولانا شاہ سید احمد اجملی سجادہ نشین دائرہ شاہ اجمل کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ شیخ افضل الہ آبادی کی ادبی خدمات پر تذکرے یوں رقمطراز ہیں۔ ایسے ایسے طلبا رفارغ ہو کر نکلے جنھوں نے عالم اسلام میں علوم وفنون کے مراکز قائم کیے اور اپنے وقت کے جید علما رمیں شمار ہوئے۔ حضرت مصطفیٰ زبیدی بلگرامی مصنف تاج العروس، شاہ عبدالعزیز بسمل گورکھپوری مولانا شرح الفیاض فائز، مولانا محمد عابد اکبرآبادی، مولانا محمد زاہد اکبرآبادی، مولانا محمد اسلم الہ آبادی شاہ محمد طاہر شارح فصوص الحکم، مولانا شیخ محمد فاخر محدث ہندی، شیخ محمد ناصر افضلی، مولانا کمال الدین، مولانا جمال الدین، مولانا جلال الدین، شاہ غلام قطب الدین مصیب، شاہ محمد اجمل الہ آبادی، شاہ محمد علیم حیرت جیسے جید علما رواد با وشعرا رمیں شمار کیے جاتے ہیں۔

شیخ محمد افضل الہ آبادی کی ساری زندگی رشد وہدایت خدمت علم وادب، درس وتدریس وتصنیف وتالیف میں گذری۔ آپکا وصال ۱۵ ذی الحجہ ۱۱۲۴ھ مطابق ۱۷۱۱ء بروز جمعہ وقت اشراق اسی دائرہ فضل وکمال میں ہوا اور روضہ میں سپرد خاک کیے گئے، جو آپ کیلیے تعمیر کیا گیا تھا۔ کان الشیخ قطباً، قطب خویش، شیخ قطب زماں، اعظم اقطاب۔ افضل قطب محمدی، قطب زمانہ افضل سے سنہ وفات نکلتا ہے۔ یہ تاریخیں مختلف علمار وفضلا نے نکالیں۔ جن میں لفظ قطب ہر تاریخ میں موجود ہے..... جو قطب وقت ہونے کا بین ثبوت ہے۔

احسن اللہ عباسی علوی مصنف مخزن الکائنات نے قطعہ تاریخ کہی ؎

شاہ افضل کہ بود از اوتاد مسکنش بود در الہ آباد
جامع فضل وصاحب عرفاں مصدر علم منبع احسال
ہاتف غیب گفت از اجلال باغ سبحاں بخواں تش سال وصال
بیش ہاتف بمن چنین فرمود سال اصلان اوست افضل بود

امتداد زمانہ سے شیخ کی تصانیف اکثر تلف ہو گئیں۔ چند نثری تصانیف اور کلیات فارسی کا ایک نسخہ قلمی کتب خانہ حضرت مولانا مدظلہ العالی میں موجود ہے۔ ان چند نثری تصانیف میں ایک حافظ کے اشعار کی شرح ہے" جو کشف الاستار عن وجوہ مشکلات الاشعار" کے نام سے مشہور ہے۔ دوسری تصنیف چھ جلدوں میں مولانا روم کی مثنوی معنوی کی شرح ہے جو نامکمل ہے۔ لیکن بیشتر حصے اس کے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ چند صفحات "محاکمہ شید او منیر" ہے جس میں ان شعرار کے اشعار کا محاکمہ کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں دوسری تصانیف کے نمونہ خاندان کے اکثر ادیبوں اور شاعروں کی کتابوں میں مل جاتے جس سے نفس مضمون کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اور شیخ کی نثر پر کماحقہ روشنی پڑتی ہے کشف الاستار حافظ شیرازی کے مشکل اور دقیق اشعار کی شرح ہے۔ اس کے دو نسخے خاندانی کتب خانہ میں موجود ہیں۔ ایک نسخہ بے حد کرم خوردہ ہے۔ لیکن بدخط نہیں ہے۔ دوسرا نسخہ بہت خوش خط اور ۱۲۲۲ھ کا لکھا ہوا ہے۔ یہ نسخہ کلیانی کی نقل ہے جو گلبرگہ میں میرے جد محترم حضرت مولانا سید شاہ نذیر احمد



وزیراعلا اترپردیش شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ ہندستانی اولمپک ہاکی ٹیم کے کھلاڑی شری محمد شاہد کو ۷ر اگست ۱۹۸۰ء کو ودھان بھون کے اپنے دفتر میں اعزاز سے نوازتے ہوئے۔ اس موقع پر وزیر کھیل کود شری چندر موہن سنگھ نیگی بھی موجود تھے۔

وزیراعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ کو یوپی سول سروس ایگزیکیٹو ایسوسی ایشن کے صدر شری اشوک کمار ۲۹ر جولائی ۱۹۸۰ء کو سیلاب زدگان کی امداد کے لیے ۱۰۰۵ روپے کا چیک پیش کرتے ہوئے۔





وزیراعلا شری وشوناتھ پرتاپ

کا اهتمام کیا۔ افطار کے بعد وصی

وزیرصنعت شری عبدالرحمٰن خان ذ





لائے ۱۹۸۰ء کو اپنی رھائش گاہ پر ایک افطار پارٹی
دی گئی۔ یہ تصویر اسی موقع کی ـــــ ھے

۵ پر ۵ راگست ۱۹۸۰ء کو منعقدہ افطار پارٹی کا ایک منظر





اکتوبر ۱۹۸۰ء کے آخری ہفتے میں منعقد ہونے والے جشن اکبر تقریبات کی تیاریوں کے سلسلے میں ۲۸ جولائی ۱۹۸۰ء کو وزیر دیہی ترقی و قومی یکجہتی شری عمار رضوی فتح پور سیکری کی تاریخی عمارتوں کا جائزہ لیتے ہوئے۔

وزیر تعلیم شریمتی سروپ کماری بخشی ۳۱ جولائی ۱۹۸۰ء کو منشی پریم چند ولادت صدی تقریبات کے موقع پر ان کی حیات و فن پر منعقدہ تصویروں کی ایک نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے۔ نمائش کا اہتمام محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش نے سوچنا کیندر لکھنؤ میں کیا تھا



اجملی ہمشیرہ زادہ حضرت مولانا سید شاہ محمد شبیر اللہ آبادی سابق سجادہ نشین دائرہ شاہ اجمل نے خوشخط کاتب سے نقل کرایا ہے۔ شیخ کی اس تصنیف کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ شعر اور اس کی خوبیوں اور خرابیوں سے کاملاً واقف تھے۔ شیخ نے اپنی اس تصنیف میں حافظ کے اشعار کی پیچیدگی اور غوامض کو حل کیا ہے اور آسان ترین عبارتوں میں ان اشعار کی تشریح کی کوشش کی ہے۔ شیخ کی کوشش یہی رہی ہے کہ حافظ کا نفس مضمون واضح ہو جائے۔ جہاں جہاں اشعار میں ابہام نظر آیا ہے شیخ نے اُس اُس شعر کی وضاحت کی ہے خاص طور سے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ وہ ابہام ان کی نثر میں نہ رہ جائے جس سے حافظ اپنے اشعار میں بچا نہ چھڑا سکے۔ بعض بعض جگہوں پر حافظ کے اشعار کا سعدی اور دیگر شعرا سے موازنہ بھی کیا ہے۔ ان صنعتوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جن کا استعمال شاعر نے اپنے شعر میں کیا ہے۔ ان تلمیحات کی بھی وضاحت کی ہے اور انھیں بیان کیا ہے جو شاعر کے اشعار میں آئی ہیں۔ شیخ نے اس کے اشعار کا جائزہ جغرافیائی نقطۂ نظر سے بھی کیا ہے۔ ان کا نفسیاتی جائزہ بھی لیا ہے۔ ضرب الامثال پر بھی کڑی نگاہ رکھی ہے۔ فارسی اور خاص طور سے اس سماج میں موجودہ محاورات پر بھی شیخ کی گرفت رہی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ شیخ نے ایک ایماندار شارح کا حق ادا کیا ہے۔ تصوف کے مختلف نکات اور اس کی اصطلاحات کی بھی وضاحت کی ہے۔ شیخ کی یہ شرح حافظ کی دوسری شرحوں سے کسی طرح کم تر درجہ کی نہیں ہے بلکہ میری اپنی ذاتی رائے یہ ہے کہ شیخ نے بعض جگہوں پر دوسرے شارحین کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ عبارت کے نمونہ سے میری اس رائے کی وضاحت ہو جاتی ہے جو میں نے اس شرح کے مطالعہ کے بعد قائم کی ہے

حافظ کے شعر

"چو چشم من ہمہ شب جو نبار باغ بہشت
خیال نرگس ست تو بیند اندر خواب"

کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اشکال ایں بیت آں است کہ جو نبار خواب ندارد پس خیال نرگس معشوق را چگونہ در خواب می بیند ہم چو جو نبار باغ بہشت در جوئے آبش آں است تو ہمی باشند و ذکر خواب دریں جا بہ طریق تزئین یعنی تزئین تشبیہ حاصل گردد ایں صفت در کتب صنایع مذکور است و فقیر نیز بیان آں در رسالہ تذکرۃ البدائع فی بیان الصنائع نمودہ و میتواند بود کہ مراد آں باشد کہ چنانکہ چشم من یعنی ذات من بمثل تو جہی کہ گذشت در خیال نرگس است کہ تو اردی بمثل جہاں توجیہ گذشتہ ذات محبوب مراد است ہمیشہ میباشند جو نبار بہشت ہمیں خیال دارد یعنی ہمہ مشتاق ذات آں عالی درجات اند" حافظ نے جہاں جہاں قرآن و احادیث و اقوال علما و صوفیا سے فیض اٹھایا ہے شیخ نے اس طرف بھی واضح اشارات کیے ہیں۔ شیخ کی یہ شرح دو سو انتیس (۲۲۹) صفحات پر مشتمل ہے [شیخ نے اس شرح کو اپنے پیر و مرشد حضرت قطب الاولیا میر سید محمد کالپوی کی فرمائش پر رقم کیا ہے۔ اس نسخہ کا مقابلہ میرے جد مکرم نے نسخہ کتب خانہ نواب کلیانی سے ۱۳۳۲ھ میں کیا ہے۔ اور جس نسخہ سے نقل ہوا ہے وہ ۱۲۵۷ھ کا کتابت کیا ہوا نسخہ تھا۔ جسے حافظ غلام محمود کاتب نے حضرت سید محمد ساکن گلبرگہ کی خواہش پر کسی نسخہ سے نقل کیا تھا۔ موجودہ نسخہ کا کاتب محمد کمال الدین کاپی نویس مطبع صدر مجلس گلبرگہ شریف ہے۔] شیخ کی ان چند تصانیف میں جو دائرہ میں موجود ہیں، دوسری قابل ذکر تصنیف شرح مثنوی مولانا روم ہے۔ اس شرح کا نام حل مثنوی بین الجمہور ہے جو چھ حصوں پر مشتمل ہے۔ شیخ کی اس تصنیف کے مطالعہ کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ اشعار کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں مشکل اور دقیق الفاظ اور اشعار کے ابہام کی تشریح عام فہم زبان میں کی ہے فلسفیانہ نکتوں کی موشگافی کی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مولانا روم کی مثنوی اور اس کے ایک ایک شعر کو سمجھنے کے لیے قرآن اور حدیث پر گہری نظر ہونی لازمی ہے شیخ اس مرتبہ پر فائز تھے لہذا قرآن و حدیث سے بھی استفادہ کیا ہے اور ان تمام نکات کی تشریح کی ہے جو مولانا روم کے یہاں قابل تشریح تھے۔ شیخ نے اس بات کا خاص طور سے خیال رکھا ہے کہ اشعار کے معنی و مطالب کے جویا ان کی تشریح کی طرف راغب ہوں اور انھیں کلی طور پر کامیابی حاصل ہو۔ اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ اشعار کے معنی و مطلب سمجھنے میں کوئی خلش باقی نہ رہے۔

تمام شبہات جو متن پڑھنے کے بعد سر ابھارتے ہیں ان شبہات کو بھی دفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے ضعیف کلام کی بھی نشاندہی کی ہے اور اس کے نقائص اور اس میں جو بھول چوک شاعر سے ہوگئی ہے اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ جن مقامات پر کوئی چارہ بجھانے کا اور تشریح کا نہ رہا وہاں اہل وحدت کے کلام سے اس کی تشریح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے نقل کو بھی واضح کیا ہے اور وہ عبارت جو شکنجے میں کسی جاسکے اس کی بھی نشاندہی کی ہے۔ الفاظ اور محاورات کی سند کے لیے شیخ نے بہت سی لغات کے حوالے بھی دیئے ہیں۔ اس شرح کے درمیان شیخ نے جن جن کتابوں سے استفادہ کیا یا جن جن شرحوں کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کے نام بھی واضح کر دیے ہیں اور ان کی غلطیوں کا بھی اظہار کرتے ہوئے بے لاگ تبصرہ بھی کر دیا ہے۔

جہاں تک زبان کا تعلق ہے اپنے طور پر شارح نے عام فہم تشریح کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ کچھ ابہام رہ گیا تھا جس کے ازالہ کے لیے ایک رسالہ بھی تحریر کیا۔ جس میں اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ اس رسالہ کا نام تکملۂ حل رکھا۔ اس کے علاوہ تکمیل حل مثنوی کے نام سے مزید مولانا شاہ سید اجملی سجادہ نشین دائرہ شاہ اجمل کے پاس موجود ہے۔ تیسری تصنیف جو چند اوراق پریشاں پر مشتمل ہے اور خستہ حالت میں شاہ صاحب موصوف کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خطوط شاہ صاحب نے اپنے اعزہ، اقارب، دوست احباب نیز مریدین و معتقدین کو لکھے ہیں اور خاندان کے افراد میں سے کسی نے جمع کیے ہیں۔ خطوط کے جملے چھوٹے چھوٹے ہیں۔ حتی الامکان شیخ نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ نفس مضمون واضح ہو جائے۔ زبان عام فہم استعمال کی ہے۔ اس کے علاوہ شاہ عبدالعزیز بسمل گورکھپوری مرید و خلیفہ شیخ محمد افضل الہ آبادی نے تقریباً پچاس مکتوب مکتوبات شاہ خوب اللہ جلد اول میں شیخ محمد افضل الہ آبادی کے جمع کیے ہیں جسے قسم اول میں محفوظ کر دیا ہے۔

محاکمہ شیدا و قدسی و منیر میں شیخ نے ان تینوں شاعروں کے اشعار کا محاکمہ کیا ہے۔ اس تصنیف کے چند اوراق پریشاں دستیاب ہوئے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ نے ان تینوں شاعروں کے اشعار کا محاکمہ کیا ہے اور ان کی خامیوں اور خوبیوں کو اجاگر کیا ہے۔ ان میں استعمال کی گئی تشبیہات و استعارات یا صنعتوں کے استعمال کرنے میں شاعر کہاں تک کامیاب ہوا ہے اور کہاں اس نے غلطیاں کی ہیں اس کی تشریح کی گئی ہے۔ اگر اسے فارسی میں عملی تنقید کا نام دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ تنقیدی نقطہ نظر سے شیخ نے ان کے کلام کا جائزہ لیا ہے۔ اس سلسلہ میں محسوس ہوتا ہے کہ شیخ کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔

شیخ بہت سی کتابوں کے مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ فارسی کے مشہور شاعروں میں بھی شمار کیے جاتے ہیں۔ پہلے شیخ تخلص فرماتے تھے۔ پھر مرید ہونے کے بعد مختصر تخلص فرمایا۔ تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی فرمائی۔ ان کی شعری خدمت الگ سے ایک مضمون کی متقاضی ہے۔ نمونہ کے طور پر غزلوں کے چند اشعار پر اس مضمون کا اختتام کروں گا تاکہ قارئین کو یہ علم بھی ہو جائے کہ شیخ فارسی کے ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب طرز شاعر بھی تھے۔

آں سزا دار شد اسرار خدا دانی را کہ جدا کرد ز خود خواہش نفسانی را
زیب پیشانی ہر کس بود از صندل دین خواہم از خاک درش زینت پیشانی را
مذہب زرطلباں حرص زر اندوختن است مذہبم ترک تمنا بدل آموختن است
ز پے بردن دل جلوہ نماید لیکن عادت ماہ وشاں چہرہ برافروختن است
دلا می آید آں نازک نہال آہستہ آہستہ تماشا کن بروئیش خط و خال آہستہ آہستہ
نہ من قامت آں صنم دیدہ ام قیامت بہ یک حرف کم دیدہ ام

حضرت شیخ محمد افضل الہ آبادی نے آج سے تقریباً ساڑھے تین سو برس پیشتر جس دائرہ علم و معرفت کی بنیاد ڈالی ان کے اخلاف نے اس کی آبیاری کی اور ایسے ایسے علما، فضلا، ادبا و شعرا اس زرخیز سرزمین سے پردہ ظہور پر جلوہ گر ہوئے جنھوں نے علم و معرفت کی اس روایت کو قائم رکھا۔ آج بھی اس خانوادے میں علم و معرفت کا چرچا ہے۔ موجودہ رہنما حضرت مولانا شاہ سید احمد اجملی سجادہ نشین

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

ضمیر میرٹھی
۲۴۹۔ لساڑی گیٹ۔ کمبوہ کا پل۔ میرٹھ

نذرِ عقیدت

(علی گڑھ یونیورسٹی)

مرکزِ علم و فن آفریں آفریں
ہے علی گڑھ ترے دم سے خلدِ بریں

خون دے دے کے اپنا نکھارا تجھے
یعنی احمد نے برسوں سنوارا تجھے
ہو گئی وا ترے در پہ رعنائی ہی
تیرے آنچل میں دوشیزۂ زندگی
معترف تیری عظمت کا سارا جہاں
تا بہ حدِ نظر گلستاں گلستاں
مرکزِ علم و فن آفریں آفریں

تیرے ذرّات ہیں ہمسرِ کہکشاں
تو نے پیدا کیے سیکڑوں نکتہ داں
شرق سے غرب تک ہر طرف ہیں عیاں
تیری تہذیب کی آج پرچھائیاں
تو فروغِ ادب کی حسیں انجمن
کس قدر دلنشیں ہے ترا بانکپن
مرکزِ علم و فن آفریں آفریں

تجھ سے روشن ہوئے علم کے وہ چراغ
مل گئے آدمیت کے جن سے سراغ
تو جلاتا رہا ہے دیے سے دیا
کتنے ذہنوں کو بخشی ہے تو نے ضیا
مٹ گئیں ظلمتیں تیری تنویر سے
خواب سیدؔ ملے اپنی تعبیر سے
مرکزِ علم و فن آفریں آفریں

جگمگانے لگی ہر طرف زندگی
تیرے دامن سے پھیلی ہے وہ روشنی
جس طرف بھی گئی تیری یادِ زباں
کتنے کانٹوں کے بن ہو گئے گلستاں
فکر و فن سے ہے معمور دامن تیرا
درحقیقت ہے تو نازشِ ایشیا
مرکزِ علم و فن آفریں آفریں

اس سلیقے سے کیں تو نے گل پاشیاں
بڑھ گئیں جس سے ذہنوں کی رعنائیاں
یوں اندھیروں میں تو نے چراغاں کیا
آدمیت کو ہر سمت نمایاں کیا
تیرے ایثار پر کچھ تعجب نہیں
تیرے دامن پہ مہرِ تعصب نہیں
مرکزِ علم و فن آفریں آفریں

تیرے جلوؤں سے کونین میں نور ہے
تیرا دامن اُجالوں سے معمور ہے
ایک مہرِ منوّر ہے مہتاب ہے
درحقیقت تو اہلِ جہاں تاب ہے
آج دنیا میں افضل ہے تیرا مقام
اہلِ عالم کا ہو کیوں نہ تجھ کو سلام
مرکزِ علم و فن آفریں آفریں
ہے علی گڑھ ترے دم سے خلدِ بریں

اشتیاق عوض
کاکوری ہاؤس
ڈالی گنج، لکھنؤ

جنگلی جانوروں کی تحفظ گاہیں (کاربٹ نیشنل پارک)

ہمارے ملک کو قدرت نے طرح طرح کی نعمتوں سے مالامال کیا ہے۔ ایک طرف پہاڑ، جنگلات، زرخیز میدان سمندر اور دریاؤں کا سلسلہ ہے تو دوسری طرف زیرزمین معدنیات یعنی جواہرات، چاندی، سونا، تیل اور تانبہ و کوئلے سے ہم کو نوازا ہے۔ مگر قومی شعور کی کمی کی وجہ سے ہم اپنی دولت کی قدر نہیں کرتے۔ اس وقت میں ملک کی اس دولت کا ذکر کر رہا ہوں جس کو جنگلی جانور کہا جاتا ہے۔ اس دولت کی وجہ سے ہمارے ملک کو دنیا میں اہم مقام حاصل ہے۔

ہمارا ہرن، ہمارا مشکی ہرن۔ ہمارا چکارا، ہمارے نیل۔ چیتل۔ چوسنگھا۔ بارہ سنگھا۔ بھالو۔ پاڑہا۔ مارخور۔ کاکڑ۔ ہاتھی۔ گینڈا۔ ارنا بھینسا۔ تیندوہ۔ بائی سن اور ہمارا رائل بنگال ٹائیگر (دھاری دار شیر) دنیا میں اپنی خصوصیات کے اعتبار سے کوئی ثانی نہیں رکھتا لیکن افسوس کی بات ہے کہ ہم قومی شعور کی کمی کی وجہ سے ہمیں بعض جنگلی جانوروں کی نسل سے ہاتھ دھونا پڑا اور ہمارے بعض جنگلی جانور دوسرے ملکوں نے منگا کر ان کی نسل کو اپنے یہاں بڑھانا شروع کر دیا ہے۔ بہرحال ہماری حکومت قابل تعریف ہے کہ اس نے دیر سے سہی اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا اور ملک بھر میں وائلڈ لائف وارڈن کے محکموں کا جال پھیلا کر جنگلی جانوروں کی تحفظ گاہیں (سینکچریاں) قائم کیں اور جنگلات کے ٹکڑوں کو محفوظ قرار دے دیا ہے۔ جن میں شکار قطعی منع ہے۔ اس طرح نیچرل ماحول میں جنگلی جانوروں کی نسل کو بڑھانے کا موقع فراہم کیا جا رہا ہے۔

ایک شکاری جنگل کے ماحول میں جنگلی جانوروں کے بیچ وقت گزارنے پر جان نچھاور کرتا رہتا ہے۔ شکاری کے علاوہ حوصلہ مند ایڈونچرسٹ، مہم پسند اور قدرتی مناظر کے مشاہدے سے ذوق رکھنے والے لوگوں کے لئے بھی یہ ماحول اتنا دلفریب، حیات بخش اور پرکشش ہوتا ہے کہ اس میں گزرے لمحات کو فلم کمپنیاں شوٹنگ کرکے کیمرے کی ریلوں میں محفوظ کر لیتی ہیں اور دنیا کے کونے کونے میں اپنی فلموں کو دکھا کر تفریح و معلومات کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ وہ سیاح اپنے کو انتہائی خوش قسمت سمجھتا ہے جو اس زندگی کی جھلک بہ چشم خود اصلی روپ میں دیکھ لیتا ہے۔

ایسے ماحول سے لطف اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ سیاح کے ساتھ کوئی گائڈ ہو، راستہ بتانے کے لیے نہیں بلکہ سچے شکاری کی طرح وہ ہر جنگلی جانور کی نفسیات اور عادتیں بتاتا جائے اور یہ بھی بتائے کہ کون جانور کس موڈ میں ہے شیر نے ناک بھوں کیوں چڑھائی۔ بھالو نے ناک کیوں سکوڑی تیندوے نے کان کیوں کھجائے۔ دُم کیوں کھینچی۔ زمین کیوں کھرچی۔ وہ مردہ بن کر زمین پر کیوں پڑا ہے۔ کس درندے کی آنکھوں میں کب محبت ہوتی ہے۔ کب قہر اور

کب سکون۔ جانور کا موڈ بھوک پیاس، خفگی۔ آرام محبت ونفرت۔ ڈر اور خوف کے جذبات دخواہشات سے جب بدلتا ہے تو مخصوص انداز واشارے کیا ہوتے ہیں۔ ان کی بولیوں میں جب فرق آتا ہے تو اس کے اشارے سمجھنا کس قدر ضروری ہوتا ہے۔ اسا گائڈ ماہرانہ کان اور آنکھ رکھنے کے ساتھ ساتھ احساسات کے اعتبار سے بھی بہت بیدار ہوتا ہے۔ جنگل کا گائڈ ان گائڈوں سے مختلف ہوتا ہے جو طوطے کی طرح تاج محل لال قلعہ اور تاریخی عمارتوں کے سلسلے میں بے سر پیر کے واقعات زیب داستاں کے لیے چرب زبانی کے سہارے بیان کرکے سیاحوں کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ وہاں تو تاریخی عمارتوں سے متعلق مرحوم ہستیاں نہ تو اس کو نہ روک سکتی ہیں نہ بول سکتی ہیں مگر جنگل میں خطرناک جانور کو بے خطر یا غضبناک و خطرناک ماحول کو محبت کا ماحول بنانا خطرہ کا سبب بن سکتا ہے جو کبھی کبھی عبرتناک انجام کو پہنچا دیتا ہے۔ دلچسپی اور عبرت کے خیال سے حال کا ایک واقعہ ان کیے دیتا ہوں۔

کچھ عرصہ ہوا امریکہ سے آٹھ سیاح زیادہ تر بڑی فیشن والے آئے تھے۔ چار لڑکیاں اور چار جوان سال لڑکے۔ ایک جنگل میں ہاتھیوں، گھوڑوں اور جیپ میں جنگل کرائے سے انگریزی بولنے والے دو گائڈوں کے ساتھ گھومتے پھرتے ایک جگہ جمع ہوئے ان میں سے ایک گروپ نے بتایا کہ ایک شیرنی اپنے بچوں کے ساتھ ایک فرلانگ کے فاصلہ پر انھوں نے دیکھی ہے۔ سیاح اور گائڈ سب پیدل اسی طرف دوڑ پڑے۔ جھاڑیاں کانٹے اور نالیاں پھاندتے۔ چند منٹ میں ایک نالے کے کنارے جا کھڑے ہوئے جس کے قریب شیرنی دیکھی گئی تھی۔ گویا بندر کا ناچ یا سرکس کا تماشہ دیکھ رہے ہوں۔

ایک ساتھ اتنی آوازیں سن کر شیرنی نے اپنے بچوں کو بھی کی جھاڑی میں چھپ گئی۔ وہاں پر نالہ تقریباً پندرہ فٹ گہرا تھا، اس کے اوپر کا کنارہ صاف ستھرا گھاس کا کشادہ میدان تھا وہاں سے شیرنی کی جھاڑی صرف پانچ سات قدم پر تھی جس میں بپھری ہوئی شیرنی ان آدمیوں پر آنکھیں گاڑے چھپی ہوئی تھی جسے کسی نے نہیں دیکھا۔ سیاحوں کی نظریں بڑی بے تابی سے شیرنی اور اس کے بچوں کو تلاش کر رہی تھیں۔ اتنے میں ایک سیاح نے بڑے اسپورٹنگ انداز میں چلا کر گائڈ سے کہا کہ شیرنی کے بچوں کو ضرور پکڑا جائے گا۔ اس بات پر سب لوگوں نے شور مچا کر واہ واہ کی اور گائڈ صاحب نے بہت تھرک کر ایک چھلانگ لگائی اور بد قسمتی سے وہ شیرنی والی پتاور کے پاس پہنچ گئے اور وہاں سے چیخ کر کہا کہ اپنے کیمرے تیار رکھو...... اتنے قریب چیخ و پکار کو شیرنی کب برداشت کرنے والی تھی۔ شیرنی نے جلدی جلدی چند دھیمی آوازیں دیں مگر ان آوازوں کو کوئی پرکھ بھی نہ پایا اور اسی کے فوراً بعد غضبناک آواز کے ساتھ جیسے بادل پھٹ پڑا۔ کوندا لپک گیا اور ایک بجلی سی لکیر پتاور سے لپکی یعنی شیرنی نے حملہ کر دیا۔ ... میں دیکھنے والوں کی پوری فوج زمین چاٹنے لگی۔ چیخ و پکار کی بھیانک آوازیں فضا میں گونج اٹھیں۔ نالے کے پانی میں سے چھپاکے کی آواز آئی اور کوئی اس میں گرا۔ کوئی لڑھک کر کچھ دور زمین پر لوٹا اور بے ہوش ہو گیا۔ کسی کی گھگی بندھ گئی اور اسی عالم میں اوندھے منہ گر پڑا۔ گائڈ صاحب کا پتلون اس جگہ سے پھٹ گیا تھا جہاں کولہے کا گوشت شیرنی کے پنجے ... چلا گیا تھا۔ شیرنی معہ بچوں کے جا چکی ... تجربہ کار مہاوت اپنا ہاتھی سیاحوں کے پیچھے پیچھے لگائے لا رہا تھا اس نے یہ سب ماجرا دیکھا اور ہاتھی کو بڑھا لایا۔ بے ہوش افراد کو اٹھانے کے لیے ڈرے سہمے اوندھے منہ پڑے لوگوں کو اس نے جگایا۔ نالے کی کیچڑ سے ... نکالا، نہلا دھلا کر زخمی گائڈ کو لے کر

آئیے اب ہم کاربٹ نیشنل پارک چلیں۔ یہ پارک اپنے دیش میں جنگلی جانوروں کے لیے تحفظ گاہ (سینکچری) کے خواب کی پہلی تعبیر اور اس تصور کا سب سے پہلا مرکز ہے جو ۱۹۳۵ء میں قائم ہوا۔ اس کا پہلا نام ہیلی نیشنل پارک رکھا گیا (یعنی سر مالکم ہیلی گورنر یو۔پی۔ کے نام پر) کچھ عرصہ بعد اس کا نام بدل کر رام گنگا نیشنل پارک رکھا گیا پھر ۱۹۵۷ء میں دوبارہ اس کا نام بدل کر کاربٹ نیشنل پارک رکھا گیا۔

مسٹر جم کاربٹ شکاری برادری کا واحد شکاری ہے جس کی شکاریات سے متعلق خدمات کو قومی سطح پر حکومت نے تسلیم کر کے اس کے نام سے جنگل کے اس ٹکڑے کو منسوب کیا ورنہ نہ جانے کتنے مایہ ناز فن کار شکاری اسی دیس کی دھرتی پر جفاکشی، بہادری اور بے غرض خدمت خلق کی انگنت مثالیں پیش کر کے موت کی گود میں سو رہے ہیں مگر ان کا نام لیوا کوئی نہیں ہے۔

بہرحال شکاری برادری کرنل جم کاربٹ کی زندگی پر فخر کرتی رہے گی۔ جم کاربٹ کون تھا۔ اس کی خدمات کیا تھیں جن کی یاد میں اتنا بڑا پارک قائم کیا گیا اس کی مختصر تفصیل اس طرح ہے۔

مسٹر جم کاربٹ ایک ماہر اور کامیاب شکاری تھا جس نے اپنے شکاری واقعات بڑی خوبصورتی سے اپنی متعدد کتابوں میں بیان کیے ہیں جس کی وجہ سے اس کو انگریزی زبان کا ماہر قصہ گو شمار کیا گیا اور اس نے عالمی شہرت پائی۔ بقول مسٹر آسٹن (کتاب دنیا کے مشہور ایڈونچرز ص ۱۰۲) "یہ بات تحقیق طلب ہے کہ کرنل جم کاربٹ بحیثیت شکاری زیادہ بلند ہیں یا بحیثیت شکاری قصہ گو کے" جم کاربٹ نے اپنے شکاری واقعات کئی کتابوں میں لکھے ہیں۔ اس سلسلے کی پہلی کتاب "کمایوں کا آدم خور" (مین ایٹرز آف کمایوں) انگریزی زبان میں ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی جو طرز بیان اور شکار کی تصویر کشی کے اعتبار سے ایک بلند پایہ تصنیف ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ بیس زبانوں میں کیا گیا۔

اسی طرح ان کی دوسری کتابیں بھی معیاری تصانیف ہیں ہندوستان میں انگریزی عمل داری کا شروع کا زمانہ تھا، کمایوں اور گڑھوال کا علاقہ ملکہ وکٹوریہ کی ذاتی جاگیر شمار ہوتا تھا نینی تال کے ڈاک خانے کے انگریز پوسٹ ماسٹر کا آٹھواں لڑکا جم کاربٹ تھا جو ۱۸۷۵ء میں وہیں پیدا ہوا۔ ملکہ وکٹوریہ کی ذاتی جاگیر کے نگراں سر ڈ ریمزے تھے جسے اس علاقے میں سب سے زیادہ باوقار سمجھا جاتا تھا اس نے ایک گاؤں جم کاربٹ کے باپ کو بطور معافی دے رکھا تھا۔ انھوں نے بمقام لال ڈھنگی ایک مکان بنا رکھا تھا۔ یہ جگہ چاروں طرف سے جنگلوں سے گھری ہوئی تھی جہاں شیر، تیندوے اور ہر طرح کے جنگلی جانور موجود تھے بچپن ہی سے جم کاربٹ بہت بہادر، مہم پسند اور شکار کا شوقین تھا۔ نشانے بازی میں مہارت اس کو قدرت نے بخشی تھی۔ جانوروں سے متعلق امور سے اسے گہری دلچسپی تھی، ان امور کو سمجھنے اور سمجھانے کی بھی اس میں زبردست صلاحیت تھی۔

جم کاربٹ دن رات شکاری زندگی کے نشیب فراز بنفس نفیس دیکھتا اور جھیلتا رہا۔ پڑھنے لکھنے میں اس کا جی نہیں لگتا تھا نشانے بازی کے شوق نے اس کو فوجی لوگوں میں روشناس کرا دیا۔ انگریزی حکومت کا زمانہ تھا اور وہ ملکہ وکٹوریہ کی ذاتی جاگیر میں معافی پر ملے ہوئے گاؤں میں رہتا تھا جس کے چاروں طرف شکار ہی شکار تھا۔ تمام سرکاری حکام اس کا خاص لحاظ کرتے اور اسے چھوٹ دیے رہتے تھے۔ کمایوں اور گڑھوال کے دور افتادہ علاقوں تک جم کاربٹ شکار کی چاٹ میں گھوما پھرا کرتا تھا اس طرح گاؤں کے زیادہ تر باشندوں سے اس کا یارانہ ہو گیا۔ جم کاربٹ نے کوئی نوکری مستقل نہیں کی نہ مستقل کاروبار کیا۔ ٹھیکیداری کی یا فوج میں رنگروٹ بھرتی کرنے کے افسر کی حیثیت سے کام کیا۔ جنگ عظیم کے زمانے میں جنگ پر بھیجا گیا مگر فوجیوں کو رائفل چلانا سکھانے کے لئے۔ اس لیے وہ کرنل کے عہدے تک پہنچا۔ مگر میدان جنگ سے واپسی کے بعد پھر فرصت تھی چنانچہ وہ دن رات شکار میں مست رہتا۔ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ کمایوں کے علاقے میں اسی زمانہ میں طاعون کی وبا پھیل گئی تھی جس سے ایک ایک دن

میں کئی گئی موتیں ہونے لگیں۔ ان مردوں کی لاشیں پہاڑی کھائیوں میں پھینک دی جاتی تھیں جنھیں وہاں کے تیندوے کھا کھا کر آدم خور بنتے گئے۔ اور بقول جم کاربٹ کے کمایوں میں آدم خور درندوں نے ۴۳۶ آدمی مارے اور چمپاوت میں چار سو آدمی مارے۔ مقامی حکام نے جم کاربٹ کی امداد چاہی اور وہ مرد میدان آدم خور درندوں کو فنا کرنے کیلیے کمربستہ ہو گیا۔ اپنے علاقے سے وہ واقف تھا ہی اس نے بڑی کامیابی کے ساتھ بدنام درندوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اگرچہ جم کاربٹ کا شکاری میدان اس کے اپنے علاقے کمایوں گڑھوال ہی تک محدود رہا۔ نہ وہ غیر ضلعوں میں گئے نہ غیر ملکوں میں۔ اسی طرح متعدد قسم کے جانور جو غیر ملکوں میں پائے جاتے ہیں جم کاربٹ کی شکاری زندگی کے تجربوں سے باہر ہیں۔ کمایوں گڑھوال میں جم کاربٹ بہت مقبول تھے۔ وہاں لوگ ان کو گورا سادھو کہا کرتے تھے وہ وائسرائے کے دربار سے لے کر ایک غریب آدمی تک بڑی اور عزت کے ساتھ ان کا ذکر کیا جاتا —— آخری عمر میں ہندستان چھوڑ کر جب وہ لندن گئے تو بہت کچھ مال سامان اور جائداد اپنے علاقے کے غریبوں کے لیے وقف کر گئے۔ ان کا آخری زمانہ افریقہ کے ملک کینیا میں گزرا اور وہیں ۱۹۵۵ء میں وفات پا گئے۔ ۱۹۳۵ء میں جنگلی جانوروں کے لیے تحفظ گاہ (سینکچری) کا تصور جم کاربٹ نے پیش کر کے اپنے علاقے میں جنگل کے بہت بڑے حصّے کو انھوں نے ہیلی نیشنل پارک کے نام سے موسوم کرا کے محفوظ کروایا۔ وہ خود جاڑوں میں ترائی کے مقام لال ڈھنگی اور گرمیوں میں نینی تال میں رہا کرتے تھے۔ کاربٹ پارک اپنی خوبصورتی کے لیے مشہور ہے۔ سال اور ہلدو کے اونچے اونچے درخت پھول دار بیلوں کی گھنی جھاڑیاں ایسا لگتا ہے گویا دوشالے اوڑھے ہیں۔ قرینے سے بنی سڑکیں۔ قریب آٹھ مینار (ٹاور) ایسی جگہوں پر بنے ہیں کہ جنگلی جانوروں کو آسانی سے دیکھا جا سکے ٹھہرنے کے لیے حکومت کی طرف سے ریسٹ ہاؤس۔ ڈاک بنگلے سجے سجائے موجود ہیں۔ جم کاربٹ کا بنگلہ اور ان کا کچھ سامان بطور یادگار محفوظ کر دیا گیا ہے تاکہ سیاح اس کا دیدار کر سکیں وہاں ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کے آنے جانے کا سلسلہ لگا رہتا ہے۔ ٹرین سروس رام نگر اور ہلدوانی تک ہے جہاں ٹیکسیاں اور بسیں ملتی ہیں۔ اس کا فاصلہ دلی سے ۲۴۵ کلومیٹر (۱۵۲ میل) ہے۔ سڑک کے راستے سے ڈھکالا ۴۰ کلومیٹر (۲۸ میل) ہے جنگل میں گھومنے کے لیے ہاتھی اور جیپ کی سواری کا انتظام رہتا ہے۔ پہلی جون سے ۳۱ اکتوبر تک یہ پارک تفریح کے لیے بند رہتا ہے۔ فروری مارچ اپریل اور مئی کے مہینے تفریح کے لیے اچھے رہتے ہیں۔

رام گنگا میں موسم بہار اور گرمیوں کے موسم میں مچھلیوں کا شکار پرلطف رہتا ہے۔ یہاں گھڑیال اور مگرمچھ نظر پڑیں گے یہاں کے رہنے والے درندے شیر اور تیندوے اب اتنے وحشی نہیں رہے بلکہ اکثر سامنے سے گزرتے نظر آئیں گے —— اور تصویریں کھینچنے دیں گے۔ آپ فرمائش کیجیے تو سرکاری عملہ آپ کے مینار کے سامنے بکری شیر کو کھلائے گا اس طرح شیر اور تیندوے کے شکار مارنے کا اصلی سین آپ دیکھ سکیں گے۔ وہاں آپ کو بھالو ملے گا جو یا تو دیمک کھا رہا ہو گا یا شہد کے چھتے میں اپنی تھوتھنی گھسیڑے شہد پی رہا ہو گا۔ اگر راستے میں اچانک مل گیا تو وہ پیروں پر کھڑا ہو کر تھوک کا بادل اڑا دے گا۔ جنگلی ہاتھی نظر پڑے تو جدھر راستہ ملے بھاگ جائیے۔ جنگل کی نازک اندام دلہن یعنی خوبصورت چیتل کے غول نظر پڑیں گے جن کا سبک و نازک بدن پھرتیلے پن کی آپ مثال ہے۔ نر چیتل بڑے بڑے سینگ لیے دوڑتے دکھائی دیں گے۔ بارہ سنگھے کسی جھابر اور کیچڑ والے علاقے میں پڑے ہوں گے۔ سانبھر قد میں گھوڑے کے برابر ہو گا۔ اور اگر وہ قریب میں بول دیا تو اس کی آواز سے وحشت محسوس ہو گی۔ کاربٹ پارک کے آخر طرف رام گنگا ندی بہتی ہے جس کا پانی جاڑوں میں بہت صاف شفاف رہتا ہے اس میں مہاشیر

(بقیہ صفحہ ۴۸ پر)

غزلیں

تجسس اعجازی
مظہر عالم پبلک لائبریری ۱۲۔ناداں محل روڈ لکھنؤ

قطرے لہو کے پہلے سپردِ قلم ہوئے
تب جاکے زندگی کے مسائل رقم ہوئے

پہنچے جو دار تک بنے خورشیدِ زرفشاں
جو رک گئے وہ سایۂ دیر و حرم ہوئے

دستِ عطا بدل گئے دستِ سوال میں
کیسے کہیں ضمیر پہ کیا کیا ستم ہوئے

گرمیٔ عیش ڈال گئی دل میں جھائیاں
آخر گلِ نشاط ہی داغِ الم ہوئے

آشفتگانِ حسن کی اللہ رے آن بان
قدموں میں دل بچھائے مگر سر نہ خم ہوئے

برقِ جمالِ خندہ بیجا سے فائدہ
خود ہوش ہی میں کب تھے جو بیہوش ہم ہوئے

تلوار خود ہی جرأتِ اظہار بن گئی
یہ سر اسی زبان کے ہاتھوں قلم ہوئے

کام آگئیں جہاں کے تجسس کی لغزشیں
سجدے ہمارے باعثِ نقشِ قدم ہوئے

سید علی شبر حسینی کرہانی
۱۰۱۔مقبرہ گولہ گنج۔لکھنؤ

خونِ جگر دیا ہے چمن زار کے لیے
جب بھی چنے ہیں پھول کچھ اشعار کے لیے

ماضی کو اپنے حال کا رہبر بنا لیا
اے وقت تیری شوخیِ رفتار کے لیے

لایا ہوں بیچنے کو میں بیداریِ عمل
سوئے ہوئے ضمیر کے بازار کے لیے

شیشے کی بستیوں میں اجالوں کے شہر میں
بیٹھا ہوں روشنی کے کچھ آثار کے لیے

کتنا بنا دیا ہے تصور نے مختصر
صدیوں کے فاصلے کو ترے پیار کے لیے

فرہاد عزم بن کے بڑھو میرے دوستو
تیشہ بہ دست وقت کے کہسار کے لیے

شہرِ غزل میں یوں ہوا چراغاں کا اہتمام
ہوں فن کے طاق فکر کی دیوار کے لیے

آتی ہے اب بھی مقتلِ احساس سے صدا
ہے کوئی سر شعور کی تلوار کے لیے

اب ہر جگہ تلاشِ حسینی نہ کیجیے
وہ وقف ہو چکا نگہِ یار کے لیے

اقبال قدوائی
روم نمبر ۱۰۵-اے ونگ
شاستری بھون۔ نئی دہلی

ہندستانی خلائی تحقیق کے نئے دور کا آغاز

ہندستان کی سائنس اور ٹکنالوجی کی تاریخ میں ۱۸ جولائی ۱۹۸۰ء کا دن سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔ اس دن صبح آٹھ بج کر تین منٹ ۴۵ سیکنڈ پر ۲۲ میٹر لمبا اور ۱۷ٹن وزنی خلائی راکٹ 'ایس ایل وی۔ ۳' مدراس سے ۱۰۰ کلومیٹر شمال میں (آندھرا پردیش کے ساحل کے نزدیک) واقع جزیرے سری ہری کوٹہ کے افق پر بلند ہوا۔ اس کے بعد فضا میں جب اس کا پہلا حصہ جلنے لگا تو نارنگی رنگ کا شعلہ تقریباً ایک منٹ تک بغیر کسی آلے کے دیکھا جا سکتا تھا۔ ۳۰ کلومیٹر کی بلندی پر جاکر یہ حصہ راکٹ سے علاحدہ ہوگیا۔ اس کے ۱۸ سیکنڈ بعد ۲۷ کلومیٹر کی بلندی پر دوسرا حصہ بھی الگ ہوگیا۔

تیسرے حصے کے راکٹ موٹر کے جلنے کے عمل کے بعد چوتھا حصہ بھی جل گیا اور اس کے ساتھ منسلک تیسرا مصنوعی سیارہ 'روہنی آر ایس۔ ۱' اپنے بیضاوی مدار میں پہنچ گیا۔ اس کی پرواز شروع سے ہی معمول کے مطابق ہے۔ یہ ۹۷ منٹ میں دنیا کے گرد ایک چکر لگا رہا ہے اور خود اپنے محور پر یہ ایک منٹ میں ایک مرتبہ گھومتا ہے۔ اس کے مدار کا کم از کم قطر تقریباً ۳۰۰ کلومیٹر اور زیادہ سے زیادہ ۹۰۰ کلومیٹر ہے۔ ۱۲ گھنٹے میں یہ دو مرتبہ سری ہری کوٹہ کے اوپر سے گزرتا ہے۔

راکٹ داغے جانے کے تقریباً ۱۲ منٹ بعد روہنی اپنے مدار میں پہنچ گیا۔

اس کارنامے کے بعد ہندستان بھی خلائی پرواز کی صلاحیت والے ممالک میں شامل ہوگیا۔ اس سے قبل سوویت یونین، امریکہ، فرانس، جاپان اور چین اس معاملہ میں کامیابی حاصل کر چکے ہیں۔ مصنوعی سیارے کو خلا میں لے جانے والے اس راکٹ کا تجربہ اس سے قبل ۱۰ اگست ۱۹۷۹ء کو بھی کیا گیا تھا۔ لیکن وہ ناکام رہا تھا۔ کیونکہ 'ایس ایل وی۔ ۳' کے دوسرے حصے میں کچھ خرابی پیدا ہو جانے کے باعث یہ راکٹ خلا میں نہ جا سکا۔ اس مرتبہ اس کی پرواز ۱۷ جولائی کو ہونا تھی لیکن ایک دن کے لیے اسے ملتوی کرنا پڑا۔ کیونکہ الٹی گنتی (کاؤنٹ ڈاؤن) کے دوران ایک معمولی سی خرابی کا پتہ چلا تھا۔ چنانچہ الٹی گنتی روک دی گئی اور اس خرابی کو دور کیا گیا۔ اس طرح پرواز میں ایک دن تاخیر ہوئی۔

ویسے تو اس سے قبل ہندستان کے دو مصنوعی سیارے خلا میں بھیجے جا چکے ہیں۔ لیکن وہ سوویت یونین کے اڈوں سے اور وہیں کے ماہرین کی مدد سے داغے گئے تھے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ ہندستان کا مصنوعی سیارہ ہندستان ہی کے اڈے سے خلا میں بھیجا گیا۔

راکٹ کا نیچے کا قطر ایک میٹر اور کل لمبائی ۲۲ میٹر ہے۔ مصنوعی سیارہ روہنی کا وزن ۳۵ کلو گرام ہے۔ پہلے تین مرحلوں کی رہنمائی اور کنٹرول کے لیے استراری (INERTIAL) نظام ہوتا ہے اور دیگر کئی طرح کے کنٹرولنگ نظام بھی ہوتے ہیں۔ ٹھوس ایندھن سے چلنے والا یہ راکٹ پہلے بالکل اوپر کی طرف اٹھتا ہے، اس کے بعد یہ جنوب مشرق کی سمت تھوڑا سا ترچھا ہونے لگتا ہے۔ اگر یہ اپنے معینہ راستے سے تھوڑا سا الگ ہونے لگتا ہے تو استراری نظام اس تبدیلی کو محسوس کر لیتا ہے اور خودکار پائلٹ نظام کو اسی مناسبت سے سمت کی تبدیلی میں مدد دیتا ہے۔ اس طرح چوتھے مرحلہ کی موٹر کے جلنے تک یہ راکٹ سوچے سمجھے راستے پر چلتا ہے۔

اس راکٹ کے پراجکٹ کی مجموعی لاگت ۲۰ کروڑ روپے ہے اور ایسے ایک راکٹ کی لاگت تقریباً ایک کروڑ روپے ہے۔ انتہائی پیچیدہ ٹکنالوجی کی بدولت یہ راکٹ انجینیرنگ اور سائنس کے کئی شعبوں کے اشتراک عمل اور امتزاج کی ایک اعلا مثال ہے۔ ان شعبوں میں راکٹ کے ڈیزائن، کنٹرول اور رہنمائی مختلف طرح کے کمپیوٹرز الکٹرانکس وغیرہ کے شعبے شامل ہیں۔ اس پراجکٹ کا تمام کام ملک کے اندر ہی ہوا ہے اور اسے ہندستانی ماہرین نے ہی انجام دیا ہے۔ کل ملاکر ۴۶ اداروں نے اس کی تیاری میں حصہ لیا۔ سری ہری کوٹہ، تری وندرم، احمد آباد اور کارنکو بار کے زمینی اسٹیشنوں پر مصنوعی سیارے سے بھیجے جانے والے حقائق حاصل کرنے کے نظام قائم کیے گیے۔

'ایس ایل وی - ۳' ایک لاکھ سے زائد پرزوں سے بنا ہے۔ اس میں کل ۴۴ بڑے نظام اور ۲۵۰ ذیلی نظام ہیں۔ اس کے پرزوں میں کئی ہزار برقی اور الکٹرانک پرزے ہیں۔ راکٹ داغے جانے کی تیاری کے دوران ہزار سے زائد قسم کی آزمائشیں ہوتی ہیں اور تقریباً ساڑھے آٹھ منٹ کے آخری دقیقے کے دوران تقریباً ۹۰۰ آزمائشیں کمپیوٹر کے ذریعہ کی جاتی ہیں۔ اس دوران الٹی گنتی ہوتی رہتی ہے۔ اگر کوئی نقص موجود ہو تو الٹی گنتی رک جاتی ہے۔ نقص کو دور کیا جاتا ہے اور الٹی گنتی شروع ہو جاتی ہے۔

مصنوعی سیاروں کی اہمیت یہ ہے کہ یہ طویل فاصلے سے معدنی وسائل کے جائزے کے لیے مفید ہیں۔ ان کی مدد سے زمین کے اندر چھپے ہوے معدنی وسائل اس طرح ظاہر ہو جاتے ہیں۔ جیسے ایکس رے کی مدد سے انسان کے جسم کے اندرونی حصے واضح ہو جاتے ہیں۔ موسم کے حالات کے مشاہدے اور مواصلات کے سلسلے میں ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ ان کی مدد سے موسم کی زیادہ درست پیشن گوئی کی جا سکتی ہے، جس میں مانسون کی پیشن گوئی بھی شامل ہے۔ مواصلات کے شعبے میں مصنوعی سیارے کی اہمیت یہ ہے کہ اس کی مدد سے دنیا کے دور دراز حصوں کے درمیان پیغام رسانی ہو سکتی ہے اور ٹیلی ویژن پروگرام بھیجے جا سکتے ہیں۔ ہندستان میں مواصلاتی مصنوعی سیارے کی کامیابی کے بعد تمام دیہی علاقوں میں ٹیلی ویژن کی سہولتیں بہم پہنچائی جا سکتی ہیں اور خواندگی کے پروگرام کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔

اس تجربہ کی کامیابی سے خلائی تحقیق کے آئندہ مراحل کے لیے راہ ہموار ہو گئی۔ پانچ برس کے اندر ہمارا ملک مواصلاتی مصنوعی سیارہ خلا میں بھیج سکے گا اور چھ یا سات برس کے بعد ۹۰۰ کلو گرام تک کے وزن کے اعلا صلاحیت کے پائیدار مصنوعی سیارے خلا میں بھیج سکے گا۔ دفاعی نقطہ نظر سے بھی اس کامیابی کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔

'ایس ایل وی - ۳' میں انتہائی اعلا معیار کا ٹھوس ایندھن استعمال ہوا ہے، لیکن اب سیال ایندھن کا استعمال بھی ممکن ہے، جس سے زیادہ وزن والے مصنوعی سیارے خلا میں بھیجے جا سکیں گے۔

ویسے تو اس مصنوعی سیارے کا کام پورا ہو چکا ہے، اس سے کافی حقائق حاصل ہو چکے ہیں، جن کا کافی عرصے تک تجزیہ کیا جائے گا لیکن یہ ابھی خلا میں موجود ہے اور اندازہ لگایا گیا ہے کہ تقریباً تین برس تک یہ اپنے مدار پر گردش کرتا رہے گا۔ مصنوعی سیارہ داغنے والے خلائی راکٹ کی تجرباتی پرواز کی کامیابی کی روشنی میں اب ہندستانی خلائی سائنسداں ایسے راکٹ کی ترقیاتی پرواز کی تیاریاں کر رہے ہیں، جو اس راکٹ سے بھی بہتر ہوگا۔



شیخ محمد افضل الہ آبادی کی ادبی خدمات — (صفحہ ۲۶ کا بقیہ)

دائرہ شاہ اجمل جو حیات اجمل، بیعت اور اس کی حقیقت جیسی اہم تصانیف کے مالک ہیں اسی کے ساتھ ساتھ آپ کی سرپرستی میں جامعہ نذیریہ اجملیہ، دارالعلوم عربیہ ہاشمی جیسے مدارس سے تشنگان علم اکتساب فیض کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ موصوف کی قائم کردہ بزم انجمن اجملیہ ادبی انجمنوں میں ممتاز حیثیت کی مالک ہے جہاں سے اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کا کام ہو رہا ہے۔



امیر احمد خسرو
سلطان پورہ
حیدرآباد-۵۰۰۰۲۴

حیدرآباد

حیدرآباد جسے شہرِ نگاراں کہیے
رنگ رخسارِ سحر حسن بہاراں کہیے
کسی شاعر کے خیالوں کی حسیں دنیا ہے
گل عذاروں کی غزالوں کی حسیں دنیا ہے
اس کی مٹی میں محبت کے کنول کھلتے ہیں
ذرہ ذرہ میں دھڑکتے ہوئے دل ملتے ہیں
اس کے سینے میں قطب شاہ کا کردار بھی ہے
وضعداری بھی ہے اخلاص بھی ہے پیار بھی ہے
اس کی باہوں میں بسی سہاگ مستی کی دنیا
جگمگاتا ہے جہاں چاند رواداری کا
مسجدیں بھی ہیں منادر بھی ہیں گرجا گھر بھی
نکہت و نور میں ڈوبا ہوا ہر منظر بھی
صبح آتی ہے مسرت کے پیامات لیے
زندگانی کے مہکتے ہوئے نغمات لیے
شام کے دوش پہ لہراتا ہے رنگیں آنچل
شب کی آغوش میں کھلتا ہے گلستانِ غزل
اس لیے میر کی غالب کی غزل کہتے ہیں
شہر کو میرے سبھی تاج محل کہتے ہیں

محمد نعیم صبا
(۴۵- نور محل - جی پی او-
بھوپال)

نذرِ اقبال

زماں مکاں کی حدوں میں جو قید رہ نہ سکا
حصارِ ذات کی محدودیت جو سہہ نہ سکا
وطن کے غم سے جو رہتا تھا رات دن بے کل
جو فکر مند رہا قوم کے لیے ہر پل
وہ جس کے نام پہ رہتی ہے دھوپ آٹھ پہر
کلام جس کا دکھاتا ہے سحر خیز اثر
جہاں سے کوچ کیا جس نے پھر بھی ہے زندہ
ہے جس کا فلسفۂ زندگی بہت گہرا
تھی بے نظیر زمانے میں جس کی دیدہ وری
خودی کو جس نے بتایا جہاں میں جیز بڑی
خدا نے جس کو بنایا .... عظیم فرزانہ
خرد نے جس کو عطا کی نظر حکیمانہ
خدا کو بندوں سے یوں جس نے ہم کلام کیا
جوابِ شکوہ میں ہر شکوے کا جواب لکھا
جو فکر و فن کا تھا لاریب ماہر کامل
وہ فخرِ ہند ہے اقبال شاعرِ کامل

خواجہ توصیف
معرفت ریونیو بورڈ
اتر پردیش۔ لکھنؤ۔

فرار

نہ اب کوئی خواہش نہ کوئی تمنا
نہ رونا غموں پر نہ خوشیوں پہ ہنسنا
نہ شکوہ کسی سے نہ کوئی شکایت
نہ آنکھوں میں ہے کوئی دلکش حکایت
نہ مایوس ہوں اور نہ امید کوئی
نہ کچھ ڈھونڈتی ہے نظر کھوئی کھوئی
مجھے اپنی دنیا سے بیگانہ سمجھے
مجھے چاہے ہر شخص دیوانہ سمجھے
نظاروں سے اس دل کو بہلا رہا ہوں
کنارے کنارے چلا جا رہا ہوں

نثار اعظمی

سرسیّد احمد خاں ۔ ایک مُطالعہ

انیسویں صدی میں جب کہ سلطنت مغلیہ تیزی سے رو بہ زوال تھی، کوئی مضبوط سیاسی وسماجی نظام باقی نہ رہ گیا تھا۔ درباری امرا و رؤسا خود غرضی اور مفاد پرستی کا شکار تھے اور سازشوں میں مصروف تھے۔ لوگوں کی زندگی سے امن وسکون ختم ہوگیا تھا۔ غریبی مفلوک الحالی سے سبھی پریشان تھے۔ پس ماندگی و بے چارگی کے سبب ذہن و دماغ ماؤف ہو چکے تھے۔ تغیر و انقلاب زمانہ کے عوامل ونتائج پر غور وفکر کی صلاحیت معدوم ہوگئی تھی غرض ملک وقوم کا شیرازۂ ہستی منتشر ہو چکا تھا۔ انھیں کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر غیر ملکی قوموں نے یہاں اپنے اقتدار وقوت کا سکہ جمانا شروع کر دیا تھا اندر رفتہ رفتہ ان کی مضبوط گرفت نے پورے ہندستان کو اپنے شکنجوں میں جکڑ لیا قوم کو اپنی حالت زار سدھارنے اور اپنی زندگی بہتر بنانے کا نہ تو کوئی حوصلہ تھا اور نہ طاقت۔ حتیٰ کہ ان کے قلب ونظر سے راہ عمل تک اوجھل ہو کر تاریکیوں میں کھو گئی تھی۔ ایسے میں ضرورت تھی ایک ایسے مرد مجاہد کی جو پژمردہ وافسردہ قوم کی عروق مردہ میں حرکت و زندگی کی لہر دوڑا دے۔ 'مردے از غیب بروں آید و کارے بکند' کے مصداق سرسید کو ملک وقوم کی اصلاح ورہبری کا فرض قدرت کی جانب سے مقدر ہو چکا تھا۔

سرسید احمد خاں کی ولادت ۵ رذی الحجہ ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۷ را کتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں سادات کے ایک مشہور خاندان میں ہوئی۔ اُن کے نانا خواجہ فرید الدین احمد خاں علم وفضل میں ممتاز اور علم ریاضی وہندسہ میں طاق تھے۔ علاوہ ازیں انگریزی حکومت کے معتمد اور بادشاہ دہلی کے وزیر تھے اور انھیں دبیر الدولہ' امین الملک' مصلح جنگ کے خطابات سے نوازا گیا تھا۔

سرسید کے والد میر متقی بھی قلعہ دہلی میں بادشاہ کے مقربین بارگاہ میں تھے۔ گاہ بگاہ سرسید بھی اُن کے ہمراہ مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار کے دربار میں حاضر ہوتے تھے۔ موصوف بڑے آزاد منش اور وضعدار انسان تھے۔ آزادی و بے فکری سے زندگی بسر کرتے تھے چنانچہ اولاد کی پرورش اور تعلیم وتربیت کی ذمہ داری زیادہ تر والدہ پر عائد ہوتی تھی۔ سرسید کا خاندان شاہ عبدالعزیزؒ کا معتقد اور پیرو تھا۔ ان کی والدہ شاہ غلام علی کی مرید تھیں جنھوں نے اولاً سرسید کو بسم اللہ پڑھائی۔ سرسید نے قرآن شریف گھر ہی پر ختم کیا مولوی حمید الدین اور دیگر اساتذہ وقت سے ابتدائی کتابیں پڑھیں اور عربی و فارسی دریات کا سبق حاصل کیا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے ماموں نواب زین العابدین سے مروجہ فنی علم ریاضی وہندسہ کی کتابیں پڑھیں۔ اٹھارہ انیس برس کی عمر میں تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا لیکن تحصیل علم کا ذوق وشوق بدستور برقرار رہا۔ عالم جوانی میں دہلی کی رنگا رنگ تہذیبی وسماجی تقریبوں اور شعر وشاعری کی محفلوں میں حصہ لیا۔ شاعری بھی کی اور آہی تخلص کیا۔ علامہ صہبائی' مرزا غالب' مفتی صدر الدین آزردہ اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی صحبتوں سے کسب فیض کیا۔

سرسید کی عمر بیس بائیس سال کی تھی کہ والد کا انتقال ہوگیا اور قلعہ کی آمدنی اور تنخواہ کا سہارا بھی ختم ہوگیا اور انھیں ملازمت کی فکر دامنگیر ہوئی۔ اپنے خالو مولوی خلیل اللہ خاں صدر امین دہلی سے عدالت کا کام سیکھ کر انھیں کے پاس سررشتہ دار ہوگئے۔ پھر دفتر کمشنری آگرہ میں نائب منشی کے عہدے پر اُن کا تقرر ہوگیا۔ اسی دوران سرسید نے اپنی ذاتی صلاحیت ولیاقت کی بدولت منصفی کے امتحان میں کامیابی حاصل کی اور ۱۸۴۱ء میں مین پوری کی منصفی کے عہدے پر اُن کا تقرر ہوگیا ۱۸۴۲ء میں مین پوری سے ان کا تبادلہ فتح پور سیکری ہوگیا ۱۸۴۶ء میں دہلی تبادلہ

ہو گیا۔ بہادر شاہ ظفر کی جانب سے انھیں جواد الدولہ، عارف جنگ کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ یہاں سرسید نے فقہ، ادب، حدیث اور قرآن کا درس نامور اساتذہ سے لیا۔ دہلی و اطراف دہلی کی قدیم تاریخی عمارتوں سے متعلق تحقیق و جستجو کر کے "آثار الصنادید" لکھی اور آئین اکبری کی ترتیب و تصحیح کا کام بھی شروع کیا۔ دہلی سے وہ قائم مقام صدر امین بنا کر رہتک بھیجے گئے، پھر جنوری ۱۸۵۵ء میں صدر امین ہو کر بجنور پہنچ گئے۔ یہاں دو سال کا ہی عرصہ گزرا تھا کہ ۱۸۵۷ء میں غدر ہو گیا۔ اپریل ۱۸۵۸ء میں بجنور سے ان کا تبادلہ مراد آباد ہو گیا جہاں انھیں صدر الصدور کے ممتاز عہدہ پر فائز کیا گیا۔ یہیں سے انھوں نے "تاریخ سرکشی بجنور" اور رسالہ "اسباب بغاوت ہند" لکھ کر شائع کیا۔ مئی ۱۸۶۲ء میں سرسید کا تبادلہ غازی پور ہو گیا۔ یہاں انھوں نے انگریزی کا ایک مدرسہ قائم کیا اور انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنے کی غرض سے "سائنٹفک سوسائٹی" کی بنیاد رکھی۔ ۱۸۶۴ء میں ان کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا۔ اپنے ہمراہ سائنٹفک سوسائٹی کو بھی یہیں لائے اور اس کے کاموں میں ترقی ہوئی۔ ایک شاندار عمارت تیار کرا کے مطبع بھی قائم کیا اور بہت قلیل عرصے میں مختلف علوم و فنون کی ترجمہ شدہ کتابیں اردو میں شائع ہو گئیں۔ سوسائٹی کا ایک ہفتہ وار اخبار "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" بھی نکالا جس میں تعلیم کو عام کرنے کے لیے ترغیب و تلقین کے مضامین لکھتے رہے اور کسی قدر سیاست میں بھی حصہ لینے لگے۔ ۱۸۶۷ء میں ان کا تبادلہ بنارس ہو گیا۔ یہاں سے دوران ملازمت رخصت لے کر ۱؍ اپریل ۱۸۶۹ء کو انگلستان کا سفر کیا جو ان کی اصلاحی کوششوں کے لیے بہت معاون و مددگار ثابت ہوا۔ تقریباً ڈیڑھ سال بعد وہاں سے واپس ہوئے اور ایک ماہ کے اندر ۲۴ر دسمبر ۱۸۷۰ء کو تہذیب الاخلاق کا اجرا کیا جس کے ذریعہ بڑے پیمانے پر تعلیمی بیداری اور اصلاح معاشرت کے لیے مضامین لکھے۔ مئی ۱۸۷۵ء میں مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ کا قیام عمل میں لایا گیا (جو اب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی شکل میں موجود ہے)۔ ۱۸۸۶ء میں انھوں نے مسلمانوں کے اندر علمی و تحقیقی ذوق و شوق پیدا کرنے کی غرض سے محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی۔ ۱۸۷۶ء میں سرسید ملازمت سے سبکدوش ہو کر مستقل طور پر علی گڑھ آ گئے اور اپنی بقیہ زندگی کالج کی خدمت اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر دی۔ ۲۷ر مارچ ۱۸۹۸ء کو اس دار فانی سے کوچ کیا اور کالج کی خاک میں آسودہ ہوئے۔

سرسید نے بلاشبہ ملک و قوم سے ہمیشہ کام کی زبان میں کام کی باتیں کیں۔ انھیں شرافت اور اولوالعزمی ورثے میں ملی تھی، غرور و تکبر کی انھیں ہوا تک نہیں لگی تھی۔ دردمندی و سوز، اخلاص و محبت، انصاف و دوستی، حق پسندی و حق گوئی کے عناصر سے ان کی شخصیت کی تعمیر و تکمیل ہوئی تھی۔ کبھی کسی کو ان کے طرز ملاقات و گفتگو سے یہ گمان نہیں گزرا کہ وہ سرسید ہیں اور باقی لوگ ان کے سامنے حقیر و بے مایہ ہیں۔

"سید القوم خادمہم" کا مقولہ ان کی شخصیت پر مکمل طور سے منطبق ہوتا ہے۔ وہ قوم کے سچے خادم اور ان کے رہبر و قائد تھے۔ ایک سچے رہبر میں جن صفات کا ہونا ضروری ہے وہ سب ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی عالی ظرفی اور بلند حوصلگی کے سبب دوست تو دوست دشمن کا بھی دل جیت لیتے تھے اور پڑھے لکھے لوگ تو ان کے گرد اس طرح کھنچ آتے تھے جیسے وہ کوئی جادوگر ہوں۔ محسن الملک، وقار الملک، حالی، شبلی، نذیر احمد اور سمیع اللہ خاں جیسے مشاہیر تھے جو سب ان کے رفقائے کار تھے۔ جو سرسید کے علمی وقار و مرتبہ کے قائل تھے اور ان کے مشوروں پر عمل کرتے تھے۔ خود سرسید میں کام کی لگن اور جد و جہد کا جذبہ تو تھا ہی دوسروں سے ان کی صلاحیتوں کے مطابق کام لینے کا گر بھی وہ جانتے تھے۔ ان کی سیرت و کردار کے متعلق تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے بابائے اردو مولوی عبدالحق نے تحریر فرمایا ہے۔[1]

"انسان کی اصل فضیلت اور برتری اس کے اخلاق میں ہے، افراد ہوں یا قوم، اخلاق کے زوال میں ان کا زوال اور اخلاق کی پابندی اور استواری میں ان کی عظمت و ترقی ہے۔ سرسید کی کامیابی کا راز اُن کے اخلاق حمیدہ میں تھا۔"

ان کے اخلاق حمیدہ کے بارے میں نور الرحمٰن صاحب کی رائے ہے:[2]

"سرسید جس طرح اپنی دوسری خوبیوں کی طرح سے اپنے ہم عصروں میں امتیاز رکھتے تھے، اسی طرح اپنے ذاتی صفات میں ممتاز تھے۔ خلوص و محبت، اولوالعزمی و بلند نظری، استقلال و ہمت، ظرافت و شوخی، جذبہ ایثار و ذوق خدمت، تمام صفات انسانی اُن کی ذات میں جمع تھے بقول حالی ؎

بہت تکتا ہے دل صحبت میں اس کی

وہ اپنی ذات سے ایک انجمن ہے۔ ان کی بے تکلف صحبتیں، ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ کی وجہ سے ہمیشہ پر لطف رہتی تھیں ان کو اپنے احباب مخلصین کے ساتھ ہمیشہ وہ تعلق رہا جو دوسروں کو اپنے قریبی عزیزوں سے بھی نہیں ہوتا۔ کتنے ہی احباب اُن کے ایسے تھے جو باوجود اختلاف خیال ان کے کاموں میں محض اُن کی محبت کے سبب اعانت کرتے تھے اور وہ بھی ان سے بے تکلفی اور خلوص کا معاملہ کرتے تھے جو یک دلی و یک جہتی کی انتہائی مثال ہے۔"

سرسید علی گڑھ تحریک کا بڑا کارنامہ وہ نہیں جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی شکل میں موجود ہے بلکہ علی گڑھ تحریک نے بیداری اور تعلیمی توسیع و ترقی کا جو صور پھونکا تھا اس کے دورس نتائج و اثرات بعد میں ظاہر ہوئے۔ اس تحریک کا نقطۂ آغاز سائنٹیفک سوسائٹی تھی، انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق اس کی توسیع کے ذرائع تھے اور بالآخر جو لائق و فائق شخصیتیں اس تحریک کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے یکجا ہوئیں وہ بجائے خود سرسید کی طرح بعد میں اپنی ذات سے ایک انجمن اور تحریک ثابت ہوئیں دارالمصنفین، ندوۃ العلماء، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اور خود علی گڑھ یونیورسٹی سب اسی تحریک سے جڑے ہوئے مختلف دھارے ہیں جو ملک کے دور دراز مقامات پر اپنا اثر و نفوذ قائم کیے ہوئے ہیں۔

سرسید اور اردو: جدید تعلیمی تحقیق کی رو سے مادری زبان میں تعلیم دینے کی بڑی اہمیت ہے سرسید نے سو سال سے بھی پیشتر اس کا تجربہ کرلیا تھا اور اسی بنا پر انھوں نے ورناکیولر یونیورسٹی کی تجویز حکومت کے سامنے رکھی تھی جو منظور نہ ہو سکی اور نہ اس پر عمل در آمد ہوا۔ بعد میں کسی قدر مسلم یونیورسٹی میں اس کا رواج ہوا۔ جہاں ہندی، اردو انگریزی تینوں زبانوں کو ذریعۂ تعلیم و امتحان کی سہولت دی جاتی ہے۔

سرسید کو اردو فارسی اور عربی تینوں زبانوں سے دلی لگاؤ تھا اور تینوں پر انھیں عبور حاصل تھا۔ فارسی اور عربی قدیم طرز کی مذہبی درسگاہوں میں پڑھائی جاتی تھی اور اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ مغلیہ حکومت فارسی عدالتی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج تھی۔ سرسید کے زمانے میں یہ صورت حال ختم ہو چکی تھی البتہ فارسی کا استعمال تعلیم یافتہ لوگوں کی تحریر و تقریر میں جاری و ساری تھا۔ عوامی سطح پر اردو ایک مکمل اور باصلاحیت زبان کے طور پر لوگوں کی ضرورتوں میں کام آرہی تھی۔ سرسید نے اپنے مقصد کے لیے اور عوام کی اصلاح و بہبود کے لیے اردو زبان کا ہی سہارا لیا اور اس کے ذریعہ ملک و قوم کی زبردست خدمات سرانجام دیں۔ ہمیشہ وہ اردو کی حمایت اور پرزور وکالت کرتے رہے ۱۸۶۷ء میں جب بعض عناصر کی جانب سے اردو زبان اور رسم الخط کو سرکاری دفتروں، عدالتوں اور تعلیمی اداروں سے خارج کرنے کی تحریک پیش کی گئی تو سرسید بہت دل برداشتہ ہوئے اور اس تحریک کی شدید مخالفت کی اور احتجاجی مضامین بھی لکھے اُس وقت اردو زبان اپنے رسم الخط کے ساتھ اس قدر رائج تھی کہ عملاً اُس کو بے دخل نہیں کیا جا سکا۔

سرسید نے اپنے ایک مختصر اور جامع مضمون میں" اردو زبان اور اس کی عہد بعہد ترقی" کا بڑے دل نشیں انداز میں تذکرہ کیا ہے اور اپنے عہد کی اردو پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ؎

"جس وقت میر اور سودا نے آوازہ اپنی خوش زبانی کا بلند کیا تھا اور یہ آویزہ ہر ایک کے کان میں پہنایا تھا، اُس وقت یہ زبان بہت درست ہو گئی تھی اور عجب رنگ ڈھنگ نکال لائی تھی، اُن کے بعد کچھ کچھ اس زبان میں تغیر و تبدیلی ہوئی اور اب ایسی منجھ گئی ہے کہ قیامت تک اس سے بہتر ہونی ممکن نہیں اور اس زبان کو شاہ جہاں آباد سے ایسی نسبت ہے جیسے فارسی کو شیراز سے، یعنی یہاں کے لوگوں کی زبان تمام اردو بولنے والوں کو سند ہے۔"

سرسید نے شروع ہی سے ملک کے وسیع تر مفادات کے لیے جد و جہد کی اور کبھی ہندو مسلم کے فرق و امتیاز کو ذہن میں نہیں رکھا بلکہ ہمیشہ اپنی تحریر و تقریر دونوں میں ہندو مسلم اتحاد پر زور دیتے رہے ؎

"ہم دونوں ایک ہی زمین پر رہتے ہیں۔ ایک ہی زمین کی پیداوار کھاتے ہیں، ایک ہی زمین کا یا دریا کا پانی پیتے ہیں۔ ایک ہی ملک کی ہوا کھا کر جیتے ہیں۔ پس مسلمانوں اور ہندوؤں میں کوئی مغائرت

نہیں ہے۔

ہم نے متعدد بار کہا ہے کہ ہندوستان ایک خوبصورت دلہن ہے اور ہندو اور مسلمان اس کی دو آنکھیں ہیں۔ اس کی خوبصورتی اس میں ہے کہ اس کی دونوں آنکھیں سلامت رہیں۔ اگر ان میں سے ایک برابر نہ رہی تو وہ خوبصورت دلہن بھینگی ہو جائے گی اور اگر ایک آنکھ جاتی رہی تو کانی ہو جائے گی۔"

ادبی خدمات

سرسید کا شمار جدید اردو نثر کے معماروں میں کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغلیہ دور حکومت میں چونکہ فارسی عدالتوں اور سرکاری دفاتر کی زبان تھی اس لیے اس کا اثر اردو میں شریک غالب کی حیثیت سے چلا آرہا تھا۔ تعلیم یافتہ حضرات نہ صرف فارسی آمیز اردو لکھتے تھے بلکہ مقفیٰ و مسجع عبارتیں لکھنے کا رواج عام تھا۔ بول چال کی زبان تحریروں میں استعمال کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ تحریروں میں تکلف اور آورد سا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ حالانکہ انیسویں صدی کے شروع میں فورٹ ولیم کالج کے ذریعہ، روزمرہ اور عام بول چال کی زبان میں دوسری زبانوں سے ترجمے کیے گئے۔ قصے کہانیاں اور داستانیں لکھی اور لکھائی گئیں لیکن طبقۂ شرفا نے اسے بنظر استحسان نہیں دیکھا اور اپنی اگلی روش پر ہی قائم رہا۔ خود مرزا غالب نے اپنی شوخی اور جدت طبع کی بدولت بے ساختہ، بے تکلف اور سادہ زبان میں خطوط لکھنا شروع کر دیا تھا لیکن عام طور پر لکھنے والوں نے یہ طرز نہیں اختیار کیا اور قدیم ڈگر پر ہی چلتے رہے۔ سرسید نے جب اپنی اصلاحی و تعلیمی تحریک تہذیب الاخلاق کے ذریعہ زور شور سے شروع کی تو ان کی زبردست طور پر مخالفت کی گئی اور اس کے جواب میں کئی رسالے نکل پڑے جو سرسید کی تردید ...... مخالفت اور اعتراض کرتے تھے۔ چونکہ سرسید ایک ریفارمر اور مصلح کی حیثیت رکھتے تھے، ان کے دل میں قوم کا درد سمایا ہوا تھا انھیں ان کے خراب حال پر کیسے چھوڑ دیتے اور ایسے نازک وقت میں جب کہ یہاں کی زندگی میں حکمراں انگریزوں کی لائی ہوئی تہذیب اپنی بہار دکھلا رہی تھی اور قدیم مشرقی تہذیب جاں بلب تھی ایک مکمل انقلاب یہاں کی زندگی میں در آیا تھا لیکن قدیم طرز تمدن و تہذیب کے دلدادہ اس کی تمامتر خامیوں اور خرابیوں کے باوجود اس کے حامی تھے۔

تہذیب الاخلاق کے ذریعہ سرسید نے جس مشن کا آغاز کیا تھا اس کا مقصد ہی یہ تھا کہ لوگ تعلیم کے میدان میں آگے بڑھیں۔ غلط رسم و رواج ترک کر دیے جائیں۔ مشرقی تہذیب کی اچھائیوں اور مذہبی واجبات و لوازم کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے بھی جدید علوم و فنون کے حصول کی طرف توجہ دیں۔ عمدہ اخلاق اور تہذیب و تمدن کے اصولوں پر کاربند ہوں نفاق و دشمنی اور بغض و حسد سے پرہیز کریں، اپنی پسندیدہ زبان و ادب کی آبیاری کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان و ادب کی بھی تعلیم حاصل کریں جس کا دامن جدید علوم و فنون سے مالا مال ہے، تاکہ دیگر اقوام کی طرح علم و ہنر اور تعلیم و ترقی کے میدان میں ہندستانی قوم بھی پیش قدمی کر سکے۔

لطف کی بات یہ کہ سرسید کے مخاطب عام ہندستانی تھے اور تحریر و تقریر میں انھوں نے اردو زبان کا ہی سہارا لیا اور جو کچھ کہا اور لکھا اس میں خاص طور پر اس بات کو ملحوظ رکھا کہ اپنی باتوں کو ایسی عام فہم زبان میں سیدھے سادے طریقے سے رکھیں تاکہ اسے سبھی اچھی طرح سمجھ سکیں اور خاطر خواہ اثر ہو۔ ان کے مضامین اور تقاریر کو اگرچہ زبان و بیان کے لحاظ سے خواہ کوئی اہمیت نہ دی گئی ہو لیکن نفس مفہوم کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔

سرسید نے تہذیب اخلاق کے ایک مضمون میں قدیم اسلوب نگارش پر تنقید کرتے ہوئے اپنے اسلوب بیان و طرز نگارش کی وضاحت کی کہ۔

" جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اردو زبان کے علم و ادب کی ترقی میں اپنے ناچیز پرچوں (تہذیب الاخلاق) کے ذریعہ کوشش کی۔ مضمون کی ادا کا ایک صاف اور سیدھا طریقہ اختیار کیا۔ جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری دی الفاظ کی درستی اور بول چال کی صفائی پر کوشش کی۔ رنگینیٔ عبارت سے (جو تشبیہات و استعارات خیالی سے بھری ہوئی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر کچھ اثر نہیں ہوتا) پرہیز کیا۔ تک بندی سے جو اس زمانے میں مقفیٰ عبارت کہلاتی تھی ہاتھ اٹھایا۔ جہاں

تک ہو سکا سادگی عبارت پر توجہ کی۔ اس میں کوشش کی
کہ جو لطف ہو مضمون کے ادا میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہو وہی
دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔

سرسید کی تحریروں پر مرزا غالب کا اثر نمایاں ہے۔ خاص طور سے سرسید کے خطوں میں بے ساختگی، بے تکلفی اور سادگی کی وہی تاثیر ہے جو مرزا غالب کا طرۂ امتیاز ہے۔ حالانکہ مرزا صاحب نے اردو نثر کو ایک راہ ضرور دکھائی لیکن زندگی کے گوناگوں مسائل اور موضوعات سے وہ نا آشنا تھی صرف احباب تک اس کا دائرۂ اثر محدود تھا۔ سرسید نے اسے ایک نئی جولانی عطا کی۔ سرسید کی بدولت اردو نثر نہ صرف نئی جہتوں سے آشنا ہوئی بلکہ اس کے دامن میں بڑی وسعت بھی پیدا ہوئی۔ سرسید کے ہمراہ ان کے رفقاء کار نے اس میں ایسے گراں قدر اضافے کیے کہ جدید اردو نثر معراج کمال کو پہنچ گئی۔

اردو میں مضامین یا انشائیہ نگاری کا آغاز سرسید سے ہوا سوانح نگاری کو عروج حاصل ہوا۔ آثار قدیمہ سے متعلق تحقیق و جستجو کر کے دستاویز نویسی کا رواج ہوا۔ مذہبی موضوعات میں اضافہ ہوا، تنقید کی راہیں ہموار ہوئیں، تالیف و ترجمہ کا کام آگے بڑھا۔ تصنیفات کے ذریعہ جدید علوم و فنون کے موضوعات اردو میں بار پا سکے۔ زندگی کی ٹھوس حقیقتوں پر نگاہیں مرکوز ہوئیں، ادب میں افادیت و مقصدیت کا دور شروع ہوا۔ زندگی سے ادب کا رشتہ قائم ہوا۔

اگر سرسید کے انشائیوں پر ان کی بنیادی مصلحانہ شخصیت اثر انداز نہ ہوتی اور ترغیب و تلقین کے عناصر جا دبیجا در نہ آتے تو ان کے مرتبہ کا کوئی انشائیہ نگار مشکل سے مل پاتا۔ جہاں جہاں انھوں نے اعتدال و توازن سے کام لیا ہے وہ انشائیہ نگاری میں بہت کامیاب رہے ہیں اس میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے اردو زبان کو متعدد شاہکار انشائیے دیے ہیں جن کا کوئی مقابلہ نہیں، بحث و تکرار، امید کی خوشی، تعصب، تکمیل، گزرا ہوا زمانہ وغیرہ اردو کے مایۂ ناز اور صف اول کے انشائیے ہیں۔

سرسید نے ایک طرف تو سادہ و سلیس اور حقیقت پسندانہ انداز بیان اختیار کیا۔ دوسری طرف اردو زبان کو سنجیدہ علمی اور فلسفیانہ مضامین کے لائق بنایا۔ ان کے یہاں مشکل سے مشکل دقیق پیچیدہ اور خشک موضوعات نے بھی طرز ادا کا انوکھا اور نیا جامہ پاکر ایسی دلکشی دکھائی ہے کہ ان کے سمجھنے میں ذرا بھی دقت نہیں پیش آسکتی ہے۔

آل احمد سرور نے ایک مقام پر حالی کے فن پاروں کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ "جب انھوں نے دکان لگائی تو اگرچہ ان کا مال نایاب تھا۔ مگر اکثر گاہک بے خبر تھے، رفتہ رفتہ سب کو خبر ہوتی رہی اور آج جس مال پر حالی کی مہر نہیں وہ ٹکسال باہر سمجھا جاتا ہے"۔ مولانا حالی علامہ شبلی، مولوی نذیر احمد، محسن الملک اور وقار الملک سرسید کے مخصوص قریبی رفقاء کار ہیں اور ہر ایک نے علمی، تحقیقی و تنقیدی میدان میں علٰحدہ علٰحدہ اپنے قلم کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ یہاں اس حقیقت کا اظہار بے جا نہ ہوگا کہ مذکورہ رفقاء کے علمی کارناموں پر سرسید کے نظریہ شعر و ادب طریقۂ تصنیف و تالیف طرز بیان، اسلوب نگارش کی گہری چھاپ موجود ہے اور ان کے جملہ کارنامے سرسید کے علمی و عملی نظریات کا توسیعی پرتو ہیں۔



غالب — ایک کلچر (صفحہ ۹ کا بقیہ)

نوازی کو کوئی کام نہ آیا۔ نہ کوئی معشوق سزاوار غزل ملا نہ کوئی ممدوح سزاوار مدح:۔

اے دریغا نیست ممدوح سزاوار مدح
وے دریغا نیست معشوقے سزاوار غزل



غزلیں

مختار شمیم
۸/۲ موتی طویلہ ۲ اندور
۴۵۲۰۰۴

لہرائی ہے رگوں میں تمنا کی آگ بھی
کھیلا غمِ حیات نے شعلوں کا پھاگ بھی

خوش رنگ منظروں میں ہیں سانپوں کی بستیاں
اے سادہ دل فریبِ تمنا سے بھاگ بھی

ایسا ہوا کہ کھلتے رہے چاندنی کے پھول
کیا کیا ہوائے شوق نے چھیڑے ہیں راگ بھی

ہر سمت اک جمود ہے اے موجِ انتشار
بے فیض موسموں کی فضاؤں میں جاگ بھی

ہم کو شمیم اس سے مگر لاکھ ہو لگاؤ
غالب نے سچ کہا ہے کہ ہو کچھ تو لاگ بھی

حسن فراز
[illegible] لکھنؤ

بھنک پہنچ گئی شاید مرے خیالوں کی
نگاہیں بدلی ہوئی ہیں زمانے والوں کی

کسی کا چاند سا چہرہ ابھی سلامت ہے
ابھی نہیں ہے ضرورت ہمیں اجالوں کی

لہو لہو ہیں کفِ پا ہر ایک راہی کے
کسے سناؤں میں روداد اپنے چھالوں کی

بدل گئے کئی موسم یہ اور بات مگر
وہی ہوں میں وہی خوشبو ہے تیرے بالوں کی

میں اپنے گھر کی فضاؤں میں اس طرح ہوں اسیر
حیات جیسے گزرتی ہو یرغمالوں کی

اب اپنا عیب بھی سن کر برا سا لگتا ہے
یہ کیسی ہو گئی عادت زمانے والوں کی

غموں کی اوس نے اس کو دبا دیا ہے فراز
اڑی تھی گرد جو گزرے ہوئے خیالوں کی

(افسانہ)

ارنسٹ ناہرسٹ

ترجمہ: زرینہ عباسی
قیصر ماموں بھانجہ۔ لکھنؤ

سانس

"بہو ..... !" کہ تلخ اور کڑک دار آواز سے گونج اٹھا — پندرہ بیس منٹ بعد یہی آواز گونج کر "کیتھی" کی زندگی میں کڑواہٹ گھول جاتی تھی۔ اس کی ساس "مسز میسی" کوئی نہ کوئی ایسا حکم صادر کر دیتی کہ اس کی ساری امنگوں پر پانی پھر جاتا اور وہ سوچنے لگتی —

"اس گھر میں اس کی اپنی نہ کوئی انفرادی حیثیت ہے نہ آواز — وہ تو ایک کنیز ہے۔ وہ نہ کنیز —" تین افراد پر مشتمل اس چھوٹے سے خاندان والے گھر میں کوئی خاص کام دھندا بھی نہ تھا۔ — تھا ہی کون "کیتھی" اس کا شوہر "جیکب" اور "ساس" "مسز میسی" بس! کیتھی اپنے گھر کا کام نہایت مستعدی سے انجام دیتی تھی، اسے اپنی گھریلو ذمہ داری کا پورا احساس تھا — وہ ہمیشہ یہی کوشش کرتی تھی کہ اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیتی رہے۔ اور کسی کو شکایت کا موقع نہ دے — لیکن مسز میسی کا رویہ بہت تکلیف دہ تھا — کبھی کبھی تو تنگ آکر وہ سوچنے لگتی — کہ اس ذلت آمیز زندگی سے تو بہتر ہے کہ وہ اس گھر کو خیرباد کہہ کر اپنے میکے چلی جائے اور اس وقت تک واپس نہ آئے جب تک مسز میسی اس کے ساتھ غیر اور کنیز کا سا برتاؤ ترک کر کے اپنی اولاد سمجھ کر مشفقانہ رویہ نہ اختیار کر لیں۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ یہ ایک نہایت احمقانہ قدم ہوگا اسے صبر کرنا چاہیئے — ایک نہ ایک دن مسز میسی کے برتاؤ میں تبدیلی ضرور آئے گی۔

کیتھی۔ جیکب جیسے نیک، آزاد خیال اور پُر وقار شوہر پر جان چھڑکتی تھی۔ جیکب بھی اسے بہت چاہتا تھا۔ وہ کیتھی پر ساتھ اپنی ماں کے غیر منصفانہ برتاؤ سے بھی پوری طرح واقف تھا۔ کیتھی پر جو بیت رہی تھی اس سے وہ باخبر تھا — اس نے ماں کی مزاجی کیفیت اور ان کی باتوں کا سنجیدگی سے کوئی اثر نہ لینے کے متعلق اکثر کیتھی کو سمجھایا بھی تھا — وہ کہتا تھا ان کے خراب برتاؤ سے میں واقف ہوں لیکن خدمت ایسی چیز ہے جو پتھر کو بھی پانی کر دیتی ہے —

لیکن کیتھی جس قدر خلوص اور سعادت مندی کا مظاہرہ کرتی مسز میسی کا رویہ اتنا ہی سخت گیر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ اس ناسازگار ماحول میں زندگی کیسے گزارے۔ کیا وہ بھی مسز میسی کی طرح۔ چیخنا۔ چلانا۔ بدزبانی کرنا — اور ان کا مقابلہ کرنا شروع کر دے۔؟ نہیں اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ وہ ایسا برتاؤ کبھی نہیں کر سکتی —

ابھی گزشتہ دوشنبہ کو کیتھی کی ایک عزیز ترین سہیلی کا ٹیلیفون آیا۔ وہ اسے سنیما لے جانا چاہتی تھی۔ کیتھی نے اپنے شوہر جیکب کو ٹیلی فون کر کے سنیما جانے کی اجازت مانگی اور اس نے بہ خوشی اسے اجازت دیدی اور اپنی ماں سے بھی فون پر کہہ دیا کہ کیتھی اپنی سہیلی کے ساتھ سینما دیکھنے جانا چاہتی تھی اس نے اجازت دیدی ہے۔ کیتھی کی سہیلی بچپن سے کالج تک اس کے ساتھ رہی تھی۔ اور

میں بڑی محبت و خلوص تھا۔ وہ کسی دوسرے شہر میں بیاہی گئی تھی۔ پچھلے چھ مہینے سے وہ ملنے کے لیے بے چین تھی۔ اجازت پاتے ہی کیتھی نے تیاری شروع کر دی۔ وہ بہت خوش تھی۔

کیتھی تیار ہو کر نیچے آئی تو معلوم ہوا کہ اس کی سہیلی کا ڈرائیور اسے لینے آچکا ہے۔ جانے سے قبل اس نے اپنی ساس سے اجازت لینا ضروری سمجھا۔ جوں ہی وہ ان کے سامنے گئی وہ برس پڑیں۔

"کیتھی! تمہارا اس طرح بن ٹھن کر گھر سے نکلنا مجھے قطعی پسند نہیں ہے۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔ تم کہیں نہیں جا سکتی ہو۔" کیتھی کو یہ یقین کرنے میں کچھ دیر لگی کہ یہ اس کی ساس کے الفاظ ہیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جیکب کی اجازت کے بعد آخر یہ پابندی کیوں ہے۔ وہ تو اپنی سہیلی کے ساتھ جا رہی ہے آخر اس میں کیا حرج ہے۔؟

"لیکن ممی جیکب تو مجھے اجازت دے چکے ہیں، میں اپنی سہیلی کے ساتھ سینما دیکھنے جانا چاہتی ہوں اس نے کار بھی بھیج دی ہے۔"

"ایک شادی شدہ عورت کی تفریح اپنے شوہر اور گھر تک ہی محدود ہونی چاہیے۔ سہیلیاں، سیر و تفریح یہ سب میرے لیے قطعی ناقابل برداشت ہیں۔"

کیتھی کی ساری خوشیوں پر اوس پڑ گئی۔ اس نے سوچا تھا اپنی ازدواجی زندگی کا ایک ایک واقعہ سہیلی کو سنائے گی اور اس کی سنے گی لیکن اس کے خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔ اس نے ڈرائیور سے کہہ دیا۔ میری ساس کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے اس لیے نہیں جا سکتی۔

ڈرائیور واپس چلا گیا لیکن ڈرائیور سے کیتھی کی گفتگو مسز میسی نے سن لی تھی۔ وہ چیخ کر بولی۔

"کمبخت تو مجھے تندرست دیکھنا نہیں چاہتی؟ میری بیماری کی اتنی آرزو ہے کہ تو نے ڈرائیور سے کہہ دیا کہ میں اچانک بیمار پڑ گئی ہوں۔ کیا تو چاہتی ہے میں بیمار پڑ جاؤں اور مر جاؤں تاکہ تجھے سیر و تفریح کا موقع مل سکے۔؟"

"نہیں! خدانخواستہ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ دراصل میری سمجھ میں اور کوئی معقول بہانا نہیں آیا اس لیے۔"

مسز میسی نے بات کاٹتے ہوئے اپنی چھڑی زمین پر پٹک کر کہا۔ "میں سب جانتی ہوں کیتھی! میں نے دنیا دیکھی ہے، یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے ہیں۔ تو مجھے بیوقوف نہیں بنا سکتی۔ میں نے اپنی ساس کے سامنے کبھی اف بھی نہیں کی اور تو مجھ سے زبان درازی کرتی ہے۔ خوب کان کھول کر سن لے اس گھر میں وہی ہوگا جو میں چاہوں گی۔" کیتھی کا دل چاہا وہ چیخ پڑے۔

"وہ دن گزر گئے مسز میسی! بہو کسی کی لونڈی یا کنیز نہیں۔ اسے بھی اپنے گھر میں ہنسنے بولنے اور عیش و آرام سے پرسکون زندگی گزارنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا گھر کے کسی دوسرے فرد کو۔" لیکن اس کی زبان ساتھ نہ دے سکی، وہ خاموشی سے سونے کے کمرے میں جا کر اپنی بے بسی پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

شام کو جب جیکب نے سنا تو اسے سخت ملال ہوا۔ جب اس نے کیتھی کو اجازت دے دی تھی تو ماں کو مداخلت نہ کرنا چاہیے تھا۔ اس نے غصہ میں یہ بات ماں سے بھی کہہ دی لیکن اس کا اثر الٹا ہی ہوا۔ مسز میسی نے چیخ کر پھر اعلان کر دیا "اس گھر میں وہی ہوگا جو میں چاہوں گی۔"

بہو.....! آواز پھر گونجی اور کیتھی گھبرا کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ آنگن میں مسز میسی کی شعلہ بار نگاہیں اس کی منتظر تھیں۔ "کیا تم بہری ہو۔ میں کب سے آواز دے رہی ہوں، سنتی نہیں ہو۔؟"

"جی میں آ ہی تو رہی تھی۔"

"کیتھی! غور سے سن لو تم دن میں اس کمرے میں ہرگز نہ رہو گی۔ میرے کمرے میں میری نظروں کے سامنے رہا کرو۔ میں دیکھتی ہوں تمہارا سارا وقت آئینے کے سامنے اور بناؤ سنگار میں صرف ہوتا ہے۔ یہی نہیں کھڑکی سے آنے جانے والوں کو بھی دیکھتی رہتی ہو۔"

کیتھی تلملا کر رہ گئی۔ اسے ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے

سینے پر گھونسا مار دیا ہو۔

"میں کہتی ہوں اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو تمہارا تو کچھ نہ بگڑے گا ہماری خاندانی عزت اور وقار خاک میں مل جائے گا۔"

کیتھی اندر ہی اندر سلگ رہی تھی ۔۔۔ "آخر یہ عورت مجھے اتنا ذلیل کیوں سمجھتی ہے؟ میں نے تو آج تک جیکب کے سوا کسی کے متعلق سوچا تک نہیں ۔۔۔ اور سوچوں بھی کیوں؟ حسین و جمیل دل و جان سے چاہنے والا پر وقار نوجوان! آخر کیا نہیں ہے جیکب میں؟ پھر میں کسی دوسرے کی طرف کیوں نظر اٹھاؤں ۔۔۔ چھی! کس قدر غلیظ خیالات ہیں اس بڑھیا کے ۔۔۔!"

"ممی آپ میرے متعلق بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں ۔۔۔"

"بکواس میں نہیں سننا چاہتی ۔۔۔ تمہیں وہی کرنا ہوگا جو میرا حکم ہے ۔۔۔ کیتھی! اس گھر میں وہی ہوگا جو میں چاہوں گی۔"

کیتھی کوشش کے باوجود اپنے کو سنبھال نہ سکی۔ وہ پھر سسکنے لگی۔ شادی سے قبل کیسے کیسے حسین خواب دیکھے تھے اس نے۔ سب نے چھوٹے اور خوشحال خاندان میں بیاہے جانے پر کتنی خوشی کا اظہار کیا تھا، بڑی بوڑھیوں نے پر مسرت زندگی گزارنے اور سسرال میں راج کرنے کی کتنی دعائیں دی تھیں لیکن کیا معلوم تھا اس کی ازدواجی زندگی کا جنازہ اٹھ رہا ہے اور اسے مسلسل ذہنی اذیت میں مبتلا رہنا ہوگا۔ مسز میسی کا برتاؤ انتہائی شرمناک اور ذلت آمیز ہوتا جا رہا تھا۔ اب اس کا صاف ستھرا رہنا، اچھے کپڑے پہننا اور کمرے میں تنہا رہنا بھی ناممکن تھا ۔۔۔ ہر وقت طعنے تشنے! بات یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ اب انھوں نے اس پر تانک جھانک اور بدنظری کا بھی الزام لگا دیا تھا۔

وہ غم سے نڈھال پڑی رہی کھانا تک نہیں کھایا۔ شام کو جیکب آیا تو اس نے رو رو کر سارا قصہ سنایا ۔۔۔ جیکب نے نہایت دکھ کے ساتھ سب کچھ سن کر کہا ۔۔۔ "کیتھی! خدا جانے ممی کو کیا ہو گیا ہے ۔۔۔ ان سے اپنے اکلوتے لڑکے کی خوشی بھی دیکھی نہیں جاتی ۔۔۔ بہرحال، اب مجھے وہی کرنا ہوگا۔ جو میں کبھی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اب ہم علاحدہ رہنے کا بندوبست کریں گے۔"

کیتھی کی پلکوں نے آنسو جذب کر لیے تھے ۔۔۔ اچانک وہ جذبات سے پر لہجے میں بولی۔ "نہیں جیکب! میں ممی کو چھوڑ کر تنہا رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی ۔۔۔ ہم یہیں رہیں گے۔ کہیں نہیں جائیں گے ۔۔۔ میں اس گھر میں ویسے ہی رہوں گی۔ جیسے ممی چاہیں گی ۔۔۔ کبھی تو ان کا دل پسیجے گا۔ آخر وہ بھی انسان ہی ہیں کوئی پتھر تو نہیں۔"

جیکب بدحواس سا کیتھی کے پر سکون چہرے پر نظریں جمائے ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہ گیا ۔۔۔ اچانک اسے یاد آ گیا کہ اس کی شادی شدہ بہن ڈیزی نے لکھا تھا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے اس کے پاس آ رہی ہے۔

بیٹی کی آمد کی خبر سن کر مسز میسی کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ ڈیزی نہایت دلچسپ ہنس مکھ اور باتونی لڑکی تھی۔ اس کے گھر میں قدم رکھتے ہی کڑھن اور گھٹن اور مسلسل طعنے تشنے والا ماحول رخصت ہو گیا۔ سارے گھر میں جیسے خوشی کی لہر دوڑ گئی ۔۔۔

ڈیزی زیادہ تر وقت کیتھی کے ساتھ ہی ہنس بول کر گزارنے لگی۔ مسز میسی کو شاید یہ اچھا نہ لگتا ہو لیکن مجبور تھیں ڈیزی کو روکنا ان کے بس کی بات نہ تھی پھر وہ اس سے کہتیں بھی کیا ۔۔۔؟

شام کا وقت تھا کیتھی باورچی خانے میں مصروف تھی اور ڈیزی اس کے کام میں ہاتھ بٹانے کے ساتھ ہی لطیفے اور چٹکلے سنا کر اس کا دل بھی بہلا رہی تھی کہ اچانک مسز میسی کی آواز گونجی ۔۔۔ "تمہیں میرے بیٹے کی گاڑھی کمائی کا ذرا بھی خیال نہیں ۔۔۔ وہ جان دے کر کماتا ہے اور تم پھوہڑپن میں اڑاتی ہو ۔۔۔ باورچی خانے میں اتنی اچھی ساڑھی پہن کر جانے کی کیا ضرورت تھی ۔۔۔؟"

ڈیزی اپنی ماں کا کیتھی کے ساتھ برتاؤ دیکھ کر دنگ رہ گئی ۔۔۔ "ممی یہ کیا طریقہ ہے؟ کیا کیتھی کپڑے بھی آپ سے پوچھ کر پہنا کرے؟ آخر وہ بھی تعلیم یافتہ اور سلیقہ مند ہے ۔۔۔ آپ کو اس کے ذاتی معاملات میں ہرگز مداخلت نہیں کرنا چاہیے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ

کیتھی کے ساتھ آپ کا برتاؤ نہایت نامناسب اور تکلیف دہ ہے۔"

"ہاں۔ ہاں تیری ساس تو جیسے تجھے سر پر بٹھائے رکھتی ہے۔" مسز میسی نے طنز آمیز لہجہ میں کہا۔

"ممی! اس میں کوئی شبہ نہیں۔ میری ساس مجھ سے جس محبت اور شفقت کا برتاؤ کرتی ہیں اس لئے مجھے کبھی یہ نہیں سوچنے دیا کہ میں پرائے گھر آگئی ہوں اور یہ وہ گھر نہیں ہے جس میں پروان چڑھی ہوں۔ ان سے مجھے وہ پیار ملا ہے جو ایک ماں صرف اپنی بیٹی کو دے سکتی ہے۔" مسز میسی استعجاب کے عالم میں بیٹی کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھیں اور ڈیزی کہہ رہی تھی ۔۔۔ "وہ میرے معمولی سے معمولی کام کو اس طرح سراہتی ہیں کہ مجھے ساس اور بہو کے تعلقات کے بارے میں مشہور قصے کہانیاں اور روایات بے بنیاد، اور گڑھی ہوئی معلوم ہونے لگتی ہیں ۔۔۔ وہ ہر وقت میرا ہی منہ دیکھتی ہیں اور بیٹی ۔ بیٹی کہتے کبھی نہیں تھکتیں ۔۔۔ اگر کبھی میری طبیعت ناساز ہو جاتی ہے تو ان کا سکھ چین حرام ہو جاتا ہے۔ ہر لمحہ میری فکر اور تیمارداری میں ہی صرف ہوتا ہے گھر کا سارا کام کاج خود ہی سنبھال لیتی ہیں ۔۔۔"

مسز میسی کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی جا رہی تھیں ۔۔۔

"ان کی بے پناہ محبت اور عظمت کی کہانی کہاں تک سناؤں جب بھی کبھی میں نے کسی سہیلی کے ساتھ بلفرا دیا سینما وغیرہ جانے کی اجازت طلب کی، انھوں نے رخسار پر ہلکی محبت آمیز تھپکی دیکر کہا ۔۔۔ "پگلی! بھلا اس میں اجازت کی کیا بات ہے! بڑے شوق سے جاؤ ۔۔۔ اسی طرح مجھے معمولی کپڑا پہنے دیکھ کر انھیں تکلیف ہوتی ہے، وہ کہتی ہیں ۔۔۔ یہی تمھارے کھانے پہننے کے دن ہیں، کوئی اچھی سی ساڑھی نکال کر پہنو ۔۔۔ ممی! میں بہت خوش ہوں ۔۔۔"

مسز میسی لمبی سانس لے کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

دوسرے ہی دن ڈیزی اپنے گھر چلی گئی، ماں اور بھائی کے اصرار کے باوجود نہیں رکی ۔۔۔ ڈیزی کے جانے کے بعد کیتھی سوچنے لگی۔ اب پھر گھر میں وہی سناٹا وہی اداسی چھا جائے گی۔ مسز میسی کے طعنے تشنے پھر گونجنے لگیں گے، گھر کا وہ پرمسرت ماحول جو ڈیزی اپنے ساتھ لائی تھی اب کہاں نصیب ہوگا ۔۔۔!

لیکن وقت گزر رہا تھا اور مسز میسی کے رویہ میں حیرت انگیز تبدیلی آ رہی تھی۔ اب بات بات پر کیتھی کو ٹوکنا طعنے تشنے، بدکلامی سب میں نمایاں فرق ہو رہا تھا، یہ خوش آئند تبدیلی کیتھی کے ساتھ اس کے شوہر نے بھی محسوس کی تھی۔ اور کیتھی سے اس کا سبب بھی پوچھا تھا ۔ کیتھی خود بھی اسباب سے واقف نہ تھی ۔۔۔ لیکن اس نے اندازہ لگایا کہ شاید ڈیزی کے مائکے میں زیادہ قیام نہ کرنے اور اصرار کے باوجود سسرال چلے جانے نے مسز میسی کو سوچنے اور اپنے رویہ کا جائزہ لینے پر مجبور کیا ہوگا۔

مسز میسی کا اب زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں ہی گزرنے لگا تھا۔ وہ زیادہ تر خاموش ہی رہتی تھیں۔ اگر کیتھی ان کی خاموشی سے تنگ آکر خود کوئی بات چھیڑ لی بھی تو وہ ہوں۔ ہاں کرکے پھر خاموش ہو جاتیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خیالات کا ہجوم ان کے ذہن کو جھنجھوڑ رہا ہو۔ ان کی خاموشی سے پریشان ہو کر جب جیکب نے سبب جاننا چاہا تو مسز میسی نے ہونٹوں پہ پھیکی اور مصنوعی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے جواب دیا ۔ بے وقوف ہوا ہے ۔؟ بھلا مجھے کیا ہو سکتا ہے ۔؟ میں بالکل ٹھیک ہوں مجھے کوئی تکلیف ہے نہ غصہ نہ بیماری ۔۔۔

کیتھی کے لیے یہ حالات بھی تکلیف دہ اور ناقابل برداشت تھے ۔۔۔ وہ ڈر رہی تھی کہ اس طرح خاموش رہ کر مسز میسی آتش فشاں بن رہی ہیں جو کسی وقت بھی پھٹ کر پرسکون ماحول کو تباہ کر سکتا ہے۔ اس دن کے تصور سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اپنے ساس کی خاموشی ان کی تلخ کلامی سے بھی زیادہ سخت معلوم ہونے لگی۔ اتوار کا دن تھا۔ کیتھی ہر اتوار کو گھر کے کمروں کا سامان نکال کر جھاڑ پونچھ کرتی تھی ۔۔۔ وہ الماری کی صفائی کر رہی تھی کہ ایک لفافہ نیچے گر پڑا۔ کیتھی اسے دیکھنے لگی، وہ ڈیزی کے نام اس کی ساس کا خط تھا۔ مسز میسی کمرے میں بیٹھی کیتھی کی طرف دیکھ رہی تھیں ۔۔۔ "بہو! کس کا خط ہے؟ میرے پاس لاؤ ۔۔۔" کیتھی کو لگا جیسے اب آتش فشاں پھٹنے کا وقت آگیا ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے خط ساس کے ہاتھ میں دیدیا ۔۔۔

"ارے ڈیزی کے پاس یہ خط کب آیا تھا ۔۔۔؟"

"ان کے آنے کے تیسرے یا چوتھے دن آیا تھا ۔۔۔ ممی!"

"یہ تو اس کی ساس کا خط معلوم ہوتا ہے ۔" اور وہ خط پڑھنے لگیں۔ جوں جوں خط پڑھتی جاتی تھیں آنکھیں حیرت سے پھیلتی جا رہی تھیں ۔۔۔ خط کا مضمون تھا ۔۔۔

بیٹی!

تمہیں گئے آج تیسرا ہی دن ہے لیکن ایسا لگتا ہے جیسے برسوں کی بات ہو۔ میں گھر میں بالکل تنہا رہتی ہوں، فلپس بھی اپنے دوستوں کے یہاں چلا جاتا ہے۔ اور مجھے تمھاری کمی بری طرح محسوس ہوتی ہے ۔۔۔ تم اس گھر کی رونق ہو ۔۔۔ تمھارے بغیر یہ گھر سونا ہے ۔۔۔ تم جتنی جلد ہو سکے لوٹ آؤ ۔۔۔ حالانکہ تم عرصے کے بعد اپنی ماں کے پاس گئی ہو اور یہ اچھا نہیں لگتا کہ تمہیں اتنی جلد بلاؤں، لیکن مجبور ہوں تمھارے بغیر مجھ سے رہا نہیں جاتا اپنی ماں سے میری طرف سے معافی مانگ لینا۔ میں تمھاری راہ دیکھ رہی ہوں۔

تمھاری: مارتھا۔

خط پڑھنے کے بعد مسز میسی نے ڈیزی کی ساس سے موازنہ کیا تو حقارت کے غار میں گرتی چلی گئیں۔ کہاں مارتھا جس نے ڈیزی کو ماں کا پیار دیا۔ اس کے لیے اس کی مفارقت ایک لمحہ کے لیے بھی قابل برداشت نہیں ہے اور ایک میں ہوں اپنی بہو کے ساتھ کتنا شرمناک ہے میرا رویہ ۔۔۔ بات بات پر جھڑکنا، طرح طرح کی پابندیاں، ایک دن بھی تو میں نے کیتھی سے قرینے سے بات نہیں کی ۔۔۔ کیا سوچتی ہوگی وہ میرے بارے میں؟ ۔۔۔ جب ڈیزی اپنی ساس کی محبت، نیکی اور عظمت کی بات کر رہی تھی تو کیتھی کے دل پر کیا بیت رہی ہوگی ۔۔۔؟

اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی چھاتی پر لدا ہوا کوئی بہت بڑا بوجھ اترتا جا رہا ہے ۔۔۔ الماریوں کو جھاڑتی پونچھتی کیتھی اس وقت اسے بڑی معصوم اور عظیم لگ رہی تھی ۔۔۔

"بیٹی!" نہایت شیریں اور نرم آواز گونجی۔ کیتھی کو یقین نہیں آیا کہ اس لہجے میں اسے مخاطب کیا گیا ہوگا ۔۔۔ وہ خود اٹھ کر کیتھی کے پاس پہنچ گئیں۔

کیتھی نے مسز میسی کی طرف دیکھا۔ وہ چشمہ اتار کر آنسو پونچھ رہی تھیں ۔۔۔ ایک وہ ساس ہے اور ایک میں ہوں۔ "بیٹی!" یہ الفاظ سننے کے لیے کیتھی کے کان کب سے ترس رہے تھے۔ کانوں میں رس گھول گئے۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں ۔۔۔ آواز گلے میں پھنس گئی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز نے ساتھ نہ دیا۔ پھر کیا یک نہ جانے دل میں کیا آیا۔ وہ دوڑ کر مسز میسی کے قدموں سے لپٹ گئی ۔۔۔

مسز میسی کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے کچھ دیر تک تو وہ ساکت کھڑی رہیں پھر بڑھیں اور دونوں ہاتھوں سے کیتھی کو اٹھا کر چھاتی سے لگا لیا ۔۔۔

کیتھی کو لگا جیسے آج فضا میں قہقہے گونج رہے ہوں۔ در و دیوار ہنس رہے ہوں۔ گھر کے کمروں کی گھٹی گھٹی ہوا کی جگہ بادِ سحر کے حیات بخش جھونکوں نے لے لی ہو ۔۔۔ ساس اور بہو کے عظیم رشتے کی برکتوں سے سارا گھر بقعۂ نور بن گیا ہو ۔۔۔



دونوں کی ہے گونج برابر
اللہ اللہ ایشور ایشور

— آرزو لکھنوی

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں)

نام کتاب : **مسعود حسن ادیب - فرد اور فن کار** مرتب : سبط محمد نقوی، صفحات : ۲۲۴ قیمت : ۲۵ روپے ملنے کے پتے ۔ ۱- کتاب نگر، دین دیال روڈ لکھنؤ ۲- دانش محل امین آباد لکھنؤ ۳- سیل ڈپو اردو اکاڈمی قیصر باغ، لکھنؤ

زیر تبصرہ کتاب صف اول کے محقق پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم کے احوال اور ادبی آثار پر لکھے ہوئے ایک درجن مضامین کا مجموعہ ہے اور اس میں مندرجہ ذیل صاحبان قلم کے مضامین شامل ہیں:

۱- ڈاکٹر نیر مسعود ۲- مرزا جعفر حسین ۳- زائر حسین کاظمی ۴- سید اطہر مسعود ۵- پروفیسر ڈاکٹر محمد حسن ۶- پروفیسر خواجہ احمد فاروقی ۷- امجد علی خاں ۸- سید محمد رشید ۹- ڈاکٹر امام مرتضیٰ ۱۰- ڈاکٹر محمد مثنیٰ ۱۱- سبط محمد نقوی ۱۲- پروفیسر سید حسن -

مضامین کے علاوہ اس کتاب میں چند منظومات بھی شامل ہیں - جو سید مہدی جعفر، الحاج سید بادشاہ حسین رمز اور فرقان احمد ہاشمی کاکوروی کا نتیجۂ فکر ہیں -

مضامین و منظومات کے علاوہ حواشی و تعلیقات بھی اس کتاب کا خاص وصف ہیں جنھیں سبط محمد نقوی نے بڑی محنت اور کاوش سے لکھا ہے -

ادبی تحقیق کے دشوار گزار کام کو پروفیسر مسعود حسن ادیب مرحوم نے جس محنت، لگن، دیانت، خوبی، خوش اسلوبی، احتیاط اور کامیابی سے سرانجام دیا ہے اُس کے پیش نظر وہ ادبی تحقیق کی تاریخ میں شہرت عام اور بقائے دوام کے مالک ہیں - مسعود صاحب مرحوم نے نہ صرف خود کو تحقیق کے لیے وقف کر دیا بلکہ اپنے نادر کتب خانے سے بھی لا تعداد افراد کو بھرپور استفادے کے مواقع دیے - بے شمار تحقیقی مضامین اور تحقیقی مقالات کتب خانۂ مسعود حسن رضوی ادیب کے مخطوطات و مطبوعات کے حوالوں سے آج بھی پر نظر آتے ہیں ——— پروفیسر مسعود حسن ادیب ادبی تحقیق کے اُن سرپرستوں میں شامل تھے جو آج بجائے خود موضوع تحقیق بن چکے ہیں - مسعود حسن صاحب مرحوم پر آج بھی ایک سے زائد پی ایچ - ڈی کے مقالے زیر تسوید ہیں - ان حالات میں مسعود صاحب کے احوال و آثار پر زیادہ سے زیادہ کتابوں کی اشاعت کی ضرورت ہے - سید سبط محمد نقوی کی زیر تبصرہ کتاب اس سمت میں ایک قابل قدر پیش رفت ہے اور امید ہے کہ یہ کتاب ادبی حلقوں میں مقبول ہوگی -

——— کاظم علی خاں

نام کتاب : **ہماری فلمیں ہمارا سماج** مصنف : پریم پال اشک قیمت : بارہ روپے - ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار دہلی ۱۱۰۰۰۶

ہمارے سماج میں فلم بینی کا شوق بہت عام ہے اور یہ وقت گزاری کا ایک دلچسپ مشغلہ نیز تفریح کا سب سے اہم ذریعہ ہے - ہمارے ادب میں فلم کے بارے میں بات کرنا ابھی تک ایک غیر معیاری رویہ سمجھا جاتا ہے - فلم کو معمولی اور عام آدمی کی تفریح کا ذریعہ قرار دے کر اس پر بات کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے - اگرچہ فلم کی مقبولیت اور اہمیت سے انکار کسی بھی طرح ممکن نہیں - اس صورت حال میں پریم پال اشک کی کتاب "ہماری فلمیں ہمارا سماج" کی اشاعت ایک فال نیک ہے - اس کتاب میں انھوں نے اپنے ایسے مضامین کا انتخاب پیش کیا ہے جو فلم انڈسٹری سے متعلق ہیں - انگریزی میں تو اس موضوع پر کوئی کچھ پڑھنے کو مل جاتا ہے مگر اردو میں یہ اپنے طرز کی شاید پہلی کتاب ہے - کتاب کے عنوان سے مجھے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے ہندستانی فلم انڈسٹری پر اشک صاحب نے کوئی بھرپور قسم کا تحقیقی مقالہ لکھا ہو، مگر حقیقت میں یہ فلم سے متعلق مختلف موضوعات پر لکھے گئے مضامین کا انتخاب ہے - بہرحال اشک صاحب نے اپنے ان مضامین کو کتابی شکل میں شائع کر کے اس ضمن میں پہل کر دی ہے - امید کی جاتی ہے کہ اب اس موضوع پر سنجیدہ قسم کا تحقیقی اور تنقیدی کام ضرور کیا جائے گا - کتاب کے پہلے دو مضامین میں خام فلم کی تیاری سے لے کر کاغذ سے پردے تک اس کے سفر کا پورا حال بیان کیا گیا ہے - یہ دونوں مضامین معلوماتی قسم کے ہیں - "قہقہوں کی بادشاہت"، "ہماری فلمیں ہمارا سماج" اور "ہماری فلموں کا سیاسی شعور" کے عنوان سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے فلم انڈسٹری

کا مطالعہ کافی سنجیدگی سے کیا ہے اور اپنے طور پر بعض نتائج بھی نکالے ہیں۔ آپ مصنف سے بعض امور میں اختلاف ضرور کر سکتے ہیں مگر یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ خاموش فلموں کے دور سے لے کر موجودہ عہد تک فلم انڈسٹری کے ارتقائی سفر پر مصنف کی اچھی نظر ہے۔ مصنف نے ان مضامین میں اچھی بُری سبھی قسم کی فلموں پر بے لاگ تبصرہ کیا ہے۔ مگر بعض جگہ جب وہ معیاری اور غیر معیاری فلموں کو ایک ہی سطح پر رکھ کر ان کے تجزیہ کی کوشش کرتے ہیں تو کچھ عجیب سا ضرور لگتا ہے۔ جیسے مصنف کے لیے معیار کوئی مسئلہ نہ ہو بلکہ وہ معلومات فراہم کرنے کو ہی سب کچھ سمجھتے ہوں۔

"نئی لہر کا جنم داتا: بیدار مغز سنیما" کے عنوان سے جو مضمون لکھا گیا ہے اگرچہ مصنف نے اسے بھی کافی محنت سے لکھا ہے، مگر یہاں مصنف سے بعض جگہ چوک ضرور ہو گئی ہے۔ نئی لہر کی فلمیں (جنھیں متوازی یا آرٹ فلم کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے) دراصل تجرباتی فلمیں ہوتی ہیں اور جو عام روش سے ہٹ کر بنائی جاتی ہیں۔ ایسی فلمیں بنانا ہمت کا کام ہوتا ہے اور ہندستانی فلم انڈسٹری کے بعض ممتاز ہدایت کاروں نے یہ ہمت کا کام اکثر کیا ہے۔ اس قسم کی فلموں کے بارے میں مصنف نے اپنے اس مضمون میں کافی مواد جمع کر دیا ہے۔ پھر بھی وہ بعض ممتاز ہدایت کاروں اور بعض اہم فلموں کا ذکر کرنا بھول گئے ہیں۔ مثال کے طور پر مصنف نے فانی مجمدار اور تپن سنہا جیسے اہم ہدایت کاروں کا ذکر نہیں کیا ہے مگر سہراب مودی، محبوب اور بی، آر چوپڑا وغیرہ کا ذکر کافی تفصیل سے کیا ہے جبکہ ان حضرات کو نئی لہر کا جنم داتا کسی بھی صورت میں نہیں تسلیم کیا جا سکتا۔ "بندنی" "اندولن" کا شمار بھی بمل رائے کی اہم فلموں میں ہوتا ہے۔ گرودت کی سب سے اہم فلم میرے نزدیک "صاحب، بی بی، اور غلام" ہے (اگرچہ اس فلم کے ہدایت کار ابرار علوی بتائے جاتے ہیں) گرودت کی دوسری فلموں کے ساتھ اس کا بھی ذکر ہونا چاہیے تھا۔ "اپہار" کو باسو چیٹرجی کی فلم لکھا گیا ہے۔ جبکہ اس فلم کے ہدایت کار مشہور آرٹسٹ سدھیندو رائے تھے۔ راج کپور کی دوسری فلموں کی طرح ان کی سب سے اچھی فلم "میرا نام جوکر" کا ذکر بھی ضروری ہے۔ منی کول کی دوسری اہم فلم "دوبدھا" کو بھی نظر انداز کیا گیا ہے جبکہ اس کی اہمیت سے بھی انکار ممکن نہیں۔ اوتار کول کی نہایت اہم فلم "۲۷ ڈاؤن" کا ذکر نہ کرنا بھی عجیب ہے۔ ایم، ایس ستھیو کی اہم ترین فلم "گرم ہوا" کا ذکر کرنا بھی مصنف بھول گئے۔ اسی طرح شیام بنیگل کی فلم "بھومیکا" کا ذکر بھی نئی لہر کی فلموں میں ناگزیر ہے۔ جب باسو چیٹرجی اور رشی کیش مکرجی کی فلموں کا ذکر اس قدر کیا گیا ہے۔ تو گلزار کا نام بھی گنایا جا سکتا تھا۔ ڈی، سلطانیہ، سکندر کھنہ اور فیروز چغتائی نے بھی تجرباتی فلمیں بنائی تھیں۔ ان کا ذکر بھی کیا جا سکتا تھا۔ ان معمولی فروگزاشتوں کے باوجود مضمون کافی معلوماتی ہے۔ دوسرے مضامین البتہ ہلکے پھلکے ہیں۔

پریم پال اشک صاحب کی اس کتاب کو پڑھ کر دوسروں کو بھی اس موضوع پر قلم اٹھانے کی تحریک ملے گی۔ کتابت اور طباعت کے لحاظ سے بھی کتاب اچھی ہے البتہ قیمت کے لحاظ سے یہ بھی دوسری کتابوں ہی کی طرح ہے۔ —————— شہنشاہ مرزا

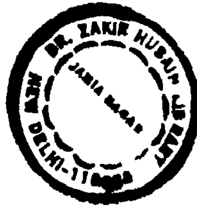


جنگلی جانوروں کی تحفظ گاہیں — (صفحہ ۳۱ کا بقیہ)

مچھلیاں نظر آتی ہیں۔ ندی کے کنارے چھوٹے بڑے بہت سے کچھوے نظر آتے ہیں۔ پاٹلی دون کے مقام پر زمین ہموار ہے۔ یہ مقام سمندر سے ۱۲۵۰ فٹ بلند ہے جہاں بارہ سنگھے اور چیتل کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ یہ علاقہ بہار کے موسم میں اپنے درختوں کے پھولوں کے لیے مشہور ہے۔ اس جگہ سے اور نیچے اتر کر ساگر تال ہے جو تیرتھ گاہ ہے جہاں کی بابت عقیدہ ہے کہ مکر سنکرانت کے تیوہار پر اوتار اشنان کرنے خود آتے ہیں اسی عقیدے کے تحت ہزاروں لوگ اس تیوہار پر یہاں اشنان کرنے جاتے ہیں۔









جلد ۳۵ نمبر ۷

اکتوبر ۱۹۸۰ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی



پبلشر: ہمیندر کمار

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یوپی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ۔ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زرِ سالانہ: پانچ روپے

ترسیلِ زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن ویبھاگ انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

باپائے قوم مہاتما گاندھی نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور ہندو مسلم اتحاد پر ہمیشہ زور دیا۔ وہ ساری زندگی ہندو مسلم اتحاد کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ اپنی تحریروں، تقریروں، اپنے عمل اور برتاؤ کے ذریعہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی قائم رکھنے کا جو راستہ انھوں نے دکھایا، وہ نہ صرف ہماری فلاح و ترقی بلکہ ملک کی بقا اور استحکام کے لیے بھی ضروری ہے۔ تصادم، تشدد اور فساد سے کبھی کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا بلکہ اور مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ زبردست جانی و مالی نقصان ہوتا ہے۔ لوگ بے گھر ہو جاتے ہیں۔ صنعت و حرفت اور تجارت کو نقصان پہنچتا ہے جس کے نتیجے میں رفتار ترقی ٹھپ ہو جاتی ہے۔ ملک پیچھے چلا جاتا ہے۔ تصادم، تشدد اور فسادات سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں، ساری توجہ انھیں حل کرنے اور نقصانات کی تلافی پر لگ جاتی ہے۔ جو عناصر تشدد اور فساد برپا کرتے ہیں، وہ حقیقتاً اس ملک کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ ہمیں ہر سطح پر ہر قدم پر ان سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ یہ عناصر باپائے قوم مہاتما گاندھی اور ان کے آدرشوں کے بھی دشمن ہیں۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتے کہ انسانوں کے بیچ وہ بھائی چارہ قائم ہو جس کے لیے گاندھی جی نے کہا تھا کہ "میری یہ دلی خواہش ہے کہ انسانوں کے بیچ اس طرح کا بھائی چارہ قائم ہو جس میں ہندو، مسلمان، عیسائی، پارسی اور یہودی سب یکساں حیثیت سے شامل ہوں۔" انسانوں کے بیچ اس طرح کا بھائی چارہ ہر شعبہ حیات میں اور ہر سطح پر قائم رہنا ضروری ہے تبھی ہم امن و سکون کے ساتھ ترقیاتی سرگرمیوں میں حصہ لے سکیں گے اور اپنے ملک اور پردیش کو آگے بڑھا سکیں گے نیز گاندھی جی کے خوابوں کے ہندستان کی تعمیر کر سکیں گے۔

تنگ نظری، تعصب، علاقائی عصبیت اور فرقہ پرستی ترقی کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ اسی لیے مہاتما گاندھی نے تمام عمر ان لعنتوں کے خلاف جنگ کی۔ انھوں نے تمام مذاہب ان کے رہنماؤں اور ان کی عبادت گاہوں کا احترام کرنے کی ہمیشہ تلقین کی۔ دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کی بے حرمتی کرنے اور انھیں نقصان پہنچانے پر انھیں بے حد دکھ ہوتا تھا۔ ایک جگہ انھوں نے کہا ہے کہ "کیا مسجد اور گرجا گھر حقیقتاً اتنے ہی مقدس نہیں جتنے مندر ہیں؟ خدا ہر جگہ ہے جتنا وہ لکڑی اور پتھر میں ہے اتنا ہی انسانی جسم کے ہر ذرے میں ہے۔"

مذاہب پر یقین رکھنے والوں کے بیچ تصادم اور تشدد کا ماحول تو کبھی پیدا ہی نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ دنیا کا کوئی بھی مذہب لڑنے اور انسانوں کو قتل کرنے کی تعلیم نہیں دیتا۔ اس کے باوجود لوگ لڑتے ہیں۔ یہ صورت حال نہ صرف افسوسناک بلکہ انتہائی شرمناک بھی ہے۔ اس سے مذاہب کی بدنامی ہوتی ہے اور ان سے بیزاری کا رجحان پروان چڑھتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ تشدد اور فساد میں ملوث ہوتے ہیں وہ حقیقتاً مذہب کے بھی دشمن ہیں۔ مذاہب کی بقا اور تحفظ کے لیے بھی ضروری ہے کہ ہم ایسے شرپسند عناصر سے ہوشیار رہیں اور ان کے بہکانے میں کبھی نہ آئیں۔ اکتوبر کا مہینہ گاندھی جی کی ولادت کا مہینہ ہے۔ اسی ماہ کی ۲ تاریخ کو ان کا جنم ہوا تھا۔ آئیے اس پرمسرت موقع پر ہم خلوص دل کے ساتھ یہ عہد کریں کہ ہر شعبہ حیات میں ہر سطح پر ہم فرقہ وارانہ ہم آہنگی، قومی یکجہتی اور باہمی اتحاد و اتفاق کا ماحول قائم رکھیں گے، اپنے قول و عمل سے روشن خیالی اور رواداری کا مظاہرہ کریں گے اور تصادم، تشدد اور فساد برپا کرنے کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیں گے۔ باپائے قوم مہاتما گاندھی کو یہی حقیقی خراج عقیدت ہوگا اور اسی طرح ہم گاندھی جی کے صحیح نام لیوا کہے جانے کے مستحق ہوں گے۔

وفیات

- ملک کے ممتاز ماہر تعلیم اور مورخ پروفیسر محمد ہارون خاں شروانی کا ۹۰ سال کی عمر میں ۱۵ر ستمبر کو حیدرآباد میں انتقال ہو گیا۔ وہ ایک طویل عرصے سے علیل تھے۔ انھیں کئی غیر زبانوں پر ماہرانہ قدرت حاصل تھی۔ اس کے باوجود انھوں نے اردو کو کبھی دوسرے درجے کی چیز نہیں سمجھا جبکہ عام طور سے یہ حال ہے کہ کسی ایک غیر ملکی زبان پر معمولی سی دسترس حاصل کر لینے والے لوگ بھی اپنی مادری زبان کو دوسرے درجے کی چیز سمجھنے لگتے ہیں۔

پروفیسر شروانی جامعہ عثمانیہ کے ان اساتذہ میں تھے جنھوں نے اردو کو اعلا تعلیم کا ذریعہ بنانے کے لیے بنیادی کام انجام دیا۔ وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ و سیاسیات کے صدر بھی رہے۔ اس کے علاوہ وہاں دارالترجمہ کی سرگرمیوں سے بھی انھوں نے ایک قریبی اور عملی تعلق رکھا۔ وہ بہت سی کتابوں کے مصنف تھے اور ان کے ان گنت مقالے اور مضامین بھی شائع ہوئے۔ خاص طور سے تاریخ کے میدان میں انھوں نے جو کام کیا ہے وہ گرانقدر اور بلند پایہ حیثیت کا حامل ہے۔ انھوں نے حکومت ہند کی فرمائش پر ہندستان کے آئین کا ترجمہ اردو میں کیا تھا۔ ان کا یہ ترجمہ بڑی مستند حیثیت رکھتا ہے۔

وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو اور دیگر اکابرین سے بھی ان کے قریبی مراسم تھے۔

- ملک کے ممتاز مجاہد آزادی اور مشہور و معروف اردو شاعر جناب میلا رام وفا کا بھی ۲۹ ستمبر کو جالندھر میں انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر ۹۰ سال کی تھی۔ وہ شاعر فطرت کی حیثیت سے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں مناظر قدرت اور دیہات کی سادہ زندگی کی بڑی خوبصورت عکاسی کی ہے۔ زبان بھی انھوں نے بڑی سادہ اور سلیس استعمال کی اور بچوں کے لیے خوبصورت اور موثر نظمیں کہہ کر انھوں نے ادب اطفال میں بھی اضافہ کیا۔ شاعری میں وہ علامہ تاجور نجیب آبادی کے شاگرد تھے۔ شعر و ادب کے ساتھ ساتھ

(باقی ص ۵۴ پر)

صباح الدین عمر
نعمت اللہ روڈ، امین آباد
لکھنؤ

مہاتما گاندھی کا مذہب

اگر یہ سوال کیا جائے کہ مہاتما گاندھی کا مذہب کیا تھا تو ہر شخص اس کا ایک سیدھا سا جواب یہ دے گا کہ وہ ہندو تھے۔ لیکن اتنا ہی جواب، اپنی جگہ درست ہوتے ہوئے بھی، نہ صرف نامکمل اور ناکافی ہوگا بلکہ گاندھی جی کا واقعی جو مذہب تھا، محض "ہندو" کہہ دینے سے اس کی کما حقہٗ وضاحت بھی نہ ہو سکے گی۔ اس میں شک نہیں کہ گاندھی جی سناتن دھرمی ہندو تھے اور اس پر وہ فخر بھی کرتے تھے لیکن اسی کے ساتھ، وہ ایسے ہندو تھے جو ہر مذہب اور اس کے پیشواؤں کو مانتا اور ان کا اسی طرح احترام کرتا تھا جس طرح ہندو مت اور ہندو مت کے بزرگوں کا۔ گاندھی جی یہ یقین رکھتے تھے کہ دنیا کے جتنے مذہب ہیں وہ سب ایک ہی منزل تک پہنچتے اور پہنچاتے ہیں۔ وہ اگر وید، رامائن اور گیتا کو مقدس اور الہامی کتابیں مانتے تھے تو انجیل، قرآن اور ژند اوستا کو بھی یہی درجہ دیتے تھے۔ وہ ہندو دھرم کو برحق مانتے ہوئے ہر مذہب اور ہر دھرم کی حقانیت اور عظمت کے معترف تھے۔ اُن کی پرارتھنا سبھا میں اگر رامائن اور گیتا کا پاٹھ کیا جاتا تھا تو قرآن، انجیل اور گرنتھ صاحب کے اشلوک بھی سنائے جاتے تھے۔ وہ مندروں کی تقدیس کے بھی قائل تھے اور مسجدوں، گردواروں اور گرجا گھروں کے بھی۔ دوسرے لفظوں میں، وہ بیک وقت ہندو بھی تھے مسلمان بھی، سکھ بھی تھے عیسائی بھی، یہودی بھی تھے اور زرتشتی بھی، بت پرست بھی تھے اور بت شکن بھی! اور یہ وہ صفات ہیں جن سے ہر کوئی متصف نہیں ہو سکتا ؎

درکفے جامِ شریعت، درکفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نہ داند جام و سنداں باختن

مذہب سے دلچسپی کی داستان

مذہب سے یہ دلچسپی، گاندھی جی کو بچپن ہی سے پیدا ہو گئی تھی۔ پہلے گھر کے ماحول نے، پھر انگلستان کے زمانۂ تعلیم نے، پھر جنوبی افریقہ کے قیام نے ان کی مذہبیت میں اضافہ ہی نہیں کیا بلکہ انھیں مختلف مذاہب، ان کی تعلیمات اور ان کے پیشواؤں کی زندگی اور حالات کے مطالعے کا شوق بھی پیدا کیا اور مذاہب کے اس تقابلی مطالعے سے اُن کے تصورِ مذہب میں مزید جلا، روشنی اور وسعت پیدا ہو گئی۔ اُن کے گھر کا ماحول بڑا مذہبی تھا۔ والدین وشنوی تھے، والدہ بھی بڑی مذہبی اور عبادت گزار تھیں اور والد بھی مذہب کے بڑے دلدادہ تھے۔ وہ راج کوٹ کی ریاست کے دیوان تھے مگر ریاستی معاملات سے وقت نکال کر مختلف فرقوں کے لوگوں اور عالموں سے مذہبیات پر اکثر گفتگو کرتے۔ ان کی اہلیہ یعنی گاندھی جی کی والدہ اپنے بچوں کو، جن میں گاندھی جی شامل تھے، راج کوٹ کے مندروں میں برابر بھیجا کرتی تھیں۔ مندروں میں جانے کے علاوہ، مہاتما گاندھی اس گفتگو کو بھی بڑی دلچسپی سے سنا کرتے جو ان کے گھر پر مختلف مذہبوں کے عالموں کے درمیان ہوتی۔ گاندھی جی نے اپنی آپ بیتی "تلاشِ حق" میں ان مذاکرات کے متعلق لکھا ہے کہ مذہب کے سلسلے میں جو باتیں میرے گھر پر ہوا کرتی تھیں انھوں نے "مجھ میں ہر مذہب کے بارے میں رواداری کا ایک رجحان پیدا کر دیا تھا"۔

ہندستان میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد گاندھی جی بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان بھیجے گئے۔ اپنے اس قیام کے زمانے میں بھی انھیں ایسے لوگوں سے ملنے کا موقع ملتا رہا جو مذہبیات میں دلچسپی

رکھتے تھے۔ گیتا کا وہ پہلے ہی مطالعہ کر چکے تھے اور بدھ مذہب کی تعلیمات سے بھی کافی واقفیت حاصل ہو چکی تھی۔ انگلستان میں انھوں نے عیسائیت اور تھیا سوفی پر بھی کتابیں پڑھیں اور جیسا کہ انھوں نے اپنے خود نوشت سوانح حیات میں لکھا ہے، وہ انجیل پڑھ کر حضرت عیسیٰ کی اس تلقین سے بے حد متاثر ہوئے کہ برائی کا بدلہ برائی سے نہ دو بلکہ اگر کوئی تمہارے داہنے گال پر تھپڑ مارے تو تم اپنا دوسرا گال اُس کے سامنے پیش کر دو۔ (اور حقیقت یہ ہے کہ مہاتما جی نے جنوبی افریقہ اور پھر ہندستان میں "ستیہ گرہ" کی جب تحریک شروع کی تو ستیہ گرہ کرنے والوں کے لیے لازمی شرط یہ رکھی کہ "اہنسا" (عدم تشدد) کا دامن کسی طرح ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے اور "انتقامی کارروائی" کسی صورت میں نہ کی جائے) گاندھی جی نے اسی زمانے میں مشہور مورخ "ٹامس کارلائل کی مشہور کتاب "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" بھی پڑھی جس میں کارلائل نے پیغمبر اسلامؐ کو ایک "ہیرو" کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ گاندھی جی نے خود لکھا ہے کہ اس کتاب کو پڑھ کر انھیں ایک نیک اور پرہیزگار انسان کے روپ میں پیغمبر اسلام کی عظمت کا احساس پیدا ہوا۔

بیرسٹری کی ڈگری لینے کے بعد گاندھی جی ہندستان واپس آئے اور یہاں سے ایک مقدمے کے سلسلے میں جنوبی افریقہ گئے، جہاں ہندستانیوں کے ساتھ انتہائی توہین آمیز اور امتیازی سلوک کیا جاتا تھا۔ وہاں کے حالات سے گاندھی جی بہت متاثر ہوئے اور جنوبی افریقہ میں رہنے والے ہندستانیوں کے اصرار پر وہیں رہ پڑے اور وہیں وکالت کی پریکٹیس کرنے لگے۔ پریکٹیس کے ساتھ انھوں نے ہندستانیوں کے ساتھ کیے جانے والے ظلم اور بے انصافی کے خلاف آواز بلند کی اور حکومت کے خلاف ایک تحریک شروع کی جس کا نام انھوں نے "ستیہ گرہ" (یعنی صداقت کی جدوجہد) رکھا۔ جنوبی افریقہ میں گاندھی جی کا قیام کئی سال تک رہا اور اس دوران اپنی دوسری سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ وہ مختلف مذہبوں کی تعلیمات کا بغور مطالعہ کرتے رہے۔ قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ بھی انھوں نے یہیں پڑھا اور اسلام پر دوسری کتابیں بھی۔ مختلف مذاہب پر وہ مختلف مذہبوں کے ماننے والے اپنے دوستوں سے تبادلۂ خیالات بھی کرتے رہے اور متعدد مذہبی مسائل پر ہر مذہب کے ماننے والے اپنے دوستوں سے خط و کتابت بھی۔ اپنی آپ بیتی کے مطابق، وہ بعض مغربی مفکرین ـــ خاص کر ٹالسٹائی اور رسکن ـــ کے خیالات سے بہت متاثر ہوئے۔ مذہب اور عالمی مذاہب کے تقابلی مطالعے نے ان کے دل پر یہ نقوش مُرتسم کر دیے کہ اگر کوئی شخص سچے دل سے اپنے مذہب کی صحیح تعلیمات پر عمل کرتا ہے تو وہ نہ صرف نہایت اچھا انسان ثابت ہوگا بلکہ دوسرے مذاہب کا بھی احترام کرے گا کیونکہ ہر مذہب میں "صداقت کا جلوہ" پایا جاتا ہے اور ہر مذہب انسان کو رواداری، ایثار یگانگت، محبت اور بھائی چارے کا سبق دیتا ہے۔

گاندھی جی کا تصوّرِ مذہب

جنوبی افریقہ کے قیام کے بعد جب گاندھی جی مستقل طور سے ہندستان آگئے اور ملک کی جنگِ آزادی کی قیادت شروع کی تو آزادی ہند تک وہ علاوہ اور باتوں کے مذہبی رواداری، حق و صداقت، اہنسا ہر مذہب کے احترام اور ہر مذہبی اقلیت کے ساتھ یکساں برتاؤ پر زور دیتے رہے۔ ہندستان واپس آجانے کے بعد انھوں نے اپنے آشرم سے پہلے "ینگ انڈیا" پھر "ہری جن" نامی دو ہفتے وار بھی نکالے اور ان میں ان تمام موضوعات پر اپنے خیالات کا تادم آخر اظہار کرتے رہے۔ گاندھی جی کی ان تحریروں سے مذہب کے بارے میں اُن کے خیالات بالکل واضح ہو جاتے ہیں اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اُن کے مذہب میں کتنی وسعت اور کتنی فراخ دلی پائی جاتی تھی اور دوسرے مذہبوں نیز اُن کے پیشواؤں کو وہ کس عقیدت اور احترام سے دیکھتے تھے۔ اُن کے نزدیک مذہب کا مفہوم محض کسی خاص ڈھنگ کی عبادت یا بعض رسوم کی ادائی نہیں تھا۔ عبادت کسی ڈھنگ سے کی جائے مگر اس کا مقصد خدا سے لَو لگانا ہے۔ وہ مختلف مذہبوں کو ایک نقطے تک پہنچنے کے لیے مختلف راستے سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ :

"مذہب کے مختلف راستے ہیں جو ایک ہی نقطے پر پہنچتے ہیں۔
اگر ہم ایک ہی منزلِ مقصود تک پہنچ رہے ہوں تو اس
میں کیا فرق پڑتا ہے کہ راستے مختلف ہوں"

وہ "صداقت" کو خدا سمجھتے تھے اور مذہب کو "صداقت" سے الگ تصور نہیں کرتے تھے۔ لکھتے ہیں:-

"مذہب کے معنی میرے نزدیک صداقت یا اہنسا کے ہیں یا
صرف صداقت کے، اس لیے کہ صداقت میں اہنسا بھی
شامل ہے۔"

گاندھی جی ہر مذہب کو نہ صرف اچھا سمجھتے تھے بلکہ اس کے بھی قائل تھے بلکہ اس کے بھی قائل تھے کہ ہر دھرم میں خوبیاں اور ایک بنیادی صداقت پائی جاتی ہے۔ کہتے تھے کہ اگر ہر مذہب کے تعلیمات کا، اس کے ماننے والوں کے نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ وہ بنیادی طور سے ایک ہی ہیں۔ ان کے نزدیک مذہب آپس میں تفریق پیدا کرنے کے لیے نہیں بنے ہیں بلکہ ایک دوسرے کو ملانے کے لیے بنے ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ کوئی شخص ہندو ہو یا عیسائی مسلمان ہو یا سکھ بنیادی طور پر سب کا مذہب ایک ہے اور اگر تمام مذہبوں کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان سب میں اختلاف بہت کم اور مشترک عناصر بہت زیادہ ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"میں دنیا کے ہر بڑے مذہب کی بنیادی صداقت پر
یقین رکھتا ہوں۔ میرا یہ بھی یقین ہے کہ تمام مذاہب
خدا کی طرف سے بھیجے گئے اور وہ ان لوگوں کے لیے
ضروری تھے جن کے لیے وہ اتارے گئے۔ مجھے یہ بھی یقین
ہے کہ اگر ہم سب مختلف مذہبوں کی کتابیں ان کے ماننے
والوں کے نقطۂ نظر سے پڑھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ بنیادی
طور پر وہ ایک ہیں اور ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔"

ایک اور جگہ وہ لکھتے ہیں:

"مذہب اس لیے نہیں اتارے گئے کہ انسانوں کو ایک
دوسرے سے جدا کر دیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ وہ ایک
دوسرے کو آپس میں لائیں۔"

ایک اور تحریر میں، یہ بتاتے ہوئے کہ ہم چاہے اپنے آپ کو ہندو کہیں، عیسائی کہیں یا مسلمان، جہاں تک مذہبوں کا تعلق ہے ان میں ایک وحدت پائی جاتی ہے، گاندھی جی لکھتے ہیں:

"جہاں تک میرا تجربہ ہے کسی نہ کسی وقت ہم پر، ہم
مسلمان ہوں یا عیسائی یا ہندو
یہ انکشاف ہوتا ہے کہ (تمام مذہبوں میں) مماثلت کی کئی
مثالیں ملتی ہیں اور اختلاف کی کم۔"

ان سب باتوں کے ساتھ گاندھی جی اس بات کے سختی سے قائل تھے کہ مذہب کے اندر کوئی غیر اخلاقی بات شامل نہ ہونا چاہیے۔ وہ اگرچہ انجیل، قرآن اور ژند اوستا کو ویدوں کی طرح الہامی کتابیں مانتے تھے لیکن اگر ان کا کوئی ٹکڑا عقل کی کسوٹی پر پورا نہ اترتا ہو یا اخلاقیات کے خلاف ہو تو وہ اسے قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتے تھے۔ انھوں نے کہا ہے:

میں ہر اس مذہبی عقیدے سے انکار کر دیتا ہوں جو عقل
کے مطابق نہ ہو اور اخلاقیات کے خلاف ہو۔

وہ مذہبی معاملات میں اخلاقیات کے اس حد تک قائل تھے کہ اگر عقل کے خلاف بھی کوئی بات معلوم ہوتی ہو مگر غیر اخلاقی نہ ہو تو اسے بھی وہ تسلیم کر لیں گے۔ انسان کی اخلاقی بنیادیں اگر کمزور ہیں اور وہ ان کے نزدیک مذہبی نہیں رہ گیا۔ کوئی انسان اگر جھوٹا اور ظالم ہے تو گاندھی جی کی رائے میں وہ یہ دعویٰ کر ہی نہیں سکتا کہ خدا اس کے ساتھ ہے۔

ہندویت گاندھی جی کے نزدیک

مہاتما گاندھی کے نزدیک مذہب کا جو مفہوم تھا وہ مذکورۂ بالا اقتباسات سے واضح ہو گیا ہوگا۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ ایک ایسا شخص جو مذہب کا یہ تصور رکھتا ہو، خود اپنے مذہب یعنی ہندویت کی کیا تعریف کرتا ہے اور وہ خود کیسا ہندو ہے۔ گاندھی جی نے اپنی ہندویت کے بارے میں اپنے اخباروں میں ایک سے زیادہ مرتبہ لکھا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک تو وہ اپنے ہندو ہونے پر فخر کرتے تھے، مندروں کا احترام کرتے تھے، پرارتھنا (عبادت) کے قائل تھے اور وید، رامائن اور گیتا کو الہامی کتابیں تسلیم کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ ہندویت کا دائرہ ان کے نزدیک بہت وسیع تھا اور اس میں دوسرے مذاہب کے تعلیمات بھی شامل ہو سکتے تھے۔ تیسرے یہ کہ وہ ہندو رہتے ہوئے بدھ مت، عیسائیت، زرتشتیت اور اسلام کو الہامی مذاہب مانتے تھے اور ان سب کی عظمت کے قائل تھے۔ بہ الفاظ دیگر ان کی ہندویت بڑی روشن خیال، بڑی رودار، بڑی اتحاد پسند، بڑی وسیع القلب، فراخ دل اور دوسرے مذہبوں سے بڑی محبت کرنے والی اور ان کی ہر اچھی چیز کو اپنے میں شامل کر لینے والی ہندویت تھی۔ اسی کے ساتھ اس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ مذہب قبول کرنے کے لیے دوسروں کو تبلیغ

کرنے کی قائل نہ تھی کیونکہ ہندویت میں، گاندھی جی کے نقطۂ نظر کے مطابق اپنے اپنے عقیدے کے مطابق عبادت اور خدا کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ہندویت کوئی جداگانہ مذہب نہیں ہے۔ اس میں دنیا کے ہر پیغمبر کی عبادت کی جگہ ہے۔ لفظ "مشنری" (مبلغ) کا جو عام مفہوم ہے وہ اس مفہوم میں مشنری مذہب نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے بہت سے قبائل کو اپنے میں مدغم کر لیا ہے مگر یہ ادغام ایک ارتقائی اور غیر مرئی نوعیت کا ہے۔ ہندویت ہر ایک کو یہ پیغام دیتی ہے کہ اپنے مذہب یا دھرم کے مطابق خدا کی عبادت کرو۔ اس لحاظ سے وہ ہر مذہب کے ساتھ ایک پرامن طریقے سے نباہ کر لیتی ہے۔"

اپنی ہندویت کی تشریح کرتے ہوئے وہ ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"میری ہندویت میں فرقہ واریت شامل نہیں ہے۔ اس میں وہ تمام باتیں پائی جاتی ہیں جنھیں میں اسلام، عیسائیت، بودھ مت اور زرتشتیت میں سب سے اچھی سمجھتا ہوں۔"

گاندھی جی بت پرستی کے بھی قائل تھے اور مندروں کا بھی احترام کرتے تھے ان کی حفاظت کرنا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ وہ یہ بھی مانتے تھے کہ کسی نہ کسی ڈھنگ سے خدا کی عبادت کرنا بھی ضروری ہے اور عبادت کرنے کی کوئی جگہ بھی۔ وہ بت پرستی کے "جذبے" کی قدر کرتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک اس سے انسانی نسل کی ترقی میں مدد ملتی ہے۔ لکھتے ہیں:

"بت پرستی کی پشت پر جو جذبہ کارفرما ہوتا ہے میں اس کا احترام کرتا ہوں۔ نسل انسانی کی ترقی میں وہ بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اور میں چاہوں گا کہ میں اپنی جان دے کر بھی اس لائق بن سکوں کہ ان ہزاروں مندروں کی جو ہمارے اس ملک کو مقدس بناتے ہیں، حفاظت کر سکوں۔"

مندروں کی ضرورت کے بارے میں انھوں نے ایک اور جگہ اس طرح اظہار خیال کیا ہے:-

"میں مندروں کے وجود کو گناہ یا توہم نہیں سمجھتا۔ کسی طرح کی مشترکہ عبادت اور عبادت کے لیے کوئی مشترکہ جگہ انسانی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔"

لیکن بت پرستی کے قائل ہونے کے ساتھ وہ اپنے کو "بت شکن" بھی سمجھتے تھے۔ بت شکن اس معنی میں کہ اگر بت پرستی کی وجہ سے مذہبی دیوانگی پیدا ہو جائے اور اپنی طرز عبادت کے علاوہ کسی دوسرے ڈھنگ کی عبادت میں کوئی خوبی ہی نظر نہ آئے۔ لکھتے ہیں:

"میں اس معنی میں بت شکن ہوں کہ میں اس بت پرستی کو توڑ دیتا ہوں جو مذہبی دیوانگی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور جو اپنے ہی طریقۂ عبادت کے علاوہ کسی دوسرے طریقۂ عبادت میں کوئی خوبی ہی نہیں دیکھتی۔"

مہاتما گاندھی "پرارتھنا" یا عبادت پر بہت زور دیتے تھے مگر طرز عبادت پر مطلق اصرار نہیں کرتے تھے۔ وہ یہ البتہ چاہتے تھے کہ چاہے چند ہی منٹ کے لیے ہو مگر عبادت اس خضوع و خشوع سے کی جائے کہ گویا بندہ اپنے خالق کے سامنے اور اس سے ہم کلام ہے۔ وہ عبادت کو مذہب کی روح اور جان سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ سچے عبادت گزار کو ایک ایسا سکونِ قلب ملتا ہے جو کسی کو میسر نہیں ہوتا۔ گاندھی جی اُن لوگوں سے اختلاف رکھتے تھے جو یہ کہتے تھے کہ اُن کا کوئی مذہب نہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے:

"یہ کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ وہ سانس تو لیتا ہے مگر اس کے ناک نہیں ہے۔"

وہ "ایشور" اور "اللہ" کو ایک سمجھتے تھے۔ ان کی پرارتھنا سبھا میں جو گانے گائے جاتے تھے ان میں کا ایک مشہور گانا ہے:

"ایشور اللہ تیرو نام سب کو سمت دے بھگوان"

مگر اُن کا یہ خدا یا ایشور عین صداقت اور عین محبت ہے۔ وہ اس حد تک رحیم و کریم ہے کہ جو اسے نہیں مانتے وہ انھیں بھی پالتا ہے۔ یہ خدا "کمزوروں کے دل میں رہتا ہے" اور گاندھی جی ان کمزوروں کی خدمت کرکے اس کی عبادت کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ رام کے ہزاروں نام ہیں۔ سچا ہائے

اللہ کہو، خدا کہو، رحیم کہو، رزاق کہو، ہے وہ ایک ہی ہستی۔

دوسرے مذہب گاندھی جی کی نظر میں

گاندھی جی نے مختلف مذہبوں کے بارے میں الگ الگ اظہار خیال بھی کیا ہے۔ جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں اُن تمام مذہبوں سے ایک عقیدت ہی نہیں تھی بلکہ انھوں نے ہر مذہب کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس کی روح کو پا لیا تھا۔ بدھ مذہب ہندستان ہی میں پیدا ہوا اور ایک زمانے میں سارے ملک میں چھا گیا تھا۔ اس کے متعلق عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ہندو مذہب سے ایک علاحدہ مذہب ہے لیکن گاندھی جی ایک طرف گوتم بدھ کی عظمت کے بے انتہا معترف ہیں اور دوسری طرف ان کی تعلیمات کو ہندو مذہب کے منافی نہیں سمجھتے بلکہ انھیں ہندو دھرم کی اصلاح خیال کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

" یہ میرا پختہ دعویٰ ہے کہ بدھ کی تعلیمات کے بیشتر اجزا آج ہندو دھرم کا ایک جزو لاینفک بن گئے ہیں۔ ہندو ہندستان کے لیے اب یہ ممکن نہیں رہ گیا ہے کہ وہ اپنے قدم پیچھے ہٹائے اور ہندویت میں جو زبردست اصلاح کی ہے اُس سے روگردانی کر سکے۔ انھوں نے ایک عظیم قربانی، اپنے تیاگ اور خلوص بے پایاں سے ہندویت پر ایک لازوال نقش چھوڑا ہے اور ہندویت اس عظیم رہنما کے ابدی احسان کے لیے اُن کی ممنون کرم ہے۔"

عیسائیت کو بھی مہاتما گاندھی ایک عظیم مذہب مانتے تھے اور حضرت عیسیٰ کو بہت بڑا پیغمبر جنھیں شہادت کا درجہ ملا۔ حضرت عیسیٰ کی اس تعلیم سے کہ اگر تمہارے ایک گال پر کوئی ایک تھپڑ مارے تو تم اپنا دوسرا گال بھی اُس کے سامنے پیش کر دو، وہ نوجوانی ہی میں متاثر ہو چکے تھے۔ عیسائیت کے بارے میں ایک اور موقع پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ اُن کے عدم تشدد کی تشکیل میں حضرت عیسیٰ کی قربانی کا عنصر بھی شامل ہے۔

اسلام اور تاریخ اسلام کا گاندھی جی نے بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ یہ ماننے کے لیے بالکل تیار نہ تھے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ وہ اسلام کو بھی دوسرے مذہبوں کی طرح امن کا مذہب تسلیم کرتے تھے اور ان کا یہ عقیدہ تھا کہ:۔

" میں اسلام کو اُسی طرح امن کا مذہب سمجھتا ہوں جس طرح عیسائیت، بودھ مت اور ہندو مت کو۔"

وہ اسلام کو ایک الہامی مذہب اور قرآن مجید کو ایک الہامی کتاب اور حضرت محمدؐ کو پیغمبر خدا مانتے تھے۔ لکھتے ہیں:

میں اسلام کو ایک الہامی مذہب، قرآن کو ایک الہامی کتاب اور محمدؐ کو من جملہ دوسرے پیغمبروں کے ایک پیغمبر مانتا ہوں۔"

مہاتما گاندھی اور ہندستان کی اقلیتیں

مہاتما گاندھی ہر ہندو، مسلمان، بودھ، سکھ، عیسائی، پارسی کو صرف مذہبی حیثیت سے نہیں دیکھتے تھے۔ وہ سیاسی حیثیت سے بھی جب کوئی جائزہ لیتے تھے تو اقلیتوں یعنی غیر ہندوؤں کو کسی طرح کا کم تر درجہ دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ انھوں نے آزادی سے بہت قبل ہی اس کا اظہار کر دیا تھا کہ:

" اگر کسی اقلیت کو، جو اپنے مذہب کی وجہ سے اقلیت میں ہو، محض اس لیے کم تری کا احساس دلایا جاتا ہے تو میں عرض یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ میرے خوابوں کا ہندستان نہیں ہے۔ اُس ہندستان میں جس کی تشکیل کے لیے میں نے زندگی بھر کوشش کی ہے، ہر آدمی اُس کا مذہب کچھ بھی ہو، مساویانہ حیثیت رکھتا ہے۔ حکومت کو سیکولر (لامذہبی) رہنا ہی ہے۔"

اُن کا یہ نظریہ بھی تھا کہ مذہب تو سب اچھے اور ایک ہی درجے کے ہیں "لیکن مختلف مذہبوں کے ماننے والے ایک دوسرے سے جھگڑا کرتے ہیں اور اس طرح اپنے مذہب سے منکر بن جاتے ہیں" وہ توقع کرتے تھے کہ ہندستان میں تمام مذاہب کے ماننے والے اپنے آپ کو ایک ہی دھرتی کے فرزند اور دختر کہلانے میں فخر محسوس کریں گے۔ اُن کے نزدیک:

" مذہب سے قومیت کا امتیاز نہیں ہوتا بلکہ وہ انسان اور اس کے خدا کے درمیان ایک ذاتی معاملہ ہے۔ اگر

(بقیہ صفحہ ۱۴ پر)

اپنی دھرتی اپنا دیش

نازش پرتاپ گڑھی
بیگم واڑہ پرتاپ گڑھ

بہ ہوش باش اے زبانِ خامہ ہے آزمائش مرے سخن کی
لبوں کی ہر جنبشِ خفی پہ لگی ہے آنکھ اہلِ انجمن کی
ہر ایک تشبیہ سج کے نکلے کہ لاج رہ جائے فکرِ فن کی
ہر ایک مصرعے کے آئینے میں حسین تصویر ہو وطن کی
اک ایک حرف آئے نذر لے کر خزانہ لفظوں کی وسعتوں کا
کہ میری طبعِ رواں نے چھیڑا ہے ذکر بھارت کی عظمتوں کا
نقوش ایلورا کے پتھروں پر کہ چشمِ گیتی میں خواب جیسے
قطب کی یہ لاٹ عزمِ آدم کی صورتِ کامیاب جیسے
یہ تاج۔ انساں کی حسن کاری الٹ رہی ہو نقاب جیسے
یہ جامع مسجد کا حسنِ سادہ دعا کوئی مستجاب جیسے
ہمالیہ کی بلندیوں میں زمین کا ہو جلال جیسے
یہ لال قلعہ کی سرخ تعمیر۔ جم گیا ہو گلال جیسے
اڑی ہے سنگم سے جب بھی خوشبو تو آبروئے ختن گئی ہے
ہنسی ہے جب رات مالوے کی تو روشنی دل میں چھن گئی ہے
پہاڑ ارضِ دکن کے ہیں یا نگاہِ محبوب تن گئی ہے
کوئی اماوس کی رات لہرا کے زلفِ بنگال بن گئی ہے
نگارِ دلی کی یہ سجاوٹ کتھا کلی کا ہو روپ جیسے
یہ لکھنؤ کی حسین شامیں گلابی جاڑے کی دھوپ جیسے
یہ رودِ سرجو ہے یا تقدس کی آنچ میں روح گل گئی ہے
یہ تِر جمنا کے روپ میں بانسری کی اک تان بہہ رہی ہے
یہ پاک گنگا کہ جس سے قلب و نظر کو آسودگی ملی ہے
ہماری دھرتی نے ہاتھ پھیلا کے ہم کو آشیرواد دی ہے
یہ سرزمینِ عظیم وہ ہے جہاں ہوئے راکھی بند بھائی
یہاں کرشن اٹھ کھڑے ہوئے ہیں دروپدی پر جب آنچ آئی

یہ دھان کی بالیاں کہ جس طرح کوئی نازک سی آرزو ہو
جھکے ہوئے خوشہ ہائے گندم کہ جیسے چشمِ بہانہ جو ہو
یہ پھیلی بکھری ہوئی سی بیلیں کہ جیسے عاشق کی گفتگو ہو
یہ پیلے سرسوں کے کھیت آنگن میں جیسے بیٹھی ہوئی بہو ہو
یہ کیاریاں ہیں کہ اک مصور کے شاہکاروں کا سلسلہ ہے
یہ کونپلیں ہیں کہ سینۂ آدمی میں جینے کا حوصلہ ہے
یہاں کی صناعیوں میں دستِ بشر کی محنت لہک رہی ہے
بنارسی ساڑیوں کی تہہ سے ہنر کی مستی چھلک رہی ہے
چکن کی یہ چاندنی کہ تخلیقِ فن کی دنیا چمک رہی ہے
یہ جامدانی کا روپ ہے یا چمن میں جوہی مہک رہی ہے
یہ کامدانی کی بوٹیاں کہکشاں سے جن کو خراج آئے
زری کی یہ دھوپ چھاؤں جیسے کسی سہاگن کو لاج آئے
ملے گا بدھ کے پیامِ حق میں وہی سکونِ حیات اب بھی
گیا کے ذرے دکھا رہے ہیں جہاں کو راہِ نجات اب بھی
اجودھیا کی فضاؤں میں ہے وفائے سیتا کی بات اب بھی
مصیبتوں کے گھنیرے جنگل میں رام و لچھمن ہیں ساتھ اب بھی
کریدیں ماضی کی راکھ اس میں شعور کا جامِ جم ملے گا
انھیں روایات کے خزانے سے ہم کو زورِ قلم ملے گا
وہی ادائیں ہیں گوپیوں کی تو کرشن کی بانسری وہی ہے
وفائے شاہجہاں نے کی تھی جو "مرمریں شاعری" وہی ہے
ہزار لٹ کر بھی اپنی دھرتی پہ جلوۂ زندگی وہی ہے[۱]
پھٹا ہے پنجاب کا کلیجہ مگر لبوں پر ہنسی وہی ہے
انھیں میں موضوعِ نظم ڈھونڈھیں یہیں پہ مینارۂ ادب ہے
حیات ہی مرکزِ سخن ہے، وطن ہی گہوارۂ ادب ہے

۱؎ حادثۂ تقسیمِ ہند کی طرف اشارہ ہے۔ نازش

نامی انصاری
۱۱/۹۶ پریڈ۔ کانپور-۲۰۸۰۰۱

کلام غالب کی معنویت

شاعری جذبات نگاری بھی ہے اور معنی آفرینی بھی۔ غالب کے زمانے میں ایک تیسرا عنصر قافیہ پیمائی کا بھی کام کر رہا تھا جس میں زبان و بیان کے حسن کو چمکانا، محاورہ بندی، صنعت گری اور حسنِ تعلیل شاعری کا نصب العین بن گیا تھا، اس رجحان کے نمائندے ذوق تھے اور انھیں کی روایت سارے قلعے میں کام کر رہی تھی۔ قافیہ پیمائی کا رجحان ذوق کے بعد بھی ترقی پذیر رہا اور اس کی تکمیل داغ، امیر مینائی اور کسی حد تک ریاض خیر آبادی کے ہاتھوں ہوئی۔ جذبات نگاری کے نمائندے مومن تھے۔ عشقیہ جذبات و احساسات کی مینا کاری جس طرح مومن کے اشعار میں ہوئی اور جس دردں بینی کا اظہار جذبات کے ریشے ریشے کو مومن نے غزل میں سمو کر کیا ہے اس کی مثال کمیاب ہی نہیں نایاب ہے۔ مومن نے جذبات نگاری ہی میں معنی آفرینی کی کوشش کی ہے مگر وہ اپنے مخصوص دائرے سے باہر قدم نہیں رکھنا چاہتے اور انھیں میں مگن رہتے ہیں۔ غالب خود مومن کی معنی آفرینی کے معترف تھے۔ منشی نبی بخش حقیر کو ۲۱ مئی ۱۸۵۲ء کے ایک خط میں مومن کی رحلت کی اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "یہ شخص (مومن) بھی اپنی وضع کا اچھا کہنے والا تھا۔ طبیعت اس کی معنی آفریں تھی۔"[1] اس ماحول میں غالب کی انفرادیت اپنے لیے ایک الگ راہ کا تقاضہ کر رہی تھی اور بالآخر اسے طرزِ بیدل میں پناہ ملی۔ قافیہ پیمائی، ذوق اور ان کے اقران کے لیے چھوڑ کر غالب نے معنی آفرینی کو اپنا نصب العین قرار دیا تاہم اس میں غالب کی دشواری یہ تھی کہ اردو شاعری میں معنی آفرینی کا کوئی قابلِ تقلید نمونہ موجود نہ تھا اور ہوتا بھی تو غالب اس پر قانع کب ہوتے۔ بیدل کو اپنی معنی آفرینی کے لیے فارسی کے ڈھلے ڈھلائے سانچے مل گئے تھے۔ غالب کو اپنے سانچے خود بنانے تھے اور انھوں نے بنائے بھی مگر چار و ناچار ان کو اندازِ بیان بیدل سے مستعار لینا پڑا اور فارسی الفاظ و تراکیب پر بھروسہ کرنا پڑا۔ اسی لیے ان کے ابتدائی کلام میں جو انھوں نے پچیس برس کی عمر تک جمع کر لیا تھا، افعال تو ہندی کے ہیں مگر اشعار کا بقیہ حصہ فارسی زبان کا رہینِ منت ہے۔ نسخۂ حمیدیہ کی غزلیں سر تا سر اسی انداز کی ہیں۔ اس زمانے میں مضامین کی جستجو میں بےشک انھوں نے خونِ جگر صرف کیا مگر ابنائے زمانہ نے ان کے اس دور کے کلام کو "کوہ کندن و کاہ بر آوردن" کہہ کر نظر انداز کر دیا اور غالب کو بھی زمانے کے آگے سپر انداز ہونا پڑا
طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا۔ اسد اللہ خاں قیامت ہے کہہ کر نہ بظاہر اس روش سے دست بردار بھی ہو گئے مگر حقیقتاً شاعر کی انا اپنی شکست تسلیم کرنے کے لیے اب بھی تیار نہ تھی۔ زمانے کی روش کو دیکھتے ہوئے اور ابنائے زمانہ کے دباؤ سے انھوں نے اپنا استعاراتی اور ایمائی طرزِ بیان ترک تو کر دیا تاہم معنی آفرینی کے نقطۂ نظر کو اب بھی حرزِ جاں اور حرزِ ایماں بنائے رکھا۔ ان کا یہ اعلان کہ ؎ راست می گویم و از راست سر نتواں کشید ؍ ہر کہ در گفتار فخر تست، آں ننگِ من است، ذوق کی قافیہ پیمائی

---

[1] نادراتِ غالب۔ حصّہ دوم

سے برأت کا اعلان بھی ہے اور اپنی معنی آفرینی پر جمے رہنے کا اعادہ بھی۔ غالب ایک تہذیبی بساط کے چوراہے پر کھڑے تھے اور آنے والے دور کی کرنیں ان کے ضمیر میں منعکس اور ان کے ذہن پر اثر انداز ہو رہی تھیں اس لیے انھوں نے جو کچھ کہا زمانے نے اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی اور ان کا کلام ایسا چمنستان رنگ و بو بن گیا جس کی تر و تازگی اور شادابی اب تک سامان صد ہزار گلستاں کیے ہوئے ہے۔ کلام غالب کی معنویت روز بروز نئے نئے رنگ میں ظاہر ہوتی ہے اور ارباب ذوق کے لیے سامان نشاط جاں بہم پہنچاتی ہے۔ یہ دیکھنا ہے کہ غالب کی معنی آفرینی کس نہج پر قائم ہے اور کائناتِ رنگ و بو کے کن کن گوشوں کو اپنے دام میں اسیر کیے ہوئے ہے۔ غالب کے مزاج کے عناصر ترکیبی میں تشکیک تمنا، رشک، تماشہ اور ایک رجائی نقطۂ نظر کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ وہ زندگی کے مظاہر اور کائنات کے اجزائے ترکیبی کو بے چون و چرا تسلیم کر لینے پر اپنے ذہن کو آمادہ نہیں کر سکتے۔ وہ ہر شے اور ہر جذبے کی ماہیت پر غور کرتے ہیں اور زندگی اور کائنات کے رشتوں کی روح تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہیں سے غالب کی وہ انفرادیت بھی نمایاں ہوتی ہے جو غالب کا طرۂ امتیاز ہے۔ غالب کے چند منتخب اشعار کی مدد سے ان نکات پر غور کرنا زیادہ سود مند ثابت ہوگا۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

بہ تجلّیٔ فرصت یک شبنمستاں جلوہ خور نے
تصور نے کیا ساماں ہزار آئینہ بندی کا

کس بات پہ مغرور ہے اے عجز تمنا
سامانِ دعا وحشت و تاثیرِ دعا ہیچ

تماشائے گلشن، تمنائے چیدن
بہار آفرینا! گنہگار ہیں ہم

تربیت فطرت اور خیال بسا بلند
اے طفل خود معاملہ، قد سے عصا بلند

جام ہر ذرہ ہے سرشار تمنا مجھ سے
کس کا دل ہے کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ

دیدہ و حسرتِ آئینہ تکرارِ تمنا
واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہ خیال
ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

تو اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

مجبوری و دعویٔ گرفتاریٔ الفت
دست تہہ سنگ آمدہ، پیمانِ وفا ہے

ربط یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل ناآشنا

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

ساغرِ جلوہ سرشار ہے ہر ذرۂ خاک
شوقِ دیدار بلا آئینہ ساماں نکلا

ان اشعار میں وہ مضمون آفرینی نہیں ہے جو ناسخ کا طرۂ امتیاز ہے یعنی "خشک مغز و خشک تار و خشک پوست" بلکہ ان میں ایسی معنی آفرینی ہے جس سے آوازِ دوست آتی ہے۔ غالب جب اپنے ذہنی جذباتی اور حسی تجربات کو الفاظ کا پیکر عطا کرتے ہیں تو ان کے پیچھے جہانِ معنی کا ایک سلسلہ ہوتا ہے جتنا الفاظ کی تہوں کو کھولتے جائیں گے معنی کا سلسلہ دراز ہوتا جائے گا۔ غالب نے جب کہا تھا ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

تو انھوں نے اشعار میں معنی کا ایک جہان رنگ و بو آباد کرنے کے بعد ہی کہا تھا۔ دیر و حرم کو آئینۂ تکرارِ تمنا قرار دینا آرائش خم کاکل میں اندیشۂ دور دراز کی دریافت گرفتاری الفت کو دست تہِ سنگ آمدہ سمجھنا، اجزائے بہار میں سبزے کی بیگانگی، صبا کی آوارگی اور گل کی نا آشنائی کا احساس کر لینا، غالب کے علوئے تخیل ہی کا ثبوت نہیں ہے بلکہ حسی تجربات کو الفاظ کے پیکر میں تحلیل کر کے معنی کے رنگا رنگ گل بوٹے کھلانے کا کارنامہ بھی ہے شاید اسی لیے فراق گورکھپوری نے کہا تھا کہ "شاعر تو میر بڑا ہے مگر فن کار غالب بڑا ہے۔" غالب کا فن محض خیالی پرچھائیوں کو متشکل کرنے کا فن نہیں ہے بلکہ پتھر سے لہو نچوڑنے کا فن ہے، بے ستون سے جوئے شیر لانے کا فن ہے، میر صاحب دل پر خوں کی اک گلابی سے زندگی بھر سرشار رہے۔ غالب نے ذہن و دماغ سے شیشہ و تیشہ کا کام لیا۔ میر نے سادہ و شیریں الفاظ میں اپنی خستگی و برشتگی کو تحلیل کر دیا، غالب نے فارسی الفاظ و تراکیب کے رگ و ریشے میں زندگی کے شعوری تجربوں کو اس طرح سمو دیا کہ الفاظ خود بخود جگمگا اٹھے۔ لفظ و معنی کے رشتوں کو ہر بڑے شاعر نے خاص اہمیت دی ہے مگر بقول پروفیسر احتشام حسین "لفظ کا استعمال شاعر کا اصل مقصد نہیں ہوتا، وہ لفظ سے کسی حقیقت تک لے جانا چاہتا ہے۔ اس لیے جب تک الفاظ کی معنوی تہوں کو کھولا نہیں جائے گا، حقیقت تک رسائی مشکل ہی سے ہو سکے گی۔" نیز "معنی ہی سے ترسیل کا مسئلہ بھی وابستہ ہے۔ غالب لفظ کو معنی تک پہنچنے کا ایک وسیلہ سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ لفظ میں انجماد ہوتا ہے معنی ان میں حرکت پیدا کرتا ہے ... معنی متحرک ہے اور مختلف لوگوں کے ذہن میں اس کا مفہوم ان کے احساس حقیقت اور وسعت شعور سے متعین ہوتا ہے۔ اگر معنی کا شعور ہو جائے تو فن کار اسے لفظوں کے علاوہ رنگ میں، جسم کی حرکت میں، ساز کی آوازوں میں بھی پہچان سکتا ہے۔"

غالب کے جدید ذہن کا صرف یہی مفہوم نہیں ہے کہ ان کے فکر و نظر پر مستقبل کی پرچھائیاں پڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے ثابت و سیار کے اندرونی رشتوں کو سمجھنے اور اشعار میں ان کو منعکس کرنے کی کوشش بھی کی ہے غالب کے ہم عصروں میں کسی اور کو یہ بات نصیب نہیں ہوئی۔ دورِ حاضر میں غالب سے ذہنی ہم آہنگی کا جو احساس پایا جاتا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کے اشعار میں ان بہت سے ذہنی و جسمانی تحریک و تجارب کی روح جادہ گر ہے جن سے ہم موجودہ سائنسی دور کی پیچیدگی میں اکثر دوچار ہوتے ہیں۔ یہی بات اقبال کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ وہ اگرچہ دوسری جنگ عظیم سے قبل ہی وفات پا چکے تھے۔ تاہم انھوں نے اپنے دور کے افکار و مسائل کی روح کو جس طرح اشعار میں منعکس کیا تھا وہ نصف صدی گزرنے کے بعد بھی "ورائے شاعری چیزے دگر است" معلوم ہوتی ہے۔ اصل حقیقت یہی ہے کہ طرز ادا، محاورہ بندی، صنعت گری، رعایت لفظی وغیرہ شعر کے ظاہری لباس ہیں اور جب تک الفاظ کے بطون میں صاعقہ و سیماب کا عالم نہیں ہوگا، معنی آفرینی کا حق ادا ہی نہیں ہو سکتا۔ اس ضمن میں استعارے اور شعری پیکر تراشی کی بڑی اہمیت ہے غالب کے اشعار میں استعاروں اور علامتوں کی جو لالہ کاری ہے اور پیکر تراشی کا جو فن کارانہ عمل ہے وہ ان کی معنی آفرینی ہی کا مظہر ہے۔

دیدہ تا دل ہے یک آئینہ چراغاں کس نے
خلوتِ ناز پہ پیرایۂ محفل باندھا

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہ خیال
ہے تصور میں ز بس جلوہ نما موج شراب

تو اور آرائش خم کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

ہیں چشمِ واکشادہ و نرگسِ نظر فریب
لیکن عبث کہ شبنمِ خورشید دیدہ ہوں

شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرہ صحرا دست گاہ و قطرہ دریا آشنا

فتادگی میں قدم استوار رکھتے ہیں
بہ رنگِ جادہ، سرِ کوئے یار رکھتے ہیں

فضیل جعفری کے الفاظ میں "شعری پیکر معنی کے اعتبار سے ہمارے تخیل کو زیادہ گہری معنویت اور دور رس تاثرات سے دوچار کرتے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شعری پیکر کسی نہ کسی سیاق و سباق میں بڑی حد تک ہمارے ذہنوں تک الفاظ کا استعاراتی تاثر منتقل کرتے ہیں۔ غالب نے چونکہ حیات و کائنات کا مطالعہ ہر پہلو سے کیا تھا اور ان کے تجربات مشاہدات کا کوئی اور چھور نہ تھا، اس لیے ان کے پاس مجرد خیالات و احساسات کا ایسا سلسلہ لامتناہی تھا جس کا بہتر اظہار شعری پیکر کی مدد ہی سے کیا جا سکتا ہے" قانونِ باغبانیِ صحرا لکھنے کے لیے غالب نے صرف سرِ ہر خار کو خونِ دل ہی میں نہیں ڈبویا بلکہ اپنے ذہن و دماغ کی مخفی قوتوں کو بروئے کار لانے میں بھی کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ غالب کے یہاں صرف شاعری کی مشق و مزاولت ہی کام نہیں کرتی بلکہ حیات و کائنات کے گوناگوں مسائل کے ادراک کی کوشش، الفاظ کے قلبِ منجمد میں روح پھونکتی ہے یا الفاظ کی سوئی ہوئی روح کو بیدار کرتی ہے۔ لفظ و معنی کے نازک رشتے کو زیادہ سے زیادہ فعال بنانے کی کوشش میں غالب نے اردو پن کو بھی قربان کر دیا۔ کیوں کہ زبان کے مروجہ ڈھانچے کی آب جو، ان کے تخیل کے بحرِ بیکراں کا بوجھ نہیں سہار سکتی تھی جس کی وجہ سے ان کے ہمعصر زندگی بھر ان کے شاکی رہے۔ عمر کے آخری حصے میں انھوں نے زبان پر بھی توجہ دی مگر ان کی افتادِ طبع نے سہلِ ممتنع میں بھی رنگِ بہارِ ایجادیِ بیدل کا تماشہ دکھایا اور وہ لفظ و معنی کے رشتوں کی تازہ کاری اور لالہ کاری سے کبھی دست بردار نہ ہو سکے۔

کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجیے
کبھی حکایتِ صبرِ گریز پا کہیے
نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے
روانیِ روش و مستیِ ادا کہیے
نہیں بہار کو فرصت نہ ہو، بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیے

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں، غفلت ہی سہی
عمر ہر چند کہ ہے برق خرام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی
ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں
نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے
نگہِ ناز سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے

غالب کی دقت پسند طبیعت اگر مسائلِ تصوف اور بیانِ غالب میں ہم آہنگی پیدا کر سکتی تھی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ سادگی و پرکاری اور بیخودی و ہشیاری کے کرشمے دکھاتے ہوئے بھی، معنی آفرینی سے باز رہتی۔ ان کی افتادِ طبع ایسی تھی کہ بے تہ پن یا اکھرے پن سے وہ کبھی مطمئن ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ غالب کا

(بقیہ صفحہ ۲۵ پر)

سید نواب افسر
حیدر رانی طاہرہ وکٹوریہ گنج، لکھنؤ

غزل

مشکلوں نے خود فراہم کی ہے آسانی مجھے
پتھروں سے بھی ملا ہے وقت پر پانی مجھے

زندگی کے رہزنوں کو دیکھتا ہوں غور سے
صورتیں لگتی ہیں ان میں جانی پہچانی مجھے

چل رہا ہوں اب غبارِ راہ بن کر ساتھ ساتھ
کارواں نے بخش دی اپنی پریشانی مجھے

تنگیِ ذہن و نظر کا میں کوئی مجرم نہیں
کیوں خجل کرتی ہے میری تنگ دامانی مجھے

شکریہ تیرا مگر بس اے نگاہِ التفات
کچھ گراں پڑ جائے گی آخر یہ ارزانی مجھے

ہر بُنِ مُو آبلہ ہے ہر نفس موجِ شرار
اور کیا دیتی یہ میری شعلہ سامانی مجھے

مجھ پہ رستہ کے چراغوں کا کوئی احساں نہیں
تا بہ منزل لائی ہے خود اپنی تابانی مجھے

دوسروں کے غم میں افسر ہو گیا ہوں یوں شریک
جیسے کم تھی اپنے حصے کی پریشانی مجھے

سید اظہر علی فاروقی
۴۸۰-دریاآباد-الہ آباد

مضامینِ سرسید اور اصلاحِ معاشرت

سرسید احمد خاں نے "تہذیب الاخلاق" میں مضامین لکھ کر ان کا ایک انبار لگا دیا ہے۔ معاشرت، تعلیم، تربیت اطفال، نصاب تعلیم، قدیم درسیات میں تنسیخ اور ترمیم، سائنس اور ریاضی جیسے موضوعات تک پر خود انھوں نے اور ان کے رفقائے کار نے صدہا مضامین قلم بند کیے۔ صرف یہی نہیں ماسٹر رام چندر کے بنائے ہوئے سادہ اسلوب سے الگ مضمون نگاری کے لیے مختلف اسالیب پیدا کیے۔ بیانی، حکائی، تشریحی، تمثیلی اور علامتی۔ آج کی صحبت میں ہم ان کے اس بیش بہا ذخیرے سے صرف ان مضامین کا ایک مختصر سا جائزہ پیش کرکے تبادلہ خیال کرنا چاہتے ہیں جو معاشرت سے وابستہ ہیں۔

صاف ظاہر ہے کہ کسی قوم کی معاشرتی بلندی اور پستی پر خود اس کی بلندی اور پستی کا انحصار ہے۔ ایسی حالت میں معاشرت میں رسوم کی اصلاح کی سخت ضرورت پیش آتی ہے۔ ہماری معاشرت ملبوسات طریقہ اکل طعام، طرز گفتگو، آداب نشست و برخاست سے لے کر شادی بیاہ، عزا داری، باہمی سلوک اور اخلاق وغیرہ پر مشتمل ہے اور سرسید احمد نے اصلاح معاشرت پر معتدبہ مضامین لکھ کر کوشش کی ہے کہ ہم ہندستانیوں اور خصوصیت سے مسلمانوں کی معاشرت اور سماجی زندگی بہتر سے بہتر بن سکے۔

اور اخر انیسویں صدی کا دور ہی اصلاحی دور رہا ہے خواہ اس کا تعلق معاشرتی رسم و رواج سے ہو یا تعلیم و تربیت سے یا دوسرے فرقوں اور دوسرے مذہب والوں سے اختلاط اور ارتباط کا ہو یا درستی مذہبی عقائد اور مذہبی رسموں سے ہو، ہر فرقے کے بہی خواہ رہنما ایسی اصلاح کے درپے رہے ہیں۔ خواہ وہ راجہ رام موہن رائے کی برہمو سماج تحریک ہو یا اس کے مقابلے کی نیو برہمو سماج یا سمواد تبھر ناشک۔ آریا سماج ہو یا ہند و تھیو فائلین تھر ایک سوسائٹی جو بعد میں تھیو سافیکل سوسائٹی بن گئی۔ رام کرشن مشن ہو یا کوئی دوسری سوسائٹی، سبھی اصلاح معاشرت، درستی اخلاق و رسم و رواج ترغیب تعلیم باہمی اختلاط و ارتباط کے لیے کوشاں ہیں۔ سرسید احمد نے اپنی آنکھوں سے وہ وقت دیکھا تھا جو ۱۸۵۷ء کی ناکام تحریک آزادی کے بعد سامنے آیا مسلمانوں کی پست سے پست حالت ان کے سامنے تھی جن کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ سیاسی حالات سے بھی وہ مطمئن نہ تھے اسی دوران علی گڑھ تحریک نمودار ہوئی اور سرسید احمد خاں کے ہمدردانہ اور مخلصانہ جذبات نے انگڑائی لی۔ انھیں مسلمانوں کی پستی اور افلاس کا احساس ہوا اور انھوں نے یہ سمجھا کہ مسلمان جب تک ذہنی طور پر بیدار نہ ہوں گے۔ اس وقت تک ان کی اقتصادی اور معاشرتی پستی دور نہیں ہو سکتی اور ذہنی بیداری کا انحصار اعلا تعلیم اور بہتر تربیت پر ہے اور یہ بات صرف انگریزی تعلیم سے ممکن ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انھیں اس بات کا بھی لحاظ رہا کہ مبادا انگریزی تعلیم مسلمان نوجوانوں کو اسلام سے برگشتہ نہ کر دے اسی لیے انھوں نے انگریزی درسیات کے ساتھ دینیاتی تعلیم اور مذہبی تربیت بھی ضروری قرار دی۔ یہ سب کچھ سہی مگر مسلمانوں میں ایک ایسا طبقہ بھی تھا جو یہ سمجھتا تھا کہ انگریزی تعلیم کفر ہے اور مسلمان اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک وہ سچا مسلمان بن کر انگریزیت کی بنیادیں نیست و نابود نہ کر دے۔ اس طرح یہ جماعت علی گڑھ تحریک کی رقیب بن گئی۔ یہ بات صرف مسلمانوں ہی میں نہیں ہوئی ہندوؤں میں بھی ایسا ہی ہوا۔ برہمو سماج کے مقابلے

میں سمواد تیمر ناشک تحریک نمودار ہوئی۔ جو راجہ رام موہن رائے کے خیالات کو ظلمت اور اندھکار سمجھتے تھے اسی لیے انھوں نے اپنی تنظیم کا نام تمیر (اندھیرا) ناشک (دور کرنے والا) رکھا۔

وقت وہ صاحب ہندستان پوری طرح برطانوی تسلط میں آچکا تھا اور اکثریت انگریزیت پسند بن رہی تھی۔ ہر انگریزی بات پسندیدگی کی نظروں سے دیکھی جاتی تھی۔ اور بنگال میں تو یہ حالت ہوگئی تھی کہ انگریزی تعلیم یافتہ بنگالیوں کی ایک جماعت بن گئی تھی۔ سرکاری عہدوں پر بنگالی سرفراز ہوتے جاتے تھے۔ مسلمان اس معاملے میں بھی دوسرے فرقوں کی بہ نسبت بہت پیچھے رہ گئے تھے۔

ان حالات کے تحت سرسید نے علی گڑھ تحریک کے لائحۂ عمل کی ترسیل کے لیے تہذیب الاخلاق کا اجرا کیا:

" تہذیب الاخلاق کے اجرا کا اہم مقصد یہ رہا ہے کہ مسلمانوں کی حسن معاشرت اور تہذیب کی ترقی ہو۔ اہل یورپ اور امریکہ کے اس اعتراض سے کہ اسلام جدید تمدن کا دشمن ہے یہ براہین قاطع دامن پاک کیا جائے۔ بیہودہ اور مضر رسموں سے نفرت دلائی جائے اور قومی تنزل کے باعث عادات و اخلاق میں جو خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں ان سے بطریق احسن مسلمانوں کو متنبہ کرکے ترقی پر مائل کیا جائے ....."

"مسلمانوں ..... ترقی ہو" کے سلسلے میں انھوں نے حسب ذیل مضامین لکھے:

" (۱) سولزیشن یا تہذیب ..... تہذیب الاخلاق یکم شوال ۱۲۹۱ھ (۲) تہذیب کی تاریخ ..... تہذیب الاخلاق یکم شوال ۱۲۹۱ھ (۳) کن کن چیزوں میں تہذیب چاہیے تہذیب الاخلاق یکم ذی الحجہ ۱۲۸۸ھ (۴) مصر اور اس کی تہذیب ۱۵ ذی الحجہ ۱۲۸۷ھ (۵) ہندوؤں میں ترقی تہذیب (۶) ترقی زراعت (۷) ترقی تجارت (۸) کاہلی (۹) تعصب (۱۰) ہمدردی (۱۱) مسلمانوں کا افلاس (۱۲) نامان خدا پرست اور دانا دنیا دار (۱۳) مہذب قوموں کی پیروی وغیرہ۔

سولزیشن یا تہذیب پر مضمون لکھنے سے پیشتر انھوں نے چند سوالات کیے ہیں مثلاً:

(۱) سولزیشن کیا چیز ہے اور کن کن چیزوں سے علاقہ رکھتی ہے (۲) کیا یہ کوئی بنائی ہوئی چیز ہے یا قدرت نے انسان کی فطرت میں اس کو پیدا کیا ہے (۳) اس کے معنی کیا ہیں؟ (۴) کیا یہ کوئی اصطلاح ہے جس کو لوگوں نے یا فیلسوفوں[1] نے مقرر کیا ہے؟ (۵) ایسی چیز ہے کہ اس کا مفہوم اور جن جن چیزوں سے اس کا تعلق ہے قانون قدرت میں پایا جاتا ہے۔؟

ان سوالات ہی کو مضمون کا خاکہ سمجھنا چاہیے جس کی بنیاد پر مضمون لکھا ہے تخیئل کے جوش میں ان سوالات میں تکرار پیدا ہوگئی ہے مثلاً نمبر۱ اور نمبر۳ ایک ہی ہیں۔ نمبر۲ کا آخری حصہ اور نمبر۴ بھی ایک چیز ہیں نمبر۵ نمبر۲ "یا قدرت ..... پیدا کیا ہے" کے تحت آجاتا ہے۔ بہرحال ان میں نمبر۲ کا آخری حصہ اور نمبر۵ لائق غور ہیں۔ چنانچہ نمبر۱ کے پہلے جزو کا جواب انھوں نے اس طرح دیا ہے:

" انسان میں ایک نظری[2] بات ہے کہ وہ اپنے خیال کے موافق کسی چیز کو پسند کرتا ہے اور کسی کو ناپسند یا یوں کہوں کہ کسی چیز کو اچھا ٹھہراتا[3] ہے اور کسی چیز کو برا اور اس کی طبیعت اس طرف مائل ہے کہ اس بری چیز کو ایسی حالت میں تبدیل کرے جس کو وہ اچھا سمجھتا ہے یہی چیز سولزیشن کی جڑ ہے۔ اسی تبادلے کا نام سولزیشن یا تہذیب ہے اور کچھ شبہ نہیں کہ یہ میلان یا خواہش انسان میں قدرتی اور فطری ہے ......"

اس اقتباس میں صاف ظاہر ہے کہ اگر ہم انفرادی پسند یا ناپسند کو معیار قرار دے لیں تو یہ معیار ایک اضافی مسئلہ بن جاتا ہے اس کا جواب آگے چل کر وہ خود اس طرح دیتے ہیں:

---

۱ فلسفیوں ۲ فطری
۳ ٹھہراتا ہونا چاہیے۔

"جب ایک گروہ انسانوں کا کسی جگہ اکٹھا ہو کر بستا ہے تو اکثر ان کی ضرورتیں، ان کی غذائیں، ان کی پوشاکیں، ان کے خیالات، ان کی معلومات وغیرہ سب یکساں ہوتی ہے اور برائی کو اچھائی میں تبدیل کرنے کی خواہش سب میں ایک سی ہوتی ہے اور یہی مجموعی خواہش تبادلہ اس گروہ کی سولزیشن ہے ...."

سچ پوچھیے تو اس معیار کی اضافیت اب بھی باقی ہے اور یہ معیار اب بھی کسی قوم یا جماعت کا ذاتی مسئلہ ہوا اگرچہ سرسید احمد اس کو تربیت یافتہ اور نا تربیت یافتہ قوموں کے عادات و اطوار اور ان کے میلانات کی چند مثالیں دے کر سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں مثلاً یہ کہ جسم، لباس، مکان، وغیرہ کی آراستگی اور بہم رسانی کی خواہش دونوں میں موجود ہے:

"ایک تربیت یافتہ قوم زر و جواہر، یاقوت و الماس سے نہایت نفیس خوبصورت زیور بناتی ہے۔ نا تربیت یافتہ قوم بھی کوڑیوں اور پوتھوں سے اپنی آرائش کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ تربیت یافتہ سونے چاندی مونگے اور موتیوں کو کام میں لاتی ہے۔ نا تربیت یافتہ جانوروں کے خوب صورت اور رنگین پروں سونیلیوں چھلے ہوئے سنہری پوست اور زمرد کے رنگ کی باریک خوش نما گھانس[1] میں گوندھ کر اپنے تئیں آراستہ کرتی ہے اور عیش و عشرت کی مجلسیں خاطر اور مدارات کے کام اور اخلاق و محبت کی علامتیں دونوں میں پائی جاتی ہیں۔ علمی خیالات سے بھی نا تربیت یافتہ قومیں خالی نہیں بلکہ بعض چیزیں مثلاً شاعری جو تربیت یافتہ قوموں میں پائی جاتی ہے نا تربیت یافتہ قوم میں عجیب عمدگی اور خوبی سے پائی جاتی ہے۔ یہاں خالی باتوں کو ادا کیا جاتا ہے اور وہاں دلی جوشوں اور اندرونی جذبوں کا اظہار ہوتا ہے۔"

آگے چل کر انھوں نے تربیت یافتہ قوموں کی موسیقی اور رقص کا موازنہ نا تربیت یافتہ قوموں کی موسیقی اور رقص سے کیا ہے۔ نا تربیت یافتہ قومیں فن موسیقی کے اصول: جانتی ہوں نال اور سرے ناواقف ہوں پھر بھی ان کی موسیقی میں ایک جوش اور ولولہ ضرور ہوتا ہے، دل کی لہر ان کی لے اور دل کی پھڑک[2] ان کا تال ہے اور ان بیانات سے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں "دلی جذبوں کو روکنا اور ان کو عمدہ حالت میں رکھنا تمام قوموں کے خیالات میں شامل ہے پس جس طرح اس کا تعلق عقلی اور مادی سب چیزوں میں دیکھتے ہیں۔ جس چیز میں برائی سے اچھائی کی طرف رجوع کرنے کی تحریک ہو سکتی ہے اس سے تہذیب بھی متعلق ہے۔ مختصر یہ کہ انسان کے افعال ارادی اور جذبات انسانی کو اعتدال پر رکھنا تہذیب ہے ....."

اس سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ سرسید کے نزدیک جذبات اور خیالات کی یکسانیت اور منظم اعتدال تہذیب ہے اور اسی لیے وہ عوامی جذبات کے اس وصف کے مداح ہیں۔ اپنی شاعری اور عوامی گیتوں، اصول و قواعد کے تحت نہیں کتھک، منی پوری کتھا کلی اور کلاسیکی رقص اور عوامی ناچوں کا موازنہ جس جذبے کے تحت کیا ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں فوک سانگ (لوک گیت) اور فوک ڈانس (لوک ناچ) کا تصور ضرور تھا۔ لیکن اس وقت یہ لفظ رائج نہیں تھے ورنہ وہ ان سے ضرور کام لیتے۔ اس کے بعد انھوں نے مہذب بننے کے ایچ۔ ٹی۔ بکل کے ان چار اصولوں کا ذکر کیا ہے جس سے یہ مضمون ماخوذ ہے۔

دوسرا مضمون تاریخ تہذیب۔ ہنری تھامس بکل بکنسر کے طویل مضمون ہسٹری آف سولزیشن ان انگلینڈ کا آزاد ترجمہ ہے۔

تیسرا مضمون "کن کن چیزوں میں تہذیب چاہیے" بھی انگریزی سے ماخوذ ایک آزاد ترجمہ ہے۔ اس میں انھوں نے نفیس

---

[1] ایک نون زائد ہے۔ روزمرہ بول چال میں ایسا رائج ہے چانول، سینکڑوں وغیرہ [2] انکی مراد یقیناً لوک گیتوں سے ہے کسی مقام کے لوک گیت ملاحظہ فرمایئے آپ کو اندازہ ہو جائے گا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمایئے مسلمانوں کے لوک گیت آج کل جمہوریت نمبر ۱۹۷۶ء، [3] کبھی گدڑیوں اور گھومیوں کے چکر سے ! ہیرولے کے بروے ناخواندہ سنتوں اور درویشوں کی لاونی اور خیال سنیے پھر اندازہ کیجیے۔

عنوانات قائم کیے ہیں اور اس مقام تک پہنچتے پہنچتے ڈسپلن اور ضبط النفس کو تہذیب کا ایک اہم اور غالب عنصر سمجھنے لگتے ہیں۔ ان عنوانات کو دیکھ کر اندازہ ہونے لگتا ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کی معاشرت اور عائلانہ زندگی کا بڑا عمیق مشاہدہ کیا ہے اور ان کے سامنے اصلاح کا ایک بڑا وسیع پروگرام تھا۔ ہم ان عنوانات میں سے صرف چند دے رہے ہیں:

(۱) آزادیِ رائے۔ سرسید احمد شخصی تقلید کے سخت مخالف رہے ہیں۔ چونکہ خود اہلِ حدیث (غیر مقلد) تھے۔ اسی لیے وہ چاہتے تھے آزادانہ طور پر سوچنے اور سمجھنے کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ (۲) تعلیم و تربیت اطفال (۳) عورتوں کی تعلیم (۴) عزت اور غیرت (خودداری) (۵) ضبط اوقات (۶) رسومات شادی (۷) رسومات غمی (۸) درستیِ عقائد (۹) تدقیق بعض مذہبی مسائل (۱۰) درستی خیالات و افعال مذہبی (۱۱) تصحیح بعض مذہبی مسائل (۱۲) طرز گفتگو (۱۳) بحث و تکرار (۱۴) رسم و رواج (۱۵) رسم و رواج کی پابندی سے نقصانات (۱۶) طرز لباس (۱۷) طریق تناول طعام (۱۸) غلامی (۱۹) دوستوں سے راہ و رسم وغیرہ۔

اس میں شک نہیں کہ سرسید احمد خاں خاندانی شرف، اقتصادی، علمی و ادبی، ذہنی، مذہبی، روحانی قوت ارادی ہر حیثیت سے نہ صرف بلند اور عظیم بلکہ عظیم ترین شخصیت رکھتے تھے پھر بھی یہ پروگرام تو ایسا ہے کہ "سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے" کا مصداق ہے اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ انھوں نے تا بمقدور جو کچھ کر سکتے تھے وہ کیا۔

نمبر ۸، ۹، ۱۰، ۱۱ کا تعلق مذہب سے ہے اور اسے معاشرت کے تحت نہ آنا چاہیے تھا ممکن ہے کہ انھوں نے اس کا اندازہ کر لیا ہو کہ عوامی معاشرت کی بنیادیں مذہب پر قائم ہیں اور مذہب ہمارا اوڑھنا بچھونا بن گیا ہے غلط یا صحیح کسی طرح بھی ہو حالانکہ سرسید احمد خاں مذہب کو معاشرت سے علیحدہ رکھنا چاہتے ہیں جیسا کہ انھوں نے کانٹے چھری سے کھانے کے بارے میں اپنے خیالات سے ظاہر کیا ہے۔ اس ضمن میں اگر ایک بات مودبانہ عرض کی جائے تو بیجا نہ ہوگی [illegible] کہ مذہبی مسائل نہ تو طے ہوئے ہیں اور نہ طے ہو سکتے ہیں تاکہ کوشش کی جائے رسم و رواج کی اصلاح بھی اسی حد میں آتی ہے۔ مولانا اسمٰعیل شہید نے کتنی کوشش کی۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے اصلاح الرسوم لکھی۔ وعظ کہے اور آج بھی کوشش کی جا رہی ہے لیکن اب بھی یہ بول سنائی دے جاتے ہیں "آنگن ہو رے آئی جاؤ اللہ میاں؛ ہمیں نہ مٹنا ہمیں نہ مٹیں۔"

اب ذرا طریق تناول طعام پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیے۔ اسے انیسویں صدی کی سماجی زندگی اور آداب معاشرت کا ایک اچھا نمونہ کہا جا سکتا ہے:

"...... اتنا فرق ہے کہ ہندو چوکے میں بیٹھتے ہیں اور مسلمان دسترخوان بچھا کر بیٹھتے ہیں جس طرح ہندو سب طرح کا کھانا ایک ساتھ اپنے آگے رکھ لیتے ہیں اسی طرح مسلمان بھی قابوں، رکابیوں اور غوریوں[1] اور تشتریوں اور پیالوں میں سب طرح کا کھانا اور سب قسم کی روٹی اور ہر طرح کے کباب اور فیرنی کے خوانچے اور بورانی[2] کے پیالے اور اچار اور مربہ کی پیالیاں سلفچیا[3] کے پوچاپے کی طرح سب اپنے آگے رکھ لیتے ہیں اور اس ایک دسترخوان پر کوئی تو فیرنی کلمہ شہادت کی انگلی سے اور کوئی چاروں انگلیوں سے چاٹ رہا ہے۔ کوئی پلاؤ میں اروی کا سالن ملا ملا کر کھا رہا ہے۔ کسی نے سالن ملا ہوا پلاؤ کھا کر نان آبی سے لتھڑا ہوا پنجہ مبارک پونچھ کر روٹی کو سالن میں ڈبو ڈبو کر کھانا شروع کیا ہے کسی نے بورانی کے پیالے کو منہ لگا کر سڑ پا بھرا اور یہ کہہ "واللہ بڑی تیز ہے" اوہ اوہ کرنا شروع کیا۔

تمام جھوٹے برتن اور نیم خوردہ کھانا، بچوڑی ہوئی ہڈیاں

۱؎ کنارے اٹھے ہوئے گہری چھوٹی رکابی کو غوری کہتے ہیں۔ ۲؎ دہی کا رایتا
۳؎ پیچک کی ڈبی

اور روٹی کے ٹکڑے اور سالن کی نکالی ہوئی ہڈیاں اور مکھیاں سب آگے رکھی ہوئی ہیں۔ اس عرصے میں جو شخص پہلے کھانا کھا چکا ہے۔ اس نے ہاتھ دھونا، کھنکار کر گلا صاف کرنا اور بیسن[1] سے دانت رگڑنے اور زبان پر دو انگلیاں رگڑ رگڑ کر زبان صاف کرنا شروع کیا۔ اور ایک بے تکلف بیٹھے کھانا نوش فرماتے ہیں۔ نہ ان متمدنوں کو خیال ہے کہ ہم کھانا کھانے والوں کے قریب کیسی نازیبا حرکتیں کر رہے ہیں اور نہ کھانا کھانے والوں کو کریہ آوازیں سننے اور زرد و زرد و ہلدی کے ملے ہوئے رنگ کا لعاب نکالنے اور بلغم کے لوتھڑے تھوکنے کر چلمچی یا تاش میں تھوک دینے اور تلچھٹ کی طرح اس کے پانی پر تیرنے کی پروا ہے نعوذ باللہ منہا...."

اس میں شک نہیں کہ مضمون 'بیلنہ مضمون' کا ایک بہترین نمونہ ہے جہاں عمیق مشاہدے سے کام لیا گیا ہے ورنہ زبردست کا ٹھینگا سر پر کا مصداق ہے۔ اتنی بلند شخصیت وہ بھی مسلمان اور وہی مسلمانوں کے طریق تناول طعام کے متعلق کتنا بھونڈا اور مضحکہ خیز بیان دے رہا ہے۔ اب آپ دو ایک باتوں پر غور کیجیے (۱) "ان میں سے جو شخص پہلے کھا چکا...... زبان صاف کرنا شروع کیا" ہمارے اودھ میں تو کم از کم ایسا رواج نہیں ہے نہ دعوتوں کی بھیڑ بھاڑ اور نہ گھریلو دسترخوان پر دعوتوں میں اگر کوئی شخص پہلے کھا بھی چکتا ہے تو اٹھنا خلاف تہذیب سمجھا جاتا ہے اور اگر کوئی شخص منہ نہ چلاتے دیکھ کر کہہ بھی دے کہ ہاتھ دھو لیجیے تو بھی وہ صاحب نہیں اٹھتے اور ایک آدھ نوالے لے کر ٹونگنے لگتے ہیں اس طرح سب قریب قریب ایک ساتھ اٹھتے ہیں۔ اودھ کے تعصبات میں تو دس گیارہ سال کے بچوں کو جب وہ بڑوں کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھتے ہیں تو انھیں پہلے نہ اٹھنے کی سخت تنبیہہ کی جاتی ہے۔ مجھے خود اچھی طرح یاد ہے کہ اس عمر کے بعد بھی میں اپنے بڑوں کے ساتھ کھانا کھانے میں تامل کرتا رہا ہوں۔ (۲) "چچوڑی ہوئی ہڈیاں...... مکھیاں سب آگے رکھتی ہیں" اور شاید[2] تو دعوتوں میں ہو سکتا ہے مگر مکھیوں کی بات نہ جانے ان کے دماغ میں کہاں سے آ گئی؟ ایسا تو کبھی کہیں نہیں ہوتا بلکہ اتفاق سے اگر کسی پیالے میں مکھی نکل بھی آئے تو وہ پیالہ واپس کر دیا جاتا ہے۔ اندازہ ایسا ہوتا ہے کہ جذباتیت کی رو میں اور جھنجھلاہٹ سے مغلوب ہو کر مسلمانوں کے طریقۂ تناول کی طرف سے زیادہ گھن پیدا کرنے کے لیے لکھتے چلے گئے۔

اس مقابلے کے بعد وہ مسلمانوں اور انگریزوں کے طریقۂ زندگی کا موازنہ کرتے کرتے کھانے پر اتر آتے ہیں۔ کانٹے، چھری میز اور کرسی کے فقدان کا احساس انھیں کمتر سمجھنے پر مجبور کرتا ہے اور انھیں مسلمانوں کے کھانے کا طریقہ بڑا مکروہ نظر آتا ہے۔ سرسید احمد نہ جانے کس طرح بون پلیٹوں کو بھول گئے۔ ہڈیوں اور اسی قسم کی دوسری چیزیں تو انگریزوں کی میز پر بھی ہوتی ہیں۔ فرق صرف اتنا سا ہے کہ وہاں ہڈیاں پلیٹ میں رکھی جاتی ہیں اور ہم دسترخوان پر ڈال دیتے ہیں۔ اس مضمون کا آخری حصہ اور بھی دلچسپ ہے اور آپ اندازہ کیجیے کہ وہ بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔

"...... یہ بات کہی جاتی ہے کہ ہاتھ سے کھانا مسنون ہے اور اس کو حقیر سمجھنا کفر تک نوبت پہنچا دیتا ہے ہم اس رائے کی صحت و سقم کی بحث سے قطع نظر کر کے اس کو تسلیم کرتے ہیں لیکن اگر مسلمان یہ بھی گوارہ کر لیں کہ مرغن کھانے جس سے ہاتھ اور منہ بھر جاتا ہے ...... اور یہی باعث نفرت اور گھن آنے کا ہوتا ہے چھوڑ دیں اور جو کے بن چھنے آٹے کی روٹی لکڑی یا کھجور سے کھا لیا کریں تو ان بزرگوں کی پوری پیروی ہوگی جس کو اب تک آدھی پیروی بتایا جاتا ہے اس وقت کوئی بھی ہاتھ سے کھانے

---

[1] جب تک صابن کا رواج عام نہیں ہوا تھا اس وقت تک اس کی جگہ بیسن کام میں لایا جاتا تھا۔
[2] کر کر آج سے سو سال پیشتر ماضی معطوفہ میں فعل کی یہ تکرار جائز تھی مگر اب متروک ہے کر کے ہونا چاہیے۔

پر نفرت نہ کرے گا مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ کھانے تو ہو دیں فرعونی اور طریق کھانے کا ہو دے مسنونی[1] ......"

اب اسی سلسلے میں چند سطریں پڑھنے کی اور زحمت فرمائیے اور دیکھیے کہ کانٹے چھری سے کھانے کو کس خوب صورتی سے مستحبات تک پہنچا دیتے ہیں:

"..... اور جب ہم یہ خیال کریں کہ ان شاندار چیزوں کا ہم بنظر تکبر استعمال نہیں کرتے بلکہ بطور ادائے شکر دی النعم استعمال کرتے ہیں اور مسلمان کی قوم کو غیر قوموں کی نگاہ میں جو ذلت ہے اس سے نکالتے ہیں جس سے اسلام کو بھی عزت ہے تو اس وقت چھری کانٹے سے کھانا مندوبات اور مستحبات سے کم نہیں سمجھتے۔"

اس پیراگراف میں سرسید احمد نے اپنی ذہانت اور فراست استدلال کا جو خوب صورت مظاہرہ کیا ہے وہ خود اپنی نظیر ہے اور "التکبّرُ مَعَ المتکبّرِ صدقۃٌ" قسم کی احادیث کا جو سہارا لیا ہے۔ اس سے ان کے مذہبی مطالعے کی وسعت کا اندازہ تو ضرور کیا جا سکتا ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ شریعت کی منطق اس کو قیاس مع الفارق (FALSE ANALOGY) کے مغالطے پر ہی محمول کرے گی۔

سولزیشن اور اس سے متعلق چند باتوں کا ذکر کرنے کے ساتھ سرسید احمد نے اس سلسلے میں مصریوں اور ہندوستانیوں کی تہذیب، مہذب قوموں کی پیروی، 'نامہذب ملک اور نامہذب گورنمنٹ' جیسے مضامین لکھتے تاکہ ہم ہندوستانی مسلمان کچھ سبق حاصل کریں۔ مصر کی تہذیب میں ولیم ہورڈ رسل کی رائے کو سامنے رکھتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ جو گورنمنٹ اپنی رعایا کی ترقی کی خواہاں نہیں ہے وہ گورنمنٹ رعایا کی دشمن ہے۔ اور یہ کہ نیچر کا قانون ہے کہ نامہذب ملک کی گورنمنٹ بھی نامہذب ہی رہتی ہے۔ انھیں اس کا احساس ہے اور اعتراف ہے کہ مسلمانوں کی تہذیبی اور سماجی پستی کا سبب ان کا افلاس ہے ورنہ وہ ذہنی طور پر اتنے پست نہیں ہیں۔

رسم و رواج اور ان کی پابندی کے نقصانات، بحث و تکرار اس سلسلے کے بڑے اچھے مضامین ہیں۔ رسم و رواج میں وہ ان چیزوں کا ذکر کرتے ہیں جو مذہبی نہ ہونے پر مذہب سے وابستہ کر دی گئی ہیں (اور جن کے بارے میں ہم اپنا خیال ظاہر کر چکے ہیں کہ ان کا مٹنا ناممکن سا ہے۔)

بحث و تکرار کی تمہید بڑی دلچسپ ہے جس میں انھوں نے جہلا کی بحث و تکرار کو کتوں کی جھڑپ سے تشبیہہ مفصل دے کر سمجھایا ہے کہ کس طرح بات شروع ہوتی ہے اور کہاں پر ختم ہوتی ہے۔ ایک پیراگراف ملاحظہ فرمائیے کہ بحث و تکرار کس طرح شروع ہوتی ہے اور یہاں تک پہنچتی ہے:

پہلے صاحب سلامت کر کر آپس میں مل بیٹھتے ہیں پھر دھیمی دھیمی بات چیت ہوتی ہے۔ ایک کوئی بات کہتا ہے دوسرا بولتا ہے واہ یوں نہیں یوں ہے۔ وہ کہتا ہے واہ تم کیا جانو۔ ان دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے۔ تیوری چڑھ جاتی ہے۔ رخ بدل جاتا ہے آنکھیں ڈراونی ہو جاتی ہیں باچھیں چر جاتی ہیں۔ دانت نکل پڑتے ہیں[2] تھوک اڑنے لگتا ہے۔ باچھوں تک کف بھر آتے ہیں۔ سانس[3] جلدی جلدی چلتا ہے۔ رگیں تن جاتی ہیں عنیف عنیف آوازیں نکلنے لگتی ہیں۔ آستین چڑھا ہاتھ پھیلا اس کی گردن اس کے ہاتھ میں اور اس کی ڈاڑھی[4] اس کی مٹھی میں۔ لپاڈگی ہونے لگتی ہے۔ کسی نے بیچ بچاؤ کر کر چھوڑا دیا تو غراتے ہوئے ایک ادھر چلا گیا اور دوسرا ادھر اور اگر بیچ بچاؤ نہ ہو سکا تو کمزور نے کپڑے جھاڑتے ہوئے سر سہلاتے اپنی راہ لی۔"

سرسید احمد کے یہ مضامین پڑھنے سے قاری کے ذہن میں یہ خدشہ پیدا ہو جانا بالکل فطری ہے کہ سرسید کی نگاہیں صرف بورژوا طبقے پر جمی رہیں۔ طریق تناول طعام، طرز لباس، درستی

---

[1] مرعونی سے سجع ملانے کے لیے رومی مسنونی لکھ دیا ورنہ مسنون کافی ہے۔

[2] تھوک لکھنؤ اور اطراف لکھنؤ میں مونث بولتے ہیں [3] سانس کی تانیث بہتر ہے۔ [4] داڑھی زیادہ فصیح ہے۔

عقائدِ مذہبی وغیرہ ایسے مضامین ہیں جو اس بات کی شہادت دے رہے ہیں، لیکن جب تاری بحث و تکرار، رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات وغیرہ قسم کے مضامین پڑھتا ہے تو اس کا یہ خدشہ معمولی طور پر دور ہونے لگتا ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ان کی نظر تیسرے درجہ کے لوگوں پر بھی پڑتی رہی خواہ وہ اصلیتی ہو ہی کیوں نہ ہو اور یہ کہ ایسے مضامین کسی مخصوص طبقے کی معاشرت کے پیشِ نظر نہیں لکھے گئے بلکہ عام مسلمانوں کی معاشرت ان کے سامنے رہی لیکن سچ پوچھیے تو ان کی نگاہ میں تعلقداروں، جاگیرداروں اور زمینداروں کو ہی وقعت رہی اور ان ہی کی معاشرتی زندگی کا عمیق مشاہدہ تھا اور یہ صرف اس لیے کہ الناس علیٰ دینِ ملوکھم ان کی دیکھا دیکھی عوام بھی درست ہونے لگیں گے۔ یہ طبقہ عوام کے لیے صحیح معنوں میں "ملوک" کا رتبہ نہ بھی رکھتا ہو پھر بھی یہ کسانوں اور مزدوروں کے لیے "مائی باپ" کی حیثیت تو ضرور رکھتے تھے۔ اس ضمن میں اگر ان کا ایک مضمون "ترقیِ زراعت" پڑھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اس کا احساس تھا کہ ذرائع پیداوار کی افزائش اور ترقی کی بدولت کاشتکاروں کی زندگیوں کے جمود میں حرکت پیدا ہو سکتی ہے۔ اور یہ طبقہ آگے بڑھ سکتا ہے۔

سرسید احمد خاں بخوبی سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کی معاشرت کی بنیاد مذہبی منقولات پر ہے جن میں سے اکثر بے بنیاد ہیں خصوصاً چند مذہبی عقائد اور رسم و رواج کے معاملے میں اور اسی لیے وہ منقولات کو معقولات کی کسوٹی پر پرکھ کر سمجھنا اور سمجھانا چاہتے تھے اور ایسا کچھ تو ان سے پہلے مجتہدین خصوصاً مغربی مجتہدین نے عام طور پر وقتاً فوقتاً کیا ہے لیکن سرسید احمد خود سمجھنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی معاشرت میں ایک انقلاب پیدا کرنا چاہتے تھے اور وہ معاشرت سکھانا چاہتے تھے کہ اس پر اسلام کی چھاپ ہو اور انگریز بھی اس پر انگلی نہ اٹھا سکیں۔ اس ضمن میں ایک بات ضرور تھی آپ خواہ اُسے کمزوری کہہ لیجیے یا روشن خیالی سے تعبیر کر لیجیے کہ انگریزیت ہر جگہ ان کے دامن گیر رہی ہے اور وہ یورپی تمدن اور انگریزوں کی پرشکوہ طاقت سے مرعوب سے نظر آتے ہیں۔ وجہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ حالات کی ناسازگاری اور اپنی بے بسی۔ مذہبی اور معاشرتی اصلاح کے ضمن میں مولانا محمد قاسم نانوتوی اور سوامی دیانند بانیِ آریا سماج کے کارنامے بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ دونوں نئی روشنی اور انگریزوں کی پرشکوہ طاقت سے مرعوب نہ ہوتے ہوئے اپنے اپنے فرقوں کی ترقی کے دل و جان سے خواہاں رہے اور اپنے شاندار ماضی پر بھروسا کرتے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہے۔ اتنی بات ضرور ہے کہ مولانا موصوف کے پیشِ نظر صرف دین رہا اور سوامی جی نے دین اور دنیا دونوں کو ملحوظِ خاطر رکھا اور اسی لیے انگریزی تعلیم کے خلاف کبھی آواز نہیں اٹھائی، بلکہ شاید ہی کوئی ایسا شہر چھوٹا ہو جہاں ڈی۔ اے۔ وی اسکول اور کالج کا افتتاح نہ کرایا ہو۔ سرسید احمد کی کوششیں بہت کچھ سوامی جی سے ملتی ہیں اور اسی لیے یہ دونوں مشن سے زیادہ کامیاب اور مفید ثابت ہوئے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ مضامین آج بھی ہمارے لیے کارآمد ہیں اور ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں؟ اثبات یا نفی میں اس کا جواب ملنے سے پہلے آیئے، ہم اور آپ دونوں اپنے آج کے سماج پر سرسری نظر ڈالیں تو اس کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔ ہم اور آپ سبھی جانتے ہیں کہ ہماری معاشرت کے ضمن میں مذہب کو اہم ترین مقام دیا جاتا ہے اور آج مذہب کا یہ عالم ہے کہ ۸۰ فی صد مسلمان خصوصاً پیشہ ور۔ دستکار۔ محنت کش طبقہ نماز نہیں جانتا۔ بقیہ بیس فی صد میں کم از کم نصف تو ایسے نکل آئیں گے جو "دعائے قنوت" نہیں جانتے۔ ۹۰ فی صد مسلمان ایسے ملیں گے جو نمازِ جنازہ پڑھنا نہیں جانتے مگر سوئم۔ تیجا۔ پھول، چالیسواں سبھی جانتے ہیں اور اس کا کرنا فرائض میں داخل ہے۔ یہ تو ہوئی بات ایک بنیادی فرض کی۔ اب آگے بڑھیے کہ ہمارا مذہب صرف یہ رہ گیا ہو کہ دروازے دروازے چندہ مانگ کر قوالی کرائیں اور جب نمازِ تراویح میں قرآن مجید سنایا جا رہا ہو، اس وقت ہم کسی پکچر ہال میں بیٹھ کر لتا منگیشکر کے سریلے نغموں سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔ مصیبت اور پریشانی سے دوچار ہونے پر "یاعلی

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

قاسم صہبا جمیلی
سکشن آفیسر ڈورنڈا ہائی کورٹ
رانچی (بہار)

پیغمبر انسانیت

مہاتما گاندھی

ذہن انساں کا بھٹکتا رہا تاریکی میں
مدتوں تک یہ گرفتارِ روایات رہا
اس کی پروازِ تخیل رہی پابندِ حدود
ذہن میں جلووں کی پرستارِ حجابات رہا

دفعتاً سینۂ ظلمات سے نکلا سورج
جس کی کرنوں نے طلسماتِ نظر موڑ دیے
جس کی آواز نے حالات کا رُخ موڑ دیا
مرہمِ لطف سے ٹوٹے ہوئے دِل جوڑ دیے

تو نے ہر ذہن کو اے روحِ عظیم گاندھی
سوچنے اور سمجھنے کا نیا ڈھنگ دیا
ظلمتِ شب کو دیا ایک چراغِ منزل
ایک بیتاب شرارہ بہ دلِ سنگ دیا

تو نے دنیا کو پڑھایا وہ اخوت کا سبق
تو نے انسان کو وہ جادۂ حق دکھلایا
گامزن جس پہ ہوا قافلۂ عقل و جنوں
جس سے گمراہ تمدن سوئے منزل آیا

تو نے تاریخِ اخوت کو نیا باب دیا
تو نے افسانۂ "تدبیر" کا عنواں بدلا
یعنی مظلوم کا دل، ظلم کی فطرت بدلی
اور صدیوں کا ستایا ہوا اِنساں بدلا

خم ہی چوکھٹ پہ "اہنسا" کی تشدد کی جبیں
تو نے وہ "نسخۂ اکسیر" دیا دنیا کو
ریگ زاروں میں کھلے جس سے محبت کے گلاب
تو نے وہ "جذبۂ تعمیر" دیا دنیا کو

بزمِ احباب میں چھڑ جاتی ہیں تیری باتیں
جب کبھی تذکرۂ "دار و رسن" آتا ہے
یاد آتی ہے تری ہمت "زنجیر شکن"
یاد جب عہدِ "غلامیٔ وطن" آتا ہے

ہند صہبا کی زباں سے تجھے کرتا ہے سلام
اس کی سوئی ہوئی تقدیر جگانے والے
تجھ کو دیتا ہے دعا چہرۂ "بے داغ" اس کا
رُخِ "تہذیب" کو آئینہ دکھانے والے

عرفان عباسی • (خاکہ)



(مضمون نگار)

جھنجھٹ لکھنوی

جھنجھٹ لکھنوی

مرے کلام پہ ہوتی ہے ختم بزم سخن
کسے کلام کا یارا مرے کلام کے بعد

میانہ قد ۔ گٹھا ہوا توانا جسم ۔ چوڑے ہاڑ ۔ غیر جاذب خد و خال ۔ مونچھ داڑھی سے محروم چہرہ ۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھری سے

عشق میں اتنا جلے ، اتنا جلے ، اتنا جلے
رنگ کالا اور کالا اور کالا ہو گیا

ممکن ہے ایسا ہی ہوا ہو بہرحال کالا رنگ ۔ بڑے دانت ۔ دبی دبی مسکراتی گول آنکھیں ۔ چھوٹی ناک پچکے گال ۔ متوسط پیشانی ۔ سر پہ برائے نام بال ۔ لڑکھڑاتا لہجہ ۔ گلابی شیروانی ۔ کشتی نما ٹوپی اور بڑی مہری کے پائجامے میں ملبوس جس شاعر کو گنگا پرشاد میموریل ہال کے ایک مشاعرے میں حضرت امین سلونوی نے دعوت سخن دی وہ تھے "جھنجھٹ لکھنوی" ۔ زندگی جھنجھٹوں سے تعبیر ہے ۔ نہ جانے کتنے جھنجھٹوں سے پڑ چکا تھا لیکن دنیائے ادب کے اس "جھنجھٹ" سے یہ پہلا سابقہ تھا ۔ ماہ و سال کا تعین تو دشوار ہے لیکن یہ کوئی ۲۰ ۔ ۳۰ سال پہلے کی بات ہو گی ۔ جھنجھٹ اسٹیج پر نمودار ہوئے ۔ رنگ محفل بدلا ۔ متانت و سنجیدگی کی بوجھل فضا میں مسکراہٹ بکھری ۔ قہقہے گونجے اور جھنجھٹ اپنے مخصوص انداز میں مقطع تک پہنچ کر بیٹھے ہی تھے کہ "اور ۔ اور" کی صداؤں سے بھرا پرا ہال گونج گیا ۔ "اور" پڑھا خوب داد ملی ۔ اسکے بعد ان کے ہم رنگ و ہم مذاق چند شعراء نے کلام سنایا ۔ مزاحیہ دور اور اس کے ساتھ ہی بزم مشاعرہ کا اختتام ہو گیا ۔ یہ ہے نقطۂ آغاز ان سے ملاقات اور اس حکایت دلداری کا جس کی یاد آج تڑپا رہی ہے ۔

جھنجھٹ سنہ ۱۹۲۲ء میں ایک متوسط ، تجارت پیشہ گھرانے کے فرد شیخ رونق علی مرحوم کے گھر محلہ احاطہ لال خاں میں پیدا ہوئے ۔ معاشی بد حالی اور خاندانی حالات کی بنا پر وہ تعلیم کے اعلیٰ مدارج نہیں طے کر سکے ۔ گھریلو تعلیم کے بعد سنہ ۱۹۳۶ء میں اردو مڈل تک پہنچے اور سلسلہ تعلیم منقطع ہو گیا ۔ مطالعہ ذاتی سے اپنی علمی استعداد میں اضافہ کی کوشش عمر بھر کرتے رہے اور حصول علم میں ناکامی کا ماتم بھی ۔

ان کے والد چکن کا کاروبار کرتے تھے ۔ اور امین آباد میں سبزی منڈی کے پاس ان کی دکان تھی ۔ جھنجھٹ بھی اسی دکان پر بیٹھتے اور والد کا ہاتھ بٹاتے رہے ۔ ان کی دکان کی چکن کی دو پلی ٹوپیوں کی اس زمانے میں بڑی شہرت تھی ۔ قرب و جوار کے قصباتی رؤسا ان کے مخصوص و مستقل گاہک تھے ۔ چند سال قبل جھنجھٹ نے نعمت اللہ روڈ پر پلاسٹک کی چپلوں کی دکان شروع کی تھی حالانکہ اس چھوٹی سی دکان پر گاہک کم شاعر اور ادیب زیادہ نظر آتے تھے ۔ لیکن آمدنی یا نفع بہرحال ہو جاتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح گذر کر لیتے تھے ۔ اور فطری زندہ دلی

کے سہارے مسکرا مسکرا کر کہتے تھے:

جتنے رنج و غم و آلام ملے دنیا میں
پوٹلی باندھ کے سب دے گئی تقدیر مجھے

جھنجھٹ نے گہوارۂ علم و ادب میں آنکھ کھولی جس کی گلی گلی، کوچے کوچے اور گھر گھر میں شعر و سخن کی محفلیں سجتی تھیں۔ علم و ادب کے تذکرے تھے ذہنی اور فکری تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ شب و روز شعر و ادب کے نغمات گونج رہے تھے۔ اور ہم عصر اساتذۂ سخن آسمان ادب پر چھائے ہوئے تھے وہ زمانہ تھا مولانا صفیؔ۔ عزیزؔ۔ آسیؔ۔ ثاقبؔ۔ آرزوؔ۔ نجوؔد۔ حسرتؔ۔ سراجؔ۔ منظرؔ۔ سالکؔ۔ قدیرؔ و یگانہؔ وغیرہ مستند و قادرالکلام شعراء کا ان میں کا ہر استاد اپنے دم سے ایک ادارہ اور ایک انجمن تھا۔ اس ماحول میں آنکھ کھولنے اور پروان چڑھنے والوں کو شعری وجدان اور ذہنی تربیت حاصل کرنے کے سلسلے میں ان گرانقدر شخصیات کے اثرات و فیوض کافی تھے۔

جھنجھٹ نے چند غزلیں کہنے کے بعد ۱۹۴۲ء کے قریب دنیائے طنز و مزاح میں اس وقت قدم رکھا جب معروف ہزل گو شعرائے لکھنؤ کی ادبی محفلوں پر چھائے ہوئے تھے۔ اور کسی نو آموز نو وارد کے لیے قدم جما لینا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن معلوم ہوتا تھا لیکن جھنجھٹ کی بے پناہ صلاحیتوں نے اسے ممکن بنا دیا وہ شمع محفل تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور ہم عصر شعراء کی صف میں نظر آنے لگے جھنجھٹ نے جتنی جلد مقبولیت و ہر دل عزیزی حاصل کر لی اس کی مثال کم ہی ملے گی۔ انھیں عوامی مقبولیت کے ساتھ ارباب علم و ادب کی قربت و شفقت بھی حاصل تھی وہ صف اول کے لکھنوی شعرا کی صحبتوں کا فیض اٹھاتے تھے۔ انھوں نے اپنے دور کے ہر استاد سے کسی نہ کسی شکل میں استفادہ کیا لیکن باقاعدہ شاگرد عمر انصاری صاحب کے ہوے۔ کلام جھنجھٹ پر مولانا آسی الدنی مرحوم کی اصلاح کا ایک واقعہ یوں سنا ہے۔

"لکھنؤ میں منعقد ہونے والے ایک مشاعرے کا مصرعہ تھا ؎

"اپنی الفت کا عبث حاصل یہی پاتا ہوں میں"

مولانا آسی گذر رہے تھے کہ جھنجھٹ نے جھپٹ کر مؤدبانہ سلام عرض کیا مولانا آسی نے پوچھا۔

- آج کے مشاعرے کے لیے کیا کہا ہے؟ جھنجھٹ نے مصرعہ لگایا تھا ؎

وہ اڑاتے ہیں پتنگ اور ڈور سلجھاتا ہوں میں
اپنی الفت کا عبث حاصل یہی پاتا ہوں میں

مولانا آسی نے چلتے چلتے فرمایا اسے یوں کر دو ؎

وہ اڑاتے ہیں پتنگ اور ڈور سلجھاتا ہوں میں
سارے حریفوں کے لیے خود چرخی بنا جاتا ہوں میں

جھنجھٹ اساتذۂ سخن کو نیازمندانہ و عقیدت مندانہ سلوک ہی سے نہیں حسن کلام سے بھی متاثر کرتے تھے۔ ایک مشاعرے میں جب انھوں نے مخصوص انداز میں یہ اشعار پڑھے ؎

ڈانٹیے گا تو بتا دوں گا کہ کیا کیا ہوں میں
پیارے بڑے تو آپ کا بیٹا ہوں میں
والدہ صاحبہ کے دل کی تمنا ہوں میں
اپنے والد کی دعاؤں کا نتیجا ہوں میں

تو حضرت سراج لکھنوی نے بہت داد دی اور چلتے وقت سینے سے لگا لیا۔ جھنجھٹ نوجوانوں میں بے حد مقبول تھے ایک زمانے میں تو واقعی کچھ ایسا ہی عالم تھا ؎

سنانے جب ہزل اپنی کہیں جھنجھٹ میاں نکلے
سنبھالے سارے شاعر اپنی اپنی پگڑیاں نکلے

اساتذہ موجود ہیں، سنجیدہ شاعری کا دور چل رہا ہے کسی طرف سے وہ غیر جاذب چہرہ اور شخصیت جسے جھنجھٹ کہتے تھے۔ نظر آئی اور ہوا جھنجھٹ۔ مطالبات و نعرے بازی شروع ہو گئی۔ اب نوجوان جھنجھٹ کے علاوہ کسی کو سننا نہیں چاہتے۔ "جھنجھٹ!" "جھنجھٹ" کے شور سے محفل درہم برہم ہو جاتی۔ منتظمین قابو پانے کی کوشش کرتے لیکن وہ چنگاری دب دب کر ابھرتی اور جھنجھٹ اسٹیج پر نظر آتے۔ اکثر دوران مشاعرہ یہ بھی ہوتا کہ ماحول کو پرسکون رکھنے کے لیے سنجیدہ دور میں بھی انھیں پڑھا دیا جاتا۔ جھنجھٹ اس وقت کے مقامی و غیر مقامی بڑے چھوٹے مشاعروں میں کثرت سے شرکت کرتے تھے۔ جن مشاعروں میں وہ نہ ہوتے انھیں کم از کم نوجوان نامکمل اور ناکام سمجھتے تھے۔ جھنجھٹ بحیثیت انسان شریف النفس منکسر المزاج۔ زندہ دل۔ بذلہ سنج پابند وضع۔ اخلاق و مروت کا پیکر حفظ مراتب کے قائل۔ بات کے کھرے

وعدے کے سچے۔ روایات کے برتنے والے۔ مرنجان مرنج اور نیک دل تھے۔ اکثر اتوار کو غریب خانے پر تشریف لاتے کبھی شعر و شاعری کبھی ناقدر شناس زمانے کا شکوہ، کبھی نقد و تبصرہ۔ اور کبھی آپ بیتی جس میں جگ بیتی بھی شامل ہوتی میں کچھ وقت گزارتے تھے۔ اس وضع میں شدید بیماری اور نقاہت کے زمانے میں بھی فرق نہیں آیا۔ اکثر لڑکھڑاتے اور چھڑی کے سہارے تشریف لاکر مجھے شرمندہ اور اپنی قدر و قیمت میں اضافہ کرتے —— سانس کے مریض تھے ہی تقریباً دو سال سے مختلف امراض نے بھی گھیر لیا تھا۔ تندرست و توانا جسم گھل کر ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ سخت بیماری کا حملہ جھیل کر ذرا سنبھلے تھے کہ ۲۴ جولائی ۱۹۷۹ء کی شب دکان پر بیٹھے بیٹھے پیر میں کھجلی محسوس ہوئی، کھجلایا، جلن کی شکایت کی، سوجن بڑھ گئی۔ نیلاہٹ میں اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ بیہوش ہو گئے۔ صبح بلرام پور اسپتال لکھنؤ کے ایمرجنسی وارڈ میں بیہوشی کی حالت میں داخل کیے گئے۔ کون جانتا تھا غم روزگار کی تلخیاں مسکرا مسکرا کر برداشت کرنے والا۔ طنز و مزاح کے پھول برسانے والا۔ خوش حالی و فارغ البالی سے بے نیاز۔ غم دوراں سے نبرد آزما۔ خون جگر سے چمن شعر و ادب کی آبیاری کرنے والا مزاح گو یوں بجھ جائے گا کہ برسوں کڑوی کسیلی دواؤں کے سہارے جینے والا ایک نقطہ کے بغیر علاج و معالجے کا کوئی اثر لیے بغیر سارے جھنجھٹ ختم کر دے گا۔ افسوس! ۲۵ جولائی ۱۹۷۹ء کو رات کے تقریباً ۱۰ بجے دنیائے ادب کا محبوب "جھنجھٹ" ختم ہو گیا۔

ہے نفس کی آمد و شد پر مدار زندگی
دیکھیے بجتا ہے کب تک یہ ستار زندگی

بجنے والے شاعر کا ستار زندگی خاموش ہو گیا حیدر خاکی قبرستان عیش باغ لکھنؤ کو سونپ دیا گیا

جھنجھٹ تو قیامت تک رہیں گے وہ جھنجھٹ اب کبھی نہ ملے گا۔ جس کا ماتم گسار ہوں —— ہائے! ہماری پیاری زبان کے ٹمٹماتے "چراغ بجھتے چلے جا رہے ہیں کیا ہوگا؟"

جھنجھٹ کا مختصر مجموعہ کلام جھنجھٹیات کے نام سے ۱۹۷۸ء میں یو پی اردو اکاڈمی کے مالی تعاون سے شائع ہوا تھا جسے ادبی حلقوں اور ان کے مداحین میں سراہا گیا۔ جھنجھٹ اپنی افتاد طبع ادبی سرگرمیوں اور معاشی مشکلات کی وجہ سے اپنے اکلوتے فرزند کو بھی معقول تعلیم نہ دلا سکے وہ سکریٹریٹ میں ملازم اور نجی طور پر تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہی ان کی یادگار ہیں۔

نمونۂ کلام

گھیرے ہیں ہمیں عشق کے شیطان وغیرہ
للہ سنبھالو ہمیں لو بان وغیرہ
وحشت میں کسی کا نہیں ہوتا کوئی جھنجھٹ
کام آتے ہیں گر کچھ تو گریبان وغیرہ

جناب شیخ کی افسوس زندگی کیا ہے
بچارے یہ بھی نہ سمجھے کہ مے کشی کیا ہے
ارادہ کر دیا مرنے کا بھی ترک
سنا جب سے بہت مہنگا کفن ہے

بچہ عدم سے باپ کو دیتا ہے یہ صدا
للہ ایسے دور میں پیدا نہ کر مجھے

جس کو حسرت ہے کہ لب ہائے کرم تک پہنچے
یا تو بچہ بنے یا ان کی حلیم تک پہنچے

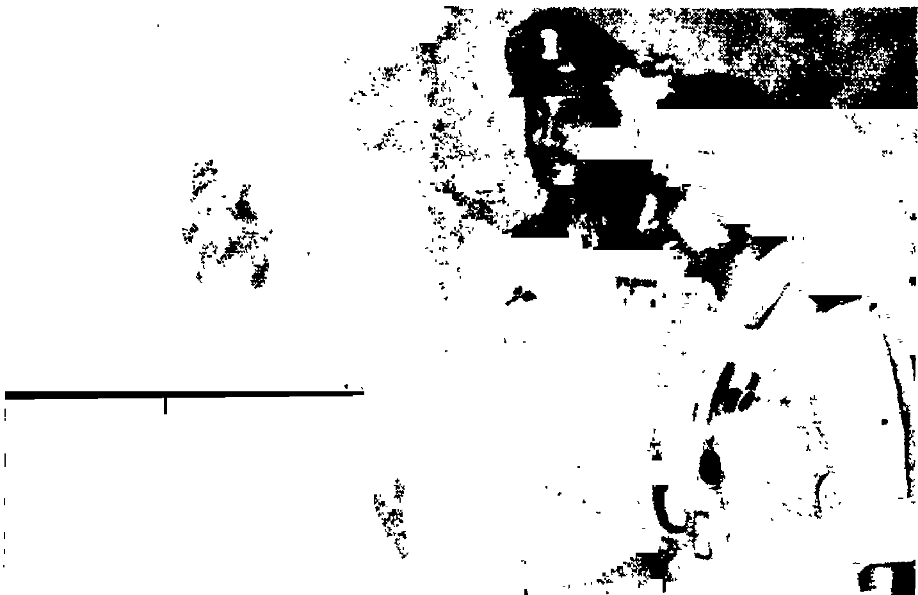
خدا کے واسطے اے شاعر و اب
نہ باندھو جھوٹ کا طومار دیکھو
نہ دیکھو باپ دادا کے چلن کو
زمانے کی نئی رفتار دیکھو

جھنجھٹ پھٹی لنگوٹی پہ بھی کھیلتا ہی پھاگ
سن لے کوئی تو چھین لے یہ بھی غریب سے



گورنر اتر پردیش شری سی. پی. این سنگھ ۲۲ راگست ۱۹۸۰ء کو راج بھون لکھنؤ میں مرکزی
وزیر مملکت شریمتی رام دلاری سنہا سے محو گفتگو ہیں۔

گورنر شری سی. پی. این سنگھ ۱۱ راگست ۱۹۸۰ء کو راج بھون میں بیچھو کی کماری رینو یادو سے جنھوں نے اتر کاشی میں واقع
۲۰۹۵۶ فٹ کی (بندر پونچھ) پہاڑی چوٹی سر کی ہے، معانقہ کرتے ہوئے۔ کماری رینو یادو کو اس سلسلے میں گورنر کا گولڈ میڈل
بھی حاصل ہوا۔



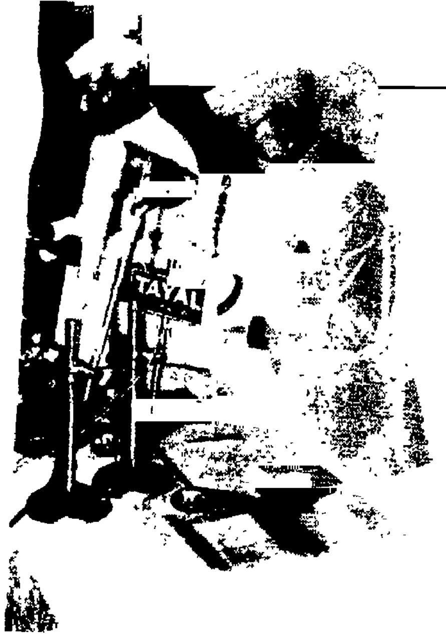


گورنر شری سی۔ پی۔ این سنگھ ۳۱ر
جولائی ۱۹۸۰ء کو راج بھون میں شری
جگدیش چندر دکشت کو عہدۂ وزارت
کا حلف دلا رہے ہیں۔ اس موقع
پر وزیر اعلا اتر پردیش شری وشو ناتھ
پرتاپ سنگھ بھی موجود تھے۔

اتر پردیش کے وزیر صحت ...
ایجوکیشن انفارمیشن افسروں



گورنر شری سی۔ پی۔ این سنگھ ۱۹ ر اگست ۱۹۸۰ء کو راج بھون میں شری چھیالال چودھری کو عہدۂ وزارت کا حلف دلاتے ہوئے۔ تصویر میں وزیر اعلیٰ شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ بھی نظر آ رہے ہیں





۔۱۹۸۰ء کو جواہر بھون لکھنؤ میں ریاست کے سیلتھ کا افتتاح کرتے ہوئے۔







وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ ۲۲ راگست ۱۹۸۰ء کو لکھنؤ میں اپنی رہائش گاہ پر "سینے جیوتی" کا استقبال کرتے ہوئے۔ تصویر میں راجیہ سبھا کے ممبر شری سبلانی بھی نظر آ رہے ہیں

گورنمنٹ پریس (عیش باغ لکھنؤ) میں نوین راجکیہ پریس ورکرس یونین کے زیر اہتمام ۹ر اکتوبر ۱۹۸۰ء کو مزدوروں کی فلاح سے متعلق منعقدہ تقریب میں وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ کو یونین کے سکریٹری شری امبیکا پرشاد معززانہ تیر" پیش کرتے ہوئے۔



شب وصل کی ہم سے باتیں نہ پوچھو
بھگائے گئے ہیں سویرے سویرے

لباسِ عہدِ حاضر نے بڑا دھوکا دیا مجھ کو
زلیخا بی جنھیں سمجھا میں وہ یوسف میاں نکلے

کچھ علاج دل سوچو کچھ جتن کرو یارو
اٹھ رہا ہے دنیا سے عشق کا چلن یارو

کس کشمکشِ زیست کا ہے نام محبت
مرغی بھی بنے جائے گی انڈے بھی نہ دے گی

ہوش کس کو جو مے کدے میں بتائے
کس کے تھوتھن پہ کس کا تھوتھن ہے

جنس کی تبدیلیاں یوں ہی اگر بڑھتی گئیں
ایک دن سالی کو سن لو گے کہ سالا ہو گیا

خاندانی خانداں در خانداں بنتے گئے
ہم فلاں ابن فلاں ابن فلاں بنتے گئے

دیکھو کوئی زبان تمھاری نہ کاٹ لے
جھنجھٹ کا نام لیتی ہو کیوں اتنے پیار سے

یہ انکسار تو دیکھو ہم ایسے لوگوں کا
پھٹی لنگوٹی کو بھی پیرہن سمجھتے ہیں



کلامِ غالب کی معنویت ——(صفحہ ۱۲ کا بقیہ)

ذہنی سفر پیچیدگی سے شروع ہو کر سادگی و پرکاری پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں بڑا اثر تو اس ماحول کا تھا جس میں غالب سانس لینے پر مجبور تھے اور کچھ اثر اس ذہنی تبدیلی کا بھی تھا جس کے نتیجے میں غالب نے فارسی کو چھوڑ کر اردو میں خطوط نویسی اختیار کی اور بقولِ خود مراسلے کو مکالمہ بنا دیا کہ زبانِ قلم سے بیٹھے باتیں کیا کرو اور ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔ خطوط میں مکالموں کی اور شاعری میں سادگی و پرکاری کی روش اس خارجی تبدیلی کی نشاندہی کرتی ہے جو انگریزوں کی آمد کے بعد، ملک کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی میں رونما ہو رہی تھی۔ غالب کے فعال ذہن نے اس خاموش تبدیلی کے اثرات کو جذب کرنے سے پرہیز نہیں کیا مگر سر رشتۂ معنی پر ان کی گرفت پھر بھی مضبوط رہی۔ غالب کا مشہور شعر ہے

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا
نہ سہی، گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

دراصل مخالفین و معترضین پر اتنا جھلاہٹ کا اظہار نہیں ہے جتنا اپنے اشعار کی معنویت اور تہہ داری پر اصرار کا اظہار ہے۔ شمع جلتی ہے جس رنگ میں جلے، غالب غمِ ہستی کے ادراک کی کوشش سے کبھی دل تنگ نہیں ہوتے اور ایک کے بعد ایک فطرت کے اسرار کے پردے اٹھانے سے خود کو باز نہیں رکھ سکتے۔ قطرے میں دریا اور ذرے میں صحرا دیکھ لینا اور دوسروں کو دکھا دینا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں ہے اور یہی غالب کی عظمت کی دلیل ہے۔



اظہار شادانی
۶۲ راجندر مارگ دھار۔ ایم۔ پی

گوتم ثانی

یوں تو دنیا میں ہزاروں رہنما پیدا ہوئے
فلسفی، لیڈر، مبلغ پیشوا پیدا ہوئے
جو بھی کرنا تھا انھیں وہ کام کرکے چل دیے
کچھ رہے گمنام اور کچھ نام کرکے چل دیے
سننے والوں کو ابھی ان کے فسانے یاد ہیں
آج بھی تاریخ کو ان کے زمانے یاد ہیں
اک شخصیت مگر ایسی بھی گزری ہے ضرور
چھا رہا ہے دہر کی تاریکیوں پر جس کا نور
دھرم جس کا آدمیت، کرم فکر بیکراں
واقعی مخدوم تھا وہ خادمِ ہندوستاں
جس نے آزادی دلائی سارے ہندوستان کو
جس کی مظلومی نے روکا ظلم سے انسان کو
ہوگیا سرسبز جس کے دم سے باغِ زندگی
خون سے روشن ہوا اس کے چراغِ زندگی
پیش کر سکتی نہیں تاریخ اب اس کی مثال
نیک فطرت، نیک سیرت، برگزیدہ باکمال
جو ہمارے واسطے لایا پیامِ زندگی
خود نہ بدلا اور بدل ڈالا نظامِ زندگی
فرق دنیا بھر کا اک پل میں مٹا کر چل دیا
محفلِ ہندوستاں کو جگمگا کر چل دیا
بے نیازِ زندگی بے فکرِ عالم ہوگیا
موت کی آغوش میں "باپو ہمارا" سوگیا
سیکڑوں نغمے تڑپتے رہ گئے اس ساز میں
کون جانے کتنی باتیں رہ گئی ہیں راز میں

عبدالصمد
بدھواری بازار۔ سیونی
(ایم۔ پی)

ہندوستاں کا مالی

ہندوستاں کے مالی، اے باوقار گاندھی
آزادیوں کی بخشی تو نے بہار گاندھی

دنیا سے مختلف اک اپنا چمن بنایا
ہر ایک رنگ و بو کے پھولوں سے ہے سجایا
جوڑے ملا کے تو نے سب ایکتا کے دھاگے
آیا ہے تب یہ بھارت دنیا میں سب سے آگے

اے شانتی کے دیوتا اے امن کے پیمبر
جمہوریت کا تحفہ بانٹا ہے تو نے گھر گھر
ہر امتیاز توڑا اونچ اور نیچ کو مٹایا
قوموں کو ایک کرکے سب کو گلے لگایا
اک دوسرے سے مل کر رہنے کا حق دیا ہے
بھارت کو ایکتا کا تو نے سبق دیا ہے

کچھ بات تو ہے جس کو دنیا بھی مانتی ہے
ہر ایک قوم تجھ کو اپنا ہی جانتی ہے
تاریخ دے رہی ہے اس بات کی گواہی
تو نے دلوں پہ کی ہے بے تاج بادشاہی

ایس۔ مسعود سراج
لکچرر، ڈپارٹمنٹ آف پوسٹ گریجویٹ
اسٹڈیز اینڈ ریسرچ ان اردو
جامعہ میسور، میسور

مہدی افادی
اردو کا ایک بے مثل نثر نگار

ایم۔ مہدی حسن افادی الاقتصادی ہمارے ان ادیبوں میں سے تھے جن کے طرز تحریر کی دل کشی اور اسلوب بیان کی رنگینی نے ہمارے بڑے بڑے انشاپردازوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ انھوں نے جو کچھ ادبی سرمایہ اپنی یادگار چھوڑا ہے وہ بہت ہی قلیل ہے۔ یعنی چند متفرق مضامین اور خطوط ہیں جو 'افادات مہدی' اور 'مکاتیب مہدی' کے نام سے شائع ہو چکے اس قلیل سرمایے کے باوجود مہدی کا شمار اردو کے اہم انشاپردازوں میں ہوتا ہے اس کی ایک اہم وجہ ان کے اسلوب بیان کی انفرادیت ہے جس کا اعتراف اردو کے مقتدر ادیبوں نے کیا ہے۔ ان کے انوکھے اور البیلے انداز بیان کے جادو نے سب کو متاثر و مسحور کیا ہے۔ شبلی جیسے انشاپرداز نے بھی ان کے طرز تحریر کی داد دیتے ہوئے رشک کیا تھا کہ کاش شعرالعجم کے مصنف کو ایسے دو فقرے لکھنے نصیب ہوتے "

وہ اپنے ایک خط میں مہدی حسن کو لکھتے ہیں:

"البشیر میں ایک مضمون دیکھا نیچے تمہارے نام کے دستخط تھے حیرت ہوئی کہ یہ وہی مرزا پوری دوست ہیں یا نذیر احمد اور آزاد کی روحوں نے ایک قالب اختیار کیا ہے۔ کئی دن دیکھتا رہا اور احباب کو دکھاتا رہا"

شبلی نے مہدی حسن کے طرز تحریر میں نذیر احمد اور محمد حسین آزاد کی خصوصیات پاتے ہیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو اس میں یونان کے سنگ تراشوں کی سی نزاکت خیال اور مصوری نظر آتی ہے مجنوں گورکھپوری کو ان کی تحریروں میں مختلف مغربی انشاپردازوں کی خوبیاں یکجا نظر آتی ہیں۔ سید سلیمان ندوی نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ

"ان کا قلم باغ و بہار تھا۔ بلا کی شوخ اور شگفتہ طبیعت پائی تھی ایسے خالص خشک فلسفیانہ مضامین میں بھی وہ اپنے طرز بیان سے رنگینی پیدا کر دیتے تھے"

'افادات مہدی' مہدی حسن کے مختلف موضوعات پر تحریر کیے گئے تیس مضامین کا مجموعہ ہے۔ جسے ان کی وفات کے بعد بیگم مہدی نے مرتب کرکے شائع کیا تھا۔ بعض مضامین مختصر ہیں بعض طویل۔ انھوں نے کہیں تاریخ پر قلم اٹھایا ہے کہیں حسن و عشق کے موضوع پر کہیں ہم عصر ادیبوں کی تحریروں پر بھی اظہار خیال کیا ہے اور مختلف رسائل اور اداروں کی کارکردگی پر بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ ہر مضمون کا عنوان جاذب نظر ہے۔ ان تمام مضامین کی ایک مشترک خوبی ان کا انوکھا دلنشیں اور شگفتہ اسلوب بیان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی یہ مضامین پسندیدگی کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں

مہدی حسن نے اردو، فارسی اور عربی کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ قدیم و جدید انگریزی ادب پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ ان کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ وہ ادب کے جدید رجحانات اور تحریکوں سے بہ خوبی واقف تھے۔ انھوں نے ایک غیر ادبی

ماحول میں رہ کر بھی ادب کی خاطر جو ریاضت کی ہے وہ معمولی چیز نہیں ہے۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ ملازمت کی نذر ہو گیا۔ اس کے باوجود انھوں نے ادب کی دنیا میں ایسے چراغ روشن کیے ہیں جن کی ضیا مدتوں تک رہ نوردانِ ادب کی رہنمائی کرتی رہیگی اور ان کو زمانے کی تند و تیز ہوا کبھی بجھا نہ سکے گی ان کی جودت طبع کو دیکھ کر اکثر یہ خیال آتا ہے کہ اگر ان کی عمر کچھ اور وفا کرتی تو مہدی حسن یقیناً تحقیق و تنقید کے میدان میں بھی گراں بہا سرمایہ چھوڑ جاتے۔

وہ دید و دریافت، ذوق شعور و جستجو کی لطافتوں سے بہرہ مند تھے۔ ان کے معیار ذوق میں لطافت اور پاکیزگی، افکار میں رنگینی اور بے باکی پائی جاتی ہے۔ اس معاملے میں وہ یونانی فنکاروں، فن پاروں اور انگریزی کے بہت سے ادیبوں کے رہین منت ہیں جن کا انھوں نے اپنے مضامین اور خطوط میں جگہ جگہ ذکر کیا ہے۔

مہدی حسن اعلا درجے کی قوت اختراع کے مالک تھے۔ وہ نئی ترکیبیں بھرپور ادبی انداز میں ڈھالتے ہیں۔ ان کی نگاہیں ہمیشہ اشیا کی لطافتٗ رستی ہیں۔ اپنے خیالات کو بڑے دل کش اور عمدہ پیرایے میں منتقل کرتے ہیں۔ ان کے انداز بیان میں لطافت نفاست، شوخی، پختگی اور بانکپن پایا جاتا ہے۔ انھوں نے حسن و عشق کے موضوع پر چار مضامین لکھے ہیں خواب طفلی اور آرزوے شباب، فلسفہ حسن و عشق (یونانیوں کے نقطۂ نظر سے) نقاد پر غیر ستائشی جنبش لب اور رہبتِ غم ——— یہ مضامین انھیں ان ادیبوں کی صف میں لے جاتے ہیں جو جمالیات کو قدر اعلا مانتے ہیں اور عورت کے حسن کو فطرت کا شاہکار سمجھ کر اس کی پرستش کو زندگی کی بڑی لذت سمجھتے ہیں۔ مہدی حسن جوز اوصنی کے شیدائی ہیں۔ ان کی زندگی کا مقصد یہی ہے کہ اسے جس قدر پُرمسرت بنایا جا سکتا ہے بنایا جائے۔ وہ ادھار پر نقد کو ترجیح دیتے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"بعضوں کا خیال ہے کہ جنت میں حوریں ملیں گی لیکن جن کو ملیں گی ان ہی کو مبارک! میں ادھار پر نقد کو ترجیح دیتا ہوں اور ڈنکے کی چوٹ پر "خیام" کا ہم خیال ہوں۔ مجھو نپڑوں میں محلوں کا خواب دیکھنا نہیں چاہتا، کسی سبزہ زار یا بہتے ہوئے چشمے کے کنارے عذرا کی مخمور آنکھیں اور ایک جام شراب میری اصلی غایت زندگی ہے جس کے سوا دنیا سے کچھ نہیں چاہتا۔"

مہدی حسن نے عورت کے کردار اور نفسیات کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ اس کی فطرت کا ذکر بڑے دل نشیں انداز میں کرتے ہیں۔ وہ حسن کے مادی تصور کے قائل ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی لذت پسندی شوخی کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ عورت کی فطرت یہ ہے کہ وہ اپنے چاہنے والے پر جان دیتی ہے۔ وہ چاہنے والے کے بغیر خوش نہیں رہ سکتی اس سلسلے میں وہ رقمطراز ہیں۔

عورت کتنی ہی پاکیزہ وش ہو؟ اس خیال سے خالی نہیں ہوتی کہ کوئی اس کی کافرادائی کا شیدائی ہو۔ اس کی فتوحات اس کا سرمایۂ نشاط ہیں۔ جن سے اس کے دل کو راحت ملتی ہے۔ اور جن سے وہ جیتے جی کبھی دست بردار نہیں ہو سکتی .... محرم کا جائزہ نظری ایک طرح کی داد حسن ہے جو ہزار پارسائی کے ساتھ وہ آپ سے لے کر رہے گی![2]

ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجیے:-

سچ کہیے عذرا واقعی بہت حسین ہے؟ حسین تو ایک معمولی اور سرسری لفظ ہے عورتیں سبھی اپنی اپنی جگہ پر حسین ہوتی ہیں۔ لیکن میں اپنے تخیل میں اوروں سے اس قدر مختلف ہوں کہ صرف گوشت پوست سے کام نہیں چلتا۔ عذرا میری عذرا تو نظم زندگی یعنی پوری شاعری ہے اس کی آواز کامل موسیقی اس کا تبسم میرا عنصر حیات ہے وہ قطعاً توبہ شکن ہے۔ توبہ شکن اور کافر ایمان، ناممکن ہے کہ نظر پڑتے ہی اس پر قابو حاصل کرنے کو جی نہ چاہے جہاں آنکھیں ملیں بس یہ معلوم ہوتا ہے تمام جسم میں بجلی دوڑ گئی۔ مدت ہوئی جب میں پہلی نظر میں شہید ہوا۔ دل سے آواز آئی "خدایا خیر"۔ جس کا نتیجہ آج تک بھگت رہا ہوں مجھ پر اتنا سخت وار کبھی نہیں ہوا کچھ تو ہے جس کی وجہ سے مٹا ہوا ہوں میری آنکھوں سے دیکھنے کی ضرورت ہے لیکن خود مجھے معلوم نہیں کس ادائے خاص کا دلدادہ ہوں"[3]

مہدی حسن کی تحریروں میں بار بار جنس لطیف کا ذکر آیا ہے مختلف

موضوعات پر دراسے زنی کرتے ہوئے بعض اوقات وہ ایسے فقرے لکھ جاتے ہیں کہ زبان چٹخارے لینے لگتی ہے پڑھنے والا انشا کی لطافت میں محو ہو جاتا ہے۔ کوئی بھی موضوع ہو ان کی تحریروں میں صنف نازک کا ذکر کسی نہ کسی صورت سے آ ہی جاتا ہے۔ جہاں کسی کی خوب صورتی کا ذکر آیا وہ عورت کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ مہدی کہنا چاہتے ہیں کہ کتابیں مستعار لے کر نہ پڑھی جائیں بلکہ خرید کر پڑھی جائیں وہ کتاب کو دوشیزۂ کاغذی قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"نفاست چاہتی ہے دوشیزہ' کاغذی غیر کی مس کردہ نہ ہو
جیسے نئی' نویلی ہو۔"

شبلی کی تصنیف سوانح مولانا روم شائع ہو کر آئی' تو دیکھئے اس کا استقبال کس خوش سلیقگی سے کرتے ہیں۔

"فاضل پروفیسر کی تالیف جدید یعنی مولانا روم کی لائف
جس کے لیے مدت سے آنکھیں فرش راہ تھیں گھونگھٹ سے
باہر آئی' اس طرح کہ عروس جمیل و لباس حریر پہنے"

مہدی نے کتابوں کو علمی حرم اور پسندیدہ کتابوں کو منظور نظر جرمنٹ کہا ہے۔

مہدی حسن سرسید، نذیر احمد، حالی اور شبلی سے متاثر تھے۔ ان تمام مشاہیر سے انھیں بڑی عقیدت تھی اپنے مضامین میں انھوں نے ان کے ادبی کارناموں کی اہمیت پر بڑا زور دیا ہے۔ ان کی خدمات کا اعتراف بڑی فراخ دلی سے کیا ہے اپنے دور کے اہل علم سے ان کا خط و کتابت کا سلسلہ تھا شبلی کے بہت دلدادہ تھے۔ ان کی تصانیف پر کسی قسم کا اعتراض گوارا نہ کرتے تھے۔ چنانچہ جب اسلم جیراج پوری نے شعرالعجم پر اعتراضات کیے تو مہدی نے ان کا سخت جواب دیا۔ وہ شبلی کو جامع الحیثیات مصنف قرار دیتے ہیں۔ کہیں خاتم المصنفین کہتے ہیں اور کہیں انھیں تاریخ کا معلم اول ٹھہراتے ہیں۔ کہیں ان کی کتابوں کو غیر فانی بتاتے ہیں شبلی پر ان کے مضامین "تاریخ کا معلم اول" "آدھ گھنٹہ علامہ شبلی کے ساتھ" بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے مضامین میں "اردو نثر کے عناصر خمسہ" "حالی اور شبلی کی معاصرانہ چشمک"، "نذیر احمد" اور "انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" کے مطالعہ سے ان کی وسیع معلومات کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں ان کی انشا پردازی اور نکتہ سنجی کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔

مہدی حسن نہ مشرقیت کے پجاری ہیں نہ مغربیت کی کورانہ تقلید کرتے ہیں۔ بلکہ ان کے یہاں دونوں کا احترام ملتا ہے۔ دونوں کی اچھی روایتوں کو انھوں نے اپنا لیا تھا۔ انھوں نے بیشتر انگریزی اصطلاحات کا ترجمہ بڑی خوش اسلوبی سے کیا اور دوسروں کو بھی اس کام کی ترغیب دی۔ بعض انگریزی اصطلاحات کے جواب دو جو ترادفات انھوں نے وضع کیے ہیں وہ بلاشبہہ اردو میں حسین اضافہ ہیں۔ مثلاً APOLOGY کے لیے معذرت CRITIC کے لیے اہل تنقید ETIQUETTE کے لیے قوائد رسمیہ DOCTORS OF LITERATURE کے لیے حکمائے' ادب وغیرہ انھوں نے البیان کے ایڈیٹر کو رائے دی تھی کہ البیان کے دو ایک کالم اصطلاحات جدیدہ کے لیے وقف کر دیے جائیں۔ مہدی انگریزی ادب سے استفادہ کرنے کے لیے ایسے افراد پر زور دیتے ہیں جو مشرقی زبانوں کے مزاج سے بھی واقف ہوں اور مغربی زبانوں پر بھی عبور رکھتے ہوں انھوں نے کبھی نری انگریزی دانی کو پسند نہیں کیا۔ اپنے ایک مضمون میں وہ لکھتے ہیں کہ "نری انگریزی دانی کسی درجہ کی ہو قوم و ملک کے لیے جہاں تک دماغی مشاغل کا تعلق ہے بیکار سی چیز ہے"۔ انگریزی اصطلاحات اور مضامین کے ترجموں کی طرف مہدی کا جھکاؤ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اردو کے دامن کو وسیع اور زیادہ سے زیادہ مالا مال کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنے مختلف مضامین میں اردو کے فروغ کے لیے متعدد تجاویز پیش کیں۔ انھوں نے مغربی ادب سے استفادہ کرنے پر زور دیا لیکن مشرقی زبان و ادب کو نظر انداز نہ کرنے کی بھی تلقین کی اردو زبان و ادب کی ترقی اور ترویج و اشاعت کے سلسلے میں مہدی نے اپنے عہد کے مشہور مستشرق پروفیسر براؤن سے مشورہ کیا اور ان کے خیالات کی روشنی میں ایڈیٹر معارف کو رائے دی تھی کہ اردو زبان کی ترقی کے لیے حسب ذیل کتابوں کی اشاعت عمل میں لائی جائے۔

۱۔ جامع اللغات اردو ۲۔ محاورات ۳۔ لغات الاصطلاحات
(۴) لغات فارسی ۔ جہاں تک اردو کی تکمیل کا تعلق ہو
(۵) لغات عربی ۔ بہ ترتیب جدید
(۶) ادب الاساتذہ ۔ ۱۲ ضخیم جلدوں میں
(۷) جامع القواعد اردو
(۸) عقلیات ۔ یعنی فلسفہ اور سائنس کی ہر شاخ پر ایک مستقل کتاب ۔
(۹) اردو انسائیکلوپیڈیا جو ضابطہ علوم عصریہ ہوگی

انھیں اس بات کا افسوس رہا کہ اجتماعی طور پر کہیں تصنیف و تالیف کا کام نہ ہو سکا ۔ انھوں نے جو توقعات اپنے ہم عصر ادیبوں سے وابستہ کی تھیں وہ پوری نہ ہوئیں ۔ علی گڑھ والوں سے انھیں اس بات کی شکایت تھی کہ وہاں کوئی دار التالیف قائم نہ ہو سکا ۔ ریاست حیدرآباد سے بھی یہی شکوہ تھا کہ وہاں بھی اردو کی ترقی اور ترویج و اشاعت کے سلسلے میں کوئی قابل قدر کام نہ ہوا کہ وہ چاہتے تھے کہ حیدرآباد جیسی ریاست اس کام کو انجام دے ۔ وہ سید علی، آزاد، حالی، شبلی اور نذیر احمد کو علمی اور ادبی خدمات کے لیے وقف دیکھنے کے آرزومند تھے ۔ اپنے اس خیال کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

"سب تو سب حیدرآباد سی شائستہ ریاست کو یہ خیال نہ آیا کہ سید علی، آزاد، نذیر احمد اور حالی و شبلی کو جن میں آزاد کے سوا سب اس کے خوانِ نعمت کے خوشہ چیں تھے ۔ صرف تصنیف و تالیف کے لیے وقف کر دیا جاسے، یہ لوگ معقول وظیفوں پر ایک جگہ رکھے جاتے اور یہ طے کیا جاتا کہ لٹریچر کی فطری ضروریات کے لحاظ سے کون کون کام ترتیباً زیادہ اہم ہیں اور ان پر عالمانہ کتابیں لکھوائی جاتیں، سید علی سا ہمہ داں جہاں موجود ہو وہاں اکبری نورتن، کی طرح پنجتن آصفی، کا عالم وجود میں نہ آنا ایک ایسی بدنصیبی ہے جس کی تلافی اب کبھی نہیں ہو سکتی سلسلۂ آصفیہ اگر برائے نام نہ ہوتا اور فرمانروائے وقت کو کچھ بھی دلچسپی ہوتی تو دنیا دیکھ لیتی کہ عہد عباسیہ جہاں تک ادبی فتوحات کا تعلق ہے نئے سر سے واپس آگیا ہوتا" [۳۱]

مہدی حسن کے مضامین میں جمالیاتی اور تاثراتی رجحان کے اثرات نمایاں ہیں ۔ وہ ان تاثرات کو اپنے دلنواز اسلوب کے ذریعے پیش کر دینا کافی سمجھتے ہیں جو کسی فنکار یا فن پارے نے ان کے ذہن و دل پر مرتب کیے ہوں ان کا انداز نقد تجزیاتی کم تاثراتی زیادہ ہوتا ہے ۔ وہ تقریباً ہر ادیب کی تعریف ایسی شدت کے ساتھ کرتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مہدی اس سے بڑا ادیب کسی اور کو نہیں مانتے وہ ہر ادیب کی تعریف میں ایک ہی طرح کے جملے لکھ جاتے ہیں مثلاً نذیر احمد کی انشاپردازی کی داد اس طرح دیتے ہیں ۔

"یہ شخص جہاں تک مادہ کا تعلق ہے اس بلا کا انشاپرداز ہے کہ اس کو کارلائل اور میکالے نہیں بلکہ جانسن کے پہلو میں جگہ ملنی چاہیے" [۳۲]

شبلی کے بارے میں یوں لکھتے ہیں ۔

"۔ آج کل کے مصنفین میں علامہ شبلی کو ایک خاص امتیاز و فوقیت حاصل ہے جو ان کے اور معصروں کے حصے میں نہیں آیا ۔ ان کے سخت سے سخت حریف مقابل بھی ان کی تحقیقات کی گرد کو نہیں پہنچے بعضوں نے موضوع سخن ایسا اختیار کیا ہے کہ اگر زمانہ کی رفتار یہی رہی تو زیادہ جیتے معلوم نہیں ہوتے ۔ نذیر احمد اپنی لائق رشک عربیت کے ساتھ بھی کچھ یوں ہی سے رہے ۔ یا دشش بخیر ! حالی نے مسدس کے ساتھ مقدمہ شعر و شاعری اور حیات جاوید لکھ کر اپنا ٹھکانہ کر لیا، لیکن شبلی قطعاً غیر فانی ہیں [۳۳] "

اور آزاد کے اسلوب نگارش کی تعریف کرنے پر آتے ہیں تو سب کو فراموش کر کے یوں لکھتے ہیں

"سرسید سے معقولات الگ کر لیجیے تو کچھ نہیں رہتے، نذیر احمد سے مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے ۔ شبلی سے تاریخ لے لیجیے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے ۔ حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں ۔ لیکن آقائے اردو یعنی پروفیسر آزاد صرف انشاپرداز ہیں جن کو کسی اور

(بقیہ صفحہ ۳۶ پر)

سردار احمد علی بیگ، سیڑھی والا گھر
کٹرہ شہاب خان۔ اٹاوہ (یو۔ پی۔)

گاندھی جی کی یاد میں

اب آرزو کی شمعوں میں باقی نہیں وہ بات
تو کیا گیا کہ لٹ گیا سرمایۂ حیات
پل پل ہے زندگی کا اجیرن ترے بغیر
ہر ہر قدم پہ پھیلی ہوئی ہے اندھیری رات

تیرے خلوص تیری محبت کی چاندنی
تاریکیِ حیات میں رخشاں ہے آج بھی
تیری نگاہ شام وہ صبحِ سخن ترا
یادوں کی بزم دل کی بڑھاتی ہے بے کلی

دل کی طرح اداس ہے راہِ وفا تمام
احساں شناس نظروں نے جھک کر کیا سلام
صد خار و گل کو باعثِ الطافِ زندگی
تیری شرابِ حسنِ عنایت کا ایک جام

نورِ چراغ صبر کی تنویر تجھ میں تھی
اک پیکرِ خلوص کی تصویر تجھ میں تھی
تھی آرزو کی شمعوں سے روشن تری حیات
عزم و عمل کے خواب کی تعبیر تجھ میں تھی

خونِ دل و جگر سے ہے یہ رونقِ حیات
ہے حسنِ دوست ہی کا تو پرتوِ غمِ حیات
سردار پر یہ راز ہوا تجھ سے منکشف
ہے انگبیں، عمل سے ہی ہر اک سمِ حیات

خلیق الزماں سحر
دلسا گرواڑہ سیونی۔ (ایم۔ پی۔)

قطعات

بے آب تو گلشن میں کلی کھل نہیں سکتی
دنیا میں مثال اس کی کہیں مل نہیں سکتی
سچائی پہ جس ملک کی بنیاد رکھی ہو
اس ملک کی بنیاد کبھی ہل نہیں سکتی

مطلوب ہمیں جنگ طرفدار سے نہیں
اظہار سے کد ہے لبِ اظہار سے نہیں
باپو کا یہ پیغام رہے ہم کو سدا یاد
نفرت ہو گناہوں سے گنہگار سے نہیں

رنگ اظہار سے تاثیر کے پہلو نکلے
خط کوئی کھینچا تو تحریر کے پہلو نکلے
اس کے اندازِ تکلم کو سحر کیا کہیے
جس کی خاموشی سے تقریر کے پہلو نکلے

کوثر چاندپوری
ہمدرد ریسرچ کلینک اینڈ نرسنگ ہوم
آصف علی روڈ نئی دہلی ۲

جرم اجیب

دندیا چل کے کوہستانی سلسلہ میں شکار کھیلنے کا پہلا ہی موقعہ تھا ہر طرف اونچے نیچے سرسبز پہاڑ تھے بیچ میں پتھریلا چٹیل میدان تھا جس کو وہاں کی زبان میں پٹھار کہا جاتا ہے اس میں جگہ جگہ سیتا پھلوں کے درخت تھے کھیر کے پیڑوں کی چھال سے کتھا بنایا جاتا ہے کردندن کی ان گنت گھنی جھاڑیاں تھیں ان کے پھولوں سے مخمور کر دینے والی مہک پھوٹ رہی تھی میدان میں پتھروں کے گول روڑے بکھرے ہوئے تھے جیپ ان روڑوں پر دھیمی رفتار سے دوڑ رہی تھی ایک جگہ بہت بڑا گھر دکھائی دیا جو کانٹوں کی باڑھ سے گھرا ہوا تھا اندر گھاس کے چھپر لکڑی کے ستونوں پر ٹکے ہوئے تھے ان کے نیچے گایوں کے بچے چل پھر رہے تھے ایک طرف کچھ جھونپڑے بنے ہوئے تھے ان میں انسانی آبادی کے نشانات تھے آٹا پیسنے کی چکیاں رکھی ہوئی تھیں مگر کوئی آدمی اس وقت موجود نہیں تھا ذرا آگے چلنے پر گایوں کا بہت بڑا ریوڑ ملا جو پتھریلی زمین پر چر رہا تھا گائیں بہت چونکال تھیں ذرا سی آہٹ پر ہرنوں کی طرح چونک کر کان کھڑے کر لیا کرتی تھیں اس کی رکھوالی ایک دراز قامت چھریرے اور سڈول بدن کی دوشیزہ کر رہی تھی جس کے ہاتھ میں لمبا ڈنڈا تھا پیروں میں بغیر ایڑی کے گنوار جوتے تھے بال ہلکے سنہری تھے مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کی کرنوں سے سونے کے تاروں کی طرح چمک رہے تھے اور شانوں پر بکھرے گندمی رنگ کے رخساروں پر بہت بھلے لگ رہے تھے جیپ اس کے قریب سے گزرنے لگی تو اس نے مڑ کے دیکھا حیران سی ہوئی منھ سے سیٹی کی آواز نکلی جس کو سنتے گائیں ڈیر کھڑی کر کے تیزی سے بھاگنے لگیں۔ دوشیزہ نے دوسری سیٹی بجا دی گایوں کا ریوڑ فوراً کھڑا ہو گیا غالباً آدمیوں کا گذر ادھر کم ہی ہوتا تھا میں نے جیپ روک لی اور پوچھا کہاں رہتی ہو

یہیں۔

اس جنگل بیابان میں۔

ہمارے لیے یہ جنگل ہی سب کچھ ہے۔

کیا نام ہے۔

رسولن۔

کوئی رسول بھی ہوگا۔

نہیں بس عنایت ہے دوسرے ڈیرے میں رہتا ہے۔

دھندا کیا ہے۔

گائیں پالنے انھیں چرانے دودھ دوہنے دہی جمانے اور اس سے مکھن نکالنے کا بہت اچھے کام کرتی ہو۔

ہاں بہت اچھے۔

شیر اور ہاتھی بھی ہوں گے ان پہاڑوں میں؟

بہت ہیں جب دادوں لگتا ہے تو شیر تھکا سے مار ڈالتا ہے عنایت نہ ہو تو روز ہی دو چار گائیں چٹ کر جایا کرے مگر عنایت کے ڈر سے شیر کی ہمت ادھر آنے کی نہیں ہوتی وہ بال باندھی گولی چلاتا ہے۔

تمھارا کون ہے وہ

پڑوسی اس کا گھر یہاں سے دور نہیں ہے دن میں دو چار چکر لگا جاتا ہے۔ رسولن دیہاتی لب و لہجہ میں بول رہی تھی ایسا لگ رہا تھا جیسے مہوے کے پیڑ سے پکے ہوئے پھل ٹپک رہے ہوں اور ہوا میں ہلکا سا نشہ گھلتا جا رہا ہو۔

تمہارا جیون بہت انوکھا ہے رسولن تم کہو تو تمہاری جنگلی زندگی پر کہانی لکھ دوں۔

کیا لکھوگے اس میں؟

جو تم کہوگی۔

میں کیا کہوں گی یہاں کوئی پری نہیں رہتی

ضرور رہتی ہے کہانی میں اس کا نام بھی لکھوں گا۔

رسولن کی گائیں بہت سدھی ہوئی ہیں اس کی سیٹیوں کا مطلب خوب سمجھتی تھیں وہ مجھے ان کے بھاگنے اور فوراً لوٹ آنے کا تماشہ دکھاتی رہی جب سیٹی بجاتی تو ایک دم دو ڈھائی سو گائیں دُمیں کھڑی کر کے اس زور سے دوڑتیں جیسے ہوا کا جھونکا چل پڑا ہو اور دوسری سیٹی پر سارا ریوڑ اسی پل رک جاتا۔

تمہیں یہاں ڈر نہیں لگتا؟

بالکل نہیں۔ یہاں شیر بھی ڈھارتے ہیں، کبھی ہاتھیوں کے چنگھاڑنے کی آوازیں آنے لگتی ہیں ڈاکو بھی آ نکلتے ہیں ان ساری بلاؤں سے گائیں ہی جان بچاتی ہیں میرے چاروں طرف گھیرا باندھ کر کھڑی ہو جاتی ہیں زور زور سے ڈکراتی ہیں ڈاکو دو چار گائیں ہانک لے جاتے ہیں شیر کے منہ ان کا خون لگ جاتا ہے، تو وہ کسی گائے کو اکیلا پاکر اٹھا لے جاتا ہے کبھی آس پاس بچے دے لیتی ہے تو اسے بھی گائیوں سے بیر ہو جاتا ہے

معلوم ہوتا ہے عنایت بہت اچھا شکاری ہے تم کہتی ہو اس کا نشانہ کبھی نہیں چوکتا۔

ہاں، ہرنوں، نیلوں یا سامروں کی ڈار ادھر آ نکلتی ہے تو دو چار گرا ہی لیتا ہے ان کا ماس بیچ کر خوب پیسے کماتا ہے اور میرا جھونپڑا سوکھڑے سے بھر جاتا ہے۔

وہ کیا ہوتا ہے؟

تم نہیں جانتے بابو میں سوکھا گوشت بھس میں دبا دیتی ہوں اس طرح وہ سڑتا نہیں، جب جی چاہے نکال لیتی ہوں بڑے مزے کا ہوتا ہے۔

کیسی عمر ہوگی عنایت کی۔

تمہارے برابر کی ہوگی، بالکل جوان پٹھا ہے، بندوق جس کو دھاگا کہتا ہے کندھے پر رکھ کر کوس دو کوس دوڑ جاتا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے اس کا دھاگا [illegible] جھولے میں بارود کی کپّی ٹاٹوں کی ڈبیہ اور سیسے کی گولیاں [illegible] پڑی رہتی ہیں گولی چلا کر ایک جانور گرا لیتا ہے تو جلدی سے پھر بندوق بھر لیتا ہے۔ جانوروں کا [illegible] پیڑ کی آڑ لے کر دوسری گولی چلا دیتا ہے۔

میں عنایت کو دیکھنا چاہتا ہوں۔

وہ کہیں گائیں چرا رہا ہوگا یا شکار کو نکل گیا ہوگا صبح سویرے اس کے ڈیرے پر چلو گے دیکھ لینا۔

یہاں گائیں چرانے کی منائی تو نہیں؟

ہے کیوں نہیں ہم بن کا ٹھیکہ لیتے ہیں جن کے لیے بہت سا روپیہ بھرتے ہیں سال میں بہت سے بچھڑے اور گھی بیچ کر پیسے اکٹھے کر لیتے ہیں یہی ہمارا دھندا ہے کل سویرے ہی میرے سنگ ڈیرے پر چلنا مٹھا پلا دوں گی۔

ضرور چلوں گا سورج نکلتے ہی آجاؤں گا۔

اگلے دن حبیب کا بازن سنتے ہی وہ آ گئی اور میرے ساتھ ڈیرے کی طرف چل پڑی ہمارے پیچھے گایوں کا ریوڑ چلتا۔ ڈیرے پر عنایت بھی مل گیا رسولن کی ماں دودھ بلو رہی تھی عنایت اس سے باتیں کر رہا تھا بڑا اکہرا بدن جوان تھا گٹھا ہوا بدن گوشت بازو بڑی بڑی آنکھیں لال لال شلغمی رخسار رعب دار موچھیں رسولن نے میرے بارے میں بہت سی باتیں عنایت اور اپنی ماں کو بتا دیں اور پیتل کے گلاس میں تازہ مٹھا بھر لائی۔

بولی، پیو!

گلاس میں مکھن کے ٹکڑے تیر رہے تھے میں نے پورا گلاس پی لیا

اس نے پوچھا مکھن کھاؤ گے؟

نہیں مٹھے ہی میں بہت ملا ہوا تھا۔

ذرا سا اور چاٹ لو

بس رہنے دو رسولن

میں دن بھر ہرن اور چیتل تلاش کرتا رہا دوپہر کو چیتل کا پٹھا ملا جس کے سینگ غلاف میں لپٹے ہوئے تھے اسے جیپ میں لاد کر پھر رسولن کے ڈیرے پر آگیا وہیں اس کی مدد سے چیتل صاف کیا اور ایک ران اس کی حوالے کر کے چلنے ہی والا تھا کہ رسولن کی ماں بولی:

لونڈیا انہیں سوکھڑ تو دے دے یہی سوغات ہے یہاں کی۔

رسولن بھس کے ڈھیر میں دبا ہوا سوکھڑ نکال لائی کہنے لگی

گوشت بہت کھاتے ہو۔ ذرا یہ سوکھڑ بھی کھا کر دیکھنا ہم جاڑے اور گرمیوں میں عنایت کے مارے ہوئے شکار کا گوشت سکھا لیتے ہیں اور سال بھر تک کھاتے رہتے ہیں۔

میں مہینے میں ایک بار رسولن کے ڈیرے پر ضرور جاتا اس سے جنگل کے حالات پوچھتا خود اس کے رہن سہن کے طور طریقے دیکھتا وہ پوچھتی:

میری کہانی لکھی تم نے

لکھونگا اس کے لیے بہت سی چیزیں معلوم کرنا ہیں۔

ایک دن میں جنگل کا چکر لگا کر ڈیرے پر گیا مگر رسولن نہیں ملی کافی تلاش کے بعد ایک بوڑھے داڑھی والے گھنے برگد کے نیچے پہنچا وہاں رسولن کی گائیں کھڑی جگالی کر رہی تھیں بعض کے تھنوں سے بچے دودھ پی رہے تھے رسولن وہاں بھی نہ تھی میں جھاڑیوں میں جھانکتا پھرا کر دندن کی ایک جھاڑی میں رسولن بیٹھی نظر آگئی عنایت بھی تھا مجھے دیکھتے ہی دونوں باہر نکل آئے رسولن نے سر کے بالوں کو دلفریب انداز سے جھٹک کر بولی:

میرا من بول رہا تھا تم ضرور آؤ گے۔

اور میں آگیا تم نے اپنا کوئی بال تو نہیں جلایا تھا۔

نہیں اس سے کیا ہوتا ہے۔

لوگ اس کے دھوئیں پر دوڑے چلے آتے ہیں۔

وہ ہنسنے لگی عنایت چپ چاپ کھڑا رہا اس کی بندوق جھاڑی میں پڑی تھی ظاہر ہے کہ میں شہری تھا۔ دیہات کی معصومیت کے آئینے میں مجھے بال پڑتا محسوس ہوا ذرا دیر جیپ میں بیٹھا رسولن اور عنایت کے چہرے دیکھتا رہا ان پر کسی طرح دھند نہ تھی جلدی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا سوچا ہم لوگ بہت شکی ہوتے ہیں دلوں پر رنگ بڑھ جاتا ہے شہروں کے پارکوں اور سینما گھروں میں رات دن آبگینے چکنا چور ہوتے رہتے ہیں گاؤں میں ایسا نہیں ہوتا اور رسولن کا ڈیرہ تو گاؤں سے بھی دور ہے بالکل اجاڑ اور سنسان جنگل میں عنایت اور رسولن کے دلوں کو زنگ نہیں لگا جذبات میں ہوس کا رنگ کبھی نہیں آیا ان پر شرم اور بے گناہی کی برف جمی ہوئی ہے میں نے عنایت کو مخاطب کیا:

بندوق خالی ہے یا بھری ہوئی

میں ایک پل کو بھی بندوق خالی نہیں رکھا کرتا یہاں ہر وقت شیر، چیتے اور تیندوے منڈلاتے رہتے ہیں۔

چلو میرے ساتھ میں تمہاری بندوق کی مار دیکھنا چاہتا ہوں!

میں پیدل ہی دوڑ کر گولی چلاتا ہوں۔

جب تک کوئی جانور نہ ملے جیپ میں بیٹھے رہنا، عنایت نے میرا کہنا مان لیا اور میں بیٹھ گیا رسولن وہیں کھڑی رہی میں نے راستے میں عنایت کا دل ٹٹولا۔

رسولن کیسی ہے؟

بالکل گئو ہے، سیدھی، سچی سی۔

گئو تو بچے بھی دیا کرتی ہے۔

رسولن ایسی گائے نہیں عنایت نے تیوری چڑھا کر کہا اسے رسولن کے بارے میں یہ جملہ اچھا نہیں لگا، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گھومنے پر ایک جھانک دکھائی دیا بڑے بڑے شاندار سینگوں والا عنایت جیپ سے کود کر اس کے پیچھے دوڑا اور ایک جگہ ٹھہر کر بندوق

داغ دی بھاگ کر گر پڑا عنایت نے اس کی گردن پر چھرا پھیر دیا مجھے اس کی مہارت پر تعجب ہوا حیرت اس بات پر تھی کہ بھاگتے وقت اس کا سانس کیوں کر قابو میں رہا اس نے کپی سے بارود ہتھیلی پر الٹ کر بندوق میں ڈال دی اور کپڑے کی ڈانٹ لگا کر گز سے ٹھونکنے لگا پھر گولی ڈال دی اس کام سے نپٹ کر بولا ۔

کہو تو کوئی اور جانور مار لوں ۔

آس پاس کے سب جانور بندوق کی آواز سے بھاگ گئے ہوں گے ۔

بھاگ کر جائیں گے کہاں ۔

یہ کہہ کر وہ ایک طرف کو چل دیا آدھا گھنٹہ بیت جانے پر اچانک جنگل گونج اٹھا بڑے زور کا دھماکہ ہوا میں نے اسی سمت کو جیپ بھگائی عنایت نے نالے کے کنارے ایک نیل مار گرایا تھا اور اسے ذبح کر کے بندوق بھر رہا تھا چھ سات مہینے اور گذر گئے ہیں رسولن کی کہانی کا نقطۂ عروج (کلائمکس) ہی ڈھونڈ رہا تھا جس کے بغیر کہانی ادھوری تھی گرمیوں کی ایک صبح کو میں ڈیرے پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ دور ایک گاؤں میں رہنے والے نوجوان منظو سے رسولن کی بات چیت چل رہی ہے اس کی ماں نے چھاچھ گلاس دیکر سب قصہ سنا دیا وہ کہہ رہی تھی کہ منظو مہینوں سے دونوں وقت آ رہا ہے چاہتا ہے کہ رسولن سے اس کی منگنی ہو جائے ۔

منظو میں کیا لعل ٹکے ہیں عنایت کیا برا ہے ۔

اس نے کبھی کچھ کہا نہیں ۔

میں ابھی اس سے بات کرتا ہوں

میں عنایت کے ڈیرے پر گیا اور عنایت کو الگ لے جا کر دیر تک اس سے گفتگو کرتا رہا اپنے من کی لونڈیا دوسرے گاؤں میں کیوں دے رہے ہو؟

اور کیا کروں کیا اچار ڈالوں ۔

تم کیوں اسے بیاہ نہیں کر لیتے ۔

عنایت چونک گیا پوچھا ۔

یہ کیوں کر ہو سکتا ہے ۔

ہو کیوں نہیں سکتا ضرور ہو سکتا ہے ۔

اور وہ ساری کیا ہو گی جو میں رسولن کی سگائی کے لیے لایا ہوں ۔

جب تمہاری سگائی اس کے ساتھ ہو تو اس کو دے دینا ۔

عنایت مسکرایا پہلی مرتبہ جذبات کی برف پگھلتی محسوس ہوئی رسولن کی کہانی کا آخری سرا جسے میں نے نقطۂ عروج کہا ہے ہاتھ آ گیا ان دونوں کی شادی بالکل دیہاتی سادگی کے ساتھ ہو گئی عنایت کی لائی ہوئی ساری رسولن کو دی گئی تو حیران ہو کر بولی ۔

اتنی بڑی چادر میں کیوں کر اوڑھ سکوں گی ۔

چادر نہیں ساری ہے باؤلی باندھی جاتی ہے ۔

اور ساری پہننے کے بعد رسولن کا مکھڑا چاند کی طرح کھل گیا دیپ سا جل اٹھا میں اپنے ساتھ جو چیزیں لایا تھا وہ دونوں کے آگے رکھ دیں اور پھر ایک دوپہر کو کروندن کی گھنی مہکتی ہوئی جھاڑی میں بیٹھ کر یہ کہانی رسولن اور عنایت کو سنائی ۔

رسولن نے مسکراتے ہوئے پوچھا ۔

اس میں کسی پری کا نام تو آیا ہی نہیں یہ کیسی کہانی ہے ؟

اور یہ رسولن کون ہے ؟

دونوں نے ساتھ ہی زور کا قہقہہ لگایا ۔



ناقوس سے غرض ہے نہ مطلب اذاں سے ہے
مجھ کو اگر ہے عشق تو ہندوستاں سے ہے
مولانا ظفر علی خان

ڈاکٹر ذکیہ کاکوروی
۱۳۷، شاہ گنج لکھنؤ

انور مسرور
ٹانڈہ فیض آباد

کنور سنگھ کنور
مرلی نگر لکھنؤ

غزلیں

زندگی بھر یوں ہی تڑپا کیا
ہائے ظالم ظلم بھی کیسا کیا
کم نہ ہونے پائی سینے کی جلن
آتشِ دل کو بہت ٹھنڈا کیا
کون سمجھے گا کسے سمجھائیں یہ
اک نگاہِ ناز نے کیا کیا کیا
دل کا عالم حسن کے آگے نہ پوچھ
ایک ذرہ مہر سے چمکا کیا
کاش رہتے ہم ترے جلووں میں گم
ہوش میں لا کر بہت رسوا کیا
اپنے دیوانے کی عظمت دیکھیے
اک زمانہ رشک سے دیکھا کیا

غربت میں کسی سے بھی نہ امیدِ کرم رکھ
یہ منزل دشوار ہے محتاط قدم رکھ
جذبے ہوں جنوں خیز تو زنجیرِ گراں مانگ
زندانِ خیالات میں زلفوں کے گرہ و خم رکھ
باقی ترے اشکوں سے ہے تابندگیِ صبح
پھر گریۂ شب، مشغلۂ دیدۂ نم رکھ
مٹ مٹ کے بصد شوق ابھر نقش کی صورت
احباب سے کچھ اور تقاضائے ستم رکھ
دے قصۂ بیداد کو عنوانِ سعادت
ممکن ہو تو خود اپنی تمنا کا بھرم رکھ
مسکن ہیں صلیبوں پہ ہیں حالات کے لاشے
لمحوں کے تقاضے ہیں کہ کاغذ پہ قلم رکھ

جیسے ہر سمت اک سیلِ نور آگیا
کیا وہ پھر آج بالائے طور آگیا
اللہ اللہ اعجازِ ذوقِ نظر
حسن پر اپنے ان کو غرور آگیا
جام و مے کی ضرورت نہیں رہ گئی
آپ کی یاد آئی سرور آگیا
آپ بالیں پہ آئے سکوں مل گیا
مرنے والے کے چہرے پہ نور آگیا
مل گئی دادِ ضبطِ الم اے کنور
آگیا وہ جو رہتا تھا دور آگیا

مہدی افادی: اردو کا ایک بے مثل نثر نگار — (صفحہ ۳۰ کا بقیہ)

سہارے کی ضرورت نہیں۔" [۹]

اس طرح کی مثالیں ان کے مضامین میں کثرت سے ملتی ہیں یہ کمزوری صرف مہدی حسن کی نہیں بلکہ ہر تاثراتی نقاد کی ہے۔ مہدی حسن کے مضامین کی خوبی ان کا تاثراتی اور رنگین اسلوب ہی ہے جس نے تنقید کو تخلیق کا درجہ عطا کیا اور بقول مجنوں گورکھپوری "تنقید کو شاعری اور وہ بھی غزل کے مرتبے کی چیز بنا دیا" مہدی حسن نے اردو نثر نگاری کو ایک خاص لب و لہجہ اور آہنگ عطا کیا۔ وہ اپنے حسین طرزِ انشا کی بدولت ہمیشہ زندہ رہیں گے۔



حواشی

[۱] افاداتِ مہدی ص ۱۶۰ [۲] افاداتِ مہدی۔ فلسفۂ حسن و عشق ص ۱۸۳ [۳] افاداتِ مہدی ص ۱۵ [۴] افاداتِ مہدی ص ۱ [۵] افاداتِ مہدی ص ۲۸۵ [۶] افاداتِ مہدی ص ۲۸۱ [۷] افاداتِ مہدی ص ۴۳ [۸] افاداتِ مہدی ص ۱۰ [۹] افاداتِ مہدی ص ۲۲۰

مناظر عاشق ہرگانوی
صدر شعبۂ اردو، مارکھم کالج ہزاری
باغ ۸۲۵۳۰۱ (بہار)

کنھیا لال کپور کی طنز نگاری

لمبے لمبے بازو ــــ لمبے لمبے ہاتھ ــ لمبی لمبی ٹانگیں ــ سڈول نہیں بلکہ بے ڈول ! ــ لمبی پیٹھ پر ہلکا سا جھکاؤ اور کمر کے گرد مجبور قسم کی حسین لچک ــ لیکن کنھیا لال کپور کی لچک میں موت کی دعوت نہیں ۔ زندگی کا ایک مسلسل اور بے باک ڈھب پایا جاتا تھا ــ ویسے خود کنھیا لال کپور کو اپنے اس پتلے جسم کا کافی احساس تھا۔ ایک مرتبہ جب وہ ایک انگریز خاتون سے ملے تو اس کا یہ احساس ایک نہایت طنزیہ لطیفے کی شکل میں نمودار ہوا۔ اس خاتون نے کپور کے ساتھ مذاق کرتے ہوئے کہا ــــ کپور صاحب ! YOU ARE AS THIN AS A NEEDLE

کپور نے بے ساختہ بھولے پن سے جواب دیا "محترمہ! آپ ذرا مبالغہ سے کام لے رہی ہیں۔ چند ایک سوئیاں مجھ سے موٹی بھی ہوتی ہیں۔"

کنھیا لال کپور ایک کامیاب طنز نگار تھے۔ وہ ان اقدار اور اشخاص کو تختۂ مشق بناتے تھے جنہیں بے نقاب کرنے کے لیے شاہین کی نظر اور چیتے کا جگر چاہیے۔ طنز کپور کے نزدیک ایک قسم کی شگفتہ تنقید ہے۔ اور طنز نگاری ایک مقدس شغل۔ ادب میں افادیت کے وہ پہلے دن سے ہی قائل تھے۔ انھیں کسی کی دل آزاری یا دل شکنی مطلوب نہیں تھی۔ البتہ جہالت، خود غرضی اور ریاکاری کو بے نقاب کرنا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔

کپور چونکہ بنیادی طور پر طنز نگار تھے اس لیے اپنے حلیے اور جسم کی بناوٹ سے بھی طنز نگار معلوم ہوتے تھے۔ جہاں تک مذاق اڑانے اور مذاق کرنے کی بات ہے، کپور خود کہتے ہیں کہ مذاق اڑانے کے سلسلے میں سب سے بڑا مذاق یہ ہے کہ جب کبھی مزاح نگار کا نشانہ چوک جاتا ہے، وہ بیچارہ خود مذاق کا نشانہ بن جاتا ہے۔ شاید اسی لیے یسوع مسیحؑ نے انجیل مقدس میں فرمایا تھا "کسی پر تنقید مت کرو تاکہ کوئی تم پر تنقید نہ کرے"۔ مزاح اور خاص کر طنز بہت حد تک ایک قسم کی شگفتہ تنقید ہے۔ میری دانست میں اچھے طنز کے لیے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ اچھا مقصد، تیز و طرار طبیعت ــــ اور دماغی توازن ــــ ! اگر ان تینوں میں سے ایک چیز کی بھی کمی واقع ہو جائے تو طنز، طنز نہیں رہتا۔ دشنام یا ہجو بن جاتا ہے۔

راستی اور پروپیگنڈے کے دور میں اچھے اور دماغی توازن سے ٹھیک ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رہی تیز و طرار طبیعت تو اس کے متعلق عرض ہے کہ ؏

ایک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے !

حالانکہ کپور نے طنز و مزاح کا جو سرمایہ چھوڑا ہے اس سے ان کی طبیعت کے تیز و طرار ہونے کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ سبز باغ دکھاتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

"آج کل تو وکالت صرف دور کے ڈھول ہو کر رہ گئی ہے۔ آنکھیں انتظار کرتے کرتے پتھرا جاتی ہیں اور موکل

نظر نہیں آتا۔ آپ کے سے لائق آدمی کو تو انشورنس ایجنٹ ہونا چاہیے تھا۔ بس وارے نیارے ہو جاتے۔ مہینے بھر میں اگر ڈیڑھ سو کیس بھی کمپنی کو دیتے تو دو ہزار کمیشن بنتی۔ آپ بن بیٹھے وکیل۔ آمدنی صفر، خرچ بے حساب ۔۔۔ نتیجہ پریشانی۔ اجی وکیل صاحب! وکالت بھی کسی قسمت والے کی چلتی ہے ورنہ اکثر تو گھر سے کچہری اور کچہری سے گھر کے چکر میں ہی پڑے رہتے ہیں۔ آپ تو خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ ہزاروں ایسے کام ہیں جو آپ کر سکتے ہیں ۔۔۔"

(سبز باغ)

کپور کے اس طرح کے مضامین کو ہم شاطرانہ کہہ سکتے ہیں۔ وہ ادب کی اس صنف (طنز و مزاح) کو زندگی کا آئینہ سمجھتے ہیں۔ جانشیں سے یہ اقتباس دیکھیے:

"(ایک کمرے میں انٹرویو بورڈ امیدواروں سے انٹرویو کر رہا ہے۔ نارد منی ایک امیدوار کے بھیس میں کمرے میں داخل ہوتے ہیں)

انٹرویو بورڈ کا ایک ممبر: تعلیم؟ قابلیت؟ سفارش؟

نارد منی: فرسٹ کلاس ایم۔اے ہوں۔ یونیورسٹی میں دوئم رہا تھا۔

دوسرا ممبر: سفارش؟

نارد منی: سفارش کوئی نہیں۔

تیسرا ممبر: (قہقہہ لگا کر) سفارش کوئی نہیں اور ملازمت حاصل کرنے آئے ہیں!"

طنز ادب کی ایک اہم صنف ہے اور ادب چونکہ زندگی کا ناقد ہے۔ اس لیے وہ قوم کی مخصوص نفسیات، عصری میلانات اور نفسی محرکات کی آئینہ داری کرتا ہے۔ یوں دیکھیں تو ہر عہد کے ادب کی کروٹوں میں اس عہد کے معاشی، معاشرتی اور نفسی واردات سے تشکیل پانے والی مخصوص قومی نفسیات رنگ افروز نظر آتی ہے۔ کپور کے بیشتر طنزیہ و مزاحیہ مضامین اسی نفسیات کا آئینہ ہیں:

کپور نے اپنے عہد کے مختلف النوع معاملات اور گوناگوں ناہمواریوں اور عام زندگی کے بے ڈھنگے پن کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کا معاشرہ تو ان کے طنز و مزاح کا موضوع ہے ہی، ساتھ ہی ان کا طنز ان کی خود کی ذاتی الجھنوں اور ذاتی معاملات کی تلخیوں کا نتیجہ بھی ہے، انھوں نے ذاتی معاملات یا نجی زندگیوں کی ناہمواریوں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔"

اپنی یاد میں کے تحت اپنے بارے میں لکھتے ہیں:

" ۱۹۴۲ء میں انھوں نے ایک چونکا دینے والا مضمون غالب ترقی پسندوں کی مجلس میں لکھا اور ۔۔۔ اردو کی ساری ادبی دنیا میں مشہور ہو گئے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ بائرن کی طرح ایک صبح اٹھے اور انھوں نے اپنے کو مشہور پایا لیکن یہ ٹھیک ہے کہ انھیں مشہور ہونے کے لئے شدید انتظار نہیں کرنا پڑا۔ یہ شہرت ان کے حق میں زہر ثابت ہوئی کیونکہ بہت جلد انھوں نے محنت سے لکھنا ترک کر دیا۔"

طبی نقطۂ نظر کے بموجب سردی کے موسم میں سر کے بال عموماً گرتے ہیں۔ اس حقیقت کا تال میل کپور جنت بے نظیر کشمیر سے قائم کرتے ہیں:

"ایک بار کچھ دوست گھیر گھار کر انھیں کشمیر لے گئے۔ کشمیر کے متعلق مشہور ہے کہ اگر گھٹا ہوا مرغ بھی اس سرزمین میں ہو تو اس کے بال دیر دوبارہ نکل آتے ہیں لیکن ان پر کشمیر کی آب و ہوا کا اثر یہ ہوا کہ سر کے آدھے سے زیادہ بال جھڑ گئے یعنی گنجے ہونے سے بال بال بچے۔ اس واقعہ کے بعد انھوں نے کبھی کشمیر کا رخ نہیں کیا۔"

(اپنی یاد میں)

یوں تو کپور نے اردو طنز و مزاح نگاری میں اپنا الگ رنگ پیدا کیا ہے لیکن وہ پطرس بخاری سے متاثر رہے ہیں۔ اپنے طنزیہ مضمون پیر و مرشد میں کپور لکھتے ہیں:

" پطرس میرے استاد تھے ۔۔۔ حافظ غضب کا پایا

تھا۔ اکثر جب کوئی نئی کتاب پڑھتے تو دوسرے دن کلاس روم میں اس کا خلاصہ اتنی صحت کے ساتھ بیان کرتے کہ لیکچر سننے کے بعد محسوس ہوتا کہ کتاب انھوں نے نہیں ہم نے پڑھی ہے۔"

ایک بار فرانسیسی فلسفی برگساں کی کتاب LAUGHTER (مزاح) کی وضاحت فرماتے وقت انھوں نے طنز و مزاح سے متعلق بہت دل چسپ باتیں بتائیں، فرمایا — "انسان ہی صرف ہنسنے والا جانور ہے۔"

میں نے کہا۔ "جناب بندر بھی ہنستا ہے۔"

ہنس کر فرمایا۔ "کیونکہ وہ انسان کا جدِ امجد ہے۔"

بیان کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا۔ "ہنسنے کے لیے عقل کا ہونا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بے وقوف کو لطیفہ سنانا تضیع اوقات ہے۔ اگر ایک آدمی کیلے کے چھلکے سے پھسل پڑے تو دوسرے اس پر ہنستے ہیں لیکن اگر ایک بھینس کیلے کے چھلکے سے پھسل کر کیچڑ میں گر پڑے تو باقی بھینسیں اس پر کبھی نہیں ہنسیں گی۔ کیونکہ بھینس کے پاس عقل نہیں ہوتی۔ تبھی تو یہ محاورہ ایجاد ہوا عقل بڑی یا بھینس، ... ہمدردی یا ترحم کا جذبہ ہنسی کے لیے زہرِ قاتل کا درجہ رکھتا ہے۔ اگر کوئی شخص سائیکل چلاتے وقت گر پڑے تو آپ اس پر ہنسیں گے۔ لیکن اگر اسے سخت چوٹ آئی ہو تو آپ کبھی نہیں ہنسیں گے۔ اگر ایک ریلوے گارڈ گاڑی چلنے سے پہلے ہر مسافر کو سخت سست کہے، کھڑکی سے باہر جھانکنے والے ہر بچے کی سرزنش کرے۔ ہر بوڑھے کو فہمائش کرے کہ اسے ڈبے میں فوراً داخل ہونا چاہیے اور خود چلتی گاڑی میں سوار ہوتے وقت گر پڑے تو تمام مسافر قہقہے لگا کر اس کی بے بسی کا مذاق اڑائیں گے۔ کیونکہ ان میں سے کسی کو اس کے ساتھ ہمدردی نہیں ہوگی۔

ایک ہی چیز المیہ اور طربیہ ہو سکتی ہے۔ سوال صرف ہمدردی کا ہے۔ فرض کیجیے بھرے میلے میں کوئی شخص یہ اعلان کرے کہ میری بیوی کھو گئی ہے۔ تو کچھ لوگ اس پر ضرور ہنسیں گے۔ یہ بات دوسروں کے نقطۂ نگاہ سے طربیہ اور خود اس شخص کے نقطۂ نظر سے المیہ ہے..... مزاح بالکل اسی طرح تیار کیا جا سکتا ہے جیسے صابن یا خوشبودار تیل۔ فارمولا یہ ہے۔ کہ دونوں چیزوں میں نامطابقت پیدا کر لیجیے۔ مثال کے طور پر یہ کہنے کے بجائے کہ —

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

یہ کہیے کہ

ہم طرفدار ہیں غالب کے سخن فہم نہیں

تو مزاح پیدا ہو جائے گا۔"

ہر دور میں اصنافِ ادب میں تجربے ہوتے رہے ہیں اور جدت پسندی کا دور دورہ رہا ہے۔ جس سے اچھی بری سبھی طرح کی تخلیقات سامنے آتی ہیں۔ ترقی پسندوں کے دور کے آغاز میں اور اس کے بعد بھی غزل اور نظم کے سانچے میں وسعت لانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے لیکن کپور نے "ترقی پسند غالب" میں اصنافِ سخن کے سلسلے میں جس باریک بینی اور جس گہرے طنز سے کام لیتے ہیں وہ انہی کا حصہ ہے۔"

"غالب: جدت لکھنوی اسٹیج پر تشریف لائیں۔

جدت لکھنوی: مرزا صاحب! مصائب دہلوی نے تو صرف نظم سے توبہ کی ہے۔ میں نے شاعری سے توبہ کر لی ہے۔

غالب:۔ تعجب، آخر اس انقلاب کی وجہ؟

جدت لکھنوی: اگر آپ اصرار کرتے ہیں تو وجہ بھی ظاہر کیے دیتا ہوں۔

غزل سے مجھے اس لیے دشمنی تھی
کہ آساں نہیں ہے غزل اچھی کہنا
بڑا مارنا پڑتا ہے اس میں پتا
بڑی دور کی لانا پڑتی ہے کوڑی
جو سچ پوچھیے ایک نشتر غزل کا
ہے سو لاکھ بے کیف نظموں پہ بھاری
مگر چاہتی ہے غزل وہ ریاضت
کہ جس کے تصور سے لرزہ ہو طاری
چنانچہ بڑے چھوٹے "مصرعے" ملا کر
میں لکھتا رہا ایسی مہمل سی نظمیں
کہ پڑھ کے جنہیں آئے قاری کو غصہ

پڑھی نظم دلّی کی مجلس میں میں نے
تو مز دور نے ایک یوں مجھ کو ٹوکا
"ابے دیکھ تو تو یہ کیا کر رہا ہے"
اُسی دن سے کی میں نے نظموں سے توبہ
کہ مشکل بہت شاعری کا ہے شعبہ
چنانچہ میں خاموش ہوں چھ برس سے
فقط اللہ ہو اللہ ہو کر رہا ہوں"

بات سے بات پیدا کرنے کا فن کپور کو خوب آتا ہے۔ ان کے فن کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے، لیکن ایسی صورت میں بھی ان کا طنز نشتر چبھوتا رہتا ہے:

"انارکلی: بات شادی کی ہو رہی تھی، قصّہ انگریزوں کا لے بیٹھے
تم بھی عجیب پروفیسر قسم کے عاشق ہو۔

سلیم: - پروفیسر کون؟ یادش بخیر پروفیسر آل احمد سرور تو نہیں۔ انھوں نے چند کامیاب غزلیں کہی ہیں۔ لیکن میرے خیال میں کسی سے عشق تو نہیں کیا۔

انارکلی: - (چمک کر) ہاں کیسے نہیں کیا۔ یاد ہے ان کی تازہ غزل کا مطلع ۔۔

کبھی سر ان کے قدموں میں کبھی ہاتھ انکے دامن پر
طبیعت ان دنوں کچھ لا ابالی ہوتی جاتی ہے

تسلیم: - مکرر، مکرر، سبحان اللہ، یہ شعر نہیں سحر ہے۔ واللہ کیا تیور ہیں، اس شعر کے۔

انارکلی: - یہ آل انڈیا مشاعرہ تھوڑا نہیں ہے سلیم، کہ تم یوں اچھل اچھل کر داد دے رہے ہو ۔۔۔۔ بات شادی کی ہو رہی ہے، پروفیسر آل احمد سرور کی نہیں ۔۔۔۔"

(تسلیم اور انارکلی)

واعظ، ناصح اور فلسفی قسم کے لوگ کہتے ہیں کہ اگر زندگی میں باقاعدگی نہ ہو تو انسان کبھی خوش نہیں رہ سکتا حالانکہ بہت سے توہمات کی طرح باقاعدگی کا وہم بھی ان لوگوں کے دماغ کی پیدا وار ہے۔ جو کم ہمت واقع ہوتے ہیں، جنھیں زندگی سے ڈر لگتا ہے۔ جو کبھی کھل کر اس لیے زندگی کی لذتوں سے لطف اندوز نہیں ہوسکتے کہ کہیں ایسا نہ ہوجائے، کہیں ویسا نہ ہوجائے۔ کپور مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

" ہمارے ایک دوست کھانے پینے کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ محتاط واقع ہوئے ہیں۔ آم وہ اس لیے نہیں کھاتے کہ اس کی تاثیر گرم ہوتی ہے۔ امرود سے اس لیے بدکتے ہیں کہ اس کے کھانے سے ہیضہ ہوجانے کا خدشہ ہے۔ کیلے کو دور سے سلام کرتے ہیں کہ یہ ثقیل ہوتا ہے۔ سنگترہ اس لیے ناپسند ہے کہ اکثر ترش ہوتا ہے۔ دہی بڑوں سے اس لیے ڈرتے ہیں کہ انھیں کھانے سے گلا خراب ہوجاتا ہے۔ غرض کہ دنیا کی آدھی نعمتوں سے انھوں نے اپنے کو محروم رکھا اور یہ سب اس لیے کہ بیمار نہ ہوجائیں لطف یہ کہ اکثر بیمار رہتے ہیں۔ کبھی اس لیے کہ فلاں پارٹی میں غلطی سے ایک گلاب جامن کھا لیا تھا۔ کبھی اس لیے کہ ایک دوست نے زبردستی انھیں سنگترے کا رس پلادیا تھا۔"

(بے قاعدگیاں)

کپور کے طنز و مزاح میں وسیع مشاہدہ، گہرا مطالعہ اور تجربات کی ہمہ گیری بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان کے یہاں لطافت اور شگفتگی کی بھی کمی نہیں ہے۔ وہ زبان کے شعبدے اور جملوں کے کرتب بھی دکھاتے ہیں، ساتھ ہی ساتھ انسانی نفسیات کی باریکیوں سے بھی روشناس کراتے ہیں۔ یوں تو انھوں نے مزاحیہ مضامین بھی لکھے ہیں، لیکن طنز کی جادوگری میں وہ زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں!



سراجؔ مرزا پوری
۲۲- دائرہ شاہ اجمل الٰہ آباد

غزل

جس پہ نیاز و ناز کا دار و مدار تھا
میں تھا مری وفا تھی مرا اعتبار تھا

ذکرِ کرم بھی غم کی لطافت پہ بار تھا
ایسا بھی ایک عالمِ صبر و قرار تھا

ہوتا بھی کون نازشِ تخلیقِ کائنات
میرا وجود ہی تو ترا شاہکار تھا

جب تک ہمارے دیدۂ تر نے وفا نہ کی
آئینۂ حیات پہ کتنا غبار تھا

سچ پوچھ ہو جیسے عالمِ سیلابِ رنگ و بو
کس درجہ دلفریب گمانِ بہار تھا

تنہا تھی میری ذات اگر کائنات میں
سایہ مرے وجود سے کیوں ہمکنار تھا

اک شخص میرے حال پہ اپنوں کے درمیاں
اپنا نہیں تھا پھر بھی بڑا سوگوار تھا

کس جبر و اختیار کی منزل میں تھا کہ میں
با اختیار ہو کے بھی بے اختیار تھا

عزمِ وفا کو جس نے سہارا دیا سراجؔ
شاید مری عروسِ تمنا کا پیار تھا

مہاتما گاندھی کا مذہب — (بقیہ صفحہ ۷)

تو میری رائے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ ہندستانی پہلے اور ہندستانی آخر تھے جیسے وہ سب مذہب کو مانتے ہوں۔"

مہاتما گاندھی اب ہمارے درمیان نہیں رہ گئے لیکن انھوں نے ہندستان میں رہنے والے ہر شخص اور ہر مذہب کے ماننے والے کو جو سبق دیا ہے وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ وہ آج بھی نہ صرف ہندستان بلکہ دنیا کے ہر ملک کے لیے مشعلِ راہ ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ پنڈت آنند نرائن ملّا کے لفظوں میں:

تو چپ ہے لیکن صدیوں تک گونجے گی صدائے ساز تری
دنیا کو اندھیری راتوں میں ڈھارس دے گی آواز تری



مضامینِ سرسید اور اصلاحِ معاشرت (صفحہ ۲۰ کا بقیہ)

المشکلات یا دافع البلیات'' کا ورد کرنے کے بجائے کچھ نہ سہی تو تیس پیسے کی ریوڑیوں کی پُڑیا ہاتھ میں لیے" دائم بابا" یا کسی دوسرے شہید بابا کی قبر کی طرف چلے جا رہے ہوں اور قبر پر ماتھا ٹیک رہے ہوں اور اسی قسم کی بہتیری باتیں آپ کے سامنے ہوں گی۔ اب آپ سمجھیے کہ ایسی حالت میں "درستیٔ مذہبی عقائد، تصحیح بعض مسائلِ مذہبی" جیسے مضامین ہمارے لیے کارآمد ہیں یا نہیں؟ ہمارا خیال ہے آپ یہی جواب دیں گے کہ بیشک ایسے مضامین آج بھی ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں۔ ہماری بے ربط اور بے ضبط زندگیاں۔ گفتگو کا انداز خواہ مخواہ کی کج بحثی، لباس، چال ڈھال، کون سی ایسی چیز ہے۔ جو آج بے ربطی اور بے ڈھنگی کا نمونہ نہیں ہے اگر آپ اس بات سے اتفاق رکھتے ہیں تو بلا تامل آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ سرسید احمد کے ضبط اوقات، [illegible]، طرزِ گفتگو، طرزِ لباس، بحث و تکرار جیسے مضامین آج بھی بے پناہ مفید ہیں، ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں اور صاف طور پر کہہ رہے ہیں:

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را



اظہر مسعود رضوی
بستان، بن پال روڈ، [illegible]

میرا اسکوٹر

مجھ سے اپنے اسکوٹر کے بارے میں کچھ لکھنے کی احباب کی فرمائش سراسر بدنیتی پر مبنی نظر آتی ہے۔ کیوں کہ وہ نہ صرف میرے اسکوٹر کے ظاہری حالات سے بہ خوبی واقف ہیں بلکہ بسا اوقات دھکا لگا کر اس کی افتادِ طبع کا بھی کماحقہ تجربہ رکھتے ہیں۔ اس مضمون میں اسکوٹر اور احباب، دونوں ہی کے دل توڑنا ہیں۔

دوستوں کی دل شکستگی اگرچہ قطعی ناویدنی ہے پھر بھی اس کا علاج انڈے، توس، مکھن وغیرہ کے تیر بہ ہدف معجون مرکب سے کیا جا سکتا ہے لیکن بہ قول پطرس بخاری اس بے زبان (اسکوٹر) اگر دل لوٹ گیا تو کبھی معاف نہیں کرے گا۔ عبد الرحیم خانخاناں بے جان چمڑے کی (صرف) آہ سے لوہا بھسم کر سکتے ہیں (مرے چام کی شواس سے لوہ بھسم ہوئی جات) تو یہ بے جان تو بہ آوازِ بلند کلکلا کلکلا کر کوستا بھی ہے۔

سودا نے (خدا بخشے مرحوم کی نظر ان مقامات تک بھی پہنچ جاتی تھی جو عام حالات میں چشم عوام سے پوشیدہ رہتے ہیں) اپنے ابلق کی پیری کے ثبوت میں یہ کہہ کر کہ

شیطاں اسی پہ نکلا تھا جنت سے ہو سوار

گویا سارے رکارڈ توڑ دیے تھے اور ان کو یقیناً اپنے ANTIQUE پر ناز بھی رہا ہو گا۔ لیکن، اگر انھیں علم ہوتا کہ ابلق کے اصطبل تک پہنچنے کے لیے شیطان نے جو سواری استعمال کی تھی وہ بھی اسکوٹر تھا اور اس وقت بھی یہ اتنا ضعیف تھا کہ بالقصد کو مادہ ہائے تاریخ کا کام بند کر کے غیب سے اس میں دھکا لگانا پڑا تھا تو شاید وہ طلبہ کو چرخ کے ہمراہ ابلق کی استخوانی پشت پر بٹھا کر اس کشمکش میں سرگرداں نہ کرتے کہ وہ (سودا انہیں ابلق) گھوڑی کو دیکھ ہنہنانے کے بجائے بے وقت کی راگنی کیوں الاپنے لگتا تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ میں اسکوٹر پر دس پندرہ میل کی رفتار سے اڑا چلا جا رہا تھا کہ ایک دوست نظر آئے جو بھاگوں بھاگ کہیں جا رہے تھے۔ اتفاق سے میں نے انھیں بیس بائیس گز دور سے ہی دیکھ لیا۔ فوراً پورا بریک مار کر اسکوٹر کو ان سے دس گز آگے روکتے ہوئے پیچھے بیٹھنے کی پیش کش کی۔ پہلے تو انھوں نے مجھے گھور کر دیکھا جیسے میری نیت کا جائزہ لے رہے ہوں پھر شکریے کے ساتھ یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے "بھئی آج بہت تھکا ہوا ہوں اور ذرا جلدی میں بھی ہوں۔"

میں اپنے اسکوٹر کو کبھی تالا لگا کر نہیں رکھتا۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ چوں کہ تالا ہے نہیں، اس لیے نہیں لگاتا۔ بلکہ میں چوروں کی نفسیات سے واقف ہوں۔ آج کا چور بھی تو امی دور کی پیداوار ہے۔ وہ بھی پائیداری کو نہیں دیکھتا، ظاہری ٹرک بھڑک پر ہی جان دیتا ہے (بلکہ اب تو جان لیتا ہے)۔ بارہا ایسا ہوا کہ اسکوٹر کو سڑک کے کنارے کھلا چھوڑ کر چلا گیا اور کئی کئی گھنٹے گیا، ہزاروں کے بعد لوٹا تب بھی اس کو جیوں کا تیوں پایا۔ ایسے موقعوں پر عجیب سی سبکی کا احساس ضرور ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ گھر سے دفتر جاتے ہوئے اسکوٹر راستے میں بند ہو گیا۔ لاکھ جتن کر ڈالے لیکن تنِ مردہ میں جان کے آثار نظر نہ آئے۔ مجبوراً فٹ پاتھ پر لگا کے پیدل ہی روانہ ہوا (مدت کے بعد اس دن دفتر ٹھیک وقت سے پہنچا) واپسی پر ایک جیب ہینڈل میں ٹھنسا ملا۔ بگڑ بہا پالیکا والوں نے چالان کر دیا تھا، فٹ پاتھ پر کوڑا لگانے کی پاداش میں۔

جب میں دفتر سے چلنے لگتا ہوں تو میرے ساتھی مجھ سے کترا کے نکلتے ہیں۔ بعض مخلصوں کا تو راسخ عقیدہ ہے کہ اگر میرے اسکوٹر کو دااور احتجاج کروں تو اس کے ساتھ مجھ کو بھی (دریا برد) کر دیا جائے تو وہ ایسے اہم مسئلے خود بخود حل ہو جائیں گے جن میں

ایک قومی اور دوسرا بین الاقوامی ہے ۔ یعنی پٹرول کی قلت اور صوتی پالیوشن۔ میں اس سے متفق نہیں ہوں ۔ پٹرول تو ضرور دوسرے اسکوٹروں کی بہ نسبت تھوڑا زیادہ صرف ہوتا ہے مگر اس کی وجہ انجن کی خرابی سے زیادہ ٹنکی کا وہ سوراخ ہے جو بند کرنے کی ہر کوشش کے بعد کچھ اور بڑھا ہوا معلوم ہونے لگتا ہے۔ دوسرے یہ بات یوں بھی غلط ثابت ہوتی ہے کہ بے چارے نے اپنی عمر رواں کا آدھا سفر تو شئے مذکورے سے بے نیاز رہ کر دھکّے کے سہارے طے کیا ہے ۔

اب رہا آواز کا مسئلہ تو دنیا میں اگر ہر چیز کا گلا ٹیپ دیا جائے تو بے چاری آواز کے لیے چند مخصوص مقامات ہی رہ جائیں گے ۔ مثل مشہور ہے "اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا اور اکیلا اسکوٹر صوتی پالیوشن نہیں پیدا کر سکتا ۔" اگر باقی سواریاں بے آواز ہیں تو اس میں اسکوٹر کا کیا قصور ! بارہا ریل کے پھاٹک کے نیچے سے گزرا اسی وقت اوپر سے ٹرین بھی گزری، لیکن بالکل بے آواز ۔ اکثر تو سڑک کوٹنے والا انجن نہایت خاموشی کے ساتھ اوور ٹیک کر لیتا ہے ۔

میں یہ بھی نہیں کہتا کہ میرا اسکوٹر بالکل بے آواز ہے۔ آواز ہے اور دوسروں سے بیس ہی ہے ۔ اس کا اعتراف میں سے گلے پٹرول کروں گا ۔ اول تو انیس بیس کا فرق کوئی بڑا فرق نہیں ہے دوسرے اس کے دو فائدے ہیں ۔ میں بریک اور ہارن کی فکر سے ہمیشہ آزاد رہتا ہوں ۔ جب میں چلتا ہوں تو اسکوٹر کے چھوٹے بڑے تمام پرزے بساط بھر آواز سے اپنی موجودگی کی اطلاع راستے بھر دیتے رہتے ہیں، یہ تو اچھی ہی بات ہے !اس طرح کہ کم کوئی پرزہ بغیر اطلاع کے اپنی جگہ تو نہیں چھوڑ سکتا ۔ ایک صاحب کے پاس بڑا عجیب قسم کا اسکوٹر تھا ۔ بالکل بے آواز ۔ کان لگا کر سننے پر بھی آواز نہیں سنائی دیتی تھی ۔ البتہ سائلنسر کے سرے پر ناک لگانے سے فوراً معلوم ہوجاتا تھا، بہ شرطیکہ سامنے آئینہ ہو (ظاہر ہے آئینے کے بغیر ناک پر جمے ہوئے دھوئیں کی کالک کیسے نظر آ سکتی ہے) ۔ ایک دن دیکھا کہ موصوف ہاتھوں میں خالی ہینڈل کا

ڈنڈا اور ٹانگوں میں سیٹ کو دبائے چلے جا رہے ہیں ۔ وہ تو کہیے گھر جلدی آگیا (اور اسکوٹر کو اسٹینڈ پر چڑھانے کی کوشش کے دوران یہ عقدہ کھلا کہ پورا اسکوٹر کہیں گر آئے ہیں ۔) ورنہ اسی طرح نہ جانے کہاں کہاں گھومتے اور لوگوں کو اپنے اوپر ہنسنے کا موقع دیتے پھرتے ۔

کچھ لوگوں نے ضلع انتظامیہ کو درخواست دی کہ بورڈ کے امتحانات کے دوران لاؤڈ اسپیکروں اور "میرے اسکوٹر" کے استعمال پر پابندی عائد کر دی جائے ۔ نتیجہ کیا نکلا؟ درخواست دہندگان کی سبکی ہی تو آخر ہوئی ۔ لاؤڈ اسپیکر تو پھر بھی بجتے رہے!!!

ایک صاحب اسکوٹر کی سیٹ پر لگے ہوئے تیل کے دھبوں کو دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ میں سیٹ کو شب خوابی کے تکیے کے طور پر استعمال کرتا ہوں جب کہ صورت حال اس کے برعکس ہے ۔

سائلنسر نے احتجاجاً (وجہ احتجاج کی وجہ آج تک میری سمجھ میں نہ آسکی) اپنا رشتہ انجن سے منقطع کر رکھا ہے اور اب تمام ضروری اور غیر ضروری اخراج سیٹ کے نیچے سے ہوتے ہیں اور میں راستے بھر دھویں اور موبل آئل کی کلیاں کرتا جاتا ہوں ۔

اسکوٹر کی بدولت میرے (اپنے) سوشل کانٹیکٹس بہت بڑھ گئے ہیں ۔ میں شہر بھر کے مستریوں کی آنکھوں کا تارا ہوں (کہ ان کی روزی روٹی کا سہارا ہوں ۔) تمام چوراہوں پر کھڑے ہونے والے ٹریفک کانسٹبل میرے گرویدہ ہیں (ان کی ہنگامی ضروریات جو مجھ سے پوری ہوتی ہیں)، شہر میں ہونے والی مختلف تقریبوں کے منتظمین بھی مجھ سے بہ خوبی واقف ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ میرے پاس جو دعوت نامے آتے ہیں ان کے 'نوٹ' میں بریکٹ کے اندر یہ اضافہ ضرور ملتا ہے ۔

"**نوٹ**: براہ کرم کارڈ ہمراہ لائیں (اور اسکوٹر گھر چھوڑ آنے) کی زحمت فرمائیں۔"



اتر پردیش شاہراہ ترقی پر

• اتر پردیش کو مزید مرکزی امداد مہیا کرنے کی درخواست • بنکروں کے مسائل حل کرنے کی یقین دہانی
• امداد باہمی زمرہ میں دو کتائی ملوں کے قیام کی تجویز • ریاست میں بجلی کی پیداوار بڑھانے کے لیے
۱۵ نئے بجلی پراجکٹ • اس اسکیم کے تحت تقریباً چھ لاکھ مزدوروں کو روزگار • حکومت
ریاست کی پسماندگی دور کرنے کے لیے پر عزم

• اتر پردیش کے وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ اور وزیر منصوبہ بندی شری برہم دت نے مرکزی وزیر منصوبہ بندی شری نرائن دت تیواری سے ریاست کو مزید مرکزی امداد مہیا کرنے کی درخواست کی ہے۔

مرکز سے یہ درخواست بھی کی گئی کہ مرکزی امداد کے "گیڈگل فارمولہ" پر، جو پسماندہ ریاستوں کے لیے ناموزوں ہے، عمل نہ کیا جائے اور اس فارمولہ کی جگہ مرکزی امداد تقسیم کرنے کے لیے ایسا فارمولہ وضع کیا جائے جو پسماندہ ریاستوں کے لیے زیادہ مفید اور منصفانہ ہو۔

وزیر اعلا نے مرکزی وزیر منصوبہ بندی سے درخواست کی کہ سال ۸۱-۱۹۸۰ء کے ۹۹۴ کروڑ روپیہ کے مصارف کا منصوبہ منظور کیا جائے کیونکہ زبردست حالیہ خشک سالی کے باعث ریاست کو جو نقصان پہنچا ہے اس سے ایک تخمینہ کے بموجب ریاست کی مجموعی آمدنی میں تقریباً ۱۵ فی صد کی کمی ہو سکتی ہے۔ خشک سالی کے باعث پیدا ہونے والے خصوصی حالات میں بے حد ضروری مدوں کے لیے ۱۲۶ کروڑ روپیہ کی مزید رقم کا بھی مطالبہ کیا گیا ہے۔

مرکزی وزیر منصوبہ بندی سے یہ درخواست بھی کی گئی کہ پہاڑی علاقہ کی ترقی کے لیے مرکزی امداد ۸۰-۱۹۷۹ء ۳۵ کروڑ روپیہ سے بڑھا کر ۴۴ کروڑ روپیہ کر دی جائے تاکہ اس علاقہ کے معیار کو ہماچل پردیش کی سطح پر لایا جا سکے۔

مرکزی وزیر منصوبہ بندی نے اتر پردیش کی مانگوں کو بغور سنا اور ملک کے چھٹے منصوبہ کو رہنما اصولوں کے مطابق تیار کرنے کا مشورہ دیا۔ انھوں نے یہ اشارہ بھی کیا کہ چھٹے منصوبہ کو آئندہ جنوری۔فروری تک قطعی شکل مل جائے گی۔

• اتر پردیش کے وزیر صنعت شری عبدالرحمان خاں نشتر نے بتایا ہے کہ بنکروں کا معیار زندگی بلند کرنے، خام مال کی حسب ضرورت فراہمی، تیار مال کی فروخت، مشینوں کی خریداری کے لیے مالی امداد دینے اور ان کی دیگر دشواریاں دور کرنے کے لیے جلد ہی ضروری اقدامات کیے جائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ اب خصوصی ہینڈلوم کامپلکس اسکیم سے بنکر بھی مستفید ہوں گے جو اس کے فوائد سے اب تک محروم تھے۔

• وزیر اعلا شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے کہا کہ ریاست کی ہینڈلوم صنعت کی حوصلہ افزائی اور بنکروں کی بڑھتی ہوئی سوت کی مانگ پوری کرنے کی غرض سے دو نئی امداد باہمی کتائی ملیں کھولنے کی تجویز ہے۔

اس کے علاوہ ریاستی حکومت کے زیر نگرانی موجودہ کتائی ملوں میں تکووں کی تعداد میں اضافہ کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ہر مل میں تکووں کی تعداد دو لاکھ پچیس ہزار سے بڑھ کر تین لاکھ ہو جائے گی۔

وزیر اعلا نے گزشتہ دنوں اتر پردیش ریاستی مومن کانفرنس سے

خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہینڈ لوم مصنوعات کی پیداوار کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کی غرض سے بنکر امداد باہمی انجمنوں کو ۲۵ فیصد سرمایہ حصص جمع کرنے پر ۵۰ فی صد امداد حکومت نے دینے کا فیصلہ کیا ہے ۔ اس سال تقریباً ۵۰ لاکھ روپیہ کی امداد فراہم کی جائے گی۔

۞ ۞ ۞

• اتر پردیش ریاستی بجلی بورڈ نے بجلی کی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لیے ۸۵-۱۹۸۰ء کے منصوبہ میں ۱۵ نئے بجلی پراجکٹ شامل کیے ہیں ۔ ان میں سات پن بجلی اور آٹھ تھرمل پراجکٹ ہیں ۔

۞ ۞ ۞

• اتر پردیش میں "کام کے عوض اناج" اسکیم کے تحت مالیاتی سال رواں کے دوران ۲۸ رجون تک روزانہ ۵۷۳۰۹۸ مزدوروں کو روزگار فراہم کیا گیا۔ ان میں سے ۴۶۳۰۹۸ مزدور محکمہ پنچایت راج کی اسکیموں میں اور ۱۱۰۰۰۰ مزدور محکمہ تعمیرات عامہ کی اسکیموں میں کام کر رہے تھے ۔

۞ ۞ ۞

• اتر پردیش کے وزیر دیہی ترقی و پنچایت راج شری عمار رضوی نے حال ہی میں محمود آباد (ضلع سیتاپور) میں منعقدہ ایک ترقیاتی سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے حکومت کے اس عزم کا اعادہ کیا کہ ریاست کے ہر علاقہ کو پسماندگی کی لعنت سے نجات دلائی جائے گی۔



اپنی بات ——— (ص ۲ کا بقیہ)

ان کا تعلق اردو صحافت سے بھی رہا۔ وہ لاہور سے شائع ہونے والے متعدد اخبارات کے ایڈیٹر رہے اور خود ان کا ایک اخبار "انصاف" بھی کافی عرصے تک شائع ہوتا رہا۔ انھوں نے اردو کے کاز کی بھی ہمیشہ حمایت کی۔ ان کا اردو زبان و ادب سے گہرا عملی تعلق اس حقیقت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے کہ اردو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب اور سیکولرزم کی ایک روشن اور مستحکم علامت ہے ۔

افسوس صد افسوس کہ اردو اپنے ممتاز جانثاروں اور علمبرداروں سے یکے بعد دیگرے محروم ہوتی جا رہی ہے اور اس طرح اردو زبان و ادب کی دنیا میں جو خلا پیدا ہو رہا ہے وہ پر ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ۔

ادارہ نیا دور علم و ادب کی ان دونوں اہم شخصیات کے سانحۂ ارتحال پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور ان کے متعلقین کے غم میں برابر کا شریک ہے ۔

——— ایڈیٹر

ایک اعلان

• اس شمارے کے بعد اب نیادور کا نول کشور نمبر شائع ہوگا ——— جو نومبر دسمبر کا مشترکہ شمارہ ہوگا۔

• قارئین اور ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں۔

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں)

نام کتاب: غمِ حیات، شاعر: سید نواب افسر
قیمت: پندرہ روپے، ملنے کا پتہ: شائننگ پبلشرس وکٹوریہ گنج لکھنؤ

لکھنؤ کسی زمانے میں شعر و شاعری کا سب سے اہم مرکز سمجھا جاتا تھا۔ کسی ایک شہر میں اتنے اساتذہ یکجا نہیں ہوئے تھے، لیکن زمانے نے ایسا پلٹا کھایا ہے کہ استادانہ نگاہ رکھنے والے شاعر اب وہاں نوادر میں شمار ہوتے ہیں۔ آنند نرائن ملّا صاحب نے بھی دلّی جا بسائی، اب سید نواب افسر اور عمر انصاری جیسے افراد ہی سے بھرم قائم ہے۔ یہ دونوں ہی ہنگامہ آرائیوں سے دور رہتے ہیں اور عام نگاہیں مشاعروں کے علاوہ ان پر کم ہی پڑتی ہیں۔ لیکن ان کا ذکر کرکے یہ بتانا مقصود ہے کہ ع اب تک ہیں اس طرح کے بھی بندے خدائی میں!

میں گزشتہ جون میں لکھنؤ گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ کچھ علم دوست حضرات جشنِ افسر منانے جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں مجھ سے بھی یہ خواہش ظاہر کی گئی تھی کہ میں اس موقع پر حاضر ہو کر اپنے خیالات بھی پیش کروں لیکن اس وقت کچھ ایسی الجھنوں اور مشغولیتوں میں مبتلا تھا کہ اس خواہش پر عمل کرنے کی خوشی نہ حاصل کر سکا۔ بہرحال، انھیں دنوں مجھے سید نواب افسر کا مجموعۂ کلام "غمِ حیات" بھی وہیں دیکھنے کو ملا۔ اس مجموعے کی رسمِ اجرا بھی جشن کے موقع پر ہونے والی تھی۔ آج اس مجموعے پر اظہارِ خیال کرکے اس جشن میں بالواسطہ شرکت کی کوشش کر رہا ہوں۔

افسر سید بہادر حسین صاحب انجم کے صاحبزادے ہیں۔ اس لیے انھیں استاد ابن استاد کہا جا سکتا ہے۔ لیکن افسر کی شاعری اپنے والد کی شاعری سے مزاج اور مواد دونوں ہی اعتبار سے مختلف ہے۔ موزونیِ طبع کے علاوہ انھیں جو چیز ورثے میں ملی ہے وہ زبان و بیان کی تہذیب ہے۔ بعض حضرات زبان کی بات یوں کرتے ہیں جیسے وہ کوئی جامد شے ہو لیکن زبان نہایت ہی جاندار، نمو پذیر اور ترقی پسند ہوتی ہے۔ جو الفاظ نئی ایجادوں یا نئے حالات کے ماتحت داخلِ زبان ہوتے رہتے ہیں ان سے قطعِ نظر، جو الفاظ صدیوں سے انتہائی بے دردی اور بے پروائی کے ساتھ استعمال ہوتے چلے آ رہے ہیں، ان کے معانی اور مفاہیم میں بھی توسیع و تخفیف و تغیر کا عمل جاری رہتا ہے۔ قومی، مقامی اور جماعتی حسیات و جمالیات سے متاثر ہو کر یہ الفاظ نئی آب و تاب حاصل کرتے ہیں۔ یا پھر مرجھاتے اور ختم ہو جاتے ہیں۔ ان پر خلاقانہ نظر رکھنا شاعر کا کام ہے۔ اس میں کچھ کوکہنی و فرازی ہے، کچھ مرصع کاری ہے، کچھ تجدد ہے، کچھ انحراف ہے اور کچھ ستھری یا کھردری تجربہ بندی۔ سب کے لیے شرط تخلیقی توازن کی ہے جس کے بغیر الفاظ نہ نثر بن پاتے ہیں اور نہ نظم۔ اسی کو پرانے زمانے میں استادی سے تعبیر کیا کرتے تھے۔

استادی کا تعلق فن کاری سے بھی تھا۔ عروض و قافیہ کے رموز، معانی و بیان کا علم، ادب کا وسیع اور متنوع مطالعہ، استقامت و محاسنِ شعری کا علم۔ یہ باتیں جس میں یکجا ہو جاتی تھیں اسے استاد مان لیا جاتا تھا۔ بلکہ استادی کا مرتبہ اس سے بھی بڑھ کر تھا۔

"غمِ حیات" کو دیکھ کر یہ مسرت آمیز احساس ہوا کہ افسر صاحب میں استادی کے شرائط یکجا ہو گئے ہیں۔ اگرچہ وقت گزرنے کے ساتھ مذاق بھی بہت بدل گئے ہیں اور استادی و شاگردی کا رواج تقریباً ختم ہو گیا ہے، لیکن اچھے شاعر میں استادی کی تمام شرطوں کا جمع ہونا آج بھی اسی طرح ضروری ہے۔ جیسے پہلے تھا۔ کوئی دوسرے کے پاس اصلاح کے لیے نہ دوڑے گا تو خود اصلاح کرے گا۔ قدیم اصول و ضوابط کو غلط سمجھے گا تو اپنے اصول بنائے گا یا پرانے اصولوں میں جزوی ترمیمات کرے گا۔ یہ عمل ذاتی استعداد .... اور ذوقِ شعری پر بھی منحصر ہوگا اور اجتماعی اور عصری تقاضوں پر بھی۔ افسر کے اس مجموعۂ کلام میں ہر طریقِ کار کی جھلک ملتی ہے۔ لیکن جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے۔ انھوں نے باقاعدہ شاگردی کسی کی نہیں کی، لیکن علمِ عروض کی کتابیں باقاعدہ پڑھیں، بڑے بڑے اساتذہ کی صحبتیں اٹھائیں اور پھر کثرت سے مطالعہ کیا، پھر ذوقِ سلیم نے رہبری کی اور وہ آج رہنمایانہ شان کے مالک ہو گئے ہیں۔

صرف استاد ہونا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ میں نے ایسے کئی حضرات دیکھے ہیں جو عروض و معانی و بیان کے ماہر، موزوں طبع اور وسیع المطالعہ سب کچھ تھے لیکن بقول غنی کشمیری

شعرت بہ ہیچ دل نزند ناخن اے غنی

"اکثر ان لوگوں میں ہیں جن کے کلام میں بڑی جان ہے اور اگر وہ صرف تلمیذ الرحمٰن ہوتے اور انھوں نے فن کو فن کی حیثیت سے حاصل نہ کیا ہوتا تو بھی وہ خوش گو شعرا میں شمار کیے جاتے۔"

خود افسر صاحب نے اپنے مقدمے میں غم دوراں کی بات کی ہے اور مجموعے کا نام بھی "غم حیات" رکھا ہے جس میں غم جاناں اور غم دوراں دونوں ہی آجاتے ہیں، لیکن عصری مسائل اور شاعری میں ویسے بھی خدا واسطے کا بیر نہیں ہے۔ کسی منظم طرز فکر کا قائل ہونے سے شاعری مجروح نہیں ہوتی۔ شاعری کو مجروح کرنے والی چیز شاعر کا اساسی طور پر غیر شاعرانہ طریق کار ہی ہے۔ ہر بات، شعر ہو یا نثر میں ہو اسی زمان و مکان کے دائروں میں جنم لیتی ہے۔ اس سے بچنا محال ہے۔ غیر منظم تحریکوں سے شاعر نہیں بچ سکتا تو منظم تحریکوں کی بات کون کرے؟ لیکن مسئلہ صرف سیاسی منظم تحریکوں کا ہے بھی نہیں؟ آج بہت سی فنی اور فکری تحریکیں بھی کم منظم نہیں ہیں۔ جو لوگ سیاسی تحریکوں سے بچنے کی زوردار تبلیغیں کرتے ہیں وہ اس کو کیسے نظرانداز کر جاتے ہیں کہ بہت سی نام نہاد فنی اور ثقافتی تحریکوں کے پیچھے کیا سیاسی سماجی اور تاریخی عوامل کام کرتے ہیں؟

دراصل، یہ غلغلہ ترقی پسندی کے دور عروج کے فوراً بعد "ردعمل" کے طور پر ابھرا تھا لیکن وہ دور ختم ہو چکا ہے اور ترقی پسندی کی مخالفت کا پرچم بلند کر کے کسی بات کی صحت یا عدم صحت پر کوئی دلیل قائم نہیں ہو سکتی۔ میں یہ بھی تسلیم نہیں کرتا کہ شاعر سیاست کے قریب نہیں جا سکتا۔ اس کو بھی عام شہریوں کے تمام حقوق حاصل ہیں۔ یہ اس کی اپنی پسند ہے کہ وہ عملی سیاست میں پڑے یا کوئی اور راستہ اختیار کرے۔ مجھے تو شاعری اور سیاست کے سلسلے میں ساری بحث صرف اس لیے کج بحثی نظر آتی ہے کہ شاعری سیاست کی یا سیاست شاعری کی تابع مہمل نہیں ہو سکتی۔ میں اس کو بار بار لکھ چکا ہوں کہ شعر کو پہلے شعر ادب کو پہلے ادب ہونا چاہیے لیبل بعد میں چپکائے جائیں گے۔ بعض ذہین ناقد عام قاری کو الجھانے کے لیے "ادب کیا ہے" کا نعرہ بلند کرکے پھر اس کو یا تو سیاست کا تابع مہمل بنا دینا چاہتے ہیں، یا سیاست کو زندگی، فکر اور ادب کی دنیاؤں سے ملک بدر کر دینا چاہتے ہیں۔ دونوں طریق کار افراط و تفریط پر مبنی ہیں بلکہ سوچنے کے غلط انداز پر مبنی ہیں۔ افسر صاحب جس طبقے اور جس دور سے تعلق رکھتے ہیں اس کو دیکھتے ہوئے ان کا طرفدار اور غیر جانبدار بن جانا ناممکن نہیں تھا لیکن انھوں نے اعتدال کا راستہ اپنایا ہے اور حسن شعری کو ہاتھ سے جانے دیا ہے اور نہ ادراک حقیقت سے غافل ہوئے ہیں۔

انھوں نے خود قاری اور شاعر کے باہمی رشتے کا بھی سوال اٹھایا ہے۔ شاعر کس کے لیے لکھتا ہے؟ افسر نے یہ سچی بات کہی ہے کہ "کلام کا فطری تقاضا ترسیل ہے" اور شاعری کے "ذاتی عمل میں بھی بڑی حد تک اجتماعیت کی عکاسی ہو سکتی ہے۔"

"غم حیات" ان کے ذاتی افکار و محسوسات کی حامل ہے۔ انھوں نے اس دنیا میں جو مسرتیں حاصل کی ہیں۔ جو غم جھیلے ہیں، جو دھوکے کھائے ہیں، جس یقین نے انھیں سہارا دیا ہے، جس بے یقینی اور مایوسی یا تشکیک نے انھیں ہرا دینا چاہا ہے، وہ اس سب کو [illegible] عمومیت کے ساتھ سمیٹ لائے ہیں۔ تعمیر آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ بکھرے ہوئے تجربوں سے کلیے بنانا اور مستثنیات کو بھول جانا، عام بات ہے، اسی لیے ہمیں دوہوں کی شاعری اور غزلیہ شاعری میں بھی تضادات کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن زندگی تضادات کا ہی نام ہے۔ تضادات کی اسی دھوپ چھاؤں سے نئی راہیں پھوٹتی ہیں۔ افراد کی زندگی میں بھی اور قوموں کی زندگی میں بھی۔ افسر کے یہاں بھی یہ تضادات ابھرتے ہیں۔

دھوکے خود ضمیر کے رہ رہ کے کھائے ہیں — سو مرتبہ چراغ جلائے بجھائے ہیں
کیا کہئے زندگی کو ضرورت اسی کی تھی — کچھ دھوکے جان بوجھ کے بھی ہم نے کھائے ہیں
بے یقینی کی اک الجھن ہے جو رہ کے ہر قدم — اپنی منزل کا پتہ بھول گیا ہے کوئی
اعتماد جستجو دل میں نہیں افسر تو پھر — عمر بھر چل کر بھی مل سکتی نہیں منزل تجھے

وہ دھوکے بھی کھاتے ہیں اور چراغ جلا جلا کے بجھا بھی دیتے ہیں لیکن اعتماد جستجو کی بات بھی کرتے ہیں۔ یہ نظمیں اپنی حدیں رکھتی ہیں۔ غزلوں اور دوہوں کے اکا دکا شعروں پر جو حضرات تنقید کی بلند عمارتیں کھڑی کر لیتے ہیں۔۔ وہ نہ زندگی کی نیرنگیوں اور بوقلمونیوں کی خبر رکھتے

ہیں اور نہ صد پہلو غزل اور دو ہوں گی۔

"غمِ حیات" میں بیشتر غزلیں ہیں۔ ان میں تجربات اور مشاہدات کا بڑا تنوع ملتا ہے جو بیدار حسیت کے ساتھ اشعار کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ اختر کو بات کہنے کا سلیقہ آتا ہے۔ وہ قاری کو نمونی جزویات کی طرف بھی توجہ کرانے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور یہ وہ خصوصیت ہے جو مشق و ریاض کے بعد ہی آتی ہے۔ ان کے شعروں میں ایک فکری اور حسی توانائی کا احساس ہوتا ہے اور تقلیدی گو اس بار کم ہی نظر آتی ہے۔ غزل کا ڈھانچہ ایسا ہے اور اس کا سرمایہ اتنا عظیم ہے کہ انحراف کی کوشش بھی ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ جدت کی رو میں بہتوں نے یہ کوششیں کی ہیں اور ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اختر سنبھل سنبھل کر چلنے والوں میں ہیں، لیکن وہ انحراف سے گھبراتے نہیں ہیں۔ موضوعات و محسوسات کے انتخاب میں یہ بات صاف نمایاں ہو جاتی ہے۔ ان کے یہاں حسن و عشق کی خواب آور چھاؤں میں بھی تیز اور تند ہواؤں کے چلنے کا احساس ہوتا ہے۔ دور کی دھوپ اور لو بھی اپنی گرمی ان سایوں تک پہنچاتی رہتی ہے۔ وہ غم کی لذت بھی جانتے ہیں اور عشرتِ شوق کی بے چینیوں سے بھی آشنا ہیں۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ نجی ذاتی محسوسات کو بھی آفاقی رنگ دے سکتے ہیں۔ ان کے بیشتر محسوسات اور جذبات پڑھنے اور سننے والوں کے دلوں کے لرزتے تاروں کو بھی چھو لیتے ہیں۔

اس مختصر سے تبصرے میں اقتباسات کی گنجائش نہیں ہے پھر بھی ادھر اُدھر سے چند شعر روا روی میں چُن لیے ہیں۔ یہ نمائندگی کرتے ہیں لیکن اس مجموعے میں بہت کچھ اور بھی ہے۔

ایسے بھی ہیں کچھ دشت جہاں ملتے ہیں انساں
ایسے بھی ہیں کچھ شہر جہاں کوئی نہیں ہے

مفہوم سمجھ لیتے ہیں سب اپنی زباں میں
حالات کی مخصوص زباں کوئی نہیں ہے

یہ اور بات کہ تم نے نہیں سُنی ورنہ
شکستِ دل کی صدا دور دور جاتی ہے

کچھ سوزِ دروں، کچھ دردِ جہاں، کچھ بے چینی کچھ بے خوابی
فن جیسے ہرا لیتا ہے، اچھے اچھے فن کاروں سے

وہ نظر جو ملتفت تھی کبھی یوں بدل نہ جاتی
کوئی پھیر پڑ گیا ہے، کوئی بات ہو گئی ہے

ہم اہلِ وفا راستہ بھٹکے نہیں یارو
ہر سمت اندھیرا ہے تو گھبرا سے گئے ہیں

دور تک ہم نے اک آواز سنی تھی کل رات
اتنی دلکش تھی کہ جیسے کوئی ایوان گرا

پہلے بھی راہِ محبت میں کوئی بھیڑ نہ تھی
اور اب تو کوئی برسوں اِدھر آتا بھی نہیں

زندگی کی ٹھوکریں ہم نے بھی کھائی ہیں مگر
ہر نئی ٹھوکر پہ سوچی ہے سنبھل جانے کی بات

آج اس نے نگہِ ناز سے کیا دیکھ لیا
آگئی جان سسکتے ہوئے ارمانوں میں

خوش ہیں ہماری جلتی ہوئی زندگی سے آپ
لیکن یہ شعلہ آپ کے دامن تک آئے گا

اب تو الفاظ بھی آجاتے ہیں لب پہ ورنہ
گفتگو ہوتی تھی دُزدیدہ نظر سے پہلے

اِن اشعار میں روایت سے کھلی بغاوت کے بغیر اور لفظیات میں اُتھل پتھل کے بغیر تازگی کا احساس بھی ہے اور ندرتِ ادا بھی۔ قافیہ پیمائی کہیں بھی نہیں ہے۔ غزلیں سب مختصر اور ہر شعر اپنی جگہ اپنا مستقل وجود رکھتا ہے۔ در و بست الفاظ میں شعورِ نظر اور فن کاری ہے اور بحیثیت مجموعی اختر کے کلام میں بڑی نمکینی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ معاصر زندگی کا پرتو بھی ہے اور اس انداز میں ہے کہ غزل کی حلاوت مجروح نہیں ہوتی۔

—— علی جواد زیدی



Urdu Monthly

Vol. 35 No. 7

OCT. 1980.

50 PAISE

NAYA DAUR

POST BOX No. 146 LUCKNOW 226001

REGD No. LW/NP. 17

Annual Subs. Rs. 5/-



ممتاز مجاہد آزادی ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی ولادت صدی کے موقع پر
دستاویزات اور اس زمانے کے نقشوں کی ایک نمائش کا افتتاح ۲۵ دسمبر ۱۹۷۹
کو نئی دہلی میں شری محمد یونس نے کیا۔ تصویر میں ڈاکٹر انصاری کی صاحبزادی
بیگم زہرہ انصاری بھی نظر آ رہی ہیں۔



مدیر

آغا محمد حسن

قیمت

نولکشور نمبر

ایک روپیہ

سوانح
منشی نولکشور
نولکشور پریس کا شائع کردہ لٹریچر
مطبع نولکشور کا اسلامی لٹریچر
ہندو، عیسائی، سیکولر لٹریچر اور نولکشور پریس
لغت نویسی اور مطبع نولکشور
نظمیں
بیادِ منشی نولکشور
محسن اردو : نولکشور
محسن علم و ادب
منشی نولکشور اور فارسی زبان و ادب
منشی نولکشور اور فارسی ادب
منشی نولکشور اور فارسی زبان ادب کی ترقی
منشی نولکشور کی فارسی نظم و نثر
نظمیں
منشی نولکشور کی نذر
مشعل فروا
منشی نولکشور
منشی نولکشور کے ہم عصر مشاہیر سے روابط
منشی نولکشور اور غالب
منشی نولکشور اور نواب کلب علیخاں والیٔ رامپور
غالب اور منشی نولکشور
منشی نولکشور اور میر انیس (رثائی ادب کی روشنی میں)
نظمیں
منشی نولکشور

محسن اردو
منشی نولکشور
منشی نولکشور
منشی نولکشور کی خدمات اور کچھ دیگر پہلو
منشی نولکشور کی خدمات
منشی نولکشور ان کا نظم و نسق
منشی نولکشور اور لکھنؤ
منشی نولکشور : قومی یکجہتی کے پیشرو
نظمیں
منشی نولکشور
باغبانِ علم و ادب
منشی نولکشور : مختلف زاویوں سے
منشی نولکشور : بحیثیت مورخ
منشی نولکشور : صحیفۂ زریں کی روشنی میں
منشی نولکشور : اودھ ریویو کے آئینہ میں
منشی نولکشور : بعض نظموں اور قطعات کی روشنی میں
منشی نولکشور : انسانی صفات کے آئینہ میں
سوانح اور خاندان
منشی نولکشور : ایک تعارف
"جیون چرتر" ایک جائزہ
منشی نولکشور کا مولد اور خاندان
منشی نولکشور اور ان کا خاندان
منظوم سوانح منشی نولکشور از تیاں لکھنوی
منشی نولکشور : حیات و شخصیت
منشی نولکشور سے متعلق چند متفرق باتیں

اپنی بات

نیا دور کا منشی نول کشور نمبر حاضر خدمت ہے۔ کسی نمائندہ نمبر کے لیے مواد کی فراہمی اور اس کی اشاعت کے لیے جن دشوار [illegible] مراحل سے گزرنا پڑتا ہے انھیں کچھ وہی حضرات جانتے ہیں جنھوں نے ان پرخار وادیوں میں کبھی قدم رکھا ہے۔

منشی نول کشور نے مشرقی علوم و فنون خاص طور سے اردو زبان و ادب کی ایسی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں جو اردو ادبیات کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھی جائیں گی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ [illegible] تہذیبی روایت کی علامت بن چکے ہیں۔ وہ صحیح معنوں میں ایک عظیم [illegible] تھے۔ ان کی عظمت صرف اس لیے نہ تھی کہ وہ ایک صاحب ثروت ہستی تھے یا [illegible] رواج [illegible]۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان کی عظمت کا راز اس حقیقت میں مضمر ہے کہ انھیں نے علوم و فنون کی نشاۃ ثانیہ میں گراں قدر [illegible] انجام دیں اور ہندوستان میں اس وقت مشرقی تہذیب و تمدن کا چراغ روشن رکھنے کے لیے ان تھک کوششیں کیں جب مغربی تہذیب و [illegible] کی تند ہوائیں اس چراغ کو بجھانے میں سرگرم عمل تھیں اور ہندوستانی قوم ہی نہیں بلکہ سارا مشرق ان آندھیوں کی زد میں تھا۔ منشی نول کشور کا [illegible] ناقابل فراموش کارنامہ [illegible] کہ انھوں نے [illegible] سے لیے آخوب زمانے میں عربی، فارسی، اردو، ہندی، سنسکرت زبانوں [illegible] میں شائع کیں۔ ان کے انتقال کے بعد [illegible] اس تعداد میں تقریباً ساڑھے آٹھ ہزار نئی کتابوں کا اضافہ کیا۔ اس طرح [illegible] کی تعداد ڈیڑھ کر ساڑھے بارہ ہزار [illegible] [illegible] میں بالا ایک ریکارڈ ہے۔ ذرا تصور کیجیے اگر منشی نول کشور جیسی اولوالعزم [illegible] ہستی عالم وجود میں نہ آتی تو ہمارا کتنا قیمتی ادبی اور [illegible] زمانہ کے ہاتھوں تلف ہو گیا ہوتا۔ ادبی اثاثہ ہی نہیں بلکہ [illegible] بہت [illegible] [illegible] [illegible] منشی جی نے اپنے شہرۂ آفاق پریس کے ذریعہ وہ عظیم کارنامہ انجام [illegible] جو اب تک کسی تہذیبی ادارے نے بھی انجام نہیں دیا۔ [illegible] منشی جی نے اپنی شائع کردہ کتابوں کے ذریعہ اسلامی حکومتوں اور ایشیائی [illegible] سے ہندوستان کے گہرے تہذیبی روابط قائم کیے۔ حکومت ہند نے [illegible] میں ان کی انھیں خدمات کے اعتراف کے طور پر انھیں سی۔ آئی۔ ای کے خطاب سے نوازا تھا۔ ان کے انتقال کے [illegible] بعد [illegible] میں ایک شکر گزار قوم نے ان کا یادگاری ٹکٹ جاری کر کے ان کی خدمات کا اعتراف کیا۔ [illegible] ان کی [illegible] کا اعتراف اس طرح کیا جا رہا ہے کہ لکھنؤ یونیورسٹی میں ان کی یادگار میں ایک لائبریری قائم کی گئی ہے۔ [illegible] انسٹی ٹیوٹ [illegible] کی جانب سے منشی نول کشور کی سوانح اور خدمات پر تحقیقی کام کیا گیا ہے جسے پروفیسر آل احمد سرور کی نگرانی میں مرتب [illegible] [illegible] ریسرچ [illegible] [illegible] آئندہ [illegible] میں شائع ہوگا۔ آج اس عظیم انسان کے ۱۵۰ ویں یوم ولادت کے موقع پر ماہنامہ نیا دور کا خصوصی [illegible] ان لوگوں کی خدمت میں پیش کرتے [illegible] پیش کر رہا ہوں جو علوم مشرقیہ کی قدر دانی کے دلدادہ ہیں۔ ہمارا یہ خصوصی نمبر بہت تاخیر سے [illegible] شائع ہو رہا ہے جس کے لیے ہم قارئین نیا دور سے معذرت خواہ ہیں لیکن جب یہ نمبر آپ دیکھیں گے تو خود اندازہ کر لیں گے کہ اس کی تیاری میں [illegible] ناگزیر تھا یوں کہہ لیا جائے "ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا"۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ یہ خصوصی نمبر اس تاخیر کی تلافی بھی کر دے گا۔ اس نمبر میں صاحب نظر یہ بھی دیکھیں گے کہ اس میں بعض ایسی نایاب اور نادر چیزیں شامل ہیں جنھیں نیا دور پہلی بار شائع کرنے کا فخر حاصل کر رہا ہے۔ ہمیں یہ دعویٰ تو نہیں کہ نیا دور کا یہ خصوصی نمبر ہر لحاظ سے حرف آخر ہے لیکن اتنا تو یقینی طور سے کہا جا سکتا ہے کہ اس سے بہتر نمبر اب تک ہندوستان میں کسی رسالہ نے شائع نہیں کیا۔

آخر میں ان تمام ادیبوں اور شعرائے کرام کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے میری درخواست پر اس شمارے کے لیے اپنی خصوصی تخلیقات بھیج کر اس نمبر کو وقیع بنانے میں میری مدد فرمائی۔ ملک کی جن مشہور و معروف ہستیوں دانشوروں اور ادیبوں نے اپنی غیر معمولی مصروفیتوں کے سبب اپنے گراں قدر پیغامات سے ہی نوازا کہ ہماری ہمت افزائی کی ہے ہم ان کے بھی ممنون و متشکر ہیں۔ ذاتی طور پر میں ڈائریکٹر اطلاعات جناب ڈاکٹر انوار الحسن اور اپنے دیرینہ کرم فرما اور سابق ایڈیٹر نیا دور صباح الدین عمر صاحب کا بھی بے حد ممنون ہوں کہ ان حضرات نے اس شمارے کی ترتیب و تزئین میں قدم قدم پر میری اعانت کی۔ ناسپاس گزاری ہوگی اگر منشی نول کشور کے ایک لائق جانشین [illegible] [illegible] کا ذکر نہ کیا جائے جنھوں نے اپنے جد بزرگوار سے مخصوص نیا دور کے اس شمارے کے لیے نہ صرف بعض غیر مطبوعہ مواد اور تصاویر فراہم کیں بلکہ ہمہ وقت اپنا تعاون پیش کرتے رہے۔ اس ضخیم نمبر کی طباعت و اشاعت کے سلسلے میں گورنمنٹ پریس لکھنؤ کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ [illegible] صاحب نے جو دلچسپی لی اس کے لیے ہم ان کے بھی انتہائی ممنون و متشکر ہیں۔ اس کے علاوہ گورنمنٹ پریس کے خوشنویس خاص طور سے منشی محمد [illegible] صاحب انصاری انچارج کتابت سیکشن کے بھی ہم شکر گزار ہیں۔ اس کے علاوہ آغا محمد حسن صاحب نے اس نمبر کی حسن کاری کے سلسلے میں جس خصوصی دلچسپی اور لگن کا مظاہرہ کیا اس کے لیے ہم ان کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

وفیات

گزشتہ دنوں اردو زبان اور شعر و ادب کی چار اہم شخصیتیں داغ مفارقت دے گئیں۔ ان میں ساحر لدھیانوی کا انتقال ۲۶ اکتوبر کو بمبئی میں ہوا۔ ساحر ایک ممتاز ترقی پسند شاعر تھے۔ ان کی انفرادیت یہ تھی کہ انھوں نے بڑی سادہ اور عام فہم زبان میں شاعری کی۔ ان کی شاعری کے موضوعات بھی بہت [illegible] ہیں۔ رومانی جذبات و احساسات کا بڑا دلنشیں اظہار ان کے یہاں ملتا ہے۔ اسی لیے ان کی شاعری نوجوانوں کے لیے خاص طور سے بڑی کشش رکھتی ہے۔ انھوں نے امن عالم کے موضوع پر بھی کئی خوبصورت نظمیں کہیں جن میں ان کی طویل نظم "پرچھائیاں" خاص طور [illegible]۔ ان کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے فلمی گیتوں کو [illegible] دی اور فلموں میں غزل کی جگہ نظموں کا چلن شروع کیا۔ انھوں نے شاعری اور عوام دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کامیاب کوشش کی [illegible]۔ [illegible] شاعر کا انتقال محض شاعری کا نقصان نہیں ہے بلکہ سماج اور عوام کے لیے ایک صدمہ [illegible] ہے۔

[illegible] مولانا مصطفےٰ حسن علوی بھی ۲۶ نومبر کو لکھنؤ میں چل بسے۔ وہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے آخری [illegible] اور اردو [illegible] وہ شاعر بھی تھے اور [illegible]۔ انھوں نے "[illegible]" اور [illegible] کتابوں [illegible] پی ایچ ڈی کی ڈگری [illegible] لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی [illegible] ۱۹۴۴ میں [illegible] لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ علوم شرقیہ میں ۱۹۳۳ [illegible] بعد میں شعبۂ عربی میں استاد اور صدر شعبہ [illegible] ۱۹۶۲ میں ریٹائر ہوئے لیکن اس کے بعد بھی یونیورسٹی ان کی علمی خدمات سے ۱۹۷۰ تک مستفید ہوتی رہی۔

مولانا مصطفےٰ علوی کا شمار [illegible] عالم [illegible] ایک ممتاز شخصیت کی حیثیت سے انھیں ۱۹۵۹ میں صدر جمہوریہ ہند [illegible] سے نوازا گیا تھا۔

ان کے انتقال پر ادارہ نیا دور ان کے پس ماندگان خاص طور سے ان کے بیٹے ڈاکٹر محمد [illegible] علوی صدر شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی سے گہری ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

دل لکھنوی کا انتقال [illegible] کو لکھنؤ میں ہوا۔ وہ [illegible] شاعر تھے۔ ان کی زندگی [illegible] لکھنوی زبان و آہنگ میں [illegible] ایک زمانے میں ان کا [illegible] مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت بن گیا تھا۔ وہ تمام ہندوستان کے مشاعروں کے ایک [illegible] شاعر تھے۔ وہ مولانا عبدالباری آسی کے شاگرد تھے۔ [illegible] انھوں نے [illegible] لکھنوی سے بھی شرف تلمذ حاصل کیا۔ ان کے انتقال سے حقیقتاً لکھنؤ کی محفلیں سونی ہو گئیں اور [illegible] ایک خوش نوا اور خوش گو شاعر سے محروم ہو گئے۔ ادارۂ نیا دور ان کے پس ماندگان سے گہری ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

ممتاز شاعر ساغر مہدی کا انتقال [illegible] کو ہوا۔ ان کا انتقال اس لیے زیادہ [illegible] کہ چالیس بیالیس سال کی عمر میں ہی وہ اچانک ہم سب کو داغ مفارقت دے گئے۔ اتنی کم عمر میں ہی انھوں نے ادبی دنیا میں اپنے لیے ایک اہم جگہ بنا لی تھی۔ وہ نیا دور کے خصوصی معاونین میں تھے۔ نیا دور کے لیے وہ ایک طویل عرصے [illegible] کچھ لکھتے رہے۔ شعر و شاعری کے ساتھ ساتھ انھوں نے متعدد مضامین بھی لکھے۔ وہ ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے لیکن گزشتہ چند برسوں کے دوران ان کی شاعری کے آہنگ اور لہجے میں تبدیلی آگئی تھی جس سے ان کی غزلوں میں مزید حسن اور تاثر [illegible] پیدا ہو گئی تھی۔

لکھنؤ میں ان کے دوستوں کا ایک اچھا خاصا حلقہ تھا۔ ادیب اور شاعر سے بڑھ کر وہ ایک انتہائی وضعدار اور مخلص دوست تھے۔ راقم حروف سے بھی ان کے پرانے اور قریبی مراسم تھے چنانچہ وہ جب بھی لکھنؤ آتے راقم حروف کو ان سے ملاقات کا شرف ضرور حاصل ہوتا۔ ان کے انتقال سے تین ہی دن قبل مرحوم کا خط وصول ہوا تھا جس میں تحریر کیا تھا کہ اب صحت کافی بہتر ہے خط کا جواب بھی نہ دے پایا تھا کہ "قومی آواز" میں ان کے انتقال کی خبر پڑھ کر دل پر جو گزری بیان نہیں کر سکتا۔ خدا مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

امیر احمد صدیقی



جناب صدیقی صاحب۔ آداب۔

محترمہ وزیر اعظم کے نام آپ کا خط ملا۔ شکریہ

یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ ماہنامہ نیا دور

"منشی نول کشور خصوصی نمبر" شائع کر رہا ہے۔

اس موقع پر وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی

کی نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔

مخلص

(امیش چندر تیواڑی)

ایڈیشنل انفارمیشن ایڈوائزر

RAJ BHAVAN



مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ منشی نول کشور کی خدمات کے پیش نظر انھیں خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے نیا دور ایک خصوصی نمبر شائع کرنے جا رہا ہے۔ منشی نول کشور نے اپنے مشہور و مقبول مطبع کے ذریعہ اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لیے بیش بہا اور گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ نیا دور کا یہ خصوصی شمارہ دانشوروں اور قارئین کے درمیان مقبول ہوگا۔

میری نیک خواہشات ہیں کہ ادارہ اس خصوصی شمارہ کی اشاعت میں کامیاب ہو۔

اخلاق الرحمٰن قدوائی

(اخلاق الرحمن قدوائی)



وشوناتھ پرتاپ سنگھ
وزیراعلیٰ
اترپردیش

میرے لیے یہ امر باعث مسرت ہے کہ اترپردیش کے محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ کا ماہنامہ نیا دور منشی نول کشور پر ایک خصوصی نمبر شائع کر رہا ہے جس میں منشی جی کی عظیم شخصیت، علم و فضل نیز اشاعت اور طباعت کے میدان میں ان کے کارناموں کو منظر عام پر لایا جائے گا۔ درحقیقت منشی جی نے برّاعظم ایشیا کے علم و دانش کے گراں بہا سرمایہ کو زیور طباعت سے آراستہ کرکے اسے تحفظ جاودانی اور حیات لافانی عطا کی ہے۔ ان کے اس عظیم کارنامہ کے لیے ان کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ان کی عظمت صرف ان کے اس کارنامے پر ہی ختم نہیں ہو جاتی۔ ان کی عظیم شخصیت کے کچھ اور دلکش پہلو بھی ہیں۔ درحقیقت وہ ایک پیکر علم و ادب اور مجسمۂ انسانیت و شرافت بھی تھے۔ انھوں نے اپنی کاوشوں سے قومی یکجہتی و ہم آہنگی کو فروغ دیا اور صحافت کے سرمایہ میں اپنی بے باک اور بے خوف تحریروں سے گراں قدر اضافہ کیا۔ منشی جی حب الوطنی، علم دوستی، انسانیت نوازی، ادب پرستی، رواداری اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کے حامل تھے۔ میں اس موقع پر منشی جی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اس خصوصی نمبر کی کامیابی کے لیے اپنی نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔

وشوناتھ پرتاپ سنگھ
(وشوناتھ پرتاپ سنگھ)



پیغام

یہ جان کر مجھے بے حد مسرت ہوئی کہ نیا دور منشی نولکشور پر نمبر شائع کر رہا ہے۔ منشی نولکشور نے اشاعت و طباعت کے میدان میں جو گراں قدر اور بے مثال خدمات انجام دیں انھیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔ تمام ایشیا میں اشاعت و طباعت کی اگر کوئی تاریخ مرتب کی گئی تو اس میں منشی جی کو نمایاں ترین مقام حاصل ہوگا۔ لیکن ان کی شخصیت محض اشاعت و طباعت سے متعلق سرگرمیوں تک ہی محدود نہیں تھی۔ بلکہ وہ اس سے آگے بھی بہت کچھ تھے۔ وہ ایک نڈر، بیباک اور حق گو صحافی بھی تھے اور ادیب بھی۔ ادب نواز بھی تھے اور ادیب نواز بھی۔ وہ ہماری مشترکہ گنگا جمنی تہذیب کی ایک روشن علامت بھی تھے۔ وہ ہر مذہب، ہر عقیدے اور ہر مسلک کا یکساں طور پر احترام کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ہر عقیدے اور ہر مسلک کی کتابیں ہزاروں کی تعداد میں شائع کیں اور اس طرح ہم آہنگی و یکجہتی کی ایک قابل تقلید مثال پیش کر گئے۔

منشی جی نے جس اسپرٹ اور جس جذبہ سے کام لیا اسی اسپرٹ اور اسی جذبے سے ہمیں بھی کام کرنا چاہیے۔ تبھی ہم ہر شعبۂ حیات میں ہر سطح پہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کا ماحول قائم رکھ سکیں گے۔

مجھے یقین ہے کہ نیا دور کے اس خصوصی نمبر سے منشی نولکشور کی اہم شخصیت کے روشن پہلو اور ان کے کارنامے اور نمایاں ہوکر سامنے آئیں گے اور اس طرح ہم آہنگی و قومی یکجہتی کے جذبے کو بھی تقویت حاصل ہوگی۔

میں منشی جی کی عظیم شخصیت کو اپنا پرخلوص خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔

عمار رضوی

(عمار رضوی)

پیغام

مدیر محترم زید لطفہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ کا موقر جریدہ "نیا دور" لکھنؤ، آنجہانی منشی نول کشور پر خاص نمبر شائع کرنے جا رہا ہے۔ منشی صاحب گوناگوں خصوصیات و کمالات کے حامل تھے اور ہندستان کی اس گنگا جمنی تہذیب کا ایک عمدہ نمونہ تھے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے بنی تھی۔

منشی صاحب کی شخصیت میں بے تعصبی، وسیع المشربی، علم پروری و ادب نوازی، سیر چشمی اور عالی ہمتی جیسی نادر خصوصیات بیک وقت جمع ہو گئی تھیں جنھوں نے ان کو خاص شہرت و مقبولیت عطا کی اور جس کی وجہ سے ہند و بیرونِ ہند میں ان کا نام اور کام ابھی تک روشن ہے۔ انھوں نے اپنے پریس کو جس طرح اسلامیات اور عربی، فارسی اور اردو ادبیات کے لیے وقف کر دیا تھا اور اس کے ذریعہ نادر و نایاب کتابوں کو جس طرح سب کے لیے دستیاب کر دیا تھا وہ مسلمانوں اور اہل علم کے اوپر ان کا احسانِ عظیم ہے۔

کیسی کیسی ضخیم و عظیم کتابیں انھوں نے اپنی عالی ہمتی و فراخ حوصلگی سے شائع کیں جنھیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور ان کی معارف پروری اور علم دوستی کی داد دینی پڑتی ہے۔ میری دعا ہے کہ آپ کا یہ نمبر ان کے شایانِ شان ہو اور ہند و بیرونِ ہند کے شائقین علم کو ان کے کارناموں سے واقف کرانے میں مددگار ثابت ہو۔

والسلام

مخلص

ابوالحسن علی

نول کشور نمبر

پیغام

جناب محترم زید لطفکم

بعد آداب، گزارش ہے کہ آپ کے دو خط موصول ہوئے، مگر بوجہ مصروفیات جواب میں تاخیر ہوئی، یہ واقعہ ہے کہ جناب منشی نول کشور صاحب انسانی ہمدردی اور علم دوستی میں یکتا تھے ان کی علم دوستی اور علماء نوازی کا نتیجہ تھا کہ ۱۸۶۶ء میں جب دار العلوم قائم ہوا تو اس کے پاس طلبہ کو دینے کے لیے درسی کتابیں موجود نہیں تھیں اس کا حل یہ نکالا گیا کہ قرب و جوار کے اہل علم سے کچھ مدت کے لیے کتابیں مستعار حاصل کی جائیں مگر اس کے ساتھ کتابوں کی فراہمی کے لیے اہل ملک سے اپیل کی گئی، چنانچہ اس اپیل کا ملک میں خاطر خواہ اثر ہوا۔ اہل مطابع نے اس موقع پر اپنی مطبوعات بڑی فراخ دلی سے دار العلوم کو پیش کیں، حتیٰ کہ بعض ہندو مالکان مطابع نے بھی بفراخ دلی کتابوں سے دار العلوم کی اعانت کی، چنانچہ روداد میں اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ارباب مشورہ مدرسہ نہایت شکر گزار ہیں جناب منشی نول کشور صاحب مالک مطبع اعظم لکھنؤ کے جنھوں نے مثل سابق کمال دریا دلی فرمائی اور چند کتب مفیدے امداد مدرسہ میں ہمت فرمائی، فہرست ان کی مندرج ہے ان میں خاص کر نسخہ قاموس کہ کتب لغت میں بے نظیر ہے اور منشی صاحب نے اپنے مطبع میں اس کتاب کو نہایت خوبی اور صحت سے طبع فرمایا ہے'

مدرسہ میں اس سے پہلے کوئی نسخہ اس کتاب کا نہ تھا، یہ کتاب ایسی محتاج الیہ ہے کہ ہر مدرس اور طالب علم کو اس کی حاجت رہتی ہے۔ یہ عطیات بڑے نیک فال ثابت ہوئے، بعد میں مسلسل ہر سال مطابع میں چھپنے والی کتابیں دار العلوم میں آتی رہیں اور آج ہزاروں درسی اور غیر درسی کتابوں کا جو عظیم الشان ذخیرہ دار العلوم میں موجود ہے یہ اس کا ابتدائی نمونہ تھا، بہرحال اس سلسلہ میں پیش قدمی اور دوسروں کے لیے نمونہ بننے کی سعادت عبد الرحمن خان مالک مطبع نظامی کانپور اور منشی نول کشور آنجہانی کے حصے میں آئی۔ عبد الرحمن خاں صاحب اور منشی نولکشور جب تک زندہ رہے برابر اپنے مطبع سے چھپنے والی کتابوں کے نسخے دار العلوم میں بھیجتے رہے روداد وں میں نہ صرف ان کی دی ہوئی کتابوں کا ذکر موجود ہے بلکہ جابجا ان کا شکریہ بھی ادا کیا گیا ہے اور لکھا ہے کہ "منشی نول کشور صاحب مالک چھاپہ خانہ اعظم لکھنؤ اس امر میں زیادہ قابل شکریہ ہیں کہ باوجود بعد مسافت بہت سی کتب سے معاونت کی۔"

۱۲۹۲ھ کی روداد میں لکھا ہے:-

"جناب منشی نول کشور مالک "اودھ اخبار" لکھنؤ اور جناب راؤ سنگھ صاحب مالک اخبار "سفیر بڈھانہ" کا بالخصوص شکریہ کہ باوجودیکہ یہ دونوں صاحب اہل ہنود ہیں مگر آفرین صد ہزار آفرین ان کی سخاوت اور عنایت پر کہ اپنے اپنے اخبارات گراں بہا اس مدرسہ کو مفت عنایت فرماتے ہیں، جملہ ارباب شوریٰ مدرسہ ہذا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں اور سب صاحبوں کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ ان کے اخبارات اور کارخانہ جات کو دمبدم ترقی عطا فرمائے اور ان کی قوت و آزادی کو قائم رکھے اور آئندہ کو بھی ان حضرات سے امید ہے کہ اس طرح ہمیشہ کو ایسی ہی عنایات سے مدرسہ کو ممنون و مشکور فرماتے رہیں، اور جملہ اہالیان مدرسہ کو اپنا دعا گو و خیر خواہ سمجھیں۔"

اس وقت کسی مستقل مضمون لکھنے کی فرصت نہیں تھی اس لیے مناسب سمجھا گیا کہ دار العلوم کے مرحوم بزرگوں نے منشی نول کشور کے متعلق جو گرانقدر رائے قائم کی تھی اس کو جناب کے پاس بھیج دیا جائے جو مذکورہ بالا اقتباسات سے واضح ہے۔

(قاری) محمد طیب (مہتمم دار العلوم دیوبند)

پیغام

منشی نول کشور مشرقی علوم کے ایک مشہور و معروف ناشر تھے۔ لیکن وہ صرف ناشر ہی نہیں ان علوم کے عموماً اور اردو زبان و ادب کے خصوصاً شیدائی بھی تھے، خادم بھی اور محسن بھی۔ ان کے کارخانہ کتب نے لاتعداد اہم کتابوں کو شائع کرکے محفوظ کردیا ورنہ ان میں سے بیشتر کتابوں کے شاید نام بھی لوگوں کو معلوم نہ ہوتے۔ ہم اس کارخانے کے معیار ترتیب پر اعتراض کرتے وقت یہ فراموش کردیتے ہیں کہ سو برس پہلے ترتیب و تہذیب کا وہ تصور ہی کہاں تھا جو آج ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ معدودے چند مثالوں کو چھوڑ کر، ہم اس معیار تک بھی نہیں پہنچ پاتے جو نولکشور کے کارخانۂ کتب کے نمونوں نے پیش کیا تھا۔

مشرقی علوم و فنون کے ایسے شیدائی کی یاد میں خصوصی اشاعت کا انتظام کرنا لائق مبارکباد ہے اس لیے کہ

نام نیکِ رفتگاں ضائع مکن

[illegible]

پیغام

اردو اور فارسی پر، بلکہ کسی حد تک عربی پر بھی، منشی نولکشور مرحوم کے جو احسانات ہیں، کوئی صاحبِ علم ان سے انکار نہیں کر سکتا۔ آج اگر ان زبانوں کے ادب العالیہ کا بیشتر حصہ محفوظ رہ گیا ہے، اور ہمیں اس کے مطالعے کی اور اس سے استفادے کی سہولتیں میسر ہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جو مسودہ بھی منشی نولکشور تک پہنچا، یا جو پرانی کتاب بھی مرورِ زمانہ سے نایاب ہو چکی تھی، کسی کے توجہ دلانے پر، انھوں نے اس کی طباعت و اشاعت سے انکار نہیں کیا۔ بیشک، صحت کا وہ معیار حاصل نہ ہو سکا، جو چاہیے تھا۔ لیکن کیا یہ کچھ کم کارنامہ ہے کہ انھوں نے اس طرح سیکڑوں ہزاروں کتابوں کو ضائع اور ناپید ہونے سے بچا لیا!

علمی خدمت کے علاوہ، ان کی زندگی کا یہ پہلو بھی قابلِ ذکر، اور قابلِ تقلید ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی بہت معمولی حالت سے شروع کی تھی۔ وہ منشی ہرسکھ رائے کے پرچے "کوہِ نور" میں قلیل مشاہرے، غالباً دس روپے پر، ملازم تھے۔ جب منشی ہرسکھ رائے پر ادبار آیا، تو منشی نولکشور لاہور سے لکھنؤ چلے آئے۔ یہاں انھوں نے اپنے علم اور تجربے کے بل بوتے پر مطبع نولکشور قائم کیا۔ آدمی تھے محنتی اور مخلص، اللہ تعالیٰ نے ان کی یاوری کی اور ان کا کاروبار دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا چلا گیا۔ مطبع نولکشور کی کتابیں سکۂ رائج الوقت کی طرح ہندستان اور افغانستان کے گھر گھر میں ہاتھوں ہاتھ لی گئیں۔ حکومتِ ہند نے انھیں سی۔ آئی۔ ای کے خطاب سے نوازا۔ امیرِ افغانستان نے بھی اِنھیں خدمات کے باعث ان کا اعزاز و اکرام کیا۔

یہ امر باعثِ مسرت و اطمینان ہے کہ ماہنامہ "نیا دور" اپنا ایک شمارہ اس محسنِ اردو کے لیے وقف کر رہا ہے۔ فرد ہو، یا قوم، جو بھی اپنے محسنوں اور خادموں کو فراموش نہیں کرتا، وہ قابلِ صد ستایش ہے!

مالک رام
۵ر اکتوبر ۱۹۸۰ء

پیغام

پنجم گووا ۴ اکتوبر ۸۰ء

عزیزم یہ معلوم کرکے کہ آپ نول کشور نمبر شائع کرنا چاہتے ہیں بے حد خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کے ارادوں میں برکت دے۔ منشی نول کشور کے اردو فارسی اور عربی پر بڑے احسانات ہیں۔ انھوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد اسلامی ذخیروں کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔ میں نے ان کے مطبع کی چھپی ہوئی کتابیں تاشقند، سمرقند، تہران، لندن اور نیویارک میں دیکھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو ان پر اور سلام آپ پر کہ آپ ان نیک بندوں کی یاد کو تازہ کرنا چاہتے ہیں۔

ہوائی جہاز میں۔ خیر طلب

خواجہ احمد فاروقی

دہلی یونیورسٹی

پیغام

مکرمی تسلیم

مجھے یہ معلوم کرکے بے حد مسرت ہوئی کہ ادارہ "نیا دور" منشی نول کشور کی خدمات کے اعتراف کے طور پر ایک خصوصی شمارہ شائع کر رہا ہے۔ منشی صاحب نے نول کشور پریس قائم کرکے اردو کتابوں کی اشاعت کا بڑے پیمانے پر انتظام کیا اور لاہور، کانپور اور لکھنؤ ہر مرکز سے اہم کتابیں شائع کیں یہ کام بجائے خود کچھ کم اہم نہیں تھا، لیکن اس سے بھی اہم یہ امر تھا کہ انھوں نے صاحب نظر ادبا اور شعرا کو تصنیف، تالیف اور ترجمے پر مائل کیا، بہتوں کی خدمات مستقل طور پر حاصل کیں اور اس طرح طباعت و اشاعت کا کام بے حد منظم اور مرتب طریقے پر کئی دہائیوں تک مسلسل ہوتا رہا۔ آج اردو میں مطبوعہ کتابوں کا جو شاندار ذخیرہ پایا جاتا ہے اس کا بہت بڑا حصہ نول کشور پریس کی طباعتی سرگرمیوں کا مرہون منت ہے۔ اگر منشی نول کشور کی مسلسل توجہ اس اہم منصوبے پر مرکوز نہ رہی ہوتی تو ہم اردو کے بہت سے شہ پاروں سے محروم رہ جاتے۔

اردو صحافت میں بھی "اودھ اخبار" کے ذریعے سے روزنامہ نگاری کی روایتوں نے فروغ پایا اور مدتوں "اودھ اخبار" کا شمار اردو روزناموں کے قافلہ سالاروں میں ہوتا رہا۔ منشی نول کشور صرف ایک بہت نمایاں ناشر کتب ہی نہیں تھے بلکہ خود اردو کے مصنف بھی تھے ان کی یاد اس حیثیت سے بھی آتی رہے گی۔

اگرچہ اب نول کشور پریس دو حصوں میں بٹ گیا ہے لیکن ان کے ورثا منشی صاحب کی روایت کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اور دونوں ہی حصوں یعنی رام کمار پریس اور تیج کمار پریس میں اردو کی طباعت اور اشاعت کا کام چل رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ہمیشہ اس روایت کو ایک قیمتی امانت سمجھ کر جاری رکھیں گے اور قوی تر بنائیں گے۔

(دستخط)

(علی جواد زیدی)

صدر

پیغام

منشی نول کشور اور ان کے مطبع نے گزشتہ سوا سو برس کے اندر ایسے قابل فخر کارنامے انجام دیئے ہیں کہ جن کی یادگار علمی اور تعلیمی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی وہ ان لوگوں میں ہیں جنھوں نے علمی توسیع میں چھاپہ خانہ کی اہمیت کو بہت جلد محسوس ہی نہیں کیا بلکہ عملی اقدام کرکے ایک قابل اتباع مثال قائم کی اور بہت جلد مطبع نولکشور علمی دنیا کا ایک جانا بوجھا اور معتبر نام بن گیا۔ اردو فارسی اور عربی کی معمولی طور پر جتنی کتابیں اس مطبع کی بدولت سہل الحصول ہو گئیں اتنی ہندستان و پاکستان کے بہت سے مطابع کی مجموعی کوششوں سے بھی ممکن نہ ہو سکیں اس مطبع نے نہ صرف برصغیر میں بلکہ عالمی پیمانہ پر بھی اپنی کارگزاری کا نقش پائیدار قائم کیا۔ مشرقی ذخائر پر مشتمل اس وقت دنیا کا کوئی کتب خانہ ایسا نہیں ہے جہاں اس مطبع کی کتابیں نہ ملتی ہوں بلکہ معمولی سا بھی علمی شغف رکھنے والا کوئی خانوادہ یا شخص برصغیر میں ایسا نہیں ہوگا جس کے پاس منشی نولکشور کے مطبع کی کتابیں نہ موجود ہوں۔ ان باتوں کے علاوہ انھوں نے ان کتابوں چھاپنے کا ایک ایسا منصوبہ برابر قائم رکھا کہ جس سے نہ صرف غریب مگر شائق ضرورت مندوں کو بہت فائدہ پہونچا بلکہ یہ بھی اندازہ ہوا کہ منشی نولکشور محض تاجر نہیں تھے بلکہ علم اور توسیع علم کے سچے خیر خواہ اور خواہشمند تھے اور انھوں نے تجارت نہیں بلکہ ریاضت اور علمی خدمت بھی کی ہے کتابوں کی اشاعت ہی کے سلسلے میں انھوں نے نہایت اہتمام سے تقریباً مسلسل ایسے دانشوروں اور علما کو اپنے مطبع سے وابستہ رکھا کہ جن کی سر بلندی آج علمی تاریخ میں مسلّم سمجھی جاتی ہے اس طرح ان کا مطبع ایک چھاپہ خانہ سے بلند ہو کر ایک مستعد اور فعال اکیڈمی بن گیا، جس کی کارگزاری کا اثر تاریخ میں ہمیشہ محسوس کیا جائے گا۔ اس لیے کہ بہت سے مصنفین، کتابیات اور ان کے متعلق معلومات کا انحصار مطبع نولکشور کے مطبوعات پر ہے۔

بہت خوشی کی بات ہے کہ ماہنامہ نیا دور اس مطبع کے خدمات کے اعتراف میں ایک خصوصی نمبر شائع کر رہا ہے اور اس طرح ایک ایسے فرض کو ادا کر رہا ہے جس کے لیے پوری علمی دنیا احسان مند رہے گی۔ مجھے یقین ہے کہ یہ نمبر اہتمام، انتظام اور شائستگی کی ان تمام اچھی روایات کے مطابق ہوگا جو ہمیشہ سے ماہنامہ نیا دور کا طرہ امتیاز رہی ہیں۔

[illegible]



پیغام

اردو کے محسنوں میں منشی نول کشور کا نام ہمیشہ سنہرے حرفوں سے لکھا جائے گا۔ انھوں نے ایک ایسے زمانے میں، جب اردو طباعت کی طرف زیادہ توجہ نہیں تھی، ایسا کارنامہ انجام دیا جس سے اردو کتابیں لاکھوں کروڑوں گھروں تک پہنچ سکیں۔ وہ ایک دور اندیش، سلیقہ مند اور مردم شناس انسان تھے۔ انھوں نے محنتی اور ذہین لوگوں کو مطبع کے کام میں لگایا اور ان سے ایسی خدمت لی جو تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ احسان مندی کی نظروں سے دیکھی جائے گی۔ وہ ادب کا بھی رچا ہوا مذاق رکھتے تھے، ورنہ مطبع نول کشور سے اتنی بڑی تعداد میں صاف ستھری، معیاری، بلند پایہ اولی تصانیف و تالیفات چھپ کر شائع نہ ہوسکتیں۔ فرد کا کتنا زبردست اثر اداروں اور جماعتوں پر پڑتا ہے اور اچھی قیادت کس طرح اداروں میں جان ڈال کر ان سے لافانی کارنامے انجام دلواتی ہے اس کی بہترین مثال نول کشور کی زندگی ہے۔

(پروفیسر گوپی چند نارنگ)

صدر شعبۂ اردو

رمضۃ الاکرام

کشور

وہ سخن ور تھا
نہ افسانہ نگار
نہ مصور نہ ادیب
نہ مجاہد نہ خطیب
محسن شعر و ادب تھا
وہ تھا اردو کا نقیب
شعر و افسانہ و تصویر سے بالا تھا وہ،
شاعری کا وہ محافظ تھا
نگہباں تھا ادب پاروں کا
اک مجاہد تھا کہ تھا معرکہ آرائے بساط معنی
اس کے فیضان عنایت کی قسم کھاتا تھا یا زانِ کلم کا فسونِ گفتار

وہ فدائی بھی تھا، دلدار بھی تھا اردو کا
اس نے اردو کو دیا اپنی محبت کا سرور
اس نے اردو کو دیا اپنی محبت کا غرور
وہ تھا عرفانِ ادراک ذہن کا شعور
اس کا سینہ تھا کتابوں کی ضیا سے روشن
کار پرداز عمل نقش گر فکر تھا وہ
جستجو اس کو لیے پھرتی تھی منزل منزل

ڈھونڈ لاتا تھا حوادث کے خرابوں سے زیاں خوردہ کتابیں کہ انہیں
پیکر تازہ میں ڈھالے' ابدیت بخشے،
وہ تھا غواص
پہنچ کر تہہ تک
ذہن کی انگلیوں سے چنتا تھا لعل و گوہر،
مصرف خامہ و قرطاس کا تھا واقف کار
وہ تھا آگاہ، فن و علم کا مقصد کیا ہے؟
ربط الفاظ و معانی کی بلاغت کا عناں دار تھا وہ
دُرج کاغذ سے کیا جوہر تحریر کا سودا اس نے
کتنی لیلاؤں کو اوراق نشیں اس نے کیا
کتنی سرگشتہ ہواؤں کو بقا زار چمن تک لایا
لوحِ محفوظ کی مانند تھی فطرت اس کی
دے کے شہ پاروں کو دامانِ تحفظ کی پناہ
صورت مہر و قمر زندۂ جاوید کیا
جس کی ضو ماضی سے امروز تک آئی ہے لیے کتنے چراغوں کی قطار

اس کی پہچان یہی روشنی ہے
اس کا احسان یہی روشنی ہے
روشنائی سے نہیں، روشنی سے اس کا فسانہ لکھو

وقار خلیل

نولِ کشور کتابِ جنوں کا بابِ خرد

نول کشور، کتابِ جنوں کا بابِ خرد
زبانِ اُردو پہ احسان اَن گنت ہیں ترے
ترے جنوں کا کرشمہ اَدب کا پھیلاؤ
تری خرد کے تصدق متاعِ عرضِ ہُنر
تری نظر نے قلم کو فضیلتیں بخشیں
کتابِ دل کی ورق در ورق کہانی کو
حقیقتوں کا لباسِ دوام تجھ سے مِلا
حدیثِ دانش و حکمت کو آگہی دے کر
ترے جنوں نے جلائے ہیں تیرگی میں چراغ
کتابیں چھاپنا، پھیلانا گاؤں گاؤں میں
یہ اشتیاق، یہ جذبہ، یہ عشق اُردو سے
تجھی پہ ختم، تجھی سے چلی تھی رسمِ وفا
اِدھر کچھ ایسا ہے رندوں میں بدحواسی ہے
برائے بیت ہی اُردو سے ربط باقی ہے
کتاب اور قلم کی فضا سیاسی ہے
شعورِ فکر و نظر میں ابھی اداسی ہے
نئی امنگ ہو پیدا، نئے چراغ جلیں
نول کشور سے اخلاص کے گلاب کھلیں
غریب اردو بھی اترائے علم و فن مہکے
یہ آرزو ہے کہ اردو بھی سربلند رہے

نشور واحدی

سیر [redacted] شیا

مطبع نول کشور کا وہ نازِ ایشیا — گنجینۂ علوم میں اعجازِ ایشیا
قائم تھا اُس سے علم و معارف کا اک نظام — محتاج اس کے حسنِ طباعت کا ہر امام
شاعر کو اپنے شعر کا پیکر وہیں ملا — عالم کو اپنے علم کا محور وہیں ملا
وہ رسمِ خط جو باعثِ رشکِ فرنگ تھا — انگریز اس کو دیکھ کے ہر لمحہ دنگ تھا
اس رسمِ خط کو اس نے بصیرت بنا دیا — ہر مشرقی نژاد کی سیرت بنا دیا
اردو ہو فارسی ہو کہ نطقِ عرب ہو وہ — اس ایشیا کی خاک کا کوئی ادب ہو وہ
ذوقِ نول کشور کا احسان سب پہ ہے — ہندوستاں سے تا حدِ ایران سب پہ ہے
اوراق اس کے رہبرِ عصرِ جدید تھے — وہ آئنہ تھا جس میں سبھی محوِ دید تھے
تہذیبِ نو میں آئنہ دارِ چمن ہے وہ — مشرق میں ابتدائے بہارِ وطن ہے وہ
کاغذ کو ایک موڑ دیا دل بنا دیا — ہر راستہ کو چھاپ کے منزل بنا دیا

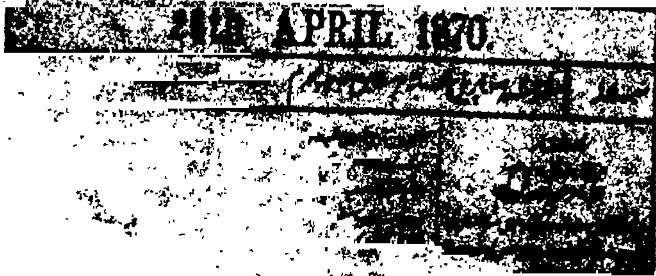
ایوانِ علم ایسا سجایا نہ جائے گا
تاریخِ ایشیا میں بھلایا نہ جائے گا

ڈاکٹر اکبر حیدری

منشی نول کشور

اور اودھ اخبار




اودھ اخبار
28th APRIL 1870

یہ زمانے کی بدقسمتی ہے کہ اس نے اردو کے محسن عظیم منشی نولکشور کے حالات زندگی اور ان کے کارناموں کو صفحۂ قرطاس پہ محفوظ نہیں کیا ناقدین اردو ادب کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا المیہ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے منشی صاحب کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ اگر موصوف کسی مغربی ملک کے ہوتے تو نہ معلوم ان پر کتنی کتابیں لکھی گئی ہوتیں۔ اور ان کے نام پر کتنے ادارے اور یادگاریں قائم ہوتیں راقم کو انتہائی کوشش کے باوجود ان کے زیادہ حالات دستیاب نہیں ہو سکے۔ جو کچھ بھی معلومات فراہم ہوئیں وہ زیادہ تر اودھ اخبارات کی فائلوں سے مرتب کی گئی ہیں.

منشی نول کشور انسان دوست، محب وطن اور روشن خیال آدمی تھے ان کا دل مذہبی تعصب سے بالکل پاک و صاف تھا بڑے عادل اور خیر خواہ تھے، غریبوں کے غم خوار اہل ہنر

کے قدردان تھے۔ اس سلسلے میں نواب احمد حسین تخلص جوش کی نظم بعنوان "اشعار آبدار بطرز مثنوی" ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ جو ان کی سیرت و کردار کی آئینہ دار ہے۔ یہ نظم یکم مارچ سنہ ۱۸۸۰ء کے اودھ اخبار کی اشاعت میں صفحہ ۲۰۵ پر اس طرح چھپی ہے:

"اشعار آبدار بطرز مثنوی"

"طبعزاد نواب محمد احمد حسن خان بہادر جوش تخلص رئیس لکھنؤ"

"نواب صاحب ممدوح نے چند اشعار از راہ خلوص و اتحاد ہمارے آقائے نعمت جناب منشی نول کشور صاحب مالک مطبع اودھ اخبار کے صفات عطیۂ الہٰی و طبعی و اخلاقی کے بیان میں تصنیف فرما کر ہمارے پاس بھیجے ہیں۔ پس ایڈیٹر اودھ اخبار اشعار مذکور کو نہایت خوشی سے ذیل میں نذر ناظرین کرتا ہے۔"

معنیِ صورتِ مروت و حلم   منبع لطف و مہر و معدنِ علم
نامیِ روزگار، در ہر فن   نکتہ سنج و فہیم ہر سخن
شاداں کردہ خلق را کرمش   شور در عالم است از حشمش
یوسفِ با جمال در روئی   تم تواج مصر خوش خوئی
ناظم ملک اتقا و یقیں   ناصر جملہ اہل ملت و دیں
دہ چہ روے کہ بر صباحت او   والہ و عاشق است ہر خورشید
لالۂ بوستانِ فضل و کمال   لولوے بحرِ حشمت و اجلال
کر بخشش جہاں تہ افلاک   کرد فقیر اند صاحب املاک
شاہد مقصد است در طلبش   شکر ہیں ہر کلام بے بدلش
واقفِ امرِ حق، حقیقت جو   دہ چہ عقل سلیم دارد او
نسبہ دانِ شریف و ہر ذی قدر   روشن است اسم پاک او از بدر
صادق القول صاحب اخلاص   صابر و شاکر و ز رنج خلاص
آفتابِ سپہر عز و علا   اختر چرخ فہم و ذہن و ذکا
حاتمِ عہد ما بلا تشریح   حد و صفش نہ لائق توضیح
بانیِ عدل و داد فیض مآب   بزمانہ دگر چو او نایاب
محو دارد خدا ز رنج جہاں   دائم او را بحق مقبولاں
دشمنش ہمچو ابر گریاں باد   خیر خواہش چو برق خنداں باد
اندریں نظم نکتہ ایست نہاں   گرشود کشف تا کنم ز بیاں
نکتہ است ایں کہ گر ز صدر و عروض   آنکہ ہست از عروضیاں معروض
نیز از ضرب و ابتدائی بیت   آنکہ شد در میان و پایانی بیت
گیری از حرف یک یک از اشعار   اسم ممدوح می شود اظہار
می شود از چہار قسم عیاں   نامش از بیت پانزدہ تو بخواں
ثابت آں بیت است و القاب   گر توانی شمار کن بحساب
جوشش از فضل ایزد متعال
ختم ایں نظم شد بحسن مقال

منشی نول کشور ہر لحاظ سے بلند پایہ آدمی تھے۔ انھیں ایک بے لوث سماجی کارکن کی حیثیت سے غیر معمولی اہمیت حاصل تھی۔ قومی یکجہتی کو فروغ دینے کے لیے بڑی محنت اور تندہی سے کام کرتے تھے اور ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے۔ لکھنؤ میں رفاہ عام کے کاموں کے لیے سنہ ۱۸۶۸ء میں ایک انجمن "جلسہ تہذیب لکھنؤ" کے نام سے قائم ہوئی تھی۔ منشی صاحب اس کے روح رواں تھے۔ مسٹر کومیٹن، ڈپٹی کمشنر لکھنؤ پریسیڈنٹ تھے۔ مسٹر ہینڈ فورڈ، ڈائرکٹر تعلیم، رابرٹ بانکٹ پرنسپل کیننگ کالج، چودھری نعمت اللہ خاں اور کچھ دیگر معززین شہر ممبران تھے۔ سنہ ۱۸۶۹ء کے سالانہ جلسے کی کارروائی اودھ اخبار مورخہ ۱۲ اپریل سنہ ۱۸۷۰ء کے صفحہ ۲۵۲ پر چھپی ہے۔ جلسے میں نول کشور صاحب نے "کتب خانوں کے فوائد" پر ایک معلوماتی تقریر کی تھی۔ آگرہ میں "انجمن آگرہ" کے نام سے ایک ادبی اور سماجی ادارہ قائم ہوا تھا۔ انجمن کا نصب العین یہ تھا کہ مغربی علوم و فنون کو اہل ہند میں رواج دیا جائے۔ منشی صاحب اس کے بھی ایک سرگرم کارکن تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موصوف بذات خود ایک انجمن اور ایک ادارہ تھے۔ برٹش گورنمنٹ کے اعلیٰ افسران ان کے مفید مشوروں سے ہمیشہ مستفید ہوتے رہے۔ سنہ ۱۸۷۸ء میں جب سرکار کی طرف سے ٹیکس عائد کیا گیا اور اس کے نفوذ سے عوام پریشان ہونے لگے تو منشی صاحب نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ حکام نے اودھ اور روہیل کھنڈ کے درمیان ریل کی آمد و رفت میں تبدیلی کی۔ اس اقدام سے لوگوں میں بڑی بے چینی پھیلی۔ منشی نول کشور نے اس کے خلاف زبردست احتجاج کیا۔ اس سلسلے میں جو پر مغز تقریر انھوں نے مورخہ ۱۲ مئی سنہ ۱۸۷۸ء کو

" جلسہ تہذیب لکھنؤ" میں کی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رفاہ عامہ کا ان کے دل میں کتنا احساس تھا۔ اور وہ کس قدر زندہ دل اور رفاہی ہمت تھے۔ ان کی پوری تقریر ضمیمے میں شامل ہے۔[۲]

منشی نول کشور بڑے ہر دل عزیز تھے، سرکاری تقریبوں میں ان کی موجودگی ضروری سمجھی جاتی تھی۔ جب ۱۷ مارچ ۱۸۷۶ء کو وقت صبح نواب شجاع الدولہ مختار الملک سید تراب علیخاں سالار جنگ حیدرآباد وارد لکھنؤ ہوئے تو جن لوگوں نے ان کا استقبال کیا تھا ان میں سرکردہ اعلیٰ افسران کے علاوہ معززین شہر بھی شامل تھے ان میں راجہ محمد امیر حسن خاں امیر الدولہ والی محمود آباد اور منشی نول کشور مالک اودھ اخبار اور لکھنؤ ٹائمس امتیازی خصوصیت رکھتے تھے۔ راجہ صاحب نے جب سالار جنگ کی دعوت کا اہتمام لکھنؤ میں کیا تو منتظمین میں منشی صاحب پیش پیش تھے[۳]۔ نواب موصوف لکھنؤ میں معشوق منزل میں اترے تھے۔ جن لوگوں نے ان سے ملاقات کی تھی ان میں منشی صاحب اور اودھ اخبار کے ایڈیٹر رتن علی صاحب بھی تھے معشوق منزل میں سالار جنگ کا قیام دو چار دن رہا تھا اس دوران منشی صاحب ان کے پاس برابر جاتے رہے۔ اور دونوں میں بے تکلفانہ گفتگو ہوتی تھی۔ جب وہ کانپور تشریف لے گئے تو اسٹیشن پر اور لوگوں کے علاوہ راجہ امیر حسن خاں اور منشی نول کشور بھی موجود تھے۔ منشی صاحب نواب سالار جنگ کے ساتھ کانپور بھی گئے تھے۔ نواب صاحب نے منشی نول کشور اور مطبع اودھ اخبار کی بڑی تعریفیں کی تھیں۔

مطبع اودھ اخبار

یہ مطبع منشی نول کشور کے ہاتھوں ۱۸۵۸ء میں قائم ہوا تھا اور اس میں سیکڑوں لوگ کام کرتے تھے۔ اودھ اخبار مطبوعہ ۲۴ مئی ۱۸۷۸ء صفحہ ۵۰۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے علاوہ اس کی شاخیں کانپور، دریبہ کلاں دہلی، اور عظیم آباد بازار گورہٹہ میں بھی تھیں اگر مطبع اودھ اخبار نہ ہوتا تو ہم تک میرؔ، سوداؔ، میر دردؔ، مصحفیؔ، انشاؔ، جرأتؔ، میر حسنؔ، ناسخؔ، آتشؔ، غالبؔ، انیسؔ، دبیرؔ، مونسؔ، ضمیرؔ، دلگیرؔ، فصیحؔ، اوسؔ بلگرامی، رندؔ، وزیرؔ، صباؔ، اسیرؔ، امیرؔ، نساخؔ، شیفتہؔ، نظیرؔ اکبرآبادی، مومنؔ، تفتہؔ، وغیرہ کا کلام نہ پہنچتا۔ مطبع نے کم و بیش تمام کلاسکی شعرائے اردو اور نثر نگاروں کی تخلیقات شائع کرکے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے جو تاریخ ادب میں سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ہیں۔ علاوہ اردو کتابوں کے منشی صاحب نے فارسی اور عربی کی سیکڑوں کتابیں شائع کرکے ان دونوں زبانوں کی بے لوث خدمات انجام دیں۔ ان میں فردوسی کا شاہنامہ، نظامی کا خمسہ، جامی کا خمسہ، خسرو کا خمسہ، دیوان کلیات نظیری، کلیات ظہوری، کلیات صائب، کلیات سعدی، کلیات ظہیر فاریابی، کلیات خاقانی، کلیات وحید، کلیات بیدل، دیوان حافظ، دیوان حزیں، دیوان ناصر علی سرہندی وغیرہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ منشی صاحب نے فارسی سے اردو میں لاتعداد کتابوں کے ترجمے مطبع سے شائع کرائے۔ ان میں شاہنامہ فردوسی، مثنوی مولانائے روم، سیر المتاخرین، تاریخ فرشتہ، کیمیائے سعادت، تفسیر حسینی، آئین اکبری، اخلاق جلالی، اخلاق محسنی اخلاق ناصری وغیرہ مشہور ہیں۔ اسی طرح عربی سے بھی سیکڑوں کتابوں کے ترجمے شائع کیے۔ ان میں فتاویٰ عالمگیری (۱۰ جلدیں) احیاء العلوم الغزالی، مشکوٰۃ شریف (پانچ جلدیں) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح موصوف نے سنسکرت سے رامائن، مہابھارت، بھگوت گیتا، سکھ ساگر اور دوسری کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرایا۔ انھوں نے سنی اور شیعہ فرقوں کی بے شمار مذہبی کتابیں بھی شائع کیں۔ طب اور علم نجوم پر بھی بیشتر کتابیں زیور طبع سے آراستہ کیں۔ ان کتابوں کے علاوہ فارسی، اردو اور عربی کے کئی مستند لغات بھی شائع کیے۔ ان میں فرہنگ آنند راج، ہفت قلزم، مؤید الفضلا، جامع اللغات (مرتبہ غلام سرور لاہوری) غیاث اللغات، لغیر اللغات، قاموس صراح، فقہ اللسان وغیرہ نہایت ہی اہم ہیں۔ گارساں دتاسی مورخہ ۲ دسمبر ۱۸۶۷ء کے خطبے میں کہتے ہیں۔

" مسٹر بیمس (BEAMS) نے مجھے مطبع نول کشور کی کوئی چھ سو کتابوں کی فہرست بھیجی ہے۔[۴]

مولانا سید سلیمان ندوی ۱۶ جنوری ۱۹۳۷ء کے خطبۂ صدارت میں کہتے ہیں کہ،

"سب سے آخر لکھنؤ کے اس مطبع کا نام لیا جاتا ہے جس کی زندگی اب اسّی برس کے قریب پہنچ گئی ہے۔ اس سے میری مراد نول کشور کا مشہور نول کشور پریس ہے۔ یہ غدر کے بعد ۱۸۵۸ء میں قائم ہوا اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ مشرقی علوم و فنون کی جتنی ضخیم اور کثیر کتابیں اس مطبع نے شائع کیں، ان کا مقابلہ ہندوستان کیا مشرق کا کوئی مطبع نہیں کر سکتا۔ ہماری زبان کی اکثر ادبی اور علمی کتابیں اسی مطبع سے چھپ کر نکلیں۔ شعراء کے دواوین، مثنویاں، ڈرامے، قصے، افسانے، داستانیں اور درس کی عام کتابیں سب اسی کی کوششوں کی ممنون ہیں[۴]۔"

اودھ اخبار

منشی نول کشور نے تیئیس برس کے سن میں ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ میں واقع کوٹھی مہاراجہ مان سنگھ بہادر ایک پریس مطبع اودھ اخبار کے نام سے قائم کیا۔ پھر اسی سال انھوں نے ایک ہفتہ وار اخبار "اودھ اخبار" کے نام سے شائع کرنا شروع کیا۔ بقول امیر حسن نورانی[۵] ابتدا میں یہ پندرہ روزہ رہا۔ مرزا محمد عسکری کہتے ہیں کہ پہلے یہ ہفتہ دار تھا اور اس کے بعد روزانہ ہوا[۶]۔ راقم الحروف کو اودھ اخبار کی جو فائلیں ۱۸۶۳ء سے ۱۸۷۵ء تک دیکھنے کا اتفاق ہوا، ان میں کوئی پندرہ روزہ یا روزانہ نظر سے نہیں گزرا۔ ان فائلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اخبار ہمیشہ ہفتہ وار ہی تھا۔

اودھ اخبار ہندوستان کے علاوہ لندن، فرانس اور دوسرے مغربی ممالک میں بھی پڑھا جاتا تھا۔ اردو کے مشہور فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی کو یہ اخبار لکھنؤ سے مسٹر ایڈورڈ ہنری پامر بھیجا کرتے تھے۔ دتاسی دسمبر ۱۸۶۹ء کے خطبے میں کہتے ہیں کہ:

"یہ اخبار پچھلے سات سال سے نہایت کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ چنانچہ اس کی ہر اشاعت پچھلی اشاعتوں سے بہتر نظر آتی ہے۔ اس کی تقطیع اور صفحات کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ اخبار ہفتہ وار ہے اور ہر چہار شنبہ کے روز شائع ہوتا ہے۔ شروع میں اس میں صرف چار صفحے ہوا کرتے تھے اور وہ بھی چھوٹی چھوٹی تقطیع پر۔ پھر چھ ہوئے اور پھر سولہ اور اب وہ اڑتالیس صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلے کے مقابلے میں اس کی تقطیع بھی بڑی ہو گئی ہے۔ میرے خیال میں اس سے زیادہ ضخیم اخبار ہندوستان بھر میں اور کوئی نہیں ہے[۷]۔"

اودھ اخبار بعد میں ہفتے میں ہر سہ شنبہ کو بڑی تقطیع ۱۲×۸ اور تین کالموں میں چھبیس صفحات میں چھپتا تھا۔ ابتدائی پرچوں میں آغاز میں کوئی نہ کوئی اشتہار شائع ہوتا تھا۔ بعد میں جنوری ۱۸۷۰ء سے صفحۂ اول میں شیو پرشاد منیجر اودھ اخبار کے نام سے ایک خاص عبارت اخبار کی افادیت کے سلسلے میں چھپتی تھی۔ ابتدا میں ذیل کا شعر درج ہوتا تھا:

الٰہی جلوۂ برق تجلی دہ زبانم را
قبول خاطر موسیٰ کلاماں کن بیانم را

اودھ اخبار کی فائلوں میں مرزا غالب، میر انیس، مرزا دبیر، مرزا حاتم علی خاں مہر، مرزا ہرگوپال تفتہ، کلب حسین خاں نادر، مرزا رجب علی بیگ سرور، عبد الغفور خاں رعنا، سر سید احمد خاں اور محسن الملک وغیرہ جیسے بلند پایہ شاعروں اور نثر نگاروں کے بارے میں مفید اور وسیع معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ مرزا غالب، میر انیس اور مرزا دبیر وغیرہ شعرائے مسلم الثبوت کی تاریخہائے وفات بکثرت چھپی ہیں۔ ان کے بارے میں کچھ مفید باتیں بھی پہلی مرتبہ دریافت ہوتی ہیں۔

اودھ اخبار میں دنیا بھر کی خبروں کے علاوہ سرکاری قوانین اور احکامات وغیرہ کے ترجمے بھی عوام کی آگاہی کے لیے شائع ہوتے تھے، عدالتی اور میونسپل کمیٹی کی کارروائیوں اور ریلوے ٹائم ٹیبل کے متعلق وقتاً فوقتاً اہم اطلاعات شائع ہوتی تھیں۔ ان کے علاوہ کم و بیش ہر پرچے میں عوام کی سہولت کے غیر معمولی اشتہارات بھی چھپتے تھے۔ بعض اشاعتوں میں ضروری اطلاعات ناگری رسم خط میں بھی شائع ہوتی تھیں۔

اخبار میں انجمنوں، مشاعروں، جلسوں اور ثقافتی تقریبات

کی کارروائیاں بھی چھپتی تھیں۔ اکثر بیشتر شعراء کا کلام بھی چھپتا تھا۔ اگر ان شعراء کے کلام کو یکجا کیا جائے تو ایک اچھا خاصا مجموعہ مرتب ہو سکتا ہے۔ ان میں بہت سے شعراء ایسے ہیں جن سے اردو دنیا ناواقف ہے۔ مثلاً نواب امجد حسین جوش تخلص سہسوانی، راجہ درگا پرشاد (پٹنہ)، ناخوحسین ناظر، جوہر سنگھ جوہر، مرزا یوسف علی خاں تخلص عزیز شاگرد غالب، محمد سلطان اسد، سیاح، گردھاری لال اسد، حضور بلگرامی، جمشید علی جم، محمد مقیم مقیم، مشتری (شمس لکھنوی والی) وغیرہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اودھ اخبار کی فائلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایام گزشتہ میں ہندستان کے طول و عرض میں اردو اخباروں کا جال بچھا ہوا تھا اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ لوگوں میں اخبار بینی کا شوق کس قدر جاگ رہا تھا۔ جن اخباروں کے حوالے ۱۸۸۰ء تک اودھ اخبار میں ملتے ہیں ان میں سے چند اخبار یہ ہیں۔

کوہ نور لاہور، پنجابی اخبار، سرکاری اخبار لاہور، وکٹوریہ اخبار سیالکوٹ، اخبار عالم لاہور، خیر خواہ پنجاب سیالکوٹ، احسن الاخبار، اکمل الاخبار، نجم الاخبار، نور الابصار، بحر الاخبار، اخبار عالم میرٹھ، کشف الاخبار، آئینہ ہند، آفتاب عالم تاب، مفرح القلوب، ماہ پرتو، برق خاطف، لارنس گزٹ، مفصلیٹ گزٹ آگرہ، شعلۂ طور، صبح صادق، آبحیات ہند، کارنامہ لکھنؤ، نور الانوار، آفاق الاخبار، شمس الاخبار، عمدۃ الاخبار، مظہر الاخبار، ریاض الاخبار (مدراس) قاسم الاخبار، گنج شائیگاں، سائنٹفک سوسائٹی، تہذیب الاخلاق، آئینۂ علم، اردو اخبار آگرہ، دبدبۂ سکندری، علی گڑھ گزٹ، غالب الاخبار، اردو گائڈ، روہیل کھنڈ اخبار، نور نظر، احسان الاخبار۔

ان اردو اخباروں کے علاوہ اودھ اخبار میں گزٹ آف انڈیا، انڈین ڈیلی نیوز، فرینڈ آف انڈیا اور پانیر جیسے انگریزی اخباروں کی اہم خبروں اور مضامین کے ترجمے بھی چھپتے تھے۔ خود منشی نول کشور بھی انگریزی میں ایک ہفتہ وار لکھنؤ ٹائمس شائع کرتے تھے۔ اس کے ایڈیٹر ایک قابل انگریز تھے۔ منشی صاحب انہیں معقول تنخواہ دیتے تھے۔

گارساں دتاسی اپنے ۲ دسمبر ۱۸۶۷ء کے خطبے میں کہتے ہیں کہ

"اردو کے سب اخباروں میں "اودھ اخبار" بہترین خیال کیا جاتا ہے۔ اس کی ہر اشاعت چوبیس صفحوں پر مشتمل ہوتی ہے اور ہر صفحے میں دو کالم ہوتے ہیں کان پور سے اس کا ضمیمہ شائع ہوتا ہے جس کا نام "کان پور گزٹ" ہے لیکن جب سے لکھنؤ اور کان پور کے درمیان ریل بن گئی ہے اس وقت سے "کان پور گزٹ" کی اشاعت موقوف کر دی گئی۔ اس لیے کہ اب خود اودھ اخبار آسانی کان پور پہونچ جاتا ہے[۵۹]۔"

اسی طرح دتاسی مورخہ ۲ دسمبر ۱۸۶۸ء کے خطبے میں اودھ اخبار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اودھ اخبار میں جو اب دس سال سے نہایت کامیابی سے چل رہا ہے۔ بعض اوقات فارسی اور اردو کی اعلیٰ پایے کی غزلیں شائع ہوتی ہیں۔ غزلوں کے علاوہ مخمس اور قصیدے بھی ہوتے ہیں۔ حال ہی میں فرحت کی ایک نظم شائع ہوئی تھی جس میں ہندستان کے مناظر کا بیان تھا۔ موصوف آج کل کے اچھے انشا پردازوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ آپ نے پریم ساگر کا اردو ترجمہ بھی کیا ہے جو لکھنؤ میں طبع ہوا ہے۔ اودھ اخبار کی ایک تازہ اشاعت میں علی گڑھ کی سائنٹفک سوسائٹی کے رسالے سے ایک مضمون نقل کیا گیا ہے جس کا موضوع ہندستانی مصنفین اور ان کی تصانیف ہے[۶۰]۔"

اودھ اخبار مطبوعہ ۱۹ اگست ۱۸۷۱ء کے صفحہ ۸۰۴ میں ایک مفید اور معلوماتی مضمون "کتب تعلیم کے واسطے حفظ حقوق مصنفین" چھپا ہے۔ یہ مضمون پہلے انگریزی اخبار "لکھنؤ ٹائمس" میں چھپا تھا۔ اخبار میں منشی نول کشور اور کپتان ہالرائڈ صاحب بہادر ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کے درمیان جو مراسلت ہوئی تھی اس کا بھی تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں منشی صاحب سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا گیا تھا وہ ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔

"بے شبہ منشی نول کشور صاحب ہمارے صحیفۂ جلیلہ کے تعلیم خانہ کارخانے کے مالک شرقیہ زبانوں کے مجموعی علوم و فنون کی اشاعت

میں کمال توجہ و سرگرمی فرما رہے ہیں۔ چنانچہ تازہ تالیفات و تصنیفات وغیرہ کے سوا علوم مشرقیہ کی وہ قدیم و نایاب کتابیں جن کا نشان یا تذکروں اور تاریخوں یا شاہی کتب خانوں میں پایا جاتا تھا۔ ہزار ہا روپیہ کے صرف سے مناسب ذریعوں کے ساتھ بہم پہونچائی گئیں۔ اور اس امر کی نسبت اہتمام بلیغ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ارزانی و کفایت کے ساتھ اشاعت عمل میں آئے۔ اسی لیے ممالک مغربی و شمالی و پنجاب و وسط ہند و بمبئی یا دِلّی و کلکتہ و دیگر اضلاع بنگال کے تاجرانِ کتب کے ساتھ سلسلے تجارت کفایت کی بنا پر اس شدو مد کے ساتھ جاری ہے کہ شائقین علم و کمال کو ہم شکر گزار پاتے ہیں۔ مطبع کی اس نیک نیتی کا ثمرہ یہ ہے کہ شہر لکھنؤ کے آٹھ سات سو آدمی اس کے فائدہ دولت کے نمک خوار ہیں اور اودھ گورنمنٹ کے حکام اعلےٰ سے ماتحت تک جس قدر نگاہ قدردانی و پرورش کی اس مطبع کی ترقی پر مبذول فرماتے ہیں اس کے ہم شکر گزار ہیں —

ان دنوں جناب منشی صاحب ممدوح نے حسب درخواست اراکین پنجاب وغیرہ ہند و پنجاب کے اہل مطابع و عامۂ خلائق کے فائدے کی غرض سے چند کتب ابتدائے مروجہ سررشتہ تعلیم پنجاب کے چھاپنے کے مشورہ کی نسبت جناب کپتان ہالرائڈ صاحب وغیرہ کے حضور میں درخواست کی۔ اس پر بحوالۂ حکم گورنمنٹ پنجاب جناب ڈائرکٹر بہادر نے ارشاد فرمایا کہ وہ ابتدائی کتابیں ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن کی رجسٹری میں داخل ہیں اور کوئی شخص ان کی اشاعت کا مجاز نہیں ہے۔

منشی نول کشور صاحب موصوف کیا اس ملک کے جلادوار علم اور کیا فضلائے فرنگستان میں جو مشرقی زبانوں کے ماہر ہیں اپنے اہل ملک کے اسباب تربیت کی اشاعت میں وہ ناموری رکھتے ہیں کہ ہماری دانست میں آج تک بہت کم ہندوستانیوں کو حاصل ہوئی ہے ہم جانتے ہیں کہ ابھی تک وہ شفقتیں اور مصائب جو مصنف اور مؤلف اور مہتمم اخبار کو بہ نفس تصنیف یا تالیف یا اہتمام اخبار میں اٹھانا پڑتی ہیں ان کے حصے میں نہیں آئے۔ بلکہ وہ ایک ایسے مطبع اعظم کے مالک ہیں کہ جس کا جی چاہے وہاں جاکر دیکھ لے کہ بڑے بڑے منشی اور فاضل اور شاعر وغیرہ تصنیفات اور تالیفات اور تمہیدات کے کاموں میں مصروف ہیں۔ منشی صاحب ایسے فضلا اور اہل کمال پر سرداری اور حکومت کی ایک خلقی لیاقت رکھتے ہیں۔ اور یہ لوگ ان کی ہمت و اخلاق کے سلسلے میں وابستہ ہیں۔ منشی صاحب کی نگاہ وہ سنجیدہ اور بلند پرواز ہے کہ زمانۂ حال کی حالتوں کو خواہ وہ بہرہ انشا پردازی سے متعلق ہوں یا حصۂ علم و ہنر سے علاقہ رکھتے ہوں تحقیق و انصاف کی نظر سے بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ گویا وہ سلسلہ قدرتی کے تقاضے سے بہ نظر اغراض انسانی اپنی منفعت سے خالی و مستغنی نہیں ہیں۔ مگر پھر بھی بلا اشتباہ بعضوں نے تفضل و ہنر کی منزل میں اپنے آپ کو تربیت و تہذیب کا رہنما ثابت کیا ہے۔ ان کی ناموری سے تحسین و آفرین کی بات نہایت علاقہ رکھتی ہے کہ اس ملک میں ان کی ہمت و کوشش کے ذریعے سے مشرقی تربیت نہایت ارزاں ہو گئی ہے اب ایک نہایت کم وقت پر جس کا اندازہ اس کی قدرت کے لحاظ سے آسان ہے مول لے سکتا ہے اگر ہم غلطی پر نہیں ہیں تو ہم کو ئی یاد آتا ہے کہ جنہوں نے پہلے پہل سستی کتابوں کے چھاپنے میں کوشش کی وہ امریکہ کے لوگ تھے۔

منشی نول کشور صاحب کیا صرف زر اور کیا مشقت ذاتی کے ساتھ تربیت اور حوصلے کے میدان میں آئے ہیں۔ کہ مفید کتابوں کے ذخیرے سے ہندوستان کو مالا مال کریں۔ اور علم و ہنر کو خوب ترقی دیں۔ کثرت اشاعت کے لیے ان کی کوشش و ہمت کا ایک عمدہ نتیجہ یہ ہے کہ بیش قیمت اور ضخیم کتابیں جس سے عظیم فائدے متصور ہیں چھپ کر ایسی قیمت پر فروخت ہوتی ہیں کہ ہر قسم کے شائقان علم کو سہولت سے دستیاب ہوں۔

منشی نول کشور صاحب جن کا اس ملک میں بہت بڑا انگلی چھاپہ خانہ ہے۔ عالی ہمتی اور نیک نیتی کے تقاضے سے اس بات پر آمادہ ہیں کہ غربائے پنجاب کے فائدے کے لیے انہیں کتابوں کو بہت کم قیمت

پر چھا ہیں گے۔"

۱۹ر جولائی ۱۸۷۰ء کے اودھ اخبار کی اشاعت میں کسی علم دوست اور صاحب مذاق قاری نے "اودھ اخبار کے شیفتہ" کی سرخی کے تحت اخبار کی ہمہ گیر شہرت کے تاثرات اس طرح بیان کیے ہیں:

منشی صاحب۔ آپ کا اخبار بلاغت آثار دفتر طلسمات ہے۔ میں کیا اس کی تعریف کروں کہ چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ خبروں کی کثرت اور معاصرین کی قبولیت سے اگر اسے اُم الاخبار کہیے بجا ہے۔ کہ اکثر اخباروں کا ایک ایک بڑا حصہ اُس کی خبروں سے بھرا دیکھا جاتا ہے۔ اور اخباروں کے اوراق کی ایک حد معین ہوتی ہے۔ آپ کے یہاں اوراق کا سلسلہ غیر متناہی رہتا ہے۔ بیس بیس ورق اور تین تین جز سے بھی کبھی زیادہ دیکھا ہے۔ بلاد قریب و بعید کی تازہ خبریں نہایت لطیف اور عمدہ عمدہ مضامین مفید اندراج پاتے ہیں اور سخن سنجان معنی رس کی ضیافت طبع کو تاریخ و غزلیات اور قصائد وغیرہ بھی لکھے جاتے ہیں۔ ولایت انگلستان کی خبریں آپ کے اخبار سے بہت جلد ملتی ہیں۔ ۲۸ر جون کے اخبار میں لندن کے واقعات ۲۱، ۲۲ جون کے دیکھے گئے۔ چھ دن کے عرصے میں لندن کا خط نہیں آسکتا۔ اور آپ کے اخبار کے ذریعہ سے ناظرین اخبار چھٹے دن مطلع ہوتے ہیں۔ ہر چند پہلے بھی مضامین اخبار کی ترتیب بہت عمدہ تھی لیکن اب ۲۸ر جون کے اخبار کی ترتیب جدید نہایت دل پذیر دیکھی گئی۔ یعنی اخبارات، خط و کتابت، کارسپانڈنٹ وغیرہ، لوکل اخبارات یعنی اخبارات شہر، انتخاب احکام گزٹ، سرکاری اشتہارات مفید خاص و عام، نظم تحنون بلند مقام، ہر ایک مضمون کے لیے ایک ایک حصہ علیحدہ مقرر کیا ہے کہ ہر قسم کے شوقین کو مضامین مطلوبہ کا مجموعہ ایک ہی جگہ ملتا ہے۔ اگر ایک حصہ سررشتۂ تعلیم کی خبروں سے بھی خاص کیا جائے تو اخبار اور زیادہ لطف پائے۔"

منشی نول کشور اردو کے محسن اعظم ہیں۔ اگر انھیں پیغمبر اردو بھی کہا جائے تو اس میں مبالغہ نہیں ہوگا۔ وہ اردو کی بقاء اور اس کے تحفظ کے لیے ہمیشہ سے ایک نڈر سپاہی کی طرح خاموش جہاد کرتے رہے۔ اس کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ ۲۵ر دسمبر ۱۸۶۸ء کو الہ آباد کے انسٹیٹیوٹ کے دوسرے اجلاس میں اردو ہندی کا مسئلہ اٹھایا گیا۔ اس میں طے پایا گیا تھا کہ دیوناگری رسم خط کو رواج دینا چاہیے۔ اس کی حمایت میں علی گڑھ کے اخبار میں اس مسئلہ پر ایک مضمون میں مفصل بحث کی گئی تھی۔ مضمون منشی نول کشور نے دوبارہ اودھ اخبار میں مورخہ ۲ر فروری ۱۸۶۹ء کو شائع کیا۔ مضمون نگار صرف اسی پہ اکتفا نہیں کرتا کہ رسم خط بدل دیا جائے بلکہ اس نے یہ بھی واضح کیا کہ اردو میں جو عربی حروف مستعمل ہیں ان کا دیوناگری میں بدل ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے سہولت اس کی مقتضی ہے کہ عام عربی الفاظ کے استعمال سے احتراز کیا جائے اور ان کی جگہ ہندی الفاظ استعمال کیے جائیں۔ اور اس طرح زبان کو وسعت دی جائے۔ مضمون نگار کے نزدیک ہندی دراصل سنسکرت کی ایک شکل ہے۔ غرض کہ ..... کی عام طور پر یہ خواہش ہے کہ عربی اور فارسی کے عنصر سے قطعی احتراز کیا جائے۔ بلکہ بعض ..... ایسے بھی ہیں جو لاطینی رسم خط کو اردو رسم خط پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ بات ان کے دلوں میں اسلامی حکومت کی مخالفت کے باعث پیدا ہوئی ہے"

منشی نول کشور نے اودھ اخبار میں مقالہ نگار کی خواہش کے مطابق مضمون چھاپ تو دیا لیکن بعد میں اس کے استدلال کی دھجیاں بکھیر دیں۔ اور تمام دلائل کو بے معنی لفاظی سے تعبیر کیا۔ اخبار نے اس ضمن میں یہ بھی بتایا کہ ہندی اردو کے جھگڑے اسی طرح لایعنی ہیں جس طرح یہ خیال کہ ایک دن آئے گا جبکہ اردو ہندی کے قضیے کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ انگریزی زبان ان دونوں پہ حاوی ہو جائے گی۔ اس لیے وہ حکام وقت کی زبان ہے۔ اور قدرتی طور پر رعایا اسی زبان کو اختیار کرے گی۔ مدیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ اردو زبان جس کی ..... لوگ اس وقت مخالفت کر رہے ہیں...... مسلمانوں اور ہندوؤں کے غلط سلط سے بالکل اسی طرح وجود میں آئی جیسے انگلستان میں

سیکسن اور فرانسیسی کا امتزاج عمل میں آیا۔ اردو میں دوسری زبانوں کے وہی الفاظ استعمال ہوتے ہیں جو کھپ جائیں ان الفاظ کے انتخاب میں خاص سلیقہ برتا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کو عدالتوں میں مقبولیت حاصل ہوئی اور سرکاری تحریرات میں یہ زبان استعمال کی گئی۔ ان تمام باتوں کی تائید میں خود ہزارہا ہندوؤں کی آراء پیش کی جا سکتی ہیں۔ بھلا یہ کون سی عقل کی بات ہے کہ اردو کے عوض جو ایک نہایت شیریں اور شستہ زبان ہے اور جو عام طور پہ سمجھی جاتی ہے۔ . . . کو فروغ دینے کی کوشش کی جائے۔ جو ایک نہایت بھدی اور درشت زبان ہے اور جس کے حروف دیکھنے میں بھلے نہیں معلوم ہوتے"[11]

مورخہ ۱۸ مئی ۱۸۶۹ء کے اودھ اخبار سے معلوم ہوتا ہے کہ الہ آباد انسٹیٹیوٹ نے یہ قرارداد منظور کی کہ "کمپنی ایکٹ" کا ترجمہ ہندی میں کیا جائے۔ یہ تجویز بھی منظور ہوئی تھی کہ ہندی زبان اور دیوناگری رسم خط کو فروغ دینے کے لیے ایک کتاب لکھی جائے اور مصنف کو معقول معاوضہ دیا جائے۔ یہ تجویز بھی مان لی گئی تھی کہ ہندی میں ایک انشا لکھی جائے جو عدالتی قواعد کاروباری خطوط اور پروانوں کے نمونوں پر مشتمل ہو۔ نیز عورتوں کے لیے بھی ہندی میں کتابیں تحریر کرائی جائیں۔

اودھ اخبار میں اس مسئلے پر موافقت میں اور مخالفت میں جو مضمون شائع ہوئے۔ ان میں ہندی کی حمایت میں ایک مضمون میری نظر سے گزرا۔ اس میں لکھا تھا کہ ہندوؤں کو اس میں بڑی دشواری ہوتی ہے کہ اپنے گھروں میں ہندی اور گھر سے باہر اردو بولیں[12]

اودھ اخبار مطبوعہ ۱۲ جولائی ۱۸۶۹ء میں ایک مضمون اردو کی حمایت میں شائع ہوا ہے مضمون نگار نے ثابت کیا ہے کہ اردو ہی وہ زبان ہے جو ہندوستان بھر میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس ضمن میں اردو کو ایک ایسے دریا سے تشبیہ دی جس میں ندیاں آ آ کر شامل ہوتی ہیں[13]۔ موصوف نے ثابت کیا ہے کہ اردو کے رسم خط کی بجائے دیوناگری رسم خط اختیار کرنے کا صرف یہ مطلب نہیں سمجھنا چاہیے کہ صرف تحریر کا طریقہ بدل گیا بلکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ ایک مکمل اور وسیع زبان کو ترک کر کے ایک . . . زبان کو اختیار کر رہے ہیں۔ . . . کو اردو پر فوقیت دینے سے اور دوسری خرابیاں جو پیدا ہوں گی اس کی اودھ اخبار میں وضاحت کی گئی ہے۔ اب رہا سوال رسم خط کا۔ تو اس باب میں بھی اردو رسم خط کو ترجیح حاصل ہے۔ اس لیے کہ اس کے ذریعہ سے سنسکرت کے ان تمام الفاظ کا پوری طرح اظہار کیا جا سکتا ہے جو ہندی میں مستعمل ہیں سنسکرت میں تالو سے ادا ہونے والے حروف کو موکدہ سے ادا کیا جا سکتا ہے۔ اگر ثانی الذکر کو (DENTAL) میں ضم کر دیا جائے مضمون نگار نے اس کی بھی وضاحت کی کہ ہندوستانی زبان کا خزانہ مالا مال ہے۔ حالانکہ ہندوستان کی دوسری زبانیں بالکل . . . ہیں مضمون کے آخر میں یہ بھی درج ہے کہ

ہمیں اپنی زبان کی حفاظت کے لیے کوشش کرنی چاہیے
اس لیے کہ اس کے ساتھ ہماری ملی زندگی وابستہ ہے۔"

مضمون نگار نے اس سلسلے میں برطانوی حکومت پر سخت حملے کیے ہیں جس نے اہل ہند کو مطبع کی آزادی دے رکھی ہے۔ موصوف کا خیال ہے کہ اردو کے خلاف جو تحریک اٹھی ہے اس کی ذمہ داری حکومت پہ عائد ہوتی ہے۔ حکومت چاہتی ہے کہ ہندوستان کی مشترک زبان کو فنا کر دے تاکہ اہل ہند پھر کبھی ۱۸۵۷ء کی شورش کی طرح یک جہتی کے ساتھ کوئی کام نہ کر سکیں۔ . . . مضمون اس شعر پر ختم ہوتا ہے ؎

ہر کہ با فولاد بازو پنجہ کرد
ساعد سیمین خود را رنجہ کرد

جس طرح منشی نول کشور ایک نڈر بے باک اور حق گو صحافی تھے اسی طرح اودھ اخبار اردو کی حمایت میں ہمیشہ حق گوئی اور بے باکی کا مظاہرہ کرتا تھا۔ اس کا ایک اور ثبوت مطبوعہ ۱۲ اپریل ۱۸۷۰ء کی اشاعت سے فراہم ہوتا ہے صفحہ ۲۵۹ میں "زبان اردو" کے نام سے ایک معلوماتی مضمون چھپا ہے۔ اردو کی حمایت میں مضمون کی بعض باتیں درج کی جاتی ہیں:

"اودھ کے واسطے عدالتوں میں اردو کا رواج انصافاً درست ہے اور اس کا جائز ہونا چند خوبیوں سے جو آگے بیان

کی جاتی ہیں سبرجن ہے۔ اگرچہ زبان ناگری میں بھی بہت خوبیاں ہیں لیکن چند۔۔۔ ایسے ہیں جو بہ نسبت اردو کے زیادہ تر ۔۔ ہیں۔ اردو زبان سے اگر بہ نظر تامل و تعمق دیکھا جائے تو بہت سی ایسی خوبیاں ظاہر ہوں گی کہ عقل خردہ بین اس کو پسند کرے۔ اردو زبان کو اگرچہ تھوڑا عرصہ گزرا ہے کہ جاری ہوئی لیکن ہندستان میں اس کا اس قدر رواج ہے کہ دوسری زبان کا نہ ہوگا۔

فرض کیا جائے کہ اردو کچہری سے موقوف کرکے اس کی جگہ ناگری جاری کی جائے تو صرف ناگری خوانوں سے کام نہیں چلے گا۔ جب تک کہ اس کے اصول یعنی سنسکرت کو اچھی طرح حاصل نہ کریں، اور ایسے لوگوں کا میسر آنا نہایت محال بہت دشوار ہے جو سنسکرت سے بخوبی آگاہ ہوں اور اگر سنسکرت خواں ملیں گے تو عدالت کے کام سے محض ناواقف ہوں گے۔ اگر وہ ناواقف لوگ عدالت میں مقرر کیے جائیں تو بلا سمجھے بوجھے مقدمات منفصل کرنے میں سراسر ظلم ہے۔ پس مناسب ہے کہ رعایا کی توجہ جس علم کی طرف زیادہ ہو دفتر میں وہی علم جاری رکھنا چاہیے۔ اور ظاہر ہے کہ ایک رئیس خواہ اہل اسلام ہو یا اہل ہنود سب کو فارسی اور اردو کی طرف رغبت ہے۔ چنانچہ ان کے لڑکے قابل تعلیم کرنے کے ہوئے یعنی جیسے پانچ چھ برس کو پہنچے۔ ویسے ہی ان کو فارسی پڑھانا شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ نہ اب دفتر فارسی رہا اور نہ اس کی قدر ہے۔ باعث یہ ہے کہ وہ فارسی اردو وغیرہ کو اپنا علم خاص تصور کرتے ہیں۔ اور اردو کی کثرت رواج سے ۔۔۔۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایسی محو ہو گئی ہے کہ دیہات اور قصبات میں بھی اردو جاری ہے۔ اور ایسی زبان بولتے ہیں جن میں اکثر الفاظ عربی اور فارسی کے شامل ہوتے ہیں۔ بہر نوع ۔۔۔ دفتر میں بہ نسبت اردو کے زیادہ لوگوں کو دقت ہوگی۔

ناگری میں ایک یہ نہایت فائدہ ہے کہ لفظ صحیح جس طرح کا لکھا ہوتا ہے ویسا ہی بولا جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہی نقصان ہے کہ اس کے لکھنے میں دیر بہت ہوتی ہے اور کاغذ کی جگہ کو بہت گھیرتا ہے۔ اور چونکہ اس کا لکھنا پڑھنا بہت جلد آتا ہے اس لیے لوگوں کو اس سے بڑا فائدہ ہوتا ہے کہ وہ چٹھی وغیرہ آپس میں لکھ پڑھ کر اپنا کام چلاتے ہیں اور آسانی کے باعث سے جو لوگوں نے ہندی یا کاسیتھی نکالی ہے اگرچہ بہت جلد آ جاتی ہے لیکن پڑھنے میں نہیں آتی۔ یہ نہایت اعلیٰ درجے کی برائی ہے۔ اور ناگری میں جو دیکھا جاتا ہے تو وہ دونوں وصف موجود ہیں۔ باوجود اس وصف کے بموجب وجوہات مذکورۂ بالا کے دفتر یا عدالت کے ۔۔۔۔ نہیں ہے۔"

منشی نولکشور اور مرزا غالب۔

منشی نول کشور اور مرزا غالب کے درمیان خط و کتابت بھی تھی۔ اودھ اخبار کے اجراء کے سلسلے میں مرزا غالب پہلی مرتبہ چار شنبہ مورخہ ۱۸، ماہ جولائی ۱۸۶۰ء کو منشی صاحب کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"نامہ بنام منشی نولکشور صاحب مطبع اودھ اخبار۔ بامیزد- امروز سخن می گویم، باکسے کہ دیدہ روشن نادیدہ ماست، و دل بمہرش گرویدہ، اینک فرمان شما پزیرفتم و در نامہ بپارسی آمیختہ، بتازی سخن گفتم، سہ نسخہ نثر دارم، پنج آہنگ و مہر نیمروز، دستنبو، بشگفت کہ در لکھنؤ نیز مردم ایں نامہ ہائے نامی داشتہ باشند، اگر ذوق نگارش پارسی دارند، چرا ایں سوادہا فراہم نیارند، رسیدن اودھ اخبار از آں سو در ہر ماہ چہار بار، و رسیدن زر ازیں سو در ہر سال، دوبار، اگر منظور دارند منظور است۔ باقبال شما میاں دادستیاح دعای فرستم و بہ دوستی گفتہ ام، تا پارسی غزلے چند نوشتہ دہد، ہمیں کہ ہمی آرد بسوے شما رواں می دارم[11]۔"

مرزا غالب کا فارسی کلام ۱۸۳۵ء میں "میخانۂ آرزو سرانجام" کے نام سے مرتب ہو چکا تھا۔ اور یہ پہلی مرتبہ ۱۸۴۵ء میں نواب ضیاء الدین احمد خاں کی تصحیح و ترتیب کے بعد مطبع دارالسلام

میں چھپا تھا۔ مرزا اس کے دوسرے ایڈیشن کو کلیات نظم کے نام سے شائع کرنے کے لیے فکر مند تھے۔ اس سلسلے میں جولائی ۱۸۶۱ء میں میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

"کلیات نظم فارسی کے چھاپنے کی تدبیر ہو رہی ہے اگر ڈول بندھ گیا تو وہ بھی چھاپا جائے گا۔ قاطع برہان کے خاتمے میں کچھ فوائد بڑھائے گئے ہیں۔ اگر مقدور یا اعانت کرے گا تو میں بے شرکت غیر اس کو چھپواؤں گا۔"

منشی نول کشور نے ۱۸۶۱ء کے آخر میں مرزا غالب کا کلیات فارسی شہاب الدین خاں سے چھاپنے کے لیے منگایا تھا۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں نے غدر کے بعد اسے بمشکل جمع کیا تھا۔

منشی صاحب نے اودھ اخبار مورخہ یکم جنوری ۱۸۶۲ء کی اشاعت میں کلیات غالب کی طباعت کا پہلا اشتہار شائع کیا۔ اشتہار ضمیمے میں شامل ہے۔ مرزا کلیات کی اشاعت کے لیے بے چین تھے۔ اس کے بارے میں وہ اکثر لوگوں سے دریافت کرتے رہے۔ سید غلام حسنین قدر بلگرامی کو مئی ۱۸۶۲ء میں لکھتے ہیں :

"اس رقعہ کی تحریر سے مراد یہ ہے کہ جناب منشی نولکشور صاحب سے میرا سلام کہیے اور یہ رقعہ ان کو پڑھا کر عرض کیجیے کہ غالب پوچھتا ہے کہ فارسی کلیات کا چھاپا ملتوی ہے یا جاری ہے۔ ملتوی ہے تو کب تک کھلے گا۔ جاری ہے تو تصحیح ...... کس طور پر ہے۔ قصیدے اور تاریخ کلیات کا مطبع میں پتا لگا ہے کہ نہیں۔"

مرزا غالب اودھ اخبار بڑے مزے سے پڑھتے تھے۔ اور اس کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ ۱۸۶۱ء میں انھوں نے اسے منگوانا شروع کیا تھا۔ اگرچہ اخبار ان کے پاس منشی نولکشور مفت روانہ کرتے تھے تاہم غالب سال بھر کے ۴۸ ٹکٹ ان کو بھیجتے تھے۔ ۱۸۶۳ء کے ایک خط میں نواب علاء الدین علائی کے نام لکھتے ہیں :

"تین جگہ کا روزینہ دار ہوں۔ ساڑھے باسٹھ روپے یعنی ۷۵۰ سال سرکار انگریزی سے پاتا ہوں۔ اور بارہ سو سال رامپور سے اور چوبیس ان مہاراج (منشی نولکشور) سے۔ توضیح یہ کہ دو برس سے ہر مہینے میں چار بار اخبار مجھ کو بھیجتے ہیں قیمت نہیں لیتے۔ مگر اڑتالیس ٹکٹ میں مطبع میں پہنچا دیا کرتا ہوں۔"

منشی نولکشور نے ۱۸۶۲ء میں غالب کی قاطع برہان شائع کی۔ کلیات نہیں چھپا پایا تھا۔ مورخہ ۱۳ر مئی ۱۸۶۳ء کے اودھ اخبار صفحہ ۳۳۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ "کلیات مطبوع ہو کر انجام کو پہنچا۔" ۲ر جون ۱۸۶۳ء کے اخبار (صفحہ ۳۹۰) کے اشتہار میں درج ہے کہ "کلیات کا تقسیم ہونا ملتوی تھا۔ اب تیار ہو گئی اور عنوان کتاب میں تصویر بموقع مناسب لگائی گئی۔ اس ہفتے سے بخدمت شائقان ارسال ہے۔"

مورخہ ۱۷ر جون ۱۸۶۳ء کے اودھ اخبار (۴۲۲) میں اشتہار میں چھپا ہے کہ "یہ کتاب نایاب کہ زبان فارسی میں عدیل و نظیر نہیں رکھتی بہ صحت مرتب ہو کر مطبع ہذا میں تیار ہے۔ اور حسب فرمائش احباب تقسیم ہونا شروع ہو گیا۔ صاحبان شائق للعہ معہ محصول بھیج کر طلب فرما دیں۔"

مرزا غالب ستمبر ۱۸۶۳ء میں اپنے ایک شاگرد بدر الدین احمد تخلص کاشف کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

"اب سنا ہے کہ وہ (کلیات) چھپ کر تمام ہو گیا ہے۔ روپیہ کی فکر میں ہوں۔ ہاتھ آجائے تو ۵-۶ بھیج کر میں جلدیں منگواؤں۔"

۲۵ر مارچ ۱۸۶۳ء کے اودھ اخبار میں مرزا غالب کے بارے میں کچھ اہم اطلاعات درج ہیں۔ اس میں مرزا غالب کا ایک اہم خط منشی نولکشور کے نام بھی ہے۔ لکھتے ہیں :

"منشی صاحب جمیل المناقب جناب منشی نولکشور صاحب کو دولت و اقبال و جاہ و جلال روز افزوں نصیب ہو۔ چونکہ احباب کامیابی و شادکامی احباب سے شاد ہوتے ہیں۔ اس واسطے مجھے ان دنوں میں یاد آوری سے ایک امر خوشی کا پیش آیا۔ تو آپ کی خوشی کے واسطے آپ کو لکھتا ہوں بلکہ نظر بہ ہمدگر کے اتحاد کے تم کو تہنیت دیتا ہوں۔ آپ کو مبارک ہو کہ آخر ماہ گزشتہ کو جو حضرت فلک رفعت نواب معلی الالقاب جناب لفٹنٹ گورنر بہادر قلمرو پنجاب دہلی میں تشریف لائے تو سہ شنبہ کے دن ۲ر مارچ ۱۸۶۳ء عالی کو اس گمنام گوشہ نشیں کو یاد فرمایا۔ اور از راہ بندہ

پروری کمال عنایت سے خلعت عطا کیا ۔۔۔"
اخبار مذکورہ میں خط سے پہلے منشی نولکشور کی یہ نایاب تحریر بھی غالب کے عطائے خلعت کے بارے میں درج ہے:
"قدردانی حکام ۔۔۔ بخت مند ہر زمانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اہل جوہر تعظیم و توقیر کو انتخاب ہوتے ہیں۔ دیکھیے ان دنوں میں سرکار نے کیسی مہربانی کی۔ کمال کی قدردانی کی۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے مرزا اسداللہ خاں غالب کو خلعت فاخرہ عطا فرمایا۔ اور رئیس نوازی کی نظر سے بہ دل التفات کر کے ہم چشموں کو ان کا اعزاز و اکرام دکھایا ۔۔۔ زیادہ کیا احتیاج بیان ہے ۔۔۔ ان کے خط سے یہ حال عیاں ہے۔"
منشی نول کشور دسمبر ۱۸۶۳ء کے آغاز میں کاروبار کے سلسلے میں لکھنؤ سے دہلی گئے۔ اور وہاں مرزا غالب، نواب ضیاالدین احمد خان نیر رخشاں اور ان کے بیٹے نواب شہاب الدین خان سے بھی ملے تھے۔ یہ منشی صاحب اور مرزا غالب کی بالمشافہ پہلی ملاقات تھی۔ مرزا غالب نے منشی صاحب کے ساتھ دوران ملاقات کلیات فارسی کی قیمت پر بھی گفتگو کی۔ اس سلسلے میں غالب، مرزا علاء الدین علائی کو ۳ر دسمبر ۱۸۶۳ء کے خط میں لکھتے ہیں:
"شفیق مکرم و لطف مجسم منشی نولکشور صاحب بہ سبیل ڈاک یہاں آئے۔ مجھ سے اور تمہارے چچا اور تمہارے بھائی شہاب الدین خان سے ملے۔ خالق نے ان کو زہرہ کی صورت اور مشتری کی سیرت عطا کی ہے۔ گویا بجائے خود "قران السعدین" ہیں۔ تم سے میں نے کچھ نہ کہا تھا۔ اور کلیات کے دس جلد کی قیمت ۵۰ مان لئے تھے۔ اب ان سے جو ذکر آیا تو انھوں نے پہلی قیمت مشتہرہ اخبار یعنی قبول کی۔ یعنی ۵ فی جلد۔ اس صورت میں دس مجلد ۲۵ میں دوں اور ۲۵ کے علی حسین خان کو دیدوں۔ کہو لکھنؤ بھیج دوں۔ اس نگارش کا جواب جلد دو۔"
مرزا غالب نے دہلی میں منشی نولکشور کے ساتھ جو ملاقات کی اس کے بارے میں غالب، مردان علی خان تخلص رعنا کو ایک خط میں لکھتے ہیں:
"منشی نولکشور صاحب یہاں آئے تھے۔ مجھ سے ملے۔ بہت خوبصورت، اور خوش سیرت سعادتمند اور معقول پسند آدمی ہیں۔ تمہارے وہ مداح اور میں ان کا ثنا خواں۔"
دہلی سے لکھنؤ لوٹنے کے بعد منشی نولکشور نے مرزا غالب کے ساتھ اپنی ملاقات کا ذکر اودھ اخبار مطبوعہ ۲۲ر دسمبر ۱۸۶۳ء مطابق ۱۱ر رجب ۱۲۸۰ھ نمبر ۱۵ جلد ۵ صفحہ ۸۵۳ میں ذیل کے الفاظ میں شائع کیا تھا۔
"جناب فیض مآب یگانہ سحر پرداز، نکتہ سنج سراپا اعجاز رنگ افزائے نازک خیالی۔ ہنگامہ آرائے بے مثالی۔ دقیقہ یاب فکر و نظر، آموزگار اہل ہنر، فرازندۂ لوائے سحبانی، نوازندۂ کوس شیوا زبانی، ناشر نغمات یکتائی۔ در مشارق و مغارب جناب میرزا اسداللہ خان بہادر غالب کی ملازمت سے مشرف ہوا۔ شرف ملازمت کا حصول اتفاقات نادرہ سے سمجھا عنایت ایزدی کا شکر یہ ہے کہ ایسے وحید عصر یگانہ آفاق، سرآمد فضلائے روزگار، آفتاب اقلیم فضل و کمال سے ملازمت حاصل ہوئی۔"
اودھ اخبار مطبوعہ ۳۰ر دسمبر ۱۸۶۳ء مطابق ۱۸ر رجب ۱۲۸۰ھ روز چہار شنبہ جلد ۵ نمبر ۵۲ صفحہ ۸۶۱ پر منشی نول کشور کی ایک اور نایاب تحریر غالب کے ایک فارسی قصیدے کی اشاعت کے سلسلے میں درج ہے۔ ذیل میں پیش کی جاتی ہے:
"نواب مرزا اسداللہ خاں غالب"
"مرزا صاحب اقلیم بلند نامی کے بادشاہ ہیں۔ سب خاص عام ان کے نام گرامی سے آگاہ ہیں۔ ان کی تعریف زبان قلم پر لانا گویا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے۔ کہ ان کی صفات حمیدہ اور کمالات پسندیدہ سے واقف تمام زمانہ ہے۔ شعرائے ہند کو ان کے نام سے اعتبار ہے۔ فصحائے فارس کو ان کی تعریف داخل ہے۔ بارہا لکھا تحصیل حاصل ہے۔ مرزا صاحب نے ایک قصیدہ لارڈ ایلجن صاحب بہادر گورنر جنرل کشور ہند کی مدح میں بھیجا تو اس کے جواب میں سکرتر اعظم کا دستخطی خریطہ نظر آیا۔ اس خط اور قصیدے کے دیکھنے سے پروپرائٹر مطبع کو نہایت سرور ہوا۔ کلیات

غالبؔ میں یہ قصیدہ نہ تھا۔ اب اس کا چھاپنا ضروری ہوا۔ لہٰذا مع نقل خط نواب گورنر جنرل بہادر کشور ہند ذیل میں تحریر ہے۔ ناظر با تمکین ملاحظہ فرمائیں۔ کہ ہر شعر بے نظیر ہے۔ خط سے قدر دانی سرکار ظاہر ہے۔ عزت و توقیر میرزا سے نامدار ظاہر ہے۔ دیہو ہذا۔

نقل خط

کرنل ڈورینڈی صاحب۔ چیف سکرتر بہادر گورنمنٹ در رسید قصیدہ بر کاغذ افشاں نقل سرنامہ "در شہر دہلی۔ خانصاحب بسیار مہربان دوستان میرزا اسد اللہ خاں غالبؔ سلمہٗ اللہ تعالیٰ مرقوم ۳۱ر جولائی ۱۸۶۳ء۔

"خانصاحب بسیار مہربان دوستان سلامت۔ قصیدۂ آب و تاب در مدحت بندگانِ نواب مستطاب معلی القاب ویسرائے و گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ وصول گردیدہ، بر رخ ارادت آن مہربان آبی بر جبینِ عقیدت الیشان تابلے افزود از گرانمایہ گوہر ہائے بحر فکر یکتا سخنور معنی پرور کہ گنج بر گنج نہادہ بود از نظر قبولی بندگان نواب صاحب ممدوح گزشتہ طرب پیرائے خاطر ہماں حضرت الیشان گشتہ۔ زیادہ چہ نگاشتہ آید۔ فقط دستخط انگریزی"

اس کے بعد "قصیدہ در مدح نواب مستطاب لارڈ الگن صاحب بہادر مرحوم" درج ہے۔ اس میں کل ۳۱ شعر ہیں۔ پورا قصیدہ راقم کی کتاب "تحقیقی نوادر" میں شامل ہے۔

منشی نول کشور نے اپنی زندگی میں مرزا غالبؔ کی حسب ذیل تصانیف شائع کی تھیں۔

(۱) "برہان قاطع" ۱۸۶۲ء، (۲) کلیات فارسی ۱۸۶۳ء، (۳) کلیات نثر ۱۸۶۸ء، (۴) دیوان غالبؔ ۱۸۷۳ء۔

راقم الحروف نے اودھ اخبار کی مختلف فائلوں سے ۱۸۶۲ء سے ۱۸۶۹ء (وفات غالبؔ) تک غالبؔ سے متعلق نایاب اور نادر تحریریں نقل کر کے ضمیمے میں شامل کی ہیں۔

ذیل میں اودھ اخبار کی فائلوں سے اہم اور ضروری یادداشتیں درج کی جاتی ہیں۔

اودھ اخبار، مطبوعہ ۲۸ر جنوری ۱۸۶۳ء کے صفحہ ۸ پر مردان علی خاں رعنا کا مضمون "چھیڑ چھاڑ کی تحریر" پر ہے۔ اسی اشاعت میں امیر اللہ تسلیم شاگرد نسیم دہلوی کی تحریر ہے بعنوان ہے "جواب اعتراضات لالہ جواہر سنگھ جوہر"۔ مورخہ ۱۱ فروری ۱۸۶۳ء کے صفحہ ۱۰۲ پر جواہر سنگھ جوہر کا ایک خط مرزا اصغر علی خاں نسیم دہلوی کے قطعۂ تاریخ کی اغلاط پر منشی نول کشور کے نام چھپا ہے۔ اسی صفحہ پر منشی صاحب کا ذیل کا جواب بھی درج ہے۔

"ہم الطاف نامۂ جوہر صاحب کے درج کرنے سے کمال خوش ہیں۔ ہم کو بحث علمی کے اندراج سے شکایت کا کیا منصب تھا۔ لیکن یقیناً نتیجۂ بحث علمی نوبت بہ نفسانیت ہو جاتی ہے۔ اگر سلامت روی مصروف و تجاوز بہ نفسانیت نہ ہو، مضائقہ نہیں۔ بمطبوع خاطر اس کی اشاعت میں احباب کی خوشی اور اس کو باعث افتخار اخبار جانتے ہیں۔"

۱۱ مارچ ۱۸۶۳ء کے اخبار سے معلوم ہوتا ہے کہ ہنگامۂ غدر کے بعد لکھنؤ کے شاہی امام باڑے حسین آباد کے متولیوں میں مقدمہ چلا تھا۔ مسٹر بیلی صاحب نے مقدمہ کی سماعت کی تھی انھوں نے نواب محسن الدولہ اور نواب ممتاز الدولہ کو امام باڑے کا متولی مقرر کیا۔ منشی دیا کرشن ریحاںؔ نے مقدمے کی فتح یابی کی تاریخ کہی۔

محسن الدولہ بہادر کہ بہ فیض دست او موج دل او دریاست
محسن عالم و فیاض زماں حامی مصر و معینِ غرباست
شد عطا ملک حسین آبادش لطف شائستہ و احسان خداست
یافت ہر دشمن اقبال شکست فتح در محفل او جلوہ نماست

گفت تاریخ مبارک ریحاں
فتح نواب و شکست اعداست

۱۸۶۳ء

مطبوعہ ۱۸ر مارچ ۱۸۶۳ء کے صفحہ ۲۰۱ پر شاہنامۂ فردوسی باتصویر کی اشاعت کا اشتہار ہے۔ اسی صفحے پر مردان علی خاں

رعنا شاگرد غالب کی ایک نایاب کتاب "غنچۂ راگ" کا بھی اشتہار ہے۔ کتاب فن موسیقی کے بارے میں ہے۔

۳۰ مئی ۱۸۶۳ء کی اشاعت میں صفحہ ۳۶۷ پر سید غلام حسنین قدر بلگرامی شاگرد غالب کی مثنوی "قضا و قدر" کی طباعت کا اشتہار ہے۔

۲۴ جون ۱۸۶۳ء کے اخبار میں صفحہ ۴۴۲ پر "عزاداری لکھنؤ" پر مردان علی خاں رعنا کا ایک مختصر مگر پر مغز مضمون چھپا ہے مضمون نگار نے عزاداری کے بعض امور پر تعمیری نکتہ چینی بھی کی ہے۔

۱۲ اگست ۱۸۶۳ء کے پرچے میں صفحہ ۵۶۲ پر یوسف علی خاں عزیز تخلص، شاگرد مرزا غالب کا "قطعۂ دبابیہ" درج ہے۔ اس میں کل ۳۴ شعر ہیں۔ تفصیل کے لیے راقم کا مضمون "مرزا یوسف علی خاں ـــ" مطبوعہ شاعر بمبئی فروری ۱۹۷۲ء ملاحظہ ہو۔

۱۶ دسمبر ۱۸۶۳ء کی اشاعت میں صفحہ ۸۲۴ پر مردان علی خاں رعنا کا وہ قطعۂ تاریخ درج ہے جو انھوں نے لارڈ ایلجن کے انتقال پر کہا تھا۔ "جلال مغرب" مادۂ تاریخ ہے جس سے ۱۲۸۰ ہجری مطابق ۱۸۶۳ء برآمد ہوتا ہے۔

۲۰ فروری ۱۸۶۴ء کے اخبار میں صفحہ ۱۱۱ پر لکھنؤ کے مشہور بازار "نظیر آباد" کی بنائے تاریخ درج ہے۔ چونکہ لوگ نظیر آباد کی وجہ تسمیہ سے بے خبر ہیں اس لیے پوری عبارت نقل کی جاتی ہے تاکہ محفوظ رہ سکے۔

قطعۂ تعمیر نظیر آباد

"داروغہ میر واجد علی صاحب نے کہ رئیس اعظم لکھنؤ سے ہیں متصل امین آباد اپنے فرزند ارجمند رشید نظیر حسن صاحب زاد اللہ عمرہ وقدرہ کے نام سے مسجد و چاہ و گنج و بازار و دکانات و سرا نظیر آباد، آباد فرمایا جس کے قطعات تاریخ مؤلفہ سید محمد میر خاں امیر تخلص اخبار مطبوعہ ۲۳ دسمبر میں درج ہو چکے۔ اب قطعۂ تاریخ تصنیف زکی شاعر جو سنگ مرمر کی تختی پر کندہ ہو کر نظیر آباد میں لگائی گئی ہے۔ واسطے طبع ناظرین اخبار کے درج ذیل کرتے ہیں۔ ایڈیٹر"

تعالی اللہ زہے ممتاز دوراں | سیادت منزلت واجد علی خاں
بنائے خیر انھیں تو نگہ ہے | سرا و چاہ و بازار اک جگہ ہے
نظیر سید ذیشاں ہے فرزند | خوش اقبال و خوش اطوار و ہنرمند
جو پوچھو نام یہ شرح حسن ہے | نظیر اول ہے بعد اس کے حسن ہے
مہ پرنور اوج عز و اقبال | جواں بخت و جواں دولت جواں سال
اسی کے نام کا بازار ہے یہ | نظیر آباد نیک آثار ہے یہ
یہیں بخت رسا ہے نام دلال | اسی بازار میں بکتا ہے اقبال
بعہد صاحبان نام آور | رعیت پرور و انصاف گستر
جناب و نفلک والا مناقب | جہاں پرور کمشنر چیف صاحب
کہ سر کو پر ہیں جو ڈلیسل کمشنر | رئیس و فاضل و اشراف پرور
وہ کیبر صاحب ذی ہمت وجود | کمشنر کی جگہ پر ہیں جو موجود
خوشا ڈپٹی کمشنر بین صاحب | کہ ہیں علم و ہنر ان کے مصاحب
بس اپنے قول کے پورے یہی ہیں | غرض انجیل کے سورے یہی ہیں
انھیں کے عہد میں با زیب و زینت | نظر آئی یہ آبادی کی صورت

زکی نے نظم کی تاریخ بنیاد

جیسے مالک نظیر آباد، آباد

۱۲۸۰ ہجری (۱۸۶۳ء)

۳ جنوری ۱۸۶۵ء کے اودھ اخبار کے صفحہ ۸ پر منشی جواہر سنگھ جوہر تحصیلدار لکھنؤ کی ایک نظم "تحفۂ نمائش گاہ ملک اودھ" کے عنوان سے چھپی ہے جو ۴۵ اشعار پر مشتمل ہے۔

جوہر تخلص کے دو شاعر تھے۔ دونوں لکھنؤ میں تحصیلدار رہ چکے تھے۔ ایک جوہر مرزا غالب کے اور دوسرے جوہر گل محمد خاں ناطق کے شاگرد تھے۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ نظم کس کی ہے۔ بہرحال نظم نایاب اور نادر ہے۔ پہلا شعر ہے

واہ کیا اچھا ہوا میلہ نمائش گاہ کا
کس قدر دلچسپ ہے جلسہ نمائش گاہ کا

آخری شعر ہے
بست و چہارم سے دسمبر کی یہ ہے دس دن تلک
لاکھ عشرت دل سے ہے خوش عشرہ نمائش گاہ کا

۲۱ر فروری ۱۸۶۵ء کی اشاعت میں صفحہ ۱۴۵ پر مولانا محمد ہادی علی کی تاریخ وفات درج ہے یہ موصوف مطبع اودھ کے کار پردازوں میں ممتاز تھے۔ جب ۱۸۶۲ء میں منشی نول کشور نے کلیات غالب کی طباعت ملتوی کر دی تھی تو اس کی وجہ مولانا کی بیماری ہی تھی۔ اس اثناء میں مرزا غالب ان کی خیریت برابر پوچھا کرتے تھے۔ ان کی وفات پر مرزا تفتہ نے ذیل کی تاریخ کہی۔

مولوی ہادی علی اشک از جہاں رفت و مرا
اندوہش در سینہ جاگیر و غمش در دل خزد
پس جز این دیگر چہ تاریخش نویسم تفتہ من
رحلت ہادی علی اشک از جہاں جانم گزد
۱۲۸۱ھ (۱۸۶۵ء)

اودھ اخبار مطبوعہ ۲۸ر مارچ ۱۸۶۵ء صفحہ ۱۹۲ پر مولوی نجف علی خاں قاضی زادہ جھجھر کی تصنیف "فرہنگ دساتیر" کا اشتہار ہے۔ اشتہار میں مصنف کے بارے میں کچھ نئی باتیں بھی درج ہیں۔ کتاب دساتیر کی شرح ہے۔ مصنف کی دوسری کتاب مقامات حریری کی غیر منقوط شرح بھی تھی۔ ایک مرتبہ مرزا غالب کو بھی "فرہنگ لغات دساتیر" کی ضرورت پڑی تھی۔ وہ علائی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں "تم نے دساتیر مجھ سے مانگی۔ اسی صحیفۂ مقدس کی قسم وہ میرے پاس نہیں ہے۔" فرہنگ دساتیر اب نایاب ہے۔ اس کا حوالہ راقم کی نظر سے نہیں گزرا ہے۔

مولوی نجف علی مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ "فرہنگ دساتیر" پر مرزا غالب نے تقریظ بھی لکھی تھی۔ یہ غالب کی "باغ دودر" صفحہ ۱۰۹ مرتبہ ڈاکٹر وزیر الحسن مطبوعہ پاکستان میں شامل ہے۔

اخبار کے صفحہ ۲۲۰ پر "کلیات مومن" مرتبہ میر عبدالرحمٰن آسی کے بارے میں اشتہار درج ہے جس میں کہا گیا کہ مطبع منشی نول کشور کو اس کا چھاپنا منظور ہے۔

۲ر مئی ۱۸۶۵ء کی اشاعت میں صفحہ ۲۹۸ پر مرزا غالب کی قاطع برہان کی حمایت میں ارسطو جاہ مولوی سید رجب علی خاں بہادر کا طویل خط غالب کے نام چھپا ہے تفصیل کے لیے تحریر دہلی مطبوعہ مارچ ۱۹۷۳ء ملاحظہ ہو۔

۲ر مئی کی اشاعت میں منشی نول کشور کا ایک جامع مضمون مرزا تفتہ پر چھپا ہے۔ اس کے لیے راقم کی کتاب "تحقیقی نوادر" مطبوعہ اردو پبلشرز لکھنؤ دیکھی جائے۔

۲۳ر مئی ۱۸۶۵ء کی اشاعت میں صفحہ ۳۰۹ پر محمد مردان علی خان رعنا نے ایک طویل خمسہ ۴۲ بندوں پر مشتمل مرزا دبیر کے سلام پر کہا۔ مطلع یہ ہے:

داغ بر دل ماہ ہے اور خاک بر سر چاندنی
چاک ہے مثل کتاں جسم قمر پر چاندنی
ماہ ہے حلقہ زنِ ہالۂ کمر چاندنی
مجرئی ہے سوگوار ماہ حیدر چاندنی
اشک ہے شبنم بکا کرتی ہے شب بھر چاندنی

مقطع:
داغ رنج ماہ دیں ہر دل میں ہے ماہ منیر
ہیں عزادارانِ حضرت اس لیے روشن ضمیر
قبر رعنا ہے تماشا گاہ ہر برنا و پیر
اک مہ داغ عزا میں کتنے جلوے ہیں دبیر
قبر پہ باہر چراغاں اور اندر چاندنی

اودھ اخبار مطبوعہ ۱۸۷۴ء تا ۱۸۷۵ء میں میر انیس اور مرزا دبیر کے انتقال پر بہت سے شعرا نے تاریخیں کہیں۔ اس سلسلے میں راقم کی "باقیات انیس اور مرزا سلامت علی دبیر شاعر اعظم" مطبوعہ اردو پبلشرز لکھنؤ ملاحظہ ہو۔

اودھ اخبار کی عنان ادارت اچھے اور قابل لوگوں کے ہاتھ میں تھی جن میں غلام محمد خاں تپش، تصدق علی، مولانا ہادی، شیو پرشاد اور سرشار وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اودھ اخبار صفحہ ۲۷۱، جلد نمبر ۴ مطبوعہ یکم جنوری ۱۸۶۲ء

"اشتہار طبع کلیات مرزا غالب دہلوی" ۲۳

ایک بشارت نئی سنو ہم سے
گوہر آب دار لو ہم سے

"ایسا مژدہ سناتے ہیں کہ کسی نے سنا ہی نہیں، وہ سامان کرتے ہیں کہ اب تک ہوا نہیں، مرحبا کہیے شاہد شیریں کار آیا ہے، مبارک ہو یوسف سر بازار آیا ہے۔ عزیز ہر دل عزیز ہے۔ دلبری میں کامل ہے۔ جب مشتاق دو چار ہوں گے نقد تمنا سے خریدار ہوں گے پردے میں جمال کیا دکھلیئے۔ اب نقاب چہرۂ سخن سے اٹھائیے۔ آویزۂ گوش جہاں ہو۔ نزدیک و دور عیاں ہو، کہ نواب مرزا اسد اللہ خاں صاحب بہادر غالب دہلوی کا فارسی کلیات مطبوع ہوا چاہتا ہے۔ نقش و نگار اس دلآرام رنگیں ادا کا شروع ہوا چاہتا ہے۔ اقسام سخن پر مشتمل ہے۔ ہر ایک شعر فرد بے بدل ہے۔ عالی مضامین قصائد لاجواب، رنگیں غزلیں، انتخاب کہ انھیں دیکھ کر ظہیر کا کمال بھول جائیے نظیری کی شوکت کبھی خیال میں نہ لائیے۔ مثنوی کی جادو بیانی میں جائے گفتگو نہیں۔ سحر حلال زلالی کی اس کے سامنے آبرو نہیں۔ رباعیوں کو پیکر سخن کے اربع عناصر کہیئے۔ آبدار قطعات کو بے تردد قطعات جواہر کہیئے۔ ہر مصرع قد موزوں سے بڑھ کر ہے۔ ہر بیت شاہد ماہ سیمائے معنی کا گھر ہے۔ دس ہزار چار سو کئی اشعار ہیں کہ سب سلک گوہر شاہوار ہیں۔ خدا کے فضل سے نسخہ بھی وہ صحیح و درست بڑے کتب خانے کا ہاتھ آیا جس کو نواب ضیاء الدین خاں صاحب بہادر دہلوی نے جد و جہد تمام سے جمع فرمایا بقول آفاق کو تعریف کی حاجت نہیں۔ آفتاب کو صفات بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ناظم کی بے مثالی آشکار ہے۔ عالم کو ان کی استادی کا اقرار ہے۔ اس زمانے میں سحبان ثانی ہیں۔ جواب انوری و خاقانی ہیں۔ ہر نقطہ ان کے قلم کا اختراع کمال ہے۔ جو سخن زبان سے نکلا سحر حلال ہے۔ ایسی نادر چیز کہاں میسر آتی ہے۔ کس خوش نصیب کی یہ امید بر آتی ہے۔ دیکھیے ہم در نایاب کے ڈھیر لگائے دیتے ہیں۔ موتی کوڑیوں کے مول لٹائے دیتے ہیں۔ سب کتاب تخمیناً چالیس جز میں چھپے گی۔ محض مقام مناسب پر تصویر مصنف کھینچی گی۔ شروع طبع میں قیمت بھیجنے سے رکو پائیں گے۔ چھپ چکنے کے بعد پورے عذر معذور ہو جائیں گے۔ غالباً اہل ہنر سنتے ہی اختراز میں آئیں گے چھپتے ہی ہاتھوں ہاتھ اٹھالے جائیں گے۔

اشتہار دینے کا یہ سبب ہے۔ صرف انتہائی مطلب ہے کہ درخواست بھیجنے والوں کو اطمینان یکسر رہے گا۔ پہلے ان کا استحقاق مدنظر رہے گا۔ اگر ابھی سے طلبگار ہوں کمی قیمت کے حصہ دار ہوں" نقط۔

اودھ اخبار لکھنؤ جلد نمبر ۴ مطبوعہ ۱۲ مارچ ۱۸۶۲ء چہار شنبہ صفحہ ۱۸۵

نواب میرزا اسد اللہ خاں غالب

"سب جانتے ہیں کچھ حاجت دلیل نہیں۔ کہ آج ہندوستان میں ان کا عدیل نہیں، فصاحت و بلاغت میں سحبان ثانی ہیں۔ فن شعر میں انوری و خاقانی ہیں۔ زمین سخن کو آسمان پر پہنچایا ہر نقطے کو اختراع معانی بنایا۔ زور فکر ان کا جہاں میں مشہور ہے۔ نتائج طبع عالی کا آوازہ دور دور ہے۔ جناب جہانیاں مآب ملکۂ معظمۂ ہند و انگلینڈ کی مداحی میں وہ پایۂ بلند و رتبۂ ارجمند پایا۔ کہ ابتدائے عملداری سرکار سے کسی ہندوستانی کے لئے اس کا دسواں حصہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ کیفیت نواب ممدوح نے خود لکھی ہے۔ اپنی کتاب دستنبو میں مفصل بیان کی ہے۔ آگے ایک قصیدہ ملکۂ معظمہ کی شان میں کہا تھا۔ نظر انور سے گزرنے کو ولایت میں بھیجا تھا وہاں تو ہر کمال کی قدر دانی ہے۔ کھلا ہوا باب فیض رسانی ہے۔ جب فیضیاب سماعت ہوا منظور نگاہ رحمت ہوا۔ جود و نوال کی طرف ہمت آئی صلۂ شاہانہ دینے پر طبیعت آئی۔ فروری ۱۸۵۷ء میں جناب رسل کلرک صاحب بہادر نے مصنف کو انگریزی میں چھٹی لکھی۔ ولایت سے ڈاک پر بھیج کر اس نوید سراپا امید سے خبر دی کہ تمہارے قصیدے کے انعام کا مقدمہ زیر تجویز ہے۔ عنقریب حظ اٹھاؤ گے بعد صدور حکم انڈیا گورنمنٹ سے اس کی اطلاع پاؤ گے۔ ناگاہ مئی سنہ مذکورہ میں سرزمین ہند پر آسمان ٹوٹا۔ فوج حوادث نے کل متاع امید کو لوٹا۔ بہتیرے بے گناہ یوں زیر آسیائے گردوں پسے۔ جس طرح چکی کے پاٹ تلے گیہوں پسے۔ کیا آغاز تھا کیا انجام ہوا کہ ہر مقصد بھی ناکام ہوا۔

نواب صاحب کا وہ معاملہ گویا خواب تھا۔ مصرعہ
جب آنکھ کھلی تو کچھ بھی نہ تھا

عجب نہیں کہ یہ درخت سلطانی پھر توجہ فرمائے یعنی حالت یاس میں لطف خسروانی سے امید برآئے۔ اس تقریب میں ایک ذکر اور سنئے کہ ان دنوں جب "تعزیت شاہزادۂ عالی پائگاہ" عالمگیر ثانی دہلی میں ایک ورق بخط انگریزی لکھا ہوا اور اس کے ساتھ دوسرا ورق سادہ پیشگاہ حکام سے مشاہیر شہر کے پاس پہنچا۔ ہر ایک نے اپنا نام لکھ دیا۔ نواب صاحب نے اس راہ سے کہ صاحب سخن ہیں۔ مدحت سرائے حضرت ملکۂ زمن ہیں۔ یہ شعر بدیہہ کہا ہوا لکھ کر مہر کر دی۔

شاہ عالی گہر دگوہر پاکش صد حیف
ونیکہ ناچار سپر دند بخاکش صد حیف

اودھ اخبار لکھنؤ : مطبوعہ ۱۵ر جون ۱۸۶۹ء صفحہ ۲۷۵۔
قطعۂ تاریخ میرزا غالب طبع زاد ماسٹر منظر الحق بمظہر تخلص۔

حیف صد حیف میرزا غالب   حیف آں انوری ثانی، حیف
بذی قعدہ ودمی بہ تاریخ   شد بہ جنت ز دار فانی، حیف
استاد شفیق بود مرا   شد بباد بار زندگانی، حیف
من چہ گویم جہاں ہمی گرید   ہر کسے کرد نوحہ خوانی، حیف
یاسمیں گشت سرخ دہم گل را   شد قبا، جامۂ کتانی، حیف
گفت مظہر، کنوں زروئے الم
حیف آں خسرو معانی، حیف

۱۲۸۵ ـــــ ہجری

صفحہ ۷۷۵ میں حالی کا مرثیہ اور قطعۂ تاریخ درج ہے جو ان کے دیوان میں موجود ہے۔ اس کے بعد غالب کے شاگرد میاں داد خاں سیاح تخلص کے ذیل کے دو شعر ہیں۔

نہ مرد آہ غالب کہ بد فخر ہند
ز جسم جہاں بلکہ رفتہ ست جاں
رقم کرد سیاح سالش چنیں
چو شد امر حق دفعتہ داد جاں

۱۲۸۵ھ

اودھ اخبار لکھنؤ مطبوعہ ۱۹ر اکتوبر ۱۸۶۹ء صفحہ ۱۰۱۱

قطعات تاریخ

"اس ہفتہ ہمارے کرم فرمائے دیرینہ، مورخ بے مثال، شاعر باکمال، منشی ہرگوپال صاحب المتخلص بہ تفتہ نے چند مادۂ تاریخ وفات مرزا اسد اللہ خاں غالب مرحوم اس دفتر میں بارشاد طبع بھیجے۔ اگرچہ قطعات ہذا، سابق ازیں اخبارات دیگر میں درج ہو چکے ہیں۔ مگر بہ پاس ارشاد جناب موصوف بطرز قند مکرر اودھ اخبار میں چھاپے جاتے ہیں۔ وھو ھذا۔

غالب وہ شخص تھا ہمہ داں جس کے فیض سے
ہم سے ہزاروں ہیچ مداں نامور ہوئے
فضل و کمال و صدق و صفا اور حسن و عشق
چھ لفظ اس کے مرتے ہی بے پا و سر ہوئے

۱۲۸۵ھ

قطعات فارسی

نصیب اہل عالم غم فراواں گشت و دیگر درد
ہزار و دو صد و ہشتاد ہجری بود، و دیگر پنج
دبیر الملک، نجم الدولہ بیگ و جزو دیگر ہم
نظام اول بود زاں بعد جنگ اے یار معنی سنج
تخلص غالب داز ہر نمط اشعار با خود داشت
برائے سیر نقاداں علم و فن، ہزاراں گنج
شد آں یکتا و تاریخ وفاتش زد رقم تفتہ
یکے حسرت، دوم حرماں، سوم اندوہ، چہارم رنج
یعنی ازاں چار لفظ تجرجہ یک عدد یکتا کہ بہ صنعت تجرجہ است سال تاریخ برمی آید (۱۲۸۵ھ)

ایضاً

خان ہمہ خاناں، اسد اللہ چو کو چید
شد شور قیامت بہ زمین و زمن، اے وائے
بے او ست دل افسردہ بہم دل چہ بکارے
بے او ست سخن مردہ، ہرچہ گویم سخن، اے وائے

در انجمنِ ہند، ہماں بود، یکے شمع
آں شمع شد و گشت تہی انجمن، اے وائے

من ہم بُردم اکنوں کہ دگر مُلکِ سخن را
کوتاہ نگی، او رفت ز دارِ کہن، اے وائے

آفاقِ چمن بود، چہ گویم کہ چسے ناگاہ
زاں بلبلِ خوش لہجہ تہی شد چمن، اے وائے

بود آنکہ ز ہر علم و فن آگہ، بہ لحد خفت
رانم چہ دگر من سخن از علم و فن، اے وائے

تاریخ دہے اے تفتہ بمنقوط حروف ست
از مردنِ غالبؔ چہ قدر رنجہ من، اے وائے

ایضاً

ہماں بود گلِ چمن ہماں بود غالبؔ
ز باغِ سخن آنچہ گلہا بچو چید

منم تفتہ یک خار، گویم چہ دیگر
بیا رحلتش "فخرِ عرفی بجو چید"

۱۲۸۵ ہجری

ایں مادۂ تاریخ کہ می نویسم، قطعہ طولانی ست، صرف مادہ نوشتہ شد
ہائے وفات اسد اللہ خاں (۱۲۸۵ ہجری)
اودھ اخبار لکھنؤ مطبوعہ ۲۶ر اکتوبر ۱۸۶۹ء صفحہ ۱۰۳۳
تا ۱۰۳۹۔

اس اشاعت میں مرزا تفتہ نے مرزا غالبؔ کی وفات پر چودہ بندوں پر مشتمل ترجیع بند میں ایک دل خراش مرثیہ کہا ہے۔ مرثیہ میں اشعار کی تعداد ۱۰۵ ہے۔ تفتہ کا یہ مرثیہ نایاب ہے اور ان کے فارسی کلیات میں نہیں چھپا ہے۔ راقم الحروف اس مرثیہ کو تفتہ کے اس کلام کے ساتھ علیحدہ کتابی صورت میں شائع کرے گا جو اودھ اخبار کے فائلوں میں دستیاب ہوا۔ یہاں یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تفتہ کا زیرِ نظر ترجیع بند ایک اعلیٰ ادبی شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے اس میں غالبؔ کے اخلاق، سیرت، ان کی شاعری، عقیدے کی پختگی اور حضرت علیؓ کے ساتھ ان کی والہانہ محبت پر روشنی پڑتی ہے۔ ذیل میں صرف پہلا بند بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ سہ

ہَیہات چہ شوال با محرم شد — اسد اللہ خاں ز عالم شد
نہ شدی کاش یک دو قرن دگر — راحتم رنج و شادیم غم شد
آہ از سینہ ام بپا ہے خاست — اشک از دیدۂ ام دما دم شد
حال او بود، آنچہ نیکو گشت — کار ما بود، آنکہ برہم شد
ہر چہ گفتم کہ طالعم برگشت — مہر کتاں آفتاب شبنم شد
یک خلق بود آنکہ نام آور — ہم چو غالبؔ بہ نسلِ آدم شد
گفتنی نیست انتہائے غمش — یعنی ایں بس، کہ پشت من خم شد
آن سخنور، دمے کہ شد بے جان — جاں ز جسمِ سخن، ہماں دم شد
چوں نہ خواہد رمید از من و دل — نام آرام ما، اگر دم شد
یاد م آمد چہ سیر دریایش — اشک جاری ز چشم پُر نم شد
آں قدر ہا کہ درد دل افزود — آں قدر تا دم ابن مریم شد
جاں بدردِ نوی مشرف گشت — دل بداغِ کہن مکرم شد
مرگ نادر دہنوز و جاں گوید — ناتوانم، ہمی توانم شد
از پسر وا ز پدر چہ ذکر و چہ وقت — دل نہ سہراب و غم نہ رستم شد
بے یکے او زیم چہ ایں دو بلا — دہر کثردم، سپہر ارقم شد
آفتابم رسید بر لب بام — لیکن اندوہ نہ ذرۂ کم شد
باورم نیست گویم از جبریل — کہ پراگندہ دل فراہم شد
یا دگر شخص گو بدایں کہ مرا — درد، درماں و زخم، مرہم شد
ہر یکے راست ایں سخن بر لب — غیر باغ الم کہ خرم شد
ہر کہ از صبر لاف زد ایں جا — پیشِ اربابِ عقل ملزم شد
تاجِ من داغ و تختِ من خاک است — تا چمن، ملکِ غم مسلم شد
تو بہ گل آمدی و ناطقہ ام — ہمہ در درد خیر مقدم شد
داشت اندازہ ہائے بوقلموں — کز ز اسرار او چہ محرم شد
گاہ آئینہ، گاہ جام گرفت — گہ سکندر شد و گہے جم شد
سائلاں را جز ینہ نغمہ بہ لب — او نہ شد از زماں نہ حاتم شد
چہ زیم من بہ تلخکامیہا — شکرِ زیست سر بسر سم شد
شد ہمی شد دگر چہ چارۂ آں — دلکے بود در برم آں ہم شد
بل من و صد چوں من دعا گو را — خاطرم آشفتہ طبع درہم شد

شدہ آغوش چشم خوں شدہ دل   تشنہ گوئی بگاہ ز منزل شد
در بہ پرسی چہ شد چرا این نوع   سورِ عالم، تمام، ماتم شد
فخرِ عراقی و رشک طالب مرد
اسد اللہ خاں غالب مرد

اودھ اخبار لکھنؤ، مطبوعہ ۷ر دسمبر ۱۸۶۹ء صفحہ ۱۱۸۸

"خط تاریخی کہ جو فرزندان جناب نواب مرزا اسد اللہ خاں غالب کو بطور تعزیت و تاریخ بند ہر فقرہ لکھا تھا۔

تاریخ وفات

آج بجا باقر علی خاں اندوہ گیں ہیں
۱۲۸۵ھ
اور حسین علی خان اب قالب بے جان
۱۲۸۵ھ
پھر کیوں کر دل آزاد معین الدین حسن آرام میں
۱۲۸۵ھ
ہے ہے کیا شکایت لکھوں فلک پیر کی
۱۲۸۵ھ

آج کیسا بڑا سرپرست چلا گیا   یہ اب کیا سخت ملال ہے
۱۲۸۵ھ   ۱۲۸۵ھ
ہائے وہ ہم کلام فردوسی خاقانی   یکتائے جہاں سخن دانی بلبل شیراز
۱۲۸۵ھ   ۱۲۸۵ھ
کشادہ پیشانی   شگفتہ رو از باب نیاز
۱۲۸۵ھ   ۱۲۸۵ھ
دیدۂ حقیقت شناس معانی ہیں   مہجور خاک نشیں و آہ شاہ سخن داں
۱۲۸۵ھ   ۱۲۸۵ھ
تفریح بلبل بے لبتاں   خورشید جلوہ کناں
۱۲۸۵ھ   ۱۲۸۵ھ

جلوہ گر فخر عالم   مدبر دفتر دانش
۱۲۸۵ھ   ۱۲۸۵ھ
روشنائی ارباب بینش   چشم مروت
۱۲۸۵ھ   ۱۲۸۵ھ
تصویر فصاحت   صدر نشین مسافت
۱۲۸۵ھ   ۱۲۸۵ھ
رسول رشک حسرت   سخن سراپا ہوش
۱۲۸۵ھ   ۱۲۸۵ھ
فردِ فیض عالم   مخزن نکتہ سنج
۱۲۸۵ھ   ۱۲۸۵ھ
مخازن معلومات بصیرت   بے مثال شاہ شاہان استقلال
۱۲۸۵ھ   ۱۲۸۵ھ

ملک الشعراء صاحب کمالات شرف داشت، کرسی نشیں مستفاد انساں دوست دار اہل بیت، منظوم دریا دل، آفتاب عالم تاب آزادہ، پندار حسن تقریر، پرداغ جدائی الصبور شکستہ، نخل عمر نامراد، دم سرد دلشکستہ جگر، حسرت خیز، آہ آہ واحسرتا۔ ماتم اسد اللہ ہے۔ وائے افسوس ختم ہوئی بہار جلوۂ غالب، آہ غالب دہمرد۔ آہ راہی اسد اللہ ہے خلد بریں کا۔

کاتب الحروف معین الدین حسن

۱۲۸۵ ہجری

(اوپر کے ہر ایک خط کشیدہ جملے سے غالب کا سال وفات ۱۲۸۵ھ نکلتا ہے)

---

[1] ملاحظہ ہو..... اودھ اخبار مطبوعہ، جون ۱۸۷۰ء، [2] اودھ اخبار ۱۱ جون ۱۸۶۸ء، [3] اودھ اخبار مطبوعہ ۱۸ مارچ ۱۸۶۸ء۔
[4] خطبات گارساں دتاسی صفحہ ۹۲۵ شائع کردہ انجمن ترقی اردو (دکن) ۱۹۳۵ء، [5] نقوش سلیمانی ص۵ طبع اول ۱۹۳۹ء، [6] علی جالبی ص۸، [7] تاریخ ادب اردو ص۹۶ حصہ نثر، [8] خطبات گارساں دتاسی ص۱۱۵، [9] خطبات گارساں دتاسی ص۶۱، [10] ایضاً ص۴۳۳، [11] خطبات گارساں دتاسی ص۵۹، [12] خطبات گارساں دتاسی ص۳، [13] ایضاً ص۱۱ دونوں سے ہماری مراد سنسکرت، عربی، فارسی،

اور ترکی ہیں۔ یہ عجب اتفاق ہے کہ میں نے بھی ۴۰ سال قبل اردو کے لیے یہی تشبیہ استعمال کی تھی۔ بعض ہمعصر علما نے اس پر میری تنقید کی۔ ۱۳؎ گارساں دتاسی، ۱۴؎ اودھ اخبار مطبوعہ ۱۲ جولائی ۱۸۶۱ء۔ ۱۵؎ کلیات نثر غالب مطبوعہ منشی نول کشور ۱۸۶۸ء۔ ۱۶؎ اردوئے معلی ص۱۳۱ مطبع مصطفائی دہلی ۱۸۹۹ء۔ ۱۷؎ خطوط غالب ص۱۱۱ مرتبہ مہیش پرشاد۔ ۱۸؎ خطوط غالب ص۱۲۱ مہیش پرشاد، ۱۹؎ ایضاً ص۳۵۵ ۲۰؎ ایضاً ص۱۱۲۔ ۲۱؎ اردوئے معلی ص۲۰۵ مطبع مصطفائی۔ ۲۲؎ اردوئے معلی ص۱۶۲۔

۲۳؎ یہ اشتہار اودھ اخبار مطبوعہ ۱۳ مئی ۱۸۶۳ء روز چہارشنبہ نمبر ۱۹ جلد ۵ ص۳۲۵ پر خط کشیدہ الفاظ میں رد و بدل کے ساتھ دوبارہ چھپا تھا۔

۲۴؎ آیا، ۲۵؎ آیا، ۲۶؎ جملہ ندارد، ۲۷؎ ندارد

۲۸؎ یعنی، ۲۹؎ ہو کر انجام کو پہنچا، ۳۰؎ اختتام کو پہنچا۔

۳۱؎ کامل، ۳۲؎ جائے، ۳۳؎ آئے، ۳۴؎ ندارد

۳۵؎ "تمام کتب، ۲۵ جز میں، چھپ کر تیار ہے اور مقام مناسب پر تصویر مصنف کی یادگار ہے۔ سابق میں سوائے پیشگی محصول پیشگی قیمت ۱۲ روپے قرار دی تھی۔ اور بعد ختم کتاب صہ درج اخبار کی تھی۔ اب چونکہ رفاہ عام منظور ہوا قیمت کا گھٹا دینا ضرور ہوا۔ لہٰذا جن سے پیشگی قیمت وصول ہے انھیں تکلیف محصول نہ دی جائے گی۔ مطبع سے ٹکٹ لگا کر کتاب ارسال کی جائے گی اور جو صاحب اب طلب کریں گے ان سے للعہ قیمت لیں گے۔ اور متعدد جلدوں کے خریدار کی رعایت بدستور ملحوظ ہے ان کا حساب علیحدہ فہرست میں محفوظ ہے۔"

۳۶؎ اس اشاعت سے مرزا غالب کے ایک نئے شاگرد کا اضافہ ہوتا ہے۔ مالک رام کی کتاب تلامذہ غالب میں مظہر کا نام درج نہیں ہے۔ تذکرہ بشیر میں درج ہے کہ "مظہر۔ حاجی محمد اسحاق عرف مولوی مظہر الحق خلف اصغر مولوی ظہور علی ظہور شاگرد اپنے والد اور مرزا غالب کے صاحب دیوان و تذکرہ، متوطن ہریانہ، باشندۂ دہلی، حال اتالیق و تحصیلدار ریاست پاٹودی راقم کے احباب میں" (بحوالہ اردو سہ ماہی غالب نمبر کراچی صفحہ ۲۴۳ مطبوعہ ۱۹۶۹ء) غالب نے مظہر کا ذکر اپنے خطوط میں بھی کیا ہے۔ مظہر تنقیدی ذوق بھی رکھتے تھے۔ انھوں نے ۱۸۹۸ء میں ایک اعلا پایہ کا مضمون یعنی ریویو میر حسن کی مثنوی سحر البیان و گلزار نسیم پر لکھا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں جب چکبست اور شرر کے درمیان مثنوی گلزار نسیم پر بحث چھڑ گئی اور جنگ کی صورت اختیار کر گئی تو پھر منشی سعید اللہ خاں ایڈیٹر "تہذیب" رام پور نے اسے جنوری ۱۹۰۵ء میں قول فیصل کے طور پر "تہذیب" میں شائع کیا۔ مضمون فصاحت و بلاغت سے لبریز ہے اور راقم کی نظر سے گزرا ہے۔

" منشی نول کشور نے اودھ اخبار اور پریس کے ذریعہ علم و ادب کو زندگی بخشی اور ملک کی ذہنی بیداری میں جو حصہ لیا اسے نظر انداز کر کے ہندوستان کی مکمل تہذیبی تاریخ نہیں لکھی جا سکتی "

——— پروفیسر احتشام حسین مرحوم

حسن ابرار

اردو صحافت کی عہد آفریں یادگار
اودھ اخبار

منشی نول کشور کا نام علمی دنیا میں اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک عربی، فارسی اور اردو زبانیں زندہ ہیں اور ان کا ادب زندہ و پائندہ ہے۔ منشی نول کشور سرکار سہار کے ایک موضع "دیڑھ" میں جوان کا ننھیال تھا ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان ضلع علی گڑھ کا معزز "بھارگوا" گھرانے کے نام سے ممتاز تھا۔ منشی جی نے ابتدائی تعلیم اپنے مولد اور ساسنی ضلع علی گڑھ میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے آگرہ کالج آگرہ میں داخل ہوئے اور تعلیم کی منزلیں طے کرنے کے ساتھ ساتھ علمی مشاغل میں مصروف رہنے لگے۔ راقم الحروف نے ان کے ایام طالب علمی کی بعض علمی تحریروں کے نمونے نول کشور گھرانے کے وشار کے پاس بچشم خود دیکھے ہیں۔ منجملہ ان کے "اخلاق محسنی" کا ایک قلمی مخطوطہ بقلم منشی نول کشور قابل ذکر ہے۔ مضمون نویسی اور انشا پردازی ان کے محبوب مشغلے تھے۔ طالب علمی کے دنوں میں وہ اکثر مضامین لکھ کر مختلف اخبارات میں بغرض اشاعت بھیجا کرتے تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد منشی ہرسکھ رائے کے اخبار "کوہ نور" کے عملۂ ادارت میں شامل ہو گئے۔ یہ اخبار لاہور سے نکلتا تھا۔ منشی جی نے اپنی بیدار مغزی اور علمی کوششوں کے ساتھ پنجاب کے محنتی اور جفاکش لوگوں کی صحبت سے مستفید ہو کر ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ میں "مطبع نول کشور" اور "اودھ اخبار" کی داغ بیل ڈالی۔ انسٹھ سال تک منشی جی نے اپنے مشہور زمانہ اودھ اخبار اور مطبع کے ذریعہ علوم و فنون کے ارتقا کی ان تھک کوششیں جاری رکھیں۔ اپنی گوناگوں صفات کی بنا پر حکام اور عوام میں ہر دل عزیزی حاصل کی۔ بے شمار رفاہ عام کے کام کیے، خیر و خیرات، داد و دہش اور عوامی بہبود کے کاموں سے انھیں بے انتہا شغف تھا۔ بے شمار علمی ادارے اور انجمنیں ان کے گرانقدر عطیات کی مرہون منت ہیں۔ بالآخر فروری ۱۸۹۵ء میں یہ آفتاب غروب ہو گیا لیکن آج بھی اس کی پھیلائی ہوئی روشنی نہ صرف ہندستان بلکہ یورپ و ایشیا و افریقہ کے متعدد ممالک کو منور کیے ہوئے ہے۔

منشی جی کو صحافت سے قدرتی لگاؤ تھا اور انھوں نے اپنی انسٹھ سالہ زندگی کا بیشتر وقت اسی مشغلہ کی دلچسپیوں میں گزارا۔ ان کی زندگی میں ان کے کارخانہ سے شائع ہونے والے اخباروں میں "اودھ اخبار" (اردو) "لکھنؤ ٹائمس"[1] (انگریزی) اور "اودھ ریویو" (اردو) کے نام ملتے ہیں۔ جن میں اودھ اخبار کو امتیازی حیثیت حاصل ہوئی۔ اودھ اخبار کی فائلوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں ہندستان میں اردو زبان کے متعدد اخبارات شائع ہوتے تھے مثلاً کوہ نور، لاہور، پنجابی اخبار، سرکاری اخبار، لاہور، اخبار عالم، میرٹھ، اکمل الاخبار، احسن الاخبار، نجم الاخبار، بحر الاخبار، نور الابصار، وکٹوریہ اخبار سیالکوٹ، خیر خواہ پنجاب، سیالکوٹ، آفاق الاخبار، ریاض الاخبار، مدراس، تہذیب الاخلاق

[1] ملاحظہ ہو: اودھ اخبار نمبر ۱۶ بابت ۱۹ اپریل ۱۸۷۷ء۔

سائنٹفک سوسائٹی گزٹ، روہیل کھنڈ اخبار، شعلۂ طور، احسان الاخبار، اردو اخبار آگرہ، علی گڑھ گزٹ، غالب الاخبار، کارنامہ (لکھنؤ) دبدبۂ سکندری (لکھنؤ) نورالانوار، شمس الاخبار، کشف الاخبار ...... صبح صادق، لارنس گزٹ، آب حیات ہند، آئینہ علم، نو رنظر، عمدۃ الاخبار، سفیر بوڑھانہ، آفتاب عالمتاب، مفرح القلوب، ماہ پرتو، برق خاطف، مظہر الاخبار، گنج شائگاں اور اردو گائڈ وغیرہ۔[1]

منشی جی نے اودھ اخبار کے نام سے مطبع اودھ اخبار بھی قائم کیا تھا اور دونوں مطابع مطبع نول کشور و مطبع اودھ اخبار اشاعت کتب کی مہم کو جاری کیے رہے۔

اودھ اخبار ابتدا میں ہفت[2] روزہ رہا، پھر ہفتہ وار[3] ہوا، بعد میں ہفتہ میں دوبار[4] شائع ہونے لگا اور اس کے بعد روزنامہ[5] ہو گیا۔ یہ غالباً پہلا اردو اخبار تھا جس نے اپنے مقالہ نگاروں اور نامہ نگاروں کو ان کی نگارشات کا معاوضہ دینا شروع کیا۔

"اودھ اخبار" کا حلقہ ہندستان ہی تک محدود نہ تھا بلکہ انگلینڈ اور فرانس نیز دوسرے مغربی ممالک میں بھی ہندستان کے ایک موقر اخبار کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور اس کے قارئین میں مشہور مستشرق گارساں دتاسی جیسے لوگوں کے نام ملتے ہیں۔ اس کے کارسپانڈنٹ انگلستان میں بھی متعین تھے۔ مرزا غالب اور سرسید جیسی شخصیتیں اس کے مضمون نگاروں میں شامل تھیں۔

اودھ اخبار بہ ظاہر حکومت کا مخالف اخبار نہ تھا بلکہ حکومت کی کارگزاریوں اور سرکاری افسران وقت کا مداح تھا لیکن حقیقتاً یہ بڑا ہی غیر جانبدار اخبار تھا۔ اگر حکومت کی حمایت و طرفداری کرتا تھا تو عوام کے مسائل پر حکومت کی تنقید سے بھی باز نہ آتا تھا۔

اس کی غیر جانبدارانہ پالیسی ہی کی وجہ سے عوام و خواص میں اسے بڑی مقبولیت حاصل تھی۔ گارساں دتاسی اس کے بارے میں رقمطراز ہیں :۔

"یہ اخبار پچھلے سات سال سے نہایت کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ چنانچہ اس کی ہر اشاعت پچھلی اشاعتوں سے بہتر نظر آتی ہے۔ اس کی تقطیع اور صفحات کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ اخبار ہفتہ وار ہے اور ہر چہارشنبہ کے روز شائع ہوتا ہے۔ شروع شروع میں اس میں صرف چار صفحے ہوا کرتے تھے اور وہ بھی چھوٹی تقطیع پر۔ پھر چھ ہوئے اور پھر سولہ اور اب وہ اڑتالیس صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلے کے مقابلے میں اس کی تقطیع بھی بڑی ہو گئی ہے۔ میرے خیال میں اس سے زیادہ ضخیم اخبار ہندوستان بھر میں اور کوئی نہیں ہے۔"[6]

۲۲ اگست ۱۸۷۱ء مطابق ۵ جمادی الثانی ۱۲۸۸ھ روز سہ شنبہ جلد ۱۳ شمارہ نمبر ۳ کے سرورق سے مترشح ہے کہ اخبار یکم اگست ۱۸۷۱ء سے ہفتہ میں دو بار نکلنے لگا یعنی سہ شنبہ اور جمعہ کو۔ اخبار کے مضامین کی تفصیل نیز اس کے بارے میں دیگر معلومات اقتباس ذیل سے پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہیں :

"اودھ اخبار ہفتے میں دو مرتبہ شائع ہوتا ہے"
ہمارے اکثر ناظرین جدت پسند و شائقین دانشمند
کی قدر دانی مدت سے ہم کو اس بات پر برانگیختہ
کر رہی تھی کہ اودھ اخبار ہفتے میں دو مرتبہ شائع
ہوا کرے۔ الحمد للہ کہ گورنمنٹ اور لوکل گورنمنٹ کی
عنایت روزافزوں سے اب سامان اس عمدہ تجویز کا

---

[1] ملاحظہ ہو اودھ اخبار فائل ۱۸۶۲ء تا ۱۸۷۰ء [2] علمی اجالے از امیر حسن نورانی صفحہ ۸۰۔ [3] تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ مترجمہ مرزا عسکری حصہ نثر صفحہ ۹۶۔ [4] یکم اگست ۱۸۷۱ء سے اودھ اخبار ہفتہ میں دو بار شائع ہونے لگا تھا۔ ملاحظہ ہو فائل اودھ اخبار ۱۸۷۱ء اس وقت منشی شیو پرشاد اس کے منیجر تھے اور اس کا صدر دفتر موجودہ نول کشور ریزیڈنس کی عمارت واقع حضرت گنج میں تھا۔ [5] تاریخ ادب اردو حصہ نثر از رام بابو سکسینہ صفحہ ۹۶۔ نیز سوانح قاسمی از مناظر احسن گیلانی ذکر روئداد مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند بابت ۱۲۹۴ہجری۔
[6] خطباتِ گارساں دتاسی ص۵۱۴ (خطبہ دسمبر ۱۸۶۶ء)۔

نہایت پسندیدہ طور پر بروئے کار آیا جس کو ہمارے قدر دانوں کی نیک نیتی کا ثمرہ اور ذوق شائستگی کا نتیجہ کہنا چاہیے۔ وہ یہ کہ ہے سرکار دولت مدار نے محصول اخبارات کا محض مالکان اخبار کی رعایت اور علوم و فنون کی اشاعت کے واسطے نصف معاف فرما دیا کہ خاص و عام کے موافق مدعا ہے اس لیے کسی کو محصول ناگوار نہ ہوگا۔ چونکہ عمل درآمد اوس حکم یکم اکتوبر سے گزٹ آف انڈیا میں مشتہر ہوا ہے۔ اس حساب سے پورے دو مہینے باقی تھے لہٰذا جناب مالک مطبع اودھ اخبار کی سیر چشمی اس بات کی مقتضی ہوئی کہ ان دو مہینوں کا محصول زائد جملہ ناظرین کو ارمغان کیا جائے اور یکم اگست ہی سے یہ اخبار ہفتے میں دو مرتبہ چھپ کر اجرا پذیر ہو چنانچہ التزام اوس کا حسب ترتیب ذیل کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ سب صاحبوں کو پسند آئے گا:۔

حصۂ اول ۔ یوم سہ شنبہ	حصۂ دوم ۔ یوم جمعہ
۱۔ اشتہارات معمولی	۱۔ لکھنؤ
۲۔ نظم	۲۔ تار برقی
۳۔ خط کتابت	۳۔ اڈیٹوریل
۴۔ مضامین کمیٹی وغیرہ	۴۔ کارسپانڈنٹ
۵۔ تار برقی	۵۔ ترجمۂ انگریزی
۶۔ کارسپانڈنٹ	۶۔ منقول
۷۔ ترجمہ انگریزی اخبارات	۷۔ خط کتابت
۸۔ اخبارات مختلف	۸۔ انگریزی گورنمنٹ گزٹ اودھ
۹۔ لکھنؤ	۹۔ اشتہارات غیر معمولی محض اوس وقت کے لیے [illegible]

اور واضح ہو کہ مضامین رفاہ عام بلا قیمت مفید خاص فی سطر ۲ ر الا جو بات نامرغوب عام یا ناپسند اڈیٹر ہوگی۔ باوجود قیمت اوس کے اندراج سے درگذر ہوگی۔ جن صاحبوں کو اس پرچہ کا ذوق ہو شوق سے قیمت بذریعہ ہنڈی یا ایک۔ ایک آنہ کے ٹکٹ بھیج کر طلب فرمائیں۔ قیمت پیشگی ماہوار عہ ما بعد المضاعف پیشگی سہ ماہی صہ ر اگر دو مہینے کے اندر نہ پہونچے تو المضاعف ششماہی عہ، اور روز اجرائے اخبار سے تین مہینے تک ادا ہونا چاہیے اور سالانہ قیمت عسہ آغاز سال یا ابتدائے خریداری کے لیے آغاز اجرا سے چار مہینے میں ادا نہ ہوگا تو المضاعف عنایت فرمانا ہوگا۔[1]

اودھ اخبار کی فائلوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں دنیا بھر کی خبروں کے علاوہ سرکاری قوانین اور احکامات بھی شائع ہوتے تھے۔ ریلوے ٹائم ٹیبل، عدالتی احکامات اور دوسرے اہم اشتہارات بھی شامل اشاعت کیے جاتے تھے۔ مختلف ادبی و علمی اداروں و انجمنوں کی روداد یں اور اہم ثقافتی سرگرمیوں کی خبریں، مشاعروں اور جلسوں کی تفصیلات بھی اودھ اخبار کے کالموں میں نظر آتی ہیں۔ اس کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی نمایاں سیاسی یا علمی یا سماجی اہمیت کی حامل شخصیت لکھنؤ میں وارد ہوتی تھی تو منشی نول کشور اسے اپنے ادارہ میں ضرور دعوت دیتے اور اس کے بارے میں تفصیلات اخبار میں شائع کرتے تھے۔ چنانچہ ایک روز منشی میاں داد خاں سیاح لکھنؤ آئے تو اس کی خبر اودھ اخبار میں شائع ہوئی۔ سیاح کا سفرنامہ بالاقساط اودھ اخبار کے کالموں میں شائع ہوتا تھا۔[2] اسی طرح جب ۱۰ مارچ ۱۸۸۷ء کو نواب شجاع الدولہ مختار الملک سید تراب علی خاں سالار جنگ حیدرآباد سے لکھنؤ تشریف لائے تو ان کا استقبال کرنے

---

[1] اودھ اخبار بابت ۲۲ اگست ۱۸۶۸ء صفحہ ۸۵ - [2] بابت ۲۲ اگست ۱۸۶۸ء، صفحہ ۸۰ -

والے سرکاری افسران کے علاوہ معززین شہر میں راجہ محمد امیر حسن خاں آف محمود آباد نیز منشی نولکشور شامل تھے[1] سالار جنگ تین چار روز تک لکھنؤ میں مقیم رہے اور روزانہ منشی نول کشور مع منشی رتن علی اڈیٹر اودھ اخبار ان کے پاس ملنے جاتے اور کافی دیر تک دونوں میں گفتگو ہوتی رہتی۔

اودھ اخبار ہندو مسلم اتحاد کا زبردست نقیب اور سماجی خدمات کا ترجمان تھا اس کی مختلف اشاعتوں میں ایسے تراشے مل سکتے ہیں جو مذکورہ امور پر روشنی ڈالتے ہیں۔ سماج سدھار، اصلاح سوم، علوم و فنون کی ترویج و اشاعت کے سلسلہ میں اودھ اخبار سر سید کی تحریکات کا حامی اور معاون تھا۔ سر سید کے اکثر مضامین بھی اس اخبار میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے تھے۔[2] ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کے بارے میں سر سید کا ناقدانہ مضمون بالاقساط اودھ اخبار میں شائع ہوا۔[3]

گارساں دتاسی ۴ دسمبر ۱۸۶۸ء کو اپنے خطبہ میں اودھ اخبار کے بارے میں فرماتے ہیں:

"اودھ اخبار میں جو اب دس سال سے نہایت کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے، بعض اوقات تصاویر اور اردو کی اعلیٰ پایہ کی غزلیں شائع ہوتی ہیں۔ غزلوں کے علاوہ مخمس اور قصیدے بھی ہوتے ہیں۔ حال ہی میں فرحت کی ایک نظم شائع ہوئی تھی جس میں ہندستان کے مناظر کا بیان تھا۔ موصوف آج کل کے اچھے انشا پردازوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ آپ نے "پریم ساگر" کا اردو ترجمہ بھی کیا ہے، جو لکھنؤ میں طبع ہوا ہے۔ اودھ اخبار کی ایک تازہ اشاعت میں علی گڑھ کی سائنٹفک سوسائٹی کے رسالے سے ایک مضمون نقل کیا گیا ہے جس کا موضوع "ہندستانی مصنفین اور ان کی تصانیف" ہے۔"[4]

منشی نول کشور نے اپنے اخبار کے ذریعہ "مصنفین کے حقوق تصنیف" پر گرانقدر خیالات شائع کیے اور اس سلسلہ میں اپنی اور کرنل ہالرائیڈ، ڈائرکٹر ایجوکیشن پنجاب کے مابین ہونے والی مراسلت کو بھی شائع کیا۔ کرنل ہالرائیڈ کے خطوط سے منشی جی کی عظیم خدمات برائے توسیع تعلیم نیز ان کے کاروبار کی ترقی کی تفصیلات بھی معلوم ہوتی ہیں۔ اس وقت ان کے اخبار اور مطبع میں آٹھ سو ملازمین کام کرتے تھے اور ان کے تاجرانہ روابط ہندستان بھر میں قائم تھے۔[5]

منشی جی موصوف نے اپنے مطبع کے ذریعہ جہاں بے شمار کتابیں فارسی، عربی، اردو، ہندی، گرمکھی، سنسکرت وغیرہ میں شائع کیں اور وہاں انھیں بے حد ارزاں نرخ پر شائقین علم تک پہونچانے کی کوشش کی وہاں "اودھ اخبار" کے کالموں میں "اردو زبان" کے تحفظ و بقا اور اس کے ارتقا کے لیے خاموش اور بیباک جہاد کرتے رہے۔ ۱۸۶۸ء میں اردو ہندی کا قضیہ بلند ہوا۔ اور الٰہ آباد کے ایک اجلاس میں طے پایا کہ دیوناگری رسم خط کو رواج دینا چاہیے۔ منشی جی نے اس متنازعہ مسئلے پر اودھ اخبار کے کالموں میں بے لاگ رائیں ظاہر کیں مثلاً:

"اردو زبان جس کی ___ لوگ اس وقت مخالفت کر رہے ہیں ___ مسلمانوں اور ہندوؤں کے خلط ملط سے بالکل اسی طرح وجود میں آئی جیسے انگلستان میں سیکسن اور فرانسیسی کا امتزاج عمل میں آیا۔ "اردو" میں دوسری زبانوں کے وہی الفاظ استعمال ہوتے ہیں جو کھپ جائیں۔ ان الفاظ کے انتخاب میں خاص سلیقہ برتا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "اردو" کو عدالتوں میں مقبولیت حاصل ہوئی اور سرکاری تحریرات میں یہ زبان استعمال کی گئی۔ ان تمام باتوں

(باقی صفحہ پر)

---

[1] اودھ اخبار مورخہ ۱۸ مارچ ۱۸۸۱ء۔ [2] اودھ اخبار بابت ۲۴ دسمبر ۱۸۸۱ء صفحہ ۱۳۹۱ تا ختم اخبار۔
[3] خطبات گارساں دتاسی صفحہ ۳۴۴۔ [4] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "اودھ اخبار" بابت ۱۶ اگست ۱۸۸۰ء۔ [5] ایضاً۔

ڈاکٹر ریاض الحسن



اور اس کے چند ایڈیٹر

اردو صحافت کی تاریخ میں اودھ اخبار کو یک مینارۂ نور کی حیثیت حاصل ہے جس کی ضو فشانی کی بدولت اردو صحافت کا مستقبل درخشاں ہوا۔ ۱۸۵۷ء کے ہندستان گیر انقلاب کے بعد اس پر آشوب دور میں منشی نولکشور نے ملک و قوم کی خدمت کے لیے ناسازگار حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے یہ تاریخ ساز اخبار جاری کیا۔ ایک طرف اودھ اخبار نے اردو زبان و ادب کو ترقی دی اور دوسری طرف ملک کی سیاسی اور سماجی بیداری میں اہم رول ادا کیا ہے۔

۱۸۵۸ء کے اوائل میں منشی نول کشور نے شاہانِ اودھ کی راجدھانی لکھنؤ میں اپنا شہرۂ آفاق مطبع قائم کیا اور اسی سال کے آخر میں ہفتہ روزہ اودھ اخبار کا اجرا عمل میں آیا۔ لکھنؤ کی تاریخی اور تہذیبی اہمیت کا نولکشور کو بخوبی اندازہ تھا۔ اسی لیے لاہور سے واپسی کے بعد وہ آگرہ پہنچے لیکن اخبار کے اجرا کے لیے انھوں نے آگرہ کا انتخاب نہیں کیا۔ جبکہ اسی شہر میں انھوں نے تعلیم مکمل کی تھی اور صحافت کی مشق اور تجربہ بھی وہیں حاصل کیا تھا۔ اودھ اخبار پہلے ہفتہ روزہ تھا لیکن بہت کم عرصہ میں سہ روزہ ہو گیا۔ نولکشور نے اس اخبار کو ایک تجربہ کار صحافی کی حیثیت سے اچھے اصولوں پر چلایا۔ چار صفحات پر مشتمل یہ اخبار ابتدا ہی سے مقبول خاص و عام ہو گیا اور بہت تھوڑے عرصے میں ۱۲ صفحات پر شائع ہونے لگا۔ ملک کی اہم ترین خبریں سب سے پہلے اسی میں شائع ہوتی تھیں۔ کیونکہ نولکشور نے بڑے بڑے شہروں میں نامہ نگار مقرر کر دیے تھے۔ غیر ممالک کی خبریں بھی چھپتی تھیں۔ بعض یورپی ممالک میں بھی اودھ اخبار کے نامہ نگار مقرر تھے۔ لندن میں اودھ اخبار کے نامہ نگار مسٹر اے۔ ایچ پامر تھے جو کیمبرج کے ایک کالج میں پروفیسر تھے۔ انھوں نے ایران کے شاہ قاچار کے سفر لندن کا حال بڑی تفصیل سے اردو میں لکھ کر اودھ اخبار میں اشاعت کے لیے بھیجا تھا۔ اس زمانہ کے ممتاز علما، ادیب اور شاعر اپنے مضامین اور کلام اشاعت کے لیے اودھ اخبار کو دیتے تھے علمی حلقوں میں اس اخبار کو عزت و وقعت حاصل تھی۔ مرزا غالب کے متعدد مراسلات اودھ اخبار میں شائع ہوئے۔ سرسید کے بعض اہم مضامین شائع ہوئے۔ والیان ریاست اور انگریزی حکومت ان تحریروں پر خاص توجہ دیتی تھی۔ جن میں ملکی و قومی مسائل پر اظہار خیال ہوتا تھا۔ ڈاکٹر عبد السلام خورشید نے اپنی کتاب "صحافت ہندو پاک" میں لکھا ہے:

> "اودھ اخبار ایک خالص غیر فرقہ وارانہ اخبار تھا بظاہر ٹیپ ٹاپ سے اور مضامین دیکھ کر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ مسلمانوں کا اخبار تھا۔ ... اس کا کوئی خاص سیاسی مسلک نہ تھا۔ ہمیشہ دامن بچا کر چلتا تھا۔ اس میں بڑے بڑے ادیب، شاعر اور انشا پرداز کام کرتے تھے۔ مثلاً غلام محمد تپش شاگرد غالب۔ سرشار۔ احمد حسن شوکت۔ شرر۔ امجد علی۔ حیرت دہلوی وغیرہ"
>
> (صفحہ ۱۸۱)

اودھ اخبار کی شہرت ہندستان کے علاوہ بیرونی ممالک میں بھی پھیل گئی تھی ۱۸۷۱ء تک اودھ اخبار ہفتہ وار رہا اور اس

کا سائز عام اخباروں کے برخلاف ۲۲×۱۰ کے بجائے ۲۹×۲۲ کر دیا گیا ۔ اخبار ہفتہ میں دو بار شائع ہونے لگا ۔

مشہور مستشرق گارساں دتاسی نے لکھا ہے کہ

"یہ اخبار پچھلے سات سال سے نہایت کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے ۔ چنانچہ اس کی یہ اشاعت پچھلی اشاعتوں سے بہتر نظر آتی ہے ۔ اس کی تعداد اشاعت اور ضخامت بھی بڑھتی جا رہی ہے ۔ یہ اخبار ہفتہ وار ہے اور چہارشنبہ کو نکلتا ہے ۔ شروع شروع میں اس میں چار صفحات ہوا کرتے تھے ۔ اور وہ بھی چھوٹی تقطیع پر ہوتے ۔ اور پھر سولہ اور اب وہ اڑتالیس صفحات پر مشتمل ہوتا ہے ۔ پہلے کے مقابلہ میں اس کی تقطیع بھی بڑی ہو گئی ہے ۔ میرے خیال میں اس سے زیادہ ضخیم اخبار ہندستان میں نہیں" (مقالات دتاسی ۱۹۶۶ء مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند)

دتاسی کا یہ لکھنا غلط ہے کہ اب یہ اخبار ۴۸ صفحات پر شائع ہوتا ہے ممکن ہے دتاسی کی نظر سے اودھ اخبار کا کوئی خاص نمبر گذرا ہو جس کی ضخامت ۴۸ صفحات ہو ۔ لیکن ۱۸۷۰ء تک اودھ اخبار ۱۲ اور ۱۶ صفحات پر چھپتا رہا ۔ ۱۸۷۰ء کے بعد اس کی ضخامت میں اضافہ ہوا ۱۸۷۱ء تک زیادہ تر ۱۶ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا اور ہفتہ وار تھا اسی سال سے ہفتہ میں دو بار شائع ہونے لگا اور سائز بھی بڑا کر دیا گیا ۔ اس پر سر سید احمد خاں بہت خوش ہوئے منشی نول کشور سے ان کے اچھے تعلقات بھی تھے ۔ سر سید نے اپنے اخبار تہذیب الاخلاق میں لکھا ہے کہ :

"اودھ اخبار پہلے سے بھی نہایت باوقعت اخبار تھا ۔ اور اب تو کچھ کہنا ہی نہیں ہے" ہم کو یہ بھی امید ہے کہ ہمارے ہم عصر وقائع نگار بھی اودھ اخبار کی تقلید کریں گے اور منشی نولکشور سلمہٗ اللہ تعالیٰ کی عالی ہمتی سے یہ امید ہے کہ ان کا اخبار مثل بڑے بڑے باوقعت انگریزی اخبارات کے روزانہ جاری ہوا کرے گا ۔ اور خدا کرے ایسا ہی ہو"

(تہذیب الاخلاق یکم جمادی الثانی ۱۲۸۸ ہجری جلد ۲ نمبر ۹)

سر سید کی توقع پوری ہوئی اور ۱۸۷۴ء میں اودھ اخبار روزنامہ ہو گیا بابت یا میں اعلان ہوا کہ روزنامہ دس صفحات پر مشتمل ہوگا لیکن مواد کی کثرت کے باعث اور زیادہ صفحات پر چھپنے لگا ۔ یہ اس کا دور عروج تھا ۔ رفتہ رفتہ اس کی تعداد اشاعت بھی بہت بڑھ گئی ۔ اسی کے ساتھ یہ روزنامہ ۲۴ سے ۴۸ صفحات تک گیا ۔ ۴۸ صفحات کا ذکر دتاسی نے کیا ہے ۔ لیکن جس خطبہ میں انھوں نے یہ ذکر کیا ہے وہ خطبہ ۱۹۶۶ء کا ہے ۔ اس وقت تک اتنی ضخامت کی تصدیق کسی اور ذریعہ سے نہیں ہو سکی ۔ اس لیے خیال غالب یہی ہے کہ اتنی ضخامت خاص نمبروں کی ہوگی ۔

اودھ اخبار میں اردو فارسی کے بلند پایہ شعرا کا کلام بھی شائع ہوتا تھا اور علما اور ادیبوں کے علمی تحقیقی اور تنقیدی مضامین کثرت چھپتے تھے ۔ اس معیار کا کوئی اردو اخبار ہندستان میں موجود نہ تھا ہندستان اور پاکستان کی تاریخ صحافت پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں اودھ اخبار کو ایک سنگ میل کی حیثیت دی گئی ہے ۔

ابتدا میں منشی نول کشور نے اخبار کی ادارت اپنے ذمہ رکھی لیکن جب مطبع کا کاروبار بڑھنے لگا تو اس بات کی فکر ہوئی کہ اودھ اخبار کی ادارت کے لیے کسی قابل شخص کو مقرر کیا جائے

۱۔ مولوی ہادی علی اشک

اس سلسلے میں انھوں نے مولوی ہادی علی اشک کی خدمات حاصل کیں ۔ وہ اودھ اخبار کے پہلے اڈیٹر مقرر ہوئے ۔

مولوی ہادی علی اشک ضلع لکھنؤ کے مشہور قصبہ بجنور کے رہنے والے تھے ۔ والد کا نام شیخ حسین علی بن شیخ مجیب الدین بن شیخ غلام قادر تھا ۔

اشک لکھنؤ میں پیدا ہوئے ، عربی ، فارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی ۔ اردو کے ادیب اور شاعر بھی تھے فتح الدولہ برق سے اصلاح لیتے تھے ۔ برق کے ساتھ کلکتہ بھی گئے جہاں عبدالغفور نساخ سے ملاقات ہوئی اور تعلقات قائم ہو گئے ۔ نساخ نے سخن شعرا میں ان کا ذکر کیا ہے ۔ اشک ایک ماہر خطاط بھی تھے خطِ نسخ میں خاص کمال حاصل تھا ۔ انھوں نے مطبع نولکشور کے لیے قرآن شریف کی کتابت بھی کی بعض کتابوں پر حواشی اور شرحیں بھی لکھی ہیں ۔ کلیات نظم غالب کی صحت

بھی ان کے ذمہ تھی۔ جس کا ذکر غالب نے اپنے خطوط میں کیا ہے۔

تذکرہ علمائے ہند کے مصنف مولوی رحمٰن علی، علمی مشوروں کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اشک، ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد مطبع محمدی لکھنؤ میں صحت کتب کا کام کرنے لگے تھے۔ ان کی قابلیت کی شہرت سن کر منشی نولکشور نے ان کو اودھ اخبار کی ادارت کے لیے بلا لیا۔ جہاں انھوں نے دوسرے علمی کام بھی انجام دیے۔ اشک کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔ انھوں نے ۲۲ رمضان المبارک ۱۲۸۲ھ کو بمقام لکھنؤ وفات پائی اور اپنے آبائی وطن قصبہ بجنور میں دفن کیے گئے۔ [1]

اشک کے بعد اودھ اخبار کے دوسرے اڈیٹر منشی رونق علی مقرر ہوئے انھوں نے ۱۸۶۷ء سے اودھ اخبار میں کام شروع کیا۔

۲۔ مولوی رونق علی رونق

یہ قصبہ کھیولی ضلع بارہ بنکی (اودھ) کے رہنے والے تھے۔ یہ سید پیر علی کھیولوی کے دوسرے بیٹے تھے۔ بچپن سے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا حالانکہ ایک سپاہی کے گھر پیدا ہوئے تھے ان کا مزاج بچپن سے سادہ تھا۔ ۱۸۵۹ء میں لکھنؤ جا کر تعلیم حاصل کی خواجہ عزیزالدین کشمیری ساکن بزری منڈی چوک لکھنؤ سے فارسی پڑھی اور مولوی نظیر علی سے عربی زبان اور اسلامی علوم کی تعلیم حاصل کی مولوی نظیر علی ریاست محمودآباد کے مدرسہ میں مدرس تھے۔ کچھ عرصہ رونق علی مولانا یوسف علی گوپامئوی کے حلقہ تلامذہ میں شامل رہے۔ نہایت ذی علم تھے۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ افسوس تخلص تھا۔ اردو کلام شیخ فضل احمد کیف کو اور فارسی کلام خواجہ عزیز کو دکھاتے تھے۔ طبیعت میں استغنا تھا۔ اپنے اشعار محفوظ نہیں رکھتے تھے اور دوسروں کو بھی اشعار جمع کرنے سے روکتے تھے۔

۱۸۶۷ء میں اودھ اخبار کی صحت کے لیے ان کا تقرر ہوا۔ اور کچھ عرصہ بعد اڈیٹر مقرر ہوئے۔ ۱۸۷۰ء میں منشی نول کشور نے ان کو اپنا سفیر بنا کر پٹیالہ کے مہاراجہ کے پاس بھیجا۔ جہاں انھوں نے وزیر اعظم پٹیالہ خلیفہ محمد حسین کے دل میں جگہ کر لی۔ جس کی وجہ سے خلیفہ نے ان کو روک لیا۔ اور ان کو سفر حضر میں اپنے ساتھ رکھتے تھے خیال رہے کہ پٹیالہ میں منشی نولکشور نے اپنے طبع کی شاخ بھی قائم کردی تھی رونق نے ۱۸۷۱ء میں ریاست پٹیالہ سے ایک اخبار جاری کردیا جس کا نام پٹیالہ رکھا۔ مہاراجہ پٹیالہ ان کی بہت قدر کرتے اور ان پر اعتماد کرتے تھے۔ اپنے ساتھ سفر میں کلکتہ بھی لے گئے واپسی میں بیمار ہو کر وطن چلے گئے۔ صحت ہونے پر دوبارہ پٹیالہ گئے مگر علالت کا سلسلہ جاری رہا۔ ہیں صرف تیس سال کی عمر میں ۲ مارچ ۱۹۰۰ء کو وفات پائی اور پٹیالہ میں دفن ہوئے۔

۳۔ غلام محمد تپش

اودھ اخبار کے تیسرے اڈیٹر غلام محمد تپش تھے۔ ان کے عہد میں اودھ اخبار روزنامہ ہوا۔ ایک ماہر صحافی کی حیثیت سے ان کا درجہ بہت بلند ہے۔

تپش دلی کے رہنے والے تھے۔ وہیں تعلیم حاصل کی۔ عرصہ تک سپٹوری کے نواب اکبر علی خاں کے مصاحب خاص رہے۔ پندرہ بیس سال تک مختلف مقامات پر قیام رہا۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں مہارت حاصل تھی۔ شعر و شاعری کا ذوق بھی تھا ان کی زبان بہت صاف و شستہ تھی۔ دلی کی زبان و محاورات کے دلدادہ تھے۔ اور اس کی حمایت میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ شاعری میں مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ منشی نولکشور نے ان کی قابلیت کی شہرت سن کر اودھ اخبار کی ادارت کے لیے بلا لیا۔ ان کے زمانہ میں اخبار کا معیار بہت بلند ہوا۔ بلکہ اودھ اخبار کے عروج کا دور اسی وقت سے شروع ہو ان کے اداریئے بہت زوردار ہوتے تھے جس کو پڑھنے کے لیے لوگ بیتاب رہتے تھے ۸ سال تک اودھ اخبار کے اڈیٹر رہے ۱۸۷۷ء میں ان کی جگہ رتن ناتھ سرشار نے لے لی۔

تپش نے اودھ اخبار سے علیحدہ ہو کر قیصر ہند کے نام سے ایک اخبار لکھنؤ سے نکالا ستمبر ۱۸۸۰ء کو اس کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا۔ تپش نے اپنے اس اخبار میں بڑے معیاری مضامین لکھے اور امیر مینائی کی لغت امیراللغات کی غلطیوں پر طویل مضامین بھی لکھے۔ تپش نے اودھ اخبار کو تو معیاری بنا دیا لیکن اپنے اخبار کو زیادہ عرصہ نہیں سنبھال سکے۔

---

[1] تذکرہ علمائے ہند صفحہ ۵۴۹۔

۱۹۰۲ء میں بمقام لکھنؤ تپش کا انتقال ہوا اور لکھنؤ کے مشہور قبرستان عیش باغ میں دفن کیے گئے۔

۴۔ رتن ناتھ سرشار

غلام محمد تپش کے علٰحدہ ہونے کے بعد پنڈت رتن ناتھ سرشار اودھ اخبار کے اڈیٹر مقرر ہوئے یہ اودھ پنچ میں مضمون لکھا کرتے تھے۔ انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کی انھیں بڑی مہارت تھی یو پی کے ڈائرکٹر تعلیمات ان کے قدردان تھے۔ انھیں کی سفارش پر اودھ اخبار کے اڈیٹر بنائے گئے۔ انھوں نے دوران ادارت فسانہ آزاد کی تصنیف شروع کی جو قسط وار اودھ اخبار میں شائع ہونے لگا اور اس قدر مقبول ہوا کہ شائقین اگلی قسط کے انتظار میں بے چین رہتے تھے۔ دو ڈھائی سال کے عرصہ میں اردو زبان کا یہ شاہکار چار ضخیم جلدوں میں منظر عام پر آیا۔ اس تخلیق نے سرشار کو شہرت دوام سے نوازا اور مطبع منشی نولکشور کی شہرت و عظمت میں اضافہ کیا۔ جس کی بدولت یہ بلند پایہ ادبی تحفہ حاصل ہوا جس نے اردو ادب کی تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل کر لیا۔ سرشار نے فسانہ آزاد کے علاوہ کئی اور کتابیں لکھیں اور متعدد کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ ان کی مشہور کتابوں میں سیر کہسار۔ ترجمہ الف لیلیٰ بطرز ناول خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

سرشار اودھ اخبار کے ممتاز اڈیٹروں میں تھے مگر وہ اپنی افتاد طبع کے باعث اور مے نوشی کی کثرت کے سبب کسی ایک جگہ ٹھہر نہ سکے چنانچہ جلد ہی اودھ اخبار سے الگ ہو گئے اور الہ آباد ہائی کورٹ میں بحیثیت مترجم ملازمت کر لی۔ وہاں بھی زیادہ دن نہ ٹھہرے وہاں سے حیدرآباد چلے گئے جہاں مہاراجہ کشن پرشاد وزیراعظم کے اخبار دبدبۂ آصفی کے اڈیٹر مقرر ہوئے اور وہیں کثرت مے نوشی کے باعث وفات پائی۔

۵۔ مولانا فخرالدین لکھنوی

اودھ اخبار کے اڈیٹروں میں ایک نمایاں نام مولانا فخرالدین لکھنوی کا ہے جو مولانا ظفر احمد کے بیٹے اور ملک العلماء مولانا محمد حیدر کے نواسے تھے۔ فخر تخلص کرتے تھے۔ عربی فارسی اور اسلامیات کے عالم تھے منشی نول کشور سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ انھوں نے مطبع نول کشور میں عرصہ تک کام کیا۔ امام غزالی کی مشہور کتاب کیمیائے سعادت کا اردو ترجمہ کیا جس کا دیباچہ خود نولکشور نے لکھا اس کے علاوہ فارسی کی مشہور تفسیر حسینی کا اردو میں تفسیر قادری کے نام سے ترجمہ کیا۔ کیمیائے سعادت کے ترجمہ کا آغاز منظوم حمد و ثنا سے کیا جس میں پچاس اشعار ہیں۔ پہلا شعر یہ ہے۔

دلا حمد الٰہی ہو رقم کیا کہ میں کیا اور مرا دست و قلم کیا

مولانا فخرالدین کچھ عرصہ تک اودھ اخبار کے اڈیٹر رہے۔ ان کے مضامین پرمغز ہوتے تھے۔ زبان بہت صاف اور شگفتہ لکھتے تھے۔ سرشار کے بعد ادارت کی ذمہ داری انھوں نے سنبھالی تھی۔

۶۔ راجہ شیو پرشاد

۱۸۶۴ء کے خطبہ میں گارساں دتاسی نے لکھا ہے کہ شیو پرشاد اودھ اخبار کے اڈیٹر ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اننک کے بعد کچھ عرصہ شیو پرشاد اڈیٹر رہے۔ شیو پرشاد کا تعلق محکمہ مال سے تھا۔ بنارس کے رہنے والے تھے۔ پہلے بنارس سے انھوں نے ہندی اخبار نکالا تھا جو ہندی اخبارات میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔ ہندی کے شیدائی تھے۔ انھوں نے اپنی پہلی کتاب گٹکا میں سنسکرت آمیز ہندی استعمال کی ہے۔ دوسری تصانیف آسان اردو میں ہیں۔ ان کو جلد اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ سنسکرت آمیز ہندی چل نہیں سکتی۔ انھوں نے لسانیات پر ایک کتابچہ بھی لکھا ہے منشی نولکشور نے ۱۸۶۲ء کے اودھ اخبار کے ایک شمارہ میں ان کا مختصر حال لکھا ہے۔ اردو اچھی لکھتے تھے فارسی الفاظ بکثرت استعمال کرتے تھے۔ اردو میں خاص مہارت حاصل تھی۔ اودھ اخبار میں ان کے مضامین اور اداریے عرصہ تک شائع ہوتے رہے۔ ان کی متعدد کتابیں بھی شائع ہوئیں۔

۷۔ طوطا رام شایاں

نہایت ذی علم شخص تھے منشی نولکشور کے زمانہ میں کچھ عرصہ اودھ اخبار کے اڈیٹر رہے۔ ان کے اجداد شاہان اودھ کے عہد میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ان کے دادا منسا رام اور پردادا من سکھ رائے اجودھیا کے حاکم تھے۔ شایان۔ نواب سعادت علی کے عہد میں عہدہ بخشی گری پر فائز رہے۔ (تذکرہ شعرائے ہنود)

شاآیاں کا علمی کارنامہ الف لیلیٰ کا منظوم ترجمہ ہے۔ جو منشی نولکشور نے اپنے مطبع سے شائع کیا اس کے علاوہ انھوں نے متعدد اور کتابیں لکھیں، بعض کتابوں کے ترجمے کیے۔ وہ باضابطہ طور پر مطبع نولکشور سے منسلک رہے۔ شعر و شاعری کا ذوق تھا۔ ان کا کلام بھی شائع ہو چکا۔

۸۔ امجد علی اشہری

امجد علی اشہری بن منشی احمد علی بن منصور علی خاں تہور جنگ۔ ان کا سلسلہ نسب امام جعفر صادقؑ تک پہنچتا ہے۔ مورث اعلیٰ جہانگیر کے عہد میں ایران کے مقام ترمذ سے ہندستان آئے تھے۔

اشہری کے متعلق تذکرہ روز روشن میں لکھا ہے کہ:

نیاگانش در عہد جہانگیری از وطن خود کہ شہر ترمذ
بود وارد ہند گشتند و بجاگیر و منصب سرفرازی یافتند

اشہری ۱۲۸۰ھ میں پیدا ہوے۔ عربی، فارسی کی تعلیم مکمل کی۔ آغاز شباب سے نظم و نثر میں ملکہ حاصل کر لیا۔ جب اودھ اخبار روزنامہ ہوا تو اشہری بھی عملہ ادارت میں شامل ہو گئے۔ بعد میں اڈیٹر مقرر ہوے۔ گارساں دتاسی کے خطبات جلد دوم صفحہ ۲۵۲ پر ان کا ذکر ہے، عرصہ تک بھوپال میں رہے۔ اس کے بعد ۱۹۰۳ء میں پیسہ اخبار لاہور سے وابستہ ہو گئے، اشہری کی مشہور تصنیف حیات انیس ہے جو انھوں نے مولانا شبلی نعمانی کے ایما پر لکھی تھی اور میر انیس کے حالات کے سلسلے میں مستند کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس کی تصنیف کے سلسلہ میں وہ خود لکھنؤ میں رہے اور خاندان انیس کے افراد سے ملاقاتیں کر کے ان کے حالات معلوم کیے۔ ان کی کتابوں میں ایشیائی شاعری حیات نورجہاں مشہور ہیں۔ اودھ اخبار میں ان کے جو مضامین اور اداریہ شائع ہوتے تھے ان کو عام طور سے پسند کیا جاتا تھا۔ ان کا شمار اردو کے ممتاز مصنفوں میں کیا جاتا ہے۔ ان کی علمی شہرت میں اودھ اخبار کا بڑا حصہ ہے۔

۹۔ مرزا حیرت دہلوی

اودھ اخبار کے اڈیٹروں میں مرزا حیرت دہلوی کی شخصیت بہت نمایاں ہے۔ حیرت دہلی کے رہنے والے اور عربی فارسی کے عالم، اردو کے اچھے ادیب اور شاعر تھے۔ انھوں نے عرصہ تک مطبع نولکشور میں علمی خدمات انجام دیں متعدد کتابوں کے ترجمے کیے۔ الف لیلیٰ اشہرزاد و دنیا زاد، انھوں نے نولکشور کی فرمائش پر لکھیں۔ انھوں نے عربی و فارسی زبانوں سے متعدد مذہبی کتابوں کے اردو میں ترجمے کیے۔ زبان نہایت شگفتہ لکھتے تھے۔ اودھ اخبار کی ادارت کے فرائض عرصہ تک انجام دیے۔ ان کی تحریریں دلچسپ اور پر مغز ہوتی تھیں۔

۱۰۔ مولانا احمد حسن شوکت میرٹھی

نہایت ذی علم شخص تھے، فارسی اور اردو ادبیات پر عبور حاصل تھا، متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ انھوں نے کچھ عرصہ تک اودھ اخبار کے عملہ ادارت میں کام کیا ہے۔ ان کے مضامین تحقیقی اور تنقیدی زیادہ ہوتے تھے۔

اودھ اخبار کے چیف اڈیٹر کے ساتھ معاون اڈیٹروں کا ایک گروہ بھی کام کرتا تھا کچھ نوآموز صحافت کی تعلیم کے لیے رہتے تھے۔ معاون اڈیٹروں میں مولوی حامد علی۔ مولوی ابوالحسن فرید آبادی، منشی دیبی پرشاد، سید زوار حسین لکھنوی کے نام قابل ذکر ہیں ۔۔۔ سید جالب دہلوی وغیرہ بھی اسی ادارے سے منسلک رہے۔ مرزا غالب کے شاگرد تفتہ سنگرامی بھی اودھ اخبار کے عملہ ادارت میں رہے۔ وہ مطبع کا کام بھی کرتے تھے۔ منشی نولکشور کی زندگی میں اودھ اخبار کے جو قابل ذکر اڈیٹر تھے ان کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ معاون اور قائم مقام اڈیٹروں کی بھی ایک فہرست ہے جسے اس مختصر مضمون میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ نولکشور کے بعد بھی اودھ اخبار کی ادارت ممتاز اہل قلم کے ہاتھ میں رہی جن کے ذکر کے لیے علٰحدہ مضمون کی ضرورت ہے۔ اودھ اخبار کے عملہ ادارت میں تربیت پانے والے بہت سے صحافی بعد میں آسمان صحافت کے چاند تارے بن گئے۔ اور سارے ملک میں اپنی صحافتی سرگرمیوں کے باعث انھوں نے عزت و شہرت حاصل کی اور ملک قوم کی خدمت میں پیش پیش رہے۔ چراغ سے چراغ جلنے کا یہ سلسلہ جاری رہا اور اودھ اخبار کی تربیت گاہ کا فیض ہند و پاک دونوں ملکوں میں آج بھی جاری و ساری ہے۔

(بقیہ صفحہ ۲۷ پر)

انصار الحسن صدیقی

مطبع اودھ اخبار کی کہانی



منشی نول کشور نے ۱۸۵۸ء میں لاہور سے لکھنؤ آکر علم و دانش کی جو شمع جلائی اس کی ضیا پاشیوں سے نہ صرف ہندستان بلکہ ایشیا، افریقہ اور یورپ کے ممالک بھی جگمگا اٹھے۔ آج دنیا میں علوم مشرقیہ کا کوئی کتب خانہ ایسا نہ ہوگا جہاں "مطبع اودھ اخبار" یا "مطبع نولکشور" کی مطبوعات نہ ہوں۔ اردو زبان ابھی اپنے ابتدائی دور ہی سے گذر رہی تھی جب منشی جی موصوف نے اپنے مشہور زمانہ مطبع اور اودھ اخبار کا اجرا کیا۔ اس مطبع نے اردو کے ممتاز ادیبوں، شاعروں اور انشا پردازوں ہی کی تخلیقات نہیں شائع کیں بلکہ ایسے گمنام یا غیر معروف لکھنے والوں کو بھی علمی دنیا سے روشناس کرانے کی گراں بہا خدمات انجام دیں جو اگر ان کے ذریعہ روشناس نہ کرائے گئے ہوتے تو علمی دنیا یقیناً ان کے ناموں اور کاموں سے ناواقف رہ جاتی۔ کہا جاتا ہے کہ منشی جی نے ہر رطب و یابس کو اپنے مطبع سے شائع کر دیا۔ یہ صحیح ہے کہ انھوں نے بہت سی ایسی کتابیں بھی شائع کیں جو اگر ان کے پریس سے نہ شائع ہوتیں تو یقیناً کبھی اور کہیں نہ شائع ہوتیں لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی ہے کہ اگر منشی جی نے اردو کے جواہر پاروں کو شائع نہ کیا ہوتا تو وہ زمانہ کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکتے اور علمی دنیا ایک بڑے اور قیمتی سرمایہ سے محروم ہو جاتی۔ ساتھ ہی اس افسوسناک حقیقت سے بھی چشم پوشی نہیں کی جا سکتی کہ علمی دنیا نے ان کے اس عظیم احسان کے تئیں شکر گزاری کا فریضہ نہیں ادا کیا۔ انھیں صرف ایک کامیاب تاجر کہہ کر نظر انداز کر دیا گیا۔ ان کی عظیم خدمات پر تحقیقی کام نہیں کیے گئے۔ ان کے نام کی پروفیسر شپ آج تک کسی یونیورسٹی میں نہ قائم کی گئی حالانکہ وہ نہ صرف علوم مشرقیہ کے محسن اعظم تھے بلکہ ہندستان میں بھی علم کے فروغ کے سلسلہ میں ان کے مطبع کی شائع شدہ ارزاں اور اہم کتابوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امریکہ دنیا کا سب سے پہلا ملک ہے جس نے کتابوں کو ارزاں نرخ پر فروخت کرنے کا آغاز کیا تاکہ علم عام ہو سکے لیکن ہندستان میں یہ شرف صرف منشی نولکشور کے مطبع کو حاصل ہوا۔ اگر منشی جی یورپ یا امریکہ کے کسی حصہ میں پیدا ہوئے ہوتے تو اُن کی ان عظیم خدمات کے صلہ میں ان کی قوم انھیں سر آنکھوں پر بٹھاتی، ان کی شایانِ شان یادگاریں قائم کی جاتیں اور ان کے نام پر متعدد انسٹی ٹیوٹ قائم ہوتے۔ یونیورسٹیز میں ان کے نام کی چیرز قائم کی جاتیں اور احسان مند قوم ان کے کارناموں کو یاد رکھے جانے کے لیے ہر ممکن جد و جہد کرتی۔

ہندستان کی کوئی یونیورسٹی، کالج اور انسٹی ٹیوٹ ایسا نہیں ہے جو اُن کی شائع کردہ کتابوں سے استفادہ نہ کرتا ہو بلکہ ہر تعلیمی ادارہ اُن کی ارزاں ترین کتابوں کا ہمیشہ طلب گار رہتا ہے۔

منشی جی نے اپنی انسٹھ سالہ زندگی میں اپنے کاروبار کو شروع

بڑھایا، ترقی دی اور رفاہ عام کے سینکڑوں کام کیے — ...لوں، علمی اداروں، اور خیراتی اداروں کی بھرپور مالی اعانت کی۔ نقد امداد کے علاوہ بے شمار کتابیں عطیہ میں دیں ...ورڈنگ ہاؤس بنوائے، تعلیم گاہوں کے اخراجات کی کفالت کی، قومی اور ملی تحریکوں کی خاموش امداد کی نیز علما، ادبا اور شعرا کی سرپرستی کی لیکن بڑے افسوس کا مقام ہے کہ آج تک اہلِ وطن نے ان کی شایانِ شان کوئی یادگار نہیں قائم کی۔

منشی جی کے معاصرین میں مرزا غالب، سرسید احمد خاں، قدر بلگرامی، مردان علی رعنا اور بانی انڈین نیشنل کانگریس اے۔ او ہیوم اور سر سالار جنگ جیسی شخصیتوں کے نام ملتے ہیں یہ لوگ ان کے قدرداں اور ان کی عظیم خدمات کے دل سے معترف تھے۔ اودھ اخبار کی فائلوں میں ان کے تاثرات کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ انہی زمانہ میں میرٹھ سے منشی وجاہت علی خان "اخبار عالم" نکالتے تھے۔ انھوں نے ۷ اپریل ۱۸۸۰ء کو منشی جی اور ان کے اودھ اخبار و مطبع کے بارے میں جو پرخلوص خیالات شائع کیے تھے وہ ہدیۂ ناظرین ہیں۔ ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ منشی جی نے کیسی عظیم خدمات اپنے اخبار اور مطبع کے ذریعہ انجام دیں اور ان کی کیا اہمیت ہے۔ "اودھ اخبار" نے "اخبار عالم" کا یہ اقتباس اپنے کالموں میں دوبارہ بجنسہٖ شائع بھی کیا تھا اور اس کے بعد اپنی رائے لکھتے ہوئے مطبع کی کارگزاریوں کا خاکہ پیش کیا تھا:

"منشی نول کشور صاحب:— ان کے اوصاف اور حالات لکھنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ عیاں راچہ بیاں۔ ہندوستان اور عرب اور عجم اور انگلستان اور مصر اور روم اور فرانس ان سب ملکوں میں ان کا نام روشن ہے۔ اس شخص کو اگر "بانی کتب علوم و فنون" کہا جائے تو بجا ہے۔ اللہ اکبر! مطبع کی شان و شوکت کا کیا بیان کیا جائے۔ جس قدر کتابیں تمام مطابع ملک ہند میں سالہا سال میں چھپتی ہوں گی اس سے زیادہ نقطان کے چھاپے خانے میں تیار ہوئیں۔ اور وہ وہ کتابیں ضخیم مختلف علوم و فنون کی چھپی ہیں کہ اکثر ان میں کی آج تک کسی چھاپے خانے ملک ایشیا اور افریقہ اور یورپ میں بھی نہیں چھپی ہیں اور ایسی خوش خط صاف اور صحیح کہ جن کے دیکھنے سے آنکھوں کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوتا ہے۔ لاکھوں آدمی اس کارخانے کی بدولت بہرہ یاب ہوتے ہیں۔ حسن اخلاق اور محبت اور اور عالی ہمتی اور دست پروری میں منشی صاحب موصوف ہزارہا آدمیوں سے افضل اور اعلیٰ ہیں[1]۔"

اڈیٹر "اودھ اخبار" اس قدردانی اور اظہار اخلاص کا شکریہ ادا کرتا ہے اور اپنے ناظرین کی خدمت میں گزارش کرتا ہے کہ منشی وجاہت علی خاں ایک شخص لیاقت مجسم جویائے ترقیات و بہبودیِ ہند، انشا پرداز بے بدل ہیں۔ اور اخلاص و محبت و الفت میں فرد ہیں۔ صرف اپنی ذاتی سعی و کوشش سے مقام میرٹھ میں اپنے مطبع کو یہ ترقی بخشی۔ گورنمنٹ ممالک مغربی شمالی میں اعتبار حاصل ہے۔ عمدگیِ خیالات کی وجہ سے ایک تعداد معقول میں سرکار سے "اخبار عالم" کی خریداری ہوتی ہے۔

منشی صاحب موصوف (یعنی منشی وجاہت علی صاحب) نے جو کلمات اس مطبع اور مالک مطبع کی نسبت اپنے اخبار میں تحریر فرمائے ہیں، یہ ان ہی کی تعریف ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ سرکار دولت مدار انگلشیہ اور ہند کے رئیسان و عمائد مخصوص عالی جناب مسٹر آر۔ ایچ صاحب بہادر چیف کمشنر اودھ عہد دولت و اقبال کی تائید سے کمال دلیری و ہمت و عزم و جزم کے ساتھ مالک مطبع اودھ اخبار کاروبار کتابی وغیرہ کی ترقی کی کوششوں میں ہمہ تن ایسے مستغرق ہیں کہ جیسے کسی شخص کو کسی شے سے عشق ہوتا ہے۔ مالک کارخانے کا حال جب غور و انصاف کی نظر سے دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ گویا جناب ممدوح اس کارخانے کو شائقان علوم و قدردانان فنون اور اہل ہنر و اہل

[1] اودھ اخبار بابت ۱۹ اپریل ۱۸۸۰ء

کمال کی ملک سمجھتے ہیں اور اپنے برادران وطن اور عامۂ خلائق کے نفع اور بہبودی کی نظر سے اس عظیم الشان کارخانے کے انتظام و انصرام کا بار مردانگی سے اپنے ذمۂ ہمت پر لیے ہوئے ہیں۔ اڈیٹر اودھ اخبار اگرچہ مطبع و اخبار کا خدمت گزار ہے، مگر منصب وقائع نگاری کے لحاظ سے یہ رائے محض آزادانہ ہے اور اپنے ناظرین اخبار کی خدمت میں التماس کرتا ہے کہ آپ لوگ بھی چشم بصیرت سے دیکھیں اور کارخانۂ قدرت الٰہی کو مشاہدہ فرمائیں۔

مطبع اودھ اخبار کے چار بہرہ ہیں: ایک بہرۂ مطبع کانپور ہے جس کے مہتمم اور کارفرما ہمارے لائق و دولت مولوی محمد اسماعیل صاحب اور منشی لالتا پرشاد صاحب جناب مالک مطبع کی جانب سے مقرر ہیں۔ بہرۂ مذکور میں دو سو آدمی کے قریب کام کرتے ہیں اور متوسط تقطیع کی کتب درسیہ مثل گلستاں وغیرہ کے سات آٹھ ہزار جز در روزمرہ تیار ہوتے ہیں۔ اور چار سو رم کاغذ ماہواری صرف ہے۔ بیشتر عمدہ عمدہ تجارتی کتابیں "مطبع کانپور" سے شائع ہوئیں ازاں جملہ "قسطلانی" سی ضخیم کتاب وہیں ختم ہوئی۔

دوسرا حصہ مختلف دیار و امصار کے گماشتوں کا ہے۔ ازاں جملہ شہر دہلی در یبہ کلاں اور عظیم آباد چوک میں بہت بڑے کتب خانے قائم کیے ہیں اور ان دونوں گنجائشوں میں اس وقت پچاس ہزار روپے کی کتابیں فروخت کے لیے موجود ہیں۔

تیسرا حصہ لکھنؤ محلہ حضرت گنج میں مالک مطبع کی ذاتی کوٹھی موسومہ "عنایت سلطان" کے اندر ہے۔ یہ کارخانہ اسی شہر میں اس واسطے دوسرے مکان کے اندر قائم کیا گیا ہے کہ کاروبار کی ترقی کے سبب سے اس وسیع مکان میں گنجائش نہیں تھی۔ حضرت گنج کے مطبع میں اخبار انگریزی موسومہ "لکھنؤ ٹائمس" جناب منشی نول کشور مالک مطبع کے تحت انصرام شائع ہوتا ہے، جس کے اڈیٹر اور مہتمم لائق و شریف، انگریز بیش قرار مشاہرہ پر مامور ہیں۔ انگریزی حروف کا کل کارخانہ اور فارسی اور سنسکرت کے انواع و اقسام کے حروف کا عظیم الشان کارخانہ اس ٹائپ کے کارخانہ کے شمول میں ہے اور کسی قدر لیتھوگرافک پریس کا کام بھی وہاں ہوتا ہے۔ ڈیڑھ سو آدمی کے قریب ہر روز وہاں کام کرتے ہیں۔

چوتھا حصہ یہ صدر کا کارخانہ ہے جہاں سے "صحیفۂ اودھ اخبار" و "انجمن ہند" شائع ہوتا ہے۔ یہ کارخانہ مختلف ممالک اور تمامی حصص ہندوستان کے تاجروں اور قدردانوں کی خط و کتابت کا مبدء و مرجع ہے۔ سال میں ۲۵ ہزار کے قریب تک خط و کتابت کی نوبت آجاتی ہے۔ ہر اقسام تقطیع کے بارہ ہزار جز روز چھاپے جاتے ہیں۔ اس کارخانہ سے فی الحقیقت کتب درسیہ و غیر درسیہ قیمتی و نایاب جیسا کہ آپ نے از راہ محبت تحریر فرمایا ہے۔ شائع ہوتی ہیں اور یہ سب آپ سے احباب کی قدردانی کا فیض ہے۔ مالک مطبع تو اپنے آپ کو خدمت گزار سمجھتے ہیں۔ ان دنوں بھی عمدہ عمدہ کتابیں چھپیں اور چھپ رہی ہیں۔ ازاں جملہ ایک قرآن شریف نہایت پُرقلم اس حسن و خوبی کے ساتھ تیار ہوا ہے کہ آج تک کبھی تیار نہیں ہوا۔ یہ قرآن شریف مولوی ہادی علی صاحب مرحوم و مغفور کا اخیر یادگار ہے، جن کا خوش نویسی کے لحاظ سے ہندوستان میں جواب نہیں ہے۔ غور توں، بچوں کا اس قرآن شریف میں پڑھنا سہولت تعلیم کا موجب ہے۔ مظاہر حق ترجمۂ مشکوٰۃ شریف بھی تیار ہے۔ عہد نامجات اقرار نامجات کی ساتوں جلدوں کا ترجمہ بھی چھپ کر اختتام کو پہنچا۔ تاریخ ٹاڈ راجستان سی ضخیم کتاب جس کے عمائد و رؤسا اور والیان ملک واقع ہند نہایت رغبت سے خواستگار ہوئے ہیں۔ اس کے سوا طب کی اکثر کتابیں ترجمہ ہوئیں اور چھاپی گئیں جیسے طب اکبر اردو ہے۔ یہ ترجمہ نہایت لطیف و صحیح ہے اور ماہ مئی میں چھپ کر شائع ہوگا۔ علی

ہذا القیاس قرابادین قادری و مفرح القلوب اردو ترجمہ ہو کر اسی مہینہ میں شائع ہوئیں۔ علاج الامراض کا بھی ترجمہ ہو رہا ہے۔ اقبال نامہ جہانگیری جس کا مؤلف آصف خان معتمد الدولہ ہے، چھپ کر شائع ہوا۔ اب مفصلہ ذیل کتابوں کے چھاپنے کا انتظام ہو رہا ہے:

۱۔ دیوانِ صائب: جہاں تک حجم کامل سکے، مطبع میں اس وقت تخمیناً ۶۰ ہزار شعر کا دیوان موجود ہے۔

۲۔ دیوانِ امیر خسرو دہلوی: جہاں تک مل سکے۔

۳۔ کلیاتِ سعدی:

۴۔ احیاء العلوم: چار جلد میں سے صرف ایک جلد ترجمہ ہونے سے باقی ہے۔ جس وقت وہ جلد ختم ہو جائے گی آغاز طبع ہوگا۔

۵۔ کلیاتِ حزیں: مصنف کے وقت کے نسخہ سے نقل ہوتا ہے۔

۶۔ تفسیر کشاف: کے چھاپنے کا بھی انتظام ہو رہا ہے۔

۷۔ دیوانِ نظیری نیشاپوری: شرح کے ساتھ چھاپا جاتا ہے۔

۸۔ قرآن شریف کو قرأت سبعہ کے ساتھ چھاپنے کا قصد ہے جس کا اشتہار آئندہ ہفتے کے اخبار میں درج ہوگا۔

درسیہ کتابیں جو بالفعل چھاپی گئی ہیں ان کی تعداد دو سو کے قریب ہوگی۔ ہر ایک کے نام کی تفصیل طوالت کلام میں داخل ہے اور بیشتر وہی کتابیں ہیں جو بارہا چھاپی گئی ہیں اور فروخت ہو گئیں۔ تالیفات و تصنیفات جدید میں سے بھی اکثر کتابیں شائع ہوئیں اور ہوتی جاتی ہیں۔

حضرات مولفان ہند بھی اس مطبع کے تہ دل سے شکر گزار ہیں کہ ان کی کتابیں کثرت سے طبع ہوئیں اور مطبع کی تدبیر سے بہ عنایت ایزدی وہ لوگ اپنے مطلب پر کامیاب ہوئے اور ان کی تالیفات اور تصنیفات برائے فروخت شائع ہوئیں۔

ہم بلا تصنع کہہ سکتے ہیں کہ اس مطبع نے عامۂ خلائق کو انواع اقسام کے فائدے ہوئے آئندہ بھی انشاء اللہ تعالیٰ ہر طرح سے امید ہے اور بے شک ہر سال ترقی تعلیم میں خاص توجہ ہوگی اور اب کے سال مقام جرمن اور فرانس کے نامی گرامی تاجروں سے جو کتب فروشی و کاغذ کی تجارت کرتے ہیں بخوبی کامیابی کے ساتھ خط و کتابت اور لین دین کا بندوبست ہو رہا ہے۔ مالک مطبع تجارت کتب کے سوا ہر قسم کے کاغذ کی بھی تجارت کرتے ہیں۔ علی الخصوص بڑا ذخیرہ کاغذ کا ہر مہینے براہ راست جرمن اور لندن اور فرانس سے منگوایا جاتا ہے۔ خدائی عنایت سے ۱۸۶۹ء کے آخر کا جمع و خرچ ڈھائی لاکھ روپے کے قریب تھا۔ پس ہمارے ناظرین اخبار اور ہمارے صادق دوست منشی وجاہت علی خاں صاحب مالک و مہتمم "اخبار عالم" میرٹھ مطبع اودھ اخبار کے کاروبار کی ترقی کو اسی سے قیاس فرما سکتے ہیں۔ الحمد للہ علی احسانہٖ ؎

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ



تبسم اعجازی

منشی نول کشور

کی صحافتی تربیت گاہ : کوہ نور

کلکتہ جرنل میں جام جہاں نما کلکتہ کے شائع شدہ مضامین کی ایک فہرست کے مطابق کلکتے میں اردو صحافت کی بنیاد جام جہاں نما کے اجرا کے ساتھ ۸ مئی ۱۸۲۲ء سے قبل رکھی جا چکی تھی۔ اور اس اخبار کے چند ابتدائی نمبر ہندستانی (یعنی اردو) زبان میں شائع ہو چکے تھے لیکن ۸ مئی ۱۸۲۲ء کے بعد اس اخبار کی زبان میں نمایاں تبدیلی کی گئی اس طرح جام جہاں نما نے اردو کا لباس اتار کر فارسی کا جامہ پہن لیا۔ لیکن زمانہ شناس نگاہوں نے اردو صحافت کے اس جامے کے لیے جلد ہی دوسرے قالب تلاش کر لیے چنانچہ نصف صدی کے ختم ہوتے



ہوتے ہندستان کے مختلف حصوں سے اردو اخبارات جاری ہو گئے۔ اردو صحافت ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات کی وسعت کے ساتھ ترقی کرنے لگی۔

جب ۱۸۴۹ء میں شدید خونریزی کے بعد انگریزوں کو پنجاب پر بھی مکمل اقتدار حاصل ہو گیا تو انھوں نے اپنی حکمت عملی کے تحت فارسی کو پنجاب کے سرکاری دفاتر سے نکال کر اردو کو باقاعدہ سرکاری زبان کی حیثیت دے دی۔ انگریزوں کے زیر اقتدار آنے سے پہلے ہی سرزمین پنجاب اردو صحافت کے لیے ہموار ہو چکی تھی۔ اس کا ثبوت ہمیں ۱۸۴۵ء کی ایک سرکاری رپورٹ

میں ملتا ہے جس میں شملہ اخبار کا ذکر تعریفی انداز میں کیا گیا ہے۔ گویا شملہ اخبار وہ پہلا اخبار تھا جو اردو زبان میں ۱۸۴۸ء میں پنجاب سے شائع ہوتا تھا۔ گارساں دتاسی کے بیان کے مطابق اس کا رسم الخط دیوناگری تھا۔ شملہ اخبار کے خریداروں کی مجموعی تعداد تیس تھی جس میں بائیس ہندو اور آٹھ یوروپین حضرات خریدار تھے اور بیس کاپیاں لوگوں کو مفت تقسیم کی جاتی تھیں۔ اس اخبار کی ماہانہ قیمت ایک روپیہ تھی اور مجموعی آمدنی تیس روپے جبکہ پچاس کاپیوں کی طباعت پر چالیس روپے ماہانہ خرچ ہوتے تھے۔ یہی سبب تھا جو رؤسا اور انگریزوں کی سرپرستی کے باوجود شملہ اخبار زیادہ عرصے تک نکل نہ سکا۔

شملہ اخبار کے بعد خطۂ پنجاب سے اردو زبان کا دوسرا اور فارسی رسم الخط میں اردو کا پہلا اخبار "کوہ نور" لاہور سے جاری ہوا۔

"کوہ نور" لاہور کا تذکرہ ہمیں سب سے پہلے ۱۸۴۹ء تا ۱۸۵۰ء کی ایک سرکاری رپورٹ میں ملتا ہے جس کے مطابق ۱۸۵۰ء میں سرکاری سرپرستی میں شائع ہونے والے اس کثیر الاشاعت اخبار کے خریداروں کی تعداد ۲۲۷ تھی۔ اس سلسلے کی داخلی شہادت خود کوہ نور کی ۱۶ جنوری ۱۸۵۵ء کی تمہید ہے۔

"یہ مطبع جس کا نام نامی اسم گرامی "کوہ نور" لاہور ہے جنوری ۱۸۵۰ء سے جاری ہے۔ عمر اس شرافت پناہ کی پورے پانچ برس کی ہے۔"

لیکن "کوہ نور" کو اپنی عمر کے چوتھے مرحلے میں ہی ہندوستان گیر شہرت اور مقبولیت حاصل ہو چکی تھی۔ بقول میر انوار حسین خمار ؎

ہو گیا جب سے مرتب کوہ نور — مطلع الانوار یہ لاہور ہے
چار دانگ ہند اور پنجاب میں — صادق الاخبار یہ مشہور ہے
یوسف معنی رنگیں ہے عزیز — پردۂ الفاظ میں مستور ہے
سطر اس کی رشک ابروئے پری — لفظ اس کا خال روئے حور ہے
اس کے اخبار و عبارات صحیح — اہل دانش کو سدا منظور ہے
مہتمم اس کا وہ ہر سکھ رائے ہے — جو کہ عند الناس میں مشہور ہے

اخبار کوہ نور کے مہتمم منشی ہر سکھ رائے تھے جو بذات خود ایک بھٹ نگری کائستھ تھے اور تحصیل سکندرآباد ضلع بلند شہر کے باشندے تھے۔

الحاق پنجاب کے بعد جب انگریزوں کو لاہور میں ایک اردو اخبار اور مطبع جاری کرنے کا خیال پیدا ہوا تو انھوں نے منشی ہر سکھ رائے کو لاہور آکر پریس قائم کرنے اور اخبار جاری کرنے کی دعوت دی۔ مالی امداد کے ساتھ "کوہ نور" کے لیے خریدار بھی مہیا کیے اور گورنمنٹ کا طباعت کا سارا کام ان کے حوالے کر دیا۔

منشی ہر سکھ رائے اپنے مربیوں کے مزاج سے بخوبی واقف تھے اس لیے ہمیشہ محتاط رہنے کی کوشش کرتے تھے لیکن اس احتیاط کے باوجود ان سے کبھی کوئی لغزش سرزد ہو ہی جاتی تھی جس کا خمیازہ بھی انھیں خود بھگتنا پڑتا تھا چنانچہ مارچ ۱۸۵۶ء میں اپنی ایک لغزش کی بنا پر قید کی سختی بھی اٹھانا پڑی اور ۱۱ مارچ ۱۸۵۶ء کی اشاعت میں "کوہ نور" کو ایک معذرت نامہ شائع کرنا پڑا۔

"ہم بہ افسوس بیان کرتے ہیں کہ اب کے ہفتہ میں اس مطبع پر ایک صدمۂ عظیم عائد ہو گیا یعنی منشی ہر سکھ رائے ایڈیٹر "کوہ نور" کو صاحب ضلع نے تین سال کو قید کر دیا اس لیے اب کی دفعہ اخبار کے پرچے میں توقف پڑا۔"

منشی ہر سکھ رائے قید کیوں کیے گئے اس کا سبب کوہ نور نے نہیں بتایا لیکن جب صادق الاخبار دہلی نے ان کی رہائی کی خبر شائع کی تو حقیقت ظاہر ہو گئی۔

"فرنگیوں نے لاہور میں یہ نیا ڈھکوسلا واسطے تحصیل زر کے نکالا ہے کہ جس قیدی کی مہینہ بھر کی قید ہے وہ پانچ روپیہ دے کر رہائی پاتا ہے۔ اس حساب سے برسوں کی میعادی چھوٹے جاتے ہیں۔ سنا گیا کہ اس اثنا میں منشی ہر سکھ رائے

مہتمم کوہ نور جو قید ہو گئے تھے ۵۰۰ روپیہ دے کر رہا ہوئے پھر بھی مطبع انگریزوں کی خوب چھاپی۔"

(صادق الاخبار دہلی جلد ۲۳ نمبر ۶ نو از دہم ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ)

آغاز اگست ۱۸۶۱ء میں منشی ہرسکھ رائے ایک فریب دہندہ کا شکار ہو گئے جس کی خبر اودھ اخبار مطبوعہ ۱۶ اکتوبر ۱۸۶۱ء میں شائع ہوئی۔

" ایک شخص مرزا اشرف علی نام ساکن دہلی گزٹ کے کام کا استاد بن کر تخمیناً ڈیڑھ مہینا ہوا کہ مہتمم کوہ نور سے سو روپے نقد مارے گیا تھا عند الاستغاثہ عدالت فوجداری سے اوس کو چھ مہینے کی قید بامشقت ہوئی اور سو روپے جرمانہ جو در صورت وصول مہتمم کوہ نور کو ملے گا ورنہ ڈیڑھ مہینے اور قید رہے گا۔"

کوہ نور کے مالک منشی ہرسکھ رائے ایڈیٹر کی حیثیت سے نہ صرف عوام میں مقبول تھے بلکہ روسا اور والیان ریاست کے درباروں میں بھی محترم سمجھے جاتے تھے۔ مہاراجہ صاحب پٹیالہ اور مہاراجہ صاحب کشمیر ان کے قدردانوں میں تھے۔ ریاست کی سرحد پر ان کا رئیسانہ استقبال کیا جاتا تھا اور سواری کے لیے ہاتھی پیش کیا جاتا تھا۔ منشی صاحب نہایت ٹھاٹھ کے کے ساتھ ریاست کے مہمان رہتے تھے۔ مہمان داری کے اختتام پر مہاراجہ کی طرف سے خلعت کے علاوہ تحفتانہ کے نام سے گیارہ سو روپے ان کی نذر کیے جاتے تھے۔ لاہور میں بھی ان کی زندگی نہایت شان و شوکت کے ساتھ بسر ہوتی تھی۔ ان کا شمار روسائے لاہور میں کیا جاتا تھا۔ وہ بلدیۂ لاہور کے نامزد رکن بھی تھے۔

منشی ہرسکھ رائے اپنے زمانۂ شباب میں لاہور آئے تھے اور وہیں ۲ ستمبر ۱۸۹۰ء کو وفات پائی۔ لیکن "کوہ نور" ان کی وفات کے بعد بھی ۱۹۰۴ء تک شائع ہوتا رہا۔ اس کے آخری ایڈیٹر محمد الدین فوق تھے۔

کوہ نور کے ایڈیٹروں کی فہرست میں ہر مذہب و ملت اور گوناگوں نظریات کے حامل افراد کے نام ملتے ہیں جس سے منشی ہرسکھ رائے کے فراخ دل اور کشادہ نظر ہونے کا ثبوت فراہم ہوتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ منشی ہرسکھ رائے نہ صرف زمانے کے رخ کو پہچانتے تھے بلکہ وہ انسان کے ظرف کی پرکھ بھی رکھتے تھے اور انھوں نے کوہ نور کی ادارت کے لیے ایسے لوگوں کا انتخاب کیا تھا جو مستقبل میں اردو صحافت کے آفتاب ماہتاب بن کر چمکے۔ سید نادر علی شاہ سیفی، منشی تاج الدین، نثار علی شہرت، مرزا موحد، سیف الحق ادیب، مولوی عبداللہ، منشی محرم علی چشتی، منشی لال سنگھ اور منشی نول کشور مطبع کوہ نور پر درخشاں ہو کر کوہ نور کو صحافت کا آئینہ زار بنا گئے۔

منشی نول کشور کی ذات محتاج تعارف نہیں وہ اردو کے ایک عظیم ناشر، طابع اور صحافی کی حیثیت سے عالمگیر شہرت رکھتے تھے۔ صحافت اور طباعت سے ان کے تعلق کی ابتدا "کوہ نور" سے ہوئی لیکن عبدالسلام خورشید اس بارے میں اپنے اختلاف کا اظہار کرتے ہوئے نقوش کے لاہور نمبر میں لکھتے ہیں۔

" جس زمانے میں انھیں کوہ نور سے وابستہ بتایا جاتا ہے اس زمانے میں وہ آگرہ سے سفیر آگرہ نکالتے تھے اور ان میں ایسے روحانی کمالات موجود نہیں تھے کہ آگرہ لاہور سے بیک وقت دو اخباروں کی ادارت کے فرائض انجام دیتے۔"

بادی النظر میں معترض کا اعتراض جائز۔ انکار مدلل اور نتیجہ ریاضی صداقتوں کا حامل معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں۔

جس وقت منشی ہرسکھ رائے کو لاہور آنے کا دعوت نامہ ملا اس وقت وہ تحصیل سکندرآباد میں نہیں بلکہ آگرے میں مقیم تھے جو ضلع بلند شہر کا ایک قریبی شہر ہے۔ منشی نول کشور کا قیام بھی اسی زمانے میں آگرے میں تھا اور منشی ہرسکھ رائے سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے جس کی بنا پر انھوں نے بھی منشی

ہرسکھ رائے کے ساتھ لاہور کا سفر اختیار کیا اور کوہ نور پریس کے قیام اور اخبار کے سلسلے میں امکانی حد تک ان کا ہاتھ بٹایا جب پریس قائم ہو گیا تو منشی ہرسکھ رائے نے ان کی تنخواہ دس روپیہ مقرر کر کے ان کے خدمات کو بحیثیت مینیجر کے مستقل کر دیا۔ منشی نول کشور کے علاوہ اس وقت مطبع واقع محلہ بیک دروازہ لاہور میں جو دوسرے ملازم تھے ان میں غلام محمد پرنٹر، علی محمد پبلشر اور پنڈت نرائن داس مظہر خوش نویس کے ناموں کی تصدیق بھی خود کوہ نور کے صفحات سے ہوتی ہے۔

۱۸۵۴ء میں منشی ہرسکھ رائے اور منشی نول کشور کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو گئی جس کے بعد منشی نول کشور نے ہمیشہ کے لیے لاہور کو خیرباد کہہ دیا اور جب جنوری ۱۸۵۶ء میں آگرہ سے ......"سفیر" کی اشاعت شروع ہوئی تو نول کشور اس کی ادارت کے فرائض انجام دینے لگے۔

"کوہ نور" کی ابتدا ایک ہفت روزہ اخبار کی حیثیت سے ہوئی تھی لیکن اپنی زندگی کے پہلے سال ہی وہ ہفتے میں دو بار یعنی ہر شنبہ اور سہ شنبہ کو شائع ہونے لگا تھا جب اس کی اشاعت میں مزید توسیع ہوئی تو ہفتے میں تین بار شائع ہونے لگا۔ بالآخر ۱۸۸۳ء میں "روزنامہ" ہو گیا ۱۸۵۱ء میں اس کی ماہوار قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (پیشگی سالانہ بارہ روپیہ) قرض سالانہ چوبیس روپے تھی، اجرت اشتہار فی سطر دو آنے، اور چھ سطر سے کم کے اشتہار کی قیمت آٹھ آنے مقرر تھی۔ اخبار میں زیادہ تر گورنمنٹ گزٹ کی خبریں نقل کی کی جاتی تھیں۔ ادبی تاریخی اور معلوماتی مضامین کو بھی جگہ دی جاتی تھی۔ کبھی کبھی تعلیم نسواں پر بھی مضامین شائع کیے جاتے تھے انجمن لاہور کی روداد کے علاوہ طرحی مشاعرے کی روداد چھاپنے کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا تھا۔ شائع شدہ کتابوں پر آزادانہ تنقیدیں کی جاتی تھیں اور ناظرین کے مذاق شعری کی تسکین کے لیے نوجوان شعرا کا کلام بھی شائع کیا جاتا تھا دیار و امصار ہند کی خبریں یا معاصر اخبارات سے بھی نقل کی جاتی تھیں۔

۱۸۵۰ء میں کوہ نور کے خریداروں کی تعداد کثیر ہونے کے باوجود ۲۲۷ تھی لیکن ۱۸۵۶ء میں خریداروں کی تعداد بڑھ کر ۳۴۹ ہو گئی تھی۔ گورنمنٹ گزٹ کے علاوہ "کوہ نور" میں نقل کیے گئے مضامین اور خبروں میں جن اخباروں کے حوالے دیے گئے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

الاخبار آگرہ، الحقائق آگرہ، انجمن آرا کلکتہ، باغ و بہار بنارس۔ بنارس گزٹ بنارس۔ جام جہاں نما میرٹھ۔ دلی اردو اخبار دہلی۔ دریائے نور لاہور۔ دہلی گزٹ۔ ریاض الاخبار سیالکوٹ۔ ریاض نور ملتان۔ زبدۃ الاخبار آگرہ۔ شملہ اخبار شملہ۔ شعاع الشمس ملتان۔ عمدۃ الاخبار دہلی۔ عمدۃ الاخبار بریلی۔ قادری گورداسپور۔ قرآن السعدین دہلی۔ مراۃ الاخبار کلکتہ۔ مراۃ الخیال کلکتہ۔ مجمع الاخبار بمبئی۔ مرتضائی پشاور مطلع الانوار گجرات۔

چونکہ اردو صحافت کی ابتدا انگریزوں کی زیر سایہ ہوئی تھی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذاتی اغراض اس تحریک کو آگے بڑھانے میں مہمیز کا کام کرتے تھے۔ اس لیے اکثر اخبارات کمپنی کی پالیسی کے تابع تھے کوہ نور بھی ان میں سے ایک تھا جس کی اپنی کوئی امتیازی پالیسی نہ تھی۔ محققین کا یہ کہنا صحیح ہے کہ کوہ نور کے اکثر صفحات اپنے عہد کے حاکموں کی خوشامد سے سیاہ ہیں لیکن اس سیاہی میں ایک محتاط صحافی کے ضمیر کی کروٹ کی جھلک بھی صاف دکھائی دیتی ہے۔ کوہ نور کی ہمعصر اخبارات سے چھیڑ چھاڑ روزمرہ کی بات تھی۔ جدید مطابع اور جدید اخبارات کا خیر مقدم بھی اس وقت کی ایک اخلاقی اور کاروباری رسم تھی۔ جو چنداں قابل ذکر نہیں البتہ ضلع کے نظم و نسق کی آڑ لے کر کمپنی کے ارباب اقتدار پر کوہ نور نے جو محتاط نوٹیں کی ہیں وہ خاصے کی چیز ہیں۔

جب ۱۸۵۶ء میں اخبارات و مطابع کی آزادی سلب کر لینے کے لیے کونسل کے اجلاس میں تجویز پیش کیے جانے کی خبر ملی تو سب سے پہلے کوہ نور نے اس تجویز کے خلاف آواز بلند

کی اور معاصرین سے متحد ہو کر اس تجویز کی مخالفت کرنے کی اپیل کی۔

"اخبار نویسان و وقائع نگاران ملک ہند اور مالکان مطابع کو واضح ہووے کہ دراں ولا یعنی لیجس لیٹو کونسل ہند میں یہ تجویز ہوئی ہے کہ ایک قانون ایسا اجرا پاوے جس سے چھاپے والوں کو اختیارات چھاپنے مضامین کے نہ رہیں اور سرکار کی طرف سے مزاحمت اور مداخلت ہووے۔ پس سب کو لازم ہے کہ ایک دل اور ایک رائے ہو کر بکمال مستعدی پیروی اس بات کی کریں کہ ایسا قانون جاری نہ ہووے۔ ورنہ سب کو ضرر ہے اور پھر اخبار اور چھاپہ کی کچھ ہستی نہ رہے گی۔ ہم کو قیاس نہیں چاہتا کہ سرکار نے یہ اختیارات دیے ہیں بلا وجہ اس میں مداخلت کرے۔"

کوہ نور ۲۹ اپریل ۱۸۵۷ء

ایک ایسے زمانے میں جب کہ انگریزوں کے خلاف تحریکیں ہندستان کے طول و عرض میں خفیہ طریقے پر پھیل رہی ہوں اور حاکم وقت ہندستان پر اپنی گرفت قائم رکھنے کے لیے کسی بھی قسم کے جبر و تشدد سے گریز نہ کرتے ہوں اس وقت کونسل کی کسی تجویز سے اختلاف ظاہر کر کے تحریک کو منظور کرنے کی دعوت دینا کوئی آسان امر نہ تھا لیکن کوہ نور نے بے خوف ہو کر یہ کام انجام دیا۔

ارباب احتساب کی سختی اور معاصرین کی چشمک نے کوہ نور کے مزاج میں "انتہا پسندی" پیدا کر دی تھی۔ وہ جس طرف بھی جھکتا تہہ تک کی خبر لاتا۔ کسی سے دوستی ہو یا دشمنی دونوں ہی باتوں میں "شدت" کا راستہ اختیار کرتا تھا۔ کوہ نور کے صحافتی مزاج کو سمجھنے کے لیے اس کے مختلف ادوار کی خبروں اور مقالات پر نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے جو درج ذیل ہے۔

(خط)

مکرمی منشی ہر سکھ رائے مہتمم کوہ نور زاد عنایتہ۔ آج اخبار دریائے نور مجریہ ۲۲ جون سنہ حال میں ہم نے جو حال بے انتظامی پولس کا بہ وضاحت لکھا ہوا بچشم خود دیکھا تو کمال تعجب بلکہ تاسف اور ایسے ایسے مردمان ناعاقبت اندیشوں کے ہو کہ قابل تحریر بلکہ تقریر نہیں کیونکہ جس قدر اب بندوبست اور انسداد واردات کا ہے بعہد کوتوال سابق مرحوم کے کبھی نہ تھا خود ناظرین کوہ نور ملاحظہ فرما دیں کہ شب و روز کس قدر با آرام و بے خوف و خطر گزران اپنے اپنے حوصلہ کے موافق فقیر امیر کرتے ہیں اور عدل و انصاف حکام وقت اور بے ملول عملہ پولس کے اس قدر ہے کہ فقیر اپنے تئیں ہم پلہ امیر اور ذی اختیار سمجھتے ہیں اور اگر کہیں ناحق سندی روزگار ہو جاوے تو بھی امیر و غریب کو مو برابر نہیں گر و اپنے اور اصلاح سے کام نہیں رکھتے عہد سابق میں تو کوئی روز ایسا نہیں گزرتا تھا کہ فی محلہ ایک دو واردات مثل چوری چکاری اچکہ گری خوں خرابہ نہیں ہوتا تھا وہ اب بالکل یک قلم مسدود و مانند بے نشان ہو گیا ہے اور جو شاذ و نادر اگر کوئی واردات چوری چکاری کی ظہور میں آئی تو وہ اسی طریقے پر ہو گئی۔ بقول کہ مال بیٹوں میں غایت وہ یہ ہے کہ یا تو ملازم خاص نے چوری کرائی ورنہ خود ہی بہ طمع تغلب مال خویش اقربا ایک مکان سے نقل مکان کر کے شہرت دی کہ چوری ہو گئی الا ہمارے شہر کے کوتوال یعنی پنڈت رام نرائن صاحب اور آنریری پولیس پنڈت اجودھیا پرشاد صاحب ایسے یافی کارگزار ہیں کہ وہ ایسی چوری کو فی الفور نکال لیتے ہیں بلکہ جاتے ہی معائنہ مقام واردات سے صاف روبروئے خاص و عام کہہ دیتے ہیں کہ یہ کام فلاں نے کیا ہے اور اقرار کرا دیتے ہیں ہم ایسے حاکمان عہد کے شکر گزار ہیں کہ یا الٰہی ایسے ایسے مردمان زود فہم و رسا کار حکام عادل و انصاف شعار کو خدا سلامت با کرامت رکھے اور ناعاقبت اندیشوں کو کریم کارساز بے نیاز ہدایت بخشے۔

(کوہ نور ۲۴ جون ۱۸۵۱ء)

نور اعلیٰ نور

ایک شفیق محترم کی تحریر سے معلوم ہوا کہ مقام لدھیانہ

میں محمد حسین نامی ایک صاحب نے ایک مطبع مسمیٰ "نور علیٰ نور" قائم کیا ہے۔ ہم کوہ نور اس نام کو سن کر بہت خوش ہوا خدا ایسا اسم بامسمیٰ کرے۔ صاحبان مطابع ہندوستان اپنے دل میں خیال کرتے ہوں گے کہ پنجاب میں خوب نور برس رہا ہے یعنی کوہ نور سے لے کر دریائے نور، ریاض نور، باغ نور، نور علیٰ نور، باغ نور تو نازل ہو چکے اس سے آگے اب خدا کا نور ہے۔ مگر سنا ہے کہ مقام بیرہ میں جو مطبع ہوا ہے اس کا نام بھی نور علیٰ نور ہے جو کہ نام مطبع لدھیانہ اکمل مشتبہ نہیں ہوا اس واسطے نور علیٰ نور سے آگے بڑھ کر ہم لدھیانہ اپنے مطبع کا نام احمد کا نور رکھیں کہ فضل الہٰی سے والا ہوا بھی ہے اور سب میں برتر بھی ہے اور چھاؤنی انارکلی میں جو ایک مطبع باہتمام علی حسین نام ایک صاحب کے کھڑا ہونے والا ہے سنا ہے کہ اس کا نام وہ آئینہ سکندر رکھنا چاہتے ہیں ہر چند نور سے خالی وہ بھی نہیں مگر وہ سمجھ لیں کہ نور علیٰ نور سے آگے خدا کا نور ہوا اور خدا کے نور سے آگے بڑھ کر کچھ ان کو تجویز کرنا چاہیے۔

(کوہ نور ۸ رجولائی ۱۸۵۱ء)

(اطلاع مشاعرہ)

بخدمت شائقان مشاعرہ مطبع کوہ نور لاہور یہ ہے کہ پہلے جلسہ مشاعرہ کا ہر یکشنبہ کو سات بجے شام ہوتا تھا اب حسب صلاح اجتماع جلسہ مذکور پانچ بجے شام سے قرار پایا ہے۔ لہذا گزارش ہے کہ آئندہ سب اصحاب پانچ بجے شام سے رونق بخش جلسہ مذکور ہوا کریں اور تجویز ہے کہ آئندہ سے کچھ غزلیں منتخب ہر پرچہ اخبار میں چھاپی جاوے گی اور بعد اس کے مشاعرہ آئندہ کے واسطے مصرعہ طرح لکھے جاویں گے چنانچہ اس ہفتہ کے مشاعرہ کی مصرع طرح یہ ہیں۔

طرح فارسی:- کز کج کردہ و خنجر بکف مستانہ می آید
طرح اردو:- غالب کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

(کوہ نور ۲۱ رجون ۱۸۵۲ء)

(قطعہ تاریخ وفات خاقانی ہند ذوق از مولانا امام بخش صہبائی)

ذوق آنکہ مدام ہمچو مردان خدا
برداشتہ بود دل ازیں جائے دنی
رفت از دنیائے دوں صہبائی گفت
خاقانی ہند رفت از دنیائے دنی

(کوہ نور ۱۲ دسمبر ۱۸۵۴ء)

اخبار مطبع جدید

بہ رسید اشتہار اخبار منیر اول مطبوعہ ۲۲ دسمبر سنہ حال روشن ہوا کہ اتفاق دینا پور میں نیر اعظم نام ایک اخبار باہتمام منشی محمد بخش صاحب پر منیر طلوع ہوا روشنائی اچھا ہے عبارت دیدہ اور نام نامی سے مسرور سینہ ہوگیا۔ خداوند کریم عمر بخشے اور قدر بڑھائے۔ شکر ہے کہ اب پنجاب میں ترقی علم کے سامان تازہ بتازہ مہیا ہوتے جاتے ہیں۔

(کوہ نور ... ۱۸۵۲ء)

اب اودھ کے لوگ ضبطی ملک سے ناخوش ہیں ہزارہا اشخاص نوکری شور غل مچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سرکار کو سوائے ملک اودھ کے غیر مقامات کے آدمیوں کو نوکر رکھنا بعید از انصاف ہے۔ بادشاہ کے قدیمی ملازمین بجز چند آدمیوں کے سب برخاست ہوگئے۔ ان سے کہا گیا ہے کہ تمھارے حقوق کا لحاظ کیا جاوے گا۔ اب بادشاہ کی حالت پر سب کو رحم آتا ہے۔ بادشاہ نے جو ہر معاملے میں سرکار کی اطاعت کی یہ بہت اچھی تجویز ہوئی لوگ اس بات سے ناراض بھی ہوئے اور ایک زمیندار مفسد نے یہاں تک کیا کہ پوشاک زنانی بھیج کر پیغام دیا کہ تم کو یہ لباس زیب ہے کیونکہ اس طرح سے بلا تکرار ملک میں دخل دے دیا اسی لائق ہے کہ عورت کا لباس پہن کر بیٹھو۔ جب سے ۵۲ پلٹن شاہی اور توپ خانہ پیدل شہر میں آیا ہے باشندگان شہر کی نظر میں انگریزوں کی اہانت ہوئی۔ گورہ لوگوں نے بہ حالت مستی شراب کے شہر میں جا کر بہت نامعقول حرکات کیں اور جبر کیے بعض لوگوں

کو توحیرت ہے کہ انگریز اور گورہ میں کیا فرق ہے ؟

کوہ نور ۲۶ فروری ۱۸۵۶ء

حتی الامکان اپنی زبان میں اگر تعلیم علوم کی ہووے تو دوسری زبان کی نسبت جلد حاصل ہوتی ہے۔ خیال کیجئے کہ اگر اردو میں سب علوم کی کتابیں بن جاویں تو وہی علوم جلد حاصل ہوں گے۔ عربی فارسی، خواہ سنسکرت والوں کو اس قدر جلد حاصل ہوں گے، کیا معنی؟ پہلے تو زبان ہے سیکھتے سیکھتے اون کے چھ سات برس گزر جائیں گے۔ غرض اس بارہ میں صواب آرائے مہتمم کوہ نور بہت درست ہے بلکہ جیسے انگریزوں نے زبان ہائے یونانی و سنسکرت سے اپنی بھاکہ میں سب علوم ترجمہ کر ڈالے ویسے ہی اردو فارسی و انگریزی و سنسکرت والوں کو چاہیئے کہ ہر علوم کو ہر ایک زبان سے لے کر اردو میں ترجمہ کیا کریں۔

(اقتباس از مقالہ) ۸ اپریل ۱۸۵۶ء

(خبر دہلی)

مسٹر تھامس صاحب نے دہلی میں پہنچ کر چارج عہدہ جج کا لے لیا۔ دوکان داروں وغیرہ کے نام پروانہ جاری کیے ہیں کہ دوبارہ شہر میں آکر سکونت اختیار کریں جس شخص کو شہر میں رہنے کی اجازت ملے گی بعوض کچھ روپیہ کے ایک ٹکٹ ملے گا۔ اگر کسی شخص کے پاس چار دن کے بعد ٹکٹ (نہ) ملے گا تو وہ شہر سے خارج کیا جائے گا۔

۲۶ جنوری ۱۸۵۸ء

کارسپانڈنٹ دہلی نے یکم مارچ کے خط میں یہ لکھا ہے کہ شہر دہلی میں اہل ہنود بستے جاتے ہیں اور خال خال مسلمان بھی آباد ہوئے ہیں جن کی نسبت احکام خاص ہوئے ہیں۔ چاندنی چوک اور دریبہ میں کچھ رونق ہو گئی ہے۔ شہر میں تھانجات بھی بجز کوتوالی ابھی قائم نہیں ہوئے۔ بلکہ تمام شہر میں ابھی چوکیدار بھی مقرر نہیں ہوئے۔ مگر تھانجات بیرونی قائم ہو گئے ہیں باغ شاہی واقعہ چاندنی چوک کی تیاری بنام نہاد باغ کمپنی ہوتی ہے۔ بادشاہ کی نسبت ابھی حکم آخر نہیں ہوا۔ مقدمہ زیر تجویز ہے۔ شہر کی آمد و رفت ساکنان دہلی بلا حصول پاس حاکم کے نہیں ہوتی ... کہتے ہیں شہر کے اندر سڑکیں نکلیں گی اور شہر کی فصیل منہدم ہو گی۔

۹ مارچ ۱۸۵۸ء

(خبر لکھنؤ)

.... لکھنؤ میں اشتہار جاری ہوا ہے کہ جو لوگ باہر چلے گئے ہیں تین دن کے اندر واپس آکر اپنے اپنے گھروں میں آباد ہو جائیں اور دوکانیں کھول لیں ورنہ باغی تصور کیے جائیں گے اور ان کے گھر اور دوکانیں لوٹ لی جائیں گی۔

(۱۳ - اپریل ۱۸۵۸ء)

.... ۲۶ جنوری جس وقت شاہزادہ صاحب (شاہزادہ ویلز) دہلی کی جامع مسجد میں سیر کو گئے تھے مسجد مذکور کی ڈیوڑھی کے ایک گوشہ میں ایک پستول پانچ نال کا پانچ گولیوں سے بھرا ہوا پڑا ملا تھا جس کا مالک اب تک کوئی نہیں ملا۔ اس سانحہ کو معلوم کر کے غالباً ہر شخص کو دہلی کی نسبت یہ خیال گذرے گا کہ اس شہر میں پھر نحوست کا ستارہ ایک مدت سے آیا ہوا ہے ابھی بدستور جاری ہے اس واسطے کہ ایسے نیک وقت میں ایسی بد حرکت ظاہر ہوئی تو اسی شہر میں ظاہر ہوئی اور وہ بھی جامع مسجد میں۔ ۲۶ جنوری ۱۸۷۶ء



ہندوستان کے اشاعتی اداروں کی تاریخ میں منشی جی کا وہی مقام ہے جو فولاد کی صنعت میں جمشید جی ٹاٹا کا ہے۔ ۱۱۱ سال پہلے اتنے بڑے پیمانے پر اشاعت کا منصوبہ بنانا اور دور دور تک اس کا پھیلاؤ کرنا کسی معمولی آدمی کا کام نہیں ہو سکتا۔

امرت لال ناگر

عمر انصاری

منشی نول کشور

ہندی کے ماہتاب سے تھے منشی نول کشور
اُردو کے آفتاب سے تھے منشی نول کشور

ایک ایک حرف جس کا جہاں پر ہو آشکار
ایسی کھلی کتاب سے تھے منشی نول کشور

لائیں کہاں سے ڈھونڈ کے اُن کی مثال ہم
آپ اپنا بس جواب سے تھے منشی نول کشور

علم و ادب سے کیوں نہ عبارت ہو اُن کا نام
علم و ادب کا باب سے تھے منشی نول کشور

ممکن نہیں بھلا سکے اردو زباں اُنھیں
اردو کا تو شباب سے تھے منشی نول کشور

لعل و گہر سے دامنِ اردو کو بھر دیا
وہ آسماں جناب سے تھے منشی نول کشور

اُردو کے صحن باغ میں فصلِ بہار کا
کھلتا ہوا گلاب سے تھے منشی نول کشور

مقبول ہو جو شیخ و برہمن میں ایک ساتھ
ایسی شراب ناب سے تھے منشی نول کشور

طابع بھی بے نظیر تھے، ناشر بھی بے عدیل
انسان لاجواب سے تھے منشی نول کشور

مذہب ہو علم ہو وہ، ادب ہو کہ فلسفہ
ہر بات کا جواب سے تھے منشی نول کشور

طبعِ رسا کا تذکرہ چھڑ جائے بس کہیں
اُڑتا ہوا عقاب سے تھے منشی نول کشور

کردار کے بلند، ہر اک دل کے دل پسند
ایمان سے فیضیاب سے تھے منشی نول کشور

پھر دیکھنے کو جس کے ترستی رہے نظر
ایسا حسین خواب سے تھے منشی نول کشور

"پیدا کہاں اب ایسے پراگندہ طبع لوگ"
لاکھوں میں انتخاب سے تھے منشی نول کشور

شباب للت

منارۂ نور منشی نولکشور

"مشتری تھی تیری سیرت" اور زہرہ[1] سا جمال"
زندگی تیری جہاں میں آپ تھی اپنی مثال
وہ علومِ ہند آنے کو تھا جن پر زوال
وہ صحیفے دورِ گردوں سے جو ہوتے پائمال
شائع کر کے ان کو بھی پائندہ تو نے کر دیا
کیا جواہر تھے جنھیں رخشندہ تو نے کر دیا

وہ ادب پارے ہوں یا ہوں شاہکارِ دینیات
داستانیں ہوں کہ تاریخیں، گرامر یا لغات
پند نامے ہوں، حدیثیں ہوں کہ ہوں اخلاقیات
ترجمے، تحقیق، نظم و نثر، احوالِ حیات
تھی سبھی اصناف پر تیری توجہ کی نظر
اہم تھے تیرے لیے مشرق کے سب علم و ہنر

سنسکرت بھاشا ہو یا عربی ہو یا ہو فارسی
خواہ اردو ہو کہ ہندی، ریختی یا گورمکھی
سب زبانوں کی بلا تفریق خدمت تو نے کی
علم کی اک آدمی تھی سرپرستی تری
جلوہ گاہِ اہلِ علم و فن ٹھکانہ تھا ترا
[2] "لکھنؤ کا فورٹ ولیم" چھاپہ خانہ تھا ترا

فلسفہ، سائنس، طب، تاریخ، انشا و نجوم
پردۂ ظلمت میں چھپ جاتے یہ مشرق کے علوم
جن کے ناشر تو نے دنیا میں مچا دی ان کی دھوم
تیرے دروازے پہ رہتا تھا ادیبوں کا ہجوم
کتنے دانش ور دیے تیرے "اودھ اخبار" نے
باب کتنے وا کیے تیرے "اودھ اخبار" نے

زندگی تیری تھی قومی ایکتا کا اک پیام
یا مسلماں اللہ اللہ یا برہمن رام رام
ہر دھرم تیرے لیے تھا لائقِ صد احترام
تیری نظروں میں مقدس ہر پیمبر کا کلام
سب مذاہب کے صحیفوں کی اشاعت تو نے کی
ملک میں تقسیم آگاہی کی دولت تو نے کی

"مطبعِ منشی نول" کا سارے عالم میں ہے نام
حکمتِ اسلاف کو جس نے کیا نذرِ عوام
تو کہ اس مے خانۂ علم و ادب کا تھا امام
کس قدر دریا دلی سے تو نے بانٹے سب کو جام
بادۂ اردو کی مستی کو دوبالا کر گیا
تو وطن والوں کے ذہنوں میں اجالا کر گیا

---

[1] مرزا غالب نے منشی نول کشور سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے خان بہادر علاء الدین خاں کو ۲ دسمبر ۱۸۶۲ء کے محررہ اپنے خط میں لکھا تھا: "شفیق مکرم و لطفِ مجسم منشی نول کشور صاحب بر سبیل ڈاک یہاں آئے۔ مجھ سے اور تمھارے چچا شہاب الدین خاں سے ملے۔ خالق نے ان کو زہرہ کی صورت اور مشتری کی سیرت عطا کی ہے۔ گویا بجائے خود قرآن السعدین ہیں۔" [2] بعض مبصروں نے مطبع منشی نول کشور کو "لکھنؤ کے فورٹ ولیم کالج" کا نام دیا ہے۔

تسنیم فاروقی

آئینۂ کتاب تھے نول کشور

بزم ادب میں عکسِ وفا تھے نول کشور
آئینۂ کتاب نشا تھے نول کشور

رنگینیٔ نشاط معانی نہ پوچھیے
دست غزل میں رنگِ حنا تھے نول کشور

وہ نکہتیں کہ جن سے مہک جائیں ذہن و دل
علم و فن ورق کی ضیا تھے نول کشور

میں کیا بتا دیں کی بہ تمام دل سے
تہذیب لکھنؤی کی ادا تھے نول کشور

تاریخیں، داستانیں، حدیثیں، حکایتیں
سب کو سنوارنے میں رسا تھے نول کشور

دنیائے ایشیا میں ہے ان کے عمل کا نام
قوموں میں ایکتا کی فضا تھے نول کشور

کاغذ کو حرف و رنگ کا عرفان دے دیا
کتنے ہی مکتبوں کی دعا تھے نول کشور

ایسی کتب کہ جن سے فرشتے بھی درس لیں
ان کی اشاعتوں پہ فدا تھے نول کشور

اس واقعے کی لاکھوں کتابیں گواہ ہیں
اک وضعدار حمد و ثنا تھے نول کشور

اس کا تو اک ' لغاتِ کشوری ' ثبوت ہے
جو پوچھتا ہو آپ سے کیا تھے نول کشور!

تسنیم کیوں نہ محسن اردو کہیں انھیں
روشن چراغ راہنما تھے نول کشور

راجہ بہادر موج

نول کشور

علم و ادب کے محسن اعظم نول کشور
اقلیمِ علم و شعر کے پرچم نول کشور

اردو میں نظم و نثر کے گلدستوں کیلئے
کرتے رہے گلوں کو فراہم نول کشور

دنیا کو دے کے گیتا و قرآں کے ترجمے
تھے مدح خوانِ گنگا و زمزم نول کشور

اسلام اور وید کی تفسیریں چھاپ کر
تھے گیان اور دھرم کے سنگم نول کشور

اردو میں بھی ہو مذہب و اخلاق کا ادب
تھے اس مہم میں فردِ مقدم نول کشور

عقبیٰ کی فکر، دین کی فکر اور جہاں کی فکر
رہتے تھے محوِ فکرِ دو عالم نول کشور

ہر گھر میں اسکے دھرم کی پستک ہو کس طرح
اسکے رہے محرکِ محرم نول کشور

اے موج کاش انکا مشن پورا ہو سکے
جو کر گئے ہیں کارِ منظم نول کشور

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی

منشی نولکشور کا مطبع

اردو زبان اور ادب کی کوئی تاریخ لکھی جائے ناممکن ہے کہ اس میں نول کشور پریس کا نام نہ آئے۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر مطبع نول کشور نہ ہوتا تو اردو زبان غدر ۱۸۵۷ء کے بعد اس قدر جلد نہ پھولتی پھلتی۔ اس وقت عوام سراسیمگی کے عالم میں تھے۔ مالی لحاظ سے نہایت کمزور نفسی نفسی پڑی تھی ایسے میں کوئی علمی خدمت کرنے کا خیال اپنے دل میں لا بھی نہ سکتا تھا۔ یوں تو ۱۸۵۸ء سے پہلے لکھنؤ میں دو چار چھوٹے چھوٹے مطبعے قائم ہو چکے تھے لیکن ان کی سرگرمی بہت محدود تھی۔ پیسے کی قلت، عملے کی کمی، کاغذ کی کمیابی، انتظامی امور میں ناتجربہ کاری۔ ان سب امور کے باعث وہ مطبعے زیادہ دنوں تک نہ چل سکے اور یکے بعد دیگرے بند ہو گئے۔

منشی نولکشور فروری ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ آئے۔ اس سے پیشتر مطبع کوہ نور لاہور میں وہ چار سال کام کر چکے تھے۔ کوہ نور اخبار اور اس کے پریس کے جملہ کاروبار سے اچھی طرح واقفیت حاصل کر چکے تھے۔ لاہور جانے سے پیشتر اخبار سفیر آگرہ کے بھی مہتمم رہے تھے اس لیے بحیثیت صحافی اور بحیثیت مہتمم مطبع وہ اپنی صلاحیتوں کو بطور خود بروئے کار لانا چاہتے تھے۔ لکھنؤ ان کی سرگرمیوں کے لیے ایک وسیع اور زرخیز میدان ثابت ہوا۔ چنانچہ یہاں انھوں نے پہلا تو چھوٹے چھوٹے ہینڈ پریس آغا میر کی ڈیوڑھی گولہ گنج، رکاب گنج میں قائم کیے اور جب اثاثہ وافر ہو گیا اور مطبع کا کام بھی بہت بڑھ گیا تو پہلے مکتب خانہ سلیمان قدر (جہاں اب نزول کا دفتر ہے) کی عمارت میں اور بعد ازاں حضرت گنج میں مبارک منزل کی عمارت حاصل کی اور وہاں دیگر زمین خرید کر کے کوٹھیاں اور مکانات تعمیر کرائے اور مطبع نیز اودھ اخبار کے تمام دفاتر یہیں منتقل کر دیے۔

۱۸۵۹ء سے نولکشور نے اودھ اخبار بھی نکالنا شروع کر دیا تھا۔ یہ ان کے مطبع سے شائع ہونے والی کتب کو مشتہر کرنے کا ایک بڑا ذریعہ تھا اور دوسرے یہ کہ یہ اخبار اودھ میں بالخصوص اور سارے شمالی ہند میں بالعموم خبریں نشر کرنے کا ایک بڑا معتبر آرگن بھی بن گیا۔ صحیح خبریں مختلف صوبوں اور بڑے بڑے شہروں نیز یوپی کے اضلاع سے فراہم کرنے کا بڑا اچھا انتظام کر رکھا تھا۔ بہت سے نامہ نگار اس سلسلے میں اودھ اخبار کو برابر خبریں بھیجتے رہتے تھے۔ اس لیے یہ اخبار جلد خاص و عام میں مقبول ہو گیا۔ کوئی اور اردو اخبار اس اہتمام سے سارے شمالی ہند میں نہیں نکل رہا تھا اور پھر جب اس میں سرشار کا ناول فسانہ آزاد قسط وار نکلنا شروع ہوا تب تو اس کی مقبولیت عروج پر پہنچ گئی تھی۔

اودھ اخبار ۲۶ نومبر ۱۸۵۸ء میں شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ پہلے ہفتہ وار تھا اور ہر چہار شنبہ کو شائع ہوتا تھا۔ ۱۸۶۲ء سے ہفتہ میں دو بار شائع ہونے لگا۔ ۱۸۷۶ء سے ہر تیسرے دن اور پھر ۱۸۷۷ء سے روزنامہ ہو گیا۔ پہلے یہ ۸ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا بعد میں ۱۲ صفحات کا کر دیا گیا تھا۔ بعض موقعوں پر ۴۸ صفحات کا بھی ہو جاتا تھا۔

اس کے اڈیٹر ملک کے بڑے لائق اور فاضل لوگ رہے ہیں جن کی علمی قابلیت اور زباں دانی ہر لحاظ سے مسلم تھی۔ ابتی

بانوے سالہ زندگی میں (یہ اخبار ۱۹۵۰ء تک نکلتا رہا) اس کے متعدد اڈیٹر ہوئے جن کی تعداد تیس چالیس کے درمیان ہوگی ان میں منشی امیر اللہ تسلیم، قدر بلگرامی (شاگرد غالب) پنڈت رتن ناتھ سرشار، نسیم دہلوی، شرر لکھنوی، مرزا حیرت دہلوی، شیو پرشاد، نوبت رائے نظر، دوارکا پرشاد افق، پنڈت بشن نرائن در، مرزا یاس یگانہ چنگیزی، پیارے لال شاکر میرٹھی، منشی پریم چند، مرزا محمد عسکری، شوکت تھانوی، امین سلونوی جیسے مشہور و معروف ادیب خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

مطبع قایم کرنے میں اور اسے کامیابی سے چلانے کے سلسلے میں صاحب مطبع کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذہانت سے معلوم کرے کہ کس قسم کی کتابیں اس کے مطبع سے شائع ہوکر نکلیں جو جلد فروخت ہو جائیں۔ منشی نولکشور ایک تجربہ کار، ذہین اور دور بیں فہم آدمی تھے انھوں نے محسوس کیا کہ اولی تو درسی کتب کی کمی ہے اور دوسرے مذہبی کتب کی مانگ بہت ہے جو دستیاب نہیں ہوتیں یا جن کی فراہمی بہت دقت طلب ہوتی ہے۔ چنانچہ جہاں انھوں نے بچوں کے لیے قاعدے اور ابتدائی درسی کتب لکھوائیں اور چھپوائیں وہیں بہت کثرت سے مذہبی کتب کی اشاعت کی۔ یوں تو ان کے مطبع سے تمام مذاہب کی کتابیں شائع ہوئیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ جتنی بڑی تعداد میں اور جس کثرت سے انھوں نے مسلمانوں کی مذہبی کتابیں شائع کرائیں اس کا صحیح اندازہ لگانا آسان نہیں ہے۔ مثلاً قرآن شریف ہی کو لے لیجیے۔ مختلف سائز کے اڈیشن شائع کیے۔ خالی متن کے ساتھ بھی اور با ترجمہ بھی۔ علاحدہ علاحدہ پارے بھی تفسیریں اس کے علاوہ چھوٹی بڑی الگ شائع کیں۔ مثلاً تفسیر سورۂ فاتحہ، (سلسلۃ المرجان) تفسیر سورۂ یوسف، تفسیر قادری (ترجمہ تفسیر حسینی) تفسیر حقانی اور پھر سب سے بڑی تفسیر مواہب الرحمٰن (از مولانا امیر علی مرحوم سابق صدر مہتمم دار العلوم دیوبند) جو بڑے سائز کی تیس جلدوں میں ہے۔ اتنی ضخیم تفسیر شاید ہی کسی زبان میں شائع ہوئی ہو۔ اسے تمام مشہور و متداول اور مستند عربی کتب تفاسیر کا نچوڑ کہا جا سکتا ہے۔ قرأت اور تجوید کے موضوع پر بھی کئی رسالے شائع کیے مثلاً رموز القرآن اور زینت القاری۔ حدیثوں میں جامع ترمذی ۔۔۔ اور مشکوٰۃ المصابیح کا اردو ترجمہ مسمی بہ مظاہر حق اور ریاض الاربعین نامی چہل حدیث۔ فقہ میں ھدایہ، فتاوائے عالمگیری . . . . کے اردو ترجمے نیز مالا بد منہ (قاضی ثناء اللہ) کا ترجمہ۔ ساتھ ہی ساتھ فقہ کے چھوٹے چھوٹے مگر کار آمد رسالے مثلاً ھدایت الاسلام، مفتاح الجنت (از مولانا کرامت علی جونپوری) شرع محمدی، احکام العیدین، عطر الاثام وغیرہ۔ فقہ شیعہ میں ۔۔۔ زاد الصالحین (۸ جلدوں میں) جامع جعفری، حلیۃ المتقین، لسان المتقین وغیرہ۔ شہدائے کربلا کے سلسلے میں شرعۃ المصائب، دہ مجلس، ذکر شہادتین، تقریر الشہادتین، جنگ نامہ کربلا وغیرہ۔ اخلاق میں اخلاق جلالی اور اخلاق محسنی کے اردو ترجمے، محبوب الاخلاق، احیاء العلوم (غزالی) کا ترجمہ مذاق العارفین ۴ جلدوں میں، کیمیائے سعادت کا ترجمہ اکسیر ھدایت کے نام سے۔ تصوف میں عوارف المعارف (شیخ سہروردی) منبہات (ابن حجر مکی)، مثنوی مولانا روم کی دو شرحیں (بوستان معرفت اور پیراہن یوسفی)۔ یہ صرف چند مثالیں ہیں۔ اگر اسلامیات سے متعلق ان کی مطبوعات کی مکمل فہرست حاصل ہو سکے تو یہ تعداد یقیناً سینکڑوں تک پہنچے گی اور اس لیے مسلمانوں کو بالخصوص اسی مطبع کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ ایسے وقت میں جب کہ ہر طرح کے انتشار ذہنی کا زمانہ تھا نولکشور پریس نے مذہبی سطح پر ان کی تسکین قلب و روح کا وافر ذخیرہ فراہم کر دیا۔ اور اسی قسم کی تالیف و ترجمہ کے کام کو ہاتھ میں لے کر سینکڑوں ذی استعداد اشخاص کو بھی کام پر لگا دیا ورنہ بہت سے قابل اشخاص لکھنؤ چھوڑ کر کہیں باہر چلے جاتے۔

دیگر علوم مثلاً تاریخ و ادبیات میں بھی اسی مطبع کے کارنامے قابل قدر بھی ہیں اور لائق یادگار بھی۔ مثلاً تاریخ و

سوانح کے موضوع پر ترجمہ فتوحات واقدی، تاریخ مدینہ منورہ، قصص انبیاء، تصریح الاذکیا۔ حدائق الحنفیہ، تذکرہ علمائے ہند، تذکرۃ الکرام البدر، تاریخ اودھ (۵ جلد) قیصر التواریخ (۲ جلد) ترجمہ تاریخ مصر، مغربی منت، تاریخ بغاوت ہند، تاریخ دربار تاجپوشی (۱۹۰۳ء) ٹالسٹائے کی سوانح عمری، سوانح عمری اکبر بادشاہ، تذکرۃ الکاملین، ہندوستان کے قدیم شہر وغیرہ۔

اردو لغات میں لغات کشوری (جو بانی مطبع کے نام سے منسوب ہے) کے علاوہ فرہنگ شفق، کریم اللغات اور امان اللغات بھی اسی مطبع سے شائع ہوئے۔

فن طب کو لیجئے تو خزائن الادویہ، مفرد ادویات کے خواص میں ایک ایسا گنجینہ ہے کہ اس سے بہتر آج تک شائع نہ ہوا۔ اس کے علاوہ مخزن الادویہ کا اردو ترجمہ (از حکیم نور کریم دریا بادی) ترجمہ شرح اسباب، ترجمہ اقصرائی، ترجمہ سویدی، ترجمہ قانون شیخ، ترجمہ نفیس، اکسیر القلوب، ترجمہ قرابادین کبیر، ترجمہ قرابادین اعظم، قرابادین نجم الغنی، علاج الغربا، ترجمہ علاج الامراض، ترجمہ کفایہ منصوری اور اس کے علاوہ اور بہت سی چھوٹی بڑی طب کی کتابیں اور رسالے اسی مطبع کی دین ہیں۔

ادبیات کے سلسلے میں حکیم نجم الغنی صاحب رامپوری کی کتاب بحر الفصاحت اپنے موضوع پر ایک بے پایاں سمندر ہے۔ پھر تاریخ ادب اردو پر رام بابو سکسینہ کی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ (از مرزا محمد عسکری صاحب) اپنے موضوع پر سب سے پہلی جامع کتاب ہے جسے اسی مطبع نے شائع کیا تھا۔ اسی طرح تذکرہ شمیم سخن، تذکرہ خواتین، اردو شاعری کی مختصر تاریخ، تاریخ اردو وغیرہ قدیم ہیں۔ اور شعرا کے ضخیم کلیات و دواوین تو اس سلسلے میں خصوصیت رکھتے ہیں۔ مثلاً کلیات میر، کلیات آتش، دیوان ناسخ، کلیات سودا، دیوان مہر حسین، کلیات نظیر اکبر آبادی، دیوان خواجہ میر درد، دیوان قلق، دیوان شہیدی، گلدستہ امانت، مراثی انیس، مراثی دبیر، مثنوی سحر البیان، مثنوی گلزار نسیم وغیرہ۔

مطبع کے کارناموں کی یہ نہایت مختصر فہرست بھی نامکمل رہے گی اگر ان جیم اور ضخیم داستانوں کا ذکر نہ کیا جائے جو اس میں شائع ہوئیں اور جن سے مطبع کی مقبولیت میں اور اضافہ ہوا۔ یعنی داستان امیر حمزہ جس کے آٹھ دفتر ہیں اور ہر دفتر میں صدہا صفحات کی کئی کئی جلدیں ہیں۔ اس کا پہلا دفتر موسوم بہ نوشیرواں نامہ دو جلدوں میں ہے اور دفتر پنجم موسوم بہ طلسم ہوشربا سات جلدوں میں ہے۔ ان کے علاوہ بوستان خیال، ہرمز نامہ، صندلی نامہ، ایرج نامہ، تورج نامہ، الف لیلہ، فسانہ عجائب، باغ و بہار، سنگھاسن بتیسی وغیرہ قابل قدر ہیں۔

منشی نول کشور بڑے زیرک، معاملہ فہم، وضعدار اور مردم شناس آدمی تھے۔ انھوں نے مطبع کے قیام کے وقت ہی سے یہ صحیح اندازہ لگا لیا تھا کہ اس زمانے میں کس قسم کی کتابوں کی زیادہ مانگ تھی۔ ان کی تجارتی سوجھ بوجھ نے انھیں بتایا کہ عام لوگوں میں مذہبیت کی طرف شغف بہت ہے اس لیے اگر مذہبی کتب شائع کرائی جائیں تو ہاتھوں ہاتھ بک جائیں گی چنانچہ مسلمانوں، ہندوؤں، سکھوں اور عیسائیوں کی تمام یا بیشتر کتب ان کے مطبع سے شائع ہونے لگیں۔ اور کثرت سے فروخت ہونے لگیں۔ رامائن، بھگوت گیتا، مہا بھارت، کئی اپنشد کے علاوہ سکھوں کی مقدس کتابیں گورمکھی زبان میں شائع کیں۔ توریت اور انجیل کے متعدد اڈیشن بھی منظر عام پر آئے۔ منشی نول کشور اپنے مذہب میں پختہ عقیدہ رکھنے کے باوجود ایک غیر متعصب انسان تھے۔ اور ہر شخص سے اس کے مرتبے اور درجے کو مد نظر رکھ کر اس سے ویسا سلوک کرتے تھے۔ مسلمانوں کی مذہبی کتب کی کتابت کے سلسلے میں ان کا حکم تھا کہ کاتب صاحبان باوضو ہو کر کتابت کریں۔ ان کے پریس سے وابستہ اس وقت کے مشہور حفاظ، علماء، مورخ، ادیب اور شعراء تو تھے ہی، پریس کے عملے

میں بھی فارسی اور دیوناگری رسم الخط کے ماہر کاتب اور باصلاحیت منشی جمع تھے اور معقول مشاہرہ پاتے تھے جس سے کبھی کسی کو کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ وضعداری کے سلسلے میں مشہور ہے کہ مولانا امیر علی ملیح آبادی مصنف "تفسیر مواہب الرحمٰن" جو عرصہ تک مطبع نول کشور سے وابستہ رہے تھے جب ضعیفی کے باعث سبکدوش ہوکر ملیح آباد میں سکونت پذیر ہو گئے تو ہر ہفتہ منشی نولکشور ان سے ملنے ملیح آباد جاتے تھے اور لکھنؤ کا مشہور خمیرہ ان کے لیے بطور تحفہ لے جاتے تھے۔ (ماخوذ از علمی اجالے مصنفہ امیر حسن نورانی)

۱۹ فروری ۱۸۹۵ء کو اس عظیم شخصیت نے مختصر علالت کے بعد بہ عمر ۶۴[1] سال وفات پائی۔ لکھنؤ میں سینتیس سال کے اندر (۱۸۵۸ء-۱۸۹۵ء) انھوں نے اردو زبان و ادب کو جو توانائی عطا کی اور اس کی ریڑھ کی ہڈی کو ہزاروں کتابیں چھاپ کر جس طرح مضبوط کر دیا اس کی مثال ابھی تک تو ملی نہیں۔



حواشی

[1] رسالہ فروغ اردو، لکھنؤ کے شمارہ مارچ ۱۹۷۰ء (نولکشور نمبر) میں میں نے "ایک نادر روزنامچہ" کے حوالے سے اُن کی عمر ۶۰ سال لکھی تھی لیکن اصل روزنامچہ مولوی مظہر علی سندیلوی کو دیکھا تو اُس میں ۶۴ سال درج تھی۔ گویا "ایک نادر روزنامچہ" میں سہو کاتب ہو گیا تھا۔ نولکشور کے موجودہ جانشین ان کی پیدائش ۱۸۳۶ء بتاتے ہیں اس لیے ان کی عمر ۵۹ سال ثابت ہوتی ہے۔ مولوی مظہر علی سندیلوی نے اپنے روزنامچے میں منشی صاحب کی وفات کے سلسلے میں جو کچھ لکھا تھا وہ درج ذیل ہے :-

<u>۱۹ فروری ۱۸۹۵ء - ۲۳ شعبان ۱۳۱۲ھ - ۱۰ پھاگن ۱۳۰۲ فصلی - روز سہ شنبہ</u>

آج چار بجے صبح کو منشی نول کشور صاحب مالک مطبع اودھ اخبار نے دفعتاً بمقام لکھنؤ قضا کی۔ بڑے مشہور، لائق و دانش مند شخص تھے۔ اپنی ذاتی لیاقت و قابلیت سے ایک بہت بڑا مطبع لکھنؤ، حضرت گنج میں قائم کیا جس میں ہزارہا آدمی کار پرداز ہیں۔ مرحوم نے کار خیر میں باظہار اپنی لیاقت و خوش رکھنے حکام وقت صرف زر کو جائز رکھا جس سے گورنمنٹ میں بہت بڑا رسوخ پیدا ہوا اور خطاب سی۔ آئی۔ ای گورنمنٹ نے عطا کیا اور متعدد دیہات میں زمینداری کرنے سے تعلقدار بھی ہوئے جس کی سند انجمن ہند لکھنؤ سے حاصل ہوئی اور لکھنؤ بنچ کے آنریری مجسٹریٹ بھی تھے۔ غرض کہ دنیوی امور میں ہر قسم کی ترقی نمایاں کی۔ متوفی نے کوئی اولاد ذکور نہیں چھوڑی۔

عمر متوفی للعہ ۶۴ سال تھی۔

ظاہر ہے کہ مولوی صاحب مذکور نے منشی نول کشور کی عمر کا اندراج اودھ اخبار یا پانیر کو دیکھ کر ہی کیا ہوگا۔ انھیں اخبارات سے وہ خبریں اخذ کیا کرتے تھے۔ خود سے کیونکر لکھ سکتے تھے۔ بہرحال عمر کے تعین میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ ہاشمی

ضیاء الدین اصلاحی

منشی نول کشور



راقم الحروف اردو کے محسن اعظم نیک نام خدمت گزار آنجہانی منشی نول کشور اور ان کے عظیم الشان اور عالم گیر شہرت رکھنے والے مطبع سے اس وقت سے واقف ہے جب نہ تو منشی جی کے نام نامی کو صحیح پڑھ سکتا تھا اور نہ ہی مطبع کے معنی معلوم تھے، درسی اور غیر درسی کتابوں کے سرورق پر منشی جی کا نام دیکھ کر اس کی تحقیق کا داعیہ بار بار پیدا ہوتا تھا اور جب کسی طرح یہ عقدہ حل ہوا تو ان کی فیض بخش اور فیض رساں ذات سے میری عقیدت بڑھ گئی اور میرے دل میں ان کی عظمت کا سکہ پوری طرح بیٹھ گیا۔

منشی نول کشور کے خدمات گوناگوں اور کارنامے اظہر من الشمس ہیں، ہزاروں کمیاب اور عسیر الحصول کتابیں ان کے مطبع سے شائع ہو کر دستبرد حوادث سے محفوظ ہو گئیں اور روزمرہ ضرورت کی کتابیں سستے داموں اور کم قیمت پر لوگوں کو مہیا ہوتی رہیں۔

۱۸۵۷ء میں سرفروشان وطن نے برطانوی جبر و استبداد کے خلاف پرچم بغاوت بلند کر کے ملک کو آزاد کرانے کی جد و جہد کی جو ناکام ہو گئی، اس کے بعد انگریزوں کے مظالم کا سلسلہ اور بڑھ گیا اور ان کی انتقامی کارروائی نے پورے ملک میں دہشت اور سراسیمگی پیدا کر دی، اس رستاخیز اور ہنگامۂ محشر میں ملک کی علمی، تہذیبی، تمدنی، سیاسی، معاشرتی اور معاشی زندگی کی پوری بساط ہی الٹ پلٹ گئی، امن و امان مفقود ہو گیا، تہذیب و تمدن کی یادگاریں اور علوم و فنون کے گہوارے مٹنے اور معدوم ہونے لگے، آباد اور پر رونق شہر اجڑنے اور برباد ہونے لگے۔ لوگ ادھر ادھر منتشر ہو گئے، علم و فن کے قدردان ختم ہو گئے، ادیب، شاعر، اہل علم اور اصحاب کمال معاشی بحران میں مبتلا ہو گئے۔ بڑے بڑے کتب خانے، نادر کتابیں اور قیمتی مخطوطات ضائع ہو رہے تھے، اس تباہی و بربادی کے زمانہ میں منشی نول کشور کو ایک مطبع قایم کرنے کا خیال ہوا، اور اس کے لیے ان کی نگاہ انتخاب لکھنؤ کی سرزمین کی جانب اٹھی، گو یہ بھی انقلاب کے اثرات سے محفوظ نہ تھا تاہم دوسرے مرکزوں کے مقابلہ میں اس کو غنیمت سمجھ کر منشی جی نے یہاں مستقل قیام کرنا پسند کیا، اور ایک معمولی مطبع سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ رفتہ رفتہ ان کا کاروبار اتنا وسیع ہوا کہ مشرق و مغرب ہر جگہ منشی نول کشور کے مطبع کا غلغلہ پڑ گیا۔

منشی جی سنسکرت، اردو، عربی، فارسی، ہندی، انگریزی، گرکھی، مرہٹی اور بنگالی زبانوں کی غیر مطبوعہ کتابیں تلاش کر کے ان کی اشاعت کا بندوبست کرتے، شاہان اودھ اور دوسرے امرا اور نوابوں کے کتب خانوں کے نوادر و مخطوطات کو خرید کر شائع کرنے کا سہرا ان ہی کے سر ہے۔ اگر ان کی کوششیں نہ ہوتیں تو آج کتنی نادر و نایاب کتابیں اہل علم اور اصحاب ذوق کی دسترس سے باہر ہوتیں۔

منشی نول کشور کا دل بھید بھاؤ سے پاک تھا اس لیے انھوں نے بلا امتیاز مذہب و ملت ہندو اور مسلمانوں دونوں کے مقدس مذہبی صحیفوں اور قدیم نادر کتابوں کی اشاعت کو اپنا مقصد زندگی قرار دیا اس سے ان کا یہ مقصد بھی تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کو مغربی اثرات سے محفوظ رکھیں۔

منشی جی نے اپنے مطبع کے ابتدائی دور میں اپنے ایک دوست مولوی محمد احسن کے مشورہ سے کلام مجید کے سپارے شائع کیے۔ اس سے ان کو بڑی منفعت ہوئی۔ ان کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے مختلف مذاہب کی مقدس کتابوں کو شائع کرنے پر خاص توجہ مبذول کی، چنانچہ جہاں ان کی کوششوں سے قرآن مجید معریٰ مترجم اور محشی شائع ہوئے وہیں ہندوؤں کی مقدس مذہبی کتابیں بھگوت گیتا، رامائن اور اپنشد بھی شائع ہوئیں اور سکھوں کے مذہب کی مقدس کتابیں گرنتھ صاحب اور جنم ساکھی وغیرہ بھی چھپیں، انھوں نے کتاب مقدس توراۃ وانجیل (عہد نامہ قدیم وجدید) کے اردو ترجمے شائع کرکے بڑی خدمت انجام دی۔

منشی جی کی رواداری اور فراخدلی نے جس طرح انھیں ہندوؤں کی مقدس کتابوں رامائن اور بھگوت گیتا وغیرہ کو اردو وفارسی میں منتقل کرنے پر آمادہ کیا اسی طرح انھوں نے قرآن مجید کے ہندی اور ملکی زبانوں میں ترجمے بھی شائع کیے، اس مبارک کام سے وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانا چاہتے تھے اور ایک دوسرے کے مذہب سے واقف کرانا چاہتے تھے۔

منشی نول کشور قرآن مجید کی حرمت وتقدس کا جس قدر خیال رکھتے تھے اتنا خیال مسلمان بھی نہیں رکھتے، ان کی تاکید تھی کہ، مصحح، پریس مین، مشین مین اور کاغذ لگانے والے ہر ایک پاک، صاف اور باوضو ہو کر قرآن مجید کی طباعت کا کام شروع کریں۔ وہ خود بھی غسل کر کے صاف ستھرے کپڑے زیب تن کرتے، پاک وصاف مسند پر فروکش ہوتے، ایک دھلی ہوئی سفید چادر اپنے زانوؤں پر ڈالتے، اس اہتمام کے ساتھ کلام مجید کی کتابت کی ہوئی کاپیاں اور پروف ملاحظہ فرماتے اپنے سامنے مشین دھلوا کر اس کے تمام ساز وسامان صاف اور پاک کراتے تب اس مشین پر قرآن مجید چھپتا تھا اول تو کوئی کاغذ نیچے گرنے ہی نہ دیتے دوسرے فرط احتیاط سے مشین کے اردگرد فرش پر بھی دھلی ہوئی چادریں بچھوا دیتے۔

عام خیال یہ تھا کہ ان کے اس حسن عمل اور قرآن مجید کی طباعت میں غیر معمولی اہتمام کی وجہ سے ان کے کاروبار میں بڑی برکت اور حیرت انگیز ترقی ہوئی، ان کے مطبع کے چھپے ہوئے قرآن مجید بہت مقبول ہوئے۔ یہاں تک کہ دوسرے ملکوں میں بھی ان کی مانگ بہت تھی۔

منشی نول کشور مسلمانوں کے بزرگوں کا بھی بڑا احترام کرتے تھے۔ جناب ناظر کاکوروی رقمطراز ہیں:-

"چند ممتاز ہندو بزرگوں کی زبان مبارک سے یہ بھی سنا ہے کہ جو احترام بزرگان دین کا منشی نول کشور کرتے تھے وہ بہت سے مسلمان بھی نہیں کر سکتے اور یہ واقعہ بھی ہے کہ کلام پاک کی اشاعت میں منشی نول کشور کی خدمات آئینہ درخشاں ہیں (اردو کے ہندو ادیب صفحہ ۱۸۲ حاشیہ)

منشی نول کشور اردو کے سب سے بڑے ناشر تھے، آج تک ان کے مطبع کے علاوہ کسی اور مطبع نے اردو میں اتنی زیادہ کتابیں نہیں شائع کیں؛ کہا جاتا ہے کہ اردو زبان کا جو مسودہ بھی ان کے پاس طباعت کے لیے آتا تھا وہ اس کو واپس نہیں کرتے تھے۔

اردو میں اور تکمیل کتابوں کی طرح انھوں نے عربی، فارسی اور سنسکرت کی بڑی بڑی کتابوں کے ترجمے بھی اپنے مطبع سے شائع کیے، اردو میں پہاڑہ اور گنتی کی کتابیں شائع کیں، اردو کے قاعدے، گرامر کی کتابیں، ریڈریں، کورس کی کتابیں وغیرہ بھی اسی مطبع کی بدولت چھپیں۔

غرض اردو کے ذخیرہ میں منشی نول کشور کے مطبع نے جس قدر اضافہ کیا اس کی کوئی مثال نہیں۔ اردو سے قطع نظر عربی وفارسی کی اہم اور نادر الوجود کتابیں بھی اسی مطبع سے شائع ہوئیں، عربی کی تفسیریں اور حدیث وفقہ کی متعدد کتابیں جو مشکل سے دستیاب ہوتی تھیں ان کو شائع کر کے نہایت سہل الحصول بنا دیا، فیضی کی بے نقط تفسیر سواطع الالہام سب سے پہلے مطبع نول کشور سے شائع ہوئی، انھوں نے فارسی کے متعدد برگزیدہ شعرا کے دواوین اور نثر کی بلند پایہ کتابیں طبع کرائیں۔ اردو، فارسی اور عربی لغت کی مشہور کتابیں بھی اسی مطبع کی بدولت متداول ہوئیں، یہ سمجھنا غلط ہو گا کہ اس مطبع نے صرف اردو، فارسی اور عربی کتابوں ہی کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا تھا بلکہ ہندی، سنسکرت اور ملک کی دوسری زبانوں کی کتابیں بھی یہاں سے اسی شان سے چھپتی تھیں۔

لیکن منشی نول کشور کے مطبع کا اصل اور اہم کارنامہ اردو کتابوں کی

اشاعت ہے، جس سے اردو زبان دنیا کی دوسری زندہ اور بڑی زبانوں کے ہم پایہ ہو گئی، ڈاکٹر رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں :-

"اس مطبع نے اردو زبان کی بڑی خدمت کی اور اس کی ترقی پر بہت بڑا اثر ڈالا اور نادر قدیم کتابوں کی اشاعت، مشہور کتب عربی و فارسی کے تراجم، جدید کتابوں کی پبلک کے مذاق کے مطابق تیاری، نیز اسکولی کتابوں کی تیاری سے ادب اردو پر بہت بڑا احسان کیا" (تاریخ ادب اردو حصہ نثر ص ۹۹،۹۸ مطبوعہ مطبع منشی تیج کمار لکھنؤ ۱۹۲۹ء)

ناظر کاکوری صاحب کا بیان ہے کہ :-

"ہندوستانی مسلمان اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کر سکتے اور نہ اس گراں بہا احسان سے کبھی بھی عہدہ برآ ہو سکتے ہیں کہ اسلامی درسیات، اردو ادبیات اور دیگر مذہبی علوم و فنون کی ترویج و اشاعت میں منشی نول کشور سی۔ آئی۔ ای کی جو درخشاں خدمات مسلّم ہیں وہ بحیثیت مجموعی کوئی مسلمان (انفرادی یا اجتماعی حیثیت سے) سرانجام نہ دے سکا" (اردو کے ہندو ادیب ص۱۴۳)

منشی جی کا جاری کردہ اودھ اخبار بھی صحافت کے اعلیٰ اصولوں پر شائع ہوتا تھا اس لیے صحافتی کساد بازاری کے دور میں بھی وہ بام عروج پر پہنچ گیا تھا، مضامین کی ترتیب اور خبروں کی سیٹنگ ایسی عمدہ ہوتی کہ ملک میں بھی ذوق شوق سے پڑھا جاتا تھا اور بیرونی ممالک میں بھی اس کو قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

اخبار کی مقبولیت کا اس سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کی تعداد اشاعت بڑھ کر بارہ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی تعجب خیز ہے۔

منشی نول کشور نے یہ اخبار قوم و ملک کی خدمت کے لیے جاری کیا تھا، مسلمانوں اور ہندوؤں میں اتحاد، یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی اس اخبار کا خاص مقصد تھا دونوں قوموں کے تہواروں عید، بقر عید، ہولی، اور دسہرہ کے موقع پر اس کا خاص نمبر رنگین سرورق کے ساتھ بہت دھوم دھام سے شائع ہوتا تھا۔

منشی جی کے بعد بھی ان کی نیک نامی کی وجہ سے اخبار اپنی روایتی شان و شوکت کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔

منشی جی کے مطبع کی کتابوں کی مقبولیت میں اودھ اخبار کا بھی بڑا دخل تھا کیونکہ اس میں ان کا اشتہار ہوتا رہتا تھا۔

اودھ اخبار کی حیثیت ایک دستاویز کی بھی ہے جس سے اس دور کی علمی، ادبی، سیاسی، تہذیبی اور تمدنی تاریخ لکھنے میں بڑی مدد ملے گی۔

مختلف ادوار میں اس اخبار سے جو نامور اہل قلم اور ممتاز ادیب وابستہ رہے ان کی فہرست بہت طویل ہے ان میں سے چند اہم نام حسب ذیل ہیں!

منشی غلام احمد ہوش، منشی امیر اللہ تسلیم، منشی ہادی علی اشک، قدر بلگرامی، مولانا عبدالحمید سحر کاکوروی، پنڈت رتن ناتھ سرشار، تسیم دہلوی عبدالحلیم شرر، مرزا حیرت دہلوی، سید جالب دہلوی، منشی نادر حسین کاکوروی، منشی پریم چند، منشی احمد علی کاتب، منشی دوارکا پرشاد افق، سید احمد علی اشہری، منشی نوبت رائے نظر، مرزا محمد عسکری لکھنوی مرزا یاس یگانہ چنگیزی مولانا عبدالباری آسی، امید امیٹھوی، پیارے لال شاکر، شوکت تھانوی، دیبی پرشاد سحر وغیرہ۔

مطبع نول کشور سے ہزاروں کتابوں کی اشاعت کے باوجود صحت کا پورا اہتمام کیا جاتا تھا، ہر کتاب صاف اور صحیح چھپتی تھی اور اغلاط سے پاک ہوتی تھی۔ منشی جی صحیح طباعت پر بڑی توجہ دیتے تھے، ان کی خواہش رہتی تھی کہ ان کے مطبع سے چھپنے والی کتاب کے حروف و اشکال میں صفائی ہو، کتابت صحیح ہو اور طباعت دیدہ زیب ہو۔

مطبع کا اصل مرکز لکھنؤ تھا لیکن اس کی شاخیں الہ آباد، کانپور، آگرہ، دہلی، لاہور، پٹیالہ، اجمیر اور جبل پور وغیرہ میں بھی تھیں۔

منشی جی کے مطبع کی شہرت ہندوستان کے باہر دوسرے ملکوں میں بھی تھی کتابوں کی طباعت کے حسن، نفاست اور دیدہ زیبی کی وجہ سے افغانستان، ایران، مصر، لندن، ٹرکی، برما، جاوا، ساترا، عراق، بخارا اور افریقی ملکوں سے بھی ان کا آرڈر آتا تھا۔

ابتدا میں عرض کیا گیا تھا کہ یہ مطبع ۱۸۵۸ء کے ابتر حالات میں قائم ہوا تھا اس وقت علما و فضلا سخت اقتصادی بدحالی میں مبتلا تھے،

اس مطبع کی وجہ سے اہل علم کی جماعت تصنیف و تالیف کے کام میں لگ گئی، منشی جی نے اس کو معقول معاوضہ دے کر فکر معاش سے بے نیاز کر دیا۔ ابتدا میں اس کا بھی ذکر آچکا ہے کہ نامور مصنفین اور اصحاب فضل و کمال کی بڑی تعداد ہمیشہ اس مطبع سے وابستہ رہی ہے، ناظر کاکوروی تحریر کرتے ہیں۔

"لکھنؤ میں مشہور ہے کہ جس قدر حافظ، محدث، مورخ، ادیب اس مطبع میں تھے ہندوستان کے کسی دوسرے مطبع کو نصیب نہ ہوئے" (اردو کے ہندو ادیب ص۱۴۳)

منشی جی اپنے مطبع سے وابستہ ارباب فضل و کمال کی پوری قدر دانی کرتے تھے اور ان کو فکر معاش سے آزاد رکھتے تھے تاکہ وہ پوری دلجمعی اور یکسوئی کے ساتھ علم و فن کی خدمت میں مشغول رہیں۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مطبع نے بیش قیمت کتابوں کے علاوہ اردو کو اچھے اہل قلم، بلند پایہ ادیب، نامور انشاء پرداز، لائق مصنف اور ممتاز شاعر بھی دیے۔ جو اس کی بڑی خصوصیت ہے۔

اصحاب علم و کمال کے علاوہ مطبع سے کارکنوں کی جو بڑی جماعت وابستہ تھی اس کی معیشت کا دارومدار بھی اسی پریس کی ملازمت پر تھا، کہا جاتا ہے کہ تقریباً بارہ سو کارکنان مطبع سے متعلق تھے، ان میں ہندو اور مسلمان دونوں تھے۔

منشی جی کو ابتدا میں بڑے صبر آزما، ہمت شکن اور نامساعد حالات سے دوچار ہونا پڑا، ان کی ابتدائی زندگی عسرت میں بسر ہوئی۔ شروع میں وہ سرکاری فارم چھاپتے تھے اور ان کو اپنے کندھے پر رکھ کر کمشنری لے جاتے تھے لیکن وہ کبھی پریشانیوں سے گھبرائے نہیں اور نہ ہمت ہاری مطبع قائم کرنے کے بعد ان کو کاغذ کی قلت کا سامنا کرنا پڑا تو انھوں نے کاغذ بنانے والا کارخانہ (PAPER MILL) قائم کیا یہ شمالی ہند میں کاغذ کا سب سے پہلا کارخانہ تھا۔

منشی نول کشور کے طباعتی کارناموں کی اہمیت و عظمت کا صحیح اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے۔ جب اُن حالات کو پیش نظر رکھا جائے، جن میں انھوں نے اپنا مطبع قایم کیا تھا۔ اُس وقت نہ آج کل کی طرح طباعت آسان اور سہل تھی اور نہ کتابوں کی اشاعت کے آج کے جیسے وسائل ہی مہیا تھے۔ پہلے پہل انھوں نے ہینڈ پریس قایم کیے کیونکہ اس وقت نہ پریس کی بڑی مشینیں آسانی سے دستیاب ہوتی تھیں اور نہ منشی جی کے پاس اتنا سرمایہ ہی تھا کہ وہ بڑی مشینوں کی خریداری کی فکر کرتے ایسے دور میں جبکہ نہ آج کی سی مشینیں تھیں اور نہ موجودہ سائنسی آلات و ذرایع تھے ایک دو نہیں متعدد زبانوں کی ہزاروں کتابیں شائع کرنا اور روزنامہ نکالنا ایک معجزہ سے کم نہیں۔



"مطبع نول کشور نے زبان اردو کی بڑی خدمت کی اور اس کی ترقی پر بہت بڑا اثر ڈالا نادر کتابوں کی اشاعت، مشہور کتب فارسی و عربی کے تراجم، جدید کتابوں کی پبلک مذاق کے موافق تیاری نیز اسکولی کتابوں کی تیاری سے ادب اردو پر بہت بڑا احسان کیا۔ منشی نول کشور کی قابلیت، دیانت داری اور پابندی اصول سے یہ مطبع تھوڑے ہی عرصے میں ہندوستان کیا بلکہ ایشیا کے سب سے بڑے مطابع میں شمار کیا جانے لگا اس مطبع سے ہزارہا عربی، فارسی، سنسکرت، اردو، ہندی کتابیں بڑے صرف اور بڑے تکلف سے چھپ کر شائع ہوئیں۔"

——— ڈاکٹر رام بابو سکسینہ
(مصنف تاریخ ادب اردو)

صباح الحسن بلال

[redacted]

۱۸۵۸ء
سے
۱۸۶۲ء
تک

منشی نولکشور کی زبانی

۸ جنوری ۱۸۶۲ء مطابق ۷ رجب ۱۲۷۸ ہجری بروز چہارشنبہ اودھ اخبار نمبر ۲ جلد ۴ میں منشی نول کشور نے اپنے مطبع کی ترقی کا ذکر ایک طویل مضمون میں کیا۔ مطبع کی سرگرمیوں اور کارکنوں کی کارگزاریوں کا تذکرہ بڑے جذباتی انداز میں نظر آتا ہے۔ یہ مضمون بجنسہ نقل کیا جا رہا ہے تاکہ نول کشور کی غیر معمولی محنت و مشقت اور ان کے مطبع کی برق رفتار ترقی کا اندازہ ہو سکے[1]

آغاز سال ۱۸۶۲ء نئے سال کا آغاز ہوا، چوتھی جلد اودھ اخبار کی شروع ہو گئی۔ تین سال گذشتہ کی ترقی مطبع نول کشور کی، جو عنایت ایزدی سے یوماً فیوماً آشکار ہوئی کروڑ کروڑ اس کا شکریہ لاکھ لاکھ زبان سے ادا ہوا نہیں کہہ سکتا، واقعی ذرے سے آفتاب تاباں کر دیا۔ اس صوبہ اودھ کے حکام والامقام اور راجاؤں، بابوؤں و شاہزادوں، وغیرہ خاص و عام میں رفعت و منزلت بخشی۔ ایسی ایسی مفید عام باتوں کی اشاعت کی توفیق بخشی کہ اس مطبع کے اجرا کا سلوک صوبہ اودھ کے متوطنوں کو مدت دراز تک یاد رہے گا۔

ایسی ایسی عمدہ خدمتیں اکثر سرکاری کاموں کے جلد اجرا کرنے میں بجالائی گئیں کہ سارے ہمارے پیشگان سبیدنے اس کو مسلّم الثبوت رکھ کر اس مطبع کی لیاقت کو تسلیم فرمایا۔ تجارت کتب کا ہزاروں روپیہ کا مال برآمد ہوا جس نظر احباب سے سب کارپردازان مطبع مورد ستائش ہوئے۔

اس لیے یہ ذرۂ بے مقدار ہیچ میرز نول کشور پروپرائٹر مطبع اپنے اعتقاد دلی سے جملہ حکام والامقام صوبہ اودھ بلکہ حکام رشتۂ تعلیم مخصوص جناب فیضمآب مسٹر رِیڈ صاحب بہادر ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن ممالک مغربی و شمالی کا سپاس گزار ہوں، جن کی اندک توجہ سے مطبع کا ستارۂ اقبال اوج ترقی پر پہونچا۔

پھر جملہ کاروروسائے عنایات فرمایان نزدیک و دور کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ انہے اپنے حسن توجہ اور لطف باطنی سے عنایات مستقلاً فرمائی۔ کہ آج ہزار گونہ رونق سے مطبع کی شادابی اور سرسبزی احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔

یہ سب باتیں جو آپ لوگوں کے سامنے گذارش کیں ایک زرہ توجہ جناب خداوند نعمت مرکز دائرہ حشمت و رفعت کرنیل ایبٹ صاحب بہادر کمشنر و سپرنٹنڈنٹ اودھ کا جن کے عواطف جمیل کا سپاس اگر ہر موئے بدن ایک زبان پیدا کرے، عمر بھر ممکن نہیں۔ اور تو کیا کہیئے اس شعر کا مضمون راست آتا ہے ؎

شکر فیض تو چمن چوں کند اے ابر بہار
کہ اگر خار و گر گل ، ہمہ پرودۂ تست

ہر چند اس مطبع کی بلند نامی اور اقتدار عالی کا کوئی دشمن خواب میں

---

[1] یہ مضمون ۸ جنوری ۱۸۶۲ء کے اودھ اخبار کے صفحۂ اول سے شروع ہو کر ص ۵ پر ختم ہوتا ہے۔

دکھائی نہیں دیتا پھر بھی ؎

دیدۂ بد خواہ کہ برکندہ باد
عیب نماید ہنرش در نظر

ایسے حضرات ناخدا ترس سینہ سیاہ جو چاہیں کہیں
جھک ماریں بکیں ؎

گر نہ بیند بروز شب پرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ
راست خواہی ہزار چشم چناں
کور بہتر کہ آفتاب سیاہ
(سعدی شیرازی)

اب فی الجملہ نفس الامر کی طرف توجہ فرما کر اگر ہمارے ناظرین اودھ اخبار اور وہ بزرگان با وقار جن کو اس مطبع سے فائدہ پہونچا ہمارے ساتھ متفق اللفظ ہو کر اس مطبع کے کارپردازوں کا شکریہ ادا فرمائیں بثبت بحال راقم صحیفہ ہے۔

مولوی محمد ہادی علی صاحب | مصحح مطبع، یہ بزرگ وہ ہیں جن کے صرف متبرک نام سے جوہر علوم معرض عرض میں آتا ہے علماء اور فضلاء کا سرمایۂ افتخار کوئی علوم و فنون متعلقہ عربی و فارسی اور دیسی زبان کا ایسا نہیں جس کے واسطے استاد مسلم نہ کہیں۔ اس وجہ سے تلمذ ہند میں مجھ کو دعوی ہے کہ کوئی اہل مطابع اپنے ہم پلہ نہیں۔

منشی شیو پرشاد منیجر مطبع | انہیں خاندانی ماتو قیر ہے۔ لیاقت و سنجیدہ شعاری میں بے نظیر ہے۔ اس سے پہلے محرری اودھ اخبار پر مقرر تھے۔ لیکن اپنی جبلی لیاقت اور کارگزاری سے مطبع کی خدمت سترگ پر ترقی کی۔ امید ہے کہ آئندہ اپنے نیک روش اور حسن کاردانی سے خاطر خواہ مطبع کے کام نے مدد دیں گے۔

شیخ نثار علی | داروغہ مطبع لیتھوگرافک، یہ بزرگ عالی منش سوشعور ہے اس وقت تک کہ ستر برس سے متجاوز ہیں عمدہ کاروبار میں رہے۔ پتھر کے چھاپے خانے کے امور میں کارکردہ انتخاب ہیں۔ کوئی دقیقہ ان سے فروگذاشت نہیں ہوتا فن طبع کے استاد جہاندیدہ لاجواب ہیں۔ تجارت کتب درسیہ میں ان کا مطبع مرتضوی عہد شاہی میں مشہور عام تھا۔ اتفاقات حسنہ سے قریب ڈیڑھ برس گزرا ہے کہ دتیمناً شیخ صاحب موصوف کا قیام مطبع کی خدمت داروغگی پر ہے۔ وہی ان کے حسن نیت و تدابیر اشاعت تجارت کتب درسیہ کے ابتدائے تشریف آوری سے آج کے دن ترقی کارخانہ شہادت دیتی ہے۔

میر حشمت علی مصلح سنگ | نے ابتدا سے اس دم تک جو جو مشکل کام پیش آئے مستقلانہ کوشش سے اس خوبی کے ساتھ انجام دیئے۔ اکثر کاغذات و کتب مطبوعہ مطبع کا کوئی دعوی مقابلہ نہیں کر سکتا یہ شخص بھی رکن عظیم مطبع کے ہیں۔

شیخ امیر علی نقاش | استاد مانی و بہزاد، صفتی علی محمد خان پرنٹر خوش نویسان جادو نگار، عمدہ روزگار ہیں۔ امیر اللہ صاحب تخلص تسلیم و منشی اشرف علی و منشی گوبند پرشاد فضا مصنف مثنوی گلزار فضا، ومنشی جوالا پرشاد منشی امداد حسین حافظ علی بخش، لالہ پیارے لال ولالہ جانکی پرشاد وغیرہ۔

اور پریس مینوں وغیرہ میں تین سو آدمیوں کا منت کش ہوں کہ اپنی اپنی دل سوزیاں ظاہر کر کے مطبع کو اوج پر پہونچایا۔ اپنے کو ملک ہندوستان کے اندر نام آور کیا۔ اور اسی طرح ہم اپنے دوسرے کارخانۂ عظیم الشان انگریزی ٹیپ اور فارسی ٹیپ اور سنسکرت و ناگری کے کارپردازوں کا بدل سپاس ادا کرتے ہیں۔ خصوصی مسٹر ڈبلیو والمسٹر داہیس صاحب سپرنٹنڈنٹ ہمارے انگریزی مطبع کے، اور مسٹر راسمس صاحب ہیڈ اکونٹنٹ مطبع، اور مسٹر کلاڈیس صاحب اور مسٹر گومس صاحب اور مسٹر الگزینڈر صاحب اور مس پھول وغیرہ کہ جنھوں نے اس مطبع کو ایسی ترقی دی کہ انگریزی کارخانوں سے کہیں سبقت لے گیا۔

حق تو یہ ہے کہ اس بحر طویل کو ہم جس قدر طول دیں مختصر ہے، غرض یہ حسن انتظام و اہتمام اور سب ترقی مناصب و اقتدار محض عنایت ایزد بے مثال و داور لایزال خداوند تعالیٰ سے ہے۔ جس کا شکر ہر لحہ ور د زبان ہی رہنا یومًا فیومًا باعث ازدیاد نعمت ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ سعدی کا مقولہ ہے، کہ:

" ہر شکر اندرش مزید نعمت' ہر نفسے کہ میرود مُمّدِ حیات است و چوں برمی آید مفرح ذات' پس در ہر نفسے دو نعمت موجود است و برہر نعمتے شکرے واجب "

از دست و زباں کہ بر آید
کز عہدہ شکرش بدر آید

یہ مطبع ایسی ایک صحبت معقول، وانجمن گاہ علم وہنر ہے جس کو اہل دانش غنیمت سمجھیں دیکھ کر خوش ہوں۔ بڑی فرخندہ فالی اور بہروزی کی بات ہے کہ اس طرح کا اجتماع میسر آئے۔ ایسا سامان یکجا ہو' ہر کام کا دستور ہے کہ جب اسباب درست اور کارپرداز اچھے ہوں۔ تو بن پڑتا ہے۔ پسند کے قابل ہوتا ہے۔ ورنہ یوں تو سب ہی اپنی اپنی کارروائی کر لیتے ہیں۔

اہل انصاف اگر غور فرمائیں' ہماری سی کہیں خدا لگتی کہیں تو تہذیب' حسن ترتیب' تصحیح' چھاپے کی صفائی خوشخطی اور سب امور کچھ ہمارے بیان کے محتاج نہیں مثل مشہور ہے' کہ" عیاں راچہ بیاں" خدائے بسیار بخش بے منت وہ کا کون کون احسان زبان پہ لائیے' ماشاءاللہ اس وقت ٹیپ کے سوا صرف لیتھو گرافک کی پچیس چھبیس کلیں رواں ہیں۔ ممکن ہے کہ بہتیری چھوٹی چھوٹی کتابیں ایک ہی دن میں ہزارہا نسخے اول سے آخر تک چھپ کر طیار ہو جائیں۔ بہر حال حافظ حقیقی دشمنوں کی چشم بد سے بچائے' دوستوں کے خاطر خواہ روز بروز ترقی کو پہنچائے۔

شعر
سعادت یار و دولت ہمنشیں باد
چنیں خود ہست تا بادا چنیں باد

★

لہ آخر میں منشی نول کشور نے مختصر تمہید و تعارف کے بعد اصغر علی نسیم کا ایک قصیدہ نقل کیا ہے۔ جو ان کی مدح میں لکھا تھا۔ طوالت کے خیال سے قصیدہ نقل نہیں کیا گیا۔ آخر کتاب میں قصیدہ کا انتخاب شامل ہے۔ بلال

اودھ اخبار اور اس کے چند ایڈیٹر ـــــ (صفحہ ۴۷ کا بقیہ)

اودھ اخبار نے اپنی زندگی میں بہت سے نشیب و فراز طے کیے۔ ۹۲ سال کی طویل مدت میں اس نے اپنا شاندار زرین دور عروج بھی دیکھا لیکن ایک وقت آیا کہ اس کو زوال کی منزل سے بھی گزرنا پڑا اور یہ منزل اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔ اودھ اخبار با نوے سال تک ملک و قوم کے علاوہ اردو زبان و ادب کی گرانقدر خدمت انجام دیتا رہا۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں وارثان مطبع نول کشور کے باہمی نزاع میں اس پر بھی نزاعی کیفیت طاری ہوئی اور یہ تاریخ ساز اخبار دو بھائیوں کی کشمکش میں اس طرح پھنسا کر چند ہچکیاں لے کر ختم ہو گیا۔

★



نول کشور نمبر

PRIME MINISTER

MESSAGE

Munshi Neval Kishore was one of our intellectual leaders of the nineteenth century. He was intensely concerned with the evolving of a synthesis between the old and new knowledge. He was a publisher of phenomenal energy. Several languages are indebted to him.

My good wishes for the success of plans to mark the 75th anniversary of Munshi Neval Kishore's death.

(Indira Gandhi)

New Delhi,
January 7, 1970.



ڈاکٹر انوار الحسن

مطبع نولِ کشور کا

مطبع نول کشور کا شعبۂ تصنیف و ترجمہ، منشی نول کشور کی بلند ہمتی اور اولوالعزمی کی زندہ مثال ہے، مشرقی علوم و فنون کی ترویج اور اشاعت میں اس شعبہ کی گرانقدر خدمات کی مثال کہیں اور مشکل سے ملے گی۔ ہماری علمی و ادبی تاریخ میں اس کو ایک نمایاں مقام حاصل ہوا۔ منشی نول کشور نے ۱۸۵۸ء میں اپنا مطبع قائم کیا۔ اور اسی سال ماہ نومبر میں اردو اخبار جاری کیا۔ ابتدا میں چھوٹی چھوٹی کتابوں کی طباعت اشاعت کا اہتمام کیا اور اپنی غیر معمولی محنت اور دیانت داری کی بدولت چند سال کے اندر ہی ترقی کی کئی منزلیں طے کرلیں، اب علمی دنیا کی ضرورت کے پیش نظر بڑی کتابوں کی طباعت کی طرف توجہ مبذول کی اور مطبع میں تصنیف و ترجمہ کا ایک شعبۂ بھی قائم کیا۔ جس کے لیے اس عہد کے نہایت قابل مصنفوں اور تجربہ کار مترجموں کی خدمات حاصل کیں۔

مطبع نول کشور سے پہلے لکھنؤ میں کئی مطابع موجود تھے جو اس زمانے کے اہل علم کی ضرورتوں کے مطابق سال میں چند کتابیں شائع کرتے تھے۔ سب سے بڑا سرکاری مطبع سلطان المطابع تھا جس نے عربی، فارسی کی بعض بڑی کتابیں بھی شائع کیں۔ اسی طرح لاہور، کلکتہ، مدراس اور دہلی میں بھی بہت سے مطابع سرگرم عمل تھے۔ جو فارسی عربی کے علاوہ اردو زبان کی کتابیں بھی شائع کرتے تھے۔ کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج میں جان گلکرسٹ کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ زیر نگرانی تصنیف ترجمہ کا بھی ایک شعبہ قائم کیا گیا تھا۔ جس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی سیاسی پالیسی کے مطابق تصنیف و ترجمہ کا کام ہوتا تھا بیشتر کتابیں ان انگریزوں کو اردو سکھانے کے لیے تیار کی جاتی تھیں جو ہندستان میں انگریزی حکومت کی مشینری کے کل پرزہ بنتے تھے۔ اسی طرح مدراس کے جارج سینٹ جانسن کالج میں بھی ایسا ہی ایک شعبہ موجود تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں بیشتر مطابع کی سرگرمیاں ختم ہوگئیں یا ماند پڑگئیں۔

منشی نول کشور نے طباعت و اشاعت کے میدان میں اس وقت قدم رکھا جب ۱۸۵۷ء کے ہندستان گیر انقلاب کے بعد علمی و ادبی محفلیں سونی ہوگئی تھیں اور علمی مراکز پر ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ بڑے بڑے سرکاری اور شخصی کتب خانے تباہ و برباد ہو چکے تھے اور ماہرین علوم و فنون اور اہل ہنر معاشی بحران میں مبتلا تھے۔ دلّی کی طرح لکھنؤ بھی انگریزوں کے ظلم و جبر کا نشانہ بن چکا تھا، ارباب علم و فن اپنے عزیز شہر کو چھوڑ کر ملک کے دوسرے علاقوں میں جینے کا سہارا تلاش کر رہے تھے، اس پر آشوب دور میں مطبع نول کشور قائم ہوا۔ منشی نول کشور نے اس طرف پوری توجہ صرف کی کہ لکھنؤ اور اطراف کے عالموں اور فنکاروں کی خدمات سے فائدہ حاصل کریں۔ اور ان کو معاشی پریشانیوں سے کسی حد تک نجات دلائیں۔ انھوں نے رفتہ رفتہ سینکڑوں فنکاروں کو اپنے مطبع کے مختلف شعبوں میں ان کے لائق خدمات سپرد کیں۔

مطبع نول کشور کا سب سے اہم جز شعبۂ تصنیف و ترجمہ تھا۔ لکھنؤ کے علاوہ ملک کے اچھے مصنفین اور مترجمین کسی نہ کسی حیثیت سے اس شعبہ سے وابستہ رہے، جیسا کہ اس کی سرگرمیوں سے اندازہ ہوتا ہے۔ تصانیف و تراجم کے سلسلہ میں تمام کاموں کی نوعیت اور تقسیم اس طرح تھی۔

(۱) قدیم مستند کتابوں کے جو مسودات حاصل ہوں ان کی صحت اور حسب ضرورت مفید حواشی کا اضافہ، مصنف یا مؤلف کا تعارف وغیرہ لکھنا۔

(۲) مکاتب، مدارس اور اسکولوں کالجوں کے لیے نصابی کتب تیار کرنا اور طلباء کے لیے مفید غیر نصابی کتابیں، فرہنگ و لغات کی ترتیب و تالیف۔

(۳) قدیم فارسی، عربی اور سنسکرت کی کتابوں کا اردو زبان میں ترجمہ کرنا۔

(۴) اردو، فارسی کتابوں کے ترجمے ہندی میں، اور بعض اہم کتابوں کے ترجمے انگریزی میں کرنا۔

(۵) انگریزی زبان کی اچھی اور مفید کتابوں کے ترجمے اردو اور ہندی زبانوں میں کرنا۔

تراجم کے سلسلہ میں منشی نول کشور کا یہ نظریہ تھا کہ ان کتابوں کو ترجمہ کے لیے منتخب کیا جائے جن کی افادیت ہر زمانہ کے لیے مسلّم ہے۔ اس معاملہ میں وہ اہل علم سے بھی مشورہ لیتے تھے اور یہ کوشش کرتے تھے کہ ترجمہ کے لیے اس عہد کے ممتاز اور قابل علماء کی خدمات حاصل کریں۔ شعبۂ تصنیف و ترجمہ سے تعلق رکھنے والے مصنفین اور مترجمین دو قسم کے تھے۔ ایک وہ جو پورا وقت دیتے تھے اور مطبع میں بیٹھ کر کام کرتے تھے۔ ان کے لیے ماہوار مشاہرہ مقرر تھا۔ دوسرے وہ جو اپنے گھروں میں بیٹھ کر حسب ضرورت اس کام پر وقت صرف کرتے تھے خواہ وہ ملک کے کسی علاقہ میں سکونت پذیر ہوں۔ ان کو کام کی نوعیت کے مطابق طے شدہ معاوضہ ملتا تھا۔ شعبۂ تصنیف و ترجمہ میں مستقل کام کرنے والے عالموں اور فنکاروں کے لیے مطبع کی عمارت کا ایک حصہ خاص کر دیا گیا تھا۔ جہاں بیٹھ کر وہ کام کرتے تھے۔ ان کے لیے امدادی کتب اور لغات وغیرہ کا انتظام بھی تھا۔ منشی نول کشور کا معمول تھا کہ وہ روزانہ سہ پہر کے وقت مصنفین اور مترجمین کے مسودات کا جائزہ لیتے تھے۔ جتنا کام ہو جاتا تھا وہ کاتبوں میں تقسیم کرا دیتے تھے۔ تاکہ ساتھ ہی ساتھ کتابت بھی ہوتی رہے اور جتنی کتابت روزانہ کاتب لاتے تھے وہ ترتیب کے ساتھ پریس کے حوالے کر دیتے تھے۔

مستقل کام کرنے والے مصنفین اور مترجمین میں حسب ذیل علماء و فضلا قابل ذکر ہیں:

مولانا سید امیر علی ملیح آبادیؒ:۔

حدیث، تفسیر اور فقہ میں زبردست مہارت رکھتے تھے۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے صدر مدرس رہے۔ ندوۃ العلماء میں پرنسپل کے عہدہ پر فائز رہے۔ مولانا عبدالحی صاحب گل رعنا اور مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ان کے شاگرد تھے۔ منشی نول کشور ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ ہفتہ میں ایک یا دو بار ان کے مکان پر بھی حاضری دیتے تھے۔ مولانا کو پچاس روپیہ ماہوار مشاہرہ ملتا تھا۔

انھوں نے فتاویٰ عالمگیری کا اردو میں ترجمہ کیا جو دس جلدوں پر مشتمل ہے۔ عین الہدایہ کے نام سے اردو میں ہدایہ کی مکمل شرح لکھی جو چار جلدوں میں ہے۔ اردو کی سب سے بڑی تفسیر، مواہب الرحمٰن تیس جلدوں میں مکمل کی۔ بخاری کی شرح فتح الباری کا اردو ترجمہ کیا۔ فیضی کی بے نقط تفسیر سواطع الالہام پر بے نقط مقدمہ لکھا اور صحت کی۔ ان کے علاوہ متعدد اور کتابوں کو عربی سے اردو میں منتقل کیا۔ مولانا موصوف نے ۱۹۱۵ء میں بمقام لکھنؤ وفات پائی۔

مولانا محمد احسن نانوتویؒ

مشہور و معروف اور بلند پایہ عالم تھے۔ انھیں اسلامی علوم میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ انھوں نے امام غزالی کی بلند پایہ تصنیف

احیاء العلوم کا نہایت آسان اور شگفتہ زبان میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ مذاق العارفین کے نام سے چار ضخیم جلدوں میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ انھوں نے متعدد مذہبی کتابوں کو عربی سے اردو میں منتقل کیا درمختار کے اردو ترجمہ میں مولانا خرم علی کے ساتھ شریک رہے۔

مولانا احتشام الدین مرادآبادی

اس عہد کے ممتاز عالم تھے انھوں نے قرآن مجید کی اردو میں تفسیر بھی لکھی ہے۔ پہلے منشی نول کشور نے فتاویٰ عالمگیری کا ترجمہ ان کے سپرد کیا تھا۔ پہلی جلد کا نصف ترجمہ یا کچھ زائد کر چکے تو یہ کام مولانا امیر علی کے سپرد ہوا۔ مولانا احتشام الدین نے ملا عبدالقادر بدایونی کی مشہور کتاب منتخب التواریخ کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ بہت سی عربی فارسی کتابوں کے حواشی لکھے اور تصحیح کا کام کرتے رہے۔

مولانا فخر الدینؒ

بلند پایہ عالم تھے۔ منشی نول کشور سے ان کے دوستانہ مراسم بھی تھے۔ انھوں نے تصحیح کتب کا کام انجام دیا اور امام غزالی کی مقبول عام کتاب کیمیائے سعادت کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ جو اکسیر ہدایت کے نام سے شائع ہوا۔ اس کا مقدمہ خود منشی نول کشور نے لکھا جس سے ان کی علمی قابلیت کے علاوہ اسلامی علوم سے واقفیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ دوسرا اہم کام مولانا نے یہ انجام دیا کہ ملا حسین واعظ کاشفی کی مشہور تفسیر حسینی کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا جو تفسیر قادری کے نام سے دو جلدوں میں منشی نول کشور نے شائع کیا۔

مفتی غلام سرور لاہوری

اپنے زمانے کے ماہر و ممتاز عالموں میں شمار ہوتے تھے۔ منشی نول کشور نے پہلے ان کو [illegible] تصحیح [illegible] کے ساتھ ساتھ انھوں نے

تصنیف و ترجمہ کے بہت اہم کام انجام دیے۔ انھوں نے جامع اللغات دو ضخیم جلدوں میں ترتیب دی۔ جو نہایت مستند لغت ہے۔ حدیقۃ الاولیا، ان کی خاص تالیف ہے جس میں اولیاء اللہ کے حالات زندگی پیش کیے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ان کی متعدد تصانیف ہیں۔ ایک نعتیہ دیوان بھی شائع ہو چکا ہے۔

مولانا فضل احمدؒ

بہت بڑے جید عالم تھے منشی نول کشور نے مطبع کی شاخ لاہور میں ان کو صحت کتب اور ترجمہ و تصنیف کی خدمت سپرد کی تھی۔ مولانا نے جامع ترمذی کا اردو میں ترجمہ کیا اور مفید حواشی لکھے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں مطبع نے شائع کی۔

مولانا خرم علی

ایک باکمال عالم تھے۔ فقہ میں ان کو بہت مہارت تھی۔ انھوں نے فقہ کی مشہور کتاب درمختار کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ مولانا محمد احسن بھی ان کے شریک کار رہے۔ یہ ترجمہ غایۃ الاوطار کے نام سے چار ضخیم جلدوں میں منشی نول کشور نے شائع کرایا۔

ان کے علاوہ اس زمانہ کے مندرجہ ذیل عالم، ادیب، اور فنکار شعبۂ تصنیف و ترجمہ سے وابستہ تھے اور مستقل طور پر خدمات انجام دیتے رہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنے فن میں ماہر تھا:

مرزا حیرت دہلوی۔ مولانا ہادی علی اشک، مولانا قطب الدین دہلوی مترجم مشکوٰۃ شریف، منشی امیر اللہ تسلیم، نسیم دہلوی، قدر بلگرامی، سید عبدالرزاق حسنی حسینی، مولانا عبدالعلی آسی مدراسی بانی اصح المطابع لکھنؤ، مولانا قطب الدین، بانی مطبع نامی لکھنؤ دوارکا پرشاد افق، نوبت رائے نظر، طوطا رام شایاں، مولانا عابد حسین جعفری، مولوی تصدق حسین لکھنوی، سید ذاکر حسین منشی [illegible] حسین [illegible] مترجم [illegible] اور رتن ناتھ سرشار۔

وہ مصنفین اور مترجمین جو منشی نول کشور کی فرمائش پر تصنیف

ترجمہ کا کام کرتے تھے۔ ملک کے مختلف علاقوں کے رہنے والے معروف اہلِ علم تھے۔ ان میں سے بعض خط و کتابت کے ذریعہ معاملات طے کرتے تھے اور بعض خود منشی نول کشور سے مل کر اپنے کام کے متعلق ضروری باتیں طے کر لیتے تھے۔ ان میں درج ذیل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں اور ان کے ہاتھوں علم و ادب کا خزانہ ہر رنگ کے جواہرات سے بھر گیا:

خواجہ عبدالمجید خاں، مترجم "مدارج النبوت"، مولوی بشارت علی مترجم فتوحات واقدی۔ مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی مؤلف کتب درسیہ، مولانا عبدالحق بریلوی مترجم جذب القلوب۔ محمد علی جویا مرادآبادی، مترجم سیر الاقطاب۔ منشی گوکل پرشاد مترجم سیر المتاخرین۔ مولوی یوسف شاہ عرف بانکے میاں چشتی مترجم مثنوی مولانا روم بنام پیراہن یوسفی، مولانا غلام حیدر گوپاموی، مترجم مثنوی روم۔ منشی خادم حسین اکبرآبادی، مصنف تاریخ چند دلیہ، مولانا وحید الزماں، مترجم شرح وقایہ۔ مولانا قطب الدین دہلوی، مترجم و شارح مشکوٰۃ شریف بنام "مظاہر حق"۔ مولوی صادق علی لکھنوی مترجم دیوان حافظ۔ ڈپٹی نذیر احمد، مصنف توبۃ النصوح و مراۃ العروس وغیرہ، مولانا رحمٰن علی، مصنف تذکرہ علمائے ہند۔ سید مہدی حسن سیدن پوری، مترجم فتوح المصر، مولوی عنایت حسین، مترجم فتوح الشام۔ مولوی ظہیر الدین بلگرامی مولوی امانت اللہ، مترجم اخلاق جلالی۔ حکیم احسن اللہ خاں دہلوی مرزا اسداللہ خاں غالب۔ مردان علی خاں رعنا۔ حکیم احسن اللہ کی تصنیف احسن القصص دو جلدوں میں شائع ہوئی۔

ان مصنفین اور مترجمین کے علاوہ بہت سے اور نام بھی ہیں جو مضمون کی طوالت کے پیش نظر درج نہیں کیے جا رہے ہیں۔

مستقل اور غیر مستقل کام کرنے والے مصنفین اور مترجمین کی محنت اور منشی نول کشور کی ہمت افزائی اور جد و جہد کی بدولت علمی اور ادبی دنیا کو جو گرانقدر تحفے حاصل ہوئے ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ لیکن چند اہم کتابوں کے نام درج کیے جا رہے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ مطبع نول کشور کے شعبۂ تصنیف و ترجمہ نے کیا کارنامے انجام دیے۔

منشی نول کشور نے عربی اور فارسی کی جن کتابوں کے اردو میں ترجمہ کرائے وہ اصل کتابیں بھی شائع کیں۔

۱۔ ترجمہ ازدو احیاء العلوم کامل ۴ جلدوں میں۔ کل صفحات ۳۰۲۴۔
سائز ۸×۱۲۔ قیمت ۱۰/- مطبوعہ ۱۸۷۵ء۔

۲۔ ترجمہ فتاویٰ عالمگیری ،، ۱۰ جلدوں میں۔

۳۔ ترجمہ مشکوٰۃ شریف اردو۔ ۴ ،، ،، صفحات ۲۲۴۲۔
سائز ۱۰×۱۴۔ قیمت ۱۰/- ۔ ۱۸۷۰ء۔

۴۔ ترجمہ دُرِ مختار ،، ۴ جلدوں میں۔

۵۔ ترجمہ جامع ترمذی ،، ۲ ،، ،،

۶۔ ترجمہ تفسیر حسینی (تفسیر قادری) ۲ ،، ،، صفحات ۱۳۰۶۔
سائز ۱۵×۱۳۔ قیمت ۶/۵۰ ۱۸۸۳ء

۷۔ ترجمہ و شرح ہدایہ۔ عین الہدایہ۔ ۴ جلدوں میں

۸۔ ترجمہ شرح وقایہ۔ ۴ ،، ،،

۹۔ منہاج النبوت ترجمہ مدارج النبوۃ۔ ۴ جلدوں میں صفحات ۱۸۵۴۔ سائز ۶½×۱۰، قیمت ۲/۵۰۔
مطبوعہ ۱۸۷۷ء۔

۱۰۔ ترجمہ فتوحات واقدی چار جلد۔ صفحات ۱۲۰۴، سائز ۸×۱۲
قیمت ۴/- مطبوعہ ۱۸۷۴ء

۱۱۔ تفسیر مواہب الرحمٰن کامل ۳۰ جلد

۱۲۔ ترجمہ منتخب التواریخ۔ بدایونی۔

۱۳۔ ترجمہ تاریخ سیر المتاخرین۔ ۲ جلد، صفحات ۱۱۱۴، سائز
۸×۱۲۔ قیمت ۳/- ۱۸۷۴ء

۱۴۔ آثار الصنادید۔ ۴ جلد۔ صفحات ۷۰۵، سائز ۹×۱۱۔
قیمت ۳/- مطبوعہ ۱۸۷۶ء

۱۵۔ فسانۂ آزاد۔ چار جلد

۱۶۔ جامع اللغات ۲ جلد

۱۷۔ پیراہن یوسفی۔ ترجمہ مثنوی مولانا روم ۶ جلد، صفحات ۹۳۰
سائز ۱۰×۱۳، قیمت ۴/- مطبوعہ ۱۸۸۴ء

۱۸۔ بوستانِ معرفت بشرح و ترجمہ مثنوی مولانا روم ۔ ۶ جلد ۔

۱۹۔ فتوح الشام منظوم ۔

۲۰۔ ترجمہ الف لیلیٰ منظوم ۔ ۴ جلد (طوطا رام شایاں) صفحات ۲۲۴

سائز ۱۰×۱۳، قیمت ۲/۲۵ ۱۸۸۴ء

۲۱۔ ترجمہ الف لیلیٰ نثر ۔ ۴ جلد ۔ (حامد علی)

۲۲۔ ترجمہ الف لیلیٰ بطرز ناول (رتن ناتھ سرشار) ۲ جلد

۲۳۔ ترجمہ الف لیلیٰ (مرزا حیرت دہلوی) ۳ جلد

۲۴۔ ترجمہ الف لیلیٰ (اصغر علی نسیم)

"سنسکرت کی مذہبی کتب کے اردو ترجمے جو اردو اور سنسکرت دونوں زبانوں میں مہارت رکھنے والے مترجمین نے کیے تھے!"

۲۵۔ منوسمرتی ۔ ترجمہ اردو ۔ مترجم لالہ سوامی دیال مطبوعہ ۱۸۸۳ء

۲۶۔ مارکنڈے پران ۔ اردو ۔ ، پنڈت رگھوراج ، ۱۸۹۵ء

۲۷۔ بھاگوت گیتا ، ، منشی شیام سندر ، ۱۸۸۱ء

۲۸۔ ہرتارک ، ، لالہ سوامی دیال ، ،

۲۹۔ دیوی بھاگوت کامل ، ، پنڈت پیارے لال ، ۱۸۷۴ء

۳۰۔ مہابھارت منظوم ، ، لالہ جے گوپال

۳۱۔ بھگت مال ، ، منشی تلسی رام ۱۸۸۰ء

۳۲۔ مہابھارت اردو نثر ۱۸۸۰ء

۳۳۔ سورساگر ، ، منشی نتھو لال ۱۸۸۱ء

۳۴۔ شیو پران منظوم ، ، منشی شنکر دیال فرحت

۳۵۔ ماہمن استوتر ، ، لالہ سوامی دیال ، ۱۸۷۹ء

۳۶۔ بید انتمت ، ، لالہ بلدیو داس ، ۱۸۸۱ء

شعبۂ تصنیف اور ترجمہ کا ایک عظیم الشان کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے فن طب کی قدیم اور جدید کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ منظرِ عام پر لا کر اس فن کو نئی زندگی بخشی ۔ منشی نول کشور نے فن طب کے ممتاز ماہرین کی کتابوں کے مسودے فراہم کیے اور ان کو اپنے دوسرے نامور اور قابل ترین اطبا کے سپرد کر کے صحت کرائی ۔ پہلے عربی فارسی کے اصل مسودات حاصل کر کے شائع کیے اس کے بعد ان کے اردو میں ترجمے کرائے ۔ بعض اہم کتب کے ترجمے ہندی میں بھی کرائے اسی طرح سنسکرت زبان میں فن ویدک کی جو مستند کتب ملیں ان کو شائع کیا اور بعض کے اردو، ہندی ترجمے بھی کرائے ۔ فن طب کی مطبوعہ کتب کا جو ذخیرہ ہندستان، ایران، افغانستان، پاکستان اور بعض دوسرے مشرقی ممالک کے کتب خانوں میں محفوظ ہے ۔ وہ بیشتر مطبع نول کشور کا شائع کیا ہوا ہے ۔ ہندستان اور پاکستان میں فن طب کا تعلیمی نصاب اسی ادارے کی رہینِ منت ہے ۔

طب کی کتب کے تراجم اور صحت کے لیے منشی نول کشور نے جن ماہر طبیبوں کی خدمات حاصل کیں ان کی فہرست طویل ہے تاہم چند خاص طبیبوں کے نام ان کی تصانیف و تراجم کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں ۔

حکیم غلام حسین کنتوری ۔ ایک جیّد عالم اور ماہر طبیب تھے ۔ قصبہ کنتور ضلع بارہ بنکی (اودھ) کے رہنے والے تھے ۔ انھوں نے حکیم بوعلی سینا کی مشہور کتاب قانون کا عربی سے آسان اردو میں ترجمہ کیا جو پانچ جلدوں پر مشتمل ہے ۔ یہ کتاب نہایت اہتمام سے شائع ہوئی اور عربی نہ جاننے والوں کو پہلی بار اس سے استفادہ کا موقع ملا ۔

حکیم ہادی حسن خاں :۔ ماہر طبیب تھے ۔ انھوں نے ذخیرہ خوارزم شاہی جیسی ضخیم اور بلند پایہ کتاب کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا ۔ اصل فارسی کتاب اور ترجمہ دونوں شائع ہوئے ۔ یہ کتاب لودھی خاندان کے عہد میں مشہور طبیب حکیم بہوہ نے تصنیف کی تھی ۔ حکیم محمد اکبر ارزانی کی کتاب طب اکبر کا ترجمہ حکیم واحد علی موہانی سے کرایا یہ دو جلدوں میں طبع ہوئی ۔ حکیم نور کریم دریاآبادی جیسے عالم اور ماہر طبیب سے مفرح القلوب اور قرابادین قادری کا ترجمہ کرایا ۔ ویدک کی مستند کتاب امرت ساگر کا اردو ترجمہ پنڈت پیارے لال نے کیا ۔ فن طب میں عربی و فارسی زبانوں کی تمام مستند کتابیں منشی نول کشور نے شائع کرائیں ۔ اور بیشتر کتابوں کے ترجمے اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں کرائے ۔ ان کے شعبۂ تصنیف

و ترجمہ کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ اور وہ ماہرین فن کو تلاش کرکے ترجمہ کا کام ان کے سپرد کرتے تھے۔ ان اطبا کی فہرست بھی طویل ہے جنھوں نے اس شعبہ ترجمہ میں خدمات انجام دیں۔ جن کتابوں کے نام درج ذیل ہیں۔ جن کو شائع کرکے ان کے ترجمے اردو میں کرائے گئے۔

علاج الامراض، علاج المواشی، طب احسانی، قرابادین ذکائی، جامع شفائیہ، معالجات سدیدی، کلیات سدیدی، کامل الصناعۃ از ابوالحسن علی، طبیب عضدالدولہ کفایہ منصوری، الحاوی ذکریا رازی (ترجمہ شائع نہ ہوسکا) دہلی کے ممتاز اطبا کی مستند کتابیں پہلی بار نول کشور نے طبع کرائیں۔ خاص طور پر حکیم اعظم خاں دہلوی کی جامع کتاب اکسیر اعظم کامل چار جلدوں میں رموز اعظم دو جلدوں میں۔ اول الذکر کا اردو ترجمہ شروع کرایا گیا تھا مگر پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ قرابادین اعظم دو ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد اردو ترجمہ کرایا گیا۔

علم طب کی کم و بیش ڈیڑھ دو سو کتابیں مطبع نول کشور نے شائع کیں۔ اس فن کی نہایت اہم کتابوں کے مسودات منشی نولکشور ملک کے مختلف علاقوں سے تلاش کراکے اور گرانقدر رقم صرف کرکے ان کو خریدتے اور ماہر اطبا کی نگرانی میں صحت کراتے پھر شعبۂ تصنیف و ترجمہ میں کام کرنے والے ماہرین سے ترجمے کراکے انھیں نہایت اہتمام سے شائع کراتے تھے۔ یہ سلسلہ منشی نول کشور کے بعد بھی کم و بیش جاری رہا۔

اردو داستانوں کی تصنیف و ترجمہ کا کام بھی شعبۂ تصنیف و ترجمہ کا مایۂ ناز کارنامہ ہے۔ اردو زبان میں داستانوں کا اتنا بڑا ذخیرہ منشی نول کشور کی بدولت فراہم ہوگیا کہ دنیا کی بڑی اور ترقی یافتہ زبانیں بھی اس کی مثالیں پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

منشی نول کشور نے اپنے زمانے کے ماہر داستان گو حضرات کی خدمات حاصل کیں۔ پہلے انھوں نے ایران سے فارسی میں شائع شدہ داستان رموز حمزہ اور بعض دوسری فارسی داستانوں کا آزاد ترجمہ کرایا۔ فارسی میں ایسی داستانوں کی چند جلدیں موجود ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اکبر کے درباری شاعر ملا فیضی نے بھی فارسی میں داستان امیر حمزہ لکھی تھی۔ بہر حال یہاں اس کی تحقیق مقصود نہیں ہے۔ بلکہ یہ بتا دینا مقصود ہے کہ امیر حمزہ نام کی فارسی داستان کو بنیاد بناکر لکھنؤ کے مشہور داستان نگاروں نے اس سلسلہ کو اتنا دراز کیا کہ اردو زبان مالا مال ہوگئی۔

منشی نول کشور نے شعبۂ تصنیف و ترجمہ سے منسلک داستان نگاروں کا ایک سیکشن بھی قائم کیا جن میں داستانوں کی تصنیف کا کام ہوتا تھا۔ تین ممتاز داستان گو اس شعبہ سے وابستہ تھے۔ منشی تصدق حسین، منشی احمد حسین قمر، منشی محمد حسین جاہ، ان کی نشست کا ایک جگہ انتظام تھا۔ نقل نویس کاتب موجود رہتے تھے۔ داستان گو خود لکھتے نہیں تھے۔ بلکہ داستان بیان کرتے تھے اور پوری توجہ اور محویت کے ساتھ کاتب لکھتے جاتے تھے۔ ایک کاتب تھک جاتا تھا تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتا تھا۔ یہ سلسلہ برسوں جاری رہا۔ داستان امیر حمزہ کے نام سے ایک جلد میں جو داستان شائع ہوئی اسی کے سلسلہ سے ملاکر داستان گویوں نے کافی داستانیں تصنیف کر دیں۔

اس سلسلہ کی سب سے بڑی اور معرکۃ الآرا داستان طلسم ہوشربا ہے جس کا اردو زبان کی تاریخ میں خاص مقام ہے۔ یہ دلچسپ داستان سات جلدوں پر مشتمل ہے۔ بعد میں دو جلدوں کا اضافہ کیا گیا اس طرح نو جلدیں ہوگئیں۔

طلسم ہوشربا جلد اول سے نمبر ۴ تک محمد حسین جاہ نے تصنیف کی اور جلد پنجم سے ہفتم تک احمد حسین قمر نے (جلد پنجم دو جلدوں پر مشتمل ہے۔)

اس کے علاوہ منشی تصدق حسین نے نوشیرواں نامہ ۲ جلد، ہرمز نامہ ۲ جلد، کوچک باختر، بالا باختر، ایرج نامہ، زعفران زار سلیمانی، تصنیف کیں۔ احمد حسین قمر نے طلسم فتنہ نور افشاں ۳ جلد، طلسم ہفت پیکر ۳ جلد، طلسم خیال سکندری ۳ جلد، طلسم زخینۂ جمشیدی ۳ جلد، ہوشان نامہ اور چند دوسری داستانیں لکھیں۔ بقیہ طلسم ہوشربا کی دو جلدیں بھی انھیں کی تصنیف ہیں۔

محمد حسین جاہ نے بھی کئی داستانیں تصنیف کیں، صندلی نامہ ۱جلد، تورج نامہ ۲جلد، محل نامہ ۲جلد، گلستانِ باختر ۲جلد، اور متعدد دیگر داستانیں انھیں ماہر داستان گویوں کی تصانیف ہیں۔ دراصل یہ خیال غلط ہے کہ یہ داستانیں فارسی داستانوں کا ترجمہ ہیں۔ یہ فی البدیہہ بیان کی ہوئی داستانیں ہیں جو مطبع نول کشور کے شعبۂ ترجمہ و تصنیف میں بیٹھ کر بیان کی گئیں اور کاتبوں نے لکھیں۔ یہی سبب ہے کہ ان میں سے کسی داستان کی اصل موجود نہیں ہے۔ جس کی پورے طور پر تصدیق ہو چکی ہے۔ وہ بلند چبوترہ اب بھی نول کشور ریزیڈنسی لکھنؤ میں موجود ہے جس پر بیٹھ کر یہ ماہر داستان گو داستانیں بیان کرتے تھے۔ ان کے لیے کھانے پینے کی ان تمام چیزوں کا انتظام بھی کیا جاتا تھا جو ان ہی کے لیے مخصوص تھیں۔

اس شعبۂ تصنیف و ترجمہ کی بدولت اردو زبان میں ان داستانوں کی تقریباً ساٹھ جلدیں مطبوعہ صورت میں اردو دنیا کو مل چکی ہیں اور تقریباً چالیس جلدیں مسودات کی صورت میں نول کشور پریس کے محافظ خانہ میں محفوظ تھیں۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اب وہ مرور ایام کے بعد کس حالت میں ہیں ان میں سے کئی دوسرے داستان نگاروں کی لکھی ہوئی تھیں۔

ان داستانوں کے علاوہ اس شعبۂ نے فسانۂ آزاد، الف لیلیٰ کے متعدد ترجمے، اور اردو نثر کی بہت سی کتابیں تیار کیں۔ جن کی فہرست طویل ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سنسکرت زبان کی بہت سی کتابوں کے ترجمے بھی اس شعبۂ میں کیے گئے اور اردو کی بعض اہم کتابوں کو ہندی میں منتقل کیا گیا جن میں ترجمہ رامائن، ترجمۂ مہابھارت ۱۸ جلدیں میں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ رامائن کے اردو میں کئی ترجمے مختلف مترجمین نے کیے جو بہت مقبول ہوئے۔

اسی طرح اردو کتب کو اس شعبہ نے ہندی میں منتقل کیا۔ داستان امیر حمزہ کا ہندی ترجمہ پنڈت کالی چرن نے ۱۸۸۳ء میں کیا۔ جیورام جاٹ نے قصہ حاتم طائی اور گل وصنوبر کو ہندی میں لکھا۔ فارسی کی مشہور کتاب شاہ نامہ فردوسی کا ہندی ترجمہ بھی کرایا گیا جس کی ایک جلد مطبع نول کشور کانپور سے شائع ہوئی تھی۔ مثنویات میر حسن کا ہندی ترجمہ پنڈت پیارے لال نے ۱۸۸۱ء میں کیا۔ یہ چند نام بطور مثال پیش کیے گئے ہیں ورنہ یہ فہرست سیکڑوں سے متجاوز ہے۔

ان بڑے کاموں کے ساتھ ساتھ اس شعبۂ نے اردو، ہندی زبانوں میں مختلف مضامین کی نصابی کتابیں تیار کرنے کا بھی اہتمام کیا تھا۔ ابتدائی، ثانوی اور اعلا تعلیم کے لیے نصابی کتابوں کا سب سے بڑا مرکز عرصہ تک نول کشور پریس ہی رہا۔ نصابی کتابیں تیار کرنے کے لیے اسکولوں، کالجوں کے اساتذہ کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں بعض کتابیں محکمہ تعلیم کے عہدہ داروں کے ایما پر ان کے بتائے ہوئے مصنفین سے لکھوائی جاتی تھیں بعض مضامین کی کتابیں انگریزی میں تھیں۔ ان کے ترجمے کرائے جاتے تھے۔ نصابی کتب کے مرتب کرنے والوں میں، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی اسماعیل میرٹھی، قادر بلگرامی، سید زوار حسین لکھنوی، مولوی ابوالحسن فریدآبادی، راجہ شیو پرشاد، پنڈت پیارے لال، دیبی پرشاد سحر وغیرہ کے نام نظر آتے ہیں۔ نصابی کتب تیار کرنے کا جو کام شعبۂ تصنیف و ترجمہ نے کیا۔ اس کی روشنی میں بعد کے ادوار میں مصنفین اور مترجمین کا کام آسان ہو گیا۔ یہ نول کشور کے شعبۂ تصنیف و ترجمہ کے عدیم المثال کارناموں کا محض ایک مختصر خاکہ ہے ورنہ یہ موضوع ایک ضخیم کتاب کا متقاضی ہے۔

نول کشور پریس کی خدمات کے بارے میں پروفیسر احتشام حسین مرحوم کا مندرجہ ذیل اقتباس توجہ کا مستحق ہے جس میں آپ لکھتے ہیں:

"منشی نول کشور نے عجیب و غریب ذہانت، جرأت اور صلاحیت سے اس کام کی طرف توجہ کی اور سیکڑوں ادب پاروں اور علمی صحیفوں کو مٹنے سے بچا لیا۔ منشی نول کشور خود صاحب علم تھے۔ اور علم و فن کی قدر و قیمت جانتے تھے۔ تجارتی پہلوؤں کو نگاہ

(باقی صفحہ ۸۶ پر)



منشی
نول کشور
کی
ایک نایاب
تصویر

منشی نولکشور
کی یاد میں جاری
کیے گئے ڈاک ٹکٹ کی
تصویر: یہ ڈاک ٹکٹ
۱۹۷۰ء میں جاری
کیا گیا تھا



منشی نولکشور کے صاحبزادے رائے بہادر
پراگ نرائن بھارگوا، جو امپیریل لیجسلیٹو کونسل
آف انڈیا کے ممبر تھے

منشی نولکشور

ڈاکٹر راج کمار رنجیت بھارگوا

کنور تیج کمار بھارگوا



منشی نولکشور (بائیں جانب) اپنے والد اور بھائیوں کے ساتھ
یہ تصویر ۱۸۶۵ء کی ہے

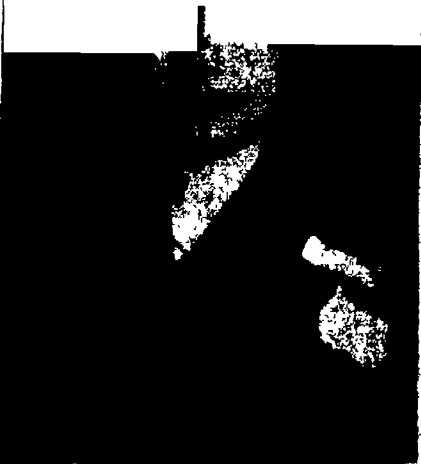


منشی نولکشور کے والد پنڈت جمنا پرشاد بھارگوا

منشی بشن نرائن کے بڑے صاحبزادے
راجا رام کمار بھارگوا

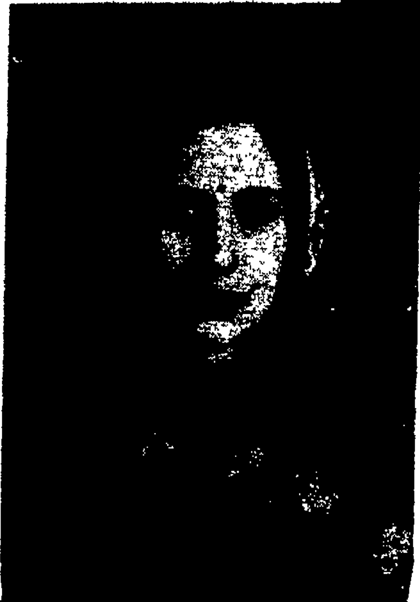


منشی نولکشور کے پوتے بشن نرائن بھارگوا جو
ہندی رسالہ "مادھوری" کے بانی تھے



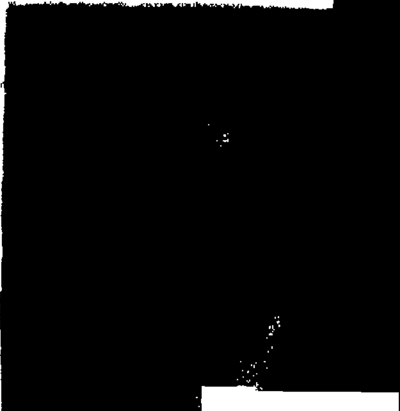
شریمتی کملا بھارگوا

پدم شری اور سابق ایم۔ایل۔سی
رانی لیلا بھارگوا



شری نو بھارگوا

شری کش بھارگوا



ڈاکٹر کنور رانی کنک لتا
رنجیت بھارگوا



اشاعت زندگی کا مرکز

جاوید وششٹ

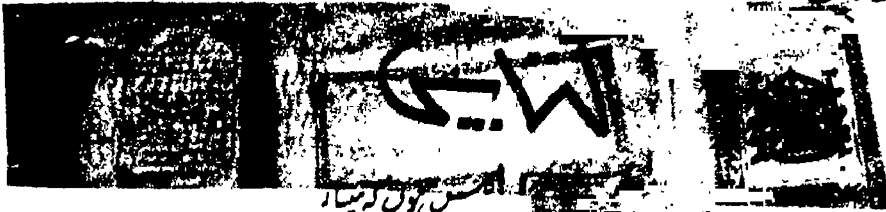
بہ یاد
آنجہانی
منشی
نول کشور

حسین اُردو زباں ہماری
سبھی کی پیاری
سدا سُہاگن، سدا جواں ہے
دلوں کے سنگم کی داستاں ہے
ڈھلے ہیں کوثر سے لفظ و معنی
حسیں تراشیدہ ہر نگینہ
چمک رہا ہے
دمک رہا ہے
پیا ہے گنگ و جمن کا پانی
لطیف و پاکیزہ خوش بیانی
نفیس در نگیں!
یہ پیار کی، پریت کی نشانی
نقیب ہے انقلاب کی بھی
حسین اُردو زباں ہماری
یہ ہندو مسلم کے دل کی دھڑکن
یہ سکھ مسیحی کے من کا آنگن
یہ گنگا جمنی زبان ہندوستاں، یہ اردو
مٹھاس ہندی کی اور نمک فارسی کا گھُٹّی میں اس زباں کی
یہ کوچہ، بازار، خانقاہوں میں صوفیوں کی
پلی، بڑھی ہے
ہوئی تھی دربار تک رسائی
رہی فقیروں کی لاڈلی بھی
عوام کی ہے زبان اُردو!
یہ بزم کی، رزم کی زباں ہے
جہاد کے عزم کی زباں ہے
حیات کے نظم کی زباں ہے

یہ شمع عرفاں
یہ گیان دیپک
ہے مشعل انقلاب اردو!
ہماری اُردو کو ایک محسن کی یاد رہ رہ کے آرہی ہے
جناب منشی نول کشور آنجہانی جن کا عظیم مطبع تھا لکھنؤ میں
پریس نے پَر لگا دیے تھے
اڑان بھرنے لگیں کتابیں
زبور، قرآن، وید، انجیل، جپ جی، دھمپد
جنوں کی، پریوں کی داستاں بھی
قدیم قصے کہانیاں بھی
سبھی اساطیر، دیو مالا
مذاہب ہند، فلسفہ بھی
زراعت و فصل و صنعت و حرفت و تجارت
بیاض، منطق
حدیث، دیواں
فنون، تاریخ، طب، ریاضی
حجاب، درشن
علوم مشرق
حیات موضوع ہر طباعت
حیات ہی مقصد اشاعت
نظر نظر ادبیات عالم
فروغ اردو
جہاں منشی جی کا کرم تھا
حیات لفظوں کو دے گئے وہ
نشاط رشتوں کو دے گئے وہ
تھی ذات ان کی

اشاعت زندگی کا مرکز!
جلائی اردو کی شمع گھر گھر
سلام کرتے ہیں ان کو جاوید اہل اردو!

ایم۔ کوٹھیاوی راہی

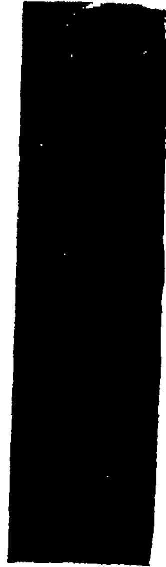


کتابیں
جدھر دیکھیے بس کتابیں
ہر اک مکتبہ
مدرسہ
جامعہ
گھر
سڑک
پٹریاں، سب ہیں آراستہ
سب پھیلی ہوئی
کچھ بڑی
اور کچھ مختصر،
ناولیں
اور الف لیلوی داستانیں

ادب
علم
حکمت
تواریخ
اور کفر و الحاد پر بحث والی کتابیں
رُباعی
غزل
مثنوی
نظم
قطعات
افسانہ
جیوتش
خطوط حسینانِ عالم کی پیاری کتابیں
سبھی سلسلے کی کتابیں
چمکتی
دمکتی
گھنی ظلمتوں کو اُجالوں کی سوغات دیتی ہوئی
احساس ہوں کہ یہ سارا
سب
لٹاتی ہوئی نور کی بارشیں
نئی اور پرانی کتابیں
یہ بس دو برس کی نہیں بات، پوری صدی کا سفر کرنے والی
سجیلی کتابیں
مقدس کلامِ الٰہی کے جگ مگ حروف آج بھی سب کی نظروں میں ہیں
اور یہ بھی
کتابوں کی اگلی صفوں کی کتابیں
دین و ایماں کی یہ جاوداں مشعلیں
جو زمیں تا فلک
تا قیامت فروزاں رہیں گی

کتابوں کی اس بھیڑ میں
آنکھ کھولی ہے میں نے
بڑھا ہوں
جواں بھی اسی بھیڑ ہی میں ہوا ہوں
مروں گا بھی شاید
اسی بھیڑ میں
کس قدر پُرسکوں زندگی ہے کتابوں کی پیاری رفاقت میں اب
کتابیں
یہی جا بہ جا بکھری بکھری کتابیں
جو مرہونِ منت ہیں
اس مردِ درویش کی جو فقط آدمی تھا
سرزمینِ اودھ کا وہ خاموش فرزند
اردو کتابوں کا پہلا نگہباں
وہ فن کار ناشر
طباعت کے فن کو جلا دے گیا ہے
نئی منزلوں کا پتہ دے گیا ہے

منشی نولکشور



ماوا کرشن گوپال مغموم

نول کشور تھا تہذیبِ لکھنؤ کا منار — نولکشور تھا انساں کی عظمتوں کا وقار
نول کشور کے دل میں تھا دردِ انسانی — نول کشور تھا اک شمعِ نورِ ایمانی
نول کشور تھا اک پیکرِ خلوص و وفا — نول کشور تھا آئینہ دارِ صدق و صفا
نول کشور تھا خود دار اور غیرت مند — نول کشور کا ہر عزم تھا اک عزمِ بلند
نول کشور تھا دلدادۂ مشرقیت کا — نول کشور تھا اک نقش آدمیت کا
نول کشور کی ہستی تھی مقتدر ہستی — نول کشور کی ہستی تھی باخبر ہستی
نول کشور تھا حاجت روائے مجبوراں — نول کشور تھا ہر غم نصیب کا پرساں
نول کشور صحافت کا مردِ میداں تھا — نول کشور فضائل کا مہرِ تاباں تھا
نول کشور کا مطبع تھا شہرہ یابِ جہاں — نول کشور سے ناشر کو پائے گا کہاں
نول کشور نے کیں طبع بے شمار کتب — نول کشور کی ہیں اب بھی یادگار کتب
نول کشور کے زورِ قلم کا اک شہکار — نول کشور کا اخبار تھا "اودھ اخبار"
نول کشور تھا جوہر شناس اہلِ ہنر — نول کشور کو تھی جستجوئے اہلِ خبر
نول کشور تھا خدمت گزارِ علم و ادب — نول کشور تھا اک جاں نثارِ علم و ادب
نول کشور کا مطبع تھا گھر ادیبوں کا — نول کشور کا گھر مستقر ادیبوں کا
نول کشور کا ہے فیض علم دانوں پر — نول کشور کے احسان ہیں زبانوں پر
نول کشور نے پھیلائی دینیات کی ضو — نول کشور نے کی تیز شمعِ علم کی لو
نول کشور نے نادر کتب چھپا ڈالیں — نول کشور نے محنت سے سب مہیا کیں
نول کشور نے کھولے کئی کتب خانے — نول کشور تھا اک شمع، لاکھ پروانے
نول کشور تھا وہ علم دوست، علم نواز — نول کشور تھا بیرونِ ملک بھی ممتاز
نول کشور تھا بے مثل محسنِ اردو — نول کشور کی ہے باغِ علم میں خوشبو
نول کشور تھا مجموعۂ صفاتِ جمیل — نول کشور تھا اک عہد ساز مردِ جلیل
نول کشور کو غالب نے بھی سراہا تھا — نول کشور کو سو جان و دل سے چاہا تھا

نول کشور سا انسان مر نہیں سکتا
ہمارے ذہن سے ہرگز اتر نہیں سکتا

حکیم عبدالقوی دریابادی

مطبع نول کشور کا اسلامی لٹریچر

منشی نول کشور نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی (جسے انگریز حکمرانوں نے غدر کا نام دے کر بدنام کرنے کی اپنی والی پوری کوشش کر ڈالی تھی) کے ٹھیک سال بھر بعد لکھنؤ میں مطبع نول کشور قائم کیا جس کی ایک شاخ کانپور میں بھی تھی۔ اس مطبع نے عربی، فارسی اور اردو کی کتابوں جن کا تعلق اس وقت کے تقریباً سب ہی علوم و فنون سے تھا۔ کے چھاپنے میں جو نام پیدا کیا وہ اس وقت ملک میں کمتر کسی اور مطبع کو حاصل ہوا ہوگا۔ مسلمان خاص طور سے منشی جی کے ممنون رہیں گے کہ ان کی بدولت ان کے مذہبی و تہذیبی ذخائر جن کا بڑا حصہ کمیاب قلمی کتب کی شکل میں تھا زیور طبع سے آراستہ ہو کر ضائع ہونے سے بچ گئے اور ان کی بہت سی بیش بہا اور قابل قدر عربی و فارسی کتب کے ترجمہ سے اردو کا دامن مالا مال ہو گیا۔ ان کی مطبوعات کی فہرست پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام اور مسلمان سے تعلق رکھنے والے تقریباً سب ہی علوم پر اس مطبع کے اہتمام سے صدہا کتابیں شائع ہوئیں اور ان کتابوں کی اشاعت کی بدولت اس مطبع کی شہرت ہندوستان تک ہی نہ محدود رہی بلکہ دوسرے مسلم ممالک۔ افغانستان، ایران، عراق، شام، حجاز، اور مصر وغیرہ تک پہونچ گئی۔ مسلمانوں کے یہاں قرآن کریم کو جو انتہائی عظمت و اہمیت حاصل ہے اس کو دنیا جانتی ہے۔ قرآن مجید کے مختلف سائزوں کے نسخے معرّیٰ اور مترجم اس مطبع سے ارزاں قیمت پر شائع ہوئے۔ جن کا سلسلہ ابھی بھی جاری ہے۔ مشہور اردو مترجم مولوی نذیر احمد دہلوی کے ترجمہ والی حمائل کے بھی بعض اڈیشن اسی مطبع سے چھپتے تھے۔ اس مطبع نے ایک کلاں تقطیع کا کلام مجید بہت جلی قلم شائع کیا تھا جس میں دو اردو ترجموں کے ساتھ ایک فارسی ترجمہ بھی تھا۔ اور حاشیہ پر مولوی عبدالحق دہلوی کی مشہور تفسیر، تفسیر حقانی درج تھی۔ ساتھ میں قرآن مجید کے مختلف پارے اور قاعدہ بغدادی بھی بہت سستے داموں والے اسی مطبع سے شائع ہوتے رہے۔ ان کے ساتھ اوراد و وظائف و عملیات کی کتابیں تینوں زبانوں میں اسی مطبع سے تقریباً دو درجن شائع ہوئی ہیں جن میں مجربات دیربی، دلائل الخیرات، جواہر القرآن، اور اداعسانی، کنز الحسین وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ تجوید و قرأت پر چھوٹے لیکن اپنے فن کے جامع رسالے رموز القرآن و زینت القاری وغیرہ اس کے مطبوعات میں شامل ہیں۔ تفسیر قرآن کے موضوع پر اس مطبع نے اردو کی ضخیم ترین تفسیر مواہب الرحمان، بڑی تقطیع کے تیس حصوں میں (ہر حصہ ایک پارہ کی تفسیر پر مشتمل ہے) مولانا امیر علی ملیح آبادی سابق صدر مدرس ندوۃ العلماء لکھنؤ سے مرتب کرا کر شائع کی تھی۔ اگر یہ مطبع اسلامیات پر صرف یہی ایک کتاب شائع کرتا تو اس کے فخر کے لیے کافی تھا۔ یہ تفسیر حد درجہ مستند اور عربی کی مشہور تفاسیر خصوصاً "تفسیر ابن جریر" وغیرہ کے بہترین ملخص کی حیثیت رکھتی ہے۔ شروع میں ایک طویل مقدمہ بھی مترجم کے قلم سے شامل ہے علاوہ ازیں ملا حسین واعظ کاشفی کی مشہور فارسی تفسیر، تفسیر حسینی کا اردو ترجمہ تفسیر قادری کے نام سے خاصا ضخیم دو جلدوں میں اس مطبع نے شائع کیا تھا۔

جس کے متعدد اڈیشن بھی نکلے۔ بعض مختصر تفسیریں، مثلاً تفسیر وادیہ (پارہ ۳۰) تفسیر سورہ یوسف، سفر المبارک (تفسیر سورہ یٰسین و سورہ فلک) بھی اس تفسیر میں شامل ہیں۔ فن حدیث پر مشکوٰۃ المصابیح کا اردو ترجمہ، مختصر تشریحات میں مظاہر حق کے نام سے پانچ ضخیم جلدوں میں اور جامع ترمذی کا ترجمہ مولانا فضل احمد کا کیا ہوا دو حصوں میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ مشارق الانوار کا اردو ترجمہ، تحفۃ الاخیار اور ریاض الاربعین (مجموعہ چہل حدیث) اس کے حدیثی مطبوعات ہیں۔

فقہ اسلامی پر اس مطبع نے متعدد ضخیم اور مشہور کتب کے اردو ترجمے شائع کرائے جن میں دو عین الہدایہ (ہدایہ کا ترجمہ) اور فتاویٰ عالمگیری کے ترجمے، مولانا امیر علی کے قلم سے تھے۔ اول الذکر چار ضخیم جلدوں میں ہے اور ثانی الذکر دس جلدوں میں۔ فتاویٰ ہندیہ کے نام سے موسوم فقہ حنفی کی ایک مشہور و متداول کتاب درمختار کا ترجمہ چار جلدوں میں، غایۃ الاوطار کے نام سے اور فقہ کی ایک نسبتاً مختصر درسی کتاب کنز الدقائق کا ترجمہ اسی مطبع کی طرف سے شائع ہوا۔ علاوہ بریں فقہی مسائل سے متعلق مختلف رسائل بھی اسی مطبع نے شائع کئے ہیں جن کی تعداد کئی درجن کے قریب ہے۔ ان میں "منہاج الفردوس، صحیح کا مستر، مراۃ الصلوٰۃ، احکام العیدین اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے مشہور رسالہ مالا بد منہ کا ترجمہ "کشف الحاجت"، رسالہ تجہیز و تکفین، مفتاح الجنت، کلید باب الحج، زاد المجر ہندی وغیرہ جمعہ و عیدین کے خطبات کے مختلف مجموعے جس میں مجموعہ خطیب علی اور خطبات ماثورہ کے نام اس وقت یاد آ گئے۔

امام غزالی کی مشہور کتاب احیاء علوم الدین جسے اسلامی علوم و فنون خصوصاً تصوف، فقہ و اخلاق کی ایک انسائیکلو پیڈیا کہا جا سکتا ہے کا اردو ترجمہ "مذاق العارفین" کے نام سے متعدد ضخیم جلدوں میں اور اسی کتاب کے فارسی ملخص کیمیائے سعادت جو انھیں امام عالی مقام کے محققانہ قلم سے ہے کا اردو ترجمہ "اکسیر ہدایت" کے نام سے اس قابل ہیں کہ ان کا شمار اس مطبع کے شاہکار کی حیثیت سے کیا جائے۔ حنفی فقہ کے ساتھ شیعی فقہ کی بھی متعدد مشہور کتابوں کے اردو ترجمے بھی اس مطبع نے شائع کیے۔

تصوف و اخلاق سے متعلق اس مطبع کے مطبوعات کی تعداد بھی خاصی ہے۔ نمونہ کے طور پر چند کتابوں کے نام درج ذیل ہیں۔ شیخ سہروردی کی "عوارف المعارف" کا ترجمہ مولوی ابوالحسن صاحب کے قلم سے ہے "منبہات ابن حجر" عربی متن مع اس کے اردو منظوم ترجمہ کے، "اخلاق جلالی" فارسی کا ترجمہ جامع الاخلاق کے نام سے، اور ملا حسین کاشفی کی فارسی درسی کتاب اخلاق محسنی کا اردو ترجمہ "محبوب الاخلاق" کے نام سے۔ "مثنوی مولانا روم کی دو ضخیم شرحیں بحر ابن یوسفی (اردو نظم میں) اور بوستان معرفت شیخ سعدی کی گلستان اور بوستان کے متعدد سائز اور مختلف خطوط کے نسخے جن میں گلستان کا جلی قلم نسخہ مشہور خوش نویس منشی شمس الدین اعجاز رقم کے قلم سے اور گلستان اور بوستان کی متعدد شرحیں اور فرہنگیں بھی شامل ہیں۔ خصوصی شہرت رکھتی ہیں۔

اسلام کے مختلف فرقوں کے عقائد و تاریخ پر مولوی نجم الغنی رام پوری کی محققانہ کتاب مذاہب الاسلام اور تاریخ اسلام کے موضوع پر ترجمہ فتوحات واقدی، صمصام الاسلام، تاریخ مکہ معظمہ، تاریخ مدینہ منورہ، حیات العلماء حدائق الحنفیہ (حنفی علماء کی سوانح حیات) ترجمہ رشحات (صوفیہ کرام کے حالات جو ملا حسین واعظ کاشفی نے فارسی زبان میں لکھے تھے) اور تفریح الاذکیاء (انبیاء کرام کے حالات) تذکرۃ الکرام (مجاہدین اسلام کے سوانح) البدر (غزوۂ بدر کی تاریخ تفصیل اور شہدائے بدر کا تفصیلی ذکر) اور عجائب القصص معروف بہ قصص الانبیاء کے نام سے بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض کتابوں کو بڑی مقبولیت نصیب ہوئی اور ان کے متعدد اڈیشن نکلے۔ میلاد نامے بھی اس مطبع نے بہت سے چھاپے، مثلاً مولود غلام امام شہید، مولود مصطفیٰ، مولود عیدی، خدا

کی رحمت، شمس الضحیٰ، سرور القلوب فی ذکر المحبوب، تاریخ احمدی
اسی طرح واقعہ کربلا سے متعلق شہادت نامے، جنگ نامے نثر و نظم میں۔ مثلاً شہادت نامہ آل حسین (منظوم) ذکر الشہادتین، تقریر الشہادتین، جنگ نامہ کربلا وغیرہ۔

فرقہ امامیہ (شیعہ) کی مذہبی کتابوں میں مجموعہ دعائے جوشن صغیر و کبیر، حلیۃ العرائش، لبعد حمد ہندی، (منظوم) جامع جعفری، تحفۃ العوام) ترجمہ صحیفۂ رضا، نزہت المصائب، چہاردہ مجلس، مقصود نجات، زاد المومنین وغیرہ شامل ہیں۔ مرثیوں میں، مراثی میر انیس اور مراثی مرزا دبیر کے مجموعے بھی اس ذیل میں قابل ذکر ہیں۔

یہ ذکر تو مطبع نول کشور کی ان کتب کا تھا جو اردو میں شائع ہوئیں۔ اس سے کہیں زیادہ تعداد میں اس مطبع سے اسلامی علوم و فنون سے متعلق عربی و فارسی کی کتابیں بڑی اور چھوٹی ہر قسم کی شائع ہو چکی ہیں۔ فارسی میں فن تفسیر میں، تفسیر حسینی، حدیث میں مشکوٰۃ کی شرح۔ اشعۃ اللمعات از شاہ عبدالحق دہلوی، فقہ میں شرح وقایہ و قدوری، کے تراجم، فتوح حرمین از شیخ عبدالقادر جیلانی، مالابد منہ، فتاویٰ برہنہ، شام حق منظوم، تاریخ و سیر میں معارج النبوت اور مدارج النبوت، وقائع حضرت معین الدین اجمیری، خزینۃ الاصفیا، روضۃ الصفا، سات ضخیم حصوں میں، تاریخ طبری وغیرہ۔ اخلاق و تصوف میں شرح تعرف، فتوح الغیب (از شیخ عبدالقادر جیلانی) زبدۃ المقامات، مکتوبات حضرت یحییٰ منیری، لوائح جامی، اخلاق جلالی، اخلاق ناصری، اخلاق محسنی بہارستان جامی، لطائف حیدری، فارسی شرح، مثنوی مولانا روم۔ فرقہ شیعہ کی مذہبی و تاریخی کتب الصافی فی اصول الکافی مخمس، ہفت بند کاشی، حیات القلوب (تین جلدوں میں)، عربی کتب میں فیضی کی بے نقط تفسیر، سواطع الالہام، شاہ ولی اللہ دہلوی کی فتح الخبیر، حدیث میں، صحیح مسلم مع شرح رجال حدیث سے متعلق ابن حجر عسقلانی کی تقریب التہذیب فقہ میں فتح القدیر، شرح وقایہ، کنز الدقائق، اصول فقہ میں توضیح تلویح، اور کتاب الاربعین (امام غزالی) عقائد و کلام میں شرح عقائد نسفی، اور رشیدیہ، اور عربی صرف و نحو کی بہت سی مفید درسی کتب۔

مثلاً شافیہ، شرح ملا جامی، کافیہ تسہیل الکافیہ، میزان الصرف و منشعب شرح فصول اکبری، وغیرہ۔ شیعہ فرقہ کی مذہبی کتب الفروع، الکافی (تین جلدوں میں)۔ النافع یوم المحشر
اگر اسلامیات سے متعلق تینوں زبانوں میں، عربی، فارسی اور اردو میں گراں قدر مطبع کی مطبوعات کی میزان لگائی جائے تو ان کی تعداد غالباً ایک ہزار تک پہونچ جائے گی۔

مطبع نولکشور کا شعبۂ تصنیف و ترجمہ

صنٹ کا بقیہ

میں رکھتے ہوئے وہ ان ادب پاروں کی اہمیت سے بھی واقف تھے جنھیں اہل علم کے سامنے پیش کرنا تھا چنانچہ انھوں نے مذہبی، تاریخی، علمی، درسی، کاروباری اور ادبی کتابوں کا ایک اتنا عظیم الشان ذخیرہ تھوڑے ہی دنوں کے اندر شائع کر دیا۔ جس کے لیے بہت سے اداروں کی ضرورت تھی۔ فارسی و عربی کی نادر قلمی کتابوں کی فراہمی، اردو شاعروں اور ادیبوں کی الماریوں میں مقفل مخطوطات کی تلاش خود ایک بڑا کارنامہ ہے نہ کہ ان کو مناسب انداز میں صحت کے ساتھ شائع کر دیا[1]

[1] اداریہ فروغ اردو نول کشور نمبر صفحہ نمبر ۳۔۴۔

شہنشاہ مرزا



نولکشور پریس

اردو اپنی ابتدا سے لے کر آج تک تمام ہندستانیوں کی زبان رہی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس زبان کی آبیاری میں مسلمانوں نے سب سے زیادہ اپنا خون جگر صرف کیا۔ لیکن اس زبان کا عام مزاج ایسا رہا ہے کہ ہر مذہب اور ہر فرقہ سے تعلق رکھنے والوں نے اسے اپنایا اور اپنے اعتقادات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ اس زبان میں بھی اتنی وسعت تھی کہ اس نے ہر مذہب کے نظریات و اعتقادات کو اپنے میں سمویا اور انھیں عام کرنے میں نمایاں طور پر حصہ لیا۔ شروع شروع میں اس زبان کو مسلمان درویشوں اور صوفیوں نے اپنایا اور ان بزرگوں کی کوششوں سے اسلامی ادبیات کا ایک وافر ذخیرہ اردو میں منتقل ہوا۔

لیکن ایسا نہیں ہے کہ اردو نے خود کو محض اسلامی نظریات تک ہی محدود کر لیا ہو، بلکہ ہندو مذہب کے مختلف مکاتب فکر سے متعلق کتب کا ایک بڑا ذخیرہ بھی اردو میں موجود ہے۔ بدھ مت اور جین مت کے اعتقاد سے متعلق کتنی ہی کتابیں اردو میں لکھی گئیں۔ آریہ سماجیوں نے تو اس زبان کو اپنی ترویج کے لیے سب سے زیادہ استعمال کیا۔ سکھوں کی مذہبی کتب کا کافی ذخیرہ اردو میں موجود ہے۔ انگریزوں کے قدم جمنے کے ساتھ ہی عیسائی مشنریوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا اور انھوں نے بھی اس زبان کو اپنے عقاید کی ترویج کے لیے استعمال کیا۔ یوں اردو زبان کا ایک سیکولر مزاج بنتا چلا گیا۔

اردو کے اس مزاج کو سب سے زیادہ بہتر طور پر سمجھنے والا ایک ایسا شخص بھی پیدا ہوا جس کے ذمہ وقت نے اردو کی خدمت کا کام تاریخ کی ایسی نازک گھڑی میں سپرد کیا جب ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے بعد ملک کا شیرازہ تقریباً منتشر ہو چکا تھا اور اردو پر بھی وہ گھڑی بہت سخت تھی۔

اس اہم شخصیت اور اردو کے بے مثل خادم کا نام منشی نول کشور ہے۔ کم عمری ہی میں انھیں لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا اور آگرہ کے "سفیر" نامی اخبار میں ان کے مضامین شائع بھی ہونے لگے تھے۔ بعد میں وہ لاہور چلے گئے، اور وہاں کوہ نور پریس سے وابستہ ہوئے۔ اس پریس کے مالک منشی ہرسکھ رائے کوہ نور نام کا ایک اخبار بھی نکالتے تھے۔ منشی نول کشور نے اس پریس میں چار سال ملازمت کی اور اس مختصر سے عرصے ہی میں انھوں نے طباعت اور اشاعت سے متعلق گہرا تجربہ حاصل کر لیا تبھی اُن کے دل میں یہ خیال آیا کہ وہ اپنا ذاتی پریس قائم کر کے خود ایک اخبار کیوں نہ نکالیں؟

۱۸۵۰ء کے آس پاس وہ لکھنؤ آ گئے۔ لکھنؤ میں اب نوابین اودھ کی عملداری ختم ہو چکی تھی اور انگریزوں کا تسلط قائم ہو چکا تھا۔ نواب واجد علی شاہ کے زوال کے ساتھ ہی اودھ کا تہذیبی زوال بھی شروع ہو گیا تھا۔ ایسے زوال پذیر معاشرہ میں منشی نول کشور نے اردو زبان و صحافت کی ترقی کے خواب دیکھے۔ انھوں نے نول کشور پریس کی بنیاد ڈال کر "اودھ اخبار" جاری کیا۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اردو زبان کی ترقی اور فروغ میں اس اخبار کا بڑا ہاتھ ہے اور تاریخ ادب میں اس کی شاندار خدمات ہمیشہ سنہرے حروف سے لکھی جائیں گی۔

اودھ اخبار اور نول کشور پریس نے بہت جلد ادبی اور صحافتی حلقوں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی۔ کہا جاتا ہے کہ اس اخبار کے لیے خبریں جمع کرنے کی غرض سے منشی جی نے اپنے نمائندے سارے ملک

پھیلا دیے تھے۔ اس زمانے میں یہ مثل مشہور تھی کہ "صوبوں اور ریاستوں میں حکومت کے نمائندے ہوتے ہیں یا نول کشور کے۔" اسی زمانے میں منشی نول کشور کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ فارسی اور سنسکرت کے جو نادر قلمی نسخے اور مخطوطے تباہ ہو رہے ہیں انھیں اردو میں منتقل کر کے کیوں نہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا جائے، یہیں سے سنسکرت اور فارسی کی نادر کتابوں کی اردو میں منتقلی کا وہ سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کی بدولت اردو ادب کی تاریخ میں منشی نول کشور کا نام ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا۔

منشی نول کشور پریس کے بارے میں عام طور پر لوگوں کو یہی معلوم ہے کہ منشی نول کشور کی ذاتی دلچسپی کی بنا پر اس پریس سے اسلامی مذہبیات سے متعلق بے حساب کتابیں، قرآن اور احادیث وغیرہ کی اردو میں شائع ہوئیں۔ لیکن اردو میں بڑی تعداد میں ہندو مذہب اور اس سے متعلق مختلف مکاتب فکر کی کتابیں، سکھوں، عیسائیوں اور بدھ مذہب سے متعلق مذہبی کتابیں بھی نول کشور پریس سے شائع ہوئیں۔

بھگوت گیتا، رامائن، مہابھارت اور پرانوں نیز ویدوں کے نہ جانے کتنے ترجمے منشی نول کشور پریس سے شائع ہوئے۔ چند اہم کتابوں کا ذکر کرنا یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ منشی نول کشور نے اردو میں دیگر مذاہب کا علمی ذخیرہ بھی کتنی محنت اور لگن سے منتقل کروایا۔

(۱) بھگوت گیتا مع اردو ترجمہ - یہ ترجمہ منشی شیام سندر لال نے کیا تھا اور نول کشور پریس سے یہ کتاب ۱۸۸۴ء میں شائع ہوئی تھی اس کتاب کی خصوصیت یہ تھی کہ اردو میں پہلی بار بھگوت گیتا کا متن مع شرح اور ترجمے کے شائع کیا گیا تھا اور اردو داں طبقہ سے روشناس کرانے کے سلسلے میں یہ کتاب بہت مشہور رہی۔

(۲) شریمد بھگوت گیتا - یہ ترجمہ پنڈت پربھو دیال مصر عاشق کا کیا ہوا تھا۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں گیتا کا منظوم ترجمہ پیش کیا گیا تھا اور زبان نہایت صاف اور شستہ تھی۔

(۳) مہابھارت منظوم - ۱۸۹۳ء میں شائع ہوئی اس کا ترجمہ منشی طوطا رام شایان کیا تھا جو اس زمانے کے مشہور شاعر تھے۔ اس کتاب میں دس بیتیں تھیں اور اس کے ذریعہ منشی طوطا رام نے فارسی میں لکھی گئی مہابھارت کو اردو میں منتقل کیا تھا۔

(۴) رامائن بالمیکی - اس کے مترجم پرمیشوری دیال تھے۔ یہ کتاب نثر میں تھی اور اس میں، کا مکمل ترجمہ پیش کیا گیا تھا۔

(۵) رامائن منظوم - اس کے شاعر منشی شنکر دیال فرحت تھے۔ اگرچہ اس کتاب میں مصنف رامائن کے چند اجزا کا ہی ترجمہ پیش کیا ہے مگر اردو میں رامائن کا قدیم ترجمہ ہے۔ یہ کتاب ۱۸۸۶ء میں شائع ہوئی تھی۔

(۶) رامائن بہار - یہ ترجمہ بانکے بہاری لال بہار کا۔ جو نول کشور پریس سے ۱۸۸۶ء شائع ہوا۔ اس کتاب میں رامائن کا منظوم خلاصہ پیش کیا گیا ہے

(۷) رامائن خوشتر - خوشتر کی رامائن اردو میں سب سے زیادہ مقبول ہوئی ہے اور اس کے متعدد ایڈیشن نول کشور پریس سے شائع ہوئے۔ اس کا آخری ایڈیشن ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا تھا۔

(۸) گنیش پوران منظوم - یہ ترجمہ بھی منشی شنکر دیال فرحت کا کیا ہوا ہے اور اس کتاب میں فرحت نے زبان کی سلاست اور روانی کا خاص خیال رکھا ہے۔ اپنے دور میں یہ کتاب بھی بہت مقبول ہوئی۔

(۹) منوسمرتی - یہ ترجمہ پنڈت سوامی دیال نے کیا تھا اور منشی نول کشور پریس سے یہ کتاب ۱۸۸۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں ہندوؤں کے مستند دھرم شاستر کا آسان زبان ترجمہ پیش کیا گیا تھا۔

مندرجہ بالا کتب کے علاوہ شری مدبھاگوت مترجم مسو دیال کالستھ، سری مدبھاگوت منظوم مترجم منشی سردار سنگھ

گیتا مہاتم منظوم مترجم منشی رام سہائے تمنا، پوتھی گیان پرکاش مولفہ منشی گلزاری لال، پوتھی موکش گیان مولفہ جے گوپال وغیرہ وغیرہ بہت سی کتابیں اہل ہنود سے متعلق بہ کثرت شائع ہوئیں۔ اس طرح کی کتب کی طویل فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ منشی نول کشور نے چند برسوں کی محنت ہی سے اردو میں ہندو مذہب کے علم و فلسفہ کا وافر ذخیرہ یکجا کر دیا۔

منشی نول کشور نے آریہ سماجیوں اور برہمو سماج کی کتابیں بھی بہ کثرت اردو میں شائع کیں۔ آریہ سماج سے متعلق جو کتابیں نول کشور پریس سے شائع ہو کر بہت مقبول ہوئیں وہ ہیں آئینہ مذہب ہنود مصنفہ جے دیال سنگھ، جو ۱۸۸۷ء میں شائع ہوئی اور دوسری ویدک دھرم پرچار جس کے مصنف رائے ٹھاکر دت ہیں۔

برہمو سماجیوں کی بہت سی کتابیں بھی نول کشور پریس سے شائع ہوئیں۔ ان میں کتاب "طریقت عبادت مجلس براہم سماج" اور "کلمات الدین" مشہور ہیں۔ ان میں برہمو سماج کے اصولوں اور طرز عبادت کی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی تھی۔

سکھوں کی مذہبی کتب بھی نول کشور پریس سے شائع ہوئیں ان میں گرو ارجن مہاراج کی سوانح عمری اور پوتھی سکھ منی سٹیک مشہور ہیں۔
تھیوسوفیکل سوسائٹی والوں کی کتابیں بھی اس پریس سے شائع ہوئی ہیں جن میں مسز اینی بیسنٹ کی مشہور کتاب "تھیوسوفی کیا ہے" بہت مقبول ہوئی۔ عیسائیوں کا مذہبی لٹریچر بھی نول کشور پریس سے بہ کثرت شائع ہوا۔ جس میں تحقیق بائبل، عہد جدید کی کتابیں مصنفہ پادری ایچ جی گرے اور حل مشکلات، مصنفہ جیمس آر مشہور ہیں۔

اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں منشی نول کشور نے جو خدمات سرانجام دی ہیں، انھیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا مگر ان کا یہ کارنامہ شاید سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ انھوں نے اسلامی لٹریچر کی اشاعت کے ساتھ ہی ساتھ دیگر مذاہب کی کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ بھی اردو میں منتقل کروا دیا جس کے نتیجے میں اردو زبان مذہبی علوم کے سلسلے میں بھی مالا مال ہو گئی۔



منشی جی کا وہ خاص کام جس کی وجہ سے ہم آج بھی انھیں یاد کر رہے ہیں، یہ نہیں کہ انھوں نے اودھ اخبار جاری کیا تھا۔ بلکہ وہ ہمیشہ عربی، فارسی، سنسکرت، اردو اور ہندی کے مسودات کی تلاش میں رہتے تھے اور ان میں سے بیشتر کو نولکشور پریس کے ذریعہ شائع کیا۔

—— ڈاکٹر بی۔ گوپالا ریڈی
(سابق گورنر اتر پردیش)

ڈاکٹر چودھری ثروت علی

لغت نویسی ـــــ اور



منشی نول کشور نے اپنے مشہور زمانہ پریس کے ذریعہ عربی، فارسی اور اردو زبانوں کے ادبیات کے ارتقار کے سلسلے میں جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں انھیں تاریخ کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔ ان کے ادارہ نے بیک وقت کئی بڑی اکاڈمیوں سے زیادہ کتابیں شائع کیں بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ تنہا ان کے ادارہ نے ان زبانوں کی جتنی تصنیفات و تالیفات اور تراجم شائع کر کے جو خدمت انجام دی، آج کی متمدن دنیا کے گوناں گوں وسائل کے باوجود بہت سے ادارے مل کر بھی اتنا کام نہیں کر سکتے۔ مطبع نول کشور نے عربی فارسی اور اردو لغات نویسی کے ارتقار میں جو اہم رول ادا کیا۔ سطور ذیل میں اس کا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اگر یہ لغات جو اس مطبع کے ذریعہ مرتب ہوئے یا صحت کے ساتھ شائع ہوئے، نہ شائع ہوئے ہوتے تو آج ہم اپنی زبانوں کی ترقی کے سلسلہ میں کتنے پیچھے رہ گئے ہوتے۔ عربی اور فارسی زبانیں تو ہندستان کے باہر دوسر ممالک میں بھی رائج ہیں اور ان کے ارتقار کا کام کرنے والے بہت سے ممالک ہیں لیکن ہندستان میں ان زبانوں کی اہم لغات شائع کر کے منشی جی نے نہ صرف بے مثل خدمت انجام دی بلکہ دوسروں کو بھی راستہ دکھایا اور بعض ایسے لغات بھی شائع کیے جو انھیں کے ادارہ کی طرف سے مدوّن کیے گئے تھے۔ جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے، بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اگر مطبع نول کشور نہ ہوتا تو آج اردو زبان کا ادب ارتقار کی منزلیں اتنی جلد نہ طے کر پاتا۔

مطبع نول کشور کے شائع شدہ یا مدوّن شدہ چند اہم لغا کا ذکر سطور ذیل میں کیا جا رہا ہے جن کو بے انتہا شہرت اور مقبو حاصل ہوئی اور ان میں سے بعض لغات تو ایسے ہیں جنھیں ایرا عرب میں بھی قبول عام حاصل ہے اور ان کی اہمیت کے اہل ز بھی معترف ہیں :-

۱۔ اساس البلاغت : عربی اصطلاحات و محاورات مشتمل یہ لغت ابی القاسم محمود بن عمر زمخشری کا مرتب کردہ ہے سند کے طور پر عربی اشعار سے حوالے دیے گئے ہیں۔ مولوی عا نے ایک قدیم مصری نسخہ سے صحت کی اور مطبع نول کشور نے شا یہ لغت ۱۲ × ۸ سائز کے ۸۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اور عربی کے لغات میں شمار کیا جاتا ہے۔

۲۔ افصح اللغات :- عربی، فارسی اور ترکی الفاظ پر یہ لغت راجہ راجیشور راؤ اصغر کا مرتب کردہ ہے جس میں ا معانی اردو زبان میں درج کیے گئے ہیں۔ صحت تلفظ کے۔ کا استعمال کیا گیا ہے۔ مؤلف حیدرآباد کے ایک ذی علم گھ کے فرد اور ممتاز زبان داں تھے۔ یہ لغت ۵ × ۶½ سائز صفحات پر مشتمل ہے۔

۳۔ برھان قاطع :- مولوی محمد حسین ابن التبریزی تخلّ برہان کا یہ مایۂ ناز لغت انیس ہزار ایک سو ستتر فارسی، پہ دری، یونانی، سریانی، رومی، ژند و پاژند نیز عربی کے

الفاظ پر مشتمل ہے۔ مؤلف سلطان عبداللہ قطب شاہ بن قطب شاہ بادشاہ ہند کا ہم عصر تھا جس نے ۱۰۶۲ھ میں یہ لغت مرتب و مدون کیا تھا۔ "کتاب ناقع برہان قاطع" سے مادۂ تاریخ نکلتا ہے۔ اسی لغت کے سلسلہ میں مرزا غالب کے زمانے میں بڑی علمی و ادبی بحثیں رہیں۔ بہرحال اس لغت کا بہت ہی مستند لغات میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ ۱۲×۸ سائز کے ۱۱۵۴ صفحات پر متعدد بار شائع ہو چکا ہے۔

۴۔ بہار عجم : فارسی زبان کے مستند عالم منشی ٹیک چند بہار کی تالیف ہے جو سراج الدین علی خان آرزو جیسے یگانۂ روزگار عالم کے شاگرد تھے۔ ۱۱۵۲ھ میں یہ لغت مدون کیا گیا جس میں اساتذہ کے کلام سے سندیں پیش کی گئی ہیں۔ مصنف کے قلمی نسخہ سے اسے مطبع نولکشور نے شائع کیا۔ مولوی ہادی علی اشک نے اس کی صحت کی۔ یہ لغت ۱۱×۱۴ سائز کے ۱۲۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

اس لغت کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ایران میں بھی اسے شائع کیا گیا ہے اور اسے فارسی زبان کے مستند ترین لغات میں شمار کیا جاتا ہے۔ اہل زبان بھی اس لغت کی سند اور اہمیت کے معترف ہیں۔ بہار کثیر التصانیف ادیب تھے جن کی متعدد تصانیف علمی دنیا سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ بہار بوستاں اور بہار عجم ان کے دو لافانی شاہکار ہیں۔

۵۔ جامع اللغات : عربی، فارسی اور ترکی کے مستعمل الفاظ و محاورات کے اردو مترادفات پر مشتمل یہ لغت اس لحاظ سے مستند کہا جاتا ہے کہ اس میں سند کے طور پر اساتذہ کے کلام سے مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ نیز لغت کا ایک حصہ طبی محاورات و اصطلاحات پر مشتمل ہے۔ مولوی غلام سرور لاہوری نے مطبع کی فرمائش پر یہ لغت تالیف کیا تھا۔ یہ دو جلدوں کے ۱۳۹۸ صفحات پر مشتمل ہے اور سائز ۱۴×۱۰ ہے۔

۶۔ ذخیرۃ اللغات : عام طور پر یہ "لغت سروری" کے نام سے مشہور ہے۔ مفتی غلام سرور لاہوری اس کے مولف ہیں۔ ۴×۶½ سائز کے ۸۰۰ صفحات پر یہ لغت شائع ہوا۔ یہ بھی عربی، فارسی اور ترکی الفاظ و محاورات اور اصطلاحات پر مشتمل ہے۔

اس لغت میں یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ ہر لفظ کی ردیف آخری حرف پر ہے۔ شاعروں کے لیے قوافی کی تلاش کے سلسلے میں یہ لغت معاون ہوتا ہے۔

۷۔ شرح نصاب الصبیان : ابو نصر فراہی معروف بہ دشت بیاضی فارسی کا مشہور اہل قلم ہے۔ جس نے نظم میں یہ کتاب تصنیف کی تھی۔ اسی کی شرح مولوی کریم الدین دشت بیاضی نے فارسی ہی میں لکھی۔ کتاب علم عروض کی اصطلاحات نیز عربی فارسی اور ترکی الفاظ کے ایک جامع لغت کی حیثیت رکھتی ہے جو ۱۱×۷½ سائز کے ۱۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

۸۔ صراح مع قراح : عربی زبان کا مستند ترین لغت ہے جسے ابو الفضل محمد بن عمر بن خالد معروف بہ جمال القرشی نے مرتب کیا تھا۔ اس پر حواشی و فرہنگ الفاظ "قراح" کے نام سے مولوی حکیم عبدالمجید خاں مرحوم نے مرتب کیے اور اصل مسودہ "صراح" کی صحت کی۔ معانی اردو میں ہیں۔ یہ حکیم صاحب کی محنت ہے۔ الفاظ کے ساتھ اس کے ابواب بھی درج لغت ہیں۔ ۱۱×۷½ سائز کے ۱۰۰۴ صفحات پر مشتمل یہ کئی بار شائع ہو کر ہندوستان کے شائقین عربی کے استفادہ کا باعث بنا۔

۹۔ غیاث اللغات مع چراغ ہدایت : مولوی غیاث الدین رامپوری کا یہ لغت فارسی کے مستند ترین لغات میں شمار کیا جاتا ہے۔ کتاب کے حاشیہ پر "چراغ ہدایت" مولفہ سراج الدین علی خاں آرزو بھی شامل ہے۔ لغت میں کرۂ زمین کا مکمل نقشہ بھی ہے۔ سند میں اشعار اساتذہ درج ہیں اور جو لغت جس کتاب سے لیا گیا ہے اس کا حوالہ موجود ہے۔ غیاث اللغات ۱۲۴۲ھ میں مرتب کی گئی تھی اور ۱۳×۱۰½ سائز کے ۵۳۰ صفحات پر شائع ہوئی تھی۔ نول کشور پریس سے جب اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہونے کے بعد نئے ایڈیشن نہیں نکلے تو دوسرے اداروں نے بھی اسے شائع کیا کیونکہ یہ ہندوستان، پاکستان، افغانستان، تاشقند اور ایران وغیرہ میں انتہائی مقبول ہے۔

۱۰۔ فرہنگ آنند راج : مہاراجہ وجیا نگرم کے میر منشی محمد بادشاہ

نے مہاراجہ کی فرمائش پر یہ مستند و جامع لغت تیار کیا تھا۔ اصل لغت کے مترادفات بھی فارسی میں دیے گئے ہیں۔ لغت میں عروض کی اصطلاحات، فارسی قواعد، صنائع و بدائع مع سند و حوالہ حروف تہجی کے لحاظ سے درج ہیں۔ ۱۳۰۶ھ میں یہ لغت مدوّن اور شائع ہوا تھا جو بڑے سائز کے تین ہزار ایک سو آٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ بعد میں فارسی مترادفات کا ترجمہ ڈاکٹر انوار الحسن صدر شعبۂ علوم مشرقیہ لکھنؤ یونیورسٹی نے کیا۔ یہ ترجمہ راجہ رام کمار بھارگو صاحب وارث نول کشور پریس کے زمانے میں چھپنا شروع ہوا لیکن اس کی طباعت مکمل نہ ہو سکی۔

۱۱۔ فرہنگِ جہانگیری: یہ لغت ابن فخر الدین حسن معروف بہ عضد الدولہ نے شہنشاہ اکبر کے عہد سلطنت میں مرتب کرنا شروع کیا تھا اور ۱۰۱۷ھ ہجری میں بہ عہد جہانگیر اس کی تکمیل ہوئی۔ اسی مناسبت سے نام فرہنگِ جہانگیری رکھا گیا۔ ۱۰×۶ ۱/۲ سائز کے ۸۶۰ صفحات پر مشتمل یہ لغت شائع بھی ہوا۔ یہ بھی فارسی کے مستند ترین لغات میں شمار کیا جاتا ہے۔

۱۲۔ قاموس: عربی زبان کا سب سے زیادہ مستند لغت ہے جس کی جامعیت اور تحقیق ضرب المثل بن چکی ہے جسے علامہ مجد الدین ابو الطاہر محمد بن یعقوب بن محمد بن ابراہیم شیرازی ثم فیروز آبادی نے مرتب کیا تھا۔ یہ اپنے زمانے کے مستند عالم اور ماہر لسانیات تھے اور ان کا سلسلۂ نسب یگانۂ روزگار عالم شیخ ابی اسحٰق شیرازی سے ملتا ہے۔ فاضل مؤلف کا سنِ ولادت ۷۲۹ھ ہے گازرون میں پیدا ہوئے اور وہیں علم فقہ و حدیث و دیگر علوم متداولہ حاصل کیے۔ پھر شام و قاہرہ گئے اور وہاں سے ہندستان آئے۔ ان کے علم و فضل کی وجہ سے ہر جگہ ان کی قدر و منزلت کی جاتی تھی۔ امرائے وقت بھی ان کے سامنے آنکھیں بچھاتے تھے۔ ان کی تصانیف میں فتح الباری شرح بخاری اور تسہیل الوصول الی احادیث الزائدۃ علی جامع الاصول نیز عربی کا یہ بے مثل لغت قاموس خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ۲۰ شوال ۸۱۷ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

قاموس کا اولین ایڈیشن قاہرہ میں شائع ہوا تھا۔ منشی نول کشور نے دوسرا ایڈیشن اپنے پریس سے شائع کیا جو ۱۳×۹ سائز کے ۱۲۸۴ صفحات اور دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ نول کشور پریس سے "قاموس" کی اشاعت پر دار العلوم دیوبند کی مجلس میں شکریہ کی ایک تجویز بھی منظور کی گئی کیونکہ یہ لغت ہندستان کے عربی مدارس کے لیے بے حد مفید اور ضروری تھا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی دار العلوم دیوبند کو موصول ہونے والے عطیات کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"انتہا یہ ہے کہ علاوہ مسلمانوں کے اس سلسلہ میں غیر فراخ دلی کا ثبوت منشی نول کشور نے پیش کیا۔" ۱۲۸۰ھ کی روئداد مجلس شوریٰ میں تحریر ہے کہ "امداد کتب کی نسبت جو سال گذشتہ لکھا گیا تھا، بہت سے اہل ہمت نے اس طرف توجہ فرمائی اور بہ ارسال کتب قیمتی و کار آمد مدرسہ کی امداد فرمائی۔ بالخصوص منشی نول کشور صاحب مالک چھاپہ خانہ اعظم مقام لکھنؤ اس امر میں زیادہ تر قابل مشکوری ہیں کہ باوجود بُعد مسافت بہت سی کتب کار آمد سے معاونت کی۔"[1]

مولانا موصوف نے ۱۲۸۹ھ کی روئداد میں از منشی نول کشور کے عطیہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ارباب مشورہ مدرسہ نہایت شکر گزار ہیں جناب منشی نول کشور صاحب مالک مطبع اعظم لکھنؤ کے جنھوں نے مثل سابق کمال دریا دلی کام فرمایا اور چند کتب مفید سے امداد مدرسہ میں بہت فرمائی۔ فہرست ان کی ضمیمہ نمبر (۴) مندرج ہے۔ ان میں سے خاص کر "نسخۂ قاموس" کہ کتب لغت میں بے نظیر ہے اور منشی صاحب نے خاص اپنے مطبع میں اس کتاب کو نہایت خوبی اور صحت سے اس سال میں طبع فرمایا ہے، لائق بیان ہے۔ مدرسہ میں اس سے پہلے کوئی اس کتاب کا نہ تھا۔ یہ کتاب ایسی محتاج الیہ ہے کہ ہر مدرس اور طالب علم کو اس کی حاجت رہتی ہے۔"[2]

آگے چل کر مولانا موصوف رقمطراز ہیں:

"گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ مدت تک دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ و طلبہ اپنی دینی و علمی ضرورتوں کو اسی ایک غیر تعلیم کے کتابی عطیہ کی مدد سے پوری کرتے رہے۔ قرآن سمجھتے رہے، حدیثوں کے لغوی مشکلات کو حل کرتے رہے۔ اور یہ تھا، دو رفاہی کا وہ دارالعلوم جو سرزمین ہند میں ہندوستان کے خاص حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے قائم کیا گیا تھا۔"

۱۳۔ کشف اللغات: عربی فارسی، ترکی اور پہلوی الفاظ و اصطلاحات پر مشتمل یہ لغت مولوی عبدالرحیم ابن احمد کا مرتب کردہ ہے جو ۱۲×۸ سائز کے ۱۰۲۴ صفحات پر شائع ہوا۔

۱۴۔ کریم اللغات: مولوی کریم الدین صاحب ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس لاہور کا مرتبہ یہ لغت عربی و فارسی کے مستعملہ و مروجہ الفاظ پر مشتمل ہے۔ بعد کے اڈیشنوں میں الفاظ جدیدہ کا اضافہ بھی کیا گیا۔

۱۵۔ لغات کشوری: مولوی تصدق حسین صاحب کا مرتب کردہ فارسی زبان کا یہ پہلا لغت ہے جو اپنی ندرت، جامعیت اور طرز بیان میں بھی ایک خصوصیت کا حامل ہے۔ یہ لغت منشی نول کشور کی خاص فرمائش پر مرتب کیا گیا اور انھیں کے نام سے موسوم ہو کر شائع ہوا۔ الفاظ کے معانی اردو میں دیئے گئے ہیں۔ یہ ۱۲×۸ سائز کے ۵۹۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس لغت کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اب تک اس کے ۳۲ اڈیشن نکل چکے ہیں۔ بعد کے اڈیشنوں میں لغات جدیدہ کا اضافہ ہوا ہے۔ اس وقت بھی اس کا ایک نیا اڈیشن زیر طبع ہے جس کی صحت اور لغات جدیدہ کا اضافہ ڈاکٹر انوار الحسن صاحب صدر شعبۂ علوم مشرقیہ لکھنؤ یونیورسٹی نے کیا ہے۔ یہ نول کشور پریس کے تیج کمار بک ڈپو سے عنقریب شائع ہونے والا ہے۔

۱۶۔ لطائف اللغات: عام طور پر یہ لغت فرہنگ لغات مثنوی مولانا روم کے نام سے معروف ہے جسے مشہور عالم مولوی عبداللطیف گجراتی نے مرتب کیا تھا۔ لغات مثنوی کی تشریح میں اسے بے مثل سمجھا جاتا ہے۔ فاضل مولف نے بڑی دقت نظر سے اسے مرتب کیا تھا۔

۱۷۔ مجمع بحار الانوار فی غرائب التنزیل و لطائف الاخبار: چار حصوں پر مشتمل یہ لغت آیات قرآنی و احادیث نبوی کے الفاظ کی تشریحات کے لیے مخصوص ہے جسے مولانا شیخ محمد طاہر شاگرد شیخ علی المتقی بن حسام نے ۹۰۶ھ ہجری میں مرتب کیا اور مولوی محمد مظہر نے حواشی شامل کیے۔ یہ ۱۲×۸ سائز کے ۱۹۷۲ صفحات پر شائع ہوا۔ قرآن و حدیث کی تشریحات میں یہ لغت بے حد معاون ہے۔

۱۸۔ منتخب اللغات شاہجہانی: مولوی عبدالرشید الحسینی المدنی اس لغت کے مولف ہیں جنھوں نے فارسی زبان میں یہ مستند لغت نہایت آسان طرز پر مرتب کیا۔ اس لغت کی تالیف عہد شاہ جہانی میں ہوئی تھی۔

۱۹۔ موید الفضلا: عربی فارسی الفاظ پر مشتمل یہ لغت اسناد و حوالہ جات اشعار کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ آخر میں اعداد و حساب و قواعد نیز فارسی کے بعض تصرفات بیان کیے گئے ہیں۔ اہل علم کے لیے اسے ایک گراں قدر تحفہ کہا جا سکتا ہے جو ۱۱ × ۷½ سائز کے ۸۷۲ صفحات پر شائع ہوا۔

۲۰۔ منتہی الارب: عربی الفاظ کے مستند معانی فارسی میں دیے گئے ہیں اور دراصل "قاموس" کا فارسی ترجمہ ہے۔ وہ الفاظ جو قاموس میں نہیں ہیں۔ اس لغت میں مستند حوالوں کے ساتھ شامل کیے گئے ہیں۔ اس لغت کے مولف مولوی عبدالرحیم بن مولوی عبدالکریم صفی پوری ہیں۔ لغت کی ترتیب آسان اور عام فہم ہے۔ مثلاً ابواب ثلاثی مجرد کا تعین صرف ایک حرکت سے کیا گیا ہے۔ اسماء کا ذکر مقدم ہے افعال اور مصادر نیز اسم مصدر و صفت کو فعل کے ذیل میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ لغت ۱۱×۷½ سائز کے دو ہزار چھیاسی صفحات پر شائع ہوا۔ یہ لغت بھی عربی کے مستند لغات میں شمار کیا جاتا ہے۔

۲۱۔ مصطلحات الشعراء: مشہور ادیب وارستہ کا تالیف کیا ہوا یہ لغت فارسی لغات، اصطلاحات اور محاورات پر

مشتمل ہے۔ سند میں اساتذہ کے اشعار پیش کیے گئے ہیں۔ مشکل لغات پر جابجا حواشی بھی دیے گئے ہیں نیز حاشیہ کتاب پر بہار عجم کا خلاصہ مندرج ہے۔

۲۲۔ نصاب مع احسن العجائب : ابتدا میں نصاب الصبیان ہے۔ بعدہ شعر نصاب میں جو لغات ہیں ان کی تشریحات و معانی اردو میں دیے گئے ہیں۔

۲۳۔ منجم اللغات : راجہ راجیشور راؤ اصغر کا مرتبہ یہ لغت فارسی و عربی الفاظ کے اردو مترادفات پر مشتمل ہے۔ عموماً متعلقہ لغات اس میں یکجا مل جاتے ہیں۔ اس لغت کا ایک اڈیشن ایسا بھی شائع ہوا تھا جس میں اردو لفظ کے معنی فارسی و عربی کے علاوہ انگریزی میں بھی دیے گئے ہیں۔

۲۴۔ نفائس اللغات : مولوی اوحدالدین بلگرامی نے محمد علی شاہ بادشاہ اودھ کے عہد حکومت میں یہ لغت مرتب کیا تھا۔ یہ لغت فارسی، عربی، ترکی و ہندی الفاظ پر مشتمل ہے اور اس میں اساتذہ کے اشعار بطور سند پیش کیے گئے ہیں۔

۲۵۔ فصیح اللغات : یہ دراصل غیاث اللغات کا اردو ترجمہ ہے۔ صوبہ مالوہ کے ایک ذی علم شخص مولوی نصیرالدین احمد خاں نے یہ لغت تیار کیا تھا۔

۲۶۔ ہفت قلزم : فارسی زبان کا یہ نادر لغت غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ کے حکم سے مولوی قبول محمد صاحب نے مرتب کیا تھا۔ یہ لغت سات جلدوں میں ہے۔ ہر جلد ایک قلزم قرار دی گئی ہے۔ چھ جلدوں میں بائیس ہزار سات سو لغات و اصطلاحات درج ہیں اور ساتویں جلد بیان حروف تہجی، زبان پارسی، معنی حروف تہجی، رسم خط، بیان شناخت ہمزہ و الف معروف مفردات و مرکبات، اقسام نظم و نثر، صنائع و بدائع، علم عروض، بحور و قوافی وغیرہ پر مشتمل ہے۔ ۱۲۲۹ھ میں اس کی تدوین کا کام شروع ہوا اور ذی الحجہ ۱۲۳۰ھ میں اس کی تکمیل ہوئی۔ اس لغت کا پہلا اڈیشن مطبع سلطانی لکھنؤ سے ۱۲۴۷ھ میں شائع ہوا۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں یہ نسخہ محفوظ تھا جس کو منشی نول کشور صاحب نے حاصل کر کے ۱۳×۱۰ سائز کے ۱۱۸۸ صفحات پر شائع کیا۔

سطور بالا میں صرف اہم اور قابل ذکر لغات کا اجمالی تعارف پیش کیا گیا ہے جو نول کشور پریس سے شائع ہوئے اور ان میں سے متعدد ایسے لغات ہیں جن کے بکثرت اڈیشن شائع ہوئے اور آج تک شائع ہو رہے ہیں۔ ان کے علاوہ اس ادارہ نے مفردات طب کے بکثرت ایسے لغات بھی شائع کیے جو صرف طب کے لیے مخصوص ہیں۔ ان میں اختیارات بدیعی (فارسی)، بستان المفردات (اردو)، تحقیقات نادرہ طبی (اردو)، مخزن الادویہ مصنفہ حکیم محمد حسین عقیلی، اردو ترجمہ از حکیم مولوی نور کریم صاحب دریابادی، مخزن الادویہ (فارسی) مع حاشیہ تحفۃ المومنین از سلیم محمد مومن، مخزن المفردات (اردو)، مجموعہ الفاظ الادویہ (فارسی) از حکیم نورالدین شیرازی، میزان الادویہ (فارسی) از حکیم تابع، فرہنگ نصیریہ (فارسی)، انیس المعالجین (فارسی) از عین الملک شیرازی، مقالات احسانی (اردو) مؤلفہ حکیم احسان علی قابل ذکر ہیں۔ ان میں بیشتر ایسے لغات ہیں جو آج بھی اہمیت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی اہمیت اور مقبولیت میں آج بھی کوئی فرق نہیں آیا ہے۔



[1] سوانح قاسمی ص۳۱ [2] سوانح قاسمی ص۵ [3] سوانح قاسمی ص۵

رباب رشیدی

بہ یاد منشی نول کشور

مذاقِ سعی و عمل نورِ زندگی ٹھہرا
مذاقِ سعی و عمل روحِ عاشقی ٹھہرا
مذاقِ سعی و عمل رنگِ سرخوشی ٹھہرا
مذاقِ سعی و عمل درسِ آگہی ٹھہرا
تمام راستے اک ذات سے یہ ملتے ہیں
اسی سے آرزوؤں کے گلاب کھلتے ہیں

مذاقِ سعی و عمل فقر بھی ہے شاہی بھی
شعارِ عجز بھی ہے آنِ کج کلاہی بھی
سکونِ قلب و نظر نعمتِ الٰہی بھی
اسی کے ضمن میں ہے عزم کی گواہی بھی
بچا کوئی تو ہمیشہ ہی بدحواس ہوا
جو اس کی راہ میں آیا وہ خود شناس ہوا

اسی کے دائرۂ کار میں ہیں تعمیریں
جلو میں اس کے ہیں سارے جہاں کی تدبیریں
اس ایک نام کی ہیں بے شمار تفسیریں
چمک رہی ہیں کتابوں میں اس کی تحریریں
اسی کے نام کی حامل تھی ایک شخص کی ذات
چراغِ منزلِ ہستی ہے آج جس کی حیات

خلوص و شوق کی دنیا نول کشور کی ذات
نیاز و نازِ سراپا نول کشور کی ذات
جمالِ ذوقِ تمنا نول کشور کی ذات
ادب کے باب میں تنہا نول کشور کی ذات
مہک رہی ہے لطافت کی زندگی بن کر
چمک رہی ہے محبت کی روشنی بن کر

اسی کے نام ہے اردو زباں کا سرمایہ
اسی سے آج ہے روشن یہ آئینہ خانہ
سدا بہار گلوں کا وہ ایک گلدستہ
ورق ورق پہ ہے اس کی نگاہ کا سایہ
کوئی حریف نہیں اس کا اس بلندی میں
کہ لاجواب ہے اپنی سلیقہ مندی میں

وہ اہلِ لطف و کرم، التفات کا پیکر
امینِ خلق، دیانت کا بے بہا گوہر
وہ سرخروئے عمل، اعتبارِ اہلِ نظر
متاعِ حسنِ یقیں، رونقِ حدیثِ ہنر
ہر ایک کام خود اپنی مثال کو پہنچا
جسے بھی ہاتھ لگایا کمال کو پہنچا

زباں کو جذبہ و احساس کو نہال کیا
ہزار طور سے اردو کو مالا مال کیا
نہ اس میں سود و زیاں کا کبھی خیال کیا
ادب کے زخموں کا تا عمر اندمال کیا
رباب دیکھ تو اب بھی ہیں جانے کتنے جری
”مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی“

حیاتِ وارثی

میں اردو [illegible] نول کشور

کل مری نظروں سے گزری ایک بوسیدہ کتاب
اس کی پیشانی پہ تھیں بیتے دنوں کی سلوٹیں
گردِ ماہ و سال سے تھا اُس کا پیرہن اَٹا
حاشیے تھے اس کے اک مفلس کے دامن کی طرح
دُھندلے دُھندلے ہو گئے تھے اس کے سب نقش و نگار
سنگِ ناقدری سے زخمی تھی وہ عاشق کی طرح
میں نے جب کھولے ورق تو سسکیاں لینے لگی
یاد کرکے اپنے ماضی کے حسیں لمحات کو
اس کو جب اپنائیت کے لمس کی لذت ملی
جان کر ہمدرد اپنا اشک برسانے لگی
میں نے پوچھا کس کی فرقت میں بنایا ہے یہ حال
بولی میں اردو زباں ہوں پیار کا گہوارہ ہوں
مسکنِ اوّل ہے میرا گولکنڈہ کی زمیں
خانقاہوں اور محلوں میں ہوئی ہے پرورش
اہلِ دہلی کو کیا میری اداؤں نے اسیر
مختلف قوموں کے لب پر پھول بن کر میں کھلی

حالات کا بہاؤ مجھے لایا لکھنؤ
بدلا گیا یہاں مرا اندازِ گفتگو
پائے جو ہم مزاج تو جوہر مرے کھلے
برسوں میں طے ہوئے مرے صدیوں کے فاصلے
ہر ایک لفظ لہجے کے دامن میں چھن گیا
ہر اہلِ لکھنؤ مری ٹکسال بن گیا
شامِ اودھ نے بخشی مجھے ایسی دلکشی
بزمِ لسانیات کی میں حکمراں بنی
مجھ کو اسی دیار سے وہ شخصیت ملی
جس نے مرے ادب کو حیاتِ دوام دی
اس شخصیت میں میرا مکمل رچاؤ تھا
علم و ادب سے اس کو حقیقی لگاؤ تھا
بالغ مشاہدوں کی علامت مرا وجود
اس شخصیت کا ذوقِ طباعت مرا وجود
انسانیت، خلوص، شرافت کا آئینہ
تھا میری طرح وہ بھی محبت کا آئینہ

کرتی ہوں احترام و عقیدت سے میں سلام
منشی نول کشور ہے اس شخصیت کا نام

محسنِ علم و ادب

خلقِ عظیم پیکرِ ایثار، علم دوست
اعلیٰ صفات صاحبِ کردار، علم دوست
تصویرِ حلم، مالکِ افکار، علم دوست
اور ناشروں میں لائقِ معیار علم دوست
حسن و عمل کی راہ تھے منشی نول کشور
آئینۂ نگاہ تھے منشی نول کشور

اردو ادب پہ آپ نے احسان وہ کیا
بوسیدہ پیرہن تھا نیا پیرہن دیا
خیاط بن کے نوکِ قلم سے اسے سیا
جب پیکرِ کتاب کو تیار کر لیا
ایک ایک حرف اس کا قبولِ نظر بنا
اور اہلِ علم کے لیے سلکِ گہر بنا

عزم و عمل ستائشِ تشہیر بن گئے
ذہن کے تخیلات کے تنویر بن گئے
جب ٹکڑے کاغذات کے تقدیر بن گئے
ذہنی تصورات بھی تصویر بن گئے
یہ داستانِ حمزہ ہے وہ بیش گنج ہے
جن کے مطالعہ سے فضا نغمہ سنج ہے

ہر فن کی ہر کتاب کو چھاپا خلوص سے
فن کار کے ہنر کو سراہا خلوص سے
فکر و نظر کا حوصلہ بخشا خلوص سے
سینے سے اس کے فن کو لگایا خلوص سے
فن کار کے شعور کا جوہر نکھر گیا
جب معرضِ وجود میں آیا ابھر گیا

شائع کلامِ پاک ہو دل کی تھی آرزو
گونجی صدا یہ نیک فضاؤں میں چار سو
آنے لگی طہارت و پاکیزگی کی بو
لکھوایا پھر کلامِ الٰہی کو با وضو
اللہ رے نفاستِ منشی نول کشور
کتنی حسین تھی فطرتِ منشی نول کشور

پارینہ ہر ورق کو نئی زندگی ملی
اس زندگی کے ساتھ ہی اک تازگی ملی
پڑھ کر جسے زمانے کو اک روشنی ملی
اس روشنی سے قلب کو آسودگی ملی
فکرِ عظیم تھی تو ہر اک کام ہو گیا
مطبع کا ایشیا میں بڑا نام ہو گیا

اپنے تصورات کو سانچے میں ڈھال کے
نسخے قدیم لائے تھے تہ سے نکال کے
کچھ موتی چن لیے تھے سمندر کھنگال کے
چھاپا بصد خلوص انھیں دیکھ بھال کے
ناشر نے کتب کے بڑا نام کر گئے
یہ کام آپ قابلِ انعام کر گئے

تھا اک اودھ کے نام کا اخبار آپ کا
دیکھا، عوام کے لیے ایثار آپ کا
کتنا دل و دماغ تھا بیدار آپ کا
خود احترام کرتی تھی سرکار آپ کا
چھائے ہے جو نصف صدی تک دماغ پر
ٹہکی نہیں نگاہ کسی کی ادھر ادھر

کہنے کو کوئی کچھ بھی کہے کائنات میں
آپ ایسے کامیاب تھے اپنی حیات میں
ضوبار ماہ جیسے ہو تاریک رات میں
کیا کہیے کتنی خوبیاں تھیں ایک ذات میں
جانِ سخن کہیں کہ کہیں روحِ انجمن
شاداب آپ ہی سے ہے اردو کا یہ چمن

پروفیسر سید امیر حسن عابدی

منشی نولکشور



فارسی ادب

اردو، فارسی، عربی اور اسلامیات کی جو خدمت مرحوم منشی نول کشور نے کی ہے، ویسی آج تک شاید کسی فرد یا کسی حکومت، یا ادارہ نے بھی نہ کی ہو گی۔ نیز انھوں نے ان زبانوں کی ترقی اور بقاو دوام میں بہت بڑا حصّہ لیا ہے۔ دنیا میں ان زبانوں کے علمی حلقے اس عظیم شخصیت سے پوری طرح آشنا ہیں اور شاید کوئی ایسا اسلامی ملک نہیں ہے جہاں ان کی شائع کردہ کتابیں داخل درس نہ ہوں اور پڑھائی نہ جاتی ہوں۔ نیز دنیا کا کوئی ایسا بڑا کتب خانہ نہ ہوگا جہاں ان کے مطبع کی چھپی ہوئی کتابیں موجود نہ ہوں۔ دنیا کے جس ادارے یا یونیورسٹی میں مشرقی علوم کا چلن ہوگا، وہاں مطبع نول کشور کی مطبوعات بھی ضرور ہوں گی۔ مجھے ایران، افغانستان، ترکی جیسے ممالک کے کتب خانے دیکھنے کا موقع ملا ہے اور مجھے اندازہ ہے کہ اس مطبع کی کتابیں کس اہتمام سے محفوظ رکھی جاتی ہیں۔

مجھے کئی سال پہلے ایک مرتبہ مشہد کے ایک ٹیلی ویژن پروگرام میں شرکت کا موقع ملا، جس کا موضوع "ہندوستان میں فارسی" تھا۔ میری گفتگو کو مؤثر بنانے کے لیے ٹیلی ویژن والوں نے کتب خانہ آستانہ قدس یعنی حضرت امام رضاؑ کے روضہ کے کتب خانہ سے نول کشور کی چھپی ہوئی کتابیں عاریتاً منگوا کر دکھلائی تھیں۔ اس طرح ہمیں یہاں رہ کر شاید منشی جی کی عظیم خدمات کا اتنا اندازہ نہ ہو سکے گا جتنا کہ ان لوگوں کو ہوگا جنھیں بیرونی ملکوں کے علمی ادارے اور کتب خانے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔

یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ عربی، فارسی اور اردو میں جتنی کتابیں نولکشور پریس سے شائع ہوئی ہیں، اتنی غالباً کسی اور ملک میں شائع نہ ہوئی ہوں گی۔ علمی اور ادبی محفلوں میں منشی نول کشور کا نام نظر آتا ہے۔ ہمارے محقق اور ادیب فارسی کے کسی موضوع پر اگر کام کریں یا کسی دیوان کو صحت و اہتمام سے ایڈٹ کریں تو ان کو اکثر و بیشتر نولکشوری نسخوں کی طرف رجوع کرنا ہی پڑے گا۔ نیز ہر مطبوعہ کتاب کا قدیم ترین نسخہ غالباً نولکشوری نسخہ ہی ہوگا۔ اس پریس سے اس وقت فارسی کی کتابیں شائع ہو رہی تھیں۔ جبکہ خود فارسی بولنے والے ملکوں میں شاید پریس کا رواج بھی نہ تھا۔

میں نے خود نولکشوری نسخوں سے فارسی کے مختلف امتحانات میں استفادہ کیا ہے۔ آج ان کتابوں کے بہتر سے بہتر ایڈیشن بازار میں آگئے ہیں۔ مگر میری طالب علمی کے زمانہ میں نولکشوری نسخوں کے علاوہ کسی اور کا نام و نشان تک نہ تھا۔

یونیورسٹی، اسکول اور کالج کے طلبا کو شاید منشی جی کی خدمات کا پورا اندازہ نہ ہوگا مگر جن لوگوں نے درس نظامی حاصل کیا ہے اور عربی مدارس میں تعلیم پائی ہے۔ ان کو پورا احساس ہوگا کہ نحو، صرف، منطق، فلسفہ، فقہ، اصول، ادب، ہیئت، لغت، عروض جیسے سبھی علوم کی بے شمار کتابیں مطبع

نول کشور نے شائع کر کے استادوں اور شاگردوں، دونوں کی مشکلوں کو حل کر دیا۔

مجھے اب تک یاد ہے کہ کسی زمانہ میں جب میں کابل میں تھا اور اپنے مطالعہ کے سلسلے میں کتب فروشوں کے یہاں بھی جانا پڑتا تھا تو میں نے دیکھا کہ مطبع نول کشور کی چھپی ہوئی لغت وغیرہ کی کتابیں وہاں اس قدر مقبول ہیں کہ بعض کتب فروش اپنے لیے مخصوص اس قسم کی کتابیں چھپوا کر ہندستان سے لاتے ہیں۔

فارسی کی مثنوی سوز وگداز (۱۸۶۷ عیسوی) پدماوت (۱۸۷۱ عیسوی) اور گلزار حال یا طلوع قمر معرفت یعنی پربود چندرادی جیسی کتابیں اسی مطبع میں چھپی ہیں جب مجھے ان کو ایڈٹ کرنے کا موقع ملا تو میں نے نولکشوری نسخوں کو اصل متن کی صورت میں رکھا۔ البتہ دوسرے قلمی نسخوں کی مدد حاصل کی اور متن کو زیادہ سے زیادہ صحت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی۔

حضرت امیر خسرو دہلوی، اور حافظ شیرازی جیسے عظیم شعرا کا کلام ایران اور ہندستان میں بار بار شائع ہوا ہے۔ مگر اب تک منشی جی کے مطبع کے چھپے ہوئے نسخوں کی بات ہی کچھ اور ہے۔ نیز تمام بڑے شعرا کا کلام شاید سب سے پہلے اور بار بار مطبع نولکشور سے ہی شائع ہوا۔

"کلیات عناصر دواوین خسرو" کے نام سے طوطی ہند حضرت امیر خسرو کے چار دیوان (تحفۃ الصغر، وسط الحیات، غرۃ الکمال، بقیہ نقیہ) کا انتخاب کئی مرتبہ اس مطبع سے شائع ہوا۔ ان میں سے ایک بار ۱۹۱۲ عیسوی میں شائع ہوا تھا اور اس سال کا چھپا ہوا نسخہ اکثر کتب خانوں میں پایا جاتا ہے۔ آج ضرورت تھی کہ ان دیوانوں کو الگ الگ ایڈٹ کر کے پورے اہتمام سے شائع کیا جاتا۔ مگر بدقسمتی سے یہ کام اب تک نہ ہو سکا اور اب بھی نولکشوری نسخوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

یہاں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ نولکشوری نسخہ کے علاوہ تحفۃ الصغر کے نام سے ایک دیوان شائع ہوا ہے، جو تحفۃ الصغر تو نہیں ہے، مگر حضرت امیر خسرو کا دیوان ضرور ہے۔ اس کے علاوہ "دیوانِ کامل امیر خسرو دہلوی" اور کلیات غزلیاتِ خسرو" تہران اور لاہور سے شائع ہوئے ہیں۔ اول الذکر پر مرحوم استاد سعید نفیسی کا مقدمہ ہے اور کلیات کو مرحوم پروفیسر سید وزیر الحسن عابدی نے چار جلدوں میں بڑے اہتمام سے مرتب کر کے شائع کرا دیا تھا۔ علاوہ بریں حضرت کا پانچواں دیوان "نہایت الکمال" بھی شائع ہو گیا ہے۔ مگر آج تک ہم لوگ منشی نولکشور کے مطبع کے چھپے ہوئے نسخوں سے بے نیاز نہ ہو سکے۔

اسی طرح دیوان حافظ کے بے شمار نسخے شائع ہوئے ہیں۔ خاص کر ایران میں" لسان الغیب " پر بہت کام ہوا ہے۔ مرحوم پروفیسر مسعود فرزاد نے حافظ پر ہزاروں صفحے لکھے ہیں اور تحقیق کا بہترین معیار پیش کیا ہے۔ نیز ان کی تمام زندگی کا یہ سرمایہ کئی جلدوں میں شیراز یونیورسٹی سے مختلف ناموں سے شائع ہوا ہے۔ ہمایوں فرخ نے بھی "حافظ خراباتی" کے نام سے کئی جلدوں میں اپنی کتاب کو شائع کیا۔ ان کے علاوہ علامہ محمد قزوینی، ڈاکٹر قاسم غنی، پروفیسر پرویز ناتل خانلری اور انجوی شیرازی نے بھی حافظ کا کلام اور دیوان مختلف نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک بڑا کام پروفیسر نذیر احمد صاحب نے کیا ہے وہ یہ کہ گورکھپور کے سبز پوش خاندان میں دیوان حافظ کے اس نسخہ کا پتہ لگایا جو مع مقدمہ کے سب سے قدیم نسخہ کہا جائے گا۔ نیز یہ نسخہ بڑی آب وتاب سے کئی مرتبہ ایران میں شائع ہو چکا ہے۔

اکثر بڑے شعرا کے دیوانوں میں الحاقی کلام بھی شامل ہو گیا ہے۔ ایک عرصہ تک دیوان رودکی میں قطران تبریزی کا کلام شامل رہا۔ تاج ریزہ، ظہیر دہلوی، احمد جہ چلوشش اور مخفی رشتی کا کلام انوری، ظہیر فاریابی، احمد جام ژندہ پیل اور زیب النسا مخفی کے دیوانوں میں شامل کر دیا گیا ہے۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اور خواجہ بختیار کاکی کے نام سے بھی دو دیوان شائع ہوئے۔ جو ان کے نہیں ہیں۔ فارسی زبان کے سب سے بڑے شاعر خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی

ہیں۔ جن کی تقریباً ہر غزل گو شاعر نے تقلید کی ہے۔ تمام قدیم بڑے شعرا کی طرح ان کے دیوان میں بھی بہت سے الحاقی کلام کی نشان دہی کی گئی ہے اور اسے جدید مطبوعہ نسخوں سے الگ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مگر اس تحقیق میں اس کا خطرہ بھی ہوتا ہے کہ کہیں کسی شاعر کا اصلی کلام بھی الحاقی کہہ کر الگ نہ کر دیا جائے۔ کابل یونیورسٹی کے پروفیسر روز برچاسل نے حافظ کی آٹھ ایسی غزلوں کے دیوان کے قدیم ترین نسخوں میں سے ایک نسخہ میں پتہ لگایا ہے۔ جسے ایرانی مطبوعہ نسخوں میں سے یہ کہہ کر الگ کر دیا گیا تھا کہ وہ الحاقی ہیں اور قدیم نسخوں میں نہیں ملتیں۔ مگر یہ سب غزلیں مطبع نولکشور کے چھپے ہوئے نسخوں میں موجود ہیں۔ یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ مطبع نول کشور سے صرف دیوان حافظ کے نسخے ۱۸۶۲ء سے لے کر ۱۹۰۶ء تک بار بار شائع ہوئے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مرحوم نول کشور کا نام عربی، فارسی اور اردو زبان و ادب کے ساتھ جڑا ہوا ہے اور جب تک یہ زبانیں زندہ رہیں گی، منشی جی کا نام بھی زندۂ جاوید رہے گا۔



اردو صحافت کی عہد آفریں یادگار ———— (صہ ۴۲ کا بقیہ)

کی تائید میں خود ہزارہا ہندوؤں کی آرا پیش کی جا سکتی ہیں۔۔۔۔"

اودھ اخبار کے بے لاگ تبصروں سے حکومت وقت کے فیصلے بھی نہیں بچتے تھے اور منشی جی حکومت کے وفادار ہونے کے باوجود حق بات لکھنے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتے تھے۔ اسی سلسلہ میں اودھ اخبار مورخہ ۲۱ جون ۱۸۸۰ء میں "جلسۂ تہذیب" کے ایک اجتماع کی تفصیل شائع ہوئی تھی۔ یہ جلسہ منشی نول کشور ہی کی صدارت میں ہوا تھا اور اس جلسہ میں حکومت کی ٹیکس پالیسی پر سخت نکتہ چینی کی گئی تھی کیونکہ یہ ٹیکس عوام کے لیے زبردست ناپسندیدگی کا سبب تھے۔

اودھ اخبار نے اپنی عمر کے بارہ سال پورے کر لیے اور تیرھویں سال میں قدم رکھا تو نئے سال کے آغاز کے موقع پر ایک اشاعت میں اڈیٹر نے اپنے اخبار کی پالیسی کا اعادہ کیا اور اس کی امتیازی خصوصیات کا سرسری خاکہ شائع کیا جسے قارئین کے مطالعہ کے لیے پیش کیا جا رہا ہے:—

"ثنا ہا ہمہ ایزد پاک را" ثریا دو طارم تاک را

خدائے کریم کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ ہر لحظہ ترقی کا سامان ہے۔ عنایت الٰہی سے تیرھواں سال ہے۔ ماہ اودھ اخبار برسر عروج و کمال ہے۔ ۱۸۸۱ء مبارک نظر آیا ہے۔ مطبع نے فروغ روز افزوں پایا ہے۔ زمانہ اس جام جہاں نما کی روشن بیانی کا قائل ہے، ایک جہان اس پر مائل ہے۔ گرماگرم خبروں پاکیزہ الفاظ کا لحاظ، نثر پُر لطافت، سلاست عبارت کا التزام ہے۔ مضامین پسندیدہ و محاورات سنجیدہ کا اہتمام ہے۔ مہذبانہ خیالات آزادانہ رائیں، ادب آموز نصیحتیں ہیں۔ شاعرانہ اشعار دلچسپ غزلیں ہیں۔ ترقی دولت، افزونی تجارت، بہبودی ملک کی تدبیریں ہیں۔ سیاست مدن، تہذیب اخلاق کی تقریریں ہیں۔ ہفتے میں دو بار دنیا بھر کی خبریں لکھی جاتی ہیں۔ موقع مناسب پر گاہ گاہ نقشے اور تصویریں بھی زیب نگارش پاتی ہیں۔ سہ شنبہ اور جمعہ چھپنے کا روز ہوتا ہے لیکن اسی دن شائع ہو کر نظر فروز ہوتا ہے۔[1]



[1] اودھ اخبار بابت ۲۲ دسمبر ۱۸۸۱ء۔ صفحہ ۱۳۸۳۔

امیر حسن نورانی

منشی نول کشور



فارسی زبان و ادب کی ترقی

فارسی زبان و ادب کی تاریخ میں منشی نول کشور کے مطبع کو سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔

ہندستان کے عالموں، ادیبوں، شاعروں نے فارسی زبان میں کئی سو سال تک جو کچھ لکھا تھا، اور علوم و فنون کے ذخیرہ میں جو گرانقدر اضافے کیے تھے، ان میں سے منتخب چیزوں کو منشی نول کشور نے شائع کر کے امیر و غریب سب کے لیے ان کا مطالعہ ممکن بنا دیا۔ ان کی علم دوستی اور شوق اشاعت کی بدولت بڑے بڑے علمی و فنی شاہکار دست بردِ زمانہ سے محفوظ ہو گئے۔ ایسی کمیاب و نادر کتابیں انھوں نے شائع کر دیں جن کے منظرِ عام پر آنے سے علوم و فنون کے سلسلہ ارتقاء کی گمشدہ تاریخ کی کڑیوں کو مربوط کرنے میں غیر معمولی مدد ملی ہے۔ ایران، افغانستان، چینی ترکستان، عراق اور ترکی وغیرہ کے مکاتب و مدارس کی تدریسی سرگرمیوں میں اس وقت اضافہ ہوا جب مطبع نول کشور کی فارسی و عربی مطبوعات ارزاں قیمت پر ان ممالک کے اساتذہ اور طلباء کو میسر آئیں، خود ہندستان کے علمی مراکز، مدارس، مکاتب میں تحصیل علم کی خاطر آنے والے طلباء اور اساتذہ کو فارسی نصاب کی کتابیں مطبع نول کشور کی بدولت ہی مل سکیں۔

اس سے قبل تمام ضروری درسی کتب کے قلمی نسخے بڑی دشواری کے بعد گراں قیمت پر تیار ہوتے تھے۔ اکثر اساتذہ اور طلباء صرف ایک قلمی کتاب سے کام چلانے پر مجبور تھے۔

نول کشور کا حیرت انگیز طریقہ کار:- عام طور سے علمی حلقوں کے لیے یہ بات باعث حیرت ہے کہ منشی نول کشور نے بہت کم مدت میں ایک عظیم الشان اور گراں قدر کتابی ذخیرہ کس طرح طباعت و اشاعت کی منزلوں سے گزار کر علمی دنیا کے سامنے پیش کر دیا جبکہ ان کے پاس ہینڈ پریس اور معمولی قسم کی مشینیں تھیں۔

موجودہ دور میں تو بہترین تیز رفتار مشینوں کے ذریعہ بھی اتنا کام انجام پانا مشکل نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ منشی نول کشور کا طریقِ کار حیرت انگیز تھا۔ جو ان کی خداداد ذہانت اور طبّاعی کا نتیجہ تھا۔ انھوں نے ۱۸۵۸ء کے آغاز میں کام شروع کیا۔ اس وقت ان کی عمر بائیس سال تھی اور انسٹھ سال کی عمر میں ۱۸۹۵ء میں وفات پائی۔ گویا، ۳۷ سال کی مدت میں ہی انھوں نے مختلف زبانوں میں علوم و فنون کی نادر و نایاب کتب کا بہت بڑا ذخیرہ علمی دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔

ابتدا میں انھوں نے دستی پریس سے کام چلایا جب کام کچھ آگے بڑھا تو ولایتی مشینیں خریدیں۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام ہو جائے۔ اس کے لیے انھوں نے تین سو سے زیادہ ہینڈ پریس فراہم کیے۔ کچھ خریدے کچھ اپنی نگرانی میں خود تیار کرائے اور ان کو اپنے مطبع کی وسیع و عریض عمارت میں نصب کرایا۔ یہ

عمارت لکھنؤ کے ایک رئیس غالب جنگ کی تھی جس کو نول کشور نے خرید لیا تھا اسی میں پریس اور کتب خانہ منتقل کر دیا۔ ہینڈ پریس پر دو کارکن مقرر کیے ایک "پریس مین" ایک مزدور ایک پریس میں کام کے اوقات کے اندر آٹھ سو سے ایک ہزار کاغذ تک چھپ جاتے تھے جو کارکن چند دنوں کام کرنے پر ٹرینڈ ہو جاتا اس کو منشی نول کشور ایک ہینڈ پریس اس شرط پر دے دیتے تھے کہ وہ پریس کو اپنے مکان لیجا کر نصب کرے اور طباعت کا کام ان کے مطبع سے لے جائے ہر روز جتنا کام کرے اس کی نصف اجرت نقد وصول کرے اور نصف پریس کی قیمت میں کٹوا دے جب کل قیمت ادا ہو جائے تو وہ اس کی ملکیت ہو جائے گا۔ اس طریقہ کار کا نتیجہ یہ نکلا کہ لکھنؤ کے ہر محلے میں ہینڈ پریس قائم ہو گئے ہر ایک نے اپنے پریس کا کوئی نہ کوئی نام رکھ لیا —

یہ سب پریس نول کشور کا کام کرتے تھے اور حسب ضرورت باہر کا کام بھی کر لیتے تھے۔ اسی لیے پرانی کتابوں پر لکھنؤ کے پچاسوں مطابع کے نام نظر آتے ہیں۔ یہ سب کرشمہ تھا منشی نول کشور کا۔ اگر ان کو پچاس فارم کی کتاب طبع کرانا ہوتا تھا تو وہ اسے پچاس کاتبوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ دو دن میں پوری کتاب مکمل ہو جاتی تو پچاس ہینڈ پریسوں کو دیدیتے تھے جو ایک یا دو دن میں کل فارم چھاپ دیتے تھے۔ اس طرح پچاس فارم کی ایک کتاب تین چار روز کے اندر تیار ہو جاتی تھی۔ مطبع نول کشور میں تقریباً ایک سو کاتب ہمہ وقت موجود رہتے تھے۔ ان میں اس فن کے ممتاز اساتذہ بھی شامل تھے۔ خاص طور پر منشی شمس الدین اعجاز رقم، مولوی ہادی علی اشک، مولوی اشرف علی اور امیر اللہ تسلیم وغیرہ قابل ذکر ہیں جو نسخ و نستعلیق کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔

نول کشور پریس کی عمارت میں باقاعدہ دارالکتابت قائم تھا جہاں کاتب بیٹھتے تھے اور نئے لوگوں کو ٹرینڈ بھی کرتے تھے۔ منشی نول کشور روزانہ شام کو کاتبوں کے کام کا جائزہ لیتے تھے اور کتابت شدہ فارم پریسوں کو تقسیم کر دیتے تھے۔

اس طریقہ کار کا نتیجہ یہ نکلا کہ بڑی بڑی کتابیں بہت کم وقت میں چھپ کر اہل علم تک پہونچنے لگیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ لکھنؤ اور اطراف میں بہت سے پریس قائم ہو گئے اور سیکڑوں آدمی برسر روزگار بھی ہو گئے۔ اشاعت و طباعت کا کاروبار ترقی کرنے لگا۔ ان ہینڈ پریسوں میں سے بعض کچھ عرصہ بعد ترقی کر کے مشہور و ممتاز پریسوں میں شمار ہونے لگے۔

منشی نول کشور نے ہندستان کے کئی مشہور مقامات پر اپنے پریس کی شاخیں بھی قائم کیں۔ کانپور کا مطبع نول کشور لکھنؤ کے بعد سب سے بڑا تھا۔ اس کے علاوہ لاہور، پٹیالہ، اجمیر، اور جبل پور میں بھی شاخیں قائم کیں۔ ان کے بکڈپو کی ایک ایجنسی لندن میں بھی قائم ہو گئی تھی۔

فارسی زبان وادب سے نمایاں دلچسپی

منشی نول کشور کے حالات زندگی اور اشاعتی سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے بعد یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ ان کو اور زبانوں کے مقابلے میں فارسی سے زیادہ دلچسپی تھی۔ اسی لیے انھوں نے بیشتر کتابیں فارسی زبان میں مختلف علوم و فنون کی شائع کیں۔ ان کی ابتدائی تعلیم فارسی میں ہوئی اور جس ماحول میں انھوں نے تربیت پائی اس پر فارسی کا اثر گئی گذری حالت میں بھی غالب تھا۔ دراصل فارسی زبان صدیوں سے ہندستان میں پھل پھول رہی تھی۔ اس کا باقاعدہ دور محمود غزنوی کے پہلے حملہ کے وقت سے شروع ہوا تھا۔ اور عہد تیموریہ میں اس نے اتنی ترقی کر لی تھی کہ مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھی اس کی تحصیل میں پیش پیش تھے۔ اس زمانے میں بے شمار ہندو شعراء فارسی میں غزل سرائی کر رہے تھے۔ اور اکثر ہندو شعراء نے اپنے فارسی دیوان مرتب کر لیے تھے۔ ہندو شعراء نے مثنوی اور دوسرے اصناف میں بھی طبع آزمائی کی اور فارسی میں کتابیں تصنیف کیں۔ سلطنت مغلیہ کے عہد کو ہندستان میں فارسی زبان کا عہد زریں کہا جاتا ہے ملک کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ اس وقت ایران میں مغلیہ حکومت کا رقیب صفوی خاندان حکمراں تھا۔ لیکن اس نے فارسی زبان کی ترقی پر اتنی توجہ نہیں کی جتنی ہندستان میں ہو رہی تھی، اسی کا نتیجہ تھا کہ ایران کے علماء اور خوش فکر شعراء ہندستان کا رخ کرتے تھے اور مدتوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ خود ایران کے اہل علم کے لکھے ہوئے تذکرے شہادت دے رہے ہیں کہ مسلسل کئی سو سال تک بحالت

رہی کہ جہاں کہیں اچھا شاعر پیدا ہوتا ہندستان اس کو دربارِ عجم سے چھین لیتا تھا۔ اس زمانہ میں اہلِ ہند اپنی زبانوں میں فارسی الفاظ شامل کرنا باعثِ عزت خیال کرتے تھے، یہاں تک کے دیہاتوں کی بولیوں میں ہی فارسی الفاظ بکثرت استعمال ہونے لگے اور اب تک باقی ہیں۔ خیال ہوتا ہے کہ اگر چند صدیاں اور اسی حالت میں گزر جاتیں تو شاید سارے ہندستان کی زبان فارسی ہوتی۔

دلّی کی تباہی اور دولتِ مغلیہ کے زوال کے زمانے میں اودھ کی سلطنت کو غیر معمولی عروج حاصل ہوا۔ سلطنتِ اودھ کے بانی محمد امین خان، برہان الملک ایرانی تھے۔ ان کی وجہ سے ایرانیوں کی آمد و رفت بڑھ گئی اور ان کا اثر اودھ میں بہت بڑھ گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی زبان اودھ میں خوب پروان چڑھی بکثرت کتابیں فارسی میں لکھی گئیں۔ مدارس و مکاتب میں اس کی تعلیم لازمی تھی بلکہ ذریعہ تعلیم عموماً یہی زبان تھی۔ اسی لیے بادشاہوں اور امیروں کے محلوں میں بڑے بڑے کتب خانے موجود تھے۔ سرکاری اور نجی دونوں قسم کے کتب خانوں میں فارسی مخطوطات کی تعداد سب سے زیادہ تھی، اودھ کی حکومت کا ۱۸۵۶ء میں خاتمہ ہوا اور حکومت انگریزوں کے ہاتھ آئی تو انھوں نے ہزاروں کتابیں اور مخطوطات یورپ بھیج دیے تاہم نجی کتابوں میں بہت سے مخطوطات محفوظ تھے۔ منشی نول کشور نے پریس قائم کیا تو ان کو یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ کس طرح ان نایاب فارسی مخطوطات کو حاصل کر کے شائع کیا جائے تاکہ وہ ضائع نہ ہو سکیں اور شائقینِ علم و ادب ان سے استفادہ کر سکیں۔ اس وقت تک فارسی ہی علمی زبان تھی اور مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں میں بھی فارسی پڑھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اکثر ہندو اپنی مذہبی کتابیں فارسی رسم الخط میں لکھی ہوئی پڑھتے تھے۔ منشی نولکشور نے فارسی کتابوں کی اشاعت میں غیر معمولی دلچسپی لی اور بہت کم مدت میں تمام اہم علمی، ادبی، تاریخی اور فنی مخطوطات کو نہایت اہتمام سے شائع کر دیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے عربی زبان سے تفسیر و حدیث اور فقہ کی مستند کتابوں کے فارسی ترجمے حاصل کیے اور بعض کے ترجمے خود کرا کے شائع کیے۔ جن کی فہرست طویل ہے، اسی طرح ہندو مذہب کی مقدس کتابوں کے فارسی ترجمے شائع کیے مثلاً مہابھارت ۱۰ حصوں میں، رامائن، بھگوت گیتا۔ شریمد بھاگوت رسائل شنکر آچاریہ وغیرہ۔ نولکشور پریس میں باقاعدہ ایک دار الترجمہ تھا جہاں عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی اور انگریزی کے ماہرین صرف ترجمہ کا کام انجام دیتے تھے۔ منشی نولکشور نے انگریزی زبان کی بہت سی مفید کتابوں کو فارسی میں منتقل کرایا۔ جو کام اس زمانہ میں حکومتوں اور بڑے علمی اداروں کی نگرانی میں انجام دیے جا رہے ہیں وہ ایک صدی قبل منشی نول کشور نے بڑی خوش اسلوبی سے پورے کیے جو اب ہماری رہنمائی کر رہے ہیں۔

فارسی مطبوعات کا آغاز اور ارتقا

ابتدا میں منشی نولکشور نے فارسی زبان کے طلبا کے لیے چھوٹی چھوٹی کتابیں شائع کیں اور جب وسائل میں اضافہ ہوا تو بڑی اور اہم کتابوں کی طباعت پر توجہ کی۔ ممتاز علما اور ماہرین کی تصانیف کے مسودات حاصل کیے اس سلسلہ میں ہندستان گیر پیمانہ پر جدوجہد کی اور مختلف مقامات پر اپنے نمائندے بھیجے، کہیں خط و کتابت سے کام چلایا۔ اس میں ان کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی اور قلیل مدت میں انھوں نے سینکڑوں قلمی مسودات فراہم کر لیے اور ان کی باقاعدہ ایڈیٹنگ اور طباعت کا انتظام کیا۔ اس وقت لکھنؤ میں ہر علم و فن کے ماہر علما موجود رہتے۔ کیونکہ لکھنؤ میں فرنگی محل جیسی عالمی شہرت کی درسگاہ بھی موجود تھی جہاں ملا نظام الدین سہالوی بانیٔ درس نظامیہ کا مدرسہ نظامیہ بھی مرکزِ علوم تھا۔ لکھنؤ ہی میں شیعہ مسلک کے زبردست عالم مولانا دلدار علی کی مستند درس گاہ بھی تھی جو مرکزِ علم و فضل تھی اور ان کے باقیاتِ صالحات سے ابھی لکھنؤ خالی نہیں ہوا تھا۔ ان اہم علمی مرکزوں کے باعث لکھنؤ کو عالمی شہرت حاصل تھی۔ منشی نولکشور نے ان علمی مرکزوں سے روشنی حاصل کی اور ممتاز علما و فضلا کی خدمات کتابوں کی ترتیب و صحت کے سلسلہ میں حاصل کیں۔

فارسی نظم۔

فارسی کے ممتاز اساتذہ کے جتنے دواوین و کلیات کے مخطوطات حاصل کیے ان کو اچھے فارسی داں علما سے صحت کرا کے شائع کر دیا۔ بہترین کتابت اور دیدہ زیب طباعت ان کے مطبع کا طرۂ امتیاز تھی۔ ان کی زندگی میں جو کتابیں طبع ہوئیں وہ صحت کے علاوہ کتابت و طباعت کے لحاظ سے بھی معیاری ثابت

ہوئیں۔ یہاں صرف چند اہم کتابوں کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

شاہ نامہ فردوسی۔ تین جلدوں میں (مکمل) بڑے سائز شائع کرایا اس کا اردو اور ہندی میں ترجمہ بھی کرایا۔ ہندی ترجمہ کی دو جلدیں مطبع نولکشور کا رنپور سے ان کی زندگی میں چھپ گئی تھیں۔ تیسری جلد مکمل نہ ہونے کے باعث اس کی اشاعت معرضِ التوا میں رہی۔ اور مطبوعہ جلدیں بھی تلف ہو گئیں۔

مثنوی مولانا روم۔ منشی نولکشور کو مثنوی سے بہت دلچسپی تھی انھوں نے متعدد مخطوطات کی مدد سے کئی علماء سے صحت کرا کے خطِ نستعلیق میں مثنوی کا خوبصورت اڈیشن نکالا۔ اس کے بعد اس کے متعدد اڈیشن نکلے۔ انھوں نے مثنوی کی حسب ذیل شرحیں بھی پہلی بار طبع کرائیں۔

(۱) شرح مثنوی از ولی محمد اکبر آبادی ۲ جلدوں میں۔

(۲) جواہر الاسرار شرح مثنوی از مولانا حسین بن حسن سبزواری تین جلدوں میں۔

(۳) پیرا ہن یوسفی مع منظوم اردو ترجمہ ۶ جلدوں میں

(۴) بوستان معرفت۔ مع شرح و ترجمہ و حواشی ۶ جلدوں میں از مولانا عبد المجید پیلی بھیتی۔

(۵) لطائف معنوی ،، از شاہ عبد اللطیف مثنوی کے مشکل اشعار کا انتخاب اور شرح۔

(۶) منتخب اللباب۔ انتخاب مثنوی۔

مثنویات خواجہ فرید الدین عطار۔ عطار کی تمام مثنویات جو دستیاب ہیں شائع کیں۔ حدیقہ سنائی۔ نظامی کی پانچوں مشہور مثنویات جو خمسہ نظامی کہلاتی ہیں۔ امیر خسرو کی پانچوں مثنویاں جو خمسہ نظامی کے جواب میں لکھی گئیں۔ ان کے علاوہ دیوان امیر خسرو، مثنوی زلالی۔ کلیاتِ خاقانی وغیرہ . . . . متعدد مثنویوں کے اردو ترجمے بھی کرائے. جو شائع ہو چکے ہیں۔

کلیات شمس تبریز (جو در اصل مولانا روم کا کلام ہے) دیوان شمس تبریز۔ کلیات صائب کلیاتِ عراقی۔ کلیات انوری۔ کلیات جامی۔ کلیاتِ بیدل۔ کلیات سعدی۔ کلیات عرفی۔ کلیات نظیری۔ کلیات ظہیر فاریابی۔ کلیاتِ جلال اسیر۔ کلیاتِ غالب۔ کلیات صہبائی۔ دیوان حافظ (متعدد اڈیشن) دیوان نظیری دیوان عرفی۔ دیوان کلیم ہمدانی۔ کلیاتِ حزیں۔ دیوان فیضی۔ دیوان واقف۔ دیوان ہلالی۔ دیوان نعمت خان عالی۔ دیوان حسن سنجری۔ دیوان ظہوری۔ دیوان غنی۔ وغیرہ ان میں بیشتر وہ ہیں جن کی اشاعت کی اولیت منشی نولکشور کو حاصل ہوئی۔ فارسی شعراء کے قصائد میں قصائد عرفی اور اس کی متعدد شرحیں۔ قصائد . . . . اور اس کی شرح اسی طرح کئی اور شعراء کے قصائد۔ بوستانِ سعدی کے کئی خوبصورت اڈیشن نولکشور کی زندگی میں شائع ہوئے۔

تاریخ، تذکرے اور سیرت۔ منشی نولکشور نے تاریخ کی تمام مستند کتابوں کے مخطوطات بڑی محنت اور مسلسل جد و جہد سے حاصل کیے اور ان کو شائع کیا۔ ان تاریخی کتابوں کی بدولت نہ صرف ہندستان بلکہ ساری علمی دنیا کو فائدہ پہنچا یہاں چند کتابوں کے نام درج کیے جا رہے ہیں جن میں سے بیشتر پہلی بار نولکشور پریس سے شائع ہوئیں۔

روضۃ الصفا سات جلد کامل۔ تاریخ فرشتہ ۲ جلد کامل۔ ترجمہ فارسی تاریخ طبری (چار حصے) پہلی بار اس مطبع نے شائع کی۔ منتخب التواریخ بدایونی۔ سیر المتاخرین۔ حبیب السیر۔ تاریخ وصاف اکبر نامہ۔ آئین اکبری۔ شاہ جہاں نامہ۔ طبقات ناصری۔ طبقات اکبری۔ تزک جہانگیری۔ جہانگیر نامہ۔ ہمایوں نامہ۔ جامع التواریخ۔ حیات القلوب۔ عماد السعادت۔ ہفت اقلیم۔ تاریخ حیدر لیہ۔ تاریخ مصر وقایع نعمت خاں۔ تذکروں میں۔ تذکرہ دولت شاہ سمرقندی۔ تذکرہ حسینی۔ نفحات ارشن جامی۔ رشحات ملا کاشفی گلشن بخار۔ صبح گلشن۔ روز روشن۔ سوانح میں مدارج النبوت۔ معارج النبوۃ۔ عجائب المخلوقات۔ روضۃ الشہدا ملا کاشفی وغیرہ۔ ان میں سے متعدد کتابوں کے اردو ترجمے بھی شائع کرائے۔

فارسی نثر، فارسی نثر میں مختلف علوم و فنون کے معروف اور بعض غیر معروف مصنفین کے نادر مخطوطات فراہم کر کے ان کو پہلی بار نہایت اہتمام سے شائع کیا۔ نثر کی ایسی کتابوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہاں صرف ان چند کتابوں کے نام لکھے جا رہے

ہیں جن کا تعلق ادبیات سے ہے۔ سب سے زیادہ تعداد میں جو کتاب بار بار چھاپی گئی وہ گلستان سعدی ہے اس کے کئی قسم کے اڈیشن متعدد کاتبوں سے لکھوا کر طبع کرائے۔ ان میں دو باتصویر اڈیشن بھی شامل ہیں۔ مشہور خطاط منشی شمس الدین اعجاز رقم کی کتابت کی ہوئی گلستاں نہایت دیدہ زیب ہے اس کے بے شمار اڈیشن نکلے اور ہندستان نیز دوسرے ممالک میں مقبول ہوئے۔ منشی نولکشور نے گلستاں کی شرحیں بھی فارسی میں شائع کیں ان میں قابل ذکر ولی محمد اکبرآبادی اور مولانا غیاث الدین رامپوری کی شرحیں ہیں۔ مرزا غالب کے شاگرد ہرگوپال تفتہ کی تضمین گلستاں بھی شائع کی۔ سعدی کی دوسری مشہور کتاب بوستان کی شرحیں فارسی زبان میں شائع کرائیں ان میں ٹیک چند بہار کی شرح بوستاں سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ گلستاں کا اردو، ہندی اور انگریزی ترجمہ بھی شائع ہوا۔ ان کے علاوہ نثر کی کتابوں میں حسب ذیل کتب شائع کیں جن کی اہمیت مسلم ہے۔ خارستان۔ مجد الدین خوافی۔ بہارستان جامی۔ گلستان حکیم قاآنی۔ اخلاق جلالی۔ اخلاق ناصری۔ اخلاق محسنی۔ انوار سہیلی۔ بہار دانش۔ عیار دانش۔ اعجاز خسروی۔ مقامات حمیدی۔ توضیحات کبریٰ۔ انشائے جامی۔ رقعات بیدل۔ ہفت تماشائے قتیل۔ رقعات ابوالفضل۔ موہبت عظمیٰ، عطیہ کبریٰ۔ حسن و عشق نعمت خان۔ رشحات عالمگیری۔ طراز دانش۔ نگار دانش۔ پنج رقعہ ظہوری۔ مجالس العشاق۔ مہر نیمروز غالب۔ ریاض الفردوس۔ انشائے رحمانی۔ شرح سہ نثر ظہوری صہبائی۔ نگار نامہ۔ مظہر العجائب۔ براہین عظیم۔ مہر الفصاحت قتیل۔ کلیات نثر غالب۔ معیار اشعار طوسی۔ حدائق البلاغت اور بہت سی چھوٹی چھوٹی کتب انشا جن کی فہرست طویل ہے۔

تصوف و اخلاق۔ تصوف کے موضوع پر بھی منشی نولکشور نے خاص توجہ کی اور بڑے بڑے صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کے ملفوظات، مکاتیب اور اہم تصانیف کے مسودے تلاش کر کے شائع کیے اور ان میں سے اکثر کی اشاعت پہلی بار انھیں کی رہین منت ہے مثلاً تاویل المحکم شرح فصوص الحکم ابن عربی۔ نفحات الانس جامی۔ تذکرۃ الاولیا عطار۔ کشف المحجوب۔ زبدۃ المقامات خواجہ باقی باللہ۔ مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانی۔ مطالب رشیدی۔ جذب القلوب شاہ عبدالحق۔ اسیر الاولیاء۔ اسرار الاولیاء۔ خزینۃ الاصفیاء۔ فتوح الحرمین۔ مقالات صوفیہ۔ مکتوبات شرف الدین منیری۔ کیمیائے سعادت امام غزالی وغیرہ۔

مذہبی اور اخلاقی کتابیں مذہبی اور اخلاقی کتابوں پر بھی منشی نولکشور نے خاص توجہ کی تھی۔ عربی۔ فارسی۔ اردو۔ تینوں زبانوں میں انھوں نے بڑی بڑی اہم کتابیں شائع کیں۔ عربی میں فقہ، حدیث و تفسیر کی مستند کتب کے مخطوطے حاصل کیے ان میں سے اکثر کا فارسی اور اردو میں ترجمہ کرایا۔ عربی کے بعد مذہبی اور اخلاقی کتابوں کا بڑا ذخیرہ فارسی میں تھا۔ ان کتابوں کی اشاعت سے علماء اور طلباء کو بہت فائدہ پہنچا اسلامی ممالک میں یہ مطبوعات ہاتھوں ہاتھ لی گئیں اور بعض ممالک کے علماء اور کارکنان مدارس نے فرمائش کر کے متعدد کتابیں طبع کرائیں۔ ایسی مذہبی کتابوں کی تعداد بہت ہے جو فارسی میں شائع ہوئیں ان کی مکمل فہرست موجب طوالت ہے۔ چند نام درج ذیل ہیں۔ تفسیر حسینی ملا کاشفی۔ مشکوٰۃ شریف کی فارسی شرح، اشعۃ اللمعات پانچ جلدوں میں۔ شرح اصول کافی۔ شرح وقایہ۔ قدوری و کنز الدقائق کے فارسی ترجمے اور بہت سی اور کتابیں۔ قرآن کے دو فارسی ترجمے شائع کیے ایک شاہ ولی اللہ دہلوی کا اور دوسرا (جو شیخ سعدی کے نام سے منسوب ہے) ترجمہ اچھا ہے لیکن یہ تصدیق نہیں ہو سکی کہ کس کا ہے۔

فارسی لغت۔ مطبع نول کشور کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے فارسی کے مستند لغت سب سے زیادہ شائع کیے اور بعض فرہنگ و لغات کی تلاش اور اشاعت کا سہرا اسی کے سر ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ فارسی لغات کی ترتیب پر ہندستان میں سب سے زیادہ توجہ کی گئی ایران نے بہت عرصہ بعد اس طرف توجہ کی۔ ان کی ضروریات مدتوں ہندستانی لغت نویسوں کے لغات سے پوری ہوتی رہیں۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ اس فن میں ہندستان نے ایران کو راہ دکھائی۔ منشی نولکشور نے ممتاز لغت نگاروں کے مسودے بڑی محنت سے فراہم کیے اور ان کو نہایت صحت و صفائی کے ساتھ طبع کرایا۔ یہاں صرف

چند لغتوں کے نام درج کیے جاتے ہیں جن سے ایرانی اہل علم آج بھی بے نیاز نہیں ہیں اور ان میں سے اکثر ایران میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن شرف اولیت نولکشور پریس کو ہی حاصل ہے۔

برھان قاطع۔ ہفت قلزم۔ بہار عجم ٹیک چند۔ فرہنگ آنند راج۔ فرہنگ جہانگیری۔ منتخب اللغات۔ - - - - - - کشف اللغات۔ غیاث اللغات، منتہی الادب کامل۔ مصطلحات الشعرا۔ لطائف اللغات۔ **جامع اللغات۔ ترجمہ عربی لغت۔ لغات کشوری** (فارسی اردو) انھوں نے خود مرتب کرا کے شائع کیا۔ منشی نول کشور نے فارسی کا ایک ایسا ضخیم لغت مرتب کرایا تھا جس میں فارسی لفظ کے سامنے اس کے معانی۔ اردو، انگریزی اور ہندی میں لکھے گئے تھے پر ان کے سامنے طبع نہ ہو سکا تھا اور اس کا مسودہ ان کے ورثا کے پاس محفوظ ہے۔[2]

علم طب۔ علم طب کی جتنی مستند کتب فارسی زبان میں لکھی گئی ہیں اتنی کسی دوسری زبان میں نہیں ہیں۔ ان کے علاوہ عربی میں طب کی تمام مستند کتب کے ترجمے بھی فارسی میں کیے گئے۔ منشی نول کشور نے اس فن کو بھی زندہ کیا اور تمام مشہور اور نامور اطبا کی کتابیں شائع کر دیں۔ متعدد کتابوں کا عربی سے فارسی اور اردو میں ترجمہ کرایا۔ مطبع نولکشور نے فن طب کی بھی کتنی خدمت کی ہے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل چند کتابوں سے ہو سکتا ہے:۔

اکسیر اعظم چار جلد از حکیم اعظم خاں دہلوی۔ ترجمہ فارسی کیا۔ قانون بوعلی سینا از ملا نجیب الدین شیرازی۔ ذخیرہ خوارزم شاہی از حکیم بہود محمد سکندر نود حکمی طب کبیر حکیم ار زانی۔ کامل الصناعہ **ابوالحسن علی طبیب۔ شفاء الابدان۔ کفایہ منصوری۔** جامع شفائیہ۔ حکیم افضل علی۔ لغات الادویہ نولکشور کی زندگی میں طب کی تقریباً سو کتابیں شائع ہوئیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ویدک۔ نجوم اور رمل پر کئی کتابیں فارسی میں شائع ہوئیں۔



حواشی

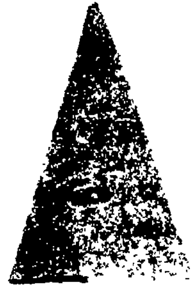
[1] ۱۹۵۴ء میں جب شہنشاہ ایران ہندوستان آئے تھے لکھنؤ کے قیام میں مطبع نول کشور کا معائنہ کیا تھا۔ جہاں راقم الحروف نے مالک مطبع کی جانب سے فارسی مطبوعات کے ساتھ وہ قرآن بھی پیش کیا تھا جس میں دو فارسی ترجمے ہیں۔

[2] راقم الحروف ۱۹۵۵ء میں نولکشور پریس کے غیر مطبوعہ مسودات کی فہرست تیار کرنے وقت اس لغت کو دیکھا تھا جو فل اسکیپ سائز کے تقریباً تین ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔

منشی نول کشور نے دنیا میں پہلے پہل قرآن مجید کی بے نقط تفسیر شائع کی "سواطع الالہام" اس تفسیر کا نام ہے جسے بادشاہ اکبر اعظم کے لائق وزیر فیضی نے فارسی زبان میں تصنیف کیا۔ منشی نولکشور نے دنیا میں پہلے پہل سنسکرت کی عظیم کتابوں "مہابھارت" اور "رامائن" کے فارسی ترجمے شائع کیے۔

پربودھ چندر

منشی نول کشور



فارسی نظم و نثر

منشی نول کشور نے رواج زمانہ کے بموجب فارسی اور اردو کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی ۔ انھیں فارسی ادبیات کا خصوصی ذوق تھا اور وہ اردو انشا پردازی کی جانب ہمیشہ مائل رہے ۔ صحافت اور مضمون نگاری کے ذوق ہی نے نول کشور پریس اور اودھ اخبار کو جنم دیا ۔ اودھ اخبار اردو صحافت کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے ۔ سیاسی نظریات کے ساتھ ساتھ اس اخبار نے علمی و ادبی سرگرمیوں کو بھی فروغ دیا ۔ کتنے ہی ناول اور افسانے اسی اخبار کے ذریعہ عوام تک پہنچے ۔ رتن ناتھ سرشار کا "فسانۂ آزاد" بھی اسی اخبار کی دین ہے ۔ اودھ اخبار حقیقتاً ایک عہد آفریں اخبار ثابت ہوا اور اس نے بہت سے عظیم ادیب و انشا پرداز اردو دنیا کو دیے ۔

منشی جی اپنی طالب علمی کے زمانے ہی سے انشا پردازی کرنے لگے تھے ۔ نول کشور پریس کی تجارتی و کاروباری زندگی میں بھی ان کا یہ شوق جاری رہا اور بقول خود اُن کے اسی شوق نے نول کشور پریس کو جنم دیا ۔ انھیں اپنی ابتدائی عمر ہی سے کتاب حُسن یا حُسن کتاب سے محبت تھی ۔ وہ اہل کمال کی صحبت کے دلدادہ اور ان کے قدردان تھے ۔ انھوں نے مطبع نول کشور کے قیام اور اودھ اخبار کے اجرا کے ذریعہ اپنے زمانے کے کاملان فن کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا ۔ خود ان کا دعویٰ ہے کہ اس تجارت کی غرض و غایت اہل فن کی صحبت حاصل کرنا تھی ۔ ان کا مشرب صلح و آشتی اور ان کا مذہب اتحاد و یک جہتی تھا ۔ وہ ایک انتہائی روشن خیال شخص، دل اور بے لوث انسان تھے اسی لیے ایسے ہی لوگوں کو پسند بھی کرتے تھے ۔

منشی جی نے اردو زبان میں متعدد تحریریں اپنی یادگار چھوڑی ہیں ۔ ایک کتاب "تواریخ نادر العصر" تصنیف کی جس میں اودھ کی تاریخ خصوصاً لکھنؤ کے حالات پر انھوں نے اپنے مشاہدے اور تجربات کی بنیاد پر روشنی ڈالی ہے ۔

ان کی فارسی کتاب "نگار دانش" ابو الفضل کی کتاب "عیار دانش" کا خلاصہ ہے ۔ جو عرصہ تک مدارس و مکاتب کے نصاب میں شامل رہی ۔ انھوں نے امیر خسرو کے فارسی دیوان "عناصر اربعہ" کا دیباچہ بڑی ادیبانہ و منشیانہ فارسی نثر میں لکھا تھا جو متعدد بار شائع ہو چکا ہے ۔

فارسی نظم میں بھی ان کی طبع آزمائی کا نمونہ مثنوی مولانا روم کے منظوم دیباچہ کی صورت میں ملتا ہے جو مثنوی کے پہلے اڈیشن ۱۲۸۲ھ میں شامل ہے ۔ اس دیباچہ میں اکیس اشعار ہیں ۔ ابتدائی اشعار صنعت براعت استہلال میں ہیں اور مصنف کا نام صنعت مراعات النظیر میں ہے ۔ منشی جی نے اس دیباچہ میں اپنے نظریات بھی بیان کیے ہیں جو لائق مطالعہ ہیں ۔

منظوم دیباچہ مثنوی مولانا روم از منشی نول کشور ۔

-۱-

حمد نذر کبریائے ذو الجلال نور او شمس منزہ از زوال

ہم چوں ذرّات، انبیاؑ اولیاء — از تجلّیٔ جمالش پُر ضیا
ہم بقدرِ ظرف در مرآت شان — شد ز نورِ لم یزل لمعی عیان
دانکہ بود آئینہ اش مثل قمر — پرتوِ کامل درو شد جلوہ گر
مصطفیٰؐ شد نامِ او بدر الدّجیٰ — مظہرِ عینیتِ شمس الضحیٰ
نورِ آلِ پاک و اصحاب کبار — عکس مہر از آئینہ شد برجدار
این تکثر در مظاہر کم نگر — وحدتِ خورشید دار اندر نظر

بل اگر چشمِ بصیرت منجلی ست
چشم ہم زان نورِ لامع ممتلی ست

-۲-

بعد ازیں الحان نئے کلکِ دبیر — می سراید نغمۂ ما فی الضمیر
کز دمِ تمسینہ محمود د ملوم — ہست میلِ طبعِ من سوے علوم
شد پسندِ خاطر از بدوِ شباب — یا کتابِ حُسن یا حُسنِ کتاب
ہمدمیٔ مردمِ اہلِ کمال — ہست منظور دلم فی کلّ حال
بہر آن طرحِ مطابع کردہ ام — کاملانِ عصر گرد آوردہ ام
مقصدِ من صحبتِ اہلِ فن است — زین تجارت بس ہمیں نفعِ من ست
ہمتِ من صرف، صرفِ مبلغی — کارِ اہلِ کار جہد المبغی
ہر یکے با خوش دلی مشغول کار — آنچہ در کار است در کار آشکار
ہم جواحیا[1] ربس مطول نسخہ ہا — منطبع گردید با حسن و صفا
رونقِ کار است افزوں ہر زمان — شکرِ داور است، بیرون از بیاں
جیبِ من در حلقۂ تقلید نیست — حاصلِ تحقیق جز توحید نیست
ظاہراً دُور از تجاوز مذہبی — باطناً پاک از تعصب مشربی
حق پرستان مذاہب اجمعین — محترم اندر ضمیرِ حق گزین

---

[1] مراد، احیاء العلوم، امام الغزالیؒ جو چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ عربی کے ساتھ اس کا اردو ترجمہ بھی انھوں نے "مذاق العارفین" کے نام چار ضخیم جلدوں میں شائع کیا۔ یہ ترجمہ منشی نولکشور نے مولانا محمد احسن نانوتوی سے کرایا تھا۔



شاہد میر

کجے قذر

زمانے میں یوں مشتہر کر گیا
ہر اک لفظ کو معتبر کر گیا

بڑا کام تیرا ہنر کر گیا
کہ خود سے مجھے باخبر کر گیا

چمکتے ہوئے نقشِ پا چھوڑ کر
فروزاں ہر اک رہ گزر کر گیا

بڑا مہرباں ابرپارہ تھا وہ
درختوں کو جو باثمر کر گیا

اُدھر روشنی سی بکھرنے لگی
وہ جس سمت اپنی نظر کر گیا

بچایا ہمیں دھوپ کے قہر سے
وہ سایہ سا مثلِ شجر کر گیا

نئی منزلوں کے بتاے سُراغ
کڑی راہ کو مختصر کر گیا



مضطرب نظامی

مشعلِ فردا

(نول کشور کی تصویر دیکھ کر)

رشکِ صد ہوش ہے اردو تری رنگیں تنویر
خوابِ بیدار بنی حسنِ تباب تعبیر
کوئی منظر نہ ہوا کیفِ نظارہ کا اسیر
دستِ فنکار سے کھنچ پائی نہ تیری تصویر

دل کی دھڑکن کا ہر انداز تھا اک رازِ ادب
دامنِ حق میں مچلنے لگی آوازِ ادب
حسنِ انفاس میں پوشیدہ تھی پروازِ ادب
تیرے افکار و خیالات سے ہے نازِ ادب

حسن چہرے پہ ہے شاداب ہیں تیرے بازو
خوب مشاطۂ فطرت نے سنوارے گیسو
سحر و شام کا اندازِ حسیں آج بھی ہے
راہِ مستقبلِ نو تیرا امیں آج بھی ہے
فکر و تحقیق میں عنوانِ یقیں آج بھی ہے
ادبِ خاص کا پائندہ نگیں آج بھی ہے

روشِ عہد میں پیغام رواں ہیں اب تک
لالہ و گل ترے قدموں کے نشاں ہیں اب تک
کس کو بتلائیں کہ کیا طبعِ رواں تھی تیری
دورِ افلاک سے بھی کاہکشاں تھی تیری
شرحِ پاشانِ تبسم بھی فغاں تھی تیری
دہنِ غنچہ و شبنم میں زباں تھی تیری

ذوقِ بیدار کو ترشا ہوا اک رنگ ملا
یہی نقطہ سرِ دیباچۂ فرہنگ ملا
عالمِ نکتہ رس و زینتِ تاریخِ ادب
اودھ اخبار میں کرنوں سے بھرے رنگ عجب
افقِ نو پہ ہے ابھرا ہوا اک مہرِ طرب
اہلِ دانش ہی سمجھتے ہیں ترقی کا سبب

دورِ تاریخ کے اوراق کی ترتیب ہے تو
جس سے کردار سنورتے ہیں وہ تہذیب ہے تو
دانشِ خاص تھی دریوزہ گری کی معراج
اے کشور اب بھی ترے سر پہ ترقی کا ہے تاج
فکرِ عالی کو بھی بخشا ہے عقیدت کا خراج
ایک مستقبلِ نو بن ہی گیا کل کا مزاج

نبضِ ادراک سے بھی تو نے نچوڑا ہے لہو
آبگینے کی طرح چھلکتے ہیں مینا و سبو

رونقِ آب و گلِ دہر ہے کیا کیا تو ہے
جادۂ پیمائے سخن مشعلِ فردا تو ہے

ڈاکٹر اقبال ماہر



کشکولِ آگہی میں وہ لعل و گہر لیے
اک اہلِ ذوق، چشم حقیقت نگر لیے
افلاکِ فکر و فن کے نجوم و قمر لیے
دامن میں اپنے دولتِ علم و ہنر لیے

گمنام اس کے فیض سے مشہور ہو گئے
بجھتے ہوئے چراغ بھی پُر نور ہو گئے

گہوارۂ جمود کو بیدار کر دیا
جو بے زباں تھے ان کو زباں داں بنا دیا
ہر راہ رو کو قافلہ سالار کر دیا
فنکار و نکتہ داں و سخنداں بنا دیا
اہلِ قلم کو صاحبِ دیواں بنا دیا
بزمِ ادب کی شمعِ فروزاں بنا دیا

شہرت کی اس کو حرص نہ تحسین کی ہوس
جوشِ عمل میں سود و زیاں تھا نہ پیش و پس
اس کی نگاہ فہم و فراست تھی دور رس
پائے جنوں کی چاپ میں تھا نغمۂ جرس

تہذیب فن کو ایک نئی زندگی ملی
دنیا میں اہلِ ذوق کو آسودگی ملی

اس نے سمندِ فکر کو مہمیز کر دیا
ذرّے چمک کے بن گئے مہتاب و آفتاب
دشواریوں میں اور قدم تیز کر دیا
قائم رہے گی جن کی زمانے میں آب و تاب
ہر شعبۂ حیات پہ لکھی گئی کتاب
اس مخزنِ ادب کا نہیں آج بھی جواب

معارفِ فن تھا مائلِ تعمیرِ آگہی
چمکی دل و دماغ میں تحریرِ آگہی
قرطاس پر بنائی وہ تصویرِ آگہی
نقش و نگارِ کاتبِ تقدیرِ آگہی

جس کے لہو میں جوش تھا جس کے عمل میں زور
اُس اہلِ دل کا نام ہے منشی نول کشور

ڈاکٹر حنیف نقوی

منشی نول کشور





منشی نول کشور کوئی نامور اور سربرآوردہ ادیب نہیں تھے، پھر بھی ہندستانی ادبیات کی تاریخ میں ان کا مرتبہ کسی مقتدر ترین شخص سے کم نہیں۔ انھوں نے ایک ناشر کی حیثیت سے ہندوستان کے علمی ورثے اور تصنیفی و تالیفی سرمایے کے تحفظ اور نشر و اشاعت کے سلسلے میں جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں وہ ان کا نام ابدالآباد تک زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔ مشرقی علوم و فنون کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس پر ان کی تابناک شخصیت کا پرتو نہ پڑا ہو اور جس سے دلچسپی رکھنے والے ان کے نام سے واقف اور ان کے کام کے قدردان نہ ہوں۔ وہ یکشنبہ ۳ جنوری ۱۸۳۶ء کو متھرا ضلع کے ریڑھا نامی ایک گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے متھرا، آگرہ اور اپنے آبائی وطن ساسنی ضلع علی گڑھ میں حاصل کی۔ دس سال کی عمر میں انھیں انگریزی تعلیم کے حصول کے لیے ساسنی سے آگرہ بھیجا گیا۔ آگرے کے قیام کے دوران نول کشور نے درسیات کی تکمیل کے علاوہ مضمون نگاری اور صحافت میں غیر معمولی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ اسی دلچسپی کی بنا پر وہ صحافت کو بطور پیشہ اختیار کرنے کے عزم کے ساتھ پندرہ سولہ سال کی عمر میں بحیثیت مہتمم اخبار "سفیر" آگرہ کے عملے میں شامل ہو گئے۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد اخبار "کوہ نور" کے ایڈیٹر منشی ہرسکھ رائے نے انھیں لاہور بلا لیا جہاں انھوں نے کوہ نور پریس اور اخبار کوہ نور کو ترقی دینے میں اپنی بھرپور انتظامی صلاحیتوں اور غیر معمولی پیشہ ورانہ مہارت کا ثبوت دیا۔ ۱۸۵۷ء میں جب ملک میں ہر طرف بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے اور زندگی کا ہر شعبہ انتشار و اختلال کی زد میں آ گیا تو وہ لاہور سے آگرہ چلے آئے۔ اس وقت وہ عمر کی بائیسویں منزل میں تھے۔

قیام لاہور کے دوران منشی نول کشور کو پریس، اخبار اور اس سے متعلق کاموں کے سلسلے میں جو تجربہ ہوا تھا، اس کی بنیاد پر انھوں نے آگرہ میں اپنا پریس قائم کرنے کا منصوبہ بنایا لیکن حالات کی ناسازگاری کے باعث وہ اسے عملی شکل نہ دے سکے۔ جب بے یقینی کی کیفیت ختم ہوئی تو وہ آگرہ سے لکھنؤ چلے آئے اور یہاں انھوں نے راجہ مان سنگھ کی کوٹھی واقع حضرت گنج میں اس عظیم الشان پریس کی بنیاد رکھی جسے ابتدا میں "مطبع اودھ اخبار" کے نام سے شہرت حاصل ہوئی اور آج ہم "مطبع نول کشور" یا "نول کشور پریس" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ "اختر شاہنشاہی" (مطبوعہ اختر پریس لکھنؤ، طبع ۱۸۸۸ء، ص ۲۰) کے مطابق اس مطبع کا قیام ۲۳ نومبر ۱۸۵۸ء کو عمل میں آیا تھا۔[1] اگرچہ اس دن رسمی طور پر مطبع کی بنیاد پڑ گئی تھی لیکن "اودھ اخبار" اور کتابوں کی طباعت و اشاعت کا کام غالباً کچھ دنوں کے بعد شروع ہوا۔ "اودھ اخبار" کی چوتھی اور پانچویں جلدوں کے بعض مسلسل شماروں کے متعلق جو معلومات سامنے آئی ہیں، ان کی روشنی میں یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ایک ہفت روزہ کی حیثیت سے اس کا پہلا شمارہ چہارشنبہ ۵ جنوری ۱۸۵۹ء کو منظر عام پر آیا ہوگا۔ یہ اخبار پریس کا اشتہاری جریدہ بھی تھا اور اردو صحافت نگاری میں ایک نئے عہد کا نقیب بھی۔

اپنی اس دوگونہ حیثیت کی بنا پر اسے ملک کے علمی و ادبی حلقوں میں بہت جلد وہ مقبولیت حاصل ہو گئی جس کا یہ واقعتاً مستحق تھا۔

مرزا غالب سے منشی نول کشور کا اولین تعارف غالباً "اودھ اخبار" ہی کے ذریعے ہوا۔ ان کی تحریروں میں اس کا قدیم ترین حوالہ منشی شیو نرائن آرام کے نام ۱۲ نومبر ۱۸۵۹ء کو لکھے ہوئے ایک خط میں ملتا ہے۔ غالب گورنر جنرل اور لفٹننٹ گورنروں کے دوروں کے پروگرام، "دربار کی صورت" اور "خیر خواہوں کو تقسیم انعام" نیز "کسی نئے بندوبست" کے اجرا جیسی اطلاعات و کیفیات سے خود کو باخبر رکھنے کے لیے پابندی کے ساتھ اخبارات کے مطالعے کے عادی تھے۔ چونکہ رسل و رسائل کے محدود ذرائع کی بنا پر ایک شہر کے کسی اخبار کا دوسرے تمام شہروں تک عمومیت کے ساتھ پہنچنا ممکن نہ تھا، اس لیے ان کے بعض احباب اور تلامذہ بھی انھیں حسب موقع مقامی اور غیر مقامی اخبارات بطور ارمغاں بھیجتے رہتے تھے۔ جس زمانے میں منشی شیو نرائن کے نام متذکرہ بالا خط لکھا گیا ہے، گورنر جنرل لکھنؤ اور قرب و جوار کے اضلاع کا دورہ کر رہے تھے، اور غالب کو ان کے اس دورے کی تفصیلات مطلوب تھیں۔ آرام نے اسی سلسلے میں انھیں "اودھ اخبار" کا ایک شمارہ جس میں غالباً "لکھنؤ کے دربار کا حال" شائع ہوا تھا، عاریتاً ارسال کیا تھا۔ اس کے جواب میں غالب نے انھیں لکھا کہ

"آج پنجشنبہ ۱۲ نومبر کو لفافۂ اخبار آیا۔ یہ اخبار بھائی ضیاء الدین خاں کے ہاں آتا ہے اور وہ میرے پاس بھیج دیا کرتے ہیں۔ اس کی حاجت نہیں، اپنے اور میرے ٹکٹ کیوں برباد کرو بلہ۔"

غائبانہ تعارف کے اس مرحلے سے گزرنے کے بعد جولائی ۱۸۶۰ء میں غالباً منشی میاں داد خاں سیاح کی وساطت سے منشی نول کشور اور غالب کے درمیان براہ راست روابط قائم ہوے۔ نول کشور کے اولین نامۂ شوق کے جواب میں غالب نے چہار شنبہ ۱۸ جولائی ۱۸۶۰ء کو ان کے نام جو خط لکھا ہے، اس میں بغیر کسی حوالہ و تعارف کے سیاح کے بارے میں یہ جملہ کہ "بہ اقبال نشان، میاں داد خاں سیاح دعائی فرستم" اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مکتوب الیہ اپنے خط میں ان کا تذکرہ کر چکے تھے۔ سیاح ان دنوں لکھنؤ میں مقیم اور منشی نول کشور کے مہمان تھے۔ سفر لکھنؤ سے قبل وہ کچھ دنوں تک دہلی میں قیام کر کے غالب کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو کر ان سے رشتۂ نیازمندی استوار کر چکے تھے۔ اس وقت تک غالب کے اردو دیوان کے دو ایڈیشن دہلی کے مطبع سید الاخبار (اکتوبر ۱۸۴۱ء) اور مطبع دار السلام (مئی ۱۸۴۷ء) سے شائع ہو چکے تھے۔ اور تیسرے ایڈیشن کی طباعت کا معاملہ زیر غور تھا جس کے لیے میرٹھ کے ایک ناشر عظیم الدین نے ان سے دیوان کی نقل حاصل کر لی تھی۔ گمان غالب یہ ہے کہ قیام دہلی کے دوران سیاح اور غالب کے درمیان اس موضوع پر بھی گفتگو ہوئی ہو گی۔ دہلی سے لکھنؤ پہنچنے کے بعد انھوں نے غالب کو جو پہلا خط لکھا، اس میں دیوان کی اس تیسری اشاعت کے متعلق بھی دریافت کیا تھا۔ غالب نے ۱۱ جون ۱۸۶۰ء کو اس کے جواب میں انھیں لکھا کہ

" دیوان کا چھاپا کیا؟ وہ شخص ناآشنا موسوم بہ عظیم الدین جس نے مجھ سے دیوان منگا بھیجا، آدمی نہیں، بھوت ہے، پلید ہے، غول ہے۔ قصہ مختصر سخت نامعقول ہے۔ مجھ کو اس کے طور پر انطباع دیوان نامطبوع ہے۔ اب میں اس سے دیوان مانگ رہا ہوں اور وہ نہیں دیتا۔ خدا کرے ہاتھ آجائے، تم بھی دعا مانگو۔"

غالب نے دیوان کا یہ نسخہ مارچ ۱۸۶۰ء کے اواخر میں رام پور سے دلی واپس آنے کے بعد "ایک آدمی کے ہاتھ" نواب مصطفیٰ خاں کی وساطت سے عظیم الدین کو بھیجا تھا۔ اس کے فوراً بعد ہی مطبع مفید خلائق آگرہ کے مالک منشی شیو نرائن آرام نے اس کی طباعت کے لیے سلسلہ جنبانی شروع کر دیا تھا۔ دیوان کی واپسی کا مطالبہ غالباً اسی تحریک کا نتیجہ تھا۔ چنانچہ سیاح کے نام ۱۱ جون کو محولہ بالا خط تحریر کیے جانے کے دو ہفتے کے اندر ہی انھیں یہ دیوان واپس

مل گیا اور انھوں نے ۲۵ جون کو اسے بذریعہ پارسل آگرہ روانہ کر دیا۔ اس اثنا میں سیاح کا ایک اور خط موصول ہوا جس کے جواب میں انھوں نے شنبہ ۳۰ جون ۱۸۶۰ء کو انھیں "بہت خوشی سے" یہ اطلاع دی کہ

" اردو کا دیوان غاصب ناانصاف سے ہاتھ آ گیا اور میں نے نورچشم منشی شیونرائن کو بھیج دیا۔ یقین کلی ہے کہ وہ چھاپ میں گئے۔ جہاں تم ہوگے، ایک نسخہ تم کو پہنچ جائے گا۔"

دیوان سے متعلق دریافت و تجسس کا یہ سلسلہ اس جانب رہبری کرتا ہے کہ غالب کی طرح سیاح بھی اس کے ایک صحیح اور صاف ستھرے ایڈیشن کی طباعت سے دلچسپی رکھتے تھے اس لیے ممکن ہے کہ انھوں نے اس سلسلے میں اپنے طور پر منشی نول کشور سے بھی تبادلۂ خیال کیا ہو۔ قرائن کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی اس وساطت سے ہی نول کشور اور غالب کے درمیان براہِ راست روابط کی راہ ہموار ہوئی۔ چنانچہ اسی زمانے میں انھوں نے غالب کو پہلی بار ایک اشتیاق آمیز خط لکھا جو اگرچہ محفوظ نہیں تاہم غالب کے جواب کی روشنی میں اس کے مشتملات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ غالب نے اپنے اس جوابی مکتوب مورخہ چہارشنبہ ۱۸ ماہ جولائی ۱۸۶۰ء میں سلسلۂ مراسلت کی اس استواری پر اظہارِ مسرت میں جس سرگرمیٔ شوق کا مظاہرہ کیا ہے، اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس خط کی صورت میں انھیں منھ مانگی مراد مل گئی ہو یا آبِ حیات کے کسی متلاشی سے خضر نے خود آگے بڑھ کر اپنا تعارف کرا دیا ہو خط کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

" بنامیزد امروز سخن می گویم با کسے کہ دیدہ و دلش تا دیدہ (کذا: ندیدہ) است و دل بمہرش گرویدہ۔ دیدہ دید ار جوے اوست و روے دل بسوے او۔ بر سر سواد این نامہ کہ از دوست بمن رسید، میان مردم چشم و سویدا اے دل ستیزہ روئے داد۔ آن می خواست کہ ہمہ اورا باشد و این می جست تا ہمہ برباید۔ من درمیان آمدم و از پرخاش باز داشتم تا دہر، یکے بہرہ برگرفت و آشتی پدید آمد۔ دیدہ را فروغ مبارک و دل را فراغ ارزانی۔" (کلیات نثر غالب، طبع چہارم ص ۲۵۴)

منشی نول کشور کا متذکرہ مکتوب اوّل غالباً فارسی میں تھا اور انھوں نے غالب سے بھی یہ فرمائش کی تھی کہ وہ اس کا جواب "پارسی آمیختہ بہ تازی" میں تحریر فرمائیں۔ غالب اس سے کئی برس پہلے فارسی میں خطوں کا لکھنا ترک کر چکے تھے کیونکہ "پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی و جگرکاوی کی قوت باقی نہیں رہی تھی۔" اس کے باوجود انھوں نے اس فرمائش کا احترام کرتے ہوئے انھیں اس کا جواب اپنی تمام انشا پردازانہ صلاحیتوں کو مجتمع کر کے فارسی ہی میں لکھا اس کے ساتھ ہی ان الفاظ میں موجودہ صورت حال کی صراحت بھی کر دی کہ

" در پارسی زبان بسا سخن گفتہ ام و ہم نامہ ہا نگاشتہ۔ اکنون کہ دل از ناتوانی بگالشت، برمن تا بہ کار بر خود آسان کردہ ام و ہر چہ می باید نبشت، در اردو می نویسم۔ گوئی گفتار در نامہ فرو می پیچم۔ بہ دوست می فرستم۔ حاشا کہ در اردو زبان نیز سخن آرائی و خود نمائی آئین باشد۔ آنچہ با نزدیکان تواں گفت، بہ دوراں نوشتہ می شود۔ مدعا ہماں گزارشِ مدعاست و دیگر ہیچ۔ اینکہ فرمان شما پذیرفتم و درنامہ بپارسی آمیختہ بتازی سخن گفتم۔"

اپنے اندازِ مکتوب نگاری کے متعلق اس وضاحت کے ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی لکھا کہ اگر میری فارسی نثر کے دیکھنے کا اشتیاق ہے تو میرے مطبوعہ "نامہ ہائے نامی" دیکھے جائیں جو لکھنؤ میں بھی یقیناً بعض حضرات کے پاس موجود ہوں گے۔ لکھتے ہیں:۔

" سہ نسخہ در نثر دارم، پنج آہنگ و مہر نیمروز و دستنبو۔ نشگفت کہ در لکھنؤ نیز مردم این نامہ ہائے نامی داشتہ باشند۔ اگر ذوقِ نگریستنِ نگارشِ پارسی دارند، چرا ایں سوا ہا را فراہم نیارند۔"

نول کشور نے اس خط میں غالباً ان سے "اودھ اخبار" کی خریداری قبول کرنے کی بھی درخواست کی تھی۔ غالب نے ان کے جواب میں انھیں لکھا کہ

" رسیدنِ اودھ اخبار از اں سو در ہر ماہ چہار بار و رسیدنِ زر باز ازیں سو دو ہر سال دو بار، اگر منظور دارند منظور است۔"

منشی جی نے غالب سے اودھ اخبار میں اشاعت کے لیے ان کی چند فارسی غزلیں بھی طلب کی تھیں، اس فرمائش کے جواب میں رقم طراز ہیں کہ

" بہ دوستے گفتہ ام تا بہ پارسی غزلے چند نوشتہ دہد ہمیں کہ بہم آرد، بسوئے شما رواں می دارم"

اس خط سے اودھ اخبار کی خریداری کے لیے غالب کی آمادگی کے بارے میں جو اطلاع ملتی ہے، وہ اس امر کی آئینہ دار ہے کہ وہ منشی نول کشور اور مطبع اودھ اخبار سے مستقل اور پائدار ربط کی استواری کے خواہشمند تھے۔ اس خط سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس مرحلے پر اخبار کے سالانہ چندے کے سلسلے میں ان کے ساتھ کوئی رعایت برتی گئی تھی لیکن بعد میں رفتہ رفتہ جب ان کے اور منشی نول کشور کے درمیان تعلقات زیادہ مستحکم ہو گئے تو انھیں اخبار کی قیمت کی ادائگی سے مستثنیٰ کر دیا گیا اور صرف ڈاک خرچ وصول کیا جانے لگا۔ اخبار کے لیے مقامی خریداروں سے بارہ روپیہ اور باہر والوں سے پندرہ روپیہ سالانہ وصول کیا جاتا تھا۔ چنانچہ جناب عتیق صدیقی کی تحریر کے مطابق ۵ فروری ۱۸۶۲ء کے شمارے میں "ابتدائے نومبر ۱۸۶۱ء سے لغایت آخر جنوری ۱۸۶۲ء" سالانہ چندہ ارسال کرنے والوں کی جو فہرست شائع ہوئی ہے، اس میں "نواب اسد اللہ خاں صاحب بہادر غالب" کے نام کے آگے صرف تین روپے کی رقم درج ہے۔ اس سلسلے میں خود غالب نے ۱۳ دسمبر ۱۸۶۳ء کو نواب علاء الدین خاں علائی کے نام لکھے ہوئے ایک خط میں یہ اطلاع فراہم کی ہے کہ

" دو برس سے (منشی نول کشور) ہر مہینے میں چار اخبار مجھ کو بھیجتے ہیں، قیمت نہیں لیتے مگر ہاں اڑتالیس ٹکٹ میں مطبع پہنچا دیا کرتا ہوں۔"

اس بیان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نام اعزازی طور پر اخبار کے اجرا کا سلسلہ ۱۸۶۲ء کے اوائل میں شروع ہوا تھا اور اس سے قبل ڈیڑھ برس تک وہ اس کا مکمل سالانہ چندہ ادا کرتے رہے تھے، ورنہ تین روپے کی معمولی رقم دو قسطوں میں ادا کرنے کی شرط فہم سے بالاتر معلوم ہوتی ہے۔ بعد کے زمانے کے مختلف خطوط سے جن میں اس اخبار کا ذکر آیا ہے، یہ پتا چلتا ہے کہ یہ اخبار انھیں اواخر عمر تک برابر ملتا رہا اور وہ پابندی اور دلچسپی کے ساتھ اس کا مطالعہ کرتے رہے۔ مرزا تفتہ کو ۱۲ فروری ۱۸۶۵ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ

"منشی (نول کشور) صاحب کو میرا سلام کہنا۔ آج یکشنبہ ہے اخبار کا لفافہ ابھی تک نہیں پہنچا۔ ہر ہفتے پنجشنبہ حد جمعہ کو پہنچتا ہے۔"

مکتوب بنام میر ولایت علی، مہتمم مطبع عظیم المطابع پٹنہ مورخہ ۳ اپریل ۱۸۶۵ء میں رقم طراز ہیں:۔

" از روئے اودھ اخبار لکھنؤ بوستانِ خیال کا ترجمہ مسمّیٰ بہ پرستانِ خیال آپ کے مطبع میں آمادۂ انطباع (ہونا) بلکہ دو جلدوں کا منطبع ہو جانا اور دونوں نسخوں کا بہ قیمت ایک روپیہ کے بہ شرطِ ارسال محصول ڈاک ہاتھ آنا معلوم ہوا۔"

منشی حبیب اللہ خاں ذکا کے نام دوشنبہ ۱۶ شعبان ۱۲۸۳ھ (۱۱ جنوری ۱۸۶۷ء) کے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

" اودھ اخبار میں ایک قصیدہ مولوی غلام امام (شہید) کا دیکھا۔۔۔ مدح مختار الملک میں متضمنِ استدعائے مسکن و مبلغ۔ پھر مہینے بعد اسی اودھ اخبار میں یہ خبر دیکھی کہ نواب نے مسکن تو نہ بدلا مگر تیس روپیہ مہینہ بڑھا دیا۔ اسی اخبار میں پھر دیکھا گیا کہ ایک صاحب نے مولوی غلام امام کے کلام پر اعتراض کیا ہے اور ان کے شاگرد وضیع تخلص نے اس کا جواب لکھا ہے۔"

میاں داد خاں سیاح کو ۱۳ مارچ ۱۸۶۷ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں

"صاحب میں نے اودھ اخبار میں دیکھا کہ چھوٹے صاحب (غلام بابا خاں) مقدمہ جیتے اور بمبئی کے صاحبوں میں ان کی افزائش جاہ و جلال و تعظیم و توقیر کمال ہوئی۔"

منشی نول کشور اور مرزا غالب کے درمیان جولائی ۱۸۶۰ء میں خطوط کے باہم تبادلے کے ساتھ براہ راست رابطے اور تعلقات کا جو دور شروع ہوا، اس کے پہلے ایک سال کی روداد کے بارے میں تمام ذرائع خاموش ہیں۔ اس عرصے میں منشی شیو نرائن آرام کے مطبع مفید خلائق کے بجائے محمد حسین خاں کے مطبع احمدی دہلی کے منتظم محمد حسین خاں کے زیر اہتمام دیوان اردو کا تازہ ایڈیشن بیوپن محرم الحرام ۱۲۷۸ھ (۲۹ جولائی ۱۸۶۱ء) کو طبع ہو کر منظر عام پر آ گیا۔ غالب نے میر مہدی مجروح کو اس کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا کہ

"کلیات اردو کا چھاپا تمام ہوا، اغلب ہے کہ اسی مہینے میں ایک نسخہ بسبیل ڈاک تمھیں پہنچ جائے گا۔ کلیات نظم فارسی کے چھاپنے کی بھی تدبیر ہو رہی ہے۔ اگر ڈول بندھ گیا تو وہ بھی چھاپا جائے گا۔ قاطع برہان کے خاتمے میں کچھ فوائد بڑھائے گئے ہیں۔ اگر مقدور مساعدت کرے گا تو میں بے شرکت غیر اس کو چھپواؤں گا، مگر یہ خیال محال ہے میرے مقدور کی تیاری کا حال مجتہد العصر (میر سرفراز حسین) کو معلوم ہے۔"

اس خط کی تحریر کے وقت تک اگرچہ دیوان اردو کا چھاپا تمام ہو چکا تھا لیکن اس کی کوئی جلد شاید مرزا غالب کے پاس نہیں آئی تھی۔ جب حق تصنیف کی ایک جلد انھیں ملی تو وہ اس کی کتابت و طباعت سے بے حد مایوس ہوئے۔ چنانچہ ۸ اگست ۱۸۶۱ء کو مجروح کے نام کے خط میں انھوں نے ان الفاظ میں اس کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کیا :-

"دیوانِ اردو چھپ چکا ہے۔ ہائے! لکھنؤ کے چھاپے خانے نے جس کا دیوان چھاپا، اس کو آسمان پر چڑھا دیا حسنِ خط سے الفاظ کو چمکا دیا۔ دلی پر اور اس کے بانی پر اور اس کے چھاپے پر لعنت۔ صاحب دیوان کو اس طرح یاد کرنا جیسے کوئی کتے کو آواز دے۔ مگر کاپی دیکھتا رہا ہوں، کاپی نگار اور تھا، متوسط جو کاپی میرے پاس لایا کرتا تھا، وہ اور تھا۔ اب جو دیوان چھپ چکے، حق تصنیف ایک مجھ کو ملا۔ غور کرتا ہوں تو وہ الفاظ جوں کے توں ہیں یعنی کاپی نگار نے نہ بنائے۔ ناچار غلط نامہ لکھا وہ چھپا۔ بہ حال خوش و ناخوش کئی جلدیں مول لوں گا۔"

اس خط میں غالب نے لکھنؤ کے چھاپے خانے یعنی مطبع نول کشور کی مطبوعات کے حسن کتابت و طباعت کے بارے میں جو خیالات ظاہر کیے ہیں اور دلی کے مطابع کو جس طرح ہدف ملامت بنایا ہے، اسے پڑھ کر معاً یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کے دل میں مطبع نول کشور سے اپنی بعض کتابوں کی اشاعت کی خواہش شدت کے ساتھ سر ابھار رہی تھی۔ پچھلے خط سے یہ بات ہمارے علم میں آ چکی ہے کہ اس وقت ان کے پاس کم از کم دو کتابیں یعنی "کلیات نظم فارسی" اور "قاطع برہان" طباعت کے لیے تیار تھیں اور انھیں چھاپنے کی تدبیر میں بھی ہو رہی تھیں۔ وہ اس کوشش میں برابر سرگرم تھے۔ چنانچہ چند دنوں کے بعد جمعہ ۴ اکتوبر ۱۸۶۱ء کے خط میں مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں کہ

"برہان قاطع کے اغلاط بہت نکالے ہیں۔ دس جزو کا ایک رسالہ لکھا ہے، اس کا نام قاطع برہان رکھا ہے۔ اب اس کے چھاپنے کی فکر ہے۔ اگر یہ مدعا حاصل ہو گیا تو ایک جلد چھاپے کی تم کو بھیج دوں گا۔"

اس خط سے صاف ظاہر ہے کہ تا دم تحریر ان کی اس خواہش کی تکمیل کا کوئی ڈول نہ بندھ پایا تھا۔ بعد میں یہ رسالہ اور کلیات نظم فارسی، دونوں کتابیں مطبع نول کشور سے شائع ہوئیں۔ غالب نے سید بدر الدین کاشف کے نام ایک خط میں ان کی طباعت کی روداد اس طرح بیان کی ہے :-

"۱۸۶۲ء میں یعنی سال گزشتہ قاطع برہان چھپی۔

پچاس جلدیں میرے مول میں ..... فارسی کا دیوان بیس پچیس برس کا عرصہ ہوا، جب چھپا تھا پھر نہیں چھپا مگر ہاں سال گزشتہ میں منشی نول کشور نے شہاب الدین خاں کو لکھ کر کلیات فارسی جو ضیاء الدین خاں نے غدر کے بعد بڑی محنت سے جمع کیا تھا، وہ منگا لیا اور چھاپنا شروع کیا۔ وہ پچاس جزو ہیں یعنی کوئی مصرع میرا اس سے خارج نہیں اب سنا ہے کہ وہ چھپ کر تمام ہو گیا ہے۔ روپے کی فکر میں ہوں، ہاتھ آجائے تو بھیجوں، بھیج کر بیس جلدیں منگوا لوں۔"

"قاطع برہان" خاتمۃ الطبع کے مطابق ۲۰ رمضان ۱۲۷۸ھ (مطابق ۲۲ مارچ ۱۸۶۲ء) کو چھپ کر تمام ہوئی تھی۔ دیوان کی طباعت کا کام اس کے تقریباً چودہ مہینے بعد ماہ ذی قعدہ ۱۲۷۹ھ مطابق مئی ۱۸۶۲ء میں مکمل ہوا۔ یہ خط بظاہر اسی زمانے میں لکھا گیا ہے۔ چونکہ اس خط میں قاطع برہان کے زمانۂ طباعت کے سلسلے میں ۱۸۶۲ء کی تعبیر سال گزشتہ سے کی گئی ہے، اس لیے دوسری جگہ بھی سال گزشتہ سے یہی سنہ مراد لے کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ منشی نول کشور نے یہ دیوان شہاب الدین احمد خاں سے ۱۸۶۲ء میں حاصل کیا تھا۔ لیکن چونکہ غالب عموماً سالِ ہجری کے مطابق حساب کرنے کے عادی ہیں، اس لیے ان دونوں مقامات پر سال گزشتہ سے ۱۲۷۸ھ مراد لینا زیادہ مناسب ہوگا، جس کی ابتدا غالب کے بیان کے مطابق "بقول تعزیہ داراں سہ شنبہ ۱۱ جولائی ۱۸۶۱ء کو اور" از روئے رویت "چہار شنبہ ۱۲ جولائی ۱۸۶۱ء کو ہوئی تھی"۔ گویا مرزا تفتہ کو ۲۴ اکتوبر ۱۸۶۲ء کو لکھے ہوئے محولہ بالا خط کی تحریر کے کچھ دنوں بعد ہی ان دونوں کتابوں کی طباعت کی ایک مناسب اور خاطر خواہ سبیل نکل آئی تھی۔ یکم جنوری ۱۸۶۲ء کے "اودھ اخبار" میں ان دونوں کتابوں کے اشتہارات بھی اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ ۱۸۶۱ء کے ختم ہوتے ہوتے یعنی زیادہ سے زیادہ جمادی الآخر ۱۲۷۸ھ تک ان کی طباعت کے سلسلے کے تمام معاملات طے پا چکے تھے۔ اودھ اخبار کے مذکورۂ بالا شمارے میں کلیات کا اشتہار اردو میں اور قاطع برہان کا اشتہار فارسی میں شائع ہوا ہے۔ کلیات کے اشتہار سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت تک اس کی کتابت وطباعت کا کام شروع نہیں ہوا تھا۔ یہ اشتہار اخبار کے صفحۂ اول پر چھاپا گیا ہے اور اس اشاعت سے متعلق تمام ممکنہ تفصیلات کو محیط ہے۔ چند غیر اہم جملے حذف کر کے یہ اشتہار سطور ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:-

"..... آویزۂ گوش جہاں ہو، نزدیک و دور عیاں کہ نواب مرزا اسد اللہ خاں صاحب غالب دہلوی کا فارسی کلیات مطبوع ہوا چاہتا ہے۔ نقش و نگار اس دل آرا رنگیں ادا کا عن قریب شروع ہوا چاہتا ہے۔ اقسام سخن پر مشتمل ہے۔ ہر ایک شعر فرد کمال (کذا در کامل) ہے یعنی مضامین قصائد لاجواب، رنگین غزلیں انتخاب کہ انھیں دیکھ کر ظہیر کا کمال بھول جائیے، نظیری کی شوکت کبھی خیال میں نہ لائیے۔ مثنوی کی جادو بیانی میں جائے گفتگو نہیں، سحر حلال زلالی کی اس کے سامنے آبرو نہیں۔ رباعیوں کو پیکر سخن کے اربع عناصر کہیے، آب دار قطعات کو قطعات جواہر کہیے۔ ہر بیت شاہد بادہ سیائے معنی کا گھر ہے، ہر مصرع قدِ موزوں سے بڑھ کر ہے۔ دس ہزار چار سو کئی اشعار، کہ سب سلکِ گوہر شاہوار ہیں۔ خدا کے فضل سے نسخہ وہ صحیح و درست بڑے کتب خانہ کا ہاتھ آیا، جس کو نواب ضیاء الدین خاں صاحب بہادر دہلوی نے جد و جہد تمام سے جمع فرمایا۔ مقبول آفاق کو تعریف کی حاجت نہیں، آفتاب کی صفات بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ناظم کی بے مثلی آشکار ہے، عالم کو ان کی استادی کا اقرار ہے۔ اس زمانے میں سحبان ثانی ہیں، جواب انوری و خاقانی ہیں۔ نقطہ ان کے قلم کا اخترِ اوجِ کمال ہے، جو سخن زبان سے نکلا، سحر حلال ہے۔ ایسی نادر چیز کہاں میسر آتی ہے، کس خوش نصیب کی یہ امید بر آتی ہے۔ دیکھیے ہم دریا بار کے ڈھیر لگائے دیتے ہیں۔ موتی کوڑیوں کے مول لٹاتے

دیتے ہیں۔ سب کتاب تقریباً چالیس جزمیں چھپے گی بعض مقام مناسب پر تصویر مصنف کھنچے گی۔ شروع طبع میں قیمت بھیجنے والے سے (تین روپے چار آنے) کو پائیں گے، چھپ چکنے کے بعد پورے صرف پانچ روپے) مقرر ہوجائیں گے۔ غالباً اہل ہنر سنتے ہی اہتزاز میں آئیں گے، چھپنے تو دو، ہاتھوں ہاتھ اٹھالے جائیں گے اشتہار دینے کا یہ سبب ہے، صرف اتنا ہی مطلب ہے کہ درخواست بھیجنے والوں کو اطمینان بکسر رہے گا، پہلے ان کا استحقاق مدنظر رہے گا۔ اگر ابھی سے طلب گار ہوں، کمی قیمت کے حصہ دار ہوں۔ فقط[۵]"

"قاطع برہان" کا اشتہار کلیات کے اشتہار کے معاً بعد شائع ہوا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک اس کی طباعت کا کام اختتام کے قریب پہنچ چکا تھا اور دو ہفتے کے اندر اس کے منظر عام پر آجانے کی امید تھی۔ اشتہار کے خاص خاص مندرجات درج ذیل ہیں:

"ارباب فرہنگ و ہنر را مژدہ باد ... کہ ... اعلیٰ نقاد جوہر تحقیق، روشن گر آئینۂ تدقیق، آموزگار جلیل المناقب نواب اسد اللہ خاں غالب ... پانغزہائے برہان از تمام کتاب چیدہ ہنجار اقامت وانمودہ وجا ہائے کہ رہوار شیر سکندری خوردہ، عنان آگہی بر متارہ سودہ۔ حاصل کز لانش برآوردہ باصلاح پرداخت و ہمہ را جمع نمودہ رسالۂ مختصر ساخت ...... طبع ایں کتاب کہ ازدہ جز بیش نباشد، قریب اختتام رسیدہ۔ یقیں کہ در دو ہفتہ طیار گردد .... ہر کرا شوق دامن دل کشد، بہ خریداری پردازد و مناسب ست کہ درخواست فرستادہ از پیش تر آگاہ سازد۔ رعایت سبق برندگان مدنظر شد، ایں زماں یک روپیہ قیمتش مقرر شد۔ فقط[۶]"

کلیات کا اشتہار یکم جنوری کے بعد کم از کم اکتوبر ۱۸۶۲ء تک دوبارہ کسی پرچے میں شائع نہیں ہوا، اس کے برخلاف قاطع برہان کا اشتہار ۹ اپریل تک برابر مختلف شماروں میں شائع ہوتا رہا۔ چونکہ خاتمۃ الطبع کے مطابق کتاب ۲۲ مارچ کو چھپ کر تیار ہوگئی تھی، اس لیے ۲۶ مارچ اور بعد کے شماروں میں اسے "اشتہار اختتام قاطع برہان" کے زیر عنوان شائع کیا گیا ہے۔ ان شماروں میں "یقیں کہ در دو ہفتہ طیار گردد و قابل تماشائے اولی الابصار گردد" کو حذف کر کے یہ خوش خبری دی گئی ہے کہ "اینکہ نوید بگوش سخن سنجان رسانم کہ طبعش بانجام رسیدہ"

قاطع برہان کی اشاعت کے زمانے تک ایک منفرد شاعر اور ممتاز ادیب کی حیثیت سے غالب کی شہرت ملک کے دور دراز گوشوں تک پہنچ چکی تھی۔ مزید برآں اس کتاب اور کلیات نظم فارسی کے اعلان طباعت کے ساتھ ان کا نام مطبع اودھ اخبار کے حلقۂ مصنفین میں بھی شامل ہوگیا تھا، اس لیے ان سے متعلق خبریں اور ان کے نتائج فکر وقلم بھی اخبار میں نمایاں طور پر شائع کیے جانے لگے تھے۔ چنانچہ ۱۲ مارچ ۱۸۶۲ء کے شمارے میں "نواب مرزا اسد اللہ خاں غالب" کے عنوان سے ایک خبر شائع ہوئی ہے جو ملکۂ وکٹوریہ کے شوہر پرنس البرٹ (متوفی ۱۴ دسمبر ۱۸۶۱ء) کی تعزیت کے سلسلے میں ان کے اظہار تاثرات سے تعلق رکھتی ہے۔ اس خبر کا ذریعہ نامعلوم ہے لیکن اس کے بیان کے لیے جو طویل تمہید باندھی گئی ہے، اس کے بعض مندرجات واضح طور پر اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ یہ تمام تفصیلات منشی نول کشور کے نام اپنے کسی خط میں خود غالب ہی نے فراہم کی ہوں گی۔ تقریباً ایک سال کے بعد اودھ اخبار ہی میں شائع شدہ ان کا ایک اور خط جو آئندہ سطور میں پیش کیا جائے گا، اس قیاس کو تقویت بخشتا ہے۔ خبر کا مکمل متن حسب ذیل ہے:

"سب جانتے ہیں، کچھ حاجت دلیل نہیں، کہ آج ہندستان میں ان کا عدیل نہیں۔ فصاحت وبلاغت میں سحبان ثانی ہیں، فن شعر میں جواب انوری وخاقانی ہیں۔ زمین سخن کو آسمان پر پہنچایا، ہر نقطے کو اختر اوج معانی بنایا۔ زور فکر ان کا جہان میں مشہور ہے، نتائج طبع عالی کا آوازہ دور دور ہے، جناب جہانیان مآب ملکۂ معظمۂ ہند وانگلینڈ کی مداحی میں وہ پایۂ بلند

ومرتبۂ ارجمند پایا کہ ابتدائے عمل داریٔ سرکار سے کسی ہندستانی کے لیے اس کا دسواں حصّہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ کیفیت نواب ممدوح نے خود لکھی ہے، اپنی کتاب دستنبو میں مفصل بیان کی ہے آگے ایک قصیدہ ملکۂ معظمہ کی شان میں کہا تھا، وہاں تو ہر کمال کی قدر دانی ہے، کھلا ہوا باب فیض رسانی ہے۔ جب فیض یاب سماعت ہوا، منظور نگاہ مرحمت ہوا جو دو نوال کی طرف ہمت آئی، صلۂ شاہانہ دینے پر طبیعت آئی۔ فروری ۱۸۵۰ء میں جناب رسل کلارک صاحب بہادر نے مصنف کو انگریزی چٹھی لکھی۔ ولایت سے ڈاک پہنچ کر اس نوید سراپا امید سے خبر دی کہ تمہارے قصیدے کے انعام کا مقدمہ زیر غور ہے۔ عن قریب خطاب پاؤ گے، بعد صدور حکم انڈیا گورنمنٹ اس کی اطلاع پاؤ گے۔ ناگاہ سنہ مذکور میں سرزمین ہند پر آسمان ٹوٹا، فوج حوادث نے بالکل متاع امید کو لوٹا، بہتیرے بے گناہ یوں زیر آسیائے گردوں پسے، جس طرح چکی کے پاٹ کے تلے گیہوں پسے۔ کیا آغاز تھا، کیا انجام ہوا کہ ہر متر صد بھی ناکام ہوا۔ نواب صاحب کا وہ معاملہ گویا خواب تھا ع

جب آنکھ کھلی تو کچھ نہ دیکھا

عجب نہیں کہ پھر دولت سلطانی پھر توجہ فرمائے، عین حالت یاس میں لطف خسروانی سے امید برآئے۔

اس تقریب میں ایک ذکر دلچسپ کہ ان دنوں جب تعزیت شاہزادۂ عالی پایۂ گاہ عالم گیر تھی، دلی میں ایک ورق بخط انگریزی لکھا ہوا اور اس کے ساتھ دوسرا ورق سادہ پیش گاہ حکام سے مشاہیر شہر کے پاس پہنچا، ہر ایک نے اپنا نام لکھ دیا۔ نواب صاحب نے اس راہ سے کہ صاحب سخن ہیں، مدحت سرائے ملکۂ زمن ہیں۔ یہ شعر فی البدیہہ کہا ہوا لکھ کر مہر کر دی ؎

شاد عالی گوہر گوہر پاکش صدحیف
و نیکنا چارسر وند بجا کش صد حیف[۴۵]

اس خبر کی اشاعت کے چھ ہفتے بعد ۲۳ اپریل ۱۸۶۲ء کے شمارے میں غالب کا ایک سیاسی نوعیت کا مضمون شائع ہوا جو "آفتاب عالم تاب" سے نقل کیا گیا تھا۔ جناب عتیق صدیقی کے الفاظ میں اس مضمون کی محرک ہندستان پر افغانستان کے حملے کی تیاریوں کی افواہیں تھیں جنھیں پڑھ کر اور سن کر ہندستانی عوام ذہنی انبساط محسوس کرتے تھے۔[۴۶] غالب نے جو کچھ ہی دنوں پہلے "سرزمین ہند میں موج زن دریائے خوں" کے ایک عینی شاہد تھے، پیش نظر مضمون میں اس قسم کی خوش فہمیوں کو نا عاقبت اندیشی سے تعبیر کرتے ہوئے اپنے ہم وطنوں کو عہد جدید کی ترقیات کی طرف توجہ دینے اور ان کی برکات سے مستفید ہونے کا مشورہ دیا ہے۔ کم سے کم دو ممتاز اخباروں میں شائع ہونے کے باوجود یہ مضمون غالباً اپنی ادبی نوعیت کی بنا پر غالب کے کسی مجموعۂ نگارشات میں جگہ نہ پا سکا اور پہلی بار عتیق صدیقی صاحب کے ایک مضمون "ذکر غالب - ۱۸۶۲ء کے اودھ اخبار میں" مشمولہ سہ ماہی "غالب نامہ" شمارہ ۲ و ۴ کی وساطت سے منظر عام پر آیا ہے۔ یہاں اس کا اعادہ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ البتہ اس کے بارے میں مدیر اخبار کے تمہیدی نوٹ کے چند جملے جن کا تعلق براہ راست غالب کی ذات سے ہے اور جن سے اس کی غایت نگارش اور اخبار میں اشاعت کے محرکات کی وضاحت ہوتی ہے، سطور ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔ اس نوٹ میں "صحائف اخبار" کی افسانہ طرازی اور ہندستانیوں کی کم عقلی پر اظہار افسوس کے بعد لکھا گیا ہے کہ:

"آج کل دانائے روزگار، سرآمد اولی الابصار، ارسطو فطرت فلاطون فطنت، جناب والاشان، عالی مناقب مرزا اسد اللہ خان غالب نے جن کی سلامت ذہن مستقیم پر قسم کھائیے۔ استقامت رائے سلیم کے صدقے جائیے، نا فہموں کی فہمائش میں ایک نثر تحریر فرمائی ہے۔ ہمارے مضمون خیالی سے توارد ہوا، ایسی تقریر فرمائی ہے، ہم اس کو درج اخبار کرتے ہیں، اہل جہاں پر آشکار کرتے ہیں۔"[۴۷]

اودھ اخبار میں یہ مضمون "نثر" ہی کے زیر عنوان شائع ہوا ہے۔

"قاطع برہان" کے اختتام طباعت کی خوشخبری جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا جا چکا ہے، اس مضمون کی اشاعت سے تقریباً

ایک ماہ پہلے شائع ہو چکی تھی۔ غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اعلان کے باوجود کتاب اواخر اپریل تک پوری طرح تیار نہ ہو پائی تھی۔ چنانچہ انھوں نے ۱۵ مئی ۱۸۶۲ء کو اپنے شاگرد عزیز میر غلام حسنین قدر بلگرامی کو جو اس وقت لکھنؤ میں مقیم اور مطبع نول کشور سے وابستہ تھے، لکھا تھا کہ:

"قاطع برہان کے اجزا کی جلدیں بندھ گئی ہیں یا نہیں اگر بندھ گئی ہوں تو جناب منشی صاحب سے کہہ کر جو پچاس جلدیں میں نے لی ہیں ان میں سے ایک جلد لے کر ۔ ۔ ۔ قبلہ و کعبہ جناب مجتہد العصر کی خدمت میں حاضر ہو اور میری طرف سے کورنش عرض کرو اور کتاب نذر کرو۔"

اس خط کے لکھنؤ پہنچتے تک جلد سازی کا کام مکمل ہو چکا تھا چنانچہ نمونے کی ایک جلد ۱۵ مئی ۱۸۶۲ء سے قبل غالب کو مل گئی تھی۔ اسی تاریخ کو میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "قاطع برہان کا چھاپا ختم ہو گیا۔ ایک جلد بطریق نمونہ آ گئی ہے میں نے پچاس جلدوں کی درخواست پہلے سے دے رکھی ہے اب پچاس روپے بھیجوں تو پچاس جلدیں منگواؤں۔ دیکھیے نومن تیل کب میسر ہو اور رادھا کب ناچے؟"

نمونے کی اس ایک جلد کے پہنچنے اور قدر بلگرامی کے جوابی مکتوب سے قبلہ و کعبہ کی نذر کی رسید نیز ان کا "مہری و دستخطی توقیع" وصول پانے کے بعد غالب نے انھیں مطبع سے مزید ایک جلد حاصل کر کے مفتی میر عباس صاحب کی خدمت میں پیش کرنے کی ہدایت کی اور لکھا کہ،

"منشی صاحب سے کہہ دینا کہ پچاس میں سے تین جلدیں میں نے پائیں۔ اب قیمت کا روپیہ بھیج کر سینتالیس اور منگا لیتا ہوں۔"

منشی عبدالغفور سرور کے نام ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ان جلدوں کی قیمت ادا کرنے کے لیے رقم کی فراہمی کی یہ مہم ماہ جون کے اواخر تک یا تو سر ہو چکی تھی یا جولائی کے اوائل میں اس کے سر ہو جانے کی کوئی قطعی صورت نکل آئی تھی، اس خط میں انھوں نے اطلاع دی تھی کہ:

"قاطع برہان کے مجلدات جو بموجب توقیع خریداری میری ملک ہیں، وہ اول جولائی میں میرے پاس اور ان میں سے دو مجلد آخر جولائی میں آپ کے پاس پہنچیں گے۔"

برہان قاطع کی طباعت کا مرحلہ تو چند مہینوں کے اندر طے ہو گیا لیکن کلیات نظم فارسی کی کتابت و طباعت بعض وجوہ کی بنا پر برابر تعویق میں پڑتی رہی۔ غالب کے متعدد خطوط اس امر کے شاہد ہیں کہ وہ اپنی کتابوں کی طباعت میں کتابت کی صحت و نفاست پر بالخصوص اور ان کی مجموعی آرائش و زیبائش پر بالعموم بہت زیادہ زور دیتے تھے اور صاحبان مطبع کو بار بار ان امور پر توجہ مرکوز رکھنے کی ہدایت کرتے رہتے تھے۔ غالباً منشی نول کشور سے بھی انھوں نے اسی شرط کے ساتھ معاملات طے کیے تھے اور انھیں کلیات کا ایک ایسا قلمی نسخہ فراہم کیا تھا جو ان کے تمام کلام کا جامع اور کاتبوں کے دخل و تصرف سے پاک تھا۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں کو جنھوں نے غدر کے بعد دوسری مرتبہ محنت کر کے اسے بڑے اہتمام کے ساتھ مرتب کیا تھا، اپنی اس متاع عزیز کو منشی نول کشور کی طلب پر ان کے حوالے کرنے میں تامل تھا۔ انھیں اندیشہ تھا کہ یہ نسخہ اگر ضائع ہو گیا تو آئندہ اس سارے کلام کا یکجا کرنا بہت دشوار ہو گا۔ غالب نے جس طرح منت سماجت کے ذریعہ انھیں اس قسم کے توہمات بے جا اور اندیشہ ہائے دور دراز سے صرف نظر کر کے یہ مجموعۂ کلام منشی صاحب کے سپرد کر دینے پر آمادہ کیا تھا، اس کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل خط سے کیا جا سکتا ہے، لکھتے ہیں:

"آپ کو دیوان کے دینے میں تامل کیوں ہے؟ روز آپ کے مطالعہ میں نہیں رہتا بغیر اس کے دیکھے آپ کا کھانا ہضم نہ ہوتا ہو سو یہ بھی نہیں، پھر آپ کیوں نہیں دیتے؟ ایک جلد ہزار جلد بن جائے، میرا کلام شہرت پائے، میرا دل خوش ہو، تمھاری تعریف کا قصیدہ اہل عالم دیکھیں، تمھارے بھائی کی تعریف کی نثر سب کی نظر سے گزرے، اتنے فوائد کیا تھوڑے ہیں؟ رہا کتاب کے تلف ہونے کا اندیشہ یہ خفقان ہے، کتاب کیوں تلف ہو گی؟ احیاناً اگر ایسا ہوا اور دلی لکھنؤ کی عرض راہ میں ڈاک لٹ گئی تو

میں فورم آبہ سبیل ڈاک رام پور جاؤں گا اور نواب فخرالدین خاں مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان تم کو لا دوں گا۔ اگر یہ کہتے ہو کہ اب وہاں سے لے کر بھیج دوں وہ یہ کہیں گے کہ وہ میاں سے کیوں نہیں بھیجتے؟ ہاں یہ لکھوں کہ نواب ضیاء الدین خاں صاحب نہیں دیتے تو کیا وہ نہیں کہہ سکتے کہ جب وہ تمھارے بھائی اور تمھارے قریب ہو کر نہیں دیتے تو میں اتنی دور سے کیوں دوں؟ اگر تم یہ کہتے ہو کہ تفضل سے لے کر بھیج دو، اگر وہ نہ دیں تو میں کیا کروں؟ اگر دیں تو میرے کس کام؟ پہلے تو ناتمام پھر ناقص بعض بعض قصائد اس میں سے اور کے نام کر دیئے گئے ہیں اور اس میں اسی ممدوحِ سابق کے نام پر ہیں۔ شہاب الدین خاں کا دیوان جو یوسف مرزا لے گیا ہے، اس میں یہ دونوں قباحتیں موجود، تیسری یہ کہ سراسر غلط، ہر شعر غلط، ہر مصرع غلط۔ یہ کام تمھاری مدد کے بغیر انجام نہ پائے گا، اور تمھارا کچھ نقصان نہیں۔ ہاں احتمالِ نقصان، وہ بھی از روئے وسوسہ و وہم، اس صورت میں میں تلافی کا کفیل، جیسا کہ اوپر لکھ آیا ہوں۔ بہرحال راضی ہو جاؤ اور مجھ کو لکھو تو میں طالب کو اطلاع دوں، اور طلب اس کی جب دوبارہ ہو تو کتاب بھیج دوں۔ رحم و کرم کا طالب، غالبؔ۔"

ظاہر ہے کہ جو نسخہ ہر اعتبار سے دوسرے تمام دستیاب نسخوں سے فائق و ممتاز تھا اور جس کے حصول کے لیے غالبؔ کو رحم و کرم کی دریوزہ گری کی سطح تک نیچے اترنا پڑا تھا، اس کی بہ حفاظت واپسی کے لیے انھوں نے کیسی کیسی پیش بندیاں نہ کی ہوں گی اور اپنی عادت کے موافق صحتِ کتابت اور حسنِ طباعت پر کس قدر اصرار نہ کیا ہو گا۔ منشی نول کشور نے ان ہدایات و خواہشات کے پیشِ نظر کلیات کی کتابت تصحیح اور طباعت کی ذمہ داری یقیناً مطبع کے بہترین کارکنوں کے سپرد کی ہو گی لیکن سوءِ اتفاق سے ساٹھ صفحات کا چھاپا تمام ہونے کے بعد کاتب چھٹی لے کر اپنے گھر چلا گیا اور مولوی ہادی علی مصحح بیمار پڑ گئے۔ غالبؔ نے ۱۵؍مئی ۱۸۶۲ء کے محولہ بالا خط میں میر مہدی مجروحؔ کو اس صورتِ حال سے باخبر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"کلیات کے چھاپے کی حقیقت سنو۔ ساٹھ صفحات چھاپے گئے تھے کہ مولوی ہادی علی مصحح بیمار ہو گئے۔ کاپی نگار رخصتی اپنے گھر گیا۔ اب دیکھیے کب چھاپا شروع ہو۔"

کلیات کی طباعت کے کام میں یہ تعویق جو متذکرہ ناگہانی اسباب کا نتیجہ تھی، غالبؔ کے لیے انتہائی تکلیف دہ اور مایوس کن تھی۔ ان کی صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی، اس لیے وہ چاہتے تھے کہ یہ کام جلد از جلد ان کی زندگی میں پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔ دوسری طرف منشی نول کشور اپنی ایک ناقابلِ عبور مجبوری اور احساسِ ندامت کی وجہ سے شاید بالکل خاموش تھے۔ غالبؔ نے اس سکوت کو توڑنے کے لیے قدر بلگرامی کی وساطت کا سہارا لیا اور ۵؍مئی ۱۸۶۲ء کے خط میں انھیں لکھا کہ:

"اس رقعہ کی تحریر سے مراد یہ ہے کہ جناب منشی صاحب سے میرا سلام کہیے اور یہ رقعہ ان کو پڑھا کر عرض کیجیے کہ غالبؔ پوچھتا ہے کہ فارسی کے کلیات کا چھاپا ملتوی ہے یا جاری ہے؟ ملتوی ہے تو کب تک کھلے گا؟ جاری ہے تو تصحیح کس طور پر ہے؟ قصیدۂ اور تاریخِ کلیات کا مطبع میں پتہ لگا ہے یا نہیں؟

منشی صاحب کے چاروں سوالوں کا جواب اور مولوی ہادی علی صاحب کا جو حال معلوم ہو، وہ بھی ضرور لکھنا اور اس خط کا جواب جلد بھیجنا۔"

معلوم ہوتا ہے کہ اس خط کے جواب میں چھاپے کا کام جلد ہی دوبارہ شروع ہونے اور اختتامِ سال تک مکمل ہو جانے کی توقع ظاہر کی گئی تھی اور اس کی تاریخِ انطباع نظم کر کے بھیجنے کے لیے کہا گیا تھا۔ اس کے جواب میں ۲۴؍مئی ۱۸۶۲ء کے خط میں لکھتے ہیں کہ:

"کلیات کے انطباع کی تاریخ میں کیوں لکھوں؟ اہلِ مطبع کو خدا منشی صاحب کے سایۂ عاطفت میں سلامت رکھے، کہہ لیں گے چھاپا ۷۸ (۱۲۷۸ھ) میں شروع ہوا، ۷۹ (۱۲۷۹ھ) میں تمام ہو گا، مولوی ہادی علی صاحب کے مطبع میں آنے کا حال تم لکھو اور کلیات کے کاپی نگار کے آنے کا بھی حال معلوم کر کے لکھو۔"

متذکرہ بالا یقین دہانی کے باوجود تعطل کی یہ کیفیت بدستور کچھ دنوں

تھا برقرار رہی اور غالب کا ذہن جو "اضمحلال قویٰ" اور "استیلائے ضعف" کے باعث ہر لمحہ "فکر مرگ اور غم عقبیٰ" سے پراگندہ و منتشر ہو چکا تھا کشمکش انتظار سے مایوسی جاوید کی سمت میں سفر کرنے لگا۔ نواب علاء الدین خاں علائی کے نام ۱۹ جون ۱۸۶۲ء کو لکھے ہوئے ایک خط میں انھوں نے اپنی اس مایوسی کا ان الفاظ میں اظہار کیا ہے:

"کلیات کے انطباع کا اختتام اپنی زیست میں مجھ کو نظر نہیں آتا۔"

کلیات کا قلمی نسخہ جس سے پریس کے لیے کاپی لکھی جا رہی تھی رضا لائبریری رام پور کے لوہارو کلکشن میں محفوظ ہے۔ اس کی صحیح حالت میں دوہائی اس امر کا پتہ دیتی ہے کہ کتابت کا کام کسی انتہائی سلیقہ مند کاتب کے سپرد کیا گیا تھا[۱۱] اندازہ یہ ہوتا ہے کہ منشی نول کشور غالب کی بے تابی اور ناراضگی کے باوجود کسی دوسرے شخص سے یہ کام لینے کے لیے تیار نہ تھے۔ کیونکہ اس صورت میں اصل نسخے کے خراب ہونے اور ردو خطوں میں کتابت کی وجہ سے مطبوعہ نسخے کی نفاست پر حرف آنے کا احتمال تھا اور یہ دونوں صورتیں نواب ضیاء الدین احمد خاں اور غالب کی ناخوشی، مطبع کی بدنامی اور اپنی شرمساری کے خیال کی بنا پر ان کے لیے بہرحال ناقابل قبول تھیں۔ چنانچہ کتابت و تصحیح کتابت اور اس کے نتیجے میں چھاپے کا کام کاتب اور مصحح کے اپنی ذمہ داریاں دوبارہ سنبھال لینے تک برابر رکا رہا، حتیٰ کہ ایک سال چار مہینے سے بھی کچھ زیادہ کے وقفے کے بعد ۱۳ مئی ۱۸۶۳ء کے اودھ اخبار میں پہلی بار یہ اعلان کیا گیا کہ کلیات کی طباعت پایۂ اختتام کو پہنچ چکی ہے۔ یہ اشتہار الفاظ اور جملوں کے معمولی سے فرق اور رد و بدل کے ساتھ بعینہٖ یکم جنوری ۱۸۶۲ء کے اخبار میں شائع شدہ اشتہار کی نقل تھا۔ وقت اور محل کی مناسبت سے اس میں جو تبدیلیاں کی گئی تھیں، ان کی تفصیل یہ ہے:

یکم جنوری ۱۸۶۲ء کے اشتہار میں ناظرین کو اس "مژدہ" کے ساتھ مخاطب کیا گیا تھا کہ:

"آویزۂ گوش جہاں ہو، نزدیک و دور عیاں ہو کہ نواب مرزا اسد اللہ خاں صاحب غالب دہلوی کا فارسی کلیات مطبوع ہوا چاہتا ہے، نقش و نگار اس نگار خانۂ رنگیں اور اکاغذ دستہ بستہ شروع ہوا چاہتا ہے۔"

۱۳ مئی ۱۸۶۳ء کے اشتہار میں اس منصوبے کی تکمیل پر یہ "نئی بشارت سنائی گئی" کہ:

"نواب مرزا اسد اللہ خاں صاحب بہادر غالب دہلوی کا فارسی کلیات مطبوع ہو کر انجام کو پہنچا، نقش و نگار اس دلارام رنگیں اور اکا اختتام کو پہنچا۔"

اشتہار مطبوعہ یکم جنوری ۱۸۶۲ء کا آخری حصہ جو "سب کتاب چالیس جز پر چھپے گی" سے شروع ہوا "کی قیمت کے حوالے پر" ختم ہوتا ہے، اس دوسرے اشتہار کے لیے ازسرنو لکھا گیا ہے جس کی بدلی ہوئی شکل حسب ذیل ہے:

"تمام کتاب ۴۸/۱ جز میں چھپ کر تیار ہے اور نقشہ تصویر مصنف بھی یادگار ہے۔ رسالۃ میں سوائے محصول ڈاک قیمت سے پہلے تین روپیہ تھا۔ آئندہ قرار دیا تھا اور بعد ختم کتاب صرف پانچ روپیہ درج اخبار کیا تھا، اب ہوکہ زیادہ عام منظور ہوا، قیمت کا گھٹانا ضرور ہوا۔ لہٰذا بجائے پیشگی قیمت وصول سے انھیں تطبیق محصول نہ دے جائے گی، مطبع سے ٹکٹ لگا کر کتاب ارسال کی جائے گی، اور جو صاحب اب طلب کریں گے، ان سے علاوہ چار روپیہ قیمت لیں گے، اور متعدد جلدوں کے خریدار کی رعایت بھی ملحوظ ہے، ان کا حساب علیحدہ فہرست میں محفوظ ہے[۱۲]۔"

اس اعلان کے بعد بھی تصویر تیار نہ ہو پانے کی وجہ سے کلیات کا "شائقین میں تقسیم ہونا" چند دنوں تک ملتوی رہا۔ تین ہفتے کے بعد ۳ جون کے اخبار کے ذریعے یہ اطلاع دی گئی کہ:

"بوجہ عدم طیاری تصویر جناب مرزا صاحب موصوف کلیات بخدمت شائقان تقسیم ہونا ملتوی تھا، اب طیار ہوگئی اور عنوان کتاب میں بموقع مناسب لگائی گئی۔ اس ہفتے سے بخدمت شائقان ارسال ہے۔ اب اس متاع گراں بہا کو با ہمیا ارزانی کہ متاع نیک دکان میں ہے ہاتھوں ہاتھ لیں، فرصت غنیمت جانیں[۱۳]۔"

مختصر عبارت سے لفظی رد و بدل کے ساتھ اسی قسم کا اشتہار اودھ اخبار میں بھی شائع ہوا۔ ان اشتہاروں کی روشنی میں یہ بات قطعی طور پر طے ہو جاتی ہے کہ تقریباً ڈیڑھ برس کے انتظار کے بعد جون ۱۸۶۳ء کے اوائل میں "کلیاتِ غالب" کی یہ پہلی اشاعت ہر اعتبار سے مکمل ہو کر بازار میں آچکی تھی لیکن مرزا غالب تک اس کے پہنچنے میں مزید کچھ دن لگ گئے۔ علائی کے نام کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی چند جلدیں غالباً نواب ضیاء الدین احمد خاں کے طور کلمی نسخے کے ساتھ پہلے لوہارو پہنچیں اور ان میں سے کچھ جلدیں وہاں سے دلّی آ کر غالب کی یہ جلدیں ۲۰ ستمبر ۱۸۶۳ء کو جو اس خط کی تاریخ تحریر ہے یا اس سے ایک دو روز قبل موصول ہوئی تھیں، غالب نے ان کی دستیابی کی رسید کے طور پر اس خط میں لکھا تھا کہ:

"پہلے خدا اور پھر بتوسط برخوردار علی حسین خاں جلد کلیات فارسی پہنچی۔ حیرت ہے کہ چار روپے قیمتِ کتاب اور چار آنے محصول ڈاک، تا ابتدائے انطباع تھی۔ اب آ کر پانچ روپے قیمت اور پانچ آنے محصول قرار پائے۔ خیر، جہاں سو وہاں سوا سو۔ میرا حال یہ ہے اور تمھارا حال مجھے معلوم ہے۔ ایں ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگر۔

اب کے مہینے میں شاید نہ دے سکوں۔ نومبر سنہ حال میں پچاس تمھارے پاس پہنچ جائیں گے۔"

یہ خط لکھتے وقت غالباً یہ بات غالب کے ذہن سے نکل چکی تھی کہ پہلے اشتہار کے مطابق چھاپا تمام ہونے کے بعد طلب کرنے والوں کے لیے قیمت مزید پانچ روپے ہی مقرر کی گئی تھی۔ چونکہ ابتدائی ساٹھ صفحات پہلے ہی چھپ چکے تھے، اس لیے سرورق پر پہلی اعلان شدہ قیمت درج کی گئی ہوگی۔ "رفاہِ عام" کی غرض سے اسے گھٹا کر چار روپے کرنے کا اعلان ۱۳ مئی ۱۸۶۳ء کے اشتہار میں کیا گیا تھا جو طباعت مکمل ہو جانے کے بعد جاری ہوا تھا۔

کلیات کی طباعت میں غیر معمولی تاخیر نے اگرچہ غالب کو منشی نول کشور کی طرف سے کسی قدر بددل کر دیا تھا لیکن علائی کے نام کے خط کے علاوہ دوسرے خطوط میں انھوں نے اس سلسلے میں اپنے جذبات کو ہر طرح قابو میں رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ منشی جی کو ناراض کرنا خلافِ مصلحت تصور کرتے تھے۔ اس عرصے میں دونوں کے درمیان غالباً براہِ راست مراسلت بہت کم ہوئی البتہ بالواسطہ نامہ و پیام کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ قدر بلگرامی کے نام کے خطوط اس حقیقت کے شاہد ہیں۔ خود قدر بلگرامی کی مطبع نول کشور سے وابستگی بھی غالب ہی کی سعی و سفارش کا نتیجہ تھی۔ ۱۸۶۲ء کے اوائل میں کسی وقت جب کہ وہ بے روزگار اور تلاشِ معاش میں سرگرداں تھے، غالب نے انھیں لکھا تھا کہ:

"تم بہت دن سے بیکار رہو، ایک جگہ مساعدتِ روزگار کی صورت ہے۔ تم بے تکلف میرا یہ رقعہ مہری لے کر لکھنؤ چلے جاؤ۔ مطبع اودھ اخبار میں میرے شفیق دلی یعنی منشی نول کشور صاحب سے ملو اور یہ رقعہ ان کو پڑھوا دو۔ اپنی نظم و نثر ان کو دکھاؤ، اور اپنا مبلغ علم ان پر ظاہر کرو۔ اگر وہ اپنی مرضی کے موافق تم کو کارگزار سمجھیں گے تو مطبع کا کام تمھارے سپرد کر دیں گے۔ مشاہرہ خاطر خواہ تم کو مقرر ہو جائے گا۔ معزز و مکرم رہو گے، زندگی کا لطف اٹھاؤ گے۔"

غالب نے اس خط میں جس اعتماد اور بے تکلفی کا اظہار کیا تھا وہ موثر ثابت ہوئی اور قدر مطبع میں ملازم رکھ لیے گئے لیکن مشاہرہ غالباً ان کی توقع سے کم مقرر ہوا تھا اس لیے انھوں نے غالب کو لکھا کہ منشی صاحب کو لکھ کر اس میں کچھ اضافہ کرا دیں تاکہ وہ اپنے اخراجات پورے کرنے کے ساتھ ساتھ گھر والوں کی بھی کسی قدر کفالت کر سکیں۔ غالب نے اس کے جواب میں انھیں صبر سے کام لینے کا مشورہ دیتے ہوئے لکھا:

"چند روز صبر کرو۔ اگر وطن میں ہوتے تو اس بیکاری میں گز کیا لیتے۔ جس طرح جب گزرتی، اب بھی گزر جائے گی بلکہ تمھارا خرچ کم ہو گیا۔ بہرحال ابھی اضافے کے واسطے نہ تم کہو، نہ میں لکھوں۔ دو چار مہینے کام کرو، اس اثنا میں اگر بلگرام میں چھاپے خانہ جاری ہو گیا تو استعفا دے کر چلے جائیو۔ یہاں بھی چند روز کے اضافہ ہونا بھی حیزِ امکان سے باہر نہیں۔"

قدر کے توسط سے نامہ و پیغام کے علاوہ غالب اس زمانے میں خاص خاص مواقع پر منشی نول کشور کو براہِ راست بھی خط لکھ

رہے۔ چنانچہ تفتہ کے نام کے ایک خط ہی سے جو ہمارے اندازے کے مطابق چہار شنبہ ۱۱ جون ۱۸۶۲ء کو لکھا گیا تھا، یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے اسی دن منشی نول کشور کو بھی کسی سلسلے میں مبارکباد کا خط لکھا تھا۔ اس خط میں لکھتے ہیں کہ:

"اس وقت آپ کی وحشت انگیز تحریر پہنچی۔ ادھر اس کو پڑھا ادھر یہ خط میں اور ایک مرزا عباس کو اور ایک خط تہنیت کا منشی صاحب کو لکھا لیکن چونکہ بلاد شرقیہ کو ڈاک لوٹ کر روانہ ہوتی ہے، ناچار یہ تینوں خط بند کر کے تمہارا اور مرزا عباس کا خط بیرنگ اور منشی جی کا خط پیڈ رکھ چھوڑتا ہوں کل صبح کو بعد از طلوع آفتاب ڈاک میں بھجوا دوں گا۔"

غالب کو "ہمیشہ نواب گورنر جنرل کی سرکار سے دربار میں سات پارچے اور تین رقم جواہر خلعت ملتا تھا"۔ غدر کے بعد "باغیوں سے اخلاص" کے جرم میں جو خود غالب کے الفاظ میں "مظنۂ محض" تھا، انھیں پنشن کے علاوہ اس اعزاز سے بھی محروم کر دیا گیا تھا۔ پنشن تو کچھ دنوں کے بعد جاری ہو گئی لیکن "لاٹ صاحب کا دربار اور خلعت جو معمولی اور مقرری تھا، عرصے تک مسدود" رہا۔ غالب اس کی بحالی کے لیے سرگرمی کے ساتھ کوشاں تھے۔ فروری ۱۸۶۳ء کے اواخر میں نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب دلی آئے اور انھوں نے وہاں دربار کیا، "ناگاہ دربار کے تیسرے دن" غالب کی طلبی ہوئی اور جب وہ حاضر خدمت ہوئے تو "جو بات تصور میں تو کیا تمنا میں بھی نہ تھی، وہ حاصل ہوئی"۔ لفٹنٹ گورنر نے وقت رخصت خلعت سے سرفراز کیا اور یہ مژدہ بھی سنایا کہ "گورنر جنرل بہادر کے ہاں بھی دربار اور خلعت کھل گیا، انبالے جاؤ گے تو پاؤ گے"۔ یہ غیر متوقع اور خلاف امید خوشی ایسی نہ تھی کہ جس میں غالب اپنے احباب کو شریک نہ کرتے چنانچہ باوجود اس کے کہ بہ سبب ہاتھ میں پھوڑے کی غیر معمولی تکلیف کی وجہ سے وہ انبالے نہ جا سکے، انھوں نے اپنے متعدد دوستوں اور شاگردوں کو خطوط لکھ کر "یاوری اقبال" کی اس کارفرمائی سے مطلع کیا۔ منشی نول کشور ان کے کرم و شفیق دوست ہونے کے علاوہ ایک کثیر الاشاعت اخبار کے مالک بھی تھے جس کے ذریعے وہ اس نوید مسرت کو زیادہ آسانی سے عام کر سکتے تھے اور گورنمنٹ کی اس عنایت و نوازش کے تشکر میں ان کے جذبات ممنونیت کو بالواسطہ حکام اعلیٰ تک پہنچانے میں بھی مددگار ہو سکتے تھے۔ چنانچہ غالب نے انھیں جو خط لکھا اس میں اہتمام سے ان دونوں مصلحتوں کو ملحوظ رکھا تھا۔ منشی جی نے ان کی خواہش کے عین مطابق یہ خط ۵ مارچ ۱۸۶۳ء کے اودھ اخبار میں شائع کر دیا تھا۔ یہاں سے "اردوئے معلّٰی" مرتبہ جناب افضل زیدی کے حوالے سے سطور ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے:

"منشی صاحب جمیل المناقب جناب منشی نول کشور صاحب کو دولت و اقبال و جاہ و جلال روز افزوں نصیب ہو

چونکہ احباب کامیابی و شادکامی احباب سے شاد ہوتے ہیں، اس واسطے مجھے ان دنوں میں یاوری اقبال سے ایک امر خوشی کا پیش آیا ہے، تو آپ کی خوشی کے واسطے لکھتا ہوں بلکہ نظر بہ تذکرۂ اتحاد پر تم کو تہنیت دیتا ہوں۔

آپ کو مبارک ہو کہ اواخر ماہ گزشتہ کو جو حضرت فلک رفعت نواب معلی الالقاب لفٹنٹ گورنر بہادر قلمرو پنجاب دلی میں تشریف لائے تو پنجشنبہ کے دن ۲ مارچ ۱۸۶۲ کو اس گمنام گوشہ نشین کو یاد فرمایا اور از راہ بندہ پروری کمال عنایت سے خلعت عطا کیا۔

سبحان اللہ! جو لوگ متعلق ہیں لفٹنٹ گورنر پنجاب سے وہ قسمتوں کے کتنے اچھے ہیں۔ جناب نواب معلی الالقاب کے مکارم اخلاق وہ روح افزا کہ جس سے مردہ زندہ ہو جائے۔ صاحب والا مناقب ٹامس ڈگلس فورسائیڈ صاحب بہادر سکرتر کے کلمات شفقت آمیز وہ روح آسا کہ جن کے بیمار شفا پائے۔ میں ...... شادمان آیا بلکہ بوڑھا گیا، جوان آیا۔ سچ ہے:-

وزیرے چنیں، شہریارے چناں
جہاں چوں نہ گیرد قرارے چناں

...... لفٹنٹ گورنر بہادر اور صاحب سکرتر بہادر کا کیا کہنا ہے... آفتاب و ماہتاب ہیں مگر پنڈت من پھول سنگھ صاحب میر منشی

بھی دیانت و امانت و کارپردازی و ظلوم نوازی میں انتخاب ہیں۔ یہ نہ مبالغہ ہے نہ خوشامد ہے، بیانِ واقعی ہے۔ شاعرانہ سخن سازی کو میں نے دخل نہیں دیا ہے، وہ لکھا ہے جو سچ اور واجبی ہے فقط۔

دوامِ دولتِ سرکارِ انگریزی کا طالب
رنجورِ ناتواں، اسد اللہ خاں غالب"[14]

یہ خط اودھ اخبار میں منشی نول کشور کے ایک تمہیدی نوٹ کے ساتھ شائع ہوا تھا جو درج ذیل ہے:

"بخت مند ہر زمانے میں کامیاب ہوتے ہیں، اہلِ جوہر تعظیم و تکریم کو انتخاب ہوتے ہیں۔ دیکھیے ان دنوں میں سرکار نے کیسی مہربانی کی، کمال قدر دانی کی۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے مرزا اسد اللہ خاں غالب کو خلعت فاخرہ عطا فرمایا اور رئیس نوازی کی نظر سے بہ دل التفات کر کے ہم چشموں کو ان کا اعزاز و اکرام دکھایا۔ زیادہ کیا احتیاجِ بیان ہے، ان کے خط سے یہ حال عیاں ہے۔"[15]

طرفین کی جانب سے اس غائبانہ مظاہرۂ اخلاص و اتحاد سے بخوبی ظاہر ہے کہ دونوں کے درمیان جو سلسلۂ روابط جولائی ۱۸۶۰ء میں باہم تبادلۂ خطوط کے ساتھ قائم ہوا تھا، وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کافی مربوط و مستحکم ہو چکا تھا، لیکن "روئش نہ دیدہ و دل بہرش گرویدہ" والی کیفیت ہنوز برقرار تھی۔ حسنِ اتفاق سے تھوڑے ہی دنوں کے بعد دسمبر ۱۸۶۳ء کے اوائل میں منشی نول کشور کا بسلسلۂ کاروبار دہلی جانا ہوا اور وہ وہاں ہفتے عشرے کے قریب مقیم رہے۔ اس عرصے میں ان کے اور غالب کے درمیان کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ غالب کے بعض خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان سے مل کر ان کے حسنِ صورت اور حسنِ سیرت دونوں سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ منشی جی کو ابھی دہلی میں وارد ہوئے ایک دو روز ہی ہوئے تھے کہ غالب نے ۱۲ جمادی الثانی (۱۲۸۰ھ) مطابق ۳ دسمبر ۱۸۶۳ء کو نواب علاء الدین احمد خاں کو ان سے اپنی ملاقات کی کیفیت اور ان کے متعلق اپنے تاثرات سے ان الفاظ میں آگاہ کیا:

"شفیق مکرم و لطف مجسم منشی نول کشور صاحب بسبیلِ ڈاک یہاں آئے۔ مجھ سے اور تمھارے چچا اور تمھارے بھائی شہاب الدین خاں سے ملے۔ خالق نے ان کو زہرہ کی صورت اور مشتری کی سیرت عطا کی، گویا بجائے خود قرآن السعدین ہیں۔"

غالب نے اس وقت تک کلیاتِ فارسی دس مجلد جن کی خریداری کا انھوں نے وعدہ کر رکھا تھا، نہیں منگائے تھے۔ علائی کے نام ۲۰ ستمبر کے خط میں انھوں نے اگرچہ اس کی قیمت میں اضافہ پر حیرت کا اظہار کیا تھا، تاہم بدرجۂ مجبوری پچاس روپے میں دس جلدیں لینے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ جب منشی نول کشور سے اس سلسلے میں گفتگو ہوئی تو وہ نہ صرف یہ کہ تخفیف شدہ قیمت یعنی چار روپے چار آنے فی جلد مع محصول ڈاک بلکہ پہلے اشتہار میں درج پیشگی قیمت یعنی تین روپے چار آنے فی جلد کے حساب سے مطلوبہ جلدیں فراہم کرنے پر رضامند ہو گئے۔ غالب نے اس تازہ خط میں ان کی اس عنایتِ خاص کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا:

"تم سے میں نے کچھ نہ کہا تھا اور کلیات کے دس مجلد کی قیمت پچاس روپے مان لیے تھے۔ اب اُن سے جو ذکر آیا تو انھوں نے پہلی قیمت مشتہرۂ اخبار یعنی قبول کی یعنی تین روپے چار آنے فی جلد۔ اس صورت میں دس مجلد کے بتیس روپے آٹھ آنے ہیں اور بتیس روپے آٹھ آنے تم دو۔ بگی پینسٹھ روپے مطبع اودھ اخبار میں پہنچانے چاہئیں۔ میں دسمبر ماہِ حال کی دسویں گیارہویں کو طالب ہوں گا۔"

منشی نول کشور ۹ یا ۱۰ دسمبر کو دلی سے روانہ ہوئے۔ غالب نے ۱۳ دسمبر کو علائی کے نام خط میں اس اطلاع کے ساتھ کہ منشی جی کو "بسواری ڈاک روانہ لکھنؤ ہوئے آج چوتھا یا پانچواں دن ہے" ان سے اپنی ایک ملاقات اور اس کے ایک خاص موضوعِ گفتگو کا بھی ذکر کیا ہے۔ شاعرانہ سخن سازی وقتاً فوقتاً اعلانِ بریت کے باوجود غالب کا محبوب مشغلہ رہی ہے۔ اس خط میں مذکور واقعہ اس کی بہترین مثال ہے اور منشی نول کشور کے حضور ان کے اظہارِ نیاز مندی کی مکمل تصویر کشی کرتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

"ایک روز منشی صاحب میرے پاس بیٹھے تھے اور برخوردار

الدین خاں بھی تھا۔ میں نے ثاقب کو مخاطب کرکے کہا" اگر میں دنیا دار ہوتا تو اس کو نوکری کہتا مگر چونکہ فقیر تکیہ دار ہوں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ تین جگہ کا روزینہ دار ہوں۔ ساڑھے باسٹھ روپے ماہوار یعنی سات سو پچاس روپے سال سرکار انگریزی سے پاتا ہوں، بارہ سو روپے رام پور سے، چوبیس روپے سال ان مہاراج سے توضیح یہ کہ دو برس سے ہر مہینے میں چار اخبار مجھ کو بھیجتے ہیں، قیمت نہیں لیتے ہیں[۵۵] مگر ہاں اڑتالیس ٹکٹ مطبع پہنچا دیا کرتا ہوں۔"

خود منشی نول کشور کے لئے بھی غالب کی خدمت میں حاضری کا شرف" ملاقات مسیحا و خضر" کی سعادت سے کم نہ تھا۔ وہ اسے اپنی بڑی خوش قسمتی تصور کرتے تھے کہ دہلی کے اس سفر کے دوران انھیں ایک ایسے شخص کی صحبتوں میں باریابی کے مواقع حاصل ہوئے، جو ہر اعتبار سے یگانۂ عصر اور منتخب روزگار تھا۔ چنانچہ جب وہ لکھنؤ واپس پہنچے تو ۲۳ دسمبر ۱۸۶۳ء کے اخبار میں اپنی روداد سفر کے تحت انھوں نے اس حسن اتفاق کا ان لفظوں میں تذکرہ کیا:۔

"جناب فیض مآب، یگانہ سحر پرداز، نکتہ سنج سراپا اعجاز، رنگ افزائے نازک خیالی، ہنگامہ آرائے بے مثالی، دقیقہ یاب فکر و نظر، آموزگار اہل ہنر، فرازندۂ لوائے سبحانی، نوازندۂ کوس شیوا زبانی، ناشر نغمات یکتائی در مشارق و مغارب، جناب مرزا اسد اللہ خاں بہادر غالب کی ملازمت سے مشرف ہوا۔ شرف ملازمت کا حصول اتفاقات نادرہ سے سمجھا۔ عنایت ایزدی کا شکریہ ہے کہ ایسے وحید عصر، یگانۂ آفاق، سر آمد فضلائے روزگار، آفتاب اقلیم فضل و کمال سے ملازمت حاصل ہوئی۔"[۵۶]

۲۳ دسمبر ۱۸۶۳ء کے اودھ اخبار میں اپنی روداد سفر کی اشاعت کے بعد اگلے شمارے میں منشی نول کشور نے غالب کا ایک فارسی قصیدہ "در مدح نواب مستطاب لارڈ الگن صاحب بہادر مرحوم" اپنے ایک نوٹ کے ساتھ شائع کیا۔[۵۷] لارڈ الگن جنوری ۱۸۶۲ء میں پنجاب کی گورنری سے ترقی پاکر" وائسرائے قلمرو ہند" مقرر ہوئے تھے اور غالب کا دربار اور خلعت لارڈ کیننگ کے حکم کو منسوخ کرکے انھوں نے ہی بحال کیا تھا۔ یہ قصیدہ ۱۶ مارچ سے ۲۰ مارچ ۱۸۶۳ء کے درمیان ان کی خدمت میں ارسال کیا گیا تھا اور غالب کو اس کی رسید مرقومہ ۳۰ جولائی ۱۸۶۳ء " خاطر آشوبی" کے ایک طویل اور صبر آزما مرحلے سے گزرنے کے بعد ۳ اگست ۱۸۶۳ء کو موصول ہوئی تھی۔ منشی نول کشور غالباً دہلی ہی میں تھے کہ گورنر جنرل موصوف کا انتقال ہو گیا۔[۵۸] چونکہ متوفیٰ وائسرائے کے حضور میں پیش کردہ اس نذرانۂ عقیدت کی تجدید اور اس دعاگوئی و خیر خواہی کے صلے میں بصورت رسید چیف سکریٹری کے مرسلہ" خریطۂ خوشنودی" کی اشاعت کے ذریعے عزت و توقیر بہ نگاہ سرکار" کے اشتہار کا یہ بہترین موقع تھا، اس کے علاوہ یہ قصیدہ کلیات مطبوعہ میں بھی جگہ نہ پاسکا تھا،[۵۹] اس لیے ممکن ہے کہ غالب نے منشی نول کشور سے کسی ملاقات کے دوران انھیں اودھ اخبار میں شائع کرنے کی خواہش ظاہر کی ہو یا خود منشی نول کشور ہی نے ان کی اشاعت پر زور دیا ہو۔ بہر صورت گمان غالب یہ ہے کہ منشی جی اس قصیدے اور خط کی نقلیں اپنے ساتھ ہی دہلی سے لکھنؤ لائے تھے۔ ۳۰ دسمبر ۱۸۶۳ء کے اخبار میں انھوں نے نقل سرنامہ، نقل خط اور اشعار قصیدہ سے قبل " نواب مرزا اسد اللہ خاں غالب" کے زیر عنوان یہ نوٹ تحریر کیا تھا:۔

" مرزا صاحب اقلیم بلند نامی کے بادشاہ ہیں، سب خاص و عام ان کے نام گرامی سے آگاہ ہیں۔ ان کی تعریف زبان قلم پر لانا گویا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے، ان کے صفات حمیدہ اور کمالات پسندیدہ سے واقف تمام زمانا ہے۔ شعرائے ہند کو ان کے نام سے اعتبار ہے، فصحائے فارس کو ان کی تعریف میں دخل ہے (کذا) بار بار لکھنا تحصیل لاحاصل ہے۔ مرزا نے ایک قصیدہ لارڈ ایلجن صاحب بہادر گورنر جنرل کشور ہند کی مدح میں بھیجا تو اس کے جواب سکرٹر اعظم کا دستخطی خریطہ آیا، اس خط اور قصیدے کے دیکھنے سے پردیر اثر مطبع کو نہایت سرور ہوا، کلیات غالب میں یہ قصیدہ نہ تھا، اب اس کا چھاپنا ضرور ہوا۔ لہذا مع نقل خط نواب گورنر جنرل بہادر کشور ہند ذیل میں تحریر ہے۔ ناظرین با تمکین ملاحظہ فرمائیں کہ ہر شعر بے نظیر ہے۔ خط سے قدر دانی سرکار

ظاہر ہے، عزت و توقیر مرزائے نامدار ظاہر ہے۔" ۵۳
دہلی سے منشی نول کشور مرزا غالب کی پر لطف صحبتوں کی یاد اور اس قصیدے اور خط کی نقلوں کے علاوہ ایک اور تحفۂ نایاب بھی اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ یہ تحفہ تھا غالب کا کلیات نثر فارسی جو ان کی تین کتابوں "پنج آہنگ"، "مہر نیمروز" اور "دستنبو" کا مجموعہ تھا، اور جسے نواب ضیاء الدین احمد خاں نے کلیات نظم کی طرح بڑی محنت اور احتیاط سے مرتب کیا تھا۔ یہ تینوں کتابیں اس سے قبل زیور طبع سے آراستہ ہو چکی تھیں۔
"پنج آہنگ"، پہلی بار بہ تصحیح حکیم غلام نجف خاں مطبع سلطانی، لال قلعہ دہلی سے ۱۳ رمضان ۱۲۶۵ھ مطابق ۴ اگست ۱۸۴۹ء کو اور دوسری مرتبہ بتصحیح مصنف مطبع دار السلام دہلی سے اپریل ۱۸۵۳ء (رجب یا شعبان ۱۲۶۹ھ) میں شائع ہوئی تھی۔ "مہر نیمروز" کا پہلا ایڈیشن ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۴ء میں مطبع فخر المطابع دہلی نے شائع کیا تھا، اور "دستنبو" بار اول مرزا صاحب کی خاص ہدایات کے تحت ان کے شاگرد رشید منشی شیو نرائن آرام نے نومبر ۱۸۵۸ء (ربیع الآخر ۱۲۷۵ھ) میں اپنے مطبع مفید خلائق، آگرہ میں چھاپی تھی۔
پہلی دونوں کتابوں کی کتابت و طباعت سے غالب صد درجہ غیر مطمئن اور بد دل تھے۔ صفیر بلگرامی کے نام ایک خط میں دیوان اردو اور دونوں تصانیف میں کاتبوں کی دراندازی کا ماتم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"خدا کی ... کاتبان ناہنجار پر، میرا دیوان اور پنج آہنگ اور مہر نیمروز کا، ستیاناس کر کے چھوڑ دیا۔"

کتابت کے اس نقص سے قطع نظر، پنج آہنگ کا مطبوعہ نسخہ صرف ان تحریروں اور خطوط پر مشتمل تھا جو ۱۸۴۵ء تک لکھے گئے تھے یا اس وقت تک یکجا کیے جا سکے تھے۔ دس سال کے عرصے میں ان کی تعداد میں خاصا اضافہ ہو چکا تھا اور یہ تمام تحریریں ضیاء الدین احمد خاں کے مرتبہ اس کلیات میں شامل تھیں۔ اس نسخے کی کیفیت اور منشی نول کشور کے ساتھ اس کے لکھنؤ پہنچنے کی روداد خود مرزا غالب نے "خاتمۂ پنج آہنگ" میں اس طرح بیان کی ہے:-

"- - - - دریں روزگار کہ سنین ہمایون ہجریہ سے ہزار و دو صد و ہشتاد و شمار آمد، روشن دل فرخ فانی گہر، مہر ورز آزرم گستر، منشی نول کشور نام آور در ایدیں دیر از شاہجہاں آباد نام گزار افتاد۔ از انجا کہ درویش نوازی خوے اوست، بہ کلبۂ احزان من روے آورد، بہ شادمانی دیدہ ریش خود را چشم روشنی گفتم۔ مجموعہ نثر ہائے پنجگانہ کہ از صحیفہ یکے از آشنایان ست، از ذو الابرار در ہمایوں فر، نواب خجستہ القاب ضیاء الدین خاں بہادر - - - بہ بسیج گرفت و باخود بہ لکھنؤ برد تا ایں کلام نامطبوع را بہ پیرایۂ طبع آراید - - - -" (طبع چہارم ص ۲۵۴)

کلیات نظم کو زیور طبع سے آراستہ دیکھنے کے لیے غالب کو ڈیڑھ، پونے دو برس انتظار کرنا پڑا تھا۔ کلیات نثر کی اشاعت میں اس سے بھی زیادہ وقت صرف ہوا اور اس کا پہلا ایڈیشن طباعت کے لیے اس کے حصول کے پورے چار سال بعد جنوری ۱۸۶۸ء مطابق رمضان المبارک ۱۲۸۴ھ میں منظر عام پر آیا۔ اس کے باوجود نہ تو غالب کے کسی خط میں اس طویل تردد و تعویق و انتظار پر بیتابی یا بد دلی کے اظہار کا کوئی سراغ ملتا ہے اور نہ کسی دوسرے ذریعے ہی سے اس کی وجوہات سامنے آتی ہیں۔ یہ ایڈیشن بڑی تقطیع کے دو سو بارہ صفحات پر شائع ہوا تھا۔ "خاتمۃ الطبع"، سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کتابت اور طباعت میں صحت اور نفاست کے اہتمام میں پوری کوشش کی گئی تھی۔ یہ خاتمہ جو منشی خدا علی عیش کا لکھا ہوا ہے، رسمی نوعیت کے چند توصیفی کلمات حذف کر کے سطور ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:-

"الحمد للہ و المنۃ کہ دریں زمان سعید و آوان حمید از ترشحات قلم اعجاز رقم جناب مستطاب والا خطاب - - - شیر بیشۂ سخنوری، شیخ زبان پارسی دری، افصح الفصحا، ابلغ البلغا، امیر کبیر جناب نواب نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر عرف مرزا نوشہ متخلص بہ غالب، المشہور بالمشارق و المغارب۔ چنانکہ در شان خود می فرماید۔ بیت ؎

نفتہ ز دساتیر بود نامۂ ما　　ساسانِ ششم بکار دانی ما یم

لہٰذا تمہ ؎

از سرِ انصاف منصف ار نشاید در گذشت　　حق تعالیٰ رتبۂ انصاف بالا کردہ است
پارسی مردہ را بخشید جانِ تازہ　　غالب معجز بیاں کار مسیحا کردہ است

کلیاتِ نثر مشکبو النثر پنج آہنگ و مہر نیمروز دستنبو کہ در رسائل و مقامات عبارت لاجواب و بے مثال ست، در مطبع آفاق مرجع عالی جناب فیض مآب ۔ ۔ ۔ ۔ جناب منشی نول کشور صاحب دام اقبالہ، خوش خط عمدہ بہ نہایت تصحیح و تنقیح بسعیِ کارگزاران مطبع موصوف بماہِ جنوری ۱۸۶۸ء مطابق شہر رمضان المبارک ۱۲۸۴ھ لباسِ انطباع پوشیدہ مرغوبِ انام و مطبوعِ خواص و عوام گردید۔ فقط"

طبعِ اول میں خاتمے کے بعد "قطعہ تاریخ فراقمہ" کے عنوان سے خاتمۃ نگار منشی فدا علی عیش کا یہ قطعہ شاملِ اشاعت ہے ؎

زہے ایں کلیاتِ نثر غالب　　کہ شد مسرور ہر طبعِ طبعش
رقم زد عیش از روئے انصاف　　بو مطبوعِ دل ہا نثر دلکش لہ

۱۲۸۳ + ۱ = ۱۲۸۴ھ

کلیاتِ نظم اور کلیاتِ نثر کی اشاعت کے درمیان غالب کا ایک مختصر رسالہ موسوم بہ "نامۂ غالب"، اودھ اخبار کی دو اشاعتوں میں اور حضرت علی سے منسوب "دعا، الصباح" کا منظوم فارسی ترجمہ مطبع نول کشور سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔ نامۂ غالب "برہانِ قاطع" کے قضیے کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ غالب نے اس کتاب کے رد میں قاطع برہان لکھ کر اور اسے شائع کر کے گویا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔ مارچ ۱۸۶۲ء میں اس کتاب کی اشاعت کے بعد انھیں بقول خود کئی طرف سے "سہام ملامت کا ہدف بننا پڑا"، اور معتقدانِ برہان قاطع (ان کے مقابلے کے لیے) برچھیاں اور تلواریں پکڑ پکڑ کے اٹھ کھڑے ہوئے"۔ چنانچہ ان کی تاویس نگارش کی تردید میں کئی کتابیں بنائی گئیں اور چھپوائی گئیں"۔ منشی سعادت علی دہلوی کی "محرقِ قاطع برہان" (مطبوعہ مطبع احمدی شاہدرا دہلی طبع ۱۸۶۳ء) کے بعد مطبع مرزا رحیم بیگ کی "ساطع برہان" اس جوابی سلسلے کی دوسری کتاب تھی۔ یہ کتاب ۱۲۷۹ھ (۶۳-۱۸۶۲ء) میں لکھی گئی اور ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۵ء) میں مطبع ہاشمی میرٹھ میں چھپ کر سامنے آئی[۲۲]۔ غالب اس سے قبل ۱۸۶۴ء میں محرقِ قاطع برہان کے رد میں منشی میاں داد خاں سیاح کے نام "لطائفِ غیبی" لکھ کر شائع کر چکے تھے۔ چونکہ ساطع برہان میں غالب کے اپنے الفاظ میں "بیشتر محرقِ قاطع کے مضامین منقول" تھے اور زیادہ تر "وہ باتیں تھیں جن کو (وہ) لطائفِ غیبی میں رد کر چکے تھے"۔ اس لیے انھوں نے اس کے جواب میں "ایک خط مرزا جی کو لکھ بھیجا، زیادہ اس طرف التفات کو تضیعِ اوقات جانا"۔ لیکن جب اس قضیے نے مزید طول کھینچا تو انھوں نے یہ خط بھی جو اپنی ہیئتِ ظاہری کے اعتبار سے بھی مکتوبات ہی کے ضمن میں آتا ہے، "نامۂ غالب" کے نام سے سولہ صفحات کے ایک رسالے کی شکل میں مطبع محمدی دہلی سے چھپوا کر شائع کر دیا۔ منشی میاں داد خاں سیاح کے نام ۱۰ ستمبر ۱۸۶۵ء کو لکھے ہوئے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے اس رسالے کی فقط تین سو جلدیں اپنے صرفِ زر سے چھپوائی تھیں اور اس خط کی تحریر سے پہلے وہ ان کو "دور و نزدیک" کے احباب و قدر شناسوں میں تقسیم کر چکے تھے۔ غالباً محدود تعداد میں چھپنے کی وجہ سے اس رسالے کی وسیع پیمانے پر اشاعت نہ ہو سکی تھی، اس لیے اسے دوبارہ شائع کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ چنانچہ منشی نول کشور نے خود غالب یا ان کے کسی شاگرد کا ایما پر یہ رسالہ اودھ اخبار کے ۱۰ اکتوبر اور ۱۷ اکتوبر ۱۸۶۶ء کے دو شماروں میں بالاقساط شائع کر دیا[۲۳]۔ غالب کی کسی تحریر میں اس دوسری اشاعت کا حوالہ موجود نہیں۔

"دعائے ماثور و منقول از جناب امیر علیہ السلام" کا منظوم ترجمہ مطبع نول کشور نے "حسب الایما مرزا عباس بیگ صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لکھنؤ" شائع کیا تھا۔ یہ غالب کی واحد معلوم تصنیف ہے جس کا ان کی یا ان کے زمانے کی کسی تحریر میں ذکر نہیں ملتا۔ اس کی متذکرہ اشاعت کا اب تک صرف ایک نسخہ دستیاب ہے جو جناب کالی داس گپتا رضا کی ملکیت ہے[۲۴]۔ اس نسخے میں کسی جگہ اس کا سالِ طباعت درج نہیں البتہ رضا لائبریری رام پور میں موجود ایک قلمی نسخہ جو اسی مطبوعہ نسخے سے ۲۳ رجب ۱۲۸۴ھ (۲۰ نومبر ۱۸۶۷ء) کو

نقل کیا گیا ہے۔ اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ یہ ترجمہ غالب کی زندگی میں اور نومبر ۱۸۶۰ء سے قبل چھپ چکا تھا۔ مرزا عباس بیگ مرزا غالب کے حقیقی بھانجے تھے اور ۱۸۶۳ء کے بعد کسی وقت ڈپٹی کلکٹری سے ترقی پا کر لکھنؤ کے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر مقرر ہوئے تھے، اس اعتبار سے اس کی طباعت کا زمانہ ۱۸۶۳ء اور ۱۸۶۷ء کے درمیان محدود کیا جا سکتا ہے۔

جنوری ۱۸۶۴ء سے جنوری ۱۸۶۸ء تک کی چار سالہ مدت میں اور اس کے بعد غالب کی بقیہ یک سالہ زندگی میں "نامۂ غالب" اور "دعائے صباح" کے علاوہ ان کی کسی معروف و معلوم مستقل تصنیف کا مطبع نول کشور سے شائع نہ ہونا بالتحقیق معلوم ہے لیکن اس عرصے میں ان کا کلام اور ان سے متعلق خبریں یقیناً اودھ اخبار میں کبھی کبھی شائع ہوتی رہی ہوں گی۔ فی الوقت اس امر کی تصدیق کا کوئی ذریعہ موجود نہیں اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ دستیاب معلومات کی حد تک غالب کا کلیات نثر ان کی آخری تصنیف ہے جو ان کی زندگی میں مطبع نول کشور سے شائع ہو کر "مطبوع انام اور مقبول خاص و عام" ہوئی۔

غالب نے ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو وفات پائی۔ مشاہیر کے انتقال پر تعزیتی نوٹ، ان سے متعلق نظمیں اور قطعات تاریخ شائع کرنا اودھ اخبار کے معمولات میں شامل تھا۔ بعض شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوسروں کے برخلاف غالب کی وفات پر ماتم سرائی کا یہ سلسلہ کافی دنوں تک جاری رہا چنانچہ ۱۶ مارچ ۱۸۶۹ء کے شمارے میں مرزا قربان علی بیگ سالک کا ترجیع بند "غالب مرحوم" کے عنوان سے، ۱۹ اکتوبر ۱۸۶۹ء کے شمارے میں مرزا ہر گوپال تفتہ کے آٹھ قطعات تاریخ اور ۲۶ اکتوبر ۱۸۶۹ء کے پرچے میں انھی کا کہا ہوا طویل فارسی ترکیب بند شائع ہوا۔ تفتہ کے قطعات تاریخ کے ساتھ ایک نوٹ بھی شائع ہوا تھا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قطعے انھوں نے خود "برائے ارشاد طبع" اخبار کے دفتر میں بھیجے تھے اور "سابق ازیں اخبارات دیگر میں درج" ہو چکنے کے باوجود" بہ پاس ارشاد جناب موصوف نظر ثانی مکرر اودھ اخبار میں چھاپے" گئے تھے۔ اخبار کے فائلوں کی نایابی کی وجہ سے اس سلسلے کی مزید تفصیلات نامعلوم ہیں۔ اگر اس زمانے کے تمام شمارے دستیاب ہو جائیں تو وفات غالب سے متعلق ایسی متعدد نگارشات کے سامنے آنے کا امکان ہے جن تک ہنوز کسی دوسرے ذریعے سے رسائی نہیں ہو سکی ہے۔

منشی نول کشور نے غالب کی رحلت کے بعد کامل چھبیس[26] سال زندہ رہ کر ۱۹ فروری ۱۸۹۵ء کو انتقال کیا۔ اس دوران میں انھوں نے "کلیات غالب" اور "کلیات نثر غالب" دونوں کے کئی کئی ایڈیشن شائع کیے اور دوسرے مطبعوں کے شائع کردہ معتبر نسخوں کی بنیاد پر "عود ہندی" اور دیوان اردو کے نول کشوری ایڈیشن چھاپ کر سابق مطبوعات کی فہرست میں دو نئی کتابوں کا اضافہ کیا۔ ان تمام اشاعتوں کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

کلیات غالب:۔ اس کلیات کی جنوری ۱۸۷۲ء کی اشاعت کو عام طور پر اشاعت ثانی تصور کیا جاتا ہے لیکن فی الحقیقت یہ اشاعت سوم ہے۔ دوسرا ایڈیشن کس سنہ میں شائع ہوا، یہ بتانا فی الوقت ممکن نہیں۔ راقم السطور کو اس کا نسخہ دستیاب ہوا ہے، وہ ناقص الآخر ہے تاہم اس کے سرورق کا یہ اندراج اس کے طبع دوم ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے:۔

این زماں بہ عون فیاض مضامیں و حسن توفیق خدائے سخن آفریں
رنگیں مجموعہ نتائج فکر بلند، زادہ ہائے طبع ارجمند آسماں پیوند،
مطلوب ہر طالب

کلیات غالب

مشتمل بر منظومات فارسی از قطعات و مثنویات و متضمن قصائد و غزلہا و رباعیات۔
در مطبع خاص منشی نول کشور دانش آئیں رونق افزائے بزم طبع دومیں شد

اس اشاعت میں "تقریظ مصنف (ص ۵۵۲ تا وسط ۵۵۵) کے بعد "تقاریظ و قطعات ختم کتاب مطبوعہ سابق" کے زیر عنوان میر مہدی مجروح، مرزا اصغر علی خاں نسیم، محمد عبدالغنی غنی، امیر اللہ تسلیم، منشی اشرف علی اشرف اور مردان علی خاں رعنا کے منظومات و قطعات شامل ہیں۔ رعنا کے مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ (مندرجہ ص ۵۶۰) پر یہ ناقص الآخر نسخہ ختم ہو جاتا ہے ؎

ہوا مطبوع کلیاتِ غالب — کیا ملکِ سخن کو جب کہ تسخیر
لکھا رعنا نے بافخر تلمذ — ہوا صد شکر "کلیات تحریر"

۱۲۷۹ھ

کلیات کا تیسرا ایڈیشن ۱۵ جنوری ۱۸۷۲ء میں شائع ہوا۔ اس کی ترتیب اور تعداد صفحات بعینہٖ اشاعتِ ثانی کے مطابق ہے لیکن یہ کسی دوسرے کاتب کا لکھا ہوا ہے۔ اصل کتاب "تقریظِ مصنف" کے ساتھ صفحہ ۵۵۵ کے نصف اول پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد منشی محمد حسین تخلص بہ اغلب رئیس موہان کا لکھا ہوا "خاتمۃ الطبع" ہے اور یہی اس اشاعت کی آخری تحریر ہے۔ پہلی دو اشاعتوں میں شامل قطعات تاریخ اس ایڈیشن سے خارج کر دیے گئے ہیں۔ خاتمے کی عبارت باختصار سطورِ ذیل میں نقل کی جاتی ہے:-

"دانا داند و شناسا شناسد کہ غالب را چہ مایہ در قافیہ سنجی و سخنگستری بود و چہ قدر در انشا پردازی یگانہ نظمش کہ دیدہ و پسند نکردہ و نثرش کہ شنیدہ کہ پذیرا نہ نمودہ ...... بنام توانائی بخش ایزدِ بخشائش گر کہ در سخن طرازی یگانہ بود و در عبارت آرائی مشہور زمانہ ..... کلیات نظم مرزا صاحب ممدوح جہاں کتابیست کہ نظیرش در عالم مثال معدوم و مثالش در عالم شہود ناپیدا، بیشتر ازیں بمطبع موصوف بطبع آمدہ خریداراں سرمایہ بینش بہا فہمیدہ دست بدست بردند، کنوں باز گرد آمد و از کار فرمائے مطبع بستند کہ بار دگر ایں عروس زیورِ انطباع پوشد۔ ازیں سلسلہ جنبانی بماہ جنوری ۱۸۷۲ء در مطبع اودھ اخبار واقع شہر لکھنؤ باہتمام کارگزاران عمدہ سرمۂ انطباع در چشم کشید" (ص ۵۵۶، ۵۵۵)۔

منشی نول کشور کی زندگی میں اس کلیات کے مزید ایڈیشن ۱۸۸۳ء اور ۱۸۹۳ء میں چھپ کر شائع ہوئے۔ یہ دونوں راقم السطور کو دستیاب نہیں ہوئے اس لیے ان کی تفصیلات نامعلوم ہیں۔

کلیاتِ نثرِ غالب:- کلیات نثر کا دوسرا ایڈیشن ۱۲۸۷ھ مطابق ۱۸۷۱ء میں چھپ کر سامنے آیا — یہ اشاعت راقم السطور کے پیشِ نظر نہیں تاہم طبع چہارم کے اندراجات کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مطبع نول کشور کی کانپور شاخ سے شائع ہوا تھا اور اس کے آخر میں منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی، منشی اشرف علی اشرف اور نواب احمد حسن خاں جوش کے قطعات تاریخ شامل تھے۔

اس کلیات کی تیسری اشاعت ستمبر ۱۸۷۵ء میں منظرِ عام پر آئی۔ اس کے صفحات کی مجموعی تعداد ۴۱۶ ہے۔ آخر میں منشی فدا علی عیش کا اشاعت اول کے لیے لکھا ہوا "خاتمۃ الطبع" کافی تحریف و ترمیم کے بعد ان کے نام کے بغیر نقل کر دیا گیا ہے۔ کتابت کی چند در چند غلطیاں اس ایڈیشن کا نمایاں ترین نقص ہیں جس کا اندازہ سرسری طور پر خاتمۂ مطبوعہ کی اس تلخیص سے لگایا جا سکتا ہے:

"الحمد اللہ (کذا) کہ ...... از منتر شحاب (کذا) قلم ..... شیر پیشہ (کذا) سخنوری مسیح زبان پارسی و دری ...... جناب نواب نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر عرف مرزا نوشہ متخلص بہ غالب مغفور و مبرور کلیات نثر مشکبو اعنی پنج آہنگ و مہر نیم روز و دستنبو در مطبع آفاق مرجع عالی جناب ..... منشی نول کشور صاحب دام اقبالہ واقع کانپور بسعی مولوی منصرم باکمال لالہ بشیشر دیال صاحب بماہ ستمبر ۱۸۷۵ء لباسِ انطباع پوشیدہ مرغوب انام و مطبوع خواص و عوام گردیدہ" (ص ۴۱۳)

خاتمے کے بعد اسی صفحے کے حاشیے پر بائیں جانب لالہ مدن موہن لال سرشار کا مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ درج ہے۔

چو جملہ نثرِ غالب طبع گردید — بوقتِ فرحت و فرخار تاریخ
پئے سالش رقم زد کلک سرشار — "کلامِ غالبِ شاذ" تاریخ

۱۸۷۵ء

کتاب کے آخری تین صفحات (ص ۴۱۴ تا ۴۱۶) فرہنگ پر مشتمل ہیں۔

منشی نول کشور کے دورانِ حیات اس کتاب کا آخری اور بہ اعتبار سلسلہ چوتھا ایڈیشن اپریل ۱۸۸۸ء میں چھپا۔ اس کے صفحات کی مجموعی تعداد ۴۱۸ ہے۔ طبع سوم کے برخلاف اس اشاعت میں فرہنگ (ص ۴۱۴ تا ۴۱۶) مقدم اور خاتمۃ الطبع موخر ہے۔ چونکہ طبع سوم میں اغلاطِ کتابت کی افراط تھی اس لیے بظاہر حال اس کی کاپی طبع ثانی سے تیار کی گئی ہے۔ خاتمہ آخری چند جملوں میں جزوی

فرق کے ساتھ بعینہٖ طبع اوّل کے مطابق ہے۔ اشاعت جدید کی ضرورت کے تحت جن جملوں میں فرق واقع ہوا ہے، وہ درج ذیل ہیں:۔

"....در مطبع آفاق، رجع ..... جناب منشی نول کشور صاحب دام اقبالہ، واقع کان پور ..... بار چہارم بماہ اپریل ۱۸۸۸ء مطابق شہر شعبان المعظم ۱۳۰۵ھ لباس انطباع پوشید ....." (ص ۴۱۷)

خاتمے کے معاً بعد اگلے صفحے پر "تاریخ طبع نتیجۂ طبع وقاد سخن نقاد، واقفِ رموزِ سخندانی منشی انوار حسین صاحب تسلیم سہسوانی" درج ہے۔ سہ

کلیاتِ نثر غالب طبع شد
این چہ ؟ می گویم حیات فارسی
خامۂ تسلیم زد سالش رقم
منطبع شد کلیات فارسی

۱۲۸۷ھ

طبع اول کے لیے عیش کے کہے ہوئے قطعہ تاریخ کی بجائے طبع ثانی کے لیے کہے گئے تسلیم کے اس قطعے کی خاتمے کے فوراً بعد شمولیت کے نتیجے میں "پارسی مردہ" پر غالب معجز بیان" کے احسانات سے متعلق ان دو شعروں کی ملکیت کے تعین کا کوئی قرینہ باقی نہیں رہا ہے جو "ملراقم" کے زیر عنوان طبع اوّل کی طرح اس اشاعت کے خاتمے میں بھی شامل ہیں۔ کتاب میں شامل باقی تین قطعات میں سے منشی اشرف علی اشرف خویش نویس اور نواب احمد حسن خاں جوش کے دو قطعے بھی طبع دوم ہی سے نقل کیے گیے ہیں۔ چوتھا اور آخری قطعہ طبع زاد نرائن بخش راقم خلف منشی گوبند پرشاد فضا جو اس طبع جدید سے متعلق ہے، حسب ذیل ہے۔ سہ

بفضلِ خدائے جہاں آفریں
چھپی نثر غالب عجیب و غریب
پئے عیسوی سال راقم نے بھی
یہ لکھا "چھپی نثر غالب عجیب" ۱۸۸۸ء

دیوان اردو:

مرزا غالب کی زندگی کے آخری ایام میں دیوان اردو کے دو اہم ایڈیشن مطبع نظامی کان پور اور مطبع مفید خلائق آگرہ سے شائع ہوئے تھے۔ مطبع نظامی کی اشاعت ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ (جون ۱۸۶۲ء) میں اور مطبع مفید خلائق کا نسخہ ۱۸۶۳ء (۱۲۷۹ھ) میں منظر عام پر آیا۔ ان میں سے اوّل الذکر اشاعت غالباً اس وجہ سے کہ اس کا متن مصنف کے نظر ثانی اور تصحیح کیے ہوئے نسخے پر مبنی تھا، زیادہ مقبول ہوئی۔ منشی نول کشور نے اسی نسخے کی بنیاد پر اگست ۱۸۷۷ء میں اپنے مطبع سے دیوان اردو کا پہلا ایڈیشن شائع کیا۔ اس زمانے کی شائع شدہ دوسری کتابوں کے ساتھ ملحق فہرستِ کتب میں اس اشاعت کا ان الفاظ میں تعارف کرایا گیا ہے۔

"کئی مرتبہ یہ دیوان مختلف مقامات میں چھپا اور بڑی خواہش سے بکا اور ہنوز خواہش خریداران اسی طرح ہے۔ کیوں نہ ہو، بڑے عالی پایہ مرزا اسد اللہ خاں دہلوی کا کلام ہے جن کا مثل و نظیر ہندستان میں نہیں ہے۔ یہ مطبوعۂ مطبع نظامی سے نقل ہوکر[26] طبع ہوا۔"

طبع اوّل کے صرف چار برس بعد ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۸۱ء میں مطبع نول کشور نے اس دیوان کو دوسری بار شائع کیا۔ بعد ازاں تین تین سال سے بھی کچھ کم فرق سے صفر ۱۳۰۱ھ مطابق دسمبر ۱۸۸۳ء اور ۱۳۰۴ھ مطابق ۱۸۸۶ء میں اس کے مزید دو ایڈیشن چھاپے گئے۔ یہ تمام اشاعتیں نسخے کے سائز، متن کے اندازِ ترتیب و کتابت اور تعداد اشعار کے اعتبار سے ہوبہو نسخۂ نظامی کی نقل ہیں۔ منشی نول کشور کی زندگی میں ان چار اشاعتوں کے بعد یعنی ۱۸۸۶ء اور ۱۸۹۵ء کے درمیان کسی نئے ایڈیشن کے منظر عام پر آنے کا حال نامعلوم ہے۔

عود ہندی

خطوطِ غالب کا یہ پہلا ایڈیشن منشی ممتاز علی خاں نے مرتب کرکے غالب کی وفات سے صرف چند ماہ پہلے ۸ رجب ۱۲۸۵ھ (۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء) کو مطبع مجتبائی میرٹھ سے شائع کیا تھا۔ یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ منشی غلام غوث بے خبر کے بیان کے مطابق قطعات

تاریخ وغیرہ چھپنے سے قبل ہی خریدار مال اٹھانے لگے تھے بلکہ دوسری بار یہ مجموعہ تقریباً سوا نو برس کے بعد فروری ۱۸۷۸ء مطابق صفر ۱۲۹۵ھ میں مطبع تارا پنی دلی میں چھاپا گیا۔ اس کے چند مہینے بعد ستمبر ۱۸۷۸ء مطابق رمضان ۱۲۹۵ھ میں منشی نول کشور نے اپنے مطبع کی کان پور شاخ سے اس کا پہلا نول کشوری ایڈیشن شائع کیا۔ منشی جی کی زندگی میں مئی ۱۸۸۷ء میں مطابق شعبان ۱۳۰۴ھ میں اسے کان پور ہی میں دوسری بار چھاپا گیا۔ فی الوقت یہی دوسرا ایڈیشن ہمارے پیش نظر ہے۔ یہ ایڈیشن عام نول کشوری سائز کے ۱۸۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اصل متن (تقریظ تلوک مشمولہ طبع اول) صفحہ ۱۸۱ کے وسط میں ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد مندرجہ ذیل "خاتمۃ الطبع" درج ہے:

"خدا کا شکر ہے کہ مجموعۂ رقعات اردو زبان یعنی عود هندی چکیدۂ خامۂ سحر نگار شاہ اقلیم انشا پردازی و سخنوری حضرت نجم الدولہ اسد اللہ خان بہادر غالب دہلوی جو پہلے شائقین کی تلاش سے مدون ہو کر مطبع مجتبائی میرٹھ میں طبع ہوا تھا اور بعد ازاں اسی مطبع میں طبع ہو کر نظر افروز شائقین ہو چکا ہے، اب بار دوم مطبع نامی سرچشمۂ فتوت جناب منشی نول کشور صاحب دام اقبالہ میں بمقام کان پور بماہ مئی ۱۸۸۷ء مطابق ماہ شعبان المعظم ۱۳۰۴ھ کے رنگِ انطباع سے رو کشِ وقع مانی ہوا۔ رنگ آرائے روزگار پسندیدۂ عالم فرماد نے۔"

(ص ۱۸۱)

خاتمہ کے بعد صفحہ ۱۸۲ پر منشی بھگوان دیال عاقل کے دو قطعات تاریخ درج ہیں جو سطورِ ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے پہلے قطعے سے اس اشاعت کا سال ہجری اور دوسرے سے سال عیسوی برآمد ہوتا ہے۔

قطعات تاریخ

زغالب عود ہندی طرفہ انشا ہست در اردو
درآمد مشتری ہا بہر خریدارش از ہر سو
نوشت از جذبۂ شوق تما خامۂ عاقل
"زہے مرغوب دل" تاریخ سالِ انطباع او

۱۳۰۴ھ

عود ہندی است طرفہ انشاے غالب از بس در معانی صفت
سال تاریخ طبع او عاقل "ہیہ عجیب رقعات غالب" گفت

۱۸۸۷ء

مطبع نول کشور سے شائع شدہ تصانیفِ غالب کے یہ ایڈیشن صحتِ متن کے اعتبار سے پوری طرح قابلِ اعتماد نہیں تاہم دوسرے مطابع کی چھاپی ہوئی ان کی کئی کتابوں سے بدرجہا بہتر ہیں۔ "قاطع برہان" کے بارے میں خود غالب کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ان کی سابقہ مطبوعہ وغیرہ مطبوعہ تصنیفات کے مقابلے میں اغلاطِ کتابت کا تناسب بہت کم تھا۔ اس کے باوجود انھیں اس کے لئے بھی "غلط نامہ" مرتب کرنے کی زحمت اٹھانا پڑی تھی۔ علائی کو ۱۹ر فروری ۱۸۶۳ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"تمھارے پاس جو قاطع برہان پہنچی ہے اگر چھاپے کی ہے تو صحیح ہے۔ جہاں تردد ہو، غلط نامۂ ملحقہ میں دیکھ لو۔ زیادہ انکشاف منظور ہو، مجھ سے پوچھ لو۔ اگر قلمی ہے تو درجۂ اعتبار سے ساقط ہے، اس کو میری تالیف نہ سمجھو بلکہ مجھ کو مول لے لو اور اس کو پھاڑ دو ......"

کلیاتِ فارسی کے بارے میں غالب نے اپنے تلامذہ میر مہدی مجروح کے نام ۲۳ر اگست ۱۸۶۳ء کے خط میں مختصراً ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے:

"کلیاتِ فارسی کا پہنچنا مجھ کو معلوم ہوا۔ میاں اس میں اغلاط بہت ہیں۔"

بار بار کی اشاعت کے باعث توجہ اور عدم توجہ کی نسبت سے مختلف ایڈیشنوں میں ان غلطیوں کا تناسب بھی کم و بیش ہوتا رہا۔ لیکن یہ نقص اپنے تمام مضمرات کے باوجود اتنا اہم نہیں کہ اس کی وجہ سے تصانیفِ غالب کے ان نول کشوری ایڈیشنوں کی اہمیت و افادیت سے انکار کر دیا جائے۔ بہ حیثیت مجموعی ان مطبوعات

نے غالب اور نگارشاتِ غالب سے دل چسپی رکھنے والوں کی تسکین ذوق و سیرابیٔ شوق میں نمایاں حصہ لیا ہے، اس لئے جب تک غالب کی یہ تصانیف اور ان کے قدر شناس باقی ہیں، منشی نولکشور غالب اور غالب شناسوں کے محسنین میں شمار کئے جاتے رہیں گے۔

★

حواشی

۱؎ بحوالہ "منشی نول کشور" مضمون از جناب نادم سیتاپوری۔ مشمولہ ماہنامہ نیا دور لکھنؤ، شمارہ ماہ اپریل ۱۹۶۵ء صفحہ ۸۔

۲؎ اردو خطوط کے تمام اقتباسات خطوطِ غالب مرتبہ مولانا غلام رسول مہر، شائع کردہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، طبع سوم (۱۹۶۲ء) سے نقل کیے گئے ہیں۔

۳؎ بحوالہ مضمون "ذکرِ غالب ۔ ۱۸۶۲ء کے اردو اخبار میں" مشمولہ سہ ماہی "غالب نامہ" جلد ۱ شمارہ ۳ و ۴ ص ۲۲۔

۴؎ بحوالہ مکتوب بنام نواب یوسف علی خاں ناظم ۔ مکاتیب غالب طبع دوم، ۱۹۴۳ء ص ۲۱ ۵؎ بحوالہ "غالب نامہ" جلد ۱، شمارہ ۳ و ۴ ص ۲۴ و ۲۵۔

۶؎ ایضاً ۔ بحوالہ "غالب نامہ" ص ۲۶ و ۲۷ ۷؎ ایضاً بحوالہ "غالب نامہ" ص ۲۹ و ۳۰ ۸؎ ایضاً بحوالہ "غالب نامہ" ص ۳۱

۹؎ ایضاً بحوالہ "غالب نامہ" ص ۳۲

۱۰؎ غالباً اس قصیدہ سے "قصیدہ در مدح لارڈ الگن" مراد ہے جو مارچ ۱۸۶۳ء میں کہا گیا تھا اور کلیات میں شامل نہیں ہوسکا۔ ۱۱؎ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے بیان کے مطابق "قاطع برہان" کی کتابت مشہور شاعر امیر اللہ تسلیم نے کی تھی (غالب اور مطالعۂ غالب، شائع کردہ سکینہ پبلشنگ ہاؤس دہلی ص ۲۰۰) ممکن ہے کہ کلیات کے کاتب بھی وہی ہوں۔ تسلیم نواحِ فیض آباد میں ایک گاؤں منگلسی کے رہنے والے تھے۔ ان کا شمار نول کشور پریس کے بہترین کاتبوں میں ہوتا تھا۔

۱۲؎ و ۱۳؎ بحوالہ "تحقیقی نوادر" از ڈاکٹر اکبر حیدری، شائع کردہ اردو پبلشرز، تلک مارگ لکھنؤ، طبع ۴، ۱۹ء ص ۳۶۶۔ ۱۴؎ و ۱۵؎ بحوالہ "اردوئے معلیٰ"، مرتبہ جناب مرتضیٰ حسین فاضل زیدی، شائع کردہ مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع اپریل ۱۹۶۷ء، جلد سوم ص ۱۰۶، ۱۰۸ تا ۱۱۰۔ ۱۶؎ بحوالہ "تحقیقی نوادر" ص ۳۶۳۔

۱۷؎ یہ قصیدہ اس مطلع سے شروع ہوتا ہے۔ ؎

بیا کہ مدحِ خداوند دادگر گویم   از آنچہ گفتم ازیں پیش بیشتر گویم

۱۸؎ غالب نے علائی کے نام ۳ دسمبر ۱۸۶۳ء کو لکھے ہوئے جس خط میں پہلی بار منشی نول کشور سے اپنی ملاقات کا تذکرہ کیا ہے، اس کے آخر میں تاریخ عیسوی کے ساتھ سنہ لکھنے کی بجائے "سال کیا غضب ہے ہے" لکھا ہے اور اس کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ "یہ گویا یہ تاریخ وفات نواب گورنر جنرل لارڈ الگن بہادر کی ہے۔" اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت الگن کی وفات ایک اہم اور تازہ موضوعِ گفتگو تھی۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے اسے ۲۰ نومبر ۱۸۶۳ء کا واقعہ قرار دیا ہے (مکاتیب غالب طبع دوم، حواشی ص ۱۴) ۱۹؎ یہ قصیدہ بعد میں "سبد چین" مطبوعہ مطبع محمدی دہلی، طبع ربیع الثانی ۱۲۸۴ھ (اگست ۱۸۶۷ء) میں شائع ہوا۔ ۲۰؎ بحوالہ "تحقیقی نوادر" ص ۳۶۷ و ۳۶۸، ۲۱؎ ایضاً بحوالہ "تحقیقی نوادر" ص ۳۷۱ و ۳۷۲، ۲۲؎ ساطع برہان کے زمانۂ تصنیف و طباعت کے بارے میں جناب فاضل زیدی تحریر فرماتے ہیں:-

"ساطع برہان (تالیف ۱۲۷۴ھ)...... مطبع ہاشمی میرٹھ سے ۱۲۸۳ھ میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب میرے پاس ہے۔"

(عود ہندی، مرتبہ جناب فاضل زیدی، شائع کردہ مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع ۱۹۶۷ء، حاشیہ ص ۳۵۷)

اپنے اس بیان کے برخلاف مولانائے موصوف نے اردوئے معلیٰ میں کتابیات کے ذیل میں اس کا سالِ طباعت ۱۲۸۰ھ لکھا ہے (جلد سوم ص ۱۰۱۰) یہ دونوں

بیانات تصحیح طلب ہیں۔ ساطع برہان مرزا رحیم بیگ کی اپنی تحریر کے مطابق ۹، ۱۲۷۸ھ (۶۲-۱۸۶۲ء) کی تصنیف ہے۔ انھوں نے اس کی تاریخ ترتیب مندرجہ ذیل قطعے میں نظم کی ہے ؎

چوں گشت مرتب ایں رسالہ　　با جملہ دلیل و حجتِ نادر

آنگہ بہ رحیم گفت ہاتف　　تاریخ "بدائع النظائر"

تاریخ انطباع کے دو قطعات رام جس اقبال نے کہے تھے، ان دونوں قطعوں کے بموجب صحیح[۲۲] سال طباعت ۱۲۸۲ھ ہے۔ ان میں سے پہلا قطعہ درج ذیل ہے۔ ؎

مطبوع شد چو ساطع برہان میرزا تم　　از اہتمام ملّا ہاشم بطرز دل کش

اقبال بے تردد از فیض ہاتفِ غیب　　"مرغوب دل" نوشتم تاریخ انطباعش (۱۲۸۲ھ)

نواب کلب علی خاں کے نام ۱۳ اگست ۱۸۶۵ء (۲۰ ربیع الاول ۱۲۸۲ھ) کو لکھے ہوئے غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس تاریخ سے پہلے "ساطع برہان" کے جواب میں "نامۂ غالب" چھپوا کر شائع کر چکے تھے۔ اس بنا پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ "ساطع برہان" ۱۲۸۲ھ کے بالکل ابتدائی دنوں میں یعنی ۲۶ مئی کے بعد اور اگست ۱۸۶۵ء سے قبل شائع ہوئی تھی۔

[۲۳] اودھ اخبار میں نامۂ غالب کے سالِ اشاعت کے سلسلے میں دو مختلف بیانات ملتے ہیں۔ پہلا بیان جناب فاضل زیدی کا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:-

"نامۂ غالب ۔۔۔ مطبع محمدی دہلی میں غالباً اگست ۱۸۶۵ء میں پہلی مرتبہ اور اس کے بعد اسی سال اودھ اخبار کی دو اشاعتوں (۱۰ اکتوبر و ۱۷ اکتوبر) میں شائع ہوا جو میری نظر سے گزرا ہے۔" (عود ہندی، شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور، حاشیہ ص ۲۵۷) دوسرا بیان مولانا غلام رسول مہر کا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:-

"(غالب نے) نامۂ غالب ۔۔۔۔ کے تین سو نسخے مطبع محمدی دہلی میں چھپوا کر اپنے دوستوں میں تقسیم کئے۔ بعد ازاں یہ "نامہ" اودھ اخبار کی دو اشاعتوں (۱۰ اکتوبر و ۱۷ اکتوبر ۱۸۶۹ء) میں من و عن شائع ہو گیا۔" (خطوطِ غالب طبع سوم ص ۶۲)

مولانا مہر کے اسی بیان کو ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ان الفاظ میں دہرایا ہے:-

"یہ (نامۂ غالب) عام اس وقت ہوا جب ۱۸۶۹ء میں اس کا متن اودھ اخبار میں بالاقساط شائع ہوا۔ پہلی قسط ۱۰ اکتوبر ۱۸۶۹ء کے اخبار میں اور دوسری قسط ۱۷ اکتوبر ۱۸۶۹ء کے اخبار میں شائع ہوئی۔" (غالب اور مطالعۂ غالب مطبوعہ دہلی، ص ۴۰)

اودھ اخبار کے متعلقہ شمارے ہماری دسترس میں نہیں، تاہم غالب پر کام کرنے والے دو ممتاز ادیبوں کے ان بیانات میں سنہ اشاعت کے اختلاف کے علاوہ ایک اور قباحت بھی موجود ہے جو انھیں قبول کرنے سے مانع ہے۔ اودھ اخبار اس زمانے (۱۸۶۹ء) تک ہفتے میں ایک بار ہر چہار شنبہ کو شائع ہوا کرتا تھا، جب کہ مبینہ بالا تاریخوں میں سے ۱۰ اکتوبر و ۱۷ اکتوبر ۱۸۶۵ء کو سہ شنبہ اور ۱۰ اکتوبر و ۱۷ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو یکشنبہ کا دن تھا۔ اس کے برخلاف ۱۸۶۶ء میں یہ دونوں تاریخیں چہار شنبہ کے دن پڑی تھیں، اس لئے صحیح سنہ اشاعت ۱۸۶۵ء اور ۱۸۶۹ء کی بجائے ۱۸۶۶ء ہی معلوم ہوتا ہے۔ اودھ اخبار کے ابتدائے سال ۱۸۶۳ء سے دسمبر ۱۸۶۵ء تک کے مسلسل شمارے ڈاکٹر اکبر حیدری کی نظر سے گزر چکے ہیں۔ (تحقیقی نوادر ص ۲۷۸) اور انھوں نے ان کی مدد سے "مرزا غالب اور اودھ اخبار" کے زیر عنوان ایک مضمون بھی لکھا ہے جو ان کے مجموعہ مضامین "تحقیقی نوادر" میں شامل ہے۔ اس مضمون میں "نامۂ غالب" کا ذکر موجود نہیں ہے۔ ۱۰ اکتوبر و ۱۷ اکتوبر ۱۸۶۵ء کے شماروں میں اگر یہ رسالہ شائع ہوا ہوتا تو وہ ضرور اس کا ذکر کرتے۔ یہ صورت حال بھی ضمناً ہمارے قیاس کی تائید کرتی ہے۔ [۲۴] تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو "دعائے صباح" طبع ثانی (دسمبر ۱۹۷۷ء) شائع کردہ جناب کالی داس گپتا رضا "متعلقات غالب" از جناب کالی داس گپتا رضا۔ ص ۴۰ تا ۵۱۔ [۲۵] بحوالہ "تحقیقی نوادر" ص ۳۰۹۔ [۲۶] بحوالہ "کلیات دہبی" موسوم بہ "مرقع ارژنگ" از منشی شیو پرشاد دہبی منیجر اودھ اخبار مطبوعہ مطبع نول کشور طبع اگست ۱۸۸۰ء۔ [۲۷] بحوالہ "عود ہندی" مرتبہ جناب فاضل زیدی۔ تعارف از مرتب ص ۶۹۔

حکیم محمد حسین خاں شفا

منشی نولکشور اور نواب کلب علی خاں والئی رام پور

منشی نولکشور نے صحافت، سیاست، طباعت و اشاعت اور علوم مشرقیہ کی حفاظت کے سلسلہ میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ تاریخ ہندستان انھیں کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ منشی جی نے ابتدائی تعلیم عربی اور فارسی کی مکتب میں حاصل کی اور پھر صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ لیکن آپ کے اصلی جوہر ۱۸۵۹ء میں مطبع نولکشور کے قیام سے ظہور پذیر ہوئے۔ آپ نے اپنی زندگی میں تقریباً چار ہزار مختلف مشرقی زبانوں کی کتابیں شائع کیں۔ جن میں سے اکثر کتابیں بین اقوامی شہرت کی حامل ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کے سیکولر کردار مذہبی رواداری اور علم پروری کا سکہ دیگر ممالک پر جما دیا۔

غالباً یہی وجہ تھی کہ جب ۱۸۸۵ء میں شہنشاہ افغانستان امیر عبدالرحمٰن حکومت ہند کی دعوت پر لدھیانہ تشریف لائے تو انھوں نے حسب روایت سب روسا و امرا سے نذرانہ قبول کیا۔ لیکن جب منشی نول کشور صاحب نذرانہ دینے کھڑے ہوئے تو امیر نے بھرے دربار میں منشی جی کو مخاطب کر کے فرمایا۔ میں آپ کا نذرانہ کس طرح قبول کر سکتا ہوں۔ آپ تو خود علم کے بادشاہ ہیں۔ یہ میرا فرض ہے کہ میں آپ کو نذرانہ پیش کروں۔ یہ کہہ کر امیر نے ایک قیمتی شال میں بہت سی اشرفیاں رکھ کر بڑی عقیدت سے منشی نول کشور کو پیش کیں۔

اسی طرح جب ۱۸۸۶ء میں شہنشاہ ایران ہندستان آئے تو انھوں نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا۔

"میرے ہندستان آنے کی سب سے بڑی غرض یہ ہے کہ منشی نول کشور اور والئیرائے ہند سے ملاقات کر سکوں۔"

منشی جی نے کتابوں کا کاروبار بہت تھوڑے سے سرمایہ اور کچھ دوست احباب کے تعاون سے شروع کیا تھا۔ جن میں نواب کلب علیخاں کا نام بھی آتا ہے۔ نواب صاحب اور منشی جی میں بہت سی قدریں مشترک تھیں۔ دونوں ہم عمر تھے مشرقی علوم و فنون کے شیدائی تھے۔ اہل علم کے قدر داں تھے اور غدر ۱۸۵۷ء کے اثرات جلد از جلد ملک سے ختم کرنا چاہتے تھے۔ نواب صاحب اور منشی جی میں گھریلو تعلقات تھے۔ منشی جی کے بارے میں شاہ افغانستان و ایران کی رائے ہم لکھ چکے ہیں۔

نواب صاحب کے سلسلہ میں ان کا ہم عصر گارساں دتاسی فرانسیسی متوفی ۱۸۷۸ء لکھتا ہے:

"ہندستان کے روشن خیال نوابوں میں نواب کلب علی خاں نہایت تعلیم یافتہ علوم و فنون سے دلچسپی لینے والے شخص ہیں۔ انھوں نے نشر علوم و فنون میں کافی حصہ لیا ہے۔ متعدد اسکول قائم کر دیے جن میں ہندستانی کی تحصیل پر خاص زور دیا جاتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ نواب صاحب اخبارات اور رسائل سے بھی دلچسپی لیتے ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ ہندستان میں مشین کے دور کو فروغ ہو۔ آپ نے ایک مطبع قائم کرایا ہے اور اخبار جاری کیا ہے۔ ہندستانی اخبارات نواب کے روشن خیالی کے معترف ہیں ۔ ۔ ۔ ۔"

منشی جی اور نواب صاحب میں مراسلت و موانست تا حیات قائم رہی۔ جس کا پورا ریکارڈ یکم جولائی ۱۹۴۹ء تک محکمۂ عالیہ دار الانشا

پولیٹیکل ریکارڈس آفس رامپور میں محفوظ تھا۔[1]

اس ریکارڈ سے اندازہ ہوتا ہے کہ منشی جی اپنی ذاتی و قومی ضروریات کے لیے نواب صاحب سے اکثر مالی امداد لیا کرتے تھے۔ اور نواب صاحب بھی بلا تکلف رازداری کے ساتھ ہر قسم کا تعاون کرتے تھے۔

منشی جی کے دوستوں میں امیر اللہ تسلیم وغیرہ شامل ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ نواب کلب علی خاں بھی منشی جی سے مختلف امور میں مشورہ کیا کرتے تھے اور کئی اہل علم دربار رام پور میں منشی جی کے توسط سے آئے۔ نواب صاحب خود بھی صاحب تصنیف تھے اور اپنی کتابیں مطبع سرکاری (رامپور) ہوتے ہوئے منشی جی کے مطبع میں چھپایا کرتے تھے۔ منشی جی بھی اپنے مطبع سے شائع ہونے والی اکثر کتابوں کے بہت سے نسخے نواب صاحب کو تحفہ میں بھیجا کرتے تھے۔ جس کے عوض ریاست کی طرف سے انعام و اکرام دیا جاتا تھا۔ اور بعض فاضل کتابوں کو مدرسہ عالیہ رام پور، و سرکاری کتب خانے رام پور سے ضرورت مند حضرات کو مفت تقسیم کیا جاتا تھا۔

نواب صاحب اور منشی جی کے تعلقات پر غالب کے خطوط سے بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔

۱۸۶۵ء میں منشی نول کشور نے اپنی لڑکی کی شادی کے سلسلے میں مالی مدد کی نواب صاحب سے درخواست کی۔ اتفاق سے اس دوران غالب بھی رامپور میں موجود تھے اور منشی سیل چند نے نواب صاحب سے اس درخواست کا ذکر غالب کی موجودگی میں کیا۔ جس کے بارے میں غالب نے تفتہ کے نام ایک خط میں لکھا تھا۔

"نواب صاحب از روئے صورت رد ... اور باعتبار اخلاق آیت رحمت ہیں ... از فیض کے تحت بند ... جو شخص دفتر ... جو کچھ لکھا ... اس کو سننے میں ... نہیں لگتی ...... منشی نول کشور صاحب کی عرضی پیش ہوئی ... عرضی ... لیا۔ واسطے منشی صاحب کے کچھ عطیہ تقریب شادی صبیہ (لڑکی)" ... ہوا ہے مقدار مجھ پر نہیں کھلی۔"[2]

دراصل نواب نے دربار میں کسی پر مقدار رقم کھولنا بھی نہیں چاہی۔ ورنہ اسی خط میں بہت سے حضرات کو دی جانے والی رقم کا غالب نے خود ذکر کیا ہے......

غالب نے اور بھی کئی خطوط میں اپنا منشی نول کشور صاحب کا اور نواب کلب علی خاں کا بڑے دلچسپ انداز سے ذکر کیا ہے۔"[3]



---

[1] ماخوذ از ریکارڈ نیشنل آرکائیوز۔ فروغ اردو مارچ ۱۹۷۰ء صفحہ ۴۔ [2] خطبات دتاسی۔ [3] مکاتیب غالب۔ از عرشی۔ صفحہ ۲۷۵

کاظم علی خاں

غالبؔ اور منشی نولکشور

نول کشور [متولد ۳ جنوری ۱۸۳۶ء] سن میں مرزا غالب [متولد ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء] سے تقریباً ۳۸ سال چھوٹے تھے۔ اس کے علاوہ نولکشور و غالبؔ کے مسکنوں [لکھنؤ اور دہلی] میں کم و بیش تین سو میل کا فاصلہ تھا۔ سنوں میں ۳۸ سال کے فرق اور مسکنوں میں تین سو میل کے فاصلے کے باوجود ان دونوں کے درمیان دوستانہ تعلقات تھے۔ نول کشور اور غالبؔ کے مابین ان دوستانہ روابط کو استوار کرنے میں منشی جی کا اودھ اخبار کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ غالبؔ اودھ اخبار سے ۱۲ر نومبر ۱۸۵۹ء سے قبل ہی متعارف ہو چکے تھے اور یہ اخبار اُن کے مطالعے میں رہتا تھا۔ اس زمانے میں غالبؔ اودھ اخبار کے خریدار نہ تھے بلکہ وہ اسے نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر و رخشاںؔ سے مستعار لے کر پڑھ لیا کرتے تھے[۱]۔ نول کشور کے نام غالبؔ نے اپنے پہلے فارسی خط مورخہ ۱۰ر جولائی ۱۸۶۰ء کے ذریعہ اودھ اخبار کی خریداری قبول کی تھی۔ غالبؔ اخبار بینی کے عادی تھے اور وہ اودھ اخبار بھی شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ اودھ اخبار سے غالبؔ کی غیر معمولی دلچسپی میں مندرجہ ذیل اسباب کی کارفرمائی محسوس ہوتی ہے۔

(۱) اودھ اخبار، لکھنؤ سے غالبؔ کو دیار و امصار کی خبریں ملا کرتی تھیں۔

(۲) اس اخبار میں غالبؔ اور اُن کے شاگردوں یا دوستوں کے بارے میں خبریں چھپا کرتی تھیں۔

(۳) اودھ اخبار غالبؔ اور اُن کے شاگردوں کی کتابوں کے اشتہار شائع کرتا تھا۔

(۴) اودھ اخبار میں کبھی کبھی غالبؔ کے مخالفین کی ایسی تحریریں بھی شائع ہوتی تھیں جن میں غالبؔ یا اُن کے ادبی آثار [پر] اعتراضات ہوتے تھے۔

(۵) یہ اخبار غالبؔ کی حمایت میں حامیانِ غالبؔ کی بھی تحریر[یں] چھاپتا تھا۔

(۶) اودھ اخبار نول کشور پریس سے نکلتا تھا، جہاں سے غالبؔ کی کتابیں شائع ہوتی تھیں [تفصیل آگے آئے گی]

(۷) اودھ اخبار کے مطالعے میں غالبؔ کی دلچسپی اس وجہ سے بھی تھی کہ یہ انھیں بلاقیمت صرف معمولی ڈاک خرچ ادا کرنے پر ملا کرتا تھا [اردوئے معلیٰ (بار اول) طبع ۱۸۶۹ء ص ۲۳۲]

(۸) اودھ اخبار سے غالبؔ کے غیر معمولی شغف کا ایک سبب یہ بھی [تھا] کہ اس میں کبھی کبھی غالبؔ اور اُن کے شاگردوں کے ادبی آ[ثار] چھپا کرتے تھے۔

ان نکات میں سے بعض تفصیل کے طالب ہیں۔ بطور ذیل ہیں:

اخبار، لکھنؤ کے بعض ایسے شماروں کی نشان دہی کی جاتی ہے جن میں غالبؔ اور ان کے شاگردوں یا دوستوں کے متعلق خبریں شائع ہوئی ہیں[۲]

(۱) اودھ اخبار لکھنؤ مورخہ ۱۲ر مارچ ۱۸۶۲ء (ص ۱۸۵) غالبؔ کے بارے میں مندرجہ ذیل تحریر کا حامل ہے:

"نواب میرزا اسد اللہ خاں غالبؔ دہلوی

سب جانتے ہیں کچھ حاجتِ دلیل نہیں کہ آج ہندستان میں ان کا عدیل نہیں۔ فصاحت و بلاغت میں سحبانِ ثانی ہیں

فن شعر میں انوری و خاقانی ہیں۔ زمین سخن کو آسمان پر پہنچایا۔ ہر نقطے کو اختر اوجِ معانی بنایا۔ زبسکہ ان کا جہان میں شہرہ ہے، تاریخِ طبع عالی کا آوازہ دور دور ہے۔ جناب جہانبانی مآب ملکۂ معظمہ ہند و انگلینڈ کی مداحی میں وہ پایۂ بلند و رتبۂ ارجمند پایا کہ ابتدائے عمل داری سرکار سے کسی ہندوستانی کے لیے اس کا دسواں حصہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ کیفیت نواب ممدوح نے خود لکھی ہے اپنی کتاب 'دستنبو' میں مفصل بیان کی ہے۔[۴] آگے ایک قصیدہ ملکۂ معظمہ کی شان میں کہا تھا۔ نظرِ انورسے گزرنے کو ولایت میں بھیجا تھا۔[۵] وہاں تو ہر کمال کی قدردانی ہے۔ تعداد ابیات خیر ... سالی ہے۔ جب فیض یاب سماعت ہوا منظور نظر و مرغوب ہوا جود و نوال کی طرف ہمت آئی، صلہ شاہانہ دینے پر طبیعت آئی۔ فروری ۱۸۵۵ء میں رسل کلارک صاحب بہادر نے مصنف [یعنی غالب] کو انگریزی چٹھی لکھی۔ ولایت سے ...... اس نوید سراپا امید سے خبر دی کہ تمھارے قصیدے کے انعام کا مقدمہ زیر تجویز ہے۔ عن قریب خطاب، خلعت، معدلت ورحکم، انڈیا گورنمنٹ سے اس کی اطلاع پاؤ گے۔ ناگاہ اسی سنہ مذکور میں سرزمین ہند پر آسمان ٹوٹا، فوج حوادث نے ...... متاع امید کو لوٹا۔ بہتیرے بے گناہ یوں زیر آسیاب گردون پسے جس طرح چکی کے پاٹ تلے گیہوں پسے۔ کیا آغاز تھا، کیا انجام ہوا، ہر منصوبہ بھی ناکام ہوا۔ نواب صاحب کا وہ معاملہ گویا خواب تھا۔ ع

جب آنکھ کھلی تو کچھ نہ دیکھا"

(۲) اودھ اخبار مورخہ ۲۵ مارچ ۱۸۶۳ء میں غالب کے متعلق یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ لفٹنٹ گورنر نے غالب کو ایک "خلعتِ فاخرہ عطا فرمایا"۔

(۳) ۲۳ دسمبر ۱۸۶۳ء کے اودھ اخبار (ص ۸۵۲) میں منشی نول کشور نے اپنے سفرِ دہلی کی روداد کے تحت دہلی میں غالب سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ اس تحریر میں غالب کی خوب مدح سرائی کی گئی ہے اور انھیں بہت سے خطابات سے یاد کیا گیا ہے مثلاً: "جناب فیض مآب یگانۂ سحر پرداز، نکتہ سنج سراپا اعجاز، رنگ افزائے نازک خیالی، ہنگامہ آرائے بے مثالی ...... زیبِ عصر یگانۂ آفاق سرآمد فضلائے روزگار، آفتاب اقلیم فضل و کمال"۔

(۴) اودھ اخبار مورخہ ۳۰ دسمبر ۱۸۶۳ء (ص ۸۶۱) میں بھی غالب کے متعلق [شاید منشی نول کشور کی] یہ تحریر چھپی تھی:

"نواب مرزا اسد اللہ خاں غالب

مرزا صاحب اقلیم بلند نامی کے بادشاہ ہیں، سب خاص و عام اُن کے نامِ گرامی سے آگاہ ہیں۔ اُن کی تعریف زبانِ قلم پر لانا گویا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے، اُن کے صفاتِ حمیدہ اور کمالاتِ پسندیدہ سے واقف تمام زمانا ہے۔ شعرائے ہند کو ان کے نام سے اعتبار ہے۔ فصحائے فارس کو ان کی تعریف میں دخل ہے ...... لکھنا تحصیلِ لاحاصل ہے۔ مرزا [صاحب] نے ایک قصیدہ لارڈ ایلجن [ایلگن] صاحب بہادر گورنر جنرل کشورِ ہند کی مدح میں بھیجا تو اس کے جواب میں سکریٹری اعظم [چیف سکریٹری] کا دستخطی خریطہ آیا۔ اس خط اور قصیدے کے دیکھنے سے پروپرائٹر مطبع ...... نہایت مسرور ہوا۔ ...... خطاب قدردانی سرکار ظاہر ہے، عزت و توقیر میرزا کے نام دار ظاہر ہے ......"

(۵) ۱۱ فروری ۱۸۶۳ء کے اودھ اخبار (ص ۱۱۰) میں غالب کے عزیز اور شاگرد نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب دہلوی کے یہاں ایک فرزند کی ولادت کی خبر چھپی تھی جس میں ثاقب کے اس فرزند کی یہ تاریخ ولادت بھی درج تھی: "۳ شعبان ۱۲۷۹ھ مطابق ۲۴ جنوری ۱۸۶۳ء وقت شام روز شنبہ"۔ تقویم[۶] ان تاریخوں اور دن میں مطابقت بتاتی ہے۔

(۶) و (۷) اودھ اخبار کے دو شماروں [مورخہ ۱۴ فروری ۱۸۶۵ء نیز مورخہ ۲ مئی ۱۸۶۵ء] میں غالب کے چہیتے شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ کے متعلق دو تحریریں شائع ہوئی تھیں جن میں استاد و شاگرد دونوں کی تعریف تھی۔

(۸) اودھ اخبار ۱۸۶۲ء کے متعدد شماروں میں غالب کے شاگرد نواب مردان علی خاں رعنا کی تعریف و توصیف میں منشی نول کشور کے نوٹ چھپے تھے۔ رعنا نہ صرف اودھ اخبار کے مالک

نول کشور بل کہ اس اخبار کے مدیر منشی غلام محمد خاں تپش سے بھی دوستانہ روابط رکھتے تھے۔ رعنا مراد آباد کے ایک صاحب ثروت خانوادے سے تھے۔ وہ انگریزی سرکار کے ملازم رہے پھر کئی دیسی ریاستوں میں اہم عہدوں پر فائز ہوتے رہے۔ ملازمت کے دوران وہ مختلف مقامات پر مقیم رہے۔ رعنا کے ہم وطن جویا مراد آبادی کے ایک قطعۂ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۸۰ھ میں رعنا کو جودھ پور میں مدار المہامی کا اہم عہدہ ملا تھا۔ رعنا ۲ رجون ۱۸۷۹ء کو سری نگر کشمیر میں فوت ہوئے تھے۔

(۹) اودھ اخبار مورخہ ۲۰ رمئی ۱۸۶۳ء (ص ۳۵۰) میں غالب کے دوست مرزا حاتم علی مہر کے متعلق یہ خبر شائع ہوئی تھی: "حسب الحکم حکام تقرر مرزا حاتم علی کا بہ عہدۂ وکالت صدر دیوانی و نظامت ممالک مغربی مشتہر کیا جاتا ہے"

(۱۰) تا (۱۵) اودھ اخبار کے جن شماروں میں مطبع نول کشور سے چھپنے والے کلیاتِ غالب [نظم فارسی] کے اشتہار (بہ زبانِ اردو) شائع ہوئے تھے اُن میں یہ چھ شمارے بھی شامل ہیں: (۱۰) یکم جنوری ۱۸۶۳ء (۱۱) ۱۲ر فروری ۱۸۶۳ء (۱۲) ۲۰ رمئی ۱۸۶۳ء (۱۳) ۳ رجون ۱۸۶۳ء (۱۴) ۱۷ر جون ۱۸۶۳ء (۱۵) ۲۴ رجون ۱۸۶۳ء۔

(۱۶) تا (۱۹) اودھ اخبار کے جن شماروں میں نول کشور پریس سے چھپنے والی غالب کی کتاب 'قاطعِ برہان' کا فارسی اشتہار نکلا تھا ان میں یہ چار شمارے بھی شامل تھے: (۱۶) ۸ رجنوری ۱۸۶۲ء (۱۷) ۲۶ر مارچ ۱۸۶۲ء (۱۸) ۲ راپریل ۱۸۶۲ء (۱۹) ۹ راپریل ۱۸۶۲ء

(۲۰) (۲۱) (۲۲) اودھ اخبار کی تین اشاعتوں میں بہ تفصیلِ ذیل غالب کے تین شاگردوں کی کتابوں کے اشتہار شائع ہوئے تھے:

(۲۰) اودھ اخبار مورخہ ۱۱ر مارچ ۱۸۶۳ء۔ اشتہار کتاب غنچۂ رنگ از مردان علی خاں رعنا۔

(۲۱) اودھ اخبار۔ ۲۰ رمئی ۱۸۶۳ء۔ اشتہار مثنوی 'قضا و قدر' از قدر بلگرامی۔

(۲۲) اودھ اخبار۔ ۲ رمئی ۱۸۶۵ء۔ اشتہار کتاب سنبلستان از منشی ہرگوپال تفتہ۔

(۲۳) اودھ اخبار مورخہ ۲۵ رجون ۱۸۶۱ء میں غالب کے خلاف آغا علی شمس لکھنوی کی ایک تحریر شائع ہوئی تھی۔ آغا علی شمس لکھنوی قاضی محمد صادق خاں اختر [تلمیذ محمد حسن قتیل] کے شاگرد تھے۔ شمس نے کتب درسیہ قتیل سے بھی پڑھی تھیں اور غالب کی قتیل شکنی کے باعث شمس لکھنوی غالب کے سخت مخالف تھے۔ دو طوائفیں زہرہ اور مشتری [جو شمس کی شاگرد تھیں] بھی اودھ اخبار میں غالب کے خلاف لکھا کرتی تھیں۔

(۲۴) اودھ اخبار مورخہ ۲ رمئی ۱۸۶۵ء (ص ۲۹۸) میں غالب کے نام اور غالب کی حمایت میں ارسطو جاہ رجب علی خاں کا ایک طویل خط شائع ہوا ہے۔ اس خط کی تاریخ تحریر ۱۱ راپریل ۱۸۶۵ء ہے۔

(۲۵) اودھ اخبار مورخہ ۱۴ رمئی ۱۸۶۲ء میں غالب کی تائید میں رعنا کی ایک اردو تحریر چھپی تھی۔

(۲۶) تا (۳۷) اودھ اخبار کے جن شماروں میں غالب اور ان کے شاگردوں کے ادبی آثار شائع ہوئے تھے ان میں بہ تفصیل ذیل بارہ شمارے شامل ہیں:

(۲۶) اودھ اخبار مورخہ ۲۳ راپریل ۱۸۶۲ء (ص ۲۸۱) میں غالب کا سیاسی نوعیت کا ایک مضمون چھپا تھا۔

(۲۷) اودھ اخبار مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۸۶۲ء میں مردان علی خاں رعنا کی بہادری کی تعریف میں غالب کا ایک اردو مراسلہ شائع ہوا تھا۔ اودھ اخبار غالب کے اس اردو مراسلے کا اولین ماخذ ہے۔

(۲۸) اودھ اخبار مورخہ ۲۵ رمارچ ۱۸۶۳ء (ص ۲۱۷) میں منشی نول کشور کے نام غالب کا ایک اردو خط چھپا تھا۔ اودھ اخبار غالب کے اس خط کا قدیم ترین ماخذ ہے۔ غالب کا یہ اردو خط استاذِ محترم مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی [مقیم لاہور] نے تلاش کیا تھا۔ نول کشور کے نام غالب کا یہ اردو خط عودِ ہندی اور اردوئے معلیٰ (حصۂ اول) پر مولانا فاضل لکھنوی کا اضافہ ہے۔

(۲۹) اودھ اخبار مورخہ ۳۰ ردسمبر ۱۸۶۳ء (ص ۸۶۱) میں لارڈ الگن کی مدح میں اکتیس اشعار پر مشتمل غالب کا ایک فارسی قصیدہ شائع ہوا تھا۔ اودھ اخبار غالب کے اس قصیدے کا قدیم ترین مطبوعہ ماخذ ہے۔ یہ قصیدہ 'کلیاتِ غالب' مطبع منشی نول کشور لکھنؤ طبع ۱۸۶۳ء پر اضافہ ہے۔ یہ قصیدہ بعد کو باغِ دو در میں شامل

ہوا تھا جہاں اس میں شعر ہیں[15]۔ اس قصیدے کا مطلع یہ ہے:

بیا کہ مدحِ خداوندِ داد گر گویم — از آنچہ گفتم ازیں پیش بیشتر گویم

(۳۰) و (۳۱) اودھ اخبار مورخہ ۱۰ اکتوبر و ۱۷ اکتوبر ۱۸۶۵ء کے دو شماروں میں رحیم میرٹھی کے نام غالب کا طویل ترین اردو خط [نامۂ غالب] دو قسطوں میں چھپا تھا۔

(۳۲) اودھ اخبار مورخہ ۱۴ فروری ۱۸۶۵ء (ص ۱۱۵) میں غالب کے شاگرد تفتہ کا ایک فارسی قصیدہ شائع ہوا تھا جو منشی نول کشور کی مدح میں تھا۔

(۳۳) اودھ اخبار مورخہ ۲۱ فروری ۱۸۶۵ء (ص ۱۴۵) میں میاں ذکی علی اشک کی وفات پر بھی تفتہ کا ایک فارسی قطعۂ تاریخ چھپا تھا۔ اشک کے حالات اسی مضمون میں آگے ملیں گے۔

(۳۴) اودھ اخبار یکم جنوری ۱۸۶۲ء سے ۲۲ اکتوبر ۱۸۶۲ء تک کے درمیانی شماروں میں بھی غالب کے شاگردوں کے ادبی آثار ملتے ہیں۔ غالب کے ان شاگردوں میں میاں داد خاں سیاح اور رعنا شامل ہیں۔

(۳۵) اودھ اخبار مورخہ ۲ دسمبر ۱۸۶۲ء میں بھی رعنا کا ایک فارسی قطعۂ تاریخ [بہ سلسلۂ وفاتِ لارڈ الگن] شائع ہوا تھا۔

(۳۶) اودھ اخبار مورخہ ۱۶ دسمبر ۱۸۶۳ء میں غالب کے شاگرد شہاب الدین احمد خاں ثاقب کی دس اشعار پر مشتمل ایک اردو غزل چھپی تھی۔

(۳۷) اودھ اخبار مورخہ ۱۲ اگست ۱۸۶۳ء (ص ۵۶۲) میں غالب کے شاگرد یوسف علی خاں عزیز کا ایک قطعہ چھپا تھا۔ مرزا یوسف علی خاں عزیز [متوفی ۱۲۹۰ھ[16]] کے حالات و نمونۂ کلام سخن شعرا[17]، گلستانِ بے خزاں[18]، ادبی خطوطِ غالب[19] اور تلامذۂ غالب وغیرہ[20] میں موجود ہیں۔ مگر کلامِ عزیز پر مشتمل مذکورۂ بالا مصادر عزیز کے قطعاتِ تاریخ سے بالکل خالی ہیں۔ مجھے یوسف علی خاں عزیز کے بعض قطعاتِ تاریخ دست یاب ہوئے ہیں۔ خواجہ امان کے ترجمۂ 'بوستانِ خیال' کی تکمیل پر شاگردِ غالب مرزا یوسف علی خاں عزیز کا ایک قطعۂ تاریخ بطورِ نمونہ پیش ہے: —

دبیرِ فلک رتبہ خواجہ امان — عطارد کو جن سے نہیں انحراف
رقم قصۂ بوستانِ خیال — کیا فارسی بار اُردو سے صاف
نئے طور پر بندہ لکھتا ہے سال — خطا ہو تو فرطِ عطا سے معاف
لکھو سہل یوسف علی خاں عزیز
دو با دو میم و دو ثا و دو قاف[21]
۴ ۸۰ ۱۰۰۰ ۲۰۰
[۱۲۸۴ھ]

مجھے شعاعِ مہر طبع اوّل میں یوسف علی خاں عزیز کی اردو نثر کا ایک کم یاب نمونہ بھی ملا ہے[22] اور شعاعِ مہر [طبع دسمبر ۱۸۶۰ء] میں بھی عزیز کے چند قطعاتِ تاریخ بھی شامل ہیں۔ مرزا یوسف علی خاں عزیز کے نام غالب کے ایک اردو مکتوب کے اصل نسخے کا عکس [بہ خطِ غالب] علی گڑھ میگزین (غالب نمبر) بابت ۱۹۴۸-۴۹ء (مقابل ص ۱۲) میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اودھ اخبار لکھنؤ دل چسپیوں کے اتنے اور ایسے سامانوں کے باعث غالب کا پسندیدہ اخبار تھا۔ غالب اور نول کشور کے مابین دوستانہ روابط کو استوار کرنے میں اودھ اخبار کا اہم رول رہا ہے اور ان تعلقات کے نقوش نہ صرف اودھ اخبار کے اوراق بلکہ غالب کے خطوط میں بھی جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ منشی نول کشور کے نام اب غالب کے محض دو مطبوعہ خطوط محفوظ ہیں لیکن نول کشور کا نام غالب کے متعدد خطوط میں موجود ہے۔ بسطورِ ذیل میں غالب کی فارسی و اردو تحریروں سے سوا دو درجن سے زائد ایسے تراشے پیش کیے جاتے ہیں جن میں نول کشور یا اُن کے پریس یا مطبوعاتِ نول کشور پریس یا اودھ اخبار کا ذکر موجود ہے اور ان تحریروں میں نہ صرف غالب کے مکاتیب بلکہ کتب بھی شامل ہیں۔

(۱)

میری اطلاع کے مطابق اودھ اخبار کے ذکر پر مشتمل غالب کی قدیم ترین تحریر منشی شیو نرائن آرام کے نام غالب کا وہ اردو خط ہے جو یک شنبہ ۱۳ نومبر ۱۸۵۹ء کو لکھا گیا تھا اور جس کا اقتباس ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

"...... اودھ اخبار بھائی ضیاء الدین خاں صاحب کے ہاں آتا ہے وہ میرے پاس بھیج دیا کرتے ہیں۔[۲۳]"

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اودھ اخبار ۱۳ر نومبر ۱۸۵۹ء سے قبل ہی غالب تک رسائی حاصل کر چکا تھا۔

(۲)

نول کشور کے نام غالب کا اولین خط بہ زبان فارسی چہارشنبہ ۱۸ر جولائی ۱۸۶۰ء کو لکھا گیا تھا۔[۲۴] اس خط کا عنوان 'کلیات نثر غالب' طبع اپریل ۱۸۸۸ء (ص ۲۵۳) میں یوں درج ملتا ہے: "نامہ بہ نام نامی منشی نول کشور صاحب مالک مطبع اودھ اخبار۔" سطور ذیل میں غالب کے اس فارسی مکتوب کا ملخص اردو مفہوم پیش ہے:

"خدا گواہ کہ آپ سے آج تک ملاقات نہیں ہوئی مگر آپ کی محبت دل میں گھر چکی ہے۔ آپ کا خط ملا تو دیدۂ دل میں تکرار چھڑ گئی۔ آنکھ سواد [سواد = سیاہی] تحریر کو سرمۂ چشم بنانا چاہتی تھی اور سویدائے دل [سویدائے دل = نقطۂ سیاہ جو دل پر ہوتا ہے] اس سے روشنی کا جویا تھا۔ میں نے دونوں میں مفاہمت کروائی، نظر کے حصے میں فروغ [فروغ = روشنی] آیا اور دل کو فراغ [فراغ = اطمینان] نصیب ہوا۔

میں نے فارسی میں بہت کچھ لکھا ہے لیکن اب مجھ سے یہ مشقت نہیں ہوتی۔ میں نے آسان راستہ اختیار کر لیا ہے۔ جو کچھ لکھنا ہو اردو میں لکھ لیتا ہوں۔ نہ سخن آرائی نہ خود نمائی۔ تحریر کو گفتگو بنا لیا ہے۔ بہر حال آپ کے ارشاد کی تعمیل میں یہ خط فارسی میں لکھ رہا ہوں۔ میری فارسی نثر کی تین کتابیں ہیں۔ 'پنج آہنگ'، 'مہر نیم روز' [اور] 'دستنبو'۔[۲۵] آپ یہ کتابیں کہیں سے منگواتے کیوں نہیں۔ ممکن ہے اہل لکھنؤ ان کے مشتاق ہوں۔

اب مجھے کافور و کفن سے کام ہے۔ ۶۵ برس جی چکا ہوں۔ پچاس برس سے لکھ رہا ہوں۔ آخر ہر آغاز کا انجام ہوتا ہے۔ میرا انجام بھی قریب ہے۔ ششماہی چندے کے عوض مہینے میں چار بار اودھ اخبار بھیجا جاتا ہو تو مجھے خریداری منظور ہے۔ میاں داد خاں سیاح کو علاحدہ میں نے ایک دوست سے کہہ رکھا ہے کہ چند فارسی غزلیں نقل کر دیں .... [غزلیں آتے ہی آپ کو بھیج دوں گا۔"

[پنج آہنگ۔ مترجمہ مہاجر ص ص ۱۸۶ تا ۱۸۰]

'کلیات نثر غالب' طبع ۱۸۸۸ء (ص ۲۵۴) میں اس خط کے آخر میں یہ عبارت مرقوم ہے: "نگاشتہ و رواں داشتۂ چہارشنبہ ۱۸ر ماہ جولائی ۱۸۶۰ء"۔ اس خط کے بافہم مطالعے سے یہ نتائج برآمد ہوتے ہیں:

(۱) غالب اور نول کشور کے تعلقات کا نقطۂ آغاز غالب کے نام منشی نول کشور کا وہ خط تھا جو ۱۰ر جولائی ۱۸۶۰ء سے قبل لکھا جا چکا تھا۔ نول کشور کے اسی خط کا جواب غالب نے ۱۰ر جولائی ۱۸۶۰ء کو دیا تھا۔

(۲) ۱۸ر جولائی ۱۸۶۰ء تک غالب اور نول کشور ایک دوسرے کے صرف نادیدہ مکتوب الیہ تھے اور ان دونوں کے تعلقات محض نصف ملاقات تک محدود تھے جو خطوط کے توسط سے ہوتی ہے۔

(۳) منشی نول کشور اپنے خط کے جواب میں غالب سے فارسی خط کے طالب تھے۔ نول کشور نظر بہ ظاہر غالب کی فارسی نثر کے مشتاق تھے۔ اسی لیے غالب نے انھیں اپنی فارسی نثر کی کتابوں کے نام بتائے اور اس انداز سے بتائے کہ نول کشور ان کی اشاعت کی طرف متوجہ ہوں۔ بعد کو نول کشور نے اپنے پریس سے غالب کی فارسی نثر و نظم پر مشتمل متعدد کتابیں شائع کی تھیں جن کی تفصیل اپنے مقام پر آگے آئے گی۔

(۴) اس خط سے یہ پتا چلتا ہے کہ غالب نے جولائی ۱۸۶۰ء میں چھ ماہ کے لیے نول کشور کے اودھ اخبار کی خریداری بھی قبول کر لی تھی لیکن بعد کو نول کشور نے غالب کے نام یہ اخبار اعزازی طور پر جاری کر دیا تھا۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

(۵) غالب نے اس خط میں نول کشور سے وعدہ کیا ہے کہ وہ منشی جی کو اپنی چند فارسی غزلیں نقل کرا کر ارسال کر دیں گے۔ شاید

نول کشور غالب کے فارسی کلام کے بھی طالب تھے۔ عجب نہیں کہ شیخ نول کشور سے شائع ہونے والا ' کلیاتِ غالب ' نظم فارسی طبع ۱۸۶۳ء غالب کے فارسی کلام سے نول کشور کی اسی دلچسپی کا نتیجہ ہو۔

(۲) اس خط میں غالب نے اپنے شاگرد میاں داد خاں سیاح کو نول کشور کی معرفت دعا کہی ہے گیا جو اوائل ۱۸۶۰ء میں یہاں لکھنؤ میں موجود تھے اور منشی نول کشور کے یہاں سیاح کی آمد و رفت تھی۔ گمان غالب ہے کہ غالب کی فارسی نثر و نظم سے نول کشور کی دلچسپی میں سیاح کی تحریک بھی شامل ہو۔ یعنی سیاح ہی کے مشورے سے نول کشور نے غالب کو خط لکھو کر غالب سے اُن کی فارسی نثر و نظم بھی طلب کی ہو اور اس کے ساتھ ہی غالب سے اودھ اخبار کی خریداری قبول کرنے کی درخواست بھی کی ہو۔ ان تمام وجوہ سے نول کشور کے نام غالب کا زیر بحث فارسی خط خاصا اہم ثابت ہوتا ہے۔

(۳)

نول کشور پریس لکھنؤ میں طباعت کے لیے ضیاء الدین احمد خاں نیر و رخشاں سے غالب اپنے فارسی دیوان [قلمی] کے طالب تھے۔ اس سلسلے میں غالب نے نیر کو ایک خط میں لکھا ہے:

"جناب قبلہ و کعبہ! آپ کو دیوان کے دینے میں تامل کیوں ہے؟ روز آپ کے مطالعے میں نہیں رہتا بغیر اُس کے دیکھے آپ کو کھانا نہ ہضم ہوتا ہو، یہ بھی نہیں پھر آپ کیوں نہیں دیتے؟ ایک جلد ہزار جلد بن جائے، میرا کلام شہرت پائے، میرا دل خوش ہو، تمہاری تعریف کا قصیدہ[۲۸] اہلِ عالم دیکھیں، تمہارے بھائی کی تعریف کی نثر سب کی نظر سے گزرے۔ اتنے فوائد کیا تھوڑے ہیں رہا کتاب کے تلف ہونے کا اندیشہ؛ یہ خفقان ہے۔ کتاب کیوں تلف ہوگی؟ احیاناً اگر ایسا ہوا اور دلی لکھنؤ کی عرض راہ میں ڈاک لٹ گئی تو میں فوراً بہ سبیل ڈاک رامپور جاؤں گا اور نواب فخر الدین خاں[۲۸] مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان تم کو لا دوں گا..... یہ کام تمہاری مدد کے بغیر انجام نہ پائے گا اور تمہارا کچھ نقصان نہیں۔ ہاں احتمال نقصان تو کو بھی اندروے وسوسہ ہو تو ہو۔ اُس صورت میں میں تلافی کا کفیل ..... بہرحال راضی ہو جاؤ اور مجھ کو لکھو تو میں طالب [طابع] سے یہاں نول کشور مراد ہیں] کو اطلاع دوں اور طلب اُس کی جب ہو۔ اگر ہو تو کتاب بھیج دوں[۲۹]..... "

نیر کے فراہم کردہ نسخے کی ہی بنیاد پر بعد کو ۱۸۶۳ء میں نول کشور پریس لکھنؤ سے ' کلیات غالب ' چھپا تھا۔ [اس کی تفصیل آگے ملاحظہ فرمائی جائے]۔

(۴)

میر مہدی مجروح کے نام غالب نے ایک خط میں اپنے جس فارسی کلیاتِ نظم کے چھپنے کی تدبیر ہونے کا ذکر کیا ہے وہ بعد کو نول کشور پریس میں چھپا تھا۔ غالب نے مجروح کو لکھا ہے:

.... کلیاتِ نظم فارسی کے چھاپنے کی بھی تدبیر ہو رہی ہے اگر ڈول بن گیا تو وہ بھی چھاپا جائے گا[۳۰]..... "

(۵)

مکتوب غالب بہ نام قدر بلگرامی[۳۱] کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

" صاحب! تم بہت دن سے بے کار ہو۔ ایک جگہ مساعدِ روزگار کی صورت ہے۔ تم بے تکلف میرا یہ رقعہ ہمراہ لے کر لکھنؤ چلے جاؤ۔ مطبع اودھ اخبار میں میرے شفیق دلی یعنی منشی نول کشور صاحب سے ملو اور یہ رقعہ ان کو پڑھوا دو۔ اپنی نظم و نثر اُن کو دکھاؤ اور اپنا مبلغ علم اُن پر ظاہر کرو۔ اگر وہ اپنی مرضی کے موافق تم کو کارگزار سمجھیں گے تو مطبع کا کام تمہارے سپرد کر دیں گے۔ مشاہرہ خاطر خواہ تم کو مقرر ہو جائے گا، معزز و مکرم رہو گے، زندگی کا لطف اٹھاؤ گے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ جلد چلے جاؤ۔ لکھنؤ تم سے نزدیک ہے، اتنی راہ کا قطع کرنا کچھ دشوار نہیں۔ . . جنت آرزو کی ہے[۳۲]"

(۶)

قدر بلگرامی کو غالب کی سفارش پر نول کشور پریس لکھنؤ میں

مت مل گئی لیکن تن خواہ کم تھی۔ قدر یا تو مشاہرے میں اضافہ چاہتے
یا لکھنؤ کی یہ نوکری چھوڑ کر اپنے وطن بلگرام واپس جانے کا خیال
ے تھے۔ غالب نے قدر کو بلگرام جانے سے روکا اور مطبع نول کشور
ؤ میں اُس وقت تک نوکر رہنے کا مشورہ دیا جب تک بلگرام
لوئی پریس نہ قائم ہو جائے۔ ان مطالب پر مشتمل قدر بلگرامی کے نام
ب کا ایک خط ملاحظہ ہو:

"آپ کا خط لکھنؤ سے آیا، حالات معلوم ہوئے۔ یہ
نہ معلوم ہوا کہ کیا کام آپ کے سپرد ہوا ہے؟ یہ بھی لکھیے۔ چند
روز صبر کرو، اگر وطن میں ہوتے تو اس بے کاری میں گھر
کی خبر کیا لیتے؟ جس طرح جب گزرتی، اب بھی گزر جائے
گی بلکہ تمہارا خرچ کم ہو گیا ہے۔ بہ ہر حال ابھی اضافے
کے واسطے نہ تم کہو، نہ میں لکھوں۔ دو چار مہینے کام کرو
اس [اثنا] میں اگر بلگرام میں چھاپہ خانہ جاری ہو گیا تو
استعفا دے کر چلے جائیو۔ یہاں بعد چند روز کے اضافہ
ہونا بھی تو حیزِ امکان سے باہر نہیں۔"[۳۳]

(۷)

قدر بلگرامی کے نام اپنے کئی رقعات میں غالب نے "منشی صاحب"
شی نول کشور کا ذکر کیا ہے۔ مکتوب غالب بہ نام قدر بلگرامی
۵ مئی ۱۸۶۲ء کا ایک تراشہ پیش ہے:

"... جناب منشی صاحب سے میرا سلام کہیے اور یہ رقعہ اُن کو
پڑھا کر عرض کیجیے کہ غالب پوچھتا ہے کہ فارسی کے کلیات کا
چھاپا ملتوی ہے یا جاری ہے؟ ملتوی ہے تو کب تک کھلے گا؟ جاری
ہے، تو تصحیح کس طور پر ہے؟ قصیدے اور تاریخ کلیات کا
مطبع [یعنی نول کشور پریس] میں پتا لگا ہے یا نہیں؟ اگر دونوں
کاغذ گم ہو گئے ہوں تو نقلیں بھیج دوں ... قاطع برہان کے
جزا کی جلدیں بندھ گئی ہیں یا نہیں؟ اگر بندھ گئی ہوں تو جناب
منشی صاحب سے کہو کہ وہ جو پچاس جلدیں میں نے لی ہیں
ان میں سے ایک جلد لے کر ... قبلہ و کعبہ جناب مجتہد العصر
کی خدمت میں حاضر ہو اور ... کتاب نذر کرو اور کہو کہ غلام
بہت خونِ جگر کھا کر فارسی کی تحقیق کو اس پایے پر پہنچایا ہے کہ
اس سے بڑھ کر متصور نہیں۔ یہ مجال کہاں کہ داد کا طلب گار
ہوں؟ صرف عزتِ قبول کا امیدوار ہوں۔
مجھے سید صاحب و منشی صاحب سے چار دا سوالوں کا جواب
اور جو قبلہ و کعبہ فرمائیں ... ہو بہو لکھ بھیجو۔ ہاں مولوی ہادی
علی صاحب[۳۴] کا جو حال معلوم ہو، وہ بھی ضرور لکھنا ...[۳۵]

(۸)

میر مہدی مجروح کو ۱۵/۱۶ مئی ۱۸۶۲ء[۳۶] کے خط میں غالب لکھتے ہیں:

"... کلیات [یعنی کلیاتِ غالب نظم فارسی جو اس وقت
نول کشور پریس لکھنؤ میں زیر طبع تھا] کے چھاپے کی حقیقت سنو،
۶۰ صفحے چھاپے گئے تھے کہ مولوی ہادی علی مصحح بیمار ہو گئے۔ کاپی
نگار رخصتی اپنے گھر گیا۔ اب دیکھیے کب چھاپا شروع ہو۔ قاطع برہان
کا چھاپا ختم ہوا۔ ایک جلد بہ طریق نمونہ آ گئی۔ میں نے پچاس
جلدوں کی درخواست پہلے سے دے رکھی ہے۔ اب پچاس روپے
بھیجوں تو ۴۹ جلدیں منگاؤں۔ دیکھیے نو من تیل کب میسر ہو
اور رادھا کب ناچے ..." [اُردوے معلّٰی (عا) طبع
مارچ ۱۸۶۹ء ص ۱۶۴]

(۹)

مکتوب غالب مورخہ ۴ مئی ۱۸۶۲ء بہ نام قدر بلگرامی کا ایک تراشہ
ملاحظہ ہو:

"... جناب منشی صاحب [یعنی منشی نول کشور] سے میرا سلام
کہہ کر اُن کے حکم سے ایک نسخہ قاطع برہان کا مطبع میں سے لو
اور مکان معلوم کر کے جناب مفتی میر عباس صاحب کے پاس جاؤ اور
میرا سلام کہو اور کتاب دو اور عرض کرو کہ جو خونِ جگر میں نے اس
تالیف میں کھایا ہے، یقین ہے کہ اُس کی داد تمھارے سوا اور
سے نہ پاؤں گا۔

ہاں صاحب، جناب منشی صاحب سے یہ کہہ دینا کہ پچاس میں سے تین
جلدیں میں نے پائیں۔ اب قیمت کا روپیا بھیج کر سینتالیس اور
منگائے لیتا ہوں۔ کلیات کے انطباع کی تاریخ میں کیوں لکھوں؟

اہلِ مطبع کو خدا منشی صاحب کے عطوفت میں سلامت رکھے۔ لیکن چھاپا؟ [یعنی ۱۲۶۸ھ] میں شروع ہوا۔ [۱۲۶۹ھ] میں تمام ہو گا۔ مولوی ہادی علی صاحب کے مطبع میں آنے کا حال تم لکھو اور کلیات کے کاپی نگار کے آنے کا حال بھی معلوم کر کے لکھو۔"

[خطوطِ غالب (۱)؛ مرتبہ مالک رام ص ۲۶۸]

(۱۰)

آپ علاء الدین احمد خاں علائی کو ۱۹ جون ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں غالب لکھتے ہیں :

"۔۔۔۔ کلیات کے انطباع کا انقضا اتنی بیست یک مجھ کو نظر نہیں آتا۔ قاطع برہان کا چھاپا تمام ہو گیا۔ حق التصنیف کی ایک جلد میرے پاس آ گئی ہے وہ تمھارے نام دارک نذر ہوئی۔ باقی جلدیں جن کا میں خریدار ہوا ہوں اور درخواست میری مطبع [یعنی مطبع نول کشور] میں داخل ہے، جب تک قیمت نہ بھیج دوں کیوں کر آئیں۔۔۔۔" [اردوے معلیٰ (۱) طبع ۱۸۶۹ء ص ص ۴۱۱ تا ۴۱۲۔ تاریخِ خط کے لیے دیکھیے خطوطِ غالب (۱): مرتبہ مالک رام ص ۲۸۰]

(۱۱)

مکتوب غالب بہ نام علائی مورخہ ۱۱ جون ۱۸۶۳ء کا ایک اقتباس بھی دیکھیے:

"۔۔۔ کلیات کے باب میں جو عرض کر چکا ہوں۔۔۔۔ جب میں دس پندرہ جلدیں منگاؤں گا، ایک بھائی کو اور ایک تم کو ارمغان بھیجوں گا اور اگر بھائی کو جلدی ہے تو لکھنؤ میں اودھ اخبار کا مطبع، مالک اُس کا منشی نول کشور مشہور۔ جتنی جلدیں چاہیں لکھنؤ سے منگا لیں میں بہر حال دو جلدیں جس وقت موقع ہو گا۔ بھیج دوں گا۔" [اردوے معلیٰ (۱) طبع ۱۸۶۹ء ص ۴۳۰]

(۱۲)

سید بدر الدین کے نام ایک خط میں غالب رقم طراز ہیں :

"۔۔۔ فارسی کا دیوان بیس پچیس برس کا عرصہ ہوا جب چھپا تھا مگر ہاں سالِ گزشتہ [محمد عتیق صدیقی کی تحقیق ہے کہ ۱۸۶۳ء کے اس خط میں یہاں غالب کو سالِ گزشتہ سے پیوستہ لکھنا چاہیے تھا۔ غالب نامہ، دہلی جلد ۱۔ شمارہ ۲۔ ۴ ص ۲۴] میں منشی نولکشور نے شہاب الدین خاں کو لکھ کر کلیاتِ فارسی جو ضیاء الدین خان نے غدر کے بعد بڑی محنت سے جمع کیا تھا، وہ منگا لیا اور چھاپنا شروع کیا۔ وہ بیاس جز ہیں یعنی کوئی مصرع میرا اس سے خارج نہیں۔ اب سنتا ہے کہ وہ چھپ کر تمام ہو گیا ہے۔ روپے کی فکر میں ہوں، ہاتھ آ جائے تو ۶۵ روپے بھیج کر بیس جلدیں منگاؤں۔ جب آ جائیں گی ایک آپ کو بھیج دوں گا۔"

[اردوے معلیٰ (۱) طبع اول ص ۱۳۰]

(۱۳)

مکتوب غالب بہ نام علائی مورخہ ۲۰ ستمبر ۱۸۶۳ء کا ایک تراشہ ملاحظہ ہو :

"۔۔۔۔ پہلے خط اور پھر بہ توسط برخوردار علی حسین خاں، مجلد کلیاتِ فارسی بھیجے۔ حیرت ہے کہ چار روپے قیمت کتاب اور ۱۲ آنے محصول ڈاک قالبِ انطباع میں آکر پانچ روپے قیمت اور ۵ آنے محصول قرار پا گئے۔ خیر جہاں سو وہاں سولے [کذا؛ سوا سے]۔ میرا حال تمھیں اور تمھارا حال مجھے معلوم ہے۔ ۔۔۔ اب کے پنشن میں شاید نہ دے سکوں۔ نومبر سنہ حال میں پچاس روپے تمھارے پاس پہنچ جائیں گے۔۔۔۔"

[اردوے معلیٰ (۱) طبع ۱۸۶۹ء ص ۴۲۶]

یہاں کلیاتِ غالب [مطبوعہ نول کشور پریس، لکھنؤ] اور اس کی قیمت کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۱۴)

منشی حبیب اللہ خاں ذکا کے نام اپنے خط مورخہ ۲۵ ستمبر ۱۸۶۲ء میں غالب نے اپنے جس کلیات کا ذکر کیا ہے وہ مئی جون ۱۸۶۳ء میں منشی نول کشور پریس، لکھنؤ سے بہ عنوان کلیاتِ غالب چھپ چکا تھا۔ غالب نے ذکا کو لکھا ہے :

"۔۔۔۔ صاحب، تاریخِ انطباعِ کلیات خوب لکھی ہے مگر ہزار حیف کہ بعد از اتمامِ انطباع پہنچی اور کتاب کی رونق افزا نہ ہوئی۔۔۔ آپ سے یہ چاہتا ہوں کہ آپ مولوی صاحب [یعنی مولوی موید الدین خاں] سے ملیں اور اُن کو یہ خط اپنے نام کا دکھائیں اور میری طرف سے بعدِ سلام میرے کلیات کے پارسل کا اُن کے پاس اور

اُن کے ذریعۂ عنایت سے اُس مجلد کا حضرت فلک رفعت نواب مختار الملک بہادر کی نظر سے گزرنا اور جو کچھ اُس کے گزرنے کے بعد واقع ہو، دریافت کرکے مجھ کو مطلع فرمائیں۔"[18]

تراشے میں غالب نے اپنے کلیات نظم فارسی (مطبوعہ ۱۸۶۳ء / ۱۲۸۰ھ) کے متعلق منشی نول کشور کے جس قطعۂ تاریخ کا ذکر کیا ہے وہ بہ ظاہر یہ ہو سکتا ہے:

ب کہ نفی مطلق اگر معنی کم است — گویم کہ ہمسرش بہ سخن کم تر آمده
ن روز مطبع منشی نول کشور — طومار سعی کارگزاراں بر آمده
ۂ انطباع نویسد ذکا ہمی — جان سخن بہ قالب طبع اندر آمده
ہا سے ہا زرشک بر آمد زمنکراں — یک حرف یا چہ شد ہمہ اغر گر آمده[19]

(۱۵)

... کے نام ۳ دسمبر ۱۸۶۳ء کے خط میں غالب کا بیان ہے:

"..... شفیق مکرم دستمنۂ تم منشی نول کشور صاحب بہ سبیل ڈاک یہاں آئے۔ مجھ سے اور تمھارے چچا اور تمھارے بھائی شہاب الدین خاں سے ملے۔ خالق نے اُن کو زہرہ کی صورت اور مشتری کی سیرت عطا کی ہے۔ گویا بجائے خود قرآن السعدین ہیں۔ تم سے میں نے کچھ نہ کہا تھا اور کلیات کے دس مجلد کی قیمت پچاس روپے مان لیے تھے۔ اب اُن سے جو ذکر آیا تو انھوں نے پہلی قیمت مشتہرہ اخبار لینی قبول کی، یعنی تین روپے چار آنے فی جلد۔ اس صورت میں دس مجلد کے بتیس روپے آٹھ آنے میں دوں اور بتیس روپے آٹھ آنے تم دو۔ کلی ۶۵ روپے مطبع اودھ اخبار میں پہنچانے چاہئیں۔ میں دسمبر ماہ حال کی دسویں گیارھویں کو طالب ہوں گا۔ کہو بتیس روپے آٹھ آنے علی حسین خاں کو دے دوں، کہو لکھنؤ بھیج دوں"

... کے نام غالب کا یہ خط اردوئے معلیٰ (حصہ اول، طبع مارچ ۱۸۶۹ء) میں موجود ہے۔ استاذی مولانا مرتضیٰ حسین صاحب فاضل لکھنوی ... نے اس خط کے اصل نسخے [بہ قلم غالب] میں منشی نول کشور کی ایک عبارت بھی دیکھی ہے جس میں نول کشور نے لکھا ہے کہ یہ قیمت ...زا صاحب بہادر کے ارشاد کے مطابق رکھی ہے۔ منشی نول کشور کی یہ ... کے اصل نسخے کے کنارے درج ہے۔ استاذی مولانا فاضل لکھنوی سے خط کے اصل نسخے کا عکس مع تحریر نول کشور حاصل کرنے کی سعی کر رہا ہوں۔ عکس ملنے پر اسے شائع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۱۶)

علائی کے نام ایک اور خط مورخہ ۱۳ دسمبر ۱۸۶۳ء میں بھی غالب نے نول کشور کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"..... نہ دن یاد نہ تاریخ، آج چوتھا یا پانچواں دن ہے کہ منشی نول کشور بہ سواری ڈاک رہ گرائے لکھنؤ ہوئے۔ کل پہنچ گئے ہوں یا آج پہنچ جائیں۔ آج روز یک شنبہ ۱۳ دسمبر کی ہے۔ ایک دن منشی صاحب میرے پاس بیٹھے تھے اور برخوردار شہاب الدین خاں بھی تھا۔ میں نے منشی صاحب کو مخاطب کر کے کہا کہ اگر میں دنیادار ہوتا تو اس کو نوکری کہتا، مگر چوں کہ فقیر تکیہ دار ہوں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ تین ٹکے کا روزینہ دار ہوں: ساڑھے باسٹھ روپے یعنی سات سو پچاس روپے سال سرکار انگریزی سے پاتا ہوں اور بارہ سو سال رام پور سے اور ... روپے سال ان مہاراجہ سے۔ تو شغل یہ کہ دو برس سے ہر مہینے میں چار بار اخبار [یعنی اودھ اخبار] مجھ کو بھیجتے ہیں، قیمت نہیں لیتے، مگر ہاں اڑتالیس ٹکٹ میں مطبع میں پہنچا دیا کرتا ہوں....."

[اردوئے معلیٰ (ط ۱) طبع ۱۸۶۹ء ص ۴۳۳]

خطوط غالب کے اقتباسات نمبر (۱۵) اور (۱۶) کے باہم مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ نومبر دسمبر ۱۸۶۳ء میں منشی نول کشور نے اپنے سفر دہلی کے موقع پر غالب سے پہلی بار ملاقات کی تھی۔ ان حالات میں مولانا غلام رسول مہر کا یہ ارشاد محل نظر ہے کہ "ستمبر ۱۸۶۱ء میں منشی نول کشور دہلی آئے اور غالب سے بھی ملے۔"[20]

(۱۷)

مکتوب غالب بہ نام مردان علی خاں رعنا کا تراشہ ملاحظہ ہو:

"..... منشی نول کشور صاحب یہاں آئے تھے، مجھ سے ملے۔ بہت خوبصورت اور خوش سیرت، سعادت مند اور معقول پسند آدمی ہیں۔ تمھارے وہ مداح اور میں اُن کا ثناخواں۔ خدا تم کو اور ان کو سلامت رکھے۔"[21]

(۱۸)

۱۲ فروری ۱۸۶۵ء کے خط میں غالب، تفتہ سے یوں مخاطب ملتے ہیں :

"۔۔۔ ہم تو آپ کو سکندر آباد قاضی گو یوں کے محلے میں سمجھے ہوئے ہیں اور آپ لکھنؤ، راجا مان سنگھ کی حویلی، مطبع اودھ اخبار میں بیٹھے ہوئے ہو اور یہ حقہ لکھنؤ کا پی رہے ہیں اور منشی نول کشور صاحب سے باتیں کر رہے ہیں۔ بھلا منشی صاحب کو میرا سلام کہنا۔ آج یک شنبہ ہے، اخبار کا لفافہ ابھی تک نہیں پہنچا۔ ہر ہفتے کو پنج شنبہ و جمعہ کو پہنچتا تھا۔۔۔۔
[اُردوے معلیٰ (حا) طبع اوّل ص ۱۱۰]

(۱۹)

علیم آباد کے ایک ناشر میر ولایت علی کے نام اپنے ۲ اپریل ۱۸۶۵ء کے خط میں غالب نے اودھ اخبار لکھنؤ کا ذکر یوں کیا ہے :

"۔۔۔۔ از روے اودھ اخبار، لکھنؤ، بوستانِ خیال کا ترجمہ مسمیٰ بہ پرستانِ [خیال] آپ کے مطبع میں آمادہ انطباع بلکہ دو جلدوں کا منطبع ہو جانا۔۔۔۔ معلوم ہوا۔۔۔۔" [اُردوے معلیٰ (صدی ایڈیشن) حصہ دوم و سوم : مرتبہ فاضل لکھنوی لاہور، ص ۱۰۳۰]

(۲۰)

تفتہ کے نام اپنے رام پور سے تحریر کردہ، مکتوب مورخہ ۲۸ نومبر ۱۸۶۵ء میں غالب کا بیان ہے :

"۔۔۔۔ نواب صاحب [والی ریاست رام پور نواب کلب علی خاں] ۔۔۔۔ خزانۂ فیض کے تحویل دار ہیں ۔۔۔۔ منشی نول کشور صاحب کی عرضی پیش ہوئی۔ خلاصہ عرضی کا سن لیا۔ واسطے منشی صاحب کے کچھ عطیہ ۔۔۔۔۔۔ تجویز ہو رہا ہے۔ مقدار مجھ پر نہیں کھلی ۔" [اُردوے معلیٰ (حا) طبع اول ص ۹۸ تا ۹۹]

(۲۱)

خواجہ غلام غوث بے خبر کے نام ۱۰ جنوری ۱۸۶۶ء کے خط میں غالب نے اودھ اخبار کا ذکر کیا ہے :

"۔۔۔۔۔ رام پور ہی میں تھا کہ اودھ اخبار میں حضرت کی غزل نظر فروز ہوئی ۔۔۔۔۔۔" [عود ہندی طبع رجب ۱۲۸۵ھ اکتوبر ۱۸۶۸ء، ص ۱۰۵۔ خط کی تاریخ بحوالہ مولانا فاضل لکھنوی۔]

(۲۲)

منشی حبیب اللہ ذکا کے نام اپنے خط مورخہ ۱۶ شعبان ۱۲۸۳ھ [مطابق ۲۴ دسمبر ۱۸۶۶ء] میں بھی غالب نے اودھ اخبار کا ذکر کیا ہے :

"۔۔۔۔۔ ہاں صاحب! اودھ اخبار میں یہ قصیدہ ۔۔۔۔۔ دیکھا ۔۔۔۔۔ پھر مہینا بھر ہوا اسی اودھ اخبار میں یہ خبر دیکھی ۔۔۔۔۔ اسی اخبار میں پھر دیکھا گیا کہ ایک صاحب نے مولوی غلام امام کے کلام پر اعتراض کیا ہے ۔"
[اردوے معلیٰ (حا) طبع ۱۹۶۹ء ص ص ۴۴ تا ۴۵]

(۲۳)

مکتوب غالب بنام سیاح مورخہ ۳۱ مارچ ۱۸۶۰ء کا ایک تراشہ ملاحظہ ہو :

"۔۔۔۔۔ صاحب میں نے اودھ اخبار میں دیکھا کہ چھوٹے صاحب مقدمہ جیتے ۔۔۔۔۔ میں تو تہنیت میں خط لکھوں گا مگر جی ۔۔ آتا ہے کہ بہ حوالہ اودھ اخبار لکھوں اور بہ حوالہ سیف الحق نہ لکھوں ۔۔۔۔۔"
[اردوئے معلیٰ (حا) طبع اول ص ۲۲]

(۲۴)

منشی نول کشور کے ذکر پر مشتمل غالب کے ایک اور خط کا اقتباس بھی دیکھیے :

"بھائی سے دو سوال ہیں۔ ایک تو یہ کہ مجموعۂ نثر کے خاتمے کو کیا کروں۔ وہ مبنی تھا اس حقیقت پر کہ نول کشور ضیا الدین خاں سے واسطے انطباع کے لے گیا ۔۔۔۔" [۲۴]
ڈاکٹر خلیق انجم نے اس خط کے متعلق اپنے حاشیے میں لکھا ہے:
"اس خط پر کوئی تاریخ تحریر نہیں ہے۔ منشی نول کشور نے ۱۸۶۲ء

میں نواب ضیاء الدین خاں کے صاحب زادے نواب شہاب الدین ثاقب سے کلیاتِ فارسی چھاپنے کے لیے منگوایا تھا۔ اس لیے یہ خط اسی سال کا قرار پاے گا[۴۳]"

ڈاکٹر خلیق انجم کو یہاں غلط فہمی ہوئی ہے۔ خط میں غالب کا یہ بیان ہے "کلیاتِ نظم کے بارے میں نہیں بلکہ اپنے" مجموعۂ نثر کے بارے میں ہے جس کا قلمی نسخہ منشی نول کشور اپنے سفرِ دہلی میں ضیاء الدین خاں سے بہ غرضِ انطباع لکھنؤ لے گئے تھے اور جیسا کہ سطورِ گذشتہ میں عرض کیا جا چکا ہے منشی نول کشور نے نومبر، دسمبر ۱۸۶۲ء میں دہلی کا سفر کیا تھا۔ نول کشور ۶۳-۱۸۶۲ء کے ماہ دسمبر کے عشرۂ اول میں دہلی سے لکھنؤ واپس ہوے تھے گو یا یہ خط ۱۸۶۲ء کے بجاے ۸ یا ۹ دسمبر ۱۸۶۲ء کے بعد لکھا گیا ہوگا۔ جناب اکبر علی خاں عرشی زادہ سے مجھے غالب کے اس رقعے کے اصل نسخے کا عکس ملا تھا جو غالب کی تحریر میں ہے اور اس میں غالب کے قلم سے نول کشور کا نام لکھا موجود ہے۔ تحریرِ غالب کا یہ عکس پیشِ نظر مضمون میں میں بہ شکریۂ جناب عرشی زادہ شائع کرایا جا رہا ہے۔

(۲۵)

خطوط کے علاوہ غالب نے تقریظ قاطع برہان میں بھی نول کشور کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"...... بارے سپاس مردمی و مہرورزی آں مردم چشم مہرورزی و مہر سپہر مردمی، آں بہ دانش گراں مایہ و آں بہ جاہ بلند پایہ، آں بہ سرکشادہ چو فریدوں با ضحاک دیا فرو دستاں چوں سلیماں با موز سرا پا دانش و ہمہ تن بینش، منشی نول کشور، بجاے آر کہ بہ خریداری دکانِ بے رونق کہ لیست، تا نقش ایں کلیہ تر بادر الطباع درست نشست۔ اگر ایں جوان مردِ بیدار دل بہ بستن شیرازۂ اوراقِ پریشاں نہ پرداختے، کاغذ مسودات قاطع برہان را با کاغذ گر پڑے دیہ آب آغشتہ فرو رفتے، یا سرمہ فروش چریدے تا عکسہ با ساختے۔ بہ آئینۂ کلک حق گذار من پایان آں نسخۂ منطبع آں بنشتن تقریظ و تاریخ وزن مہر نقش دیگر انگیخت تا ہیچ کس بے دستوری صاحب مطبع اودھ اخبار میں سوا اور کالبد الطباع فرو توانند ریخت ......"[۴۴]

(۲۶)

غالب نے خاتمۂ پنج آہنگ میں بھی نول کشور کا ذکر کیا ہے[۴۵] جس کے متعلقہ حصوں کا ملخص اردو مفہوم پیش کیا جاتا ہے:

"........ آج میری عمر ۶۰ برس کی ہو چکی ہے..... پچھلے دو برس سے اس فکر میں تھا کہ اپنی ...... [تحریروں] کو مرتب کروں اور مزید خامہ فرسائی اور خود نمائی کو چھوڑ کر انھیں اہلِ نظر کی خدمت میں پیش کروں۔ اب کہ ۱۲۸۰ھ [۶۴-۱۸۶۳ء] ہے، روشن دل روشن طبع صاحب مہر و مروت منشی نول کشور نام آدر کا، اس ویرانے میں جس کا نام شاہ جہاں آباد ہے گزر ہوا اور وہ ازرہِ درویش نوازی غریب خانے پر تشریف لاے۔ میں نے اس ملاقات کی شادمانی پر اپنے آپ کو مبارک باد دی ..... منشی نول کشور میری نثر کا مجموعہ جس میں یہ صحیفہ [پنج آہنگ] بھی شامل ہے نواب ضیاء الدین خاں سے مستعار لے کر اپنے ساتھ لکھنؤ لے گئے تاکہ اس کلام نا مطبوع کو زیورِ طباعت سے آراستہ کریں ......"[۴۶]

(۲۷)

منشی نول کشور کے نام اردو میں غالب کا اب صرف ایک مطبوعہ خط محفوظ ہے جو سطورِ ذیل میں منقول ہے:

"منشی صاحب، جمیل المناقب جناب منشی نول کشور صاحب کو دولت و اقبال و جاہ و جلال روز افزوں نصیب ہو۔ چونکہ احباب کا رنج و شاد کامی احباب سے شاد ہوتے ہیں اس واسطے مجھے ان دنوں میں یاوریِ اقبال سے ایک امر خوشی کا پیش آیا ہے، تو آپ کی خوشی کے واسطے لکھتا ہوں بلکہ نظر ہم دگر کے اتحاد پر تم کو تہنیت دیتا ہوں۔

آپ کو مبارک ہو کہ اواخر ماہِ گذشتہ کو جو حضرت فلک رفعت نواب معلی الالقاب لفٹنٹ گورنر بہادر قلمرو پنجاب دہلی میں تشریف لاے تو سہ شنبہ ۳ مارچ ۱۸۶۳ء کو اس گمنام گوشہ نشین کو یاد فرمایا اور از راہِ بندہ پروری کمال عنایت سے خلعت عطا کیا۔

سبحان اللہ! جو لوگ متعلق ہیں لفٹنٹ گورنر پنجاب سے، وہ قسمتوں کے کتنے اچھے ہیں۔ جناب نواب معلی الالقاب کے مکارمِ اخلاق وہ روح افزا کہ جس سے مردہ زندہ ہو جائے۔ صاحب والا مناقب تامس ڈگلس فورسائٹ صاحب بہادر سکرٹر [سکریٹری] کے کلمات شفقت آمیز وہ روح آسا کہ جس کو سن کر بیمار شفا پائے ہیں ... شاداں آیا بلکہ بوڑھا گیا جوان آیا۔ سچ ہے: ؎

وزیرے چنیں، شہریارے چناں
جہاں چوں نہ گیرد قرار چناں

..... لفٹنٹ گورنر بہادر اور صاحب سکرتر بہادر کا کیا کہنا ہے۔ آفتاب و ماہتاب ہیں مگر پنڈت من پھول سنگھ صاحب میر منشی بھی دیانت و امانت و کار پردازی و مظلوم نوازی میں انتخاب ہیں۔ یہ نہ مبالغہ ہے، نہ خوشامد ہے، بیان واقعی ہے، شاعرانہ سخن سازی کو میں نے دخل نہیں دیا ہے، وہ لکھا ہے جو سچ اور واجبی ہے۔ فقط دوام دولتِ سرکار انگریزی کا طالب بجز ناتواں اسد اللہ خاں غالب۔" (رقیمہ)

منشی نول کشور کے نام غالب کا یہ اردو خط اودھ اخبار لکھنؤ مورخہ ۲۵ مارچ ۱۸۶۲ء میں چھپا تھا۔ یہ خط استاذی مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی کی تلاش کے نتیجے میں منظرِ عام پر آیا تھا۔ اس خط کا زمانۂ تحریر مارچ ۱۸۶۲ء ہے مگر یہ خط ۳ مارچ کے بعد اور ۲۵ مارچ سے قبل لکھا جا چکا ہوگا۔

(۲۸ و ۲۹)

مجھے نول کشور کے نام غالب کے دو ایسے خطوں کا علم ہوا ہے جو اب ناپید ہیں۔ قدر بلگرامی کو ایک خط میں غالب نے اطلاع دی ہے:

"........ اس وقت آپ کی وحشت انگیز تحریر پہنچی۔ ادھر اس کو پڑھا اور ادھر یہ خط لکھیں اور ایک ..... خطِ تہنیت کا منشی صاحب کو لکھا ..... " [خطوطِ غالب (ج ۱) مرتبہ مالک رام ص ص ۲۶۸ تا ۲۶۹]

یہاں "منشی صاحب" سے مراد منشی نول کشور ہیں اور اس خط کا زمانۂ تحریر جون ۱۸۶۲ء ہے۔ مجھے تلاش کے باوجود غالب کے اردو یا فارسی خطوط میں نول کشور کے نام جون ۱۸۶۲ء کا کوئی خط نہیں مل سکا ہے لیکن منقولہ تراشہ بخوبی ثابت کرتا ہے کہ جون ۱۸۶۲ء میں بھی غالب نے نول کشور کو ایک تہنیتی خط لکھا ہے جو اب غالب کے گم شدہ خطوط میں شامل کیا جائے گا۔

قدر بلگرامی ہی کو اپنے خط مورخہ ۵ مئی ۱۸۶۲ء میں منشی نول کشور کے نام پیام دیتے ہوئے غالب نے یہ فقرہ بھی لکھا ہے:

"یوسف مرزا صاحب بذریعہ میرے خط کے آپ سے مل گئے یا نہیں؟"

[خطوطِ غالب (ج ۱)، مرتبہ مالک رام ص ۲۶۷]

اس فقرے کے مخاطب نظر بظاہر نول کشور ہیں اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۵ مئی ۱۸۶۲ء سے کچھ قبل شاید یوسف مرزا کے بارے میں غالب نے نول کشور کے نام کوئی خط لکھا تھا۔ اگر میرا اندازہ درست ہے تو نول کشور کے نام غالب کا یہ خط بھی اب ناپید ہے۔ اس خط کو ملا کر اب نول کشور کے نام غالب کے رقعات کی تعداد چار ہوتی ہے (ان چار خطوں میں سے اب دو خط محفوظ ہیں جو سطور گذشتہ میں اقتباسات (نمبر ۲ و ۲۷) کے ماتحت) پیش کیے جا چکے ہیں۔

غالب کی تحریروں میں نول کشور کے نام اور نول کشور کے نام غالب کے مکاتیب کا جائزہ لینے کے بعد اب ہم غالب کی چند ایسی کتابوں کا ذکر کرتے ہیں جو غالب کی زندگی میں ہی مطبع منشی نول کشور سے شائع ہوئی تھیں۔

(۱) قاطع برہان طبع ۱۸۶۲ء

غالب [متوفی ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء] کی زندگی میں نول کشور پریس نے غالب کی جو کتابیں شائع کی ہیں ان میں قاطع برہان پہلی کتاب ہے۔ قاطع برہان میں غالب نے محمد حسین برہان کی ضخیم فارسی فرہنگ برہان قاطع [زمانۂ تکمیل ۱۰۶۲ھ] کے بائیس ہزار تین سو بائیس الفاظ میں سے دو سو چوراسی الفاظ کے مطالب وغیرہ پر سخت اعتراض کیے ہیں۔[۴۸] قاطع برہان کا خاصا کمیاب [مگر ناقص الآخر] پہلا ایڈیشن میرے پاس موجود ہے۔ مولانا حالی نے اس کا سنہ اشاعت خلاف واقعہ ۱۲۷۶ھ

بتایا ہے۔[۸۶] حالانکہ قاطع برہان طبع اول کے خاتمۃ الطبع[۸۷] سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ یہ کتاب "بستم رمضان ۱۲۷۸ھ" کو شائع ہوئی تھی جو از روئے تقویم شنبہ ۲۲ مارچ ۱۸۶۲ء کے مطابق ہے۔ مولانا مرتضیٰ حسین فاضل قاطع برہان طبع اول کا سنہ اشاعت ۱۸۶۱ء بتاتے ہیں[۸۸] جو محلِ نظر ہے۔

قاطع برہان طبع اول کی قیمت ایک روپیہ فی جلد[۸۹] ضخامت ۹۸ صفحات، ناپ ۲۵ × ۱۶ سنٹی میٹر اور سطر ۲۲ سطری ہے۔ پوری کتاب کے صفحات جدولوں سے مزین ہیں۔ جدولوں کے درمیان کتابت کی ناپ ½ ۲۲ × ½ ۱۱ سنٹی میٹر ہے اور صفحات کے چوگرد کنارے سادے چھوٹے ہوئے ہیں۔

قاطع برہان طبع ۱۸۶۲ء کے کاتب مشہور شاعر شیخ امیر اللہ تسلیم لکھنوی تھے[۹۰] یہ اطلاع ڈاکٹر فضل امام کے پی۔ایچ۔ ڈی کے مقالے پر اضافہ ہے۔ ڈاکٹر فضل امام نے یہ لحاظ بیشتر تسلیم کو کاتب تو بتایا ہے[۹۱] مگر یہ نہیں بتایا کہ تسلیم قاطع برہان طبع اول کے کاتب بھی تھے۔ جناب قاضی عبدالودود بھی تسلیم کو قاطع برہان طبع اول کا کاتب تسلیم کرتے ہیں[۹۲]۔

نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع شدہ کتاب قاطع برہان حیاتِ غالب کے آخری دور کے لیے خاص اہم ہے کہ اس کے نتیجے میں غالب کو ایک زبردست ادبی معرکے سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ قاطع برہان کے خلاف کئی کتابیں لکھی گئی تھیں اور غالب کو ان میں سے بعض کے جواب میں خود کئی مختصر رسائل چھپوانا پڑے جن میں نامۂ غالب، تیغِ تیز، لطائفِ غیبی اور سوالات عبدالکریم شامل ہیں [تفصیلات کے لیے دیکھیے ذکرِ غالب مالک رام، مکتبہ جامعہ نئی دہلی طبع فروری ۱۹۷۰ء ص ۱۰۹ تا ۱۸۰]۔ ان رسائل کے علاوہ اکتیس اشعار پر مشتمل غالب کا ایک فارسی قطعہ[۹۳] بھی اسی ادبی معرکے کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آیا تھا۔ گویا قاطع برہان[۹۴] مطبوعہ نول کشور پریس غالب کے متعدد ولد و رسائل اور ایک فارسی قطعے کے لیے محرک ثابت ہوئی۔ کراہیت کے ان تمام پہلوؤں کے باوجود قاطع برہان کی اشاعت غالب کے لیے بہت مہنگی ثابت ہوئی۔ اس کتاب کے باعث وہ اپنی زندگی کے آخری دور میں طرح طرح کی ذہنی اذیتوں کے شکار ہوئے اور اس کتاب نے ان کی ادبی ساکھ کو بھی صدمہ پہنچایا۔

(۲) کلیاتِ غالب طبع ۱۸۶۳ء

غالب کے فارسی کلام کا مجموعہ بہ عنوان کلیاتِ غالب پہلی ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۳ء[۹۵] میں نول کشور پریس لکھنؤ سے غالب کی زندگی ہی میں چھپا تھا۔ اس کمیاب ایڈیشن کا ایک نسخہ میرے پاس موجود ہے۔ کلیاتِ غالب طبع ۱۸۶۳ء کے متعلق بعض امور یہ ہیں:

۱۔ ناپ: ۲۲ × ½ ۱۴ سنٹی میٹر
۲۔ کتابت کی ناپ: ½ ۲۰ × ۱۲ سنٹی میٹر
۳۔ سطر: ۲۱ سطری
۴۔ قیمت: پانچ روپے فی جلد[۹۶]
۵۔ ضخامت: ۵۶۳ + ۳ = ۵۶۶ صفحات
۶۔ یہ کتاب غالب کی تصویر از رائجے بھی مزین ہے۔

کلیاتِ غالب طبع ۱۸۶۳ء کی ترتیب یہ ہے:

صفحہ ۱۔ سرنامہ
صفحہ ۲ تا ۱۱ (فارسی دیباچہ از غالب)
صفحہ ۱۱ تا ۵۴۔ چھیاسٹھ قطعات
صفحہ ۵۴ تا ۵۵۔ ایک مخمس
صفحہ ۵۵ تا ۶۷۔ تین عدد ترکیب بند
صفحہ ۶۷ تا ۷۰۔ ایک عدد ترجیع بند
صفحہ ۷۰ تا ۱۲۹۔ گیارہ عدد مثنویاں
صفحہ ۱۳۰ تا ۲۵۲۔ چوسٹھ عدد قصائد
صفحہ ۲۵۳ تا ۵۳۶۔ غزلیات
صفحہ ۵۳۶ تا ۵۵۲۔ رباعیات
صفحہ ۵۵۲ تا ۵۵۵۔ فارسی نثر میں غالب کی تقریظ
صفحہ ۵۵۵ تا ۵۵۸ فارسی تاریخ از میر مہدی مجروح بہ طرز مثنوی
صفحہ ۵۵۸ تا ۵۵۹۔ بہ طرز مثنوی فارسی تاریخ از اصغر علی خاں نسیم
صفحہ ۵۵۹۔ فارسی قطعۂ تاریخ از محمد عبدالغنی [تلمیذ مولوی ہادی علی اشک]

صفحہ ۵۵۹ تا ۵۶۰ - فارسی تاریخ چار مثنوی از شیخ امیر اللہ تسلیم۔
صفحہ ۵۶۰ - منشی اشرف علی اشرف کے دو فارسی قطعات تاریخ
صفحہ ۵۶۰ - اردو قطعۂ تاریخ از مردان علی خاں رعنا
صفحہ ۵۶۱ تا ۵۶۲ - فارسی نثر میں خاتمۃ الطبع از ہادی علی اشک
صفحہ ۵۶۲ - فارسی قطعۂ تاریخ از ہادی علی اشک

غالب کے فارسی کلام کے لیے کلیاتِ غالب مطبوعہ نول کشور پریس یقیناً ایک نہایت اہم ماخذ ہے۔

(۳) دعای صباح

نول کشور پریس لکھنؤ نے غالب کی زندگی ہی میں دعای صباح کے عنوان سے ۲۶ صفحات پر مشتمل غالب کی ایک فارسی مثنوی بھی شائع کی تھی جس پر سنہ اشاعت درج نہیں۔ یہ مثنوی مرزا عباس بیگ کے ایما پر چھپی تھی۔ مرزا عباس بیگ دراصل غالب کی سگی بہن چھوٹی خانم کے فرزند یعنی غالب کے سگے بھانجے تھے۔ دعای صباح مطبوعہ نول کشور پریس کے نسخے کی ایک قلمی نقل رضا لائبریری، رام پور میں موجود ہے۔ رام پور کی اس قلمی نقل کی تاریخ کتابت ۲۲ رجب ۱۲۸۴ھ ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دعای صباح مطبوعہ نول کشور پریس ۲۲ رجب ۱۲۸۴ھ [مطابق ۲۱ نومبر ۱۸۶۷ء] سے قبل چھپی تھی۔ دعای صباح کا یہ مطبوعہ نسخہ جناب کالیداس گپتا رضا کے پاس موجود ہے اور موصوف نے اسے دسمبر ۱۹۷۷ء میں شائع بھی کیا ہے۔[۹۵]

(۴) کلیات نثر غالب طبع ۱۸۶۸ء

نول کشور پریس سے غالب کی زندگی میں غالب کی جو کتابیں شائع ہوئی تھیں ان میں کلیات نثر غالب طبع جنوری ۱۸۶۸ء آخری کتاب ہے۔ اس کا ایک نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں میری نظر سے گزرا ہے۔ ۲۹ سطری مسطر میں یہ کتاب ۲۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں غالب کی یہ کتابیں شامل ہیں:

(۱) پنج آہنگ (۲) مہر نیم روز (۳) دستنبو

میرے پاس کلیات نثر غالب کا چوتھا ایڈیشن موجود ہے جو مطبع منشی نول کشور کانپور سے اپریل ۱۸۸۰ء میں شائع ہوا تھا۔

وفات غالب کے بعد بھی نول کشور پریس غالب کی کتابیں چھاپتا رہا اور ان میں نہ صرف فارسی بلکہ اردو کتابیں بھی شامل ہیں۔ میری اطلاع کے مطابق نول کشور پریس نے بہ تفصیل ذیل غالب کی آٹھ کتابیں شائع کی ہیں:

(۱) قاطع برہان (۲) کلیات غالب (۳) دعای صباح (۴) پنج آہنگ [مشمولہ کلیات نثر غالب] (۵) مہر نیم روز [مشمولہ کلیات نثر] (۶) دستنبو [مشمولہ کلیات نثر] (۷) عود ہندی (۸) دیوان غالب (اردو)

ان کتابوں میں سے بیشتر بہ تکرار چھپ چکی ہیں۔[۹۶] مطبوعات نول کشور پریس میں سے میرے پاس غالب کی چند اور قابل ذکر کتابیں یہ ہیں:

(۱) کلیاتِ غالب: مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ[۹۷] طبع جنوری ۱۸۷۲ء
(۲) عودِ ہندی: غالب۔ مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ طبع دسمبر ۱۹۲۵ء
(۳) کلیات غالب: مرتبہ امیر حسن نورانی۔ راجا رام کمار بکڈپو وارث مطبع نول کشور، لکھنؤ، مطبوعہ ۱۵ فروری ۱۹۶۸ء
(۴) عود ہندی۔ مطبع تیج کمار وارث مطبع نول کشور، لکھنؤ طبع ۱۹۶۸ء [گیارھواں ایڈیشن]
(۵) دیوان غالب (اردو)۔ تیج کمار پریس، لکھنؤ (وارث نول کشور پریس) طبع جون ۱۹۷۶ء (طبع بار دوازدہم)

نول کشور پریس سے منظرِ عام پر آنے والی غالب کی ان مختلف کتابوں کی بے شمار اشاعتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے میرا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نول کشور پریس غالب کی کتابوں کا بہت بڑا ناشر رہا ہے۔ نول کشور پریس کے لیے یہ شرف دراصل غالب اور نول کشور کے درمیان اُن دوستانہ روابط ہی کا عطیہ ہے جن کی تفصیل سطور گذشتہ میں پیش کی گئی ہے۔



حواشی

۱؎ ان امور کے لیے دیکھیے مکتوبِ غالب مورخہ ۱۳ نومبر ۱۸۵۹ء بہ نام منشی شیو نرائن آرام مشمولہ اردوئے معلّیٰ (حصّہ اوّل) طبع مارچ ۱۸۶۹ء ص ۲۸۸
۲؎ مشمولہ کلیاتِ نثرِ غالب ۔ مطبع نول کشور، کان پور طبع اپریل ۱۸۸۸ء ص ص ۲۵۳ تا ۲۵۴۔ ۳؎ اس مضمون میں اودھ اخبار لکھنؤ کے جن شماروں کا ذکر کیا گیا ہے اُن کی فائلیں مختلف کتب خانوں میں ہیں جن تک سر دست راقم الحروف کی رسائی ممکن نہیں لہٰذا اودھ اخبار کے شماروں کے لیے راقم الحروف کو مندرجہ ذیل مصادر پر انحصار کرنا پڑا ہے:

(۱) نگار، رام پور جون ۱۹۶۲ء ص ص ۴۰ تا ۴۳ [مضمون اکبر علی خاں عرشی زادہ] (۲) نگار، رام پور اگست ۱۹۶۲ء ص ص ۳۵ تا ۳۹ [مضمون امیر حسن نورانی] (۳) غالب نامہ، دہلی جلد ۱۔ شمارہ ۳ و ۴ ص ص ۲۱ تا ۲۶ [مضمون محمد عتیق صدیقی] (۴) صحیفہ لاہور (غالب نمبر) جنوری ۱۹۶۹ء ص ص ۱۴۶ تا ۱۵۴ [مضمون مرتضیٰ حسین فاضل] (۵) تحقیقی نوادر: ڈاکٹر اکبر حیدری۔ اردو پبلشرز لکھنؤ۔ طبع ستمبر ۱۹۷۴ء ص ص ۳۶۳ تا ۳۹۰۔ (۶) غالب نام آورم: نادم سیتاپوری۔ سرفراز پریس، لکھنؤ۔ طبع ۱۹۶۹ء ص ۱۶۹۔ (۷) انتخابِ فتنہ: نادم سیتاپوری۔ نسیم بک ڈپو، لکھنؤ ص ۱۵ (۸) ہنگامۂ دلِ آشوب: مرتبہ سید قدرت نقوی۔ انجمن ترقیِ اردو کراچی طبع ۱۹۶۹ء ص ص ۱۰۵، ۱۳۶، ۱۴۷ (۹) علی گڑھ میگزین (غالب نمبر) بابت ۴۹-۱۹۴۸ء ص ۱۳۲ [مضمون مہیش پرشاد]

۴؎ یہاں اودھ اخبار نے دستنبو میں غالب کے جس بیان کا حوالہ دیا ہے وہ دستنبو مشمولہ کلیاتِ نثرِ غالب طبع اپریل ۱۸۸۸ء (ص ص ۳۹۲ تا ۳۹۵) میں موجود ہے۔ ۵؎ اودھ اخبار نے ملکۂ انگلستان کی مدح میں یہاں غالب کے جس قصیدے کا ذکر کیا ہے وہ بظاہر کلیاتِ غالب۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ طبع ۱۸۶۳ء (ص ص ۲۵۶ تا ۲۶۰) میں قصیدہ نمبر ۲۹ کی شکل میں موجود ہے۔ ملکہ وکٹوریا کی مدح میں ستتر اشعار پر مشتمل غالب کا یہ فارسی قصیدہ تین مطلعوں کا حامل ہے جن میں سے مطلعِ اوّل یہ ہے: ؎

نطقم نخست زمزمۂ خونچکاں دہد کز خوں طراز سرورقِ داستاں دہد

ڈاکٹر خلیق انجم نے غالب کے اس قصیدے کو خلافِ واقعہ اناسی (۷۹) اشعار پر مشتمل بتایا ہے۔ لیکن اشعار کی صحیح تعداد ۷۷ ہے۔ [غالب اور شاہانِ تیموریہ: خلیق انجم۔ مکتبہ جامعہ، دہلی طبع دسمبر ۱۹۷۴ء ص ۸۰ مع حاشیہ ۱]۔ ۶؎ جُود بہ معنی بخشش [غیاث اللغات طبع نومبر ۱۸۷۴ء ص ۱۲۹]۔ نوال بہ معنی عطا [منتخب اللغات: مولانا عبدالرشید الحسینی المدنی۔ مطبع احمدی، کان پور طبع ۱۸۸۰ء ص ۶۵۵]
۷؎ مُترصّد بہ معنی امیدوار [فرہنگ آصفیہ (جلد چہارم): سیّد احمد دہلوی۔ ترقیِ اردو بورڈ، دہلی طبع ۱۹۷۴ء ص ۲۷۸]
۸؎ تقویم یک صد و دو سالہ۔ مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ طبع ۱۸۶۵ء [مملوکہ رضا لائبریری، رام پور] ۹؎ منشی غلام محمد خاں تپش دہلوی اودھ اخبار کے مدیر، اخبار مشیرِ قیصرِ ہند کے مالک اور غالب کے شاگرد تھے۔ تعمیرِ ہریانہ کے نول کشور نمبر (ص ۶، نیز ص ۷۷) میں منشی غلام محمد خاں تپش کا نام ایک مقام پر "منشی غلام بخش تپش" اور دوسری جگہ "منشی غلام احمد تپش" درج ملتا ہے۔ فروغِ اردو کے نول کشور نمبر (ص ۲) میں بھی تپش کا نام "منشی غلام بخش خاں" درج ہوا ہے۔ یہ تمام اندراج نظرِ ثانی کے محتاج ہیں۔ تپش کا صحیح نام غلام محمد خاں تھا جس کی تائید ارمغانِ طبع ۱۸۷۷ء]، آبِ بقا، خمخانۂ جاوید اور تلامذۂ غالب سے ہو جاتی ہے۔ تپش نے اپنے جس سلسلِ مضمون [مطبوعہ مشیرِ قیصرِ ہند] میں امیر مینائی کے امیر اللغات کے اغلاط کی نشان دہی کی تھی اُس کے بارے میں ڈاکٹر ابو محمد سحر کا پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ [مطالعۂ امیر: نسیم بک ڈپو، لکھنؤ طبع مئی ۱۹۶۵ء ص ص ۴۴۲ تا ۴۴۵] خاموش ملتا ہے حالاں کہ آبِ بقا [طبع ستمبر ۱۹۲۸ء] و تلامذۂ غالب میں تپش کے اس مضمون کا ذکر موجود ہے۔ لالہ سری رام کا بیان ہے کہ تپش نے ۱۸۹۰ء کے قریب وفات پائی تھی مگر آبِ بقا میں تپش کا سنہ وفات ۱۳۲۰ھ [مطابق ۱۹۰۳-۱۹۰۲ء]

قرار دیا گیا ہے جسے تلامذۂ غالب میں بھی تسلیم کیا گیا ہے۔ خمخانۂ جاوید، آبِ بقا و تلامذۂ غالب میں تپش کے جو حالات درج ہیں اُن پر راقم الحروف نے مندرجہ ذیل اضافے کیے ہیں:

(۱) میری اطلاع کے بموجب سرسید احمد خاں، غلام محمد خاں تپش [مدیر اردو اخبار] کے مکتوب الیہ تھے۔ مجھے سرسید کے نام منشی غلام محمد خاں کا جو اردو خط ملا ہے اس سے کئی امور کا پتا چلتا ہے۔

(۲) غلام محمد خاں تپش کے نام سرسید بھی خط لکھا کرتے تھے۔ گویا غلام محمد تپش بھی سرسید کے مکتوب الیہ ہونے کا شرف رکھتے تھے۔

(۳) تپش ایک اچھے مضمون نگار تھے اور سرسید کے تہذیب الاخلاق میں تپش کے مضمون کو جگہ ملتی تھی۔

(۴) مجھے عبدالغفور نساخ کے اُردو دیوان ارمغان [طبع ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء] میں منشی غلام محمد خاں تپش دہلوی کا مندرجہ ذیل فارسی قطعۂ تاریخ بھی ملا ہے:

چو شد طبع دیوان ثالث بہ اُردو	مسلّم شدہ در جہان فضلِ قائل
ازآنجا کہ ہست از کمالاتِ نساخ	بگفتم کمالاتِ نسّاخ کامل

۱۲۹۴ھ

رک: (۱) خمخانۂ جاوید (جلد دوم): لالہ سری رام۔ رائے گلاب سنگھ پریس، لاہور طبع ۱۹۱۱ء ص ۳۵۔ (۲) آبِ بقا: مولوی عبدالرؤف عشرت لکھنوی۔ نامی پریس، لکھنؤ طبع ستمبر ۱۹۲۸ء ص ۱۰۰۔ (۳) تلامذۂ غالب: مالک رام۔ مرکزِ تصنیف و تالیف، نکودر (طبع اوّل) ص ۵۹ (۴) سیلکٹڈ ڈاکیومنٹس فرام دی علی گڑھ آرکائیوز طبع ۱۹۶۶ء ص ص ۱۶۹ تا ۱۷۰۔ (۵) ارمغان: نسّاخ۔ مطبع نظامی، کانپور طبع ۱۸۷۷ء ص ۱۲۵ [مملوکہ کاظم علی خاں]

۱۰ خیابانِ تواریخ: سید محمد علی حریا مراد آبادی۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ طبع ۱۸۸۱ء ص ۳۹ [مملوکہ کاظم علی خاں] ۱۱ تلامذۂ غالب ص ص ۲۸ تا ۲۸۴۔ ۱۲ بحوالۂ مثنوی سراپا سوز: مصنفہ محمد صادق اختر۔ مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی۔ مکتبہ کلیان، لکھنؤ ص د ۱۳ رک: ہنگامۂ دل آشوب ص ۴۶۔ ۱۴ غالب نے اپنے متعدد خطوں میں قتیل کو ہدفِ ملامت بنایا ہے جس سے غالب کی قتیل دشمنی ظاہر ہوتی ہے! رک ① عودِ ہندی: غالب۔ مطبع مجتبائی، میرٹھ (طبع اوّل) مطبوعہ ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ (اکتوبر ۱۸۶۸ء) ص ص ۸، ۱۱، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۹، ۲۰، ۲۲ وغیرہ ② خطوطِ غالب: مرتبہ غلام رسول مہر۔ لاہور طبع ۱۹۶۸ء ص ۱۹۳]۔ ۱۵ باغِ دودر: غالب۔ مرتبہ وزیر الحسن عابدی۔ پنجابی ادبی اکیڈمی پریس لاہور طبع ۱۹۷۰ء ص ص ۴۷ تا ۴۹ [اس کتاب کے لیے میں جناب پروفیسر ڈاکٹر آغا سہیل (لاہور) کا ممنون ہوں]۔ ۱۶ مرزا یوسف علی خاں عزیز کا سنہ وفات "تلخیص تاریخ لطیف" مشمولہ نگار۔ رام پور جولائی ۱۹۶۲ء (ص ۲۸) میں ۱۲۹۰ھ درج ملتا ہے لیکن خمخانۂ جاوید (جلد پنجم): مولفہ لالہ سری رام۔ مرتبہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی۔ ناشر امیر چند کھنہ، دہلی طبع ۱۹۴۰ء (ص ۵۰۸) میں عزیز کا سنہ وفات ۱۲۸۹ھ لکھا گیا ہے جو تصدیق کا طالب ہے۔ تلامذۂ غالب (ص ۲۳۷) میں بھی عزیز کا سنہ وفات ۱۲۸۹ھ ہی مرقوم ہے۔ ۱۷ سخن شعرا: نسّاخ۔ مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ۔ طبع اکتوبر ۱۸۷۴ء ص ۳۲۹۔ ۱۸ گلستانِ بے خزاں: باطن۔ مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ۔ طبع جون ۱۸۷۵ء ص ص ۱۶۸ تا ۱۶۹۔ ۱۹ ادبی خطوطِ غالب: مرتبہ مرزا محمد عسکری۔ ادارۂ فروغِ اُردو، لکھنؤ۔ طبع ۱۹۷۰ء ص ص ۲۶۸ تا ۲۶۹ ۲۰ رک: ① تلامذۂ غالب: مالک رام (طبع اوّل) ص ص ۲۳۷ تا ۲۳۸ ② خمخانۂ جاوید (جلد پنجم) ص ص ۵۸۶ تا ۵۸۸۔ ۲۱ ملہم تاریخ۔ طبع دسمبر ۱۹۱۲ء ص ۲۶۔ ۲۲ مثنوی شجاع مہو: مرزا حاتم علی مہر۔ مطبع حیدری، آگرہ مطبوعہ ۵ دسمبر ۱۸۶۰ء ص ۶۔ صفحاتِ تقاریظ۔ [اس کتاب کے لیے میں جناب امجد علی خاں لکھنؤ کا متشکر ہوں]۔ ۲۳ اردوئے معلّٰی (حصہ اول): غالب۔ اکمل المطابع، دہلی طبع مارچ ۱۸۶۹ء ص ۲۰۰۔ ۲۴ منشی نول کشور کے نام غالب کا یہ فارسی خط پنج آہنگ طبع اگست ۱۸۴۹ء، پنج آہنگ طبع اپریل ۱۸۵۳ء نیز کلیاتِ نثرِ غالب طبع جنوری ۱۸۶۸ء میں شامل

نہیں۔ وزیر الحسن عابدی کی تحقیق کے بموجب یہ خط پہلی بار کلیاتِ نثرِ غالب طبع جنوری ۱۸۷۱ء میں بطور اضافہ شامل ہوا تھا [پنج آہنگ مرتبہ سید وزیر الحسن عابدی لاہور طبع ۱۹۶۹ء (دیباچہ مرتب) ص ص ۱۴ تا ۱۵]۔ میری اطلاع کے مطابق یہ خط اب تک جن مصادر میں چھپ چکا ہے ان میں مندرجہ ذیل کتب شامل ہیں:

① کلیاتِ نثرِ غالب۔ مطبع منشی نول کشور، کانپور طبع ۱۸۷۱ء۔ ② کلیاتِ نثرِ غالب: مطبع منشی نول کشور، کانپور طبع اپریل ۱۸۸۸ء ص ص ۲۵۳ تا ۲۵۴۔ ③ پنج آہنگ: غالب۔ مرتبہ سید وزیر الحسن عابدی۔ مطبع عالیہ لاہور طبع ۱۹۶۹ء ص ص ۶۰۵ تا ۶۰۶۔ ④ پنج آہنگ: مترجمہ محمد عمر مہاجر۔ ادارۂ یادگارِ غالب۔ کراچی طبع مارچ ۱۹۶۹ء ص ص ۱۸۶ تا ۱۸۷ (خط کا اردو مفہوم)۔ اس کتاب کے لیے میں جناب قاضی عبدالودود کا ممنون ہوں۔

۲۵ خط کی تاریخِ تحریر ۱۸ جولائی ۱۸۶۰ء تک فارسی نثر میں غالب کی یہی تین کتابیں چھپ چکی تھیں، اور ان کی اشاعت کے زمانے یہ ہیں: ① پنج آہنگ طبع اگست ۱۸۴۹ء و طبع اپریل ۱۸۵۳ء ② مہرِ نیم روز مطبوعہ نومبر ۱۸۵۴ء ③ دستنبو مطبوعہ نومبر ۱۸۵۸ء۔ ان تینوں کتابوں پر راقم الحروف اپنے تین مضامین میں بحث کر چکا ہے۔ یہ مضامین ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔ ۲۶ اس خط کی تاریخ تحریر ۱۸ جولائی ۱۸۶۰ء [مطابق ۲۸ ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ] تک ہجری تقویم کے بموجب غالب (متولد ۸ رجب ۱۲۱۲ھ) اپنی عمر کے ۶۴ برس پورے کر کے پینسٹھویں سال میں آ چکے تھے اور ہجری کیلنڈر کے مطابق اُس وقت غالب کی صحیح عمر ۶۲ سال ۵ ماہ ۲۰ دن تھی۔ ۲۷ مکتوب الیہ نیر کی مدح میں غالب کا یہ فارسی قصیدہ کلیاتِ غالب مطبع نول کشور طبع ۱۸۶۳ء (ص ص ۳۴۳ تا ۳۴۶) میں قصیدہ نمبر ۱۹ کے ماتحت موجود ہے اور ساٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس قصیدے کا مطلع یہ ہے: ؎

چہ گوہرم کہ محیط از صفائے گوہرِ من　　بہائے افزونیابد، گزشتن از سرِ من

۲۸ نواب فخر الدین خاں خورد دہلوی نواب شرف الدین محمد خاں کے فرزند تھے۔ خورد شاعری کے علاوہ کتابت بھی کیا کرتے تھے۔ غالب، شیفتہ اور نیر کے دوستوں میں تھے۔ خورد کی کتابت عموماً اغلاط سے پاک ہوتی تھی۔ نواب فخر الدین خاں خورد دہلوی کے حالات مندرجہ ذیل مصادر میں موجود ہیں:

① گلشنِ بے خار: شیفتہ۔ مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ۔ طبع اکتوبر ۱۸۷۴ء ص ۶۵ [ملوکہ کاظم علی خاں میں] ② سخن شعراء: نساخ۔ مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ طبع اکتوبر ۱۸۷۴ء ص ۱۴۸۔ ③ گلستانِ بے خزاں: باطن۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ طبع جون ۱۸۷۵ء ص ۲۱۹ ④ بزمِ سخن: سید علی حسن خاں سلیم۔ مطبع مفیدِ عام، آگرہ طبع ۱۸۸۱ء ص ۴۴ [ملوکہ کاظم علی خاں] ⑤ خمخانۂ جاوید (جلد سوم): لالہ سری رام۔ دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی طبع ۱۹۱۷ء ص ۱۲ ⑥ مکاتیبِ غالب: مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی، ناظم پریس رامپور۔ طبع ۱۹۴۹ء (دیباچہ ص ۳۳ حاشیہ ۱) ۲۹ اردوئے معلیٰ (حصہ اول) طبع ۱۸۹۹ء ص ص ۲۸۹ تا ۲۹۰۔ ۳۰ عودِ ہندی طبع رجب ۱۲۸۵ھ ص ۹۰۔ ۳۱ سید غلام حسنین قدر بلگرامی غالب کے شاگرد تھے۔ قدر کا سنہ ولادت ۱۸۳۳ء ہے اور انھوں نے ۱۴ ستمبر ۱۸۸۴ء کو یک شنبے کے دن بلگرام میں وفات پائی۔ تلامذۂ غالب (ص ۲۱۹) میں جناب مالک رام نے قدر کی تاریخ وفات ۱۴ ستمبر ۱۸۸۴ء کو خلافِ تقویم شنبہ قرار دیا ہے۔ زیرِ نظر مضمون کے ساتھ قدر بلگرامی کی تصویر بھی شائع کرائی جا رہی ہے۔ [خیابانِ غالب: ناشر مکتبۂ مدینہ پبلشنگ کمپنی، کراچی طبع اپریل ۱۹۷۰ء ص ۱۹۹ نیز ص ۲۰۵۔ اس کتاب کے لیے جناب صباح الدین عمر کا ممنون ہوں] ۳۲ اردوئے معلیٰ (نقش ایڈیشن) حصہ دوم و سوم: مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی۔ مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور طبع اپریل ۱۹۷۰ء ص ص ۱۰۵۲ تا ۱۰۵۳۔ ۳۳ ایضاً ص ۱۰۵۳ ۳۴ مولوی ہادی علی اشک لکھنوی شیخ حسین علی بجنوری کے فرزند اور فتح الدولہ مرزا محمد رضا برق لکھنوی کے شاگرد تھے۔ وہ فارسی کے کہنہ مشق شاعر تھے۔ حج بھی کر آئے تھے۔ تاریخ گوئی میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ نول کشور پریس لکھنؤ میں مصحح تھے۔ اشک کا اردو دیوان بھی چھپ

چکا ہے ۔ لالہ سری رام اور مولانا فاضل لکھنوی نے اشک کا سنہ وفات ۱۸۸۱ء لکھا ہے جو درست نہیں ۔ اودھ اخبار، لکھنؤ مورخہ ۱۲ فروری ۱۸۶۵ء (ص ۱۴۵) سے معلوم ہوتا ہے کہ اشک نے ۱۸۶۵ء / ۱۲۸۱ھ میں وفات پائی تھی ۔ اشک کے حالات مندرجہ ذیل مصادر میں موجود ہیں :
① سخن شعرا : نساخ ۔ طبع اکتوبر ۱۸۷۴ء ص ص ۳۰ تا ۳۱ ۔ ② اردوئے معلیٰ (حصہ اول) : غالب ۔ طبع مارچ ۱۸۶۹ء ص ۴۳
③ بزم سخن : سید علی حسن خاں سلیم ۔ مطبع مفید عام، آگرہ طبع ۱۸۸۱ء ص ۱۲ ۔ ④ خم خانۂ جاوید (جلد اول) لالہ سری رام مطبع منشی نول کشور، لاہور طبع ۱۹۰۸ء ص ۳۱۳ ⑤ اردوے معلیٰ (صدی ایڈیشن) حصہ دوم و ⑥ تحقیقی نوادر : ڈاکٹر اکبر حیدری ص ۳۸۹ ۔

۳۵ خطوطِ غالب (حصہ اول) : مرتبہ مالک رام ۔ انجمن ترقی اردو (ہند)، علی گڑھ طبع ۱۹۶۲ء ص ۲۶۷ ۔ ۳۶ بہ حوالہ ایضاً ص ص ۳۲۷ تا ۳۲۸ ۔ ۳۷ یہاں بھی غالب سے سہو ہوا ہے ۔ میری تحقیق ہے کہ میر مہدی مجروح کے مرتب کردہ تذکرے طلسم راز کے سال اتمام [یعنی ۱۲۶۶ھ (۱۸۵۰ء - ۱۸۴۹ء)] کا غالب کا فارسی قطعۂ تاریخ کلیاتِ غالب طبع ۱۸۶۳ء سے باہر رہ گیا تھا ۔ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے میرا مضمون "غالب کے بعض غیر معروف ادبی آثار" مطبوعہ نیا دور، لکھنؤ جولائی ۱۹۸۰ء ص ص ۱۲ تا ۱۳ ۔ ۳۸ اردوئے معلیٰ (۱) طبع ۱۸۶۹ء ص ۳۹ ۔
۳۹ بہ حوالہ غالب اور رذکا : ضیاء الدین احمد شکیب ۔ غالب اکیڈمی، نئی دہلی طبع فروری ۱۹۷۲ء ص ۱۱۶ ۔ ۴۰ غالب : مولانا غلام رسول مہر لاہور پریس، دہلی (سنہ اشاعت ندارد) ص ۴۳۰ ۔ ۴۱ اردوے معلیٰ (۱) طبع اول ص ۱۱۰ ۔ ۴۲ غالب کی نادر تحریریں : مرتبہ خلیق انجم ۔ مکتبہ شاہراہ، دہلی طبع فروری ۱۹۶۱ء ص ۴۸ ۴۳ ایضاً ص ۱۵۵ ۔ ۴۴ قاطعِ برہان : غالب ۔ مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ طبع رمضان ۱۲۷۸ھ [مارچ ۱۸۶۲ء] ص ۹۷ ۔ بہ شکریہ جناب قاضی عبدالودود صاحب ۔ ۴۵ کلیاتِ نثرِ غالب طبع ۱۸۸۸ء ص ۲۵۲ ۔
۴۶ پنج آہنگ : مترجمہ محمد عمر مہاجر ص ص ۱۸۸ تا ۱۸۹ ۔ ۴۷ اردوے معلیٰ (صدی ایڈیشن) حصہ دوم و سوم : مرتبہ مولانا فاضل لکھنوی ص ص ۱۱۰۶ تا ۱۱۰۷ ۔ ۴۸ بہ حوالہ تعبیرِ غالب : ڈاکٹر نیر مسعود ۔ کتاب نگر، لکھنؤ طبع ۱۹۷۳ء ص ۵۹ ۔ ۴۹ یادگارِ غالب : مولانا حالی ۔ شانتی پریس، الہ آباد طبع ۱۹۵۸ء ص ۳۹ ۔ ۵۰ قاطعِ برہان : غالب ۔ مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ طبع ۱۲۷۸ھ ص ۹۳ ۔
۵۱ اردوے معلیٰ (صدی ایڈیشن) حصہ اول جلد دوم : مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل ۔ مجلس ترقی ادب، لاہور طبع ۱۹۶۹ء ص ۴۹۷ (حاشیہ)
۵۲ بہ حوالہ اردوے معلیٰ (۱) طبع ۱۸۶۹ء ص ۱۶۴ ۔ یہاں غالب نے قاطعِ برہان کی پچاس جلدوں کی قیمت پچاس روپے بتائی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کی قیمت ایک روپیہ فی جلد تھی ۔ ۵۳ قاطعِ برہان طبع اول (ص ۹۵) میں قاطعِ برہان کی تاریخ سے متعلق شیخ امیر اللہ تسلیم کی فارسی مثنوی پر یہ عنوان درج ملتا ہے ۔" ... مثنوی تاریخ طبع از شیخ امیر اللہ کاتب الحروف قاطع برہان ... " اس سے بہ خوبی ثابت ہوتا ہے کہ قاطعِ برہان طبع اول کے کاتب شیخ امیر اللہ تسلیم تھے ۔ عنوان ایک سطر میں ہے جس کا ابتدائی اور آخری حصہ میرے مملوکہ نسخے میں کٹا ہوا ہے ۔ ۵۴ امیر اللہ تسلیم حیات و شاعری : ڈاکٹر محمد فضل امام ۔ اسرار کریمی پریس، الہ آباد طبع ۱۹۷۲ء ص ۲۰ نیز ص ۲۶ ۔ ۵۵ آثارِ غالب : مرتبہ قاضی عبدالودود ص ۴۹ [مشمولہ علی گڑھ میگزین ۔ غالب نمبر بابت ۴۹ - ۱۹۴۸ء ۔ اس جریدے کے لیے میں جناب اطہر مسعود رضوی کا متشکر ہوں] ۔ ۵۶ غالب کا یہ فارسی قطعہ مندرجہ ذیل مصادر میں موجود ہے :
① باغِ دودر : غالب ۔ مرتبہ وزیر الحسن عابدی ص ص ۱۹ تا ۲۲ ۔ ② ہنگامۂ دل آشوب، مرتبہ سید قدرت نقوی ص ص ۴۴ تا ۴۷ ۔
۵۷ کلیاتِ غالب ۔ مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ طبع ۱۸۶۳ء / ۱۲۷۹ھ ص ۵۶۰ نیز ص ۵۶۲ ۔ ۵۸ بہ حوالہ اردوے معلیٰ (۱) طبع اول ص ۴۳۶ ۔ ۵۹ رک : ① دعای صباح : غالب ۔ مرتبہ کالیداس گپتا رضا ۔ دل پبلی کیشنز، بمبئی طبع دسمبر ۱۹۷۰ء ص ص ۶، ۷، ۱۹،

۲۳ نمبر ۴۸ [اس کتاب کے لیے میں جناب کالیداس گپتا رضا کا ممنون ہوں] (۲) متعلقات غالب: کالیداس گپتا رضا ص ص ۴۰ تا ۸۱ ۔
۳۴ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو غالب ببلوگرافی: مرتبہ محمد انصار اللہ۔ علی گڑھ طبع ۱۹۷۲ء ۔ ۳۵ کلیاتِ غالب: مطبع منشی نول کشور لکھنؤ طبع جنوری ۱۸۷۲ء [مملوکہ راقم الحروف] کے متعلق ضروری امور سطورِ ذیل میں درج ہیں:

(۱) ناپ: ۲۳ × ۱۵½ سنٹی میٹر (۲) کتابت کی ناپ: ۳۰½ × ۱۲ سنٹی میٹر (۳) سطر: ۲۱ سطری (۴) ضخامت: ۵۵۶ صفحات (۵) کتاب کا متن جدولوں سے مزین ہے (۶) کلیاتِ غالب کے اس ایڈیشن میں اصناف کی ترتیب ۱۸۶۳ء کے ایڈیشن جیسی ہے اور قطعات، مخمس، ترکیب بند، ترجیع بند مثنویات و قصائد وغیرہ کی تعداد بھی ۱۸۶۳ء کے ایڈیشن کے مساوی ہے لیکن کتاب کے آخر سے مجروح، نسیم، تسلیم، اشرف، نیرنگ وغیرہ کی وہ تمام تاریخیں نکال دی گئی ہیں جو ۱۸۶۳ء کے ایڈیشن میں شامل تھیں۔ ص ص ۵۵۵ تا ۵۵۶ میں فارسی نثر میں منشی محمد حسین موہانی کا خاتمۃ الطبع اس ایڈیشن میں بڑھا دیا گیا ہے (۷) کلیات غالب طبع جنوری ۱۸۷۲ء کا جو نسخہ میرے پاس موجود ہے اس کی یہ خصوصیت بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہ مشہور شاعر مہدی حسین ناصری کی ملکیت میں رہا ہے اور اس کے سرورق نیز متعدد صفحات پر ناصری مرحوم کے قلم کی تحریریں بھی موجود ہیں (۸) یہ ایڈیشن غالب کی تصویر اور زائچے سے محروم ہے۔

(۱)

(۲)



(۱) عکس مکتوب غالب جس میں غالب کے قلم سے منشی نول کشور کا نام درج ہوا ہے۔

(۲) شاگردِ غالب قدر بلگرامی جو غالب کی سفارش پر نول کشور پریس میں ملازم ہوئے تھے۔

[بہ شکریہ جناب انیس اشفاق]

سید علی احمد دانش

منشی نولکشور

اور

(رثائی ادب کی روشنی میں)

اردو میں رثائی ادب کی ابتدا تقریباً تین سو برس پہلے دکن میں ہوئی تھی اور اس تحریک نے ایک مختصر سے عرصے ہی میں ہندستان کی چھوٹی اور بڑی سبھی ریاستوں میں اپنے لیے ایک نمایاں جگہ بنائی تھی۔ فضلی کی کربل کتھا، محمد قلی، وجہی، ہاشم اور مرزا کے رثائی فن پاروں نے رسولِ اسلامؐ کے نواسے کی شہادت کے واقعات کو دردمند دلوں کی دھڑکن بنا دیا تھا۔

رثائی ادب سے خواص اور عوام الناس کی والہانہ دلچسپی اس کی ترقیوں کی ضامن بنی ہوئی تھی، ہندستانی ریاستوں اور بالخصوص اودھ کے خطۂ پاک میں رثائی ادب کے معماروں کی قدر و منزلت، عقیدت و احترام نے مرثیہ گو اور مرثیہ خوان شاعروں کے حوصلے کو دوچند کر دیا تھا۔ برہان الملک سعادت علی خان سے جانِ عالم واجد علی شاہ اختر تک وزیر و امیر اور شاہ و گدا سب کے لیے یہ صنفِ سخن "محبوب" تھی اور نجات اخروی کا سبب سمجھی جاتی تھی۔ عقیدت کی نرم و لطیف چاندنی میں عود و اگر سے مہکی ہوئی مجلسی فضاؤں نے بلاتفریق مذہب ہر خاص و عام کے دل کو مسحور کر رکھا تھا۔ حیدری، سکندر، گدا، احسان، افسردہ، فصیح، دلگیر، ضمیر اور خلیق کی شب و روز کی ریاضتوں اور کاوشِ سخن نے اردو کے رثائی ادب کو نہ صرف مالامال کر دیا تھا بلکہ مستقبل کی ترقیوں کے دریچے بھی باز کر دیے تھے۔ مرثیہ گو شعرا کے دوش بدوش ایک طبقہ علما، واعظین کا بھی سرگرمِ عمل تھا، روضہ خوانوں کے گروہ میں بھی قابلِ لحاظ اضافہ ہو چکا تھا۔ "ذکرِ شہادت" کی فکر نے اردو نثر میں مصائب کے دفتر کے لیے بھی راستہ ہموار کر دیا تھا۔ ذاکرین اپنے مسودات کی ترتیب، مضامین کی تراش خراش اور لفظوں کے دروبست کی طرف اور زیادہ متوجہ ہو چکے تھے۔ ذاکرین کے گروہ میں صوتی امتیاز قائم کرنے کے لیے ان کے اسلوبِ تقریر کو ذریعہ بنایا گیا تھا۔ اب روضہ خوانوں کی قائم مقامی قاری، نثار اور خطیب بھی کر رہے تھے۔ غرض اودھ میں نظم کے شانہ بشانہ چل کر نثر نے بھی رثائی ادب کی ترقی میں اپنا حق ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ منظوم رثائی ادب میں ضمیر و خلیق کی وراثت جس وقت مرزا دبیر اور میر انیس کے ہاتھوں میں پہنچی تو اس وقت ہندستان کے سیاسی حالات دگرگوں تھے۔ ۱۸۵۷ء کی انقلابی جد و جہد کے بعد ہر طرف پراگندہ ذہنی اور انتشار کا دور دورہ تھا۔ فرنگیوں کے جبر و استبداد کے سائے میں ہندستان کا معاشرہ کراہ رہا تھا، لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم تھا۔ فرنگی حاکم اور ان کے فرستادہ دونوں ہاتھوں سے مال و دولت سمیٹ رہے تھے۔ غریبوں کا کیا ذکر رئیسوں کی ڈیوڑھیوں کا سلامت رہنا دشوار ہو گیا تھا۔ کش مکش کے اس ماحول میں ظالموں کے خلاف سماج میں نفرت کے احساس کو قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ ایک ایسے مظلوم کی سیرت کا آئینہ پیش کیا جاتا رہے جس نے انسانیت

کے قیام اور حق کے حصول کے لیے کسی بڑی سے بڑی قربانی سے بھی گریز نہ کیا ہو، تاریخ کے اس اہم موڑ پر بھی رثائی ادب نے ناقابل فراموش خدمت انجام دی، کربلا کے واقعات کی اشاعت نے نہ صرف ضمیرِ حریت کو بیدار رکھا بلکہ دلوں کو وہ توانائی اور حوصلہ بھی بخشا جس سے کام لے کر انسان بڑے سے بڑے ایثار اور قربانی کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔ عام انسانی بیداری کا یہی وہ نقطۂ عروج ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ جوش ملیح آبادی نے کہا ہے ؎

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسین

یہ دور وہی تھا جسے ادبی تاریخ میں انیس و دبیر سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اسی دور میں رثائی ادب نے اپنے عروج کی اہم منزلیں طے کیں۔

منشی نول کشور بھی متذکرہ دور کے ایک نمایندہ انسان تھے۔ جو بیک وقت کئی اوصاف کے مالک تھے۔ وہ عربی و فارسی کے عالم بھی تھے اور اردو زبان و ادب کے مزاج شناس بھی۔ وہ اودھ اخبار کے ایڈیٹر بھی تھے اور ایک عظیم مطبع کے پروپرائٹر بھی۔ عوام و خواص میں انھیں یکساں مقبولیت حاصل تھی۔ اپنے عہد کے نباض ہونے کی وجہ سے ان کی نگاہیں بھی رثائی ادب کی روز افزوں ترقی کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اسی لیے اودھ اخبار کے کالموں میں بھی مرثیہ خوانی کی چند اہم مجلسوں کا ذکر ملتا ہے۔

منشی نول کشور میر انیس کے خاص مداحوں میں تھے اور ان کے کلام کے حد درجہ شائق تھے اور اکثر انیس کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ وہ یہ خواہش بھی رکھتے تھے کہ کلام انیس کی جلدیں مرتب کر کے انیس کی حیات میں شائع کر دیں۔ اپنی اس خواہش کا اظہار انھوں نے بہ نفسِ نفیس خود میر صاحب سے کیا تھا، لیکن میر صاحب نے اپنی حیات میں اپنے کلام کی اشاعت کی اجازت نہیں دی، منشی نول کشور مجبوراً خاموش ہو گئے۔ لیکن والد مرحوم میر محمد ہادی لائق کا بیان ہے کہ "منشی نول کشور نے اپنے اودھ اخبار میں سب سے پہلے میر انیس کا ایک مکمل مرثیہ اپنے تعارف نامے اور شکریے کے ساتھ شائع کیا تھا جس کے بعد کلام انیس کی اشاعت کا باقاعدہ آغاز ہوا۔"

منشی نول کشور کو مرثیہ کہاں سے دستیاب ہوا؟ اور اس کا مطلع کیا تھا؟ اور اودھ اخبار کی کس اشاعت میں شائع کیا گیا؟ یہ سب باتیں ابھی پس پردہ ہیں۔

منشی نول کشور نے میر انیس کے انتقال کے بعد نومبر ۱۸۷۶ء میں مولوی سید تصدق حسین رضوی کنتوری کو کلام انیس کی فراہمی، ترتیب اور تصحیح کے کام پر مامور کیا۔ تصدق حسین اس کام اہم کی ذمہ داری سے بخوبی واقف تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ براہ راست انیس کے اخلاف سے مراثی کے ذخائر فراہم ہونا آسان امر نہیں اور لکھنؤ میں پھیلے ہوئے نسخوں کو یکجا کرنا بھی کوئی معمولی کام نہ تھا۔ اولاً انھوں نے مطبع کی جانب سے اودھ اخبار میں اپیل شائع کی اور پھر انیس کے مداحوں سے فرداً فرداً ملاقاتیں بھی کیں، غرض جو مرثیہ جہاں سے اور جس صورت سے ہاتھ لگا اسے حاصل کیا، آخر کلام انیس کا ایک بڑا حصہ ان کی نظر کے سامنے آگیا جس میں رباعیاں، سلام اور مرثیے بھی شامل تھے جن کی ترتیب و تصحیح بھی بجائے خود ایک مرحلہ تھی، تصدق حسین نے یہ کام بھی حتی الامکان بڑی جانفشانی، محنت اور تحقیق کے ساتھ انجام دیا۔ کلام انیس کی اشاعت کی داستان بیان کرتے ہوئے حامد علی خاں حامد نے مرثیہ پر بھی روشنی ڈالی ہے:

"فی زمانہ طریقہ مرثیہ گوئی کا شاعرانِ ذی کمال نے نکالا ہے اگر بہ نظر انصاف دیکھو تو یہ طرز سب سے نرالا ہے۔ اگرچہ وادیٔ ناپیدا کنار اور دشت پُرخار اس فن خاص میں ہر ایک نے قدم ہمت و جرأت کو آگے بڑھایا مگر شل گردشِ پرکار جہاں سے چلے تھے وہیں پھر آپ کو پایا۔"

لیکن میر انیس کی روش دوسرے مرثیہ گو شاعروں سے جدا اور ممتاز تھی۔ وہ جن راستوں سے ہو کر گزرے تھے ان کا

پہلے سے پامال ہوتا تو کجا ان راستوں پر تو دور دور تک کوئی نقش قدم بھی نظر نہ آتا تھا چنانچہ حامد صاحب بھی اس حقیقت کے معترف ہیں:

"فارس مضمار فصاحت، یکہ تاز جولانگاہ بلاغت، اکمل الکاملین، زبدۃ الشاعرین، سلطان الذاکرین، افسر الناظمین، دانائے رموز خفی و جلی جناب میر ببر علی صاحب اسکنہ اللہ بحبوحتہ الفرادیس نے اس مادۂ حشت خیز اور بیدائے ہلاکت انگیز کو بکمال آسانی طے کیا۔"

میر انیس کے کلام کی مقبولیت کا کچھ اندازہ ذیل کی سطور سے بھی کیا جا سکتا ہے:

"اس فردوسی ہند کا کلام بلاغت نظام عجب پر تاثیر ہے کہ سامعین کے دلوں پر ایک کیفیت وجد پیدا کرتا ہے اسی سبب سے ہر صغیر و کبیر ان کے سخن کا دم بھرتا ہے۔ ہر شخص اس امر کا متمنی تھا کہ کسی طرح اس ممدوح کا کلام یکجا فراہم ہو"

آخر منشی نول کشور صاحب نے اس کار اہم کا بیڑہ اٹھایا:

"ہزاروں ہزار کوشش اور صرف زر کثیر سے ایسے مرثیوں کا ذخیرہ جمع کیا کہ کسی کے وہم و خیال میں بھی نہ تھا اور فی الواقع اگر کلام بلاغت انضمام اس ممدوح کا زیر طبع نہ آتا تو باقیات الصالحات ایسے باکمال کا نہ ہو ...."

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر منشی نول کشور انیس کے انتقال کے فوراً بعد کلام انیس فراہم کر کے شائع نہ کرا دیتے اور تصحیح و ترتیب میں کد و کاوش سے کام نہ لیتے تو یقیناً کلام انیس کا موجودہ ذخیرہ نظر کے سامنے نہ آتا اور اگر آتا بھی تو ان مرثیوں میں الحاقی عناصر کی کارفرمائیاں بہ کثرت ہوتیں۔ جن کا اصل کلام سے جدا کرنا آسان کام نہ ہوتا۔

منشی نول کشور کے احکام کے مطابق مولوی سید تصدق حسین رضوی نے میر انیس کے کلام کو بالترتیب چار حصوں میں تقسیم کیا۔ جلد اول میں دو ہزار چھ سو تیرہ بند پر مشتمل انتیس[۲۹] مرثیے شامل



نول کشور پریس سے شائع شدہ جلد انیس کا عکس

کیے۔ جلد دوم میں تین ہزار چار سو بیاسی بند پر مشتمل ستائیس[۲۷] مرثیے شامل کیے۔ جلد سوم میں ایک ہزار نو سو پچاس بند پر مشتمل انیس[۱۹] مرثیے شامل کیے۔ جلد چہارم میں ایک ہزار چھ سو چار بند پر مشتمل تینتیس[۳۳] مرثیے شامل کیے اور ہر جلد میں سلام اور رباعیات کو بھی جگہ دی۔ اس طرح مجموعی طور پر میر انیس کے ایک سو آٹھ مرثیے مطبع نول کشور کے ذریعے منظر عام پر آ گئے۔

مراثی انیس کی جلدوں کی اشاعت سے قبل منشی نول کشور نے میر انیس کے معاصر مرزا دبیر کے مراثی کی دو جلدیں دسمبر ۱۸۷۵ء اور اپریل ۱۸۷۶ء میں شائع کی تھیں۔ ۱۲۹۲ھ میں برادر انیس میر نواب مونس کے انتقال کے بعد ان کے مراثی کی ایک جلد (جو مونس کے مداح نواب میر محمد حسین خان نے فراہم کیے تھے) مرتب

منشی نولکشور

مصطفیٰ فطرت

مشہورِ روزگار ہیں منشی نول کشور
اردو کی یادگار ہیں منشی نول کشور

تحقیقِ فکر و فن کا ذخیرہ گواہ ہے
اک عہدِ پُر بہار ہیں منشی نول کشور

سرمایۂ ادب کی اشاعت کے واسطے
تابندہ یادگار ہیں منشی نول کشور

اردو ادب کا ایک بھی چھوڑا نہ زاویہ
کتنے خلوص کار ہیں منشی نول کشور

کیونکر بھلا سکے گی بھلا اپنی زیست میں
اردو کے غمگسار ہیں منشی نول کشور

بدلی روش نہ اپنی زمانے کے ساتھ ساتھ
کچھ اتنے وضعدار ہیں منشی نول کشور

مل جائے کوئی جاننے والا تو پوچھ لو
مفہومِ انکسار ہیں منشی نول کشور

تاریخ، فلسفہ اور ادب کی بساط پہ
اک نقشِ پائدار ہیں منشی نول کشور

یارانِ تیز گام بھی آگے نہ بڑھ سکے
اک ایسے شہسوار ہیں منشی نول کشور

جو بھی ادب نواز ہیں کرتے ہیں احترام
کچھ اتنے باوقار ہیں منشی نول کشور

منصف مزاج اہلِ نظر کی نگاہ میں
فطرتؔ کا اعتبار ہیں منشی نول کشور

یونس رحمانی

وہ خادمِ ادب، وہ صحافت کا شاہکار
جو تھا ہمیشہ خدمتِ اردو میں بے قرار
ثابت قدم رہا، گو بہت رہ میں آئے خار
کیا جنوں پسند تھا، کیا جنوں شعار

بے مثل چھاپہ خانہ تو اخبار لاجواب
کاغذ کا کارخانہ، ترقی کا ایک باب
اک شخص کی لگن تھی کہ دنیا ہو فیض یاب
وہ اپنی کاوشوں میں رہا ہو کے کامیاب

تھا جلوہ گر جو مسندِ انصاف پر کبھی
سی۔ آئی۔ ای کا پایا تھا جس نے خطاب بھی
اور بلدیہ کا رکن بنایا گیا وہی
لیکن جو منکسر تھی طبیعت وہی رہی

سرگرمِ کار ایسا کہ جھپکے نہیں پلک
تھی "آگرہ سفیر" میں جس کی کبھی جھلک
جس سے شعور و علم کا روشن ہوا فلک
ہے مستفیض راہروِ شوق اب تلک

تجار کی صفوں میں تھا وہ فردِ فرد سے
دامن تھا جس کا پاک تعصب کی گرد سے
لڑتا رہا زمانے کے وہ گرم و سرد سے
بے چین عمر بھر رہا انساں کے درد سے

دہلی، الہ آباد اور اجمیر، آگرہ
لاہور، کانپور میں، لندن میں سلسلہ
"مطبع نول کشور" کا یہ عزم و حوصلہ
تاریخ اس کے حق ہی میں کرتی ہے فیصلہ

سابق گورنر اتر پردیش ڈاکٹر بی گوپالا ریڈی جنوری ۱۹۷۰ء میں لکھنؤ کارپوریشن ہال میں منعقد تقریب میں منشی نولکشور کی تصویر کی نقاب کشائی کی رسم ادا کرنے کے بعد جلسے کو خطاب ہوئے ــــ تصویر میں تھائی لینڈ کی شہزادی پی۔ بی۔ ڈسکل DISKUL بھی دیکھی جا سکتی ہیں

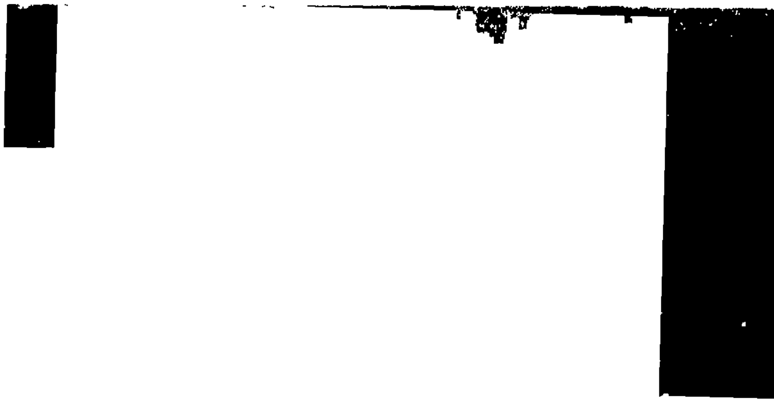
راج کمار رنجیت بھارگو لکھنؤ میں اکتوبر ۱۹۶۹ء میں خان عبدالغفار خاں کو مطبع نولکشور کے شائع ردہ قرآن مجید کے اٹھارویں اڈیشن کی ایک جلد دیتے ہوئے۔ اس موقع پر رانی لیلا بھارگوا اور کنور تو بھارگوا بھی موجود تھے



راجہ رام کمار بھارگوا اور رانی رام کمار بھارگوا
۱۹۵۳ء میں پنڈت جواہر لال نہرو، پنڈت
گووند ولبھ پنت اور شری کے۔ ایم منشی کے ساتھ



پدم شری رانی لیلا بھارگوا ۱۹۶۰ء میں صدر جمہوریہ
ڈاکٹر رادھا کرشنن اور وزیر اعظم پنڈت جواہر لال
نہرو کا لکھنؤ میں خیر مقدم کرتے ہوئے۔



ڈاکٹر راجکمار رنجیت بھارگوا
۲ مئی ۱۹۸۰ء کو کلکتہ میں مغربی
جرمنی کے صدر کے نمائندے
سے جرمن آرڈر آف میرٹ
حاصل کرتے ہوئے۔ ڈاکٹر
رنجیت بھارگوا کو یہ اعزاز
ہند جرمن روابط کو اور مستحکم



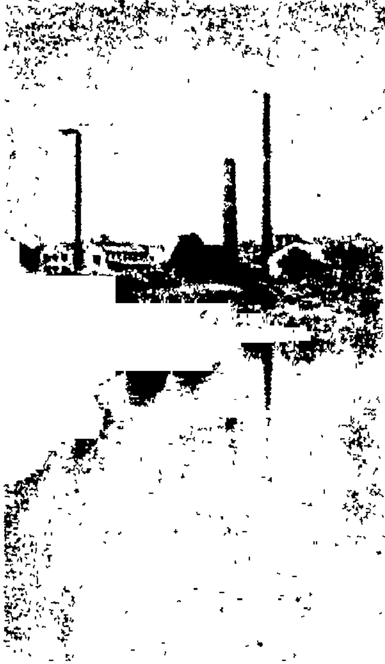
اودھ اخبار کا دفتر۔ جو حضرت گنج لکھنؤ میں تھا

مطبع نولکشور کا ایک قدیمی لیتھو گراف



مطبع نولکشور کا ایک اندرونی منظر۔ یہ تصویر ۱۸۹۰ء کی ہے

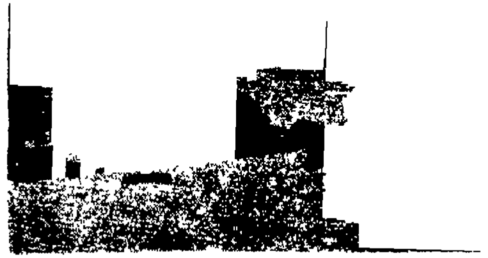




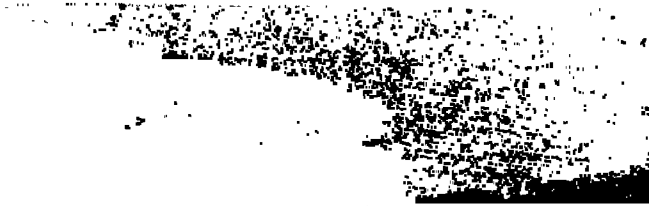
منشی نولکشور کی لکھنؤ میں قائم کردہ پیپر مل
یہ ہندستان کی قدیم ترین پیپر مل ہے

مطبع نولکشور کی ۱۹۳۸ء میں قائم کی گئی اجمیر شاخ



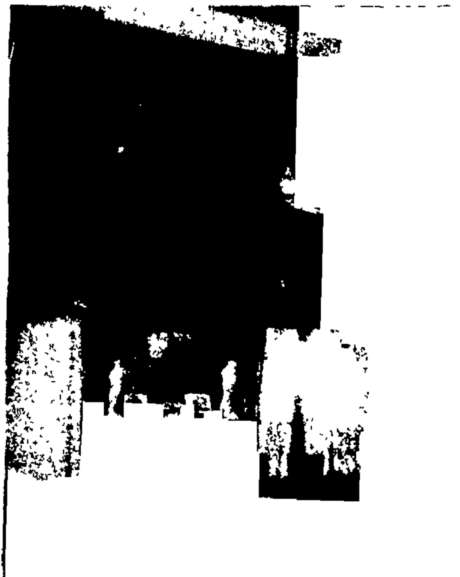


نولکشور بکڈپو لکھنؤ کا ایک قدیم منظر



لکھنؤ کا فیشن ایبل اور خوبصورت بازار حضرت گنج ۱۹۰۰ء میں

نولکشور ہاؤس لکھنؤ کا مشہور ٹائیگر روم



منشی نول کشور ہاؤس حضرت گنج لکھنؤ



امین سلونوی

منشی نولکشور کی خدمات

جب کوئی مورخ یا تذکرہ نویس اردو صحافت اور اردو کی خدمت پر قلم اٹھائے گا اور ایسے دانشوروں کی فہرست تیار کرے گا، جنھوں نے اردو زبان کو علم کا درجہ دیا تو سرِ فہرست اگر کوئی نام لکھا جائے گا تو وہ منشی نولکشور کا نام ہوگا۔ انھوں نے غدر کے ہیبتناک دور کے بعد لکھنؤ کو اردو ادب کا ایک مرکز بنا دیا اور ایک اخبار "اودھ اخبار" کے نام سے جاری کیا۔ جو ابتدا میں ہفتہ وار تھا لیکن ایسا ہفتہ وار کہ اس کے خریداروں اور پڑھنے والوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی تھی۔ یہ اخبار صرف لکھنؤ تک محدود نہ تھا۔ بلکہ ہندوستان کی تمام دیسی ریاستوں میں بڑی تعداد میں جاتا تھا۔ اس کے نامہ نگار اہل قلم اور دانشور ہوتے تھے اور تمام ریاستوں کے حالات و کوائف، مختلف رجحانات، رسم و رواج وغیرہ کی معلومات اودھ اخبار ہی کے ذریعہ حاصل ہوتی تھیں۔ حکومت اور نظم و نسق وغیرہ کے بارے میں یہ اخبار جو کچھ لکھتا تھا اس کو ایوان حکومت میں بڑے غور سے پڑھا جاتا اور اس کے مشوروں پر عمل بھی کیا جاتا تھا۔ حکومت بھی اپنی کارکردگیوں اور نظم و نسق کے سلسلے میں برابر اخبار کو مطلع کرتی رہتی تھی۔ اخبار کے دفتر میں اخبار سے وابستہ اہم شخصیتوں کا ایک ایسا گروپ رہتا تھا جو مختلف امور و علوم پر عبور رکھتا تھا۔ آج ان دانشوروں کو لوگ کتابوں میں پڑھتے ہیں تو حیرت میں رہ جاتے ہیں۔

رتن ناتھ سرشار نے فسانہ آزاد اودھ اخبار سے ہی شروع کیا تھا۔ آگے چل کر سرشار کے اس فسانہ نے زبردست شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ طلسم ہوشربا، نورافشاں اور امیر حمزہ کی داستانیں اسی اخبار کے ذریعہ عوام تک پہنچیں۔ ان تمام شخصیتوں کا طریقۂ کار اور اس زمانے کے حالات وغیرہ پر لکھنے کے لیے کافی وقت چاہیے اور میں اب زندگی کے ایک ایسے دور میں ہوں کہ میرے لیے یادداشتوں کو ذہنی طور پر جمع کرنا بھی مشکل ہے۔ قلم بھی چلتا نہیں۔ نگاہیں بھی اپنا کام نہیں کرتیں، لیکن چونکہ میں نے بھی روزنامہ اودھ اخبار میں ۱۰ سال تک کام کیا ہے اور مرحوم شوکت تھانوی، سید نورالحسن، مولانا عبدالباری آسی اور یگانہ چنگیزی نیز معلوم نہیں کیسے کیسے اہل قلم اودھ اخبار سے وابستہ رہے ہیں۔ چنانچہ مختصراً کچھ لکھنا بھی چاہتا ہوں۔

منشی نولکشور اپنے ادارے میں کام کرنے والوں سے بڑا شاہانہ سلوک کرتے تھے۔ مثلاً سنا ہے کہ رتن ناتھ سرشار کے لیے یہ انتظام تھا کہ وہ چاندنی راتوں میں دریائے گومتی کے کنارے بیٹھ کر اپنی تخلیقات سپرد قلم کریں۔ وہاں جس چیز کی خواہش انھیں ہوتی وہ مہیا کی جاتی۔

کوئی ناول یا کوئی افسانہ اور اس کے ساتھ ساتھ ملکی و قومی افکار اس اخبار میں پیش کیے جاتے تھے۔ اخبار کی پالیسی فرقہ واریت مخالف تھی۔

اخبار سے وابستہ کوئی دانشور یا کوئی اور کارکن اگر کبھی بیمار پڑ جاتا یا کسی تکلیف میں مبتلا ہوتا تو منشی جی اس کی عیادت کے لیے اس کے گھر جاتے اور اس کے علاج معالجہ کا خصوصی بندوبست کراتے اور اس کی ضروریات کو پورا کرتے۔ منشی نولکشور نے اخبار کے ساتھ ساتھ اپنے پریس کو بھی اتنی وسعت دی کہ وہ عالمگیر شہرت کا حامل ہوگیا۔ پریس میں منشی جی نے سب سے پہلے قرآن مجید کی طباعت کا خصوصی اہتمام کیا اور ایسا اہتمام کہ شاید ہی دنیا میں کسی پریس نے ایسا اہتمام کیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ منشی

نولکشور نے نہ صرف اردو پر بلکہ مسلمانوں پر بھی احسان کیا ہے۔ انھوں نے قرآن کریم کے متعدد تراجم اور متعدد تفسیریں شائع کیں اور اس کثرت سے شائع کیں کہ آج ملک کے ہر کتب خانہ میں نولکشور پریس کی چھپی ہوئی تفسیریں اور کتابیں جتنی بڑی تعداد میں ملتی ہیں، اتنی تعداد میں کسی اور پریس کی چھپی ہوئی نہیں ملتیں۔ بعض تفاسیر اور تراجم ایک ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہیں جو نولکشور پریس نے شائع کیے۔ قرآن کریم کے نسخے ہزاروں کی تعداد میں مختلف مسلم ممالک کو ان کے آرڈر پر تیار کر کے بھیجے۔

منشی نولکشور پر اگر کوئی مورخ تحقیق کر کے کچھ لکھے تو ان کی خدمات کی پوری تصویر سامنے آ سکتی ہے۔ میں نے ایک اخبار نویس کی حیثیت سے اودھ اخبار سے اپنی وابستگی کے دوران بہت کچھ دیکھا اور سنا ہے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ دہلی میں امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد[1] نے مجھ سے کہا کہ فلاں فلاں دینی کتابیں بڑی اہم ہیں۔ چنانچہ انھیں کیوں نہ چھاپا جائے اور اگر ان پر نظر ثانی کی ضرورت ہو تو منشی جی کے پریس کی ان مطبوعہ کتابوں کے نسخے میرے پاس لاؤ۔ میں ان پر نظر ثانی کرنے کی خدمت انجام دوں گا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ان کو ایڈٹ کر دوں۔ ایسی خدمت کرنے میں مجھے خوشی ہوگی۔ لیکن افسوس کہ اس کا موقعہ ہی نہ ملا۔ وہ کتابیں ان تک نہ پہنچیں اور مولانا کا انتقال ہوگیا۔ بہرحال اودھ اخبار بھی ۱۹۵۰ء کے بعد بند ہوگیا۔ میں نے بحیثیت اسسٹنٹ ایڈیٹر جدوجہد آزادی کے سلسلے میں اودھ اخبار میں بہت کچھ لکھا ہے۔ کیونکہ مجھے اس کی پوری آزادی تھی اور اودھ اخبار کی یہ خصوصی پالیسی بھی تھی کہ ملک و قوم کے لیے جو کچھ مفید ہو، وہ لکھا جائے۔ فرقہ واریت کے خلاف اور اتحاد و یکجہتی کے لیے خاص طور سے مقالات شائع کیے گئے۔ اگرچہ ایسے مقالات پر مقامی حکام ہمیشہ باز پرس کرتے تھے۔ لیکن میں نے اس پالیسی کو کبھی چھوڑا نہیں۔

منشی نولکشور نے اودھ اخبار اور اپنے مطبع کے ذریعہ ایسی خدمت انجام دی کہ وہ شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گئے۔ بعض ممالک کے عالم و دانشور مدتوں یہ سمجھتے رہے کہ ہندستان میں نول کشور نام کا کوئی مرکزی شہر ہے وہ اسے دیکھنے کی آرزو میں ہندستان آئے اور انھیں جب یہ پتہ چلا کہ نولکشور لکھنؤ میں اودھ اخبار اور ایک عظیم پرنٹنگ پریس کے مالک ہیں تو انھیں بڑی حیرت ہوئی۔

منشی جی نے عربی، فارسی اور سنسکرت کی ایسی کتابوں کے ترجمے بھی اردو میں کرائے جو ایک ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہیں، جنھیں کسی اور پریس نے کبھی چھاپنے کی ہمت نہیں کی۔ جبکہ نولکشور پریس سے یہ کتابیں کئی کئی بار چھاپی گئیں اور یہ کتابیں ایسی ہیں جن سے مورخین تذکرہ نویسوں اور ریسرچ اسکالروں سب کو بڑی مدد ملتی ہے۔ ان کتابوں کی تعداد تو بتانا مشکل ہے، لیکن مطبع کی کتابوں کی فہرست ایک بہت ضخیم اور موٹی جلد پر مشتمل دیکھی جاتی ہے۔ جس سے لوگ اپنی ضرورت کی تالیف و تصنیف کا انتخاب کرتے ہیں۔ ان میں مذہبی اور تاریخی کتابیں تفاسیر، احادیث، مختلف علوم و فنون کے ماہرین کے کارنامے اور سوانح وغیرہ بھی شامل ہیں۔



[1] مولانا آزاد اکثر مجھے دہلی بلایا کرتے تھے اور لکھنؤ کے تمباکو، حقہ اور کتب وغیرہ کی فرمائش کرتے تھے ——————— (ا-ص)

ڈاکٹر آصفہ زمانی

منشی نولکشور اور ان کا نظم و نسق

طنز و تشنیع کے انداز میں کہی ہوئی بات اکثر دل کو جا لگتی ہے اور پھر آدمی لاشعوری طور پر نتیجتاً وہ کر دکھاتا ہے جو نمایاں ... دے ڈالتا ہے کہ عقل محو حیرت رہ جاتی ہے۔ گوسوامی تلسی داس کا عظیم اور لافانی شاہکار 'رام چرت مانس' ان کی بیوی رتناولی کے طنز کا ہی نتیجہ ہے۔ مطبع نولکشور کی بنیاد بھی منشی جی کے والد جمنا پرشاد کی اس طنزیہ ڈانٹ کا ثمرہ ہے۔ جو ایک روز انھوں نے بیٹے سے کہہ بیٹھے کہ تم آرام طلب ہوتے جا رہے ہو اور کوئی کام نہیں کر سکتے۔ یہ بات منشی نولکشور کے دل کو ایسی لگی کہ انھوں نے کچھ کر دکھانے کا عزم کر لیا۔ اور اس پریس کی بنیاد ڈالی جس نے انھیں زندہ جاوید کر دیا۔

آگرہ کالج میں دوران تعلیم منشی جی کی مضمون نگاری کی شہرت اخبار "سفیر" تک ہو چکی تھی۔ "سفیر" کے مہتمم بھی رہ چکے تھے۔ صحافت نگاری کی طرف ابتدا ہی سے رجحان تھا۔ اس زمانے میں اخبار "کوہ نور" لاہور بام عروج پر تھا۔ مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید کے مصداق منشی ہرسکھ رائے بھٹناگر مالک "کوہ نور" نے منشی نولکشور کی صلاحیتوں کی خوشبو پائی اور انھیں لاہور کھینچ بلایا۔ اپنے چار سال کے دوران قیام انھوں نے جس محنت، جانفشانی اور خوش اسلوبی سے "مطبع کوہ نور" کا کام سنبھالا اس سے نہ صرف منشی ہرسکھ رائے ہی متاثر ہوئے بلکہ خود انھوں نے اپنے اندر ایک خود اعتمادی محسوس کی اور بائیس سال کے اس نوجوان نے ان کی ایما سے اپنا علاحدہ پریس کھولنا چاہا۔

اس کے لیے ان کی نظر انتخاب علم و تمدن کے مرکز لکھنؤ پر پڑی۔ ۱۸۵۷ء کا پرآشوب زمانہ تھا۔ نادر و نایاب کتابوں کے ذخائر تحریک جنگ آزادی کی نذر ہو چکے تھے۔ ہزاروں کتب خانے یا تو برباد ہو گئے تھے یا یورپی ممالک کی زینت بن رہے تھے۔ منشی جی علم و ادب کی یہ تباہی دیکھ کر تڑپ اٹھے، انھوں نے سوچا کہ کچھ بھی ہو ہر قیمت پر انھیں اس انمول خزانے کو بچانا ہے۔ سرمایہ کی کمی تھی لیکن عزائم بلند تھے پریس کی بڑی مشینیں نایاب تھیں۔ محلہ ڈیوڑھی آغا میر کے ایک چھوٹے سے کرایے کے مکان میں چند ہینڈ پریس اور پتھر خرید کر اس پریس کی بنیاد ڈالی جس نے دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں کی تعداد میں ہندی، اردو، فارسی، عربی اور سنسکرت کی کتابوں کو اس شان سے شائع کیا اور اس قدر ترقی کی کہ اس مطبع کا شمار اس وقت دنیا کے دوسرے بڑے مطبعوں کی فہرست میں نمبر دو پر تھا۔

منشی جی انتظامی امور میں غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے مطبع کی ترقی میں ان کے اعلیٰ نظم و نسق کا بڑا ہاتھ ہے۔ صحافت کا تجربہ تھا ہی۔ ابتدا میں چھوٹی چھوٹی مذہبی کتابیں چھاپنا شروع کیں۔ چھاپے خانے کے قیام کے چند ماہ بعد اردو کا "اودھ اخبار" جو بانوے سال تک جاری رہا، شائع ہوا۔ اس اخبار میں تازہ ترین خبروں کی اشاعت کے لیے آپ نے مختلف صوبوں میں اپنے نمائندے اور نامہ نگار مقرر کیے۔ اخبار میں مضامین لکھے جانے پر آپ نے مضمون نگاروں کو معاوضہ دینے کا چلن

رائج کیا۔ منشی جی کی انتھک کوششوں سے مطبع کا کام بڑھتا ہی گیا۔ اب یہ پریس لکھنؤ کے کشادہ بازار حضرت گنج کی وسیع و عریض بلڈنگ میں منتقل ہو چکا تھا۔ پریس کا عملہ بڑھا تو آسانی کے لیے مکبڈپو کے عملہ کو مندرجہ ذیل شعبہ جات میں تقسیم کیا :۔

۱:۔ دفتری خانہ لیتھو گرافی
۲:۔ دفتری خانہ ٹائپ ہندی و انگریزی
۳:۔ کھاتہ نویساں
۴:۔ محکمہ روانگی کتب ذریعہ وی پی و تعمیل فرمائشات
۵:۔ شعبۂ ترجمہ و تالیف ۳؎
۶:۔ شعبۂ کتابت
۷:۔ شعبۂ مالیات
۸:۔ شعبۂ فروخت نقد
۹:۔ شعبۂ نگرانی عمارات
۱۰:۔ شعبۂ اشتہارات
۱۱:۔ شعبۂ حصول فرمائشات
۱۲:۔ شعبۂ خطوط نویسی
۱۳:۔ شعبۂ جائزہ باقیات کتب و زیر طبع و زیر تجویز۔

ان شعبہ جات کی صحیح دیکھ ریکھ اور جانچ پڑتال ہوتی رہے اس کے لیے انھوں نے مختلف رجسٹر ترتیب دیے جو اس طرح تھے :۔

۱:۔ رجسٹر نامہائے تاجران کتب
۲:۔ " باقیات کتب معدوم موجود
۳:۔ " قابل الطبع یعنی زیر تجویز کتب کے ناموں کا رجسٹر
۴:۔ " کھتونی باقیات
۵:۔ " اطلاعات اقسام کتب
۶:۔ " جائزہ وقت بوقت
۷:۔ " کتب دیمک خوردہ
۸:۔ " خرچ کتب
۹:۔ " روزنامچۂ دستی
۱۰:۔ " حسب الخرچ
۱۱:۔ " روانگی کتب
۱۲:۔ " یادداشت گودام
۱۳:۔ دفتری خانہ لیتھو
۱۴:۔ " " ٹائپ
۱۵:۔ جائزہ ٹوٹ پھوٹ کتب گودام

مطبع کے رکارڈ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک رجسٹر "مسائل و امور مطبع" بھی رہتا تھا۔ جس کے ایک خانے میں، منیجر محکمہ جات امور خاص میں استفسارات درج کرتے تھے، منشی جی اس کے سامنے اگلے خانے میں اس کا جواب اور اپنا حکم درج کرتے تھے۔ ہر حکم پر تاریخ اور نمبر کا اندراج بھی ہوتا تھا۔

منشی جی ہر نام کی دیکھ بھال میں انتہائی چوکس رہتے۔ روزنامچہ کے طور پر اپنے احکامات لکھتے مثلاً ۱۸ نومبر ۱۸۹۱ء کے ایک حکم نامہ میں لکھتے ہیں :۔

"کسی خط کا جواب اگر ۴۸ گھنٹے میں روانہ نہ ہوئے تو اس کی وجہ سے جواب کے ساتھ مطلع فرمایا جائے۔ ڈاکخانہ کے استفسارات

کا جواب تاریخ وصول سے دوسرے دن تک روانہ ہوگا۔ متفرق امور کا جواب، اسی دن، اور زیادہ دیر ہو جائے تو دوسرے دن اس کی تعمیل ہو جائے، ہر ایک غلطی میں ایک ادنیٰ غلطی درج ہوگا۔ یادداشت ایسی غلطیوں کی دفعات روز تحریر ہوا کرے۔"

ایک دوسرے حکم نامہ کی مثال دیکھیے۔ حکم نامہ نمبری ۶۲۴ مورخہ ۱۳ نومبر ۱۸۹ء میں منشی جی یوں رقم طراز ہیں:۔

"چونکہ فی الحال کام روانگی میں دو محرران ذیل کام کرتے ہیں۔ یعنی لالہ بندا پرشاد و لالہ سوہن لال۔ وہ مجھ سے ہر وقت استفسار کرتے ہیں، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ روانگی کا کام میں انجام دوں تاکہ میری طبیعت کام میں مصروف ہو کر اچھی ہو جائے۔ لالہ بندا پرشاد محرر مطبع میرے ہمراہ امداد دیویں گے۔ اور لالہ سوہن لال کے ذریعہ دوسرا کام تیاری رجسٹران ذیل ہونا چاہیے:۔

رجسٹر ناتمام، رجسٹر قابل الطبع، رجسٹر خرچ، رجسٹر فیصل شدہ

مطبع کے ملازمین کے کام کے لیے منشی جی نے ایک دستور العمل مقرر کر دیا تھا۔ یہ دستور العمل ہر ملازم کے پاس رہتا، جس کے مطابق وہ اپنے کام کی انجام دہی کرتا۔ اس طرح ہر ملازم اپنے وقت سے ڈیوٹی پر آجاتا اور وقت سے گھر چلا جاتا۔ منشی جی کی سخت تاکید تھی کہ کسی سے اوور ٹائم نہ لیا جائے۔ حکم نامہ نمبری ۲۸۹ مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۸۸۹ء میں منیجر مطبع کو تاکید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"کوئی کام فضول نہ لیا جائے ورنہ فضول وقت صرف ہوگا۔"

جس ملازم کے سپرد جس قدر کام ہوتا اس کو سخت تاکید تھی کہ وہ پوری ذمہ داری سے اپنے فرض کو نبھائے۔ حکم نامہ نمبری ۲۷۴ مورخہ ۴ ستمبر ۱۸۸۹ء میں رقمطراز ہیں:۔

"ہر ایک شخص کو مطلع کیا جائے کہ اپنا اپنا کام متعلقہ پورا کر کے بعد اجازت دفتر برخاست کیا جائے۔ اگر کوئی شخص کام بقیہ چھوڑ کر گھر چلا جاوے گا اس کی غیر حاضری درج ہوگی جس کو منظور نہ ہو وہ آج ہی استعفا اپنا پیش کرے گا۔"

بچتی وقت کام کو ٹھیک سے انجام دینے کے لیے تھی۔ ورنہ منشی جی اپنے عملہ کے لوگوں سے بے حد ہمدردی اور خلوص و محبت سے پیش آتے تھے۔ ان کے بکڈپو میں ہر ایک وقت بارہ سو ملازمین کام کرتے تھے۔ منشی جی ان سب کے راحت و آرام کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ اس وقت دور جدید کی طرح بجلی کی اتنی آسانیاں نہ تھیں نہ ایرکنڈیشنڈ کمرے تھے نہ واٹر کولر، نہ برقی پنکھے۔ منشی جی موسم گرما میں کمروں کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے بکڈپو کے دروازوں پر خس کے پردے ڈلواتے، پچاس کورے گھڑے پانی بھروا کر گودام میں رکھوا دیے جاتے تاکہ عملہ کے لوگ گرمی اور پیاس سے پریشان نہ ہوں۔ بکڈپو میں پنکھے ٹنگوا دیے جاتے انھیں کھینچنے کے لیے پانچ تک علاحدہ اسٹاف کا بندوبست کیا جاتا۔

(بحوالہ رکارڈ مطبع بابت ۱۹ اپریل ۱۸۹ء)

مطبع کے تصنیف و تالیف کا کام کرنے والوں کے لیے خصوصاً داستان گویوں کے لیے افیون کا انتظام کیا جاتا۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کے متعلق تو یہاں تک مشہور ہے کہ ان کو گھر سے لانے کے لیے منشی جی کی گاڑی، ان کے گھر پر کھڑی رہتی، جس پر وہ انتہائی عزت و احترام کے ساتھ تشریف لاتے ان کے لیے بھنا ہوا گوشت اور گلابی بوتل کا خاص انتظام رہتا تھا۔

اپنے عملے کے لوگوں کی غمی و خوشی میں برابر کے شریک رہتے۔ مولانا امیر علی ملیح آبادی (مفسر مواہب الرحمن) جب بوجہ ضعیفی ملیح آباد میں سکونت پذیر ہو گئے تو منشی جی ہر ہفتہ ان سے ملنے کے لیے ملیح آباد جایا کرتے۔ مولانا حقہ کے بڑے شوقین تھے، لکھنؤ کا خمیرہ انھیں بے حد پسند تھا۔ منشی جی وہ ساتھ لے جانا کبھی نہ بھولتے تھے۔

منشی جی کے مطبع کا کوئی کام بغیر ان کی ایما کے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ ان کا مطمئن ہونا بہت ضروری تھا۔ حکم نامہ نمبری ۳۴۲ مورخہ ۳ دسمبر ۱۸۸۹ء میں یہ لکھتے ہیں:۔

"اگلے ویلیو پے ایبل موزونہ م دیجیپی وغیرہ لکھے ہوئے مجھے دکھلائے جائیں۔"

۴ دسمبر کو اس حکم کی تعمیل ہوئی۔ کاغذات کو دیکھنے کے بعد اس طرح رقمطراز ہیں:-

"جیسی وولیو بے ایل مونز تم دیکھے صحت کے ساتھ چھپے ہوتے پائے۔ لیکن اردو میں لکھا ہوا تھا اس لیے خطا چھپا نہیں تھا۔ انھیں احتیاط سے لکھیں تاکہ خط عمدہ ہو۔"

اگر ضرورت ہوتی تو منشی جی اپنے مطبع کے مختلف محکمہ جات کے افسران کو رات کو اپنے گھر بلاتے، مختلف امور پر صلاح و مشورہ کرتے تاکہ محکمہ کا ہر شخص اپنے کو بہتر کارگزاری کے لیے آمادہ کر سکے۔

(حوالہ ریکارڈ مطبع ۱۸۸۹ء)

منشی جی نے بکڈپو کے گوداموں میں ردیف وار کتابیں لگانے کا طریقہ بھی رائج کیا۔ اس کے لیے انھوں نے کچھ اصول بھی مقرر کیے۔

کاغذ کی کمی کو پورا کرنے کے لیے گومتی کے کنارے کاغذ تیار کرنے کا کارخانہ بھی قائم کیا جس کی مشینیں ولایت سے منگوائی گئیں تھیں۔

منشی جی رمضان المبارک کی آمد پر خاص اہتمام کرتے۔ اس ماہ کتب کی خریداری پر ۲۵ فیصد خصوصی رعایت دیتی تھی۔ مطبع میں عرق بید مشک [illegible] رہتا۔ اس کی قیمت بھی اس ماہ چار روپیہ کی چھوٹ رہتی۔

(حوالہ ریکارڈ مطبع بابت ۲۸ اپریل ۱۸۸۹ء)

مشہور ہے کہ قرآن شریف کی کتابت و پروف ریڈنگ اور طباعت کے وقت [illegible] خود باوضو رہتے اور تمام اسٹاف کے لوگوں کو بھی باوضو رہنے کی تاکید کی جاتی۔

ان کی خوش انتظامی سے متاثر ہو کر مہاراجہ جے پور نے انھیں اپنا نائب بنانے کی پیشکش کی لیکن منشی جی نے نامنظور کر دیا۔ منشی جی کے بہترین نظم و نسق کا ہی نتیجہ تھا کہ ان کی زندگی ہی میں اس مطبع سے تقریباً ۴ ہزار چھوٹی بڑی کتابیں شائع ہوئیں۔ جن میں فارسی کی نادر کتابیں مثلاً تاریخ طبری، مہابھارت اور رامائن کا فارسی ترجمہ، اٹھارہ ہزار صفحات پر مبنی ضخیم کتاب طلسم ہوشربا،

قرآن شریف کی بے نقط تفسیر سواطع الالہام (فیضی) کے علاوہ دوسری نایاب تفاسیر قرآن، ستور و تلسی، ظفر و غالب، مومن، میر کے دواوین انتہائی دیدہ زیب کتابت کے ساتھ شائع ہوئے جو نہ صرف ہند بلکہ بیرون ہند مثلاً ایران، افغانستان، فرانس اور انگلستان تک پہنچے۔

منشی جی اس قدر محنتی اور جفاکش تھے کہ نہ صرف تمام چھپنے والی کتابوں کے پروف خود دیکھتے بلکہ بیشتر کتابوں پر اردو فارسی میں خود دیباچے بھی لکھتے۔ مدارج النبوۃ، اعجاز خسروی، دیوان نثر و نگار، انشاء خلاصہ انوار سہیلی وغیرہ وہ کتابیں ہیں جن پر انھوں نے فارسی میں دیباچے تحریر کیے۔ منہاج النبوۃ، تاریخ [illegible] الہیر ہدایت وغیرہ میں ان کے لکھے ہوئے اردو دیباچے موجود ہیں۔

مطبع نول کشور کی حیثیت اس وقت شہد کے چھتے کی سی تھی جس سے اس وقت کے تمام مشاہیر بیک وقت وابستہ تھے۔ مثلاً رتن ناتھ سرشار، شرر، مرزا حیرت دہلوی، نوبت رائے نظر، منشی دوارکا پرشاد افق، منشی ہری پرشاد سکینہ، منشی پریم چند وغیرہ

"اردو کے ہندو ادیب" کے مصنف نے لکھا ہے کہ:-

"لکھنؤ میں جس قدر مشہور حافظ، عالم، مورخ، ادیب اور شاعر اس مطبع میں بیک وقت جمع ہو گئے تھے، ہندوستان کے کسی دوسرے مطبع کو نصیب نہیں ہوئے۔"

اس چھاپے خانے کے متعلق غالب کے الفاظ تو زبان زد خاص و عام ہو گئے۔ مرزا فرماتے ہیں:-

"اس چھاپے خانے نے جس کسی کا بھی دیوان چھاپا اس کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔"

پروفیسر احتشام حسین مرحوم اس پریس کے متعلق اپنی رائے کا یوں اظہار فرماتے ہیں:-

"منشی نول کشور نے اودھ اخبار اور پریس کے ذریعہ علم و ادب کو نئی زندگی بخشی اور ملک کی ذہنی بیداری میں جو حصہ لیا اسے نظر انداز کر کے ہندوستان کی مکمل تہذیبی تاریخ نہیں لکھی

جا سکتی ہے

امرت لال ناگر نے منشی جی کے متعلق بہت عمدہ بات کہی ہے فرماتے ہیں :-

ہندوستان کے اشاعتی اداروں کی تاریخ میں منشی جی کا وہی مقام ہے جو فولاد کی صنعت میں جمشید جی ٹاٹا کا ہے[2]

منشی جی کی شہرت و عزت کا یہ عالم تھا کہ شہنشاہ افغانستان امیر عبدالرحمن نے انھیں اپنے پاس بٹھانے میں فخر محسوس کیا[3] ۱۸۸۵ء میں شہنشاہ ایران نے ہندستان آنے کی غرض و غایت بتاتے ہوئے کہا تھا کہ ان کا مقصد منشی نولکشور [illegible] سے ملاقات کرنا تھا۔ ایک دوسرے نے تو یہاں تک [illegible] کہا کہ منشی نولکشور ہندوستان کے [illegible] ملکہ وکٹوریہ نے انھیں [illegible] کے خطاب سے نوازا۔

لائبریری [illegible] امتیاز [illegible] اور ادب کی جو [illegible] منشی جی نے [illegible] وہ ان کے تدبر و تفکر [illegible] ہے

---

[1] "سفیر" آگرہ سے دیوان چند [illegible] شائع ہوتا تھا [illegible] پہلے شروع کیا جاتا تھا۔ [2] اس شعبہ میں انگریزی [illegible] ترجمہ [illegible] اور کوری شنکر [illegible] [3] مضمون "منشی نولکشور آنجہانی" از امین سلونوی۔ نولکشور نمبر نیا دور۔ جولائی اگست ۱۹۶۹ء۔ [5] ماخوذ از "علم [illegible]" [illegible] نورانی۔
[6] مضمون "منشی نولکشور — چند اہم خدمات" [illegible] نولکشور نمبر [illegible] جولائی اگست ۱۹۶۹ء۔

منشی نولکشور نے اپنے اودھ اخبار کے ذریعے اردو زبان کو دو عہد آفریں ادیب دیے — رتن ناتھ سرشار اور عبدالحلیم شرر۔ جس زمانے میں سرشار اور شرر تھے وہ اردو نثر کی تاریخ میں سرشار اور شرر کا زمانہ کہلاتا ہے۔

مرزا جعفر حسین

منشی نولکشور اور لکھنؤ



منشی نول کشور نے اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت کے سلسلہ میں ناقابل فراموش خدمات انجام دے کر اردو کی تاریخ میں اپنی ایک نمایاں جگہ بنالی۔ لیکن آج مطبع نول کشور کو قائم ہونے کے سو برسوں سے زیادہ مدت گزر جانے کے بعد دورِ حاضر کے لوگ ہو سکتا ہے کہ یہ کہہ اٹھیں "منشی نولکشور بڑے ہوشمند تاجر تھے انھوں نے مطبع قائم کرکے بہت دولت کمائی۔ لہٰذا ان کی علم دوستی اور ادب پرستی مشکوک ہو جاتی ہے۔"

ویسا کہنا حق ناشناسی کے برابر ہے۔ ہر تاجر کم سے کم سرمایہ لگا کر زیادہ سے زیادہ منافع کمانا چاہتا ہے۔ یہاں ابتدا ہی سے صورت برعکس تھی۔ مطبع اور اودھ اخبار دونوں اداروں سے معقول تعداد میں شاعر اور ادیب متعلق رہے۔ اخبار کے لیے بکثرت مراسلہ نگار ملازم تھے اور خبر رساں ایجنسیاں قائم تھیں۔ ظاہر ہے کہ ان کثیر مصارف کے بار کا اخبار متحمل نہیں ہو سکتا تھا اور یہ تمام اخراجات مطبع ہی کی آمدنی سے پورے ہوتے تھے۔ انھیں رقوم کو ہم منشی صاحب کا منافع تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ پریس کے منافع پر اخبار کے کثیر مصارف کا بار ڈالنا ان کے ایثار کا واضح ثبوت ہے۔ یہ ایثار صرف اسی وجہ سے عمل میں آتا تھا۔

منشی نول کشور علم وادب کے پرستار تھے اور علم وادب کی پرخلوص خدمت کرتے تھے۔ انھوں نے بیشمار کتابیں زیورِ طبع سے آراستہ کرائی ہوتیں تب بھی اودھ اخبار اردو زبان وادب اور ہماری قدیم تہذیب و معاشرہ کے حق میں ایک احسان عظیم تھا۔ پروفیسر احتشام حسین نے ایک مقام پر فرمایا ہے:

"منشی نول کشور نے اودھ اخبار اور پریس کے ذریعہ علم وادب کو زندگی بخشی اور ملک کی ذہنی بیداری میں جو حصہ لیا اسے نظر انداز کرکے ہندستان کی مکمل تہذیبی تاریخ نہیں لکھی جا سکتی۔ اودھ اخبار کی پالیسی قومی یکجہتی، جذباتی ہم آہنگی، باہمی اتحاد، حکومت اور عوام میں ربط واشتراک، اشاعتِ تعلیم، تربیت اخلاق اور سماجی اصلاح پر مبنی تھی۔ ہندستانی ادب کی خدمت، مشرقی تہذیب کی قدروں کو ابھارنا، ذہنی بیداری کی حفاظت کرنا، اخوت اور انسان دوستی اس کے نصب العین تھے۔"

کہنا پڑتا ہے کہ یہ تمام اعلا خدمات، ایک تاجرانہ ذہنیت کی پیداوار نہیں ہو سکتے۔ یقیناً ان تمام امور کے انجام دینے میں خدمت ملک وقوم کا جذبہ شامل تھا وہ یقیناً اردو زبان وادب کے محسن تھے۔

فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ منشی نول کشور نے اپنی اقامت اپنی تجارت اور اپنے مجوزہ اخبار کی اشاعت کے لیے شہر لکھنؤ کو کیوں منتخب کیا؟ یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ وہ لاہور سے آگرہ گئے تھے اور وہاں کچھ مدت تک رہ کر لکھنؤ آئے تھے اس لیے ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ انھوں نے ہر پہلو پر غور کرکے اس شہر کو پسند کیا تھا۔ ان کے والد علی گڈھ کے رئیس تھے۔ انھوں نے خود ابتدائی تعلیم متھرا میں پائی تھی۔ جہاں ان کے بزرگوں کی جائدادیں تھیں ثانوی تعلیم آگرہ میں حاصل کی اور صحافت کا مشغلہ اسی مقام پر

شروع کیا۔ سفیرِ اخبارِ آگرہ کی بدولت شہرت حاصل کی پھر لاہور جاکر صحافت اور پریس کے کام میں ملکہ حاصل کیا۔ بالآخر ان سب مقامات سے ترکِ تعلق کر کے لکھنؤ آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ حالانکہ ۱۸۵۷ء کے تلاطم میں دوسرے مقامات کی طرح لکھنؤ بھی مبتلا تھا۔ یہاں کی ابتری کا یہ عالم تھا کہ انتزاعِ سلطنتِ اودھ کے بعد بہت بڑی آبادی شہر بدر ہو گئی تھی۔ لکھنؤ اجڑ چکا تھا اس کی بہار رخصت ہو چکی تھی۔ کہنا پڑتا ہے کہ یہ شہر حالتِ خزاں میں بھی پُر بہار تھا اور کچھ ایسی بہار تھی کہ تاجرانہ ذہنیت والے لوگوں کو بھی اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔

ہر شخص کو کسی شہر میں وارد ہونے کے بعد سب سے پہلی ضرورت قیام گاہ کی لاحق ہوتی ہے۔ منشی صاحب کو اس زحمت کا سامنا نہیں ہوا۔ وہ تشریف لائے اور جلد از جلد تبدیلیٔ مکان کرتے رہے اس کی وجہ یہ تھی کہ کثرت سے مکان خالی تھے۔ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا تھا کہ عہدِ واجد علی شاہ میں سات لاکھ کے قریب لکھنؤ کی آبادی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ سب لوگ مکانات میں رہتے تھے۔ سلطنت اجڑی اور آبادی معزول ہوئی تو یہ مکانات بڑی تعداد میں خالی ہو گئے۔ جن پر باہر سے آنے والوں نے قبضہ کر لیا یعنی بہ کرایا آباد ہوئے۔ اسی طرح لکھنؤ آنے کے بعد منشی صاحب کو قطعاً قیام گاہ پسند کر لینے میں کوئی دشواری نہ ہوئی ہوگی۔ اس کے بعد خورد و نوش کے ضروریات کا مسئلہ سامنے آیا۔ ان اشیاء کی یہاں فراوانی تھی ـــــ ترکاریاں مضافاتِ شہر سے آکر فروخت ہوتی تھیں۔ ہر ترکاری اپنی فصل سے قبل ہی آجاتی تھی۔ یہاں کے لوگوں کے مزاج لطافت و نزاکت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ وہ لوگ ہر چیز میں جدت و ندرت پسند کرتے تھے۔ لہٰذا ہر ترکاری کی قدر و قیمت موسم سے قبل مل جانے میں بڑھ جاتی تھی۔ کھانے والے جب کم ہو گئے تھے تو ترکاریوں اور اجناس کی فراوانی ہو گئی ہوگی۔ ان اشیاء کے دام پہلے بھی بہت کم تھے۔ فراوانی کے بعد اور زیادہ کم ہو گئے ہوں گے۔ اس لیے منشی صاحب کو قیام کے ساتھ طعام میں بھی تمام سہولتیں بہم رہی ہوں گی جو ان کو کسی دوسرے مقام پر حاصل نہیں ہو سکتی تھیں۔

ضروریاتِ زندگی کی فراہمی اور ارزانی کے ساتھ لکھنؤ کا حسن و جمال بھی اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ اس شہر میں اتنے باغ تھے جن کے نام بتانا بھی سہل نہیں ہے۔ مثال کے طور پر لیجئے۔ دلکشا، چارباغ، عالم باغ، عیش باغ، بنارسی باغ، بادشاہ باغ، جند باغ، کیننگ باغ وغیرہ وغیرہ، بے شمار باغ، اب محلّوں میں تبدیل ہو گئے۔ اور محلّے اپنے باغوں کے نام سے مشہور رہیں۔ ان باغات کے ساتھ مرصّع اور مزیّن عمارتیں بہت دلکش اور جاذبِ نظر تھیں۔ نوابوں اور رئیسوں کے عالیشان محل تھے جن میں لاتعداد عمارتوں کی بلندی پر گھڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک مرتبہ ایک سیاح نے لکھا تھا کہ اگر فضا میں بلند ہو کر دیکھا جائے تو سفید جھلملاتی ہوئی عمارتوں پر گھڑیوں کی چمک آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دیتی ہے۔ ان محلوں اور محلسراؤں میں غریب ملازمین کے رہنے کے واسطے ٹھکانے رہا کرتے تھے۔ ایک عالیشان محل سے متصل غریب عورت کی جھونپڑی بھی نظر آجاتی تھی۔ غربا پروری ہر رئیس اور ہر امیر کبیر کا شعار تھا۔ غریبوں کو ستانا یا ان کا دل دکھانا بہت بڑا گناہ سمجھا جاتا تھا۔

عمارات اور باغات کے علاوہ بڑے بڑے بازار بھی اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ حضرت گنج کا بازار، انگریزوں کے لیے مخصوص تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل تک اس بازار میں خال خال ہندوستانی نظر آتے تھے۔ ہندوستانیوں کا سب سے بڑا دیدہ زیب، نظر فریب، خوش نما اور خوش رنگ بازار چوک تھا۔ گول دروازہ سے داخل ہوتے ہی خوشبوؤں کی مہک اور لہک سے دماغ معطر ہو جاتا تھا۔ داہنی جانب سونے چاندی کے سادے اور جڑاؤ زیورات دعوتِ نظارہ دیتے اور بائیں جانب خوش وضع، خوش رنگ اور دلفریب کامدانی اور کارچوبی کپڑے، اپنی بہار دکھاتے تھے۔ دوکانوں کی زیبائش صفائی اور سجاوٹ بے مثل و بے نظیر ہوتی تھی۔ دوکان دار اپنی اپنی دوکانوں پر انتہائی صاف شفاف نورانی کپڑے زیبِ تن کیے رہتے، ان سے بات کرنے میں مزا ملتا

تھا۔ اور ہر دوکان عود و اگر کی خوشبو سے بسی رہتی تھی۔ دارالشفار کے مقابل کپتان کے کنویں کے قریب خوانچے والے میووں کی برفی بیچتے تھے۔ بادام کی برفی، پستہ کی برفی، اخروٹ کی برفی، ناریل کی برفی وغیرہ وغیرہ۔

یہ دوکاندار اپنے بزرگوں کے وقت سے ہر شام کو اسی مقام پر برفی بیچتے تھے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں ہر برفی آٹھ آنے فی سیر کے حساب سے ملتی تھی۔ وسط چوک میں متفرق چیزوں کی دوکانیں تھیں۔ جن میں ہر دوکان کا صاف ستھرا اور معطر ہونا ضروری تھا۔ الائچی اور چکنی ڈلی کی دوکانیں طرفہ مہک فراہم کرتی تھیں۔ انھیں دوکانوں میں متعدد کتب فروش بھی تھے۔ جہاں شام کو پڑھے لکھے لوگ تفریح کیا کرتے تھے۔ تحسین کی مسجد کے نیچے، مقابل اور اکبری دروازے میں اشیائے خوردنی کی دوکانیں تھیں۔ بعض دوکانوں سے ایسی خوشبو آتی تھی کہ بھوک نہ لگی ہو تو لگ جائے۔ اکبری دروازہ میں بہترین مٹی کے کھلونے اور دیگر اشیا مثلاً رکابیاں، پیالے، آبخورے، حقے وغیرہ ملتے تھے۔ ان کی سوندھی سوندھی خوشبو دل و دماغ کو سکون فراہم کرتی تھی۔ چوک بازار میں پان کی بڑی نفیس دوکانیں تھیں اور جگہ جگہ حقہ پلانے والے نفیس حقوں پر پھولوں کے گجرے بیٹھے پیسہ پیسہ یا دو دو پیسہ پر راہ گیروں کی ضیافت کرتے تھے۔ انھیں دوکانوں کے بالاخانوں پر مہ جبینان شوخ و شیریں اور گل رخان حسینانِ جاں ہر شام کو اپنی تمام زینت و زیبائش سمیت دیدہ و گوش کو جنت فردوس کا لطف فراہم کرتی تھیں۔ برتنوں وغیرہ کے بازار علیٰحدہ تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ حسن و جمال نہ آگرہ کو نصیب تھا نہ لاہور کو۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ دلی کے پاس بھی عظمت و جبروت کے علاوہ اور کچھ نہ تھا جو خواص و عام سب کو یکساں طور پر متوجہ کر لیتا۔

انسان کا جوہر خوش گفتاری میں کھلتا ہے۔ لکھنؤ والوں کو اس فن میں اتنا کمال تھا کہ اچھی بات اچھے لہجہ میں اور برمحل کہنا ان کی فطرت ثانیہ ہو گیا تھا۔ شیریں گفتاری میں امیر و غریب خواص و عوام اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ یہاں کے سودے والے بھی شیریں مقال اور شیریں زبان تھے۔ شاہان اودھ کے زمانہ میں اس شہر کے در و دیوار شعریت میں سرشار ہو چکے تھے۔ وہ کیفیت انتزاع سلطنت کے بعد بھی تخمیناً بہتر برس تک برقرار رہی تھی۔ پڑھے لکھے لوگوں کا یا شاعروں کی بزلہ سنجی کا کیا ذکر، جہلا و پست درجہ کے آدمیوں کی گفتار میں بھی لطف تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل کے دو تجربے یاد آ رہے ہیں۔ چوک میں ایک بار ایک چھوٹی دوکان وقت پر نہیں کھلی تھی۔ غالباً گیارہ بج چکے تھے۔ ایک مجہول جوان لڑکا اس دوکان کے دروازہ سے متصل اپنا برتن دھو رہا تھا۔ ناگاہ مالک دوکان وارد ہوا۔ اس کا مزاج کچھ برہم تھا۔ اس نے ذرا ترش ہو کر کہا کہ "ہٹو، یہاں کیا کر رہے ہو"۔ اس جوان نے اس کی بیجا برہمی مزاج کا صرف یہ جواب دیا کہ "خیریت تو ہے"۔

دوسرا واقعہ بہت دلچسپ ہے۔ احاطۂ نواعلیاں جاتے ہوئے کونے سروں پر میں نے ایک نوجوان لڑکے کو ایک نوجوان لڑکی سے چراغ جلنے کے قریب چپکے چپکے باتیں کرتے دیکھا۔ صورت حال کو سمجھ کر میں نے قدم آہستہ کیے اور ان کی باتیں سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو گیا۔ یہ دونوں غالباً کہار پیشہ خاندان کے افراد تھے۔ میں نے لڑکی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ "جس دن تم کو نہیں دیکھتے ایسا لگتا ہے کہ جیسے آج ہم نے اشنان نہیں کیا ہے"۔ یہ کلمہ سن کر دل پھڑک اٹھا۔ ظاہر ہے کہ جس شہر کا ماحول ایسے خوش گفتار اور بذلہ سنج افراد سے معمور ہو وہاں سے اگر کسی حساس اور ادب پرست شخص کا نکل جانا قہر آ ہو سکتا ہے، خوشی سے کوئی خیرباد نہیں کہہ سکتا۔

منشی نول کشور کے ایسے فطری ذوق و ادب کے مالک کو یقیناً اس شہر کے ذرہ ذرہ نے مسخر کیا ہوگا۔ اور وہ یہاں کی تہذیب و معاشرت کے اتنے گرویدہ ہو گئے ہوں گے کہ یہیں کے ہو رہے اور پھر کبھی آگرہ، لاہور اور متھرا کا رخ نہیں کیا۔

ان تمام نعمتوں اور برکتوں کے علاوہ تجارتی ضروریات کے سارے لوازمات بھی اس شہر میں موجود تھے۔ منشی نولکشور کا تجارتی منصوبہ علم و ادب سے متعلق تھا اور لکھنؤ علم و ادب کا ایک جلیل القدر مرکز تھا۔ اودھ کی سلطنت قائم ہونے کے قبل سے فرنگی محل کا چراغ روشن تھا۔ یہ صرف ایک مدرسہ نہ تھا بلکہ حقیقتاً سارے

ایشیا میں ایک عظیم ترین یونیورسٹی کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس ادارہ کی طرف دنیا بھر کی اتنی مرجعیت تھی کہ فرنگی محل والوں کو فرمانروایان اودھ کا کبھی ممنون احسان نہیں ہونا پڑا تھا۔ انتزاع سلطنت کے بعد بھی جب لکھنؤ تباہ و برباد ہو چکا تھا فرنگی محل تشنگان علم و ادب کو سیراب کر رہا تھا۔ اسی درس گاہ کی آدمیت اور شرافت کا یہ فیض تھا کہ ۱۸۵۷ء کی غدر پورتا راجی کے بعد بھی ہمارے شہر میں علم کا چراغ روشن رہا اور شعر و ادب کی محفلیں سونی نہیں ہوئیں۔ فرنگی محل کے علاوہ بھی علما و فضلا دوسرے محلوں میں آباد تھے اور ہر طرح کے فنکار اپنے اپنے کمال دکھاتے تھے چنانچہ منشی نول کشور نے اسی شہر کا بنا ہوا ہینڈ پریس خرید کر اپنا کاروبار شروع کیا تھا۔ کاریگروں کے ساتھ قدردانوں کی بھی کمی نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ منشی صاحب کے کام شروع کرتے ہی لکھنؤ والوں نے ان کے متاع کو فی الفور اس طرح قبول کیا کہ ان کا پریس دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرتا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ منشی نول کشور نے مطبع قائم کرنے کے بعد پہلے چھوٹی چھوٹی کتابیں شائع کی تھیں لیکن یہ امر یقینی ہے کہ ان کے پیش نظر اخبار نکالنے کے کام کو فوقیت تھی۔ اس لیے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انھوں نے دونوں کام قلیل مدت کے فاصلے سے شروع کیے ہوں گے۔ صورت حال جو کچھ بھی ہو مگر یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ لکھنؤ نے پریس اور اخبار دونوں کے لوازمات فراہم کیے تھے۔ یہاں خوش نویس بھی تھے، اچھے کاتب بھی تھے اور فنکار رنگ ساز بھی موجود تھے۔ مطبع کے مالک کو ہوشیار کام کرنے والوں کی فراہمی میں کوئی زحمت نہیں ہوئی۔ اخبار نکالا تو ابتداءً ادارت اپنے سے متعلق رکھی۔ مگر ان کو اسی شہر میں ایک سے ایک بہتر صحافی اور نامہ نگار برابر ملتا رہا تھا۔

منشی نول کشور یقیناً صاحب نظر، قدرشناس اور تجربہ کار بزرگ تھے لیکن لکھنؤ کی یہ خصوصیت تھی کہ ان کو کسی منزل پر اور کسی معاملہ میں مایوسی نہیں ہوئی۔ یہ سچ ہے کہ ادیبوں اور فنکاروں کی۔ انھوں نے جو عملہ فراہمی کی پھر بھی لکھنؤ میں ایسے ادیبوں اور فنکاروں کی کوئی کمی نہ تھی جو ان کی قدردانیوں کے مستحق قرار پاتے۔ لکھنؤ والوں کو جن میں علما و فضلا، شاعر، ادیب اور صحافی سب شامل تھے، زمانہ نے اتنا کچل دیا تھا کہ بیشتر لوگ فلاکت زدہ ہو گئے تھے لیکن فلاکت میں بھی صاحبان فضل رہنا اور تباہی میں بھی علم و ادب کی دولت میں کمی نہ آنے دینا ہمارے شہر کی خصوصیت خاصہ میں داخل تھا۔ منشی نول کشور کو یہ سرمایہ لکھنؤ کے علاوہ اور کسی شہر میں حاصل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ہم کو ان کی نظر انتخاب کا بہرحال اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

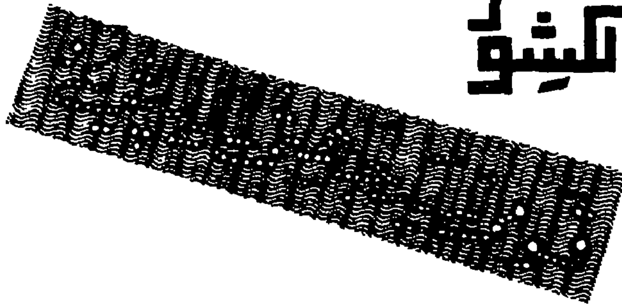


نول کشور پریس محض ایک چھاپہ خانہ نہ تھا، یہ ایک اشاعتی اور تصنیفی ادارہ بھی تھا۔ اس نے نہ صرف کلاسیکی ادب کو حیات نو دی بلکہ بہ کثرت اپنی فرمائش پر داستانیں اور دوسرے ادب پارے لکھوائے اس طرح اس تجارتی ادارے نے اپنے دور میں، اپنے طور پر وہی فریضہ انجام دیا جو اس سے پہلے فورٹ ولیم کالج نے اور بعد میں انجمن ترقی اردو نے دیا۔

——— ڈاکٹر گیان چند

شمس تبریز خاں

منشی نول کشور



قومی یک جہتی کا صحیح اور قابل عمل مفہوم یہ ہے کہ کسی ملک کے افراد اگر مختلف مذاہب و تہذیب سے تعلق رکھتے ہوں تو ان میں رواداری و بے تعصبی، مفاہمت و مصالحت، ہمدردی و خیر خواہی پر مبنی اور خوشگوار تعلقات ہوں، ان میں ایک دوسرے کو سمجھنے، باہم قریب آنے اور ذہنی ہم آہنگی کا جذبہ کارفرما ہو اور وہ بے جا دباؤ سے آزاد ہو کر کھلی فضا میں ایک دوسرے کے تہذیبی و معاشرتی حسن و خوبی کو اپنا سکیں یا کم از کم اس کی قدر و تحسین کر سکیں۔

علوم و فنون، زبان و ادب اور تہذیبی اقدار و افکار کا تبادلہ یا موازنہ کر سکیں، اس کے ساتھ وہ مجموعی طور پر اچھے پڑوسیوں بلکہ دوستوں کی طرح باہمی حقوق و فرائض کا لحاظ رکھیں، وقت پڑنے پر ملک کا مشترک دفاع کریں اور حب الوطنی کے تقاضے پورے کریں۔ بغض و عناد کے بجائے اتحاد و اعتماد کا ماحول تیار کریں اور انسانیت کا ایسا دلکش نمونہ پیش کریں جس سے دوسرے ملکوں کے انسان متأثر ہوں اور اس طرح پوری دنیا میں جنگ و استحصال کے بجائے امن و اخوت اور تعاون و محبت کی خوشگوار فضا چھا جائے اور ایسا عالمی ماحول بن جائے جس میں انسان اپنے مقصد حیات کی تکمیل کر سکے، اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکے، اور فکر و عمل، اور عقل و وجدان کے خوبتر اور خوب تر اظہار کے ذریعہ اپنی تکمیل و ارتقا کے مراحل طے کر سکے اور دنیا میں خیر اور حسن و صداقت کا اجالا پھیل جائے اور قومی یک جہتی بین الاقوامی یک جہتی کا ذریعہ اور وسیلہ بن جائے۔

قومی یک جہتی اور ہندو مسلم اتحاد کے علمبرداروں میں منشی نول کشور کا نام بھی ممتاز حیثیت رکھتا ہے؛ یوں تو انھوں نے تمام ہی ہندستانی مذاہب کی ثقافتی خدمت انجام دی مگر اسلام سے انھیں خاص عقیدت تھی اور وہ اسلامی تہذیب و ثقافت سے اپنے کو بہت مانوس پاتے تھے اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے مشہور نام مطبع کو زیادہ تر اسلامی لٹریچر اور مشرقی علوم و فنون بشمول دینیات کی اشاعت کے لیے وقف کر رکھا تھا، اس سلسلے میں انھوں نے مثالی بلند ہمتی اور عالی حوصلگی کا ثبوت دیا کہ اسلامیات (خصوصاً تفسیر و حدیث و فقہ و تصوف) کی ایسی ضخیم اور نایاب کتابوں کو شائع کر کے . . . . . .

ہر مدرسے اور ہر گھر تک پہنچا دیا، جس سے اسلامی نظام تعلیم کو خاطر خواہ فروغ حاصل ہوا۔ مولانا امیر علی کی تفسیر مواہب الرحمٰن کی تیس جلدیں شائع کیں، اس کے ساتھ فتح الباری، عینی، تاریخ طبری، شامی، فتح القدیر، ترجمہ قانون شیخ، تاریخ روضۃ الصفا، فتاویٰ عالمگیری، ترجمہ کیمیائے سعادت، مظاہر حق، مراثی میر انیس، داستانِ امیر حمزہ، طلسم ہوشربا اور فتوح الشام کی اصل مجلدات اور ان کے اردو ترجموں کی ضخیم جلدیں شائع کیں اور لوگوں کو اسلامی ثقافت سے مانوس اور متعارف ہونے کے مواقع فراہم کر دیے، اس کے ساتھ ہی ہندو ازم، سکھ ازم اور بدھ ازم سے متعلق لٹریچر بھی شائع کر کے ان سے بھی واقفیت کی سہولت بہم پہنچائی۔

اردو اور ہندی کتابوں کے ساتھ ہندستان کی دوسری علاقائی زبانوں میں بھی کتابیں شائع کر کے انھوں نے لسانی عصبیت کو بھی مٹانے اور اس معاملہ میں رواداری برتنے کی تعلیم دی۔ تاہم وہ اردو کے بہت بڑے محسن تھے کیونکہ نولکشور پریس کی زیادہ تر کتابیں اردو ہی میں ہوتی تھیں

اردو صحافت کی تاریخ میں بھی "اودھ اخبار" کے ذریعہ اُن کا نام یادگار رہے گا جو کم و بیش ایک صدی تک نکلتا اور معیاری صحافت کا نمونہ پیش کرتا رہا، اسی کے ذریعہ شررؔ اور سرشارؔ جیسے ادیب اردو کو ہاتھ آئے اور جس کے ادارۂ تحریر میں ایسے اہلِ قلم کے نام ملتے ہیں جو شاید ہی کسی اور رسالہ کے ادارتی عملہ میں ملتے ہوں جیسے منشی امیر اللہ تسلیمؔ، ہادی علی اشکؔ، قدرؔ بلگرامی، سرشارؔ، نسیمؔ دہلوی، مولانا شررؔ، مرزا حیرتؔ، نوبت رائے نظرؔ، یگانہؔ چنگیزی، پریم چند، مرزا محمد عسکری، مولانا آسیؔ، شوکتؔ تھانوی اور امین سلونوی۔ اس کے علاوہ ان کے پریس سے بیک وقت اتنے اور ایسے ادیب و عالم اور اہلِ قلم وابستہ تھے کہ اسے نولکشور اکیڈمی کہنا صحیح ہوگا۔

انسانی حیثیت سے بھی وہ ایک مثالی شخصیت کے مالک تھے حاجت مندوں، یتیموں اور بیواؤں کی مدد اور اہلِ علم کی اعانت اور ان کی قدردانی ان کی خاص ادا تھی جس کے بارے میں غالبؔ نے علاء الدین خاں بہادر کو ۳ر دسمبر ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں لکھا "شفیق مکرم و لطف مجسّم منشی نولکشور صاحب بہ سبیلِ ڈاک یہاں آئے مجھ سے اور تمھارے چچا اور تمھارے بھائی شہاب الدین خاں سے ملے، خالق نے ان کو زہرہ کی صورت اور مشتری کی سیرت عطا کی ہے گویا بجائے خود قرانِ السعدین ہیں۔" منشی صاحب کے گھرانے کی ایک فرد رانی لیلا بھارگو لکھتی ہیں "منشی نولکشور اپنی آمدنی کا ایک بڑا حصہ امورِ خیر پر خرچ کرتے تھے، ان کی طرف سے کتنے ہی یتیموں، اور بیواؤں اور ضرورت مندوں کے لیے بلا تفریق مذہب و ملت وظیفے مقرر تھے۔ منشی نولکشور اہلِ علم کے قدردان اور ان کے مرتبہ شناس تھے۔ اُن کا سابقہ بھی ایسے ہی لوگوں سے رہتا تھا وہ ان کے منصب کے بموجب ان کی قدر و منزلت کرتے تھے اپنے مطبع کے اشاعتی کاموں کے سلسلے میں بلند مرتبہ علما کی خدمات حاصل کرتے تھے تو اس طرح کہ انھیں اپنے پریس میں بلانے کے بجائے خود ان کے پاس جاتے تھے یا اپنے مخصوص معتمدین کو ان کے پاس بھیجتے تھے[۸]۔"

اسی طرح وہ علمی تہذیبی اداروں کی بھی بلا تفریق مذہب و ملت اعانت کرتے اور انھیں اپنی گرانقدر مطبوعات ہدیہ کرتے تھے ایسے اداروں میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جلسۂ تہذیب لکھنؤ، دارالعلوم دیوبند، فرنگی محل لکھنؤ وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

آج سے سوا سو سال پہلے جب ہندستان پر جہالت و ناخواندگی کے سیاہ بادل محیط تھے اور طباعت و اشاعت کی سہولتیں میسر نہ تھیں، منشی نولکشور اپنی مطبوعات کے ذریعہ علم و ثقافت کا اُجالا پھیلا رہے تھے اور اس وقت کے علمی و ثقافتی ادارے اُن سے مستفید ہو رہے تھے۔ اس زمانے میں کتابوں کی نایابی کا اندازہ اس سے ہوگا کہ ۱۸۶۶ء میں قائم ہونے والے دارالعلوم (دیوبند) کے دوسرے سال کی روداد میں لکھا گیا تھا کہ "ترقیٔ خواندگی میں بالخصوص یہ امر بھی حارج رہا کہ کتب درسیہ خاصتہً کتب ادب و انشاء عرب جس کی تعلیم بیشتر مدنظر ہے، بقدر کفایت ہم نہ پہنچ سکیں ..... دیوان متنبی اور نفحۃ الیمن کے بارے میں ہے کہ "بالکل بہم نہ ہو سکیں[۵]۔"

اس مایوس کن فضا کو بدلنے میں منشی نولکشور کا بڑا ہاتھ تھا چنانچہ اسی دارالعلوم کی روداد میں تحریر ہے کہ "امداد کتب کی نسبت جو سال گزشتہ لکھا گیا تھا بہت سے اہلِ ہمت نے اس طرف توجہ فرمائی اور بار سال کتب قیمتی و کارآمد مدرسہ کی امداد فرمائی ... بالخصوص منشی نولکشور صاحب مالک چھاپہ خانہ اعظم مقام لکھنؤ اس امر میں زیادہ تر قابل مشکوری ہیں کہ باوجود بعد مسافت، بہت سی کتب کارآمد سے معاونت کی[۶]۔"

اسی طرح دوسری روداد میں ہے کہ "اربابِ مدرسہ نہایت شکرگزار ہیں جناب منشی نولکشور صاحب مالک مطبع اعظم لکھنؤ کے جنھوں نے مثل سابق کمال دریادلی سے کام فرمایا اور چند کتب مفید سے امدادِ مدرسہ میں ہمت فرمائی۔ فہرست ان کی ضمیمہ نمبر ۴ میں مندرج ہے۔ ان میں سے خاص کر نسخۂ قاموس کہ کتب لغت میں بے نظیر ہے اور منشی صاحب نے خاص اپنے مطبع میں اس کتاب کو نہایت خوبی اور صحت سے اس سال طبع فرمایا ہے لائق بیان ہے ..... مدرسہ میں اس سے پہلے کوئی نسخہ اس کتاب کا نہ تھا یہ کتاب ایسی محتاج الیہ ہے کہ ہر مدرس اور طالب علم کو اس کی حاجت رہتی ہے[۷]۔"

مولانا مناظر احسن گیلانی ان مندرجات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ مدت تک دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ وطلبا اپنی دینی وعلمی ضرورتوں کو اسی ایک غیر مسلم کے کتابی عطیہ کی مدد سے پوری کرتے رہے۔ قرآن سمجھتے رہے، حدیثوں کے معنوی مشکلات کو حل کرتے رہے۔ بلکہ حیرت کی بات یہ ہے کہ منشی نولکشور جو اپنے یہاں کی کتابوں سے دارالعلوم کی ہر سال امداد کرتے تھے اور ان ہی کے مطبع سے ایک روزنامہ اودھ اخبار نکلتا تھا جو غالباً ہندوستان کا پہلا روزنامہ تھا۔ منشی نولکشور کی طرف سے یہ اخبار بھی مدرسہ دارالعلوم میں آتا تھا[5]

دارالعلوم کی روداد میں اس کے بارے میں لکھا گیا کہ "جناب منشی نولکشور مالک مطبع اودھ اخبار لکھنؤ اور جناب راؤ امراؤ سنگھ مالک اخبار [illegible] بالخصوص باوجود دونوں صاحب اہل ہنود سے ہیں مگر آفریں صد ہزار آفریں ان کی سخاوت اور عنایت پر کہ اپنے اپنے اخبارات گرانبہا اس مدرسہ کو مفت عنایت فرماتے ہیں۔ جملہ ارباب تحویل مدرسہ بذات دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں... اور سب [illegible] کے حق میں اور ان کے اخبارات کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ ان کے اخبارات اور کاروبار تجارت کو دمبدم ترقی عطا فرمائے۔ ان کی قوت دل آزادی کو قائم رکھے۔"[6]

قومی یک جہتی کے لیے ہمسایوں اور ہم وطنوں کے جذبات وخیالات کا احترام اور اس سلسلے میں مروت ومدارات ایک ضروری چیز ہے اور شرافت وانسانیت کا تقاضا بھی۔ چنانچہ ہم اس معیار پر بھی منشی نولکشور کو پورا اترتے دیکھتے ہیں۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ قرآن مجید کی کتابت سے لے کر طباعت واشاعت تک کے تمام مرحلوں میں وہ قرآن پاک کی عظمت وتقدیس کو پوری طرح ملحوظ رکھتے تھے اور کاتبوں سے لے کر پریس کے عملہ تک کو اس سلسلے میں ہدایات دے رکھی تھیں اور عملے کے غسل و وضو تک کی تاکید کرتے تھے۔ قرآن مجید کی پلیٹوں کو ادب کے خیال سے گومتی ندی میں دھلواتے تھے۔ ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے پیش نظر صرف کاروبار نہ تھا بلکہ ان کا مقصد اسلامی ومشرقی علوم وفنون اور ثقافت کی مخلصانہ خدمت اور اس طرح قومی اتحاد تھا۔ میرا یقین ہے کہ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں میں منشی نولکشور جیسی علم دوست، انسانیت نواز، بے تعصب، روادار، فراخ دل وبلند ہمت اشخاص کی کثرت ہوتی تو آج ہندو مسلم اتحاد کی راہ میں کوئی خلیج حائل نہ ہوتی، فرقہ وارانہ عصبیت کی دیوار نہ ہوتی اور اس طرح برصغیر کی تاریخ مختلف ہوتی۔ اے کاش ہم میں بہت سے نولکشور ہوتے!



حواشی

[1] ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ، نولکشور نمبر، ص ۱۳۱۔ [2] روداد دارالعلوم، دیوبند ۱۲۸۴ھ، ص ۲۔ [3] روداد ۱۲۸۷ھ، ص ۳ [4] روداد ۱۲۸۹ھ، ص ۵۔ [5] سوانح قاسمی ۲/ ۱۳۱۔ [6] روداد ۱۲۹۴ھ، ص ۶۳ بحوالہ سوانح قاسمی ۲/ ۳۱۶۔

اودھ اخبار اپنے عہد کی ادبی، تمدنی، معاشرتی اور سیاسی تاریخ کی مستند اور باوقار دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں اس عہد کے ایسے نادر واقعات ملتے ہیں جن سے موجودہ تاریخیں خالی ہیں۔

——— امداد صابری

منشی نول کشور

بسنت کمار بسنت

وہ جس کے دم سے ہے تابندہ کائناتِ ادب
وہ جس کے نام سے پائندہ ہے حیاتِ ادب
وہ جس کے فن سے ہوا [illegible] ذاتِ ادب
وہ شخصیت کہ جو تھی حاملِ صفاتِ ادب
ادب کی راہ میں شمعیں نئی جلاتا رہا
ادب کے چرخ پہ سورج سا جگمگاتا رہا

کہاں گہر وہ گیا وہ کہاں دُرِ نایاب
سلام روح کو اس کی اُسے ہزار آداب
کہاں وہ باغِ ادب کا حسیں شگفتہ گلاب
کہاں وہ عرشِ بریں کا ہے مہرِ عالم تاب
وہ جس کے دم سے درخشاں ہے آج اردو ادب
ہے اس کی ذات سے روشن سراج اردو ادب

حیات اردو ادب پر نثار کر کے رہا
لہو سے دشت ادب لالہ زار کر کے رہا
زبان اردو کو جو پائیدار کر کے رہا
نوائے وقت کو جو سازگار کر کے رہا
زمیں سے تا بہ فلک ڈھونڈھ کر نہ پایا کہیں
نول کشور سا وہ محسنِ ادب ہی نہیں

باغبانِ علم و فن و ادب

سعید تابش

اے کہ تو تھا ناشرِ [illegible] مذہب کی کتب
خادمِ قرآن و سنت، [illegible] بائبل
لوحِ پیشانی پہ تیری نورِ حکمت تھا عیاں
تجھ کو زیبا تھا خطابِ دلبرِ [illegible]
باعثِ نازِ وطن تھا، ترجمانِ [illegible] تھا تو
آسمانِ زندگی کا کوکبِ [illegible] تھا تو

تیری ہر کوشش میں پنہاں اک نئی تعمیر تھی
تجھ سے وابستہ تیرے [illegible] کی توقیر تھی
تیرے ہاتھوں میں عزت قوم کی تقدیر تھی
ذاتِ پاکیزہ تری اخلاص کی تصویر تھی
بحرِ اخلاق و محبت کا دُرِ یکتا تھا تو
رونقِ بزمِ گلستاں تھا گلِ رعنا تھا تو

ہر پریشاں حال کا غم خوار و ہمدم تھا تو
دردمندوں کے لیے تسکین کا مرہم تھا تو
جو بجھائے تشنگی پھولوں کی وہ شبنم تھا تو
ناز ہے جنت کو جس پر ہاں وہی آدم تھا تو
ہیں تری خدماتِ علمی فی الحقیقت بے بہا
تیرے دم سے نام ملک و قوم کا روشن ہوا

ڈاکٹر نیر مسعود

منشی نول کشور [illegible]

"تواریخ نادر العصر" کے آئینے میں

منشی نول کشور کو اردو کے عظیم ترین ناشر کی حیثیت سے شہرت حاصل ہے لیکن ان کی تالیف "تاریخ نادر العصر" انھیں اودھ کے ایک اہم مورخ کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔

تخمیناً چالیس ہزار الفاظ پر مشتمل "تواریخ نادر العصر" منشی نول کشور نے بہت مختصر وقت میں لکھ ڈالی تھی۔ اس کتاب کی شان نزول یہ ہے کہ سن اٹھارہ سو ستاون کی شورش کے بعد منشی نول کشور پنجاب سے آگرے اور وہاں سے سن اٹھارہ سو اٹھاون کے آخر میں لکھنؤ پہنچے۔ اس زمانے میں کرنل سانڈرس الکسن ایبٹ ہوشیارپور پنجاب کی ڈپٹی کمشنری سے تبادلہ ہو کر لکھنؤ کے کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ مقرر ہو گئے تھے۔ پنجاب میں منشی نول کشور کے مطبع کو حسن کارکردگی کی بدولت شہرت اور حکام کی قدردانی حاصل تھی۔ لکھنؤ میں انھوں نے کرنل ایبٹ سے ملاقات کی اور انھیں کی عنایت سے وسائل کی کمی کے باوجود کلکتے سے چھپائی کے "اسباب و آلات" لکھنؤ لا کر یہاں مطبع قائم کیا جسے روز بروز ترقی ہوتی گئی۔ سن اٹھارہ سو ترسٹھ میں کرنل ایبٹ نے پانچ سال تک لکھنؤ میں رہنے کے بعد پندرہ مہینے کی رخصت لے کر ولایت جانے کا فیصلہ کیا۔ عمائد لکھنؤ نے اس سلسلے میں اسی سال سہ شنبہ چوبیس مارچ کو چھتر منزل لکھنؤ میں ایک الوداعی تقریب منعقد کر کے کرنل کو سپاسنامہ پیش کیا۔ منشی نول کشور نے بھی "موقع مناسب سمجھ کر ہفتے عشرے کے اندر" یہ کتاب "تالیفات قدیمہ سے انتخاب کر کے اور کچھ اپنی یادداشت سے بڑھا کر" تیار کی اور کرنل ایبٹ کی خدمت میں یادگار کے طور پر بخش کی۔[1]

کتاب کے سرورق کی نقل حسب ذیل ہے:

تحفہ کرنیل ایبٹ

TOHFA COLONEL ABBOTT

یعنی واسطے یادگار نام نامی جناب کرنیل سانڈرس الکسن ایبٹ صاحب بہادر کمشنر لکھنؤ کے منشی نول کشور پروپرائٹر مطبع نے مختصر کیفیات ہند و تواریخ اودھ تا عہد واجد علی شاہ مسمیٰ بہ

تاریخ نادر العصر نام تاریخی ۱۸۶۳ء

مع حالات و تعمیرات شاہی و نقشہ خاص شہر لکھنؤ مرتبہ کرنیل صاحب معتمد الیہ جس سے محلے محلے کے حدود اور بعد مسافت سڑکوں اور عمارات کا باہم دریافت ہو بعجلت تمام واسطے پیشکش صاحب معتمد الیہ کے تالیف و ترتیب کیا مقام لکھنؤ میں۔

کارگزاران مطبع منشی نول کشور مولف نسخہ ہذا کے اہتمام سے چھپا

۱۸۶۳ء

اس کتاب کے مشتملات کی فہرست حسب ذیل ہے:

(۱) ذکر حالات کرنیل صاحب (۲) کرنیل صاحب کا ولایت جانا (۳) شکریہ روسا و عمائد شہر (۴) جواب شکریہ از جانب کمشنر صاحب (۵) مضامین تمہیدیہ شکریہ والا صفات صاحب موصوف (۶) قصائد و اشعار (۷) ابتدائے عالم (۸) ہندوستان کے ہندو راجوں کا سلسلہ (۹) علم کا بیان (۱۰) ہنود کے مذہب کا طریق (۱۱) ہند کا حال (۱۲) ہند کے باشندوں کا ذکر (۱۳) جدول مدنیات ہند (۱۴) شاہان اسلام (۱۵) جدول حال اور تخت نشینان از عہد تیمور تا بہادر شاہ ظفر (۱۶) تسلط سرکار کمپنی انگلشیہ کا بیان (۱۷) غدر کا حال (۱۸) ذکر عہد دولت

۱۔ "تواریخ نادر العصر" مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۸۶۳ء (ابتدائیہ)

اس فہرست کو دیکھ کر خیال ہو سکتا ہے کہ یہ کتاب پورے ہندستان کی تاریخ ہوگی، لیکن دراصل یہ اودھ کی تاریخ ہے جس کی ابتدا میں ہندستان کی عمومی تاریخ پس منظر کے طور پر ابتدائی تینتیس صفحوں میں بہت اجمال کے ساتھ بیان کر دی گئی ہے۔ باقی ایک سو چالیس صفحے اودھ کی تاریخ سے مخصوص ہیں۔

"تواریخ نادر العصر" ایک انگریز حاکم کو پیش کرنے کے لیے لکھی گئی تھی اس لیے اس کے مؤلف سے یہ توقع نہیں کرنا چاہیے کہ وہ انگریزوں کی مصلحت اور مزاج کے خلاف کچھ لکھے گا۔ تاہم اودھ کے حکمرانوں کے بارے میں منشی نول کشور کا رویہ سراسر غیر ہمدردانہ نہیں ہے۔ وہ انگریزوں کو بہر حال خوش کرنے کی کوشش میں مصروف نظر نہیں آتے اور برموقع موقع سے اودھ کے حکمرانوں کی تعریف بھی کر دیتے ہیں۔ مثلاً:

نواب سعادت علی خاں: "فراست اور دانائی میں ارسطوئے وقت تھے۔ نواب سعادت علی خاں برہان الملک سے واجد علی شاہ تک ایسا بیدار مغز، عالی ہمت عقیل کوئی صاحب مسند و تخت نہیں ہوا[2]"

غازی الدین حیدر: "یہ بادشاہ بھی بہت نیک تھا، عادل اور منصف اور سخی کمال تھا"

نصیر الدین حیدر: "اگرچہ یہ حد سے نازک مزاج تھا لیکن سخی و قدردان تھا ۔ ۔ ۔ اس کے عہد سلطنت میں خاص صفتیں یہ تھیں کہ اہل تجارت کو نفع ہوا۔ آمدنی بھی نہیں رکی، ملک بھی آباد رہا۔ رعب سلطنت و داب سیاست بھی بہت تھا"

محمد علی شاہ: "اس بادشاہ نے خوب سرانجام جز و کل امور سلطنت کا کیا، اس وجہ سے کہ تربیت یافتہ نواب سعادت علی خاں کے تھے، مُسن اور کار آزمودہ تھے ۔ ۔ ۔ ۔ انتظام وزارت ملک کا بھی بحسن الوجوہ ظہور میں آیا۔ آمدنی کا بھی انتظام ہوا زر کثیر اپنے عہد سلطنت میں جمع کیا اور باوجود ضعف و پیری اور کثرت امراض کے ہر جزو کل کار سلطنت کا خود کرتے تھے اس بادشاہ کے وقت میں صورت برہمی کار سلطنت مبدّل بہ خوش اسلوبی ہوئی خلاصہ یہ ہے کہ بادشاہ بہت نیک نیت تھا، کسی کام خیر کے انتظام دینے میں بند نہ تھا"

واجد علی شاہ: "چند اوصاف اس بادشاہ کے قابل ذکر بھی ہیں۔ (۱) گو یہ بادشاہ اس قدر عیاش تھا مگر ۔ ۔ ۔ سب عورتیں نکاحی اور متاعی تھیں۔ بے اس کے کسی عورت نامحرم سے اس بادشاہ نے مقاربت نہ کی اور نہ کسی کو جبر سے بیگم بنایا (۲) اس کثرت عیش و عشرت اور عالم جوانی اور سلطنت پر نماز پنجگانہ میں سے کوئی نماز قضا نہیں ہوئی۔ یہ حکم رہا اور اب بھی ہے

۱ تواریخ نادر العصر ص ۸۰، ۲ ایضاً ص ۹۰

کہ اگر صبح ہوتے بھی ہم سو جائیں تو بھی زبردستی
بے خوف و خطر اور بے پاس ادب جگا دینا
چنانچہ ایسا ہی ہوتا ہے اور کبھی نماز اور
تلاوت قضا اور ترک نہیں ہوتی ہے۔ این کار از
تو آید و مردان چنیں کنند (۳) یہ بادشاہ اس
قدر رحم دل اور رقیق القلب ہے کہ باوجود
اس قدرتِ سلطنت اور زور و زر کے
اس سنِ شباب میں کسی پر طیش اور بے
رحمی نہیں کی بلکہ گالی تک بھی زبان پر
نہیں آئی، نہ کسی موافق اور مخالف کو ظلم سے
ستایا، نہ کسی کی جان لی۵۔ باوجود اس سلطنت
اور جاہ و حشمت اور شباب کے اس
بادشاہ میں غرور و نخوت جس سے ہزاروں
میں بھی کوئی امیر خالی نہیں ہوتا، نام
کو نہ تھا۔ مگر یہ دولت پرستی مست نہ گردی
مردی .... یہ بادشاہ عادل تھا۔ کسی
موافق اور مخالف یا امیر یا رگانے کی عدل
میں رعایت نہیں کی ۶؎"

منشی نول کشور نے اودھ کی یہ تاریخ اگرچہ عجلت میں اور اختصار کے ساتھ لکھی ہے لیکن ان کی کتاب اہم معلومات اور دلچسپ واقعات سے خالی نہیں ہے۔ مثلاً امجد علی شاہ کے عہد کا ایک واقعہ وہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

"سچ ہے یہ شہر لکھنؤ چراغ شبستانِ ہند کا تھا اور جو
سامان امارت یہاں اس آخری وقت میں تھا وہ کسی ریاست
میں نہ ہوگا۔ ایک حال یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ ۱۲۶۲ھ کو انھیں
(امجد علی شاہ) کے عہد سلطنت میں نواب صمصام الدولہ بہادر
فرخ آباد کے نواب لکھنؤ میں واسطے ملاقاتِ بادشاہ کے آئے
حسن باغ میں جو کہ عمارت عمدہ اور باغ پُر فضا تھا۔ اس میں
حسبِ حکم شاہی فروکش ہوئے...... اور دوسرے دن بادشاہ
کی ملاقات کو گئے۔ بطریق تحفہ ایک تھالی جو ظرف آب خورہ
سنگِ یشب کے مرصع کار مطلّا بہت عمدہ اور بہتر لے گئے تھے اور
اپنے نزدیک اس کو نایابِ زمانہ جانتے تھے، بادشاہ کو دیا، بادشاہ
نے بھی بپاسِ خاطر ان کے بہت خوش اور محظوظ ہو کر اس کو
قبول کیا اور تعریفیں بہت زبانِ مبارک پر آئیں۔ یہاں دستور
یہ تھا کہ جس رئیس سے بادشاہ ملاقات کرتے تھے، روزِ اول
باہم رسم تحفہ و تحائف ادا ہوتی تھی۔ عطر دان اور کشتی وغیرہ موافق
رسم کے دی جاتی تھیں۔ دوسرے روز سامان دعوت کا ہوتا تھا، آیا
میں خواہ انگریز ہو خواہ ہندوستانی۔ چنانچہ نواب مسبوق الذکر
کی تین دعوتیں قرار پائیں اور دوسرے ہی دن سے مقرر
ہوئیں۔ اور یہاں کی شان و شوکت اور انداز دعوت چائے
پانی یا بڑے کھانے کا یہ تھا کہ ایک عالیشان مکان میں کہ وہ سب
طرح شیشہ آلات وغیرہ سے آراستہ ہوتا تھا، اس میں تیس
گز کا لانبا اور بارہ گز کا چوڑا میز بچھتا تھا، اس کے گرد
ایک سو پندرہ کرسی بچھتی تھی۔ اس پر بادشاہ اور اعزۂ بادشاہ
اور کارپرداز تمام اور ریزیڈنٹ بہادر مع صاحبانِ عالی شان جلوہ
افروز ہوتے تھے۔ قصہ کوتاہ اسی میز پر روز دعوت اول تمام
برتن مع چنگیر و گلدان و حوض و فوارہ سب سنگ یشب کے
مرصع کار، مطلّا، جواہر نگار تھے۔ اور کھانوں کا کیا وصف بیان
ہو کہ بادشاہی خاصہ تھا، وہ نواب اور سب حکام عالی شان
یہ سامان دیکھ کر متحیر تھے۔

دوسرے دن دوسرے مکان میں سامان ضیافت کا مہیا
ہوا۔ اس میں بھی اسی قدر میز پر جملہ برتن اسی انداز سے جواہر نگار
سنگِ یشب کے صورت میں اور طرح کے لگائے گئے،
تیسرے دن بھی اسی قدر سامان اتنی ہی بڑی میز پر سب

۴؎ تاریخ اودھ ص۔ ۹ ۵؎ ایضاً ص ۱۰۱ ۶؎ ایضاً ص ۱۰۸، ۱۰۹ ۷؎ ایضاً ص ۱۲۴، ۱۲۵

برتن اسی مقدار پر اور روز دل سے نہایت تحفہ، عمدہ، خوب صورت، باریک کار، جواہر نگار سنگِ یشب کے مہیا تھے۔ نواب ممدوح یہ سامان دیکھ کر اپنے دل میں سخت محجوب اور شرمندہ ہوتے تھے۔ شانِ خدا کو یاد کرتے تھے۔

حاصل کلام بعد برخاست چائے پانی اور کھانے اور بعد رخصت نواب ممدوح کے امجد علی شاہ بادشاہ ...... مجد الدولہ بہادر مہتمم خزانہ کو شطحات سے بوجہ اس حسنِ انتظام کے نہایت خوش اور محظوظ ہوئے اور زبان مبارک سے بہت تعریفیں کیں۔ خلعتِ گراں بہا سے مخلع فرمایا۔ اس وقت مجد الدولہ بہادر نے دست بستہ ہو کر عرض کیا کہ غلام اقبال بادشاہ تئیس دن تک کا اقرار کرتا ہے کہ اگر حکم ہو تو اسی طرح کے ہر روز سنگِ یشب کے برتن طرح طرح کے صورت میں نئے لگایا کرے۔ اس عرض بیان پر دوسرا خلعت ان کے رتبے سے کہیں زیادہ جلدوے دیانت دامانت...... میں عنایت ہوا[1]"

اسی بیان کے ذیل میں حسن باغ کے متعلق نول کشور نے یہ معلومات فراہم کی ہے:

"وہ باغ خاص اسی واسطے مقرر تھا کہ جب رئیس اور امیر جلیل القدر کی خاندانِ شاہی میں سے کبھی شادی ہوتی تھی اس کو یہ باغ عنایت ہوتا تھا۔ چنانچہ شادی مرزا نصیر الدین حیدر بادشاہ کی اور مرزا عالی جاہ اور مرزا والا جاہ پسران دلیر الدولہ ولد مرزا حیدر نیشاپوری کی بھی اس میں سرانجام پذیر ہوئی تھی۔ اکثر اسی طرح خاندان کو عنایت ہوتا تھا۔ اور رئیس تازہ وارد بھی اسی میں اتارا جاتا تھا، چنانچہ گارن صاحب بہادر سوداگر جاگیردار کوڑیا کاس گنج کے بھی زمانہ نصیر الدین حیدر میں وارد شہر ہوئے ان کو بھی بسبب اعزاز واقتدار کے بذریعہ پرچہ پیام میجر جان لو صاحب بہادر کے یہ باغ عنایت ہوا تھا۔[2]"

تاریخ واقعات کے اختتام کے بعد منشی نول کشور نے لکھنؤ کی مندرجۂ ذیل تعمیروں کا حال لکھا ہے:

"کوٹھی بیبا پور، کوٹھی دل کشا، ولایتی باغ، الماس گنج، ہزر گنگ، کوٹھی حیات بخش دار الشفاء، بیگم کوٹھی، کنکر والی کوٹھی، کوٹھی نور بخش، بادشاہ منزل، چینی بازار، شیر والی کوٹھی، امام باڑہ سبطین آباد، سکندر باغ، قدم رسول، شاہ نجف، تعمیرات موتی محل، مبارک منزل، شاہ منزل، خورشید منزل، تارے والی کوٹھی، میدان، قیصر باغ، چینی باغ، حضرت باغ، چاندی والی بارہ دری، چولکھی، لکھی دروازہ، قیصر پسند، جلو خانہ، شیر دروازہ، مقبرۂ سعادت علی خاں، مقبرۂ مرشد زادی، چھتر منزل، کوٹھی فرحت بخش، نصیر السلطان، رزیڈنسی، پل آہنی، پل پختہ، مچھی بھون، رنگ محل، پنج محلہ، بڑا امام باڑہ، جامع مسجد، رومی دروازہ، دولت خانہ، امام باڑہ حسین آباد، تالاب، گھنٹہ گھر حسین آباد، موسیٰ باغ، چوک، اکبری دروازہ، کاظمین، کربلائے دیانت الدولہ، درگاہ حضرت عباسؑ، ملکہ زمانیہ کا امام باڑہ، دینگفیلڈ منزل۔

"شہر لکھنؤ کے باشندوں کا حال" کتاب کا آخری باب ہے اور اسی باب کے اقتباس دے کر ہم "تواریخ نادر العصر" کے اس تعارف کو ختم کرتے ہیں:

"بڑا خاندان شاہی ہے۔ اگلے نواب اور بادشاہوں کی نسل سے ان کے پوتے اور نواسے اور بیگمات وغیرہ بکثرت ہیں۔ سب کا علیٰ قدر مراتب وثیقہ ہے۔ عیش و عشرت سے گزران کرتے ہیں

شاہِ دہلی کی نسل سے اولاد جہاں دار شاہ و میرزا سلیم سے بھی یہاں چند شاہزادے ہیں اسی سرکار سے ان کو وثیقے اور پنشن سے قوت لایموت ملتا ہے۔

---

[1] تواریخ نادر العصر ص ۱۱۴- ۱۱۹ [2] ایضاً ص ۱۱۴، ۱۸۱

عزیزان برہان الملک سعادت خاں سے شاہزادہ ہائے نیشاپوری کا بھی عالی خاندان ہے۔ ان کے وثیقے بھی اچھے اچھے ہیں۔ سب چین کرتے ہیں، مگر بعض بے چاروں کا وثیقہ غدر کی جیقلش میں بند ہوگیا۔ اس سے یک لخت فقیر ہوگئے، مقام افسوس ہے و عبرت۔

ان کے سوا امرائے شاہی ہیں جن کی نسل اور واسطہ دار بھی اکثر وثیقہ دار اور صاحب معاش نوٹ وغیرہ سے خوش گزران ہیں۔ اس میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔

سوا ان کے ہندو مسلمان سوداگر، تاجر، مہاجن بھی کروڑپتی لکھ پتی سے لے کر ہزار پتی تک اکثر ہیں اور سب کا اچھی گزر، بہ نسبت عہد شاہی کے روزگار ان کا سست اور معاش واجبی ہے، مگر غنیمت۔

بعد ان کے لوگ روزگار پیشہ ہیں جو اسی شہر یا بیرونجات اور اور ملک میں روزگار کر کر بسر اوقات کرتے ہیں۔

علم کی کثرت، ملا فاضل، اکثر عربی فارسی کا درس، اور علم یہاں کا مشہور، اور طبیب بکثرت، اور یہ شہر علم کی ٹکسال، ہر علم و فن کا آدمی یہاں ہے اور طبیعت داروزی کی۔ خوش نویس بھی ہر خط کے مثل علی، حافظ خوش، ارکان ایک سے ایک اعلیٰ۔

پھر اہل حرفہ ...... ہر قسم کے دست کار، صناع، چابک سبک دست، ہر کام میں کماکھاتے ہیں۔ اور بہ نسبت اور شہروں کے یہاں کے صناع غنیمت۔

اسی طرح دوکاندار بھی، کہ وہ بھی ایک فرقہ ہے.....

اس شہر کا جوتا اور کلاہ، زری دکار، چوب دکام دانی اور خمیرہ تمباکو اور زیور مرصع اور زیور، ظروف طلا و نقرہ، کمہار و نقاشی و آتش باز و چکن ساز عمدہ سے عمدہ مشہور دیار و امصار و دساور ہے۔ دور دور مال جاتا ہے۔ مگر بہ نسبت عہد شاہی کے یہ سب کام اب کم ہے۔ صرف بھی کم ہے۔

ہندو مسلمان کے میلے بارہ مہینے اس شہر میں بکثرت اور دھوم سے ہوتے رہتے ہیں۔ ....عیش باغ اور علی گنج اور سورج کنڈ کا میلا بھی مشہور ہے۔

واجد علی شاہ کے جانے سے ہزاروں آدمی اور اکثر امرا اور وزیر و بیگمات بھی ان کے ساتھ کلکتے چلے گئے، اس لیے رونق شہر کی بالکل کم ہے۔

..... مرد یہاں کے تماشابین، عیاش، تن پرور، خوش باش اکثر ہیں.... مگر اس پر بھی جس قدر خیرات اور علم یہاں ہے اور جگہ کم ہے۔ ہزاروں ان میں حاجی ہیں جو کربلا اور حج ہو آئے ہیں اور ہر سال صدہا ہزارہا آدمی کا قافلہ جاتا ہے۔

موسم یہاں کے سب غنیمت مگر برسات میں فضا اور سبزہ زیادہ خوش نما ہوتا ہے اور ہوا دل چسپ۔ شہر کی آب و ہوا ذرا اچھی نہیں، پانی بھی کھاری ہے۔ جا بجا نشیب و فراز نالے، مگر اب صفائی ہوتی جاتی ہے۔ قرب دریا سے سفید پوشی زیادہ ہے.....

ہندو مسلمان میں یہاں شادی دھوم سے کرتے ہیں۔ روشنی، آتش بازی، تخت آرائش، ناچ، تماشا، محفل تکلف اور سامان سے ہوتی ہے۔ برات بھی اپنے اور مستعار سامان سے دھوم سے لے جاتے ہیں۔ لڑکی کی طرف سے مقدور بھر جہیز بھی دیا جاتا ہے اور اس کو اپنی نیک نامی جانتے ہیں۔ ہندو کی برات سے قبل سوگی نام سامانِ ترک مع تختِ آرائش وغیرہ اٹھتا ہے، وہ زیادہ تر قابل دید ہے۔ عجیب عجیب کھلونے میوے، تصاویر، مکان وغیرہ ہو بہو اصل جیسے ہوتے ہیں....

افیون اور پان کا رواج زیادہ ہے اور رنگین پوشی کا بھی، اسی لیے رنگ ریز اور حقے والے اور تنبولی کی دکان اکثر ہیں، کوئی بازار اور کوچہ اور محلہ خالی نہیں۔

اس شہر کی ساقن مشہور ہیں اور اکثر ہر محلے میں ان کا ایک بازار ہی علیحدہ ہوتا ہے۔ ساقن ایک عورت ہے جو بن سنور کر دکان حقہ و بنگ و چرس و گانجا لگاتی ہے گاتی بجاتی بھی ہے۔ تکلف سے دکان کرتی ہے۔ اکثر بازاری بانکے اور افیونی حقے باز اس کی دکان پر حقہ افیون وغیرہ کھاتے

پیتے ہیں ۔ اس کو ایک پیسے سے روپیہ تک دیتے ہیں ان میں آگے پچاس پچاس ہزار، لاکھ لاکھ تک کی ذی مقدور بھی تھیں ۔ اب بھی سو پچاس سے پانچ سات ہزار تک کی صاحب مقدور بہت ہیں ان کے لباس و زیور اور انداز پر اجنبی آدمی یہی جانے کہ یہ بھی کوئی بیگم صاحب ہیں۔

بڑے بڑے عالی شان مکانات اور محلات و محلے و بازار کھد گئے ۔ اب بھی جا بجا بازار بہت ہیں ، مگر چوک کا نکڑا ذرا زیادہ رونق کا ہے ۔ ہر قسم کے دکاندار ، جوہری ، بزاز ، دوشالہ فروش ، جفت فروش ، صرّاف ، ہنڈی والے ، سوداگر ، نان پز ، حلوائی ، عطر فروش ، گل فروش ، سبزہ فروش وغیرہ قسم قسم کے تکلف سے بیٹھتے ہیں ..... چار بجے سے شام تک خوب گرم بازاری اور رونق و کثرت رہتی ہے۔ شہر کے امیر و غریب بھی اکثر سیر کو آتے ہیں ....

سر بازار اکثر اور یوں بھی قوم طوائف اکثر رہتی ہیں ان کے ٹھاٹھ اور زیور و پوشاک کا تکلف بیگمات سے کم نہیں ۔ گانا بجانا ، بتانا یہاں کا ہندمیں ضرب المثل ہے ،

..... ان کا مجرا سات روپے سے بیس روپے تک ہے۔ ان میں اکثر لکھو تیا ہیں ۔ سوا اس کے خانگیاں بے شمار .....

شہر میں مسلمان اکثر ، ہندو ان سے کم ، مگر باہم اتفاق و سلوک و رسم ..... ہندو عورات کی وضع خاص ہوتی ہے مگر مسلمان مرد اور ہندو مرد کی وضع لباس سب یکساں ہے ۔ داڑھی منڈانے کا رسم علی العموم اور داڑھی رکھنا معیوب ہے ۔ نفاست ، نزاکت ، خوش خوری ، خوش پوشی ، مکلف مکان اور دھوم شادی اور فضول خرچی میں یہ لکھنؤ ہند میں انگشت نما گویا ہند کا پیرس فرانس ہے ـــــ"



منشی نولکشور نے دنیا کی سب سے زیادہ ضخیم کتاب "طلسم ہوش ربا" شائع کی تھی جو بہت بڑے سائز کے ۱۸ ہزار صفحات پر مشتمل ہے ۔

سید نجم الدین نقوی

منشی نولکشور



"صحیفۂ زریں" ایک نہایت ضخیم کتاب ہے جو ۱۹۰۲ء میں نولکشور پریس سے شائع کی گئی۔ اس کتاب کے مرتب و مہتمم نولکشور کے فرزند پراگ نرائن بھارگو تھے جنھیں "فروغ اردو" (لکھنؤ) کے نولکشور نمبر میں منشی نولکشور کا بھتیجا اور متبنیٰ کہا گیا ہے۔ اس کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ منشی نولکشور لاولد تھے اس لیے انھوں نے اپنے بھتیجے کو گود لے لیا تھا ہو سکتا ہے کہ یہ بات درست ہو۔ مگر خود پراگ نرائن بھارگو نے "صحیفۂ زرّیں" کا جو دیباچہ اردو اور انگریزی زبانوں میں لکھا ہے اس میں انھوں نے نولکشور کو اپنا والد بتایا ہے۔ لکھا ہے کہ مجھ سے لوگوں نے کہا کہ میں اپنے اور اپنے والد کے حالات بھی اس کتاب میں شامل کر دوں مگر میں نے اپنی حد تک اسے قبول نہیں کیا۔ البتہ والد کے حالات کتاب کے آخر میں درج کر دیے ہیں۔

"صحیفۂ زرّیں" کی ترتیب تدوین اور اشاعت ایڈورڈ ہفتم کے جشن تاج پوشی کے موقع پر ہوئی تھی۔ یہ جشن وائسرائے ہند لارڈ کرزن نے یکم جنوری ۱۹۰۳ء کو دہلی میں منعقد کیا تھا "صحیفۂ زرّیں" میں اس عہد کے مہاراجگان کے علاوہ اور بہت سے قابلِ ذکر اور ذی وجاہت لوگوں کا بھی ذکر ہے اور ان کے فوٹو بھی شامل ہیں۔ اس میں ایک سو تیرہ "۱۱۳" ایسے والیانِ ریاست کا تذکرہ ہے، جنھیں سلامی دی جاتی تھی۔ تین سو تینتیس "۳۳۳" دوسرے امرا اور رؤسا کا بھی ذکر اس میں شامل ہے۔ اس کتاب میں دو ہزار سے زیادہ ان حضرات کا تعارف کرایا گیا ہے جو کسی نہ کسی حیثیت سے قابلِ ذکر تھے اور اس کتاب میں ان تینتیس "۳۳" رئیسوں کے نام مع پتہ درج ہیں جنھوں نے مالی تعاون دیا تھا اور ہر ایک کے نام کے سامنے زرِ تعاون بھی لکھ دیا گیا ہے۔ زرِ تعاون کی میزان لگ بھگ دو ہزار سات سو پینتالیس (۲۷۴۵) روپے ہوتی ہے۔ اس زمانے میں کاغذ کی قیمت، کتابت کی اجرت اور اشاعت کی لاگت بہت کم تھی۔

اس لیے قیاس یہ کہتا ہے کہ یہ رقم کتاب کو منظرِ عام پر لانے کے لیے کافی رہی ہوگی بلکہ کچھ بچ گئی ہوگی۔ پھر بھی اسے اس کاوش اور خلوص کا معاوضہ ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا جو مرتب نے اس کی تدوین و ترتیب و اشاعت میں صرف کیا۔ کتاب منشی نول کشور کے قائم کردہ پیپر مل میں بنے ہوئے کاغذ پر چھپی ہے، اور مشہور عالم رضا لائبریری میں موجود و محفوظ ہے۔ اکھتر برس گزر جانے کے بعد بھی اس کی پائداری قائم ہے اور سوادِ خط نہایت روشن ہے۔ اس میں مولانا عرشی جیسے لائق مہتمم کتاب خانہ کی نگرانی اور دیکھ ریکھ کو بھی بڑا دخل ہے۔ کتاب کے دیباچے میں ایک ایسی حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے جس کے بیان سے اردو والوں کو بے انتہا مسرت ہوگی۔ ۱۹۰۲ء میں سارے ملک میں اردو کی ہر دل عزیزی اور اس کے اثر و نفوذ کا عالم خود بھارگو کی مندرجہ ذیل عبارت میں ملاحظہ ہو:

"...AND IN ORDER TO SECURE A LARGER PUBLIC, I HAVE COMPILED IT IN URDU WHICH IS ADMITTEDLY THE LINGUA FRANCA OF INDIA."

اس بیان کو اس حیثیت سے مت دیکھیے کہ یہ ایک غیر مسلم کے قلم سے

نکلا ہے بلکہ اس لحاظ سے دیکھیے کہ یہ بات ایک پبلشر کہہ رہا ہے جسے کتاب کی زیادہ سے زیادہ اشاعت عزیز ہے۔

"فروغ اردو" کے نولکشور نمبر میں بعض لوگوں نے نولکشور کا مولد ریڑھا (ضلع متھرا) بتایا ہے۔ مگر صحیفۂ زریں میں بستولی، ضلع علی گڑھ تحریر ہے۔ ظاہر ہے کہ اسی کو صحیح ماننا پڑے گا۔ کیونکہ یہ تحریر اُن کے جانشین اور متبنٰی فرزند کی ہے۔ اس لیے اگر نولکشور کے اخلاف بعد کو کوئی ایسا بیان دیتے ہیں جس سے نولکشور کی زاد بوم بدلتی ہے تو وہ قابل پسند نہیں ہو سکتا۔

"صحیفۂ زریں" میں نولکشور کا سنہ وفات ۱۸۹۵ء درج ہے۔ تاریخ ولادت نہیں دی گئی۔ بعد کے بیانات میں تاریخ اور دن دونوں کو متعین کر دیا گیا ہے یعنی یکشنبہ ۳، جنوری ۱۸۳۶ء۔

تعجب ہے کہ پراگ نرائن نے سنہ وفات تو درج کر دیا مگر تاریخ اور دن مقرر نہ کر سکے، حالانکہ یہ کام ان کے لیے بہت آسان تھا کیونکہ وہ ۱۵ برس کی عمر میں اپنے والد کی زندگی میں ہوش مند ہو چکے تھے ـــــ ایسے ہونہار نولکشور کی وفات کے صرف سات برس بعد "صحیفۂ زریں" جیسی وقیع و مستند کتاب پیش کر سکے، ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے بھی اپنی مشہور کتاب "تاریخ ادب اردو" میں بستولی، ضلع علی گڑھ ہی کو منشی صاحب کا مولد بتایا ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کتاب لکھتے وقت "صحیفۂ زریں" ان کے پیش نظر تھی، اس لیے کہ نولکشور کے حالات اور کارناموں کے تذکرے بیشتر اسی کتاب کے مندرجات پر مشتمل ہیں۔

"صحیفۂ زریں" کے مطابق نولکشور نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، پھر آگرہ چلے گئے اور عمر کی سولہویں منزل میں کالج چھوڑ کر آگرہ سے ایک اخبار نکالا۔ بہت بعد کے مضامین میں کالج کا نام آگرہ کالج بتایا گیا ہے۔ یہ کالج پنڈت گنگا دھر شاستری نے ۱۸۲۳ء یا ۱۸۲۵ء میں اپنی بہت بڑی جائداد کا ٹرسٹ بنا کر سنسکرت کی تعلیم کے لیے قائم کیا تھا۔ یہ کالج آج بھی موجود ہے اور مشہور و ممتاز ہے۔ اب یہاں علوم جدیدہ کی بھی تعلیم ہوتی ہے بہت بعد کے بیان میں ایک جگہ کہا گیا ہے کہ منشی نول کشور آگرہ کے ایک اخبار "سفیر" میں مضامین شائع کراتے رہے اور پھر لاہور چلے گئے جہاں انھوں نے "کوہ نور" اخبار کا کام سنبھالا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ نول کشور کے والد نے ایک دن اُن سے کہا کہ وہ دنیا میں کوئی کام نہ کر سکیں گے۔ اس پر وہ ناراض ہو کر بلا اطلاع لاہور چلے گئے۔ "صحیفۂ زریں" میں نہ تو "سفیر" آگرہ میں مضامین شائع کرانے کا تذکرہ ہے اور نہ والد کی سرزنش پر دفعتاً لاہور جانے کا ذکر۔ اس لیے یہ دونوں باتیں معتبر نہیں ہو سکتیں اور یہی ماننا پڑے گا کہ آگرہ میں منشی نول کشور نے خود اخبار نکالا اور بعد میں ان کی صحافتی اور انتظامی شہرت نے انھیں "کوہ نور" لاہور تک پہنچایا۔

منشی جی کا بستولی سے آگرہ جانا، وہاں سے لاہور کا سفر اور پھر ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد لکھنؤ آ کر مطبع قائم کرنا، ہزاروں کتابیں شائع کر کے ملک کے طول و عرض اور بیرون ملک بھیجنا، لکھنؤ میں پیپر مل قائم کرنا، مختلف اسکولوں اور کالجوں کی امداد دینا، تعلیمی اداروں سے متعلق رہنا، گورنمنٹ سے خطاب پانا، پبلک میں بے حد مقبول ہونا، وغیرہ وغیرہ تمام امور تفصیل سے مختلف لوگوں نے اپنے مضامین میں بیان کر دیے ہیں اس لیے انھیں دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ البتہ ایک بات جو بار بار لکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ منشی نولکشور ان لوگوں میں شامل تھے جنھوں نے انڈین نیشنل کانگریس، منعقدہ بمبئی میں ۱۸۸۵ء میں شرکت کی تھی۔ تاریخ تحریک آزادی ان لوگوں کو ہمیشہ فخر سے یاد کرے گی جو شراب حب وطن سے سرشار ہو کر اس اجلاس میں شریک ہوئے تھے جس نے قومی تحریک کے کارواں کو جادہ پیما کیا تھا۔ اگر منشی جی خالص تجارتی ذہن کے انسان ہوتے تو انھوں نے کاروباری مفاد کو ذہن میں رکھ انگریزوں کی خوشنودی کے لیے اس اجلاس میں شرکت کرنے سے گریز کیا ہوتا۔

سنا ہے کہ جب سر جان ہسٹن، سابق گورنر یو-پی، خان بہادر شیخ احمد حسین خاں مرحوم، رئیس پریاواں، ضلع پرتاب گڑھ کی دعوت پر مع لیڈی ہسٹن پریاواں گئے تو خان بہادر کے سمدھی سید اکبر حسین اکبر الٰہ آبادی نے ایک شعر کہا تھا:

بگاڑیں لاٹ صاحب یہ شیخ ایسے نہیں کچے
مرتجا دیکھتے ہیں اس طرف کھیوٹ ادھر نیچے

مگر منشی نول کشور نے اس کا مطلق خیال نہیں کیا کہ لاٹ صاحب سے بگڑ سکتی ہے اور ان کے کاروبار کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ مطبع نول کشور سنہ ۱۸۵۸ء کے غدر کے بعد قائم ہوا تھا اور صرف ستائیس برس کی مدت میں منشی صاحب کی محنتِ شاقہ، قوتِ ارادی اور غیر معمولی انتظامی صلاحیت کی بدولت سنہ ۱۸۸۵ء میں وہ جس منزل پر پہنچ گیا اس کا اندازہ ایک امریکن کی رپورٹ سے ہوتا ہے جس نے سنہ ۱۸۸۵ء میں مطبع کو دیکھا تھا اور امریکہ پہنچ کر کسی اخبار میں اس کے بارے میں لکھا تھا۔ اس رپورٹ کا اردو ترجمہ "صحیفۂ زرّیں" میں دیا گیا ہے جو درج ذیل ہے:

"— ہندستان کے باشندے جلد از جلد مغربی طریقے اختیار کرتے جاتے ہیں اور قدیم مذاہب کے بیدار کرنے والوں میں ایک منشی نول کشور کا چھاپہ خانہ ہے۔ اس مطبع سے تمام جزیرہ نمائے ہندستان کو کتابیں جاتی ہیں۔ منشی نول کشور ایک عالی دماغ اور بلند حوصلہ شخص اور پبلشر کی حیثیت سے بالکل بے تعصب ہیں اور گو ان کے مطبع میں اسلامی مذہبی کتابیں بہت کثرت سے طبع ہوتی ہیں لیکن وہ برہمنوں اور بدھ مت والوں کی کتابیں اسی مستعدی سے شائع کرتے ہیں جس مستعدی سے اسلامی کتب اور رسالے چھاپتے اور کم قیمت پر فروخت کرتے ہیں۔ مطبع منشی نول کشور حضرت گنج کے متعلق بے شمار عمارتیں ہیں جو ایک وسیع رقبے کو گھیرے ہوئے ہیں، اور صدہا آدمی ہر طرف اپنے اپنے کاموں میں مصروف نظر آتے ہیں۔ مطبع میں نہ صرف ہندستان بلکہ ترکی، افغانستان، عرب اور یورپ سے فرمائشیں آتی ہیں۔ اس مطبع کا رقبہ اس قدر بڑا ہے کہ یورپ میں اس کی قیمت پانچ لاکھ ڈالر سے کم نہ ہوتی۔ منشی نولکشور ایک ایسے ہوشیار شخص ہیں کہ ولایت سے ٹائپ نہیں منگاتے بلکہ حروف ڈھالنے کا ایک ایسا کرتب سیکھ لیا ہے کہ خود تیار کرا لیتے ہیں۔ اس بڑے کارخانے کا بہت بڑا کام پتھروں سے ہوتا ہے۔ پریسوں کے چلنے کے متعدد کمرے ہیں۔ میں نے ایک کمرے میں اکسٹھ پریس شمار کیے جو ہاتھوں سے چلائے جاتے تھے، اور ہر شخص کو اپنے کام میں مصروف پایا۔ پتھروں کی تعداد بے شمار تھی۔ ان کے چالان جرمن وغیرہ سے برابر چلے آتے ہیں۔ الیائٹ وانع پیرس کے کارخانے کی طرح کارخانہ نول کشور میں تالیف و تصنیف کا بہت بڑا کام کارخانے کے اندر ہی ہوتا ہے۔ اس کارخانے کا گودام عجائبات میں ہے۔ اس مطبع میں بارہ سو آدمی سے کم نہیں۔"

اس رپورٹ سے واضح ہوتا ہے کہ سنہ ۱۸۸۴ء تک مطبع کا کام ہاتھ کے پریسوں سے ہوتا تھا۔ اس کے بعد پھر بڑی بڑی مشینیں آئیں۔

رام بابو سکسینہ نے اپنی تاریخ ادب اردو میں منشی نولکشور کے متعلق لکھا ہے کہ جب ان کا انتقال ہوا تو انھوں نے جو جائداد اور کاروبار چھوڑا اس کی مالیت ایک کروڑ کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ منشی صاحب کا انتقال ۱۹ر فروری ۱۸۹۵ء میں ہوا۔ مطبع ۱۸۵۸ کے لگ بھگ قائم ہوا۔ سینتیس (۳۷) برس کی قلیل مدت میں کتنی بڑی بزنس ہوئی اور منشی جی نے محنت کا کتنا بڑا معجزہ پیش کیا، یہ سوچ کر حیرانی ہوتی ہے۔

منشی نول کشور کی دلچسپیاں محض کاروباری زندگی تک محدود نہ تھیں۔ وہ علم دوست، عالم شناس اور ارباب کمال کے شیدائی تھے۔ اسی لیے تو ان کے مطبع میں ہر علم و فن کے صاحبانِ کمال جمع ہو گئے تھے۔ ان کی فہرست طویل ہے اور "صحیفۂ زریں" میں دیکھی جا سکتی ہے۔

منشی نولکشور کے روابط مرزا غالب مرحوم سے بھی تھے چنانچہ منشی جی کے نام غالب کا ایک خط اردو میں اور ایک فارسی میں موجود ہے۔ غالب نے اپنے بعض خطوط میں جو دوسروں کو لکھے ہیں منشی نولکشور کا تذکرہ کیا ہے۔ اس طرح کا ایک خط نواب لوہارو کے نام اور ایک مرزا تفتہ کے نام ہے۔

(باقی صفحہ ۱۸۹ پر)

ڈاکٹر سرو قیوم خاں

منشی نول کشور

"اودھ ریویو" کے آئینہ میں

منشی نول کشور علوم مشرقیہ کے ایک نامور محسن تھے۔ انھوں نے انیسویں صدی میں علم ودانش کی جو شمع جلائی تھی اس سے ساری دنیا جگمگا اٹھی۔ اردو زبان جو ابھی اپنی ارتقائی منزلوں سے گزر رہی تھی مشہور زمانہ "نول کشور پریس" کی بدولت دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگی۔ ان کے "اودھ اخبار" کو اردو صحافت میں ایک اہم تاریخی مقام حاصل ہے۔ منشی جی نے "اودھ اخبار" کے علاوہ اردو میں ایک ہفتہ وار پرچہ "تفریح" بھی جاری کیا تھا اور اپنے انتقال سے کچھ ہی روز پہلے "ماہنامہ اودھ ریویو" کے نام سے ایک ادبی رسالہ جاری کیا تھا جس میں ناول، ناٹک، قصہ، لطائف وظرائف، شعروسخن، سوانح عمریاں، علمی واخلاقی مضامین، مہینہ بھر کے واقعات اور خبریں، اخبارات اور کتابوں پر تبصرے شائع ہوتے تھے۔ اس رسالہ کا پہلا شمارہ منشی جی کی وفات سے ایک ماہ قبل جنوری ۱۸۹۵ء میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹ فروری ۱۸۹۵ء کو منشی جی کی وفات ہوگئی اور یہ پرچہ ان کے بعد عرصہ تک جاری رہا۔ اس کے بعد بند ہوگیا۔ منشی رام جی داس بھارگو اس رسالہ کے اڈیٹر اور منیجر تھے۔ اس رسالہ کے ذریعہ منشی جی نے اردو کے قارئین کو ٹائپ سے بھی روشناس کرانے کی کوشش کی تھی کیونکہ پہلے شمارہ کا ٹائیٹل ٹائپ میں چھپا ہوا ہے۔

منشی نول کشور کے حالات زندگی پر مشتمل ایک مضمون ان کی وفات کے بعد منشی رام جی داس بھارگو اڈیٹر "اودھ ریویو" نے لکھا تھا جو ماہنامہ "اودھ ریویو" بابت فروری ۱۸۹۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کی اہمیت اس اعتبار سے اور زیادہ ہے کہ اس کے لکھنے والے منشی جی کے ہم عصر اور ان کے عملہ کے ایک ذمہ دار فرد تھے اور وہ مضمون اسی ماہ شائع ہوا جس ماہ ان کا انتقال ہوا تھا۔ اس مضمون سے ڈاکٹر نورالحسن صاحب ہاشمی (سابق صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی) کے اس اشتباہ کا ازالہ بھی ہوجاتا ہے جسے انھوں نے منشی جی کے سال ولادت کے بارے میں ظاہر کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کے نزدیک منشی جی کا سال ولادت ۱۸۲۵ء ہے اور ان کی معلومات کا ذریعہ "ایک نادر روزنامچہ" کے مؤلف مولوی مظہر علی سندیلوی مرحوم کا بیان ہے جنھوں نے منشی جی کی وفات پر لکھا ہے کہ "عمر متوفی ۶۹ سال تھی"۔ اس حساب سے سال ولادت ۱۸۲۶ء ٹھہرتا ہے۔ لیکن "اودھ ریویو" میں شائع شدہ مضمون سے سال ولادت ۱۸۳۶ء ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس حساب سے ۱۹ فروری ۱۸۹۵ء کو وفات کے وقت منشی جی کی عمر ۵۹ سال نکلتی ہے۔ سطور ذیل میں "اودھ ریویو" میں شائع شدہ مضمون بجنسہٖ پیش کیا جارہا ہے۔ اس کے مطالعہ سے منشی جی کی سوجھ بوجھ حوصلہ مندی بے تعصبی اور رفاہ عام سے ان کی دلچسپیوں کا بھی اندازہ ہوگا:

"منشی نول کشور صاحب سی، آئی، ای کا زاد بوم "بستوئی" ضلع علی گڑھ ہے۔ آپ ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ جد والا تبار رائے بال مکند صاحب ایک خاندانی رئیس اور آگرہ میں ضلع کے خزانچی تھے۔ رائے صاحب نے اضلاع آگرہ اور متھرا میں بہت سی زمینداری مول لی تھی، لیکن انقلاب زمانہ سے اب صرف چند گاؤں باقی رہ گئے ہیں۔ منشی صاحب کے والد کا نام جمنا پرشاد ہے۔

منشی جمنا پرشاد کے پانچ بیٹے تھے اور ان میں منشی نول کشور صاحب دوسرے بیٹے تھے ۔ منشی صاحب نے ابتدائی تعلیم وطن میں پائی تھی اور اس کی تکمیل "آگرہ کالج" میں کی تھی۔ آپ بڑے ذہین اور طباع تھے ۔ آپ کو اخبار اور کتب بینی کا شوق آگرہ میں ہوا تھا۔ آپ نے سولھویں سال کالج چھوڑا اور ایک اخبار نکالا ۔

منشی ہر سکھ رائے، صاحب مالک "کوہ نور" کو مطبع کے کاموں کے لئے ایک شخص کی ضرورت ہوئی۔ انھوں نے اپنے برادر مکرم رائے لکھن لال صاحب سابق سب جج کو جو اُن دنوں آگرہ کے منصف تھے، تحریر کیا کہ کسی لائق شخص کو اس کام کے لیے بھیج دیجیے ۔ رائے لکھن لال صاحب نے منشی صاحب کو لاہور بھیجا ۔ منشی صاحب نے تھوڑے عرصہ تک "مطبع کوہ نور" کی ملازمت کی ۔ اس کے بعد وہ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد لکھنؤ آئے ۔

منشی ہر سکھ رائے صاحب کو ان کی لاثانی خدمات بہت پسند آئیں۔ وہ اپنے خطوط میں ہمیشہ منشی نول کشور کو "عزیز من، جان من" لکھا کرتے تھے ۔

منشی صاحب نے ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ میں اپنا ذاتی مطبع جاری کیا۔ ان کے مُربی کرنل ایبٹ صاحب کمشنر لکھنؤ تھے اور انھیں کی تحریک سے منشی صاحب اجرائے مطبع پر آمادہ ہوئے ۔ اول اول منشی صاحب نے چند پریس اور پتھر مول لیے اور آغا میر کی سرائے میں ایک مکان کرایہ کا لے کر مطبع قائم کیا ۔

تجارتی کاروبار میں اکثر مالی دقتیں پیش آتی ہیں، چنانچہ منشی جی کو بھی انھیں دقتوں سے متواتر سامنا پڑا مگر آپ بڑے صاحب اقبال اور اولوالعزم تھے کبھی کسی مشکل سے پریشان نہیں ہوئے ۔

منشی صاحب نے پہلے "پٹواریوں کی پیمائش" کی کتاب چھاپی ۔ پھر ۱۸۶۰ء میں "قانون تعزیرات ہند" چھاپنے کو ملا ۔ اس کتاب کی تیس ہزار جلدیں گورنمنٹ نے خرید لیں ۔ اُس وقت یہ کتاب تین روپے کو فروخت ہوئی تھی ۔ اس زمانہ سے منشی صاحب نے مطبع کو عروج و فروغ دینا شروع کیا ۔

چند روز بعد مطبع نول کشور آغا میر ڈیوڑھی سے گولہ گنج میں منتقل ہوا اور وہاں سے راجہ مان سنگھ والئ اجودھیا کی خاص کوٹھی میں اٹھ آیا ۔ مہاراجہ مان سنگھ صاحب بھی آپ کی بڑی قدر و منزلت فرماتے تھے ۔ ۱۸۷۰ء میں منشی صاحب نے حضرت گنج میں ایک وسیع احاطہ مول لیا جس میں کئی عمارتیں پہلے سے موجود تھیں اور کئی منشی صاحب نے اپنی ضرورت کے مطابق خود بنوائیں ۔ اب مطبع اسی احاطہ میں ہے ۔ ابتدا ہی سے حکام والامقام مطبع کے کام سے خوش تھے ۔ چنانچہ مسٹر ونگفیلڈ صاحب نے جو ۱۸۶۱ء میں اودھ کے چیف کمشنر تھے، ایک چٹھی میں تحریر فرمایا ہے ۔

"منشی نول کشور مالک مطبع ہندوستانی لائق و معزز شخص ہیں اور صوبہ اودھ میں یہی ایک عمدہ مطبع ہے جس کا کُل انتظام معقول اور پسندیدہ ہے ۔"

منشی صاحب سرکاری کاموں کے ساتھ پرائیویٹ کاموں کو بھی ترقی دیتے جاتے تھے ۔ آپ نے اردو فارسی اور عربی کی بہت سی کتابیں طبع کیں ۔ ابتداءً اُن کی فروخت صرف اودھ تک محدود تھی مگر آپ کی اولوالعزمی سے یہ کام ملک کے بڑے بڑے شہروں مثلاً کلکتہ، بمبئی اور لاہور وغیرہ میں پھیل گیا ۔

منشی صاحب تاجروں کے ساتھ خاص رعایتیں ملحوظ رکھتے تھے ورآپ کا برتاؤ ایسا پسندیدہ تھا کہ کوئی تاجر مایوس نہیں ہوتا تھا اور چونکہ اُن دنوں ویلو پے ایبل (V.P.) کا طریقہ جاری نہ تھا اور کتابیں اس قدر عجلت سے تیار نہیں ہو سکتی تھیں جس طرح ان دنوں مشینوں کے ذریعہ ہوتی ہیں، اس لیے اکثر تجار کلکتہ اور لاہور وغیرہ کے بڑے بڑے معاملے کرتے تھے اور ایک عرصہ دراز تک مطبع میں پڑے رہتے تھے ۔ اور جب کتب مطلوبہ چھپ کر تیار ہو جاتی تھیں، اپنا مال اپنے ہمراہ لے کر جاتے تھے ۔ منشی صاحب ہر تاجر کی خواہ بڑا ہو یا چھوٹا یکساں عزت کرتے تھے اور جب تک وہ قیام کرتے تھے اُن کے آرام و آسائش کا معقول انتظام کرتے تھے ۔ منشی صاحب کے عروج کا یہ دوسرا سبب تھا ۔

منشی صاحب کے مزاج میں بڑی فیاضی تھی ۔ آپ نے جب سے پبلک زندگی شروع کی، اپنے کو ملک کا خادم سمجھا ۔ رفاہ عام کا ایسا کوئی کام نہیں ہوتا جس میں آپ شریک نہ ہوتے اور اس میں کچھ نہ کچھ

مدد نہ دی ہو۔

۱۸۶۱ء کے قحط میں منشی نول کشور صاحب نے قحط زدوں کی امداد میں نہ صرف خود چندہ دیا بلکہ عظمائے ملک سے اس قدر چندہ دلوایا کہ گورنمنٹ اور رعیت دونوں کی خوشنودی کا بہت بڑا سبب ہوا۔ منشی صاحب ہر شخص کے کام میں شریک ہوتے تھے اور جس قسم کی مدد درکار ہوتی تھی اس کے دینے میں انکار نہ تھا اور ہر مذہب اور ملت کے لوگوں میں منشی صاحب بہت ہر دل عزیز تھے۔ اور یہ منشی صاحب کی ترقی کا تیسرا سبب تھا۔ دنیا میں نیک نامی حاصل کرنے کے لیے صرف تین چیزوں کی ضرورت ہے: فیاضی، خوش اخلاقی اور بے تعصبی۔ منشی صاحب میں یہ تینوں چیزیں بدرجہ کمال موجود تھیں۔

منشی صاحب بڑے علم دوست، ہنر شناس اور قدردان تھے۔ آپ نے اپنے مطبع میں ایسے ایسے لائق مصنف، مفسر، مولف، کاپی نویس، پریس مین اور منتظم بڑی بڑی تنخواہوں پر ملازم رکھے جو ہندوستان میں اپنا نظیر نہیں رکھتے۔ منشی صاحب نے لائق مترجموں کی خدمات بھی حاصل کیں اور ایسی ایسی دقیق اور بڑی بڑی کتابوں کے ترجمے شائع کیے جن کا شائع کرنا کسی معمولی شخص کا کام نہیں تھا۔

۱۸۷۲ء میں نول کشور پریس میں ایک امریکی سیاح آئے تھے۔ اس زمانہ میں مطبع کے کاروبار میں ایسی ترقی نہ تھی، تاہم سیاح مذکور کی تحریر سے ترقی کا کچھ اشارہ پایا جاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ :۔

"ہندوستان کے دیسی باشندے جلد جلد مغربی طریقے اختیار کرتے جاتے ہیں اور قدیم مذاہب کے بیدار کرنے والوں میں ایک منشی نول کشور کا چھاپا خانہ ہے۔ اس مطبع سے جزیرہ نمائے ہندوستان کو کتابیں جاتی ہیں۔ نول کشور ایک لائق شخص ہے اور پبلشر کی حیثیت سے بالکل بے تعصب ہے۔ وہ ایک بڑا مالی دماغ اور پُر حوصلہ شخص ہے، اور گو اُس کے مطبع میں اسلامی مذہبی کتابیں بہت کثرت سے طبع ہوتی ہیں لیکن وہ برہمنوں اور بدھ مت والوں کی کتابیں ایسی مستعدی سے شائع کرتا ہے جس مستعدی سے اسلامی کتابیں اور رسالے چھاپتا ہے، اور کم قیمت پر فروخت کرتا ہے۔ چھاپا خانہ نول کشور حضرت گنج میں واقع ہے۔ چھاپا خانہ کی عمارتیں بے شمار ہیں۔ یہ کل عمارتیں ایک بڑے رقبہ کو گھیرے ہوئے ہیں اور صدہا آدمی ہر طرف اپنے اپنے کاموں میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اس مطبع میں نہ صرف ہندوستان، بلکہ ٹرکی، افغانستان، عرب اور یورپ سے فرمائشیں آتی ہیں۔ اس مطبع کا رقبہ اس قدر بڑا ہے کہ یورپ میں اس کی قیمت پانچ لاکھ ڈالر سے کم نہ ہوگی (ڈالر ڈھائی روپے کا ہوتا ہے۔ ایڈیٹر)۔ اس میں بالغ اور کم سن لڑکے بہ تعداد کثیر زمین کے فرش پر کام کرتے ہیں۔ کشور ایسا ہوشیار اور چالاک ہے کہ ولایت سے ٹائپ نہیں منگواتا بلکہ حروف ڈھالنے کا ایسا کرتب سیکھ لیا ہے۔ پریسوں کے چلنے کے بہت کمرے ہیں۔ ایک کمرے کے پریسوں کو میں نے شمار کیا۔ اس میں اکتیس تھے جو ہاتھوں سے چلائے جاتے تھے۔ یہ کمرہ پریسوں اور آدمیوں سے ایسا کھچا کھچ بھرا ہوا تھا کہ اس میں حرکت کرنا محال تھا اور دم گھٹا جاتا تھا۔ لیکن ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر تھا اور اپنے کام سے اس کو غرض تھی۔ پتھروں کی تعداد بے شمار ہے اور ان کے چالان جرمن وغیرہ سے برابر چلے آتے ہیں۔ کارخانہ کشور میں تالیف اور تصنیف کا بہت سا کام اندر ہی ہوتا ہے اور اگر اس کی کوئی نظیر میں نے دیکھی ہے تو اطباعین کے کارخانہ واقع پیرس میں دیکھی ہے، جہاں مصنف بھی اسی جگہ کام کرتے ہیں جہاں چھپائی کے متعلق کام ہوتے ہیں۔ کارخانہ کشور کا گودام عجائبات عالم سے ہے۔ اس میں غیر مجلد کتابیں زمین کے فرش پر بڑی لمبی لمبی قطاروں میں چھت تک چنی ہوئی ہیں۔ مجھ کو یہ امر فروگذاشت نہ کرنا چاہیے کہ علاوہ کتب اور رسائل کے یہ کارخانہ ایک روزنامہ اخبار بھی شائع کرتا ہے۔ کشور کے مطبع میں جو لوگ بہ حیثیت پریس مین، جلد بند، ساہی، محافظ، منشی، کلرک وغیرہ کے کام کرتے ہیں، ان کی تعداد ایک ہزار دو سو سے کم نہ ہوگی۔"

پریس اور پتھر سیاح صاحب کے اس بیان سے منشی نول کشور کی عظمت کا اندازہ ہو سکتا ہے، مگر یہ بیان ۱۸۷۲ء کا تھا، جس کو گیارہ برس ہوئے۔ اس اثنا میں منشی صاحب نے اپنی علو ہمتی سے مطبع میں بہت سی مفید اصلاحیں کی ہیں۔ پہلے بہت سا کام دستی پریسوں سے ہوتا تھا اور اب بھی ہاتھ کے پریسوں سے ہوتا ہے، لیکن ان کے علاوہ بیس بڑی مشینیں ہیں۔ جو انجن سے چلتی ہیں۔ ایک دستی پریس ایک دن میں ایک ہزار دو سو کاغذ

طبع کرسکتا ہے لیکن یہ مشینیں ایک گھنٹہ میں ایک ہزار داب چھاپتی ہیں۔

چسپیدہ پتھر مطبع میں اکیس ہزار پتھر ہیں اور بہت سی کتابیں، میلاد، قرآن وغیرہ جو ایسے خوش نویسوں کی لکھی ہوئی تھیں جن کی ہندوستان میں کیا ساری دنیا میں نظیر ملنا مشکل ہے، سنگ چسپیدہ رکھی ہوئی ہیں اور اتنی ہزار ہا پتھر پھنسا پڑا ہے۔ کتابوں کا سنگ چسپیدہ رکھنا منشی نول کشور صاحب ہی کا کام تھا اور ہندوستان میں درکنار دنیا میں کوئی مطبع نہ ہوگا جس میں سنگ چسپیدہ کتابیں ہوں گی۔

اودھ اخبار منشی صاحب کے مطبع سے روزانہ "اودھ اخبار" شائع ہوتا ہے۔ اس اخبار کو جاری ہوئے بتیس برس ہوئے اور جو ناموری اور شہرت اس نے حاصل کی یا جس عزت اور وقار کی نظر سے وہ دیکھا جاتا ہے دنیا آج ہندوستان میں کوئی اردو اخبار نہیں ہے۔ صوبہ مغربی و شمالی اودھ میں صرف "اودھ اخبار" ہی پہلا روزنامہ ہے اور اس کے خریدار اور سرپرست بڑے عالی وقار اور معزز اشخاص ہیں۔ منشی صاحب کے مطبع کی شاخیں کانپور، لاہور، پٹیالہ اور کپورتھلہ میں ہیں اور ان شاخوں میں کانپور کی شاخ سب سے بڑی ہے۔

مطبع کے ملازموں کی ماہنامہ تنخواہیں اور خرچ ٹکٹ

منشی صاحب کے ملازموں کی ماہواری تنخواہ تقریباً پندرہ ہزار روپے ہے اور کئی سو روپے ماہوار ضعیف ملازموں اور بیواؤں کو پنشن ملتی ہے۔ مطبع میں پندرہ ہزار روپے سے زائد کا کاغذ ہر مہینہ میں صرف ہوتا ہے اور مطبع کے متعلق ایک خاص ڈاک خانہ ہے جو مطبع اودھ اخبار کے نام سے موسوم ہے۔ مطبع میں ٹکٹ ڈاک کا اندازہ خرچ پچاس ہزار روپے سالانہ ہے۔

تعداد مطبوعات تین ہزار سے زائد کتابیں جن میں تقریباً دو ہزار پانچ سو اصل اور پانچ سو ترجمے ہیں۔ غرض یہ کہ صرف منشی صاحب نے جس قدر مشرقی علوم کو ترقی دی اتنی دنیا کے پردہ میں کسی شخص نے نہیں دی۔

مذہبی کتابیں جس قدر منشی صاحب کے مطبع سے مذہبی کتب کی اشاعت ہوئی وہ کسی اور ذریعہ سے نہیں ہوئی۔ منشی صاحب نے اپنی فیاضی اور علو ہمتی سے کئی قسم کے قرآن اور ان کی تفسیریں اور ترجمے شائع کیے اور ان کو اس قدر ارزاں نرخ پر فروخت کیا کہ ہر گھر میں کئی کئی قرآن دکھائی دیتے ہیں اور ہر شخص اپنے دین سے واقف ہوگیا اور ہوتا جاتا ہے۔

منشی صاحب نے صرف قرآن شریف ہی نہیں بلکہ ہزاروں کتابیں شائع کیں جو نادر الوجود تھیں اور ایک دن معدوم ہو جاتیں۔ جس طرح منشی صاحب نے اسلامی کتابیں شائع کیں اسی طرح مذہب ہنود کے متعلق "مہابھارت" جیسی بڑی بڑی کتابیں اور ان کے ترجمے شائع کیے اور سارے ملک کو نور علم سے معمور کر دیا۔

رفاہ عام اور منشی نول کشور منشی صاحب نے اپنی حیات میں اڑھائی لاکھ روپے سے زاید خیراتی کاموں میں صرف کیا ہے اور لکھنؤ میں پانچ پانچ سات ہزار کی کئی رقوم کے علاوہ پندرہ پندرہ ہزار روپیہ لیڈی ڈفرن فنڈ اور اٹھارہ ہزار روپیہ جوبلی ہائی اسکول کو دیا۔ آپ اپنی قوم "بھارگو" کے بھی بہت بڑے سرپرست تھے اور آپ کی ذات والا صفات سے قوم کو بڑے بڑے فائدے پہنچے۔

منشی صاحب نے طلبائے قوم کو نہ صرف وظائف سے مدد دی بلکہ بیس ہزار روپیہ کا گاؤں اور کئی ہزار روپیہ عطا کر کے اور قوم کے لوگوں سے کثیر تعداد جمع کرا کے ایک بورڈنگ ہاؤس تعمیر کرایا جو "فنلے بورڈنگ ہاؤس" کہلاتا ہے اور جس کا سر آکلینڈ کالون صاحب نے افتتاح کیا تھا۔ جو طلبہ اس میں رہتے ہیں ان میں اکثر نے بڑی ناموری کے ساتھ امتحانات پاس کیے ہیں۔ منشی صاحب کی فیاضی کی ایک مثال اور بیان کی جاتی ہے اور وہ یہ کہ آپ نے حسب ذیل پبلک کارخانہ کی کل مطبوعات کی ایک ایک جلد جن کی حیثیت مجموعی کئی ہزار روپیہ قیمت کی ہے عطا کیں:-

۱۔ میور کالج۔ الہ آباد
۲۔ کائستھ پاٹھ شالہ، الہ آباد
۳۔ کیننگ کالج، لکھنؤ
۴۔ کارمیکل لائبریری بنارس (۲۔سٹ)
۵۔ پبلک لائبریری، فیض آباد
۶۔ پبلک لائبریری، بریلی
۷۔ بھارگو نیشنل ایسوسی ایشن، متھرا

۸ ۔ بھارگو بورڈنگ ہاؤس، آگرہ
۹ ۔ جلسۂ تہذیب، لکھنؤ (رفاہ عام کلب)
۱۰ ۔ لائبریری جموں وکشمیر، بیادگار مہاراجہ رنبیر سنگھ
۱۱ ۔ لائبریری جے پور بیادگار مہاراجہ رام سنگھ ۔
۱۲ ۔ لائبریری پٹیالہ بیادگار مہیندر سنگھ
۱۳ ۔ پنجاب پبلک لائبریری، لاہور
۱۴ ۔ میوزیم لائبریری لکھنؤ
۱۵ ۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آکسفورڈ یونیورسٹی، آکسفورڈ (بنام مسٹر اسپارکس)

منشی صاحب علاوہ پبلشر کے بڑے ذی حوصلہ تاجر بھی تھے ۔ صرف آپ کی کوششوں سے لکھنؤ میں پیپر مل جاری ہوئی ۔"

مندرجۂ بالا طویل اقتباس سے منشی جی کی ان انتھک کوششوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جو انھوں نے ان عظیم کاموں کو سرانجام دینے میں کی ہوں گی۔ بقول متنبی ؎

علیٰ قدر اھل العزم تاتی العزائم
وتاتی علیٰ قدر الکرام المکارم

منشی جی نے جن اداروں کو مالی اور کتابی امداد دی اسکی فہرست دراصل بہت طویل ہے جس کا ذکر مندرجہ بالا فہرست میں بھی شامل نہیں ہے مثلاً دارالعلوم دیوبند کو نہ صرف عطیۂ کتب دیا بلکہ اودھ اخبار بھی مدرسہ کے نام جاری کیا جس کا ذکر دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کی روداروں میں ملتا ہے ۔ اسی طرح محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کو دس ہزار روپے نقد اور اتنی ہی مالیت کی کتابیں بطور عطیہ دی تھیں۔ ان کی ہمہ جہت ترقی کا راز اس بات میں مضمر تھا کہ وہ ایک طرف اپنے پیشہ میں نہایت انہماک سے کام لیتے تھے ۔ دیانت داری، خوش اخلاقی، محنت اور خلوص ان کے کردار کی نمایاں خصوصیات تھیں ۔

دوسری طرف داد و دہش، امور خیر پر توجہ اور صرف زر کے سلسلہ میں انھوں نے بڑی فراخ دلی، بے تعصبی اور حوصلہ مندی کا ثبوت دیا۔ اگر حکومت کی بہی خواہی میں رقوم بطور چندہ دیں تو قومی کاموں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ ان کا مذہب انسانیت کی اعلیٰ قدروں پر پورا اترتا ہے۔ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، بدھ، جین، سب کے لئے ان کے دل میں گنجائش تھی اور وہ سب کے ساتھ خلوص کا برتاؤ کرتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا نام اب تک زندہ ہے اور آئندہ بھی زندہ رہے گا ۔



حواشی

۱ مضمون بہ عنوان "اودھ ریویو"۔ رسالہ نوائے ادب صفحہ ۲۵ بابت اکتوبر ۱۹۵۰ء از پروفیسر نجیب اشرف ندوی ۲ منشی نولکشور کا سال ولادت ۔ ڈاکٹر ہاشمی مطبوعہ فروغ اردو نولکشور نمبر بابت مارچ ۱۹۶۰ء ۳ ماخوذ از رسالہ "اودھ ریویو" بابت فروری ۱۹۵۰ء از منشی رام جی داس بھارگو۔

منشی نولکشور "صحیفۂ زرّیں" کی روشنی میں (صفحہ ۱۸۴ کا بقیہ)

آخرالذکر خط کا اقتباس مولانا عرشی نے اپنے مرتب کردہ "مکاتیب غالب" (حصۂ خطوط) صفحہ ۲۵ کے فٹ نوٹ میں دیا ہے۔ پورا خط اردوئے معلیٰ میں دیکھا جا سکتا ہے ۱۸۶۵ء میں نواب کلب علی خاں کا جشنِ تاج پوشی منعقد ہوا تھا۔ غالباً اُسی زمانے میں منشی نول کشور نے نواب صاحب مرحوم کو کوئی عرضی بھیجی تھی۔ چنانچہ مرزا غالب، مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں: "منشی نولکشور صاحب کی عرضی پیش ہوئی۔ خلاصہ عرضی کا سُن لیا۔ واسطے منشی صاحب کے کچھ عطیہ بہ تقریب شادی صبیہ تجویز ہوا ہے۔ مقدار مجھ پر نہیں کھلی ۔"

غالب کے اس خط سے یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ منشی نول کشور لاولد نہیں تھے۔ ہاں! یہ ہو سکتا ہے کہ اُن کے کوئی بیٹا نہ رہا ہو اس لیے اپنے بھتیجے پراگ نرائن بھارگو کو گود لے لیا ہو۔



ادارہ

منشی نول کشور



> نول کشور سے متعلق یہ چند قطعات اور بعض نظموں کے اقتباسات ڈاکٹر حنیف نقوی لکچرر شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی کے توسط سے موصول ہوئے ہیں ۔ اس کے لیے ادارہ نیا دور نقوی صاحب کا شکرگزار ہے ۔ ان قطعات اور اقتباسات سے بھی منشی جی کی سیرت و شخصیت اور زندگی کے کئی پہلوؤں کو سمجھنے میں مدد ملے گی ۔
>
> ——— ایڈیٹر

اقتباس از "قطعۂ خاتمہ دیوان فلق (آفتاب الدولہ خواجہ ارشد علی خاں بہادر شمس جنگ عرف خواجہ اسد)

ریختۂ قلم جواہر رقم محمد انوار حسین تسلیم سہوانی"

یہ مطبع کے صاحب کا ہے فیض عام | کہ ہے خاص وہ لطفِ فضلِ الٰہ
وہ ہے مالکِ ملکِ دانشوری | وہ ہے شاہ اقلیم توقیر و جاہ
وہ ہے بحرِ مواجِ فیض و کرم | امیران دونوں کے ہیں بے اشتباہ
کرم میں، عنایت میں، اخلاق میں | وہ مشہور ہے ہند سے تا فراہ
سمجھتے ہیں سر تیغ رایے اسے | جگہ سر پہ دیتے ہیں صاحب کلاہ
ثناگستری اس کی ہاں وہ کرے | کہ ہو علم کی جس کو کچھ دستگاہ
نہ مجھ سا کہ جو جانتا ایک ہو | حسابِ عدد سے سپید و سیاہ

ہر اک اس کا شاعر ہے شیریں مکاں | ہر اک اس کا منشی عطارد پناہ
اسے بات کی اپنی ہے پچ ہر طرح | اسے عہد کا اپنے کرنا نباہ
ہمیشہ ترے دل سے منظور ہے | ندیم و ملازم کی اس کو رفاہ
پڑھوں ایک مطلع دعا میں شتاب | دعا سے مری ہو اجابت کو راہ

خدیو جہانگیر انجم سپاہ
ترے آستانے پہ ہوں دادخواہ

رہے جب تلک چہرۂ کاہ زرد | رہے جب تلک سبز برگِ گیاہ
زمیں پر رہے آسماں جب تلک | رہے جب تلک دل سے معنی کو راہ
سلامت رہے تو قیامت تلک | رہے گرم بخشش تری بارگاہ
تری بزم عشرت میں ناظر ہو شمس | رہے زہرہ محفل میں سرگرم راہ

بڑھیں روز اتنے تری عمر کے   گھٹیں جتنے حسّاد کے سال و ماہ

جو بدخواہ ہو تیرا، اس کے کبھی
نہ ہو کفش پا میں، نہ سر پر کلاہ

(۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۲ء)

"تاریخ وفات دختر منشی نول کشور صاحب مالک مطبع اودھ اخبار بقاعدہ توشیح" از منشی انوار حسین تسلیم سہوانی

دلا سا چاہیئے طبع حزیں کا   نغاں کیسا، موئی گر خورد دختر
خدا دے گا تجھیں نعم البدل میں   خلف خورشید منظر، ماہ پیکر
=۱۲۸۴ھ

(ملخص تسلیم۔ ص ۹۴)

اقتباس از مثنوی "سعدین" مصنفہ منشی محمد انوار حسین تسلیم سہوانی مطبوعہ مطبع نول کشور کانپور

اب میں لکھتا ہوں مدحت آقا   کردہ ہے شکر نعمت مولا
کیمیا آقا کہ ہے وہ لاثانی   قدردانی کا موجد و بانی
اس کا ہر قول لائق تعریف   اس کا ہر فعل قابل توصیف
جود کو اس کے نام پر نازش   لطف کو اس کے کام پر نازش
ذات اس کی ہے منہل انعام   صفت اس کی ہو خاص مرجع عام
آفتاب سپہر دانائی   روشنی چراغ بینائی
درِ یکتائے بحر لطف و کرم   گل نوخیز باغ جود و ہمم
حکمران ولایت اخلاق   شمع پر نور مجلس اشفاق
اس کا اک نکتہ، حکمت لقماں   اس کے جوہر کا اک عرض سحباں
باعث ارجمندی فطرت   سبب سربلندی فطنت
تمکنت اس سے ہو فراست کی   آبرو اس سے ہو کیاست کی
اس نے چمکا دیا مروت کو   زور اس نے دیا فتوت کو
مہر اس کی ہے نکہت گل تر   قہر اس کا ہے شعلۂ آذر
موجۂ بحر چین پیشانی   دست دُر ریز ابر نیسانی
دیکھ کر اس کی گوہر افشانی   پانی پانی ہے ابر نیسانی
صاحب عقل اس کو جانتے ہیں   اور منصف سب اس کو مانتے ہیں
حسن فہمیدگی کو اس سے ملا   وزن سنجیدگی کو اس سے ملا
ہے وہ نام خدا ہزار میں ایک   سچ تو یہ ہے کہ بے شمار میں ایک
خوب صورت، جواں، پری دیدار   مالک مطبع اودھ اخبار
جلوۂ حسن ہے شباب اُس کا   مصرع قد ہے لاجواب اس کا
اُس کا ثانی نہیں زمانے میں   نام یوسف کا ہے فسانے میں
نام نامی نول کشور اس کا   ہفت اقلیم میں ہے شور اس کا
ہر جگہ اس کا کارخانہ ہے   اس اولو العزمی کا ٹھکانا ہے
زور کا اپنے عہد میں رستم   جود میں اپنے وقت کا حاتم
ہیں نے دیکھا نہ مَن چلا ایسا   کون ہے جس کا حوصلا ایسا
عام انعام پر نوازش ہے   پر نوازش کو اس پہ نازش ہے
اُس سے تازہ ہے گلشن تحریر   اُس سے روشن ہے مجلس تحریر
اُس سے سمٹی ہنروروں کی بندھی   اُس کے ناخن سے گانٹھ غم کی کھلی
ناظموں کی اسی سے عزت ہے   ناشروں کی اسی سے شہرت ہے
مجھ سے اس کے ہیں سو ثنا گستر   اُن میں بھی ایک ایک سے بہتر
آبرو پاتے ہیں ستائش گر   ہوتے ہیں نامور نیایش گر
پر کہاں طاقت زبان و قلم   ایک بھی سو سے کر سکوں جو رقم
طوطیٔ آئینہ ہوں حیرت سے   صاف سکتا ہوا ہے عبرت سے

نطق پر اپنے آپ کر کے نظر
میں یہ کہتا ہوں خامشی بہتر

(۱۲۸۷ھ مطابق ۱۸۷۰ء)

اقتباس از قطعۂ تاریخ طباعت "دیوان غافل" طبع زاد مولوی حکیم نیاز احمد خاں صاحب ہوش رئیس بانس بریلی وارد حال لکھنؤ شاگرد منشی مظفر علی صاحب اسیر"

لکھنؤ میں ہے مطبع زیبا   منشیٔ باوقار و دانا کا
روبرو اُن کی عقل و دانش کے   عقل کل کا ہے تذکرہ بےجا
ہے سخاوت میں مثل حاتم کے   جو کسی نے طلب کیا، پایا
جوش دریائے فیض سے اس کے   قطرے پر بھی ہے حکم دریا کا
تھا ازل سے ملا جو ان کو نوال   نام آخر نول کشور ہوا
کس زباں سے ہو اُن کی مدح و ثنا   ناطقہ بند ہے یہاں سب کا
وصف مطبع کا کیا بیاں کیجے   ہے وہ مطبوع طبع شاہ و گدا
دل اہل نظر ہے ہر اک سنگ   جس میں خرم حرف کا دل ہے پتھر کا

زرد کا نی نظر پڑی جس کو — گل صد برگ کا ہوا دھوکا
ورق صاف کی تجلّی سے — ورق آفتاب شرمایا
کاتبوں نے یہاں کے بے تشویش — منشیِ چرخ پر ہے خط کھینچا
جو کہ مطبوع یاں کا نسخہ ہے — نسخہ کیمیا سے وہ ہے سوا

(۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۲ء)

"اشعار در تعریف اودھ اخبار بصنعتِ توشیح" یعنی اگر تمام مصرعوں کے ابتدائی حروف یکجا کر دیے جائیں تو "صاحبِ مطبع" کا نام (منشی نول کشور صاحب) بھی معلوم ہو جائے۔

نتیجۂ فکر محمد سلیمان خاں اسدؔ نبیرۂ نواب محبت خاں محبتؔ و شاگرد اسیرؔ لکھنوی

ممکن نہیں شاعر سے ثنائے اودھ اخبار
نثر ایسی کہ ہو نظم فدا سنے اودھ اخبار
ٹھہرے رہے تا حشر زمانے میں اب اس کا
یارب ہو ترقی پہ بہائے اودھ اخبار
نظارۂ عالم ہو جسے دید سے اس کی
وہ آنکھوں سے پھر کیوں نہ لگائے اودھ اخبار
لکھے زبس اخبارِ دلاویز ہیں اس میں
کیوں سر میں نہ ہو سب کے ہوائے اودھ اخبار
شرماتے ہیں گل ہائے مضامیں سے گلستاں
وہ روپ دکھاتی ہے فضائے اودھ اخبار
رونق اسے آفاق میں ہے جس کی بدولت
صنعت ہی میں نام اس کا جتائے اودھ اخبار

آئینہ صفت صاف جو دیکھو تو اسی میں
حرفِ سرِ مصرع سے دکھائے اودھ اخبار
بس دے نہ اسدؔ طول اب اس کو کہ فزوں ہے
از حدِ بیاں تو ثنائے اودھ اخبار

(ماخوذ از "انتخاب اسدؔ" مطبوعہ مطبع نول کشور دہم ذی قعدہ ۱۲۸۷ھ مطابق یکم فروری ۱۸۷۱ء)

"قطعہ تاریخ صحت جناب منشی نول کشور صاحب" از نواب احمد حسن خاں بہادر عرف اچھے صاحب متخلص بہ جوشؔ نبیرۂ نواب محبت خاں محبتؔ و شاگرد اسیرؔ لکھنوی

مالکِ مطبع اخبارِ اودھ کو امسال
فصلی امراض سے صحت جو ہوئی حاصل
سال تاریخ یہ ہے از سرِ افضال لے جوشؔ
حق تعالیٰ نے عطا کی ہے شفائے کامل ۱۲۸۶+۱=۱۲۸۷ھ

(ماخوذ از "چمنستانِ جوشؔ" مطبوعہ مطبع نول کشور، یکم ذی قعدہ ۱۲۸۷ھ مطابق ۲۳ جنوری ۱۸۷۱ء)

"مثنوی تاریخ تولد فرزند ارجمند منشی نول کشور صاحب"

نتیجۂ فکر مرزا محمد جعفر علی خاں نسیمؔ شاگردِ مومنؔ

زہے طالعِ منشیِ باکرم — ہمایوں نژاد و مبارک شیم
دریں سال فرخندہ و نیک فال — خداداد پورے بآں خوش خصال
بمیلادِ آں اخترِ پرضیا — پئے سال کردم ز دل التجا
چناں در خیالِ حبیب آمدہ — چہ مہرِ درخشاں پدید آمدہ ۱۲ھ

(ماخوذ از "دفترِ شگرف" دیوانِ نسیمؔ)



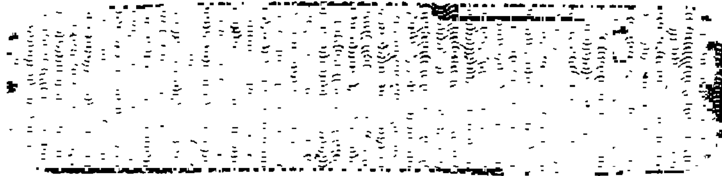
نیا دور کے قلمی معاونین سے

براہ کرم اپنی تخلیقات کے شروع میں یا آخر میں اپنا مکمل پتہ ضرور تحریر فرمائیں۔ غیر طلبیدہ مضمون، افسانہ، غزل یا نظم کی ایک نقل اپنے پاس ضرور محفوظ رکھیں۔ اگر ان کی واپسی چاہتے ہوں تو ساتھ میں ٹکٹ چسپاں لفافہ ضرور ارسال کریں ورنہ ادارہ پر ان کی واپسی کی ذمہ داری نہ ہوگی۔

—— ادارہ

معین اعجاز

منشی نول کشور



مجازؔ مرحوم نے لکھنؤ کو "فردوسِ حسن و عشق" کہا تھا۔ تہذیب کی یہ جنت ہمارے صدیوں کے ثقافتی سرمائے اور مشترکہ کلچر کی امانت دار ہے۔ اس شہر کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ منشی نول کشور جیسی یکتائے روزگار ہستی نے اسے اپنا مسکن اور مرکز بنایا حالانکہ ان کا خاندان علی گڑھ میں آباد تھا جہاں ان کے دادا بال مکند کو مغل بادشاہ کی طرف سے جاگیر عطا ہوئی تھی۔

خودداری، دردمندی، علم دوستی، رواداری اور مہر و محبت۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو انسان کی شخصیت کو نکھارتی ہیں اور یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ منشی نول کشور میں یہ صفات بدرجہ اتم موجود تھیں۔ وہ کس قدر خوددار تھے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ایک بار ان کے والد جمنا پرشاد جی نے صرف اتنا کہا "تم بڑے آرام طلب ہوتے جا رہے ہو۔" تو وہ گھر چھوڑ کر لاہور چلے گئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد منشی جی لکھنؤ آ گئے اور یہیں مطبع نولکشور کی بنیاد رکھی۔

اس مطبع نے علم و ادب، صحافت اور مذاہب کی جو خدمت کی ہے۔ اس سے ہندستان ہی نہیں بلکہ تمام دنیا واقف ہے۔ منشی جی پیدائشی طور پر تو ہندو تھے لیکن دراصل ان کا مذہب انسانیت تھا۔ وہ ہر مذہب کو احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر مذہب کی مقدس کتابوں کو انھوں نے اپنے مطبع سے شائع کیا۔ قرآن مجید، گرنتھ صاحب، بھگوت گیتا اور رامائن جیسی مقدس کتابیں یہاں چھاپی گئیں جنھیں ساری دنیا میں سراہا گیا۔ منشی جی کی ان کوششوں کو "تجارتی" یا "کاروباری مصلحت" سے نہیں تعبیر کیا جا سکتا۔ اس زمانے میں شمالی ہند میں اور بھی بہت سے اہل ثروت اور تاجر تھے لیکن اتنے بڑے پیمانے پر کتنوں نے علم و ادب کی خدمت کی منشی جی کے پریس میں جو کتابیں چھپتی تھیں ان کی نفاست کا کیا عالم تھا۔ یہ مرزا غالب کے الفاظ میں سنیے:

"اس چھاپہ خانہ نے جس کسی کا بھی دیوان چھاپا
ہے۔ اس کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا ہے"

نیک انسان ضرورت مندوں کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ منشی جی پاک دل اور نیک طینت انسان تھے۔ ان کے پاس خدا کا دیا ہوا سب کچھ تھا۔ عزت، شہرت اور دولت نے ان کے قدم چومے تھے اس کے باوجود ان کے یہاں تکبر نہیں بلکہ انکساری تھی۔ ان کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ ضرورت مندوں اور فلاحی اداروں پر خرچ ہوتا تھا۔ یتیموں اور بیواؤں کی مدد وہ بلا تفریق مذہب و ملت کیا کرتے تھے۔ نہ انھیں "ستائش کی تمنا تھی نہ صلے کی پروا"۔ انفرادی طور پر کچھ لوگوں کی جو مدد یا خدمت انھوں نے کی اس کا تو کوئی شمار ہی نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس سے قطع نظر انھوں نے جن اداروں کو گرانقدر عطیات سے نوازا۔ ان میں مختلف تعلیمی اداروں کے علاوہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا نام بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

اپنے دور کے علماء، صاحب فن اور اہل علم کی قدردانی

منشی نول کشور نے جس طرح کی اس کی مثالیں کم از کم ہمارے یہاں بڑی مشکل سے ملتی ہیں کیونکہ ہمارے یہاں عام طور سے فنکار کی خدمات کا اعتراف بعد از مرگ ہی کیا جاتا ہے۔ منشی جی اہلِ علم اور اہلِ فن کی تلاش میں رہتے تھے۔ اپنے مطبع کے اشاعتی کاموں کے لیے انھوں نے ملک بھر کے علما اور اہلِ قلم کی خدمات حاصل کیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ کسی کو اپنے پریس میں نہیں بلاتے تھے بلکہ بہ نفسِ نفیس ان کے یہاں جاتے اور اگر خود نہ جاتے تو اپنے کسی خاص معتمد کو ان کے پاس بھیجتے تھے۔

ان کے دل میں ادیبوں کی کس قدر عزت تھی اس کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ وہ "اودھ اخبار" میں شائع ہونے والے مضامین کے لکھنے والوں کو پابندی سے معاوضہ بھی دیا کرتے تھے۔ معاوضہ دینے کا پہلا کریڈٹ (کم از کم اردو میں) منشی جی کو جاتا ہے۔ "اودھ اخبار" کے توسط سے اردو کو دو بلند پایہ نثر نگار بھی ملے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار اور مولانا عبدالحلیم شرر۔ منشی جی نے جن کی بھی خدمات حاصل کیں اسے منھ مانگا معاوضہ نذر کیا۔ اس کی زندہ مثال "کتھا سرت ساگر" کے ہندی ترجمے کے دیباچے میں موجود ہے۔ مترجم یوں رقمطراز ہے۔

"ہندی زبان کے خیر خواہ بھارگو خاندان کے چشم و چراغ منشی نول کشور نے عالموں کی زبانی اس "کتھا سرت ساگر" نام کے گرنتھ رتن کی تعریف اور سبق آموز کہانیوں کو سن کر اپنی مادری زبان ہندی کی شان دوبالا کرنے کے لیے ہم لوگوں کو منھ مانگا دھن دے کر ان کا ترجمہ کروایا۔"

منشی جی کی یہی اعلیٰ صفات تھیں جن کی وجہ سے ہندستان ہی نہیں بلکہ ہندستان سے باہر بھی ان کا نام بڑے احترام اور ادب سے لیا جاتا تھا۔ بڑی بڑی محفلوں میں اچھے اچھے شہزادوں کو بھی وہ اعزاز نہ مل پایا جو منشی جی کے حصے میں آیا۔ ۱۸۸۵ء کا ایک واقعہ بہت مشہور ہے۔ لدھیانہ میں افغانستان کے بادشاہ امیر عبدالرحمن کے اعزاز میں لفٹننٹ گورنر کی جانب سے ایک دربار منعقد ہوا تھا۔ منشی جی کو شہزادوں سے زیادہ اہمیت دی گئی جس پر کچھ لوگوں نے ناک بھوں چڑھائی بلکہ احتجاج بھی کیا۔ اس پر لفٹننٹ گورنر نے فوراً کہا:

"یہ نامناسب بات ہے کہ جس ہستی کے بارے میں آپ کچھ نہیں جانتے اس پر آپ لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ یہ مشہور منشی نولکشور صاحب ہیں۔"

شاہ افغانستان نے جب ان کا نام سنا تو بڑی محبت سے پیش آئے اور بولے "کیا یہ وہی منشی نول کشور ہیں جنھوں نے جنوبی ایشیا میں علم و ادب کی شمع روشن کی ہے؟ انھیں میرے پاس لے آیئے۔"

جب منشی جی ان کے قریب پہنچے تو بادشاہ تعظیماً کھڑے ہو گئے پھر ان سے یوں مخاطب ہوئے۔

"خدا کا شکر ہے۔ ہم نے آپ کو دیکھ لیا۔ ہندستان میں آکر جو مسرت آپ کو دیکھنے سے ہوئی۔ کسی کام سے نہیں۔"

ایک اور مثال ملاحظہ کیجیے۔ ۱۸۸۶ء میں شہنشاہ ایران بھی ہندستان تشریف لائے۔ کچھ لوگوں نے ان سے تشریف آوری کا سبب دریافت کیا تو انھوں نے کہا "میرے ہندستان آنے کی سب سے بڑی غرض یہ ہے کہ منشی نول کشور اور وائسرائے ہند سے ملاقات کر سکوں۔"

اللہ! کیا عزت اور کیا مرتبہ پایا تھا منشی جی نے! یہ سب کچھ "بزورِ بازو" یا "بزورِ دولت" نہیں حاصل ہوا تھا۔ ان کی علم دوستی، رواداری اور انکساری نے اچھوں اچھوں کا دل جیت لیا تھا۔

دوسرے مذاہب اور ان کی مقدس کتابوں کا احترام کرنا منشی جی کی شخصیت کا ایک جزو لاینفک تھا۔

آج ہمارے ملک میں جمہوری نظام نافذ ہے۔ سیکولرزم ہندستانی قومیت کے ضمیر میں رچ بس گیا ہے نیز کوئی اور نظام یا معاشرہ یہاں کے لیے مناسب ہو بھی نہیں سکتا اور ملک کا یہ مزاج کوئی ایک دو دن میں نہیں بنا ہے۔ ہمارا ملک ہمیشہ رواداری در گذر اور مہر و محبت کی تلقین کرتا رہا ہے لیکن آج

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر



منشی نول کشور

منشی نول کشور دنیائے علم و ادب و صحافت کے ایک ایسے درخشاں ستارے کا نام ہے جس کی شعائیں نہ صرف ہندستان میں پھیلیں بلکہ اس کی تابانی نے تمام ایشیا، اور دنیا کے دوسرے کئی ملکوں میں بھی ہندستانی تہذیب اور ادب کو روشناس کرایا۔ صحافت اور طباعت میں جو موڑ اور منزلیں منشی جی نے طے کیں وہ بعد کی نسلوں کے لیے سنگ میل اور مشعل راہ ثابت ہوئیں۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ انیسویں صدی نے دنیا بھر میں جو عظیم شخصیتیں پیدا کیں ان میں منشی نول کشور کا نام فخر کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ اور یہ تسلیم کرنے میں عار نہیں ہونا چاہیے کہ ہندستان بھر میں منشی جی کے ہم رتبہ چند ہی لوگ یہ صدی دے سکی۔

ہندی، سنسکرت، فارسی، عربی اور خاص طور پر اردو ادب آپ کی خدمات کو فراموش نہیں کر سکتے۔ اگرچہ منشی نول کشور کوئی شاعر، ادیب، فن کار، درویش نہیں تھے مگر وہ ان سب کے اوصاف کا مرکب تھے۔ ان کی جوڑ کا کوئی آدمی ملنا مشکل ہے۔ ان کی شخصیت اپنی محنت، دیانت داری، لگن اور ذہانت کی بنا پر عظمت کی اس بلندی پر پہنچ گئی جسے عروج کی حد سمجھا جا سکتا ہے۔

اپنی زندگی میں منشی جی نے مطبع نول کشور سے چار ہزار کتابیں شائع کیں۔ تقریباً بارہ سو کارکنان اس مطبع میں کام کرتے تھے۔ اس طرح یہ ایشیا کا دوسرا عظیم ترین مطبع بن گیا تھا۔ منشی جی نے دنیا کی سب سے زیادہ ضخیم کتاب "طلسم ہوشربا" شائع کی جو بڑے سائز کے اٹھارہ ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ منشی نول کشور نے دنیا میں پہلے پہل قرآن مجید کی بے نقط تفسیر شائع کی جس کا نام 'سواطع الالہام' ہے۔ منشی جی نے سب سے پہلے عظیم مذہبی گرنتھوں، راماین اور گیتا کے جو سنسکرت میں تھے، ترجمے شائع کیے۔ سکھوں کی مقدس کتاب "گرو گرنتھ صاحب" اور "جنم ساکھی" انھوں نے پہلے پہل چھپوائی۔ اپنشدوں کو شائع کرایا۔ بہت سے اپنے قلمی نسخے اور مخطوطات جو اودھ کے روسا کے کتب خانوں میں محفوظ تھے اور ان میں سے اکثر تو انگلستان کے کتب خانوں میں پہنچ چکے تھے منشی جی نے بڑی محنت اور جستجو کے ساتھ ان کو تلاش کر کے ان کی طباعت اور اشاعت کرائی اور ان کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔ ورنہ ہندستانی ادب بہت بڑے سرمایہ سے محروم رہ جاتا۔ منشی نول کشور نے ایشیا میں پہلی بار "تاریخ طبری" کا فارسی ترجمہ شائع کیا جسے فارسی نثر کی چار قدیم کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے جتنی لغات منشی جی نے اپنے مطبع میں ترتیب دے کر شائع کرائیں ان کی مثالیں کہیں اور نظر نہیں آتیں۔

منشی نول کشور علمی و ادبی مشاغل کے علاوہ سیاسی اور سماجی امور میں بھی سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ ۱۸۸۵ء میں کانگریس کے پہلے اجلاس میں منشی جی نے بڑی اہم خدمات انجام دیں۔ منشی جی دربار اودھ میں ممتاز ترین فرد کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ لکھنؤ میونسپل بورڈ کے پہلے ہندوستانی ممبر چنے گئے تھے۔ اودھ روہیل کھنڈ ریلوے بورڈ کے ممبر بھی چنے گئے۔ الٰہ آباد گورنمنٹ پریس منشی جی کی نگرانی میں دیا گیا۔

بہ حیثیت انسان منشی نول کشور کا مقام بہت بلند تھا۔ وہ ہندو تھے مگر ہر مذہب کی عزت دل و جان سے کرتے تھے ان کے بارے میں مشہور ہے کہ قرآن پاک کی پروف ریڈنگ

کے لیے جب بیٹھتے تو باوضو ہو کر بیٹھتے تھے یہی حکم تمام کارکنان کے لیے بھی تھا۔ صحیح معنی میں انھوں نے نسل آدم کی خدمت تعصب اور یک طرفہ مذہبی جذبات سے دور رہ کر کی۔ اگرچہ وہ اپنے وقت کے بہت ہی متمول باعزت اور باوقار رئیس تھے لیکن ان میں غرور اور خودنمائی ذرا بھی نہ تھی۔ غریب طلبا کو وظائف یتیموں اور بیواؤں کی امداد اور دیگر اداروں اور انجمنوں کی سرپرستی بڑی خاموشی سے کرتے تھے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، کیننگ کالج لکھنؤ اور اسی طرح کے بہت سے اداروں کو مالی امداد دیتے رہے۔

منشی نول کشور کو شاعروں سے بھی بڑا لگاؤ تھا۔ انھوں نے اردو کے اس وقت کے سبھی بلند مرتبہ شاعروں کا مطالعہ کیا۔ اپنے مکان پر بھی اکثر محفل مشاعرہ منعقد کرتے تھے جس میں مقامی اور غیر مقامی شعراء حصہ لیتے تھے۔

منشی جی کی اچھائیوں کے ذکر کے لیے ایک مضمون ناکافی ہے۔ مختصر یہ کہ منشی نول کشور ایک ایسے انسان تھے جسے کئی صدیاں مل کر پیدا کرتی ہیں اور پھر کئی صدیاں دوبارہ ایسے انسان کی آمد کا انتظار کرتی ہیں۔ ۵۹ برس تک دنیائے علم و ادب پر نور برسانے والا یہ ستارہ ۱۹ فروری ۱۸۹۵ء کو اس دنیا سے کوچ کر گیا لیکن اس کی روشنی آج بھی ہمارے دلوں کو روشن کیے ہوئے ہے۔



"اس چھاپے خانے نے جس کا بھی دیوان شائع کیا اس کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا"

——— مرزا غالب

منشی نولکشور — انسانی صفات کے آئینے میں — (صفحہ ۱۹۴ کا بقیہ)

کی آزاد فضا اور صنعتی دور میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی ایکتا کے موضوعات پر آئے دن کانفرنسیں اور جلسے بھی ہوتے رہتے ہیں یعنی ان چیزوں کی زیادہ ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ اس پس منظر میں اگر ہم منشی نول کشور کی شخصیت کا جائزہ لیں تو ان کا قد اور بلند ہو جاتا ہے۔

سوا سو سال قبل ہندستان پورے طور پر غلامی کے شکنجے میں تھا اور انگریزی حکمرانوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ ہندو۔ مسلمان کو ایک دوسرے سے دور رکھا جائے لیکن اس دور میں بھی منشی جی نے انسانیت اور محبت کی شمع ہمیشہ روشن رکھی۔

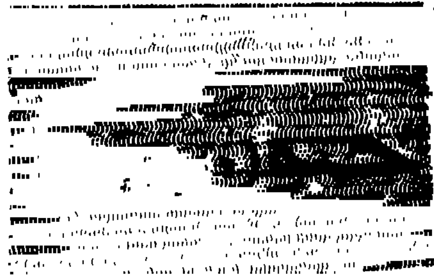
منشی جی نے یوں تو دنیائے علم و ادب اور ملک کو بہت کچھ دیا لیکن لکھنؤ پر ان کے بڑے احسانات ہیں۔ وہ جدید لکھنؤ کے معماروں میں سے ایک تھے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اہل لکھنؤ انھیں کس طرح یاد رکھتے ہیں؟ ایسی ہی عظیم المرتبت شخصیتوں پر میر کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی



ڈاکٹر تنویر احمد علوی

مرتب شدہ



منشی نول کشور اپنے عہد کے ایک بڑے انسان تھے یہ تاریخ ساز دور پچھلی صدی کے نصف آخر سے تعلق رکھتا ہے جس میں ہماری قومی تاریخ کے ایک سے زیادہ ممتاز افراد اپنے دائرۂ فکر و عمل کے اعتبار سے عہد آفریں کارنامے انجام دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

منشی صاحب ایک ذی حیثیت گھرانے میں پیدا ہوئے لیکن اپنی زندگی میں وہ تمول و ثروت اور عزت و احترام کے جن اعلےٰ مدارج پر فائز نظر آتے ہیں وہ ان کے خاندان کا ورثہ نہیں۔ ان کی اپنی بے نظیر انسانی صلاحیتوں اور جہد و عمل کی بے پناہ قوتوں کا ثمرہ تھا۔ ان کے سوانح و سیرت میں انسانی خوبیوں کے اعتبار سے ایسے بہت سے روشن پہلو اور تابناک گوشے موجود ہیں جو انسان کو محدود وفاداریوں سے بلند ہو کر انسانیت پر اعتماد کرنا اور ناسازگار حالات میں ایک روشن مستقبل کی تعمیر کے لیے حوصلہ مندانہ قدم اٹھانے کی نمایاں مثال پیش کرتے ہیں۔

دیسی زبانوں کی تالیفات کی وسیع پیمانہ پر اشاعت (جس میں عربی فارسی اور انگریزی کتابوں کے ترجمے بھی شامل ہیں) اور ہندستانی فن طباعت کی توسیع و فروغ میں منشی صاحب کی مساعی اور ان کے مطبع کی کارکردگی نے جو حصہ لیا ہے وہ ایسا بڑا کام ہے جسے ان زبانوں کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ اگر منشی جی نے اپنے مادی اور ذہنی وسائل کو کام میں لا کر عربی، فارسی، سنسکرت ہندی اور اردو کے بے شمار مخطوطات اور مسودوں کو بڑی مخلصانہ سعی و کاوشوں کے ساتھ حاصل کر کے، ان کی اشاعت کا اہتمام نہ کیا ہوتا تو نہ جانے ہمارا کتنا بڑا علمی تہذیبی، مذہبی اور ادبی سرمایہ ضائع ہو گیا ہوتا اور ہمیشہ کے لیے یہ زبانیں اپنے اس بیش بہا ورثہ سے محروم ہو جاتیں۔

منشی جی محض کاروباری ذہن کے ہی آدمی نہ تھے جس کا اندازہ ان کے ذہنی اقدامات اور عملی منصوبوں سے ہوتا ہے۔ وہ علوم و فنون کے فروغ اور شعر و ادب کے مطالعہ سے بھی گہرا شغف رکھتے تھے۔ اور اسی شوق کے باعث وہ اتنے بڑے پیمانہ پر مختلف زبانوں اور ان کے ذریعہ تخلیق پانے والے شعر و ادب اور علم و فن کی خدمت کر سکے۔

ان کی زندگی ہی میں ان کے بڑے کارناموں کا اعتراف سرکاری و غیر سرکاری سطح پر کیا جاتا رہا۔ اس اعتبار سے وہ بڑے خوش نصیب تھے۔ ان وسائل سے ایسا دستاویزی ریکارڈ مہیا ہو گیا۔ جس کی روشنی میں ان کے سوانح و سیرت کا مطالعہ ممکن ہے لیکن ان کی کوئی باقاعدہ سوانح عمری مرتب کی جائے اس کی طرف نسبتاً کم توجہ دی گئی۔ ان کی وفات کے بعد ایک کمیٹی بہ اطلاع مولوی امیر حسن نورانی اس مقصد کے لیے بنائی گئی تھی لیکن اس سمت میں کوئی بڑی پیش رفت نہیں ہو سکی۔ بعض ایسے اشخاص نے جو منشی صاحب سے ذہنی یا ذاتی وابستگی رکھتے تھے اپنے اپنے طریق رسائی کے مطابق ان کی لائف کے بارے میں منظوم اور منثور کتابچے ترتیب دیئے۔ ایسی ہی ایک مختصر سوانح عمری راقم الحروف کے پیش نظر ہے جس کا

مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ قریب قریب ایک ہم عہد سوانح عمری ہونے کے رشتہ سے اس کی اپنی ایک استنادی حیثیت بھی ہے۔

یہ مختصر سوانح عمری جیون چرتر کے نام سے ۱۹۰۲ء میں خود مطبع نول کشور سے اشاعت پذیر ہوئی ہے۔ غیر ضروری اختصار سے کام لینے کی وجہ سے اس میں وہ جزیاتی مطالعہ یا سوانحی تفصیلات کا وہ تجزیاتی اسلوب نہیں ملتا جو ایک اچھی سوانح عمری کے لیے ضروری ہے۔

اس کے مولف لال جی منشی کوئی صاحب ہیں، جنھوں نے اپنے نام کے ساتھ جو بطور دستخط کتاب کے آخر میں درج ہے۔ لال جی منشی پیشتر لکھا ہے۔ اور "لعبد" لکھ کر اس کے ذیل میں دستخط کیے ہیں۔

ممکن ہے مولف کا منشی نول کشور سے کوئی رشتہ بھی ہو لیکن کتاب سے رشتہ ارادت کے علاوہ کسی خاندانی رشتہ یا ذاتی روابط کا پتہ نہیں چلتا۔

کتاب کی زبان کہیں غیر معمولی طور پر سخت ہندی ہے لیکن اکثر و بیشتر بعض ہندی الفاظ کے استعمال کے باوصف مولف نے فارسی آمیز اردو کا سہارا لیا ہے۔

یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس کا رسم الخط بہرحال اردو ہے۔ — پوری کتاب آٹھ اوراق اور پندرہ صفحات پر مشتمل ہے موجودہ صورت میں اس کی تقطیع ۴½ × ۱۲ کے قریب ہے۔ سرورق ... کے چاروں کونوں پر چار پھول بنے ہیں۔ باقی صفحہ کو جدول کی صورت میں خوبصورت خطوط کھینچ کر مزین کیا گیا ہے۔ اس کے مندرجات حسب ذیل ہیں:۔

"جیون چرتر۔ منشی نول کشور صاحب۔ اس میں آدی سے انت تک سرب ہیت کاری بھرگ کل کملی دوا کر منشی نول کشور جی صاحب سی۔ آئی۔ ای مالک مطبع اودھ اخبار لکھنؤ کے مہا اپکارک چرتر درج ہیں۔ بار اول مطبع نامی منشی نول کشور میں چھپا۔ سنہ ۱۹۰۲ء"

عبارت کا یہ حصہ جس پر خط کھینچ دیا گیا ہے، ظاہر کرتا ہے کہ مولف کے پیش نظر ان کی کوئی مکمل سوانح عمری ترتیب دینا نہیں ہے۔ وہ اس کتاب کے قارئین سے ان کے اپکاروں کا تعارف کرانا چاہتا ہے۔ جن کا سلسلہ منشی صاحب کی زندگی میں ادھر سے ادھر تک پھیلا ہوا ہے۔ اسی لیے اس نے "سرب ہتکاری" کا لفظ ان کے لیے متعدد بار استعمال کیا ہے۔

دوسرے صفحہ سے سوانحی نگارشات کا سلسلہ بغیر کسی تمہید یا عبارات حمد و ثنا کے شروع ہو جاتا ہے جس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ کوئی باقاعدہ کتاب نہیں صرف ایک مضمون ہے جسے کتابی صورت میں چھاپا گیا ہے اور "تمت خاتمہ" لکھ کر اسے کتابی شکل دینے کی کوشش کی ہے۔

ابتدائے سوانح میں منشی صاحب کے آبائی وطن ساسنی کا ذکر کرتے ہوئے مولف نے لکھا ہے۔

"پچھم دیس شہر علی گڑھ کے پاس ساسنی گرام پرسدھ ہے۔ بڑے بڑے پرتشٹھتا بھرگ ونشی اور سب برنوں کے لوگ دھن دولت سے پورن اس میں رہتے تھے وہاں سری جمنا پرشاد جی بھارگو بڑے پرتاپی دھن دولت (والے) علاقہ زمینداری سے سمپن رہتے تھے۔ سری بھگوان نے دیا کر کے اس دھن کے سوائے پانچ پتر دیے، جن کے نام یہ ہیں، پھول چند (جگت کھیات سرب ہتکاری) منشی نول کشور جی، بابو تلسی رام جی، بابو سیوک رام جی، بابو دامودر داس جی۔

سری جمنا پرساد جی مہاراج کے یہ پتر تاب سے سب بتر بھاگ سالی دھن دولت بدیا کے ادھیکاری اور ریبکھ منشی نول کشور جی اس کل کے بھوشن اور بھرت کھنڈ بھر میں بدیا۔ بچار، دان مان سے سورج سمان جگ کاست اور ادویتہ پرش ہوئے۔"

اس موقع پر مولف نے اپنے ایک پیش رو سوانح نگار پنڈت بندی دین صاحب کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو موضع مواسی ضلع اناؤ کے رہنے والے تھے ان کے لیے "بھی سرومنی" کا لفظ استعمال کیا اور بتایا کہ انھوں نے منشی صاحب کا جیون چرتر بھاشا کا بیر

اور منو ہر چھندوں میں لکھا تھا۔ یہ منظوم سوانح عمری جو بھاشا کابیہ میں لکھی گئی تھی۔ مولف کی اس زیر نظر کتاب کا اصل ماخذ ہے کچھ باتیں ادھر ادھر سے لے کر اس نے اپنی طرف سے بعض اضافے کیے جو اس کے خیال سے ضروری تھے۔

مولف نے منشی جی کی پیدائش کو سنہ ۱۸۹۲ بکرمی سمبت کا واقعہ قرار دیا ہے اور لکھا ہے۔

"سمبت ۱۸۹۲ بکرمی اور پوس مہینہ پنچ چھتر تری متھرا پوری کے ریڑھا گاؤں میں منشی نول کشور جی کا جنم ہوا۔ بعد اقساہ جاتک بکرم آدکے متھرا ریڑھا گاؤں سے سامنی گرام اپنے کھیہ استھان میں آن کر چھٹویں برس بدیا پڑھنے کا آرمبھ کیا۔"

سمبت ۱۸۹۲ اور پوس ماہ کے مطابق میں منشی جی کا سال پیدائش عیسوی سنہ کے اعتبار سے ۱۸۳۶ قرار دیا گیا ہے۔ اور ۳ جنوری ان کی تاریخ پیدائش ظاہر کی گئی ہے جس میں ان کے اکثر سوانح نگار متفق نظر آتے ہیں لیکن فروغ اردو کے مذکورہ شمارہ نول کشور میں پروفیسر نورالحسن ہاشمی صاحب نے ایک قدیم روزنامچہ کے اندرجات کی روشنی میں اس تاریخ پر شبہ کا اظہار کیا ہے۔ اس روزنامچہ میں جو ایک معاصر روایت ہے وفات کے وقت (۱۸۹۵ء) میں ان کی عمر ۶۶ برس قرار دی گئی ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ ان کی پیدائش سنہ ۱۸۳۶ کے بجائے ۱۸۲۹ء یا اس کے قریبی زمانہ میں ہوئی۔

زیر نظر تالیف میں وفات کے وقت ان کی عمر ۵۹ برس لکھی ہے جو روایت کے مطابق ہے۔

دس گیارہ سال کی عمر میں اپنی ابتدائی تعلیم سے فراغت کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آگرہ کا رخ کیا۔ مولف نے لکھا ہے۔

"تھوڑے ہی کال میں دیس بدیا کا بودھ ہو گیا اور انگریزی بدیا لابھ کی بڑھتی دس برس کی اوستھا میں آگرہ پہنچ کر کالج میں پڑھنا آرمبھ کیا، یہاں بھی پانچ برس پڑھنے سے امتحان میں پاس اور بدیا بدھ میں کوسل ہو کر اخباروں کے دیکھے اور دیس اپکار کے ہیت مضمون نگاری کا شوق بڑھا یا اخبار آگرہ سفیر میں مضامین لکھنے لگے۔ سرکار نے آپ کی جوشا علمی دیکھ کر وظیفہ مقرر فرمایا۔"

اخبار سفیر آگرہ اس زمانہ میں شمالی ہندستان کا ایک مشہور اور با اثر اخبار سمجھا جاتا تھا۔ مضمون نگاری کے شوق کے علاوہ اس زمانہ میں کتابوں کا مطالعہ بھی ان کا ایک محبوب مشغلہ تھا۔ مولوی امیر حسن نورانی نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"اردو زبان و ادب میں خاصی مہارت حاصل کر لی۔ ہندی اور سنسکرت میں بھی اچھی استعداد بہم پہنچا لی۔ انگریزی زبان بھی سیکھ لی۔"

یہ ابتدائے عمر کی مشق اور مضمون نگاری کا شوق ان کے لیے اچھی خاصی شہرت کا باعث بن گیا۔ سرکاری وظیفہ گویا اس کا ایک اعتراف تھا۔

نورانی صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ "منشی نول کشور کچھ دن سفیر آگرہ کے مہتمم بھی رہے۔" پھر جلد ہی وہ وقت آیا کہ وہ مطبع کوہ نور لاہور سے منسلک ہو گئے۔ جس کے لیے "جیون چرتر" کے مولف کا بیان ہے۔

"منشی ہرسکھ رائے صاحب مالک مطبع کوہ نور لاہور کی تعریف دانش مندی اور خوش انتظامی مطبع جان کر آگرہ سے ان کے پاس لاہور چلے گئے۔ منشی ہرسکھ رائے صاحب نے آپ کی فضیلت علمی و طرز رفتار گفتار سے نہایت خوش ہو کر ٹھہرا لیا اور لاہور میں رہنے اور اپنے مطبع میں کام کرنے کی خواہش کی آپ نے سمت سنگ مناسب اور اپنے شوق کا کام دیکھ کر منظور فرمایا اور لاہور میں منشی ہرسکھ رائے صاحب کے مطبع میں ملازم ہو کر کام کرنے لگے۔"

اخبار کوہ نور جس کے مطبع میں کام کرنے کے لیے منشی صاحب نے ملازمت اختیار کی تھی ۱۴ جنوری ۱۸۵۰ کو جاری ہوا۔ یہ اخبار ہفتہ وار تھا اور پیر کے دن نکلتا تھا۔ صفحات کی

تعداد بارہ ہوتی تھی بعد میں سہ روزہ ہوا پھر دو روزہ ہوگیا۔[8]

مولوی امیر حسن نورانی صاحب نے اس ضمن میں لکھا ہے:

"اخبار کوہ نور کے مالک منشی ہرسکھ رائے بھٹناگر ذات کے کایستھ تھے اور ضلع بلند شہر کے رہنے والے تھے۔ اخبار سفیر آگرہ کے مالک دیوان چند اور ہرسکھ رائے میں اختلاف پیدا ہوگیا تھا۔ انھوں نے (منشی نول کشور) اس نزاع کو ختم کرایا۔ منشی ہرسکھ رائے نے منشی نول کشور کی ذہانت سے متاثر ہوکر ان کو لاہور آنے کی دعوت دی۔[9]

مطبع کوہ نور میں رہتے ہوئے منشی صاحب نے بڑی تندہی اور سلیقہ مندی سے کام کیا (جب) "ہر کام میں ترقی اور آپ کی خیر خواہی پائی گئی تو منشی (ہرسکھ رائے) نے کل کام مطبع کا آپ کے آدھین کر دیا۔"

تین برس بعد اکسمات ایک مقدمہ فوجداری منشی ہرسکھ رائے پر قائم ہوا اور یورپ جنم کے سنسکار سے اس میں قید ہوگئے۔ ... نہایت رنج مانا اور (ایسی) کوشش کی کہ منشی ہرسکھ رائے صاحب کو قید سے چھڑا لیا۔ منشی صاحب اور اہل کاران مطبع اور شہر کے معزز لوگ آپ کی وفاداری و کارگزاری سے واقف اور خوش ہوگئے۔ بڑی نیک نامی پرسدھ ہوئی۔[10]

مطبع کوہ نور میں کام کرنے سے اس کاروبار کے عملی تجربہ کا مزید موقع ملا۔ جس کی ترقیاں اور وسیلہ سے علوم و فنون اور زبان و ادب کی خدمت کاتب تقدیر نے ان کے نام لکھ دی تھی۔ اسی لیے بہت جلد ان کے حوصلۂ کار نے انھیں خود اپنا مطبع جاری کرنے پر آمادہ کیا۔ اس ضمن میں صاحب تالیف نے آگے چل کر لکھا ہے:

"نوکری مطبع کی چھوڑ کر واسطے تجویز انتظام کام اور مقام کے آگرہ میں آئے اور آگرہ سے لکھنؤ اس شہر میں جب غدر کے بعد (سرکاری) تسلط ہوگیا۔ حکاموں کے مشورہ سے سامان مطبع کا جمع کر کے کوٹھی غالب جنگ میں مطبع قائم کیا اور پرچہ اودھ اخبار نکالنا شروع کر دیا۔[11]"

نورانی صاحب کا بیان ہے:

"سنہ ۱۸۵۸ عیسوی کے اوائل میں منشی نول کشور لکھنؤ پہنچے اور آغا میر کی ڈیوڑھی میں ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لیا کچھ ہینڈ پریس اور پتھر خرید کر مطبع قائم کیا۔ وہاں سے گوالہ گنج منتقل ہوئے۔ بعد میں محلہ رکاب گنج میں مان سنگھ کی کوٹھی میں جگہ حاصل کی اور اسی میں پریس قائم کر دیا۔[12]

"جیون چرتر" کے مولف نے اس دور میں اودھ اخبار کی مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ہر شہر اور ہر ملک سے اس کی مانگ ہوئی۔ راجہ مہاراجہ تعلقدار اور زمیندار، راج کرمچاری یعنی عہدے دار سرکاری اور ہر پیشے کے لوگ لیتے تھے۔[13]" اخبار کی کامیابی اور ہر دل عزیزی سے متعلق اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ کے اخبارات کو کس طبقہ کی سرپرستی اور خصوصی تعاون کی ضرورت ہوتی تھی اور کن لوگوں کے ذکر اذکار سے اس زمانہ کا صحافتی کردار امتیاز پاتا تھا۔

اخبار کی اس کامیابی اور منشی نول کشور کی شہرت نے مطبع کے فروغ میں بھی نمایاں طور پر حصہ لیا اور دوسرے حلقوں کے علاوہ سرکاری انتظامیہ کی نگاہ میں بھی مطبع کی کارکردگی کا اعتبار قایم ہوگیا۔ صاحب تالیف نے لکھا ہے:

"حکام نے مطبع کی خوش انتظامی اور کفایت خرچ سے مطمئن ہوکر سرکاری کام چھپوائے، فارم اور کتابوں اسکول وغیرہ کا کام دیدیا، کارخانے نے ترقی پکڑی ... کی ادھکتا (فراوانی) ہوئی اس کے چھاپے کم ہونے سے پرانی کتابیں ہر علم و فن کی ڈھونڈھے نہیں ملتی تھیں آپ نے ان کا کھوج کرنا شروع کیا اور بڑے بڑے امرا اور متوسلان خاندان شاہی کے کتب خانوں[14] ... سے ہزاروں روپیہ خرچ کر کے ہم پہنچائیں۔ پنڈت، سنسکرت بید پڑیا جاننے والے، عالم عربی فارسی کے، مشہور انگریزی داں، لائق خوش نویس، بادشاہی خطابی شاعر، نامی

کارخانے کے کام کرنے والے نوکر بڑھائے اور ان کتابوں کو لکھوا اور ترجمہ وغیرہ کرا کے اپنے مطبع میں چھپوایا۔[18]"

پبلک میں مقبولیت اور کاروبار میں ترقی کے ساتھ منشی جی کی ایچ دن بدن زیادہ روشن اور شخصیت باوقار بنتی گئی اور صاحب تالیف کی روایت کے مطابق سرکار نے آپ کے کاموں سے خوش ہو کر سی۔آئی۔ای کا خطاب دیا۔ اودھ کے درباریوں میں نامزد کیا، الہ آباد یونیورسٹی کے (فیلو) اور میونسپل بورڈ لکھنؤ کے ممبر بنائے گئے آنریری انسپکٹر جیل اور اودھ روہیل کھنڈ ریلوے بورڈ کے رکن نامزد ہوئے[19]"

سرکار و دربار میں اپنی نیک نامی و عزت کے ساتھ منشی صاحب نے قومی بھلائی کے لیے جو بہت سے کام کیے اور قدم اٹھائے ان میں سے ایک کانگریس کے اجلاس منعقدہ سنہ ۱۸۸۶ میں شرکت بھی ہے۔

منشی صاحب کی کاروباری سوجھ بوجھ اور حوصلہ مندانہ اقدامات کے تذکرہ میں مولف نے ان کے سفر کلکتہ اور نیلام میں خریدے جانے والے کاغذ کے واقعہ کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے اور لکھا ہے:

"کلکتہ میں دربار کی شرکت اور وہاں کے رئیسوں اور امیروں سے ملنے کے بعد جہازی حکاموں سے بھی ملے اس سمے ایک جہاز کاغذ کا لدا ہوا آیا۔ کلکتہ میں تجارتی مال اور ملکوں کا اکثر نیلام کیا جاتا ہے۔ کھرتی کرور پتی لوگ نیلام میں خرید کر کے اس مال کو دیس بدیس کے سوداگروں کے پاس بھیجتے اور بیچتے ہیں۔ اس نیلام میں لاکھوں روپیہ کا نفع نقصان ہے ہر شخص کا کام نہیں کہ اتنا بڑا نیلام خرید کرے اس جہاز کا کاغذ دیکھ کر نیلام خرید کرنے والے لوگوں نے ناپسند کیا اور بولی ہونے پر نہایت کم دام لگائے۔ اور مشہور ہو گیا کہ کاغذ ناکارہ ہونے سے بولی نہیں بڑھ سکتی۔ آپ نے کاغذ دیکھ کر سب سے زیادہ بولی دی۔

کلکتہ کے دام لینے لگے مال خریدنے نہیں آئے تھے۔ یونہی گھومنے آئے تھے۔"[20]

لیکن اس بولی میں آپ کا بول بالا ہوا اور منشی جی نے بہت نفع کمایا۔ ہزاروں روپیہ کا کاغذ اپنے کارخانہ کے واسطے لے کر اور ہزاروں روپیہ نفع کما کر لکھنؤ پہونچے، کوٹھی غالب جنگ بڑی عالی شان عمارت ہے لیکن اس میں جگہ کافی نہ دیکھ کر اپنی کوٹھی اور کارخانے کے مکانات الگ بنوائے پھر آس پاس کی اور کوٹھیاں کارخانے کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے لیے خریدیں اور بالفاظ مولف ایک مطبع ہونے سے شناخت نہ ہوئی کانپور الہ آباد، لاہور، دہلی، آگرہ اور اجمیر، قریب قریب نامی شہروں میں کہیں اپنا مطبع اور کہیں تجارتی کارخانہ کھولا[21]

مولف نے منشی صاحب کے ایسے کاموں کو بہت سراہا ہے۔ جن میں دوسروں کی بھلائی اور قومی اداروں کی فلاح کے لیے روپیہ خرچ کیا اور بڑے دان مان کے ساتھ ان کی مدد کی۔ ایسے کچھ کاموں کی ایک مختصر فہرست بھی شامل کتاب کی ہے۔ سرکار نے آپ کے کام اور نام کو بڑی عزت دی۔ شہر دہلی کے دربار قیصری میں اودھ کے رئیسوں میں آپ کو نمبر اول کی کرسی دی گئی اور دربار لدھیانہ کے موقع پر جب امیر عبدالرحمٰن والی کابل رونق افزائے دربار ہوئے تو دربار گورنری میں جہاں والیان ریاست اور راجہ مہاراجہ کرسی نشین تھے وہیں آپ بھی تھے۔ اس پر بعض اہل ریاست کو اعتراض بھی ہوا لیکن منشی صاحب کو خود وہاں خصوصی امیر کابل کی نگاہ میں کیا درجہ اعتبار حاصل تھا اس کا اندازہ امراء کو اس وقت ہوا جب امیر موصوف منشی صاحب سے بڑی اپنائیت کے ساتھ اور بہت اعزاز و احترام کے ساتھ باتیں کیں۔ مولف نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"امیر صاحب بہادر نے بڑی عزت سے پاس بٹھا کر پوچھا آپ ہی منشی نول کشور ہیں۔ ہم نے بخارا میں اور اکثر اپنی دارالسلطنت میں آپ کی شائع کردہ نایاب کتابیں جو شاہی کتب خانہ میں نہیں تھیں دیکھ کر خوش ہوتے تھے کہ کوئی

ایسا عالی ہمت، خوش انتظام ہے جس نے ان کو بہم پہنچایا خدا کا شکر ہے کہ ہم نے آپ کو دیکھا۔ ہم بھی چاہتے ہیں کہ ایک چھاپہ خانہ اپنے ملک میں جاری کریں۔ اس میں آپ کی مدد چاہیے۔"[19]

دولت و ثروت کی فراوانی اور دوسروں کی نگاہ میں اس اعزاز و احترام کے باوصف آپ اتنے بڑے کاروبار اور اس سے متعلق کاموں کی نگرانی بذات خود کرتے تھے اور جس طرح وہ سیکڑوں خطوں کو پڑھتے، جواب لکھتے اور لکھواتے تھے اور اس کے ساتھ دوسرے کام کرتے تھے اس پر دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی تھی۔

منشی جی کے جرأت مندانہ اقدامات کے سلسلہ میں مولف نے ایک اور اہم واقعہ کا بھی قدرے تفصیل سے ذکر کیا ہے:

"ایک کارخانہ کاغذ بنانے کا لکھنؤ میں قائم کرنا چاہا اور شہر اور دور دور کے بڑے بڑے لوگوں سے مشورہ لے کر سو سو روپیہ کا حصہ نامزد کیا اور گومتی کے کاٹھ والے پل کے پاس زمین لے کر تیاری عمارت شروع کرا دی۔ ولایت سے کل منگائی گئی اس کے چلانے والے بڑے بڑے تنخواہ والے ولایت سے بلائے اس میں لاکھوں روپیہ کا قرض ہو گیا جتنوں کا روپیہ وقت پر ادا نہیں ہوا، قرضہ والوں کے نالشات سے یہ نتیجہ ہو گیا کہ کارخانہ کی کلیں نیلام ہو کر بعلت باقی قرضہ حصہ داران سے روپیہ خسارہ لے لیا جاوے گا۔ اس اندیشہ سے بعض حصہ داروں نے اپنے حصہ سو روپئے والے آدھے دام پر بیچ ڈالے۔ حصہ دار اور ڈائریکٹر صاحبان میں کوئی ایسا نہ تھا کہ اس حالت نازک سے کارخانے کو نیلام سے بچا سکتا تھا..."

مگر منشی نول کشور کے حوصلہ کار نے کارخانے کو اس بحران سے بچا لیا۔ کارخانہ جاری ہوا اور جاری رہا۔ مہاراجہ جے پور نے منشی صاحب کو "نائب الریاست" بنانا چاہا لیکن آپ نے اپنے کاروباری ذمہ داریوں اور دلچسپیوں کے پیش نظر معذرت پیش کی۔

صاحب تالیف نے آگے چل کر لکھا ہے:

"اسی کا نام اقبال ہے کہ بڑے بڑے کام انسان کے ہاتھ سے کرا لے۔ جو اس کی طاقت انسانی سے زیادہ ہیں۔ ضلع بارہ بنکی اور اوناؤ وغیرہ ملک اودھ میں جو علاقہ خرید کیا اس کا کام بھی اچھی طرح دیکھتے تھے جس سے اہل کار علاقہ اپنا منصبی کام عمدگی سے انجام دیتے تھے اور کوئی شکایت عدم وصول روپیہ یا کسی بیجا نالش جھگڑے کی آپ کے علاقہ میں نہیں ہو سکی۔"[12]

ہزاروں بندگان خدا منشی صاحب کے دامن دولت سے اور کاروبار سے وابستہ تھے۔ نہ جانے کتنے منشی، کاتب، سنگ ساز، نقاش، مصحح اور مترجم آپ کے مطبعوں میں کام کرتے تھے۔ بہت سے مصنف و مولف اپنے نام اور کام کے اعتبار سے اس مطبع اور اس کے اخبار کے کالموں کی وجہ سے زندہ رہے اور ان میں سے بہت سے نام اور اردو زبان و ادب کی تاریخ کے بڑے نام ہیں۔ اپنے منہ بولے بیٹے پراگ نرائن کی شادی خانہ آبادی بڑے دھوم دھام سے کی اور پوتے کا سکھ بھی دیکھا۔ بقول مولف:

"ان کے بیاہ کا اتساہ کر کے پر پوتر (پوتے) کا جنم اتسا بھی دیکھ لیا۔ اسٹھ برس کی اوستھا (عمر) ہونے پر سمت ۱۹۵۱ بکرمی بیساکھ بدی دسمی منگل دن، پرمجھ ہورت میں اچھے بھلے کام کرتے بولتے چالتے جوگی راجوں کی سمان بھگوان میں من لگائے سریر چھوڑ کر بیکنٹھ دھام کو سدھارے۔"[13]

'خاتمہ' کے عنوان سے مولف نے جو عبارت سپرد قلم کی ہے اس میں اپنا نام اس وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔

"نام مجھ لکھنے والے کا لال جی خلف نو ندھ رائے بن بینو لال ابن دیوان رام پرشاد جی صاحب قانون گو کاکوری ضلع لکھنؤ ہے ——

سمت ۱۹۵۷ بکرمی میں اس کی ترتیب ہوئی۔ سہو و خطا انسانیت کا لازمہ ہے اور مجھ ایسے کم لیاقت کے واسطے تو ضرور ہی ہے۔ اس واسطے کہ دیکھنے سننے والوں سے امید وار معافی ہوں۔"[14]

★

حواشی

۱ مولوی امیر حسن نورانی صاحب نے اپنے مضمون مشمولہ فروغ اردو۔ نول کشور نمبر (بابت ماہ مارچ ۱۹۷۰ء) میں بابو جمنا پرشاد کے ذکر میں لکھا ہے: "بابو جمنا پرشاد بھارگو موضع سانسنی ضلع علی گڑھ کے رئیس زادے تھے، دادا منشی بال مکند انگریزی عہد میں آگرہ کے مہتمم محافظ خانہ رہے۔ انھوں نے متھرا اور آگرہ میں جائیدادیں خرید لی تھی۔ اسی لیے اس خاندان کے افراد کا قیام اکثر ان اضلاع میں رہتا تھا۔ ۲ زانی لیلا، رام کمار بھارگو نے اپنے مضمون میں، جو اسی شمارے میں شامل ہے، لکھا ہے کہ منشی نول کشور کے پردادا کا نام اندر سنگھ تھا وہ مرہٹوں کے کمانڈر تھے اور انھیں اپنی عسکری خدمات کے صلے میں ایک بڑی جاگیر عطا ہوئی تھی" ۱۰۴۔ ۲ جیون چرتر ۔ ۱

۳ جیون چرتر، ۳۔ ۴ ملاحظہ ہو، فروغ اردو (منشی نول کشور کی تاریخ ولادت) ۱۹، ۵ جیون چرتر: ۲، ۶ نول کشور: ۱۲

۷ جیون چرتر، ۳، ۸ شمارہ نول کشور: ۱۳۔ ۹ ایضاً ۱۳۔ ۱۰ جیون چرتر، ۳، ۱۱ ایضاً: ۴، ۱۲ شمارہ نول کشور: ۱۴

۱۳ ایضاً: ۱۴، ۱۴ جیون چرتر: ۴، ۱۵ جیون چرتر: ۵۔ نورانی صاحب کے بیان کے مطابق اودھ کے چیف کمشنر ... نے اپنے ایک خط میں حکومت کو تحریر کیا کہ منشی نول کشور بڑے لائق شخص ہیں اور اردو ادب میں ان کا مطبع سب سے اچھا ہے۔ ۱۸۔ ۱۶ جیون چرتر ۵۔

۱۷ جیون چرتر، ۶، ۱۸ ملاحظہ ہو: ۷

۱۹ جیون چرتر: ۱۱، ۲۰ جیون چرتر: ۱۲، ۲۱ ایضاً: ۱۲، ۲۲ ایضاً: ۱۳۔ انگریزی سنہ کے اعتبار سے وفات کی تاریخ ۱۹ فروری سنہ ۱۸۹۵ء ہے۔

۲۳ جیون چرتر ۱۵۔

"یہ اخبار پچھلے سات سال سے نہایت کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ چنانچہ اس کی ہر اشاعت پچھلی اشاعتوں سے بہتر نظر آتی ہے۔ اس کی تقطیع اور صفحات کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ اخبار ہفتہ وار ہے اور ہر چہار شنبہ کو نکلتا ہے۔ پہلے کے مقابلے میں اس کی تقطیع بھی بڑی ہوگئی ہے۔ میرے خیال سے اس سے ضخیم اخبار ہندوستان میں نہیں ہے۔"

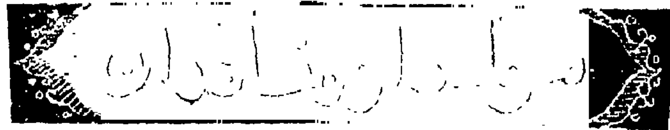
اردو اخبار گارساں دتاسی کی نظر میں

مقالہ ۱۸۶۶ء

قاضی سید ظہیر الحسن

منشی نولکشور

کا



انیسویں صدی میں ہندوستان کی اہم ترین شخصیتوں میں منشی نول کشور ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کو ہندوستان کے علاوہ بیرونی ممالک میں بھی بہت شہرت حاصل ہوئی۔ وہ اپنے عہد کے ممتاز صحافی علم دوست انسان اور اشاعت علوم و فنون کے علمبردار تھے ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کے بعد جب سارا ملک تباہی و بربادی کے طوفان میں ہچکولے کھا رہا تھا اور علمی و ادبی سرگرمیاں ماند پڑ چکی تھیں اس وقت منشی نول کشور نے علم و ادب کی ایک ایسی مشعل نول کشور پریس کی صورت میں روشن کی جس کی تابانیوں سے آج بھی ہماری علمی و ادبی محفلیں اور تعلیمی ادارے منور ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ منشی نول کشور جیسی عظیم ہستی کے مولد ان کے وطن اور خاندان کے سلسلہ میں اب تک کچھ غلط فہمیاں عام ہیں جن کو دور کرنے کی ان کے وارثوں نے بھی کوشش نہیں کی۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود غلط فہمی میں مبتلا ہیں حالانکہ منشی نول کشور کی وفات کو صرف پچاسی سال گزرے ہیں یہ کوئی ایسی طویل مدت نہیں کہ جس کی وجہ سے ان کے خاندانی حالات اور مولد کا پتہ لگانے میں غیر معمولی جد و جہد کی ضرورت پیش آتی۔

رسالہ فروغ اردو کے منشی نول کشور نمبر میں مضامین میری نظر سے گزرے جن میں ان کا مولد ..... ریڑھا نامی گاؤں ظاہر کیا گیا ہے اس سلسلہ میں جناب امین سلونوی کا مضمون قابل ذکر ہے جو خود بھی عرصہ تک نول کشور پریس کے اودھ اخبار کے عملہ ادارت میں رہ چکے ہیں موصوف نے لکھا ہے کہ منشی نول کشور متھرا پوری کے قریب ریڑھا گاؤں میں پیدا ہوئے۔

میں نے اس سلسلہ میں پوری تحقیق کی لیکن نہ تو متھرا پوری نام کا کوئی قصبہ موجود ہے اور نہ ریڑھا نام کا کوئی گاؤں آباد ہے غالباً اس متھرا پوری کے نام کو پڑھ کر کچھ لوگوں نے منشی نول کشور کا مولد ..... ضلع متھرا کے ریڑھا گاؤں کو قرار دیا۔ حالانکہ ضلع متھرا میں اس نام کا کوئی گاؤں نہ چھوٹا اور نہ بڑا پایا جاتا ہے اتنا ہی نہیں بلکہ جس زمانے میں متھرا ضلع کا صدر مقام بنایا گیا تھا وہ زمانہ ۱۸۳۲ء کا تھا مطلب یہ کہ یہ متھرا اس زمانے میں نیا نیا ہی شہرت پذیر ہو رہا تھا ورنہ اس کی حیثیت ۱۸۳۲ء تک صرف ایک معمولی سے گاؤں کی تھی۔ حالاں کہ یہ زمانہ قدیم میں ایک پر رونق مقام تھا۔

لارڈ لیک نے بھرت پور کے راجہ کو ۱۸۰۵ء میں شکست دی تھی صلحنامہ کی رو سے سرکار سہار کا علاقہ بھرت پور ریاست سے لے کر انگریزی سرکار میں شامل کیا تھا۔ اس کے تقریباً ۲۷ سال بعد ۱۸۳۲ء میں سرکار سہار کو ختم کر کے متھرا کو ضلع کا صدر مقام بنایا گیا تھا جس میں سرکار سہار کا پورا علاقہ بھی ضم کر دیا گیا تھا۔

سرکار سہار اس علاقہ کا بہت بڑا خطہ تھا جس کا طول اکبری عہد میں ضلع دہلی کے شہر پلول کی حدود سے شمال میں شروع ہو کر جنوب

بن بندرابن تک اور مشرق میں جمنا کے ساحل سے لے کر کوہ اراولی کی پہاڑیوں تک جو یہاں کالے پہاڑ کے نام سے مشہور تھیں پھیلا ہوا تھا۔ اس کا صدر مقام سہار نامی شہر تھا جس میں بھارگو گوتوں نیوں یا برہمنوں کا [illegible] کے قدیم خاندان بستے تھے جن میں سے کئی خاندان تو خود اس کے نام پر "سہاریہ" کہلاتے ہیں اور آج بھی پائے جاتے ہیں۔ آئین اکبری میں بھی ابوالفضل نے سرکار سہار کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ زمانہ شاہجہاں میں یہ علاقہ خالصہ میں شمار ہو کر دارا شکوہ کی جاگیر میں شامل رہا تھا۔ بعد میں جاٹوں کے عروج کے زمانہ میں اس خطہ پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ چنانچہ چورامن راجہ بھرت پور کے بھائی تھا۔ زبدان سنگھ نے اس شہر میں ایک حویلی ایک باغ اور ایک کچہری اور ایک کنواں بنوایا تھا نیز ایک تالاب بھی بنوایا تھا۔ بعد میں جاٹ راج کی دیوانی کی خدمت کے صلہ میں جاگیر کے ساتھ ساتھ یہ حویلی اور باغ وغیرہ ایک بھارگو خاندان کو دے دیا گیا تھا اور اس خاندان کے ذی علم اور دیوان ریاست ہونے کے سبب منشی کا خطاب بھی دیا گیا تھا جو بعد میں آج تک اس خاندان کے افراد کے نام کے ساتھ لازمی لاحقہ بنا ہوا ہے۔

سرکار سہار کے قصبہ سہار کے قریب ہی ڈیڑھ میل دور ایک "رهیڑا"، نامی چھوٹا سا [illegible] گاؤں بھی ہے جس میں زراعت پیشہ کاشتکار رہتے ہیں امین سلونوی صاحب کو دراصل اشتباہ ہوا ہے۔ راڑھا گاؤں یہی رهیڑا ہے۔ ہم نے اپنے بزرگوں سے بھی سنا ہے کہ سہار کے ڈھونسروں میں بڑے بڑے عالم گذرے ہیں جن میں منشی نول کشور بھی ہوئے ہیں۔

ہمارے خیال میں لفظ راڑھا کے مشہور ہونے کا سبب ان کے بزرگوں کے وہ زرعی کاغذات ہیں جن میں "رهیڑا" میں ان کی زمین اور کھیت کاشتکاروں کو دیے جانے کا تذکرہ ہو گا۔ اور رهیڑے کا راڑھا ہو جانا ناممکنات میں سے نہیں ہے۔

اگر ہماری تحقیق صحیح ہے تو منشی نول کشور کا خاندان سہار کا مشہور بھارگو خاندان ہوا جس میں منشی کا لفظ لازمی لاحقہ تھا اور ان کے خاندان کی قدیم جائداد بشکل حویلی (بُدھی لال ڈھونسر کی حویلی) تا حال موجود ہے جس کے قریبی ورثا آج بھی متھرا شہر جے پور آگرہ میں رہتے ہیں اور کبھی کبھی آج سے پچیس برس پہلے تک گاؤں میں اپنے مورث اعلیٰ کی جائداد دیکھنے آیا کرتے تھے۔

منشی نول کشور کے اجداد کے زمانہ میں سرکار سہار کے علاقہ میں کئی بار زبردست قحط پڑے غالباً اسی سے پریشان ہو کر منشی نول کشور کے دادا اور والد نے یہاں سے ترک سکونت کر کے علی گڑھ کے ضلع میں بمقام ساسنی سکونت اختیار کی اور وہاں بھی جائداد خرید لی تاہم اس خاندان کے بہت سے لوگ اس علاقہ میں اقامت پذیر ہیں یہاں سے ترک سکونت کا دوسرا سبب لارڈ لیک اور بھرت پور کے راجا کے درمیان جنگ ہونا بھی ہو سکتا ہے۔ اس جنگ کے اثرات اس علاقہ پر بھی پڑے تھے۔

بہرحال مذکورہ حقائق سے واضح ہو جاتا ہے کہ منشی نول کشور کا تعلق ایک معزز علمی گھرانے سے تھا اور منشی کا لاحقہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ خطاب ان کے خاندان کے ہر فرد کے نام کا جز رہا ہے اور ان کا مولد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ راڑھا نہ ہو کر غالباً رهیڑا ہو سکتا ہے ورنہ سہار ہے یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گی کہ سرکار سہار کے اطراف ہی میں مرزا غالب کے خاندان کی جاگیر بھی واقع تھی یعنی سونکھ۔ سونسہ شاہ پور۔ اور پونہانہ کے پرگنے سہار ہی کے اطراف میں واقع تھے۔ نیز یہ خطہ خالص برج بھی ہے جس میں گوبردھن برسانہ بندرابن کوٹ بن نندگاؤں جیسے ہندو مذہب کے مقدس مقامات بھی واقع ہیں۔



نور جہاں

منشی نول کشور اور ان کا خاندان

ضلع علی گڑھ کے موضع سا سنی میں بھارگو برہمن گھرانے کے ایک معزز زمیندار، پنڈت جمنا پرشاد[1] کے لائق اور ہونہار بیٹے[2] منشی نول کشور نے اپنی اعلیٰ صلاحیتوں اور غیر معمولی لیاقتوں سے ایسا نام پیدا کیا جو علوم و فنون کے ارتقار کی تاریخ میں ہمیشہ زریں حروف سے لکھا جائے گا۔ ان کے ذاتی کارناموں نے نہ صرف ان کا اور ان کے خاندان کا بلکہ ہندستان کا نام دنیا میں اونچا کر دیا بلکہ عربی، فارسی اور اردو و ہندی زبانوں اور ان کے ادبی سرمایہ کے تحفظ و ارتقار کے ضمن میں منشی جی کی اَن تھک کوششوں اور خدمات کو کبھی فراموش نہ کیا جا سکے گا۔ ان کا سخت ترین نقاد بھی ان کے ان کارناموں کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گا۔

منشی جی کی پیدائش[3] ۳ جنوری ۱۸۳۶ء کو ان کے ننھیال میں ریڑھا نامی گاؤں میں ہوئی جو متھرا ضلع میں واقع[4] تھا۔ منشی جی کے والد پنڈت جمنا پرشاد کی بڑی جائیداد علی گڑھ متھرا اور آگرہ اضلاع[5] میں تھی۔

منشی جی کی والدہ کا نام یشودا[6] دیوی تھا جن کا آبائی وطن ریڑھا تھا۔

منشی جی کی ابتدائی تعلیم ساسنی میں ہوئی۔ رواج زمانہ کے مطابق انھوں نے عربی و فارسی کی متداول کتابیں پڑھیں اور قدیم طرز پر مکتب کی تعلیم حاصل کی۔ ثانوی تعلیم کے لیے آگرہ کالج، آگرہ میں داخل کیے گئے۔

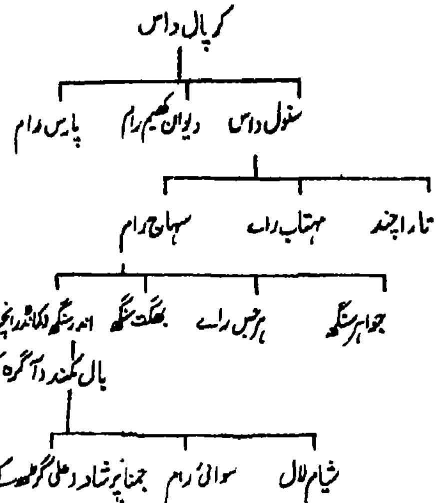
منشی جی کو طالب علمی کے زمانے ہی سے مضمون نگاری کا شوق دامن گیر ہوا اور انھوں نے لکھنے کی مشق شروع کر دی یہی شوق آگے چل کر ان کی صحافتی زندگی کی بنیاد بنا اور اسی کی بدولت "اودھ اخبار" جیسا تازگی پرچہ منصۂ شہود پر آیا۔

۱۹ فروری[7] ۱۸۹۵ء کو منشی جی کی وفات ہوئی لیکن اڑسٹھ سال کی زندگی میں انھوں نے گلستان علم و ادب کی جس طرح آبیاری کی اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ تقریباً چار[8] ہزار کتابیں منشی جی کی زندگی میں نول کشور پریس سے شائع ہوئیں۔

منشی جی نے اشاعت کتب کے مہتم بالشان کارنامہ کے ساتھ ساتھ سماجی کاموں میں بھی جی کھول کر حصہ لیا۔ فیاضی سے عوامی بہبود کے لیے بے دریغ خرچ کیا اور ملک کی سماجی زندگی میں بھی ایک اہم اور نمایاں مقام حاصل کیا۔ مختلف تعلیمی اداروں کی خدمت و اعانت، اسپتالوں، خیراتی اداروں اور کتب خانوں کی نقد اور کتابی امداد ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اور اس فیاضی کے لیے مذہب کی کوئی قید نہ تھی نہ ذات یا برادری کی کوئی بندش نہ تھی۔

منشی جی کے دادا پنڈت بال مکند آگرہ میں مہتمم خزانہ تھے اور ان کی بڑی جائیداد تھی۔ لیکن منشی جی نے اپنی ذاتی کوششوں سے ترقی کی اور اپنے ہنر ذات سے اپنے خاندان کی دیرینہ عظمت میں چار چاند لگائے۔ ان کا سلسلۂ نسب[10] اس طرح تھا۔

کھیم چند
|
رام داس
|
کیول چند
|
دھرم داس
|



منشی جی کی شادی ابتدائی عمر ہی میں مسماۃ سرسوتی کور سے ہوئی تھی جو منشی جی کے بعد چھ سال تک زندہ رہیں۔ ۱۹۰۱ء میں انھوں نے وفات پائی لیکن ان سے کوئی اولاد نرینہ نہ ہوئی۔ اس لیے منشی جی نے اپنے بھتیجے یعنی سیوک رام کے بیٹے "پراگ نرائن" کو گود لے لیا تھا۔ ویدک دھرم کے مطابق وہی ان کے بیٹے اور وارث و جانشین ہوئے۔ باوثوق روایت کے بموجب منشی جی نے ایک مسلمان عورت سے بھی شادی کی تھی جو "بیگم صاحبہ" کہلاتی تھیں اور کوٹھی مان سنگھ واقع رکاب گنج لکھنؤ میں رہتی تھیں۔ وہ بھی منشی جی کے بعد کئی سال زندہ رہیں اور ان کے انتقال کے بعد کوٹھی مان سنگھ جو عام طور پر اجودھیا والی کوٹھی کہلاتی تھی منشی پراگ نرائن نے فروخت کر دی۔ منشی پراگ نرائن کی پرورش و تربیت انھیں کے زیر سایہ ہوئی تھی۔ سطور ذیل میں خانوادہ نول کشور کا اجمالی تعارف پیش کیا جارہا ہے جس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ "ایں خانہ تمام آفتاب است" کا مقولہ اس خاندان کے افراد پر کس قدر صادق آتا ہے۔ اس خاندان کی سماجی خدمات پر لکھنؤ یونیورسٹی میں ایک تحقیقی مقالہ بھی لکھا جا چکا ہے۔

رائے بہادر منشی پراگ نرائن: (۱۸۶۲ء — ۱۹۱۶ء)

۱۸۶۲ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ جوبلی ہائی اسکول لکھنؤ، آگرہ کالج آگرہ اور کیننگ کالج لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی۔ منشی نول کشور کے حقیقی وارث و جانشین ہوئے۔ آگرہ اور اودھ کے ایک معزز تعلقدار اور ممتاز صنعت کار کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ علی گڑھ، گونڈہ، بارہ بنکی، ہمیرپور، اناؤ اور کانپور میں ان کی بڑی جائیداد تھی۔ انھوں نے منشی جی کے بعد اُن کے کارناموں کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ ان کی ترقی کے لیے اَن تھک کوششیں کیں۔ انھیں کے عہد میں مطبع کی شاخیں پٹیالہ اور جبل پور میں بھی قائم ہوئیں اور ان ہی کی نگرانی میں "اودھ اخبار" ہفتہ میں دوبار سے روزنامہ اخبار بنا۔ اردو میں ہفتہ وار "تفریح" اور انگریزی میں ماہنامہ "اسٹوڈنٹس ورلڈ" بھی جاری کیا تھا۔ منشی جی کا جاری کردہ ماہنامہ "اودھ ریویو" ۱۹۰۲ء تک جاری رہا جس کا ذکر پروفیسر نجیب اشرف ندوی مرحوم نے اپنے ایک تحقیقی مضمون میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ "ستمبر ۱۸۹۵ء میں یعنی منشی جی کی وفات کے سات ماہ بعد یہ پرچہ بند ہو گیا تھا"۔ لیکن بعد کی تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ ۱۹۰۲ء تک یہ پرچہ نکلتا رہا۔ لکھنؤ آئرن ورکس، نول کشور امپوریم، ٹائر آئرس ڈپو، نول کشور آئس فیکٹری، بھارگو کمرشیل بینک اور بھارت نیشنل بینک کا قیام انھیں کی مساعی کا نتیجہ تھا۔ نول کشور امپوریم میں حسب ذیل چیزیں ملتی تھیں:۔

(۱) اشیاء زردوزی (ہر قسم کی) ۔ کلاہ، رومال، دوپٹہ وغیرہ
(۲) کلابتونی اور ریشمی اشیاء
(۳) عمدہ ظروف، صراحی وغیرہ، نقرئی، طلائی، منقش، گنگا جمنی
(۴) ظروف ہر قسم کے: بدری، جستی، قلمکاری، برنجی، منقش، گلزار اور سادہ
(۵) جفت پائی ہر وضع کی: بوٹ ولایتی، گھیتلا اور زیر پائی زردوزی کامدار اور سادہ
(۶) کلاہ ترکی، دو پلڑی چکن کے کام کی، سادی تیز کامدانی کی۔
(۷) قسم پارچہ، ململ بجنوری، جامدانی، ڈوریہ ڈھاکہ، شربتی، اودھی وغیرہ
(۸) گوٹہ، پٹھہ، بنت، کرن، گوکھرو، سلمہ، ستارہ، بھوکلی، کلابتو طلائی و نقرئی، بیل، لیس، فیتہ، بانکڑی، فیتون

چھپا اکہرا او دُہرا۔

(۹) عطر مجموعہ (موتیا، حنا، جوہی، کیوڑہ، اگر، بیلا، چنبیلی، مشک وغیرہ

(۱۰) مذکورہ بالا اشیاء کے علاوہ دیگر اشیاء حسب فرمائش

مطبع نولکشور میں طباعت و اشاعت کتب کے ساتھ ساتھ "دفتری خانہ" کا جداگانہ انتظام کیا گیا اور اس کے علاوہ اسباب چھپائی مانند پتھر، پیچ، حروف ٹائپ، روشنائی، ہر قسم کا کاغذ اور دوسری متفرق اشیاء بھی فروخت ہوتی تھیں۔[۲۰] بابو پراگ نرائن نے منشی جی کے زمانے سے قرآن پاک کی طباعت کا خصوصی اہتمام دکھایا تھا۔ انھوں نے اسے برقرار رکھا اور اس کی اشاعت کے سلسلے میں نئے اقدام کیے مثلاً یہ کہ ایک حمایل عکسی لندن سے چھپوا کر شائع کیا تھا جو ۴۰۶ صفحات پر مشتمل تھا جس کی صحت پر ہندوستان کے ۱۶ حافظوں اور قاریوں کی مہریں ثبت ہیں۔ نفیس سفید ولایتی کاغذ، عمدہ پاکیزہ خط، ہر صفحہ کے چاروں طرف خوشنما بیل کا حاشیہ ہے، پیشانی پر نام پارہ و سورہ و منزل درج ہے اور حاشیہ پر رکوع کے نشان ہیں۔ مجلد کا ہدیہ صرف ایک روپے چار آنے اور غیر مجلد کا ایک روپیہ دو آنے تھا۔[۲۱]

اسی طرح ان کے زیر اہتمام ایک "قرآن شریف رنگین پیشانی" شائع ہوا تھا۔ یہ اپنے طرز کا پہلا قرآن مجید ہے جو ہندوستان میں پہلی بار نولکشور پریس سے شائع ہوا تھا۔ اس کی طباعت و اشاعت میں یہ جدت کی گئی تھی کہ ہر پارہ کی پیشانی پر منجملہ مقامات مقدسہ کے مضمون آیات کی مناسبت سے ایک مقام کا نقشہ دیا گیا ہے اور وہ نقشہ مع صفحہ اول کے مختلف رنگوں میں طبع کیا گیا ہے۔ چنانچہ پہلے، دوسرے، دسویں، تیرھویں، سترھویں اور بیسویں پارے کی پیشانی پر خانۂ کعبہ کا نقشہ شامل ہے۔ چوتھے پارہ پر کوہ احد کا نقشہ ہے، چھٹے اور اٹھارہویں پارے پر مسجد قوۃ الاسلام، چودھویں پر کوہ طور، پندرھویں، سولھویں، انیسویں، بائیسویں اور چوبیسویں پارے پر بیت المقدس، چھبیسویں پر رسول اکرمؐ کی جائے ولادت، اٹھائیسویں پر مسجد نبوی اور تیسویں پر غار حرا کا نقشہ ہے جہاں قرآن مجید کی سب سے پہلی آیت کریمہ "اِقْرَأ" نازل ہوئی تھی۔ یہ نقشے نہایت نفیس اور خوبصورت بنے ہوئے ہیں۔ رنگوں کا امتزاج بھی حسین اور دیدہ زیب ہے۔ مطبع نے اس نادر اڈیشن کو رجسٹرڈ بھی کرا دیا تھا تاکہ اس کی نقل نہ کی جا سکے۔ یہ قرآن پاک ۱۲۴ صفحات پر مشتمل تھا اور غیر مجلد کا ہدیہ صرف دو روپے آٹھ آنے مقرر کیا گیا تھا۔[۲۲]

منشی پراگ نرائن کو زراعت اور باغبانی کا بھی شوق تھا اور اس میدان میں بھی انھوں نے نئے اور اہم تجربات کیے۔ ایک بڑے صنعت کار اور سرمایہ دار ہونے کی وجہ سے انھیں بھارت نیشنل بینک دہلی اور بھارگوا کمرشل بینک کا ڈائرکٹر منتخب کیا گیا تھا۔ وہ یونائیٹڈ چیمبر آف کامرس کے صدر بھی تھے۔[۲۳]

اپنے والد کی طرح انھیں بھی توسیع تعلیم سے بڑی دلچسپی تھی۔ انھوں نے لکھنؤ اور الہ آباد یونیورسٹی کو اکیاون اکیاون ہزار روپے اور بنارس ہندو یونیورسٹی کو اکیس ہزار روپے کے گراں قدر عطیات دیے۔ وہ لکھنؤ میڈیکل کالج کے بانی ممبر تھے۔ انھوں نے پریہر ٹرسٹ کے نام سے ایک بڑا علاقہ تعلیم کی ترویج و اشاعت اور امور خیر کے لیے وقف کیا تھا۔ انھوں نے منشی نولکشور اور ان اہلیہ کی یادگار میں اس ٹرسٹ کی زیر نگرانی ٹلر روڈ لکھنؤ میں ہسپتال کے سامنے دو مندر ایک گھاٹ اور منشی نولکشور سنسکرت ودھیالیہ، قائم کیے تھے۔ مندرجہ ذیل اصحاب مذکورہ ٹرسٹ کے متولیان تھے:۔

پراگ نرائن بھارگو، گنگا پرشاد ورما ایڈوکیٹ، منشی باسدیولال، درین دیال، پیارے لال، کالی چرن اور متھرا پرشاد۔[۲۴]

رفاہ عام کے کاموں سے پراگ نرائن صاحب کو بھی بڑی دلچسپی تھی اور انھوں نے بھی منشی نول کشور کی طرح بہت سے تعلیمی اور سماجی کاموں کے لیے دل کھول کر چندے دیے، کتابیں دیں اور دوسری طرح اعانت کرتے رہے۔ ۱۹۰۹ء میں انھیں رائے بہادر کا خطاب ملا لیکن انڈین نیشنل کانگریس کے معاونین کی فہرست میں بھی ان کا نام ملتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ میانہ روی کے قائل تھے۔ ان کے خصوصی احباب میں لوکمانیہ تلک، لالہ لاجپت رائے، پنڈت مدن موہن مالویہ، پنڈت موتی لال نہرو، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی نیز مولانا ابوالکلام آزاد جیسے قومی رہنما شامل تھے۔ وہ یو۔ پی لیجس لیٹو کونسل اور امپیریل لیجس لیٹو کونسل آف انڈیا کے ممبر بھی ہوئے اور پہلی جنگ عظیم کے بعد انھیں امپیریل وار کونسل آف انڈیا، کا ممبر بھی نامزد کیا گیا تھا۔ انھوں نے "بھارگو سبھا"، کی تنظیم کا کام بھی انجام دیا اور اس کے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۱۶ء میں چوالیس سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔[۲۵]

[illegible]

[illegible] انھوں نے اپنے اپنے نام کے ایک ٹریڈ مارک [illegible]
[illegible] سے بےحد دلچسپی تھی اور انھوں نے اپنی

[illegible]

... عمال ممبری حیثیت سے ... [illegible]

... [illegible] ...

اور دیگر تحائف پیش کرتی تھیں ... [illegible]

بیمار اور ... کی ... [illegible]

زدگان کی امداد کے لیے بڑی بڑی رقوم دیں اور دیگر ... [illegible]

نے بہت سے بین الاقوامی اجتماعات میں ہندستان کی نمائندگی کے فرائض انجام دیے ہیں۔ وہ نول کشور سنسکرت ودھیالیہ کی صدر اور جبلی کالج لکھنؤ مجلس عاملہ کی رکن ہیں۔

رانی صاحبہ اسٹیٹ وائلڈ لائف بورڈ کی واحد خاتون ممبر رہ چکی ہیں۔ انھیں شکار کا بڑا اچھا تجربہ حاصل ہے اور انھوں نے اب تک متعدد شیر مارے ہیں۔ وہ پوسٹ اینڈ ٹیلیگراف ریجنل ایڈوائزری بورڈ یو۔پی، اور اسٹیٹ سنگیت ناٹک اکیڈمی کی ممبر بھی ہیں۔ اس کے علاوہ پرنس برائن اسپورٹس کلب کی صدر۔ اور لکھنؤ زولوجیکل گارڈن ایڈوائزری بورڈ کی ممبر رہ چکی ہیں۔

اُن کی ان غیر معمولی سماجی خدمات، تعلیم اور کھیل کود وغیرہ سے دلچسپی کے باعث انہیں گورنر یو۔پی نے ۱۹۶۶ء میں یو۔پی۔ لیجسلیٹو کونسل کا ممبر نامزد کیا تھا اور ۱۹۸۱ء میں حکومت ہند نے انھیں پدم شری کے خطاب سے نوازا۔

مال ومتاع کی فراوانی اور عزت وجاہ کی ارزانی کے باوجود رانی صاحبہ بڑی خوش اخلاق، ملنسار، کریم النفس اور فیاض ہیں۔ وہ قومی یکجہتی کی علمبردار، ایک انسانیت دوست خاتون کی حیثیت سے سماج میں ایک ممتاز مقام کی حامل ہیں۔ وہ انتہائی منکسر المزاج ہیں، سب کا دکھ درد سنتی ہیں اور بلا تفریق مذہب وملت کسی کی مدد سے دریغ نہیں کرتی ہیں۔

راج کمار ڈاکٹر رنجیت کمار بھارگو: راجہ رام کمار بھارگو کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر رنجیت کمار بھارگو ۲۶ ستمبر ۱۹۴۵ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی وثانوی تعلیم لامارٹینیر کالج لکھنؤ میں حاصل کی۔ انھوں نے ایم۔اے پولیٹیکل سائنس کی ڈگری لکھنؤ یونیورسٹی سے فرسٹ کلاس میں حاصل کی۔ اور ہندستان کی خارجہ پالیسی پر اسی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کیا۔ بین الاقوامی تعلقات کے ایک ماہر کی حیثیت سے انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ سیاسیات میں ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۹ء تک تدریسی خدمات بھی انجام دیں۔

ڈاکٹر بھارگو خانوادہ نولکشور کے ایک ۳۵ سالہ ہونہار نوجوان ہیں جن سے مستقبل میں بڑی توقعات وابستہ ہیں۔ اس خاندان نے جنوبی ایشیا کی سماجی وتہذیبی تاریخ میں نمایاں اور امتیازی مقام حاصل کیا۔ اسلامی اور آرین علوم وفنون کے ارتقا میں بھی اس گھرانے کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ مئی ۱۹۸۰ء میں ڈاکٹر بھارگو کو بین الاقوامی خیر سگالی کے کارکن کی حیثیت سے اس کم عمری میں صدر فیڈرل ریپبلک آف جرمنی کی طرف سے "RITTER (KNIGHT) OF THE ORDER OF MERIT" کا اعزاز عطا کیا گیا جو اتنے کم عمر شخص کو اس سے قبل نہیں دیا گیا تھا۔ یہ اعزاز ڈاکٹر بھارگو سے قبل صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ایس رادھا کرشنن اور جناب جے۔ آر۔ ڈی ٹاٹا کو ملا تھا۔ ڈاکٹر بھارگو اس اعزاز کے اہل اس لیے قرار دیے گئے کہ انھوں نے سماجی، تہذیبی اور علمی میدانوں میں ہندستان اور جرمنی کے درمیان دوستی کی بنیادیں مضبوط کیں نیز ہندستان اور جرمنی کے باہمی تعاون سے پہاڑوں کی بلندیوں پر چڑھنے اور جنگلات کے تحفظ کے سلسلے میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ وہ ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۹ء تک انڈو جرمن کلچرل سوسائٹی یو۔پی کے صدر رہے۔ [illegible]ء میں انھیں حکومت مغربی جرمنی نے خیر سگالی کے دورہ پر جرمنی مدعو کیا۔ ۱۹۷۶ء سے ۱۹۷۹ء تک وہ انڈو عرب فرینڈشپ سوسائٹی یو۔پی کے صدر اور ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۹ء تک انٹرنیشنل افیرس فورم لکھنؤ کے کنوینر رہے نیز ۱۹۷۸ء سے نول کشور اکیڈمی لکھنؤ کے صدر ہیں۔

گزشتہ پندرہ سال سے ڈاکٹر بھارگو سماجی کاموں میں بھی نمایاں دلچسپی لے رہے ہیں۔ ۱۹۶۵ء کی ہند پاک جنگ کے دوران انھوں نے قومی دفاعی فنڈ کے لیے رقوم فراہم کیں اور جوانوں کے لیے خون کا عطیہ دینے والوں کی فہرست مرتب کی۔ ۱۹۶۶-۶۷ء کے دوران لکھنؤ میں خشک سالی سے متاثر ہونے والوں اور ۱۹۷۱ء کے سیلاب سے متاثر ہونے والوں کے لیے فلاحی کام انجام دیے۔ ڈاکٹر بھارگو کی عوامی زندگی کا آغاز لکھنؤ یونیورسٹی کی پارلیمنٹ کے لیڈر اور پرائم منسٹر کی حیثیت سے ہوا۔ وہ بھارت یووک سماج کے نائب صدر، گاندھی میموریل لائبریری یو۔پی کے جنرل سکریٹری، یوتھ اینڈ اسٹوڈنٹ کونسل یو۔پی کے صدر بھی رہے۔ اس کے علاوہ یو۔پی کے متعدد تعلیمی اداروں کی مجلس

استظامیہ سے بھی ان کی وابستگی رہی ہے نیز وہ ایک اسکاؤٹ بھی ہیں۔ جنگلات کے تحفظ سے انھیں خصوصی دلچسپی رہی ہے اور اس کے لیے انھوں نے بہت کام کیا ہے۔ وہ یو۔پی۔ اسٹیٹ وائلڈ لائف ایڈوائزری بورڈ کے ممبر اور اعزازی وائلڈ لائف وارڈن ہیں۔ انھیں نوجوانی ہی سے پہاڑوں کی چوٹیاں سر کرنے کی مہم سے گہری دلچسپی رہی ہے اور وہ نینی تال ماؤنٹینیرنگ کلب کی لکھنؤ شاخ کے صدر بھی رہے ہیں۔

ڈاکٹر بھارگو نے نولکشور اسٹیٹ کی گرتی ہوئی معیشت کو اپنی سوجھ بوجھ اور فطری و خاندانی ذہانت سے سنبھالنے کی کوششیں کم عمری ہی سے شروع کر دیں اور اس میں نمایاں کامیابی بھی حاصل کی۔ وہ ایک مہذب باشعور اور ہونہار نوجوان ہیں جن کا مسلک صلح و آشتی ہے۔ وہ اپنے خاندان کی عظمت کے محافظ ہیں اور اس کے ارتقا کے لیے کوشاں بھی رہتے ہیں۔ انھوں نے فرنچ، جرمن، اردو اور عربی زبانیں بھی سیکھی ہیں اور سیاست عالم پر تازہ ترین کتابوں اور رسائل کا مطالعہ ہی ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ انھیں مذہب سے گہرا لگاؤ ہے لیکن وہ تنگ نظری سے کوسوں دور ہیں۔ مذاہب عالم کے تقابلی مطالعہ سے بھی گہری دلچسپی ہے اور وہ ہر مذہب کی اعلیٰ تعلیمات کے مداح ہیں۔

ڈاکٹر بھارگو کی اہلیہ ڈاکٹر "کنک لتا" ایم۔بی۔بی۔ایس ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں اور ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے اپنے شوہر کے دوش بدوش سماجی خدمات انجام دیتی رہتی ہیں۔[10] "انرودھ" ان کے ہونہار بیٹے کا نام ہے جو نینی تال کے ایک انگلش اسکول میں زیر تعلیم ہے۔

کنور تیج کمار بھارگو: راجہ رام کمار بھارگو کے چھوٹے بھائی ہیں۔ آپ کی ولادت ۵ دسمبر ۱۹۲۵ء کو ہوئی۔ ابھی عمر کے پندرہ دن گزرے تھے کہ ماں کے سایہ سے محروم ہوگئے اور پانچ سال کی عمر میں باپ کی بھی رحلت ہوگئی۔ آپ نے کالون تعلقدارس کالج لکھنؤ اور لکھنؤ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۴۳ء میں شریمتی کملا بھارگو سے آپ کی شادی ہوئی۔ تیج کمار صاحب کو اپنے کاروبار سے بڑی دلچسپی رہی ہے۔ ۱۹۴۶ء ہی سے انھوں نے پریس اور بک ڈپو کے انتظامات میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ تقسیم نولکشور پریس کے بعد سے ان کا اپنا ادارہ "تیج کمار بک ڈپو" کے نام سے چل رہا ہے۔ اس ادارہ کی طرف سے قدیم کتابوں کے نئے ایڈیشن حواشی اور صحت کے ساتھ نکلتے رہتے ہیں اور اب یہ ادارہ ایک پرائیویٹ لمیٹڈ فرم کی حیثیت سے چل رہا ہے۔ اس ادارہ کی بدولت متعدد قدیم اور کمیاب کتب کے نئے ایڈیشن منظر عام پر آچکے ہیں۔

کنور صاحب کی اہلیہ شریمتی کملا بھارگو بھی سماجی خدمات کے سلسلے میں مشہور ہیں۔ وہ متعدد تعلیمی اور سماجی اداروں سے وابستہ ہیں۔ کنور صاحب کی صرف دو صاحبزادیاں ہیں۔

★

"حوالہ جات"

۱ جیون چرتر (اردو) از منشی لال جی تالیف ۱۹۵۶ بکرمی مطبوعہ نولکشور پریس ۱۹۰۲ء صفحہ ۲۔ ۲ جیون چرتر (ہندی) از پنڈت بندی دین دیکشت تالیف ۱۹۰۵ء مطبوعہ نولکشور پریس مئی ۱۹۰۵ء صفحہ ۲۔ ۳ منظوم سوانح نولکشور (مخطوطہ ۱۹۰۵ء) ملکیت راج کمار ڈاکٹر رنجیت کمار بھارگو، از ماتا دین عرف نیساں لکھنوی۔ ۴ ایضاً صفحہ ۲-۳ ۵ نیساں: منظوم سوانح نولکشور (مخطوطہ) ۶ جیون چرتر (ہندی) صفحہ ۴ ۷ نیساں: منظوم سوانح نولکشور (مخطوطہ) ۸ جیون چرتر (ہندی) صفحہ ۴ ۹ ایضاً صفحہ ۵ ۱۰ جیون چرتر (اردو) صفحہ ۳ (۱۹۵۱ بکرمی) مطابق ۱۸۹۵ء ۱۱ نیساں: منظوم سوانح نولکشور (مخطوطہ)۔ ۱۲ رجسٹر چھپائی نولکشور پریس ۱۳ WHO IS WHO IN INDIA IV P. 169 ۱۴ ایضاً ۱۵ ڈاکٹر سرور قیوم: "نیازم بر نسب نیست" زمانہ اودھ نولکشور نمبر مارچ ۱۹۸۰ء صفحہ ۵۔ ۱۶ رانی لیلا رام کمار بھارگو: "منشی نولکشور حقائق کی روشنی میں" فروغ اردو مارچ ۱۹۸۰ء صفحہ ۴۰ واودھ اخبار مورخہ ۱۸ مارچ ۱۹۱۰ء ۱۷ WHO IS WHO IN INDIA-1911 ۱۸ راج کمار ڈاکٹر رنجیت کمار بھارگو (وارث نولکشور پریس) سے ایک انٹرویو ۱۹

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۲۶ پر)

ڈاکٹر رنجیت کمار بھارگوا

منظوم سوانح منشی نول کشور

از نسیاں لکھنوی

(تصنیف ۱۸۹۶ء)

[منشی نول کشور کے عظیم کارناموں نے ان کا تعارف دنیا کے ہر اہل علم سے کرا دیا ہے۔ "مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید" کے مصداق منشی جی کی خدمات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ منشی ماتا پرشاد نسیاں لکھنوی نے ان کی داستان حیات نظم کی تھی جو آج تک شائع نہیں ہو سکی۔ نسیاں صاحب نے خود منشی جی کے عہد میں ان کے مطبع میں عرصہ تک بعض خدمات انجام دی تھیں اور ان کے بعد بھی اس ادارے سے وابستہ رہے۔ نسیاں لکھنؤ کے ایک علم دوست کایستھ خاندان کے فرد تھے۔ شعر و شاعری ان کو ورثہ میں ملی تھی۔ ان کے پردادا منشی اودے راج متطلع اور دادا منشی ایشوری پرشاد شعاعی فارسی کے خوش گو شاعر تھے۔ نسیاں کے ایک بھائی منشی رام سہائے تمنا اردو کے نہایت اچھے شاعر تھے۔ دوسرے بھائی منشی دوارکا پرشاد اُفق نے بہت شہرت حاصل کی۔ انھوں نے "الف لیلیٰ" کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا تھا جو سوا جلدوں پر مشتمل تھا اور مطبع نول کشور سے شائع ہو چکا ہے۔ خود ان کا اپنا مطبع "نظم اخبار" کے نام سے نوبستہ لکھنؤ میں تھا اور متفرق ضروریات کی کتابیں شائع کرتا رہتا تھا۔ غرض کہ نسیاں کا پورا خاندان محلہ نوبستہ لکھنؤ میں آباد تھا اور علم و فضل، شعر و ادب کے سلسلے میں مشہور تھا۔ اُفق لکھنوی کے خلف جناب شور لکھنوی بھی اپنی زود گوئی اور موزونی طبع کے لیے مشہور ہوئے۔

پیش نظر مسدس میں شاعرانہ خوبیوں کی تلاش بے سود ہے لیکن اس کی اہمیت اس حیثیت سے بہت زیادہ ہے کہ منشی نول کشور کے حالات زندگی کا ایک مستند خاکہ اس میں موجود ہے۔ پھر ایک ایسے شخص کی تخلیق ہے جو ان کا ہم عصر اور شریک کار رہا اور اس کے خاندان کے بیشتر افراد بھی مطبع نول کشور سے وابستہ رہے۔ اس نظم سے بعض ایسی معلومات مل جاتی ہیں جو دوسری جگہ نہیں ملتیں۔ نظم میں جہاں کہیں افراد، مقامات اور اداروں کے نام آئے ہیں یا دوسرے توضیح طلب امور نظر آئے ان کی تشریح حواشی میں کر دی گئی ہے — رنجیت کمار]

منشی نول کشور جو مشہور عام تھے
ذی فخر و ذی وقار تھے ذی احتشام تھے
جو وصف چاہیے تھے وہ ان میں تمام تھے
دنیا میں نامور تھے بڑے نیک نام تھے
کام ایسے ایسے کر گئے اپنی حیات میں
ان کی بہار ہے چمن کائنات میں

فضل خدا سے پانچ پسر نامدار تھے
سب نکتہ سنج و نکتہ ور و ہوشیار تھے
سب خوبیوں میں فرد تھے سب ہونہار تھے
سب خاندان کے لیے گویا بہار تھے
لیکن سبھوں میں فرد یہی ذات پاک تھی
ان ہی سے کل کی سارے زمانے میں ناک تھی

متھرا میں ریڑھا گاؤں جو مرغوب ہے مقام
مشہور خاص و عام ہے جس سرزمیں کا نام
رکھتے تھے ان کے والد ماجد وہاں قیام
خوش طالعی پہ اپنی جنھیں ناز تھا مدام
ناجی رئیس و صاحب اولاد و مال تھے
اقبال مند ان ایسے جہاں خال خال تھے

پھیلایا جب جہان میں ان کی جبیں نے نور
اٹھارہ سو پہ بانوے سمبت کا تھا ظہور
چھوٹوں بڑوں کو سب کو تھا اس جشن سے سرور
فضل خدا نے رکھا انھیں چشم بد سے دور
سب سے مبارک ان کے تولد کا سال تھا
جلوہ یہ ان کا کل کے لیے نیک فال تھا

ان کے حسین جانفزا سے تھی سب کو خوشی کمال
یہ نونہال دیکھ کے ہر ایک تھا نہال
القصہ پڑھ گاؤں میں گزرے جو پانچ سال
ان کے پتا کے دل میں یہ پیدا ہوا خیال
تعلیم ہو سکے گی نہیں اس مقام میں
بہتر ہے سب سے چلو اصلی گرام میں

آباد جب مکاں میں یہ آ کر مکیں ہوئے
پہلے تھا گھر جہاں یہ متمکن وہیں ہوئے
بچپن ہی سے یہ نکتہ و نکتہ بیں ہوئے
پڑھنے کو چھٹویں سال میں مکتب نشیں ہوئے
جودت سے شوق انھیں تھا جو کسب کمال میں
تحصیل علم خوب ہوئی پانچ سال میں

اب تو ذہانت اور بھی ان کی رسا ہوئی
پہلے سے بھی وہ فہم و فراست سوا ہوئی
اس ابتدا سے شوق کی یہ انتہا ہوئی
حاصل خدا کے فضل سے ہر مدعا ہوئی
القصہ دس برس میں یہ منزل تمام کی
تحصیل علم جو تھی وہ حاصل تمام کی

کالج میں درس کے لیے داخل یہ اب ہوئے
مصروف لکھنے پڑھنے میں یہ روز و شب ہوئے
ہر امتحان میں یہ ہوئے پاس جب ہوئے
ان کی لیاقتوں پہ فدا لوگ سب ہوئے
یہ اپنی ہر صفت میں جو موصوف ہو گئے
مشہور کیسے عام میں معروف ہو گئے

ان کا اثر جو پھیل گیا خاص و عام میں
قدرت سے لگ گئے پر سرخاب نام میں
مشاق پورے ہو گئے ہر ایک کام میں
آئی ہمائے عز و شرف ان کے دام میں
پھر تو کچھ اور ان کے خیالات ہو گئے
چھوٹے بڑے تھے وہ سب مات ہو گئے

اخبار آگرہ میں جو تھا آگرہ "سفیر"
مضموں نگار اس کے تھے منشی بے نظیر
لکھے مضامین اس میں وہ دلچسپ دل پذیر
ہم پلہ کوئی بھی نہ تھا ہم عصر و ہم صفیر
عزت کے ساتھ سب نے انھیں پر نگاہ کی
آتی تھی ہر طرف سے صدا واہ واہ کی

نامی بڑا تھا مطبع و اخبار "کوہ نور"
خوش انتظامی اس کی تھی مشہور دور دور
یہ حال حسن کے دل میں جو پیدا ہوا سرور
سوچے کہ سال وہاں کچھ سیکھئے ضرور
ان کی بھی دل سے مالک مطبع کو چاہ تھی
دونوں میں ارتباط و محبت کی راہ تھی

اعلیٰ لیاقتوں کا بڑا قدر داں ملا
پر شفیق حال ملا مہرباں ملا
ڈھونڈا جسے انھیں وہ بصد عز و شاں ملا
جو کچھ خیال دل میں تھا وہ سب یہاں ملا
جب منیجر یہ مطبع لاہور کے ہوئے
حاصل کل اختیار انھیں ہر طور کے ہوئے

القصہ تین سال تک اس کام پر رہے
خورسند اُدھر وہ اور یہ راضی اِدھر رہے
مصروف کاروبار میں شام و سحر رہے
اوصاف خیر خواہی کے مد نظر رہے
کون ان سے بڑھ کے اور کوئی خیر خواہ تھا
قبضے میں ان کے سارا سفید و سیاہ تھا

آفت جو ایک مالک مطبع پہ آ گئی
داغ آبرو میں بیٹھے بٹھائے لگا گئی
وحشت دلوں میں چھوٹوں بڑوں کے سما گئی
مایوسیوں کی آندھی نگاہوں میں چھا گئی
پوری نہ کوششیں ہوئیں کوئی امید میں
افسوس پھر بھی ڈالے گئے سخت قید میں

تشویش دل میں بڑھ گئی اس طرفہ حال سے
چوٹ ان کے دل پہ سخت لگی اس ملال سے
ان کی محبت اور وفا کے خیال سے
امداد انھوں نے قید میں کی زر سے مال سے
ساعی رہائی کے لیے بے انتہا ہوئے
ان کے سبب سے مالک مطبع رہا ہوئے

سر سے اتارا بوجھ جو یہ بھاری دیکھ کر
مداح سب تھے ان کی وفاداری دیکھ کر
ان کوششوں کی محنتیں یہ ساری دیکھ کر
دانائی ان کی دیکھ کے ہشیاری دیکھ کر
یہ بات خاص و عام کو معلوم ہوگئی
لاہور بھر میں ان کی بڑی دھوم ہوگئی

ان کی رفاقتوں میں گزارے جو پانچ سال
خوش نیتی کے ساتھ یہ پیدا ہوا خیال
کچھ دیس کی بھلائی میں حاصل کرو کمال
ہمت کے آگے بات یہ کوئی نہیں محال
ان کی ملازمت سے اب انکار ہی کرو
جاری اک اپنا پرچۂ اخبار ہی کرو

اس میں رفاہ خاص بھی ہے اور عام بھی
نکلے گا اس سے اور ان کا اور اپنا کام بھی
ہیں گٹھلیوں کے دام بھی کھانے کو آم بھی
ہوگا فلاح دین میں، دنیا میں نام بھی
اس خوبی خیال سے یہ خوش بڑے ہوئے
سب کاروبار چھوڑ کے بس اٹھ کھڑے ہوئے

آئے جو لکھنؤ میں تو تازہ بہار تھی
حامی نصیب تھا مدد کردگار تھی
لشکر ان کو اپنے کام کی لیل و نہار تھی
دل میں جمی جو تھی وہی بس ہوبہار تھی
ہمت بڑھی تو ان پہ خدا کا کرم ہوا
سب ساز جمع ہوگئے ساماں بہم ہوا

حکام وقت ان کے جو ہم راز ہوگئے
دمساز و دل نواز و ہم آواز ہوگئے
پورے جو کاروبار کے انداز ہوگئے
امید و کامیابی کے در باز ہوگئے
پھر تو نہ کاروبار میں کوئی خلل پڑا
دریا جو دل میں جوش کا تھا وہ ابل پڑا

خوش طالعی کے ساتھ جو تقدیر لڑ گئی
محنت سے ان کی فکر جو رنگت پکڑ گئی
شہرت بالکے جی میں یہی بات گڑ گئی
اخبار و کارخانے کی بنیاد پڑ گئی
مطبع سے جاری یہ اودھ اخبار ہوگیا
خوبی کے ساتھ دیس کا ایکا ہوگیا

کھولیں انھوں نے راہیں سب اصلاح و خیر کی
جو بات حیث کی وہ تعصب بغیر کی
خوبی تھی ان میں رشک و حسد کی نہ بیر کی
شکوہ کیا نہ اپنا، شکایت نہ غیر کی
اخبار وہ نکالا جو عالم پسند ہے
مضموں ہر ایک آئینۂ وعظ و پند ہے

اخبار کی اشاعت تازہ یہ جب ہوئی
ہر شہر و ہر دیار میں اس کی طلب ہوئی
تحریر خالی لطف سے کوئی بھی کب ہوئی
حکام خوش تو شاد رعایا بھی سب ہوئی
القصہ وہ ترقی ہوئی کارخانے کو
حیرت کہاں کی، اس کا حسد تھا زمانے کو

مقبول خاص و عام یہ اخبار ہوگیا
دیکھا جسے وہ اس کا خریدار ہوگیا
کچھ ایسا جوشِ گرمیِ بازار ہوگیا
جس کو طلب نہ تھی وہ طلبگار ہوگیا
ہر ایک اس کو دیکھ کے گرویدہ ہوگیا
عالم فدائے صورت نادیدہ ہوگیا

مالی خیال افسر و حکام مل گئے
ہر ایک کی طرف سے پیغام مل گئے
سب تازہ حکم سب نئے احکام مل گئے
سرکاری چھاپنے کے لیے کام مل گئے
کثرت کچھ ایسی ہوگئی فرمائشات کی
ہر کام کیا ترقی ہوئی بات بات کی

پھر تو ترقی ہونے لگی کارخانے کی
فرمائشات آنے لگیں کل زمانے کی
تدبیریں سوچیں علم و ہنر کے بڑھانے کی
ارزاں کتابیں ہوگئیں پڑھنے پڑھانے کی
درسی کتب کا مول گھٹا کارخانے میں
ہاتھ آیا مال روپیہ کا چار آنے میں

جو جو کتابیں اہل جہاں کو تھیں دل پسند
جو یا تھے جن کتابوں کے ارباب عقلمند
تھے نسخہ جات شاہی کتب خانوں میں جو بند
مجموعۂ نصائح و اخلاق و وعظ پند
صرف کثیر کرنا پڑا ان کے واسطے
ہوتا تھا اہتمام بڑا ان کے واسطے

ہاتھ آگئی نئی کہ پرانی کتاب انھیں
تصنیف مل گئی جو کوئی لاجواب انھیں
اس کے خریدنے میں نہ تھا پیچ و تاب انھیں
جو خرچ ایسی مد میں کرنا پڑا بے حساب انھیں
اہل کمال لوگوں کی عزت دو چند کی
صرف کثیر کرنے میں مٹھی نہ بند کی

پھیلایا ہر دیار میں علم و ہنر کا جوش
نزدیک و دور بھیج کے ایجنٹ اہل ہوش
بٹھلا دیے نئے نئے صدہا کتب فروش
یہ دیکھ دیکھ کے تھا خریداروں کو خروش
مجمع اس طرح جو علم کا بازار ہو گیا
ارزاں یہ مال بھر خریدار ہو گیا

دربار دلی میں اپنی یہ حاتم مثال تھے
سب مستفیض ملک میں اہل کمال تھے
طلاب اکثر ان کی مدد سے نہال تھے
پورے انھیں کے فیض سے سب کے سوال تھے
ناداروں کو وظیفے دیے اور نہیں دی
جو دی مدد انھوں نے سبھوں سے دہ بین ذی

ہر طرح سے انھیں تھا خیال رفاہ عام
صرف کثیر سے کیا معقول انتظام
تیمار دار ڈاکٹر بھی ملازم رہے مدام
مفلس مریضوں کے جو معالج تھے صبح و شام
رہنے کو تھے مکان بھی ہوتی دوا بھی تھی
ماشی یہاں سے ایسوں کو پوری غذا بھی تھی

سرکار اس روش سے بہت مہرباں ہوئی
خاص ان کی نیکیوں کی بڑی قدر داں ہوئی
تعریف ان کی ہونے لگی بس جہاں ہوئی
ان کی عزت اوروں کو حاصل کہاں ہوئی
حکام ان سے شاد جو بے حد و عد ہوئے
درباریوں میں منتخب و نامزد ہوئے

تمغاے افتخار و شرف اور بھی ملا
پایا انھوں نے وہ جو نہ اب تک کبھی ملا
فضل خدا سے موقع خوش طالعی ملا
پایا خطاب تمغہ سی۔ آئی۔ ای ملا
یہ بڑھ گئے کل اہل مطابع سے شان میں
ہم پلہ ان کا کون تھا ہندوستان میں

ہے یہ الہ آباد میں جو یونی ورسٹی
سرکار نے وہاں کی بھی دی ان کو ممبری
ممبر یہ منتخب ہوئے میونسپل کے بھی
آئی پسند انھوں نے جہاں پر جو راے دی
افسر یہ آنریری ہوئے جیل خانے میں
دھوم ان کے اس وقار کی تھی کل زمانے میں

کلکتہ میں جو موقع دربار آگیا
فوراً اِدھر خط آیا اُدھر تار آگیا
طلبی میں حکم نامۂ سرکار آگیا
گویا نوید طالعِ بیدار آگیا
فخر و وقار شرکتِ دربار سے ہوا
الطاف سے عنایتِ سرکار سے ہوا

بگڑے ہوئے بناتا ہے ہر کام کارساز
جو سب سے بڑھ کے پاک ہے جو سب سے بے نیاز
ان کے لیے کیا در اُمید اُس نے باز
دیکھا اسے جو آیا تھا کلکتہ میں جہاز
نیلام کرنے کے لیے سب اس میں مال تھا
جس کے خریدنے کا نہ اصلا خیال تھا

کاغذ جو اس میں تھا وہ ہوا سب کے ناپسند
اس مال کی نکاسی کے رستے ہوئے تھے بند
سب جانتے تھے اس کی خریداری میں گزند
کیا فائدے کا ذکر کہ نقصان تھا دوچند
واپس جب اس کے سارے خریدار ہوگئے
یہ سارا مال لینے کو تیار ہوگئے

حیرت تھی اور لوگوں کو یہ حال دیکھ کر
سب خندہ زن تھے طرفہ تر احوال دیکھ کر
سودا نیا یہ دیکھ کے یہ مال دیکھ کر
کہتے تھے لوگ ان کو بد اقبال دیکھ کر
منشی نول کشور جو آنے کو آئے تھے
دراصل اپنی پونجی گنوانے کو آئے تھے

جو لوگ ساتھ تھے یہی ان کا خیال تھا
اتنے بڑے خسارے سے سب کو ملال تھا
بالکل ردی یہ سب کی نگاہوں میں مال تھا
سب کو اس آئینہ میں نظر آتا بال تھا
منشی نول کشور کو لیکن یہ غم نہ تھا
اس کاغذی جہاز میں سودا کچھ کم نہ تھا

مطلق نہ ان کو فکر تھی اس بار اٹھانے سے
ان کا جدا خیال تھا سارے زمانے سے
منگوایا نقد روپیہ کچھ کارخانے سے
بیوپاریوں سے کچھ لیا کچھ خزانے سے
اس طرح قیمت اس کی تمام ادا ہوئی
جو ابتدا تھی اس کی یہی انتہا ہوئی

القصہ مال کھولا گیا اب جہاز کا
آکر تماشہ دیکھتے تھے سب جہاز کا
تیزی سے مال اترنے لگا جب جہاز کا
سوداگروں پہ حال کھلا تب جہاز کا
کھوٹا جو مال تھا وہ کھرا مال ہوگیا
یاور نول کشور کا اقبال ہوگیا

کاغذ کا جابجا جو یہ انبار ہوگیا
دریا پہ گویا مصر کا بازار ہوگیا
جو آیا دیکھنے وہ خریدار ہوگیا
دم میں ہزاروں لاکھوں کا بیوپار ہوگیا
ٹوٹے پہ ٹوٹے آنے لگے تھوڑی دیر میں
لاکھوں کے وارے نیارے ہوئے ایک پھیر میں

نکروں سے اب یہ پورے سبک دوش ہوگئے
اندیشۂ گزند فراموش ہوگئے
جو قیل و قال کرتے تھے خاموش ہوگئے
شرما گئے حجاب سے روپوش ہوگئے
سوداگروں کے بیچ میں ہلچل یہ پڑ گئی
منشی نول کشور کی تقدیر لڑ گئی

سودا اِدھر یہ نقد کیا، گھر اُدھر چلے
سوداگروں کو سوچنے سے سودائی کر چلے
لاکھوں کے وارے نیارے کیے نئے کے زر چلے
واپس وطن سفر سے بہ فتح و ظفر چلے
اس کے علاوہ مال ہزاروں کا ساتھ تھا
دونوں بھرے تھے [illegible] مال [illegible] تھا

سبے نرالا ان کی تجارت کا ڈھنگ تھا
یہ سود و نفع دیکھ کے ہر ایک دنگ تھا
ہر طرح سے ترقیِ مطبع کا رنگ تھا
پہلے کا یہ فراخ مکان اب تو تنگ تھا

اس زیادتی سے سب نیا سامان بڑھ گیا
جو ولولہ تھا بڑھ گیا ارمان بڑھ گیا

پہلے سے اب تو بڑھ گئی مطبع کی شان اور
کچھ اور ٹھاٹھ ہو گئے اب آن بان اور
پہلے سے نام اور بڑھا اب نشان اور
پہلا مکان چھوڑا، خریدا مکان اور

لیکن یہ کارخانہ جو ان کا عظیم تھا
تنگی میں یہ بھی مثلِ مکانِ قدیم تھا

اب اور بھی اضافہ ہوا کاروبار میں
تعداد میں حساب و عدد میں شمار میں
گل اور پھولنے لگے اس گلعذار میں
تازہ بہار اور ہوئی اس بہار میں

قرب و جوار میں نئی املاک بن گئی
یہ سرزمین رشکِ صد افلاک بن گئی

پھر بھی نہ کارخانے کی اس میں بسر ہوئی
تنگی جگہ کی سب کے لیے دردِ سر ہوئی
ترمیم اِدھر ہوئی کبھی ترمیم اُدھر ہوئی
وافر جگہ نہ پھر دفعتہً مگر ہوئی

پھر تو انھوں نے اور نئی راہیں کھول لیں
جو کوٹھیاں قریب میں تھیں سب وہ مول لیں

پھر بھی یہ ان کی تاب و توانائی دیکھیے
یہ سیر چشمی حوصلہ افزائی دیکھیے
یہ ہوشیاری دیکھیے دانائی دیکھیے
اپنی تجارت اور بھی پھیلائی دیکھیے

اس کارخانے سے نہ جو پوری کسر ہوئی
ہر طرح سے ترقی پہ ان کی نظر ہوئی

مشہور ہیں زمانے میں جو شہر دور دور
لاہور، دہلی، آگرہ، اجمیر، کانپور
اپنی رسائیوں سے وہاں بھی کیا ظہور
پھیلایا جا کے جہل کی تاریکیوں میں نور

گن گن کے ہم سے پوچھیے کس کس مقام میں
پھیلا ہو نور ان کا نہ جس جس مقام میں

جاری ہیں ان کے مطبع و اخبار ہر طرف
یہ مال ہر طرف ہے خریدار ہر طرف
چھایا ہوا ہے ابرِ گہربار ہر طرف
پھیلا ہوا ہے نورِ پُر انوار ہر طرف

ہمت سے وہ فروغ دیا کاروبار کو
درکار عمرِ خضر ہے جس کے شمار کو

جو جو ارادے دل میں تھے سب پورے کر دیے
فیضِ رفاہِ عام سے دل سب کے بھر دیے
توڑے یہ توڑے جیب سے ہر بات پر دیے
صد ہا اِدھر دیے تو ہزاروں اُدھر دیے

ہر بات انھوں نے کی جو رفاہِ عوام کی
ٹھہریں ہیں مہر و ماہ یہ زرّاں کے نام کی

اس طرح سے ترقیِ اعزاز جب ہوئی
پہلے سے بڑھ کے اور ہی کچھ شان اب ہوئی
عزت ہوئی جو ان کی وہ اوروں کی کب ہوئی
دربارِ قیصری میں بھی ان کی طلب ہوئی

اس ملک کے رئیسوں میں ان کا شمار تھا
حاصل یہ افتخار و شرف یہ وقار تھا

لدھیانہ میں ہوا تھا جو دربارِ نامدار
اس میں بھی تھے شریک یہ منشیِ باوقار
ان کا بھی نامدار رئیسوں میں تھا شمار
بخشا تھا لفٹننٹ گورنر نے افتخار

یہ منشی جی کے واسطے دربار خاص تھا
مخصوص تھا یہ بھید یہ اسرار خاص تھا

کلکتہ میں جو موقعِ دربار آگیا
فوراً اِدھر خط آیا اُدھر تار آگیا
طلبی میں حکم نامۂ سرکار آگیا
گویا نویدِ طالعِ بیدار آگیا

فخر و وقار شرکتِ دربار سے ہوا
الطاف سے عنایتِ سرکار سے ہوا

بگڑے ہوئے بناتا ہے ہر کام کارساز
جو سب سے بڑھ کے پاک ہے جو سب سے بے نیاز
ان کے لیے کیا در امید اس نے باز
دیکھا اسے جو آیا تھا کلکتہ میں جہاز

نیلام کرنے کے لیے سب اس میں مال تھا
جس کے خریدنے کا نہ اصلا خیال تھا

کاغذ جو اس میں تھا وہ ہوا سب کے ناپسند
اس مال کی نکاسی کے رستے ہوئے تھے بند
سب جانتے تھے اس کی خریداری میں گزند
کیا فائدے کا ذکر کہ نقصان تھا دوچند

واپس جب اس کے سارے خریدار ہوگئے
یہ سارا مال لینے کو تیار ہوگئے

حیرت تھی اور لوگوں کو یہ حال دیکھ کر
سب خندہ زن تھے طرفہ تر احوال دیکھ کر
سودا نیا یہ دیکھ کے یہ مال دیکھ کر
کہتے تھے لوگ ان کو بد اقبال دیکھ کر

منشی نول کشور جو آنے کو آئے تھے
دراصل اپنی پونجی گنوانے کو آئے تھے

جو لوگ ساتھ تھے یہی ان کا خیال تھا
اتنے بڑے خسارے سے سب کو ملال تھا
بالکل ردی یہ سب کی نگاہوں میں مال تھا
سب کو اس آئینہ میں نظر آتا بال تھا

منشی نول کشور کو لیکن یہ غم نہ تھا
اس کاغذی جہاز میں سودا کبھو کم نہ تھا

مطلق نہ ان کو فکر تھی اس بار اٹھانے سے
ان کا جدا خیال تھا سارے زمانے سے
منگوایا نقد روپیہ کچھ کارخانے سے
بیوپاریوں سے کچھ لیا کچھ خزانے سے

اس طرح قیمت اس کی تمام ادا ہوئی
جو ابتدا تھی اس کی یہی انتہا ہوئی

القصہ مال کھولا گیا اب جہاز کا
آکر تماشہ دیکھتے تھے سب جہاز کا
تیزی سے مال اترنے لگا جب جہاز کا
سوداگروں پہ حال کھلا تب جہاز کا

کھوٹا جو مال تھا وہ کھرا مال ہوگیا
یاور نول کشور کا اقبال ہوگیا

کاغذ کا جا بجا جو یہ انبار ہوگیا
دریا یہ گویا مصر کا بازار ہوگیا
جو آیا دیکھنے وہ خریدار ہوگیا
دم میں ہزاروں لاکھوں کا بیوپار ہوگیا

تو ڑے پہ توڑے آنے لگے تھوڑی دیر میں
لاکھوں کے وارے نیارے ہوئے ایر پھیر میں

فکروں سے اب یہ پوچھئے سب خوش ہوگئے
اندیشہ گزند فراموش ہوگئے
جو قیل و قال کرتے تھے خاموش ہوگئے
شرما گئے حجاب سے روپوش ہوگئے

سوداگروں کے بیچ میں ہلچل یہ پڑگئی
منشی نول کشور کی تقدیر لڑ گئی

سودا اِدھر یہ نقد کیا، گھر اُدھر چلے
سوداگروں کو سودے سے سودائی کر چلے
لاکھوں کے وارے نیارے کیے لے کے زر چلے
واپس وطن سفر سے بہ فتح و ظفر چلے

اس کے علاوہ مال ہزاروں کا ساتھ تھا
دونوں بھرے تھے کوئی بھی خالی نہ ہاتھ تھا

سب سے نرالا ان کی تجارت کا ڈھنگ تھا
یہ سود و نفع دیکھ کے ہر ایک دنگ تھا
ہر طرح سے ترقیِ مطبع کا رنگ تھا
پہلے کا یہ فراخ مکان اب تو تنگ تھا
اس زیادتی سے سب نیا سامان بڑھ گیا
جو ولولہ تھا بڑھ گیا ارمان بڑھ گیا

پہلے سے اب تو بڑھ گئی مطبع کی شان اور
کچھ اور ٹھاٹھ ہو گئے اب آن بان اور
پہلے سے نام اور بڑھا اب نشان اور
پہلا مکان چھوڑا، خریدا مکان اور
لیکن یہ کارخانہ جو ان کا عظیم تھا
تنگی میں یہ بھی مثلِ مکانِ قدیم تھا

اب اور بھی اضافہ ہوا کاروبار میں
تعداد میں حساب و عدد میں شمار میں
گل اور پھولنے لگے اس گلعذار میں
تازہ بہار اور ہوئی اس بہار میں
قرب و جوار میں نئی املاک بن گئی
یہ سرزمین رشکِ صد افلاک بن گئی

پھر بھی نہ کارخانے کی اس میں بسر ہوئی
تنگی جگہ کی سب کے لیے دردِ سر ہوئی
ترمیم اِدھر ہوئی کبھی ترمیم اُدھر ہوئی
وافر جگہ نہ بہر دفاتر مگر ہوئی
پھر تو انھوں نے اور نئی راہیں کھول لیں
جو کوٹھیاں قریب میں تھیں سب وہ مول لیں

پھر بھی یہ ان کی تاب و توانائی دیکھیے
یہ سیر چشمی حوصلہ افزائی دیکھیے
یہ ہوشیاری دیکھیے دانائی دیکھیے
اپنی تجارت اور بھی چمکائی دیکھیے
اس کارخانے سے نہ جو پوری کسر ہوئی
ہر طرح سے ترقی پہ ان کی نظر ہوئی

مشہور ہیں زمانے میں جو شہر دور دور
لاہور، دہلی، آگرہ، اجمیر، کانپور
اپنی رسائیوں سے وہاں بھی کیا ظہور
پھیلایا جا کے جہل کی تاریکیوں میں نور
گن گن کے ہم سے پوچھیے کس کس مقام میں
پھیلا نہ نور ان کا نہیں جس مقام میں

جاری ہیں ان کے مطبع و اخبار ہر طرف
یہ مال ہر طرف ہے خریدار ہر طرف
چھایا ہوا ہے ابرِ گہربار ہر طرف
پھیلا ہوا ہے نورِ پُر انوار ہر طرف
ہمت سے وہ فروغ دیا کاروبار کو
درکار عمرِ خضر ہے جس کے شمار کو

جو جو ارادے دل میں تھے سب پورے کر دیے
فیضِ رفاہِ عام سے دل سب کے بھر دیے
توڑے یہ توڑے جیب سے ہر بات پر دیے
سو بار اِدھر دیے تو ہزاروں اُدھر دیے
ہر بات انھوں نے کی جو رفاہِ عوام کی
شہرت ہیں مہر و ماہ یہ ذرّاں کے نام کی

اس طرح سے ترقی اعزاز جب ہوئی
پہلے سے بڑھ کے اور ہی کچھ شان اب ہوئی
عزت ہوئی جو ان کی وہ اوروں کی کب ہوئی
دربارِ قیصری میں بھی ان کی طلب ہوئی
اس ملک کے رئیسوں میں ان کا شمار تھا
حاصل یہ افتخار و شرف یہ وقار تھا

لدھیانہ میں ہوا تھا جو دربار نامدار
اس میں بھی تھے شریک یہ منشیِ باوقار
ان کا بھی نامدار رئیسوں میں تھا شمار
بخشا تھا لفٹننٹ گورنر نے افتخار
یہ مشورت کے واسطے دربار خاص تھا
مخصوص تھا یہ بھید یہ اسرار خاص تھا

اس وقت سب بڑے بڑے سردار آئے تھے
سب خیر خواہ و تابع سرکار آئے تھے
یعنی امیر کابل و قندھار آئے تھے
بہر صلاح و شرکت دربار آئے تھے

دربار الگ امیر کا تھا بارگاہ میں
مشروط تھی یہ بات نئی رسم و راہ میں

یہ پہلے پہلے آئے تھے ہندوستان میں
اتنوں میں سب سے بڑھ کے یہ تھے آن بان میں
تھا ساتھ جو وزیر بڑی عز و شان میں
ہر بات ان سے کہتا تھا پشتو زبان میں

انگریزی اردو فارسی یہ جانتے نہ تھے
بے جانے یہ ہر ایک کو پہچانتے نہ تھے

آمادہ راجہ لوگ ہوئے نکتہ چینی پر
درپے تمام ہوگئے اس عیب بینی پر
آپس میں بحث تھی اسی امر یقینی پر
منشی نول کشور کی کرسی نشینی پر

یہ ہم نشینی سب کے لیے کسر شان تھی
شمشیر و تیغ چلنے میں سب کی زبان تھی

مغرور سب کے سب تھے جو اپنے گمان میں
تھیں تیزیاں ہر ایک کے طرز بیان میں
بیجا جو قیل و قال ہوئی ان کی شان میں
سب پوچھا صاف صاف گورنر کے کان میں

پھر بھی نہ فتح یاب ہوئے پھر بھی زک ہوئی
سب کی ہتک ہوئی نہ کچھ ان کی ہتک ہوئی

سب سے کہا کہ آپ ابھی جانتے نہیں
منشی نول کشور کو پہچانتے نہیں
افسوس اس پہ ہے جو کہا مانتے نہیں
دانا جو ہیں وہ تنتے نہیں تانتے نہیں

اعزاز ان کا ہوتا ہے ہر خاص و عام میں
ہے زعفران کی شاخ لگی ان کے نام میں

القصہ ان امیر نے سن کر یہ طرفہ حال
یہ گفتگو و بحث یہ تقریر و قیل و قال
اپنے وزیر خاص پہ ظاہر کیا یہ حال
ہے شوق ہم کو ان کی ملاقات کا کمال

بالآخر اُن سے اِن کی ملاقات ہوگئی
جس کا نہ کچھ خیال تھا وہ بات ہوگئی

بٹھلا کے پاس امیر نے شیریں زبانی کی
الطاف سے کرم سے بڑی مہربانی کی
اوصاف ان کے دیکھ کے رطب اللسانی کی
بخشا وقار عز و شرف قدردانی کی

فرمایا "خوش ہم ایسی ملاقات سے ہوئے
آکر یہاں نہ جیسا کسی بات سے ہوئے"

اظہار شوق پر ہوا مائل یہ اہل تاج
فرمایا: "آپ کیا ملے بر آئی احتیاج
کابل میں چھاپہ خانے کا منظور ہے رواج
دانش وری سے دیکھیے اس کی صلاح آج

درکار جتنے دام ہوں وہ دام لیجیے
تکلیف کرکے آپ یہ سب کام کیجیے"

جب اس طرح امیر نے ان پر کرم کیا
اس بندگی میں عذر نہ کچھ بیش و کم کیا
شکریۂ وقار ادا دمبدم کیا
اظہار عجز سے سر تسلیم خم کیا

کی عرض "دیر ہوگی نہ کار ضرور میں
کب مجھ کو کوئی عذر ہے حکم حضور میں"

یہ حال انھوں نے آ کے گورنر سے سب کہا
یاد آوری کا، اس طلبی کا سبب کہا
اخلاق کا وہ جوش، وہ جوش طرب کہا
چھاپے کا تذکرہ وہ روایت طلب کہا

یہ بھی کہا کہ میں نے یہ خدمت قبول کی
نعمت حصول کی، نئی نعمت حصول کی

یہ حال جب سنا تو گورنر ہوئے نہال
سب حاضرین وقت کو پورا ہوا خیال
یہ حال سن کے سب کو تعجب ہوا کمال
اگلا وہ ذکر بھول گئے سب وہ قیل و قال

کہنے لگے دراصل ہماری یہ بھول ہے
فرمائیے جو آپ وہ دل سے قبول ہے

دربار سے جب الغرض اعزاز پا چکے
شرکت کا لطف اٹھا چکے حظ اٹھا چکے
اپنے وقار و فخر کی رنگت دکھا چکے
سکہ جب اپنا سب کے دلوں پر جما چکے

فرمائشات تازہ کی تکمیل ہو گئی
حکم امیر کی یہاں تعمیل ہو گئی

دل میں ہوا جو شوق نئے کارخانے کا
اس لکھنؤ میں تازہ تجارت بڑھانے کا
ہمت کے ساتھ کھول دیا در خزانے کا
کل اہتمام کر لیا کاغذ بنانے کا

اس مل میں حصے آنے لگے حصے داروں کے
لاکھوں کے لین دین تھے کیسے ہزاروں کے

آغاز ہی میں اس کے خسارہ جو پڑ گیا
جو رنگ جم گیا تھا وہ بالکل اکھڑ گیا
نقشہ بنا بنایا ہوا سب بگڑ گیا
رستہ میں چلتے چلتے یہ گھوڑا جو اڑ گیا

لاکھوں کا کارخانے پہ جب بار ہو گیا
پھر تو سنبھلنا مشکل و دشوار ہو گیا

دل میں گھسا ہوا تھا خسارہ کا سب کے چور
نقصان کا پڑ گیا چاروں طرف سے شور
دل سب کے پست ہونے لگے گھٹ گیا وہ زور
لیکن نہ مضطرب ہوئے منشی نول کشور

پھر بھی وہی انھوں نے کیا جو سدا کیا
لاکھوں کا بار اپنی گرہ سے ادا کیا

جے پور کا جو راج ہے مشہور عام میں
پوری ہے مہر و مہ کی صفت جس کے نام میں
ہر چند دست ملک میاں ہر انتظام میں
ہر ایک نظم و نسق میں ہر اہتمام میں

دوران یہ تھا یہاں کی وزارت کے واسطے
یہ منتخب ہوئے تھے صدارت کے واسطے

یہ امر تھا جو ان کے دلی عہد کے خلاف
کی عرض ادب کے ساتھ کہ تقصیر ہو معاف
کرتا ہوں قدر دانیوں کا دل سے اعتراف
تعمیل حکم سے ہے مجھے عذر صاف صاف

فرصت نہیں ہے اتنی مجھے کاروبار سے
یہ بات ہے بعید مرے اختیار سے

اس وقت بابو پراگ نرائن تھے خورد سال
خوش بخت و خوش نصیب و خوش اقبال و خوش خصال
یہ حال ڈھال دیکھ کے خورسند تھے کمال
رہتا تھا ان کے درس کا تعلیم کا خیال

فکر ان کی دیکھ بھال کی لیل و نہار
اس واسطے وزارت انھیں ناگوار

دنیا کے آگے دین کا تھا ان کو دھیان بھی
ست کار سب کا کرتے تھے اور سب کا مان بھی
جا جا کے تیرتھوں پہ دیا گیت دان بھی
ممکن نہ تھا جو کہہ سکے ان کی زبان بھی

نیت کیا جو کرتے تھے خیرات و خیر
شرکت کبھی نہ اس میں ہوئی کار خیر

پردہ نشین عورتوں کے دستگیر تھے
ممنون ان کے فیض سے برنا و پیر تھے
داد و دہش میں ان کے مصارف کثیر تھے
حاتم مثال کہیے کہ حاتم نظیر تھے

بیواؤں پر بھی رحم و کرم کی نگاہ
دن رات ان کو فکر تھی ان کے رفاہ

صدہا غریب لڑکیوں کا کر دیا بیاہ
جو کچھ دیا زباں سے اس کا کیا نباہ
تھا شہرہ ان کے فیض کا از ماہی تا بہ ماہ
وہ کون ہے نہ جس کا انھوں نے کیا رفاہ
صدہا غریب پالے ترحم کی راہ سے
اپنا رفاہ سمجھے تھے سب کی رفاہ سے

اسّی برس گزارے اسی آن بان سے
جاہ و حشم سے فخر سے عزت سے شان سے
خدماتِ ملک کرتے رہے دل سے جان سے
نام و نشاں بلند کیا کل جہان سے
بے وقت اجل نے آکے سرِ شست گھات کی
آخر کو شام ہو گئی صبحِ حیات کی

بیماری تھی نہ کسلِ طبیعت کا نام تھا
بھر سرور دور میں صحت کا جام تھا
معمولی شغل تھا وہی معمول کام تھا
لطفِ حیات حاصل انھیں صبح و شام تھا
لیکن جو شب کو ان کی طبیعت بگڑ گئی
حالت خراب ہو گئی صحت بگڑ گئی

پھاگن بدی کی دسمی تھی منگل کا روز تھا
عالم کے واسطے یہی دن غم فروز تھا
دل سوز تھا یہ رنج و الم سینہ سوز تھا
سب کے لبوں پہ نالہ تھا ماتم تھا سوز تھا
ہر ایک مبتلائے صد آلام ہو گیا
اس سانحے سے شہر میں کہرام ہو گیا

اس صدمۂ الم سے ہوئے لوگ دل فگار
یہ حالِ زار جس نے سنا تھا وہ زار زار
بھیجے ادھر ادھر گئے صدہا خطوط و تار
پھیلی خبر کہ ہو گیا سنسار نرادھار
جس نے سنا یہ حال وہ بے حال ہو گیا
سینہ الم کے تیر سے غربال ہو گیا

کیا غضب یہ ہو گیا کیا ستم ہوا
ہر ایک محوِ ماتم و رنج و الم ہوا
یہ غم نہ بابو پراگ نرائن کو کم ہوا
افسوس کیا اپنی یتیمی کا غم ہوا
اب تک تو سب طرح سے یہ بے خوف و بیم تھے
لیکن صفت میں آج سے دُرِّ یتیم تھے

مرتک شریر لے کے چلے "خاص ریل" پر
ہمدردان کے ساتھ میں تھے سینکڑوں بشر
تھی خاص کر ملازموں کی بھیڑ اس قدر
اک اژدہام دیکھا اٹھی جس طرف نظر
پہنچا جنازہ گھاٹ پہ جب دھوم دھام سے
گنگا پہ اگن داہ کیا اہتمام سے

لاشے پہ لکڑیوں کا جب انبار ہو گیا
عالم نظر میں سب کی دھواں دھار ہو گیا
بھڑکی جو آگ شعلہ شرربار ہو گیا
کہتے تھے جس کو نور وہی نار ہو گیا
قصہ جو پاک ہو گیا اس جسم چاک کا
دم بھر میں سب کو آیا نظر ڈھیر خاک کا

خیرات سب سے بڑھ کے ہوئی اس مقام پر
صدہا ہزار اٹھے ایک ایک کام پر
مخفی نہیں یہ بات رہی خاص و عام پر
دسویں کے دن علاقہ دیا ان کے نام پر
اس کام میں حساب نہیں کچھ شمار کا
پورا تعلقہ تھا یہ پچپن ہزار کا

القصہ سب ادا ہوئے پورے فرائضات
دریا دلی کے ساتھ کیے کل تصرفات
جو چاہیے تھی کی وہی پوری ہر ایک بات
پائی یہ رسمیات ادا کر کے جب نجات
حاصل وہ تجربہ کیا ہر کاروبار میں
ہے بات کون تھی جو نہیں اختیار میں

ہے انتظام سب وہی دستور سب وہی
رُوئے زمیں پہ ہے یہی سرکار نامدار

منظور انھیں جو تھا رہا منظور سب وہی
داد و دہش کا جس کے نہیں کوئی ہے شمار

ہیں فکر و تذکرے بھی مذکور سب وہی
اس کارخانے کے تھے پُرانے جو اہلِ کار

ہیں کاروبار قرب وہی دور سب وہی
پنشن بہت سے پاتے ہیں صدہا وظیفہ خوار

پہلے سے ہی فروغ پہ سب کارخانے ہیں
ہوتی ہے سب کے ساتھ رعایت اصول

پوری ترقیوں پہ یہ اب کارخانے میں
پنشن ہر ایک پاتا ہے پنشن کے رُول

منشی نول کشور نے اُپکار جو کیے
چندے دیے خزانے سے سفار کے لیے
صدہا دیے کہیں تو ہزاروں کہیں دیے
القصہ اپنی عمر میں جس لوٹ جو لیے
اس کے بیاں سے لطفِ سخن میں جو ہرج ہے
تفصیل اس کی نقشہ ہٰذا میں درج ہے

نمبر شمار	نام ادارہ و مقام	تعداد چندہ و دیگر رعایت مع کیفیت ضروری
۱	آگرہ کالج، آگرہ	اس کالج میں منشی جی نے تعلیم پائی تھی اور بورڈنگ ہاؤس نہ ہونے سے طلبہ کو تکلیف تھی اس لیے مبلغ بیس ہزار روپے دے کر مکان تعمیر کرا دیا اور اس کے مصارف آئندہ کے واسطے پندرہ سو روپے سالانہ آمدنی کا موضع خرید کر وقف کر دیا۔
۲	" "	جب سرکار نے اخراجات کثیر کے باعث اور کوئی سرپرست نہ ہونے سے اس کالج کو بند کرنا چاہا تو آپ نے کافی چندہ دے کر اور اس کی نگرانی اپنے ذمہ لے کر کالج کو قائم رکھا۔
۳۔	لائبریری مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ۔	مبلغ دس روپے نقد اور ہزاروں روپے کا کتب خانہ دیا۔
۴۔	جبلی ہائی اسکول لکھنؤ	مبلغ پندرہ ہزار روپے نقد دیئے۔
۵۔	لیڈی ڈفرن فنڈ	مبلغ پندرہ ہزار روپے نقد اخراجات کے واسطے اور پانچ ہزار روپے مکان کے واسطے دیے
۶۔	البرٹ اسکول	بیوہ عورتوں اور لاوارث لڑکوں کے واسطے تین ہزار روپے نقد عطا کیے۔
۷۔	مندر کہنہ سری چمن رشی پٹیالہ	یہ مندر شکستہ حالت میں تھا جس کی مرمت مصارف کثیر سے کروائی اور بارہ سو پچاس روپے آئندہ کے مصارف کے واسطے دیے۔
۸۔	یادگار سر جارلس بمقام لکھنؤ	پانچ سو روپے نقد اور ہزاروں روپیہ کا کتب خانہ دیا۔
۹۔	رمزی ہسپتال نینی تال	پانچ سو روپے نقد دیے۔
۱۰	میور سنٹرل کالج الہ آباد	ہزاروں روپے کا کتب خانہ دیا۔

نمبر شمار	نام ادارہ و مقام	تعداد چندہ و دیگر رعایت مع کیفیت ضروری
۱۱	کیننگ کالج لکھنؤ	ہزاروں روپیہ کا کتب خانہ دیا
۱۲	یادگار سر جارج کوپر لکھنؤ	عمارت بنوائی اور ہزاروں روپیہ کا کتب خانہ دیا۔
۱۳	پبلک لائبریری بریلی	ہزاروں روپے کا کتب خانہ دیا
۱۴	رفاہ عام لائبریری فیض آباد	" " " "
۱۵	بھارگو پبلشنگ سوسائٹی متھرا	" " " "
۱۶	جموں لائبریری	" " " "
۱۷	کشمیر لائبریری	" " " "
۱۸	یادگار مہاراجہ رام سنگھ جی سوائی۔	" " " "
۱۹	یادگار مہاراجہ مہندر سنگھ پٹیالہ۔	" " " "
۲۰	جلسہ تہذیب لکھنؤ	" " " " " " " " " "
۲۱	ہندو سٹوڈنٹس لائبریری کلکتہ	" " " " " " " " " "
۲۲	پبلک لائبریری میرٹھ	" " " " " " " " " "
۲۳	نواب گنج بارہ بنکی لائبریری	تیاری عمارت کے لیے چندہ اور ہزاروں روپے کا کتب خانہ دیا۔
۲۴	لائبریری ریاست کشن گڑھ	ہزاروں روپے کی کتابیں دیں
۲۵	چوبے بورڈنگ ہاؤس	" " " " " " " " "
۲۶	کائستھ پاٹھ شالہ الہ آباد	" " اور ایک ہزار روپے نقد دیے۔

جس دن سے بابو پراگ نرائن ہیں جانشیں
ان کی سمجھ یہ فہم و فراست یہ آفریں
اپنی خوش انتظامی سے خوش نظمیاں وہ کیں
اس کو فلک بنا دیا پہلے جو تھی زمیں

سب سے زیادہ اب یہ مسرت کا ہے مقام
جاری ہے ان کے دم سے بھی فیض رفاہ عام
دستور سب وہی ہے وہی سب ہیں انتظام
پیدا کیا انھوں نے بھی داد و دہش میں نام

ہر بات کارخانے کی پہلے سے دونی ہے
نفع و رفاہ و داد و دہش میں فزونی ہے

دل سے رفاہ عام کا ان کو بھی شوق ہے
حاصل وہی دفتاً وہی ان کو ذوق ہے

اب کارخانہ ان کا بہر طور بڑھ گیا
جو کاروبار پہلے تھا وہ اور بڑھ گیا
ہر کام ان کے دور میں فی الفور بڑھ گیا
خوش نظمیوں سے مطبع لاہور بڑھ گیا
چمکا اِدھر نصیب تو اقبال اُدھر بڑھا
دولت بڑھی علاقہ بڑھا مال و زر بڑھا

سو بار لاکھ بار ہوا اس کا امتحاں
داد و دہش میں ان کو تامل ہوا کہاں
جب سے بنا پڑی مڈیکل ہال کی یہاں
چندہ دیا وہیں یہ ضرورت ہوئی جہاں
تیرہ ہزار نقد خزانے سے دے دیے
ہر رفاہ اس ہی بہانے سے دے دیے

لوہا بنانے کا جو نیا کارخانہ ہے
جس کا ہر ایک کام پسند زمانہ ہے
سب کے رفاہ عام کا یہ بھی بہانہ ہے
صدہا ملازموں کا یہاں آب و دانہ ہے
فیض رفاہ عام کا شوق ان کو آپ ہے
جاری انھیں کی ذات سے یہ درک شاپ ہے

آمادہ ہیں رفاہ کے ہر کاروبار میں
داد و دہش سے نام ہوا ہر دیار میں
سو میں ہوئے وہ بندہ نہ چوکے ہزار میں
چندہ یہ چندہ دینے میں یادگار میں
فرمائی "ہائی جوبلی اسکول" کی مدد
اس بورڈنگ کے واسطے معقول کی مدد

سرکاری خیر خواہی کا دم بھرتے ہیں مدام
کرتے ہیں صدق دل سے وفاداری صبح و شام
حکام و افسران کے ہوئے معترف تمام
زندہ انھیں سے منشیٔ مغفور کا ہے نام
جو کچھ روش تھی اُن کی وہی ان کی راہ ہے
اُن کی ہر ایک بات کا پورا نباہ ہے

القصہ ذکر کیجیے کن کن صفات کا
کیا لکھیے حال نظم میں ایک ایک بات کا
شہرہ ہے چار دانگ میں اب ان کی ذات کا
ہر وکرم کا فیض کا خیر و زکات کا
اس واسطے ہے شرح کی تکمیل ذیل میں
ہے کل امور خیر کی تفصیل ذیل میں

شہزادے لکھنؤ میں جو تشریف لائے تھے
شوری جو یادگار کے تجویز پائے تھے
اس جشن میں کثیر مصارف اٹھائے تھے
دریا دلی سے جوہر ذاتی دکھائے تھے
اس یادگار کے لیے دلدادہ ہو گئے
انجام کار کرنے کو آمادہ ہو گئے

جب تک عروج داوج پہ چرخ بریں رہے
جب تک یہ شش جہات میں فرش زمیں رہے
قائم رہے یہ نام یہ نقش و نگیں رہے
منشی نول کشور کا یہ جانشیں رہے
نیساں کی صدق دل سے ہے لب پہ دعا یہی
خالق سے التجا ہے یہی مدعا یہی



حواشی

۱ موضع دیڑھا منشی نول کشور کا ننھیال تھا جہاں آپ کی ولادت ہوئی ۲ شری جنا پرشاد بھارگو ۳ بھائیوں کے نام یہ ہیں:۔ منشی بھول چند، منشی نول کشور، تلسی رام، سیوک رام، دامودر داس۔ ۴ ماہ پوس سنہ ۱۸۹۲ بکرمی مطابق جنوری ۱۸۳۶ء ۵ سابق ضلع علی گڑھ۔ ۶ آگرہ [illegible]

ذیل کتبۂ قبر

آگرہ ۔ ۵ سفیر آگرہ نام اخبار ۔ ۶ اخبار و مطبع کوہ نور لاہور مملوکہ منشی ہرسکھ رائے ۔ ۷ واقع کوٹھی مہاراجہ مان سنگھ بہادر لکھنؤ معروف بہ کوٹھی راجہ امجد علی ۔ ۸ آنریری انسپکٹر جیل خانہ جات اودھ و روہیل کھنڈ ۔ ۹ منشی جی کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے ۔ ۱۰ کوٹھی مان سنگھ رکاب گنج ۔ ۱۱ کوٹھی غالب جنگ بہادر حضرت گنج ۔ ۱۲ منشی جی کے زمانے میں ان کے مطبع کی شاخیں لاہور، کانپور، دہلی، آگرہ، الہ آباد، پٹیالہ، جبل پور، اور اجمیر میں قائم ہو چکی تھیں ۔ ۱۳ دربارہ انسداد پیش قدمی شہنشاہ روس بہ اطراف کابل و قندھار ۔ ۱۴ یعنی امیر عبدالرحمن خان والیٔ افغانستان ۔ ۱۵ لکھنؤ پیپر مل جسے منشی جی نے قائم کیا تھا ۔ ۱۶ ویدک دھرم کے بموجب منشی جی نے اپنے بھتیجہ بابو پراگ نرائن کو متبنیٰ بنایا تھا جو ان کے وارث و جانشین ہوئے ۔ ۱۷ انتقال کے وقت یعنی ۱۹ فروری ۱۸۹۵ء کو منشی جی انسٹھ سال کے تھے ۔ ۱۸ تاریخ انتقال منشی جی پھاگن ۱۵ ۱۹ بکرمی تھی ۔ ۲۰ اسٹیشن پر منشی جی کا جنازہ لے جایا گیا تھا ۔ ۲۲ صندل کی لکڑی ۔ ۲۳ علاقہ پریل واقع کانپور ۔ ۲۴ لکھنؤ آرٹ و دستکاری اسکول جس کی بنیاد بابو پراگ نرائن نے رکھی تھی ۔ ۲۵ پرنس آف ویلس شہزادۂ برطانیہ لکھنؤ آئے تھے ۔ ۲۶ کنگ جارج میڈیکل کالج اور اس سے متعلقہ ہسپتال کے سارے کاغذات انگریزی و اردو منشی پراگ نرائن مفت چھاپتے تھے ۔ نقد امداد کے علاوہ یہ مدد مقرر کی تھی ۔ ۲۷ گورنمنٹ جوبلی ہائی اسکول لکھنؤ

صفحہ ۲۱۳ فٹ نوٹ کا بقیہ

۳۵ ڈاکٹر انوار الحسن: "اردو اخبار" ۔ فروغ اردو مارچ ۱۹۶۱ء صفحہ ۳۱ ۳۶ فہرست نولکشور پریس ۱۹۱۳ء ۳۷ اودھ اخبار مورخہ ۱۲ مئی ۱۹۱۳ء ۳۸ اودھ اخبار مورخہ ۱۳ مئی ۱۹۱۰ء ۳۹ ایضاً ۴۰ فہرست نولکشور پریس بابت ۱۹۱۳ء ۴۱ ایضاً ۴۲ ایضاً ۴۳ ایضاً ۴۴ WHO IS WHO IN INDIA PART III P. 170 ۴۵ اودھ اخبار بابت ۱۸ مارچ ۱۹۱۰ء ۴۶ WHO IS WHO IN INDIA PART III P. 170 ۴۷ BHARGAVA PATRIKA, JAIPUR 1970 P. 36 ۴۸ ایضاً ۴۹ ایضاً ۵۰ ایضاً ۵۱ ایضاً ۵۲ ایضاً صفحہ ۳۷ ۵۳ ۳۸ ۵۴ ایضاً صفحہ ۳۸ ۵۵ ریکارڈس راجہ رام کمار بک ڈپو ۵۶ بھارگو پتریکا جے پور صفحہ ۳۶



> "لکھنؤ میں جس قدر مشہور حافظ، عالم، مؤرخ ادیب اور شاعر اس مطبع میں بیک وقت جمع ہو گئے تھے ہندوستان کے کسی دوسرے مطبع کو نصیب نہ ہوئے"
>
> ——— مصنف "اردو کے ہندو ادیب"

ڈاکٹر عبدالاحد خاں خلیل

منشی نول کشور — حیات و شخصیت

آگرہ، لاہور اور لکھنؤ، اُس عہد کے تین ایسے اہم تہذیبی اور علمی مراکز تھے کہ جو منشی نول کشور کی حیات کے نشیب و فراز پر اثر انداز ہوئے، اور جنھوں نے ان کی شخصیت کے نشو و نما کے سلسلے میں غیر معمولی تربیت گاہوں کا کام کیا۔ ان کو ایسے تجربات، مشاہدات اور علمی و ادبی مشاغل سے روشناس کرا دیا کہ جو ان کی طبیعت ثانیہ بن گئے اور مدت العمر ان کے کام آئے۔

اپنی جائے پیدائش ضلع علی گڑھ کے مقامی مکتبوں میں اس زمانے کے رواج کے مطابق عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ دس سال کی عمر میں آگرہ کالج کے ثانوی درجات میں داخل ہوئے اور پانچ سال وہاں زیر تعلیم رہے۔ اسی زمانہ میں ان کو مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوا اور مقامی اخبار 'سفیر' آگرہ میں مضامین لکھنے لگے۔ منشی ہر سکھ رائے جو لاہور کے ممتاز اخبار 'کوہ نور' کے ایڈیٹر تھے، ان کے علمی و ادبی ذوق سے بے حد متاثر ہوئے اور منشی نول کشور کو آگرہ سے لاہور جانے کا موقع مل گیا۔ اور وہ 'کوہ نور' کے ادارۂ صحافت سے وابستہ ہو گئے اور چار سال لاہور میں رہے۔ منشی ہر سکھ رائے ان کے ذوقِ علمی اور حسنِ کارکردگی کی بڑی قدر کرتے تھے اور ان کی ہر آسائش کا خیال رکھتے تھے۔ اس زمانہ میں نول کشور نے پوری دلچسپی اور لگن سے اخبار نویسی کے رموز و نکات، عوام سے ربط قائم رکھنے کے اصول و تجربات، کتابت و طباعت کے معاملات، تنظیمی و ترتیبی مسائل، مطبع کی دیکھ بھال اور اس کے نظم و نسق کے طور طریقے وغیرہ وغیرہ غرض کہ پوری طرح لوازم و آدابِ صحافت سے واقفیت حاصل کر لی اور منشی ہر سکھ رائے کے دستِ راست اور معتمدِ خاص بن کر 'کوہ نور' کو اور چمکایا اور اس کی اشاعت و مقبولیت کو بڑھایا۔ اپنے محسن کا پریشان حالی میں ساتھ دیا اور نامساعد حالات میں بھی اخبار کے معیار کو قائم رکھا۔

لاہور کے علمی و ادبی ماحول، زندہ دلانِ پنجاب کی صحبت، ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی کی تباہ کاری و عبرت آموزی، اور خود ان کی طبعی ذہانت، جرأت، شرافت، ہمت، حوصلہ مندی اور دور اندیشی نے بیس بائیس سال کی عمر ہی میں منشی نول کشور کو جہاں دیدہ و کار آزمودہ بنا دیا، اور بنی نوعِ انسان سے محبت اور خدمتِ خلق کا جذبہ ان کے دل میں بیدار و مستحکم کر دیا۔ انھوں نے گرد و پیش کے حالات اور سیاسی، اقتصادی اور معاشی صورتِ حال کا امعانِ نظر سے مطالعہ کیا اور ارادہ کر لیا کہ وہ ممالکِ متحدہ آگرہ پہنچ کر اہلِ وطن کی خدمت کو اپنا مقصدِ حیات بنائیں گے اور مٹتی ہوئی تہذیبی یادگاروں کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کریں گے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد وہ لاہور سے آگرہ واپس آئے۔ اور مقامی صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ بجائے آگرہ کے لکھنؤ زیادہ مناسب اور بہتر مقام ہوگا کہ جہاں ان کے عزائم کو پروان چڑھنے کا موقع مل سکے گا، اور ان تجربوں سے پوری طرح فائدہ اٹھایا جا سکے گا کہ جو انھوں نے لاہور کے دورانِ قیام، اور 'کوہ نور' کے ادارۂ تحریر سے وابستہ ہو کر حاصل کیے ہیں۔ چنانچہ لاہور سے واپسی پر لکھنؤ کو انھوں نے اپنا مستقل مستقر بنایا اور اعتمادِ کامل اور یقینِ محکم کے ساتھ کام شروع کر دیا

منشی نول کشور نے دیکھا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں سب سے زیادہ تباہ حال وہ خاندان ہوئے ہیں کہ جو متمول اور مقتدر تھے، ہندوستانی تہذیب و شائستگی کو سخت نقصان پہنچا ہے اور اس یک جہتی اور

یگانگت کی جان پر آبنی ہے جو اس انقلاب سے پہلے ہمارے لیے باعث فخر و ناز تھی۔ ان کا دل سوز و گداز سے لبریز، مضمحل تھا اور ان کی آنکھیں اہل ملک کی حالتِ زار پر اشک بار تھیں۔ انھوں نے ہمت کر کے لکھنؤ کی روایتی تہذیبی زندگی اور شام اودھ کی دلکشی کو برقرار رکھنے کا تہیہ کر لیا اور دل و جان سے کوشش کی علوم و فنون کے خزانوں اور قدیم تہذیبی روایات کو زندہ و پایندہ رکھنے کے لیے اپنی زندگی وقف کر دیں گے۔ انھوں نے ۱۸۵۸ء میں ایک چھوٹا سا مطبع لکھنؤ میں قائم کیا اور مذہبی صحائف اور اردو، فارسی، عربی، سنسکرت اور ہندی کی درسی و غیر درسی علمی و ادبی، تاریخی و لسانی کتابوں کی اشاعت کا بندوبست کیا اور اسی سال ۲۶ نومبر ۱۸۵۸ء کو 'اودھ اخبار' جاری کیا۔

منشی نول کشور غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے اور مسلمانوں کے انتزاع حکومت و زوالِ اقبال سے بیحد متاثر تھے۔ انھوں نے کوشش کی لکھنؤ کے تباہ شدہ خانوادوں، شاہانِ اودھ کے پس ماندگان، خوف زدہ شرفا اور اہل فضل و کمال کی مدد سے علوم مشرقیہ کی تمام معیاری کتابوں کو جمع کریں اور پھر ان کو پورے اہتمام و صحت متن کے ساتھ اپنے مطبع میں چھاپنے کا بندوبست کریں وہ اس قدیم ورثے کی پوری طرح حفاظت کرنا چاہتے تھے کہ جس نے یو۔پی بالخصوص اودھ کو دلکش اور جانِ عالم بنایا تھا۔ ان کا مطبع فی الحقیقت ایک جامعۂ علوم و ادارۂ مصنفین اور مکتبۂ دانش تھا جس میں انھوں نے اس عہد کے تمام اہل فضل و کمال بالخصوص لکھنؤ اور اس کے قرب و جوار کاکوری و ملیح آباد کے مشاہیر اہل علم کو اپنے خلوص و ایثار کی بدولت جمع کر لیا تھا اور بڑے احترام کے ساتھ وہاں ان کی فاضلانہ صلاحیتوں سے کام لیا جاتا تھا۔ انھوں نے مطبع میں ایک دار الترجمہ بھی قائم کیا تھا جس میں عربی و فارسی سے اردو میں، اور سنسکرت سے ہندی و اردو میں اہم تصانیف کا ترجمہ کرایا جاتا تھا۔ منشی نول کشور بڑی کوشش اور کاوش سے عربی، فارسی، سنسکرت وغیرہ کے مخطوطے اور قدیم مطبوعات، نادر و نایاب قلمی کتابیں زر کثیر خرچ کر کے یا اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے کام لے کر حاصل کرتے تھے جن کے متعلق اندیشہ تھا کہ انقلاب دہر اور امتداد زمانہ کا شکار ہو جائیں گے اور پھر ان پر اپنے مطبع سے وابستہ نامور اہلِ تحقیق عالموں سے نظر ثانی و تصحیح کرانے اور ان پر حواشی کا اضافہ کرانے کے بعد پوری توجہ اور احتیاط سے شائع کرتے تھے۔ ان کے پروف ریڈر پڑھے لکھے ہوتے تھے اور کاتب خوش نویس و سنگ ساز بہت دیدہ ور اور محتاط۔ یہی وجہ تھی کہ مطبع منشی نول کشور کی مطبوعات علمی دنیا میں معیاری سمجھی جاتی تھیں اور ذاتی کتب خانوں اور عوامی لائبریریوں میں بلا تکلف اور بڑے اشتیاق سے خریدی جاتی تھیں۔ منشی نول کشور اس کا بھی خیال رکھتے تھے کہ ان کی مطبوعات کی قیمت اتنی زیادہ نہ ہو کہ متوسط طبقہ یا کم استطاعت لوگوں کی گرانی خاطر کا باعث ہو اور وہ ان کی خریداری اور استفادہ سے معذور و محروم رہ جائیں۔ ذاتی منافع سے کہیں زیادہ ان کو اشاعت علوم و تحفظ ادب کا لحاظ رہتا تھا۔ انھوں نے لغات فارسی و عربی، تاریخی کتب، کلیات و دواوین، منظومات اور نثری داستانیں اتنی ضخیم اور طویل اپنے مطبع میں چھاپنے کا خوش دلی، فراخ حوصلگی اور شوق سے انتظام کیا کہ کوئی دوسرا اس کی ہمت ہی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ہمارے علوم مشرقیہ اور ملی تہذیب و شائستگی کے محافظ تھے۔ انھوں نے علم و ادب کی روشنی کو پھیلایا بھی اور اس سے نفع بھی اٹھایا۔ انھوں نے بچوں کے لیے اردو ریڈریں تیار کرائیں اور ہر طرح کی نصابی کتابیں مختلف مضامین کی شائع کیں۔ مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کی اردو ریڈریں منشی نول کشور ہی کا تحفہ ہیں جو آج بھی مقبول و مروج ہیں۔

منشی نول کشور کی نگاہیں بڑی مردم شناس اور اور ان کی طبیعت بڑی وسیع المشرب و نکتہ رس تھی۔ جہاں کہیں انھیں کوئی جوہر قابل نظر آ جاتا تھا وہ اس کا بڑا احترام کرتے تھے اور اپنے مطبع سے اس کو متعلق کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اسی طرح جہاں کہیں ان کو کوئی ادب پارہ ملنے کی توقع ہوتی تھی وہ اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے اور پوری احتیاط کے ساتھ اس کو شائع کرتے تھے۔ ۱۸۶۱ء میں انھوں نے شہاب الدین احمد خاں ثاقب کو لکھ کر مرزا غالب کا دیوانِ فارسی دہلی سے منگوایا اور ۱۸۶۳ء میں اپنے مطبع سے ۵۴۰ صفحات پر شائع کیا۔ اس دیوان میں دس ہزار چار سو چھبیس اشعار ہیں اور خاتمۃ الطبع میں میر مہدی مجروح، مرزا محمد اصغر علی خاں نسیم، شیخ امیر اللہ تسلیم، منشی اشرف علی اشرف خوش نویس، معشوق علی

مال رعنا کے قطعات تاریخ ہیں۔

منشی نول کشور نے اپنے مطبع میں قدیم و جدید تمام اساتذہ کے نثر و نظم کے شاہکاروں، تذکرہ ہائے شعراء، تفاسیر و احادیث، اور مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کی مذہبی کتابوں کی طباعت کا اہتمام کیا تھا اور صحت متن و حواشی ضروریہ کے ساتھ ان کو شائع کیا تھا۔ وہ تصانیف کی ضخامت اور ان پر اخراجات سے کبھی گھبراتے نہیں تھے اور بڑی فراخدلی اور خندہ پیشانی سے اس کا بندوبست کرتے تھے۔ انھوں نے مطبع کی ضروریات کے پیش نظر کلکتہ جا کر ایک غیر ملکی کاغذ کا جہاز خریدا اور لکھنؤ میں پیپر مل قائم کر کے اپنے اور دوسروں کے اشاعتی پروگرام کی کفالت کی۔ ان کو علوم مشرقیہ اور ان کے سرمایہ کے تحفظ سے اتنی دل چسپی تھی کہ اہم و غیر اہم ہر قسم کے مسودات کو حاصل کرنے اور ان کو شائع کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ اور نفع نقصان کا بالکل خیال نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں ......
...... کے مذہبی صحائف، دینی شعار اور تہذیبی
......
اقدار کی ہمیشہ قدر کی۔ ان کے عزائم بہت بلند تھے اور ذوق ادب بہت پختہ اور مستحکم۔ انھوں نے خدمت خلق، احیائے علم اور طباعت و اشاعت کے جو منصوبے بنائے ان کو تکمیل تک پہنچایا اور ناموافق حالات میں بھی کبھی تنگ دل اور آزردہ خاطر نہیں ہوئے۔ وہ کاروباری آداب سے بھی خوب واقف تھے اور ملک کی تہذیبی و ثقافتی ضروریات سے بھی۔

منشی نول کشور کی پایندہ یادگار دو غیر معمولی کارنامے ہیں۔ ایک مطبع، اور دوسرا اودھ اخبار۔ یہ اخبار اتنا مقبول اور اہمیت کا حامل تھا کہ ہر طبقہ کے لوگوں میں نہایت دل چسپی سے پڑھا جاتا تھا۔ تازہ بتازہ خبریں اس میں درج ہوتی تھیں اور اس کے خصوصی نامہ نگار ملک کے ہر حصہ میں پھیلے ہوئے تھے، بلکہ بیرون ملک بھی اس کے پڑھنے والے اور خبر نویس موجود تھے۔ شاہ فارس جب انگلینڈ گئے تھے تو ان کے دورہ کی مفصل رپورٹ پروفیسر ای، ایچ پامرس E. H. PALMER نے اردو میں اودھ اخبار کے لیے بھیجی تھی جو اخبار کے ... کالموں میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا تذکرہ پروفیسر اے۔ جے۔ آربری A. J. ARBURRY کے ان مقالوں میں ملتا ہے کہ جو انھوں نے مشرقی علوم پر سپرد قلم کیے ہیں۔

اودھ اخبار صرف اخبار یعنی خبروں کا مجموعہ ہی نہیں تھا بلکہ اس میں علمی و ادبی مضامین، دل چسپ افسانے، ممتاز فارسی شعراء کا کلام، تنقید و تبصرے، سرکاری اعلانات اور عوامی دل چسپی کے مسائل پر اظہار رائے، غرضکہ بہت کچھ ہوتا تھا۔ حکومت میں اس کا وقار تھا اور ملک میں اس کا اعتبار۔ مرزا غالب شروع ہی سے اودھ اخبار بڑی دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ پہلے تو یہ اخبار ان کو نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر کے یہاں سے مل جاتا تھا۔ لیکن ۱۸۶۱ء سے منشی نولکشور ان کو لکھنؤ سے بلا قیمت بذریعہ ڈاک بھیج دیا کرتے تھے۔ البتہ اپنی حیثیت کے تحت مرزا غالب ان کو اخراجات ڈاک بصورت ٹکٹ کسی نہ کسی وسیلے سے پہنچا دیتے تھے۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل خط ملاحظہ ہو: نومبر ۱۸۵۹ء میں مرزا غالب منشی شیو نرائن کو لکھتے ہیں:

"برخوردار، دو خط آئے، اور آج یکشنبہ ۱۳ نومبر کو لفافہ آیا۔ یہ اودھ اخبار بھائی ضیاء الدین خاں کے ہاں آتا ہے۔ وہ میرے پاس بھیج دیا کرتے ہیں۔ اس کی حاجت نہیں۔ اپنے اور میرے ٹکٹ کیوں بھیجو گے
..... غالب روز یکشنبہ ۱۳ نومبر ۱۸۵۹ء۔

(اردوئے معلی صفحہ ۲۱۲)

دسمبر ۱۸۶۳ء کا پہلا ہفتہ ہی وہ زمانہ ہے کہ جب مرزا غالب کی دہلی میں منشی نول کشور سے مفصل و بے تکلف ملاقات کی صورت ہوئی۔ مرزا غالب ان کی وجاہت، شخصیت، متانت اور اخلاص سے بےحد متاثر ہوئے۔ اس وقت منشی نولکشور کی عمر تقریباً ۲۷، ۲۸ سال رہی ہوگی۔ مرزا غالب نے جو بقول خود کسی زمانے میں اپنے چینیٔ رنگ پر نازاں تھے، خط بنام مرزا حاتم علی مہر اردوئے معلی صفحہ ۲۱۲ میں منشی نول کشور کو "خوبصورت اور مشتری سیرت" کہا۔ اور ان کی خوش معاملگی و معقولیت کی داد دی۔

فی الحقیقت منشی نول کشور خوبصورت خدوخال، پسندیدہ سیرت اور دلکش اطوار و خصائل کے مالک تھے۔ ان کی شخصیت میں مقناطیسیت اور

ان کے شعار میں یگانگت و محبت تھی یہی ان کی صفات تھیں جو لوگوں کو ان کا دلدادہ اور ان کے اودھ اخبار کا فریفتہ و قدرشناس بنا دیتی تھیں ۔ اودھ اخبار میں سیاسی و سماجی مسائل پر تبصروں کے علاوہ اس عہد کے اساتذہ کا تازہ کلام بھی شائع ہوتا رہتا تھا جو اہل علم کی نظروں میں اس کو وقیع بنا دیتا تھا۔ میر منشی خواجہ غلام غوث بےخبر کو مرزا غالب ایک خط میں لکھتے ہیں :

" رام پور میں تھا کہ اودھ اخبار میں حضرت کی غزل نظر افروز ہوئی، کیا کہنا ہے، ابداع اس کو کہتے ہیں جدت طرازی اس کا نام ہے۔ جو ڈھنگ تازہ زبانِ ایران کے خیال میں نہ گزرا تھا وہ تم بروئے کار لائے۔ خدا تم کو سلامت رکھے۔"

(اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۲۴)

ایک دوسرے خط میں منشی حبیب اللہ خاں ذکا کو دوشنبہ ۱۷ شعبان ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶ء) کو لکھتے ہیں :

" ہاں صاحب اودھ اخبار میں ایک قصیدہ مولوی غلام امام کا دیکھا۔ مکان تنگ است۔ جہان تنگ است مدح مختار الملک میں متضمن استدعائے مسکن دیکھا۔ پھر مہینہ بھر بعد اسی اودھ اخبار میں یہ خبر دیکھی کہ نواب نے مسکن تو نہ بدلا مگر تیس روپیہ مہینہ بڑھا دیا۔ اسی اخبار میں پھر دیکھا کہ ایک صاحب نے مولوی غلام امام کے کلام پر اعتراض کیا ہے۔ اور ان کے شاگرد منیع تخلص نے اس کا جواب لکھا ہے۔ آپ سے اس روداد کی تفصیل اور جوابِ اعتراض و معترض کے نام کا طالب ہوں بسبیل استعجال۔"

(اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۶)

مطبع نول کشور اور اودھ اخبار کے تذکرے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ منشی نول کشور کی شخصی خصوصیات پر بھی اجمالی نظر ڈال لی جائے۔ وہ بڑے بارعب، مخیر، متین، بامروت اور محنتی انسان تھے اور اپنے کارپردازوں سے محنت لینا اور ان سے برضا و رغبت کام کرانا بھی خوب جانتے تھے۔ اپنے مطبع کے کاروبار میں شخصی طور پر دلچسپی لیتے تھے اور حسن سلوک سے دوسروں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔ ضرورت مندوں کی دامے درمے مدد کرتے تھے اور قلبی ادیبوں کی دل کھول کر سرپرستی کرتے تھے۔ بہت باذوق، اور باہمت، صاحبِ بصیرت انسان تھے اور تعمیری سرگرمیوں سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے شکستہ دل اور افسردہ خاطر، ستم رسیدہ اور بلاکشیدہ ہندوستانیوں کو زمانہ کا رنگ دیکھتے ہوئے جنگ و جدال پر آمادہ کرنے کے بجائے روحانی اقدار کی طرف مائل کیا اور حاکمانِ وقت سے برسرِ پیکار ہونے سے روک کر مذہبی معمولات اور تہذیبی ورثہ کی طرف متوجہ کیا۔ اور اس طرح قلبی سکون، ذہنی آسائش اور اخلاقی توانائی کا سامان فراہم کیا۔ وہ بنی نوع انسان کے ہمدرد تھے اور اہل ملک کے بہی خواہ، زبان و ادب کے محسن تھے اور یک جہتی و یگانگت کے شیدائی۔ انھوں نے سرشار و شرر، نوبت رائے نظر و عبدالباری آسی نیز دیگر ادیبوں اور شاعروں، عالموں اور داستان نگاروں کو روشناس خلق کیا اور ایک عظیم ناشر کی حیثیت سے خود بقائے دوام حاصل کر لیا۔

منشی نول کشور کی زندگی بامقصد اور ان کی شخصیت اتنی بابرکت تھی کہ اودھ اخبار ۹۲ سال تک زندہ رہا اور سوا سو سال گزر جانے کے بعد آج بھی ان کا مطبع ان کے وارثان راجہ رام کمار اور کنور تیج کمار کی مساعی کی بدولت قائم ہے اور اپنی قدیم روایات کے احترام میں ضخیم کتابوں کی اشاعت میں مصروف ہے۔ وارثان منشی نول کشور بھاری پتھر چوم کر چھوڑ دینے کے قائل نہیں ہیں اور اردو، فارسی، عربی اور سنسکرت کے شاہکار، بالخصوص اپنے مطبع کے مطبوعات وقتاً فوقتاً شائع کر کے اپنے مورثِ اعلیٰ کے کارناموں کو پائندہ رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

بصورت موجودہ ضرورت اس امر کی ہے کہ منشی نول کشور کی حیات اور ان کی ادبی خدمت پر ریسرچ کی جائے۔ ان کے مطبع کی مطبوعات کی تفصیلات، ان پر حاشیہ نگاروں کے اسمائے گرامی اور ان کے سوانح حیات جمع کیے جائیں۔ کلیات و دواوین کے ترتیب دینے والوں، داستان نگاروں، لغات مرتب کرنے والوں، شرح نویسوں اور ترجمہ کرنے والوں کے ناموں کی فہرست تیار کی جائے۔ مطبع نول کشور کی مدد سے ان موضوعات پر مقالات لکھوا کر شائع کیے جائیں اور منشی نول کشور کے نام اور کام کو زندہ اور پائندہ رکھا جا سکے۔ ★

مرزا محمد رضوان

منشی نول کشور سے متعلق چند متفرق باتیں

[زیر نظر مضمون منشی نول کشور سے تعلق رکھنے والے چند افراد کے بارے میں بعض متفرق امور پر مشتمل ہے۔ اس میں نول کشور کی اردو نثر کا ایک غیر معروف نمونہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ ان چیزوں کے علاوہ اس مضمون میں نول کشور پریس لکھنؤ سے مئی ۱۸۷۰ء میں چھپنے والی ایک کتاب سے محسن علی ساقی کی ایک منظوم تقریظ کے ایسے اشعار بھی شامل ہیں جو ۱۸۷۰ء تک نول کشور پریس یا اودھ اخبار کے لیے عینی شہادت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ مضمون نول کشور پر کام کرنے والے صاحبانِ قلم کے لیے اپنے دامن میں دلچسپی کا کچھ ایسا سامان رکھتا ہے جو افادیت سے خالی نہیں]

منشی ہرسکھ رائے

نول کشور اپنی ابتدائی زندگی میں جن شخصیتوں کی سرپرستی، رہنمائی اور ہمت افزائی سے فیض یاب ہوئے ان میں اخبار کوہ نور لاہور کے مالک منشی ہرسکھ رائے بھی شامل ہیں۔ منشی ہرسکھ رائے مضافات سکندر آباد (ضلع بلند شہر) کے رہنے والے تھے۔ ہرسکھ رائے نے لاہور سے ۱۸۵۰ء میں اخبار کوہ نور جاری کیا جو اپنے عہد کا خاصا اہم اخبار تھا۔ منشی ہرسکھ رائے نے سترہ سالہ نوجوان نول کشور کو اپنے لاہور کے پریس میں جگہ دی جہاں نول کشور نے ۱۸۵۳ء سے ۱۸۵۷ء یعنی چار سال تک محنت اور دیانت سے کام کیا۔ منشی نول کشور نے صحافت اور طباعت میں بعد کو جو مہارت حاصل کی اس میں منشی ہرسکھ رائے کے مطبع اخبار کوہ نور لاہور میں کام کرنے کا وہ چار سالہ تجربہ بھی شامل تھا جو وہ صرف ۲۱ سال کے سن میں حاصل کر چکے تھے۔ نول کشور کے مربی منشی ہرسکھ رائے کے نام سر سید احمد خاں کا ایک انگریزی خط مورخہ ۸ ستمبر ۱۸۶۸ء ذیل میں منقول ہے:

FROM SYED AHMAD KHAN
SECRETARY TO THE SCIENTIFIC
SOCIETY OF ALIGARH.
TO PUNDIT HARSUKH RAI
SECRETARY TO THE SOCIETY
FOR THE DIFFUSION OF
USE FUL KNOWLEDGE
AT LAHORE.

SIR,

I AM DIRECTED BY THE SCIENTIFIC SOCIETY TO ACKNOWLEDGE RECEIPT OF A MEMORANDUM FROM YOU DATED THE 31ST MARCH LAST AND TO INFORM YOU IN REPLY THAT THIS SOCIETY WILL BE ONLY TOO GLAD TO EXCHA-

-NGE THEIR PUBLICATIONS WITH THOSE OF THAT SOCIETY, TO MAINTAIN A FRIENDLY CORRESPONDENCE AND WILL ACCORDINGLY FORWARD YOU ANY PUBLICATIONS THAT MAY HENCEFORTH BE ISSUED.

I HAVE THE HONOUR TO BE

SIR

YOUR MOST OBEDIENT SERVANT

SYED AHMED KHAN

SECRETARY.

سرسید احمد خاں کے اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ نول کشور کے سرپرست منشی ہرسکھ رائے اور سرسید ایک دوسرے کے مکتوب الیہ تھے اور علمی کاموں سے سرسید کی طرح منشی ہرسکھ رائے بھی شغف رکھتے تھے۔

منشی غلام محمد خاں تپش

منشی غلام محمد خاں تپش نول کشور کے اودھ اخبار لکھنؤ کے مدیر تھے۔ سرسید احمد خاں کے نام ان کا ایک اردو خط ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

جناب فیض مآب حضرت مولوی صاحب قبلہ مدظلہ

بعد سلام سنت الاسلام و آرزوے قدم بوسی گزارش یہ ہے کہ اس نیازمند اور جناب منشی نول کشور صاحب نے آپ کے مضامین تہذیب الاخلاق کو معائنہ کیا۔ سبحان اللہ ایسے خیالات پاکیزہ اور لطیف ہیں کہ اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ خدا نے فصاحت اور شیرینیِ گفتار حضرت پر ختم کردی۔ چنانچہ وہ کل مضمون درج اودھ اخبار کیا گیا اور ایک تمہید مناسب بھی چھاپی گئی اور منشی صاحب ممدوح نے فرمایا ہے کہ ہمیشہ اس نیک کام اور ملکی ہمدردی میں اودھ اخبار حتی الامکان معاون رہے گا اور شورش انگیز خیالات عام جو مختلف اخباروں کے ذریعے سے شائع ہوں گے ان شاء اللہ اس کی بھی اصلاح کرے گا۔

میں نہایت افسوس اور عذر کرتا ہوں کہ بعض ہی نہیں بلکہ اکثر حضرات آپ کے بالکل خلاف رائیں لکھ کر بھیج دیتے ہیں۔ پس وہ اوّل تو بہت کم چھاپی جاتی ہیں اور جو چھاپی جاتی ہیں ان کی تردید میں کبھی نہ کبھی رائے دے دی جاتی ہے اور بہت سے مضامین واپس کیے جاتے ہیں۔ اکثر ردّی کیے جاتے ہیں۔ ان شاء اللہ آئندہ زیادہ تر ایسے امور کا لحاظ رہے گا۔

حضور کا نوازش نامہ قبل آنے تہذیب الاخلاق کے صادر ہوا تھا۔ اُس کی بھی تعمیل کی گئی مگر اس قدر تاسف رہا کہ بوجہ ضیق فرصت کے کوئی آرٹیکل بسیط نہیں لکھا گیا جو آئندہ بہ شرطِ فرصت تحریر ہوگا (ان شاء اللہ) امید کہ کبھی کبھی دالانامجاتِ فیض کرامت سے یاد فرماتے رہیے۔ زیادہ آداب مکرر۔ تہذیب الاخلاق میں جو اس نیازمند کے ناچیز مضمون وغیرہ کا شکریہ فرمایا ہے اُس کا ہزار ہزار سپاس ادا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت با کرامت رکھے۔

رقیمۂ نیاز

غلام محمد اڈیٹر اودھ اخبار

منشی نولکشور کی ایک تحریر

پدماوت بھاکا: ملک محمّد جائسی: مطبع منشی نولکشور

لکھنؤ طبع مئی ۱۸۷۰ء (ص ص ۳۵۹ تا ۳۶۰) میں "گزارش من جانب صاحب مطبع" کے عنوان سے منشی نول کشور کی ایک مختصر اردو تحریر شائع ہوئی تھی جو سطور ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

"مخفی نہ رہے کہ یہ کتاب مستطاب پدماوت تصنیفِ فقیر روشن ضمیر صوفی صاف دل عارف باللہ حقیقت آگاہ، ہادی منازلِ خدارسی جناب حضرت ملک محمد جائسی کی ہے جو فقرا و خیل اولیا میں ایسا درویش کامل بہت کم گزرا سلسلۂ عالیہ صوفیہ میں یہ بڑے رتبے کے فقیر تھے۔ اکثر لوگ اس کتاب لاجواب کے مشتاق اور شائق تھے مگر

کم یابی کے قلمی نسخہ ملنا حکم اکسیر رکھتا تھا۔ اس واسطے نیاز گزار نے کتاب موصوف کو بصرف زر خطیر و تصحیح و تحشیہ جناب فضیلت مآب مجمع علوم شریف و منبع فنونِ لطیف فاضلِ افضل عالم اکمل مقبول ذوالمنن مولوی علی حسن صاحب ساکن موضع کھیولی من مضافاتِ صوبۂ اودھ کہ اس بھاکا زبان کے عالم ہیں گویا ملکِ زبان دانی کے حاکم ہیں، چھاپی ہے۔ شائقین دیار و امصار خصوصاً خریداران ملک پورب کہ انھیں صاحبوں کے اصرار اور خواہش سے یہ کتاب طبع ہوئی امید کہ ہاتھوں ہاتھ خرید لیں اور یقین ہے کہ جوشِ رغبت اور وفور خریداران سے نوبت طبع پیہم کی بہم پہنچے۔ چونکہ یہ کتاب زبان بھاکا ہندی سے خطِ فارسی نقل ہوئی اگر کسی مقام پر سہواً غلطی واقع ہو تو اس کو معاف فرمائیں۔"

اودھ اخبار اور نول کشور پریس ۱۸۷۰ء میں

بہاوت بھاکا مطبع منشی نول کشور لکھنؤ طبع مئی ۱۸۷۰ء (صفحہ ۳۵۴ تا ۳۵۹) میں مولوی محسن علی ساقی (شاگرد ناسخ لکھنوی) کی طرز مثنوی کا ایک منظوم تقریظ بھی چھپی تھی۔ اس تقریظ میں ساقی نے نول کشور پریس، اودھ اخبار، کارگزاران مطبع اور خود منشی نول کشور کو جو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مئی ۱۸۷۰ء تک صرف بارہ سال کے عرصے میں نول کشور پریس اور اودھ اخبار نے شہرت اور مقبولیت کی کتنی منزلیں سر کر لی تھیں۔ سطورِ ذیل میں پیش ہونے والے ساقی کے اشعار، ۱۸۷۰ء تک مطبع نول کشور اور اودھ اخبار کی بارہ سالہ ترقیوں کے لیے معاصر ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں:

بیانِ مطبع و کارگزارانِ مطبع

نکل آیا چھپ [illegible] مطبع [illegible] [illegible] کا ہیں دیکھوں ذرا
[illegible] [illegible] [illegible] سے آشکار
[illegible] [illegible] [illegible] ہر اک سنگ ہے

کلیں وہ کہ دیکھے سے ہو بے کلی — پری بھی پرستاں سے آئے چلی
وہ چلتی ہر اک کل ہو اس ڈھنگ سے — پری بن کے نکلے ورق سنگ سے
کہیں "کیمیائے سعادت" چھپی — کہیں "ہفت پیکر" برابر لگی
کسی سنگ پر "بوستاں" کی بہار — کسی جا پہ پھولی ہے "باغ و بہار"
معانی و منطق چہ علمِ ادب — عجم اور عرب کی کتب سب کی سب
چہ تصنیفِ فردوسی و انوری — تواریخ جمشید و اسکندری
سخن ہائے شعرائے ماضی و حال — مضامینِ رنگین و نازک خیال
تصانیفِ مجموع اہلِ زباں — جز و کل کلامِ زباں آوراں
ریاضی و حکمت میں جو کچھ بڑا — مکرر سکرر وہ چھاپا گیا
طبابت کے نسخے بھی اتنے چھپے — نہ میزان میں عقل کی آ سکے
سوا اس کے ہندی و اردو میں بھی — کتاب اک نہ چھپنے سے باقی رہی
کتاب ایسی عالم میں ہے کون سی — جو مطبع میں یاں کے نہ ہووے چھپی
جو پتھر ہیں چھاپے کے کہسار ہیں — کتابوں کے ہر جا پہ انبار ہیں
کوئی دیکھتا کیا سنا بھی نہیں — نہیں ہے نہیں ایسا مطبع کہیں
نہ لوگ ایسے مشاق و استادِ کار — کہ اک دم میں جو چھاپ ڈالیں ہزار
سوا اس کے چھپتا ہے اخبار بھی — وہ خبریں کہ جھوٹی نہ ہو دیں کبھی
مقرر ہیں اہلِ قلم جا بہ جا — لکھیں حال روزانہ ہر ملک کا
وہ خبریں کہ تحقیق اور راست ہیں — صداقت نما بے کم و کاست ہیں
عجب شعبدے کا ہے یہ امر خیر — کہ گھر بیٹھے ہے ہفت کشور کی سیر
یہ اخبار لیتے ہیں جو ناظرین — جہاں میں سفر ان کو واجب نہیں
یہ چھپتا مہینے میں ہے ہفتہ وار — نکلتا ہے ہر ماہ میں چار بار
روانہ یہ ہوتا ہے ترتیب ہو — ولایت ولایت کو ہر شہر کو
رہیں شوق میں منتظر ناظرین — ادھر کیوں نہ ہوں ان کی آنکھیں لگیں
لکھوں اہلِ تصحیح کا کیا میں حال — ہر اک علم میں عالم بے مثال
نظر اللہ کی کاپی پہ جس دم پڑی — ہوئی صحت آ دست بستہ کھڑی
وہ اعجاز ہیں میر عظمت علی — کہ پتھر پہ لکھیں خفی و جلی
کہوں کیا جو پتھر بناتے ہیں وہ — تو قدرت خدا کی دکھاتے ہیں وہ
چھپے صاف [illegible] الٹا لکھیں — نہ کہیے کرامت تو پھر کیا کہیں
اور اک دوسرے ہیں امیر علی — اور ان کا وہ بیٹا وزیر علی

مغضب کے یہ نقاش ہیں تیز دست
لکھیں آب پر شکل بالا و پست

جو تحریر کے جان پیدا ہوئی
جو تصویر کھینچی وہ گویا ہوئی

مقابل ہوں آکر جو استاد ہیں
کہاں آج مانی و بہزاد ہیں

سوا ان کے ہیں میر ابن حسن
بڑے اہلِ تہذیب و فخرِ زمن

میر دان کو مطبعے کا ہے اہتمام
بڑے خوش سلیقہ ہیں خوش انتظام

یہ چار آدمی ' چار رکنِ وقار
گویا شخص مطبعے کے عنصر ہیں چار

یہی چار ہیں ایسے چالاک و چست
انھیں سے ہے مطبعے کی ہر کل درست

لکھوں اہلِ دفتر کو گر فرد فرد
ابوالفضل کے چار دفتر ہوں گرد

یہ اشخاص یہ کارخانہ کہیں
جو دیکھو تو روئے زمیں پر نہیں

یہ مطبع بہارِ زمانہ ہوا
طلسمات کا کارخانہ ہوا

جو مطبعے کی تعریف میں نے لکھی
یہ تھی ایک کیفیت واقعی

مجھے نظم کرنا ہے اب اُس کا حال
جو ہے اہلِ مطبع مبارک خصال

جناب نول کشور ذو الکرام
کریم و سخی باذل و نیک نام

جو معروف نزدیک اور دُور ہو
غرض ہفت کشور میں مشہور ہے

خدا نے دیا اس کو وہ عز و جاہ
کہ دربانِ در جس کے ہیں مہر و ماہ

جواں ہے مگر عقل میں پیر ہے
جہاں میں فلاطونِ تدبیر ہے

جہاں اُس کی ہے ذات سے فیض یاب
کفِ جود سے ابر ہے آب آب

وہ مطبعے کا مالک ہے صاحب حشم
معظم مکرم مجسم کرم

علوم اس نے ارزاں کیے اس قدر
جہاں میں نہ کوئی رہے بے ہنر

بہ ہر شہر و ہر قریہ و ہر دیار
روانہ ہے گنجِ کتب بے شمار

جہاں میں جو ہیں اہلِ علم و ہنر
پریشاں پھریں کیوں وہ اب در بدر

بہ اہلِ کمال از من ایں مژدہ باد
رسید عشرت و رفت عسرت بباد

زمیں مخیر وہ موجود ہے
جو سر چشمۂ جود و بہبود ہے

بھلائی میں دن رات مصروف ہے
جہان کرم میں وہ معروف ہے

نہیں کوئی ایسا سخی حق پرست
فلک جس کی ہمت کے آگے ہے پست

وہ حاتم اور اس کی سخاوت ہے کیا
نہیں اس زمانے میں اچھا ہوا

بہت رد و بدل اس کے ہوتا ذلیل
زمانے میں مشہور ہوتا بخیل

بھلا تھی یہ حاتم کو قدرت کہاں
کہ اک آن میں دے حاصلِ بحر و کاں

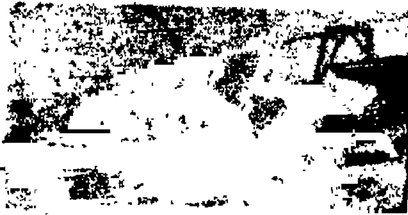
اسے گنجِ قاروں اگر ہاتھ آئے
تو بے صرفہ اک دم میں اس کو لٹائے

سخاوت کی پہلے ہی سن کے خبر
تہِ خاک قاروں چھپا لے کے زر

الٰہی یہ ساقیؔ کی ہے التجا
یہی ہے مرا حاصلِ مدعا

خدایا ہمیشہ اسے شاد رکھ
باکرام و اقبال آباد رکھ

تمنائے دل اس کی بر لا مدام
سخی و مخیر ہے وہ نیک نام[۵]





---

[۱] حیاتِ نول کشور کے بارے میں یہ امور مندرجہ ذیل مصادر پر مبنی ہیں:

(۱) تعمیرِ ہریانہ، چندی گڑھ۔ منشی نول کشور نمبر۔ جولائی۔ اگست ۱۹۷۹ء ص ۲۹

(۲) ہندستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں)؛ محمد عتیق صدیقی۔ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ دسمبر ۱۹۵۷ء ص ۳۰

(۳) جیون چرتر منشی نول کشور صاحب۔ مطبع منشی نول کشور لکھنؤ طبع ۱۹۰۲ء ص ص ۲ تا ۴

[۲] مشمولہ انگریزی کتاب "سیلکٹیڈ ڈاکیومنٹس فرام دی علی گڑھ آرکائیوز" مرتبہ یوسف حسین علی گڑھ طبع ۱۹۶۶ء ص ۶۹

[۳] ایضاً ص ۱۶۹ تا ۱۷۰

[۴] بحوالہ تاریخ؛ پروفیسر ڈاکٹر شبیہ الحسن نونہروی۔ اردو پبلشرز، لکھنؤ طبع فروری ۱۹۷۵ء ص ۱۹۳

[۵] پرمادت جھا کا مطبع منشی نولکشور لکھنؤ طبع مئی ۱۸۷۰ء - ص ۳۵۶ تا ۳۵۹



اوده اخبار

22nd August, 187 .

نمبر ۳۷ مطبوعہ ۲۲ اگست ۱۸۷۰ء مطابق ۵ جمادی الثانی ۱۲۸۷ ہجری روز سہ شنبہ — جلد ۱۲

اشتہار

اودھ اخبار لکھنؤ میں دو مرتبہ شائع ہوتا ہے، بجائے اکثر ناظرین جدت پسند و شائقین یاکشمند کی قدر دانی سے اور اس بات پر جو کہ معیشت کریمی تھی کہ اودھ اخبار ہفتے میں دو مرتبہ شائع ہوا کرے —

اسی طرح گورنمنٹ اور لوکل گورنمنٹ کی عنایت سے اب سامان اس عمدہ تجویز کا سامنا ہے، یہ طور پر ہوسکتا ہے کہ قدر دانوں کی نیک نیتی کا ثمرہ اور رونق شائستگی کو تجلی ہو —

لیکن یہ سمجھ کر کہ ہم دو اخبار سے محصول علیحدہ کا ہی اضافہ اخبار کی معاشت اور علوم و فنون کی اشاعت کے مواقع ...

صاحبان جنہیں سے محصول ناگوار ہو، چونکہ علاوہ اس کے حکم کا کم اکتوبر سے گزشتہ ماہ انڈیا میں مشتہر ہوا ہے اس حساب سے پورے دو مہینے باقی ہیں لہذا اخبار کے مطبع اودھ اخبار کی سیر منشی امرائے سنگھ شفیق عیسیٰ کے ان دو مہینوں کا محصول زائد جلد ناظرین کرام رمضان کیا ہے اور یکم اگست ہی سے یہ اخبار ہفتے میں دو مرتبہ چھپ کر اجرا ہوا اور یہ جواب التزام اور سلسلہ تبدیل کیا گیا سے کسب صاحبوں کو پسند آئے گا

حصہ دوم یوم جمعہ	حصہ اول یوم سہ شنبہ
۱ ـ لکھنؤ ـ	۱ ـ اشتہارات محصول
۲ ـ اخبار ـ	۲ ـ تعلیم
۳ ـ ٹیلیگراف ـ	۳ ـ خط و کتابت
۴ ـ کارسپانڈنٹ ـ	۴ ـ مضامین علمی وغیرہ
۵ ـ ترجمہ انگریزی ـ	۵ ـ ہنسی
۶ ـ کارسپانڈنٹ	۶ ـ منقولی ـ
۷ ـ ترجمہ انگریزی اخبارات	۷ ـ خط و کتابت
۸ ـ اخبارات مختلف	۸ ـ انگریزی گورنمنٹ گزٹ
۹ ـ لکھنؤ ـ	۹ ـ اشتہارات غیر معمولی اور سبورٹ کے ...

اور امر واضح ہو کہ مضامین ... علم و ادب ... انتشار کے اخبار سے ... کا ذوق و شوق ... ہر شخص ... سالانہ قیمت ... سال ... اخبار ...

منقول از اخبارات اردو

کلکتہ

[illegible]

اخبار عالم

تعلیم

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سیاسیات

[illegible]

لکھنؤ

[illegible]

بیان تعداد مردم شمار مردم

[illegible]

سنگدلی

[illegible]

[illegible]

مولوی سید احمد خان صاحب بہادر سی ایس آئی کی رائے ڈاکٹر ہنٹر صاحب کی کتاب کی نسبت

[illegible]

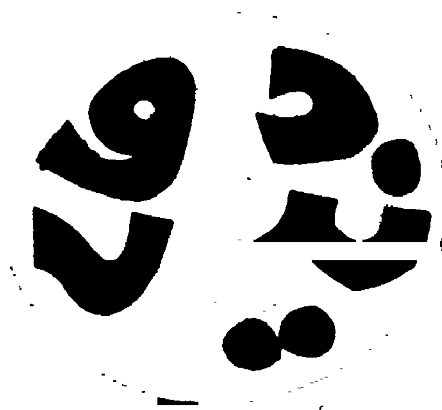


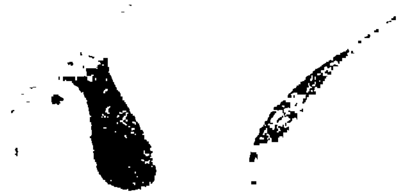





NEW DE











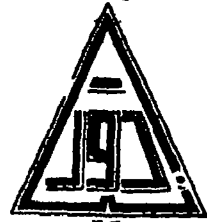








عنوانات



جلد ۳۵ نمبر ۱۰، ۱۱

جنوری، فروری ۱۹۸۱ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی



پبلشر: شری لال شکلا

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یوپی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زرِ سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پبلیکیشنز، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یوپی، لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

نمائندگی ادارتی: انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یوپی، لکھنؤ

اپنی بات

ہندستان میں عوامی جمہوریہ کے قیام کو ۳۱ سال پورے ہو گئے۔ ان ۳۱ برسوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ہماری جمہوریت اس طویل عرصے میں مختلف مراحل سے گزری ہے۔ ان مراحل نے نہ صرف یہ کہ ہمیں بہت کچھ سکھایا ہے بلکہ جمہوری نظام کو استحکام بھی بخشا ہے اور اس طرح اسے مزید توانائی اور قوت بھی حاصل ہوئی ہے۔ گزشتہ ۳۱ برسوں کے عملی تجربات نے یہ حقیقت بھی روشن اور ثابت کر دی ہے کہ جمہوری نظام حیات اور ہندستان ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ جمہوریت ہندستان کے لیے اسی طرح ضروری اور ناگزیر ہے جس طرح آزادی۔ ہمیں اپنی آزادی کے ساتھ ساتھ جمہوریت کی حفاظت کے لیے بھی بیدار اور چاق و چوبند رہنا ہے۔ ہمیں یہ بات ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ جمہوریت کی جڑیں ہمارے ملک میں اب اتنی گہری ہو گئی ہیں کہ انھیں اب اکھاڑ پھینکنا ممکن نہیں رہا ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے یہاں اگر جمہوریت نہ رہی تو ہماری آزادی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ یہاں یہ بات بھی دہرانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جمہوریت بجائے خود مقصد نہیں ہے۔ جمہوریت دبے کچلے پسماندہ اور مظلوم افراد کو پسماندگی، افلاس اور استحصال کی دلدل سے نکال کر انھیں ترقی و خوشحالی کے راستے پر گامزن کرنے کا وسیلہ ہے۔ جمہوریت اگر ان مقاصد کی تکمیل میں ناکام ہو جائے تو بے معنی ہو جاتی ہے اور اعتماد کھو دیتی ہے بعض ممالک کے تجربات نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ عوام کی ضروریات و خواہشات کی عدم تکمیل وہاں جمہوریت کے خاتمے کا سبب بن گئی۔ یہ حقیقت ہے کہ جمہوریت کی صحیح معنوں میں ضرورت غریب عوام کو ہی ہوتی ہے اور یہ عوام ہی جمہوریت کا سرچشمہ اور جمہوریت کی طاقت ہوتے ہیں۔ اسی لیے ابراہم لنکن نے بجا طور پر جمہوریت کو "عوام کے لیے عوام کے ذریعے عوام کی حکومت" قرار دیا تھا۔ لیکن جمہوریت صرف یہی نہیں ہے کہ عوام ووٹ دے دیں۔ صحیح معنوں میں عوام کا اقتدار قائم ہونا ہی جمہوریت ہے۔ ایک مغربی صحافی کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ "صرف یہ کافی نہیں ہے کہ کسی ملک میں جمہوریت ہے یا نہیں؟ سوال یہ ہے کہ کسی ملک میں کس حد تک جمہوریت ہے۔ جمہوریت کی مستقل توسیع کی ضرورت ہے۔ جمہوریت کوئی مشین نہیں ہے جسے آپ چلا دیں یا بند کر دیں۔ یہ ایک پودا ہے جس کی نشو و نما ہونی چاہیے۔ جس کے لیے مٹی تیار کرنی چاہیے اور جسے پانی دینا چاہیے"

ریاستی بجٹ ۔ ریاستی اسمبلی میں ۲۷ جنوری ۱۹۸۱ء کو ریاست کا ۸۲-۱۹۸۱ء کا بجٹ اتر پردیش کے وزیر مالیات شری برہم دت نے پیش کیا۔ یہ بجٹ مالیاتی نظم و نسق کو چاق و چوبند رکھنے، عوامی رقومات کو پیداوار میں اضافے پر خرچ کرنے اور سماج میں فعال بھی تعمیری اور پیداواری طاقتوں کی حوصلہ افزائی کرنے کے حکومت کے عزم کا مظہر ہے۔ اس بجٹ میں ایسے اقدامات تجویز کیے گئے ہیں جن سے عوامی نظام تقسیم کو ایک نئی شکل اور استحکام حاصل ہوگا۔ یہی اقدامات افراط زر کے خلاف ریاستی حکومت کی حکمت عملی کی بنیاد ہوں گے۔

[وزیر مالیات شری برہم دت نے اپنی بجٹ تقریر میں یہ یقین ظاہر کیا کہ مالی، معاشی اور انتظامی نوعیت کے مختلف اقدامات کے ذریعہ جلد ہی مہنگائی پر موثر ڈھنگ سے قابو پا لیا جائے گا۔ انھوں نے مزید کہا کہ زبردست خشک سالی اور سیلاب کے باعث ریاست کو زبردست نقصان پہنچا جس کے اثرات کم کرنے اور بڑے پیمانے پر امداد پہنچانے کی غرض سے موجودہ حکومت نے عزم مصمم کے ساتھ معیشت کی نو تعمیر کے لیے فوری اقدامات کیے جس کے یقینی طور سے بہتر نتائج برآمد ہوئے اور ریاست کی معیشت ترقی کی راہ پر گامزن ہو گئی۔ شری برہم دت نے کہا کہ بجٹ گزشتہ ۳۰ برسوں کے بعد بروقت پیش کر دینا حکومت کے اس عزم کا مظہر ہے کہ جو ابتر صورت حال تھی وہ بدلی جائے گی اور ریاست کے عوام کو فعال اور چاق و چوبند نظم و نسق فراہم کیا جائے گا۔

بجٹ کے ۴۶ء۹ کروڑ روپے کے تخمینی خسارہ کو سرکاری بقایوں کی وصولی میں مزید تیزی لا کر غیر منصوبہ جاتی اخراجات میں کفایت شعاری برت کر عوامی زمرہ کے اداروں کو ادارہ جاتی مالیات سے زیادہ سے زیادہ امداد دلا کر اور ان کی کارکردگی میں ایسا سدھار لا کر جس سے وہ ریاست کی بجٹ سے متعلق امداد پر انحصار کم کریں، ۱۵ کروڑ روپئے تک پورا کیے جانے کی تجویز ہے۔ ٹیکس تشخیص کمیٹی نے متعدد اقدامات تجویز کیے ہیں جن کا مقصد موجودہ ڈھانچے کے تحت ٹیکس کے نظام کو ایک نئی شکل دینا، اسے آسان بنانا اور ٹیکس کے نظام کی بنیاد کو وسیع دینا ہے تاکہ اسے اور موثر بنایا جا سکے۔

آہ مسعود اختر جمال! اردو کے خوش فکر ترقی پسند شاعر مسعود اختر جمال کا ۲۷ جنوری کو الٰہ آباد میں طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا وہ مجاز، فیض اور سردار جعفری وغیرہ کے ہمعصر اور ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور کی نمایاں شخصیتوں میں تھے۔ وہ اصلاً ردولی ضلع بارہ بنکی کے تھے لیکن ایک طویل عرصے سے ان کا قیام الٰہ آباد میں ہی تھا۔ انھوں نے ۱۹۴۲ء کی "ہندستان چھوڑو" تحریک میں بھی حصہ لیا اور جیل بھی گئے۔ وہ ایک کہنہ مشق شاعر تھے اور ان کی متعدد تصانیف شائع ہو چکی ہیں جن میں "نو رس" اور "مہتاب" دو شعری مجموعے ہیں۔ ان کی ایک کتاب "جشن آزادی" نے خاصی شہرت حاصل کی۔ ان کی آخری تصنیف "یادیں" زیر طبع ہے جو وہ مکمل نہیں کر سکے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۶۶ برس تھی۔ خدا مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

—— ایڈیٹر

فراق گورکھپوری
۸/۴ بینک روڈ
الہ آباد - ۳

غزل

کیسے کہوں کس طرح بتاؤں کہ کہاں میں قید ہوا ہوں
گنجِ بیکراں کے زنداں میں سہم سہم کہنا بھول گیا ہوں

میں کیا جانوں دوری و قربت میں کیا سمجھوں ہجر و وصال
تجھ سے مل کے ہوا اندازہ اپنے سے کتنا دور رہا ہوں

کاش بتا دیتے رستم کو آہ کہ میں ہی ہوں سہراب
عشق کے ہاتھوں زندگی پائی عشق کے ہاتھوں قتل ہوا ہوں

اپنی گمراہی کے صدقے لاؤں کہاں سے راہ نما
میں ترے گھر کا رستہ تھا اپنا رستہ بھول گیا ہوں

کتنے جگ آئے اور بیتے سب ہیں میری نظروں میں
یہ بھی دیکھا وہ بھی دیکھا لیکن اب کیا دیکھ رہا ہوں

خیر و شر میری پرچھائیں کیسی نیکی کیسی بدی
مشکل سے سمجھیں گے مجھ کو میں ہی اہرمن میں ہی خدا ہوں

مجھ سے مشرق کی پیشانی ہو جاتی ہے رنگا رنگ
میں ہی دھرتی کا سہاگ ہوں روز افق پر جھلک جاتا ہوں

مجھ کو فراق اب صدیاں گذریں یاد نہیں کب نغمہ سرا تھا
اب بھی کان کھنک جاتے ہیں اب بھی فضا میں گونج رہا ہوں

مولانا امتیاز علی خاں عرشی

کیا مولانا فضل حق خیرآبادی کا ۱۸۵۷ کے فتوائے جہاد سے تعلق تھا؟

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں جن اہل علم نے سزا بھگتی ان میں مولانا فضل حق خیرآبادی بھی شامل ہیں۔

جناب عبدالشاہد خاں شروانی نے "باغی ہندستان" میں لکھا ہے ؎

"..... علامہ فضل حق کو بھی باغی قرار دیا گیا اسیر فرنگ ہو کر بند ہوئے۔ ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۸۵۹ء میں لکھنؤ میں مقدمہ چلا۔ علامہ کے ثبات، استقلال، صداقت، حقانیت اور بلند ہمتی، شیر دلی کے لیے سیر العلما کی یہ عبارت کافی ہے۔

۱۸۵۹ء میں سلطنت مغلیہ کی وفاداری، یا فتوائے جہاد کی پاداش یا جرم بغاوت میں مولانا ماخوذ ہو کر سیتاپور سے لکھنؤ لائے گئے۔ مقدمہ چلا۔ مولانا موصوف کے فیصلے کے لیے جیوری بیٹھی۔ ایک اسیسر نے واقعات سن کر بالکل چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ سرکاری وکیل کے مقابل خود مولانا بحث کرتے تھے۔ بلکہ لطف یہ تھا کہ چند الزام اپنے اوپر خود قائم کیے اور پھر خود ہی مثل تار عنکبوت عقلی و قانونی دلیل سے توڑ دیے جج یہ رنگ دیکھ کر پریشان تھا اور اُن سے ہمدردی بھی تھی جج نے صدر الصدوری کے عہد میں مولانا سے کچھ عرصے کام بھی سیکھا تھا۔ وہ مولانا کی عظمت و تبحر سے بھی واقف تھا دل سے چاہتا تھا کہ مولانا بری ہو جائیں۔ مگر وہ کیا کرے، ظاہر یہ تھا کہ مولانا بری ہو جائیں گے ...... دوسرا دن آخری دن تھا۔ مولانا نے اپنے اوپر جس قدر الزام لیے تھے۔ ایک ایک کر کے سب رد کر دیے جس مخبر نے فتوے کی خبر کی تھی اس کے بیان کی تصدیق و توثیق کی فرمایا:

"پہلے اس گواہ نے سچ کہا تھا اور رپورٹ بالکل صحیح لکھوائی تھی۔ اب عدالت میں میری صورت دیکھ کر مرعوب ہو گیا اور جھوٹ بولا۔ وہ فتویٰ صحیح ہے میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری رائے وہی ہے۔

جج بار بار علامہ کو روکتا تھا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ مخبر نے عدالت کا رُخ اور علامہ کی بارعب و پُر وقار شکل دیکھ کر شناخت کرنے سے گریز کرتے ہوئے کہہ ہی دیا تھا کہ یہ وہ مولانا فضل حق نہیں وہ دوسرے تھے، گواہ حسن صورت اور پاکیزگی سیرت سے بے انتہا متاثر ہو چکا تھا۔ مگر علامہ کی شانِ استقلال کے قربان جائیے۔ خدا کا شیر گرج کر کہتا ہے:

"وہ فتویٰ صحیح ہے۔ میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے"

نالہ از بہر رہائی نہ کند مرغ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نبود

علامہ کے اقرار و توثیق کے بعد گنجائش ہی کیا باقی رہ گئی تھی بے حد رنج کے ساتھ عدالت نے حبس دوام بعبور دریائے شور کا حکم سنایا۔ آپ نے بکمال مسرت اور خندہ پیشانی سے سُنا۔

علامہ کے استاد بھائی اور رفیق خاص مفتی صدرالدین صاحب آزردہ صدر الصدور دہلی نے بھی علامہ کی تجویز سے فتوے پر "شہدت بالحق" لکھ کر دستخط کر دیے تھے۔ گرفتاری کے بعد

مفتی صاحب نے یہ بتایا کہ میں نے پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ جبراً دستخط کرنا پڑ رہے ہیں۔ بالجبر پر نقطے نہ لگے تھے علمائے وقت نے اسے بالخیر پڑھا اور مفتی صاحب نے بالجبر بتا کر جان چھڑائی البتہ جائداد و املاک کا کافی حصہ ضبط کر لیا گیا ؎

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

بلند ہمتی کی سعادت ہر شخص کے حصے میں نہیں آیا کرتی

"نہ ہر درخت تحمل کند جفائے خزاں
غلام ہمت سروم کہ ایں قدم دارد"

جناب شیروانی کے مذکورہ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ:

(۱) مولانا خیرآبادی پر یہ الزام عاید کیا گیا کہ انھوں نے جہاد کا فتویٰ لکھ کر مسلمانوں کو انگریزی حکومت کے خلاف اور سلطنت مغلیہ کے ساتھ وفاداری پر آمادہ کیا۔

(۲) مولانا پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا تھا اور انھیں صفائی پیش کرنے کا پورا موقع ملا تھا۔

(۳) مولانا نے اپنی صفائی پیش بھی کی تھی اور خود بحث کر کے اپنی برأت ثابت بھی کر دی تھی

(۴) ایک اسیسر بھی مولانا کی رہائی کا موید تھا۔

(۵) جج بھی جو مولانا کا شاگرد تھا از راہ ہمدردی مولانا کو چھوڑ دینا ہی چاہتا تھا۔

(۶) گواہ نے بھی کہہ دیا تھا کہ یہ وہ مولانا فضل حق نہیں وہ دوسرے تھے۔

(۷) مگر دوسرے دن مولانا نے شان استقلال اور بلند ہمتی دکھائی اور اپنے فتوائے جہاد لکھنے کے جرم کا اقرار کر لیا اور باوجودیکہ

(۸) جج نے مولانا کو بار بار روکا مگر وہ اپنی بلند ہمتی کے باعث اپنے اقرار پر جمے رہے۔

(۹) مجبوراً جج نے حبس دوام بعبور دریائے شور کا حکم دے دیا۔

جہاں تک واقعات تاریخی کا تعلق ہے ان میں سے اکثر محتاج ثبوت ہیں، بلکہ مولانا کے رسالہ غدریہ کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خود مولانا کا بیان ان کے خلاف ہے۔

(۱) سب سے پہلے فتوائے جہاد کو لیجیے جو مولانا کے سزایاب ہونے کی بنیاد ہے۔ جناب شروانی نے اسی کتاب کے صفحہ ۱۵۶ پر لکھا ہے:

"علامہ سے جنرل بخت خاں ملنے پہنچے مشورے کے بعد مولانا نے آخری تیر ترکش سے نکالا بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں علما کے سامنے تقریر کی۔ استفتا پیش کیا۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہ صدر الصدور دہلی، مولوی عبد القادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبرآبادی، سید مبارک شاہ رام پوری نے دستخط کر دیے اس فتوے کے شایع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی دہلی میں نوے ہزار سپاہ جمع ہو گئی تھی۔"

اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ جنرل بخت خاں کے مشورے کے بعد مولانا خیرآبادی نے جامع مسجد میں تقریر کر کے علما کو جہاد کا فتویٰ دینے پر آمادہ کیا۔

چونکہ جناب شروانی نے یہ مطالب مولانا ذکاء اللہ دہلوی کی تاریخ سے نقل فرمائے ہیں۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے الفاظ بھی پڑھ لیے جائیں۔ مولانا ذکاء اللہ تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ جلد ۵ صفحہ ۶۰ میں فرماتے ہیں:

"سب سے اوّل مولوی رحمت اللہ کرانہ سے اس ٹوہ میں آئے کہ دہلی میں جہاد کی کیا صورت ہے۔ وہ بڑے فاضل عیسائی مذہب کی رد میں صاحب تصنیف تھے وہ قلعے کے پاس مولوی محمد حیات کی مسجد میں اترے، اس دانش مند مولوی کے نزدیک دہلی میں جہاد کی کوئی صورت نہ تھی بلکہ ایک ہنگامہ برپا تھا۔ وہ یہ سمجھ کر اپنے وطن کو چلا گیا۔ جب تک دہلی میں بخت خاں نہیں آیا جہاد کے فتوے کا چرچا شہر میں بہت کم تھا۔ مساجد میں منبروں پر جہاد کا وعظ کم تر ہوتا تھا۔ دلی کے مولوی اور اکثر مسلمان خاندان تیموریہ کو ایسا

جو انہیں بطور خطرہ جانتے تھے کہ وہ ناممکن سمجھتے تھے کہ اس خاندان کی بادشاہی ہندوستان میں ہو۔ مگر اس کے ساتھ ۔۔۔ مسلمانوں کو یہ یقین تھا کہ انگریزی سلطنت کے بدن میں یہ ایسا پھوڑا نکلا ہے کہ وہ جانبر نہیں ہوگی یہ کام ۔۔۔ مسلمانوں کا تھا کہ وہ جہاد جہاد پکارتے پھرتے تھے۔

مگر جب بخت خاں جس کا نام اہل شہر نے کم بخت خاں رکھا تھا، دلی میں آیا تو اس نے یہ فتویٰ لکھایا کہ مسلمانوں پر جہاد اس لیے فرض ہے کہ اگر کافروں کی فتح ہو گی تو وہ اُن کے بیوی بچوں کو قتل کر ڈالیں گے اس نے جامع مسجد میں مولویوں کو جمع کر کے جہاد کے فتوے پر دستخط و مہریں اُن کی کرائیں اور مفتی صدر الدین نے بھی ان کے جبر سے اپنی جعلی مہر کر دی۔ لیکن مولوی محبوب علی و خواجہ ضیاء الدین نے فتوے پر مہریں نہیں کیں اور بے باکانہ کہہ دیا کہ شرائط جہاد موافق مذہب اسلام موجود نہیں اس فتوے کا اثر یہ تھا کہ ۔۔۔ مسلمانوں میں جوش مذہبی زیادہ ہو گیا، جن مولویوں نے فتوے پر مہریں کی تھیں وہ کبھی پہاڑی پر انگریزوں سے لڑنے نہیں گئے۔ مولانا نذیر حسین جو وہابیوں کے مقتدا اور پیشوا تھے ان کی تحریر میں تو ایک سہمی سہمی بھیجی تھی۔

اس فتوے پر کچھ مہریں اصلی کچھ جعلی تھیں۔ ایک مولوی کی مہر تھی جو غدر سے پہلے قبر میں سو چکا تھا۔"

اس عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ تنہا بخت خاں فتویٰ جہاد کا ذمہ دار ہے اُسی نے جامع مسجد میں تمام مولویوں کو جمع کر کے فتوے پر دستخط کرائے تھے۔ مولوی ذکاء اللہ کی اسی تاریخ (جلد ۵ صفحہ ۶۸۱) سے پتا چلتا ہے کہ جولائی کے شروع میں بخت خاں بڑی سلیقہ مندی اور ہوشیاری سے دہلی میں آیا۔ لہٰذا فتوائے جہاد کو ماہ جولائی سے پہلے معرض وجود میں نہ آنا چاہیے۔ جناب شروانی نے اپنی کتاب (ص ۱۵۵) میں منشی جیون لال کے روزنامچے سے نقل کیا ہے کہ ۱۹ اگست ۱۸۵۷ء کو مولانا خیر آبادی شریک دربار ہوئے اور اشرفی نذر میں پیش کی اور صورت حالات کے متعلق تبادلہ

سے گفتگو کی اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "علامہ اس فتوے کی اشاعت کرتے ہوئے اگست ۱۸۵۷ء میں دلی پہنچے" مرض اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۶ اگست ۱۸۵۷ء کے بعد مذکورہ بالا فتویٰ مرتب ہو کر شائع ہوا۔

ڈاکٹر اطہر عباس رضوی کی ایک ہندی کتاب سوتنتر دلی ہے جو ۱۸۵۷ء کی یادگار میں حکومت یوپی نے شائع کی ہے اس کے آخر میں بہت سے اہم کاغذات کے عکس بھی چھاپ دیے گئے ہیں ان کے منجملہ صادق الاخبار دہلی مورخہ ۲۶ جولائی ۱۸۵۷ء کا فوٹو بھی ہے اس کے ایک صفحے پر فتوائے جہاد بھی موجود ہے مدیر اخبار نے اس فتوے کی سُرخی یہ دی ہے: "نقل استفتا از اخبار الظفر دہلی اردو" اور اس کے بعد حسب ذیل عبارت نقل کی ہے:

"کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ اب جو انگریز دلی پر چڑھ آئے اور اہل اسلام کی جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں اس صورت میں اب شہر والوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں اگر فرض ہے تو وہ فرض عین ہے یا نہیں۔ اور لوگ جو اور شہروں اور بستیوں کے رہنے والے ہیں ان کو بھی جہاد چاہیے یا نہیں؟ بیان کرو اللہ تم کو جزائے خیر دے۔"

جواب: درصورت مرقومہ فرض عین ہے اوپر تمام شہر کے لوگوں کے اور استطاعت ضرور ہے اس کی فرضیت کے واسطے چنانچہ اب اس شہر والوں کو طاقت مقابلے اور لڑائی کی ہے بسبب کثرت اجتماع افواج کے اور مہیا اور موجود ہونے آلات حرب کے تو فرض عین ہونے میں کیا شک رہا۔ اور اطراف و حوالی کے لوگوں پر جو دور ہیں باوجود خبر کے فرض کفایہ ہے ہاں اگر اس شہر کے لوگ باہر ہو جائیں مقابلے سے یا سستی کریں اور مقابلہ نہ کریں تو اس صورت میں اُن پر بھی فرض ہو جائے گا اسی طرح اور اسی ترتیب سے سارے اہل زمین پر شرقاً و غرباً فرض عین ہو گا اور جو عدو ان بستیوں پر ہجوم اور قتل اور غارت کا ارادہ کریں تو اس بستی والوں پر بھی فرض ہو جائے گا بشرطیکہ ان کی طاقت کے۔

العبد المجیب احقر نور جمال عفی عنہ"

اس جواب کے نیچے حسب ذیل ۳۳ علما کے دستخط ہیں۔

(۱) محمد نذیر حسین (۲) رحمت اللہ (۳) مفتی صدر الدین (۴) منشی اکرام الدین معروف سید رحمت علی (۵) محمد ضیاء الدین (۶) عبد القادر (۷) احمد سعید احمدی (۸) محمد میر خاں یا میر محمد خاں) (۹) محمد عبد الکریم (۱۰) سکندر علی (۱۱) محمد کریم اللہ (۱۲) مولوی عبد الغنی (۱۳) محمد علی (۱۴) فرید الدین (۱۵) محمد سرفراز علی (۱۶) سید محبوب علی جعفری (۱۷) محمد حامی الدین (۱۸) سید احمد علی (۱۹) الٰہی بخش (۲۰) محمد مصطفےٰ خاں ولد حیدر شاہ نقش بندی (۲۱) محمد انصار علی (۲۲) مولوی سعید الدین (۲۳) حفیظ اللہ خاں (۲۴) محمد نور الحق (۲۵) سراج العلما ضیاء الفقہا مفتی عدالت العالیہ محمد رحمت علی صاحب (۲۶) اللہ الغنی وانتم الفقراء (۲۷) حیدر علی (۲۸) سیف الرحمٰن (۲۹) سید عبد الحمید (۳۰) محمد ہاشم (۳۱) سید محمد (یا حافظ کو مربع لکھ کر بیچ میں نام لکھا ہے) (۳۲) محمد امداد علی (۳۳) خادم شرع شریف رسول الثقلین قاضی القضات محمد علی حسینی۔

اس سے دو باتیں بالکل متعین ہو جاتی ہیں۔

(۱) پہلی یہ کہ زیر بحث فتویٰ ۲۶ جولائی ۱۸۵۷ء سے پہلے اخبار الظفر دہلی میں اور اسی تاریخ کو صادق الاخبار دہلی میں شائع ہوا تھا جبکہ مولانا خیر آبادی کو دہلی میں آنے کے لیے ابھی کم از کم بیس دن درکار تھے۔

(۲) دوسری یہ کہ چونکہ یہ فتویٰ مولانا کے ورود دہلی سے پہلے مرتب ہو کر شائع ہو چکا تھا اس لیے اس پر مولانا خیر آبادی کے دستخط نہیں ہو سکتے تھے۔

اس کے بعد مولانا خیر آبادی کا اپنا بیان پڑھیے وہ رسالہ عذریہ (ص ۲۳، ۲۴) میں فرماتے ہیں:

"یہ تو سب کچھ ہو ہی رہا تھا کہ بعض شہر و دیہہ سے بہادر مسلمانوں کی ایک جماعت علماء زہاد اور ائمہ اجتہاد سے جہاد کے وجوب کا فتویٰ لے کر جدال و قتال اور رزم (جہاد) کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔"

اس بیان میں مولانا نے علماء زہاد اور ائمہ اجتہاد کے فتویٰ دینے کا تو ذکر کیا ہے مگر اپنا حوالہ بالکل نہیں دیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر وہ شریک فتویٰ بھی ہوتے تو جیسا کہ آگے چل کر (ص ۸، ۳۰) ارباب حکومت کو اپنے مشورے دینے کا تذکرہ فرماتے ہیں یہاں بھی فتوے کی طرف کچھ نہ کچھ اشارہ ضرور کرتے (اور اس شق کے ثابت ہو جانے کے بعد پھر شق نمبر ۲ کو بھی کالعدم ماننا چاہیے ورنہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مولانا خیر آبادی کے خلاف گواہی دینے والے نے نہیں بلکہ خود مولانا خیر آبادی نے غیر شرعی شوق شہادت سے مجبور ہو کر ایسا جھوٹ بولا تھا جو اگر باور کر لیا جاتا اور اس کے مطابق انھیں پھانسی کی سزا دے دی جاتی تو وہ ایک طرح کی خودکشی کے مرتکب قرار پاتے۔

(۳) اب شق نمبر ۲ اور ۳ کو لیجیے خود جناب شروانی نے سیر العلما کی جو عبارت نقل کی ہے اس سے یہ ثابت ہے کہ مولانا پر باقاعدہ مقدمہ چلایا گیا تھا۔ مولانا نے اس مقدمے کی بھرپور پیروی کی تھی اور ان کے بڑے بیٹے مولانا عبد الحق خیر آبادی کی درخواست پر مولوی نبی بخش صاحب، مولوی قادر بخش صاحب اور مولوی سید ضامن حسین صاحب شہادت صفائی کے لیے لکھنؤ گئے تھے اور منشی کرم احمد خیر آبادی اس مقدمے کے پیروکار تھے۔

اگر مولانا خیر آبادی کا منشا ہی سزا پانا ہوتا تو وہ یہ سب کچھ کیوں کرتے۔ اور اگر ان کی خواہش کے خلاف ان کے بیٹوں اور اعزا و احباب کی طرف سے کیا گیا ہوتا، تو خود اپنی برأت ثابت کرنے کے لیے عدالت میں بحث نہ کرتے اور کم از کم اس لطف کی بات کے موجد تو ہرگز نہ ہوتے کہ خود ہی چند الزام اپنے اوپر قائم کرتے اور پھر خود ہی مثل تار عنکبوت عقلی و قانونی ادلہ سے توڑ دیتے۔

یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا نے عدالت میں جو کچھ اپنی صفائی میں کہا سنا اور جس قدر سعی و کوشش ان کے اعزا نے کی اس سے مقصود انگریزوں کے ظلم و ستم کو اور نمایاں کرنا اور دنیا کو یہ دکھانا تھا کہ باوجود مولانا کی برأت ثابت ہو جانے انھیں ظلماً سزا دے دی گئی مگر

جناب شروانی کا یہ ارشاد کہ مولانا خیرآبادی نے سب کچھ ثابت کردینے کے بعد خود ہی اقرار جرم کرلیا اس جواب کو رد کردیتا ہے کیونکہ اس اقرار سے انگریزی حکام کی بیداد کا مطلق اظہار نہیں ہوتا۔

(۳) رہی یہ بات کہ جج مولانا کا ہمدرد تھا کہ انھیں بری کردے تو یہ بات خود مولانا خیرآبادی کے بیان کے خلاف ہے۔ وہ رسالہ غدریہ (ص ۱۰۲) میں فرماتے ہیں کہ :-

"میرا معاملہ ایسے ظالم حاکم کے سپرد کردیا جو مظلوم پر رحم کرنا ہی نہ جانتا تھا اس ظالم حاکم نے میری جلاوطنی اور عمر قید کا فیصلہ صادر کردیا اور میری کتابیں جائداد، مال و متاع اور اہل و عیال کے رہنے کا مکان غرض ہر چیز پر غاصبانہ قبضہ کرلیا"

(۴) یہی صورت حال جناب شروانی کے اس ارشاد کی ہے کہ مخبر نے عدالت کا رخ اور علامہ کی بارعب و پروقار شکل دیکھ کر شناخت کرنے سے گریز کرتے ہوئے کہہ دیا تھا کہ "وہ مولانا فضل حق نہیں، وہ دوسرے تھے۔ کیونکہ مولانا خیرآبادی نے مذکورہ بالا بیان میں یہ بھی فرمایا ہے کہ :

" میری چغلی ایسے دو مرتد، جھگڑالو، تندخو افراد نے کھائی، جو مجھ سے قرآن کی محکم آیت میں مجادلہ کرتے تھے جس کا حکم یہ تھا کہ نصاریٰ کا دوست بھی نصرانی ہے وہ دونوں نصاریٰ کی مودت و محبت پر مُصر تھے۔ انھوں نے مرتد ہوکر کفر کو ایمان سے بدل لیا تھا"

اگر مخبر عدالت میں مولانا کے حق میں گواہی دے چکا تھا تو مولانا کا جزائر انڈمان میں بیٹھ کر اُسے مرتد جھگڑالو اور تندخو کہنا اُن کی شان کے قطعاً خلاف تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات بھی واقعے کے خلاف ہے اگر اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ وہ شوق شہادت میں ناکردہ گناہ کی سزا پانا چاہتے تھے تو یہ اُن کے تمام صاف اور صریح بیانوں کے خلاف ہے وہ قصیدۂ ہمزیہ میں افسوس کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:
"میں بیٹھنے والوں کو لڑائی میں برابر آگے بڑھاتا رہا اور لڑائی شروع ہوجانے پر خود بیٹھ رہا۔ میں اپنی سستی کی وجہ سے ایسے موقع پر باز رہا یہ میں نے بڑا جرم کیا۔ پس جبکہ نیک بخت حضرات شہید ہوگئے تو میں شہادت سے محروم رہا۔ اے پروردگار میرے قصور کو معاف کر مجھ سے عفو و درگزر ہی کی امید ہے"

اور اگر یہ کہا جائے کہ انھوں نے تلافی مافات کے خیال سے اب شہید ہونے کی تدبیر نکالتے ہوئے اقرار تحریر فتویٰ کیا تھا۔ تو یہ بھی درست نہیں کیونکہ انھوں نے اپنے دونوں قصیدوں اور رسالۂ غدریہ میں جگہ جگہ نصاریٰ کے ظلم و استبداد ملکہ وکٹوریہ کے غدر و مکر اور مخبروں کے جھوٹ اور فریب کو اپنے تمام مصائب کا سبب قرار دیا ہے اور اللہ تعالیٰ سے بے حد تضرع و زاری کے ساتھ دعائیں کی ہیں کہ وہ انھیں قید اور اس کے عذابوں سے جلد از جلد نجات دے کر بخیر و عافیت اہل و عیال تک واپس پہنچا دے، لہذا یہ کہنا کہ مولانا خیرآبادی نے خود اقرار جرم کیا اور خوشی خوشی قید و بند کے مصائب کو اپنے اوپر لادا کسی طرح بھی ان کے خیالات کی ترجمانی نہیں ہے۔

کتاب خانہ رام پور میں مولانا خیرآبادی کا ایک خط محفوظ ہے اس سے مولانا کے اسباب قید و بند اور مدار رہائی سعی و کوشش رہائی پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ ذیل میں اُسے نقل کیا جاتا ہے تاکہ اہل تاریخ صحیح صورت حال سے آگاہ ہوجائیں خط ملاحظہ ہو:

جناب عالی جناب نواب صاحب خداوند نعمت فیاض زمان ملاذ و معاذ علمائے دوران دام اقبالہ،

بعرض ———— میرساند

کہ پیش ازیں دو تا عریضۂ عقیدہ مشتمل بر ابتلای خویش ارسال عالی جناب کردہ ام بنظر اشرف گزشتہ کاشف مجاری مندرجہ شدہ باشد دم رعب کاری این جاد اینج شد کہ فدوی را بعلت نوکری خان بہادر خان و نظامت بیلی بھیت و چکلہ داری محمدی و افسری لشکر باغی ماخوذ کردہ اند و حال آنکہ فدوی ازیں ہر سہ امر محض بری ست و منشا ء مواخذہ آنست کہ شخصے میر فضل حق نام از سادات شاہجہانپور کہ قبل ازیں در سرکار بقرار بندگان عالی ملازم ماندہ بسررشتہ داری بیلی بھیت مامور شدہ در زمانے تحصیلدار آنولہ و بیلی بھیت ماندہ بود، در ابتدائی غدر از طرف خان بہادر خان ناظم بیلی بھیت گردید، و بعد فتح بریلی در ملک اودھ رسیدہ از حضر

خان علی خاں چکلہ دار محمدی شدہ۔ پس از زمانے بافسری کرامی لشکر باغی همراه فیروز شاه آں طرف جمن فرار کرد عزیزان او در سرکار کمپنی بعہدہ ہائے جلیلہ ماموزند۔ چنانچہ برادر حقیقی او مولوی مبین ڈپٹی کلکٹر سہارنپور بود۔ مہتمان اخبار خانہ خراب نا واقف ازیں تفصیل کہ او شخصی دیگر ست و فدوی از شیوخ خیرآباد شخصی دیگر در اخبار نامہ حال نظامت بیلی بھیت و محمدی و افسری لشکر و فرار او با فیروز شاہ آں طرف جمن نوشتہ، بعض علامات فدوی افزودند کہ برادر حقیقی او در سرکار مہاراجہ پٹیالہ نوکر و برادر دیگرش در سہارنپور ڈپٹی کلکٹر ست حاکمان ایں جا باشتباه ہماں مولوی فضل حق کہ ہم نام و در بعضے علامات شریک فدوی است فدوی را محض بے جرم مقید کردہ اند۔ ہذا عرض رسا نست کہ اسمٰعیل خاں رئیس مالاگڑھ دریں روز ہا وارد آں دیار اند و از حال فدوی و مولوی فضل حق شاہ جہاں پوری مذکور بخوبی واقف، بایشاں ایمارود تا ایشان کیفیت تفصیلی مشار الیہ و حال عبور او دریای جمن راہمراہ فیروز شاہ و حال بے جرمی فدوی نوشتہ مع عرضی خود بنام ترپ صاحب کمان افسر بریلی متضمن درخواست ارسال کیفیت مذکور بذریعہ چٹھی خود محکمہ اسپیشل کمشنر لکھنؤ خدمت ترپ صاحب موصوف روانہ دارند و در کیفیت تغائر بسیار میان فدوی و فضل حق شاہجہانپوری ثابت سازند و نوکر بودن فدوی بسرکار کرامی باغی و افسر نبودن فدوی بکدامی لشکر و ناظم نماندن فدوی بعلاقہ بیلی بھیت و محمدی ایں جملہ امور واقعی است بوجہ احسن ثبت کنند تا صاحب موصوف عرضی و کیفیت مرسلۂ ایشان راہمراہ چٹھی خود دریں جا روانہ فرمایند و بواسطۂ آں چٹھی و کیفیت اشتباہ حکام ایں جا رفع شود و نمک خوار قدیم رہائی یافتہ بدعاے ترقی حشمت و جاہ گردد از پرورش خاوندانہ و مواسات کریمانہ امید وار است توجہ بسیار بحال زارم مبذول شود و بعجلت پرچہ تمام ترا ثر توجہ مسئول ظاہر گردد۔ واجب بود عرض نمود۔ آفتاب ترقی جاہ و جلال ہموارہ تاباں باد۔

ترقی خواہ

عرضے

مہر (فضل حق ۱۲۴۳) نمک خوار قدیم

۱۸ ر فروری

مولانا نے یہ عریضہ لکھنؤ سے نواب یوسف علی خاں بہادر والی رام پور کو لکھا تھا چونکہ نواب صاحب کا رویہ انگریزوں کے موافق رہا تھا اس لیے یہ امید کی جا سکتی تھی کہ وہ کوشش اور سفارش کریں گے تو انگریزی قید و بند سے نجات مل سکے گی۔ اس لیے مولانا نے انھیں یکے بعد دیگرے تین خطوط لکھے، پہلے دو خط محفوظ نہ رہے یا محفوظ نہ رکھے گئے، تیسرا خط پہلی بار اہل تاریخ کے سامنے پیش ہو رہا ہے۔

اس خط سے حسب ذیل امر ہمارے علم میں آتے ہیں:

(۱) مولانا خیرآبادی نے ابتلا کے سلسلے میں نواب رام پور کو تین خط لکھے تھے، چونکہ آخری خط میں اُن سے مدد کی خواہش کی گئی ہے اس لیے قیاس یہ ہے کہ پہلے دو خطوں میں بھی اسی قسم کی تمنا کا اظہار کیا گیا ہو گا۔

(۲) مولانا پر حسب ذیل تین الزام عاید کیے گئے تھے:

(الف) نواب خان بہادر خاں نبیرۂ حافظ رحمت خاں بہادر نے جب انگریزوں کے خلاف بریلی میں مخالفت کی تو مولانا نے ان کا ساتھ دیا اور ان کی طرف سے نظامت پیلی بھیت کا کام انجام دیا۔

(ب) جب انگریزوں نے بریلی فتح کر لی تو مولانا یہاں سے بھاگ کر اودھ پہنچے اور خان علی خاں کی طرف سے ریاست محمدی کے چکلہ دار مقرر ہوئے۔

(ج) مولانا نے اس کے بعد ایک باغی لشکر کی کمان اپنے ہاتھ میں لی۔

(۳) مولانا پر جو مذکورہ بالا تین الزام لگائے گئے تھے،

یہ دراصل میر فضل حق رام پوری ثم شاہ جہاں پوری[۳] کے کارنامے تھے مولانا ان سے بری الذمہ تھے۔

(۴) مخبروں نے ہم نامی کی بنا پر دھوکا کھایا اور اپنی خفیہ رپورٹوں میں اتنا اور اضافہ کر دیا کہ ان کا ایک بھائی مہاراجہ پٹیالہ کا ملازم ہے جو ایک امر واقعی تھا۔

(۵) اگر کسی طرح ان الزاموں کا غلط ہونا یعنی ان جرموں کا میر فضل حق شاہ جہاں پوری سے تعلق ثابت ہو جاتا تو مولانا بری ہو جاتے۔

(۶) لہٰذا مولانا نے نواب صاحب سے انتہائی عاجزی و زاری کے ساتھ مدد کی التجا کی تھی۔

(۷) مولانا کا یہ خط ۱۸ فروری ۱۸۵۹ء کا نوشتہ ہے اور انھیں ۲۰ فروری کو حکم سزا (حبس دوام بعبور دریائے شور) سنایا گیا اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ آخری وقت تک اپنی رہائی کے اسباب میں لگے رہے تھے۔

ان کے پیش نظر یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ مولانا خیر آبادی پر تحریر فتویٰ کا الزام عائد نہیں کیا گیا تھا بلکہ ان پر غدر دہلی سے متعلق کوئی الزام ہی نہ لگا تھا اور جو الزام عائد کیے گئے تھے وہ دراصل دوسرے مولوی فضل حق کے کام تھے یہ اُن سے بالکل بری الذمہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب عدالت میں مخبر پیش ہوئے تو بقول جناب عرشی رامپوری انھوں نے مولانا کے متعلق صاف کہہ دیا کہ یہ وہ فضل حق نہیں ہیں وہ دوسرے تھے، مگر انگریز پر جبر کا بھوت سوار تھا۔ حاکم نے اس شبہہ کا فائدہ مولانا کو صرف اتنا دیا کہ انھیں پھانسی کی جگہ حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا دے دی۔

فتوائے جہاد کی اصلیت

پچھلے صفحات میں صرف یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مولانا خیر آبادی کا جہاد کے فتوے سے کوئی تعلق نہ تھا اب اس پر بھی غور کرنا ہے کہ کیا حقیقت میں جہاد کا فتویٰ دہلی کے علماء کی طرف سے چھاپا گیا تھا یا باغی سپاہیوں نے عوام اور اہل اسلام کو اپنے ساتھ ملا کر بغاوت کو کامیاب بنانے کے لیے یہ چال چلی تھی۔

اس نقطے پر سب سے پہلے سرسید نے اپنی کتاب "اسباب سرکشی ہندوستان" (ص، طبع آگرہ ۱۸۵۸ء) میں روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"دلی میں جو جہاد کا فتویٰ چھپا وہ ایک عمدہ دلیل جہاد کی سمجھی جاتی ہے مگر میں نے تحقیق سُنا ہے اور اس کے اثبات پر بہت دلیلیں ہیں کہ وہ محض بے اصل ہے میں نے سُنا ہے کہ جب فوج نمک حرام میرٹھ سے دلی میں گئی تو کسی شخص نے جہاد کے باب میں فتوے چاہا سب نے فتویٰ دیا کہ جہاد نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اس پہلے فتوے کی میں نے نقل دیکھی ہے مگر جب کہ وہ اصلی فتویٰ معدوم ہے تو میں اس نقل کو نہیں کہہ سکتا کہ کہاں تک لائق اعتماد کے ہے۔

مگر جب بریلی کی فوج دلی میں پہنچی اور دوبارہ فتویٰ ہوا جو مشہور ہے اور جس میں جہاد کرنا واجب لکھا ہے بلاشبہ اصلی نہیں چھاپنے والے اس فتوے کے جو ایک مفسد اور نہایت قدیمی بدذات آدمی تھا جاہلوں کو بہکانے اور ورغلانے کو لوگوں کے نام لکھ کر اور چھاپ کر اس کو رونق دیا تھا۔ بلکہ ایک آدھ مہر ایسے شخص کی چھاپ دی تھی جو قبل غدر مر چکا تھا۔ مگر مشہور ہے کہ چند آدمیوں نے فوج باغی بریلی اور اس کے مفسد ہمراہیوں کے جبر اور ظلم سے مہریں کی تھیں۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ:

(۱) آغاز سرکشی میں دہلی کے علما سے فتویٰ مانگا گیا تو انھوں نے عدم وجوب کا فتویٰ دیا۔

(۲) اس فتوے کی نقل سرسید نے بچشم خود دیکھی تھی۔

(۳) مگر فوج بریلی کے ورود کے بعد ایک مفسد نے وجوب جہاد کا فتویٰ بہت سے اہل علم کی مہروں کے ساتھ شائع کیا۔

(۴) یہ فتویٰ جعلی تھا اس لیے کہ اس پر ایک آدھ مہر ایسے شخص کی بھی چھاپی گئی تھی جو قبل غدر مر چکا تھا۔

(۵) مشہور یہ ہے کہ کچھ عالموں نے جبر اور ظلم کے تحت اپنی مُہریں لگا دی تھیں۔

سر سید کے بعد مولوی ذکاء اللہ دہلوی نے تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ (ج ۵ ص ۶۰۵) میں اس فتوے کا ذکر کیا ہے۔ ان کی مطلوبہ عبارت آغاز مضمون میں نقل کی جا چکی ہے، یہاں صرف ضروری حصہ نقل کرنا کافی ہوگا۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

"جب بخت خاں — دہلی میں آیا تو اس نے یہ فتویٰ لکھا کہ مسلمانوں پر جہاد — فرض ہے۔ اس نے جامع مسجد میں مولویوں کو جمع کر کے جہاد کے فتوے پر دستخط و مہریں اُن کی کرالیں اور مفتی صدر الدین نے بھی اس کے جبر سے اپنی جعلی مہر کر دی۔ لیکن مولوی محبوب علی اور خواجہ ضیاء الدین نے فتوے پر مہریں نہیں کیں۔ اس فتوے پر کچھ مہریں اصلی کچھ جعلی تھیں۔ ایک مولوی کی مہر تھی جو غدر سے پہلے قبر میں سو چکا تھا۔"

اس عبارت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ فتویٰ جبراً حاصل کیا تھا اس لیے کچھ مہریں جعلی ہیں اور جو اصلی ہیں وہ خود اختیاری نہیں بلکہ جبری ہیں، چونکہ سر سید نے اُس زمانے میں یہ کتاب لکھی تھی جب انگریز قوم سخت برہم تھی اور اُن کا مقصد اس قوم کے غصے کو ٹھنڈا کرنا تھا۔ اس لیے انھوں نے پہلے عدم وجوب کے فتوے کا ذکر کیا اور پھر وجوب کے فتوے کو بے اصل ٹھہرا کر اہل علم کی صفائی پیش کر دی۔ مولوی ذکاء اللہ صاحب کا منشا اسلام کو انگریزوں کے کینے سے محفوظ رکھنا تھا اس لیے انھوں نے بھی سر سید کی ہم نوائی کر کے جعل اور جبر کی سپر سامنے کر دی لیکن اس وقت کے حالات کو بنظر غائر دیکھا جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ دستخط کرنے والوں میں کچھ اہل علم ایسے بھی تھے جو دل و جان سے انگریزی تسلط کے مخالف تھے اور انگریزوں کے خلاف جنگ کو مذہباً ضروری جانتے تھے اس لیے انھوں نے یہ فتویٰ مرتب کیا اور اپنے اختیار اور رضامندی سے دستخط کیے۔ بقیہ نے مجبوراً توثیق کی۔ شکست کے بعد جان بچانے کی صرف یہی ایک تدبیر باقی تھی کہ جبر کی پناہ لی جائے۔ اس بنا پر جس سے باز پرس ہوئی اس نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔

اس کے ثبوت میں مولانا خیر آبادی کی حسب ذیل عبارت دوبارہ پڑھیے کہ:

"بہادر مسلمانوں کی ایک جماعت علماء زہاد اور ائمۂ اجتہاد سے جہاد کے وجوب کا فتویٰ لے کر عزم جہاد کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔"

اگر فتویٰ مطلقاً جعلی و جبری ہوتا تو مولانا اپنی نجی روداد غم میں اس امر کا ضرور تذکرہ کرتے یا کم از کم ایسا پیرایہ اختیار نہ کرتے جس سے فتوے کے اصلی ہونے کا یقین ہوتا ہے۔

آزردہ اور جبر

مولانا شروانی نے صدر الدین خاں آزردہ کے فتوے پر دستخط کرنے کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے اور اُس سے مولانا خیر آبادی کی بلند ہمتی اور آزردہ کی پست ہمتی و عیاری کا جو نتیجہ نکالا ہے اس سے قطع نظر کرتے ہوئے مجھے اس امر کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ جو لکھا ہے کہ آزردہ نے فتوے پر دستخط کرنے سے پہلے شہدت بالجبر لکھ دیا یہ بات دو وجوہ سے درست نہیں:

(۱) پہلی یہ کہ یہ موقع گواہی کا نہ تھا۔ جو آزردہ "شہدت" لکھتے بلکہ توثیق جواب کا تھا اس لیے کم از کم "کَتَبْتُ" لکھنا چاہیے تھا جس کا مطلب تھا، "میں نے لکھا۔"

(۲) دوسری یہ کہ فتوے کی جو نقل صادق الاخبار میں چھپی ہے اُس میں مولانا کی مُہر کے آگے پیچھے سرے سے کوئی عبارت ہی نہیں ہے۔

اس سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ "شہدت بالجبر" واقعہ نہیں ہے لطیفہ ہے۔

مولانا خیرآبادی کی دوسری بیوی

آخر میں اتنا اور کہہ دوں کہ کتاب خانہ رام پور میں ایک فارسی ط مولانا خیرآبادی کی دوسری بیوی کا بھی محفوظ ہے، جو انھوں نے صفر ۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲ء) کو نواب کلب علی خاں بہادر والی رام پور کے نام لکھا تھا۔ اور اپنی مالی پریشانیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اُن سے امداد چاہی تھی۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ان خاتون کا نام مراد بیگم تھا۔ اور اس زمانے میں وہ دہلی کے اندر محلہ بلی ماران بارہ دری شیر افگن خاں میں رہتی تھیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے بطن سے مولانا کے دو بیٹے تھے جن کے نام محمد شمس الحق اور محمد علاء الحق تھے۔



حواشی

۱ باغی ہندوستان نام ہے مولانا خیرآبادی کے ایک عربی رسالے موسوم بہ رسالۂ غدریہ کے مترجم ایڈیشن کا۔ یہ ترجمہ مع ایک مفصل دیباچے کے اس کے مترجم عبدالشاہد خاں شروانی نے ۱۹۴۷ء میں مدینہ پریس بجنور سے شائع کرایا تھا۔ اسی کتاب کے ص ۱۲۸ و بعد سے یہ عبارتیں نقل کی گئی ہیں۔ ۲ یہ جملہ معنوی اعتبار سے محل نظر ہے، کیونکہ جہاں تک میرا علم ہے فتوے کی توثیق کرتے ہوئے یہ لفظ استعمال نہیں کیے جاتے۔ بلکہ اس کی جگہ کوئی ایسا جملہ جس کا مطلب مجیب کی رائے کو درست بتانا ہو، لکھا جاتا ہے بہرحال اس سے آئندہ بحث کی جائے گی۔ ۳ یہ دوسرے میر فضل حق رام پور میں بزمانۂ نواب احمد علی خاں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید عبداللہ تھا عربی و فارسی کے فاضل اور دیندار بزرگ تھے۔ ۱۸۵۷ء میں جہاد کی نیت سے مرزا فیروز شاہ کے شریک ہو گئے، نواب یوسف علی خاں نے جو اس زمانے میں رام پور کے حکمراں تھے ہرچند چاہا کہ یہ رام پور چلے آئیں پر انھوں نے یہ جواب دیا کہ اب تو تمنائے شہادت ہے چنانچہ جھانسی میں شہید ہوئے ملاحظہ ہو تذکرہ کاملان رام پور ص ۲۱-۳۲۰

غزل

اغر مہدی
ہ دواڑہ۔ بہرائچ

پنا غم بے لباس کیا کرتے
دوستوں کو اداس کیا کرتے

ساری خوشبو نچوڑ لی اس نے
پھول گلشن میں باس کیا کرتے

یری آنکھیں تھیں میکدہ لیکن
اپنے ہونٹوں کی پیاس کیا کرتے

ہ لمحہ بدلتی دنیا میں
وضع داری کا پاس کیا کرتے

پسے حالِ دل چھپا تو نہ تھا
آپ سے التماس کیا کرتے

سب تو چہروں سے اپنے تھے محروم
آئینے انعکاس کیا کرتے

تجھ پہ اپنا گماں جب نہ ہوا
خود پہ تیرا قیاس کیا کرتے

لاکھ چہرے تھے ایک چہرے پہ
پھر قیافہ شناس کیا کرتے

سارا عالم تھا ایک ساغر میں
جا کے دنیا کے پاس کیا کرتے

رباعی:— ۲۰-۱-۵۲ء

تکلیف بھی دیکھی ہے، عیش بھی دیکھا ہے
یاد اس کی نہ ہم کو رنج اس کا ہے
تسلیم و رضا یہ کہہ رہے ہیں مشتاق
یارب ہر حال میں شکر تیرا ہے

غزل کے چند اشعار:—

خیال یار میں تو ہی تسلی مجھکو دیتا ہے — خیال یار ہمدم کوئی تجھ سا ہو نہیں سکتا
مجھ کو دیوانہ بنا انھیں رسوا کیا — اک دل بیتاب نے کیا کیا کیا
تیرے ساتھ وہ نظر آئے — گل کے پہلو میں خار کو دیکھا
پہلے دعویٰ ان کو یکتائی کا تھا — آئینہ دیکھا تو حیرت ہو گئی
ہر بشر کے لیے ہے راہ عدم کی درپیش — آج جاتا ہے کوئی اور کوئی کل جائے گا
جفا آپ مشتاق پر کر رہے ہیں — ذرا سوچئے تو یہ کیا ہو رہا ہے
مرے [illegible] جفا کا ہو نہیں سکتا — زبان شکر ہے یہ اس سے شکوہ ہو نہیں سکتا
یہ کیا خبر تھی کہ تم دل میں مرے بیٹھے ہو — میں جستجو میں تمھاری کہاں کہاں کو
کبھو تم بھی مشتاق حال جدائی — سناتا ہے ناصح قیامت کا

نظم "قلم" کے ۲ بند:—

اے قلم تو جسم ہے اور جان تری تحریر ہے — علم اور تعلیم کی تو بولتی تصویر
پھیلی کیا دنیائے دانش میں تری تو یر تک — طالب و خواہاں ترا ہر اک جو ان
عرش پر سنتے ہیں اے خامہ تری خلقت ہوئی
یہ بھی انساں پر خدائے پاک کی رحمت ہوئی

قید میں تحریر کی لاتا ہے تو ہی واقعات — بالیقیں ہے تو ہی وجہ باقیات اللہ
تو نہ ہوتا تو ہمیں سب بھول جاتی اپنی بات — تیری تحریرات سے ہیں لطف لذ
اس تمدن کی ترقی پر ترا احسان ہے
تو ہر اک علم و ترقی کی یقیناً جان ہے



گنیش شنکر ودیارتھی — (صفحہ ۴۶ کا بقیہ)

جانا نہ جانا برابر ہوگا۔

ان کی شہادت کانپور کے دنگے میں ہوئی۔ باپو یہ خبر سنکر چیخ اٹھے۔ اور اپنے جذبات کا اظہار یوں کیا: "ہمیں تو گنیش شنکر ودیارتھی بننا چاہیے۔ اس نے اہنسا کی سپنا کا ہر... آدرش ہمارے سامنے رکھ دیا۔ اس کی قربانی رائیگاں نہ... ہم ان کی عظمت کو سلام کرتے ہیں۔"

پریس جسٹریشن آف بکس ایکٹ ۱۸۶۷ء (۱۹۵۵ء میں ترمیم شدہ) کی دفعہ ۱۹ ڈی کے قاعدہ ۸ کے مطابق ماہنامہ نیا دور کی ملکیت وغیرہ کے بارے میں مندرجہ ذیل تفصیلات شائع کیے جاتے ہیں:—

(۱) مقام اشاعت	لکھنؤ
(۲) وقفہ اشاعت	ماہوار
(۳) پرنٹر کا نام، قومیت اور پتہ	شری اشوک ور، ہندستانی۔ سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری، اتر پردیش، الہ آباد۔
(۴) پبلشر کا نام، قومیت اور پتہ	ٹھاکر پرشاد سنگھ، ہندستانی۔ ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش لکھنؤ
(۵) اڈیٹر کا نام، قومیت اور پتہ	شری ایم محمود علی، ہندستانی۔ ایڈیٹر نیا دور محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش لکھنؤ
(۶) ان اصحاب کے نام جو اس رسالے کے مالک یا حصہ دار ہیں یا اس کے تمام سرمایے کے ایک فیصدی سے زیادہ کے حصہ دار ہیں۔	نیا دور سرکاری جریدہ ہے اس لیے اس کے بارے میں ان اصحاب کے نام اور پتے کا جو اس جریدے کے مالک یا حصہ دار ہیں یا ساری پونجی کے ایک فیصدی سے زیادہ کے حصہ دار ہیں سوال نہیں

میں ٹھاکر پرشاد سنگھ اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔
(دستخط) ٹھاکر پرشاد سنگھ (پبلشر)

اپنی تاریخ کے یہ کالے بھیانک اوراق
نظر آتا ہے کسی صفحے کا منھ خوف سے فق
کثرتِ بارِ حوادث سے زبوں حال کوئی
فرطِ غم، شدتِ آلام سے صفحہ کوئی شق
بربریت کا ہے شہکار کہیں کوئی ورق
سر بزانو ہے ورق کوئی، کوئی خاک بسر
کہیں بکھری ہوئی لاشیں کہیں بکھرے ہوئے سر
منجمد ہو گئی ہے چیخ کسی صفحے پر

اپنی تاریخ کے یہ کالے بھیانک اوراق
ماؤں کی لوریاں خاموش کھڑی ہیں جن میں
دودھ کی شیشیاں بیکار پڑی ہیں جن میں
چوڑیاں، بیندیاں زندہ ہی گڑی ہیں جن میں
اپنی تاریخ کے یہ کالے، بھیانک اوراق
ارضِ بھارت کے تقدس کا اڑاتے ہیں مذاق

کون سوچے کہ ان اوراقِ زبوں کے پیچھے
کتنی جاں سوز کراہوں کا جہاں ٹھہرا ہے

کہیں زخم اور کہیں دردِ نہاں ٹھہرا ہے
کتنی رسوائیاں قدموں سے لپٹ جاتی ہیں
ذلتیں ہیں کہ تعاقب میں چلی آتی ہیں
ہر ورق اپنے لیے دشمنِ جاں ٹھہرا ہے

ٹھہرو۔ اے جاتے ہوئے سال کے بوجھل لمحو!
جا رہے ہو تو یہ اوراق بھی لیتے جاؤ
کہ ان اوراق سے اب ہم کو حیا آتی ہے
اور بھی بارِ ندامت کا اٹھانا نہ پڑے
صبحِ فردا پہ ان اوراق کا سایا نہ پڑے

اپنے ماضی کے الم ناک سیہ خانے میں
میں ہوں محبوس، مرا ذہن تو محبوس نہیں
اور یہ ذہن۔ جو انسان سے مایوس نہیں
مجھ سے کہتا ہے کہ وہ جانِ وفا آتی ہے
تازہ دم، تیز قدم بادِ صبا آتی ہے
صبح نزدیک ہے، خوشبوئے ضیا آتی ہے

صباح الدین عمر
نعمت اللہ روڈ - امین آباد -
لکھنؤ -

جمہوریت : اس کا ارتقا، قسمیں اور خصوصیات

ہندستان میں ہر سال ۲۶ جنوری کو یوم جمہوریہ منایا جاتا ہے۔ اس تاریخ کا بھی ایک پس منظر ہے اور "جمہوریت" کا بھی۔ حصول آزادی سے قبل ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کو آل انڈیا کانگریس کے لاہور اجلاس میں "آزادی کامل" کی قرارداد منظور ہوئی اور یہ طے کیا گیا کہ سارے ہندستان میں ہر سال ۲۶ جنوری کو اس قرارداد کی تائید میں جلسے ہوا کریں اور یہ قرارداد ہر جلسے میں دہرائی جایا کرے۔ اگست ۴۷ء میں ہندستان کو آزادی حاصل ہو گئی اور ہندستان کا دستور اساسی منظور کرنے کے لیے ایک دستور ساز اسمبلی (CONSTITUENT ASSEMBLY) بنائی گئی۔ ڈاکٹر امبیدکر کی قیادت میں ایک کمیٹی بنائی گئی جو اس دستور اساسی یا آئین کا مسودہ اس اسمبلی کے سامنے پیش کرے۔ یہ مسودہ اس اسمبلی میں پیش ہوا اور کافی دنوں تک اس پر بحث و مباحثے کے بعد ہندستان کا دستور اساسی منظور ہو گیا۔ دستور اساسی کا مسودہ تیار کرنے والوں نے ساری دنیا کے مختلف نظام ہائے حکومت کا بہ غور مطالعہ کیا تھا اور ان سب کے مطالعے کے بعد ہندستان کا جو آئینی نام تجویز کیا تھا (اور جو دستور ساز اسمبلی نے منظور بھی کر لیا تھا) وہ تھا: "پورے اختیار رکھنے والی عوامی جمہوریہ[1]"۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ "جمہوریہ" (ری پبلک REPUBLIC) کے ساتھ عوامی (ڈیموکریٹک DEMOCRATIC) کا لفظ کیوں بڑھایا گیا جب کہ عام طور سے "جمہوریت" سے مراد یہی لی جاتی ہے کہ اس نظام حکومت میں عوام کو بہت زیادہ دخل ہے۔ بات اپنی جگہ صحیح ہے لیکن عوام کی حکومت (DEMOCRACY) اور جمہوریت (REPUBLIC) میں نازک سا فرق بھی ہے اور اسی لیے ہندستان کو "عوامی جمہوریہ" کہا گیا ہے۔

عوام کی حکومت اور جمہوریت

ڈیموکریسی (DEMOCRACY) کے معنی ہیں "عوام کی حکومت"۔ انگریزی لفظ "ڈیموکریسی" اصل یونانی لفظ "ڈیموکریتیا" (DEMOKRATIA) سے بنا ہے۔ یونانی زبان میں یہ لفظ مرکب ہے دو لفظوں "ڈیمو" (DEMO) اور کریٹوس (KRATOS) سے۔ ڈیمو (DEMO) کے معنی ہیں "عوام" اور کریٹوس (KRATOS) کے معنی ہیں حکومت یعنی ڈیموکریسی (DEMOCRACY) کا مطلب ہوا "عوام کی حکومت"[2]۔

"ریپبلک" (REPUBLIC) یا جمہوریت، اطالوی زبان "رس پبلیکا" (RES PUBLICA) سے نکلا ہے۔ اس سے مراد ایک ایسے نظام حکومت سے ہے جس میں کوئی بادشاہ تو نہ ہو مگر حکومت کے اختیارات عوام کو بھی براہ راست حاصل نہ ہوں یا دوسرے لفظوں میں حکومت مکمل طور پر عوام کے زیر اقتدار نہ ہو۔ "عوامی حکومت" (DEMO-CRACY) اور جمہوریت (REPUBLIC) میں یہی نازک سا

---

[1] SOVEREIGN, DEMOCRATIC REPUBLIC

[2] ENCYCLOPAEDIA BRITANNICA

فرق ہے۔ جمہوریت میں حکومت کے انتظامی معاملات اور پالیسی میں عوام براہ راست زیادہ دخل نہیں دے سکتے۔ ہندستان کے نظام حکومت میں چونکہ عوام کا بھی کافی دخل رکھا گیا ہے۔ اس لیے اسے "عوامی جمہوریہ" کہا گیا ہے اور ساتھ ہی اس نظام کی پالیسی کی مزید تشریح کے لیے پارلیمنٹ نے ۱۹۷۶ء میں ہندستان کے دستور اساسی میں بیالیسواں ترمیمی ایکٹ منظور کرکے "عوامی جمہوریہ" کے پہلے دو اور لفظ "سوشلسٹ سیکولر" بڑھا دیے گئے اور اب اس کا نام ہے "پورے اختیار والی سوشلسٹ سیکولر عوامی جمہوریہ"[2]۔

عوامی حکومت اور جمہوریت کا ارتقا

یقینی طور سے یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ کسی خاص نظام حکومت (بادشاہت، آمریت عوامی حکومت، جمہوریت) کا رواج کس سال یا کس زمانے سے ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ زمانہ ماقبل تاریخ کی بالکل ابتدا میں جب انسان میں کوئی شعور نہیں پیدا ہوا تھا تو وہ درختوں کی شاخوں پر رہتا تھا۔ پھر درختوں سے اترا اور پہاڑوں کے غاروں یا میدانوں میں رہنا شروع کیا۔ پتھر اور آگ کا استعمال بھی اب اس کی سمجھ میں آگیا تھا اور وہ پتھر کے اوزار بنانے لگا تھا۔ اس کے بیوی بچے اسی کے ساتھ رہتے۔ دوسرے لوگ اور ان کے خاندان بھی قریب ہی رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ ان میں ایک اجتماعی اور تنظیمی شعور پیدا ہوا۔ مگر ان کی زندگی خانہ بدوشوں کی زندگی تھی۔ پانی اور چراگاہوں کی تلاش میں وہ ادھر ادھر پھرا کرتے تھے۔ البتہ چونکہ تنظیمی شعور پیدا ہو گیا تھا اس لیے جتنے بھی لوگ آس پاس یا ایک ساتھ رہتے تھے وہ سب ایک ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی حیثیت ایک قبیلے کی سی ہو گئی۔ اور سارے فیصلے ایک دوسرے سے صلاح مشورے کے بعد ہی کیے جانے لگے۔ دھیرے دھیرے ہر قبیلے کا سردار بھی منتخب ہونے لگا۔ البتہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایک سردار کے مرنے کے بعد دوسرے سردار کا انتخاب کیسے کیا جاتا تھا۔ بہرحال خانہ بدوشی کی یہ زندگی بھی ختم ہو گئی اور ہر قبیلہ ایک محدود علاقے کے اندر مستقل طور سے قیام پذیر ہو گیا۔ اس مستقل اقامت کے بعد ہر علاقے کے باشعور افراد اپنے سماج کے قوانین بھی وضع کرنے لگے جن کی پابندی اس علاقے کے ہر رہنے والے کو کرنا پڑتی تھی۔ انسانی شعور نے اور ترقی کی تو اس نے لکھنا پڑھنا بھی سیکھ لیا اور اس کی طرز معاشرت اور رہن سہن کا معیار بلند ہونے لگا۔ پھر علم و شعور نے اور ترقی کی آبادی کافی بڑھ گئی۔ تہذیب و تمدن کا معیار بلند تر ہو گیا اور علوم و فنون کے حصول کے ساتھ باقاعدہ حکومتیں بھی قائم ہونا شروع ہو گئیں۔ بعض جگہوں پر ان حکومتوں کا دائرہ اقتدار بہت بڑا تھا اور بعض جگہوں پر بہت مختصر۔ مثلاً خطۂ یونان کے بعض علاقوں جیسے ایتھنس وغیرہ میں پانچویں صدی قبل مسیح کے دوران "شہری حکومتیں" قائم ہوئیں۔ ان حکومتوں میں اس کے دائرۂ اقتدار کی تقریباً ساری آبادی انتظام حکومت میں براہ راست حصہ لیتی تھی اور ہر شخص اپنی رائے کا اظہار کر سکتا تھا۔ ان شہری حکومتوں کو براہ راست "عوامی حکومتوں" یا "جمہوریت" کے اولین نمونوں کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ مگر یہ حکومتیں صرف ایک حد تک عوامی حکومتیں یا جمہوری حکومتیں کہی جانے کی مستحق ہیں کیونکہ ان میں عورتوں کو اور ان لوگوں کو جو دوسرے غیر متمدن علاقوں سے غلام بنا کر لائے جاتے تھے، اظہار رائے کا اختیار نہ تھا۔ اس کے علاوہ ہر بالغ مرد کو بھی انتظام حکومت میں دخل اندازی کے حقوق نہیں تھے۔ اس طرح ایتھنس کی کل دس ہزار آبادی میں سے تقریباً ایک تہائی یعنی تقریباً ساڑھے تین ہزار آدمی "براہ راست" انتظام حکومت میں حصہ لیتے تھے۔ بعد میں یورپ کے نشاۃ ثانیہ کے زمانے میں بعض شہروں، مثلاً وینس اور فلورنس میں تھوڑی مدت کے لیے شہری حکومتیں قائم ہوئیں۔ لیکن ان حکومتوں کو بھی صحیح معنوں میں عوام کی حکومت اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ

---

[1] ENCYCLOPAEDIA BRITANNICA:

[2] SOVEREIGN SOCIALIST SECULAR DEMOCRATIC REPUBLIC.

اصل اقتدار، اونچے طبقے کے چند خاندانوں کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ حکمرانوں کے انتخاب کا حق بھی تمام لوگوں کو حاصل نہ تھا بلکہ حقِ رائے دہندگی محدود تھا۔ قدیم ہندستان میں بھی بعض علاقوں میں کچھ ایسی ہی چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم تھیں اور ان کے نظام میں بھی عوام کو بڑا دخل حاصل تھا۔ یہ چھوٹی چھوٹی حکومتیں یا شہری حکومتیں بھی بہت عرصہ ہوا ختم ہو گئیں۔ البتہ سوئزرلینڈ میں اب بھی بعض چھوٹے چھوٹے مقامات پر وہاں کے تمام رہنے والے ایک کھلی جگہ جمع ہوتے ہیں، اپنے لیے قوانین وضع کرتے ہیں اور اپنے روزمرہ مسائل کے بارے میں فیصلے کرتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں ہندستان کی "پنچایتیں" پیش کی جاسکتی ہیں جو اب قریب قریب ہر دیہات میں پائی جاتی ہیں۔

بہرحال، چھوٹی چھوٹی حکومتوں کی جگہ بڑی حکومتوں اور ملکوں نے لے لی۔ ان ملکوں کے باشندوں میں ایک قومیت کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ البتہ ان ملکوں میں کہیں تو موروثی بادشاہت قائم ہو گئی۔ کہیں کچھ اعلا اور اونچے بااثر طبقے کے کچھ افراد انتظام حکومت کرنے لگے اور کہیں فوجی طاقت کے بل پر ایک فرد کی حکومت قائم ہوتی رہی۔ عام طور پر نہ صرف یورپ بلکہ دنیا کے بیشتر متمدن ملکوں میں عہد وسطیٰ تک موروثی بادشاہتیں بھی قائم ہوا کیں۔ ایک بادشاہ کے مرنے کے بعد عام طور سے اس کا بڑا لڑکا بادشاہ تسلیم کر لیا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ ان بادشاہتوں کی جگہ جمہوریت کا تصور پیدا ہونے لگا۔ ویسے تو آگسٹس کے زمانے میں، روم کی شہنشاہیت کے قیام سے قبل قدیم روم کی حکومت کو بھی جمہوری حکومت کہا جاتا ہے لیکن یہ بھی صحیح معنوں میں جمہوریت نہ تھی کیونکہ اس نظامِ حکومت میں اعلا طبقے کے افراد کا زیادہ اثر تھا اور وہی اصل میں حکومت کرتے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ اس نظامِ حکومت میں ایک تو کسی شخص کو بادشاہ کا درجہ حاصل نہیں تھا، دوسرے انتظامِ حکومت میں دخیل افراد کی ایک اجتماعی ذمہ داری رہتی تھی اور مفادِ عامہ بھی ان کے پیشِ نظر رہتا تھا۔

جمہوریت کا وہ تصور جس نے آج کل کی جمہوریت کی شکل اختیار کی یورپ اور امریکہ میں سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں ابھرا۔ سب سے پہلے انگلستان کے بادشاہ چارلس اول کے زمانے میں کرامویل کی قیادت میں ۱۶۴۸ء میں انگلستان کے عوام میں یہ جذبہ پیدا ہوا مگر یہ عارضی تھا۔ اس کے بعد فرانس اور امریکہ میں انقلاب ہوا اور فرانس میں "آزادی، اخوت اور مساوات" کا نعرہ بلند کیا گیا۔ بعد میں نپولین نے فرانس ہی میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا لیکن واٹرلو میں اس کی شکست کے بعد وہاں پھر جمہوریت قائم ہو گئی۔ دوسری طرف امریکہ نے برطانوی تسلط سے نجات حاصل کر کے ایک عوامی حکومت قائم کی جس کی تعریف امریکہ ہی کے ایک صدر ابراہم لنکن نے ان الفاظ میں کی ہے: "عوام کی حکومت، عوام کے لیے عوام کے ہاتھوں سے" یورپ کے کئی ملکوں مثلاً انگلستان میں بادشاہت البتہ قائم رہی اور آج بھی ہے لیکن یہ بادشاہت "آئینی بادشاہت" ہے جس میں بادشاہ کو کسی جمہوری ملک کے صدر سے زیادہ اختیارات نہیں ہیں۔ بلکہ بعض صورتوں میں تو بادشاہ ہی نہیں اس کے افراد خاندان پر بھی بعض پابندیاں عائد ہیں خود شاہ برطانیہ کی یہ حالت ہے کہ وہ وزیر اعظم کی مرضی حاصل کیے بغیر اپنی شادی بھی نہیں کر سکتا۔ موجودہ ملکۂ برطانیہ ملکہ الزبتھ دوم کے چچا، شاہ ایڈورڈ ہشتم کی داستان ابھی بہت پرانی نہیں ہوئی ہے۔ وہ ایک مطلقہ خاتون سے جو خاندانِ شاہی سے تعلق نہیں رکھتی تھیں، شادی کرنا چاہتے تھے مگر وزیر اعظم اس شادی کے خلاف تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بادشاہ کو اپنی سلطنت سے دست بردار ہونا پڑا۔ تبھی وہ اپنی پسند کی شادی کر سکے۔ مختصر یہ کہ ایسی آئینی بادشاہتوں میں، سارے اختیارات، پارلیمنٹ اور پارلیمنٹ میں اکثریت رکھنے والی عوامی پارٹی کو، جس کے نمائندے عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوتے ہیں، حاصل ہیں۔ بعض دوسرے ملکوں میں بھی بادشاہتیں قائم ہیں مگر عہد وسطیٰ کے بادشاہوں کی طرح کے اختیارات انھیں بھی حاصل نہیں، حتیٰ کہ جاپان کے بادشاہ کو جسے سورج دیوتا کی اولاد کہا جاتا ہے اور جس کی کبھی لفظی

معنوں میں "پرستش" بھی ہوتی تھی اب "آئینی بادشاہ" کی سی ہی حیثیت رہ گئی ہے۔ ہاں دورِ حاضر میں، بعض بعض ملکوں جیسے اٹلی اور جرمنی میں، مسولینی اور ہٹلر نے بادشاہت کی جگہ آمریت یا ڈکٹیٹرشپ رائج کر دی تھی مگر ان کی یہ آمریت بھی بے انتہا خوں ریزی کے بعد آخر کار ختم ہو گئی۔

عوامی حکومت کی قسمیں

عوام کی حکومت یا ڈیموکریسی کی قسمیں بھی ہیں۔ ان میں سے کسی قسم کی حکومت ہو لیکن کہا جائے گا سب کو عوام کی حکومت یا ڈیموکریسی۔ انھیں ایک دوسرے سے تمیز کرنے کے لیے ماہرینِ آئین نے کچھ وضاحتی نام دے رکھے ہیں۔

ڈیموکریسی کی ایک قسم تو وہ ہے جو زمانۂ ماقبلِ تاریخ میں بھی پائی جاتی تھی۔ یعنی جب انسان اپنے خاندان یا قبیلے کے ساتھ خانہ بدوش کی زندگی بسر کرتا تھا تو ہر معاملے میں، کہاں ٹھہریں کب تک ٹھہریں، کہاں جائیں وغیرہ، خاندان یا قبیلے کا ہر فرد رائے دیتا تھا۔ قبیلے کا سردار بھی منتخب ہونے لگا تھا مگر وہ بھی دوسروں کی رائے جاننا چاہتا تھا۔ ہوتے ہوتے جب باقاعدہ قانون وضع ہونے لگے اور بڑی ریاستوں یا مملکتوں کا رواج ہوا تو ان ریاستوں کے شہری کثیر تعداد میں، انتظامِ حکومت میں، براہِ راست حصہ لینے لگے۔ ایسی حکومتوں اور نظامِ حکومت کو "براہِ راست عوامی حکومت یا DIRECT DEMOCRACY" کہا جاتا ہے۔

عوامی حکومت کی دوسری قسم وہ ہے جس میں مملکت یا ریاست کے تمام افراد براہِ راست حصہ نہیں لیتے بلکہ اپنے نمائندوں کا انتخاب کرتے ہیں اور یہی نمائندے انتظامِ حکومت میں حصہ لیتے ہیں۔ نمائندوں کے ذریعہ عوام کی اس حکومت کو "نمائندوں کے ذریعہ عوامی حکومت" یا (REPRESENTATIVE DEMOC-RACY) نام دیا گیا ہے۔

عوام کی حکومت کی ایک تیسری قسم وہ ہے جس میں حکومت بیک وقت کچھ آئینی پابندیوں کے ماتحت کام کرتی ہے، اُن نمائندوں کو جو برسرِ اقتدار پارٹی کے ہم خیال نہیں ہوتے لیکن اس پارٹی کے اراکین کے مقابلے میں اقلیت میں ہوتے ہیں کچھ آئینی حقوق دیے جاتے ہیں اور اکثریت والی پارٹی یا برسرِ اقتدار پارٹی کی حکومت کو ان حقوق کا احترام کرنا پڑتا ہے۔ اقلیت کے ایسے اراکین کو اپنی رائے کے اظہار کی آزادی ہوتی ہے اور وہ حکومت کی پالیسی اور اُس کے فیصلوں پر اعتراض کر سکتے ہیں۔ ایسی حکومت کو "آئینی عوامی حکومت" یا CONSTITUTIONAL DEMOCRACY کہا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا قسموں کے علاوہ عوامی حکومت کی ایک قسم وہ ہوتی ہے جس کا مقصد عدم مساوات کو دور کرنا، بالخصوص نجی جائداد یا دولت پر پابندی عائد کرنا یا اُس دولت کو مساویانہ طریقے سے تقسیم کرنا ہوتا ہے۔ ایسے سماجی یا اقتصادی عوامی حکومت (SOCIAL OR ECONONIC DEMOCRACY) کہتے ہیں۔ ایک اور جمہوری نظامِ حکومت کو صدارتی نظامِ حکومت کہا جاتا ہے۔ اس میں مختلف پارٹیوں کے امیدواروں کے علاوہ، صدرِ مملکت کا بھی انتخاب کیا جاتا ہے اور سارا ملک اس انتخاب میں رائے دیتا ہے۔ اس طرح جو صدر منتخب ہوتا ہے اُسے صدرِ ریاست اور وزیرِ اعظم دونوں کی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور چونکہ سارے ملک نے اُسے ووٹ دے کر منتخب کیا ہے اس لیے اس کے اختیارات بھی زیادہ ہوتے ہیں۔

ارسطو اور حکومت کے مختلف نظام

مشہور یونانی فلسفی، ارسطو آج سے تقریباً ڈھائی ہزار سال قبل، مختلف قسموں کے نظام ہائے حکومت پر اپنی رائے کا اظہار کر چکا ہے۔ ایک نظامِ حکومت اُس نے بادشاہت (ROYALTY) بتایا ہے۔ ایک اور نظامِ حکومت اُس کے نزدیک ایک فرد کی حکومت ہے جسے اختیاراتِ کلی حاصل ہوں، اگرچہ اُسے بادشاہ نہ کہا جاتا ہو۔ ایسی حکومت کو اب آٹوکریسی (AUTOCRACY) کہا جاتا ہے۔ ارسطو نے نظامِ حکومت کی ایک اور قسم یہ بتائی ہے کہ

ایک خاص طبقے کے چند افراد کی حکومت ہو اور انھیں اختیار ہو کہ وہ جو قانون چاہیں وضع کریں۔ اسے انگریزی زبان میں "اولیگارکی" (OLIGARCHY) کہتے ہیں۔ ارسطو کی رائے میں ایک اور نظامِ حکومت وہ ہے جس میں افراد کا ایک گروہ تو حکومت کرے لیکن کچھ خاص اصول وضوابط کے ماتحت۔ انگریزی میں اسے "پالیٹی" (POLITY) کہا جائے گا۔ لیکن اس کے برعکس اگر تمام افرادِ ملک انتظامِ حکومت میں حصہ لینے لگیں تو وہ عوام کی حکومت یعنی ڈیموکریسی (DEMOCRACY) کہلائے گی۔ ارسطو نے ان تینوں نظامہائے حکومت میں "پالیٹی" (POLITY) کو جس میں مقررہ اصولوں اور قواعد کے ماتحت افراد کا ایک گروہ حکومت کرے، بہترین نظامِ حکومت قرار دیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ ارسطو کے سامنے عصرِ حاضر کے جمہوری نظامہائے حکومت نہ تھے نہ اُسے یہ تصوّر تھا کہ ڈھائی ہزار سال بعد دنیا کتنی ترقی کر جائے گی، آبادی میں کتنا اضافہ ہو جائے گا، انسان کا سیاسی شعور کس حد تک بیدار ہو چکا ہوگا۔ اس کی عقل ایک ترقی یافتہ نظامِ حکومت وضع کرنے کے لیے کیا کیا موشگافیاں کر چکی ہوگی اور تجربات کی روشنی میں اس کا ذہن کس حد تک جزئیات پر بھی غور کر چکا ہوگا۔ ارسطو کے زمانے میں تو صرف شہری حکومتیں تھیں۔ ارسطو کے ڈھائی ہزار سال بعد، مختلف قسم کے تجربات سے گزر کر موجودہ دور میں "عوامی جمہوریہ" کی جو شکل سامنے آئی ہے اسی کو اب بہترین نظامِ حکومت تسلیم کیا جاتا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ یہی نظامِ حکومت، دوسرے نظامہائے حکومت کے مقابلے میں ہر لحاظ سے بہتر ثابت ہوا ہے۔

عوامی یا جمہوری حکومتوں کے خصوصیات

عوامی یا جمہوری نظامِ حکومت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ جس میں ریاست یا حکومت کو نہیں [illegible] کو اعلا ترین مقام دیا گیا ہے۔ اس نظامِ حکومت کا اولین مقصد ہی یہ ہے کہ فرد کی عظمت مقدم سمجھی جائے اور حکومت کی پالیسی اور مطمحِ نظر یہ ہو کہ فرد کو زیادہ سہولتیں حاصل ہوں، اسے اپنی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے اور ترقی کے مدارج طے کرنے کے زیادہ سے زیادہ اور یکساں مواقع فراہم ہوں، اس کے جذبات و احساسات کا احترام کیا جائے، اس کے حقوق متعین کیے جائیں اور کسی فرد کو دوسرے پر فوقیت نہ دی جائے۔

جمہوریت کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ جمہوری ملک میں ایک مقررہ مدت کے بعد افرادِ ملک کو حکومتِ وقت کے بدل دینے یا برقرار رکھنے کا پورا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ اگر ملک کے عوام اُس سیاسی پارٹی سے جو برسرِ اقتدار ہے مطمئن نہیں تو وہ دوسرے عام انتخابات کے وقت دوسری سیاسی پارٹی کے افراد کو کثیر تعداد میں پارلیمنٹ یا اسمبلی میں اپنے ووٹوں کے ذریعے کامیاب کرا سکتے ہیں۔ اگر اس پارٹی کے افراد کی اسمبلی یا پارلیمنٹ میں اکثریت ہو جاتی ہے تو یہ پارٹی اپنی حکومت قائم کر سکتی ہے۔ عام انتخابات کا یہ دن گویا حکومتِ وقت کے محاسبے کا دن ہوتا ہے۔ عوام یہ دیکھتے رہتے ہیں یا انھیں محسوس ہوتا رہتا ہے کہ حکومت اپنے فرائض صحیح طریقے سے انجام نہیں دے رہی ہے اور انتخابات کے وقت اسے بدل دیتے ہیں۔ ایک مغربی ماہرِ دستور، لِنڈزے، کے بہ قول کسی سیاسی جماعت کو اپنے ووٹوں سے برسرِ اقتدار لانا ایک جوڑ جوتا خریدنے کے مترادف ہے۔ اگر جوتے خریدنے کے بعد ہی جوتے خریدنے والے کے پیر دبانے لگیں تو وہ تکلیف محسوس کرنے لگتا ہے۔ وہ یہ چاہے نہ جانتا ہو کہ جوتوں میں کیا خرابی ہے مگر یہ ضرور جانتا ہے کہ جوتے پیر دبا رہے ہیں۔ اگر برسرِ اقتدار جماعت کی حکومت میں اشیا کی قیمتیں بڑھنے لگیں، روز مرّہ کی چیزوں کی کمی ہو جائے، بے روزگاری بڑھ جائے، کثرت سے ٹیکس لگنے لگیں تو انھیں تکلیف ضرور ہوگی اور دوسرے عام انتخابات کے وقت وہ یہ جوتے ضرور بدل دیں گے۔[1]

1. A.D. LINDSAY: THE MODERN DEMOCRATIC STATE

جمہوریت میں اُن جماعتوں کی رائے کا بھی احترام کیا جاتا ہے جو پارلیمنٹ یا اسمبلی میں اقلیت میں ہیں مگر ان کے کچھ نمائندے کو بھی عوام ہی کے ایک طبقے نے اپنے ووٹ دے کر مجالس قانون ساز میں بھیجا ہے۔ یہ جماعتیں یا ان کے افراد پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں حکومت وقت کی پالیسیوں اور اس کے طریقہ کار پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور اس کی خامیاں بتاتے ہیں۔ حکومت اس تنقید کو سنتی ہے اور اگر اس کے سامنے ایسی شکایتیں پیش کی جاتی ہیں جو حق بہ جانب ہوتی ہیں تو ان کا ازالہ بھی کرتی ہے۔ چند مغربی مفکرین کے الفاظ میں: عوامی حکومت وہ طرز حکومت ہے جس میں اکثریت، اقلیت کو پوری طرح (مذاکرات میں) حصہ لینے کی اجازت دینے کے بعد اقلیت کے پورے طور سے حصہ لینے کے بعد اور اقلیت اور اس کے آرا کا پورا احترام کرنے کے بعد اپنے فیصلوں پر عمل درآمد کرانے کے لیے حکومت کے اختیارات استعمال کرتی ہے لہ بعض مغربی ماہرین آئین اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ ملک کے آئین میں ایسی پابندیاں عائد کرنا جو قلیتی سیاسی جماعتوں کے حق میں ہوں، جمہوریت کا لازمی عنصر ہے۔

جمہوریت میں ان افراد کو بھی تحریر یا تقریر میں نکتہ چینی کا حق حاصل ہے جو مجالس قانون ساز کے رکن نہیں ہوتے۔ افراد ہی نہیں اخبارات کو بھی آزادی ہوتی ہے کہ وہ ایسی خبریں شائع کر سکیں جن میں حکومت یا عمال حکومت کے غلط کاموں کا پردہ فاش کیا گیا ہو اور ایسے اداریے لکھ سکیں جن میں حکومت کے کسی فیصلے یا قانون پر کھل کر اعتراضات کیے گئے ہوں۔ دوسرے لفظوں میں جمہوریت میں افراد کو تحریر کی آزادی ہوتی ہے، تقریر کی آزادی ہوتی ہے، اظہار خیال کی آزادی ہوتی ہے، بیان کی آزادی ہوتی ہے اور یہ آزادی بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے ہم خیالوں کی انجمن بنائیں۔ سیاسی حیثیت سے ہی نہیں، مذہبی حیثیت سے بھی افراد کو جمہوریت میں پوری آزادی حاصل رہتی ہے۔ وہ جس مذہب کو پسند کریں اس کی پیروی کر سکتے ہیں اور ان کا مذہب ان کی ترقی کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا۔ انھیں جمہوری ملک میں وہی حقوق حاصل ہوں گے جو دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو ملے ہوئے ہیں۔ جمہوری نظام اسی کے ساتھ اقلیتوں کے مذہب، کلچر اور زبان کی حفاظت کا بھی ذمے دار ہوتا ہے۔ ملک میں اکثریت کا مذہب، زبان، کلچر اور تہذیب کچھ بھی ہو، صحیح معنوں میں جمہوریت وہی ہے جس میں اقلیتی طبقوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے کلچر، تہذیب اور زبان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔

جمہوریت کی ایک بڑی دین یہ بھی ہے کہ ملکی قوانین کے ماتحت پر امن زندگی بسر کرنے والے کو یہ کھٹکا کبھی نہیں ہوتا کہ اسے بے وجہ پھانسی دے دی جائے گی یا وہ گرفتار کر لیا جائے گا۔ اول تو ایسا ہوتا نہیں اور اگر عمال حکومت کسی شخص کو بغیر کسی وجہ کے گرفتار بھی کر لیں تو اس کے لیے عدالتوں کے دروازے کھلے رہتے ہیں، عدالتیں جمہوریت میں آزاد ہوتی ہیں اور انتظامیہ کے ماتحت نہیں ہوتیں۔ ان کا کام یہ دیکھنا ہے کہ کسی کو خلاف قانون پریشان نہ کیا جائے۔ حکومت، عدالتوں کے فیصلوں کا احترام کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ عدالتیں ایسے عمال حکومت پر سختی سے نکتہ چینی بھی کر سکتی ہیں۔ (اور کرتی بھی ہیں) جنھوں نے خلاف قانون کسی فرد کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہو۔ عدالتیں، زیادتی کرنے والے حکام کے خلاف کارروائی کرنے کی بھی حکومت کو ہدایت کر سکتی ہیں اور حکومت کو عدالت کی ہدایت کے مطابق کارروائی کرنا پڑتی ہے۔

آمریت اور جمہوریت میں فرق

آمریت یا ڈکٹیٹرشپ بھی ایک طرح کا نظام حکومت ہے اس میں ایک فرد کو سارے اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ اختیارات ایک فرد کے نہیں بلکہ ایک چھوٹے سے گروہ کے ہاتھ میں آجاتے ہیں۔ اسے گروہ کی آمریت کہہ لیجیے۔ بہرحال ڈکٹیٹر

لہ DILLON- LEIDEN- STEWART: INTRODUCTION TO POLITICAL SCIENCE

کے لیے ملک کے قوانین کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ وہ یا تو اپنی مرضی کے مطابق قوانین نافذ کردیتا ہے یا عدالتوں کے اختیارات ہی سلب کرلیتا ہے۔ جمہوریت میں فرد کی عظمت کا جتنا خیال رکھا جاتا ہے، آمریت میں فرد کی عظمت کو اتنا ہی پامال کیا جاتا ہے۔ جمہوریت میں مملکت یا ریاست کا درجہ دوسرا ہوتا ہے اور فرد کا پہلا۔ آمریت میں مملکت یا ریاست کا درجہ پہلا، آخری اور فرد کا کوئی درجہ نہیں ہوتا۔ جمہوریت میں ریاست کا فریضہ ہے کہ وہ فرد کی عظمت بالا رکھے اور آمریت میں فرد کا فریضہ ہوتا ہے کہ وہ مملکت یا ریاست کی عظمت بالا رکھے خواہ فرد یا افراد کو اپنی جانوں کی قربانی ہی دینا پڑے۔ جمہوریت میں فرد کے مذہب، کلچر، زبان کے تحفظ کی ضمانت ہوتی ہے اور آمریت کبھی کبھی اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ فرد کے خیالات، مذہب، کلچر سب کو ریاست کے تابع ہونا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب یہ صورت ہو تو آمریت میں تحریر و تقریر کی آزادی کہاں نصیب ہوسکتی ہے۔ یہ ساری آزادیاں فرد سے سلب کرلی جاتی ہیں اور وہ ڈکٹیٹر یا آمرانہ حکومت کے خلاف اشارۃً یا کنایۃً بھی لب کشائی کی جرأت نہیں کرسکتا۔ آمریت میں فرد اپنے جان و مال کو کسی وقت بھی محفوظ نہیں سمجھ سکتا۔ ایک مغربی مفکر کے بقول، جمہوریت میں فرد کو یہ اطمینان ہوتا ہے کہ اگر وہ مروجہ قوانین ملک کی پابندی کرتا رہے تو اسے حکومت بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی لیکن آمریت میں وہ یہ یقین نہیں کرسکتا کہ اگر رات اس نے اپنے گھر میں ہوئی ہے تو صبح بھی اسی کے گھر میں ہوگی یا قید خانے میں۔ جمہوریت میں افراد ایک مقررہ مدت کے بعد (یا بعض اوقات مقررہ مدت سے پہلے ہی) عام انتخابات کے وقت حکومت کو اپنے ووٹوں سے بدل سکتے ہیں۔ آمریت میں اس کا کوئی سوال نہیں۔ آمریت ووٹوں سے نہیں بلکہ بندوقوں یعنی کشت و خون ہی سے بدلی جاسکتی ہے۔ جمہوریت میں حکومت کی تبدیلی کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ آمریت میں یہ دروازہ بند کردیا جاتا ہے۔ یہ دروازہ اسی وقت کھل سکتا ہے جب طاقت کا استعمال کرکے اسے توڑ دیا جائے۔

جمہوریت میں کوئی بھی سیاسی جماعت اپنے دلائل اور اپنی پالیسی کی بنا پر عوام کی ہمدردی حاصل کرکے برسر اقتدار آسکتی ہے۔ انتخابات کے موقع پر عوام کو سمجھایا جاتا ہے کہ وہ کسی ایک پارٹی یا فرد کو وہ ووٹ کیوں دیں۔ آمریت میں دلیل کے بغیر عوام کے جذبات کو ابھارا جاتا ہے اور طاقت کے بل پر برسر اقتدار آیا جاتا ہے اور پھر طاقت ہی کے بل پر حکومت کی جاتی ہے۔
جمہوریت میں ہر شخص کو جماعت سازی کا حق حاصل ہوتا ہے۔ ڈکٹیٹر شپ میں اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ڈکٹیٹر شپ میں یا تو کوئی سیاسی پارٹی ہوتی ہی نہیں یا ہوتی ہے تو صرف ڈکٹیٹر کی حمایت کرنے والی پارٹی۔ ڈکٹیٹر شپ میں اگر نام کے انتخابات ہوتے بھی ہیں تو انھیں لوگوں کو ووٹ دے دیے جاتے ہیں جن کو ڈکٹیٹر نے نامزد کیا ہو۔

جمہوری نظام پر اعتراضات

جمہوریت کے مخالفین اور ڈکٹیٹر شپ یا آمریت (خواہ فرد کی ہو خواہ کسی ایک گروہ کی) کے حامی، جمہوریت پر کچھ اعتراض بھی کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ عوامی حکومت یا جمہوریت میں ایسے فرد کو بھی منتخب کرلیا جاتا ہے جو نا اہل ہوتے ہیں۔ یہ الزام منتخب شدہ اشخاص پر نہیں بلکہ ان تمام حلقوں کی بڑی آبادی پر عائد کرنا ہے جس نے ایسے لوگوں کو منتخب کیا۔ اگر کسی حلقے کی بھی اکثریت کسی کو اپنا نمائندہ منتخب کرتی ہے تو اس سے یہی نتیجہ نکالنا چاہیے کہ کامیاب امیدوار میں کوئی نہ کوئی خوبی ضرور ہوگی۔ دوسرے یہ کہ انتخاب کے وقت صرف امیدوار کو نہیں اس سیاسی جماعت کی اہلیت و صلاحیت کو بھی مدنظر رکھا جاتا ہے جس نے عام انتخابات کے موقع پر اس فرد کو اپنی طرف سے امیدوار بنایا ہے۔ اس لحاظ سے ووٹ اس پارٹی کو دیا جاتا ہے جس کا وہ امیدوار ہے۔

جمہوریت پر ایک اور الزام یہ عائد کیا جاتا ہے کہ اس میں کوئی کام جلد نہیں ہو پاتا اور کوئی اسکیم جلد بروے کار

نہیں آتی؛ سارا وقت بحث میں صرف ہو جاتا ہے، پھر عمل درآمد کے دوران ہر ہر قدم پر اس کا خیال رکھا جاتا ہے کہ کوئی بات خلاف قانون تو نہیں ہو رہی ہے۔ لیکن اس کے برعکس آمریت میں ہر کام بہت جلد انجام پا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جمہوریت میں ہر اسکیم اور ہر تجویز پر بحث ہوتی ہے اور اس کے ہر ہر پہلو پر غور کیا جاتا ہے مگر یہی بحث اور غور و خوض اس اسکیم یا تجویز کو بہتر بنا دیتا ہے۔ آمریت میں فیصلہ ایک فرد کرتا ہے اور عمل درآمد میں جبر سے کام لینے میں بھی گریز نہیں کیا جاتا جس کا نتیجہ یہ تو بے شک ہوتا ہے کہ کام جلد سر انجام پا جاتا ہے مگر بالآخر اکثر یہ ثابت ہوتا ہے کہ سارا فیصلہ ہی غلط تھا اور اس کے نتائج و عواقب نہایت تباہ کن ثابت ہوئے ہیں۔ مثال میں دوسری جنگ عظیم پیش کی جا سکتی ہے۔ ہٹلر نے فیصلہ کیا کہ جنگ چھیڑ دی جائے۔ شروع شروع میں نازی جرمنی کو شاندار کامیابیاں بھی ہوئیں لیکن آخر میں اس کا جو انجام ہوا اور اس جنگ نے جو تباہی پھیلائی وہ کبھی بھلائی نہیں جا سکتی۔

ایک اور بات یہ کہی جاتی ہے کہ جمہوریت میں صرف ۵۱ فی صد کی اکثریت ۴۹ فی صد پر حکومت کرنے لگتی ہے۔ یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے۔ ۴۹ فی صد کیا اگر مخالفین کی تعداد ۱۵ فی صد بھی ہو تب بھی جمہوریت میں ان کی رائے کا احترام کیا جاتا ہے۔

جمہوریت میں افراد کی ذمے داریاں

جمہوری نظام کی یہ تمام خوبیاں ضرور ہیں لیکن جمہوریت میں افراد اور سیاسی جماعتوں پر کچھ ذمے داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ ان میں سب سے بڑی ذمے داری یہ ہے کہ فرد ہو یا سیاسی جماعت، اسے اپنی آزادی کا ناجائز استعمال نہ کرنا چاہیے۔ فرد کی آزادی وہیں تک ہے جہاں تک دوسرے کی آزادی مجروح نہ ہو آزادی تحریر و تقریر اور آزادی نقل و حرکت کے یہ معنی نہیں کہ دوسرے کو ذلیل کیا جائے، اس پر غلط الزامات لگائے جائیں یا اسے گالیاں دی جائیں۔ اگر آزادی کا بہانہ لے کر دوسرے کی کردار کشی شروع کر دی جائے تو دوسرے کو بھی حق ہوگا کہ وہ جوابی کارروائی کا آغاز کر دے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سارے ملک میں لوگ جنگ و جدل کرتے نظر آئیں گے اور ملک میں جمہوریت نہیں بلکہ تاراج اور انتشار پھیل جائے گا۔ اسی طرح حکومت وقت کی مخالف پارٹیوں کو بھی تخریبی تنقید سے باز رہ کر تعمیری تنقید کرنا چاہیے۔ مقصد یہ ہونا چاہیے کہ حکومت کو اس کے غلط کاموں پر ٹوکا جائے نہ کہ اچھے کاموں کی بھی مخالفت کی جائے۔ پارلیمنٹ یا اسمبلی میں جو سب سے بڑی مخالف پارٹی ہوتی ہے اس کی اور اس کے لیڈر کی ذمے داریاں جمہوریت میں اور بڑھ جاتی ہیں۔ اس مخالف پارٹی کے لیڈر کو خود حکومت ایک خاص درجہ اور سہولتیں فراہم کرتی ہے۔ برطانوی پارلیمنٹ میں تو سب سے بڑی مخالف پارٹی کے لیڈر کو "ملک معظم کا لیڈر حزب مخالف" کہا جاتا ہے اور اسے متبادل وزیر اعظم سمجھا جاتا ہے یعنی یہ کہ اگر برسر اقتدار پارٹی کسی وجہ سے اقلیتی پارٹی میں تبدیل ہو جائے تو حزب مخالف ہی کے لیڈر کو دوسری حکومت کی تشکیل کی دعوت دی جاتی ہے۔ دوسرے جمہوری ملکوں میں بھی جن میں ہندستان شامل ہے، حزب مخالف کے لیڈر کا احترام کیا جاتا ہے۔ اس لیے حزب مخالف کو بھی پوری سنجیدگی اور دیانت داری سے اپنا کردار ادا کرنا ہے اس کا یہ کام نہ ہونا چاہیے کہ وہ عوام کو "توڑ پھوڑ" اور ہنگامے کرنے پر آمادہ کرنے لگے۔ اگر کسی جمہوری ملک میں مخالف پارٹی یا مخالف پارٹیاں یہی رویہ اپنانے لگیں تو ملک افراتفری کا شکار ہو جائے گا جمہوریت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ ڈکٹیٹروں کے انداز میں ملک میں ہنگامہ بپا کر کے بزور حکومت حاصل کر لی جائے۔

ہندستان کا نظام حکومت

ہندستان نے انھیں تمام باتوں کا خیال کر کے اپنے لیے وہ دستور اساسی وضع کیا ہے جو صحیح معنوں میں "سیکولر سوشلسٹ عوامی جمہوریہ" ہے اور اس دستور کی تمہید ہی میں یہ کہہ دیا گیا ہے کہ :-

"ہم ہندستان کے لوگوں نے پوری سنجیدگی کے ساتھ یہ

فیصلہ کیا ہے کہ ہندستان کو ایک پورے اختیار والی 'سوشلسٹ، سیکولر[1] عوامی جمہوریہ بنائیں' اور اس کا بندوبست کریں کہ اس کے ہر شہری کو

انصاف ملے، سماجی اور سیاسی

مساوات ملے، حیثیت اور موقعوں کے اعتبار سے

اور ہم نے یہ بھی طے کیا ہے کہ شہریوں کے درمیان اس طرح کا بھائی چارہ پیدا کریں کہ فرد کا وقار اور [قوم کی ایکتا اور سالمیت[1]] محفوظ رہے۔

اس لیے ہم اپنی دستور ساز اسمبلی میں آج ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ء کو اس دستور کو منظور کرتے ہیں، اسے قانون کا رتبہ دیتے ہیں اور اسے اپنے اوپر نافذ کرتے ہیں[2]۔

اب یہ ہندستان والوں کا فرض ہے کہ وہ جمہوریت کی روح کو سمجھیں اور اپنے ملک کے لیے انھوں نے جو دستور وضع کیا ہے اسی کے مطابق، ملک کی سالمیت اور قوم کی ایکتا برقرار رکھنے کے لیے، اپنا کردار ادا کریں۔



وقار ناصری
شیش محل حسین آباد، لکھنؤ

غزل

سبزہ و برگ، ثمر، پھول، صنوبر تیرے
دور تک پھیلے ہوئے باغ سراسر تیرے

روشنی دیتے ہوئے چاند، ستارے، سورج
دشمنِ تیرہ شبی، نور کے لشکر تیرے

رنگ ہی رنگ میں سمٹی ہوئی دنیا تیری
حُسن ہی حسن ترا، حسن کے پیکر تیرے

قاف تا قاف ترے نام کا لکھا روشن
سلسلے اوج کے سب حرفِ مکرّر تیرے

لہر بن لیتا ہوا دریاؤں میں پانی تیرا
دشت و کہسار ترے، سات سمندر تیرے

لالہ و گل سی لہکتی ہوئی وادی وادی
ہفت اقلیم تری لعل و جواہر تیرے

چپے چپے سے ابھرتی ہوئی اجلی اجلی
سرمئی شام تری صبح کے منظر تیرے

سر اٹھائے ہوئے اشجار یہ سایہ تیرا
دھوپ کا فرش ترا چھاؤں کے بستر تیرے

---

[1] ہندستان کا دستور اساسی، جیسا کہ دستور کے بیالیسویں ترمیمی ایکٹ ۱۹۷۶ء میں اسے منظور کیا گیا۔

[2] "ہندستان کا دستور اور اس کی مختصر شرح" مولفہ پروفیسر ہارون خاں شروانی مرحوم

رباب رشیدی
۶۵ تارین ٹکی۔ شاہجہاں پور (یوپی)

عہد نامہ

رخصتِ سالِ رواں آمدِ سالِ نو پر
سوچتا ہوں تو خیالوں کا جہاں پیشِ نظر
کتنے خوابوں کا وہی دائرۂ تیرہ شبی
کتنے ہی لمحے جو احساس سے کتراتے رہے
کتنے ہی نغمے تاثر کے فسوں سے خالی
کتنے افسانے ترستے ہوئے عنوانوں کو
کتنے تابندہ حقائق نظرِ شوق سے دور
کتنے ہی راستے قدموں کی لگائے ہوئے آس
کتنے ہی قافلے منزل کے تجسس میں رواں
کتنی بھیگی ہوئی آنکھوں میں کئی تلخ سوال
کتنے شہروں سے محبت کی فضا روٹھی ہوئی
مشکلیں بیس طرح کی ابھی شمشیر بکف
مسئلے بیس طرح کے ابھی اک کوہِ گراں
لوگ جھانکیں تو سہی اپنے گریبانوں میں

کون مجرم ہے یہاں کس کو سزا دی جائے
یہی بہتر ہے کہ ہر شخص ہو خود پر نادم
پھر نئے سال پہ اک عہد کریں سب مل کر
بہ ایں انداز بنیں حسنِ عمل کے پیکر
کوئی بھی خواب نہ شرمندۂ تعبیر رہے
شاہدِ فکر کے چہرے سے چھٹے گردِ ملال
اب نہ عنوان سے محروم ہو افسانہ کوئی
چشمِ ادراک سے آئینۂ جاں جاگ اٹھے
اور احساس کی گرمی سے پگھل جائیں دل
اجنبی راستے مقصودِ عزائم ٹھہریں
قافلے امن کے آسودۂ منزل ہو جائیں
سب کی آنکھوں میں ہو صہبائے مسرت کا سرور
خشک ہونٹوں کو تبسم کے اجالے ہوں نصیب
پھول ہی پھول محبت کے چمن میں مہکیں

ڈاکٹر عمار رضوی
وزیر اطلاعات و دیہی ترقی
اتر پردیش

اتر پردیش کی موجودہ حکومت اور دیہی ترقی

بابائے قوم مہاتما گاندھی نے کہا تھا کہ ہندستان گاؤں میں آباد ہے ظاہر ہے کہ دیہی ترقی کے بغیر ملک یا ریاست کی ترقی ممکن نہیں ہے۔ ہماری ریاست میں ۱۱۲۶۲۴ گاؤں ہیں جن میں ریاست کی ۸۸۳۴۱۱۴۴ کی آبادی میں سے ۷۵۹۵۲۵۴۸ افراد رہتے ہیں۔ آپ تصور کیجیے کہ اتنے گاؤں اور اتنی بڑی آبادی کی ترقی کا کام کتنا بڑا کام ہے لیکن یہ کام ہم سب کو مل جل کر کرنا ہے کیونکہ گاؤں کے بھائی بہنوں کی معاشی حالت کو بہتر بنائے بغیر اتر پردیش کی ترقی کوئی معنی نہیں رکھتی۔

دیہی ترقی کی اہمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے موجودہ حکومت اس کام کے لیے پوری طرح مستعد ہے۔ ہمیں دیہی اداروں کو فعال بنا کر زراعت، تعلیم بالغان علاج وصحت، پینے کے پانی، روزگار کی فراہمی اور چھوٹی صنعتوں کے لیے تیز رفتاری سے کام کرنا ہے۔ چنانچہ ریاست میں غریب دیہی باشندوں کے لیے انتیودیہ، ہریجنوں کے لیے مکانات رابطہ سڑکوں کی تعمیر اور خود اپنا روزگار شروع کرنے سے متعلق پروگرام جیسی متعدد فلاحی اسکیمیں جاری ہیں۔

دیہی ترقی کے پروگراموں کو صحیح ڈھنگ سے چلانے اور دیہی باشندوں کو ضروری اشیاء فراہم کرنے کی غرض سے ریاست کے ہر گاؤں کے بارے میں یہ اعداد وشمار جمع کیے جا رہے ہیں کہ اس گاؤں میں کیا کیا سہولتیں دستیاب ہیں اور دیہی باشندوں کی ضروریات کی تکمیل کے سلسلہ میں حکومت کی کون سی اسکیمیں زیر عمل ہیں۔

میں سب سے پہلے مربوط دیہی ترقیاتی اسکیم کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو ریاست کے سبھی ۸۸۵ ترقیاتی بلاکوں میں گزشتہ ۲ اکتوبر سے نافذ ہے۔ اس اسکیم کے تحت زراعت، چھوٹی آبپاشی، نگہداشت مویشیان اور صنعتی پروگراموں کی [illegible] کے ذریعہ چھوٹے اور مارجنل کسانوں، زرعی مزدوروں اور دیہی دستکاروں کو حسب ضرورت مالی امداد [illegible] کوشش کی جا رہی ہے کہ روزگار کے مزید مواقع مہیا کر کے انھیں غریبی کی سطح سے اوپر لایا جائے۔ مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام پر مناسب طریقے سے عمل درآمد کے لیے ریاست کے تمام اضلاع میں ضلع دیہی ترقی شعبہ قائم کرنے کا حکم دے دیا گیا ہے۔ ریاست کے ہر ترقیاتی بلاک میں چھوٹے کاشت کاروں کو مالی امداد دینے کے لیے پانچ لاکھ روپیہ مختص کیا گیا ہے۔ اس طرح ریاست کے ۸۸۵ ترقیاتی بلاکوں کو ۴۴.۲۵ کروڑ روپیہ چھوٹے کاشت کاروں کی امداد کے لیے دستیاب ہوگا۔ اس کے علاوہ اس کی دوگنی رقم ادارہ جاتی مالیات کی شکل میں دی جائے گی یعنی تقریباً ۱۵۰ کروڑ روپیہ سالانہ چھوٹے کسانوں کو مالی امداد اور قرضہ کے طور پر فراہم کیا جائے گا۔ ایک ہیکٹیر (ڈھائی ایکڑ) سے کم جوت والے کسانوں کو ۳۳ فیصد اور ایک سے دو ہیکٹیر تک کی جوت والے کسانوں کو ۲۵ فیصد مالی امداد دی جائے گی۔ ریاست کے ہر ترقیاتی بلاک میں ایک سال کے دوران ۶۰۰ یا چھٹے پنچ سالہ منصوبہ میں ۳۰۰۰ منتخب خاندانوں کو مالی امداد فراہم کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ چھوٹے کسانوں کھیت مزدوروں اور دیہی دستکاروں کی معاشی حالت کو بہتر بنانے کا یہ ایک حوصلہ مندانہ پروگرام ہے جس کے تحت ریاست میں ۱۹۸۰-۸۱ء کے دوران اب تک ۲.۸۱ لاکھ سے زیادہ

افراد مستفید ہوئے ہیں اور ۲۹ ر ۱۹۱۹ لاکھ روپیہ کا قرضہ تقسیم کیا جا چکا ہے۔

ریاست کے ۱۹۲ پسماندہ ترقیاتی بلاکوں میں زیر عمل چھوٹے کاشتکاروں کے ترقیاتی پراجکٹ سے ۵۴۵۰۱ افراد مستفید ہوئے۔ اس پراجکٹ کے تحت چھوٹے اور مارجنل کسانوں، کھیت مزدوروں اور دیہی دستکاروں کو مالی امداد فراہم کی گئی۔ خشک سالی سے متاثر ہونے والے چھ اضلاع یعنی وارانسی، الہ آباد، مرزاپور، جالون، ہمیرپور اور باندہ کے ۴۰ منتخب ترقیاتی بلاکوں میں خشک سالی سے ہونے والے نقصانات کو کم کرنے اور اس علاقہ کے کمزور لوگوں کو مالی امداد مہیا کرکے روزگار سے لگانے کے لیے خشک سالی علاقائی ترقیاتی پروگرام شروع کیا گیا۔ ریاست میں شاردا سہایک، رام گنگا اور گنڈک نہر نظام کے ۲۹ اضلاع کے ۳۳۳ منتخب ترقیاتی بلاکوں میں دستیاب آبپاشی وسائل کو سائنسی طریقہ سے استعمال کرنے کے لیے کمانڈ علاقہ ترقیاتی پروگرام پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔

اترپردیش میں نجی چھوٹی آبپاشی اسکیم کے تحت پہلی ششماہی میں ۴۵ ر ۱۰۵ لاکھ روپیے خرچ ہوئے اور ۲۶۶۰۱ نجی ٹیوب ویلوں، ۳۵۶۸ پمپنگ سیٹوں اور ۸۰۷۰ بورنگوں کا کام مکمل کیا گیا۔ اس کے علاوہ ۰۶ ر ۴ لاکھ ہیکٹر رقبہ میں آبپاشی صلاحیت پیدا کی گئی۔ انتودیہ پروگرام سے اب تک ۱۹۱۱۶ خاندان مستفید ہو چکے ہیں۔ ضلع پریشدوں نے ۴۳ ر ۳۰۴ لاکھ روپیہ اور کاروباری بنکوں نے ۱۷ ر ۴۵ لاکھ روپیہ کی رقم تقسیم کی ہے۔ اسی طرح مقامی ترقیاتی اسکیم کے تحت ضلع پریشدوں نے ۴ ر ۱۹۸ لاکھ روپیے اور کاروباری بنکوں نے ۲۰ ر ۱۶ لاکھ روپیے فراہم کیے جس سے ۲۷۲۸ پیداواری واحدوں نے کام کرنا شروع کر دیا ہے۔

ہریجنوں کو پینے کے پانی کی فراہمی سے متعلق اسکیم کے تحت ۸۲۴ کنویں تعمیر کیے جا چکے ہیں اور خشک سالی کے پیش نظر ۸۴،۵۴ کنووں اور پہاڑی علاقہ میں ۹۱۱ کنووں کو بلاسٹنگ کے ذریعہ گہرا کیا گیا۔ اس کے علاوہ ۱۱۴۳ ہینڈ پمپ لگائے گئے اور ۱۳۳ ڈگیاں تعمیر کی گئی ہیں۔ کام کے عوض اناج اسکیم یا قومی روزگار اسکیم کے تحت اس سال ۱۰۱ لاکھ ٹن اناج دستیاب ہوا تھا۔ اب تک ۳۲۶۸۳ اسکیمیں مکمل کی جا چکی ہیں اور ۳۵۹۹ اسکیموں پر کام جاری ہے۔

ریاست میں قبائل مندرجہ فہرست افراد کی کثرت والے علاقوں میں خصوصی قوت بخش غذا اسکیم کے تحت حاملہ خواتین، ماؤں اور چھ سال تک کی عمر کے بچوں کو قوت بخش غذا فراہم کی گئی۔ اس سال ۶۱۵۲ ر ۱ افراد اس سے مستفید ہو چکے ہیں۔ کمزور طبقوں کے لیے تعمیر مکانات اسکیم کے تحت ۲۸۷۸ مکانات تعمیر کیے جا چکے ہیں اور ۱۴۰۰۰ مکانات زیر تعمیر ہیں۔ اس سال اس پروگرام پر ۳ ر ۱۷ لاکھ روپیے خرچ ہوئے۔

ریاست میں قائم ۸۹۲ نجاتی صنعتوں میں ۸۰۰۰ مزدور کام کر رہے ہیں۔ گزشتہ چھ ماہ کے دوران ۶۷ ر ۱۹۹ لاکھ روپیہ مالیت کی مختلف اشیاء تیار کی گئیں جن میں سے ۹۱ ر ۱۹۸ لاکھ روپیہ کی اشیاء فروخت ہوئیں۔

توسیعی تربیتی پروگرام کے تحت ریاست میں ترقیاتی کام میں لگے ہوئے افسروں اور کارکنوں کے علاوہ قوت بخش غذا پروگرام کے تحت مختلف تربیتی مرکزوں میں ۵۹۸۶ افراد کو مختلف پیشوں کی تربیت دی گئی۔

جیسا کہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ دیہی ترقی کا کام اتنا بڑا ہے کہ اس میں سب کا تعاون درکار ہے۔ قومی تعمیر کے اس مقدس کام میں ہر شخص کو خواہ وہ کسی بھی پارٹی کا ہو مل جل کر حکومت سے تعاون کرنا چاہیے۔ عوام کے ہر طبقہ کو اس کام میں پوری دلچسپی لینا چاہیے۔ سرکاری افسروں اور ملازمین سے تو یہ توقع ہے کہ وہ ریاست کے دیہی علاقوں کے غریب اور پسماندہ افراد کی ترقی کے لیے پورے خلوص کے ساتھ خدمت کے جذبہ سے کام کریں گے۔

★

خورشید افسر بسوانی
بسواں۔ سیتاپور

یہ سرزمینِ وطن

یہ سرزمینِ وطن
یہ سرزمینِ وطن
جواں کیا ہے اسے مدھ بھری ہواؤں نے
بھری ہے مانگ بھی فطرت کی اپسراؤں نے
بڑی لگن سے سنوارا ہے دیوتاؤں نے
یہ مسجدوں کی اذانیں، یہ مندروں کے بھجن
یہ سرزمینِ وطن

کبھی ہواؤں کے جھونکوں میں برف کی للکار
شرر فشاں کبھی موسم، کبھی فضا گلبار
کبھی جوان بگولے، کبھی حسین پھوار
کئی رُتوں نے بنایا ہے اس کو مل کے دُلہن
یہ سرزمینِ وطن

کبھی یہ گوتم و نانک کو جنم دیتی ہے
کبھی یہ سرمد و چشتی کو گود لیتی ہے
یہی تو گاندھی و ٹیگور کی پہیلی ہے
دیا ہے نذرل و اقبال نے خراجِ سخن
یہ سرزمینِ وطن

یہ سرخ قلعۂ دِلّی، یہ حسن تاج محل
الورا اور یہ اجنتا، یہ شالیمار، یہ ڈل
اودھ کی شام، بنارس کی صبح، سب کا بدل
یہ نرم نرم شعاعیں، یہ سانولے سے بدن
یہ سرزمینِ وطن

یہ سحر کاری راگنی، یہ کیفِ نینی تال
یہاں ہے شوخیِ پنجاب، جادوئے بنگال
یہ ہیر اور یہ رانجھا، یہ سوہنی مہوال
یہ رام و شیام کی دھرتی، یہ پیار کا آنگن
یہ سرزمینِ وطن

یہاں سبھی کے لیے ہے بہار کا سندیس
گلے ملو کہ یہ ہے اس دیار کا سندیس
اک ایک لہر سناتی ہے پیار کا سندیس
مچل مچل کے گلے مل رہے ہیں گنگ و جمن
یہ سرزمینِ وطن
یہ سرزمینِ وطن

حنیف کیفی
شعبۂ اردو
جامعہ ملیہ۔ دہلی

ڈاکٹر عابد حسین کی شاعری

ایک ادیب اور دانشور کی حیثیت سے ڈاکٹر عابد حسین کی ت گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں، لیکن ایسے لوگ بہت ہوں گے جو انھیں ایک شاعر کی حیثیت سے بھی جانتے ہوں۔ صورت حال کے ذمہ دار خود ڈاکٹر عابد حسین ہیں۔ انھوں نے ر گوئی کو نہ مشغلہ بنایا نہ اپنا فن ٹھہرایا، نہ شاعری کو ذریعہ رت بنانے کی کوشش کی اور نہ اپنی شاعرانہ حیثیت تسلیم نے کے لیے اپنی دوسری مسلمہ حیثیتوں کو حربے کے طور پر ستعمال کیا۔ اپنے کلام کا کوئی مجموعہ ترتیب دینا اور شائع انا تو درکنار، انھوں نے اسے مجتمع اور محفوظ کرنا بھی ضروری سمجھا، ان کا کچھ کلام "علی گڑھ میگزین" اور "جامعہ" جیسے سالوں کے چند پرانے پرچوں میں منتشر ہے، اور کچھ بیگم لحہ عابد حسین نے ان کی وفات کے بعد یکجا کرکے اپنے لیے تسکین طر اور دوسروں کے لیے دعوت نظر کا سامان فراہم کر دیا ہے اس ح عابد صاحب کا جو اردو کلام دستیاب ہوتا ہے، وہ صرف دو زلوں، چند نظموں اور کچھ قطعات تاریخ پر مشتمل ہے۔ اس کے وہ ایک نامکمل فارسی مرثیے کی مختصر تمہید بھی، جو رسالہ "جوہر" ۱۹۱[illegible] میں شائع ہوئی۔ ان کی یادگار ہے، ہو سکتا ہے کوئی لار ریسرچ اسکالر تقریباً نصف صدی پہلے کے رسائل کی ان بین کی صبر آزما مہم سر کرکے اس سرمایے میں کچھ اور اضافہ سے، لیکن ایسی ممکنہ اضافہ کے باوجود کسی سرمایۂ کثیر کے فراہم نے کا امکان کم ہی نظر آتا ہے۔ کلام عابد کا یہ مختصر سرمایہ کسی ایسے بھرپور مقالے کی بنیاد بننے میں مانع ہے، جو تنقید و تجزیہ کا وافر سامان مہیا کر سکے، اور جس کے ذریعہ شاعر کے فکر و فن کا تفصیلی جائزہ لیا جا سکے لیکن ایک کثیر الجہات شخصیت کی یہ متاعِ قلیل بھی اس بات کی مستحق ضرور ہے کہ اس کے اس پوشیدہ گوشے کو متعارف کرایا جائے۔

ڈاکٹر سید عابد حسین کی شعر گوئی کا آغاز اس وقت ہوا جب وہ صرف سید عابد حسین تھے۔ یہ کہنا دشوار ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے مشق سخن کب کی، البتہ ان کی دستیاب شعری تخلیقات میں اولیت ایک نظم "تصویر تلوّن" کو حاصل ہے، جو "علی گڑھ میگزین" بابت نومبر، دسمبر ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد "علی گڑھ میگزین" ہی کے اگلے شمارے میں یعنی جنوری ۱۹۲۱ء میں ایک غزل شائع ہوئی۔ یہ اس وقت کی بات ہے، جب عابد صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایم۔اے۔ کے متعلم تھے۔ "تصویر تلوّن" ایڈیٹر کے اس تعارفی نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔

"ہمارے مکرم دوست سید عابد حسین صاحب میور سنٹرل کالج الہ آباد سے اسی سال نہایت اعزاز کے ساتھ بی۔اے پاس کرکے ہم میں آ ملے ہیں۔ تصویر تلوّن آپ کی ذہانت و ذکاوت کی خاموش تعبیر، لیکن "بولتی ہوئی" تصویر ہے۔ ناظرین اس کا مطالعہ کرنے کے بعد خود یہ رائے قائم کر لیں گے کہ ہمیں سید صاحب کا تعارف کراتے ہوئے یا تو بالکل خاموش رہنا چاہیے تھا یا اس سے کہیں زیادہ کہنا چاہیے تھا۔ ذیل کی نظم

نوجوانانِ ہند کی سیماب وشی اور قوتِ فیصلہ کے فقدان کا کتنا صحیح نقشہ پیش کرتی ہے۔"

اس تعارفی نوٹ کے علاوہ بھی کئی مقامات پر ایڈیٹر نے تحسین کے کلمات لکھے ہیں۔ یہ نظم دراصل الگ الگ عنوانات کے تحت بارہ[12] قطعات کا مجموعہ ہے۔ یہ تمام قطعات سوائے آخری قطع کے جو دس مصرعوں پر مشتمل ہے، چار چار مصرعوں کے ہیں۔ تکنیک کے اعتبار سے ان مختلف قطعات کو جو چیز نظم کی وحدت میں پروتی ہے وہ ایک بحر اور قافیے کی پابندی ہے۔ اس کے علاوہ ردیف کے طور پر واحد متکلم کا استعمال، جس کے ذریعہ مختلف خیالات ایک ہی کردار کے ذہنی تلوّن کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ نظم میں وحدت موضوع کا اہتمام ہے۔

نظم کے کچھ اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔ ابتدا "کشمکشِ اضطراب" کے عنوان سے اس طرح ہوتی ہے۔

عالم میں کچھ عجیب تلاطم ہے ان دنوں
اک کشمکش میں دیکھتا ہوں بحر و بر کو میں

دل بھی ہے ایک چھوٹی سی دنیا بجائے خود
ہلچل میں یاں بھی پاتا ہوں ہر دشت و در کو میں

"شباب کی شورانگیزی اور ناعاقبت اندیشی" کے تحت یہ اشعار نظم کیے گئے ہیں۔

ہے عالمِ شباب حرارت لہو میں ہے
حرفِ غلط سمجھتا ہوں خوف و خطر کو میں

وہ خام طبع ہوں کہ پرکھتا نہیں کبھی
معیارِ غور و فکر پہ ہمت کے زر کو میں

نظم کا اختتام ان اشعار پر ہوتا ہے۔ ان کا عنوان ہے "مختلف النوع سیاسی افکار کا تصادم"۔

ہے یوں کہ پختہ مغزِ محبت نہیں ہنوز
ہر دم بدلتا رہتا ہوں سمتِ نظر کو میں

میرے لیے وہ لوگ ہیں سوہانِ روح آج
کل جا نفزا سمجھتا تھا جن کی نظر کو میں

گہ بزمِ اعتدال میں محوِ خیال ہوں
گہ نامِ انقلاب پہ دھنتا ہوں سر کو میں

خالد کے ساتھ ہوں کبھی پیرو ہوں زید کا
گہ اختیار کرتا ہوں طرزِ بکر کو میں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

جنوری ۱۹۲۱ء کے "علی گڈھ میگزین" میں عابد صاحب کی جس غزل کی اشاعت کا ذکر کیا گیا، اس کا مطلع اور چند شعر نمونے کے طور پر یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

ہے دل سے اشارہ نگہِ ہوش ربا کا!
دکھلا دوں تجھے آنکھ سے نیرنگ قضا کا

اب لذتِ پُر درد ہے آغازِ محبت
ہو درد میں لذت یہ ہے انجام وفا کا

احساس مجھے دل کا ہوا دل کی تڑپ سے
آزارِ محبت نے کیا کام دوا کا

دریا نے ابھارا ہے کہ لے جائے بہا کر
خاشاکِ سرِ موج ہوں سیلاب فنا کا

اسی رسالے میں "حضرت لسان العصر سے نامہ و پیام" کے عنوان کے تحت اکبر الہ آبادی کے کچھ خطوط ایڈیٹر کے نام شائع کئے گئے تھے۔ ان کے ساتھ ایک خط عابد صاحب کے نام بھی شائع ہوا تھا جس میں ان کی ایک نظم کی تعریف کی گئی تھی۔ ایڈیٹر کا جو نوٹ اس خط کے ساتھ شائع ہوا تھا اس کے مطابق اس نظم کا عنوان "شرحِ دردِ اشتیاق" ہے۔ لکھتے ہیں:

"ایک اور صحیفۂ کرامت ہمارے مکرم دوست سید عابد حسین صاحب بی۔ اے کے نام صادر ہوا جس میں ان کی نظم "شرح دردِ اشتیاق" کے متعلق ارشاد فرمایا ہے۔"

متعلقہ خط کے الفاظ یہ ہیں:

"برادرم عزیزم سلمہ اللہ تعالےٰ۔ آپ کی نظم نے مجھ کو

آپ کا بہت مشتاق کر دیا، خصوصاً آخر کے دو تین بند تو ایسے ہیں کہ میں نے بے اختیار کہا۔

آپ کی ہستی تو راہِ ذوقِ عرفاں میں مٹی
کاش چھوڑے آپ کے دامن کو یہ تو رسّی

ماشاء اللہ نہایت اعلیٰ قابلیت ان اشعار سے ظاہر ہوتی ہے زندہ رہا تو فروری میں ملنا ہوگا۔" اکبر "

یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ نظم عابد صاحب نے ذاتی طور پر اکبر کے مطالعے کے لیے بھیجی تھی یا اکبر نے اسے مطبوعہ شکل میں دیکھ کر اس کی داد دی تھی، البتہ اکبر کے مذکورہ خط کی اشاعت کے تقریباً تین سال بعد یہ نظم "جامعہ" علی گڈھ، نومبر ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی جبکہ عابد صاحب جرمنی میں مقیم تھے، نظم کا پہلا اور آخری بند پیش ہے۔

محو رخِ امکاں کا رنگِ زمیدہ ہوں   آفرینش کا دلِ پر درد ہوں
زیست کے آئینۂ دل کا غبار   مرگ کے نقشِ قدم کی گرد ہوں
تھا عدم کی آنکھ میں ایک قطرۂ خوں   سینۂ ہستی میں آہِ سرد ہوں
مجھ کو لائے ہیں مری مرضی بغیر   یعنی میں آمد نہیں آوردہ ہوں
چوں مرا در دارِ دنیا کردہ اند
نیں پشیمانند بیجا کردہ اند

باعثِ تسکین مگر ہے یہ خیال   عارضی ہے زیست کا رنج و ملال
اتحادِ نور و ظلمت تا بہ کے   چند لحظہ، چند ساعت، چند سال
پھر وہی آہنگ سیرِ لامکاں   پھر وہی سودائے حسنِ لازوال
قیدِ صورت سے ملے گی پھر نجات   شاہدِ معنی سے پھر ہوگا وصال
مرغِ جاں را، آشیانے دیگر است
"این مکاں را ہم مکانے دیگر است"

قیامِ جرمنی ہی کے زمانے کی ایک اور نظم حسن بے پروا ہے۔ مثلث کی ہیئت میں کہی گئی اس نظم کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔

تجھے اے حسین لڑکی ہے بہشت زندگانی
ہے مسرتوں کی دنیا ترا عالمِ جوانی
تری صبحِ حسن و خوبی کی ہے ہر گھڑی سہانی

کچھ اور نظموں کے اقتباسات ملاحظہ فرمائیے:

"بسترِ تنہائی"

ابھی بارہ بجا چکی ہے گھڑی   رات برسات کی ہے اندھیاری
آسماں پر گھری ہے کالی گھٹا   ہر طرف چھا رہا ہے سناٹا
تھے فنا کن ہوا کا نام نہیں   ہو کا عالم، صدا کا نام نہیں
اور کچھ سائیں سائیں سی ہے بھی
اور بڑھتی ہے اس سے خاموشی

یہ شبِ تار اور یہ تنہائی   دلِ مضطر تری قضا آئی
کن بہانوں سے تو نے رُکے تھے   وہ خیالات پھر امڈ آئے
پھر وہی حسن و عشق کا جھگڑا
پھر وہی سلسلہ سوالوں کا

دلِ وحشی یہ گفتگو کب تک   رازِ الفت کی جستجو کب تک
تجھ سے پہلے بھی تھے بہت غریب   نہ ہوا پر کسی کو چین نصیب
اب مناسب تجھے یہ ہے سو جا   سارے عالم سے بے خبر ہو جا
خواب اور مرگ ہی میں ہے یہ اثر   کہ ہر اک غم سے چھوٹ جائے بشر
اب نہ جانے فنا کی گودی میں   نیند اور موت کی خموشی میں
ہم محبت کا بھید پاتے ہیں   یا یہ قصہ ہی بھول جاتے ہیں
خیر دونوں کا ایک ہی ہے مآل   یعنی جاتا رہے یہ رنج و ملال
مرنے جینے پہ اختیار کسے
نیند آجائے تو غنیمت ہے
("جامعہ" دہلی مارچ ۱۹۲۶ء)

"عید قرباں"

آخری بند ــــ
جانتی ہے عید بھی طرزِ تغافل ہائے یار
ہائے اس کا منھ دکھانا سال بھر میں ایک بار
اے تعالیٰ اللہ کیسا خوش دلی کا روز ہے
ہر خوشی دنیا کی اس دن ہے مسرت پہ نثار

اہلِ دل باہم گلے ملتے ہیں کس کس شوق سے
دل سے دل کو راہ ہے سینے سے سینہ ہمکنار

نعرۂ الیومُ عیدٌ سازِ لب سے نغمہ ریز
کتبۂ الحبُّ للہ لوحِ دل پر آشکار

سرخمارِ بادۂ عشرت سے محوِ سرخوشی
رخ دفورِ نشۂ شادی سے ہم رنگِ بہار

باش اے طبعِ فضولم یاوہ گوئی تاکجا
نعرۂ مستانہ بس کن و خامشی عرض دار

بس خجل ہستم نہ دارم فدیۂ شایانِ تو
آنچہ عید از کثرت شاہا می کنم قربانِ تو

("جامعہ" دہلی، جون ۱۹۲۶ء)

"کشمیر شب ماہ میں"

جلوۂ طور ہے مقابل آج
زیبِ گردوں ہے ماہِ کامل آج

بے نقاب آج ماہِ انور ہے
کس قدر دلفریب منظر ہے

یہ سہانا سماں یہ پیاری زمین
کیوں نہ کہئے اسے بہشت بریں

حسنِ فطرت کی دلربا تصویر
جانِ نظارہ خطۂ کشمیر

کچھ عجب دل کشی ہے پانی میں
چاندنی بہہ رہی ہے پانی میں

ماہِ کامل نے روئے روشن سے
حسنِ فطرت کو چار چاند لگے

رات کو اس نے دن بنایا ہے
سوتے سنسار کو جگایا ہے

("جامعہ" دہلی، ستمبر ۱۹۲۶ء)

عابد صاحب کی مذکورہ نظمیں موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے سنجیدہ بیانیہ نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں مشاہدات و محسوسات کی سیدھی سادی عکاسی ہے یا خیالات و نظریات کی کسی قدر فلسفیانہ رنگ آمیزی کے ساتھ ترجمانی ہے۔ پہلی نظم "تصویرِ تلوّن" میں طنز کی ہلکی سی چاشنی ہے لیکن اصلاحی انداز غالب ہے۔ ان سنجیدہ نظموں کے ساتھ عابد صاحب نے کچھ منظومات طنز و مزاح کے پیرایے میں بھی کہی ہیں۔ ان میں تین اشعار پر مشتمل ایک قطعہ "کون و فساد"، ایک فرد، "ممبر کونسل"، مسدس کی ہئیت میں ایک مختصر نظم "بندر"، اور ایک قطعہ تاریخ "ایک شاعر کی تاریخِ ہجرت" شامل ہیں۔ یہ طنزیہ و مزاحیہ منظومات ایسی ہیں کہ انھیں مکمل پیش کیے بغیر بات نہیں بنتی ـــ

"ممبر کونسل"

یہ نہیں معلوم اس نے یس کہا یا نو کہا
میں تو کہہ گزرا کہ صاحب سچ ہے تو نے جو کہا

("جامعہ" - مئی ۱۹۲۶ء)

"کون و فساد"

فلسفی دو بحث کرتے تھے یہ تھانے کے قریب
کیوں تغیر آشنا ہے "عالمِ کون و فساد"

فیصلہ کیا خوب فرمایا ہے تھانیدار نے
فلسفے سے ذوق جن کو ہے وہ دیں گے اس کی داد

سوتے سوتے چونک کر بولے کہ او کانسٹبل
ایک دم چالان کر دو کون کرتا ہے فساد

("جامعہ" مئی ۱۹۲۶ء)

بندر

سچ بتا اے نونہالِ گلستانِ ارتقاء
سچ بتا ملے بچہ حیوان وش انسان تھا

بارگاہِ آفرینش میں ترا منصب ہے کیا
کیا اثر تاریخِ عالم پر ہے تیری ذات کا
عالمِ ایجاد کس حد تک ترا ممنون ہے
ہاں تری نشو و نما کا کون سا قانون ہے

ابتدا میں لوگ تیری شان سے واقف نہ تھے
تجھ کو نادانی سے مطلق جانور کہتے رہے
عہد میں تہذیب کے تیرے بھی آخر دن پھرے
تیرے پوتے ڈارون انگلینڈ میں پیدا ہوئے
سب سے پہلے معرفت تیری انھیں حاصل ہوئی
عقلِ انسانی انھیں کی ذات سے کامل ہوئی

نازشِ یورپ ہے تیری ذاتِ میموں لا کلام
اشرفِ مخلوق ہے اس دور میں تیرا ہی نام
ایشیا لیکن ہے ایسا جہل و وحشت کا مقام
اس کو ہے تری سیادت اور بزرگی میں کلام
یہ تو مذہب کی خیالی شمع کا پروانہ ہے
یہ بھی باعث ہے کہ یہ تہذیب سے بیگانہ ہے

ہم کو لازم ہے کہ ہم تجھ سے سبق حاصل کریں
مصلحت کی تنگ وادی میں ترے پیرو بنیں
تیری پھرتی سیکھ لیں تیری صفائی سیکھ لیں
مکر و چالاکی میں بس تیرے ہی چیلے ہو رہیں
دے کے بھبکی ہاتھ ماریں دوسرے کے مال پر
عیب وہ لیکا ہو رہے اس ڈال سے اس ڈال پر

جن کو بدنامی کا ڈر ہے، ہیں کہاں وہ بزدلے
دیکھ لیں آزادیٔ نسواں میں تیرے حوصلے
گو تری تقلید ہم کر لیں تو یہ جھگڑا مٹے
کم سے کم بندری کا اسٹیٹس تو عورت کو ملے

اے کہ در عالم نہ باشد جز تو دیگر پیرِ ما
ذاتِ میمونت چراغِ راہ در تدبیرِ ما
(جوہر ۱۹۳۵ء)

"ایک شاعر کی تاریخِ ہجرت"

میں نے کل پوچھا یہ فنِ شعر سے — اور پھر تا دیر پچھتاتا رہا
وہ زباں آور سخنور کیا ہوا — جو ترا فرزند کہلاتا رہا
دخترِ رز اس کو گرماتی رہی — اور وہ محفل کو گرماتا رہا
لوگ اس کو سر پہ بٹھلاتے رہے — وہ اکڑتا ناز فرماتا رہا
سن کے یہ جھنجھلا کے بولی شاعری
تھا کبھی اب ناخلف جاتا رہا

۱۳۷۵ھ

اہلِ نظر اندازہ کر سکتے ہیں کہ روئے سخن کس کی طرف ہے۔ بیگم صالحہ عابد حسین کی اطلاع کے مطابق "اس تاریخ کا یہ تیکھا مصرعہ عابد صاحب کے حلقۂ احباب و قدردانوں میں خاصا مقبول ہوا۔"

عابد صاحب کی تاریخ گوئی کا ذکر آگیا ہے تو بیگم صالحہ عابد حسین کے الفاظ میں یہ عرض کر دوں کہ "ادھر چالیس پینتالیس سال سے ان کی شاعری زیادہ تر تاریخ گوئی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اپنے دوستوں اور عزیزوں اور جن سے ان کو گہری عقیدت ہوتی ان کی وفات سے متعلق تاریخیں نکالتے تھے۔ اس سے بھی زیادہ دوستوں اور عزیزوں کی شادی بیاہ وغیرہ کی تاریخیں نکالنے اور پھر ان پر مصرعے لگانے کا شوق تھا۔ اس ضمن میں دو ایک مزاحیہ یا طنزیہ انداز کی تاریخیں بھی موجود ہیں۔" مزاحیہ تاریخ کی مثال ابھی پیش کی گئی۔ سنجیدہ قطعاتِ تاریخ میں بیگم صالحہ سے شادی کی تاریخ، علامہ اقبال، مولانا ابو الکلام آزاد، خواجہ غلام السیدین، سید قیصر حسین زیدی، مولانا سعد انصاری، استاذ جامعہ ملیہ اسلامیہ، اور عابد صاحب کے بھانجے مختار مہدی کی وفات کی تاریخیں خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ یہاں ان قطعاتِ تاریخ کا وہ شعر پیش کیا جاتا ہے جس کے دوسرے مصرعے سے تاریخ نکلتی ہے۔ البتہ بیگم صالحہ کی شادی کی تاریخ کا پورا قطعہ درج کیا جاتا ہے۔ اس کے آخری دو مصرعوں میں سے پہلے

ہے عیسوی تاریخ اور دوسرے سے ہجری تاریخ نکلتی ہے۔

ملاحظہ فرمایئے ـــــ

ہوائے محبت کچھ ایسی چلی — کہ بس کھل گئی آرزو کی کلی
ہوا آتشِ شوق دہکا گئی۔ — ریاضِ تمنا کو مہکا گئی
مشامِ دل وجاں معطر ہوا — نفس غیرتِ مشک وعنبر ہوا
ہوئے عقدِ عابد سے احباب شاد — برآئی عزیزوں کے دل کی مراد
گلستانِ سعدی کا اک شعر تر — ہوا بہر تاریخ مد نظر
ذرا سے تصرف سے بے قیل وقال — نکل آئی دو طرح تاریخ سال

زنِ نیک وخوب وخوش وپارسا

۱۹۴۲ء

کند بادشہ مرد درویش را

۱۳۵۱ھ

تاریخ وفات علامہ اقبالؔ ـــــ

فکر کی جب سال رحلت کی تو آئی یہ صدا
ملتِ اسلام میں اقبال کا ماتم ہے آج

۱۳۵۷ھ

تاریخ وفات مولانا ابو الکلام آزاد ـــــ

ہے یہ ہمارا نالہ تری رحلت کی تاریخ بھی ہے
دل پہ آج ہجوم یاس تیرے غم میں ہے آزاد

۱۹۵۸ء

تاریخ وفات خواجہ غلام السیدین۔

دعا کے طور پہ تاریخ رحلت کہہ کے بس کہیے،
"غلام السیدین آسودۂ رحمت ہو" یوں کہیے

۱۹۷۱ء

تاریخ وفات مولانا سعد انصاری ـــ

دل نشین ہے دل سے نکلی ہے یہ تاریخ وفات
سعد صاحب سچے عاشق جامعہ کے اٹھ گئے

۱۳۶۵ھ

دیگر

ہے بیاں واقعی مصرعِ تاریخ بھی
سعد انصاری کے غم میں جامعہ سنبل ہے آج

۱۹۴۶ء

تاریخ وفات سید قیصر حسین زیدی (بہ قاعدۂ تخرجہ)

نکلا ہے ایک مصرعِ تاریخ عیسوی
قیصر کو قصرِ خلدِ بریں میں نصیب ہو

۱۹۷۵ — ۱ = ۱۹۷۴

سوائے سیدین صاحب کی تاریخ کے باقی تمام تاریخیں پورے مصرعے سے نکالی گئی ہیں۔ مختار مہدی کی تاریخ وفات دو مصرعوں سے نکالی گئی ہے۔ ایک مصرع میں بڑی خوبصورتی سے وہ حادثہ بیان کر دیا گیا ہے جو اس جوان مرگ عزیز کی موت کا سبب بنا تھا۔ ملاحظہ کیجئے۔

ڈوبا گنگا میں چاند اپنا
حوضِ کوثر پہ آج نکلا

+۳۱۶

۱۹۶۸ء = ۱۴۵۲

تاریخ گوئی ایک مشکل فن ہے لیکن عابد صاحب کی قدرتِ کلام اور زورِ تخیل نے اس مشکل کو آسانی میں تبدیل کر دیا ہے۔ اور آورد کو آمد بنا دیا ہے۔ ان کی تاریخوں میں عام طور پر روانی، برجستگی وبیساختگی پائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر عابد حسین کی منظوم نگارشات کے سلسلے میں اپنی ایک دریافت کا ذکر بطور خاص کرنا چاہتا ہوں۔ ابتک جتنی بھی منظومات کا ذکر کیا گیا ہے، وہ سب قدیم ہیئتوں میں لکھی گئی ہیں لیکن ایک نظم "تلافیِ مافات" جو جامعۂ علی گڑھ میں جولائی ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی تھی، ایک ایسی ہیئت میں نظم کی گئی ہے۔ جو اس زمانے کے جدت پسند نظم نگاروں میں خاصی مقبول ہو رہی تھی۔ یہ انگریزی کی ایک اسٹینزا فارم (QUATR-AIN) (مربع) تھی۔ جس میں پہلا مصرع تیسرے کا اور دوسرا مصرع چوتھے کا ہم قافیہ ہوتا ہے۔ اردو میں اس ہیئت کی ابتدا

انیسویں صدی کے اواخر میں پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کے ہاتھوں ہو چکی تھی لیکن اسے مقبولیت نظم طباطبائی کی "گورِ غریباں" سے حاصل ہوئی۔ عابد صاحب کی "تلافیٔ مافات" اسی طرز جدید میں منظوم ہے۔ اس نظم کا تعارف مدیر "جامعہ" نورالرحمٰن نے ان الفاظ میں کرایا ہے:

"شعر فطرت انسانی کا ایک ایسا پرتو ہے جو خیالات کی وسعت، لطفِ زبان اور اظہارِ مطلب کے تمام پہلو اپنی محدود مختصر دنیا میں بند رکھتا ہے۔ "تلافیٔ مافات" اسی قسم کی ایک نظم ہے جس میں یہ سب خوبیاں موجود ہیں۔
عابد صاحب کی یہ نظم ان کوششوں میں شمار ہونے کے قابل ہے جو اپنی جدت طرازی، ندرتِ تخیل و بلند پروازی سے دوسروں کے لیے بھی ایک نئی راہ پیدا کر دیتی ہیں، اور ظاہر ہے کہ یہ مرتبہ بلند ہر شخص کا حصہ نہیں۔ فلسفہ اور معرفت کا یہ درس زمین شعر کی رنگینی دونوں ہی میں کچھ ایسا بھلا معلوم ہوتا ہے کہ جی چاہتا ہے کہ عابد صاحب اس طرز میں کچھ اور لطف فرماتے۔"

نورالرحمٰن کی یہ آرزو کہ "عابد صاحب اسی طرز میں کچھ اور لطف فرماتے" غالباً پوری نہیں ہوئی کیونکہ عابد کی اس انداز کی کوئی اور نظم مجھے باوجود تلاش کے نہ مل سکی۔ بے محل نہ ہوگا اگر خود نظم کے چند ابتدائی بند نمونے کے طور پر پیش کر دیے جائیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

ہے جلوہ گاہِ صبحِ ازل عالمِ خیال
حیرت کے ساتھ ذوقِ تماشا لیے ہوئے
پیشِ نظر ہے شاہدِ لاریب کا جمال
اور دل سے ممکنات کے پردے اٹھے ہوئے

ہیں بے خبر وصال کی لذت سے کاف و نون
وحدت کو آپ اپنی نظر سے حجاب ہے
شورش سکوں کے پردے میں بیٹھی ہے سرنگوں
ہستی عدم کی گود میں مصروفِ خواب ہے

لیکن نہاں ہے پردۂ ظلمت میں ایک شے
جس کو نہیں قبول کسی طرح یہ جمود
• جو جلوہ افگنی کے لئے بے قرار ہے
تخلیق حسن کی فطرتِ اصلی کی ہے نمود

ایک بار کرکے شعلۂ قدرت سے کسبِ نور
یوں ظلمتِ عدم میں جل اٹھتا ہے یہ چراغ
جیسے سیاہیٔ شبِ موسیٰ میں شمعِ طور
جیسے سوادِ ہجر میں عاشق کے دل کا داغ

یہ ہے عابد صاحب کی شعری کاوشوں کا جائزہ۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تعداد و معیار دونوں اعتبار سے شاعری کی حیثیت عابد صاحب کے یہاں ضمنی و ثانوی ہے۔ شعر گوئی ان کے لیے کبھی کبھار کا مشغلہ ہی رہی۔ انھوں نے اسے سنجیدگی سے کبھی نہیں اپنایا اور بالآخر اب سے تقریباً نصف صدی پہلے اسے ہمیشہ کے لیے ترک کر کے (سوائے تاریخ گوئی کے۔) انھوں نے اپنی ساری توجہ اپنے اصل میدان نثر نگاری پر صرف کر دی۔ اس طرح ان کی شاعری ان کے عہدِ جوانی کی یادگار رہے لیکن اس میں جوانی کم ہی ہے۔ جوانانہ سرمستی کے بجائے اس میں ایک بزرگانہ سبق آموزی کا رجحان نظر آتا ہے۔ بیگم صالحہ عابد حسین نے عابد صاحب کے ترکِ شاعری کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

"عابد صاحب نے ارادتاً شاعری چھوڑ کر نثر کے میدان کو اپنایا تھا کہ جو کچھ وہ کہنا اور کرنا چاہتے تھے اس کی تفسیر و تعبیر کا بار نثری ادب ہی اٹھا سکتا تھا۔ لیکن ان کا ذہن اور دل شاعر کا رہا۔ شاعری ان کے اندر ہمیشہ زندہ رہی۔"

میرا خیال ہے کہ عابد صاحب کے اسی اقدام میں ان کی اس دیانت دارانہ خود انتقادی کو ضرور دخل رہا ہوگا کہ موزونیت طبع کے باوجود مزاجِ شاعرانہ انھیں حاصل نہ تھا، اس لیے وہ سخنور تو ہو سکتے تھے، شاعر نہیں۔ ان کا استدلالی ذہن شاعر کے جذباتی مزاج کے منافی تھا۔ شروع ہی سے ان کا ذہن اور دل ایک مفکر کا تھا۔ شاعر کا نہیں۔ ان کے پاس تخئیل و تفکر بھی تھا۔

(بقیہ صفحہ ۲۰۲ پر)

جلال ملیح آبادی
ملیح آباد ۔ لکھنؤ

رباعیات

پھر ہو یہ سبو، یہ جام کس کو معلوم
اس عمر کا اختتام کس کو معلوم
ہاں جام اٹھا کہ ہے غنیمت ہر سانس
کل ہوگی کہاں یہ شام کس کو معلوم

ہر عیش، عدوئے صبر و تمکیں پایا
ہر جشن کے بعد دل کو غمگیں پایا
جس ساغرِ گل تاب کو دیکھا دمِ صبح
خود اپنے ہی خونِ دل سے رنگیں پایا

یہ رنگِ شفق۔ یہ شام۔ کل ہو کہ نہ ہو
یہ وقتِ طرب یہ جام۔ کل ہو کہ نہ ہو
ہاں جھوم کہ چوم وہ مہکتی زلفیں
محبوبۂ لالہ فام کل ہو کہ نہ ہو

یہ دورِ غم آہنگ ابھی اور سہی
حالات سے یہ جنگ ابھی اور سہی
کچھ رات ابھی اور ہے باقی۔ ساقی!
اک جام لہو رنگ ابھی اور سہی

گو آج ہے یہ خیمۂ گل سایۂ تاک
انجام مگر مثلِ گل ہے زیرِ افلاک
اک روز نہ میں نہ تم رہو گے۔ یارو!
اک جام، بیادِ دوستانِ تہِ خاک

پھر سوئے چمن گھوم رہے ہیں بادل
موسم کی جبیں چوم رہے ہیں بادل
اک نعرۂ مستانہ۔ یہ آوازِ بلند
اے بادہ کشو! جھوم رہے ہیں بادل

حرمت الاکرام
رام باغ، مرزاپور (یو۔ پی)

غالب کا عشق

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

غالب کا مشہور شعر ہے۔ لیکن اسے ان کے نظریہ عشق کی اساس نہیں بنایا جا سکتا۔ بلکہ ان کے تجرباتی شعور کا ایک پہلو یا زیادہ سے زیادہ ان کے تجربات کا ایک ایسا رخ کہا جا سکتا ہے جس پر نگاہ دیر تک ٹھہری رہتی ہے۔ غالب کے بعض (بلکہ بیشتر) ناقدین ان کی عظمت کا راز محض ان کی فکری قوتوں میں تلاش کرتے ہیں اور ان کو فلسفی قرار دے کر خوش ہوتے ہیں، اگرچہ اقبال کی طرح غالب کو بھی صرف اس لیے عظیم نہیں کہا جا سکتا کہ وہ فلسفی تھے بلکہ وہ اس لیے عظیم تھے کہ ان کی شاعری جتنی منفرد ہے، اتنی ہی غیر روایتی ہے اور جتنی غیر روایتی ہے، اتنی ہی رنگا رنگ ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ غالب کی شخصیت ہی کی طرح انوکھی اور تیکھی ہے۔

خود غالب نے "آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں" کہہ کر ایک بڑی بات کہہ دی ہے۔ لیکن غالب اردو کے پہلے شاعر ہیں جن کے احاطۂ فکر میں پوری زندگی سمٹ آئی ہے۔ میر نے عشقیہ شاعری کو جو عظمت دی ہے اس کی مثال اردو شاعری یقیناً پیش نہ کر سکی۔ انھوں نے اس ایک پہلو کو کتنا نکھارا اور اس ایک پہلو کو کتنے متنوع رنگ دیے۔ اس کے اظہار کی ضرورت نہیں مگر غالب نے اسعد کی پوری عشقیہ شاعری کو کس قدر پہلودار بنا دیا، قطرہ میں دجلہ دکھانے کے کیا کیا سامان کیے اور فروغ شمع سخن کو دل گداختہ کی لوؤں سے مربوط کرنے کی کیسی کیسی صورتیں نکالیں، یہ بھی ظاہر ہے۔ یہ کیفیات ان کی شاعری کو ایک گردش کرتا ہوا فانوس بنا دیتی ہیں جس میں نفسیات عشق کی نیرنگیاں تصویروں کی مانند رقصاں ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ میر کی شاعری ایک دبی دبی کسک، ایک رندھی رندھی لے کی جو پونجی رکھتی ہے، غالب اس سے محروم ہیں اور یہ بنیادی خط ہے۔ جو میر و غالب کے درمیان ایک فصیل کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ لیکن غالب نے شعر کو شعور کی حدوں سے قریب تر کرنے اور فکر کی تیشہ آزمائیوں سے بہرہ مند ہونے کا جو انداز دیا، وہ اردو کے لیے بالکل نیا ہے، اتنا ہی نیا جتنا ان کا وہ لہجہ جس پر بیدل کی مشکل پسندی گہرے بادلوں کی طرح منڈلاتی ہے۔ غالب کے مشاہدات و تجربات جن میں خود بھی بڑا تنوع اور بڑی بیکرانی ہے، ایک اندرونی توانائی بھی رکھتے ہیں جو ذہن کو پوری قوت سے اپنی جانب کھینچتی ہے۔ میر کی شاعری کبھی کبھی ایک مقام پر رکی ہوئی معلوم ہوتی ہے، غالباً اس لیے کہ اسے لہو کی جو حرارت چاہیے تھی وہ بعد کے ادوار میں خاطر خواہ شدت کے ساتھ برقرار نہ رہ سکی لیکن غالب کی شاعری جس کو تپش فکر کی نئی چنگاریاں ملتی جاتی ہیں، پیچ در پیچ مراحل سے گزرتی اور ہر بلند و پست سے ابھرتی آگے بڑھتی جاتی ہے۔ غالب کی شاعری اور زندگی کی تفہیم میں ان کے خطوط بھی بڑی معاونت کرتے ہیں۔ وہ مرزا حاتم علی بیگ مہر کو ان کی محبوبہ چنا جان کی تعزیت میں لکھتے ہیں:

"آپ کا غم زا نامہ پہنچا۔ یوسف علی خاں عزیز کو پڑھوا دیا۔ انھوں نے جو میرے سامنے اس مرحومہ کا اور آپ کا معاملہ بیان کیا یعنی اس کی طاعت اور تمھاری اس سے محبت، سخت ملال ہوا۔ سنو صاحب! شعرا میں فردوسی اور فقرا میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں، یہ تین آدمی تین فن میں سر دفتر پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال

یہ ہے کہ فردوسِ ہو جائے، فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے منھ کی کھائے۔ عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو، لیلیٰ اس کے سامنے مری تھی۔ تمھاری معشوقہ تمھارے سامنے مری۔ بلکہ تم اس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمھاری معشوقہ تمھارے گھر میں مری بھی، مغل بچے بھی غضب کے ہوتے ہیں، جس پر مرتے ہیں اسے مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں عمر بھر میں ایک ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم دونوں کو بھی کہ زخم مرگ دوست کھائے ہوئے ہیں، مغفرت کرے۔

چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے تاآنکہ یہ کوچہ چھوٹ گیا۔ اس فن سے میں بیگانہ محض ہو گیا ہوں لیکن کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں، اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔"

اسی سلسلے کے ایک اور مکتوب میں (حاتم علی بیگ مہر ہی کو لکھتے ہیں:

"مرزا صاحب! ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ پینسٹھ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے یہ نصیحت کی تھی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانع فسق و فجور نہیں۔ پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا غم وہ کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک فشانی کہاں کی مرثیہ خوانی؟ آزادی کا شکر بجا لاؤ، غم نہ کھاؤ اور اگر ایسی ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی، منا جان سہی۔"

غالب پر کسی مرشد کی نصیحت کا جو کچھ اثر ہوا اور جیسا اثر ہو لیکن جاگیر دارانہ ماحول کا اثر کم نہ تھا جس نے عشق کو تفریح پسندی، خوش باشی اور عیش کوشی سے قریب کر دیا تھا۔ اسی نے معاشرے میں بالا خانوں کی مقبولیت و اہمیت کو فروغ دیا جن کی حیثیت (اس دور کے امراء و رؤسا کے لیے) وہی تھی جو آج زنانہ (متوسط طبقہ کے لیے) سینما گھروں کی ہے۔ ہوشان بازاری سے محفلیں بھی آباد ہوتی تھیں اور گھروں کو بھی رونق ملتی تھی۔ امارت نے ان مشاغل کو اپنی باہوں میں

ہی نہیں، دل کے نرم گوشوں میں بھی جگہ دے رکھی تھی اور اخلاقی قدریں بھی ان کے پاس و احترام پر مجبور تھیں۔ اس معاشرے نے ہندستانی تہذیب کو کئی نئے رخ دیئے۔ جن کی رنگا رنگی بڑی خیرہ کن اور نظر فریب تھی۔ امراء کے ان مشاغل پر نہ اعزہ نکتہ چیں ہو سکتے تھے نہ بیگمات کو اعتراض کا کوئی حق تھا۔ رہے احباب، وہ حق دوستی ادا کرتے تو شریکِ انجمن کون ہوتا۔؟

غالب بھی امیر زادے تھے، اگرچہ کسی جاگیر کا سہارا تھا نہ کوئی معقول و مستقل آمدنی معاون کار تھی لیکن کلاہ خسروی سے بوئے سلطانی نہیں جاتی اور جا بھی کیسے سکتی تھی! انھیں خود بھی فخر تھا کہ سو پشت سے پیشۂ آبا سپہ گری ہے اور یہ احساس تو کہیں مدتوں کے بعد ہوا کہ ان کی کوئی جگہ ہو سکتی ہے (جو نمایاں بھی ہے اور ممتاز بھی) تو محفلِ سخن میں ــــ چنانچہ قیدِ فرنگ میں انھوں نے جو معرکہ آرا ترکیب بند سپرد قلم کیا تھا اس کا یہ شعر کس قدر غور طلب ہے:

آئی نہ باشم کہ بہر بزم زمن یاد آرید
دارم امید کہ در بزم سخن یاد آرید

بایں ہمہ غالب نے داد امارت دی اور اس کوچہ کی خاک چھانی جو کاروبارِ شوق کے شعلوں کو بھڑکا تو سکتا ہے مگر جذبات کو سمندر کی گہرائی نہیں دے سکتا۔ یہ ضرور ہے کہ آدمی کو دلبازی کی اچھی خاصی مشق ہو جاتی ہے جس کی حدیں کبھی کبھی جاں بازی کی حد تک جا پہنچتی ہیں۔ "کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے ہائے ہائے۔" بھی غالب کے اسی ذوقِ جمال کی فریاد ہے جس کی آسودگی کی صورتیں انھیں کلکتے میں زیادہ نظر آئیں مگر چار و ناچار رختِ سفر باندھنا پڑا۔ یہ آتشیں خلش بھی غالب کے دل میں تا حیات شعلہ زن رہی اور تھا عمر الفت کے باوجود انھیں دلّی میں ایک بار اور ہائے ہائے کی جان کاہ لے چھیڑنی پڑی۔

دردسے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے
تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے
گل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے
عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

یہ غزل فی الاصل ایک خوش مذاق عورت کا مرثیہ ہے جو اچھا ذوقِ سخن رکھنے کے ساتھ ساتھ غالب سے وہ لگاؤ رکھتی تھی جسے انھوں نے دوست داری، اور رسم و راہِ یاری کا نام دیا ہے۔ چنانچہ غالب عشق کو خللِ دماغ کہتے رہیں لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ۔

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

"وہ عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا" کے اعتراف پر مجبور ہیں اور

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام
دل کو خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

کا جراتِ مندانہ تصور جو غالب کے شب و روز پر چھا گیا تھا، انھیں یہ کہنے پر اکساتا ہے:

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے   کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

صرف مراسم کو ٹوٹنے سے محفوظ رکھنے کے لیے محبوب کی عداوت کا خواستگار ہونا (اور اس کو ترکِ تعلق پر ترجیح دینا) شعلوں پر چلنے سے کم حوصلہ آزما نہیں جس کو اپنے وجود سے عداوت قرار دیا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ چنانچہ: ؎

یا رہے چھیڑ چلی جائے اسد   گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

کا سودا جھنکا تو پڑنا ہی چاہیے "اور ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک" یا "دل کا کیا رنگ کریں خونِ جگر ہونے تک" کا سوال سامنے آجائے تو کیا عجب مگر ؎

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

کے باوجود غالب ہیرا پھیری سے باز نہیں آتے۔ عشق میں دل کے ساتھ پاسبانِ عقل کا رہنا ممکن نہیں اور دل کا کیا، "دل سا دوست نہ دل سا دشمن"۔

اس کی ستم ظریفیاں دیکھیے:

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

لیکن لطف یہ ہے کہ چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش، سرکش موجوں کی طرح لمحات کی چٹانوں سے ٹکراتی رہتی ہے اور غالب، "کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے" کا لحاظ کیے بغیر کہہ بیٹھتے ہیں۔

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

محبوب پاؤں دابنے کو کہے تو خوشی کے مارے ان کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں اور اس کا اظہار نہایت بے تکلفانہ زندہ دلی کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان میں وہ سادہ مزاجی نہیں جو روایتی عشاق کا شیوۂ ازلی ہے اور نہ عجز و نیاز کی اس روایت سے جو میر کے دور سے چلی آرہی ہے ان کا کوئی ربط معلوم ہوتا ہے: ؎

دھول دھپّا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

یہ پیش دستی حیرت انگیز بھی نہیں کیونکہ وہ پہلے ہی سے کہتے آرہے ہیں:

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

اور ایک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے کے مدعی کے لیے عذرِ مستی کا کیا قحط!

دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہو گئے
عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

مانع تو آتے تھے، لیکن:

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

سے بے خبر کب تھے۔ غالب تو محبوب کو "تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر" کی راہ بتانے والوں میں ہیں اور

"آپ اٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے"

ان کے نزدیک گھر کی رونق کا مدار ایک ہنگامے پر ہے، خواہ یہ نغمہ

شادی کے بجائے نوحۂ غم ہی کیوں نہ ہو۔ ستم رخوں سے تقریب ملاقات کی آرزو انھیں معتوری سیکھنے کا سبق دیتی ہے۔ وہ عذرِ (محبوب کی) رسم و راہ کا برا نہیں مانتے لیکن اتنا ضرور کہتے ہیں کہ مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو۔

بہرحال ان کے انداز ہر موقع پر نرالے ملتے ہیں اور اسی لیے

آگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

یا

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا!

کی خم بخم وادیوں سے گزرنے کے باوجود

سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

کا اقرار کر لینے میں عافیت سمجھتے ہیں۔ غالب جانتے ہیں کہ غم لازمۂ حیات ہے اور سینے میں دل ہے تو غم سے مفر ممکن نہیں۔ کوئی غمِ عشق و غمِ روزگار کو خانوں میں تقسیم کیا کرے لیکن غالب ان کو ایک ہی تصویر کے دو رخ تصور کرتے ہیں اور اس احساس کی اہمیت پر ایمان رکھتے ہیں۔ لہٰذا کہتے ہیں

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے
غمِ عشق اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

ان کے نزدیک قیدِ حیات و بندِ غم بھی ایک ہی زنجیر کے دو حلقے ہیں۔ چنانچہ غم سے نجات کی خواہش، موت کو مترادف قرار دیتی ہے۔ وہ غم کی خلش انگیز گہرائیوں میں اترتے ہیں اور جس طرح اقبال (نزع کی کیفیت میں) موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا چاہتے تھے، اسی طرح غالب غم کی باہوں میں باہیں ڈال کر زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ وہ لذتِ آزار سے ناآشنا نہیں۔

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ تیرِ نیم کش ان کے دل میں تاحیات پیوست رہا اور وصالِ یار کی آرزو وہاں کی بے رحم بجلی کی مانند کوندتی رہی۔ بالآخر انھیں کہنا پڑا کہ،

'اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا'

محرومی کی یہ کیفیت انھیں عرفانِ غم کی منزل تک لاتی ہے:

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو، یہ اگر شرار ہوتا

ان کے دل سے،

'خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا'

کی آواز آتی رہی اور اس خونِ جگر کا حساب وہ قطرہ قطرہ کر کے دیتے رہے۔ ایک عاشق، وہ بھی غالب جیسے عاشق کو جسے اندیشہ ہائے دور دراز نے شکووں سے اس طرح پُر کر دیا ہو، جیسے راگ سے باجہ، کہنا پڑا کہ

اک ذرا چھیڑیے، پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

لیکن وہ جگر لخت لخت کو جمع کرنے کی تدبیریں سوچتے رہتے ہیں اور یہ کوشش تنہائیوں سے یہ مصرعہ بار بار ابھرتا ہے:

عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

کسی خرابِ عشق کے لیے اس سے زیادہ اذیت ناک بات کیا ہو سکتی ہے کہ گریباں چاک کیے ہوئے مدت گزر جائے ایسی وضع احتیاط کس کام کی اور غالب:

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

کی آواز بلند کر بیٹھے تو حیرت کیسی؟ تغیرات نے دنیا بدل دی ہے۔ لیکن آرزوؤں کا تموج کس کے روکے رکا ہے؟ تمناؤں کی پشتہ بندی کس سے ہو سکی ہے؟ اس لیے دل کی بات زبان پر آ ہی جاتی ہے:

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

لیکن سوچنے کی بات ہے کہ تصورِ جاناں میں بھی کوئی ایسا پہلو نہ نکل آئے کہ غالب کو اپنی ذات پر رشک آنے لگے۔ کیا کیجیے، روشنی طبع کی طرح غالب کی طبیعت کا البیلا پن بھی انھیں چین سے نہیں

رہنے دیتا:

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

ایک پیکرِ محبوبی کے جلوے بکھر رہے ہیں، عاشق لاکھ صبر طلب ہو مگر تمنا کی بیتابی بڑی قاتل ہوتی ہے۔ نگاہِ شوق اپنا حق مانگتی ہے۔ مگر ساتھ ہی ایک نشتر بھی کھٹک اٹھتا ہے اور دل و دیدہ ایک دوسرے کی رقابت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ نگاہ پھیرنا ممکن نہیں اور عالم یہ ہے کہ خود ان کا وجود ہدفِ رشک بنا جا رہا ہے کس قدر صبر آزما منزل ہے:

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالبؔ
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

اضطرابِ حشر سامانی نے کبھی انھیں مرزا صاحب سے کہلوایا تھا۔

کیوں ترا وقتِ سفر یاد آیا؛

وہ لمحات ایک بار پھر پلٹ آتے ہیں۔ محبوب آمادۂ سفر ہے اور وہ بھی رقیب کے ہمراہ۔ اس منظر کی تاب شاید ہی کوئی لا سکے نہ کہ غالبؔ جن کا مذاقِ رشک، محبوب کو خدا کے بھی حوالے نہیں کر سکتا۔ بات بڑی عجیب ہے مگر کیا غالبؔ کی شخصیت کم عجیب ہے۔ وہ معشوق کے دامن کو حریفانہ [illegible] کا بھی خوصلہ رکھتے ہیں مگر محض حوصلہ مندی، کامیابی کی ضمانت نہیں۔

آخر آخر مایوسیوں نے غالبؔ کے دل سے ذوقِ وصل اور یادِ یار تک کے نقوش اس طرح محو کر دیے جیسے آگ لگنے سے کسی گھر کا پورا اثاثہ جل جائے۔ عناصر میں اعتدال نہیں رہا، قمار خانۂ عشق چھوٹ چکا ہے۔ گرہ میں مال نہیں۔ انھیں جیتے جی مرنا پڑا اور فریاد کی لے (اگرچہ غالبؔ کے نزدیک فریاد کی کوئی لے نہیں ہے) بے اختیار جاگ پڑی:

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد
آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

اور یہی بیکسیِ عشق (تھوڑی سی معنوی وسعت کے ساتھ) غالبؔ کے تاجِ فن کا کوہِ نور بن جاتی ہے:



ڈاکٹر عابد حسین کی شاعری (بقیہ صفحہ ۳۴)

علم و شعور بھی اور حسیت و آگہی بھی۔ لیکن اس جذباتیت اور حساسیت کی ان میں کمی تھی، جو حسیت کو انگیز اور فکر کو مہمیز کر کے تحریک شعر کا سبب بنتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ موزونیتِ طبع کے باعث ان میں قوتِ شعر گوئی ہمیشہ زندہ رہی۔ لیکن وہ شاعرانہ جنون (POETIC FRENZY) ان کے دل و دماغ پر کبھی طاری نہ ہو سکا جو شاعری کی شرطِ اولین ہے۔ تاریخ گوئی تو خیر ایک میکانکی عمل ہی ہے، عابد صاحب کا دیگر منظوم کلام بھی (بشمولِ غزل) ان کے اس مصرع کا مصداق ہے "یعنی میں آمد نہیں آورد ہو لہذا" اور ظاہر ہے کہ محض آورد اور قدرتِ کلام کے سہارے سچی اور اچھی شاعری وجود میں نہیں آ سکتی۔ البتہ عابد صاحب اگر طنزیہ و مزاحیہ شاعری کی طرف توجہ کرتے تو اپنے لیے امتیاز کا پہلو نکال سکتے تھے۔

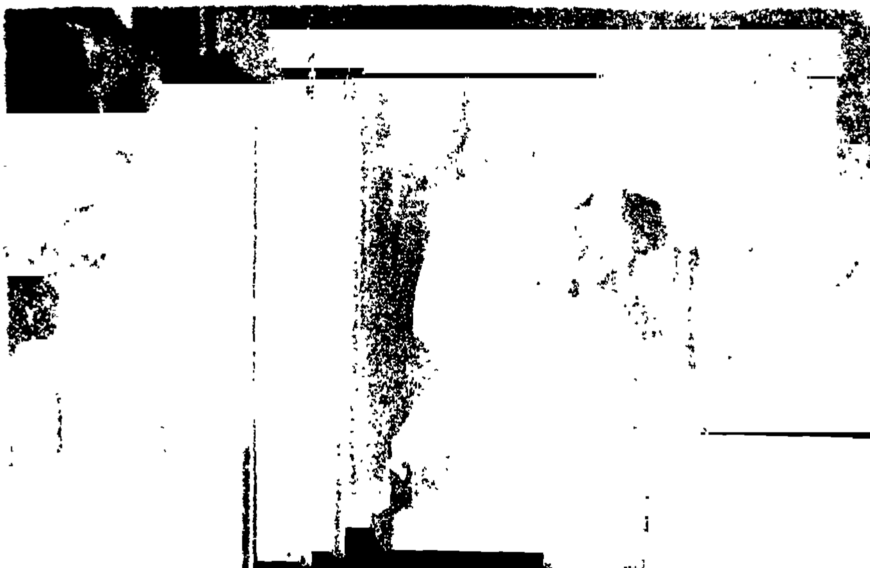
ڈاکٹر عابد حسین نے جس وقت شاعری کو ترک کرنے کا فیصلہ کیا ہوگا تو ان کے پیشِ نظر یہ تمام خود شناسانہ حقائق رہے ہوں گے۔ ان کے اندر کے نقاد نے اپنی شخصیت کا جائزہ لے کر اور اپنی صلاحیتوں کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھ کر صحیح فیصلہ کیا، اور اردو علم و ادب کو ایک ایسا عظیم المرتبت اور روشن دماغ ادیب و دانشور عطا کیا جس سے آئندہ نسلیں ہمیشہ کسبِ فیض کرتی رہیں گی۔





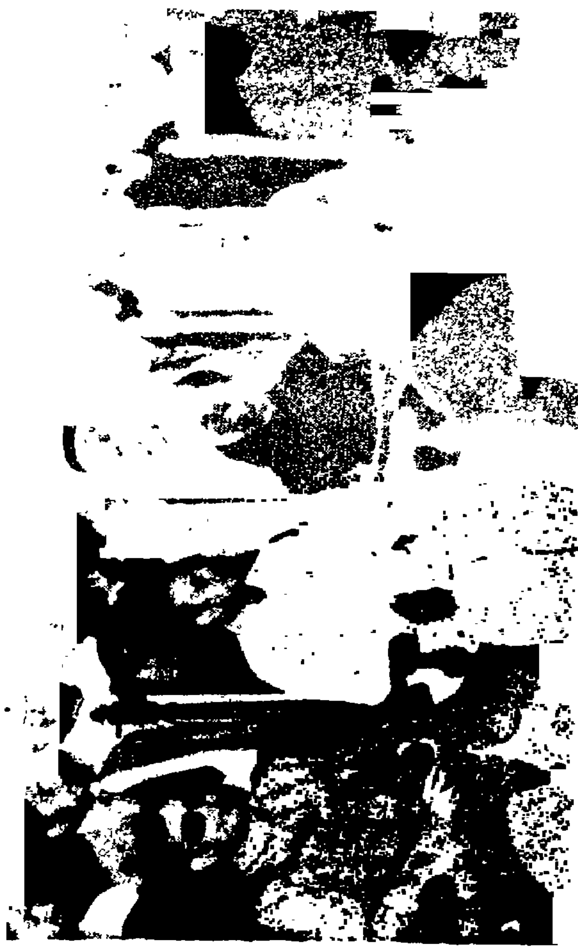
اترپردیش اردو اکاڈمی کے زیر اہتمام منعقدہ دو روزہ پریم چند صدی تقریبات کے موقع پر ۳۰ دسمبر ۱۹۸۰ء کو وزیر اطلاعات و قومی یک جہتی ڈاکٹر عمار رضوی پریم چند کی تصویر کی گل پوشی کرتے ہوئے۔

ڈاکٹر عمار رضوی پریم چند صدی تقریبات کے موقع پر منعقدہ "پریم چند نمائش" دیکھتے ہوئے تصویر میں محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش کے ڈائرکٹر شری لال شکلا، جوائنٹ ڈائرکٹر ٹھاکر پرشاد سنگھ، اردو اکاڈمی کے صدر شری علی جواد زیدی، ڈاکٹر رضوان علوی (جو اس وقت اکاڈمی کے چیرمین تھے) اور اکاڈمی کے سکریٹری شری غلام حسین زیدی بھی نظر آ رہے ہیں۔











صلحِ کُل







یروں
ے
میں

محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش کے زیر اہتمام ۲۴ر نومبر ۱۹۸۰ء کو سہکاریتا بھون لکھنؤ میں منعقدہ مشاعرے/کوی سمیلن میں ڈاکٹر عمار رضوی تقریر کرتے ہوئے۔ تصویر میں وزیر صحت شری لوک پتی ترپاٹھی، نذیر بنارسی، خورشید افسر بسوانی، معراج فیض آبادی وغیرہ بھی نظر آرہے ہیں۔

۲۴ر نومبر کے مشاعرے/کوی سمیلن کے حاضرین کا ایک منظر۔

نصرت قریشی
۷۷۴ - بہادر گنج
الہ آباد ۳

یہ میرا وطن

یہ میرا وطن، صد رشک چمن، ملکوں ملکوں شہرت کا چلن
دھرتی دھرتی خوشبو اس کی، مٹی میں کھلی پھولوں کی پھبن
خوابوں کی کلی ہر ایک گلی، سمٹی، شرمائی جیسے دلہن
ہونٹوں پر پیار کے نغمے ہیں، پیروں میں بجتی ہے جھانجھن
تالاب، ندی، دریا، پربت، سب اس کے حسن کا ہیں درپن

یہ میرا وطن

کتنے شاعر اور رہا کوی، لیکھک، دانشور، فخر زمن
تہذیب و ثقافت کا دامن بھرتے ہیں یہاں سب اہل فن
ملکوں ملکوں مکتی کے مارگ پہ تپتے ہوئے بھکشو کے بدن
گوتم، چشتی اور نانک کی تعلیم سے ہر دل ہے روشن
اک تاج محبت کا پہنے، جمنا تٹ ناچیں رادھا کشن

یہ میرا وطن

یہ رام، رحیم کے متوالوں کی یک جہتی کا ہے درپن
سیتا، ساوتری، مریم کی تقدیس کی پاکیزہ چلمن
اجمیر سے کاشی، متھرا تک پھیلا ہے پیار کا برندابن
مذہب کے پرستاروں میں ہے گنگا جمنا کا جیسے ملن
مندر، مسجد، گردواروں اور گرجوں میں حق کی ہے دھڑکن

یہ میرا وطن

رشیوں منیوں سے بھری ہوئی یہ دھرتی پیر فقیروں کی
متھرا، مندر اور درگاہوں میں جھلکتی ہیں جبینیں امیروں کی
پھولوں کی سیج کے ساتھ کبھی اک سیج سجی ہے تیروں کی
آزادی کے دیوانوں پر یلغار ہوئی شمشیروں کی
ہنستے ہنستے مرنے والے یہ امر شہیدوں کا مدفن

یہ میرا وطن

یہ میرا وطن، اس کی دھرتی سونا اگلے، گلزار کھلیں
ہر شاخ نئی کونپل پھوٹے، ہر موسم میں رخسار کھلیں
سڑکوں کے کنارے رونق سے بھرپور، حسیں بازار کھلیں
پھولوں کی طرح شاعر کے قلم سے نکلے ہوئے اشعار کھلیں
میں شاعر گیت لکھوں ایسے، اشعار میں ہے نغموں کا چمن

یہ میرا وطن

اس دور کشاکش میں بھی ہے یہ امن بھرا پیغام لیے
ہر صبح کے بچھڑوں کی خاطر اک پیاری ملن کی شام لیے
پیاسوں کی پیاس بجھانے کو بادل امرت کا جام لیے
ہونٹوں پر پیار کے نغمے ہیں، ہر دل ہے وفا کا نام لیے
یہ میرا وطن، الفت کے چلن میں ڈوبا ہوا ہنستا موہن

یہ میرا وطن

یہ میرا وطن، دنیا میں وفا کا نام جگا کر زندہ ہے
اک پیار کا دیپک آندھی میں ہر سمت جلا کر زندہ ہے
نفرت سے بھری دنیا کے لیے اخلاص لٹا کر زندہ ہے
انسانی محبت کا پرچم ہاتھوں میں اٹھا کر زندہ ہے
یہ شاد محبت، فخر زمن، دنیا پہ لٹائے پیار کا دھن

یہ میرا وطن

اے میرے وطن تیری شہرت کا چاند کبھی نہ گہنائے
نفرت کے غار سے یوں ہی ابھر کر پیار بھرا سورج آئے
ظلمت کے پرستاروں کا دل روشن ہو، تجھ سا بن جائے
تیری عظمت بڑھتی ہی رہے، یہ پیار کا پرچم لہرائے
تو سب کا وطن، الفت کا چلن، تجھ پر ہیں نچھاور جان و تن
دھرتی پہ گگن !

ہے سب کا وطن !
یہ میرا وطن

سید نجم الدین نقوی،
۱۲-اے قلعہ معلیٰ رامپور (یو۔پی)

امیر مینائی اور قیصر باغ

رضا لائبریری، رام پور کی فہرست اردو مخطوطات میں ایک اندراج نظر آیا "نثر در تعریف قیصر باغ" مصنفہ امیر مینائی۔ کتاب نکلوائی تو دیکھا کہ یہ نثر، کتاب کے گیارہ اوراق یعنی اکیس صفحات پر محیط ہے۔ اکیسویں صفحہ پر صرف چند سطریں ہیں۔ کتاب میں نہ تاریخ کتابت درج ہے نہ کاتب کا نام۔ شروع میں یہ عبارت ملتی ہے "رجسٹر درآمد اشیائے کتب خانہ دارالریاست، رام پور، ۱۱ اپریل ۱۹۱۵ء" فہرست مخطوطات میں اس کتاب کا نمبر ۴، ۲ ہے۔ اور فہرست کے کالم سنِ تصنیف میں "عہدِ خلد آشیاں" درج ہے۔ "خلد آشیاں" نواب کلب علی خاں مرحوم کے لیے لکھا جاتا ہے۔ ان کا عہدِ حکومت ۲۱ اپریل، ۱۸۶۵ء تا غایت ۲۴ مارچ ۱۸۸۷ء رہا۔ اسی نثر میں اکیس اشعار کی ایک غزل بھی توصیف "قیصر باغ" میں درج ہے۔ قافیہ "دربار، رفتار" وغیرہ اور ردیف "قیصر باغ میں" نثر کا مطالعہ کرنے سے اور غزل کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ یہ نثر اور غزل امیر کے رام پور آنے سے قبل لکھنؤ میں انشا ہوئی تھی۔ کیوں کہ اس میں قیصر باغ کے میلے کا ذکر اور اس میں موزونوں کے حسن و جمال کا بیان اور پھر بادشاہ کا دیدار ہونا تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

چنانچہ داخلی شہادت کی بنا پر یقین ہوا کہ یہ نثر اور غزل امیر نے رام پور آنے سے قبل لکھنؤ ہی میں لکھی تھی۔ پھر بھی یہ فکر رہی کہ کسی مستند محقق کے بیان سے میرے یقین کو تقویت ملے۔ یاد آیا کہ ڈاکٹر ابو محمد سحر نے امیر مینائی پر تحقیقی کام کیا ہے اور "مطالعۂ امیر" کے نام سے اپنی تھیسس بھی شائع کی ہے۔ اس کتاب کو دوبارہ دیکھا اور مسرت ہوئی کہ میرا خیال صحیح تھا۔ "مطالعۂ امیر" میں دی گئی فہرستِ تصنیفاتِ امیر پر نظر ڈالی تو کتاب کے صفحہ ۱۲۲ پر "نثر در تعریف قیصر باغ مخطوطہ رضا لائبریری" کا اندراج پایا اور اسی کے ساتھ یہ نوٹ بھی ملا "غیر مطبوعہ، غدر سے پہلے لکھی گئی" "مطالعۂ امیر" ہی کے صفحہ ۱۳۸ پر یہ عبارت ملتی ہے "مشہور ہے کہ یہ غزل، امیر نے ایک شاہی مشاعرے کی طرح میں لکھنؤ میں کہی تھی" امیر کا اس غزل کو متذکرہ نثر میں شامل کرنا اور بھی ثابت کرتا ہے کہ یہ نثر لکھنؤ ہی میں انشا ہوئی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ نثر اور غزل ایک ساتھ لکھی گئیں یا علاحدہ علاحدہ۔ اگر ڈاکٹر ابو محمد سحر کا یہ بیان مان لیا جائے کہ یہ غزل شاہی مشاعرے کی طرح میں کہی گئی ہوگی تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ نثر اور غزل دونوں علاحدہ علاحدہ معرضِ وجود میں آئیں اور بعد میں امیر مینائی نے ان دونوں کو یکجا کر دیا۔

چونکہ رضا لائبریری کے مخطوطے میں کاتب کا نام اور تاریخ کتابت نہیں ہے اور چونکہ یہ نثر اور غزل رجسٹر درآمد اشیائے کتب خانہ، دارالریاست رام پور ۱۱ اپریل ۱۹۱۵ء میں درج ہے اس لیے یہ نتیجہ نکالنا بہت آسان ہے کہ یہ مخطوطہ امیر مینائی کے مرنے کے بعد نواب حامد علی خاں مرحوم کے عہد میں کتاب خانے میں داخل

تھا۔ امیر مینائی کا انتقال ۱۹۰۰ء میں حیدرآباد میں ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ مخطوطہ امیر کے خاندان والوں میں سے کسی ایک نے داخل کتب خانہ کیا ہو۔ میں نے منشی امیر مینائی کے قریبی عزیز مولوی مہتاج الدین مینائی صاحب (رام پور) سے دریافت کیا تو انھوں نے اس امر سے لاعلمی ظاہر کی کہ یہ مخطوطہ کب اور کس طرح لائبریری میں آیا۔

میں نے استادِ محترم، مولانا عرشی صاحب ڈائرکٹر رضا لائبریری سے جب دریافت کیا کہ یہ مخطوطہ کس کے ہاتھ کا تحریر کردہ ہے تو انھوں نے یہ فرمایا کہ ممکن ہے اسے میر عوض علی خطاط نے لکھا ہو جو نواب یوسف علی خاں مرحوم کے عہد میں لکھنؤ سے رام پور آئے تھے۔ میں نے مولانا کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر ایسے کچھ مخطوطے لائبریری میں ہوں جنھیں میر عوض علی نے تحریر کیا ہو اور جن کی مزید تصدیق کی ضرورت نہیں تو ان سے اس مخطوطے کا مقابلہ کر کے پتہ چل سکتا ہے کہ میر عوض علی مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے یا نہیں۔ دو تین دن بعد مولانا نے بہ کمال عنایت کئی ایسے مخطوطوں کی نشان دہی فرمائی جو میر عوض علی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ ان مخطوطات میں ایک بیاض نواب یوسف علی خاں کی غزلیات کی بھی ہے۔ جب مخطوطہ زیرِ بحث کو ان مخطوطات سے ملایا گیا تو یقین ہو گیا کہ یہ مخطوطہ میر عوض علی کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ چونکہ میر عوض علی مرحوم کی اولادوں میں ابھی چند دن پیشتر تک سید عظمت علی مرحوم جو میر عوض علی کے پر پوتے تھے، رام پور میں رہتے تھے، اس لیے یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ یہ مخطوطہ میر عوض علی کے خاندان والوں ہی میں کسی نے لائبریری کو پیش کیا ہو یا لائبریری کے ہاتھ فروخت کیا ہو۔ اگر لائبریری میں اس کا التزام کیا گیا ہوتا کہ جو کتاب جس جگہ سے اور جس شخص سے اور جس طریقے سے حاصل کی گئی ہو اس کا بھی رجسٹر اندراجات میں اندراج کر دیا جائے تو بہتر ہوتا۔

متذکرہ مخطوطے میں جس جگہ یہ غزل درج کی گئی ہے اس سے پہلے یہ عبارت ملتی ہے: "بسمل تیغ آرزوئے پابوس شہنشاہ گردوں سریر، امیر احمد متخلص بہ امیر" نثر کی ساری عبارت مقفیٰ اور مسجع ہے اور متذکرہ غزل درج ذیل ہے:

کس گل تازہ کا ہے دربار قیصر باغ میں
پھول کر ٹوپی، ہوئی دستار قیصر باغ میں

کس کے، چمکے، چاند سے رخسار قیصر باغ میں
چاندنی ہے سایۂ دیوار قیصر باغ میں

کس نے تانے ابروئے خم دار قیصر باغ میں
چل رہی ہے حسن کی تلوار قیصر باغ میں

کیا صفا ہے اس زمیں کی، پاؤں کا مذکور کیا
دل پھسلتا ہے دم رفتار قیصر باغ میں

بند جو ٹوٹے، شکستِ توبہ کی آئے صدا
لیں اگر انگڑائیاں مے خوار قیصر باغ میں

نہر میں موجیں ہیں انگشتِ اشارت اس لیے
سب کا ہو جائے گا بیڑا پار قیصر باغ میں

گل سمجھ کر نقشِ پا پر بلبلیں دیتی ہیں جان
پاؤں رکھنا ہو گیا دشوار قیصر باغ میں

کوئی گل، تا نہ، نہ بھولے شاہ کی سرکار ہے
گل رخو، اچھی نہیں تکرار قیصر باغ میں

چار نغموں میں ہو سعدی کی گلستاں کا جواب
بلبلیں کھولیں اگر منقار قیصر باغ میں

نخلِ گل ہے ہر تماشائی، یہ ہے فیضِ بہار
پھول جھڑتے ہیں دم گفتار قیصر باغ میں

بن گئے دانے، انارِ گلشن فردوس کے
جگنو آ بیٹھے جہاں دو چار قیصر باغ میں

بک رہے ہیں کوڑیوں کے مول یوسف سے حسیں
چار سو ہے مصر کا بازار قیصر باغ میں

کاٹ لے منقار بلبل، صاف گلچیں ادب
پھول کیا، توڑے جو کوئی خار قیصر باغ میں

اتنے پتے بھی نہ پاؤ گے گلشن فردوس میں
جس قدر پھولوں کے ہیں انبار قیصر باغ میں

تشنگانِ عشق پیاسانِ لبِ شیریں ہیں آج
بٹ رہا ہے شربتِ دیدار قیصر باغ میں

کہہ رہی ہے یہ صنوبر قامتوں سے فاختہ
آئیے بہرِ خدا، بردار قیصر باغ میں

قطرے شبنم کے رگِ گل پر دکھاتے ہیں بہار
گو ندور ہے پہ موتیوں کے ہار قیصر باغ میں

غنچہ جب چٹکا، تڑپ کر دل نے یہ مجھ سے کہا
آپ رہیے گا ذرا ہشیار قیصر باغ میں

میرے پہلو میں نہ کر، ہمدم، مرے دل کی تلاش
وہ بچا ہوگا کہیں سرشار قیصر باغ میں

دور ہوں گی کلفتیں، مٹ جائیں گی سب کاوشیں
لالہ ہے بے داغ، گل بے خار قیصر باغ میں

ناز کیوں کر ہو نہ مجھ کو اپنے طالع پر امیرؔ
رشکِ قیصر کا ہوا دیدار قیصر باغ میں

مخطوطے کے غالباً آخر میں جہاں نثر تمام ہوئی ہے یہ شعر درج ہے :

شعر : جو مدح باغ ہو، بر باد ہو
کوئی لہو، گلچیں ہو یا صیاد ہو

پروفیسر ابو محمد سحرؔ کے بقول مخطوطے کی غزل میں بعد میں امیرؔ مینائی نے بعض جگہ ترمیمات کی ہیں۔ صنم خانۂ عشق میں جو بیس اشعار شامل ہیں ان میں بقول پروفیسر سحرؔ کے "صرف سات اشعار اپنی اصلی حالت پر ہیں یعنی ان میں اور نثر در تعریف قیصر باغ" کے اشعار میں کوئی فرق نہیں ہے۔ باقی اشعار میں دس نئے شعر بڑھائے گئے ہیں اور تین میں لفظی رد و بدل کیا گیا ہے۔ جن اشعار میں لفظی ترمیم کی گئی ہے وہ یہ ہیں۔

(نثر)
کیا صفائی اس زمیں کی، پاؤں کا نہ کور کیا
دل پھسلتا ہے دمِ رفتار قیصر باغ میں

(صنم) پاؤں کا یاں ذکر کیسا، صاف ہے ایسی زمیں
دل پھسلتے ہیں دمِ رفتار قیصر باغ میں

(نثر) نہر میں موجیں ہیں انگشتِ اشارت اس لیے
سب کا ہو جائے گا بیڑا پار قیصر باغ میں

(صنم) یہ اشارہ نہر میں کرتی ہے ہر انگشتِ موج
سب کا ہو جائے گا بیڑا پار قیصر باغ میں

(نثر) نخلِ گل ہے ہر تماشائی، یہ ہے فیضِ بہار
پھول جھڑتے ہیں دمِ گفتار قیصر باغ میں

(صنم) نخلِ گل ہے ہر تماشائی تو ہے فیضِ بہار
پھول جھڑتے ہیں دمِ گفتار قیصر باغ میں

ترمیم و تنسیخ اور حذف و اضافے کا عمل ہر قابلِ ذکر شاعر کے یہاں ملتا ہے۔ یہ صرف امیرؔ کی خصوصیت نہیں ہے۔ اقبال کے مشہور "ترانۂ ہندی" میں بھی یہ صورتِ حال ملتی ہے۔ رضا لائبریری (رامپور) کی INSPECTION BOOK میں صفیؔ لکھنوی اور جوشؔ ملیح آبادی کے منظوم معائنے درج ہیں۔ ان میں سے جوشؔ کی نظم ان کے کسی شعری مجموعے میں بہت سی ترمیموں کے بعد "ایک مشرقی کتب خانہ" کے عنوان سے شامل ہے۔ اس میں رضا لائبریری کا ذکر نہیں ہے۔

جوشؔ ملیح آبادی اور صفیؔ لکھنوی مرحوم بہ یک وقت نواب رضا علی خاں بہادر مرحوم کے خاص باغ پیلس میں مہمان تھے۔ اور یہ منظوم معائنے غالباً فی البدیہہ اسی زمانے میں لکھے گئے۔



لہ "مطالعۂ امیرؔ" مصنفہ ڈاکٹر ابو محمد سحرؔ، ص ۱۲۸-۱۲۹

قاسم صہبا جمیلی
فلیٹ ۵ عدالت گنج پٹنہ ۱

علّامہ جمیل مظہری

حیف صد حیف کہ وہ خسرو معنی نہ رہا
دم بخود سازِ سخن ہے کہ مُغنّی نہ رہا
چمنِ شعر و ادب پر ہے کہا سا اے دوست
پاسباں اس کا جو تھا آج وہ مالی نہ رہا
شاعری نوحہ کناں ہے کہ سخندانی میں
مظہری غیرتِ خاقانی و جامی نہ رہا
زندگی جس کی تجسس تھی بقول اخترؔ[1]
اعتبارات کا وہ شاہد عینی نہ رہا
شاعری جس کی تھی آئینۂ تفسیرِ حیات
وہی شاعر نہ رہا زیست کا شاکی نہ رہا
روشِ عام سے کچھ ہٹ کے نکالی تھی راہ
نقش پا رہ گئے وہ راہ کا راہی نہ رہا
ناز جس پر تھا اصولوں کو وہ ہستی نہ رہی
زندگی! آج وہ کردار کا غازی نہ رہا
جا ملا تارِ نفس ٹوٹ کے اپنے رب سے
عالمِ خاک میں وہ بندۂ خاکی نہ رہا
غمِ دوراں میں غمِ دل کو ڈبونے والا
خلق و ایثار و مروّت کا وہ حامی نہ رہا
خاک اڑاتے رہو صحرائے سخن میں جہجاؔ
نقشِ منزل جو دکھائے گا وہ ہادی نہ رہا

---

[1] ڈاکٹر اختر اورینوی

جعفر عسکری
۱ نوراللہ روڈ
الہ آباد ۳

مجاہدِ لوح و قلم

(مرحوم ساغر مہدی کی نذر)

مرے قبیلے کا وہ مجاہد
جو شہرِ جاں سے گیا ہے سوئے عدم، تو کیا غم
کہ سلسلے ٹوٹتے نہیں ہیں یوں ہجرتوں سے قرابتوں کے
علامتیں جسم و جاں کی باقی رہیں نہ پھر بھی
ورق ورق پر نقوشِ فکر و سخن ہیں اُس کے ہنوز تازہ
فصیلِ فن پر کھلا ہے اُس کے جنوں کا پرچم
حروفِ سادہ میں اُس کے پنہاں ہے جہدِ پیہم کی اک کہانی
جہاد تھی اُس کی زندگانی
جہاد ہی سے ملی تھی اُس کو شکستہ لمحوں میں کامرانی
بساطِ لوح و قلم ہے جب تک
جہاد قائم رہے گا پیہم
وہ شہرِ جاں سے گیا ہے سوئے عدم، تو کیا غم!

محمد اسحاق صدیقی
ایم اے۔ گوئن تالاب لکھنؤ

نئی دنیا سے کیا آیا؟

کتنے ہی ایسے پھل اور ترکاریاں ہیں، جن کے بارے میں کبھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ بدیسی ہوں گی لیکن اگر آپ زیادہ نہیں صرف پانچ سو سال پہلے ہندستان میں پیدا ہوتے تو بہت سے لذیذ پھلوں اور ترکاریوں کی لذت سے محروم ہوتے۔ کیونکہ قدرت کے یہ تحفے امریکا سے مخصوص تھے اور نئی دنیا کی دریافت کے بعد ہی ان کا پرانی دنیا میں رواج ہوا۔

۱۴۹۲ء میں مشہور اطالوی سیاح کولمبس (COLUMBUS) اسپین سے مغرب کی طرف ہندستان پہنچنے کے لیے بحری راستے کی تلاش میں روانہ ہوا لیکن ہندستان پہنچنے کے بجائے اتفاق سے امریکا پہنچ گیا، جس کا اس وقت تک کسی کو پتہ نہ تھا۔ اسی لیے اسے "نئی دنیا" کہا گیا۔

جیسے ہی یورپ یہ خبر پہنچی کہ مغرب کی طرف بڑے بڑے نامعلوم ملک ہیں تو اسپین اور پرتگال کے مہم جو ملاح اپنے اپنے ملکوں کے لیے نئی نئی سرزمینوں کا سراغ لگانے اور وہاں کی دولت بٹورنے کے لیے نکل پڑے۔ ان دو ملکوں کی بڑھتی ہوئی رقابت کے پیش نظر عیسائی دنیا کے رہنماے اعظم پوپ کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ اسپین مغرب میں اور پرتگال مشرق میں نئے ملکوں کی تلاش کرے گا۔

نئی دنیا میں اسپین والوں کی پیش قدمی کی مختصر داستان یہ ہے کہ ۱۵۱۹ء میں کارٹیز (CORTES) میکسکو پہنچا اور وہاں کے مقامی حکمراں کو شکست دے کر اس کے ملک پر قبضہ کر لیا۔ ۱۵۲۷ء میں پزارو (PIZZARO) نے پیرو پر قبضہ کر لیا۔ رفتہ رفتہ پورے وسطی امریکا اور جنوبی امریکا پر (برازیل کو چھوڑ کر) اسپین والوں کا قبضہ ہو گیا۔

مغرب کے بعد اب مشرق کا حال سنیے۔ ۱۴۸۸ء میں پرتگیز سیاح ڈیاز (DIAZ) نے افریقہ کے مغربی ساحل کا جائزہ لیا اور جنوبی افریقہ کے سرے یعنی راس امید (CAPE OF GOOD HOPE) تک پہنچ گیا۔ آگے بڑھتے ہوئے وہ ایک طوفان میں ہلاک ہو گیا۔ جس کام کو اس نے ادھورا چھوڑا تھا۔ اسے واسکوڈاگاما (VASCODAGAMA) نے پورا کیا۔ وہ راس امید سے ہوتا ہوا ۲۰ مئی ۱۴۹۸ء کو ہندستان کے مشہور بندرگاہ کالی کٹ پہنچ گیا۔ وہاں کے ہندو راجہ نے جس کا خاندانی نام زمورن (ZAMORIN) تھا۔ اس کا استقبال کیا۔ اس طرح ہندستان اور پرتگال والوں میں دوستانہ اور تاجرانہ تعلقات کی بنیاد پڑی۔ اس سے پہلے مغربی ملکوں سے جو تجارت سمندری راستے سے ہوا کرتی تھی، وہ عربوں کے ہاتھ میں تھی۔ رفتہ رفتہ پرتگیزوں نے اپنے بہتر جنگی جہازوں اور بحری جنگ میں مہارت کی بدولت بحر ہند میں عربوں کی جگہ لے لی۔

ہندستان میں پرتگیزوں کے اثر کو پائیدار بنانے میں البوقرق (ALBUQUERQUE) کا بڑا ہاتھ تھا۔ وہ پہلے پہل ۱۵۰۲ء میں جنگی جہازوں کے ایک دستے کے کمانڈر کی حیثیت سے آیا تھا۔ اس کی اعلیٰ کارکردگی سے متاثر ہو کر پرتگالی حکومت نے اسے ۱۵۰۹ء میں ہندستان میں اپنا گورنر مقرر کیا۔ نومبر ۱۵۱۰ء میں

اس نے سلطان بیجاپور کے مالدار بندرگاہ گوا پر قبضہ کر لیا اور وہاں قلعہ تعمیر کر کے پرتگالی حکومت کی بنیاد ڈال دی۔ وہ مشرق میں پرتگیزی سلطنت بنانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کی یہ پالیسی تھی کہ پرتگیز مرد ہندستانی عورتوں سے شادی کریں تاکہ وفادار رعایا کا جنم ہو۔ اس نے ملکا (MALACCA) پر قبضہ کر لیا تاکہ جزیرے نما ملایا پر اقتدار قائم ہو اور مسالوں کی پیداوار کے جزیروں، جاوا، سماترا، بورنیو وغیرہ نیز چین تک رسائی میں آسانی ہو۔

۱۵۱۵ء میں البوقرق کا انتقال ہو گیا۔ اس کے جانشین رفتہ رفتہ ہندستان کے مغربی ساحل پر قابض ہو گئے۔ انھوں نے گوا (GOA) ڈامن (DAMAN) ڈیو (DIU) سالسیٹ (SALSETTE) بے سین (BASSEIN) چول (CHAUL) اور بمبئی میں تجارتی کوٹھیاں اور قلعے تعمیر کر لیے۔ مشرقی ساحل پر مدراس کے پاس سین تھومے (SAN-THOME) اور بنگال میں ہگلی میں انھوں نے اپنی تجارتی کوٹھیاں بنا لیں۔ لنکا کے بیشتر ساحل پر بھی ان کا قبضہ تھا۔

پرتگیزیوں نے ایک بڑی غلطی یہ کی کہ ملک کی اندرونی سیاست میں دخل دینے لگے، مذہب کے نام پر ظلم و ستم کرنے لگے، لوگوں کو زبردستی عیسائی بنانا اور غلام بنا کر بیچ دینا ان کا معمول ہو گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقامی آبادی میں نفرت، خوف اور بے چینی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ شاہجہاں نے بنگال کے گورنر قاسم علی خاں کو پرتگیزوں کی سرکوبی کا حکم دیا۔ اس نے پرتگیزوں کو شکست دے کر ۱۶۳۲ء میں ہگلی پر قبضہ کر لیا۔ اس دوران مرہٹے بھی عروج حاصل کر رہے تھے۔ انھوں نے ۱۷۳۹ء میں سالسیٹ اور بے سین پر حملہ کر کے انھیں پرتگیزیوں کے چنگل سے آزاد کرا لیا اور انگریز، ڈچ، ڈین اور فرنچ تاجر بھی مقابلے پر آ چکے تھے۔ ہندستان میں ان کی اپنی اپنی الگ تجارتی کوٹھیاں اور قلعے تھے۔ فوجیں تھیں، جہازی بیڑے تھے۔ وہ بھی ہندستان کو آہستہ آہستہ اپنے چنگل میں لینے کی فکر میں تھے۔ ان کا بھی پرتگیزوں سے مقابلہ ہوا۔ رفتہ رفتہ اٹھارہویں صدی تک ہندستان سے بحری راستے سے ہونے والی تجارت میں پرتگیزوں کی بالادستی ختم ہو گئی۔ صرف گوا، ڈامن اور ڈیو پر ان کا قبضہ رہ گیا اور ۱۹۶۱ء میں ہماری حکومت نے وہاں سے بھی انھیں نکال باہر کیا۔

بہرحال اپنے تین سو سالہ بحری اقتدار کے زمانے میں انھوں نے ہندستانیوں پر جو ظلم و ستم کیے اس سے تاریخ ہند کے طالب علم بخوبی واقف ہیں۔ لیکن انھوں نے امریکا میں پیدا ہونے والے پھلوں اور ترکاریوں کو ہندوستان میں رائج کر کے ہم پر جو احسان کیا اسے بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ اس احساس نے مجھے یہ مضمون لکھنے پر آمادہ کیا۔ تو لیجیے ملاحظہ ہو نئی دنیا کے لذیذ تحفوں کی مختصر تاریخ اور ان کے ناموں کی دلچسپ داستان۔

۱۔ مکا۔ اسے انگریزی میں میز (MAIZE) کہتے ہیں، جو ہسپانوی زبان کے لفظ میز (MAIZ) کی بدلی ہوئی صورت ہے ہسپانوی میں یہ لفظ ویسٹ انڈیز کی ہائٹی زبان (HAITIAN) سے پہنچا ہے۔

مکا کا اصلی وطن جنوبی امریکا کا اینڈیز (ANDES) کا علاقہ ہے، جہاں سے اس کا رواج پہلے وسطی امریکا میں اور پھر شمالی امریکا میں ہوا۔ پرانی دنیا کے لوگوں کو نئی دنیا کا یہ سب سے اہم تحفہ ہے ۵ر نومبر ۱۴۹۲ء کو دو ہسپانوی سیاحوں نے جنھیں کولمبس نے کیوبا کے اندرونی علاقوں کی چھان بین کے لیے بھیجا تھا، اسے آکر بتایا کہ وہاں کے لوگ میز کھاتے ہیں جو کھانے میں لذیذ ہوتی ہے، پکائی جاتی ہے، سکھائی جاتی ہے اور اس کا آٹا پیسا جاتا ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ چلی سے کناڈا تک امریکی ہندی اس کی کاشت کرتے تھے۔ یہ ان کی خاص غذا تھی۔ امریکا کی دو عظیم تہذیبوں کے بانی وسطی امریکا کے ازٹیک (AZTEC) اور جنوبی امریکا میں پیرو کے انکا (INCA) مکا ہی کھاتے تھے۔ اس کے بیج کولمبس اور اس کے ساتھی اسپین لے گئے اور ساٹھ سال کے اندر مکا کا رواج شمال میں ناروے، سویڈن سے لے کر جنوب میں کیپ آف گڈ ہوپ (افریقہ) تک اور مغرب میں یورپ سے لے کر مشرق میں چین تک ہو گیا

ہندستان میں مکا پرتگیز لوگ لائے۔ مکا کی وجہ تسمیہ نامعلوم ہے۔ ہوسکتا ہے یہ لفظ میزبی کے بگاڑ سے بنا ہو۔

مکا کو بڑی جوار بھی کہتے ہیں اور چھوٹی جوار کو مکئی۔ لیکن دونوں میں بڑے چھوٹے ہی کا فرق نہیں ہوتا بلکہ دونوں مختلف قسم کے پودے ہیں۔ مکے کی بالیوں کو بھٹا کہتے ہیں

۲۔ آلو: ہماری غذا کا ضروری جز ہے۔ جتنا یہ لذیذ اور مقوی ہوتا ہے اتنی ہی دل چسپ اس کی کہانی ہے۔ آلو کا وطن جنوبی امریکا کا اینڈیز کا علاقہ ہے، جہاں سے اس کا رواج پہلے وسطی امریکا میں اور پھر آس پاس کے جزیروں میں ہوا۔ ویسٹ انڈیز کی زبانوں میں آلو کو بٹاٹا (BATATA) کہتے ہیں۔ اس نام کو پرتگیز سیاحوں نے اپنا لیا اور مختلف ملکوں میں پھیلا دیا۔ چنانچہ بمبئی میں آج بھی آلو کو بٹاٹا کہا جاتا ہے ہسپانوی زبان میں یہ لفظ بگڑ کر پٹاٹا (PATATA) ہوگیا اور انگریزی میں جا کر پوٹیٹو (POTATO) بن گیا۔

آپ کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ آلو (आलू) سنسکرت زبان کا لفظ ہے لیکن سوال یہ ہے کہ جب قدیم ہندستان میں آلو نہیں ہوتا تھا تو اس کا نام کہاں سے آگیا۔ پہلے چیز ہوتی ہے پھر اس کا نام رکھا جاتا ہے۔ چیز غائب نام موجود، آخر یہ کیا پہیلی ہے؟

ہندستانی الفاظ کی تحقیق سے متعلق دل چسپ کتاب "ہابسن جابسن (HOBSON-JOBSON) کے مولفین کے مطابق "آج یہ لفظ ہندستانی اور دوسری بولیوں میں "پوٹیٹو" کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

لیکن کہتے ہیں کہ اس قدیم سنسکرت لفظ کے معنی ایرم کیمپانولیٹم (ARUM-CAMPANULATUM) نامی خوردنی جڑ کے تھے۔ "یہ زمین کند کا لاطینی نام ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آلو پہلے کسی دوسری چیز کا نام تھا اور بعد میں اس سے چھن کر باہر سے آئے ہوئے آلوؤں کے لیے استعمال ہونے لگا۔ لیکن یقین کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ خوردنی جڑ "زمین کند" تھی یا کچھ اور۔ اس سلسلے میں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ فارسی زبان میں مختلف پھلوں کے ناموں کے آخر میں لفظ آلو پایا جاتا ہے، جیسے زردآلو، شفتالو، آلوبخارا، آلوچہ، وغیرہ لیکن خود آلو کو فارسی زبان میں "سیب زمینی" کہتے ہیں۔ غالباً یہ ارتھ ایپل (EARTH APPLE) کا ترجمہ ہے جو پرانی انگریزی میں آلو کا نام تھا۔ اس سلسلے میں آلو کے عربی نام بھی قابل غور ہیں۔ پہلے آلو کو تفاح الارض کہتے تھے جو سیب زمینی کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ جدید عربی میں آلو کو بطاطا یا بطاطس کہتے ہیں جو قدیم امریکی نام بٹاٹا کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں۔

۳۔ شکر قند: جب امریکا دریافت ہوا تو شکر قند میکسکو کے لوگوں کی خاص غذا تھی۔ شکر قند ویسٹ انڈیز سے یورپ ۱۵۲۶ء میں پہونچی۔ ہندستان میں اس کا رواج کب ہوا یہ بتانا مشکل ہے۔ اسے انگریزی میں سویٹ پوٹیٹو (SWEET POTATO) یعنی "میٹھا آلو" کہتے ہیں۔ ہسپانوی زبان میں اسے بٹاٹا کہتے ہیں۔

فرہنگ آصفیہ کے مطابق شکر قند کی اصلی صورت "شکر کند" ہے۔ شکر معلوم، کند ہندی زبان میں خوردنی جڑ کو کہتے ہیں (جیسے زمین کند، کندمول) گویا پورے نام کے معنی ہوئے "میٹھی جڑ" اور یہ اسم بامسمیٰ ہے۔

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ آلو اور شکر قند میں کافی مشابہت ہونے کے باوجود علم نباتات کی رو سے دونوں میں کوئی تعلق نہیں۔ شکر قند مارننگ گلوری (MORNING GLORY) کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور آلو ٹماٹر کا قریبی رشتہ دار ہے۔

۴۔ ٹماٹر: آلو کی طرح ٹماٹر کا وطن بھی جنوبی امریکا ہے اور غالباً پیرو کے لوگوں نے سب سے پہلے اس کی کاشت شروع کی تھی۔ کولمبس کی دریافت امریکا سے پہلے یہ شمالی اور جنوبی امریکا میں دور دور تک پھیل چکا تھا۔

ٹماٹر کو انگریزی میں ٹومیٹو (TOMATO) کہتے ہیں۔ اور ہسپانوی میں ٹومیٹے (TOMATE)۔ یہ لفظ ناہواٹل (NAHUA) زبان کے لفظ ٹوماٹل (TOMATL) یا ٹوماٹل کی

(TOMATL) کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ اور یہ نام ہندی کی ٹماٹر سے قریب تر ہے۔ کیونکہ آوازیں آپس میں بدلتی رہتی ہیں۔

ناہوا ان زبانوں میں سے ایک تھی جسے میکسکو کے ازتیک لوگ بولتے تھے۔ یہ قوم ایک اعلا تہذیب کی حامل تھی جسے اسپین والوں نے زیر کرکے ان کے ملک پر قبضہ کر لیا۔

اسپین والوں کے ذریعہ پہلے یورپ میں زرد رنگ کے ٹماٹروں کا رواج ہوا۔ وہاں کے لوگوں نے اس کے بڑے دل پسند نام رکھے سب سے پرانا نام جو اطالوی زبان کی ایک کتاب (مطبوعہ ۱۵۵۴ء) میں پایا جاتا ہے گولڈن ایپل (GOLDEN APPEL) یعنی "سنہرا سیب" ہے۔ فرانس میں ۱۷۰۰ء میں اسے لو ایپل (LOVE APPLE) یعنی "سیب محبت" کہتے تھے۔

پہلے اسے باغوں اور پارکوں میں محض آرائش کے لیے لگایا جاتا تھا۔ چونکہ یہ ڈیڈلی نائٹ شیڈ (DEADLY NIGHTSHADE) کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ جو ایک زہریلا پودا ہوتا ہے۔ اس لیے کوئی اسے کھانے کی ہمت نہ کرتا تھا۔ انیسویں صدی کے آغاز تک لوگ اسے زہریلا سمجھتے رہے۔ آخر کار کسی بہادر شخص نے اسے کھانے کی ہمت کی اور جب وہ اسے کھا کر مرا نہیں تو دوسرے لوگ بھی کھانے لگے اور رفتہ رفتہ ساری دنیا میں اس کا استعمال عام ہو گیا۔

یورپ میں ٹماٹر کا رواج سولہویں صدی میں ہوا تھا لیکن بڑے پیمانے پر کاشت انیسویں صدی سے شروع ہوئی ہندستان میں اس کا رواج پرتگیزوں کے ذریعہ ہوا۔

۵۔ کدو: لوکی اور کدو ایک ہی خاندان کے پودے ہیں۔ دونوں کی بیلیں ہوتی ہیں۔ البتہ پھول اور پھل مختلف ہوتے ہیں۔

لوکی کے پھول سفید ہوتے ہیں اور کدو کے پیلے۔ غالباً لوکی پرانی دنیا کا پودا ہے اور کدو "نئی دنیا کا"۔ کدو کا وطن شمالی میکسکو اور شمالی امریکا کا مشرقی حصہ ہے۔ جب یورپ کے لوگ پہلے پہل امریکہ پہنچے تو وہاں کے لوگوں نے ان کی کدو سے ضیافت کی۔

انگریزی میں کدو کو پمپکن (PUMPKIN) کہتے ہیں۔ ہندی میں اس کے کئی نام ہیں۔ مثلاً سیتاپھل، کاشی پھل، کاشی پھل، لوکا اور کمہڑا۔ کدو فارسی لفظ ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ قدیم میں ایران میں جس کدو کا رواج تھا، وہ گول لوکی سے مشابہ کوئی چیز تھی۔ اور بعد میں امریکی کدو نے اس کی جگہ لے لی لیکن نام پرانا ہی برقرار رہا۔

۶۔ لال مرچ: انگریزی میں مرچ کو پیپر (PEPPER) کہتے ہیں اور عربی میں فلفل۔ دونوں کا تعلق سنسکرت پپلی یا پپلی سے ہے۔ دراصل عرب تاجروں نے ہندستان سے جو مرچ یورپ پہنچائی وہ گول یا کالی مرچ تھی۔ اس کا لال مرچ سے کوئی تعلق نہیں۔ دونوں کے پودے مختلف خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

لال مرچ کا وطن جنوبی امریکا ہے۔ شمالی پیرو کے کسان کم سے کم ساڑھے تین ہزار سال پہلے اس کی کاشت کرتے تھے اس کی تین قسمیں تھیں: ہری، زرد، اور لال۔ ذائقے دو تھے۔ میٹھی اور کڑوی۔ جب کولمبس ویسٹ انڈیز پہنچا تو وہاں کے لوگ اپنی مرچوں کا استعمال کرتے تھے۔ کولمبس ان مختلف اقسام کی مرچوں کے بیج اپنے ساتھ یورپ لے گیا۔ اسپین میں امریکی مرچ کا ۱۴۹۳ء میں رواج ہوا۔ انگلستان میں ۱۵۴۸ء میں اور وسطی یورپ میں ۱۵۸۵ء تک یہ مرچ عام ہو گئی۔ سترھویں صدی میں پرتگیز لوگ امریکی مرچ کی تینوں قسمیں (لال، ہری اور زرد) ہندستان لائے اور جنوبی ایشیا کے دوسرے ملکوں میں لے گئے۔

سرخ مرچ کو چلی (CHILLI) بھی کہتے ہیں۔ یہ دراصل ازتیک لوگوں کی زبان ناہواتل (NAHUATL) کا لفظ ہے اس کی وجہ تسمیہ نامعلوم ہے۔ ہوسکتا ہے اس کا نام جنوبی امریکا کے ملک چلی (CHILI) کے نام پر پڑا ہو۔

۷۔ انناس: کولمبس کی دریافت امریکا سے پہلے امریکی ہندیوں میں یہ ایک مقبول عام پھل تھا۔ اس کا پیراگوئے سے میکسکو تک رواج تھا۔ اسے ہسپانوی اور

پرتگیزی سیاحوں نے یورپ اور اپنی نو آبادیوں میں پھیلا دیا۔ ہندستان میں ۱۵۴۸ء تک اس کی پیداوار شروع ہو چکی تھی۔

برازیل کی زبان میں اسے ننا (NANA) یا ناناس (NANAS) کہتے تھے۔ جنوبی امریکا سے جہاں جہاں یہ پھل گیا، وہاں اس کا نام بھی پہنچا، سوائے انگلستان کے۔ چنانچہ انگریزی میں اس کا نام پائین ایپل (PINE APPLE) ہے کیونکہ اس کی بیرونی سطح پائین کون (PINE CONE) یعنی پائین کے پھل سے مشابہ ہوتی ہے۔

ہندستان میں اس کا رواج پرتگیزوں کے ذریعہ ہوا۔ پرتگیزی میں اسے اناناس (ANANAS) یا آناناز (ANA NAZ.) کہتے ہیں۔ ہندستان میں یہ انناس کے نام سے مشہور ہوا۔

آئین اکبری سے معلوم ہوتا ہے کہ (تقریباً ۱۵۹۰ء میں) انناس شہنشاہ اکبر کے دسترخوان پر پیش کیا جاتا تھا۔ ایک کی قیمت چار دام یا روپے کا دسواں حصہ ہوا کرتی تھی۔ جہانگیر نے لکھا ہے کہ انناس ان بندرگاہوں سے آیا کرتا تھا جو پرتگیزوں کے قبضے میں تھے۔

ابوالفضل نے آئین اکبری میں یہ بھی لکھا ہے کہ انناس کو کٹھل سفری کہتے ہیں کیونکہ اس کا پھل کٹھل سے مشابہ ہوتا ہے اور سفر میں اس کے پودے کو گملے میں لگا کر لے جا سکتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر تر و تازہ پھل کام میں لا سکتے ہیں۔ اس سے ہمارا خیال امرود کی طرف جاتا ہے۔ جو کبھی بنگال میں "سفری آم" کہلاتا تھا۔ اور روہیل کھنڈ میں امرود کو اب بھی سفری کہتے ہیں۔

۸۔ امرود۔ امرود کا وطن برازیل ہے اور وہیں سے اس کا رواج دوسرے ملکوں میں ہوا۔ ہندستان میں اسے غالباً پرتگیز لائے لیکن امرود یا امرودت فارسی لفظ ہے۔ اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ امریکا سے ایران آیا تو اس کا یہ نام کیسے پڑا۔ ہو سکتا ہے کہ پہلے یہ امرود سے مشابہ کسی دوسرے پھل کا نام ہو۔ انگریزی میں اسے گوآوا (GUAVA) کہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ جنوبی امریکا کی کسی زبان کا لفظ ہو اور یا پھر اس کا تعلق گوا (GOA) سے ہو سکتا ہے جہاں سے یہ پھل ملک کے دوسرے حصوں میں پھیلا۔ چنانچہ تامل میں امرود کو گویاپلم (گوا کا پھل) اور تلگو میں گوواپلم کہتے ہیں۔ بنگلہ میں اس کو گوا آچی پھل کہتے تھے۔

۹۔ پپیتا۔ ہسپانوی زبان کے لفظ پپیا (PAPAYA) کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ انگریزی میں اس کے دو نام ہیں۔ پپیا اور پاپا (PAW PAW) یہ دونوں نام کاریبی (CARIB) زبان کے الفاظ ہیں۔ کارب ایک قوم تھی جو وسطی امریکا اور جنوبی امریکا کے شمالی حصے میں آباد تھی۔ یہ پھل جنوبی امریکا سے نکلی یا نکن اور ملکا ہوتا ہوا ۱۵۹۸ء میں ہندستان پہنچا۔ ہمارے ملک میں اسے "ارنڈ خربوزہ" بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کے پتے ارنڈ (رینڈی) سے اور پھل کا رنگ، گودا اور ذائقہ خربوزے سے مشابہ ہوتا ہے۔ عربی اور فارسی میں اسے "انبہ ہندی" کہا جاتا ہے۔

۱۰۔ شریفہ۔ اس بارے میں اختلاف ہے کہ شریفہ ہندستان کی اپنی چیز ہے یا باہر سے آیا ہے۔ مشہور ماہر آثار قدیمہ جنرل کننگھم (GENL. CUNNINGHAM) کا خیال تھا کہ شریفہ ہندستان کی اپنی چیز ہے کیونکہ اجنتا کے غاروں اور بھارت کے استوپ میں شریفے کی تصاویر ملتی ہیں۔ علاوہ اس کے ہندستان کے بعض حصوں میں شریفے کے خود رو جنگل پائے جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف ماہرین نباتات کا خیال ہے کہ شریفے کا اصل وطن جنوبی امریکا ہے اور اس کو سولہویں صدی عیسوی میں پرتگیز ہندستان لائے۔

سب سے عمدہ شریفے حیدرآباد دکن کے ہوتے ہیں۔ جہاں اسے سیتا پھل کہا جاتا ہے۔ لیکن اتر پردیش میں سیتا پھل کدو کو کہتے ہیں۔ بعض مقامات پر بیل اور ناریل کو "شری پھل" کہا جاتا ہے۔ میرے خیال میں کبھی شریفے کو بھی شری پھل کہا جاتا ہوگا۔ اس کے ل کو حذف کر کے اور پ کو ف سے بدل کر مسلمانوں نے شریفہ کر دیا۔ یہ عربی لفظ ہے۔ سنسکرت میں شری کے تقریباً وہی معنی ہیں جو عربی شرف اور شریف کے ہیں۔

۱۱۔ رام پھل۔ سیتا پھل (شریفہ) سے ہمارا خیال رام پھل کی طرف جاتا ہے۔ جسے انگریزی میں بلکس ہارٹ (BULLOCKS HEART) کہتے ہیں۔ یعنی

۔ پھل کا وطن ۔ یہ امریکہ ہے ۔ جو کہ اس کی ناپ اور صورت دل کی جیسی اور چھلکے پر اس کا رنگ سرخی مائل بھورا یا سرخی مائل زرد ہوتا ہے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندستان میں پرتگیز لوگ دو نئے پھل ایک ساتھ لائے۔ ایک کا نام رام پھل رکھا گیا اور دوسرے کا سیتا پھل۔ علم نباتات کی رو سے یہ دونوں ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے مقبول عام اور علمی نام یہ ہیں :۔

رام پھل	سیتا پھل (شریفہ)
CUSTARD_APPLE	SUGAR- APPLE
BULLOCK'S HEART	SWEET- SOP
ANNONA RETICU-LATA.	ANNONA SQUA-MOSA.

دونوں کا وطن امریکہ ہے اور غالباً ویسٹ انڈیز سے یہاں آئے ہیں انگریزی ہندی اور انگریزی اردو لغتوں میں عام طور پر کسٹرڈ ایپل (CUSTARD - APPLE) کے معنی "شریفہ" دیے جاتے ہیں اور یہی مشہور بھی ہے۔ نہ جانے یہ غلطی کیسے عام ہو گئی۔ اس سلسلے میں لکشمن پھل کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے جس کا انگریزی نام چیری مویا (CHERI MOYA) ہے۔ یہ شریفہ کا رشتے دار ہے اور امریکہ سے آیا ہے لیکن اس کے رواج کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ اس کی اور شریفے (سیتا پھل) کی قلم سے ایک دوسرا پھل تیار کیا گیا ہے۔ جسے ہنومان پھل کہتے ہیں۔ اب آپ ہی سوچیے کہ جن پھلوں کے نام رام اُن کے مشہور دوں پر ہوں انھیں کون باہر سے آیا ہوا مانے گا۔ لیکن یہ حقیقت ہے۔

۱۲۔ مونگ پھلی :۔ مونگ پھلی کا وطن برازیل (یعنی جنوبی امریکا) ہے۔ جہاں آج بھی اس کی پانچ جنگلی قسمیں پائی جاتی ہیں۔ پرتگیز ملاح مونگ پھلی کو برازیل سے یورپ اور افریقہ لے گئے۔ انھیں کے ذریعہ پندرھویں اور سولھویں صدی میں اس کا رواج ایسٹ انڈیز اور فلپائن میں ہوا۔ ہندستان میں وہ ۱۸۰۰ء کے آس پاس لائے اس کی پھلیاں زمین کے نیچے اُگتی ہیں۔ اس لیے غالباً اس کا نام بھوم پھلی رکھا گیا۔ (بھوم یا بھومی (भूमि)، بھو یا سنسکرت میں زمین کو کہتے ہیں) جو بگڑ کر بوم پھلی ہو گیا۔ (فارسی میں سنسکرت بھوم کے مقابلے پر بوم کے معنی "زمین" کے ہیں) اور چونکہ آواز میں ب اور م آپس میں بدلتی رہتی ہیں۔ اس لیے بوم، موم سے بدل گیا اور موم سے مونگ۔ اس بحث کا خلاصہ یہ ہوا :

بھوم پھلی ــ بوم پھلی ــ موم پھلی ــ مونگ پھلی۔

مونگ پھلی کا مونگ کی دال سے کوئی تعلق نہیں۔ دونوں مختلف قسم کے پودے ہیں۔ انگریزی میں مونگ پھلی کو گراؤنڈ نٹ (GROUND NUT) کہتے ہیں۔ جو بھوم پھلی کا صحیح ترجمہ ہے۔ ظاہر ہے کہ جس بنا پر اس کا نام ہندستانیوں نے رکھا، اسی بنا پر یہ نام انگریزوں نے رکھا۔ اسی لیے دونوں کا مفہوم ایک ہے۔

۱۳۔ کاجو :۔ کاجو کا وطن برازیل ہے، جہاں سے اس کا رواج مشرق اور مغرب کے گرم ملکوں میں پرتگیزوں کے ذریعہ ہوا۔ اسے انگریزی میں کیشو نٹ (CASHEW NUT) کہتے ہیں۔ اس کا ہندی نام کاجو، جنوبی امریکا کی ٹوپی (TUPI) زبان کا لفظ ہے۔ جس میں اسے کاجو (CAJU) یا اکاجو (ACAJOU) کہتے ہیں۔

۱۴۔ سپاٹو یا چیکو :۔ اس پھل کا انگریزی نام سیپوٹا (SAPOTA) یا سیپوڈلا (SAPODILLA) ہے۔ ہندستانی نام سپاٹو غالباً سیپوٹا کی بدلی ہوئی صورت ہے اور انگریزی نام کا ماخذ ہسپانوی زپوٹ (ZAPOTE) ہے جو امریکا کی ناہوا زبان کے لفظ زاپوٹل (TZAPOTL) کا اختصار ہے۔

اس کا نام چیکو کیسے پڑا، یہ بتانا مشکل ہے۔ اس کا وطن میکسکو ہے۔ امرود کی طرح اسے بھی ہندستان کی آب و ہوا اتنی راس آئی کہ لوگ اسے مقامی پھل سمجھتے ہیں۔ یہ پھل دو طرح کے ہوتے ہیں۔ گول اور بیضوی۔ چھلکا باریک اور مٹیالا ہوتا ہے۔ گودا دانے دار اور کافی میٹھا ہوتا ہے۔ لیکن خاص قسم کی مہک آتی ہے۔

کھڑکی کے ساتھ اس کی قلم بھی لگائی جاتی ہے۔ ہندستان میں اس کے پیڑ پھلوں کے لیے لگائے جاتے ہیں لیکن میکسیکو، وسطی اور جنوبی امریکا میں اس کی چھال کا دودھ حاصل کرنے کے لیے لگایا جاتا ہے۔ اس کا دودھ گوند کی طرح چپچپا ہوتا ہے۔ اس گوند کو چکل (CHICLE) کہتے ہیں۔ اس میں شکر اور خوشبو ملا کر چیونگ گم (CHEWING - GUM) بنایا جاتا ہے۔ جسے چکلیٹ (CHICLET) بھی کہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ چیکو لفظ چکل سے ہے رشتہ رکھتا ہو۔

۱۵۔ تمباکو:- ہسپانوی زبان کے لفظ ٹوبیکو (TABACO) کی بدلی ہوئی صورت ہے جس کا انگریزی تلفظ ٹوبیکو (TOBACCO) ہے۔ ہسپانوی میں یہ لفظ وسطی امریکا کی ہائٹی (HAITI) یا کاریب (CARIB) لوگوں کی زبان سے آیا تھا۔ ٹبیکو کو تمباکو سے بدلنے میں غالباً لفظ تامبول کی رعایت ہے۔ سنسکرت میں پان کو تامبول ([illegible]) کہتے ہیں (اسی سے لفظ تنبولی بنا ہے۔ بہ معنی "پان فروش") اور تمباکو پان کا خاص جز ہے۔

جب کولمبس امریکہ پہنچا (۱۴۹۲ء) تو وہاں تمباکو کا عام رواج تھا۔ امریکی ہندی۔ تمباکو کھاتے پیتے اور سونگھتے تھے۔ حد یہ ہے کہ وہاں کے نہایت قدیم قبرستانوں سے پائپ اور سونگھنے کی نلکیاں برآمد ہوئی ہیں۔ جنھیں دوسری زندگی میں استعمال کے لیے مُردوں کے ساتھ دفن کیا گیا تھا۔

تمباکو کی کاشت یورپ میں سب سے پہلے فرانس (۱۵۵۶ء) میں شروع ہوئی۔ اس کے بعد پرتگال (۱۵۵۸ء)، اسپین (۱۵۵۹ء) اور انگلستان (۱۵۶۵ء) میں۔

بہارِ عجم میں مآثرِ رحیمی کے حوالے سے درج ہے کہ ہندستان میں تمباکو یورپ سے پہلے دکن میں آئی اور دکن سے شمالی ہندستان میں اس کا رواج بڑھا۔ (اس تمباکو کو جو ہاتھ سے مل کر کھائی جاتی ہے، سورتی کہتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا رواج سورت سے شروع ہوا تھا۔ جہاں اسے پرتگیزی لوگوں نے رائج کیا تھا۔) شہنشاہ اکبر (۱۵۵۶ء-۱۶۰۵ء) کے زمانے سے اس کا رواج شروع ہوا۔ جہانگیر (۱۶۰۵ء-۱۶۲۷ء) نے اپنی تزک میں لکھا ہے کہ مضر اثرات کی بنا پر میں نے اس کے روک تھام کی کوشش کی اور ایران میں شاہ عباس نے بھی اس کے انسداد کے لیے ایک قانون بنایا لیکن یہ کوششیں رائیگاں ثابت ہوئیں اور تمباکو دن بدن مقبول ہوتی رہی۔ شاہ جہاں کے زمانے (۱۶۲۷ء-۱۶۵۸ء) میں اس کا عام رواج ہو گیا اور بظاہر اس میں کوئی کمی نظر نہیں آتی۔

آخر میں اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ امریکا سے آنے والے کل تحفے اتنے ہی نہیں ہیں اور بھی ہوں گے جن کی تحقیق کا مجھے موقع نہیں ملا۔ اگر آپ کے علم میں ہوں تو براہ کرم مجھے ضرور بتائیے تاکہ منتشر معلومات کو یکجا کرکے عوام کی علم تک رسائی کو آسان بنایا جا سکے۔



حواشی

۱؎ پرتگال کے رہنے والے کو پرتگیز (PORTUGUESE) کہتے ہیں۔ زبان کا نام پرتگیزی ہے۔ اسپین کے باشندے اور زبان کو ہسپانوی (SPANISH) کہتے ہیں۔

۲؎ انگریز (انگلستان کا باشندہ)، ڈچ (ہالینڈ کا باشندہ)، ڈین (ڈنمارک کا باشندہ) فرنچ (فرانس کا باشندہ)۔

۳؎ HOBSON - JOBSON BY COL. HENRY YULE & A.C. BURNELL LONDON: JOHN MURRAY, 1886.

۴؎ فلپائن بھی پرتگیزوں کے ماتحت تھا جہاں وہ وسطی اور جنوبی امریکا فتح کرنے کے بعد پہنچے تھے۔

غزلیں

رضا مظہری
۵۔ سی مندل اسٹریٹ (فلیٹ نمبر ۱)
کلکتہ ۱۶

عیب جوئی کوئی فن ہو جیسے
یہ بھی تنقیدِ سخن ہو جیسے
اُن سے ملنے کی تمنّا ہے نڈھال
اک مسافر کی تھکن ہو جیسے
یونہی رہ رہ کے گماں ہوتا ہے
ان کے ابرو پہ شکن ہو جیسے
آدمی جیسے ہو اک زندہ لاش
زندگی اس کا کفن ہو جیسے
ہم وفا کر کے بھی شرمندہ ہیں
بے وفائی کا چلن ہو جیسے
ہے یہی ان کی اداؤں کا کمال
ان میں بیساختہ پن ہو جیسے
بھٹکتی پھرتی ہیں امیدیں میری
کوئی آوارہ وطن ہو جیسے
کوئی دل درد سے خالی ہی نہیں
یہ جہاں دارِ محن ہو جیسے
محفلِ شعر و سخن کا ہے یہ حال
مجمع زاغ و زغن ہو جیسے
دل میں اب بھی ہے تمنائے یاد ان کی
ایک میٹھی سی چبھن ہو جیسے

شعور بریلوی
معرفت صابر کرانہ مرچنٹ
گولہ گنج
لکھنؤ

میری ایک جنبشِ چشم کا یہ فروغِ حسن کمال تھا
جو تمہارے رُخ سے چھلک پڑا وہ مری نظر کا جمال تھا

تری جستجو میں رواں دواں تھے مری نگاہ کے کارواں
جو قدم قدم پہ تمہارہنما وہ ترا ہی حسنِ خیال تھا

نہ یہ راز کوئی سمجھ سکا جو مری نظر نے سمجھ لیا
کہ خیالِ شامِ فراق سے رخِ آفتاب نڈھال تھا

تری یاد کو غمِ زندگی کی اذیتیں نہ مٹا سکیں
مرے ساغرِ مئے زیست میں ترا عکسِ روئے جمال تھا

تجھے کیا بتاؤں میں ہم نشیں کہ چمن میں گزری ہے کس طرح
یہ سمجھ کہ فصلِ بہار میں مجھے سر چھپانا محال تھا

میں شعورؔ دامِ فریبِ غمِ زندگی کے نہ آسکا
مجھے ان کے غم نے بچا لیا غمِ دوست شاملِ حال تھا

لکچرر شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی۔ لکھنؤ

جنگ آزادی کا ایک سورما: احمد اللہ شاہ شہید

اٹھارھویں صدی عیسوی صرف ہندوستان ہی کے لیے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لیے ایک اہم سیاسی تبدیلی کا زمانہ رہی ہے۔ امریکہ اپنی جنگ آزادی میں کامیاب ہو چکا تھا۔ انقلاب فرانس نے سارے یورپ میں آزادی کی روح پھونک دی تھی۔ اگر کسی کی حالت بدتر تھی تو وہ تھی اسلامی حکومت۔ دولت عثمانیہ تیزی سے تنزلی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ایران میں انتشار پیدا ہو چکا تھا اور ادھر سلطنت مغلیہ آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کی آنکھ بند ہوتے ہی یہاں اتھل پتھل کی وہ فضا پیدا ہوئی کہ الحفیظ الاماں اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ مغل سلطنت جس کا اقتدار کشمیر سے دکن اور بنگال سے کابل و قندھار تک تھا سمٹ کر قلعہ معلی کی چار دیواری میں آ گیا[1]

مغلیہ سلطنت کے انحطاط میں آتے ہی اودھ کا آزادانہ وجود تسلیم کر لیا گیا۔ شاہان اودھ اگرچہ آزاد تھے لیکن مغل شہنشاہ کے وزیر خیال کیے جاتے تھے۔ انگریزوں نے اپنے اثرات سے انھیں دہلی کے حلقے سے آزاد کرنے کی کوشش کی اور غازی الدین حیدر کے بعد ان وزیروں کو "شاہ" کا خطاب دے دیا۔ یہی شاہیت جب ۱۸۰۱ء میں کمپنی کے زیر اثر آئی تو "شاہ" سے "غلام" بن گئی۔ گورنر کلائیو اور وارن ہیسٹنگز کے زمانے میں رشوت اپنے عروج کو پہنچ گئی۔ ان کے ساتھ کمپنی کے ایسے لوگ آنا شروع ہو گئے جو وہاں روٹی کو ترستے تھے یہاں آ کر کھل ناچے اور کمپنی اشرار کی آماجگاہ بن گئی۔ یوں تو انگریز پورا ہندوستان ہڑپنے کے خواب دیکھ رہے تھے لیکن اودھ پر ان کی نظر خاص طور پر تھی اس لیے کہ یہ زمین سونا اگلتی تھی اودھ ہاتھ آ جانے کے معنے تھے کہ پورا ہندوستان ہاتھ آ گیا۔ ملک ناکک سکریٹری گورنر جنرل لکھتا ہے کہ "اودھ ہندوستان کی مشین کا ایسا پرزہ ہے جس کی بدولت ہم بہت سی آفات سے محفوظ رہتے ہیں۔"

۱۷۶۴ء میں انگریزوں کے خلاف بکسر کی جنگ ہوئی جس میں آپسی رشک و حسد سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں نے شجاع الدولہ کو چند شرائط کے ساتھ پیمان دوستی باندھنے پر مجبور کر دیا۔ آصف الدولہ کے عہد میں ریاست بنارس ہاتھ سے نکل گئی وزیر علی اور سعادت علی کے زمانے میں ان کا شکنجہ مضبوط سے مضبوط تر ہو گیا۔ اور واجد علی شاہ کے زمانے میں گویا ان کا خواب پوری طرح شرمندۂ تعبیر ہو گیا۔ ۱۸۵۶ء میں اودھ کے صوبے کا الحاق ہو گیا۔ نئے قوانین اور نئے ایکٹ پاس ہوئے۔ زمینداریاں ضبط ہوئیں۔ لاوا اندر ہی اندر پکنا شروع ہوا۔ لیجسلیٹو کاؤنسل میں عوام کا کوئی آدمی نہ تھا جو عوام کے حالات و جذبات سے گورنمنٹ کو باخبر کرتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طرف سے بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے۔ واجد علی شاہ، کلکتہ جلا وطن کر دیے گئے۔ نواب حضرت محل نے گیارہ برس کے کمسن برجیس قدر کو بادشاہ قرار دے کر انگریزوں سے بڑی جانفشانی سے مقابلہ کیا لیکن ان کے بھی قدم اکھڑ گئے۔ ہر خاص و عام میں جہاد کا جذبہ کارفرما نظر آ رہا تھا۔ ایسے وقت میں مسجد میں بیٹھنے والا غریب علما طبقہ بھی کسی سے پیچھے نظر نہیں آتا۔ اور جب مسلمانوں نے بخت خاں کا یہ فتوی سنا کہ جہاد مسلمانوں پر فرض ہے تو ان میں مذہبی جوش دو نا ہو گیا۔ اور

حضرت محل کی پشت پناہی میں علما و مجاہدین اسلام کی منظم جماعت محمدی جھنڈا لے کر نکل کھڑی ہوئی لیکن ریزیڈنٹ کے حکم سے سب کو گرفتار کر لیا گیا۔ نہ جانے کتنے مجاہدین آزادی کو پھانسی دیدی گئی۔ ان شہید ہونے والے سورماؤں میں تاریخ کے صفحات سے ایک ایسا نام ابھرتا ہے جو بظاہر دنیاوی جاہ و ثروت کا مالک ہے۔ ایک ذی وجاہت شاہی خاندان کا فرد ہے لیکن طبیعتاً ملا صوفی اور درویش صفت ہے جس کا دل علوم باطنی سے منور ہے۔ جو حضرت سید قربان علی شاہ اور محراب شاہ قادری قلندری جیسے مرشدوں کی صحبتوں سے فیض یاب ہو چکا ہے۔ لیکن وہ بخوبی جانتا ہے کہ مجذوب کی صفت ترک دنیا نہیں بلکہ اسی دنیا میں رہ کر علائق دنیاوی سے اپنے کو محفوظ رکھنا ہے۔ اور ایک مجاہد بن کر جینا ہے۔ وہ مجاہد ہے سید احمد علی خاں دلاور جنگ ملقب بہ احمد شاہ، جو نواب سراج الدولہ محمد انوار الدین خاں بہادر فاروقی گوپاموی کے جیالے پرپوتے تھے جو خود بھی فرانسیسیوں کے خلاف جہاد کرتے ہوئے میدان کارزار میں شہید ہونے کی ابتدا کر چکے تھے۔ آپ کے پردادا گوپامؤ (اودھ) ضلع ہردوئی کے رہنے والے تھے جو بعد کو ارکاٹ میں جا کر بس گئے تھے۔

احمد اللہ شاہ بمقام مدراس پیدا ہوئے۔ آپ کی صحیح تاریخ پیدائش کا علم نہیں ہو سکا لیکن چونکہ شہادت کے وقت آپ کی عمر تقریباً ستر سال تھی لہذا گمان غالب ہے کہ آپ $\frac{\text{۱۲۰۲ھ}}{\text{۱۷۸۸ء}}$ یا $\frac{\text{۱۲۰۴ھ}}{\text{۱۷۸۹ء}}$ کے درمیان پیدا ہوئے ہوں گے۔ آپ کے والد محمد علی نواب والا جاہ صوبہ کرناٹک پایاں گھاٹ کے صوبہ دار تھے۔ والدہ کا انتقال آپ کی پیدائش کے وقت ہی ہو گیا تھا چنانچہ آپ نے اپنی پھوپھی نواب ملکۃ النساء بیگم کی آغوش میں تربیت حاصل کی پانچ برس کی عمر میں بسم اللہ کی رسم ادا ہوئی۔ آپ نے کن کن اساتذہ سے کسب فیض کیا یہ نہ معلوم ہو سکا۔ فن سپہ گری کی بھی تعلیم حاصل کی۔ آپ انگریزی بھی لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے تھے جیسا کہ ڈپٹی کمشنر فیض آباد کی ایک رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ "وہ (مولانا احمد اللہ شاہ) انگریزی بولتا اور سمجھتا ہے اگرچہ انگریزی ناقص ہے"۔ تقریباً سولہ سال کی عمر میں آر [illegible]

شاہ جارج سوم شاہ انگلستان سے آپ کے والد کے دوستانہ تعلقات تھے اسی لیے حیدرآباد سے لندن کا سفر کیا طبیعت ابتدا ہی سے مائل بہ درویشی تھی چنانچہ جب وہاں ملکہ وکٹوریہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تو حکمراں نے خوش ہو کر مدراس کی حکمرانی دینا چاہی۔ آپ نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ یہ احسان سیم و زر لے کر کون گلے میں طوق فرمان ڈالے۔ حجاز اور زیارت مقدسہ نیز عراق و ایران کا بھی سفر کیا۔ بادشاہ ایران بھی آپ کو روکنا چاہتے تھے لیکن یہاں بھی فقیری اور درویشی آڑے آئی۔ آپ کو تو وطن کی خاطر سر دینا تھا پھر بھلا ان عیش کوشی و سرمستیوں کی طرف طبیعت کیوں کر راغب ہو سکتی تھی چنانچہ آپ واپس اپنے وطن ہندوستان آ گئے۔ گوالیار سے آگرہ ہوتے ہوئے تقریباً [illegible] میں پہلی بار لکھنؤ تشریف لائے اور محلہ گھسیاری منڈی میں قیام پذیر ہوئے یہاں ان کی مجلس وعظ و تبلیغ نے ایسا اثر کیا کہ کیا بوڑھے کیا جوان آپ کے گرد جوق در جوق جمع ہونے شروع ہو گئے۔ اور جب آپ نے کھل کر جہاد کی قیادت کی تو ہر شخص نے آپ کی آواز پر لبیک کہا۔ لکھنؤ مکمل طور پر انگریزوں کی ملکیت میں تھا۔ کوئی شخص ان کے خلاف لب کشائی کی جرأت نہیں کر سکتا تھا حالات کچھ ایسے ناگزیر ہوئے کہ آپ کو اپنے رفقاء کے ساتھ فیض آباد کی طرف رخ کرنا پڑا جہاں آپ سرائے چوک میں قیام فرما ہوئے اور تحریک آزادی کا کھل کر پرچار کرنے لگے۔ آپ اور آپ کے ساتھی آزادانہ اور بے باکانہ ہر گلی کوچہ میں ہتھیاروں سے لیس ہو کر نکل کھڑے ہوئے۔ ڈپٹی کمشنر کو خبر ہوئی۔ ہتھیار ضبط کر لینے کا حکم ہوا۔ ادھر سے مزاحمت ہوئی تو ادھر سے گولیوں کی بوچھار کر دی گئی۔ چند رفقاء شہید ہوئے اور احمد شاہ گرفتار کر لیے گئے۔ سرائے چوک فیض آباد میں آپ کا یہ پہلا خونی معرکہ تھا۔ لفٹننٹ طامس زخمی ہوا۔ احمد شاہ بھی معمولی طور پر زخمی ہوئے اور اپنے دوسرے زخمی ساتھیوں کے ساتھ اپنی ہاسپٹل میں علاج کے لیے داخل ہوئے۔ مقدمہ قائم ہوا، باغی [illegible]

عزت اور وقعت نہ صرف مسلمانوں کے دل میں تھی بلکہ ہندو بھی آپ کے گرویدہ و شیدا تھے چنانچہ پھانسی کا حکم سنتے ہی کیا ہندو کیا مسلمان سبھی مشتعل ہو گئے، اور فیض آباد جیل پر دھاوا بول دیا۔ ۹ جون ۱۸۵۷ء کو ایک غیر مسلم شیدائی نے جیل خانے کا پھاٹک توڑ کر اپنے محبوب لیڈر کو آزاد کروا دیا۔ آپ کا جیل سے باہر آنا تھا کہ عقیدت مندوں کا ہجوم بے قابو ہو گیا اور آپ اس دن سے اہل فیض آباد کے محبوب لیڈر تسلیم کر لیے گئے۔ اس واقعہ کے بعد آپ فیض آباد میں زیادہ دن نہیں ٹھہرے بلکہ راجہ مان سنگھ کو اپنی قیادت سپرد کر کے لکھنؤ کی طرف روانہ ہوئے۔

لکھنؤ میں انگریز سپاہ سے کئی جگہ مڈبھیڑ ہوئی جس میں ۳۰ جون ۱۸۵۷ء کو بمقام چنہٹ اس قدر زبردست جنگی مظاہرہ ہوا کہ انگریزی فوج جو ہتھیاروں سے لیس تھی اپنا تمام جنگی سامان یہاں تک کہ توپیں وغیرہ چھوڑ کر راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوئی۔ اس طرح مع توپوں کے کافی مال غنیمت ہاتھ آیا۔ چنہٹ سے آزادی کے متوالوں کا یہ قافلہ بیلی گارد (ریزیڈنسی) کی طرف بڑھا، جنگی اسلحہ کی کمی کے باعث بھی ان کا دل مادر وطن کی محبت سے ایسا سرشار تھا کہ ہمت نہ ہاری۔ بیلی گارد کے مورچے پر ڈٹے رہے۔ بیلی گارد سے ایسی شدید گولہ باری ہوئی کہ مورخین لکھتے ہیں کہ دریائے گومتی پر بنا ہوا آہنی پل ہل گیا۔ اس کے باوجود بھی ان سپوتوں نے ہمت نہ ہاری ۴ جولائی ۱۸۵۷ء کو اپنے پہلے ہی حملے میں انگریز سپہ سالار چیف کمشنر اودھ مسٹر ہنری لارنس کو اس بری طرح زخمی کیا کہ وہ زخموں کی تاب نہ لا کر چھتیس گھنٹے کے اندر چل بسا۔ مولانا احمد اللہ شاہ بھی اس گولہ باری میں زخمی ہوئے لیکن واہ ری ہمت کہ اپنے ساتھیوں کو اس کا احساس بھی نہ ہونے دیا کہ آپ زخمی ہو گئے ہیں صرف اس لیے کہ کہیں ان کے جیالے ہمت نہ ہار بیٹھیں۔ اسی درمیان جنرل چارلس اوٹرم کانپور سے کمک لے کر آ پہنچا۔ ان تھکے ہارے ساتھیوں نے بمقام عالم باغ جنرل اوٹرم کی تازہ دم فوج کا بڑی دلیری سے مقابلہ کیا، لیکن باوجود بیگم حضرت محل اور ممو خاں کی حوصلہ افزائیوں کے یہ لوگ انگریزی فوج کے شدید ترین گولہ باری پر قابو نہ پا سکے اور آخر کار انھیں یہ مورچہ چھوڑنا پڑا۔ پیچھے کمانڈر ان چیف سر کولن کیمبل کانپور سے اپنی فوج لے کر لکھنؤ آ پہنچا۔ بیگم حضرت محل کے چھکے چھوٹ گئے، اور وہ بونڈی کی طرف روانہ ہونے پر مجبور ہوئیں۔ کرنل ہوپ گرانٹ ان کے تعاقب میں بڑھا لیکن مولانا احمد اللہ شاہ کی جنگی تدابیر اور سوجھ بوجھ کی تعریف کرنا پڑے گی کہ ان کے ایک دستے نے کرنل ہوپ گرانٹ کی جماعت پر پیچھے سے حملہ کر دیا اس لیے اس کی ساری تدابیر پر پانی پھر گیا۔

لکھنؤ میں افراتفری مچی ہوئی تھی۔ گیارہ سالہ کمسن برجیس قدر کو بادشاہ تسلیم کر لیا گیا تھا۔ ممو خاں الگ اپنی سازشوں میں لگا ہوا تھا۔ گولوں میں بارود کی جگہ بُرادے کا بھرا جانا انھیں لوگوں کی سازشوں کا نتیجہ تھا۔ جنگی سامان کا علیحدہ فقدان تھا۔ آپسی پھوٹ بھی کچھ کم نہ تھی چنانچہ انگریزی فوج قیصر باغ اور موتی محل سے بڑھتی ہوئی، لکھنؤ کے بیشتر حصوں پر قابض ہو گئی اور مولانا ایک بار اس مورچے میں پھر زخمی ہوئے۔ انجام کار آپ کو لکھنؤ سے باڑی (سیتاپور) کی طرف کوچ کرنا پڑا۔ باڑی سے مولانا نے محمدی (کھیم پور) کی طرف کوچ کیا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں سے شاہجہانپور فرخ آباد اور سرحد دلی کے گرد و نواح میں آسانی سے حملے کیے جا سکتے تھے۔ مولانا کے محمدی کے قیام کے زمانے میں مختلف سمتوں سے ممتاز مجاہدین آزادی کھنچ کھنچ کر آنا شروع ہو گئے۔ جن میں بیگم حضرت محل کا مع برجیس قدر کے آ کر مولانا کے ہاتھ پر بیعت کرنا بھی شامل ہے۔ نواب بہادر خاں والی بریلی بھی انگریزوں سے ہزیمت اٹھا کر آپ کے پاس پناہ گزیں ہوئے۔ دلی سے شہزادہ فیروز شاہ بھی بھاگ کر احمد اللہ شاہ کی جماعت میں آن ملے۔ اسمٰعیل خاں اور تانتیا راؤ دھوندو پنتھ کانپور سے بھاگ کر محمدی پہنچے۔ اب احمد اللہ شاہ کی جماعت کو بظاہر کافی استحکام نصیب ہو چکا تھا چنانچہ ۲۰ مارچ ۱۸۵۸ء کو بمقام محمدی آپ نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ چونکہ بادشاہت کے استحکام کے لیے سکہ ایک ضروری اہمیت کا حامل ہے چنانچہ فوری

طور پر ٹکسال کا قیام وجود میں آیا۔ اور اس طرح آپ کے نام کا سکہ بھی رائج ہو گیا۔ انگریز اُن سے بہت خوف زدہ ہو گئے۔ جنرل اوٹ رم کی طرف سے آپ کی گرفتاری پر پچاس ہزار روپیہ کا اعلان کیا گیا۔ اسی درمیان آپ نے شاہ جہاں پور کا معرکہ بڑی کامیابی سے سر کیا جب کہ آپ کی اور دشمنوں کی فوج کی تعداد میں ایک اور تین کا فرق تھا۔ تحریک آزادی دن بدن زور پکڑ رہی تھی۔ ایک سال کے اندر مختلف جنگوں اور چھوٹے بڑے معرکوں میں عموماً انگریزوں ہی کو منھ کی کھانی پڑی۔ دوسرے چند افراد تو کسی صورت سے قابو میں آ بھی گئے تھے لیکن نہیں کمند پڑ رہی تھی تو مولانا احمد اللہ شاہ پر چنانچہ انگریزی سپاہ کو کسی ایسے شخص کی تلاش تھی جو بظاہر مولانا کا ہمدرد اور دوست ہو لیکن ان کا اپنا آدمی ہو۔ کیوں کہ فریب اور سازش کے بغیر تیر نشانے پر لگتا نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ پچاس ہزار کی لالچ کچھ کم نہ تھی چنانچہ پوایاں (ضلع شاہ جہاں پور) کے زمیندار اور رئیس راجہ جگن ناتھ سنگھ اور اس کے منجھلے بھائی بلدیو سنگھ نے مل کر ایسا جال بچھایا کہ مولانا باوجود اپنی سوجھ بوجھ اور ذہانت و ذکاوت کے اس کے دام میں آ گئے۔ بلدیو سنگھ کا کہنا تھا کہ اس کا بڑا بھائی جگن ناتھ سنگھ انگریزوں سے مل گیا ہے چنانچہ اسے معزول کر کے مجھے ریاست کا رئیس مقرر کیا جائے۔ مولانا صاف دلی سے اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے بذاتِ خود تشریف لے گئے۔ جون کی ۱۵ تاریخ تھی منگل کا دن دوپہر کا وقت تھا۔ بے لوث اور وفادار محسنِ اعظم کی آخری گھڑی آ پہنچی تھی۔ موت سر پر منڈلا رہی تھی۔ پاک روحیں شہید وطن کو آغوش میں لینے کے لیے بے قرار تھیں۔ حور و غلمان جام صہبائے نور لیے منتظر تھے۔ قضا و قدر کا لکھا کب ٹلا ہے۔ مولانا مع اپنے ساتھی گڑھی کے پھاٹک تک پہنچے، بلدیو سنگھ پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ پھاٹک بند تھا۔ کھولنے کی تاکید کی گئی۔ لیکن پھاٹک نہیں کھلا۔ بات بڑھ گئی۔ اچانک گڑھی کے اوپر سے گولیوں کی بوچھار شروع ہو گئی مولانا زخمی ہو کر لڑکھڑائے۔ اور آن واحد میں مولانا کا سر قلم کر لیا گیا۔

نیست ازیں خوب تر در ہمہ آفاق کار دوست رسد نزد دوست یار بہ نزدیک یار

محب وطن اپنے محبوب حقیقی سے جا ملا۔ سب انسپکٹر تھانہ پوایاں اس واقعہ کو یوں ضبط تحریر میں لاتا ہے:-

"کنور بلدیو سنگھ نے بہادری کی اور اُن کو (احمد شاہ) گولی کا نشانہ بنایا" اور راجہ نے سر قلم کر کے مجسٹریٹ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ مصنف بغاوت ہندیوں رقم طراز ہے:-

"راجہ سر کو رومال میں لپیٹ کر ہاتھی پر سوار ہوا اور شاہ جہاں پور کے مجسٹریٹ کے پاس سر کو لے گیا۔ جو اُس وقت دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے۔ راجہ نے رومال کھول کر مولوی کا سر دکھایا مجسٹریٹ دیکھ کر بڑے خوش ہوئے دوسرے دن یہ سر کوتوالی میں لٹکا دیا گیا۔"

اس طرح انگریزوں کی سازش کارگر ہوئی لیکن دشمنوں کو سر لے کر بھی چین نہ پڑا۔ اس کے بعد جسد مبارک کی جو تذلیل ہوئی وہ للتا پرشاد محرر کی زبانی سنیے:-

"احمد اللہ شاہ سرغنہ مارا گیا۔ نعش اس کی پھونک دی گئی۔ اور اہل گدھوں کا جائے سوختگی نعش نا مبردہ کے چلوایا گیا اور سر اُس کا بمقام کوتوالی ٹانگا گیا۔ لہٰذا تم کو لکھا جاتا ہے کہ تم اس بات کو مشہور کر دو۔"

۱۸ جون ۱۸۵۸ء
بہ قلم للتا پرشاد محرر۔
بہ نام کوتوال شاہ جہاں پور
حکمنامہ جات از طرف مجسٹریٹ
شاہ جہاں پور

اتر پردیش کے اس وقت کے سب سے بڑے انقلابی خلیفہ قائد احمد اللہ شاہ کو ختم کر کے انگریزوں نے گویا پوری تحریک آزادی کو ہی ختم کر دیا۔ قائد کے بغیر تحریک کا بے جان ہو جانا لازمی امر تھا۔ لیکن ہندوستان کی تاریخ میں ان کا نام امر ہو گیا۔

ان کی دلیری اور جنگی مہارت کا دوست و دشمن سبھی نے اعتراف کیا۔ بغاوت ہند کا مصنف لکھتا ہے:۔

"مولوی نے اپنی تلوار کو کسی بے گناہ کے خون سے کبھی آلودہ نہیں کیا۔ پس ساری قومیں اس مولوی کو یاد کریں گی کہ وہ تعظیم و ادب کا جو شجاعت و صداقت کے لیے لازم ہیں، مستحق تھا" ہومس اپنی تاریخ "SEPOYWAR" میں لکھتا ہے:۔

"ایک موزوں اور بھرپور قابلیت اور صلاحیت کا انسان صرف احمد اللہ یعنی مولوی فیض آبادی تھا۔"

کرنل میلیسن تاریخ بغاوت ہند یا "MUTINIES OF INDIA" میں لکھتا ہے:۔

"مولوی بہت ہی حیرت انگیز آدمی تھا، سالار افواج ہونے کی بے پناہ صلاحیت کے ثبوت بغاوت کے زمانے میں ملتے ہیں۔ کوئی دوسرا شخص سوائے مولوی کے اس بات پر فخر نہیں کر سکتا کہ اس نے میدان جنگ میں دوبارہ سر کولن کیمپبل (کمانڈر ان چیف) کو نیچا دکھایا۔"

بلا شبہ یہی وہ لوگ ہیں جو مر کر بھی امر ہو جاتے ہیں

ع ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما



حواشی

۱۔ FALL OF THE MUGHAL EMPIRE. VOL. (1). P. 438 ۲۔ "واجد علی شاہ" ص۔ تقی الدین۔ ایم۔ اے ۳۔ نواب ملکہ النساء بیگم جو نواب والا جاہ بہادر اول کی منجھلی صاحبزادی تھیں اور نواب حسام الملک المعروف بہ ٹیپو شاہ سے چھوٹی تھیں۔ چونکہ وہ دریا میں سفر کرتے وقت پیدا ہوئی تھیں اس لیے ان کی عرفیت "دریا بیگم" تھی۔ ۴۔ بیلی گارڈ، ریزیڈنسی (لکھنؤ) کے ایک دروازے کا نام تھا جو کرنل بیلی کے نام سے منسوب تھا۔ اسی وجہ سے اس کا نام بیلی گارد پڑ گیا۔ آج بھی یہ جگہ لکھنؤ میں توپوں کے نشان کے ساتھ باقی ہے ۵۔ شہزادہ فیروز شاہ، شاہ عالم کا پوتا اور فیض آباد کا رہنے والا تھا۔ ۶۔ نانا دھوندو پنتھ وہ شخص ہے جس کو باجی راؤ پیشوا نے اپنا لڑکا مانا تھا۔ پیشوا انگریزی پنشن خوار تھا۔ ۱۸۵۱ء میں مر گیا۔ پنشن کی رقم آٹھ لاکھ تھی جو نانا کو نہیں ملی غالباً انگریزوں سے انحراف کا باعث یہی بات تھی۔ ۷۔ "تاریخ بغاوت ہند" ـ پنڈت کنہیا لال ص ۱۱۱ ـ مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ـ ۸۔ مولانا کی فوج کی تعداد صرف پندرہ سو تھی جبکہ دشمن کی فوج کی تعداد ساڑھے چار ہزار کے قریب تھی بحوالہ از مولانا تائب مثنوی تاریخ احمدی۔ ۹۔ اس منظر کو مولانا تائب نے اپنی مثنوی "تواریخ احمدی" میں بڑی خوبصورتی سے نظم کیا ہے۔ ۱۰۔ بتاریخ ۷ ذیقعدہ ۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۸ء ـ مولانا تائب نے تاریخ شہادت یوں لکھی ہے

خودی سوز ہے شہ کی تاریخ وصل ۱۲۷۴ھ ہوا "نفی" سے وہ اثبات وصل

۱۱۔ عرضی واردھنہ بلدیو سنگھ مندرجہ ص ۳ فائل ص ۵ (سٹیٹ آرکائیوز الہ آباد) ـ ۱۲۔ "بغاوت ہند" یا عروج عہد انگلیشیہ جلد سوم و چہارم۔

کرشن بہاری نورؔ
۹۶۔ عزت نگر۔ لکھنؤ۔ ۱

غزلیں

کیلاش بہاری ہؔ
ایشوری بھون سبھاش
بریلی

پلکوں کی اوٹ میں وہ چھپا لے گیا مجھے
یعنی نظر نظر سے بچا لے گیا مجھے

ب اس کو اپنی ہار کہوں یا کہوں میں جیت
روٹھا ہوا تھا میں وہ منا لے گیا مجھے

مدت سے ایک رات بھی اپنی نہیں ہوئی
ہر شام کوئی آیا —— اٹھا لے گیا مجھے

اک جاندار لاش سمجھیے مرا وجود
اب کیا دھرا ہے کوئی چرا لے گیا مجھے

ہو واپسی اگر تو انھیں راستوں سے ہو
جن راستوں سے پیار ترا لے گیا مجھے

دامن کی قید سے کب چھوٹتا کبھی
بس تیرا پیار تھا جو چھڑا لے گیا مجھے

دھرتی کا یہ سفر مرا جس دن ہوا تمام
جھونکا ہوا کا آیا اڑا لے گیا مجھے

طوفاں کے بعد میں بھی بہت ٹوٹ سا گیا
دریا پھر اپنے رخ پہ بہا لے گیا مجھے

میں بھی چھلک چھلک کے رہا اس کے ہونٹ تک
مانندِ جامِ مئے وہ اچھالے گیا مجھے

مدت کے بعد نورؔ ہنسی لب پہ آئی ہے
وہ اپنا ہم خیال بنا لے گیا مجھے

میں جس کو اجنبی سمجھا مرا ہی چہرا تھا
مرے وجود کا دیوار و در پہ سایا تھا

خود اپنے قدموں کی آہٹ سے خوف تھا مجھ کو
سیاہ رات تھی، میں رہ گزر میں تنہا تھا

ترس رہا تھا کوئی شخص زندگی کے لیے
کہ جیسے پیاس سے بیتاب کوئی دریا تھا

گلوں تک اپنی رسائی نہ ہو سکی ممکن
چمن کے چاروں طرف خوشبوؤں کا پہرا تھا

وہ ایک بستی جہاں درد تھا نہ راحت تھی
وہ ایک شہر جہاں دھوپ تھی نہ سایا تھا

نہاں تھی وسعتِ گلشن میں دلکشی میری
مگر میں حادثہ بن کر فضا میں ابھرا تھا

نظر برنی

مولانا شوکت علی

محمد علی شوکت علی کو ہندستانی تاریخ میں بے مثال جوڑی سمجھا جاتا ہے جس نے جنگِ آزادی میں ایک دوسرے کے دوش بدوش باہمی تعاون کیا اور انگریزوں سے نبرد آزما ہوکر اپنی قربانیوں اور ایثار کی وہ مثال قائم کی ہے جو رہتی دنیا تک زندہ رہے گی۔

اس جوڑی کو عام طور پر علی برادران کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جن کی برادرانہ اخوت و محبت، باہمی ربط و ضبط اور خلوص و تعاون نے ہندستانی عوام کے دلوں پر گہرا نقش قائم کیا ہے۔ دونوں بھائیوں کے ساتھ علی برادران کا لاحقہ تاریخ کی سب سے بڑی حقیقت بن گیا ہے۔ ان کی قرابت و رفاقت، یگانگت و محبت اور میل جول کے تسلسل و ارتباط کا یہ عالم تھا کہ زندگی بھر دونوں بھائی ایک دوسرے پر جان چھڑکتے رہے۔ محمد علی چھوٹے بھائی ضرور تھے لیکن میدان سیاست میں ان کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنے بڑے بھائی شوکت علی کی تعظیم و تکریم میں کبھی کوتاہی نہیں کی اور ہر معاملے میں ان سے مشورہ ضرور کرتے تھے۔

مولانا محمد علی کی خداداد صلاحیتوں، جودتِ طبع اور فہم و فراست نے بہت جلد زمانہ سے اپنا لوہا منوالیا۔ ان کے قلم کی برجستگی، زبان و بیان کی دل کشی اور بصیرت و استدلال ہر شخص کو متاثر کرتا تھا۔ مولانا شوکت علی اسی عہد آفریں شخصیت کے برادرِ کلاں تھے۔ ان میں تنظیم و منصوبہ بندی کی بے پناہ قوت موجود تھی۔ ان کے خلوص نیت اور انسانی صفات نے شوکت علی کو ایک بلند کردار شخصیت بنا دیا تھا۔

شوکت علی اپنے والد عبدالعلی (خاں) کی دوسری اولاد تھے جن کی ولادت ۱۸۷۳ء میں رام پور میں ہوئی۔ یہ اپنے بھائی محمد علی سے ۵ سال بڑے تھے۔ ان کی والدہ بی اماں بڑے دل گردہ کی مشرقی خاتون تھیں جن کو قدرت کی جانب سے مردانہ دل و دماغ ودیعت ہوا تھا۔ انھوں نے اپنے شوہر کے انتقال کے بعد اپنے پانچ لڑکوں اور ایک لڑکی کی پرورش و پرداخت، تعلیم و تربیت اور رہنمائی کی ذمہ داری اپنے سر پر لے لی۔ عبدالعلی کا انتقال اس وقت ہوگیا جب کہ بی اماں کی عمر صرف ۲۷ سال تھی۔ بی اماں کا اصل نام آبادی بانو تھا جن کے خیالات باغیانہ، پاکیزہ اور دین دارانہ تھے۔ انھوں نے عملی زندگی میں بڑے حوصلہ کا ثبوت دیا۔ انھوں نے اپنے تین لڑکوں، ذوالفقار علی، شوکت علی اور محمد علی کو انگریزی تعلیم کے لیے جدید اسکولوں میں داخل کرایا۔ بریلی اسکول سے میٹرک پاس کرنے کے لیے یہ لڑکے علی گڑھ کے کالج میں داخل ہوئے۔ مولانا محمد علی ایک جگہ رقمطراز ہیں:

"جب میرے بڑے بھائی شوکت کو انگریزی تعلیم کے لیے علی گڑھ روانہ کیا گیا تو ہمارے ایک چچا نے، جو کہ ہمارے خانگی کام کاج اور جائداد کی دیکھ بھال کرتے تھے، بڑے بھائی شوکت کی تعلیم کے لیے اسکول کے مصارف برداشت کرنے سے صاف انکار کر دیا لیکن یہ ہماری والدہ ہی کا دم تھا کہ انھوں نے ہماری تعلیم کا بند و بست جاری رکھا اور اپنے زیورات کو گروی رکھ کر اپنے ارمان کی تکمیل کی۔ یہ ہماری والدہ کا عزم قابلِ دید تھا حتیٰ کہ ہمارے یہ چچا بھی ان سے متاثر ہوئے اور انھوں نے گروی شدہ زیورات کو واپس لے لیا۔ میری تعلیم و تربیت میں شوکت صاحب کا جو دخل

تھا، وہ میں کبھی بھول نہیں سکتا۔"

شوکت علی نے بریلی کے ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ دو سال پیشتر ان کے بھائی ذوالفقار علی اس اسکول سے میٹرک پاس کرکے علی گڑھ چلے گئے تھے۔ علی گڑھ کا ایم اے او کالج اس زمانہ میں انگریزی طرز کا پبلک کالج تھا جس کو دس بارہ برس قبل سر سید احمد خاں نے قائم کیا تھا۔

شوکت علی کا حلیہ ملاحظہ فرمائیے :

"دراز قد، قوی ہیکل، دلکش چہرہ، روشن پیشانی، آنکھیں چمک دار، سر پر فر والا ٹوپ، کلین شیوڈ، مونچھیں گھنی اور گنجان، لباس قیمتی، جوتے مہنگے، پاجامہ تنگ موری کا اور چوڑی دار، ہاتھ میں سگار دبائے ہوئے اور چہرے پر ایک انوکھی مسکراہٹ۔"

شوکت علی علی گڑھ کے ممتاز و مقبول طالب علم تھے۔ وہ مادر زاد رہنما تھے اور طالب علمی کے دوران ہی وہ یونین کے سکریٹری اور کالج کی کرکٹ ٹیم کے کپتان کی حیثیت سے شہرت حاصل کر چکے تھے۔ ابتدا میں انھوں نے اپنے بھائی محمد علی کی طرف خاص توجہ نہیں کی لیکن یہ جونیر طالب علم (محمد علی) رفتہ رفتہ ایک ذہین طالب علم کے ناطے ابھرنے لگے۔ جب شوکت علی نے محمد علی کی فطری صلاحیتوں کو اچھی طرح بھانپ لیا تو انھوں نے بھی محمد علی کے مستقبل کو سنوارنے کے لیے اپنی جد و جہد شروع کر دی۔

شوکت علی مزاجاً مشفق، مرنجان مرنج، حلیم الطبع، اور وسیع القلب تھے۔ وہ حقیقتاً خلوص و ایثار کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ محمد علی نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ "میری تعلیم تربیت میں بالخصوص آکسفورڈ بھجوانے میں مالی اعانت اور خلاقی حوصلہ افزائی شوکت صاحب نے ہی کی تھی"۔

جب محمد علی نے بی اے پاس کیا تو شوکت علی سرکاری عہدے دار تھے۔ وہ اس زمانہ میں محکمۂ منشیات کے اعلیٰ افسر کی حیثیت سے خاندان کی کفالت کرتے تھے۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی (محمد علی) کو بڑا آدمی بنانا چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے محمد علی کو سرکاری ملازمت کے بجائے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آکسفورڈ بھجوانے کا بندوبست کیا اور وہاں کے سارے اخراجات بخوشی برداشت کیے۔

مولانا صبغت اللہ فرنگی محلی لکھتے ہیں :

"۱۹۱۲ء میں ایک نوجوان مولانا عبدالباری سے ملنے آیا اس کے چہرے پر انوکھی کشش تھی اس کا قد سات فٹ پانچ انچ تھا۔ یہ نوجوان تھا مسٹر شوکت علی بی اے (علیگ) جو کہ علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کا سکریٹری، ہندوستان کا معروف کرکٹ کھلاڑی اور سرکاری شعبۂ افیم کا اعلیٰ عہدہ دار تھا۔ وہ ایک فیشن ایبل نوجوان، بذلہ سنج، ایک مستعد منتظم اور باہمت نوجوان تھا جس نے انگریز حاکم کے منہ پر تھپڑ مارنے میں بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ وہ نوجوان مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کا بہادر سپاہی تھا جو اپنی مادر درس گاہ کے لیے روپیہ اکٹھا کرنے کے لیے یہاں آیا ہوا تھا۔ اس نوجوان نے "انجمن خدام کعبہ" کے نام سے ایک سوسائٹی بنائی اور آغا خاں کے مشیر کی حیثیت سے پوری ملک کا دورہ کیا اور اپنی مادر درس گاہ کو یونی ورسٹی بنانے کے جوش میں لاکھوں روپے کا فنڈ جمع کر لیا تھا۔"

۱۹۱۵ء میں انگریزوں نے قسطنطنیہ پر اچانک حملہ کر دیا۔ اس پر دنیائے اسلام میں کہرام مچ گیا اور ہندوستانی مسلمان بھی اس سے رنجور ہو گئے۔ مولانا محمد علی نے انگریزوں کی اس پالیسی کی سخت مذمت کی۔ وہ اس وقت تک ملک کے مسلمہ لیڈر بن چکے تھے۔ انگریزی حکومت نے محمد علی کے اس رویّہ کو سخت ناپسند کیا اور انھیں ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت نظر بند کر دیا گیا۔

شوکت علی اس وقت صرف مذہبی، سماجی اور تعلیمی سرگرمیوں میں منہمک نظر آتے تھے لیکن چھوٹے بھائی کی نظر بندی کے بعد وہ بھی سیاست میں کود پڑے۔ شوکت علی ۱۷ سال کی ملازمت کے بعد رضاکارانہ ریٹائرمنٹ لے کر سرکاری عہدے سے کنارہ کشی اختیار کر چکے تھے۔ ان کو بھی ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے ذریعہ گرفتار

ہو لیا گیا:

۱۹۱۱ء میں جب شہنشاہ برطانیہ نے دہلی آنے کی خواہش ظاہر کی تھی تو مسلمانانِ ہند نے فیصلہ کیا تھا کہ علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی بنانے کا مطالبہ کیا جائے گا۔ چنانچہ چندے اکٹھا کرنے کی ملک گیر تحریک چلی تو شوکت علی نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انھوں نے قلیل مدت میں لاکھوں روپے چندوں کے ذریعہ جمع کر لیے لیکن حکومت نے شوکت علی کی اس تعلیمی سرگرمی کو بھی سیاسی چال سے تعبیر کیا اور انھیں نظر بند کر دیا گیا۔

۱۹۱۳ء میں شوکت علی نے انجمن خدام کعبہ کی بنیاد ڈالی۔ اس انجمن کے بانی ممبران نے یہ تہیہ کر لیا کہ وہ تحفظ کعبہ کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا دیں گے۔ انگریزوں نے اس تحریک سے خطرہ محسوس کیا اور اس کی سرگرمیوں کو حکومت کے منافی قرار دیا۔

اقبال شیدائی کے مطابق علی برادران اور مولانا عبید اللہ سندھی نے تحریک ہجرت شروع کی تھی۔ ہزاروں لوگوں نے ترک وطن کر کے غیر ممالک میں سکونت اختیار کر لی کیونکہ وہ لوگ ایک غلام دیس میں رہنا نہیں چاہتے تھے۔

۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۹ء کی مدت میں علی برادران نظر بند رہے اور اس اثنا میں یورپ کے حالات خراب ہونے لگے۔ ترکی جو اب تک آزاد مملکت تھی وہ بھی انگریزوں کی سازشوں کا شکار بن گئی۔ جرمنی، ترکی کا واحد ترین طرف دار ملک تھا، اس لیے وہ بھی انگریزوں کی نگاہ میں بری طرح کھٹکنے لگا، ہندستانی عوام انگریزی حکومت سے نالاں ہونے لگے اس لیے فطرتاً ان کو بھی ترکی کے ساتھ ہمدردی ہونے لگی۔

۱۹۱۸ء میں مدراس، لکھنؤ، دہلی اور دوسرے مقامات پر قسطنطنیہ پر انگریزی تسلط کے خلاف مظاہرے اور احتجاجی جلسے ہوئے۔ بمبئی میں چھوٹانی کی صدارت میں ایک خلافت کمیٹی کی تشکیل ہوئی جس کے سکریٹری صدیق کھتری مقرر ہوئے۔ مولانا شوکت علی جیل سے رہا ہوئے تو ان کو خلافت کمیٹی کا سکریٹری مقرر کیا گیا۔ اس کے بعد شوکت علی بھی سیاسی افق پر اپنے چھوٹے بھائی

کی طرح چمکنے لگے اور ایک اہم شخصیت بن گئے۔

خلافت کمیٹی کا پہلا اجلاس ۲۴ نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی ہوا جس کی صدارت فضل الحق نے کی۔ مہاتما گاندھی، موتی لعل اور دوسرے قومی رہنماؤں کو بھی اس کانفرنس میں دعوت دی گئی گویا یہ تنظیم انگریزوں کے خلاف ہندو مسلمانوں کا زبردست محاذ بن گئی۔ شوکت علی، محمد علی، حسرت موہانی اور دوسرے دانشور اس تحریک کے روحِ رواں تھے۔ انھوں نے آزادی کی جدوجہد کی تحریک کا راستہ ہموار کر دیا۔ ۱۹ مارچ ۲۰ء کی خلافت کانفرنس نے ایک قرارداد کے ذریعہ یہ فیصلہ کیا اگر ترکی پر ناقابلِ قبول شرائط مسلط کی گئیں تو پھر ہندستانی مسلمان انگریزوں سے قطع تعلق کر لیں گے۔ حکومت نے اس اجلاس کو غیر قانونی قرار دے دیا اور اپنے ملازمین کی اس اجلاس میں شرکت پر پابندی لگا دی۔ خلافت کانفرنس نے اپنا وفد لندن روانہ کیا جس نے ہندستانی عوام کے اس مطالبہ کو دہرایا کہ وہ ترکی کے ساتھ اپنے تعلقات بحال کرے لیکن برطانیہ نے اس کو ٹھکرا دیا اور سلطان ترکی کو اس کے اختیارات سے محروم کر دیا۔

خلافت کانفرنس کی شاخیں پورے ملک میں قائم ہونے لگیں۔ ہر شخص میں ۱۸۵۷ء کی طرح جوش و ولولہ نظر آنے لگا ہندوؤں نے بھی اس تحریک کا ساتھ دیا۔ ۲ جون ۱۹۲۰ کو ترک موالات کی تجویز پاس ہوئی جس میں تمام ہندو اور مسلمان شریک ہوئے۔ ۱۸ جولائی کو خلافت کانفرنس کا اجلاس لکھنؤ میں ہوا اور دسمبر ۱۹۲۰ء کو ناگپور میں اجلاس ہوا جس میں انگریزوں کے ساتھ عدم تعاون پر زور دیا گیا، اس وقت مسلمانوں میں جہاد کا جذبہ کارفرما تھا۔

۸ جولائی ۱۹۲۱ء میں خلافت کمیٹی کا ایک اجلاس کراچی میں ہوا جس میں رئیس الاحرار مولانا محمد علی نے اپنی ولولہ انگیز تقریر میں مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ فوجی ملازمتوں کا بائیکاٹ کریں۔ یہ تقریر ان کے خطیبانہ زور و قوت کا مظہر تھی۔ اس سے انگریز حکومت بوکھلا اٹھی اور اس نے علی برادران مولانا

حسین احمد مدنی، شنکر آچاریہ، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور مولانا نثار احمد کانپوری کو نظر بند کر کے کراچی کے خالق دینا ہال میں مقدمہ چلایا۔ محمد علی نے اپنے دفاع میں جو تقریر کی وہ بے حد دلآویز اور مدلل تھی۔ یہ مقدمہ تحریک آزادی کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

خلافت کا خاتمہ ہو گیا اور مصطفیٰ کمال برسر اقتدار آ گئے۔ ادھر عبدالعزیز بن سعود نے ۱۹۲۴ء میں حجاز پر دھاوا بول دیا۔ خلافت کانفرنس نے ۱۹ مارچ ۱۹۲۴ء میں ایک قرارداد پاس کی اور عربوں کی آزادی کی بھرپور حمایت کی۔ ۵ اکتوبر کی قرارداد میں حجاز کے لیے جمہوری نظام کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں ایک ٹیلی گرام ابن سعود کو بھیجا گیا۔ ۲۴ اکتوبر کو ابن سعود نے شوکت علی کے نام یہ جواب بھیجا۔

"آپ کا تار موصول ہوا اور ہم ہندستانی مسلمانوں کے جذبات سے بیحد ممنون ہوئے۔ جب تک شریف حسین یا اس کے خاندان کا کوئی فرد بھی مکہ کی حکومت پر قابض ہے، عوام چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ حسین تمام واقعہ کے لیے ذمے دار ہے اور مکہ اس کی حرکتوں کا شکار ہے۔ لیکن آخری فیصلہ اسلامی دنیا کے ہاتھ میں ہے۔"

شوکت علی بڑے بھائی تھے اس لیے محمد علی ان کو اپنے والد کی طرح محترم سمجھتے تھے۔ علمیت میں چھوٹے بھائی کو سبقت حاصل تھی لیکن عملی زندگی میں بڑے بھائی کو برتری ملی۔ محمد علی ذہین تھے تو شوکت علی تنظیمی صلاحیت کے مالک۔ محمد علی شعلہ مقال خطیب تھے تو شوکت علی کم گو مگر متین۔

مولانا شوکت علی نے ۱۹۱۹ء سے کھدر پوشی کا آغاز کیا تھا اور آخر دم تک کھدر استعمال کرتے رہے۔ ان کی ٹوپی پر "خدام کعبہ" کا تمغہ ضرور ہوتا تھا جو کہ وہ ۱۹۱۳ء سے تنظیم "انجمن خدام کعبہ" کی علامت کے طور پر لگاتے آ رہے تھے۔

محمد علی کی طرح وہ بھی ایک بے باک اور حق گو صحافی کی حیثیت سے میدانِ صحافت میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے "خلافت" کے نام سے اخبار نکالا اور عدیم الفرصتی کے باوجود اس کے بعض اداریے انھوں نے ہی تحریر کیے۔

مولانا شوکت علی سربرآوردہ شخصیتوں سے مرعوب ہونا نہیں جانتے تھے۔ ہمیشہ ایسے لوگوں سے آنکھ ملا کر بات کرتے تھے۔ نواب رام پور اور اکبر حیدری سے تصادم ہوا تو انھوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ان کے نقائص کو ہدف ملامت بنایا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے لیے جس وقت ڈاکٹر ضیاء الدین احمد اور نواب محمد اسمٰعیل خاں میں کشمکش چلی تو شوکت علی نے نواب اسمٰعیل خاں کی حمایت کی اور کہا کہ یہ سرمایہ دار لوگ یونیورسٹی کے مسائل میں اس لیے مداخلت کر رہے ہیں کیونکہ وہ یونیورسٹی کو بڑے بڑے عطیے دیتے ہیں۔ وہ مہاراجہ الور اور مہاراجہ پٹیالہ کے دوستوں میں تھے۔

وہ ذیابیطس کے مریض تھے لیکن بلا تکان کام کرنے کے عادی تھے وہ جد و جہد میں یقین رکھتے تھے اپنے ایک خط میں ایڈیٹر خلافت کو لکھا کہ "کام کرو، کام کرو، کام کرو۔"

وطن کی غلامی سے مولانا اس درجہ کبیدہ خاطر تھے کہ جب افغانستان کے حکمراں امیر امان اللہ خاں بمبئی آئے تو مولانا نے ان کے اعزاز میں استقبالیہ دیا اور سپاسنامہ میں لکھا:

"ہم مسلمانان ہند غلام ہیں۔ ہم سوائے خدا کے حقیقتاً کسی دوسرے پر بھروسہ نہیں کرتے۔"

امیر افغانستان مولانا شوکت علی کے جذبات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے اپنے جواب میں کہا:

"اللہ کی اماں میں رہ کر مایوس ہونا حرام ہے۔"

مولانا شوکت علی جذباتی انسان تھے لیکن وہ اپنے بدخواہوں کے ساتھ بھی درگزر سے کام لیتے تھے۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ایک زمانہ میں روزنامہ اپنے اخبار "ہند" کلکتہ میں مولانا شوکت علی کے خلاف کچھ نہ کچھ لکھا کرتے تھے۔ ایک بار شوکت علی کلکتہ گئے

(بقیہ صفحہ ۲۷ پر)

مہدی پرتاپگڑھی
معرفت ایگزیکیٹو انجینئر اریگیشن
ڈویژن پرتاپ گڑھ

قدم مِلا کے چلیں

گھرے ہیں مصلحت آمیزیوں کے نرغے میں
عجیب شے ہے ثقافت کی آئینہ سازی
دلوں میں بغض و کدورت کے بیج بوتے ہیں
فریب خوردہ ہیں بھٹکے ہوئے ہیں منزل سے
لہو سے کب ہوئی تفریقِ ہندو مسلم کی
اُجالے کی نہ کوئی نسل ہے نہ کوئی ذات
منافقت کی رِدا اوڑھ کر مفاد پرست
بسی بسائی ہوئی بستیاں جلا کے کبھی
نہ کوئی پھول ہے مسلم، نہ کوئی گُل ہندو
لہو جو رام کی رگ رگ میں موجزن ہے میاں
نہ بوئے گل ہوئی مخصوص اک چمن کے لیے
نہ مہر و ماہ ہی پابند ایک طبقے کے
نہیں سکھایا مذاہب نے نفرتوں کا چلن
مسائل ایک ہمارے، ہمارا درد ہے ایک
جہاں بھی ذہنوں میں پلتا ہے خوفِ بغض و عناد

جو سوچا کرتے ہیں ہر وقت نسل و ذات کی بات
اندھیرے کو جو کہے صبح اور اُجالے کو رات
اُٹھائے رہتے ہیں جو نسل و ذات کی دیوار
وجود ان کا ہے ملت کے واسطے آزار
گھٹا نے سوچا نہیں فرقِ گلشن و صحرا
شعور و فکرِ بشر ہے امانتِ فردا
کبھی "تحفظِ ملت" پہ دل جلاتے ہیں
درندگی پہ خود اپنی ہی مسکراتے ہیں
نہ برگ و بار کے نام و نسب میں جھگڑا ہے
وہی رحیم کی شریانوں میں بھی ملتا ہے
گلاب تک نہیں محدود موجِ فصلِ بہار
منافرت کا نہیں ان کے رُخ پہ کوئی غبار
ہم ایک ہیں تو قدم کیوں نہ پھر ملا کے چلیں
تو پھر خلوص کا پرچم نہ کیوں اُٹھا کے چلیں
بشر کو یاد نہیں رہتے زیست کے آداب

زمیں کے سینے سے اُگتی ہیں درد کی فصلیں
ہر آن ہوتی ہے مہدی حیات خانہ خراب

عبدالعلیم قدوائی
خاتون منزل۔ گولہ گنج لکھنؤ

مولانا عبدالماجد دریابادی
ایک مثالی صحافی

مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم نے اپنے علمی و تصنیفی کارناموں سے اردو کو اتنا کچھ دیا کہ اس کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ صحافت میں مولانا کو ایک اعلا اور منفرد مقام حاصل ہے جہاں وہ اپنی خداداد صلاحیت، خلوص اور تبلیغی جذبہ کی مدد سے پہنچے۔ انھوں نے اردو صحافت کو ایسی توانائی بخشی جس کی بدولت اردو اخبارات و رسائل کو علمی دنیا میں وقعت اور عزت حاصل ہوئی۔

آج سے ستر پچھتر سال قبل مولانا نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز مضمون نگاری سے کیا۔ وکیل امرتسر میں ان کے مضامین شائع ہوتے۔ علامہ شبلی نعمانی کے طرز تحریر سے مولانا بہت متاثر تھے۔ اور اسی تعلق سے ندوۃ العلماء سے بھی ربط پیدا ہوا جو عمر کے ساتھ بڑھتا گیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ سے تعلقات اسی زمانے سے قائم ہوئے۔ مولانا ابوالکلام کے الہلال اور مولانا محمد علی جوہر کے ہمدرد میں ان کے قلمی رشحات نکلتے رہے۔ اس کے علاوہ الناظر لکھنؤ، ادیب الہ آباد، صبح امید لکھنؤ، زمانہ کانپور اور معارف اعظم گڑھ میں مختلف مضامین شائع ہوئے اس طرح علمی و ادبی حلقوں میں مولانا کی تحریریں مقبولیت حاصل کرتی رہیں۔ اسی زمانے میں مولانا کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اپنی زیر نگرانی ہفتہ وار اخبار نکالیں چنانچہ لکھنؤ سے حقیقت کا اجرا ہوا اور مولانا نے پوری دلچسپی اس کی ترتیب اور اشاعت میں لی۔ جلد ہی یہ ہفتہ وار مقبول ہو گیا لیکن چند سال بعد بعض اسباب کی بنا پر نگرانی کا یہ تعلق ختم ہو گیا لیکن رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم کے روزنامہ ہمدرد سے مولانا کا تعلق روز بروز بڑھتا گیا کیونکہ مولانا محمد علی مرحوم اپنی سیاسی مصروفیات اور خرابیٔ صحت کی بنا پر پورا وقت نہیں دے سکتے تھے اور اپنے مخلصوں میں وہ سب سے زیادہ قابل اعتماد مولانا مرحوم کو سمجھتے تھے۔ مولانا کے نام سے مضامین تو ہمدرد میں کم ہی شائع ہوئے البتہ انگریزی اخباروں کے اقتباسات و تراجم زیادہ تر مولانا ہی کے قلم سے ہوا کرتے تھے اور ان سے اخبار کی افادیت و معیار میں اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں جب علاج کے لیے مولانا محمد علی نے یورپ کا سفر اختیار کیا تو ادارت کا عملی چارج وہ مولانا مرحوم کو سونپ گئے تھے اور لندن سے اپنے خطوط میں ہمدرد کی ترتیب و مضامین کے معیار کی برابر تعریف کرتے رہتے تھے۔ لطف یہ کہ ہمدرد روزنامہ دہلی سے شائع ہوتا تھا اور مولانا اپنی علمی مصروفیات کی بنا پر زیادہ تر دریاباد میں قیام پسند کرتے تھے لیکن اس زمانے میں دہلی اکثر جایا کرتے تھے اور وہاں کئی کئی روز مقیم رہتے تھے۔

یہ زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں بڑا پر آشوب تھا۔ سیاسی محکومیت سے کہیں بڑھ کر خطرناک فرنگیت سے ذہنی مرعوبیت تھی جس کا شکار ملک کا ہر طبقہ ہو رہا تھا مسلمان خاص طور سے اس کی زد میں تھے۔ گاندھی جی اور مولانا محمد علی کی طرح مولانا عبدالماجد دریابادی نے بھی خاص طور پر اس طرف توجہ کی اور اس کے خلاف قلمی جہاد

آخر دم تک کرتے رہے۔ مولانا کا حساس دل ملکی و سیاسی حالات
کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی معاشرتی و تمدنی زبوں حالی سے بھی
بہت متاثر ہوا چنانچہ انھوں نے بدعات و رسوم کے خلاف مہم شروع
کی اور اسی مقصد کے لیے انھوں نے اپنا ذاتی ہفتہ وار "سچ" کے نام
سے ۱۹۲۵ء میں نکالنا شروع کیا۔

اس طرح مولانا کی باقاعدہ صحافتی زندگی کا ۱۹۲۵ء
سے آغاز ہوا اور اس کا سلسلہ زندگی کے آخری ڈیڑھ دو سال
چھوڑ کر ۱۹۷۶ء تک جاری رہا۔ ان کی یہ پچاس سالہ زندگی ہر
لحاظ سے کامیاب تھی انھوں نے کبھی بھی تجارتی یا کاروباری
نقطۂ نظر نہیں اپنایا اور اپنی تمام تر توجہ تبلیغ و اصلاح پر مرکوز
رکھی۔ جلد ہی "سچ" نے باوجود اپنی ظاہری بے سروسامانی
کے بڑی مقبولیت حاصل کر لی۔ تہذیب فرنگ کو مولانا نے اپنے
مخصوص انداز میں اس طرح بے نقاب کیا کہ اس کی بے وقعتی
اور تہی دامانی بالکل عیاں ہو گئی اور عام ذہنوں میں فرنگیت
سے جو مرعوبیت تھی وہ بڑی حد تک دور ہو گئی اس کے ساتھ
ہی ساتھ ہندستانی مسلمانوں میں حب الوطنی کا صحیح جذبہ پیدا
کرنے اور انھیں مذہب کی جانب مائل کرنے کے سلسلے میں مولانا
نے بڑا کام کیا وہ بلاخوف و خطر قوم و ملت کی رہنمائی کرتے
رہے۔ "سچ" کے شذرات میں حالات حاضرہ پر بڑا بے لاگ
تبصرہ کیا جاتا تھا جس کے نتیجے میں آخر کار اسے برطانوی حکومت
کے عتاب کا شکار ہونا پڑا اور اس سے ضمانت طلب کی گئی۔
لیکن مولانا اپنے موقف پر قائم رہے اور "سچ" کو بند کر کے
انھوں نے "صدق" کے نام سے دوسرا ہفتہ وار نکالنا شروع کیا
جس کا نام کچھ عرصے بعد صدق جدید کر دیا گیا اور جو بفضلہ آج
بھی مولانا کی معنوی یادگار کی حیثیت سے برابر شائع ہو رہا ہے
صدق جدید کو بھی اپنے پیشرو اخباروں کی طرح بلکہ ان سے
کہیں زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی اس میں بہت بڑا دخل مولانا
کی بے مثل انشاپردازی کا تھا۔ "صدق" میں ان کی تحریروں کا
ایک ایک لفظ بڑے ذوق و شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ ان تحریروں کا
حسن یہ تھا کہ ان میں ہر موضوع پر بڑے سلیقے سے اس
طرح اظہار خیال کیا جاتا کہ ایک طرف پڑھنے والا
کی حسیتی رنگینی اور شگفتگی پر سر دھنتا تو دوسری طرف م
بلاغت دل میں اترتی جاتی۔ مولانا رعایت لفظی کے با
تھے ان کی طبیعت میں غضب کی روانی اور آمد تھی وہ
کی پرخار وادی میں صنائع و بدائع کا استعمال آسان نہ
لیکن مولانا کا قلم اس سلسلے میں بھی منزّہ اور منفرد تھا۔ کیا
کہ کوئی بھرتی کا لفظ آ جائے یا کبھی ہلکا سا شائبہ بھی
تصنع یا آورد کا پیدا ہو جائے مولانا خالص لکھنؤ کی ز
اور روزمرہ نہایت لطافت اور چابک دستی سے استعمال کرتے
"سچ" اور "صدق" کی ترتیب بھی مولانا ہمیشہ اپنے مذاق کے
کی جو اپنی ندرت اور اچھوتے پن کی بنا پر بہت پسند کی گئی۔
"سچی باتیں" کے مستقل عنوان کے تحت مولانا عبرت و حکمت
موتی بکھیرتے جس کا تعلق روزمرہ کی زندگی اور اعمال و اف
سے ہوتا۔ اس کے بعد چھوٹے چھوٹے شذرات میں ملکی و بین
حالات، معاشرتی و تمدنی معاملات پر مولانا اپنے مخصوص متین و
انداز میں تبصرہ کرتے اور سب سے بڑھ کر پرکشش اور دلآویز
سرخیاں ہوتیں جو متن یا خبر کی مناسبت سے مولانا اپنے ذہن رسا
دراکی سے لگاتے۔ اکثر مصرعے ضرب المثل یا چند حرفی سر
ایسی برجستہ پھڑکتی ہوئی لگاتے کہ معلوم ہوتا کہ عین اسی م
کے لیے تھی۔ مولانا کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ شعر و ادب سے ا
خصوصی دلچسپی تھی۔ اس پر مستزاد تھی ان کی بے پناہ قوت ح
یہی وجہ ہے کہ برمحل اور برجستہ اشعار اور مصرعوں کا جتنا
حسین اور برجستہ استعمال مولانا کے یہاں ملتا ہے وہ کسی او
صحافی کے یہاں نہیں ملتا۔ ان منفرد خصوصیات سے مولانا نے بھرپور
فائدہ اٹھایا اور مختلف صحافتی معرکوں میں نمایاں کامیابی بھی
حاصل کی۔ مولانا کی کامیابی کا دوسرا گُر ان کا کامیاب طنز
ہے۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ انھوں نے کبھی اس کا بے محل
استعمال نہیں کیا۔ ان کے دوسرے مستقل عنوانات مشورے اور

گزارشیں نیز تفسیری حاشیے تھے۔ کتابوں پر تبصروں کے علاوہ مولانا کے لکھے ہوئے مقالات، سفرنامے، ریڈیائی تقریریں وغیرہ بھی شامل اشاعت ہوا کرتی تھیں۔

اپنے اخبارات کے ذریعہ مولانا نے اردو ادب و انشا کو مالا مال کیا، اصلاحی و اخلاقی تربیت و تبلیغ کا فریضہ انجام دیا اور اس سے بڑھ کر عظیم کارنامہ یہ انجام دیا کہ انھوں نے اردو صحافت کے لیے چند زریں اصول متعین کر دیے جن کی بنا پر انھیں اردو کا مثالی صحافی کہا جا سکتا ہے۔ ان اصولوں کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

(۱) تنقید یا تنقیص ہمیشہ کسی قول اور عمل کی کی جائے، شخصیات و ذاتیات سے کوئی سروکار نہ رکھا جائے۔ اس اصول کی پابندی مولانا نے بڑی سختی سے کی اور اسی وجہ سے وہ سب کے محترم و محبوب قرار پائے۔

(۲) خبروں خاص طور پر سرخیوں سے سنسنی خیزی نہ پیدا کی جائے اور ہوش کو ہمیشہ جوش پر غالب رکھا جائے۔ متانت و شائستگی کو مولانا نے اپنی پوری صحافتی زندگی میں جس طرح ملحوظ رکھا اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

(۳) توازن اور اعتدال کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے اور مخالفت کے قول و عمل کا جائزہ اسپرٹ سے لیا جائے۔ خود مولانا نے کبھی اپنے کو کسی پارٹی، فرقہ یا ازم سے وابستہ نہیں کیا اور اعتدال، رواداری اور وضع داری کی روش اختیار کی۔

(۴) حق گوئی اور اصول پرستی کو کسی حال میں ترک نہ کیا جائے۔ "سچ" اور "صدق" کا مسلک ہمیشہ یہی رہا اور مولانا نے اس راستہ سے منحرف ہونا کبھی بھی گوارہ نہیں کیا۔

(۵) صحیح اردو لکھنے کا خاص اہتمام کیا جائے۔ مولانا ان گنے چنے انشاپرداز صحافیوں میں تھے جنھوں نے لغت، محاورہ اور روزمرہ کا پورا التزام رکھا اور غلط ترکیبوں اور سوقیانہ طرز تحریر سے ہمیشہ پرہیز کیا۔

(۶) دوسروں کی دل آزاری سے ہمیشہ بچا جائے۔ اصل مقصد دوسروں کے دل ہمدردی اور نرمی سے جیتنے کا ہونا چاہیے۔

ان سب اصولوں کو مولانا نے اپنی ۵۰ سالہ صحافتی زندگی میں بڑے سلیقہ سے برتا اسی کا نتیجہ تھا کہ سب نے ان کو اپنا مقتدا اور پیشوا تسلیم کیا۔ نومبر ۱۹۷۳ء میں اردو اخبارات کے ایڈیٹروں کی ایک یادگار کانفرنس قیصر باغ بارہ دری لکھنؤ میں منعقد ہوئی جس میں وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ اس موقعہ پر مولانا نے شہر لکھنؤ کی طرف سے ان کا خیر مقدم اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں کیا۔ یہ خطبہ اردو صحافت اور انشا پردازی دونوں کے لیے خاصہ کی چیز ہے۔

آج مولانا دریاآبادی ہمارے درمیاں نہیں ہیں لیکن اردو صحافت ان کو ہمیشہ عزت و احترام کے ساتھ یاد رکھے گی کیونکہ انھوں نے اس کو آبرو، وقعت اور توانائی بخشی۔

★

مولانا شوکت علی — (صفحہ ۲۳ کا بقیہ)

تو مولانا ملیح آبادی بھی ملنے گئے۔ مولانا شوکت علی نے ان سے کہا "آپ مجھے جی بھر کے گالی سنا سکتے ہیں لیکن آپ اپنے اخبار کے قیمتی کالموں کو کیوں خراب کرتے ہیں۔ میں جب بھی کلکتہ آتا ہوں تو آپ مجھے بے تحاشا گالیاں دے سکتے ہیں؟" مولانا رزاق ملیح آبادی اس بات پر سخت شرمندہ ہو گئے اور آئندہ شمارہ میں شوکت علی کی تعریف میں مضمون لکھا۔

شوکت علی کا انتقال ۱۹۳۸ء میں ہوا اور ان کا مزار دہلی میں جامع مسجد کے قریب واقع ہے۔

★

جمہور کے پھولوں کا سخن

مطرب نظامی
جوہری محلہ، لکھنؤ

جمہور کے پھولوں کا سخن لے کے بڑھے ہیں
عالم کے لیے مشک ختن لے کے بڑھے ہیں
وہ دیس جو تہذیب کا گہوارہ ہے اب بھی
اس دیس کے انساں کا چلن لے کے بڑھے ہیں
یکجہتی کہ نہ ہوں جذبات محبت کے شکستہ
غالب کا ادب تلسی کا فن لے کے بڑھے ہیں
ہمت کے سہارے ہیں ارادوں کے سفینے
پاکیزگی گنگ و جمن لے کے بڑھے ہیں
تاریکی دوراں کا بھی دل کانپ رہا ہے
ابھرے ہوئے سورج کی کرن لے کے بڑھے ہیں
آئینۂ تدبیر پہ اک خاص جلا کی
ہر عزم میں تقدیر وطن لے کے بڑھے ہیں
ہر نقش قدم مشعل انوار یقیں ہے
دنیا ابھی اس راز سے واقف ہی نہیں ہے
ہر سانس میں پیغام وطن لے کے بڑھے ہیں
دکھتے ہوئے ہر دل کی چبھن لے کے بڑھے ہیں
احساس کے پھولوں میں وفاؤں کی ہے خوشبو
آزردہ جبینوں کی شکن لے کے بڑھے ہیں
باغوں میں بھی گلچیں کا گزر ہو نہیں سکتا
ہم جذبۂ تعمیر چمن لے کے بڑھے ہیں
تاریخ کے ہر باب کو رنگین بنانے
خوں اپنا شہیدان وطن لے کے بڑھے ہیں
ہیں اصل میں خود ان کے ارادے ہی نگہباں
جو حوصلۂ دار و رسن لے کے بڑھے ہیں
منزل انھیں آئینہ دکھاتی ہی نہیں ہے
جو بعض ترقی کی تھکن لے کے بڑھے ہیں
بکھرائیں گے سو رنگ سے تعمیر کے گیسو
ہو جائیں گے شل گردش ایام کے بازو

نیا سال

آفتاب نقوی سہسوانی
آورش انٹر کالج، کوڑا جہان آباد، فتح پور

ہماری صبح بنے رشک صبح باغ ارم
ہماری شام میں جھلکے نہ عکس شام الم
ہماری رات نہ دیکھے شب فراق کا غم
خدا کرے یہ نیا سال ہم کو راس آئے

ہماری بزم میں شمعیں نئی فروزاں ہوں
ہماری بزم کی آرائشیں نمایاں ہوں
مسرتیں جو ملیں ہم کو وہ فراواں ہوں
خدا کرے یہ نیا سال ہم کو راس آئے

ہماری راہ میں عقل و خرد کی جوت جلے
شعور عزم کا سورج یہاں کبھی نہ ڈھلے
کوئی چلے تو ہمارے ہی نقش پا پہ چلے
خدا کرے یہ نیا سال ہم کو راس آئے

فضا میں آئیں نہ گھر گھر کے بادل غم کے
ہمارے صحن چمن پر نہ برق اب چمکے
یہاں ہو بارش ابر بہار جھم جھم کے
خدا کرے یہ نیا سال ہم کو راس آئے

ہر ایک سمت وطن میں ہو دور امن و اماں
خلوص اور محبت کی ندیاں ہوں رواں
کسی بھی دل میں رہے اب کوئی بغض نہاں
خدا کرے یہ نیا سال ہم کو راس آئے

ہمارے دیس میں کوئی بھی دلفگار نہ ہو
کسی کی آنکھ یہاں غم سے اشکبار نہ ہو
سکوں نصیب ہوں سب کوئی بیقرار نہ ہو
خدا کرے یہ نیا سال ہم کو راس آئے

افسانہ

وجاہت علی سندیلوی
سنڈیلہ، ضلع ہردوئی

کامیاب انسان

حامد علی کہاں تو اپنے برآمدے میں اکیلے بیٹھے اونگھ رہے تھے اور کہاں جیسے ہی ڈاکیے نے انھیں پوسٹ کارڈ دیا اور انھوں نے عینک لگا کر اس پر ایک نظر ڈالی، ہڑبڑا کر ایک جوتا پہنے اور دوسرے میں پیر ڈال کر گھسیٹتے گھر کے اندر بھاگے۔ ان کی بیوی زہرہ بیچ صحن میں ایک ٹاٹ کے ٹکڑے پر بیٹھی دھان پچھوڑ رہی تھیں اور ان کی لڑکی فیروزہ نالی کے پاس بیٹھی دوپہر کے کھانے کے جھوٹے برتن مانجھ رہی تھی۔ حامد نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں قریب قریب چیختے ہوئے کہا: "اب کی اتوار کو بھائی صاحب اور بھابی آرہے ہیں۔"

زہرہ خوش ہو کر کھڑی ہوگئی "ارے پورا خط سناؤ نا!"

حامد علی نے خط پڑھا "لکھنؤ ۲ جنوری۔ پیارے حامد دعا۔ تم عرصے سے نہیں آئے۔ آئندہ اتوار ۹ جنوری کو ہم لوگ خود گاؤں آرہے ہیں۔ دس بجے تک موٹر سے پہنچ جائیں گے۔ سب کو دعائیں۔ راقم شاہد علی۔"

زہرہ ہنس کر بولی "آہی گیا خون جوش میں۔ تم عرصے سے نہیں آئے تو ہم آرہے ہیں۔"

"آج بدھ ہے۔ وہ لوگ آج کے چوتھے دن پہنچ رہے ہیں۔ بڑا انتظام کرنا پڑے گا۔ سارا گھر بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔ ایک کمرہ بھی ایسا ڈھنگ کا نہیں ہے جس میں وہ لیٹ بیٹھ سکیں۔ ابا کے مرنے کے سترہ برس بعد حویلی میں قدم رکھیں گے۔" حامد علی نے پریشانی سے کہا۔

زہرہ نے حامد علی کی بات سنی ان سنی کر کے سرگوشی کے لہجے میں کہا: "میرا دل کہتا ہے کہ شہابو کے لیے اپنی فیروزہ کا ہاتھ مانگنے آرہے ہوں گے۔ آخری ٹھیکرے کی منگنی ہے کہ باتیں! اور پھر خود چچا جان کی طے کی ہوئی۔ مرحوم چچا جان کو اس رشتے کا کتنا ارمان تھا؟ بھائی صاحب پڑھے لکھے آدمی ہیں، اتنے بڑے جج رہ چکے ہیں، وہ بھلا مرحوم باپ کی وصیت کیسے ٹال سکتے ہیں؟ ہو نہ ہو یہی بات ہے۔"

حامد علی کچھ نہ بولے اور صحن میں ٹہلنے لگے — ماں کی بات سن کر فیروزہ کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اور اس نے گلے میں پڑے دوپٹے کو سر سے ایسے اوڑھ لیا کہ اس کا آدھا منہ چھپ گیا۔

کچھ دیر بعد حامد علی نے گھر سے باہر جاتے ہوئے کہا: "دیکھو اگر لفافی مل گیا تو میں ابھی بھیجتا ہوں، تم گھر کی صفائی تو شروع ہی کروادو۔ میں سرپنچ کے یہاں سامان کے لیے اور دوسرے مزدور ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔ اور ہاں کچھ روپیوں کا بھی بندوبست کرنا ہے، کھانے اور چائے کا بھی تو انتظام کرنا ہوگا۔"

دھان واپس بوری میں بھرتے ہوئے زہرہ نے کہا: "اور اگر وہ لوگ منگنی کا جوڑا اور زیور لائے تو ہماری طرف سے کم سے کم نوشہ کے لیے ایک انگوٹھی تو ہونا ہی چاہیے۔"

"ابھی خط میں تو کچھ لکھا نہیں ہے۔ نوشہ کو دینے کے لیے کہاں رکھی ہے اپنے پاس انگوٹھی؟ موقع پر دیکھا جائے گا۔ پہلے گھر کا حلیہ تو ٹھیک کرو۔" کہتے ہوئے حامد علی بردے سے باہر نکل گئے۔

خان بہادر راشد علی موضع شیام پور کے تنہا زمیندار تھے، بڑے شاہ خرچ اور بہت مقروض۔ ان کے بڑے لڑکے شاہد علی نے وکالت پاس کرنے کے بعد لکھنؤ کے ایک بہت

بڑے گھرانے میں شادی ہوگئی تھی اور وہ وہیں کے ہو کر رہ گئے تھے ۔ شادی کے بعد وہ باپ کے سامنے صرف ایک مرتبہ — ماں کے مرنے پر پھر خود باپ کی موت پر ہی آ پائے ڈیوڑھی پر آئے تھے ۔ وہ منصفی سے ترقی کرکے پہلے ڈسٹرکٹ جج اور پھر ہائی کورٹ کے جج ہوگئے تھے تین سال ہوئے وہ اپنے اس عہدے سے ریٹائر ہو کر لکھنؤ میں اپنی بنوائی ہوئی کوٹھی میں رہنے لگے تھے ۔ ان کے ایک لڑکا شہاب الدین اور دو لڑکیاں تھیں ۔

حامد علی بی اے کرکے کلکٹری میں کلرک ہوگئے تھے ۔ ان کی شادی ان کی پھوپھی کی لڑکی سے ہوئی تھی ، جس سے صرف ایک لڑکی فیروزہ تھی ۔ زمینداری کے خاتمے کے بعد ان کے والد کی مالی حالت بہت سقیم ہوگئی تھی اور صحت جواب دے چکی تھی ، زمینداری کے معاوضے کے بانڈ ، باغات ، سیر اور خودکاشت کے کھیتوں کو بیچ بیچ کر گزارا اور دوا علاج ہوتا رہا ۔ مرنے سے کچھ سال پہلے باپ نے ملازمت سے استعفیٰ دلوا کر انھیں اپنے پاس بلا لیا تھا ۔ حامد علی اور ان کی بیوی نے خان بہادر کی بڑی خدمت کی تھی اور جب ان کے آخری دنوں میں انھیں لکھنؤ لے جایا گیا تو زہرہ کے سارے زیور ان کے علاج کی نذر ہوگئے تھے — شاہد علی اس زمانے میں الٰہ آباد میں تعینات تھے ۔ وہ باپ کو دیکھنے بھی نہیں آئے ۔ البتہ کبھی کبھار سو روپے کا منی آرڈر ضرور بھیجا ۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں انھوں نے آنے کا حتمی وعدہ کیا تھا ۔ لیکن جب یہ چھٹیاں آئیں تو وہ بیوی کی بہت مہلک بیماری کا عذر لکھ کر شیام پور آنے کے بجائے کشمیر چلے گئے تھے — خان بہادر جب ان کی بے تعلقی پر خفا ہوتے تو حامد علی بھائی کی وکالت کرتے " بڑے عہدے کی بڑی ذمہ داریاں ہوتی ہیں ابا بھائی صاحب کو آسانی سے چھٹی نہیں مل سکتی ۔ وہ یقیناً آپ کے لیے بے چین مگر مجبور ہوں گے "

باپ نے کوئی زمین نہیں چھوڑی تھی ۔ حامد علی کی گزر بسر صرف اس پندرہ بیگھہ زمین اور ایک باغ سے ہوتی تھی۔ جو ان کی بیوی نے اپنی ماں سے ترکے میں پایا تھا ۔ بھائی بھاوج کی بے رخی کے باوجود حامد علی کبھی خربوزے ، کبھی اور کبھی فصل کی کوئی اور چیز لے کر ان کی کوٹھی پر چلے جاتے پھر گاؤں واپس آ کر سرپنچ ، پردھان ، لیکھ پال ، گرام سیوک اور اپنے دوسرے ملنے والوں سے وہ " جج صاحب " کی امارت رسوخ اور قابلیت اور اپنے ساتھ شفقت کے خوب جھوٹے قصے سناتے تو ہائی کورٹ کے جج کے بھائی ہونے کی حیثیت ان کا سینہ چوڑا اور سر اونچا ہو جاتا اور سننے والے بھی تھوڑی دیر کے لیے ان سے مرعوب ہو جاتے ۔ وہ کبھی کوئی اچھا کپڑا پہن پہنتے تو کہہ دیتے کہ بھائی صاحب نے دیا تھا ۔ کسی سے قرض مانگتے وقت ان کا مخصوص جملہ یہی ہوتا " بھائی صاحب کا منی آرڈر بس آنے ہی والا ہے "

خان بہادر کی محل سرا ، جو ان کے پردادا کے زمانے کی لکھوری اینٹوں اور ساکھو کی دھنیوں سے بنوائی ہوئی تھی ، ان کی غفلت اور لاپرواہی کی وجہ سے آدھے سے زیادہ ان کی زندگی ہی میں گر چکی تھی ۔ حامد علی کو بھی کبھی عمارت کی مرمت کرانے کی توفیق نہ ہوئی ۔ ان کا چھوٹا سا خاندان تھا ۔ جب کسی حصے کی دھنیاں یا دیواریں گرنے لگتیں ، تو وہ دوسرے بنے ہوئے حصے میں منتقل ہو جاتے زنانے مکان میں اب صرف ایک سہ دری اور دالان اور کچھ کمرے اور کوٹھریاں خستہ حالت میں بچ رہی تھیں ۔ باہر مردانے میں خان بہادر کا دو منزلہ بیٹھکا گرا تو آس پاس کی اچھی خاصی عمارتوں کو بھی لے بیٹھا ۔ اب حامد علی برو ٹھے سے باہر اس برآمدے میں بیٹھتے جس میں پہلے چوکیدار اور سپاہی بیٹھا کرتے ۔ اس کے دونوں طرف بغلی کمرے تھے ۔

بدھ سے لے کر سنیچر کی شام تک حامد علی کا دوڑتے دوڑتے برا حال ہو گیا ۔ کبھی گھر میں مزدوروں کو دیکھتے اور کبھی باہر سے سامان لاکر آتے ۔ بیچارے بڑی طرح ہلکان ہو گئے تھے لیکن جب یہ سوچ لیتے کہ میرے گھر کے سامنے جج صاحب کی چمچماتی موٹر دیکھ کر گاؤں والوں کے سینوں پر کیسے سانپ لوٹ جائیں گے اور ایک دفعہ پھر میرے

باپ خان بہادر کے گھرانے کا نام چمک جائے گا" لوگ کہنے لگیں گے کہ "ہاتھی لاکھ لٹ جائے تب بھی سوا لاکھ ٹکے کا"۔ حامد علی ایک بھائی پریشان ہے تو کیا؟ خان بہادر کا دوسرا لڑکا تو جج ہے۔ ان کے گھر سے دولت اور امارت تو نہیں ختم ہو گئی ہے" وہ اپنے آپ میں ایک نئی توانائی محسوس کرنے لگتے۔

پہلے طے پایا تھا کہ باہر کے برآمدے کے دونوں بغلی ہی کمروں میں جج صاحب کے بیٹھنے اور کھانے کا انتظام کیا جائے لہٰذا برآمدے کے ساتھ انھیں کی صفائی اور قلعی کرائی گئی تھی لیکن پھر زہرا نے یہ شوشا چھوڑ دیا کہ کہیں بھائی صاحب اندر نہ آویں تو اندر بھی صفائی اور قلعی کرانا پڑی۔ سنیچر کو تیسرے پہر ایک دم سے یہ خیال آیا کہ اگر جج صاحب کو باتھ روم جانے کی حاجت ہوئی تو کیا ہوگا۔ باہر کے نوکروں والے ٹوٹے اور گندے تدمچے تو ان کے لائق ہیں نہیں لہٰذا ایک طرف اینٹیں گر کے ایک دیوار بنائی گئی اور اس میں خان بہادر کے وقت کی چوکی لگا دی گئی۔ زہرہ نے جب یہی مسئلہ بھابی کے متعلق پیش کیا تو زنان خانے میں بھی ایک پرانی چوکی قنات علاحدہ لگانا پڑی۔ باہر اینٹوں اور ملبے کے ڈھیر سارا صحن گھیرے ہوئے تھے۔ اُن کو اٹھوانا تو برسوں کی بات تھی۔ بہرحال جتنا ہو سکا اسے سمٹوا دیا گیا۔ بڑے پھاٹک کا ایک دروازہ جو گر گیا تھا اسے ملبے کے سب سے بڑے ڈھیر پر اس کو چھپانے کے لیے رکھ دیا گیا۔

سر تیج نے مذاق میں یہ کہتے ہوئے "حامد میاں! بھائی بھابی تو آ رہے ہیں کوئی لڑکی کی شادی تو کر نہیں رہے ہو" منھ مانگا سامان یعنی دو تخت، چھ چار پائیاں اور چار قالین دیدیے۔ پردھان نے بڑی دری اور دو گلاس اور دو گلدان دیدیے۔ کھانے کے برتن پلیٹیں اور گلاس وغیرہ ممتاز علی ریٹائرڈ کانسٹبل کے یہاں سے آ گئیں۔ اسکول سے بڑی میز اور کرونن کے چار گملے مل گئے۔ چھجو رام کے لڑکے کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی اس کو صوفہ سٹ اور کرسیاں جہیز میں ملی تھیں۔ وہ دینا تو نہ چاہتا لیکن پھر حامد علی اپنے پرانے زمیندار کے بیٹے سے انکار نہ کر سکا اور یہ فرنیچر بھی آ گیا۔

سویرے جب کھانے کے لیے مرغ، چاولوں، اور میدے اور گھی کا انتظام ہو چکا تو دفعتاً حامد علی کو یاد آیا کہ جج صاحب والے کمرے میں بڑا آئینہ تو ہے ہی نہیں۔ اگر انھیں اپنی صورت دیکھنے کی ضرورت پیش آ گئی تو؟ گھر میں آٹھ بڑے بڑے آئینے تھے لیکن جب باپ کی تعزیت میں جج صاحب آئے تھے تو قالین، دریاں اور جھاڑ، فانوس کے ساتھ وہ یہ کہہ کر سب آئینے بھی اپنے ہمراہ لیتے گئے تھے "تمھیں ان چیزوں کی یہاں کیا ضرورت؟" اور وہ اس خیال سے خوش ہو گیا تھا کہ باپ دادا کی یادگار چیزیں خراب ہونے کے بجائے صحیح مصرف میں رہیں گی۔ حامد علی نے ایک بڑا آئینہ شوبھا رام کے یہاں دیکھا تھا لیکن اس سے مانگنے کا اس کا منھ نہ ہوتا، کئی سال ہوئے جب سے باہر کا ٹھیکا گرا تھا شوبھا رام برابر اس ڈھیر کو اس سے آٹا چکی لگانے کے لیے مانگ رہا تھا۔ پانچ سو روپیہ نذرانہ اور تیس روپیہ ماہوار کرایہ دینے کو تیار تھا۔ خود حامد علی کو اس تجویز پر کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ وہ اس بات کو مناسب سمجھتے کہ کچھ روپے بھی مل جائیں گے اور ایک مستقل آمدنی بھی ہو جائے گی لیکن وہ ڈرتے تھے کہ اگر یہ بات جج صاحب کے کانوں تک پہنچی تو وہ بہت ہی ناراض ہوں گے کہ جہاں ابا اور دادا حضور بیٹھ کر دربار لگاتے، سارے جوار میں اپنا سکہ چلاتے اور مجسٹریٹی کرتے تھے وہاں اب آٹا چکی چل رہی ہے۔ بہرکیف اس کی مصیبت یوں آسان ہو گئی کہ فیروزہ گھر کے اندر سے ایک چھوٹا مگر نقشی چوکھٹے کا خوب صورت آئینہ ڈھونڈ لائی اور وہ جج صاحب کے لیے مخصوص کمرے میں لٹکا دیا گیا۔

اس خاطر تواضع کے انتظام کے سلسلے میں زہرہ کے سونے کے بندے بھی مہاجن کے یہاں پہنچ چکے تھے لیکن اس نے اس کی تلافی یوں کر ڈالی تھی کہ پڑوس کے پنڈت جی (جو کبھی ڈیوڑھی پر منشی تھے) کی بیوی سے پانچ چھ زیور منگا کر خود پہن لیے تھے اور زہرہ کو بھی پہنا دیے تھے۔

خود حامد علی بیوی سے چھپائے دل میں ایک راز رکھے ہوئے تھے۔ فیروزہ کے ساتھ شہاب کی منگنی کے خیال کو تو وہ محض خیالِ

کا خواب سمجھتے تھے۔ بھلا کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ البتہ اس نے طے کیا تھا کہ کھانا کھانے کے بعد حسب معمول جب بھائی صاحب تنہائی میں لیٹیں گے تو وہ ان کو اپنی مصیبتیں سنا کر اور خصوصاً یہ بتا کر کہ باپ کی تیمارداری کے لیے اس نے اپنی اچھی بھلی نوکری چھوڑ دی تھی اور اپنی بیوی کے دس ہزار روپوں کے زیور ان کے علاج میں صرف کر دیے تھے وہ ان سے درخواست کرے گا کہ وہ کم سے کم اسے تین ہزار روپے ضرور دیدیں تا کہ اس کے دو کھیت جو کئی برسوں سے گروی پڑے ہیں انھیں وہ چھڑا لے۔

شاہد علی کی چمچماتی شیورلٹ کار ہارن بجاتی محل سرا کے ایک ٹوٹے غائب پھاٹک میں داخل ہو کر جیسے ہی برآمدے کے سامنے رکی حامد علی نے بڑھ کر اس کا پٹ کھولا، شاہد علی برآمد ہوئے تو وہ ان سے لپٹ گئے۔ شاہد علی خاموش کھڑے حویلی کے کھنڈر اور ملبے کے ڈھیر دیکھتے رہے۔ ان کی بیوی فرزانہ دھوپ کی عینک لگائے اور ناک پر رومال رکھے اُن کے پیچھے تھیں۔ موٹر کی آواز سے تماشائیوں کا ایک ہجوم باہر سڑک پر جمع ہو گیا تھا۔ زہرہ اور فیروزہ بروسٹے کے پردے سے سر نکالے جھانک رہی تھیں۔

برآمدے کے سامنے کھڑے ہو کر شاہد علی نے غم اور غصے کے لہجے میں کہا "یہ محل سرا کی کیا درگت بنا رکھی ہے تم نے؟"

"آدھی سے زیادہ محل سرا تو ابا کی زندگی ہی میں گر گئی تھی۔ اور یہ باہر کا بیٹھکا چار سال ہوئے گر گیا" حامد علی نے مجوب لہجے میں کہا۔

"جب مرمت نہیں کراؤ گے تو پھر گا کیا؟" شاہد علی نے درشتی سے کہا۔

"ابا کی تیمارداری کرنے کے لیے ان کے حکم سے جب میں نے نوکری چھوڑی ......" حامد علی پوری بات بھی نہ کہہ پائے کہ ملبہ دیکھنے کے لیے شاہد علی دوسری طرف مڑ گئے اور اسی وقت لالہ شوبھارام بھی آگئے اور انھوں نے بڑے ادب سے دونوں بھائیوں کو نمستے کیا۔

شاہد علی نے شوبھارام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "لالہ تم کل آجاؤ میں اپنے حصے کی محل سرا کا بیعنامہ لکھ دوں گا۔ لیکن دام جو میں نے بتائے ہیں اس میں کمی نہیں ہوگی"

شوبھارام نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "مگر حضور نے کی حالت تو دیکھ ہی لی۔ اب اس میں رکھا ہی کیا ہے؟"

"خیر دام کل ہی طے ہو جائیں گے" کہتے ہوئے شاہد علی بیوی کی طرف جو ساکت برآمدے کی سیڑھی کے نیچے کھڑی تھیں ات اور دونوں موٹر میں ڈرائیور کے پٹ کھولنے پر بیٹھ گئے۔ حا کہنے کے لیے دوڑے کہ کھانا تیار ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ ان کے آواز نکلے شاہد علی نے کہا "تم نے اپنی نوکری چھوڑ کر بڑی حما کی۔ جذباتی لوگ زندگی میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے" اور موٹر فراٹے کے ساتھ چل پڑی۔



غزل

بے رخی کا تری ملال نہیں
تجھ سے شکوہ مری مجال نہیں

تم پشیماں نہ ہو خدا کے لیے
یہ فسانہ ہے عرضِ حال نہیں

اک نظر دیکھیے زمانے کو
کون ہے غم سے جو نڈھال نہیں

یوں تو جینا محال ہے لیکن
تم جو چاہو تو کچھ محال نہیں

بیکراں آئنہ کو حیرت ہے
آپ کے حسن کی مثال نہیں

ایس۔ بی۔ ایل۔ ورما بیکراں
سرایں اسٹیشن۔ سیتاپور

جشنِ جمہوریہ

بشیر فاروقی
نمبر ۱۵ - اکھاڑہ کریم اللہ شاہ
مراد علی لین - لکھنؤ

رہنے والو دیارِ گاندھی کے
جشنِ جمہوریہ کا یوم ہے آج
ہر طرف رنگ شادمانی ہے
کس قدر خوش ہر ایک قوم ہے آج

دھڑکنیں جذبۂ اخوت میں
کہہ رہی ہیں دل و نظر کو سلام
حریت کی حسین شہزادی
لکھ رہی ہے نئی سحر کو سلام

اک نئی صبح کی کرن پھوٹی
کھل اٹھے مسکراہٹوں کے چمن
زندگی کے لیے بنا ماحول
شمعِ عزم و عمل ہوئی روشن

خوں سے لکھا تھا جو شہیدوں نے
وہ فسانہ بھی ہم کو یاد آیا
جب تھی ہونٹوں پہ مہرِ پابندی
وہ زمانہ بھی ہم کو یاد آیا

الجھنیں آئیں، مشکلیں آئیں
پھر بھی ہم لوگ مسکراتے رہے
ناامیدی کی رہ گزاروں پر
حوصلوں کے دیے جلاتے رہے

روشنی مل گئی اندھیروں کو
اور حالات خوشگوار ہوئے
یہ وہ دن ہے کہ جب ہم اہلِ وطن
سارے عالم میں باوقار ہوئے

اِن اجالوں کا احترام کرو
جو ملے ہیں عطائے حق کی طرح
آج کا دن بہت مقدس ہے
وید و انجیل کے ورق کی طرح

وقت آواز دے رہا ہے تمہیں
نفرتوں کے دریچے بند کرو
زندگی کی حسین قدروں کے
پرچمِ شوق کو بلند کرو

ہم نے پائی ہے زندگی جس سے
ہم مٹیں گے اسی چمن کے لیے
آؤ مل جل کے ہم یہ عہد کریں
ہم جئیں گے سدا وطن کے لیے

(افسانہ)

شمیم صادقہ
شعبۂ اردو۔ گورنمنٹ ویمنس کالج
مریم منزل گردنی باغ۔ پٹنہ
۸۰۰۰۰۲

ایک اور پیالہ

وہ ایک جھلسا دینے والی دوپہر تھی، تند ہوائیں چل رہی تھیں سارے افراد دروازے کھڑکیوں کے سیاہ پردوں کے اندر کولر کی خنکی میں گہری نیند سو رہے تھے کہ اس کی بے چینی حد سے بڑھ گئی۔

ویسے بھی نیند گہری پرسکون اور خواب آفریں نیند اس سے پتہ نہیں کب کی روٹھ چکی تھی۔ رات کو بھی، جب سارے افراد سو جاتے، ایک دن کا صدیوں پہ محیط تاریک ختم ہوتا، وہ تھک کے چور چور ہو جاتی، جب بھی وہ بستر پر لیٹتی تو بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگتی جیسے بستر کی تہہ میں کانٹے پیوست ہوں، کبھی اٹھ بیٹھتی کبھی ٹہلنے لگتی اور اسے محسوس ہوتا جیسے دن بھر کی مشینی مصروفیت سے کہیں زیادہ کٹھن آرام کے ان لمحوں کو جھیلنا ہے' جب خود کو مصروف رکھنے کا کوئی ذریعہ بھی نہیں ہے اور نہ خود کو بھلا دینے کے لیے بیتے دنوں کی خوشگوار سی یادیں ہیں۔ وقت کی تیز آندھی نے تو اس شیرازے کو کب کا بکھیر دیا جس کے بعض صفحے اب بھی لاشعور میں پھڑپھڑایا کرتے ہیں مگر یہ صفحے اپنا سیاق و سباق کھو چکے تھے ——— اور تشنہ معنویت کا زہر اپنی تاثیر کھو چکا تھا۔ حالات کے لق و دق صحرا کی جلتی ہوئی ریت کے لیے وہ کس سے شکایت کرتی۔ اسے نہ تو اپنے پیروں کے آبلوں سے کوئی شکوہ تھا اور نہ وہ ان کے لیے کسی ٹھنڈے سایے کی متلاشی تھی۔ کبھی بھی نہیں۔ بلکہ وہ اپنے دکھوں سے انتقامی خوشی محسوس کرتی اور کہہ اٹھتی ——— "تم جانو ——— اور تمہارا فلسفۂ حیات!" ان بے چین لمحوں میں وہ خود کو بزی رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی۔ مگر یہ ہوتا کہ وہ کچھ پڑھنا چاہتی ——— اور کچھ دیر بعد ہی لگتا جیسے الفاظ سارے کے سارے متحرک ہو کر اس کے گرد آسیب کا حلقہ بنانے لگے ہوں اور وہ ان کی بے رحمی سے تنگ آ کر، کچھ سرہانے کی میز پر رکھ دیتی، کچھ تکیے کے نیچے ڈال دیتی اور روشنی مدھم کر کے سونے کی کوشش کرنے لگتی ——— مگر بھلا یوں بھی سوا ہے۔ اس کے اندر بڑی نفاست پسندی تھی اور کتابوں کی وہ بڑی کیا کرتی تھی ——— یکبارگی عجیب سی بے چینی در آتی ——— اور تھوڑی دیر کروٹیں بدلنے کے بعد، پھر ٹیوب لائٹ آن کر کے ساری کتب قرینے سے رکھ دیتی، بستر کی شکن ٹھیک کرتی ——— دعائیں کرتی ہوئے خوشگوار لمحوں کے چھلنی چھلنی سائبان کے نیچے تھکے ہوئے کو تھپکیاں دیتی کہ شاید اسے نیند آ جائے۔ مگر پھر وہی بے چینی۔ کر چھت کے سفید اور دیواروں کے سبز رنگ کو تکتے تکتے آنکھیں تھ لگتیں ——— اور جب صبح کی نقیب چڑیاں چہچہانے لگتیں تب وہ خود کو نیند کے اندھیرے غار میں ڈوبتا ہوا محسوس کرتی غار گہرا ہوتا جاتا ——— اور گہرا ——— کہ اچانک صبح کی چہل پہل شروع ہو جاتی۔ چائے کی پیالیوں کی آوازیں کھنکنے لگتیں۔ سارے افراد رات بھر سو کر ہشاش بشاش پھرنے لگتے ——— وہ چاہتی کہ گھنٹوں سوتی رہے مگر اس کی نازک سی نیند تو جاگنے کی پہلی کرن سے ہی ٹوٹ جایا کرتی ——— آوازوں کے اس بڑھتے ہوئے شور میں بھلا سونا کہاں ممکن تھا۔ مجبوراً بستر سے اٹھ جاتی تو لگتا آنکھوں میں مٹھی بھر ریت بھر گئی ہو۔ طبیعت میں عجیب چڑچڑاپن ——— تھکاوٹ اور اضمحلال ——— پھر بھی وہ دن بھر خود کو مشینوں کی طرح مصروف رکھتی ——— کوئی سا موسم ہو، دوپہر میں سونے کا سوال ہی نہ تھا ——— سونا چاہتی مگر بے چینی کے اس پہچانے ہوئے عذاب کو جھیلنے سے بچنے کے

لیے، وہ کبھی کچھ لکھنے لگتی ——— کبھی کچھ اور کرتی — ڈاکٹروں نے اس کی صحت کے لیے سخت تشویش کا اظہار کیا تھا۔ مگر وہ خود حفاظتی کا احساس کھو چکی تھی — زندگی جتنی مختصر ہو، اچھا ہے — اس کے باوجود اگر کوئی بہت خلوص سے اس کی گرتی ہوئی صحت کے متعلق کچھ کہتا تو رو پڑتی — اپنے آنسوؤں پہ اسے قطعی اختیار نہ تھا اور نہ باتیں کرنے کی عادت تھی۔ اور پھر جو جہنم اس کے اندر سلگا کرتا ہے، کیا وہ اظہار کے احاطے میں سمٹ سکتا ہے؟ شاید اسی لیے ایک زیرِ لب طنزیہ سی مسکراہٹ کے سوا اس کے پاس کوئی جواب تھا بھی نہیں! ——— اسے تو اپنے نام سے بھی نفرت تھی۔ اگر اپنے نام کے جزوی حصے کے استعمال کا بھی موقع ہوتا تو وہ اوائڈ کر جاتی ——— یہ عدم اعتمادی نہیں بلکہ ایک طرح کی بیگانگی تھی جسے کرب کی شدت نے پیدا کیا تھا۔ جبھی کہ اگر کوئی بہت خلوص سے کسی آؤٹ سائڈر سے اس کے متعارف کراتا تو وہ بے بسی سے ایک ٹک، دیکھتی رہ جاتی جیسے اس کی ہزار داستان آنکھیں کہہ رہی ہوں۔

"پلیز ——— ایسی بے رحمی نہیں ——— اس کی چمک سے کن زخموں کے ٹانکے ٹوٹتے ہیں، کیا آپ نے اندازہ کیا ہے کبھی؟"

مگر وہ کچھ بھی نہ کہہ پاتی ——— صرف یہ ہوتا کہ بہت ہی گھسی پٹی فارمیلیٹی کے ساتھ 'وِش' کر دیتی ——— کبھی 'آداب' تو کبھی "ہیلو!" —

یہ ہمیشہ ہوا کرتا ——— یہ سب نیا نہ تھا۔ مگر اس آتشیں دوپہر کو وہ عجب طرح سے بے چین تھی۔ حالانکہ کئی فارمل خطوط کے جواب لکھنے تھے ——— چند ایک اچھے رسالے تھے جنہیں وہ لفظ بلفظ پڑھنا بھی چاہتی تھی ——— مگر یہ مخصوص لمحے کہ اُسے فراز بہت یاد آ رہا تھا ——— ویسے تو ہر پل اس کی یادوں کا سایہ تھا۔ مگر ان شبنمی یادوں پہ انگاروں کی بارش سی ہونے لگی تھی۔ اس نے چاہا کہ وہ کہیں سے بس اسے ڈھونڈ لائے۔ اس قدر شدت سے پکارے کہ چٹانوں کا یہ آبلہ پا مسافر، گلزاروں کی طرف لوٹ آئے۔

فراز اور صرف فراز۔ مگر وہ کس قدر دور تھا۔

اس پل اسے شدت سے محسوس ہوا تھا۔ باہری نہیں اندرونی فاصلہ بھی بہت اہم ہوتا ہے — اور اسی طرح کوئی ہر لمحے شہ رگ کے پاس ہو تو بھی دل کبھی شدت سے باغی ہو کر اسی سے باتیں کرنا چاہتا ہے ——— کیا اہم ہے اور کیا اہم نہیں ہے؟ یہ فیصلہ تو کب کا ہو چکا — پھر یہ اکثر ایسے کیا ہو جاتا ہے؟ کیا وہ جانتی نہیں کہ صورتِ حال کیا ہے؟ — وہ چاہے بھی تو اس کے پاس نہیں آ سکتا اور نہ وہ اس سے مل نہیں سکتی۔ کچھ دیواریں حالات کی بنائی ہوئی تھیں — مگر ان دیواروں کی نیونہیں نے ڈالی تھی۔ کیا وہ خود اُسی نے نہیں؟ پھر وہ اتنی ناسمجھ اتنی جذباتی کیوں ہو جاتی ہے —؟ — اس نے خطوط کے جواب دینے کی کوشش کی، مگر لگا جیسے دو تین سطروں کا رسمی جواب دینا بھی اس کے بس کا نہیں — ایک دفعہ ایک ایسے ہی کمزور لمحے میں اس سے کتنی بڑی نادانی ہو گئی تھی اسے فراز کو بھی خط لکھنا تھا اور اسی شہر میں رہنے والی ایک عزیزہ کو بھی ——— اور فراز لیں ذہن پہ حاوی تھا کہ پتے بدل گئے تھے ——— بیچاری عزیزہ نے وہ صفحہ یہ کہہ کے واپس کر دیا تھا کہ "شاید جلدی میں آپ نے کسی کہانی کا درمیانی صفحہ مجھے بھیج دیا ہے۔ وہ ادھوری رہ کے برباد نہ ہو جائے اس لیے واپس کر رہی ہوں۔"

اور وہ کہانی کے اس درمیانی ادھورے صفحے کی نوعیت کو سوچ کر رو پڑی تھی! ——— دوسری طرف فراز کو وہ گھریلو خط ملا تو وہ بھی اس کی ذہنی کیفیت سے گھبرا اٹھا تھا — اور وہ ان دونوں کے ذہنوں کے آئینے میں خود کو دیکھ کر بہت دکھی ہوئی تھی! ———

خود کو .... سمجھانے کے لیے بہت کچھ سوچ لینے کے بعد بھی دل کی اداسی سے جکڑن اور ذہن کی بے چینی ختم نہ ہو سکی۔ سارے لوگ بے خبر سو رہے تھے۔ وہ وحشت زدہ سی ان سوئے ہوئے معصوم چہروں کو دیکھتی رہی ——— مگر پھر بھی سکون نہ ملا۔ مثلاً اس کا جی چاہا کسی سے بہت ساری باتیں کرے — بالکل

ہی پرخلوص انداز سے سچی باتیں ——— ویسے بھی اسے جھوٹ سے نفرت تھی ——— مگر کس سے ؟ ——— ایک ایک کرکے اس نے اپنی ان تمام سہیلیوں کو یاد کیا جن کے نمبر اس کے ذہن میں محفوظ تھے۔ مگر وہ ان سے کون سی باتیں کرسکتی تھی

پھر وہی فارملیٹی، پھر وہی خرافات ——— پھر وہی بھرم ——— اس کا جی چاہا، وہ ان حدوں کو توڑ کے کسی سے فراز کی باتیں کرے ——— فراز کی شخصیت کے ان اجالوں کی باتیں جسے عام سطحی لوگ اندھیروں سے تعبیر کرتے ہیں ——— مگر اس کی طرح اسے جاننے والا ہے کون ——— ؟

لامحالہ اس نے ایک نمبر ڈائل کیا ———،

اور اس آواز میں کچھ ایسی بلا کی کشش تھی کہ مغرور ہونے کی حد تک ریزرو اور سیلف سنٹرڈ ہونے کے باوجود وہ بول اٹھی ———

" جی ——— ہاں۔ آج کسی سے باتیں کرنے کی بہت خواہش ہوئی۔ اس لیے آپ کو زحمت دی ——— غالباً آپ بہت بزی ہیں۔ اور یوں ڈسٹرب کرنے پر جھلا گئے ہوں گے"!

عین اسی پل لاشعور نے اعتراف کیا، وہ فارملیٹی کے ساتھ باتیں تو بنا سکتی ہے مگر فراز کا نام لبوں زبان پر نہیں لا سکتی ——— کہ اندر کے معبد کا وہ تنہا بت، صرف اسی کا ہے ———

دوسری طرف اس مخصوص آواز نے کہا تھا۔

" ایسا اکثر ہوتا ہے ——— جب آدمی اندر کی آوازوں کو دبانے کے لیے باہر کے ہنگاموں کا سہارا لیتا ہے۔"

وہ سوچ رہی تھی، آواز کا شخصیت سے کتنا گہرا رشتہ ہوتا ہے ——— بعض آوازیں واقعی انسان شناسی، نفسیاتی آگہی اور بزم مزاجی کا آئینہ ہوتی ہیں ——— مگر وہ اندر ہی اندر لرز گئی ——— کیا وہ اس طرح ٹوٹ چکی تھی کہ اس کا بکھرنا محسوس کیا جانے لگا ہے مگر نہیں اس نے تو خود سے بھی خود کو چھپا رکھا ہے ——— بھلا آئیڈیلزم کے حصار میں اپنی تمناؤں کو سنگسار کرنے کا ماحصل یہی ہے کہ دیواریں ٹوٹ کے گرنے لگیں ——— اور وجود کے شہ ریزے

ریت کے کن بن کر آنکھوں میں چبھنے لگیں ؟ ——— اگر زخم اپنی پہچان بن کر خون آلودانی، سامنے رکھ کر گہرائی کا خراج مانگے تو ایسے کرب پہ لعنت ہے ! ——— پھر یہ اتنا ہمدردانہ لہجہ کیوں ؟ ——— یہ نرمی اور اخلاق مندی، غالباً اس کی ذاتی صفت ہے، وہ ہرگز تشنگی داماں کا اشتہار نہیں بنی ہے، یہی سوچ کر اسے سکون سا محسوس ہوا ——— اس آواز میں عجیب سی شریت تھی، گہرا کرب ——— اور بڑی بیگانگی ——— بازیچۂ اطفال ہے دنیا میرے آگے ! ——— پتہ نہیں مصرع غلط ہے یا صحیح۔ اسے کبھی اشعار ٹھیک طرح سے یاد نہیں رہے۔ ایک دفعہ فراز نے اس کے سامنے بڑی پیاری سی غزل کہی تھی ——— اور جب اس نے اشعار صفحے پر محفوظ کر لیے تو اس کے متھورے محض یادداشت کی بنا پر ان اشعار کو سن کر ہنس پڑا تھا ———

"——— اگر مجھے پتہ ہوتا، تم میرے اشعار کا یوں حلیہ بگاڑو گی تو میں شاعری چھوڑ دیتا ———" اور وہ اس کی جھلاہٹ پہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی تھی ——— !

" اچھا ——— چند ایک اچھے اشعار سنیے ——— ذہن کا رخ بدل جائے گا ———" اس نے کہا،

واقعی بہت اچھے اشعار تھے ——— نہ جانے کس کس کے ——— مگر پھر اس نے محسوس کیا، اشعار میں تو جو کچھ ہوتا ہے وہی تھا۔

دراصل وہ لفظ لفظ کو سنبھال کر پڑھنے کا حسن تھا کہ وہ اتنے قیمتی اور اثر انگیز محسوس ہونے لگے تھے

" خدا حافظ "! ——— اس نے گھبرا کر ریسیور رکھ دیا۔ نہ جانے وہ کیا کیا کہنا چاہتی تھی ——— گفتگو کی بے ربطی سے اسے محسوس ہوا کہ جیسے یہ کلاکہ شیشہ گری، یہ ذاتی اور غیر ذاتی گفتگو کی معنویت اسے چکنا چور کر دے گی ——— بھلا وہ کیا باتیں کر سکتی ہے ؟ ——— وہ سسک کر رو پڑی ——— !

" فراز ——— کاش تم دیکھ پاتے کہ تمہاری یاد مجھے کن تھپیڑوں کے حوالے کر دیتی ہے کہ میں خود کو ہی بزدل، کمزور اور خوفزدہ

محسوس کرنے لگتی ہوں"

کئی دن تک وہ اپنی شکست کے باہر کی جواز تلاش کرتی رہی ــــ جیسے ہی دوپہر کی لو اور تپش بڑھنے لگتی وہ کسی کام میں خود کو اس قدر بری کر لیتی کہ شکست کا خارجی اور فراز کا داخلی احساس سر نہ ابھار سکے ــــ کبھی کچھ سلنا، کبھی کچھ لکھنا، کبھی اسکیچنگ ــــ تو کبھی پینٹنگ ــــ مگر دو چار دن بعد پھر اسے خواہش ہوئی، اسی مخصوص آواز کو سننے، جس میں خلوص کی نرمی، بڑی ہی شائستگی اور بہت اپنا پن تھا۔ وہ پھر نمبر ڈائل کر کے دم بخود رہ جاتی کہ کہنے کو ہے کیا؟

اندر اندر جھلایا کرتی کہ وہ خود ہی اس کے اندر کے اکیلے پن کو محسوس کر کے جیسے فلاں اور فلاں کا ذکر کرتا ہے، ویسے ہی فراز کی باتیں کیوں نہیں کرتا ــــ؟ ایز این آؤٹ سائیڈر، تو فراز کی اپنی اہمیت تھی ہی ــــ مگر یہ کلیش، ٹکراؤ، صرف اتفاق، کی بات ہو سکتی ہے ــــ اور زندگی کے طوفانی دریا میں اتفاق کی اہمیت کیا تھی ــــ؟ وقت کی آندھی تو اتفاقات کے خیمے کب کی اکھاڑ چکی ہے۔ پھر یہ اسے کس مخصوص لمحے کا انتظار ہے ــــ تو۔ سپریم ــــ یہ تصور تو نقش بر آب ثابت ہو چکا ہے ــــ مگر پھر اسے خود ہی ہنسی آ جاتی

"کیا ایسا ممکن ہے ــــ؟ کیا وہ اس آئینے کا سامنا کر سکے گی ــــ؟ اگر وہ فراز تو کیا، پاکستانی شاعر احمد فراز کا بھی ذکر، بھولے سے کر دے تو وہ شاید اس طرح بکھر جائے گی کہ اس کا سمٹنا ناممکن ہو جائے گا۔

پتہ نہیں کیوں وہ اس طرح بے کل سی تھی ــــ اس کا جی چاہا، فراز کو بہت طویل خط لکھ کے جھنجھوڑ ڈالے۔ اسے لکھ دے کہ مجھ سے یوں نہیں جیا جاتا ــــ تمہاری جلاوطنی ختم ہونے تک خون کے قطروں سے انتظار کے دیئے جلائے رکھنے تک میری زندگی ساتھ نہیں دے سکتی ــــ مجھ سے یوں نہیں جیا جاتا، خود سقراط وقت بنے پھرتے ہو اور زہر کا پیالہ مجھے پینا پڑتا ہے ــــ" مگر اس کے نام خطوط لکھ لکھ کر پھاڑتی رہی۔ بغیر پوسٹ کیے ــــ کیونکہ اپنی ضد میں آ کر اس نے اسے نہ لکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا ــــ اور وہ بہت ضدی تھی ــــ اس نے فراز کے جلے کٹے اشعار سنے تھے۔ اس کی بچوں جیسی جھلاہٹ پہ ہنسی آ گئی تھی ــــ شاید جو بہت اپنا ہوتا ہے اس سے کبھی ایسی ناراضگی نہیں ہوتی جو نفرت کی تخم کاری کر سکے۔

ضبط کے جذبے پہ بہت ناز تھا تمہیں ــــ بابا، میں ہر طرح ویکیوم کو جانتی ہوں ــــ مجھ پر تمہارا یہ پوز کرنا شروع سے ہی فضول تھا ــــ میں اپنے اصولوں کی پابند ہوں ــــ اب دیواروں سے سر ٹکرایا کرو ــــ پھر بھی اگر تمہیں خود پہ گھمنڈ محسوس ہو تو ــــ اس کے کیا معنی؟" ــــ

"تم اپنے کسی خط کی ہزار نقلیں کر ڈالو ــــ انہیں مجھ تک پہنچانے کی ہمت تم نہیں کر سکتے ــــ اس حد تک تو مجھے جانتے ہو۔ پھر بھی وہی بھرم ــــ وہی خود فریبی ــــ تو یہ ہے ا ـــ وہ سوچ سوچ کے کڑھتی رہتی ــــ بے اختیار ہو کے جی چاہنے لگتا۔ وہ اس سے ان بچوں جیسی حرکتوں کا سبب پوچھے، مگر وہ اپنے احساسات کو کبھی پوسٹ نہ کر سکی۔

یہ سب کہنا اور سننا اسے بہت سطحی محسوس ہوتا۔ جیسے وہ اس کی طفلانہ حرکتوں کا سبب جان کر ہنس دیا کرتی اسے یہ بھی یقین تھا کہ وہ بھی سب کچھ سمجھتا ہے۔ اسے تو فراز کی شخصیت پہ فخر تھا۔ وہ اس کے اندر رہتہ بہ رہتہ چھپی ہوئی معصوم ہستی کی پرستش کرتی تھی ــــ پھر وہ غلاف کے اعتراف کے لیے یہ ضد کیوں تھا؟ یہ ناراضگی، کب، کیسے اور کہاں شروع ہوئی تھی اسے اب بھی یاد تھا ــــ اور اس دن بھی وہ اس سرہانے پہ سر رکھ کے رو پڑی تھی ــــ

"یہ صرف تم ہو ــــ صرف تم"

اور فراز کی کھوئی کھوئی، سوچتی ہوئی بے چین آنکھیں ذہن کی پرتوں میں دھنستی گئیں ــــ پتہ نہیں کیوں، اسے بہت دکھ ہوا تھا ــــ وہ اپنا انداز فکر فراز تک کبھی سچ سچ منتقل نہیں کر سکی ــــ کبھی بھی نہیں! ــــ وہ اپنی زندگی اور اپنے ذہن

کے جہنم کا ذمہ دار خود تھا ـــــ شاید وہ اس کی کوئی بھی نہیں تھی ـــ اسے ایک ایسا ہی شعر یاد آیا ـــ فاصلہ نہیں تھا، پھر بھی تمام عمر اجنبیوں کی طرح رہے ـــ توبہ ہے! ـــ وہ پھر الجھ گئی ـــ اشعار کبھی صحیح یاد نہیں رہتے اور بعض اچھے اشعار یاد بھی آتے ہیں تو غلط سلط اور بدلی ہوئی شکل میں ـــ جس کا شعر ہو، وہ اگر ان اشعار کا بگڑا ہوا چہرہ دیکھے تو نہ جانے کس قدر خفا ہو ـــ اگر کسی کی تخلیق کو کوئی انجانے میں ہی سہی، بگاڑ کے رکھ دے تو سچ ہے، خالق کو تکلیف ہوگی ہی ـ ـــ پھر جب کوئی نام بھی ذہن میں نہ ہو تو کس سے معافی مانگی جائے ـــ اور پھر کس کس سے ـــ ویسے بھی اپنی اس لاشعوری عادت سے اسے بہت چڑھ تھی ـــ وہ بے حد مہذب بھی تھی اور شائستگی اسے بہت عزیز تھی ـــ خواہ مخواہ کسی کا دل دکھا دینا اسے اذیت ناک محسوس ہوتا ـــ کون سمجھے گا کہ اس کے اندر میدان حشر ہے اور اس کے باہر صحرا در صحرا ـ وہ خود سے بہت پریشان بھی تھی اور متنفر بھی! ـــ

اسے لوگوں کی بھیڑ سے بھی بڑی وحشت ہوتی ـــ وہ بنیادی طور پر ہجوم، کی شخصیت نہیں تھی اور پھر بہت سارے لوگوں کے درمیان فراز کی کمی اسے ماحول اور وقت کے تقاضوں سے بے پروا کر دیتی ـــ اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا ـ ـــ وہ وحشی ہرنی کی طرح راہ فرار تلاش کرتی ہوئی، یکبارگی بھری محفل سے اٹھ جاتی ـــ لوگ اس کے اٹی کیٹ پر حرف زنی کریں تو کریں، ـ مگر وہ خود کو بے بس محسوس کرتی ـ ہاں یہ سلسلہ کچھ ایسا بے اختیار ہو چلا تھا کہ کچھ بھی اس کے بس میں نہ رہا ـ بہت ہمت کر کے خود کو بچوں کی طرح سمجھا بجھا کے آمادہ کرتی، اور پھر ضدی بچے کی طرح خود ہی اپنے آپ سے روٹھ جاتی ـ

"نہیں فراز ـ مجھ سے ایسے نہیں جیا جائے گا"ـ اُسے تو اب چند دنوں کا بھی اعتبار نہ تھا ـ اگر کوئی دو دن بعد کے کسی پروگرام میں بھی اُسے مدعو کرتا تو وہ بہت گھبرا جاتی ـ انجان سے خوف کے تحت اُسے یقین ہو جاتا کہ وہ شریک ہو ہی نہیں سکے گی ـ اسی لیے قبل از وقت معذرت کر لیتی ـ وقت کی اس بے اعتباری کی جڑیں وہاں پیوست تھیں جہاں فراز کی غلط فہمی منجمد تھی ـ اُسے کسی آنے والے پل کا یقین نہ تھا ـ اور کبھی جب لمحے اُسے دو دھاری تلوار کی طرح کاٹنے لگتے تو وہ گھبرا کے اُس کو فون کرتی جو فراز تو نہیں مگر فراز ہی کا کوئی اپنا تھا ـ اس لیے کہ اس کی باتوں میں بڑی سچائی اور اس کے لہجے میں بے پناہ خلوص ہوتا ـ اور یہ خلوص اُسے از حد قیمتی محسوس ہوتا ـ وہ احساسات کی قدر و قیمت سمجھتی تھی ـ اسی لیے گہری عقیدت مندی کے ساتھ ـ اس کی آواز سے مسحور ہو کر گھنٹوں بے سر پیر کی باتیں کیا کرتی ـ ان باتوں کا کوئی خاص مفہوم نہ تھا کوئی سطحی معنویت بھی نہ تھی ـ لیکن یہ دنیا بڑی سطحی واقع ہوئی ہے ـ لوگوں کو اسکینڈلز سے لاشعوری آسودگی ملتی ہے اور سلف کی تشفی کے لیے یہ سطحی لوگ کسی کو کسی بھی حد تک کھینچ سکتے ہیں' ـ اُس دن، کچھ لکھتے ہوئے اچانک اُس نے سوچا اور فیصلہ کر لیا ـ "یوں وہ بار ـ بار کسی کو پریشان نہیں کرے گی. باتوں کا یہ سلسلہ کیا پتہ، میری یا اس کی پریشانی کا سبب بن جائے کہ نہ جانے ان لایعنی باتوں کا سلسلہ کوئی آؤٹ سائیڈر کہاں سے جوڑ دے ـــ'ـــ

دراصل اس کے لاشعور نے اُسے ٹوکا تھا ـ! وہ اس مخصوص، پرکشش آواز کی عادی ہوتی جا رہی ہے ـ عقیدت اور احترام کے احساسات بڑے نازک ہوتے ہیں ـــ ان کی معنویت کوئی بھی بڑی آسانی سے بدل سکتا ہے ـــ یا کیا پتہ نئے معنی شناخت کے لیے شعور پہ دستک دینے لگیں ـ جب اندر کی بے پناہ ہنگامہ خیزیاں سینے کی دیواریں توڑ ڈالتی ہیں تو رکا ہوا طوفان کسی بھی رخ سے کنارے کی دھرتی کو بہا لے جاتا ہے ـــ چلتے چلتے جب پاؤں میں آبلے پڑ جاتے ہیں تو ببول کی جھاڑیوں کو دیکھ کر بھی قدم رکنے لگتے ہیں ـــ اور وہ تو سایۂ گل کی طرح ہی فرحت بخش اور خوش گوار تھا،

وہ خود اپنے ہی حضور میں جواب دہ تھی! ـــ یقیناً

(بقیہ صفحہ ۸۰ پر)

نقد و تبصرہ

تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں

نام کتاب : "بوڑھا درخت" مصنف : ڈاکٹر زرینہ ثانی
قیمت : پندرہ روپے۔ ملنے کا پتہ : جے ۱۲ راجوری گارڈن
نئی دہلی ۲۷،۰۰۱۱

بوڑھا درخت ہوں مجھے جڑ سے اکھاڑ دو
میرا پھٹا ہوا ہے لباس اور پھاڑ دو

ظاہر ہے کہ اس کتاب کا نام اسی شعر سے چنا گیا ہے ڈاکٹر زرینہ ثانی نے اپنی قلمی اور علمی روانی کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے یہ کتاب چونکہ ضیا فتح آبادی پر ایک مطالعہ اور تذکرے کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے اس کے تمام تر حقوق ڈاکٹر زرینہ ثانی نے ادا کیے ہیں۔ ضیا فتح آبادی کی ہفت رنگ تخلیقی جہم ان کی سوانح ان کا زبار حیات سب کچھ اس کے دامن میں روشن ہے۔

آغاز اوراق میں ڈاکٹر عنوان چشتی نے شاعر کی عظمت افکار کا جس زاویۂ نقد و نظر سے اعتراف کیا ہے وہ پوری کتاب کے جملہ نظائر و مقاصد کا احاطہ رکھتا ہے۔ بلاشبہ ضیا صاحب سیماب اکبرآبادی سے وابستگی کے سبب فی زمانہ ان کے اسکول کی نمایندگی کرتے ہیں اور تمامی اصناف سخن میں دسترس رکھنے کی بنا پر ان کے فن کو تقلید کے لیے منتخب کیا جا سکتا ہے موصوف نے عمر کے گھٹتے ہوئے زینوں کے باوجود ہر دور میں بے شمار مسائل کے دباؤ کا اثر قبول کیا ہے اور پوری واقعیت سے اس کا اظہار اپنے پیرایے میں کیا ہے۔

ڈاکٹر زرینہ ثانی کی یہ چوتھی پانچویں کتاب ہے۔ انھوں نے اتنی مفصل کتاب پیش کر کے اردو ادب کے ایک خاص مطالعے کی تکمیل کی ہے۔ کتاب کے آخر میں شاعر کے کلام کا شاہکار حصہ بھی شامل ہے۔ بوڑھا درخت واقعی پڑھنے والوں اور ادب کے باوقار پرستاروں کے لیے ایک نادر ترین انعام ہے۔

تسنیم فاروقی

نام کتاب : مشعل آزادی (حصہ اول ؟)
شاعر : ساغر نظامی۔ قیمت :۔ چالیس روپیے۔ صفحات ۳۱۹ معہ حواشی۔ ملنے کا پتہ :۔ پبلیکیشنز ڈویژن۔ پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی۔

ساغر نظامی کسی ایک فرد کا نام نہیں۔ ساغر نظامی نام ہے۔ ایک عہد ایک ادارہ ایک تہذیب اور ایک کلچر کا جو ایک درجن شعری تصانیف میں بکھرا ہوا ہے خصوصاً بادۂ مشرق۔ رنگ محل۔ موج و ساحل۔ شکنتلا۔ انارکلی۔ نہرو نامہ قابل ذکر ہیں اور اب مشعل آزادی کے نام سے ان کی شعری ریاضت کا یہ شاہکار منظر عام پر آیا ہے جسے حکومت ہند کے پبلیکیشنز ڈویژن نئی دہلی نے نہایت اہتمام خوبصورتی سلیقے اور طباعت کے بلند ترین معیار کے ساتھ شائع کیا ہے جس کے لیے شاعر کے علاوہ رام ڈھینجہ صاحب ڈائریکٹر پبلیکیشنز ڈویژن اور شہباز حسین صاحب مدیر ماہنامہ آجکل بھی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

اس طویل رزمیہ کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جس کے عنوانات ہیں نیرنگ آزادی۔ ارژنگ غلامی۔ رزداں دریا۔ شعلے کا سفر اور چشم خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا۔ ہندستان کی جنگ آزادی کے تعلق سے اگرچہ اردو کے مختلف شعراء وادیبوں نے حسب توفیق اپنے سرمایہ میں اضافہ کیا ہے مگر ساغر نظامی صاحب کی یہ طویل نظم "مشعل آزادی" اپنے طور پر ایک انفرادی اور اچھوتی کوشش ہے جس میں رزمیہ کا رچاؤ بھی ہے اور تہذیبی تاریخی اور تمدنی رکھ رکھاؤ بھی۔ اردو میں یقیناً ایسی مستقل اور مسلسل شعری ریاضت اس غزل زدگی اور تن آسانی کے دور میں بہت ہی صبر آزما اور قابل قدر چیز ہے۔ ساغر نظامی صاحب نے جس ولولے، جذبے اور خلوص کے ساتھ شہیدان وطن کی یادوں کو چمکایا اور روشن کیا ہے۔ وہ مشاعروں کی وقتی اور تفریحی داد تحسین اور تعریف و ستائش سے بالا تر ہے۔

ساغر نظامی صاحب خود بھی جنگ آزادی کے ایک جیالے اور بے باک سپاہی رہے ہیں اور یہ جذبہ ان کو اپنے خاندان سے وراثت میں ملا ہے۔ ان کے نغموں نے تحریک آزادی کے دشوار گذار مراحل میں کبھی برسر اقتدار افراد سے سمجھوتہ نہیں کیا۔

"مشعل آزادی" سادگی و پرکاری۔ آہنگ اور زور بیان کے ساتھ ساتھ لفظوں کے مناسب برتاؤ سلیقے اور دلکشی کا ایک "ایک ہمیشہ مہکنے والا گل دستہ ہے جو آنے والی نسلوں کے مشام جاں کو معطر کرتا رہے گا۔

"مشعل آزادی" اپنے رزمیہ شعری محاسن اور فنی رچاؤ کے ساتھ ساتھ ڈرامائی عناصر اور مکالماتی جواہر سے آراستہ ہے۔ جو اسٹیج کے فن کاروں اور ریڈیائی ڈراموں کے لیے بھی گراں قدر سرمایہ ہے۔ شاعر نے اس رزمیہ کے قاری کو ناظر بنا دیا ہے جس کی آنکھوں کے سامنے تحریک آزادی کے سارے مناظر گھومنے لگتے ہیں اور قاری خود اپنی ذات کو بھی اس تحریک میں شامل و شریک محسوس کرتا ہے۔ تحریک آزادی کے بہت سے سورما جو گردماہ و سال اور آشوب روزگار کی دھند میں اپنی شناخت اور پہچان کھو چکے تھے اپنی صلابت۔ حریت اور کردار کی عظمت کے ساتھ مشعل آزادی کے حوالے سے ابھر کر ہمارے سامنے آئے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ مشعل آزادی" ملک کے طول و عرض کے تمام اہم کتب خانوں اور درس گاہوں کی زینت بنے گی اور آزادی کے ادب کے سلسلے کی اہم ترین مطبوعات میں شمار کی جائے گی۔

ساغر مہدی



ایک اور پیالہ ۔۔۔ (صفحہ ۷۸ کا بقیہ)

اس پر بت شکنی کا الزام عائد ہو جائے گا۔ وہ جانتی تھی آدرشی شخصیت کا آئینہ ہوتی ہیں ۔ وہ بھی اسی کی طرح حساس، نازک طبع اور زود حس تھا۔۔۔

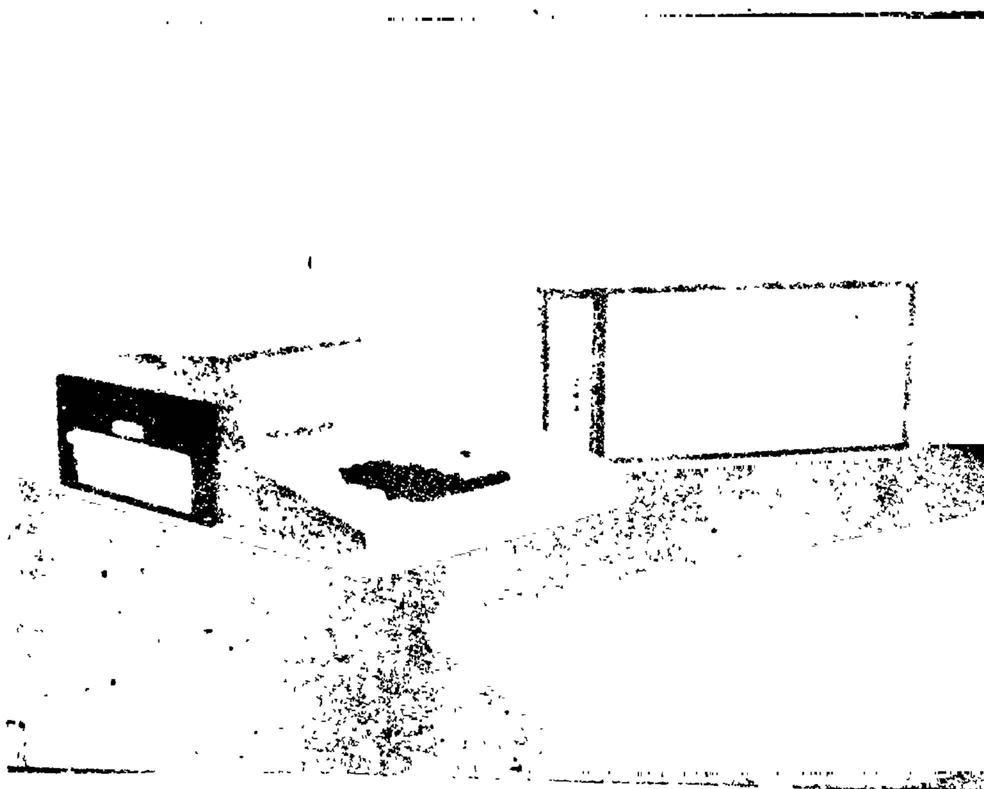
"نہیں فراز ۔۔۔ تمہارے دیئے ہوئے کرب کا یہ خراج نہیں۔ عظیم شخصیتیں لائق احترام اور قابل پرستش ہوتی ہیں۔" اور آخری بار ڈائل کرتے ہوئے، اس کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ اعتراف کا ۔۔۔ جواز کا ۔۔۔ خود وضاحتی کا ۔۔۔ آخر وہ کیا کہے ۔۔۔ ان لایعنی باتوں کی کیا توضیح وہ کر سکتی تھی ۔۔۔ یہ کرب و آگہی کے عجیب سے رشتے پہ ایک کھلا طنز تھا ۔۔۔ اس کی شیشے کی سی نازک شخصیت پہ پتھروں کی بارش تھی! ۔۔۔ کیا ۔۔۔ اور کیا؟ ۔۔۔

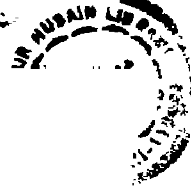
مگر اس مرحلے سے گذرنا ہی تھا ۔۔۔ پھر اپنی بے بسی کو سمیٹنے کے لیے ذہن کے صحرا کی تپتی ریت میں چھپے ہوئے جلا دینے والے پتھروں جیسے حالات سے گریز کر کے، بہت ہی نرم لہجے میں اس نے کہا ۔۔۔

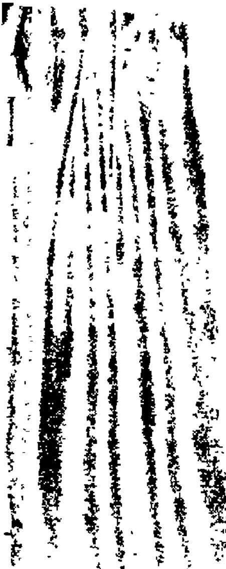
"معاف کیجیے گا ۔۔۔ ان دنوں بار بار فون کر کے آپ کا قیمتی وقت برباد کیا کرتی تھی ۔۔۔ دراصل ان دنوں مجھے کوئی خاص مصروفیت نہ تھی ۔۔۔ ورنہ ایسی کوئی بات نہ تھی جسے کہنا ضروری ہوتا، یا جسے "سننا" قیمتی کہا جا سکتا تھا۔ لہذا ۔۔۔ معافی ۔۔۔ اور خدا حافظ" ۔۔۔

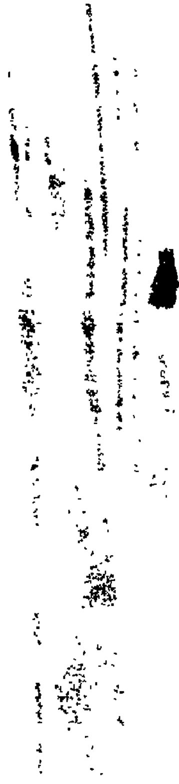
اور "تضیع اوقات" کا یہ الزام بھی اپنے سر لے کر اس نے آہستگی سے ریسیور رکھ دیا ۔۔۔ جیسے سقراط نے موت کے انتظار کی بے چینی کم کرنے کے لیے زہر کا ایک اور پیالہ ہونٹوں سے لگا لیا ہو !!! ۔۔۔







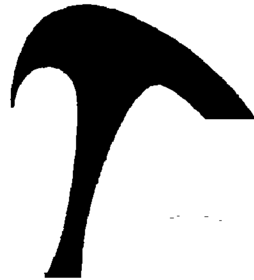






وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی نے بمبئی میں گزشتہ اکتوبر میں نیشنل سنٹر آف پرفارمنگ آرٹس کے
تعمیر کردہ نئے تھیٹر کا افتتاح کیا۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے۔


HUSAIN LIBRARY



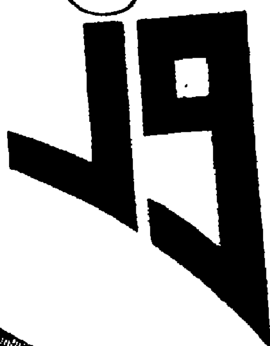
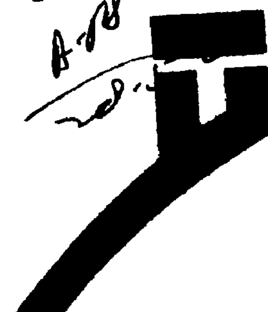












نیا دور

جلد ۳۵ نمبر ۱۲

مارچ ۱۹۸۱ء

ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

★

پبلشر: ٹھاکر پرشاد سنگھ

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یو پی

مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

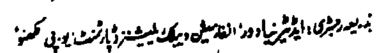
شائع کردہ محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ۔ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے

زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پبلی کیشن بیورو انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔ پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ


بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔ پی لکھنؤ

عنوانات


نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش ان سے بہرحال متفق ہو



اسلامیات، علوم مشرقیہ اور غالبیات پر بیک وقت ماہرانہ دسترس رکھنے والے ممتاز عالم و محقق مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا انتقال علم و ادب کے لیے بلا شبہ ایک ایسا نقصان عظیم ہے جس کی تلافی شاید کبھی نہ ہو سکے گی۔ ہمارے یہاں رسمی تعزیت اور عقیدت کا اظہار ایک عام بات ہے۔ یہ رویہ بھی بہت عام ہے جس کے تحت ہم مستند علماء اور ادباء کو بڑی آسانی سے ادارہ یا انجمن قرار دیتے ہیں۔ لیکن عرشی صاحب کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ وہ اپنی ذات سے ایک ادارہ یا ایک انجمن تھے، تو یہ بات ان کی جیسی قد آور شخصیت پر جتنی صادق آتی ہے اتنی اور کسی پر شاید ہی آسکے۔ انھوں نے ادبی سیاستوں اور جوڑ توڑ سے خود کو ہمیشہ دور رکھا اور انتہائی خاموشی کے ساتھ ایک طرح کی گوشہ نشینی کے انداز میں مسلسل ۵۰ برس علم و ادب کی گرانقدر خدمت کی اور بقول پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی "اردو کو فرش سے عرش تک پہنچا دیا۔" انھوں نے کبھی عہدوں کی پرواہ کی نہ ستائش کی تمنا۔ ۱۹۲۵ء میں جب انھیں ڈھائی ہزار روپے ماہانہ تنخواہ کے ساتھ افغانستان کی ثقافتی ... پیش کی گئی تو انھوں نے اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جبکہ اس وقت ان کی تنخواہ صرف دو سو پچاس روپے ماہانہ تھی ۔۔ ر... لائبریری رام پور سے انھیں اس قدر لگاؤ تھا کہ اسی کی خاطر انھوں نے اتنی بڑی پیش کش ٹھکرا دی۔ اور رام پور چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ اس لائبریری کے ... انھوں نے ایک اور بڑا ایثار کیا وہ یہ کہ عربی مخطوطات کا کیٹلاگ تیار کرنے پر جب انھیں حکومت کی جانب سے حق المحنت کے طور پر بارہ ہزار روپے کی رقم موصول ہوئی تو انھوں نے بڑی خاموشی سے یہ ساری رقم بطور عطیہ لائبریری کو دے دی۔ ان کے اسی لگاؤ، خلوص، ایثار اور محنت کے نتیجہ ہی میں رضا لائبریری جس کے وہ آخری وقت تک ڈائرکٹر رہے۔ علم و ادب کا ایک عظیم مرکز بن گئی۔ لائبریری پر اتنی توجہ اور محنت کے ساتھ ساتھ وہ تصنیف و تالیف کا کام بھی کرتے رہے۔ ایک طرف تو ان کا یہ عالم تھا کہ لائبریری میں موجود ہزاروں کتابیں ان کے ذہن نشین تھیں تو دوسری طرف "دیوان غالب۔ نسخہ عرشی" اور "مکاتیب غالب" جیسے عظیم ادبی کارنامے بھی انھوں نے انجام دیے۔ ان کی مطبوعہ تصانیف کی تعداد ۲۷ ہے۔ جو اردو، عربی، فارسی، ہندی، انگریزی، ترکی اور پشتو زبان میں ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے ۱۰۰ سے زیادہ تحقیقی مقالے بھی سپرد قلم کیے جو مختلف ہندوستانی اور غیر ملکی رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔ ان کی یہ ٹھوس اور گرانقدر تصانیف علم و ادب میں بلا شبہ اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن انھوں نے کبھی اپنی علمیت کو کسی پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ اپنی علمی حیثیت سے کوئی دنیاوی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ان کے مزاج، ان کی نشست، رہن سہن اور رکھ رکھاؤ سب میں بلا کی سادگی تھی۔ وہ انتہائی منکسر المزاج بھی تھے۔ چنانچہ ان سے ملنے والے ان کے علم و فضل سے متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ہی ملاقات میں ان کے گرویدہ بھی ہو جاتے تھے۔ علم و تحقیق کے میدان میں ان کی حیثیت ایک ایسے آفتاب کی سی تھی، جس کی روشنی میں تپش کے بجائے چاندنی جیسی ٹھنڈک تھی۔ یہ روشنی تشنگان علم و تحقیق کو صدیوں راستہ دکھائے گی۔ دوسری طرف اپنے مزاج اور کردار کی سطح پر وہ ایک ایسے شجر سایہ دار تھے جس کی چھاؤں میں راحت، سکون اور توانائی ملتی ہے۔

ان کا انتقال محض ان کے متعلقین ہی کا المیہ نہیں ہے۔ بلکہ ان سب کا المیہ ہے جنھیں اردو زبان اور علم و ادب سے دلچسپی اور لگاؤ ہے۔ اس نقصان عظیم پر ادارہ نیا دور زبردست رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور انھیں اپنا پر خلوص خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔

● نیا دور کے نول کشور نمبر کی علمی اور ادبی حلقوں، ادیبوں اور دانشوروں نے جس طرح پذیرائی کی ہے وہ ہمارے لیے باعث مسرت بھی ہے اور وجہ افتخار بھی۔ یہ نیا دور کا اب تک کا ضخیم ترین نمبر تھا جسے بعض ادیبوں اور دانشوروں نے نیا دور کا اہم ترین اور حسین ترین نمبر بھی قرار دیا ہے۔ اس نمبر کے سلسلے میں تعریفی اور مبارکبادی کے خطوط کی آمد کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ لیکن حقیقتاً مبارکباد کے مستحق ہمارے وہ قلمی معاونین ہیں جن کی گرانقدر تخلیقات و مضامین نے اس نمبر کو اتنی اہمیت کا حامل بنا دیا۔ اس نمبر کو اتنا معیاری اور وقیع بنانے میں جن حضرات کا قلمی تعاون اور مفید مشورے حاصل ہوئے۔ ادارہ ان کا ایک بار پھر انتہائی متشکر ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کا بھی شکر گزار ہے جنھوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ہماری حوصلہ افزائی کی۔ امید ہے کہ اپنے معاونین اور کرم فرماؤں کا تعاون اور مشورے ہمیں اسی طرح آئندہ بھی حاصل رہیں گے۔

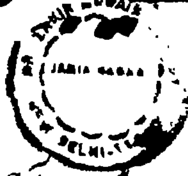
نول کشور نمبر کی برابر مانگ آرہی ہے۔ جبکہ اس کی چند ہی کاپیاں باقی رہ گئی ہیں۔ چنانچہ اس کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت بھی زیر غور ہے۔ نول کشور نمبر کی اشاعت میں ہونے والی تاخیر کا اثر ہمارے بعد کے شماروں پر بھی پڑا۔ چنانچہ جنوری۔ فروری ۱۹۸۱ء کا شمارہ بھی تاخیر سے شائع ہوا۔ مارچ کے شمارے کی اشاعت میں بھی تاخیر ہوئی۔ لیکن امید ہے کہ اب آئندہ شماروں کی اشاعت معمول پر آجائے گی۔ اس تاخیر کے لیے ہم اپنے قارئین اور معاونین سے انتہائی معذرت خواہ ہیں۔

—— ایڈیٹر

نذیر بنارسی
پانڈے حویلی، وارانسی

خطیبِ ہند

مولانا ابوالکلام آزاد
کو
نذرانۂ عقیدت



ہے جنوں آزاد اب آزادیٔ تقریر سے
آج منہ کھولے ہوئے ہر حلقۂ زنجیر ہے

گوشۂ کشمیر ہو یا قلعۂ احمد نگر
سب ترے دورِ اسیری کے گواہِ معتبر

لائقِ صد آفریں ہیں الہلال و البلاغ
دو چراغوں نے ترے روشن کیے لاکھوں چراغ

روشنی پھیلائی تو دیتی ہوئی تحریر سے
بیڑیاں پگھلا کے رکھ دیں گرمیٔ تقریر سے

خادمِ قوم اور اقلیمِ ادب کا تاجدار
راہِ آزادی میں میدانِ عمل کا شہسوار

مردِ خوش گفتار بھی تھا غازیٔ کردار بھی
تو سپاہی بھی وطن کا اور سپہ سالار بھی

قوم کا خادم بھی تو اور اک عظیم انسان بھی
ہند کا اک فرد بھی اور پورا ہندوستان بھی

ہند کے مردِ مجاہد تاجدارِ حرّیت
شخصیت گر ہے خطیبِ ہند تیری شخصیت

مصر سے ایران و عراق و عرب سے رابطے
تم نے ہی قائم کیے بھارت کے سب سے رابطے

قدر کرنا چاہیے ہم سب کو اس معمار کی
ہر زمیں پر جس نے بھارت کی زمیں ہموار کی

اتحادِ ہند و مسلم کی وہ روحِ رواں
جس نے سلجھائی ہے زلفِ مادرِ ہندوستاں

ناز ہے ہم سب کو جس کی پاکیٔ کردار پر
بارشِ ابرِ کرم اس قافلہ سالار پر

قلعۂ دہلی نگہبانی کرے ہے صبح و شام
مسجدِ جامع ترے نزدیک ہے تیرا امام

تیرے سائے میں خطیبِ ہند محوِ خواب ہے
اب بھی تیرے پاس تیرا گوہرِ نایاب ہے

السّلام اے محسنِ آزادیٔ ہندوستاں
السّلام اے جنگِ آزادی کے میرِ کارواں

اتحادِ ہند و مسلم کے سنگم السّلام
السّلام اے قافلہ سالارِ اعظم السّلام

پروفیسر عبدالقوی دسنوی
اردو ڈپارٹمنٹ - سیفیہ کالج - بھوپال

مولانا محوی صدیقی

فروری ۱۹۶۱ء کے ایک مشاعرے میں مولانا محوی صدیقی کا کلام پہلی بار بمبئی میں سننے کا موقع ملا۔ نام عرصہ سے سن رکھا تھا۔ لیکن، نہ دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، نہ ان کے منھ سے ان کا کلام سننے کا موقع ملا تھا۔ اس لیے اس وقت بڑی مسرت حاصل ہو رہی تھی۔ خاص طور سے اس احساس نے ایک قسم کی کیفیت پیدا کر دی تھی کہ مولانا نے، بابائے اردو کے دوش بدوش اردو کی خدمت کی ہے اور اُن کے بے شمار شاگرد شعرا ہندستان کے مختلف خطوں میں اردو کی خدمت کر رہے ہیں اور اب ایسے استاد فن، عاشق اردو کہاں ملتے ہیں۔

مولانا نے کانپتے ہاتھوں سے مائک کو ہاتھ میں لیا اور پھر تھرتھراتی آواز سے کلام سنانا شروع کیا تو صابو صدیق کے وسیع کھلے میدان میں ہزاروں بیٹھے ہوئے سامعین پر ایک عجیب خاموشی طاری ہو گئی، اور اس خاموش فضا میں مولانا نہایت جوش کے ساتھ اپنا کلام سنا رہے تھے۔ ان کی آواز میں ایک عجیب اثر تھا جس نے ان کی شاعری کو ساحری کی حدود میں داخل کر دیا تھا۔ البتہ، واہ واہ، بہت خوب اور مکرر کی آواز سے سکوت ٹوٹتا تھا تو کچھ اور ہی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی، دیر تک یہ سحر آگیں سماں بندھا رہا۔ مولانا نے دل کو بھی متاثر کیا، دماغ کو بھی، اس لیے آج جب اس مشاعرے کی یاد آتی ہے تو مولانا کی آواز کانوں میں گونج جاتی ہے۔ اُن کے پڑھنے کا انداز نگاہوں کے سامنے سے تصویر بن کر گزر جاتا ہے ——— لیکن یہ سب دور کا جلوہ تھا، کبھی صاف کبھی دھندلا، قریب سے دیکھنے کا، سننے اور باتیں کرنے کا اتفاق تو بھوپال آکر ہوا۔

میں فروری ۱۹۶۱ء میں بھوپال آیا تو ایک دن درگا پرشاد شاد سے معلوم ہوا کہ مولانا محوی صدیقی بھوپال ہی میں رہتے ہیں اور ان کے محترم استاد ہیں۔ وہ انھیں سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے ہیں۔ دیر تک درگا پرشاد شاد سے مولانا سے متعلق گفتگو ہوتی رہی ——— وہ نہایت احترام کے ساتھ خوش ہو ہو کر والہانہ انداز سے اپنے استاد محترم کے متعلق گفتگو کرتے چلے جا رہے تھے ——— دل میں درگا پرشاد شاد کا احترام اسی وقت سے پیدا ہو گیا تھا۔ سوچنے لگا تھا کہ اس دور میں بھی ایسے لوگ ہیں جو اپنے اساتذہ سے محبت اور ان کا احترام اس درجہ کرتے ہیں۔ ایک دن اُن ہی کے ساتھ مولانا کے دولت کدے پر پہنچا، کنڈی کھٹکھٹائی گئی تو مولانا ہی نے دروازہ کھولا ——— تعارف ہوا۔ تو بزرگانہ شفقت کے ساتھ ملے، چہرے پر مسرت جاگتی نظر آئی۔ کمرے میں داخل ہو کر ہم لوگ آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ پھر گفتگو شروع ہوئی میرے بارے میں، سید سلیمان ندوی کا ذکر چھڑا، بات سید نجیب اشرف ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن اور سید شہاب الدین دسنوی تک پہنچی۔ بمبئی کا ذکر آیا، مشاعرے کی یاد آئی، پھر کیا تھا ایک دوسرے علامہ محوی صدیقی اسٹیج پر کلام سنا رہے تھے ——— سامنے مولانا محوی صدیقی سے بات ہو رہی تھی ——— وہ تصویر دھندلی تھی، آواز کے ذریعے، کانوں کے سہارے دل میں اتری تھی، چہرے کے نقوش صاف دکھائی نہیں دیتے تھے۔ یہ تصویر بہت قریب کی تھی، ہنستے، بولتے، محوی صاحب کی میری آنکھوں نے تصویر کشی کی، کانوں نے آواز کے رنگ بھرے۔ احساسات اور

جذبات نے اُن میں زندگی پیدا کر دی۔ تھوڑی دیر میں دل کے ورق پر ایک مخلص بزرگ کی تصویر اُبھر آئی۔ بابائے اردو سے کچھ کچھ ملتی جلتی ـــــ بابائے اردو کے ایک دوست کی ـــــ بابائے اردو کے ایک چاہنے والے کی۔ بابائے اردو کے ایک رفیق کار کی، اردو کے عاشق کی، اردو والوں کے پرستار کی۔ مولانا محمد حسین محوی صدیقی کی ـــــ درمیانہ قد، صحت مند جسم، لٹھے کا چوڑی مہری کا پاجامہ پاؤں میں پمپ جوتا، شیروانی میں ملبوس، گندمی چہرے پر خشخشی سفید داڑھی، ناک متناسب، آنکھیں روشن، پیشانی چوڑی ذہانت کی پہچان بڑے بڑے کان، سر پر رامپوری ٹوپی، چہرے پر شگفتگی ابھرتی ہوئی، عالمانہ وقار نمایاں، پیشانی اور چہرے کے نقوش ان کی عمر کی پختگی اور تجربہ کاری کی طرف اشارے کرتے ہوئے۔ گفتگو میں علمیت بھی تھی، شرافت بھی، بزرگانہ شفقت بھی۔

دیر تک بات چیت ہوتی رہی، اُن کے خلوص نے لطف کے سامان بہم پہنچائے پھر جو یہ سلسلہ چلا تو جب تک وہ جئے لطف و کرم فرماتے رہے۔

محوی صاحب کا تعلق لکھنؤ سے تھا، ان کے والد حافظ حسین لکھنؤ کے ایک عالم گھرانے کے فرزند تھے اور اس وقت کے علوم مروجہ عربی و فارسی کے عالموں میں شمار کیے جاتے تھے۔ اردو کے بجائے فارسی میں شاعری کرتے تھے اور فوز تخلص کرتے تھے۔ خوشنویسی کے استاد، خطاطی کے ماہر شمار کیے جاتے تھے۔ مطبع نولکشور میں ملازمت کرتے تھے۔ فوز کے والد بھی اپنے وقت کے مشہور عالم اور حافظ قرآن تھے

انھیں حافظ علی حسین کے یہاں ۱۵ مئی ۱۸۹۱ء کو ایک فرزند عالی قدر پیدا ہوا۔ جس کا نام محمد حسین رکھا گیا۔ جو بعد میں مشہور شاعر، پرخوف زباں داں، لائق استاد، فاضل مترجم، اردو کے سپاہی، وطن کے شیدائی، ادب کے خدمت گزار علامہ محمد حسین محوی صدیقی کے نام سے عزت اور احترام کی نظر سے غیر منقسم ہندستان میں دیکھے جانے لگے۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی اس زمانے کا یہی دستور تھا۔ بعد میں لکھنؤ کے فرنگی محل کے مدرسہ نظامیہ میں تعلیم حاصل کی پھر بھوپال چلے آئے۔ جہاں مدرسہ احمدیہ اور مدرسہ سلیمانیہ میں عربی، فارسی میں سند حاصل کی۔ ۱۹۱۱ء میں بھوپال سے لکھنؤ تشریف لے گئے۔ اور ماہنامہ "الناظر" سے متعلق ہو گئے پھر کچھ عرصے بعد اس کی ادارت سے وابستہ ہو گئے۔ یہ سلسلہ ۱۹۱۶ء تک قائم رہا۔

اس زمانہ قیام لکھنؤ میں مولانا عبدالحلیم شرر، پیارے صاحب رشید، پنڈت برج نرائن چکبست، ۔۔۔ت لکھنوی، عزیز لکھنوی، اکبر الہ آبادی، وحید الدین سلیم اور ۔۔۔ دہلوی وغیرہ سے پہلے ملاقاتیں ہوئیں، پھر رفتہ رفتہ دوستانہ تعلقات پیدا ہوئے۔

اسی زمانے قیام لکھنؤ میں مولوی عبدالحق بابائے اردو سے پہلی بار ملاقات ہوئی ـــــ ہوا یہ کہ ۱۹۱۴ء میں انجمن ترقی اردو کا ایک جلسہ لکھنؤ میں ہوا۔ غالباً اس جلسہ کا سارا انتظام محوی صدیقی کے ذمہ تھا، مولانا محوی کی بابائے اردو سے یہ مختصر ملاقات آگے چل کر دوستانہ تعلقات میں تبدیل ہو گئی ـــــ ۱۹۱۶ء میں اپنے والد کی علالت کی وجہ سے مولانا کو بھوپال آنا پڑا، جلد ہی یہاں دفتر تاریخ میں عربی کے مترجم کی حیثیت سے اُن کا تقرر ہو گیا۔ تقریباً دو سال بھوپال میں قیام رہا۔ مولانا کی پہلی تصنیف "ازواج الانبیا" اسی دوران لکھی گئی ہے اور ایک زمانہ میں بڑی مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔

مولانا محوی ۱۹۱۸ء میں پھر واپس لکھنؤ گئے۔ جہاں انھوں نے دائرہ ادبیہ کی بنیاد ڈالی۔ مولانا کی دوسری تصنیف "انسانی قربانیاں" ۱۹۱۹ء میں لکھنؤ کے اسی زمانہ قیام کے دوران میں شائع ہوئی۔

۱۹۱۹ء میں مولانا محوی صدیقی لکھنؤ سے کانپور چلے آئے اور "مدرسہ الٰہیات" سے جو اس زمانہ میں بہت مشہور درس گاہ تھی منسلک ہو گئے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ مشہور سیاسی رہنما مولانا آزاد سبحانی اس درس گاہ کے بانی تھے۔ مولانا سبحانی، مولانا محوی کی علمی صلاحیت کے قدرداں تھے، اُنھیں کی خواہش اور تعلق سے مولانا کانپور تشریف لائے تھے۔

دو سال بعد ۱۹۲۱ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ کے شعبہ تصنیف و تالیف سے مولانا وابستہ ہو گئے "طبقات ناصری" اور

"تاریخ فیروز شاہی" کے ترجمہ کا کام اسی علی گڈھ کے قیام کے زمانہ میں ہوا۔ ۱۹۲۲ء میں بھوپال تشریف لے آئے۔ اور عبیدیہ ادارۃ اشاعت میں مہتمم کے عہدے پر فائز ہوئے لیکن چند ماہ بعد ہی بابائے اردو کی خواہش سے اورنگ آباد چلے گئے جہاں وہ مولوی عبدالحق صاحب کے انگریزی اردو لغت کی ترتیب و تدوین میں ہر طرح سے معاونت کرتے رہے۔ جس کا بھرپور اعتراف بابائے اردو نے اس لغت کے دیباچہ میں اور دوسری بعض تحریروں میں بھی کیا ہے اور وہ اس بات کو ہمیشہ مانتے رہے کہ اگر مولانا محوی صدیقی کا تعاون انھیں حاصل نہ ہوتا تو شائد اس لغت کا مکمل ہونا ممکن نہ ہوتا۔

اورنگ آباد کے دوران قیام میں مولانا نے عثمانیہ کالج میں فارسی کے استاد کی حیثیت سے تین سال کام کیا۔ ۱۹۳۰ء میں مدراس تشریف لے گئے۔ جہاں انھوں نے جمالیہ عربک کالج میں ایک سال تک عربی زبان کے استاد کی حیثیت سے کام کیا۔ بعد میں مدراس یونیورسٹی کے اورینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ میں بحیثیت لکچرار تقرر ہوا۔ جہاں تقریباً بیس سال تک درس و تدریس میں مصروف رہے۔ اور علم و ادب کی خدمت کرتے رہے اس دوران قیام میں مولانا کی مرتب کردہ کتابیں (۱) واقعات اظفری (۲) دیوان اظفری (۳) میر اسمٰعیل خاں ابجدی کا انورنامہ (۴) دیوان امیر محمد مہدی بیدار دھلوی (۵) کلمات الشعراء سرخوش (۶) کلیات ابجدی (چار جلدیں) مدراس یونیورسٹی سے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع ہوئیں۔ ان کتابوں نے مولانا محوی کی علمی شہرت کی جنوبی ہندستان میں دھوم مچادی۔ جنوب میں ان کی شہرت اور عزت اس لیے تھی کہ وہاں اردو کو بڑے پیمانے پر متعارف کرانے میں مولانا محوی کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ انھوں نے مشاعروں اور رسائل کے ذریعہ لوگوں میں اردو سے دلچسپی پیدا کی اور ایک بڑے طبقہ کو اردو پڑھنے اور علمی ادبی خدمت کی طرف متوجہ کیا۔

اس دوران میں مولانا کی بے شمار غزلیں، نظمیں اور نثری تحریریں اور ترجمے ہندستان کے معیاری اور معتبر رسائل و اخبارات میں شائع ہوتے رہے اور مقبولیت حاصل کرتے رہے۔

تعمیر، الارشاد، معیار ادب وغیرہ معیاری رسائل خود مولانا مختلف وقتوں میں بھوپال، بنگلور، مدراس اور لکھنؤ سے نکالتے رہے۔ مدراس، بنگلور، بھوپال اور بمبئی کے بعض رسائل جلوہ سخن، فانوس، بشریٰ، کردار، نقاش، تنقید وغیرہ کی سر فرمائی۔

۱۹۵۱ء میں مولانا ملازمت سے سبکدوش ہوکر ۱۹۵۲ء میں بھوپال تشریف لے آئے اور ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہوکے رہ گئے یہیں ر انھوں نے شعر و شاعری کے سلسلہ کو جاری رکھا۔ عمر کے آخری میں مولانا بیمار رہنے لگے تھے لیکن علم و ادب اور اردو زبان کی کسی نہ کسی طرح خدمت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۹ نومبر ۷۵ء کو ان کی زندگی نے ساتھ چھوڑ دیا۔ اور وہ ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔

اسی دوران میں مولانا کے دو شعری مجموعے نغمۂ فردوس ۱۸؍ اور آبشار (۱۹۷۱) منظر عام پر آئے۔ ان کے انتقال کے بچوں سے متعلق نظموں کا مجموعہ "بالک باغ" ۱۹۷۶ء میں اُن کے صاحبزادے منیر المحوی صاحب نے شائع کیا۔

شعر و شاعری مولانا نے اس وقت سے شروع کی تھی جب ابھی ان کی عمر بارہ سال ہونے کو آئی تھی۔ یہ ۱۹۰۳ء کی بات ابتدا میں اطہر تخلص رکھا، پھر رنگین تخلص کرنے لگے۔ ۱۹۰۷ء سے مولانا کے کلام اور کہانیوں کی اخبارات اور رسائل میں اشاعت کی ابتدا ہوئی۔

۱۹۱۰ء میں احمد علی شوق قدوائی سے اپنے کلام پر اصلاح لینے لگے اور اسی زمانہ سے اپنا تخلص رنگین سے محوی کر دیا۔

مولانا محوی صدیقی نے شاعری میں غزلیں اور نظمیں سب سے زیادہ کہیں، رباعیات پر بھی طبع آزمائی کی بچوں کے لیے بھی نظمیں نعتیہ کلام بھی ان کے شعری سرمایہ میں موجود ہے۔ لیکن ان کی نظموں غزلوں کا سرمایہ بہت زیادہ ہے اور قابل قدر ہے۔



فضا ابن فیضی
مئوناتھ بھنجن۔ یوپی

غزل

رنج شوریدہ سری، راہ گزر اور سفر
گھر میں رہ کر بھی وہی راہ گزر اور سفر

بڑی مشکل ہے جو پیچھے کو پلٹنا چاہوں
دور تک پھیلی ہوئی راہ گزر اور سفر

جب بھی ہنستا ہوں، برس پڑتی ہے احساس پہ گرد
لب، مرے لب کی ہنسی، راہ گزر اور سفر

تو ہے اور پاشکنی، گوشہ نشینی کی تھکن
میں ہوں اور دربدری، راہ گزر اور سفر

تو کہ محبوب تجھے کنج اماں اور قیام
میں کہ منزل ہے مری، راہ گزر اور سفر

تو بہ ایں خوش ہنری، راہ کا بے حس پتھر
میں بہ ایں بے ہنری، راہ گزر اور سفر

تو بہ ایں باخبری، خول میں شیشے کے ہے بند
میں بہ ایں گم شدگی، راہ گزر اور سفر

تو، وہ زلفوں کی خنک چھاؤں، وہ آرام کی نیند
میں، یہ شعلوں سے بھری، راہ گزر اور سفر

دیر ہوگی تو یہ لمحہ بھی گزر جائے گا
ڈھونڈھ اسے بے خبری راہ گزر اور سفر

بے مکانی کا تقاضا ہے کہ چلتے رہیے
توشۂ رہ گزری، راہ گزر اور سفر

ایک سے کب رہے، تیرے ہوں کہ میرے حالات
کبھی دیوار، کبھی راہ گزر اور سفر

آ کے اس موڑ تلک کھو گیا سب کا رستا
زندگی اور تری راہ گزر اور سفر

عمر اپنی تو اسی خانہ بدوشی میں کٹی
آگہی، خود نگری، راہ گزر اور سفر

[illegible]
۱۴۱ وکٹوریہ اسٹریٹ ۔ لکھنؤ

غالب کے مطبوعہ اردو مکاتیب

مرزا غالب کے اُردو مکاتیب ہماری ادبی تاریخ کا ایک اہم باب ہیں۔ غالب شناسوں نے برسوں کی چھان بین کے بعد رقعات غالب کے متعلق جو انبار در انبار معلومات پیش کی ہیں وہ اُردو تحقیق اور تنقید کے لیے ایک وسیع سرمایہ ہیں لیکن اس کے باوجود غالب کی اُردو مکتوب نگاری کے بارے میں ابھی ایسے متعدد بنیادی مسائل موجود ہیں جو غالب شناسوں کی توجہ کے طالب ہیں۔ ان مسائل میں یہ دو سوال بھی شامل ہیں کہ غالب کے مطبوعہ اُردو مکاتیب کی مجموعی تعداد کیا ہے اور یہ رقعات کتنے افراد کے نام لکھے گئے ہیں؟ زیر نظر مضمون میں غالب کے اُردو خطوط کے متعلق انھیں دونوں بنیادی سوالوں کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس سلسلے میں خاصی چھان بین کے بعد مجھے جو اعداد و شمار دستیاب ہوئے ہیں وہ غالب شناسوں کی خدمت میں بہ نظر اصلاح پیش کیے جاتے ہیں۔ تحقیق کے دشوار گزار خارزار میں اعداد و شمار کا اغلاط سے صد فی صد محفوظ رہنا آسان نہیں لہٰذا ان اعداد و شمار کو مزید تحقیق کے بغیر حرف آخر کے طور پر قبول کر لینا کسی طرح مناسب نہ ہوگا۔

مولانا حامد حسن قادری نے برسوں پہلے غالب کے اُردو خطوط کی تعداد "تقریباً ۲۵۰" بتائی تھی جو نئے خطوط کی دریافت کے باعث اب ناقابلِ قبول ہو چکی ہے۔ مختلف مصادر سے مجھے غالب کے ۸۰۳ (آٹھ سو تہتر) مطبوعہ اُردو خطوط ملے ہیں۔ ان میں دو ایسے خطوط بھی شامل ہیں جن کے مکتوب الیہم کے ناموں کا تعین نہیں ہو سکا ہے۔ باقی ۸۷۱ (آٹھ سو اکہتر) رقعات کے مکتوب الیہم کی تعداد ۹۰ (نوّے) ہوتی ہے۔ غالب کے رقعات کے متعلق یہ اعداد و شمار مختلف مجموعوں میں خطوط کے اندراج میں متعدد اغلاط کی تصحیح کے بعد برآمد ہوئے ہیں اور ان اغلاط میں کہیں ایک خط کو دو خطوط قرار دیا گیا ہے، کہیں دو خطوط کو ایک خط سمجھا گیا ہے یا ایک ہی خط کو دو افراد کے نام درج کیا گیا ہے یا کبھی غالب کے نام سے جعلی خطوط بھی تیار کر دیے گئے ہیں۔ ان مختلف تسامحات کی تصحیح کرنے کے بعد مجھے غالب کے مطبوعہ اردو مکاتیب کے متعلق جو اعداد و شمار ملے ہیں وہ سطور ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

مکتوب الیہ	رقعات کی تعداد	زمانۂ تحریر
(۱) منشی ہرگوپال تفتہ	۱۲۳	آخر مئی ۱۸۴۸ء تا ۱۸۶۸ء
(۲) والی ریاست رام پور نواب کلب علی خاں	۷۵	۶ مئی ۱۸۶۵ء تا جنوری ۱۸۶۹ء
(۳) منشی نبی بخش حقیر	۷۰	۹ مارچ ۱۸۴۸ء تا ۲۲ ستمبر ۱۸۵۸ء

مکتوب الیہ	رقعات کی تعداد	زمانۂ تحریر
(۴) نواب علاء الدین احمد خاں علائی	۵۷	۱۲ر مئی ۱۸۵۸ء تا جون ۱۸۶۸ء
(۵) میر مہدی حسین مجروح	۵۰	۷ر فروری ۱۸۵۸ء تا ۱۰ر جون ۱۸۶۵ء
(۶) والیِ رام پور نواب یوسف علی خاں ناظم	۴۰	۱۵ر فروری ۱۸۵۷ء تا ۱۱ر مارچ ۱۸۶۵ء
(۷) منشی شیو نرائن آرام	۳۶	۱۸ر جولائی ۱۸۵۸ء تا ۳ر مئی ۱۸۶۳ء
(۸) میاں داد خاں سیاح	۳۵	۱۱ر جون ۱۸۶۰ء تا ۲۵ر اگست ۱۸۶۷ء
(۹) قاضی عبدالجلیل جنون	۳۰	۱۸۵۲ء تا ۱۳ر اکتوبر ۱۸۶۶ء
(۱۰) چودھری عبدالغفور سرور	۲۷	۱۸۵۸ء تا ۲۵ر ستمبر ۱۸۶۶ء
(۱۱) خواجہ غلام غوث خاں بیخبر	۲۵	۲۰ر دسمبر ۱۸۵۸ء تا ۲۳ر جولائی ۱۸۶۶ء
(۱۲) حکیم غلام نجف خاں	۲۳	فروری ۱۸۵۲ء تا ۱۸۶۶ء
(۱۳) غلام حسنین قدر بلگرامی	۲۲	۲۳ر فروری ۱۸۵۷ء تا ۶۸-۱۸۶۷ء
(۱۴) نواب انور الدولہ شفق	۲۰	۱۸۵۳ء تا ۱۵ر فروری ۱۸۶۴ء
(۱۵) مرزا حاتم علی بیگ مہر	۱۹	اواخر جون یا اوائل جولائی ۱۸۵۸ء تا ۱۸۶۱ء
(۱۶) منشی حبیب اللہ خاں ذکا	۱۶	۳۰ر جولائی ۱۸۶۳ء تا ۲۸ر جنوری ۱۸۶۸ء
(۱۷) نواب یوسف مرزا	۱۲	۱۸۵۶ء تا ۱۹ر مئی ۱۸۶۰ء
(۱۸) حکیم سید احمد حسن مودودی فنا و جمالی	۱۱	۲۸ر جون ۱۸۶۱ء تا ۱۷ر جولائی ۱۸۶۸ء
(۱۹) میر غلام بابا خاں	۱۰	۶ر ستمبر ۱۸۶۳ء تا ۱۸۶۸ء
(۲۰) مولوی عبدالرزاق شاکر	۱۰	۱۸۶۴ء تا یکم اپریل ۱۸۶۶ء
(۲۱) مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب	۸	۸ر فروری ۱۸۵۸ء تا ۸ یا ۹ر اکتوبر ۱۸۶۵ء
(۲۲) نواب امین الدین احمد خاں	۸	۶۳-۱۸۶۲ء تا ۳ر مارچ ۱۸۶۷ء
(۲۳) منشی سیل چند منشی	۷	۲۵ر دسمبر ۱۸۶۴ء تا ۱۸ر ستمبر ۱۸۶۸ء
(۲۴) سید فرزند احمد صفیر بلگرامی	۶	۱۲ر مئی ۱۸۶۴ء تا ۳ر مئی ۱۸۶۵ء
(۲۵) ذوالفقار الدین حیدر خاں عرف حسین مرزا	۶	۱۸ر جون ۱۸۵۹ء تا ۳۱ر دسمبر ۱۸۵۹ء
(۲۶) صاحب عالم	۶	اپریل ۱۸۵۹ء تا دسمبر ۱۸۶۶ء
(۲۷) میر ابراہیم علی خاں وفا	۵	۱۲ر اگست ۱۸۶۶ء تا اگست ۱۸۶۸ء
(۲۸) بدرالدین احمد کاشف فقیر صاحب	۵	۱۸۵۲ء تا ستمبر ۱۸۶۳ء
(۲۹) پیارے لال آشوب	۵	اگست ۱۸۶۵ء تا ۳۰ر جنوری ۱۸۶۸ء
(۳۰) شہزادہ بشیر الدین توفیق	۴	۱۸۶۰ء تا ۱۶ر جون ۱۸۶۸ء
(۳۱) مولوی نعمان احمد	۴	ستمبر ۱۸۶۶ء تا ۱۷ر دسمبر ۱۸۶۶ء

مکتوب الیہ	رقعات کی تعداد	زمانۂ تحریر
(۳۲) محمد حسین خاں مدیر دبدبہ سکندری رام پور	۴	۱۱ اپریل ۱۸۶۱ء تا ۲۵ فروری ۱۸۶۸ء
(۳۳) منشی جواہر سنگھ جوہر	۳	۱۸۴۹ء تا ۲ فروری ۱۸۶۴ء
(۳۴) منشی بہاری لال مشتاق	۳	۱۸۵۸ء تا ۷ جون ۱۸۶۸ء
(۳۵) مرزا یوسف علی خاں عزیز	۳	اکتوبر ۱۸۵۹ء تا ؟
(۳۶) مرزا باقر علی خاں کامل	۳	۱۸۶۷ء تا ۷ دسمبر ۱۸۶۷ء
(۳۷) میر افضل علی عرف میرن صاحب	۳	نومبر ۱۸۵۸ء تا ۱۲ جولائی ۱۸۶۴ء
(۳۸) شاہ عالم شائق	۳	مئی ۱۸۶۰ء تا ۶ نومبر ۱۸۶۵ء
(۳۹) منشی عبد اللطیف	۲	۱۰ مارچ ۱۸۵۱ء تا ۶ دسمبر ۱۸۵۸ء
(۴۰) نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ	۲	۷ فروری ۱۸۶۵ء تا ۱۸۶۶ء
(۴۱) حکیم ظہیر الدین احمد خاں	۲	۱۸۵۶ء تا ۲ نومبر ۱۸۶۵ء
(۴۲) منشی ہیرا سنگھ درد	۲	۱۸۶۸ء
(۴۳) بابو ہرگوبند سہائے نشاط	۲	۲۹ دسمبر ۱۸۵۸ء تا جنوری ۱۸۵۹ء
(۴۴) مولوی ضیاء الدین خاں ضیاء دہلوی	۲	۱۸۶۴ء تا ۲۷ فروری ۱۸۶۶ء
(۴۵) حکیم غلام رضا خاں	۲	[ایک خط ۱۸۶۵ء کا معلوم ہوتا ہے]
(۴۶) مرزا قربان علی بیگ سالک	۲	[ایک خط ۱۱ جولائی ۱۸۶۴ء کا ہے دوسرے خط کا زمانہ نامعلوم]
(۴۷) مرزا شمشاد علی بیگ رضوان	۲	۳ نومبر ۱۸۶۵ء تا اگست ۱۸۶۶ء
(۴۸) میر احمد حسین میکش	۲	۱۲۷۲ھ
(۴۹) میر سرفراز حسین	۲	اگست ۱۸۵۸ء تا ۲۷ مارچ ۱۸۶۳ء
(۵۰) نواب سجاد مرزا سجاد	۲	۵ مارچ ۱۸۶۵ء تا دسمبر ۱۸۶۵ء
(۵۱) نعیم اسحق آزاد	۲	[ایک خط ۹ مارچ ۱۸۵۹ء کا ہے]
(۵۲) نجف علی خاں	۲	[ایک خط نومبر ۱۸۵۸ء کا ہے]
(۵۳) زکریا خاں زکی دہلوی	۲	۱۸۶۸ء
(۵۴) مولوی احمد حسن خاں عرشی قنوجی	۲	اگست ۱۸۶۰ء تا ۱۲ ستمبر ۱۸۶۰ء
(۵۵) احمد حسین مینا یا تمنا مرزا پوری	۲	[ایک خط ۳ جولائی ۱۸۶۰ء کا ہے]
(۵۶) میر ولایت علی [مہتمم مطبع عظیم المطابع عظیم آباد]	۲	اپریل ۱۸۶۵ء
(۵۷) منشی ولایت علی خاں ولایت و عزیز	۲	۱۸۶۵ء
(۵۸) نواب زین العابدین خاں عرف گلن میاں	۲	۲۴ مارچ ۱۸۵۸ء تا ۱۴ مارچ ۱۸۶۵ء
(۵۹) سید محمد عباس علی خاں بیتاب رام پوری	۲	نومبر ۱۸۶۶ء

مکتوب الیہ	رقعات کی تعداد	زمانۂ تحریر
(۶۰) مردان علی خاں رعنا	۲	۱۸۶۲ء
(۶۱) مرزا رحیم بیگ	۱	اگست ۱۸۶۵ء
(۶۲) مفتی محمد عباس	۱	شنبہ ۱۹ صفر ۷۹ ۱۲ھ [۱۶ اگست ۱۸۶۲ء]
(۶۳) امیر الدین احمد خاں عرف فرخ مرزا	۱	۱۸۶۹ء
(۶۴) منشی غلام بسم اللہ	۱	۱۸۶۶ء
(۶۵) مولوی عبدالغفور خاں نسّاخ	۱	۱۸۶۴ء
(۶۶) مولوی عزیز الدین عزیز و صادق	۱	غدر ۱۸۵۷ء کے بعد کا خط
(۶۷) نجم الدین حیدر	۱	۱۸۵۶ء
(۶۸) منشی کیول رام ہشیار	۱	۱۸۶۵ء
(۶۹) مرزا عباس بیگ		۱۴ مئی ۱۸۶۹ء
(۷۰) محمود مرزا [مرزا عاشور بیگ]	۱	۱۲ مئی ۱۸۶۳ء
(۷۱) فرقانی میرٹھی	۱	۱۲۸۳ھ [۱۸۶۴-۶۵ء]
(۷۲) مولوی کرامت علی	۱	۱۸۶۰ء
(۷۳) تفضیل حسین خاں	۱	۱۸۶۰ء
(۷۴) حکیم غلام مرتضیٰ خاں	۱	۱۱ مارچ ۱۸۶۵ء
(۷۵) منشی محمد ابراہیم خلیل وفوق آروی	۱	جمعہ ۴ جنوری ۱۸۶۱ء
(۷۶) شیخ لطیف احمد بلگرامی	۱	۱۸۶۸ء
(۷۷) مظہر علی مارہروی	۱	اکتوبر ۱۸۶۸ء
(۷۸) منشی سخاوت حسین مدہوش بدایونی	۱	دوشنبہ ۴ فروری ۱۸۶۱ء
(۷۹) قاضی محمد نور الدین حسین فائق	۱	جولائی ۱۸۶۲ء
(۸۰) میر بندہ علی خاں	۱	۱۸ جنوری ۱۸۶۴ء
(۸۱) حکیم محب علی	۱	۱۸۶۳ء
(۸۲) محمد حسن صدر الصدور	۱	۱۱ جنوری ۱۸۶۶ء
(۸۳) منشی نول کشور	۱	مارچ ۱۸۶۳ء
(۸۴) مرزا احمد زکی لکھنوی	۱	۱۸۶۸ء
(۸۵) مہاراجا سردار سنگھ والی بیکانیر	۱	۵ جنوری ۱۸۵۹ء
(۸۶) ولیم کولڈ اسٹریم	۱	۲۸ جون ۱۸۶۵ء
(۸۷) محمد حسین خاں مالک مطبع احمدی دہلی	۱	۱۸۶۱ء

مکتوب الیہ	رقعات کی تعداد	زمانۂ تحریر
(۸۸) جلیل الدین حسین ابو محمد شاہ فرزند علی صوفی	۱	۶۸-۱۸۶۷ء
(۸۹) نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر درخشاں	۱	۱۸۶۰ء
(۹۰) خلیفہ شیخ احمد علی احمد رام پوری	۱	[زمانہ ؟]

۹۰ (نوے) مکتوب الیہم کے نام خطوط کی مجموعی تعداد	۸۷۱	۹ مارچ ۱۸۴۸ء تا جنوری ۱۸۶۹ء

محولہ بالا (نوے) ۹۰ مکتوب الیہم کے نام غالبؔ کے مطبوعہ اردو خطوط کی تعداد ۸۷۱ ہے۔ ان ۸۷۱ خطوط میں غالبؔ کے دو ایسے خطوط شامل ہونا ہیں جو نامعلوم افراد کے نام ہیں۔ گویا غالبؔ کے مطبوعہ اردو مکاتیب کی مجموعی تعداد ۸۷۳ ہوتی ہے۔



حواشی

۱؎ داستان تاریخ اردو: حامد حسن قادری۔ آگرہ اخبار پریس آگرہ طبع ۱۹۶۶ء ص ص ۲۱۷ تا ۲۱۸۔ مولانا حامد حسن قادری کے علاوہ ڈاکٹر سید عبد اللطیف نے بھی غالبؔ کے خطوط کی ایک فہرست تیار کی تھی جس میں ۵۶ مکتوب الیہم کے نام غالبؔ کے ۴۶۵ خطوط شمار کیے گئے تھے [[illegible] غالبؔ: ڈاکٹر سید عبد اللطیف۔ مترجمہ سید معین الدین قریشی۔ جہاں گیر بک ڈپو دہلی ص ص ۵۰ تا ۵۱]۔ ۲؎ مصادر کی فہرست سطور ذیل میں ملاحظہ ہو:

(۱) اردوے معلیٰ (حصہ اوّل): غالبؔ۔ اکمل المطابع دہلی طبع مارچ ۱۸۶۹ء (۲) اردوے معلیٰ (حصہ دوم): غالبؔ۔ مطبع مجتبائی دہلی طبع اپریل ۱۸۹۹ء (۳) عودِ ہندی: غالبؔ۔ مطبع مجتبائی میرٹھ طبع ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ [اکتوبر ۱۸۶۸ء] تا (۴) اردوے معلیٰ صدی ایڈیشن حصہ اوّل دوم وسوم: مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل۔ مجلس ترقی ادب لاہور طبع ۱۹۶۹ء [تین جلدیں] تا (۵) عودِ ہندی: مرتبہ مولانا مرتضیٰ حسین فاضل مجلس ترقی ادب لاہور طبع جون ۱۹۶۷ء (۶) نادراتِ غالبؔ: مرتبہ آفاق حسین آفاق — مشہور پریس کراچی طبع ۱۹۴۹ء (۷) مکاتیبِ غالبؔ: مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی۔ ناظم پریس رام پور طبع ۱۹۴۶ء (۸) خطوطِ غالبؔ: مرتبہ غلام رسول مہر۔ غلام علی اینڈ سنز لاہور طبع ۱۹۶۸ء (۹) خطوطِ غالبؔ (جلد ۱) مرتبہ مالک رام۔ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ طبع ۱۹۶۲ء (۱۰) غالبؔ کی نادر تحریریں: مرتبہ خلیق انجم۔ مکتبہ شاہ راہ دہلی طبع فروری ۱۹۶۱ء (۱۱) تلاشِ غالبؔ: نثار احمد فاروقی۔ کوہ نور پریس دہلی طبع مئی ۱۹۶۹ء (۱۲) نادر خطوطِ غالبؔ: مرتبہ سید محمد اسمٰعیل رسا ہمدانی گیاوی۔ کاشانۂ ادب لکھنؤ طبع ۱۹۳۹ء۔ اس کتاب کے جعلی خطوط کو چھوڑ کر صرف اصلی خطوط کو شمار کیا گیا ہے۔ (۱۳) صحیفہ لاہور غالبؔ نمبر جنوری ۱۹۶۹ء ص ص ۷۷ تا ۸۷ [مضمون اکبر علی خاں عرشی زادہ]

عالم فتح پوری
کشمیری بازار آگرہ - ۲

غزل

پھر فصلِ بہار آئی پھر سرو سمن مہکے
شاخوں نے لی انگڑائی پھولوں کے بدن مہکے

یادِ غمِ جاناں اک خوشبوئے مجسّم ہے
یہ ہو نہ اگر دل میں تن مہکے نہ من مہکے

اے خلدِ دل آرائی۔ اے جنّتِ رعنائی
پھر ذکر ترا آیا، پھر کام و دہن مہکے

ماضی ہی کی خوشبو سے یہ دَور معطّر ہے
خونِ رگِ انساں سے صدیوں کے کفن مہکے

وہ خون ہمارا تھا جس خون کے قطروں سے
یہ گنگ و جمن چمکے۔ یہ گنگ و جمن مہکے

یہ راز کھلا ہم پر عالمؔ کی غزل سن کر
کردار کی خوشبو سے فن کار کا فن مہکے

ڈاکٹر شفیع احمد عثمانی

رسالہ زمانہ

رسالہ زمانہ، کا پہلا شمارہ فروری ۱۹۰۳ء میں منشی شیوبرت لال صاحب ورمن کی ادارت میں قیصری پریس، بریلی، سے شائع ہوا تھا۔ لیکن عبدالرزاق صاحب قریشی نے اپنے ایک مضمون میں اس کے اجرا کے بارے میں سہواً لکھ دیا ہے کہ رسالہ زمانہ ۱۹۰۱ء سے نکلنا شروع ہوا۔ ابتدائی ۹ ماہ (یعنی فروری سے اکتوبر ۱۹۰۳ء) تک یہ رسالہ منشی شیوبرت لال صاحب ورمن کی نگہداشت میں پرورش پاتا رہا اس کے بعد نومبر ۱۹۰۳ء سے اس کو پروان چڑھانے کی ذمہ داری منشی دیا نرائن صاحب نگم کو سپرد کی گئی۔ منشی جی نے چالیس سال تک بڑی جانکاہی سے اس کی پرورش کی اور اس چھوٹے سے وے کو اسقدر تناور بنا دیا کہ اُردو صحافت میں نہ معلوم کتنے قتصادی بحران آسے مگر اس کی جڑوں کو جنبش نہ ہوئی۔ س دوران بہت سے ادبی اور علمی رسالے اُفق ادب پر طلوع ے اور قلیل عرصہ کی زندگی کے بعد چراغ سحری کی طرح ململا کر خاموش ہو گئے۔ یہ صرف منشی نگم صاحب کی پرخلوص ششوں اور اُن کی بے مثل صحافیانہ صلاحیت کا نتیجہ تھا کہ الہ زمانہ کو ایک طویل عمر نصیب ہوئی جو اس کے کسی ہمعصر الہ کو میسر نہ ہوئی۔

'زمانہ' کے صفحات ابتدا ہی سے ایک صالح ادبی شش اور پرخلوص علمی سعی و عمل کے لیے مخصوص رہے۔ ، زمانہ میں منشی جی نے رسالہ 'زمانہ' کی باگ ڈور سنبھالی، اُس وقت ملک ایک انقلابی دور سے گزر رہا تھا سیاسیات اور ادب دونوں ایک نشاۃ ثانیہ سے دوچار ہو رہے تھے۔ مدتوں کی غلامی کے بعد قومی احساسات جاگ اُٹھے تھے اور ملک بھر میں ایک نئی زندگی کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ کچھ تو مغربی تہذیب و تمدن کے اثرات سے اور کچھ قومی تحریک کے زور پکڑ جانے سے سیاسی اور ادبی موضوعات پر لکھنے والوں کا ایک پورا گروہ ایسا نکل آیا تھا جو قوم کی ذہنی زندگی کو جلد از جلد نئے مسئلوں اور تغیرات سے روشناس کرا دینا چاہتا تھا۔ اس میں علامہ شبلی، مولانا حالی، اکبر الہ آبادی، مولوی عبدالحق، منشی پریم چند، سلیمان ندوی، علامہ اقبال، سر عبدالقادر، لالہ لاجپت رائے، وقار الملک اور چکبست وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

'زمانہ' نے اُس دور کے جدید خیالات کی ترجمانی کر کے زندگی کے اعلیٰ اقدار و معیار پیش کیے ہیں۔ اس نے فرقہ وارانہ جذبات سے بالاتر ہو کر اردو زبان کی ترقی کے لیے ایسی اہم اور قابل قدر خدمات انجام دی ہیں جن پر اُردو صحافت فخر کر سکتی ہے۔ اس کی تحریریں عموماً سنجیدہ اور حقیقت رہی ہیں اور اُن کا لہجہ ایسا رہا ہے جو اُن لوگوں کو بھی ناگوار نہ ہو جو لکھنے والوں کے ہم خیال نہ ہوں۔ یہی رنگ ایک غیر جانبدار رسالہ کے لیے موزوں ہے۔

'زمانہ' نے ہندو مسلم اتحاد کی ہمیشہ صالح کوشش کی۔

جب جب اُن میں کشیدگی پیدا ہوئی، اُس نے اُردو لٹریچر کی اشاعت سے ہندو مسلم اتحاد کا عملی ثبوت دیا۔........

........جب ترک موالات کی تحریک کمزور ہوئی اور ہندو مسلم اتحاد پارہ پارہ ہوگیا اور اعلیٰ طبقوں سے لے کر ادنیٰ درجہ تک کے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے حریف نظر آنے لگے، اُس وقت بھی 'زمانہ' ہندو اور مسلمان اتحاد کا ادبی پرچم بلند کیے میدان میں ڈٹا رہا۔

'زمانہ' اُن رسالوں میں ہے جس نے یہ ثابت کر دیا کہ اُردو محض مسلمانوں ہی کی زبان نہیں بلکہ ہندو قوم بھی اس کو اپنے ملک کی ایک زبان کی طرح عزیز رکھتی ہے ہندوستان کے اردو رسالوں میں ایسا کوئی بھی رسالہ نظر نہیں آتا جس کے ہر نمبر میں مشترکہ طور پر ہندو مسلمان مضمون نگاروں نے سالہا سال لگاتار مضمون نہ لکھے ہوں اس کی یہ خصوصیت اُردو صحافت کی تاریخ میں سنہرے حروف میں لکھی جائے گی۔

'زمانہ' نے اُردو زبان میں مغربی اور مشرقی خیالات کے ارتباط و ہم آہنگی کی تصویر پیش کی نیز اُن علوم و فنون اور واقعات پر خامہ فرسائی کی جو ہمارے طرز معاشرت پر اثرانداز ہوتے ہیں اور جن کی معمولی واقفیت تہذیب و شائستگی کا معیار قرار دی جاتی ہے۔

اُردو رسائل میں عریاں تصویروں اور مخرب اخلاق باتوں کی بڑی فراوانی ہے مگر رسالہ 'زمانہ' کا دامن ہمیشہ ان آلائشوں سے پاک رہا۔ اس نے ایسے بیش بہا ادبی جواہر پارے پیش کیے جس کی وجہ سے اُس کا شمار ادب کے شاہکاروں میں ہوتا ہے۔

'زمانہ' کے صفحات میں اُردو زبان کی بیسویں صدی کے نصف اول کی مکمل تاریخ ملتی ہے۔ اس نصف صدی میں اُردو زبان نے جتنی ترقی کی ہے، اس کے صفحات اس کی پوری کہانی کے حامل ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس کی معاشی و سیاسی ترقیوں پر بھی جا بجا تبصرے ملتے ہیں۔ تحقیقی و تنقیدی مضامین کی بھی اس میں کمی نہیں۔ ادب کا کوئی گوشہ ایسا نہ ہوگا جس پر نہایت پر مغز مضامین موجود نہ ہوں۔

-۲-

'زمانہ' فروری ۱۹۰۳ء سے جون ۱۹۴۹ء تک یعنی تقریباً ۴۶ سال تک جاری رہا۔ نومبر ۱۹۴۲ء میں منشی جی کی وفات کے بعد اس کی ادارت کی باگ ڈور ان کے بڑے بیٹے جناب سری نرائن صاحب نگم نے سنبھالی مگر وہ کچھ تو اپنے پیشہ کی مصروفیت اور کچھ زمانہ کی ناقدر دانی کی بنا پر اسے زیادہ عرصہ تک جاری نہ رکھ سکے۔ 'زمانہ' کی ۴۶ سال کی عمر میں اس کی ۹۲ جلدیں شائع ہوئیں جس میں مجموعی طور پر ۳۴۲۳ مضامین مختلف موضوعات پر شائع ہوئے۔ یہ تعداد اتنی بڑی ہے کہ ان پر جداگانہ تبصرہ کے لیے ایک ضخیم دفتر درکار ہوگا۔ اس لیے اجمالاً اُن کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

'زمانہ' میں سب سے زیادہ مضامین "سوانح حیات" کی شکل میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کی تعداد ۹۳۸ ہے جس میں ۶۵۱ سوانح عمریاں صرف ادیبوں اور شاعروں کی ہیں۔ یہ تعداد اتنی کثیر ہے کہ اگر ان کی تدوین کر کے علاحدہ کتاب کی شکل میں شائع کیا جائے تو ایک نایاب تذکرہ تیار ہو سکتا ہے۔ ان میں بعض سوانح عمریاں تو ایسی ہیں جو کسی نئے یا پرانے تذکرہ میں شاید ہی دستیاب ہو سکیں۔

سوانح حیات کے بعد دوسرا نمبر ادبیات کا ہے۔ اس کے ۸۰۷ مضامین میں ۹۴ مضامین اردو شاعری پر ہیں جس میں اُس کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ ان مضامین کے مطالعہ سے اُردو شاعری کے قدیم و جدید رجحانات پر سیر حاصل واقفیت دستیاب ہو سکتی ہے۔

لسانیات کے تحت جو مضامین اُردو ہندی تضیہ پر شائع ہوئے ہیں، وہ بہت ہی بصیرت افروز ہیں۔ اُردو ہندی تضیہ اس وقت بھی کم نہیں ہوا ہے بلکہ اس میں پیشتر سے کچھ اضافہ ہی ہو گیا ہے۔ ان مضامین کا مطالعہ اس پیچیدہ مسئلہ کے حل میں مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

'زمانہ' کے مضامین کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے علم و ادب کی کسی بھی شاخ مثلاً فلسفہ، مذہب، سماجی علوم، لسانیات، سائنس، اطلاقی سائنس، فنون لطیفہ ادبیات، تاریخ، سفرنامے اور سوانح حیات وغیرہ کو تشنہ نہیں چھوڑا۔ حتی الوسع اس نے اس کی ہر شاخ کی آبیاری کرکے اسے سرسبز و شاداب رکھنے کی کوشش کی ہے اور اپنے قارئین کو رنگا رنگ مضامین سے نوازا ہے۔ اس کی یہی چیز اسے اپنے دوسرے ہمعصر رسائل سے ممتاز کرتی ہے۔

مضامین نثر کے علاوہ اس میں مجموعی طور پر ۳۹۹۶ قصاید، غزلیات، نظمیں، مراثی، رباعیات، قطعات، سہرے اور گیت وغیرہ بھی شائع ہوئے ہیں۔ یہ تعداد مضامین نثر سے بھی زیادہ ہے۔ یہ غزلیں اور نظمیں اس زمانہ کے چوٹی کے شعراء کی ہیں جس سے اس رسالہ کی ادبی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

- ۳ -

کسی بھی رسالہ کی اہمیت و افادیت کا اندازہ اس بات سے کیا جاتا ہے کہ اس کو قلمی معاونین کس طرح کے ملے۔ 'زمانہ' کو اس بات پر ناز ہے کہ اس دور کا کوئی اہل قلم ایسا نہیں گزرا جس نے 'زمانہ' کی قلمی معاونت سے دریغ کیا ہو۔ اس میں مجموعی طور پر ۸۷۸ مضمون نگاروں نے اس کی قلمی معاونت کی۔ یہ تعداد اتنی کثیر ہے کہ شاید ہی کسی دوسرے رسالہ کو نصیب ہوئی ہو۔ اس میں مختلف اقوام و مذہب کے مشہور اہل قلم شامل ہیں۔ ان میں بعض تو ایسے ہیں جنھوں نے 'زمانہ' کا سہارا لے کر لکھنا سیکھا اور آگے چل کر شہرت و مقبولیت حاصل کی اور آج دنیائے اُدب میں اُن کا ڈنکا بج رہا ہے۔

ہر مضمون نگار کے تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی کارناموں متعلق لکھنے کی یہاں گنجائش نہیں۔ اس لیے تفصیل سے گریز کرتے ہوئے اجمالی طور پر چند مشاہیر کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

منشی پریم چند ان شخصیتوں میں ہیں جنھوں نے 'زمانہ' کا سہارا لے کر لکھنا سیکھا اور آگے چل کر ایسی شہرت کے مالک بنے جو ان کے کسی ہمعصر ناول نگار کو نصیب نہ ہوئی۔ منشی جی کے قریب ایک سَو افسانے اور ڈرامے رسالہ 'زمانہ' میں شائع ہوئے۔ آپ کا تاریخی ڈرامہ "کربلا" سب سے پہلے 'زمانہ' میں قسط وار شائع ہوا تھا جو اب کتابی شکل اختیار کر چکا ہے۔

جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی کے مصوری، موسیقی، رقص، اداکاری پر مضامین بے مثال ہیں اسی طرح بشیشور پرشاد منور لکھنوی کے مضامین "بحر ترنم" نے علم موسیقی میں ایک گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ یہ مضامین دس قسطوں پر مشتمل ہیں۔

اقبال ورما سحر ہتگامی نے اپنے مضامین 'ہندو مسلم اتحاد' اور "موجودہ ہندو مسلم نفاق" کے ذریعہ ہندو مسلم کشیدگی دور کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون "مذہب کا مستقبل" میں بتایا ہے کہ مذہب کا مفہوم کیا ہے اور انسان کی تربیت میں اس کا کیا مقام ہے۔

رسالہ 'زمانہ' کے معاونوں میں محمد عبدالرؤف عشرت لکھنوی کا ایک مخصوص مقام ہے۔ آپ کا موضوع تحریر صرف "تاریخ اودھ" ہے۔ آپ کے اس موضوع پر تقریباً ۵۵ مضامین شائع ہوئے ہیں جس میں موصوف نے اودھ کے مختلف تاجداروں اور بیگمات کے حالات قلمبند کیے ہیں۔

اُردو ہندی تنازعہ ابتدا ہی سے چلا آ رہا ہے۔ کسی کا دعویٰ ہے کہ یہ مسلمانوں کی زبان ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ شمالی ہند کے ہندو مسلم دونوں کی مشترکہ زبان ہے۔ انھیں خیالات کے پیش نظر "حق پرست" نے اس موضوع پر متعدد مضامین 'زمانہ' میں لکھے۔ ان مضامین میں موصوف نے اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر بحث

کر کے تصویر کے دونوں رخ دکھانے کی کوشش کی ہے"۔ حقیقت کی طرف شیام موہن لال جگر بریلوی نے بھی اس متنازعہ مسئلہ کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔

اردو لسانیات اور فلسفہ پر سلیم جعفر صاحب کے مضامین کافی اہمیت رکھتے ہیں۔

منشی دیا نرائن نگم نے خود 'زمانہ' کے لیے اتنے مضامین لکھے ہیں جو شاید آج تک کسی مضمون نگار نے نہ لکھے ہوں گے۔ اُن کے مضامین کی تعداد ۳۶۲ ہے۔ اُن کے مضامین زیادہ تر 'رفتار زمانہ' کے عنوان سے شائع ہوتے تھے جس میں اُس دور کے سماجی، معاشی، سیاسی حالات پر تبصرہ ہوتا تھا۔ آپ نے ایک دوسرا سلسلہ "یادِ رفتگاں" کے عنوان سے بھی شروع کیا تھا جس میں کسی مشاہیر ادب یا شاعر کے حالات قلمبند کرتے تھے۔

ان مضمون نگاروں کے علاوہ بابو گنگا پرشاد ورما، منشی ذکا اللہ، برج نرائن چکبست، منشی نوبت رائے نظر لکھنوی، لالہ بالمکند گپتا، تصدق حسین، محمد یحیٰ تنہا، جے۔ آر۔ رائے، جعفر علی خاں اثر لکھنوی، منظور الحق کلیم، مرزا سلطان احمد، شیو نرائن شمیم، ضیاالدین احمد برنی، حسرت موہانی، عبدالحق، عبدالماجد دریا آبادی، شیخ عبدالقادر، محمد ہادی عزیز لکھنوی، محمد عزیز مرزا، فراق گورکھپوری، حامد حسن قادری، کشن پرشاد کول، لاجپت رائے، مالک رام، آنند نرائن ملا، نظم طباطبائی، نیاز فتحپوری، برج نرائن، دتاتریہ کیفی، پریم ناتھ در ما اور پروفیسر محمد حبیب جیسے عظیم المرتبت ادیبوں نے اپنے مضامین سے اس رسالہ کی وقعت کو بڑھایا۔

خاتون مضامین نگاروں میں شریمتی چاندرانی، شریمتی شیورانی دیوی، مسز پریم چند، شریمتی شیو کماری دیوی، اخلاق فاطمہ، امجدی بیگم، مسز روشن لال، مسز شیریں فوجدار، صغیر بیگم بریلوی، مسز عبدالواحد، محترمہ فرحت ہاشمی بدایونی، بیگم شفیع احمد قدوائی وغیرہ نے بھی رسالہ زمانہ کی قلمی معاونت فرمائی۔

یہ محض اتفاق کی بات ہے کہ رسالہ "زمانہ" کے قلمی معاونین میں مضمون نگار اور شعراء کی تعداد کم و بیش برابر برابر ہے۔ تقریباً ۸۴ شعراء نے اپنی فکر بلند سے اس رسالہ کے اوراق کو گل گلزار بنایا ہے۔ اس میں اُس دور کے چوٹی کے تمام شعراء بلا امتیاز مذہب و ملت شامل ہیں۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن کا ذکر مضامین نگار کے سلسلے میں آچکا ہے۔ ان شعراء کی فہرست کافی طویل ہے۔ اس مختصر مضمون میں ان پر تبصرہ کی گنجائش نہیں۔ لہٰذا تفصیل سے گریز کر کے ذیل میں چند شعراء کے اسمائے گرامی دیے جاتے ہیں جو آسمان شاعری کے درخشندہ آفتاب اور درخشندہ مہتاب کی حیثیت رکھتے ہیں مثلاً حالی، شبلی، اقبال، اکبر الہ آبادی، چکبست، شاد عظیم آبادی، اثر لکھنوی، جگر مراد آبادی، جوش ملیح آبادی، سرور جہان آبادی، نوبت رائے نظر لکھنوی، بشن نرائن در ابر لکھنوی، نادر کاکوروی، احسان دانش، آرزو لکھنوی، جگن ناتھ آزاد، اصغر گونڈوی، افسر میرٹھی، برق دہلوی، بیتاب بریلوی، ثاقب کانپوری، جگر بریلوی، حسرت موہانی، راز چاندپوری، جگت موہن لال رواں، روش صدیقی، ریاض خیرآبادی، اقبال ورما سحر ہنگامی، شرر سہارنپوری، صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی، فراق گورکھپوری، تلوک چند محروم، محشر لکھنوی، سنت پرشاد مدہوش، آنند نرائن ملا، منور لکھنوی، سورج نرائن مہر دہلوی، رام پرشاد ناشاد، نشور واحدی اور علی حیدر نظم طباطبائی وغیرہ۔



حواشی

۱ زمانہ، فروری ۱۹۲۸ء (جوبلی نمبر): جلد ۵۰: نمبر ۲: ص ۱۹ (بحوالہ دیا نرائن نگم) ۲ رسالہ "آج کل" (اردو) دسمبر ۱۹۵۹ء

غزلیں

حقؔ بنارسی

تو یہ نہ سمجھ میں ترا محتاجِ کرم ہوں
اے گردشِ ایام میں خود خالقِ غم ہوں

میں ناز کشِ حلقۂ اربابِ ستم ہوں
محرومِ کرم ہو کے بھی ممنونِ کرم ہوں

اے قافلے والو مجھے غیرت نہ دلاؤ
ہے مصلحتِ وقت جو میں سست قدم ہوں

مدت ہوئی دیکھا تھا صنم خانے کی جانب
اب تک ہدفِ طعنۂ اربابِ حرم ہوں

کیوں آپ حقارت سے مجھے دیکھ رہے ہیں
رسوائے زمانہ ہوں مگر آپ سے کم ہوں

دنیا سے الگ ہے مرا اندازِ تباہی
برباد ستم سب ہیں میں بربادِ کرم ہوں

یوں گامزنِ رہگذرِ ضبط ہوں اے حقؔ
دنیا یہ سمجھتی ہے کہ ناواقفِ غم ہوں

شوکتؔ پردیسی
جسہاں - جونپور

وہ ہوتے اور ہم ہوتے تو کوئی گفتگو ہوتی
غرض یہ ہے کہ جو بھی بات ہوتی روبرو ہوتی

تمہارے دم سے ہے دنیا میں رنگِ دلکشی ورنہ
نہ کوئی ولولہ ہوتا نہ کوئی آرزو ہوتی

اگر تم مہرباں ہوتے تو ایذا غیر کیوں دیتا
یہ دنیا خود نشاطِ دل میں رنگ و بو ہوتی

کسی صورت، کسی عنواں سے دل آباد ہی رہتا
نہ ہوتی آرزو تو آرزو کی آرزو ہوتی

جلا کر خاک کر ڈالا نہ یہ سوچا، نہ یہ سمجھا
کلی جب پھول بن جاتی، چمن کی آبرو ہوتی

اگر تم مل بھی جاتے تو نہ ہوتا ختم افسانہ
کہ اس کے بعد دل میں جانے کیا آرزو ہوتی

اسی کی دھڑکنوں پر ہے مدارِ زندگی ورنہ
نہ ہوتا دل تو پھر کیوں کر صدائے ہاؤ ہو ہوتی

اجڑ کر میں نے اک رونق نئی دی بزمِ گیتی کو
نہ میں بربادِ غم ہوتا نہ دنیا سرخ رو ہوتی

شبِ غم میں ہوں شوکتؔ اور اک سفاک خاموشی
شریکِ غم کوئی ہوتا تو شرحِ آرزو ہوتی

عتیق جیلانی سالک
کوچہ فرنگن رام پور

شاد عارفی: ایک مطالعہ

عظیم شاعر کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ اپنے دور کا انقلابی ہوتا ہے، یعنی اس کی شاعری روایتی اور بندھے ٹکے مضامین تک محدود نہیں ہوتی — بلکہ وہ اپنے لیے آسمان و زمین خود پیدا کرتی ہے۔

اہل کمال خان آرزو کے زمانے تک فارسی کی لذت ہائے گوناگوں کے اس درجہ والہ و شیدا تھے کہ ریختہ ان کے نزدیک بقول میر فن بے اعتبار تھا — حالانکہ فارسی استعارات اور محاوروں کی وجہ سے اردو کا دامن کافی وسیع ہو گیا تھا۔ لیکن خود اردو زبان میں جب کبھی مجدد شعرا پیدا ہوئے انھیں ایک منفرد تصور کیا گیا۔ میر اگرچہ خدائے سخن کہلائے مگر نظیر سے بڑھ کر انقلابی نہ تھے۔ غالب کے کلام میں فارسیت کے رچاؤ کے باوجود ان کی اپنی شخصیت، طنز کی نشتریت اور نئے نئے مضامین کی چاشنی نے انھیں غالب بنایا۔

اس سے ہٹ کر ہماری نظر حالی سے ہوتی ہوئی اکبر اور اقبال تک آتی ہے۔ اقبال نے اردو نظم کو درجۂ کمال تک پہنچایا تو میرا جی اور ن م راشد کے بعد یگانہ چنگیزی کی بے پناہ انانیت نے ہمیں چونکنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن اس کے بعد اردو شاعری کی فضا میں دبیز سناٹا دکھائی دیتا ہے۔ اور ایسا کوئی شاعر نہیں ملتا۔ جو صرف ترقی پسند نہ ہو۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کی تاریخ کو نیا موڑ دینے والا ہو۔ میری مراد جدیدیت کے علم برداروں سے بھی ہو سکتی تھی۔ بشرطیکہ "شاد عارفی" اپنے آپ کو "جدیدیت" کا پیرو کار تسلیم کر لیتے۔ اس طرح وہ نہ "جدیدیے" ہیں۔ نہ قدیمیے" — بلکہ ان کے درمیان کی کڑی بنے ہوئے ہیں۔ وہ "جدیدیے" اس لیے نہیں کہ ان کی جدیدیت کی نقل نہیں ہو سکتی۔ جب کہ "جدیدیت" ایک ازم بنتی جاری ہے۔ خود انھوں نے ورڈسورتھ، کارلائل، اور سولفٹ کی تقلید کا الزام سختی سے رد کر دیا ہے۔ اور "سفینہ چاہیے" میں اپنے ترقی پسند ہونے سے بھی انکار کیا ہے۔ حالانکہ وہ کافی ترقی پسند نظر آتے ہیں ؎

جب غریب جنتا نے 'پرچمِ آزادی' دل پہ تیر کھا کر سعی سرخرو کی ہے
کیا بتائیں ان داتا، اب رہا نہیں جاتا آپ عیش کرتے ہیں، اور قوم کلبو کی ہے
غیر کی عطا کردہ حکمت و سیاست پر، ناسزا قیادت پر قوم کٹ بھی جاتی ہے
قوم ڈٹ بھی جاتی ہے، پھر بھی آج تک ہم نے احتیاط کی حد میں تم سے گفتگو کی ہے
آپ کی نگاہوں نے موٹروں کے شیشوں سے مختصر وقفے میں، نوجوان دیکھے ہیں
کاش غور فرماتے، عمر کی رعایت سے، ان کے دل کے اندر لو بند بھی ہوئی ہے

لیکن وہ ماقبل جاری ازم کے ماننے والے نہیں تھے۔ ان کا ازم شاد عارفی ازم تو ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ یہ ازم شاد عارفی سے شروع ہوا اور انھیں پر ختم ہو گیا — بالکل اسی طرح۔ جیسے نظیر کے ساتھ ہوا۔ یا اردو نثر میں مکاتیب مہدی افادی کہ ان کا اتباع کوئی نہ کر سکا۔ شاد ادب برائے زندگی کے قائل تھے۔ لیکن اس کی تفسیر بھی انھوں نے جس انداز سے پیش کی ہے۔ وہ ہم عصر شعرا میں سب سے مختلف اور انوکھی ہے۔

شاد نے اپنی شاعری کے ذریعے ترقی پسندی وجدیدیت دونوں سے بغاوت کرتے ہوئے ایک نئی آواز اور

سے اسلوب سے اردو شاعری کو آشنا کیا۔ ان کی یہ کوششیں ہر قسم کی ملمع کاری و بناوٹ سے پاک و صاف ہیں۔ بلکہ زیادہ تر کلام میں کہانی یا ڈرامے کا سا مزہ آتا ہے۔ جب کہ جدیدیوں کے یہاں اشارے کنایوں سے کام لینا انتہائی کمال سمجھا جاتا ہے۔ ترقی پسندوں کی طرح وہ بھی جاگیردارانہ نظام سے شاکی نظر آتے ہیں مگر ان کی ترقی پسندی اُن سے مختلف ہی رہتی ہے یعنی نہ تو وہ لینن وادی بنتے ہیں۔ اور نہ کروچے اور سارتر کے خوشہ چیں۔

کلامِ شاد میں جہاں کہیں غریبی، امیری کا ٹکراؤ ہے بھی تو اس میں کسی مشن یا تحریک کا کوئی دخل نہیں۔ وہ اپنی بات پوری قوت اور آمد کے ساتھ بے خوفی سے کہتے ہیں۔ یہی ان کا کمال ہے۔

اردو شاعری میں خاص طور سے غزل گو شعراء نے موضوعات میں کوئی جدت نہیں پیدا کی۔ اور وہ لوگ محض لکیر کے فقیر بنے رہے۔ جس کے نتیجے میں الفاظ کی بھرپور جادو بیانی اور پیچیدہ تراکیب، تشبیہات، استعارات اور غیر مانوس تلمیحات جن کا ہماری روزمرہ زندگی سے کوئی تعلق نہیں، غزل کی جان بن گئیں۔ یوں تو شاد کے علاوہ بھی کئی شعراء نے اپنے کلام میں عصری آگہی کا بھرپور اظہار کیا۔ مگر شاد کا کمال ان سے پھر بھی مختلف ہی رہتا ہے۔ کیوں کہ وہ واقعات کے علاوہ الفاظ بھی وہی استعمال کرتے ہیں جو ان کے معاشرہ میں روزمرہ کی زندگی میں بولے جاتے ہیں۔

اردو ادب کی تاریخ میں نظیر اور انشاء اللہ خاں انشا کی شخصیتیں ایسی ہیں جنھوں نے خالص عوامی ماحول کی عکاسی کی ہے۔ لیکن کہیں کہیں وہ ادبیت کو مجروح کر بیٹھے ہیں۔ لیکن شاد، انشا اور نظیر دونوں کے مقابلے میں زیادہ قابلِ تعریف ہیں۔ کیوں کہ وہ عوامی ماحول کے ساتھ ساتھ حسنِ تغزل بھی برقرار رکھتے ہیں۔ وہ سماج کا گہری نظر سے جائزہ لیتے ہیں۔ اس کے مسائل کو محسوس کر کے بجنسہٖ پیش کر دیتے ہیں۔ چوں کہ واقعات میں وارداتِ قلب شامل ہیں۔ اس لیے ان کی نشتر زنی کے پیچھے کوئی نظلم یا ہ نہیں، نہ وہ کسی پر پہلے حملہ آور ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں ان حملوں میں ایک درد اور تڑپ موج زن رہتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی سے انتقام لے رہے ہوں۔ یا یہ کسی واقعہ کا ردِ عمل ہو۔

کلاسیکی شاعری کے پرستار جدید غزل پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس میں تغزل اور بلاغت مفقود ہے جب کہ یہ غزل کی جان ہیں۔ لیکن آپ کو شاد کی غزلوں میں تغزل بھی ملے گا۔ نیز انفرادیت اور ندرت بھی! وہ غزل کی لطافت کو جدید صوتیات کی خاطر مجروح نہیں ہونے دیتے۔ وہی بے تکلف اندازِ سخن جو ان کی منظومات کا مایۂ افتخار ہے، غزلیات میں بھی جاری و ساری رہتا ہے۔

شاد کا کلام عروض کی پیچیدہ اور خشک موشگافیوں سے پسپا نہیں ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ وہ "معریٰ" کہتے ہوں ــ مگر اس کا خیال رکھتے ہیں کہ کہیں "وجدان" قربان نہ ہو جائے ــ چنانچہ ان کا کلام ان کے دل کی آواز اور عوام کے لیے پسندیدہ بن گیا ہے ؎

دیکھتی رہتی ہیں آنکھیں، کون ہے کس رنگ میں
سوچتی رہتی ہے دنیا، کس کو رسوا کیجیے

اسے جس حال میں سجدہ کیا ہے
اُسے اللہ بہتر جانتا ہے

؎ ہر مکیش کی ذہنی کاوش اس محور پر گھوم رہی ہے
جیسے وہ سنبھلا بیٹھا ہے، جیسے محفل برہم ہے

شاد عارفی کی مقامیت نے ان کو محدود کرنے کی سعی کی ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی جس طرح میر کا ذاتی غم آفاقی ہو گیا۔ اور جس طرح ہمیں انیس کے مراثی میں کربلا کا ماحول نامانوس نہیں لگتا۔ چنانچہ ہم اسے اپنانے پر مجبور ہو گئے ہیں ــ جس طرح نظیر کی منظومات میں آگرے کا ماحول بالکل اجنبی نہیں معلوم ہوتا۔ اسی طرح شاد کے کردار

وواقعات مخصوص ہوتے ہوئے بھی محدود نہیں رہ سکتے۔ کیوں کہ ان مسائل اور حالات سے ہمارا سابقہ کسی نہ کسی طرح ہر جگہ پڑتا ہے۔ اور ہم انھیں کو علامت قرار دے کر دوسرے حالات یا اشخاص پر قیاس کر سکتے ہیں۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ کو ان کے بعض الفاظ نامانوس معلوم ہوں۔ لیکن شادؔ کی لفظیات ایسی ہیں کہ ان کے نکال دینے سے بے ساختگی اور بے تکلفی معدوم ہو جائے گی۔ مثلاً

کل تھا لیکن آج نہ ہوگا　　طاقِ در کا ٹھینگا سر پر

سنبھل سنبھل کر قدم بڑھاتے ہیں اس طرح مصلحت کے پیرو

کہ جیسے سکّے کی طرح، رستے میں، کامیابی پڑی ملے گی

یہ اور بات ہے کہ قفس جھیل جائیں ہم　　ممکن نہیں، قفس کو نشیمن بنا سکیں

راہنما کی الجھی باتیں جیسے پگڈنڈی کی زلفیں　　ماتھے کی شکنیں کچھ ایسی جیسے بستر رکھو لگیا ہو

مصلحت ہیں، ورنہ زور زور ممکن ہیں　　نوجوان فن پارے ریشمیں خیالوں سے

چار چھ ایسے ہیں لیکن بیشتر یہ بھی نہیں　　کوئی ہمدردی کا جملہ، کوئی بہلانے کی بات

ناصح جو غلط بین دغلط کار رہا ہے　　آنکھوں سے ترے ذہن سے نادار رہا ہے

مگر یہاں تو جل رہا ہے آدمی سے آدمی　　سنا یہ تھا چراغ سے چراغ جلتے آئے ہیں

یہ اور اس طرح بے شمار الفاظ، محاورے، حسین استعارے شادؔ کی دین ہیں۔ اس طرح علامت نگاری کے سلسلے میں بھی شادؔ نے نہ صرف نئے تجربات کیے ہیں، بلکہ معاصرین میں اپنی انفرادیت بھی برقرار رکھی ہے۔ کیوں کہ ان کے علائم کی توجیہہ اتنی دشوار نہیں لگتی کہ عام طور پر نظر آتی ہے۔ انھیں شادؔ کا معاشرہ کسی نہ کسی حالت میں برتتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تاثرات کافی دقیع ہوتے ہیں۔ "گھٹا کی زلفِ مشکیں سے دھواں اٹھنا" "سکّے کی طرح راستے میں کامیابی پڑی ملنا"، "ماحضر پر تجربہ فرمانا"، "اجالوں کے پجاری اور اندھیروں کے دھنی ہونا"، "مونڈھے کا اصول ہونا"، "ذہنیتوں کا رہین تجھی ہونا"، "فکر کے عنوان سے انسلیٹ ہونا"، جوتے جھاڑ لینا، آنگن ناپنا، باہیں مروڑنا، روپ دھارنا، باری لکھنا، برقِ سرو قد، پشیمانِ عقیدت، خود غزل دستہ، وغیرہ یہ تمام اختراعات شادؔ عارفی ہی کا حصہ ہیں۔

شادؔ کے یہاں اکثر مکالماتی اندازِ بیان ملتا ہے — جس سے محاکات کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے —

حسیں ہو تم آپ کی بلا سے پری ہو تم آپ کی دعا سے

جواب ملتا ہے سخت لہجے میں ان سے جو بات پوچھتا ہوں

شادؔ کا اصلی آرٹ "طنز" ہے۔ ان کی طنزیہ تخلیقات مزاح پھبتی اور ظرافت سے برائے نام قریب ہوتی ہیں۔ ورنہ وہ خالص طنز کے مزاج داں ہیں۔ "میرا حصّہ دور کا جلوہ" میں فرماتے ہیں

میر و سودا سے لے کے انشا تک　　غالباً آپ بھی کریں گے صاد

طنز اردو ادب میں تھا ہی نہیں　　اور تھا بھی اگر تو نام نہاد

ایک اور جگہ فرماتے ہیں

جب کیا قوم پر مسدس چست　　کانپ اٹھا دلِ غلام آباد

طنزِ حالیؔ کی اس عمارت میں　　کام آئی نظیرؔ کی بنیاد

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اپنے منفرد اندازِ بیان یا اسلوب ہی کا احساس نہیں تھا۔ بلکہ وہ اپنے مخصوص "طنز" پر نازاں بھی تھے۔

ڈاکٹر مظفر حنفی فرماتے ہیں کہ "ان کے یہاں طنزیہ اشعار کی تلخی کو کم کرنے کے لیے ان پر مزاح کی چاشنی نہیں لپیٹی گئی لہٰذا ان میں بقول نیاز فتح پوری

TO HIT THE HAIL ON THE HEAD

والی قطعیت پیدا ہو گئی ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ وہ جو کبھی لڑائی لڑنے کے عادی نظر آتے

ہوا۔ بیا پچہ ذہنی ہمارے آجاتا ہے زخمی ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

آئی ہیں مرے طنز کی چھینٹیں تو کبھی پر
یہ کیا کہ فقط آپ برامان رہے ہیں

چمن کے چہرے پر یہ خراشیں، انھیں سگو نے کہیں کہ لائیں
بہار نے مشق نازکی ہے، خزاں کا پھیرا نہیں ہوا ہے

جب چلی اپنوں کی گردن پر چلی
چوم لوں منھ آپ کی تلوار کا

ایک ادیب یا شاعر کی نظر عام آدمی کے مقابلے میں زیادہ متجسس اور تیز ہوتی ہے۔ وہ زندگی کی باریک ترین حقیقتوں اور نازک ترین گوشوں و جزئیات کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ خاص طور سے اس کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے۔ جب وہ سماج کے گھناؤنے چہرے سے نقاب ہٹا دیتا ہے اور رستے ہوئے ناسوروں کا نوک قلم سے آپریشن کرتا ہے۔ اس وقت وہ ایک ماہر سرجن بن کر سامنے آتا ہے ۔ شاؔد کے یہاں یہ خوبیاں اُن کے مخصوص آرٹ کے ساتھ ملیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام فوراً پہچان لیا جاتا ہے۔ اس پہچان میں شاد کی مقامیت، طنز، ڈرامائی عناصر، مخصوص انداز بیان، اسلوب، لفظیات، سادگی و پرکاری، علامتی انداز سخن، وغیرہ کارفرما نظر آتے ہیں۔ شاؔد کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ اعتراض نہیں برداشت کر سکتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے کھینچ تان کر اپنے ہر معترض پر جوابی مضامین لکھے اور ان کے اشعار کی قلعی کھولنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انھوں نے کبھی کسی کا کہنا نہیں مانا۔ بقول خلیل الرحمٰن اعظمی بعض تلامذہ ان کے بتائے ہوئے طریقہ کے خلاف شعر کہہ ڈالتے تھے۔ اور ان کے رکھے ہوئے الفاظ و تراکیب کو رد کر دیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ یہ ہوگی کہ وہ الفاظ ان کی طبیعت سے میل نہیں کھاتے ہوں گے۔ اختلاف رائے اور لوگوں کو بھی رہا ہے۔ خود کئی بار شاؔد عارفی نے اپنے کلام میں نمایاں تبدیلیاں کی ہیں۔ چنانچہ ایک ہی غزل یا نظم مختلف مقامات پر مختلف شکل میں شائع ہوئی ہے۔ کبھی کبھی وہ دوسروں کے کہنے سے بھی اپنے کلام میں تبدیلی کرنے پر راضی ہو جاتے تھے۔ انھوں نے اپنے دور کے نامی گرامی شعرا دانشوروں کو بھی نہیں بخشا۔ ایسے مواقع پر نہ صرف شاعری بلکہ تحریر بھی ان کا قلم اپنی جولانیاں دکھاتا تھا۔ ان کی اسی بے خوفی نے ان کی نثر میں بھی وہی بے ساختگی اور تیکھا پن پیدا کر دیا ہے۔ ان کی نثر میں انداز بیان کہیں واضح اور دلچسپ ہے اور کہیں استعاراتی۔ جس سے ایک مخصوص دلکشی و دل آویزی اور حسن پیدا ہو گیا ہے۔ افسوس کہ ابھی تک ان کی شاعری کی طرح نثر نگاری کا تفصیلی جائزہ نہیں لیا گیا۔ انھوں نے بہت سے فرمائشی مضامین بھی لکھے اور بہت کچھ محض تفنن طبع کے لیے لکھا۔ ان کا مقصد تحقیقی میدان میں دادخواہی ہرگز نہیں تھا۔ اسی لیے ابوالکلام آزاد کی طرح محض اپنی یادداشت پر بھروسہ کر کے جو بھی ذہن کے کینوس پر ابھرا لکھتے چلے گئے۔



نصر قریشی
۷۷/۴ ۔ پٹیا بہادر گنج
الہ آباد ۔ ۳

ہولی آئی ہے

ہولی آئی ہے ، حسیں رنگ اڑاتے جاؤ
دل کے دروازوں کو رنگین بناتے جاؤ
رنگ بے رنگ نظاروں کو ملا رنگوں سے
لالہ زاروں کی طرح سب کو ہنساتے جاؤ
ہولی رنگوں کا ہے تہوار ، ملن کا موسم
دشمنوں کو بھی گلے اپنے لگاتے جاؤ
رنگ پیراہنِ گل غنچوں کو رنگت بخشے
رنگِ رخسار سے دامن کو سجاتے جاؤ
نغمہ و رنگ سے رنگین ہے محفل ساری
رنگ برسا ہے ، فضاؤں کو جگاتے جاؤ
آج پورا ہوا ہے رنگ کی سوغات کا خواب
داغِ دل ، داغِ تمنا بھی مٹاتے جاؤ
کوئی تفریق نہیں غیروں کی اور اپنوں کی
پیار گنگا ہے جو ہر سمت بہاتے جاؤ
ہولی کے رنگ کا مقصد ہے محبت یارو !
دل سے نفرت کے نشانوں کو مٹاتے جاؤ
ایک سنگم ہے یہاں مختلف تہذیبوں کا
قومی یکجہتی کا آئینہ دکھاتے جاؤ
نصرؔ غم رنگ کی برسات میں بہہ جائے گا
بزمِ احباب میں تم ہولی مناتے جاؤ

شاکر جرولی
معرفت "قومی آواز"
لکھنؤ

غزل

چھپا کے خنجرِ نکہت تہہ ردا کوئی
خزاں کے زخم بہاروں کو دے گیا کوئی

نہ زندگی ترے میلے میں چل سکا کوئی
ابھی تھا بھیڑ سے نکلا کہ کھو گیا کوئی

ہے بڑھتی دھوپ سے اتنا ڈرا ہوا کوئی
طلوعِ مہر کو کہتا ہے حادثہ کوئی

لیے ہے دوش پہ دونوں جہاں کا غم لیکن
خود اپنا بوجھ نہ اب تک اٹھا سکا کوئی

ابھی تو دھول بھی بیٹھی نہ تھی رہِ دل کی
پھر آ گیا تری یادوں کا قافلہ کوئی

سما سکی جو نہ آنچل میں سو کتابوں کے
وہ بات چند اشاروں میں کہہ گیا کوئی

وہ گیسوؤں کا دھندلکا ، یہ صبحِ عارض کی
نہ جانے کب سے مری انجمن میں تھا کوئی

اٹھا نہ ایک بھی شعلہ ملی کہیں بھی نہ راکھ
پرائی آگ میں اس طرح جل گیا کوئی

گیا وہ چھوڑ کے صحرا کہیں جسے شاکرؔ
ہے کس کو ریت کے ٹیلوں میں ڈھونڈتا کوئی ؟

۵۷۔ موتی لال بوس روڈ
نیا گاؤں — لکھنؤ

(خاکہ)

مشتاق سلونوی

۱۸۷۸ء — ۱۹۴۵ء

سب کو معلوم ہے مشتاق ہے تلمیذ شہیر
جس کی مشہور زمانے میں غزل خوانی ہے

اللہ بخشے مولوی محمد صدیق کو ان کا صدیق بک ڈپو نصف صدی تک مرکز ادب بنا رہا اور اس کے توسل سے اس دور کی لاتعداد گرانقدر ادبی شخصیات کی زیارت، تعارف، گفتگو اور ان کی تخلیقات و تصنیفات سے لطف اندوز ہونے کے مواقع بار بار فراہم ہوتے رہے — ان ادبی شخصیات میں ایک ایسا فصاحتی، قادر الکلام شاعر اور مصنف بھی ہے جو اپنی کثیر شعری و نثری تصانیف کے باوجود بے اعتنائی زمانہ کے ہاتھوں گوشۂ گمنامی میں چلا گیا۔

متوسط بلکہ قد سے نکلتا قد۔ گوری رنگت۔ اکہرا لیکن ...انا جسم۔ ستواں ناک۔ متوسط ذہین آنکھوں میں غور و فکر کی چمک۔ مسکراہٹ پر آمادہ ہونٹ۔ چہرے پر متانت و سنجیدگی ...م و حوصلہ۔ خوبصورت تراشی ہوئی خشخشی داڑھی اور کتری ...ی پوری مونچھیں۔ سر پر پٹے نما سنوارے ہوئے بال۔ جسم پر ...ت لکھنوی شیروانی، پائجامہ، پیر میں ڈوری دار جوتا۔ ...اوضع قطع میں جن صاحب سے تعارف کا شرف حاصل ہوا وہ ...ے "اشتیاق احمد صاحب مشتاق سلونوی"۔

یکم محرم الحرام ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) کو خوش حال زمیندار ...انے کے فرد حافظ سرفراز احمد صاحب مرحوم کے گھر سلون ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن نارہ ضلع الہ آباد تھا۔ ضلع رائے بریلی میں کئی گاؤں کی زمینداری تھی اس کی دیکھ بھال کے سلسلے میں ان کے اجداد نے سلون میں قیام کیا اور پھر وہیں کے ہو گئے مشتاق صاحب کی مروجہ ابتدائی تعلیم کی ابتدا مقامی اساتذہ و مکاتب سے ہوئی۔ ۶-۷ سال کی عمر میں والد ماجد کے ساتھ ریاست ریواں (مدھیہ پردیش) چلے گئے۔ مشتاق صاحب ... ریواں میں اپنے جد امجد خان بہادر حکیم رحمان علی صاحب کی نگرانی و سرپرستی میں عربی و فارسی زبانوں میں مہارت حاصل کر کے انگریزی تعلیم کی طرف رجوع ہوئے۔ ۱۸۹۴ء میں "ریواں ہائی اسکول" میں داخلہ لیا دو ہی سال پڑھ پائے تھے کہ ۱۸۹۶ء میں چند خانگی وجوہ کی بنا پر وطن سلون، ضلع رائے بریلی واپس آنا پڑا اور وہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ کچھ دن یوں ہی گذرے پھر حصول تعلیم کے لیے رائے بریلی گئے اور وہاں سے انگریزی مڈل کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۰۳ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے انٹرنس کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ کچھ دن کرسچین کالج لکھنؤ میں پڑھا پھر اسی سال ۱۹۰۴ء میں علی گڑھ بھیجے گئے۔ وہاں ایف۔ اے میں داخلہ لیا لیکن دل نہ لگا کچھ دن بعد وطن واپس آگئے اور اعلیٰ تعلیم کے مدارج طے نہ کر سکے۔ کچھ ایسے حالات

ہوئے کہ فکرِ معاش دامن گیر ہوئی اور صاحب جائداد ہونے کے باوجود کبھی کپڑے کی تجارت کی، کبھی مختلف محکموں میں ملازمتیں کیں لیکن افتادِ طبع اور فطری ادبی ذوق نے کہیں چین نہ لینے دیا۔ بچپن سے ہی ذوقِ شاعری زندگی بن گیا۔ ۹-۱۰ سال کی عمر میں ہی شعر موزوں کرنے لگے تھے لیکن والد اور خاندان کے دوسرے بزرگوں نے ذوقِ شاعری کو حصولِ علم کی راہ میں حائل ہوتے دیکھ کر انھیں سختی سے منع کیا یہاں تک کہ والد ماجد نے اپنے کمرے میں سونے کا حکم دے دیا تاکہ رات کو وہ فکرِ سخن نہ کر سکیں۔ مشتاق صاحب خود لکھتے ہیں :

"میرے عنفوانِ شباب کے شوقِ شاعری کو اب سخت ترین مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ اس قید و لبت نے سمندِ شوق پر گویا تازیانہ لگایا طبعِ رواں اور مضامین کا دریا ادھر لہریں لیتا تھا اور کشتیٔ دل اس وجہ سے سخت تلاطم میں تھی کہ میں خود قید تھا، قیدِ تحریر میں اشعار کیوں کر لاتا — جاڑے کے دن تھے اور لمبی لمبی راتیں لوگ سمجھتے تھے کہ میں سوتا ہوں مگر میں تھا کہ لحاف کے اندر ہی اندر غزل کہتا تھا اور بھول جانے کے خیال سے ایک ایک شعر کو دس دس بار رٹ کر قیدِ حافظہ میں کرتا صبح اٹھ کر جب اسکول جاتا انھیں مدرسے کی کاپیوں پر لکھ لیتا۔ عرصے تک دل میں شوقِ سخن چھپاتے رہا۔ جب یہ حال بھائی صاحب مرحوم کو معلوم ہوا تو انھوں نے والد صاحب، سے کہہ سن کر مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا —"

اس طرح جب پابندیوں سے نجات ملی تو مشتاق صاحب کو باقاعدہ اور کھل کر شعر گوئی کا موقع ملا، اپنے منتشر اشعار یکجا کر کے، چھپ چھپ کر ہم سبقوں کو سنانے کے بجائے ہر محفل اور ہر جگہ کلام سنانے اور داد پانے لگے۔ اسی زمانے میں ان کے والد قلبی امراض میں مبتلا ہو کر یہاں سے وطن سلون منتقل ہو گئے۔ سلون میں مشتاق صاحب کا حافظ محمد یار خاں - حافظ کا ساتھ ہو گیا - اور دن رات شعر و سخن کا چرچا اور شعر گوئی کا مشغلہ رہنے لگا۔ شاہ محمد نعیم عطا صاحب سلونوی (جو اس وقت تک سجادہ نشین نہ ہوئے تھے)، کے یہاں شعر و سخن کی محفلیں سجتی تھیں —— جن میں علی بخش صفا، میر تقی حسین ادہم۔ مرزا فضل علی ضو اور ہادی ٹونکی وغیرہ شرکت کرتے تھے۔ مشتاق صاحب ان محفلوں میں پابندی سے شرکت کرنے لگے۔ دورانِ قیام رائے بریلی بھی انھیں ادبی ماحول ملا۔ وہاں نواب ابن حسن جیسے باذوق حضرات موجود تھے اور ان کے یہاں اکثر مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔ ان میں شرکت اور کاملانِ فن کی صحبت نے مشتاق صاحب کے ذوق اور فن کو نکھارنے میں معاونت کی۔ شروع میں منشی ابوسعید صاحب سعید سے اصلاح لی پھر نوح ناروی صاحب کے مشورہ پر چند غزلیں بغرضِ اصلاح حضرت داغ دہلوی کو حیدرآباد بھیجیں لیکن داغ صاحب کی مصروفیات اور شاگردوں کی کثرت کے سبب اصلاح میں تاخیر سے دل برداشتہ ہو گئے۔ پھر جلیل مانکپوری صاحب کی وساطت سے چند غزلیں حضرت امیر مینائی کی خدمت میں پیش کیں وہاں ایک سال کی مدت میں پانچ چھ غزلوں کی اصلاح کی نوبت آئی تھی کہ حضرت امیر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مشتاق صاحب کی پرگوئی کا یہ عالم تھا کہ ایک ایک نشست میں سو سو شعر کہہ لینا کوئی بات نہ تھی۔ اسی زمانے میں ایک دن منشی عبدالمجید صاحب (تلمیذ شہیر مچھلی شہری) کی ایک اصلاح شدہ غزل پر نظر پڑ گئی۔ اور شہیر صاحب کے طریقۂ اصلاح سے متاثر ہو کر غالباً ۱۹۰۱ء میں ان کے سامنے دامنِ تلمذ تہ کیا اور آخر تک انھیں سے وابستہ رہے وہ استاد کی عظمتوں کے بڑے مداح تھے اور اکثر اشعار میں اس کا اظہار کرتے تھے۔

شہیر نامور سے فیضِ فن مشتاق نے پایا
تلمذ کا جو رشتہ لو تو وہ ناسخ کے پوتے ہیں
مشتاق فیض ہے یہ جناب شہیر کا
شہرہ کلام کا مرے کیوں جا بجا نہ ہو

سی طرح استاد کو بھی اس باصلاحیت اور مقبول شاگرد پر
از تھا جس کا اظہار اپنے دیوان میں ایک جگہ یوں کیا ہے ؎

اب مرے نورِ افادت سے شہیرؔ
خوب شاگردوں میں چمکے مشتاقؔ

فطری ذوق۔ استاد کے فیض۔ رسائی ذہن۔ حسنِ بیان
ور پرگوئی و قادر الکلامی کی بدولت مشتاق صاحب نے مقبولیت
ی منزلیں طے کیں۔ ان کا کلام ملک کے مقتدر رسائل و جرائد میں
کثرت چھپنے لگا اور وہ ملک کے گوشے گوشے میں منعقد ہونے
الے مشاعروں میں شریک ہوکر دادِ سخن سے جھولیاں بھرنے
لے۔ مشتاق صاحب کی ہمہ گیر طبیعت نے ہر شاخ و شعبۂ نظم
یں خامہ فرسائی کی ہے اور پرگوئی و قادر الکلامی کے جوہر دکھائے
یں انھیں غزل کے علاوہ تمام اصنافِ سخن قصیدہ، مثنوی،
ظم، رباعی، قطعہ پر کمال حاصل تھا۔ اور نعت، سلام اور
رثیے بھی کثیر تعداد میں کہے تھے۔

افسوس یہ قادر الکلام و پرگو قصباتی روایات کا دلدادہ
اعر کثیر اثاثہ شاعری مطبوعہ و غیر مطبوعہ چھوڑ کر مئی ۱۹۴۵ء
ں موت سے ہمکنار ہو گیا۔

مشتاق صاحب کی مندرجہ ذیل تصانیف اردو ادب
بیش بہا سرمایہ اور ان کی ادبی یادگاریں ہیں:—

ری مطبوعات:—

۔"دردِ دل" قومی نظموں کا مجموعہ۔ صفحات ۸۰۔ سائز
۳۰+۲۰ طابع حسن برقی پریس۔ ہیوٹ روڈ
لکھنؤ۔ سن اشاعت درج نہیں ہے۔ دیباچہ
جناب صباح الدین عمر صاحب نے اور مختصر
تعارف نیاز فتح پوری صاحب نے لکھا تھا۔
نیاز صاحب لکھتے ہیں:—
"مشتاق صاحب اودھ کے نہایت معروف
و پرگو شعرا میں سے ہیں۔ آپ کی نظمیں رسائل و
جرائد میں اکثر شائع ہوتی رہتی ہیں۔ مشتاق
صاحب نے اچھا کیا کہ ان کو ایک شیرازہ سے
منسلک کر کے پبلک کو استفادہ کا موقع دیا۔"
سن اشاعت کے بارے میں صباح الدین عمر صاحب نے
بتایا کہ "۱۹۳۴-۳۵ء" ہوگا کیونکہ جب انھوں نے دیباچہ
لکھا تو وہ ایم اے کے طالب علم تھے اور ایم۔ اے ۱۹۳۶ء میں
کیا تھا۔

۲۔"خلیل المناقب" طابع سرکاری پریس ریاست رام پور
۱۳۳۷ھ/۱۹۱۹ء صفحات ۳۴۔ سائز
مدحیہ قصائد، رباعیات و غزلیات کا مجموعہ ہے
جو مشتاق صاحب نے اپنے پیر و مرشد اور
سلسلہ چشتیہ کے مشہور بزرگ حضرت شاہ
محمد عین اللہ عرف خلیل احمد صاحب (صفی پور۔
اناؤ) کی مدح میں کہی تھیں۔

۳۔"افتخار الکلام" ۵۰۰ اشعار کا نعتیہ قصیدہ ہے جو
(مرقع سخنوری ۱۳۳۶ھ) یوسفی پریس لکھنؤ میں جنوری ۱۹۳۳ء
میں چھپا تھا۔

۴۔"غریب الوطن" گولڈ اسمتھ کی طویل انگریزی نظم
"ڈیزرٹیڈ ویلج" کا منظوم ترجمہ۔

غیر مطبوعہ کلام:—

۱۔"طوفانِ خیال" (دیوانِ اول عاشقانہ) فل اسکیپ سائز کے ۳۰۰ صفحات پر مشتمل نہایت خوبصورت و خوشخط لکھا گیا (بہ خطِ مصنف) ضخیم دیوان
ہے جس میں الف تا یائے مجہول ہر ردیف میں
تقریباً ۱۸۰ غزلیں اردو اور چند فارسی شامل
ہیں۔ ہر صفحہ پر عموماً ۱۵ اشعار ہیں اور کل اشعار
کی تعداد تقریباً ساڑھے چار ہزار ہوگی۔ ۱۰
صفحات پر مصنف نے اپنے تفصیلی حالات
معہ فہرست دواوین تحریر کیے ہیں۔

۲۔"ترانۂ خیال" فل اسکیپ سائز کے ۲۴۰ صفحات پر

پر پھیلا ہوا تقریباً ۱۲ ہزار اشعار کا مجموعہ ہے۔
ہر صفحہ پر عموماً ۲۲ اشعار درج ہیں۔ اس میں غزلیات، نظمیں، قصائد، رباعیات، قطعات سلام، نعتیں اور سہرے وغیرہ شامل ہیں۔ مختلف رسائل و جرائد میں شائع شدہ کلام کے تراشے بھی جا بجا چسپاں ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مشتاق صاحب کا کلام اس وقت کے جرائد میں بکثرت چھپتا تھا۔ اکثر تخلیقات مدیران کے نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی ہیں جس میں ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو سراہا گیا ہے اور فنی مہارت کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ ملک کے مختلف مقامات کے مشاعروں میں پڑھی گئی غزلیں بھی شامل ہیں جن میں مقامات مثلاً ضلع آرہ، بزم ادب لکھنؤ۔ ردولی۔ کانپور۔ الہ آباد سندیلہ۔ میرٹھ۔ پرتاپ گڑھ۔ فرخ آباد علی گڑھ وغیرہ کا حوالہ دیا گیا ہے۔

۳۔ "خمخانۂ ازل" فل اسکیپ سائز کے ڈھائی سو سے زائد صفحات پر مصنف کی تحریر بہ نہایت خوشخط و منقش دیوان نعت (اردو و فارسی) جس کے ۲۳ صفحات پر فارسی نعتیں ہیں۔ اس پر ۱۵ فروری ۱۹۳۰ء درج ہے جو غالباً تکمیل دیوان کی تاریخ ہے۔

۴۔ "لسان العجم" فل اسکیپ سائز پر مصنف کے ہاتھ کا خوشخط لکھا ہوا فارسی کلام کا مجموعہ ہے جو تین حصوں میں منقسم ہے۔ حصہ اول میں نعتیں، حصہ دوم میں چونتیس غزلیات۔ ایک ۲۹ اشعار کا قصیدہ اور حصہ سوم میں ۸ طویل نظمیں و قصائد شامل ہیں۔ کل اشعار کی تعداد تقریباً ایک ہزار ہوگی۔ نہایت خوبصورت ٹائٹل پر "اکتوبر ۱۹۳۱ء" تحریر ہے جو غالباً تکمیل مجموعہ کی تاریخ ہے۔

۵۔ "ہر ہفت"

تضمین ہفت بند فارسی

۶۔ "برق غم" ۱۰۶ سلاموں، مراثی، منقبات اہلبیت، قصائد اردو فارسی، مخمس، میرانیس، نفیس و مونس وغیرہ کے مشہور مراثی کی تضمین وغیرہ کا مجموعہ ہے۔ کل اشعار کی تعداد ۱۶ سو ہے۔ آخری صفحہ پر سال تکمیل مارچ ۱۹۳۲ء درج ہے۔

۷۔ "کشت زعفران" کاپی سائز پر لکھا ظریفانہ کلام کا مجموعہ ہے۔ پشت ٹائٹل پر مندرجہ ذیل عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مجموعہ غالباً زبانی گفتگو کے بعد مولوی صدیق صاحب مالک صدیق بکڈپو لکھنؤ کو بغرض اشاعت بھیجا گیا تھا۔ لیکن چھپ نہ سکا۔

"مہربان جناب صدیق صاحب۔
رسالہ "کشت زعفران" کا حق اشاعت دائمی منیجر صدیق بکڈپو کو اس شرط پر دیا کہ ہر ایڈیشن پر ۲۵ جلدیں بلا قیمت میری نذر کریں۔
۔ اشتیاق احمد مشتاق مصنف کتاب۔
ساکن سلون ضلع رائے بریلی۔ ۷ نومبر ۳۰ء"

۸۔ "مثنوی تریاق عشق" سائز ۳۰×۲۰/۱۶ صفحات ۵۰۔ مناظر حسن و عشق کے موضوعات پر تقریباً ایک ہزار اشعار کی مثنوی ہے جو مثنوی زہر عشق کے وزن پر کہی گئی ہے۔

۹۔ "شاہد فطرت": ۳۰×۲۰/۸ کے عموماً ۲۰ سطری ۹۰ صفحات پر خوشخط لکھا گیا مختلف موضوعات پر تقریباً ۶۵ نظموں کا مجموعہ ہے جس کی ابتدا حمد، نعت و

ما جا سکتا ہے۔ ۱ صفحات پر مشتاق صاحب کی تصانیف کی فہرست اور ۲ صفحات پر علامہ نیاز فتحپوری کا انھیں کی تحریر میں تعارف ہے تاریخ تحریر ۳۰ / مئی ۱۹۳۰ء درج ہے۔ ۶ صفحات نواب مرزا جعفر علی خاں۔ اثر لکھنوی کا نام لکھ کر ان کے مقدمہ کے لیے چھوڑے گئے ہیں۔ لیکن مقدمہ شامل نہیں ہے۔ اس مجموعہ کے کل اشعار کی تعداد اٹھارہ سو کے قریب ہوگی۔

۱۰۔ "حالت الاخوان" رجسٹر سائز پر لکھا قومی و اصلاحی نظموں کا مجموعہ ہے۔ کل صفحات ۵۰ ہیں۔ ابتدائی دو صفحات پر دیباچہ اور تاریخ تکمیل ۱۵ / مارچ ۱۹۰۴ء درج ہے۔ اس میں ۶۸ بند کی ایک طویل نظم "حالت الاخوان" کے علاوہ چھ بند کی نظم انقلاب زمانہ جس کے پہلے، دوسرے اور تیسرے بند میں ۱۳ ــ ۱۳ اشعار، چوتھے، پانچویں و چھٹے بندوں میں ۱۲ ــ ۱۲ اشعار ہیں ــ نظم "گریہ دل" میں ۱۶۲ اشعار ہیں اور "عظمت اسلام" ۳۰ شعروں کی نظم ہے۔ "نوحہ اسلام" میں ۵۲ بند ہیں۔ اس کے بعد تین مطبوعہ نظمیں (تراشے) نظم قومی ــ شوق حکومت ــ "اور گاندھی لے کر جا رہے ہیں کارواں سوراج کا" چسپاں ہیں ــ

"ابطال الباطل" تردید عقائد مذہب قادیانی کے موضوع پر ۵۰۰ (پانچ سو) اشعا کی طویل نظم۔

نوشتہ تقدیر ایک طویل مرثیہ ہے جو مشتاق صاحب نے اپنے نوجوان بیٹے کی ناوقت موت پر نہایت پر درد و موثر انداز میں کہا تھا۔

پنجۂ مرجان علامہ اقبال کی مشہور نظم "تصویر درد" کی تضمین ہے۔

۱۴۔ "مجمع التواریخ" تواریخ سنین ہجری و عیسوی کا مجموعہ ہے جو مشتاق صاحب کی فہرست تصانیف میں شامل ہے۔ لیکن راقم الحروف کو دستیاب نہ ہو سکا۔

۱۵۔ "پریم درپن" رجسٹر سائز کے ۳۸ صفحات پر خوشخط لکھا گیا۔ ہندی و بھاشا کلام کا مجموعہ ہے۔ جس میں ہندی و بھاشا زبانوں پر عبور کے علاوہ مشتاق صاحب نے فن موسیقی میں اپنی بے پناہ صلاحیتوں کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ ۱۰۲ ٹھمری و دادرہ وغیرہ مختلف راگوں کے اعتبار سے ترتیب دیے گئے ہیں اور ان کی ہمہ جہت فنی صلاحیتوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

ان کے علاوہ فہرست میں چند نثری تخلیقات "تنقید شدید" "مختلف المضامین" "تاریخ سلوق" ــ وغیرہ بھی شامل ہیں۔

نثری تخلیقات اور منتشر کلام ان کے علاوہ ہیں۔

نمونۂ کلام

حمد کے چند اشعار ؎

حمد ہے اللہ برتر کے لیے
جس نے پیدا دونوں عالم کر دیے
ہے ہر اک شے میں عیاں خالق کا نور
ہے ہر اک شے سے خدائی کا ظہور
کر دیئے پیدا زمین و آسماں
بحر و بر میں اس کا جلوہ ہے عیاں
اس نے پیدا کی ستاروں میں چمک
سبزۂ بیگانہ کو بخشی مہک
راہ مذہب کی دکھا دی مستقیم
ہے وہی خلاق و رحمان و رحیم

(باقی صفحہ ۴۲ پر)

جینٹ لیس (امریکی افسانہ) ترجمہ: عشرت امیہ
کمپاؤنڈ شادی لال، ایٹہ

پچھتاوا

اس روز میں صبح ہی سے فکرمند تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ لیس سے کس طرح رقم مانگوں گی۔ صبح پولی کے لیے نئے کپڑے خریدنا تھے اور میرے پاس ایک دھیلا بھی نہ تھا۔ پولی میری پندرہ سالہ لڑکی تھی۔ جمعرات کو اس کے اسکول میں سالانہ تقریب منعقد ہو رہی تھی۔ اسے نئے کپڑوں کی ضرورت تھی ورنہ سہیلیوں میں اس کی سبکی ہوتی۔ خود اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ اپنے ڈیڈی سے نئے کپڑوں کا تقاضہ کر سکے۔ بار بار وہ میرے پاس آتی اور دبے لفظوں میں اپنی ضرورت بیان کرتی۔ ایک بار میں نے اسے ٹالنے کی کوشش بھی کی لیکن وہ رونے لگی۔

"ممی سال بھر کے بعد یہ تقریب آتی ہے اگر میں پرانے کپڑے پہن کر گئی تو سب لڑکیاں میرا مذاق اڑائیں گی۔ مجبور ہو کر مجھے وعدہ کرنا پڑا کہ میں اس کے ڈیڈی سے کچھ رقم مانگوں گی۔ دن بھر میں اسی خیال میں گم رہی۔ شام کو لیس دوکان سے لوٹا تو میں نے رقم کا مطالبہ کرنا چاہا لیکن اس کے چند دوست ساتھ تھے۔ اس لیے میں خاموش رہی۔ رات کے کھانے پر پولی بار بار میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں اس کی نگاہوں کا مفہوم سمجھتی تھی۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ لیس کی مالی حالت اچھی نہیں ہے۔ اس کا سارا سرمایہ کاروبار میں پھنسا ہوا تھا۔ دراہم بمشکل گزر بسر کر رہے تھے۔ میں نے لیس کی طرف دیکھا وہ بہت خوش نظر آرہا تھا میں بات شروع کرنے ہی والی تھی کہ وہ بول اٹھا۔ آج رات ایک شخص ہمارے یہاں آرہا ہے وہ ماں کے کان ٹیسٹ کرے گا اور وہ آلۂ سماعت بھی آزما کر دیکھے گا۔ خدا کرے ممی سننے لگیں۔

میں نے افسردگی سے پولی کی طرف دیکھا۔ مایوسی کے عالم میں اس کا سر میز پر جھک گیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ گود میں رکھے تھے۔ وہ کھانا نہیں کھا رہی تھی۔ پولی کے بعد میری نظریں ماں کی طرف اٹھ گئیں۔ لیس کی ماں حسب معمول اپنی آرام کرسی پر بیٹھی تھیں۔ قریب ہی نو سالہ یتیم بچی کوزی کھڑی تھی۔ ماں ہنس ہنس کر کوزی سے باتیں کر رہی تھیں۔ انھوں نے لیس کی گفتگو نہیں سنی تھی۔ سنتیں بھی کیسے ان کے کان جو خراب تھے۔

"ڈیڈی۔ کیا دادی اماں اب ہماری باتیں سن سکیں گی؟"
میرے نو سالہ لڑکے ہیری نے پوچھا۔

"ہاں بیٹا۔"

آج سے ایک سال قبل بھی لیس نے یہی الفاظ کہے تھے۔ آلۂ سماعت خریدنے پر ہماری جمع پونجی اٹھ گئی تھی۔ وہ مشین ابھی تک ماں کی میز کی دراز میں پڑی تھی۔ انھوں نے ایک دو روز سے زیادہ اسے استعمال نہیں کیا تھا۔ لیس کے اصرار پر انھوں نے کہا تھا:۔

"میرے سر میں درد ہونے لگا ہے۔ میں یہ منحوس آلہ استعمال نہیں کر سکتی۔"

اس طرح ہمارے پچھتر ڈالر ضائع ہو گئے تھے۔ اس رات بھی میں یہی سوچ رہی تھی کہ ایک نیا آلہ خریدنے کے لیے ہمیں

خاصی رقم کی ضرورت پڑے گی اور یہ رقم بھی گزشتہ سال کی طرح بیکار جائے گی۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ پولی کھانا کھا نے بغیر سونے کے کمرے میں چلی گئی تھی۔ لیس مسکراتا ہوا اٹھا اور ماں کے قریب جاکر ان کے کان میں زور سے بولا: "ماں آج رات ایک ڈاکٹر آپ کے کانوں کا معائنہ کرے گا"

"بیٹا کیوں پیسے ضائع کرتے ہو، میرے کان اب ٹھیک نہیں ہوں گے"۔ ماں نے بڑی شفقت سے کہا اور وہ دوبارہ کوزی سے باتوں میں مصروف ہوگئیں۔ کوزی بول نہیں سکتی تھی۔ ماں لاکھ مغز کھاتیں لیکن اس کے منہ سے اوں آں کے سوا کچھ نہ نکلتا! تاہم ماں مایوس نہیں تھیں اور مسلسل کوشش کر رہی تھیں کہ وہ بولنے لگے۔ پولی کے نئے کپڑوں کا مسئلہ الگ رہا۔ اب تو ماں کے معالج کی فیس کے لیے بھی رقم کی ضرورت تھی۔ میں نے لیس کے پاس جاکر آہستگی سے پوچھا:

"تم جانتے ہو ہماری مالی حالت کیسی ہے۔ کیا تمھارے پاس اتنی رقم موجود ہے کہ تم ڈاکٹر کی فیس ادا کرنے کے علاوہ ماں کے لیے نیا آلہ بھی خرید سکو؟" "دیکھا جائے گا۔ میں نے ڈاکٹر سے کہہ دیا ہے۔ اور وہ آج رات آجائے گا: اس نے بے پروائی سے کہا اور باہر لاگیا۔ میں بے دلی سے پلیٹیں دھونے لگی۔ ماں ابھی تک کوزی سے اسی طرح باتیں کر رہی تھیں اور وہ جواب میں حلق سے طرح طرح کی آوازیں نکال رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے سر اٹھاکر دیکھا۔ پولی میرے پیچھے کھڑی تھی۔ "ممی آپ نے ڈیڈی سے میرے ڈریس کے لیے کہا۔؟" اس نے رازداری کے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں آج تمھارے ڈیڈی بہت تھکے ہوئے ہیں —— کل پوچھوں گی۔"

"اگر میرے کپڑوں کا بندوبست نہ ہوا تو میں سالانہ تقریب میں شریک نہ ہوں گی"۔ "فکر نہ کرو میں بندوبست کرلوں گی۔ اب تم آرام کرو۔ رات خاصی جا چکی ہے۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔ میں پلیٹیں رکھ کر میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگاکر بیٹھ گئی اور صورت حال پر غور کرنے لگی۔ وہ دن کتنا منحوس تھا جب ہمیں لیس کے ابا مسٹر اسٹون کے مرنے کی اطلاع ملی تھی۔ ان دنوں ہم لوگ شکاگو میں تھے۔ لیس ایک فرم میں مکینک کی حیثیت سے ملازم تھا۔ اچھی تنخواہ تھی، رہنے کو مکان ملا ہوا تھا۔ ہم بڑے مزے سے زندگی گزار رہے تھے۔ مسٹر اسٹون کی وفات نے ہمارے چھوٹے سے گھر کو ہلاکر رکھ دیا۔ لیس نے فوراً ہی ڈی کلبی کے قصبے میں جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ میں نے بہترا سمجھایا کہ اچھی بھلی ملازمت چھوڑنا کہاں کی عقلمندی ہے لیکن لیس نے میری ایک نہ سنی۔ وہاں ماں اکیلی ہیں۔ تم خود ہی سوچو ان کی سماعت جواب دے چکی ہے۔ بے چاری اتنی ضعیف ہیں۔ اکیلی کیسے رہیں گی۔

"لیکن تمھارے دو بھائی اور بھی ہیں۔ ماں کی دیکھ بھال کا فرض صرف تمھیں پر عائد نہیں ہوتا۔"

"ٹام فوج میں ہے اور رو تحریری سروس میں۔ دونوں اپنی جگہ مطمئن ہیں۔ انھیں ملازمتیں نہیں چھوڑنا چاہئیں ——" اپنے متعلق تمھارا کیا خیال ہے۔؟

میں نے جل کر پوچھا۔ "میرا کیا ہے۔ میں وہاں ڈیڈی کی دوکان سنبھال لوں گا۔ آخر بچپن میں بھی میں ان کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔ ڈی کلبی بڑا خوبصورت قصبہ ہے۔ ہمارا مکان ایک پہاڑی پر ہے نیچے چاروں طرف دور دور تک چاولوں کے کھیت ہیں، جن کی سوندھی سوندھی خوشبو ہر وقت فضا میں پھیلی رہتی ہے۔ واقعی بڑی پیاری جگہ ہے —— میرا خیال ہے کہ اگر ایک بار بھی تم وہاں چلی گئیں تو زندگی بھر واپس آنے کا نام نہ لوگی۔

لیس سے الجھنا بے کار تھا وہ ڈی کلبی جانے کا تہیہ کرچکا تھا۔ میں چپ ہو رہی۔ اس کی بات واقعی ٹھیک تھی۔ ڈی کلبی میں ہمارا گھر بہت خوبصورت تھا۔ ماں بہت نیک اور خوش اخلاق خاتون تھیں۔ ہر وقت دوسروں کی مدد کرنے کو تیار رہتیں۔ پڑوس میں کوئی بیمار ہوتا تو وہ رات رات بھر جاگ کر مریض کی دیکھ بھال کرتیں۔ غریبوں اور محتاجوں کو کھانا کھلانے میں انھیں بڑا مزہ آتا تھا۔ انسان تو ایک طرف رہے وہ جانوروں پر بھی مہربان تھیں کہیں کتے بلی کو باہر سردی میں آوارہ پھرتے دیکھتیں تو پچکار کر ساتھ

لے آتیں۔ "نووارد" کو گرم گرم کھانا کھلایا جاتا۔ بڑے اہتمام سے اس کے لیے سونے کا انتظام کرتیں۔ ایک بار تو ایک پاگل کتے نے ان پر دانت بھی آزمائے۔ ہفتہ بھر پیٹ میں انجکشن لگواتی رہیں لیکن جانوروں پر رحم کھانے کی عادت نہ گئی۔ ماں واقعی بہت اچھی تھیں لیکن ان کی اچھائی مجھے سخت ناپسند تھی۔ ان کی سخاوت میرے لیے وبال جان بن گئی۔ یہاں اپنا ہی گزارہ مشکل تھا، دوسروں کے لیے گنجائش کیسے نکالتے، لیکن ماں کو ان باتوں کی پرواہ نہ تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے گھر لٹا رہی تھیں۔ میں کسی نہ کسی طرح یہ برداشت کر رہی تھی لیکن زیادتی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ جب ایک دن ماں مسٹر اینڈ مسز ڈینگن کی گونگی لڑکی کوزی کو گھر لائیں۔ میں برداشت نہ کر سکی۔ معلوم ہوا کہ دونو میاں بیوی بیمار تھے اور محلے والوں نے انھیں اسپتال پہنچا دیا تھا۔ ان کی اکلوتی لڑکی گھر میں اکیلی تھی۔ ماں کو ایسا موقع خدا دے، وہ جھٹ اسے اپنے ساتھ لے آئیں۔ کوزی کے والدین گونگے اور بہرے تھے کوزی خوش قسمت تھی کہ وہ سن سکتی تھی۔ بولنا اس کے بس کا روگ نہ تھا

"ماں" آپ اس مصیبت کو کہاں سے اٹھا لائیں ہیں اس کے والدین کو چھوت کا مرض ہے۔ اگر یہ اس گھر میں رہی تو میرے بچے بھی بیمار پڑ جائیں گے"۔ میں نے چلا کر کہا لیکن ماں کو میری بات سنائی ہی نہ دی۔ وہ کوزی کو زبردستی چاکلیٹ کھلانے میں مصروف تھیں۔ میں خون کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔ ماں میری طرف دیکھ کر بولیں۔

"خدا کا شکر ہے کہ کوزی صحیح سلامت ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ لے آئی ہوں۔ جب اس کے ماں باپ ہسپتال سے لوٹیں گے تو اپنی بچی کو لے جائیں گے۔

"جی ہاں! اور اس وقت تک اس بن بلائے مہمان کے لیے کھانا میں تیار کروں گی، کپڑے میں دھوؤں گی اور اس کے کھانے پینے پر جو رقم صرف ہوگی اس کا انتظام بھی میں کروں گی۔ آپ کو ان بکھیڑوں سے کیا غرض؟" میں نے جل کر کہا۔

کیا بات ہے جینی؟ لیس نے کمرے میں داخل ہو کر پوچھا: میں نے سارا قصہ بیان کر دیا۔

"یہ گھر ماں کا ہے اور وہ جسے چاہیں یہاں لا سکتی ہیں" لیس ناگواری سے بولا۔ "لیکن۔۔۔۔۔؟"

"جینی میں تمھیں کس طرح سمجھاؤں کہ ماں دوسروں کی مدد کے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے آج تک کسی شخص کو اس دروازے سے خالی ہاتھ لوٹتے نہیں دیکھا۔

اتنی ظالم نہ بنو ۔۔۔ آخر ایک معصوم بچی نے تمھارا کیا بگاڑا ہے۔ پندرہ روز یہاں رہے گی۔ پھر اس کے والدین اسے لے جائیں گے"۔ میں خاموش ہو گئی ۔۔ ہوا وہی جس کا مجھے خدشہ تھا۔ کوزی کے والدین یکے بعد دیگرے چل بسے اور اپنی گونگی لڑکی کو ہمیشہ کے لیے ہمارے پلے سے باندھ گئے۔

اس واقعہ کو تین ماہ گزر چکے تھے ہم جوں توں کر کے زندگی کے دن پورے کر رہے تھے کہ لیس نے کسی میڈیکل فرم کو ماں کے لیے نیا آلہ سماعت لانے کا آرڈر دے دیا اور میری بچی پولی کے لیے نئے کپڑے نہ بن سکے۔ اس رات کرسی پر بیٹھے بیٹھے میں انھیں خیالات میں گم تھی اور دل ہی دل میں کڑھ رہی تھی کہ اچانک دروازے پر گھنٹی بجی۔ تھوڑی دیر بعد ایک شخص ہاتھ میں اٹیچی کیس لیے اندر آیا۔

"جینی ڈاکٹر صاحب تشریف لے آئے ہیں، تم بھی ماں کے کمرے میں آ جاؤ۔" لیس نے برآمدے ہی سے مجھے پکارا۔ میں بادل نخواستہ اٹھی اور کمرے کی طرف چل دی۔ ڈاکٹر نے ماں کے کانوں پر ہیڈ فون لگایا اور مشین چلا دی۔ شور سے ہمارے کانوں کے پردے پھٹنے لگے لیکن ماں نے نفی میں سر ہلا دیا کہ انھیں کچھ سنائی نہیں دے رہا ہے۔ ڈاکٹر مشین کے بٹن گھماتا رہا۔ بالآخر ماں کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"میں سن سکتی ہوں۔ لیس مجھے سب کچھ سنائی دے رہا ہے"۔ وہ خوشی سے بے اختیار ہو کر بولیں میں خود بھی ایک لمحے کے لیے اپنے سارے دکھ بھول گئی۔ ڈاکٹر نے ہیڈ فون اتار لیس سے مخاطب ہو کر بولا۔ ان کے کانوں میں خاصا نقص ہے۔ سماعت کے وہ آلے جو بازار میں ملتے ہیں سودمند ثابت نہیں ہوں گے۔ ہمیں ان کے لیے ایک خاص آلہ تیار کرنا پڑے گا۔ آپ ہمارے چھپے ہوئے فارم پر آرڈر

اس خاص آلہ کی قیمت کیا ہوگی؟" لیس نے پوچھا" تقریباً
"دوسو پچاس ڈالر۔"
میں کانپ اٹھی۔ اتنی رقم تو ہم عمر بھر جمع نہیں کرسکتے تھے۔
"کیا آپ قیمت قسطوں میں وصول نہیں کرسکتے؟ کیوں نہیں۔ البتہ شروع میں آپ کو ایک سو ڈالر جمع کرانے پڑیں گے۔ آلہ سماعت آپ کو دیدیا جائے گا باقی رقم آپ قسطوں میں ادا کر سکتے ہیں۔"
"ٹھیک ہے میں اسی ہفتے کے آخر تک ایک سو ڈالر بھیج دوں گا۔ آپ خود ہی میرا فارم پُر کر دیجئے گا۔" بہت بہتر!
"میں اور لیس ڈاکٹر کو بیرونی دروازے تک چھوڑنے گئے۔ جب اس کی گاڑی نظروں سے اوجھل ہوگئی تو میں نے لیس سے پوچھا۔
"تم نے وعدہ تو کرلیا ہے لیکن ایک سو ڈالر کہاں سے آئیں گے؟"
میں مسٹر اسٹین کے ٹرک کی مرمت کررہا ہوں جونہی کام پورا ہوجائے گا وہ میری پوری اجرت ادا کردیں گے۔ علاوہ ازیں مجھے بہت لوگوں سے رقم وصول کرنا ہے۔ پرسوں پل سے کر میں شہر کا چکر لگاؤں گا کہ لوگ اپنے اپنے واجبات ادا کریں۔" لیس کیا تم پولی کے لیے کہیں سے بیس ڈالر حاصل کرسکتے ہو؟ اسے سالانہ تقریب کے لیے نئے کپڑے چاہئیں۔ میں اس سے وعدہ کرچکی ہوں۔"
"جینی تم تو جانتی ہو ایک سو ڈالر جمع کرنے کے لیے مجھے کتنے پاپڑ بیلنے پڑیں گے، میرا خیال ہے کہ پولی کے پاس خاصے کپڑے ہیں، وہ کوئی اچھا سا جوڑا پہن کر جاسکتی ہے۔ تم خود استری کردینا۔" لیکن اس کے کپڑے پچھلے سال کے سلے ہوئے ہیں اب اس کا جسم بڑھ گیا ہے، بے چاری بڑی مشکل سے ان کپڑوں میں پھنستی ہے۔"
"جو بھی ہو میں اس وقت بیس ڈالر کا انتظام نہیں کرسکتا۔ اس کے کپڑے اُدھیڑ کر بڑے کردو۔"
ٹھیک ہے تم ماں کے لیے سو ڈالر جمع کرسکتے ہو اور اپنی بیٹی کے لیے بیس ڈالر کا انتظام نہیں کرسکتے۔ اس گھر میں ماں کا راج ہے، وہ جو چاہتی ہیں وہی ہوتا ہے۔ میری یہاں ایک کوڑی کی عزت نہیں۔" میں نے غصّہ میں آکر کہا۔
"جینی خدا کے لیے ہوش میں آؤ۔ کیسی بہکی بہکی باتیں کررہی ہو۔ نئے کپڑے خواہ کسی کے لیے ہوں ایک معذور اور ضعیف خاتون کی سماعت سے زیادہ اہم نہیں ہیں۔" میں خاموش ہوگئی۔ اچانک مجھے پھر خیال آیا۔
"لیس کیا یہ مناسب نہیں کہ ہم تمھارے بھائیوں روجر اور ٹام کو خط لکھ کر ان سے تھوڑی تھوڑی رقم منگوالیں؟" جو تمھارے دل میں آئے کرو۔" ٹھیک ہے۔ تم خط لکھ دو میں خود ہی پوسٹ کردوں گی۔"
"میں خط نہیں لکھوں گا یہ کام بھی تمھیں خود ہی کرنا پڑے گا۔"
یہ بھی خوب رہی بھائی تمھارے اور خط میں لکھوں؟ میں نے تنک کر کہا۔
"میں ان سے مدد مانگنا نہیں چاہتا۔" لیس نے مختصر سا جواب دیا۔
دوسری صبح جب میری آنکھ کھلی تو لیس کام پر جاچکا تھا میں نے باورچی خانے کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا اوپر دوکان پر روشنی ہورہی تھی۔ لیس ویلڈنگ کررہا تھا دور دور تک چاول کے کھیت دکھائی دے رہے تھے۔ شروع میں جب میں یہاں آئی تو مجھے یہ کھیت بہت خوبصورت لگتے تھے۔ لیکن اب انھیں دیکھ کر غصّے اور نفرت سے میری پیشانی پر بل آجاتے ہیں۔ مجھے چاولوں سے کوئی دشمنی نہ تھی۔ مجھے تو ان لوگوں پر غصّہ آتا تھا جو ان کھیتوں کے مالک تھے وہ لیس سے اپنے اوزاروں کی مرمت کرواتے اور نئے اوزار خریدتے۔ لیکن ایک پائی بھی ادا نہ کرتے۔ جب کبھی لیس تقاضہ کرتا وہی رٹا رٹایا جواب مل جاتا۔ فصل بکنے پر میں تمھاری اجرت ادا کردوں گا، فصل بک جاتی۔ چاول بازار میں فروخت ہونے لگتے۔ لیکن لیس کو ایک پائی بھی نہ ملتی۔ لیس دوبارہ پوچھتا۔ پھر نیا بہانہ۔ اس مرتبہ فصل کچھ اچھی نہیں ہوئی ہے۔ اگلی مرتبہ

تمھاری پائی پائی چکا دوں گا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کہنے والے کا منھ نوچ لوں لیکن لیس نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا کہ مسکرا کر کہتا کوئی بات نہیں!

دوپہر کو جب لیس کھانے کے لیے گھر آیا تو میں نے اس سے دوبارہ پولی کے لیے بیس ڈالر مانگے۔ "جینی خدا کے لیے مجھے زیادہ پریشان مت کرو۔ تم خوب جانتی ہو میرے پاس یہ رقم موجود نہیں ہے۔" جو ہو سو ہو۔ میں پولی کے لیے نئے کپڑے ضرور ضرور خریدوں گی۔ مجھے بھی ضد ہو گئی تھی۔ "اگر تم مجھے بیس ڈالر نہیں دو گے تو میں ادھار لے لوں گی۔"

"نہ نہ نہ، ایسا غضب مت کرنا۔ تمھیں معلوم ہے کہ مجھے ادھار لینے سے سخت کوفت ہوتی ہے۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"یہ بھی خوب کہی — ادھار سے اتنی ہی نفرت ہے تو لوگوں کو ادھار کیوں دیتے ہو نقد کیوں نہیں وصول کرتے۔؟"

"جینی یہاں کے لوگ بہت غریب ہیں، بے چارے دن بھر کام کرتے ہیں تب کہیں جا کر انھیں کھانے کو ملتا ہے۔ اس سال تو چاول کی فصل واقعی بہت خراب ہوئی ہے۔ بھلا ایسے میں غریب کسانوں کے پاس نقد دینے کے لیے کہاں سے پیسے آئیں گے۔"

"تمھیں دوسروں کی غربت کا بڑا خیال رہتا ہے ہم کون سے لکھ پتی ہیں۔ تم کیا جانو میں کیسے گھر چلا رہی ہوں۔ ایک بات پوچھوں؟" لیس نے قریب آ کر کہا۔

"پوچھو....." "آخر تم نے پولی کے کپڑوں کو اتنی اہمیت کیوں دے رکھی ہے؟" میں نے اس کی بات کا جواب نہ دیا اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ بستر پر بیٹھ کر میں نے آرام سے سوچا، پولی کے کپڑے واقعی اہم نہیں تھے۔ دراصل میں ماں پر ایک سوڈالر خرچ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ یہ رقم بیکار جائے گی۔ میں اس گھر سے اکتا چکی تھی۔ مالی مشکلات نے مجھے چڑچڑا اور بدمزاج بنا دیا تھا۔ پولی کے کپڑے تو محض بہانہ تھے۔ دراصل میں اپنے ماحول کے خلاف لڑ رہی تھی۔ میں چاہتی لیس یہ گھر چھوڑ دے اور کہیں اور جا کر قسمت آزمائی کرے۔ مجھے ماں کی سماعت پر غصہ آتا تھا۔ نہ وہ دونوں ہاتھوں سے دوسروں پر لٹاتیں نہ ہم اتنے پریشان ہوتے۔ میں حالات سدھارنا چاہتی تھی چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ لیس اور ماں کے بجائے گھر کا سارا بجٹ اب میں بناؤں گی۔ آخر میں اس گھر کی مالک تھی۔ سب سے پہلے میں نے پولی کو بلایا اور اسے خوب پیار کیا۔

"ممی میرے کپڑوں کا بندوبست ہو گیا؟" اس نے وہی سوال دوہرایا۔ "ہاں بیٹی تم مزے سے اسکول جاؤ۔ بدھ کی شام تمھیں کپڑے مل جائیں گے۔ مگر دیکھو یہ بات اپنے تک رکھنا۔ ڈیڈی اور دادی کو پتہ نہ چلے۔" پولی نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ شاید وہ میری بات سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تمھیں دیر ہو رہی ہے اب تم اسکول جاؤ۔" میں نے اسے ایک بار پھر پیار کرتے ہوئے کہا — وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھتی ہوئی باہر چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد ماں کمرے میں داخل ہوئیں وہ بہت خوش نظر آرہی تھیں۔ میرے قریب آکر بولیں۔ "جینی مجھے نئے آلۂ سماعت کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ لیکن جب مجھے اس بچی کا خیال آتا ہے تو بے اختیار جی چاہتا ہے کہ میں سن سکوں، اگر میرے کان ٹھیک ہو جائیں تو میں اسے بولنا سکھا سکتی ہوں۔" میرے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ وہ منحوس چھوکری کو نری کا ذکر کر رہی تھیں۔ انھیں کیا معلوم کہ اوں آں سے زیادہ اس کے حلق سے کچھ نہیں نکلتا۔ "جہنم میں جائے وہ اور چولھے میں جائیں آپ!" میں نے برا سا منھ بنا کر کہا اور گفتگو ختم ہو گئی۔

اگلے چند دن تیزی سے گزر گئے۔ اس دوران میں لیس منھ اندھیرے گھر سے نکل جاتا اور رات گئے واپس آتا۔ وہ بدھ کی شام کو گھر لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا لفافہ تھا۔ اس نے لفافہ مجھے دے کر کہا۔ "جینی میں نے ایک ایک پائی جمع کر کے یہ رقم اکٹھی کی ہے۔ بہرحال میں خوش ہوں کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔ بہت تھک گیا ہوں اور مجھ میں اتنی سکت نہیں ہے کہ پوسٹ آفس جا سکوں تم ابھی جا کر میڈیکل فرم کو منی آرڈر کر دو۔"

میں نے بجھے ہوئے دل سے لفافہ کھولا۔ کل ایک سو دس ڈالر تھے۔ "اور میں مہینہ بھر کے لیے سودا سلف کہاں سے لاؤں گی۔؟" گھر کے خرچ کے لیے تمہیں کم از کم تیس ڈالر درکار ہیں۔ تم ایک سو ڈالر فوراً فرم کو بھیج دو۔ دس ڈالر سے چند دن گزارو۔ اتنے میں میں تھوڑے بہت پیسوں کا بندوبست اور کر لوں گا۔ میں نے گیراج سے لیس کی پرانی سی VAN نکالی پولی کو ساتھ لیا اور پوسٹ آفس جانے کی بجائے سیدھی بازار پہنچ گئی۔ ریڈی میڈ کپڑوں کی دکان پر وہ سوٹ ابھی تک لٹک رہا تھا۔ جسے پولی پہلے ہی پسند کر چکی تھی۔ میں نے اچھی طرح اسے دیکھا بھالا اور دوکاندار سے قیمت دریافت کی۔ "تیس ڈالر" کیا میں رقم پھر ادا کر سکتی ہوں۔؟

بڑے شوق سے ہم یہ جوڑا ایک طرف رکھ لیتے ہیں۔ کسی وقت بھی آ کر لے جائیے۔ دوکاندار خوش اخلاقی سے بولا: آپ شاید میرا مطلب نہیں سمجھے۔ ہمیں یہ لباس آج ہی چاہیئے۔ دو چار روز بعد قیمت ادا کر دوں گی۔ دوکاندار نے مجھے سر سے پاؤں تک گھورا۔ میرا نام جینی لیس ہے۔ میں وہ سامنے والی پہاڑی پر رہتی ہوں۔ آپ مسٹر اسٹون کو جانتے ہوں گے وہ یہاں کے مقامی باشندے تھے۔ چند ماہ ہوئے ان کا انتقال ہو گیا۔ میں ان کی بہو ہوں۔ میرے شوہر ویلڈنگ کا کام کرتے ہیں۔ وہیں پہاڑی پر ان کی دکان ہے۔ میں ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گئی۔

معاف کیجئے گا محترمہ ہم ادھار بہت کم دیتے ہیں۔ اس کے لیے آپ کو ایک فارم پُر کرنا ہو گا۔ کل آپ کے لکھے ہوئے پتہ پر ہم اپنا نمائندہ بھیجیں گے۔ جب وہ آپ کے تمام کوائف کی اچھی طرح تصدیق کر لے گا تو آپ کو یہ کپڑے مل جائیں گے۔

کیا یہ سارا کام آج ہی نہیں ہو سکتا۔؟

"جی نہیں آپ کو کم از کم دو دن انتظار کرنا پڑے گا۔" میں نے پولی کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ بے اختیار میرا ہاتھ لفافہ کی طرف اُٹھ گیا۔ میں نے ایک سو دس ڈالر میں سے تیس نکالے اور دوکاندار کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ کپڑوں کے جوڑے کو VAN کے پچھلے حصہ میں احتیاط سے رکھ کر جنرل اسٹور میں گئی۔ بہت ہاتھ روکا پھر بھی ہفتے بھر چیزوں پر پچیس ڈالر اُٹھ گئے۔

پوسٹ آفس پہنچی اور باقی رقم گنی۔ اب میرے پاس کل پچپن ڈالر تھے۔ کمپنی کو ایک سو ڈالر بھیجنا ضروری تھے۔ اچانک مجھے لیس کے بھائیوں کا خیال آیا۔ آخر ماں کا ان پر بھی تو حق تھا اور پھر یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ وہ دونوں صاحب حیثیت تھے۔ میں نے چونتیس ڈالر ہی کا منی آڈر فارم بھرا اور فرم کو بھیجا ساتھ ہی ایک تار بھی دیدیا کہ ماں کے تین بیٹے ہیں چونتیس ڈالر ہم بھیج رہے ہیں باقی چھیاسٹھ ڈالر دونوں بیٹے دیں گے۔ جب آپ کے پاس سو ڈالر جمع ہو جائیں تو آلہ سماعت لے کر آ جایئے گا۔ اس وقت تک ہم انتظار کریں گے۔ لیس کے دونوں بھائیوں کو بھی میں نے اطلاع دیدی ہے کہ ماں کے لیے ہمیں سو ڈالر چاہیئں۔ چونتیس ہمارے پاس ہیں باقی چھیاسٹھ آپ ویسٹ اینڈ میڈیکل ایکویپمنٹ فرم کے نام منی آڈر کر دیں۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں اطمینان سے گھر لوٹ آئی۔ مجھے یقین تھا کہ روجر اور ٹام فوراً ہی رقم بھیج دیں گے۔ اور اس طرح لیس کو کانوں کان خبر نہ ہو گی۔

اس رات کھانے کے بعد میں فوراً ہی بستر پر لیٹ گئی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ لیس مجھ سے رقم کے بارے میں دریافت کرے۔ چنانچہ اس نے کوئی سوال نہ کیا اور فوراً ہی سو گیا۔ شاید وہ تھکا ہوا تھا۔

دوسری صبح لیس دکان پر جانے سے قبل مجھ سے مخاطب ہوا۔

"جینی تمہیں آج کہیں جانا تو نہیں؟

نہیں کیوں کیا بات ہے۔؟

آج جمعرات ہے۔ میڈیکل فرم والے ڈاکٹر صاحب نے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ میں ڈر گئی۔ ہو سکتا ہے لیس نے فرم کو فون کیا ہو۔ کیا آپ ڈاکٹر صاحب سے ملے تھے؟ میں بھلا انھیں کیسے مل سکتا تھا دن بھر کام سے فرصت ہی نہیں ملی۔ میں انھیں ملی تھی میں نے یہ بھی بتایا تھا کہ ہم نے رقم منی آڈر کر دی ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ تین چار روز میں دفتری کاروائی مکمل ہو جائے گی اور وہ آلہ سماعت لے کر پہنچ جائیں گے۔ میں نے جھوٹ بولا۔

"ٹھیک ہے خدا کرے ماں جلد از جلد سننے لگیں۔ اس رقم کے لیے جتنی محنت کرنا پڑی ہے وہ میں ہی جانتا ہوں۔

شام کو پولی کے اسکول میں سالانہ تقریب ہونے والی تھی۔ دوپہر کو وہ اسکول سے لوٹی تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ کیا ہوا پولی تم اتنی اداس کیوں ہو۔؟

" ممی وہ تقریب اب اگلی جمعرات کو ہوگی۔ وہ آہستگی سے بولی۔ اس خبر نے مجھے بھی افسردہ کر دیا۔ میں نے کپڑے خریدنے میں عجلت سے کام لیا تھا۔ اگر یہی بیس ڈالر یہاں صرف نہ کرتی تو آج مجھے جھوٹ بولنا نہ پڑتا۔ بہرحال اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں نے ایک جھوٹ بولا تھا اور اس کو چھپانے کے لیے مجھے کئی جھوٹ بولنے پڑ رہے تھے۔ دو دن گزر گئے ہر شام لیس کام سے لوٹتے ہی مجھ سے یہ سوال کرتا۔ ڈاکٹر صاحب نہیں آئے۔؟ جی نہیں۔

آخر تم اتنے پریشان کیوں ہو۔ آجائیں گے۔ میں ہمیشہ اسے تسلی دینے کی کوشش کرتی۔ سوموار تک اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا۔

جینی آج میں خود ڈاکٹر صاحب کے پاس جاؤں گا۔ ناشتے کی میز پر اس نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اب کیا ہوگا۔؟ اگر لیس ڈاکٹر صاحب سے ملا تو وہ ضرور فرم کے دفتر میں فون کریں گے۔ اس صورت میں میری چوری پکڑی جائے گی۔

لیس میرے پاس گھر کا خرچ چلانے کے لیے ایک دھیلا تک نہیں تم آج کسی نہ کسی طرح کچھ بل وصول کر لو۔ میں ڈاکٹر صاحب کے پاس چلی جاؤں گی۔ بہت بہتر۔ ان سے کہنا آج شام ضرور آئیں میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیس نے دوکان پر جانے سے قبل ایک بار پھر مجھے ڈاکٹر صاحب کے پاس جانے کی تاکید کی پلیٹیں دھو کر میں باہر نکلی ماں صحن میں کھڑی تھیں جینی تم نے شہد کی مکھیوں کا چھتہ دیکھا ہے؟ وہ مجھے دیکھ کر بولیں۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

وہاں سڑک پر جھاڑیوں میں ہے۔ میں نے کوزی سے وعدہ کیا ہے کہ میں اسے تازہ شہد دوں گی۔ ذرا میرے ساتھ چلو۔ ہم سڑک پر پہنچے تو ایک ٹرک خالی ٹریلر لے کر اوپر جا رہا تھا۔ پہاڑی کی چوٹی پر لیس کی دوکان تھی۔ یہ وہی ٹرک تھا جس کی مرمت سے لیس تین چار روز قبل فارغ ہوا تھا۔ یہ سڑک دکان کے سامنے پہنچ کر ختم ہو جاتی تھی۔ ماں چھتے کے پاس چلی گئیں اور کوزی سڑک پر سے پتھر چننے لگی۔ میں چھوٹے لڑکے ہلیری کے ساتھ دوکان کی طرف چل دی۔ دوکان کے باہر لیس ٹرک کے ایک انجن کی دیکھ بھال میں مصروف تھا۔ ایک شخص اس کے پاس کھڑا تھا۔ دوکان کے عقب میں ایک چھوٹی سی قدرتی جھیل تھی۔ میں چبوترے پر کھڑی ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اچانک کسی بھاری شے کی لڑھکنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا اف میرے خدا! ہلیری نے ٹریلر کو ٹرک سے کھول دیا تھا۔ دکان بلندی پر تھی اور نشیب میں جانے والی سڑک پر ٹریلر تیزی سے لڑھکتا جا رہا تھا۔ لیس اور وہ شخص اندھا دھند اس کی طرف بھاگ رہے تھے۔ کچھ فاصلہ پر ماں سڑک کے عین وسط کوزی کے پاس بیٹھی تھیں۔ ان کی پشت ہماری طرف تھی ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ موت ان سے چند قدم کے فاصلے پر ہے۔ لیس پوری طاقت سے چلّا رہا تھا۔ ماں سڑک سے ہٹ جاؤ۔ لیکن بے چاری ماں کو کیسے سنائی دیتا۔ میں تیزی سے ان کی طرف دوڑی لیکن ایک پتھر سے ٹھوکر کھا کر سڑک پر گر پڑی۔ دوبارہ اٹھی تو ٹریلر کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ سڑک کے عین وسط میں لیس اور وہ شخص بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے ماں کا خون میں نہایا ہوا جسم پڑا تھا۔۔۔ میری آنکھوں کے سامنے سرخ دھبے ناچنے لگے۔ لیس یہ کیا ہوا میں نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ لیس خاموش رہا اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا پاس کھڑے ہوئے شخص نے جھک کر ماں کے سینے پر ہاتھ رکھا۔ اور تیزی سے بولا۔" ابھی ان کی سانس چل رہی ہے ہمیں جلد از جلد انھیں اسپتال پہنچانا چاہیے۔ میں گھر کی طرف بھاگی۔ تھوڑی دیر بعد ہم VAN میں ماں کو اسپتال لے جا رہے تھے بازار کے چوک میں پہنچ کر لیس کی آواز سنائی دی وہ ماں کے ساتھ VAN کے پچھلے حصہ میں تھا۔ ہسپتال جانے سے کوئی فائدہ

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: آپ تھے (تذکرہ شعرائے قصبات اودھ)
مصنف: عرفان عباسی۔ صفحات: ۔ ۲۲۰
قیمت: ۲۵ روپے۔ ملنے کا پتہ: نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ امین الدولہ پارک، لکھنؤ۔

"آپ تھے" قصبات اودھ کے ۸۴ مرحوم شعراء کے خاکوں پر مشتمل ہے۔ ان خاکوں میں اختصار کے ساتھ شاعر کے حالات زندگی، شخصی و شعری خصوصیات اور اشعار کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ یہ خاکے تعارفی نوعیت کے ہیں اور FIRST INFORMATION کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس طرح ان خاکوں کی اپنی جگہ ایک افادیت ہے۔

"آپ تھے" میں ریاض خیرآبادی، جاں نثار اختر اور سلام مچھلی شہری جیسے اہم شعرا کے خاکے بھی شامل ہیں۔ اس میں عباس علی خاں بیخود صاحب کا خاکہ بھی شامل ہے۔ جو کلکتہ یونیورسٹی میں اردو کے لیکچرر تھے اور ۲۶ اگست ۱۹۶۹ء کو وہیں ان کا انتقال ہوا۔ کلکتہ میں عام طور سے انھیں بیخود کلکتوی ہی کہا جاتا ہے۔ لیکن ان کے خاکے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ فیض آباد کے تھے۔ اس طرح ان خاکوں سے بعض شعرا کے سلسلے میں جو غلط فہمیاں ہیں وہ بھی دور ہو جاتی ہیں۔

لکھنؤ میں اگر کسی شخص کو کسی شاعر کے حالات زندگی اور نمونہ کلام نہ دستیاب ہو پا رہا تو وہ اگر عرفان عباسی صاحب سے رابطہ قائم کرے تو اسے یہ چیزیں ان سے یقیناً بڑی آسانی سے حاصل ہو جائیں گی۔ ان خاکوں اور تذکروں کی شکل میں عباسی صاحب جو کام کر رہے ہیں، اس کی افادیت کے پیش نظر وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ لیکن ان سے ایک گذارش بھی ہے وہ یہ کہ انھیں افسانہ نگاروں، ناول نگاروں اور ناقدین پر بھی توجہ دینی چاہیئے اور ان کے خاکے اور تذکرے بھی لکھنا چاہیئے تاکہ اردو میں اس سلسلے میں جو کمی ہے اس کے دور ہونے کا سلسلہ شروع ہو سکے۔

—— شاہ نواز قریشی



مشتاق سلونوی —— (صفحہ ۲۸ کا بقیہ)

نعت کے چند اشعار

لب پہ ہے نام محمدؐ دل میں ارمان رسولؐ
یوں پہنچتے ہیں مدینہ مبتلا یان رسولؐ

قوت بازوئے احمدؐ تھے علی مرتضےٰؑ
پارۂ دل فاطمہؑ، حسنین تھے جان رسولؐ

طالب بخشش جو ہو دنیا کے جھگڑے چھوڑ کر
کیوں نہیں بنتے ہوا سے مشتاق دربان رسولؐ

نعلین دوست حق سے بڑھا افتخار عرش
دونا ہوا نبیؐ کے قدم سے وقار عرش

محبوب حق، امین خدا، رحمت جہان
ختم رسل، شفیع امم، شہسوار عرش

سلام کے چند اشعار سے

حیف جو مالک کوثر ہے وہ پیاسا رہ جائے
مجرئی سب پئیں احمد کا نواسہ رہ جائے

پانی جو دے نہ سکے آل نبیؐ کو اپنا
یا خدا بہنے سے اس طرح کا دریا رہ جائے

اے فلک کیا ستم ہے کہ دم ظہر حسینؑ
سر کٹانے کے لئے تشنہ و تنہا رہ جائے

غلام صابر قلندری سندیلوی
۲۷ سیانی ٹولہ۔ پاٹانالہ
لکھنؤ ۳۔ ۲۲۶۰۰۳

ساحر لدھیانوی

سحر کرتا نہ اگر دل پہ کلامِ ساحر
ہوتا مشہور نہ یوں دہر میں نامِ ساحر
ذہنِ فنکار پہ قربان ہے خود عظمتِ فن
کس قدر ارفع و اعلیٰ ہے مقامِ ساحر
مٹ سکیں گے نہ کبھی علم و فراست کے نقوش
ثبت ہے صفحۂ دانش پہ دوامِ ساحر
جھومتے ہیں اہلِ سخن نشۂ ادراک سے مست
بادۂ علم سے لبریز ہے جامِ ساحر
اس کی حب الوطنی کا ہے یہ بیّن ثبوت
ساتھ لدھیانے کے وابستہ ہے نامِ ساحر
درسِ اخلاق سے لبریز ہے ساحر کا کلام
صلح و اخلاص و محبت ہے پیامِ ساحر
چھا گئے پردۂ سیمیں پہ ترانے اس کے
فلم میں پا نہ سکا کوئی مقامِ ساحر
اس کے گیتوں نے اسے دی ہے حیاتِ جاوید
کیسے بھولے گا زمانہ کبھی نامِ ساحر
موت نے چھین لیا گو اسے ہم سے لیکن
مٹ سکے گا نہ کبھی دہر سے نامِ ساحر

گلشنِ شعر سے گلہائے عقیدت لے کر
نذرِ منجانبِ صابر ہے بنامِ ساحر

آزر بارہ بنکوی

تیرے بعد

(ساغر مہدی کے نام)

تیرے گھر گریہ کناں، نوحہ بہ لب آیا ہوں میں
تجھ سے شرمندہ ہوں اے ساغر! کہ اب آیا ہوں میں

جب ترے در پہ کوئی آہٹ نہ قدموں کے نشاں
تیرے گھر کی خامشی جب لے رہی ہیں سسکیاں
خواب سارے ہو گئے محروم جب تعبیر سے
جیت لی بازی شبِ تیرہ نے جب تنویر سے
گھر ہے جب ویران، جب سونی پڑی ہے خوابگاہ
یاس سے دہلیز تیری تک رہی ہے تیری راہ
نغمگی پر چھا چکا ہے جب سکوتِ انجمن
نبضِ دوراں پر دفورِ غم سے طاری ہے تھکن

جب قلم تیرا ترستا ہے روانی کے لیے
جب بتانِ فکر افسردہ ہیں مانی کے لیے
صرف تشبیہات کیسی اور کیا لطفِ بیاں
کھو چکی جب حسن اپنا استعاروں کی زباں
بھول کر زندہ دلی کا ہر حیات افزا اصول
زیست تیری کر چکی ہے جب شکست اپنی قبول

تجھ سے شرمندہ ہوں اے ساغر! کہ اب آیا ہوں میں
تیرے گھر گریہ کناں، نوحہ کناں آیا ہوں میں

معرفت گورنمنٹ سیکنڈری اینڈ ٹریننگ
اسکول فار مسلمس مدراس ۲

زندۂ جاوید کتابوں کے محرک

اردو ادب میں بعض کتابیں ایسی ہیں جنھیں شاہکار کا درجہ حاصل ہے اور وہ اپنی گوناگوں خوبیوں اور خصوصیتوں کی بنا پر بے پناہ مقبولیت کی حامل ہیں۔ ان کی اہمیت و افادیت رہتی دنیا تک اردو ادب میں دائم و قائم رہے گی۔ جب یہ کتابیں صفحۂ قرطاس پر چاند اور سورج کی طرح جگمگائیں تو اپنے ساتھ اپنے مصنف کے نام کو بھی روشن کیا اور انھیں عالمگیر شہرت عطا کی لیکن عجیب بات یہ ہے کہ یہ کتابیں مصنف کی ذاتی تحریک پر وجود میں نہیں آئیں اور نہ مصنف کو اس قسم کی تحریر اور تالیف کا اپنی جانب سے کبھی خیال ہوا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بعض دوراندیش شخصیتوں نے جب کسی صاحب کمال میں کوئی خوبی دیکھی تو انھوں نے انھیں اس کی ترغیب دلائی اور تصنیف و تالیف پر آمادہ کیا۔ مجھے اپنے اس مختصر مضمون میں ان مشہور و معروف اشخاص کا تذکرہ کرنا مقصود ہے جن کی ترغیب اور تحریک پر تین عظیم الشان اور بے نظیر کتابیں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئیں۔

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر شیدائی رسول تھے اور آپ کو سرورِ کونین احمد مجتبیٰ صلعم کی ذات اقدس سے غیر معمولی عقیدت تھی۔ چنانچہ مولانا جوہر ایامِ اسیری کے دوران رسول کریم صلعم کی حیاتِ طیبہ پر ایک مبسوط سیرت تصنیف کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ کتابوں کی کمیابی اور وسائل کی کمی کے باعث مولانا کو خاطر خواہ مواد حاصل نہ ہو سکا جس کی بنا پر وہ اپنے مقصد کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ قید سے رہائی کے بعد بھی سیاسی امور میں ایسے الجھے کہ اس کام کے لیے مولانا وقت نہ نکال سکے۔ پھر بھی مولانا کے دل سے یہ خیال نہ نکلا۔ بس اسی کی دھن تھی اور جب یہ منصوبہ اپنے ہاتھوں عملی جامہ پہنتا نظر نہیں آیا تو آپ نے مولانا شبلی نعمانی کو ترغیب دلائی کہ حضور اکرم کے اسوۂ حسنہ پر ایک ایسی مبسوط کتاب تصنیف کی جائے جس سے سیرت کا مفہوم کما حقہٗ پورا ہو جائے۔

علامہ شبلی نعمانی کو اسلامی علوم سے خاص شغف تھا اور آپ نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور سیرت النبی کے ابتدائی حصے تصنیف کیے۔ اس عرصہ میں شبلی نعمانی کی صحت جواب دینے لگی اور جب انھوں نے دیکھا کہ یہ کتاب پایۂ تکمیل کو پہنچتی نظر نہیں آتی تو انھوں نے اپنے ہونہار شاگرد سید سلیمان ندوی کو اس کی تکمیل کے لیے مائل کیا جنھوں نے اپنے محترم استاد کی وصیت کی تعمیل کرتے ہوئے شبلی نعمانی کی وفات کے بعد بھی اس کام کو جاری رکھا اور سیرت النبی کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ سیرت پر یہ لاجواب اور بے مثل کتاب ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ نے مولانا عبدالماجد دریابادی کو ان کے اپنے قول کے مطابق از سرِ نو مسلمان کیا۔ جب مولانا شبلی نعمانی کی سیرت النبی شائع ہوئی تو مولانا محمد علی جوہر نے اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں کرنا چاہا مگر سیاسی مصروفیات کے باعث وہ اس کام کے لیے بھی وقت نہ نکال سکے۔ بہرکیف یہ ایک حقیقت ہے کہ جوہر کی خواہش پر سیرت النبی کی تصنیف عمل میں آئی۔

سر سید احمد خاں مرحوم کو ہمیشہ اپنی قوم کی اصلاح اور ترقی کی فکر دامن گیر رہتی تھی اور انھوں نے اپنی ساری زندگی قوم

کی فلاح و بہبودی کے لیے وقف کردی تھی۔ موصوف نے خواجہ الطاف حسین حالی کو فرسودہ اور لغو شاعری سے روکا اور قومی شاعری کی ترغیب دلائی۔ موصوف کی تحریک پر حالی نے اپنی طویل نظم "مد و جزر اسلام المعروف مسدس حالی" تصنیف کی جو اپنی بے شمار خصوصیات کی بنا پر اپنی قوم میں بے حد مقبول ہوئی۔ یہ وہ شاہکار ہے جس پر سرسید کو فخر تھا اور اسے وہ اپنے لیے توشہ آخرت سمجھتے تھے اور انھوں نے اپنے اس خیال کا اظہار اپنے مخصوص انداز میں یوں کیا تھا:

"بروز حشر اگر اللہ تعالیٰ مجھ سے پوچھے کہ اے سید احمد! تو نے دنیا میں کیا کیا اور کیا لایا ہے؟ تو بارگاہ ایزدی میں مسدس حالی پیش کرتے ہوئے کہوں گا کہ الٰہی! میں نے دنیا میں کوئی نیکی نہیں کی ہے سوائے اس کے کہ مولانا حالی سے "مسدس حالی" لکھوا لایا ہوں۔"

مولانا حالی کو بھی اس بات کا اعتراف ہے "یہ بات میرے اپنے بس کی نہ تھی۔ سرسید کے ایما پر میں اس بات کی ہمت کر بیٹھا اور مجھے غیر معمولی کامیابی نصیب ہوئی۔" حالی کے بیان کی روشنی میں یہ بات بلا شک و شبہ کہی جا سکتی ہے کہ اگر مولانا حالی کو سرسید کی رہبری اور رہنمائی حاصل نہ ہوتی تو مسدس حالی معرض وجود میں نہ آتی اور اسلامی دنیا اس کیمیائے سعادت سے محروم رہ جاتی۔

حاجی جمال محمد مرحوم جنوبی ہند کے ایک چوٹی کے مخیر رئیس تھے۔ آپ ایک ماہر تاجر ہونے کے ساتھ ساتھ علم و ادب کا نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ مذہبی علوم سے آپ کو خاص دلچسپی تھی۔ موصوف نے اپنے مذاق کو بحال رکھنے کی خاطر مدراس میں ایک انجمن کی بنیاد رکھی اور اس کے تحت علمی، ادبی اور مذہبی خطبات کا اہتمام کیا۔ اس کے زیر اہتمام مفکر اعظم علامہ اقبال مرحوم کو مدعو کیا گیا کہ وہ مدراس تشریف لا کر کسی خاص اسلامی موضوع پر لکچر دیں۔ چنانچہ ۱۹۲۸ء میں حکیم ملت شاعر مشرق سر محمد اقبالؒ نے چھ لکچر اسلام کے موضوع پر انگریزی زبان میں دیے جو اردو دنیا میں "خطبات مدراس" کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ معرکتہ الآرا خطبات "RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHTS IN ISLAM" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ اس کتاب کا اردو زبان میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو عمیق فلسفہ، اور باریک بینی، بلند خیالات و افکار سے لبریز ہے۔ اس کتاب کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ لگانے کے لیے مصنف کی اپنی ذاتی رائے ہی کافی ہے: "اگر میری یہ کتاب خلیفہ مامون الرشید کے دور میں شائع ہوتی تو پورے عالم اسلام میں تہلکہ مچ جاتا۔"

اس بات کا علم بہت کم لوگوں کو ہے کہ اس کتاب کے اصل اور حقیقی محرک حاجی جمال محمد مرحوم ہیں جن کی خواہش پر دانائے راز شاعر اسلام سر محمد اقبال مرحوم نے اس کتاب کی تشکیل کی۔ بقول ڈاکٹر الحاج عبدالحق مرحوم (کرنولی)، حاجی جمال محمد مرحوم کا یہی ایک کارنامہ ان کی بقائے دوام کے لیے کافی ہے۔



پچھتاوا — (صفحہ ۳۶ کا بقیہ)

لیس نے محبت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر کوزی کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ آج اس واقعہ کو کئی ماہ گزر چکے ہیں لیکن ماں کی یاد ہمارے دلوں میں روز اول کی طرح موجود ہے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہمدردی اور انسان دوستی کے اس چراغ کو کبھی بجھنے نہ دوں گی جسے ماں نے روشن کیا تھا۔ ماں زندگی بھر دوسروں کے کام آتی رہیں اور اس دنیا سے جاتے وقت مجھے ایک ایسا سبق دے گئیں جس نے مجھے صحیح معنوں میں جینا سکھایا۔





ایم ۔ اے ۔ قدیر
۳۳-اے - کابیور روڈ
الٰہ آباد

لمحۂ ہجر مرے دل پہ گراں ہے کہ جو تھا
شوقِ دیدار مگر حاصلِ جاں ہے کہ جو تھا

اپنی قسمت میں وہی کم نگہی، تشنہ لبی
دستِ ساقی میں وہی رطلِ گراں ہے کہ جو تھا

ساحل و موج کا ہر لحظہ وہی وصلِ دوام
سطحِ امواج پہ نقشِ ہجراں ہے کہ جو تھا

حسنِ خاموش سے پھر لے کے پیامِ تحریک
موجزن عشق کا سیلابِ رواں ہے کہ جو تھا

اک زمانے سے ہے جاری عملِ چارہ گری
آج بھی درد قریبِ رگِ جاں ہے کہ جو تھا

اب نہ وہ رسمِ محبت، نہ وہ ایثار و خلوص
بزمِ یاراں کا وہ ماحول کہاں ہے کہ جو تھا

آہ اس دورِ ترقی میں بھی انسانوں سے
آدمی کو وہی اندیشۂ جاں ہے کہ جو تھا

سرد مہری کے کئی دور چلے پھر بھی قدیر
بزم میں اپنا وہی زورِ بیاں ہے کہ جو تھا

نظیر صفی پوری
۳۳۵/۱۶۲ محمود نگر
لکھنؤ-۳

سوچتے ہو کیا جاگو صبح نے پکارا ہے
اب افق کے دامن میں آخری ستارا ہے

آہٹوں کے گننے میں کاٹ دیں جواں راتیں
اک زمانہ ہم نے بھی پیار میں گزارا ہے

جتنے پاس آؤ گے اتنے فاصلے ہوں گے
تم سے دور رہنا بھی اس لیے گوارا ہے

ہم کھڑے ہیں ساحل پر منتظر سفینے کے
اور نگاہ سے اوجھل دوسرا کنارا ہے

آپ کہیے تو بیٹھوں آپ کہیے اٹھ جاؤں
آپ کی یہ محفل ہے آپ کا اجارا ہے

پڑھ سکو تو اب پڑھ لو روشنی کی تحریریں
ہر چراغ کی لو میں مضمحل اشارا ہے

اے نظیر بجھا دو تنگ دل ہواؤں کو
یہ زمیں ہماری ہے یہ چمن ہمارا ہے



عشرت احمد عشرت بریلوی

چڑھائیم پنجابیان
بریلی

اک زندگی ملی ہے فرقت کی زندگی سے
ذوقِ نظر بڑھا ہے دیدار کی کمی سے
دل کی تڑپ نہ پوچھو ہمرازِ عاشقی سے
یہ راز کی ہیں باتیں کہتے نہیں کسی سے
تھی تبصرہ چمن کا غنچوں کی خود نمائی
سب راز کھل گیا ہے بیساختہ ہنسی سے
انجامِ ربطِ الفت اب آگے جو بھی کچھ ہو
فریاد بن کے نظریں اٹھنے لگیں ابھی سے
حسنِ ازل کے جلوے دل میں چھپے ہوئے تھے
کچھ راز کھل گیا ہے اسرارِ بیخودی سے
سازِ وفا کے نغمے خاموش ہو چکے تھے
جب تم نے حال پوچھا مایوس زندگی سے
انجامِ فصلِ گل ہے انکی نظر میں عشرت
غنچے میں دل گرفتہ گل کی شگفتگی سے

آفاق احمد فاخری

جلال پور فیض آباد

رک گئے تم تو کبھی نیند نہ آئے گی ہمیں
وہ کھنڈر تم کو بہت روز صدائیں دے گا

کیا خبر تھی کہ وہ اس طرح سزائیں دے گا
میرا قاتل مجھے جینے کی دعائیں دے گا

اس سے مت مانگو یہ کیا دے گا نشانِ منزل
یہ تو جگنو ہے تمہیں صرف دشائیں دے گا

اپنی دہلیز کے دیپوں کو بجھانے کے لیے
کیا خبر تھی مرا دامن بھی ہوائیں دے گا

دُزدِ شب جس میں جلیں گے ترے خوابوں کے بدن
اب کے احساس کا موسم وہ گھٹائیں دے گا

سلطان احمد نادم

لکھنؤ ٹیکسی کمپنی
بانس کی مسجد لکھنؤ

جلوۂ حسن سے جو آگ لگا لیتے ہیں
اپنے سینہ کو وہ اک طور بنا لیتے ہیں

یہ الگ بات ہے اپنے نہ ہمیں غیر کہیں
ہم تو غیروں کو بھی اپنا ہی بنا لیتے ہیں

میرے احساسِ محبت کو ہے شکوہ ہر دم
غیر بھی آ کے کچھ ناز اٹھا لیتے ہیں

دل کو تسکین کی ہوتی ہے ضرورت جب بھی
ہم تری یاد کو سینے سے لگا لیتے ہیں

ترے ہوتی ہیں محبت کی ہزاروں باتیں
جب خیالوں کی کوئی بزم سجا لیتے ہیں

ہم نے دیکھا ہے جو انجامِ محبت نادم
کوئی ہنستا ہے تو ہم اشک بہا لیتے ہیں

ہونے پر ہے۔ بچی!

صوفیہ ــــ بابا خدا کے لیے ایسا نہ کہیں اس بھری دنیا میں تنہا نہیں رہ سکتی۔ یہ کہتے ہوئے صوفیہ کی بوجھل پلکوں میں آنسو الجھ کر رہ گئے اور ایک آہ فضا میں تحلیل ہو گئی۔

بوڑھا:۔ اچھا بچی! چھوڑو ان باتوں کو! ــ خدا کو جو منظور ہوگا وہی ہوگا۔ وہی ہوگا۔ اس وقت کتنی سردی لگ رہی ہے۔ .... ہوا تیز ہو رہی ہے۔ چلو اس گھنے درخت کے نیچے چل کر سوئیں۔

صوفیہ ــ بابا میں تو اس گھنے درخت کے نیچے نہیں جاتی. مجھے ڈر لگتا ہے۔ دیکھو نا کتنا خوفناک اور ڈراؤنا نظر آرہا ہے. جیسے اس میں کوئی خونخوار دیو بیٹھا ہو۔

بوڑھا۔ نہیں بچی! ڈر کس بات کا ہے ــ ان درختوں میں بھوت کہاں....؟

صوفیہ:۔ نہیں بابا میں نہیں جاتی۔ وہ سامنے والا قبرستان ہے نا ــ اس سے رات کو بڑی خوفناک آوازیں آتی ہیں۔ میرا تو دل کانپ جاتا ہے۔ کتنا اندھیرا چھا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ساری دنیا اونگھ گئی ہو.....

اسی اثنا میں ایک ستارہ آسمان سے ٹوٹا اور روشنی چھوڑتا ہوا گم ہو گیا۔ صوفیہ کی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھیں اور فضا کی وسعتوں میں کسی شے کو تلاش کرتے ہوئے کھو گئیں۔

صوفیہ:ــ بابا! یہ ستارے ٹوٹ کر کہاں جاتے ہیں؟"

بوڑھا ــ یہ تارے ٹوٹ کر ان سرمئی کناروں میں کھو جاتے ہیں۔ جہاں سے شفق کی لہریں پھوٹتی ہیں...

صوفیہ:ــ یہ کیوں ٹوٹتے ہیں....؟"

بوڑھا ــ بیٹا خدا کی قدرت ہے وہ لوگوں کو اپنی بے نیازی دکھاتا ہے ــ

بیٹی ــ سردی بڑھ رہی ہے۔ اگر درخت کے نیچے نہیں چلتی تو آگ ہی جلا دے۔ جسم تو اکڑتا جا رہا ہے۔

صوفیہ ــ" بابا لکڑیاں تو صبح ہی اکٹھی کر لی تھیں۔ مگر اس وقت آگ کہاں سے لاؤں ــ؟"

بوڑھا ــ بھلا آگ بھی ایسی قیمتی چیز ہے جو پیسوں کے بغیر نہیں مل سکتی ــ اس سامنے والے دفتر میں چلی جا۔ پڑی ہوگی۔ دفتر والے تمام رات کام کرتے ہیں....

صوفیہ" میں تو دفتر میں اکیلی آگ لینے نہیں جاتی..."

بوڑھا۔" پاگل ہو گئی ہے کیا؟ ہر بات میں انکار اچھا نہیں ہوتا۔ اگر تو نہ گئی تو پھر آگ کون لائے گا۔؟ ...جاؤ بیٹا...."

صوفیہ" بابا وہ تو آگ کی قیمت مانگتے ہیں ...قیمت.."

بوڑھا: پگلی کہیں کی.... بھلا آگ جیسی معمولی چیز کی بھی کوئی قیمت مانگتا ہے۔

صوفیہ:ــ بابا ــــ تم مجھے پاگل ہی سمجھتے ہو ــــ جیسے میں کچھ جانتی ہی نہیں۔ جب میں پرسوں آگ لینے گئی تھی نا تو وہ لمبا سا پتلون والا آدمی جو کل تم سے کھڑا ہمدردانہ باتیں کر رہا تھا۔ وہ کہنے لگا ہم آگ کی قیمت لیتے ہیں ــ مفت نہیں دیتے۔ یہ آگ ــ

بوڑھا۔ نہیں صوفیہ اس نے یونہی مذاق کیا ہوگا.. وہ تو بے چارہ اچھا آدمی ہے۔ آج صبح وہ مجھے روٹی دے گیا تھا۔

صوفیہ" تو کیا تم نے وہ روٹی کھالی تھی.....؟" یہ بات سن کر صوفیہ کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے منہ پر زور کا طمانچہ مار دیا ہو.....

بوڑھا:۔ ہاں بیٹا میں نے وہ روٹی کھالی تھی....

صوفیہ بابا تم نے اس سے کیوں لی تھی؟ وہ تو.... وہ تو...." بہت برا آدمی ہے.....

بوڑھا ــ تمہیں یونہی اس پر شبہ ہو رہا ہے بیٹی۔ اس نے مذاق کیا ہوگا۔

صوفیہ:۔ نہیں بابا۔ مذاق نہیں سچ مچ اس نے آگ کی قیمت

مانگی تھی۔ وہ پیسے نہیں مانگتا تھا۔" وہ تو کچھ اور۔۔۔۔! یہ سنتے ہوئے وہ غصہ میں بولا، کیا کہہ رہی ہو صوفیہ۔۔۔؟

۔۔صوفیہ ـــ بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔۔ جب کل میں آگ لینے گئی ـــ پہلے تو اس نے پیار سے کہا۔۔۔۔۔۔ آؤ صوفیہ، آؤ۔۔۔۔"

۔۔۔۔ اور میں اندر چلی گئی تو اس نے دروازہ بند کر لیا۔ اور مجھے۔۔۔۔ میرا ہاتھ پکڑ لیا ـــ میں غصہ میں چلائی تو اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔۔۔۔ میں نے ایک تھپڑ اس کے منھ پر دے مارا۔۔۔۔ اور بھاگ آئی۔۔۔۔ اس نے کہا تھا صوفیہ اب تم بیشک بھاگ جاؤ۔۔۔۔، مگر ایک دن۔۔۔۔

بوڑھا:۔ اف خدایا یہ میں کیا سن رہا ہوں۔۔۔۔۔۔۔ تیری دنیا میں غریب کی عزت اس بھاؤ فروخت ہونے لگی ہے ـــ کھوں۔۔۔۔ کھوں۔۔۔۔۔ بوڑھے کی کھانسی تیز ہو گئی ـــ کھوں۔۔۔۔ کھوں۔۔۔۔۔ رات اور بھی سرد اور گہری ہو گئی۔۔۔۔

بوڑھا:۔ صوفیہ! رات بڑی خوفناک معلوم ہوتی ہے۔۔۔ آسمان سیاہ بادلوں میں چھپ گیا ہے۔ ہوا کہہ رہی ہے۔ بارش ہو گی۔۔۔ چلو کسی سایہ میں چل کر سوئیں ـــ نہیں تو۔۔۔۔ میری جان ختم ہو جائے گی۔۔۔۔۔

کھوں۔۔۔۔ کھوں۔۔۔۔۔ یہاں بارش آ گئی تو۔

صوفیہ:۔ بابا رات آدھی سے زیادہ ڈھل چکی ہے۔۔۔ اور۔۔۔ ہر طرف پہرہ دار موجود ہوں گے۔ بھلا کوئی ہمیں کہیں گھسنے دے گا۔۔۔۔۔

بوڑھا:۔ صوفیہ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے، ہاتھ پاؤں سن ہو چکے ہیں۔ اف اتنی سردی ہو گئی ـــ آسمان برف برسا رہا ہے۔

۔۔۔ کھوں۔۔۔۔ کھوں۔۔۔ بیٹا! کھانسی تنگ کر رہی ہے ـــ اب سردی نہیں سہی جاتی۔ کہیں سے آگ لے آؤ ـــ ورنہ یہ بوڑھی زندگی دم توڑ دے گی۔

"اف صوفیہ! یہ کون آ رہا ہے میری طرف؟ بھیانک لباس والا۔۔۔ کون؟۔۔۔۔ موت کا سایہ!"

صوفیہ کی نگاہوں میں کالی رات، بے پناہ سردی، آگ کی قیمت۔ بوڑھے باپ کی لاش۔۔۔۔۔ ایک دم یہ چیزیں اس کے ذہن پر چھا گئیں۔۔۔۔۔، وہ سوچنے لگی میرا باپ اب مر جائے گا ـــ اور۔۔۔۔۔ صوفیہ دنیا میں اکیلی رہ جائے گی ـــ نہیں۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی ـــ میں باپ کو بچاؤں گی۔۔۔۔ میں ضرور آگ لاؤں گی۔۔۔۔۔ مگر نہیں۔۔۔۔ میں باپ کی زندگی کے لیے آگ کی اتنی بڑی قیمت ادا نہیں کر سکتی۔۔۔۔۔ موت اور گناہ۔۔۔۔۔ عصمت اور زندگی۔۔۔۔۔ مجھے موت قبول کر لینی چاہیے۔۔۔۔

بوڑھے کی سانسوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔۔۔۔۔۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا اور بوڑھا دم توڑ گیا۔۔۔۔۔ ساری دنیا پر گہری خاموشی پھیل گئی۔ یکایک بادل زور سے گرجے اور کائنات کانپ اٹھی۔۔۔۔۔۔

صوفیہ کا باپ اس کی آنکھوں کے سامنے بےبسی کی حالت میں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا ـــ رات گہری ہوتی گئی۔ بجلی نے چاروں طرف پر نکالنے شروع کر دیے ـــ صوفیہ نے باپ کی لاش کی طرف آخری بار دیکھا اور اس کی چیخ نکل گئی۔۔۔۔ اس کی نگاہیں آسمان کی بلندیوں کی طرف اٹھیں۔۔۔۔ اور جھک گئیں۔۔۔۔ دو موٹے موٹے آنسو اس کے پلکوں سے گر کر بوڑھے کی میلی داڑھی میں جذب ہو گئے ـــ

" صوفیہ نے اپنی بوسیدہ اوڑھنی سے باپ کی برہنہ لاش کو ڈھانپ دیا اور خود کفن بن کر اس سے لپٹ کر سو گئی۔ صبح کے وقت جب سامنے کے دفتر کا بابو سیر کے لیے نکلا تو اس نے باپ بیٹی کو ایک دوسرے کے ساتھ سوتے پایا۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔ دونوں ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ اب انھیں آگ کی ضرورت نہیں تھی۔۔۔۔۔۔





اپنی باتیں

گزشتہ ماہ ملک کے ممتاز دینی، ملی اور قومی ادارے دارالعلوم دیوبند کا صد سالہ جشن منایا گیا جس میں نہ صرف ملک کے گوشے گوشے سے بلکہ دنیا کے مختلف حصوں خاص طور سے عرب ممالک سے آئے ہوئے علماء و زعماء شریک ہوئے۔ اس کے علاوہ اسپیشل ٹرینوں کے ذریعہ اور متعدد دیگر ذرائع سے لاکھوں کی تعداد میں لوگ صد سالہ جشن کی تین روزہ تقریبات میں شریک ہوئے جو ۲۱ مارچ سے ۲۳ مارچ تک جاری رہیں۔ اس موقع پر قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا عدیم المثال مظاہرہ بھی دیکھنے میں آیا۔ غیر مسلم حضرات نے ان تقریبات کے انعقاد کے سلسلے میں اپنا بھرپور تعاون دیا اور مہمانوں کا پرتپاک اور پرخلوص خیر مقدم کیا۔ اس جشن کی تقریبات میں جن ملکوں کے ممتاز علماء دین شریک ہوئے ان میں بنگلہ دیش، پاکستان، شام، اردن، عراق، مصر، کویت، اور سعودی عرب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اس موقع پر ۲۱ مارچ کو وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی بھی دارالعلوم دیوبند تشریف لائیں اور انھوں نے ایک وسیع پنڈال میں تقریباً ۵ لاکھ افراد کے زبردست اجتماع سے خطاب کیا۔ انھوں نے دارالعلوم دیوبند کی شاندار اور گرانقدر قومی، ملی اور تعلیمی خدمات کا اعتراف کیا اور انھیں سراہتے ہوئے کہا کہ دارالعلوم کا ایک خاص کردار رہا ہے۔ اس نے ہماری قوم کی بیداری میں مدد دی ہے۔ وزیراعظم نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا کہ ہم نے اسلام کو کبھی بیرونی مذہب نہیں سمجھا۔ ہم اسلام کو بالکل ہندستان کا مذہب تصور کرتے ہیں۔

شریمتی اندرا گاندھی نے آگے چل کر اقلیتوں کے تحفظ کے سلسلے میں حکومت کے عزم کا اعادہ کیا اور کہا کہ "ہم اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ، ان کی سلامتی اور ہندستانی سماج میں ایک باعزت مقام و حیثیت دلانے کے لیے روزگار کے مناسب مواقع فراہم کرنے کے لیے مقدور بھر کوشش کرتے رہیں گے۔"

دارالعلوم دیوبند محض ایک مذہبی اور تعلیمی ادارہ ہی نہیں رہا ہے اس نے ملک کی جنگ آزادی میں ایک قائدانہ کردار بھی ادا کیا ہے۔ یہ ادارہ ایک مستقل مکتب فکر کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ سیکولر انداز فکر، قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو تقویت پہنچانے کا ایک موثر وسیلہ بھی رہا ہے۔ اس کی یہ حیثیت اور یہ نوعیت کردار برقرار رہنا چاہیے۔ تاکہ اپنی تمام تر خصوصیات اور انفرادیت کے ساتھ یہ ادارہ، رجعت پسند اور فرقہ پرست عناصر کے خلاف جدوجہد کا ایک طاقتور مرکز بھی بن جائے۔

● گزشتہ ماہ ۲۶ تاریخ کو مولانا آزاد میموریل اکاڈمی کے زیر اہتمام لکھنؤ کے گنگا پرشاد میموریل ہال میں ایک شاندار جلسہ منعقد ہوا جس میں مولانا ابوالکلام آزاد کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ اس موقع پر گنگا پرشاد ہال کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ اس جلسے میں مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مرکزی وزیر مملکت ضیاء الرحمان انصاری کے علاوہ مصر کے ممتاز عالم ڈاکٹر عبدالمنعم نے بھی مولانا آزاد کو پرخلوص نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد ایک جید عالم دین، ایک صاحب طرز انشاپرداز اور ادیب، ایک بیباک صحافی نیز ایک روشن خیال اور وسیع النظر انسان تھے۔ وہ ہندستان کی جنگ آزادی کے صف اول کے مجاہدین میں سے تھے۔ انھوں نے مذہب کی روح کو سمجھا تھا۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ ہم ابھی تک انھیں پوری طرح سمجھ نہیں سکے ہیں۔ خاص طور سے ہماری نئی نسل مولانا آزاد کے سیکولر انداز فکر، ان کی علمی، دینی اور سیاسی حیثیت، ان کی بیش بہا ادبی، صحافتی اور قومی خدمات سے بہت کم واقف ہے۔ چنانچہ ضرورت ہے کہ نئی نسل کو ان سے پوری طرح واقف کرایا جائے۔ خاص طور سے مولانا آزاد نے جس سیکولر سیاست پر زور دیا، قومی یکجہتی اور ہندو مسلم اتحاد کی جس انداز اور جس زبان میں (جسے مولانا علی میاں نے بجا طور پر نیم مذہبی نیم سیاسی زبان کہا ہے) وکالت کی۔ اس سے نئی نسل کو روشناس کرانا ضروری ہے۔ یہ کام اردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی زبان میں بھی ہونا چاہیے۔ امید ہے کہ مولانا آزاد میموریل اکاڈمی جس کا قیام ایک فال نیک ہے اس جانب بھی توجہ دے گی۔

وفیات

گزشتہ ماہ دو اہم اور منفرد شخصیتیں اس دار فانی سے رخصت ہو گئیں۔ ایک قاضی عدیل عباسی دوسرے مولانا سید ابن حسن نونہروی۔ قاضی عدیل عباسی نے ۲۲ مارچ کو داعی اجل کو لبیک کہا ——— ان کے انتقال سے ملک ایک عظیم مجاہد آزادی، ایک دانشور، صحافی اور ادیب سے محروم ہو گیا۔ قاضی صاحب کی شخصیت ہشت پہلو تھی۔ انھوں نے تعلیم کے میدان میں بھی گرانقدر خدمات انجام دیں اور اردو کے کاز کے لیے انتھک جدوجہد کی۔ انھوں نے جو کام بھی شروع کیا اس کے پیچھے ایک آدرش اور مشن کارفرما رہا۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ وہ جدوجہد اور وہ تحریک ہے جس کے تحت انھوں نے مکتبی تعلیم عام کرنے کے لیے گاؤں گاؤں مکتب قائم کرنے کا تصور پیش کیا اور اس تصور کو عملی جامہ پہنایا۔ وہ فرقہ واریت کے خلاف بھی ہمیشہ لڑتے رہے۔ سیکولر انداز فکر سے ان کی وابستگی اٹوٹ تھی۔ ان کی تحریر و تقریر اور عمل اس وابستگی کے مظہر ہیں۔ خدا مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

مولانا سید ابن حسن نونہروی کا انتقال ۲۵ مارچ کو ہوا۔ وہ ایک ممتاز عالم دین، ایک ادیب، ایک بلند پایہ معلم اور ایک منفرد ذاکر تھے۔ انھیں تفسیر قرآن، عربی ادب اور نہج البلاغہ کے رموز و نکات کی تشریح میں زبردست ملکہ حاصل تھا۔ فلسفہ ان کا خاص موضوع تھا۔ طبعیتاً وہ انتہائی خوش مذاق، خوش گفتار اور بذلہ سنج بھی تھے۔ ذاکری میں وہ صاحب طرز تھے اور ذاکری کے ایک نئے اسلوب کے موجد۔ فلسفیانہ، مذہبی اور علمی مسائل کو وہ لکھنوی زبان میں بڑے دلنشیں انداز میں بیان کرتے تھے جس سے عام لوگ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ لکھنؤ کی ٹکسالی زبان پر انھیں عبور اور ماہرانہ دسترس حاصل تھی۔ ان کے انتقال سے ہم لکھنؤ کی تہذیب اور اس کی اعلیٰ قدروں کے ایک بہترین نمائندے اور علمبردار سے محروم ہو گئے۔ ان کے انتقال پر ادارہ نیا دور اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور ان کے پسماندگان خاص طور سے محترمی ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نونہروی کو دلی تعزیت پیش کرتا ہے۔

——— ایڈیٹر

سے ہمرد بھری۔ یہ حقیقت ہے کہ قومی بیداری کے سلسلے میں جو اہم رول 'پرتاپ' نے ادا کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ۹ جون ۱۹۱۹ء کے شمارے میں دیش کی آتما کے عنوان سے وہ تحریر کرتے ہیں کہ "دیش کی روح آفاقی، لامحدود اور ناقابلِ تسخیر ہے، دن بیتتے ہیں، برس ٹل جاتے ہیں، زمانوں کا اختتام ہو جاتا ہے، بڑے بڑے نادر شاہ خاک میں مل جاتے ہیں مگر روحِ وطن زندہ جاوید ہے، جور و استبداد کے طوفان اس کو فنا کرنے کے ناپاک ارادے لے کر آگے بڑھیں، چاہے افکار و خیالات کے فاسد دھارے اس کو مٹانے پر کمربستہ ہو جائیں مگر اس کی ابدیت پر حرف نہیں آسکتا۔ اس کی تشنگی صرف آزاد و خود مختار فضا بجھا سکتی ہے۔ غلامانہ ماحول میں آبِ حیات بھی اس کی پیاس نہیں بجھا سکتا۔"

'پرتاپ' کے ذریعہ وہ لگ بھگ ۱۷ برس تک سامراجی حکومت کے ظلم و جور نیز سماجی بے انصافیوں پر لکھتے رہے۔ ۴ مارچ ۱۹۱۶ء کو انھوں نے لکھا کہ "آج سے سال بھر پہلے ۵ مارچ ۱۹۱۵ء کو ملک کے نمائندہ صحافیوں کا ایک وفد لارڈ چیمس فورڈ سے دہلی میں ملا تھا اور اُن کو عرض داشت پیش کی تھی" پریس ایکٹ "آزادیٔ فکر کا گلا گھوٹ رہا ہے، لہذا اُس کو فوراً واپس لیا جائے۔ اگر ایسا ہو جائے تو ملک ایک بڑی بے چینی سے نجات پا سکتا ہے اور اراکینِ حکومت اپنی جابرانہ پالیسیوں پر نظرِ ثانی کر سکتے ہیں، دیش ترقی کی راہ پر بھی لگ سکتا ہے حالانکہ ہمیں اُمید نہیں کہ یہ ہوگا ہمارے حاکم ایک جگہ پر گڑے رہ سکتے ہیں مگر یہ خیالِ خام دل سے نکال دیں کہ وقت بھی اُن کے لیے ایک جگہ گڑا رہے گا۔"

وہ ملک کی آزادی کو پریس کی آزادی کے ساتھ جوڑتے تھے وہ نہ صرف کالے قانونوں کے کٹر دشمن تھے۔ بلکہ بڑھتی ہوئی غریبی پر بھی مضطرب رہتے تھے۔ وہ اپنے مضامین میں مسلسل قارئین کو متوجہ کرتے تھے کہ آزادیٔ رائے پر پابندی اور مفلوک الحالی دونوں خطرناک ہیں۔ انگریزوں کے ساتھ وہ مقامی سرمایہ داروں کو بھی ایک خطرہ سمجھتے تھے۔ ۱۶ ستمبر ۱۹۱۸ء کو انھوں نے لکھا تھا کہ "غریبی نے اور بھی بھیانک روپ اختیار کر لیا۔ اب پیمانۂ صبر چھلکنے والا ہے۔

ہم پوچھتے ہیں۔ پاپی کون ہے؟ غریب یا امیر؟ غریب بے چارہ ایک مٹھی بھر اناج کے لیے آپ کو سامانِ عیش فراہم کرتا ہے۔ آپ امیر باپ کے بیٹے ہونے کے ناطے گُشن کے گدوں پر خواب استراحت کے مزے لوٹتے ہیں اور غریب باپ کا لڑکا کھرّی چارپائی کو ترستا ہے۔ یہ بے شرمی نہیں تو اور کیا ہے؟"

ان کی اسی جرأت و بے خوفی نے انھیں بار بار قید و بند کی مصیبت میں ڈالا۔ مگر نہ کبھی ان کے پائے استقامت ڈگمگائے نہ اپنے راستے سے منھ موڑا۔ ۱۹۱۳ سے ۱۹۳۰ء تک چلنے والی تمام تحریکوں میں قدم سے قدم ملائے وہ پرتاپ کے ذریعہ ان کی افادیت سے قوم کو آگاہ کرتے رہے اور بے تکان لکھتے رہے۔ چمپارن میں گوروں کے ظلم، دیسی ریاستوں میں ہونے والے استبداد سبھی پر وہ آگ برساتے رہے۔ کافی عرصے تک مہاتما گاندھی، پرتاپ کو خصوصی طور پر اپنائے رہے۔

کانپور کو انقلابی مرکز بنانے میں ودیارتھی جی کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ چندر شیکھر آزاد، راجکمار سنہا، بٹکیشور دت، بھگت سنگھ جیسے انقلابیوں سے ان کا ذاتی تعلق تھا، یہ سارے عظیم انقلابی گنیش شنکر ودیارتھی کو ایک بے غرض، مخلص اور دردمند اور آزادی کی سچی تڑپ رکھنے والی شخصیت کے روپ میں عقیدت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

'پرتاپ' میں انھوں نے انقلابیوں پر زبردست مضامین بھی لکھے۔ دوسری طرف جو دانشمندی ان کی عظمت کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ نگاہِ دوربیں ہے۔ جو مغربی ثقافت اور زبان کو سرخ نشان سمجھتی ہے۔ اس مرحلے پر ان کا قلم درد و غم میں ڈوبا نظر آتا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر مغربی کلچر پوری طرح اس سرزمین میں سرایت کر گیا اور بدیسی زبان کو مکمل دسترس حاصل ہو گئی تو پھر آزادی کا مفہوم ہی بے معنی ہو جائے گا اور انگریز کا

(بقیہ صفحہ ۴۸ پر)

نہیں واپس گھر چلو۔ ہم نے مڑ کر دیکھا ماں اپنا سفر پورا کر چکی تھیں۔

ماں کے جنازہ پر سارا شہر امنڈ آیا تھا اور روجر اور اس کی بیوی بھی پہنچ گئے تھے۔ فوج میں ہونے کی وجہ سے ٹامؔ کو چھٹی نہ ملی تھی۔ اس نے اپنے بیوی بچوں کو بھیج دیا تھا۔ تدفین سے اگلے روز سب ڈرائنگ روم میں سوگوار بیٹھے تھے۔ اس حادثے نے میرے ذہن و قلب کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ماں کی موت کی ذمہ دار میں ہوں۔ اگر میں پولی کے لیے کپڑے نہ خریدتی اور فوراً ہی ایک سو ڈالر فرم کو بھیج دیتی تو جمعرات کو وہ لوگ آکر ماں کو آلۂ سماعت دے جاتے ـــــ آلۂ سماعت ہوتا تو وہ ہماری آوازیں ضرور سن لیتیں اور سڑک پر سے ہٹ جاتیں۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ میری ضد اور ناسمجھی نے ان کی جان لے لی تھی ـــــ بار بار مجھے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوتی۔ کوئی چیز میرے اندر کلبلا رہی تھی۔ میرے دل کو بھینچ رہی تھی میں کمرے کے دروازے بند کر کے بیٹھی تھی لوگ سمجھتے تھے کہ ماں کے سوگ میں ہوں، انھیں کیا معلوم ضمیر کی خلش مجھے بے چین کر رہی تھی۔

شام کے وقت ہلیریؔ مجھے بلانے آیا میں بوجھل قدموں سے باہر صحن میں پہنچی لیس ہاتھ میں ایک بیگ لیے کھڑا تھا جینی یہ رقم رکھ لو۔ میں نے بیگ میں جھانکا وہ نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ تم نے کہاں سے لیے ہیں؟

"ماں کی خبر سن کر لوگوں نے میرے سارے بل ادا کر دیے ہیں تیرہ سو سے کچھ اوپر ڈالر ہیں۔ میں نے بے دلی سے بیگ لے لیا۔ ہم وہیں کھڑے تھے کہ کوزی دکھائی دی۔ پچھلے دو دنوں میں میں اسے بھول گئی تھی۔ وہ بھی ماں کے ساتھ سڑک کے وسط میں بیٹھی تھی لیکن وہ صحیح و سالم تھی۔ ماتھے پر البتہ ایک پٹی بندھی تھی۔

اس وقت تک یہ کہاں تھی۔؟ میں نے لیس سے پوچھا ٹریلر قریب آگیا تو کوزی بھاگ کر ایک طرف ہو گئی تھی۔ لیس نے افسردگی سے کہا۔

ڈرائنگ روم میں بہت سے لوگ جمع تھے وہ سب ماں کی تعریفیں کر رہے تھے۔ ماں کی سخاوت، شفقت اور محبت نے ان سب کے دلوں پر انمٹ نقوش چھوڑے تھے۔ شام تک مردوں عورتوں کا تانتا بندھا رہا۔ رات کو جب سب لوگ چلے گئے۔ تو لیس میرے پاس آیا اس کا چہرہ غصّہ سے لال بھبوکا ہو رہا تھا۔

جینی مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے میں عمر بھر تمہارے کرتوت سے واقف نہ ہوتا وہ تو اچھا ہوا روجر نے باتوں باتوں میں مجھے بتا دیا۔ میں سمجھ گئی۔ روجر سے اسے علم ہو گیا تھا کہ میں نے فرم کو صرف چونتیس ڈالر بھیجے تھے۔ میں سر جھکائے آنسو بہاتی رہی اور لیس مجھ پر برستا رہا، میں اپنے کیے پر نادم تھی۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ ندامت کے یہ آنسو ماں کو واپس نہیں لا سکتے تھے۔ وہ اب ایسی جگہ پہنچ گئی تھیں جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ پولی کا لباس اب تک الماری میں رکھا تھا اور اکتیس ڈالر میری میز کی دراز میں پڑے تھے۔ ماں کی کرسی خالی تھی۔ اور ان کی پالتو بلّی کمرے میں انھیں تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ لیس کا غصّہ دم بدم بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ میرے منھ پر تھپڑ مارنے ہی والا تھا کہ کوزی اچانک آڑے آ گئی۔ اس کا چہرہ کملایا ہوا تھا۔ اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"نہ ـــ نہ ـــ" اس کے منھ سے الفاظ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔ ہمیں لڑائی سے باز رکھنے کی کوشش میں وہ کچھ کہنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔

ماں ..... بمشکل تمام اس کے منھ سے نکلا تھا اور وہ ہچکیاں لے لیکر رونے لگی۔ میرے اور لیس کے ہاتھ بیک وقت اس کی طرف اٹھ گئے۔ ہم نے اس کے آنسو پونچھے اور تسلّی دینے لگے۔ اس کی نظریں ہم پر جمی تھیں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ نظریں محبت اور ہمدردی کا پیغام دے رہی ہوں۔ "لیس مجھے معاف کر دو میں غلطی پر تھی۔ میں نے کوزی کو گود میں لیتے ہوئے کہا۔"

(بقیہ صفحہ ۳۹ پر)

نازش پرتاپگڈھی
بیم وارڈ
پرتاب گڑھ

صبح نزدیک ہے

(۱۹۸۰ء کے نام)

ٹھہر و اے جاتے ہوئے سال کے بوجھل لمحو!
اپنی بخشی ہوئی سوغات بھی لیتے جاؤ
بار ہو تو یہ حالات بھی لیتے جاؤ
جن سے میں اور مرا سارا وطن گذرا ہے
روح گذری ہے کبھی اور کبھی تن گذرا ہے

سالہا سال سے ہم بے بس و مجبور و ملول
دیکھتے آئے ہیں دنیا کو تماشے کی طرح
دیر سے ٹھہرے یہ لب ہیں کسی لاشے کی طرح
ایک بے گور و کفن زندہ جنازے کی طرح
دفن ہیں اپنے ہی ماضی کے عزا خانے میں
اپنی تاریخ کے اوراق زبوں اوڑھے ہوئے
چہرے سے پاؤں تلک چادرِ خوں اوڑھے ہوئے

اور تاریخ کے یہ کالے بھیانک اوراق
درج ہے جن میں کسی پر کوئی افسانۂ قہر
ہے کسی صفحے کا عنوان فقط زہر ہی زہر
کوئی لٹتی ہوئی بستی، کوئی جلتا ہوا شہر
وقف ہے کوئی ورق ذکرِ عداوت کے لئے
کوئی تلخی کے لیے ہے، کوئی نفرت کے لیے
کوئی وحشت کے لیے، کوئی شقاوت کے لیے
اپنی تاریخ کے یہ کالے، بھیانک اوراق
جن میں ہے ذکر خود اپنوں کی ستم گاری کا
جھوٹ کا کوئی ورق ہے، کوئی مکاری کا
کوئی تخریب کا صفحہ، کوئی غداری کا

کے تعلقات اور قہر کی شخصیت اور سوانح کے بعض دوسرے پہلوؤں کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ اس لیے جستہ جستہ اشعار یوں نقل کیے جاتے ہیں۔

اک روز یہ بندہ رو سیہ قہر ۔ تھا وارد بزم شوخ مہ چہر
یعنی ہے بیان فرخ آباد ۔ ملقبیں زمانہ، اک پری زاد
کہتا ہے ہر اک اسے مغل جان ۔ میں تو ہوں مغل وہ ہے مری جان
فی الجملہ ہے صاحب طبیعت ۔ کچھ شعر و سخن سے بھی ہے رغبت
مجھ سے کہا اس نے، کیجے ارشاد ۔ گر کچھ ہو آپ کو یاد
یہ سن کے میں بول اٹھا خوب ۔ اور پڑھنے لگا وہ شہر آشوب
جو ہے قفس طیور مضموں ۔ جمات کا ہوا ہے جس میں دل خوں
مطلع جونہی اس کا لب پر آیا ۔ اور لفظ "بنا" زباں سے نکلا
بیٹھے تھے وہاں پہ ایک صاحب ۔ نواب رئیس کے مصاحب
کہنے لگے یہ کو سن کے مغموم ۔ اس طرح کی گفتگو ہے مذموم
با ایں ہمہ دعوی فصاحت ۔ اک نقطہ کی بھی نہیں ہے صحت
میں نے کہا، دست بستہ ہو کر ۔ میری غلطی ہے بندہ پرور
مولد مرا غیر لکھنؤ ہے ۔ اس واسطے ایسی گفتگو ہے
اردو کی بیاں سے کب ہوں آگاہ ۔ تسلیم کریں حضور اللہ

غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے قہر کا غائبانہ تعارف مغل جان ہی نے کرایا تھا اور وہ اشعار بھی دکھائے تھے جو قہر نے ان کی تعریف میں کہے تھے اور اپنے ہاتھ سے لکھ کر انھیں دیے تھے۔ غالب نے اس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے جب کہ قہر سے ان کے دوستانہ روابط قائم نہیں ہوئے تھے، لکھا ہے:-

"ایک وہ زمانہ تھا کہ مغل نے تمہارا ذکر مجھ سے کیا تھا اور وہ اشعار جو تم نے اس کے نعت میں لکھے تھے، تمہارے ہاتھ کے لکھے ہوئے مجھے دکھائے تھے۔"

ایک اور خط سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ صرف قہر ہی مغل جان کی زلف گرہ گیر کے اسیر نہیں تھے، مغل بھی اپنے دل میں ان کے لیے نرم گوشہ رکھتی تھیں۔ اپریل ۱۸۶۵ء میں لکھے ہوئے اس خط میں غالب قہر کو ان کی تصویر کی رسید اور طرح داری کی تعریف میں لکھتے ہیں:-

"بھائی تمہاری طرحداری کا ذکر میں نے مغل جان سے سنا تھا۔ جس زمانے میں کہ وہ نواب حامد علی خاں کے نوکر تھی اور اس میں اور مجھ میں بے تکلفانہ ربط تھا تو اکثر مغل سے پہروں اختلاط ہوا کرتے تھے۔ اس نے تمہارے شعر اپنی تعریف کے بھی مجھ کو دکھائے ہیں۔"

جیسا کہ اس سے قبل بھی ذکر کیا جا چکا ہے، ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳ء) میں مغل جان نے فرخ آباد میں اپنا مکان تعمیر کرایا تھا۔ قہر نے ان کی فرمائش پر اس کے لیے جو تاریخی قطعہ کہا تھا، وہ درج ذیل ہے:

مغل کرد چوں قصر عالی بنا ۔ سزد، گو لمیش گر محبت کدہ
پے سال تاریخ آں خود زمیں ۔ بگفتا "کرم" کن بہ "عشرت کدہ"

عوامی تصور کے مطابق یہ مکان مغل جان کے لیے منحوس ثابت ہوا اور وہ اسی سال انتقال کر گئیں۔ قہر نے اس حادثے کی یادگار کے طور پر یہ قطعۂ تاریخ نظم کیا:

بنا کردہ قصر فلک منزلت ۔ مغل در جناں شمع محفل شدہ
پے سال تاریخ ایں واقعہ ۔ بہ "عشرت کدہ"، "مرگ" داخل شدہ
۹۹۹ + ۲۶۰ = ۱۲۵۹ھ

درگا جان آگرے کی رہنے والی تھیں۔ اس زمانے کے عام مذاق اور دستور کے مطابق انھیں شعر و ادب سے بھی دلچسپی تھی۔ خود بھی شعر کہتیں اور صنم تخلص کرتی تھیں۔ مشاعرہ آگرہ کے گلدستے "شعر و سخن" سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں مرزا اعظم علی بیگ اعظم سے فیض تلمذ حاصل تھا اور ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) میں ان کی عمر خود ان کے بیان کے مطابق تیس سال تھی۔ (۲۰) دوسرے معاصر گلدستوں میں بھی ان کی طرحی غزلیں موجود ہیں۔ بعض تذکرہ نگاروں نے بھی اپنے یہاں ان کا ذکر کیا ہے۔ قہر نے اپنی مثنوی "شعاع مہر" اگرچہ کنور مکھ درتی سنگھ کنور کے اصرار پر نظم کی تھی لیکن فی الحقیقت اس میں درگا جان کے ایما اور ترغیب کو زیادہ دخل تھا۔ اس مثنوی کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے:

خدا کا آسرا، عشق صنم ہے ۔ یہ دو باتیں ہیں جب تک دم میں دم ہے
مرا [illegible] محبوب خدا ہے ۔ مرا مطلوب، مطلوب خدا ہے

آگے [illegible] کر مثنوی کے سبب تصنیف کے تحت قہر نے اپنے مدعائے دلی کا اظہار اس طرح کر دیا ہے: